سال نامہ

ت ۱۹۵۲ء

دِن بہ دِن، ایک نیا حُسن،
ایک نئی دِلکشی
رکسونا صابن ہر روز
استعمال کیجئے۔ اسکے "کیڈِل"
سے آپ کی جِلد میں ایک نئی آب و
ایک نیا حُسن پیدا ہوگا۔
رکسونا
"کیڈِل*" آمیز واحد صابن
Rexona
Rexona
CADYL
* جِلد کو ملائم بنانے والے تیلوں کے
ایک خاص مرکب کا ملکیتی نام
رکسونا پروپرائٹری لمیٹیڈ کیلئے ہندوستان میں بنایا گیا
RP. 99-50 U

ترتیب

بچوں کا آج کل

اردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ملسیانی

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- بال مکند عرش ملسیانی

جگن ناتھ آزاد

جلد ۱۱ —— نمبر ۱

سالانہ چندہ —— ہندوستان میں - چھ روپے / پاکستان میں - چھ روپے

غیر ممالک سے —— نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ —— ہندوستان میں - آٹھ آنے / پاکستان میں - آٹھ آنے

اگست ۱۹۵۲ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

جوش ملیح آبادی

سینۂ عدم میں وجود کا پیچ و تاب

تخلیق سے پیشتر خلائے بسیط پر خدا کے عزمِ تخلیق کا پرتو

ایک آبنوسی سیاہی میں
اک کھنکتے سکوت کا عالم
سینۂ قطرگیٔ پنہاں میں
پیچ و تاب خروشِ موجۂ یم

روئے خنداں نہ دیدۂ گریاں
جلوۂ گل، نہ رشحۂ شبنم
کوئی بد مست صبح کو جیسے
ہو خود اپنے فشار سے خرم

سازِ دیوانگی، نہ سوزِ خرد
نغمۂ سرخوشی، نہ نوحۂ غم
ہم دم و ہم نشین و ہم آغوش
موجِ تریاق و آبِ قلزمِ سم

نہ تغافل، نہ ارتباط و نیاز
نہ تجاہل، نہ اختلاط و کرم
ہم گہر، ہم سرشت، ہم آہنگ
جملہ ذراتِ ارذل و اکرم

نہ بہاروں کی سنبلِ پیچاں
نہ نگاروں کی کاکلِ پرخم
توامِ اطفال، خواب میں جیسے
یوں فضا کے شکم میں دیر و حرم

سوزِ تخلیق ساز — در پردہ
اور بیرونِ پردہ زیر نہ بم
ساز و آواز کی تمنا میں
خامشی رہنِ کرب و خستۂ غم

ذہنِ تصویر ساز میں جس طرح
متحرک ہزار ہا البم
نطق کی راہ پر خلائے گنگ
گوش کے موڑ پر فضائے اصم

موجۂ برق رو میں جوں بجلی
تارِ بربط میں جس طرح سرگم
چشم بر راہ و گوش بر آواز
بربطِ انبیا و رقصِ امم

گاہ پوشیدہ، گاہ نیم عیاں
باہم آویزشِ وجود و عدم
صبح صادق کی آرزوئے جمیل
صبح کاذب کی مونس و ہمدم

"ہشت" ایہامِ نیستی سے بے کیف
"نیست" ابرامِ "ہست" سے بے دم
ظلمتوں کی تہوں میں زیر و زبر
پرتوِ برہمن، نقوشِ صنم

ایک نورس نگارِ معنی کو
محملِ لفظ کی تلاشِ اتم
تیرہ اوجِ خلا پہ جنبش میں
زلفِ لیلےٰ و دامنِ آدم

نیم رس پا بگل عناصر میں
ایک ابھرتا ہوا سا جذبۂ رم
بے شعوری کے بام پر لرزاں
کُل گجا سا شعور کا پرچم[1]

ایک ایسا نیا عمل جس میں
گوشۂ مدح اور نہ پہلوئے ذم
شانۂ ایں و آں پہ کھلتا سا
گیسوئے جود و جعدِ فضل و کرم

خود سے کھلتی ہوئی سی اک زنجیر
خود سے کھلتا ہوا سا ایک علم

[1] نشان و لوا کے معنی میں اب یہ لفظ عام ہو چکا ہے ۔

غنچۂ نیم وا کی صورت میں　　گرہِ تنگِ خشک و عقدۂ نم　　اک جمالِ تبسمِ علوی　　اک جلالِ ارادۂ اعظم
ایک کوندے کی نرم چشمک سے　　قلبِ لیلائے تیرگی ملہم　　ایک کھوئے ہوئے سے جادے پر　　اک پُراسرار سی صدائے قدم
نورِ پنہاں کا رُخ سوئے ظلمات　　خیطِ باطل کی رَو درونِ ظُلَم　　اک صدا اور اُس میں سو شعبے　　ایک "میں" اور اُس کی گونج "ہیں ہم"
کربِ ناگفتہ حرف میں پرّاں　　دردِ ناآفریدہ جام میں جم　　ایک چشمک سی بے مقام و جہت　　اک تمنا سی مخفی و مبہم
ابروئے ذوقِ آفرینش میں　　ایک دھندلے ہلال کا سا خم　　اک صنم بے نیازِ ناز و ادا　　ایک ناز و ادا بغیرِ صنم
تیرگی اس چراغ کے مانند　　ہر نفس ہو رہا ہو جو مدھم　　اک خم و چم بغیرِ سروِ رواں　　ایک سروِ رواں بے خم و چم
کپکپی تیرگی میں یوں - گویا　　نور بننے کی کھا رہی ہے قسم　　اک تپاں حرف بے لبِ گفتار　　ایک لرزاں نگینہ بے خاتم
خیطِ ابیض کی طرح ظلمت میں　　سلکِ تسنیم و رشتۂ زمزم　　ایک نادر کشودہ دار الضرب　　ایک نامہر دیدہ خام درم
کچھ بگولے سے مضطرب و بے تاب　　کچھ ہیولے سے درہم و برہم　　ایک تمکین رواں سوئے حرکت　　اک جراحت رواں سوئے مرہم
سر پر اک برزخی دھندلکا سا　　جس میں اک رنگ سا نہ بیش نہ کم　　ایک اثبات نفی میں چسپاں　　ایک دریا سراب میں مدغم
جیسے جوڑے میں نیم تاب افشاں　　جیسے کہرے میں اگرئی شبنم　　ایک نادیدہ پیکرِ مہماں　　ایک نشنیدہ نغمۂ مقدم
چند جگنو سے دم بدم غلطاں　　چند تلکیں سی پے بہ پے برہم　　اک یقینِ شبک بشکلِ گماں　　اک وجودِ تنک بسانِ عدم
موج زن سا تخیلِ موجد　　سرمئی سا تصورِ عالم　　ایک ابہام سا نہ ظن نہ یقیں　　ایک ابہام سا نہ کیف نہ کم
عزمِ تخلیق کا تموجِ ناز　　سرسرائے ہوا میں جوں ریشم　　ایک عالم بغیرِ لیل و نہار　　ایک پیماں بغیرِ لا و نعم
یوں فضا سوزِ عزمِ "کُن" سے تپاں　　حمل سے جس طرح دلِ مریم　　ایک تعمیر بے در و دیوار　　ایک تشکیل بے حدوث و قدم
گاہ سنگم کے درمیان دریا　　گاہ دریا کے درمیاں سنگم　　اک حکایت بغیرِ گوش و زباں　　اک کتابت بغیرِ لوح و قلم
اک سکوں پیشِ خیمۂ طوفاں　　ایک اندیشۂ قبلِ کارِ اہم　　ایک نادیدہ عقدۂ بے ناخن　　ایک آوارہ راز بے محرم
ہر سکوں میں ادا تزلزل کی　　ہر تزلزل سکونِ مستحکم　　اور اُس آوارہ راز کے اندر　　قلبِ خالق کی جنبشِ پیہم

یہ نظم اس سے پہلے نامکمل صورتوں میں کئی بار چھپ چکی ہے - اب یہ مکمل اور آخری صورت میں یہاں شائع کی جا رہی ہے

عرش ملسیانی

مہجور کاشمیری مرحوم

کشمیر کا عوامی شاعر جو سراپا کشمیر کی محبت کا پیکر تھا آج سے قریب قریب ایک سال پہلے دہلی آیا۔ مدت سے اُس کا نام سُن رکھا تھا۔ شوقِ ملاقات کشاں کشاں مجھے اس کی جائے قیام پر لے گیا۔ مہجور پرتھوی راج روڈ پر کشمیر کے ٹریڈ کمشنر کا مہمان تھا۔ تصور میں اُس کی تصویر ہزاروں انداز سے کھینچتا جب میں اُس کے کمرے میں پہنچا تو متجسس نگاہوں سے اُسے ڈھونڈھنے لگا۔ میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب ایک پست قد، کمزور سے پیرمرد نے خالص کشمیری لہجے میں مجھ سے کہا "آیئے تشریف رکھئے، مزاج تو اچھا ہے"۔ قرائن سے میں نے اندازہ لگایا کہ مہجور ہی مجھ سے مخاطب ہو رہا ہے اور میرا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ خلوص اور سادگی کا پیکر تھا۔ تصنّع اور بناوٹ اُس سے کوسوں دُور تھے۔ شعراء کے تکلّفات اُسے چھو نہیں گئے تھے۔ تبسّم آمیز چہرے اور محبت کی چمک سے منوّر آنکھوں سے وہ مجھے اپنا گرویدہ بنا رہا تھا۔ اپنی بے بضاعتی پر ایک پُر عجز تبصرہ کرتے ہوئے وہ مجھے ٹریڈ کمشنر کے ملاقاتی کمرے میں لے گیا۔ جو کشمیر کی صنعت اور پُرتکلّف ساز و سامان سے مزیّن تھا۔ گفتگو کے دوران میں میں نے اُس سے بیسیوں سوال اُس کی زندگی اور شاعری سے متعلق کئے۔ وہ نہایت خندہ پیشانی اور سادگی سے میرے سوالوں کا جواب دیتا رہا۔ اُس کے اندازِ گفتگو اور لہجے سے خلوص ٹپکتا تھا۔ اُس کی ہر بات سے شانِ استغنا جھلکتی تھی۔ وہ کشمیر کا دلدادہ تھا۔ اُس کے مرغزار، اُس کے کہسار، اُس کے آبشار مہجور کے لئے شاعری آموز اور شعر افروز تھے۔ اپنے سوالوں اور اُس کے جوابوں سے اُس کی زندگی اور شاعری کے باب میں جو کچھ مجھے معلوم ہو سکا وہ اختصار کے ساتھ ذیل میں درج ہے۔

غلام احمد مہجور ۱۳ ستمبر ۱۸۸۵ء کو پیدا ہوا۔ فارسی اور عربی پرانے مکتبوں میں پڑھی۔ مروّجہ تعلیم قومی اسکول سری نگر میں حاصل کی۔ ۲۰ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ سب سے پہلے فارسی زبان میں شعر کہنا شروع کیا۔ آٹھ سال کے قریب یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر سات آٹھ سال اردو شاعری کی طرف رجحان رہا۔ اس کے بعد وہ اپنے اصل میدان یعنی کشمیری زبان کی شاعری میں داخل ہوا۔ اور یہی شاعری ہے جس نے اُسے بقائے دوام بخشی ہے۔ کشمیری زبان کی ترقی میں مہجور نے اپنی تمام کوششیں صرف کر دیں۔ اُس نے ابتدائی نظموں کے سوا کبھی غیر مقامی نام اور مقام اپنی نظموں میں تشبیہہ و استعارہ کے طور پر استعمال نہیں کئے۔ اُس نے بڑے فخر سے مجھ سے کہا کہ اُس کی نظموں میں کوہِ طور، سمندر (کشمیر سمندر سے دُور ہے) بندھیاچل، جمنا اور اسی قسم کے غیر کشمیری ناموں کا ذکر نہیں ملتا۔ وہ جھیل، شکارہ۔ کہسار، مرغزار، کیسر کی کیاری، بلبل اور پھول کا ذکر کرتا ہے۔ وہ ایک چہکتے ہوئے طائر کی طرح کشمیر کی بہاروں کو دیکھ کر چہکتا ہے۔

خالص کشمیری روایات کا ذکر مہجور بڑے فخر سے کرتا۔ حبہ خاتون کا نام بڑے احترام سے لیتا۔ حبہ خاتون کے تصنیف کردہ گیتوں کا وہ عاشق تھا۔ اُس نے اس راز کو پا لیا تھا کہ شاعری عوام کی لَے میں ہو تو قبولِ عام سے فیضیاب ہوتی ہے۔ وہی شاعری ارفع ہے جو بچے بچے کی زبان پر ہو۔ مہجور محکمۂ مال میں ملازم تھا۔ پینتیس سال پٹواری کا کام کرتے کرتے مہجور نے شعر و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ جب میں نے اُس سے پوچھا کہ ملازمت کی پابندیاں اس کی شاعری میں کسی قدر حائل ہوئیں تو اُس نے کہا کہ وہ مہینے میں ستائیس دن آزاد رہتا تھا صرف تین دن کام کرتا تھا۔ ملازمت اور شاعری میں اسی لئے نزاع پیدا نہ ہوا۔ پھولوں کے پاس گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ مرغزاروں میں چلتے پھرتے سارا دن گزار دیتا۔ قدرت نے جو فیاضیاں سرزمین کشمیر سے

وابستہ کی ہیں اُن کو نغموں کی شکل میں ڈھالتا۔ اَن پڑھ کشمیری مہجور کا نغمہ سنتے تو وجد میں آجاتے۔ کیونکہ یہ انھیں کی زبان، انھیں کی لَے اور انھیں کے مزاج کے مطابق تھا۔

مہجور حافظ، امیر خسرو اور عُرفی کا بہت قائل تھا۔ نظریاتی طور پر اقبال سے اختلاف رکھتا تھا۔ ٹیگور نے مہجور کی نظموں کے کچھ ترجمے پڑھ کر اُسے بہت داد دی تھی۔ مہجور اس پر فخر کرتا تھا اور کہتا تھا کہ وہ خود ٹیگور سے بہت متاثر ہوا ہے۔ مہجور نے کشمیری زبان کو سنوارنے کی طرف بہت توجہ کی تھی۔ کشمیری میں فارسی الفاظ کی کثرت ہے۔ وہی شاعر اچھا سمجھا جاتا تھا جو فارسی الفاظ زیادہ استعمال کرے۔ لیکن مہجور نے فارسی الفاظ کو بہت بڑی حد تک خارج کر دیا تھا جس طرح ہندوستان کے لوک گیتوں میں عام طور پر عورت عاشق ہے اسی طرح مہجور نے کشمیری زبان میں اسی دستور کو رواج دیا۔ حالانکہ یہ سراسر اردو اور فارسی شاعری کی روایات کے خلاف تھا۔

مہجور کے والد عبداللہ شاہ مذہبی آدمی تھے، اور یہی اُن کا پیشہ تھا۔ حالانکہ مہجور نے ابتدائی تعلیم والد سے پائی تھی لیکن اس کی زندگی نے والد کی زندگی سے اثرات قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ مہجور نے مسجد کی امامت یا پیشہ ورانہ مولویت سے نفرت کا اظہار کیا۔ یہ اس کی پہلی بغاوت تھی۔

آغا حشر لدھیانوی کی دعوت پر اُردو مشاعرے میں مہجور نے ایک اردو نظم پڑھی۔ عوام نے اُس کا مذاق اُڑایا۔ مہجور نے فوراً محسوس کیا کہ وہ غلط راستے پر جا رہا ہے۔ یہیں سے اس کی کشمیری زبان کی شاعری کا آغاز ہوا۔ یہاں اس بات کا ذکر کر دینا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ اُردو کی مشہور نظم "جوگی" کے مصنف چودھری خوشی محمد ناظر جب لداخ میں وزیر وزارت تھے تو مہجور بھی وہیں ملازم تھا۔ مہجور نے اُن کی صحبت سے بہت فائدہ اُٹھایا بلکہ آغاز میں اُن سے اصلاح بھی لی۔

مہجور کی کشمیری شاعری کے تین دور ہیں۔ ابتدا میں وہ غزل کا اسیر تھا۔ دوسرے دور میں سماجی اور سیاسی قسم کی شاعری کے علاوہ وہ کشمیریوں کے اخلاص کا ترجمان اور اُن کی ترقی کا آرزومند تھا۔ وہ دوسروں کے لئے مشعلِ ہدایت بنا۔ عبدالستار عاصی مہجور سے متاثر تھا اور عبدالاحد آزاد، کشمیری انقلاب کا زبردست حامی مہجور کا شاگرد تھا۔ ذیل میں مہجور کی فارسی، اردو اور کشمیری زبان کی شاعری کے نمونے جو خود مہجور کو پسند تھے اور جو میں نے اُس سے پچھلے سال حاصل کئے تھے درج کئے جاتے ہیں۔

نومبر ۱۹۵۱ء کے آغاز میں جب میں کشمیر گیا تو مہجور سے آخری ملاقات ہوئی۔ ملاقات مختصر تھی اور شاعروں کی ملاقات ہوتی بھی ایسی ہی ہے کہ رسمی خیر و عافیت پوچھنے کے علاوہ اور کوئی بات ہی نہیں کی جاسکتی۔ لیکن مجھے اُس نحیف و زار جسم کو دیکھ کر نہ جانے کیوں یہ خیال آرہا تھا کہ یہ چراغ اب بجھ رہا ہے۔ چنانچہ ۹۔اپریل ۱۹۵۲ء کو وہی ہوا جو موت ہر ذی روح کے ساتھ کرتی ہے۔

آہ! آدمی ابھی کس قدر بے بس ہے۔

فارسی شاعری

"گلِ ویرانہ"۔ فارسی زبان کی یہ ایک طویل نظم گل و شاعر کا مکالمہ ہے۔ جس کی "شانِ نزول" یہ ہے کہ ۱۹۱۱ء میں (جبکہ کشمیر کی سیاست کے ہر شعبے پر غیر ملکی اقتدار چھایا ہوا تھا اور کسی کشمیری کو آگے بڑھ کر اپنی قابلیت دکھانے کا موقع نہیں دیا جاتا تھا) ایک دن مہجور سیر کے لئے گھر سے نکلا۔ آبادی کے خاتمے پر ایک سرسبز باغ سے اس کا گزر ہوا۔ باغ کے رنگا رنگ پھولوں سے سرسری لطف اندوز ہونے کے بعد ایک سنسان میدان میں پہونچا۔ جہاں کوئی جھاڑی یا درخت نہیں تھا۔ شاعر نے چند بڑے بڑے پتھروں کی آڑ میں ایک کھلا ہوا پھول پایا۔ شاعر اس سے ہم کلام ہوا۔ یہ ساری داستان نظم میں بیان کرکے شاعر پھول سے کہتا ہے ؎

گفتمش اے شاہدِ گلہائے گلزارِ ارم ۔۔۔ وے زگلہائے زماں از رنگ و بُو والا گہر

اندریں وادی است باغے رشکِ فردوسِ بریں ۔۔۔ ہر گُلِ او ایمن و محفوظ از خوف و ضرر

صد ہزاراں گُل در و بے وصف مکیں یافتند ۔۔۔ با چنیں خوش رنگ و نکہت تو درین عالم بسر؟

چوں بگوشِ گُل رسید ایں نالۂ مہجورِ خویش ۔۔۔ پارہ پارہ گشتہ بیروں آمدش لختِ جگر

از زبانِ حال با من پُر درد و دُرفشاں ۔۔۔ یا ز حکمت مخزنِ ادراک را بکشاد دَر

گُفت اے مہجور! از نیرنگیِ چرخِ کہن! ۔۔۔ نیستی آگہ؟ نہ دانی حیلۂ ایں حیلہ گر؟

خار و خس در صحنِ گلشن، لالہ اندر کوہسار! ۔۔۔ سینۂ او داغدار، از کس نپرسی خم کمر

سنگ و ردِ قدر شاہی مست برفرقِ خرِ ۔۔۔ شیر زد در غار ویراں بر زمیں افگندہ سر

شکوۂ جورِ فلک ! (پامال مضمونِ قدیم) ترک کن ! بیں سوئے خود اے صاحبِ علم و ہنر
حضرتِ انساں کو لافِ اناالحق میزند خویشتن را می شمارد از ملک پاکیزہ تر
لیک و ز تنظیمِ انساں ایں تماشا دیدہ ام عاقلے محتاجِ لطفِ ابلہِ شوریدہ سر
در تمیزِ خویش و بیگانہ دریں دیرِ کہن گُل شمارد خار را خرمہرہ پندارد گہر
چوں ندانی قدرِ جنبش خویش اے بسیار گو
تو چہ دانی قدرِ گُل ! رو داستاں کن مختصر

اُردو شاعری

فارسی زبان کی شاعری کے بعد مہجور نے اردو شاعری کی طرف رجوع کیا۔ غزلیں، رباعیات اور چند ایک نظمیں لکھیں اور زبان کے مستند شعراء کی غزلوں پر تضمینیں بھی کہیں۔ یہاں نمونے کے طور پر غزل سودا کی تضمین کے تین بند درج کئے جاتے ہیں ؂

گلزارِ کاشمیر کا سروِ خمیدہ ہوں صحنِ چمن کا سبزۂ دامن کشیدہ ہوں
خاموش مثلِ غنچۂ خاطر کبیدہ ہوں نے بلبلِ چمن نہ گُلِ نو دمیدہ ہوں
"میں موسمِ بہار میں شاخِ بریدہ ہوں"

آتے ہیں دور دور سے رندانِ خوش خرام وہ مستِ بادہ اور میں بیٹھا ہوں تشنہ کام
اپنی کمی و غیر کی بیشی پہ صبح و شام گریاں بشکلِ شیشہ و خنداں بطرزِ جام
"اس میکدے کے بیچ عبث آفریدہ ہوں"

نا واقفِ حیات و ممات، اور گرم و سرد نا آشنائے فرقِ سفید و سیاہ و زرد
مہجور سن یہ نکتۂ اقوالِ نیک مرد "میں کیا ہوں اور کون ہوں، سودا بقولِ درد"
"جو کچھ بھی ہوں میں سو غرض آفت رسیدہ ہوں"

کشمیری زبان کی شاعری

کشمیری زبان میں مہجور کی شاعری کا کافی سرمایہ موجود ہے۔ مہجور نے اوّل اوّل اپنا زورِ کلام رومانی شاعری عشقیہ و جذبات نگاری پر صرف کیا۔ اس کے بعد قومی شاعری کی طرف متوجہ ہوا۔ اُس کی غزلیں اور نظمیں اکثر و بیشتر عوامی زبان اور عوامی لَے اور رَس بھری ہیں۔ اور ترنم کے ساتھ عوام کی زبان پر جاری ہیں۔ مہجور نے بعض خاص خاص عنوانات پر بھی غزلیں اور نظمیں لکھی ہیں۔ مثلاً کسان کی لڑکی۔ کشمیری عورت۔ چاند۔ بجلی۔ محنت۔ بہار۔ محبّل کی چوٹی۔ نیا کشمیر وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام غزلوں اور نظموں نے اب لوک گیت کا درجہ حاصل کیا ہے۔

مہجور کی ایک رومانی غزل ملاحظہ فرمائیے۔

کشمیری

آئینتن چھوی میون زوتے جان
ترجمہ۔ میری جان۔ اور میرا جسم حاضر ہے۔ پیشکش ہے
مارہ منہ وارہ وتہ لاگ میون پان
(اے میرے محبوب! مجھے اچھے رستے پر لگانا اور میرے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا)
لومہ نار پانس گُندم ہیرہ بون
(محبت کی آگ نے پاؤں سے لے کر چوٹی تک مجھے جلا دیا)
امہ نارہ سرتلہ سپنم سون
(اس آگ نے میرے پیتل کو سونا بنا دیا ہے)
ولیسہ کیا زہ آسم ولیسہ راورن
(نہ جانے یہ سہیلیاں (محبت سے) مجھے کیوں ڈراتی تھیں!!)
• مارہ منہ وارہ وتہ لاگ میون پانی
(میرے محبوب!! مجھے اچھے راستہ پر لگانا، اور میرے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا)

اسی انداز کے چند ابیات کے بعد مہجور تشبیہات و استعارات میں یوں پیغام دیتا ہے ؂

گُل و پان حُسنس منز چھم کمال
(گُل کہتا ہے کہ میرا حُسن کمال کے درجے تک پہنچ گیا ہے۔)
مشک تے رنگ چھم زُلف تے خال
(رنگ و بُو۔ زلف و خال کا مالک ہوں)
مہ وچھیت دومت دل چھ شہلدن
(میری ایک نگاہ سے جلے ہوئے دلوں میں ٹھنڈک پیدا ہوتی ہے)
مارہ منہ وارہ وتہ لاگ میون پانی
(اے میرے محبوب!! مجھے اچھے راستے پر لگانا اور اچھا برتاؤ کرنا)
اپہ گلس منزہ کال چھو نہ ٹھہراو
(افسوس ہے کہ اسی پھول کو یہاں زیادہ دیر ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہے۔)
پتہ چھس طوفان درژن واو
(باد خزاں اور طوفان اس کی بربادی کے درپے ہیں۔)
خاکس سیت چھس ملہ تاوان
(اس خوبصورت پھول کو مٹی میں ملا دیتے ہیں۔)

مصور:- سوشیل سرکار

کڈولنی

صفیر بلگرامی

جن کے نام غالب کے خطوط کا بالتفصیل تذکرہ
قاضي عبدالودود نے اپنے مقالے میں کیا ھے

مھجور کاشمیری

آپ کي شاعري سے متعلق عرش ملسیاني کا
مقالہ اسي شمارے میں ملاحظہ کیجئے

مارہ منہ دارہ ونہ لاگ میون پان
(اے میرے محبوب! مجھے اچھے راستہ پر لگانا اور اچھا برتاؤ کرنا)
بلبلن وپوگلس حسن چھوئی پور
(بلبل نے پھول سے کہا! بے شک! تیرا حسن بے مثال ہے۔ لاثانی ہے۔)
کیا ونے زیو چھے نہ سوئی چھوی قصو
(مگر کیا کہوں! تری زبان نہیں۔ یہی کوتاہی تیری فنا کا باعث ہے)
بے زبان چھہ نہ بیتہ زندہ روزان
(بے زبان یہاں زندہ نہیں رہا کرتے۔ اس کو زندہ رہنے کی یہاں اجازت نہیں ہے۔)
مارہ منہ . . . .
(میرے محبوب! . . . .)
نالن تہ بوگن ہیہ دورہ دور
(نالہ و فریاد ۔ چھپانا ۔ اور دوڑ دھوپ)
گاہے نغمہ تے گاہے شور
(کبھی نغمۂ شادی ۔ کبھی نوحۂ ماتم کا شور)
اہتہ دیان چھہ زندگی دارہ تھو دھیان
(اسی کا نام زندگی ہے ۔ اچھی طرح دھیان رکھ)
مارہ منہ . . . .
(میرے محبوب! . . . .)
گل یوان صبحس گژھان شامس
(گل صبح کو آتا ہے اور شام کو واپس چلا جاتا ہے)
بلبل پراران انجامس
(بلبل انجام کا منتظر قیام پذیر ہے ۔)
بلبل چھو خانہ دار گل چھو مہمان
(گویا) بلبل صاحب خانہ (میزبان) اور پھول مہمان ہے)
مارہ منہ . . . .
(میرے محبوب!! . . . .)

مہجور کی غزلوں میں ایسی بیسیوں مثالیں موجود ہیں ۔ یہاں صرف ایک ہی نظم کا حوالہ دیا جاتا ہے ۔

مہجور اپنی ہر قسم کی غزلوں اور نظموں میں گل و بلبل کا زیادہ استعمال کرتا ہے ۔ یہ اس کی شاعرانہ خصوصیت ہے ۔

تقسیم ہند کے بعد مہجور زیادہ تر قومی ، اصلاحی اور انقلابی نظموں کی طرف متوجہ ہوا ۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ مہجور سری نگر سے باہر ایک کھلے سبزہ زار میں مصروف سیر تھا ۔ اُس نے سرسبز اور لہلہاتے کھیتوں میں گل لالہ کو دیکھا جو کہ ابھی نیم شگفتہ ہی تھا ۔ اس نے دیکھا کہ لالہ عالم عدم سے ہی داغ لے کر آ رہا ہے ۔ اس پر اُس نے گل لالہ سے داغ سینہ کی وجہ پوچھی ؂

لالو لالو ہا گلِ لالو! حال کرو اظہار
(لالہ! لالہ!! اے گلِ لالہ!!! اپنے دل کا حال بتا دے)
داغ ہیتیہ کتو آگہہ لالہ گو پالو! تتہ چھا ساری داغ دار
(اے لال گوپال! تو یہ داغِ سینہ کہاں سے لایا ۔ کیا وہاں سب داغ دار ہیں؟)
تتہ عالمس منز آلیس خاموشی ۔ غمہ نشہ اوس موکہ عار
(ہم نے سنا تھا) اُس عالم میں خاموشی ہے ۔ عالمِ ہُو ہے ۔ وہاں غم سے فراغت ہے۔)
داغک اسباب تتہ آس نایاب ۔ تتہ اوس موکلنے قرار
(داغ کے اسباب وہاں نایاب ہیں ۔ وہاں سکھ اور قرار ہے)
نازک والنجہ کم وار داتن ۔ وانہ لو دیئے زہ آزار
(تو بتا دے) تیرے نازک دل کو کس صدمے نے آزار پہونچایا اور وہ داغدار ہوا)
تتہ تہ چھا تیہ چی ہتی بے راہی ۔ تتہ تہ چھا بنوی گرہ کار
(کیا وہاں بھی ہماری دنیا کی طرح بے راہ روی ۔ بد انتظامی ہے ۔ کیا وہاں بھی ہماری دنیا جیسا اندھیر ہے؟)
تتہ تہ چھا ۔ ینبرزل تتہ تہ چھا مسول ۔ تتہ تہ چھا گل تہ گلزار
(کیا وہاں بھی نرگس اور مسول ہے ۔ کیا وہاں بھی گل و گلزار ہیں)
تتہ چھا بلبلس پوشن ہنز کل ۔ تتہ تہ چھا ژلہ دن بہار
(کیا وہاں بھی بلبل گل کا طلبگار ہے ۔ کیا وہاں بھی نہ ٹھہرنے والی ناپائدار بہار ہے)

تنہ نہ چہا انسان مارنہ باپتہہ ۔ انساں گران ہتھیار
(کیا وہاں بھی انسانوں کو قتل کرنے کے لئے ۔ انسان ہی آلات طیار کرتا ہے؟)

تنہ تہ چہا ز نا مَن ۔ موسم شرن بٹھ ۔ انسان گران بم بار
(کیا وہاں بھی انسان چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں اور عورتوں پر بم باری کرتے ہیں؟)

تنہ نہ چہا کنٹرول ۔ انتظام گول مول ۔ تنہ نہ چہا چور بازار
(کیا وہاں بھی کنٹرول اور اس کا گول مول انتظام ہے ۔ کیا وہاں بھی چور بازار ہے؟)

تنہ نہ چہا سامانہ رایہ رایہ باگران ۔ تنہ تہ چہا تحصیلدار
(کیا وہاں بھی سامان زندگی طرف داری سے تقسیم کئے جاتے ہیں ۔ کیا اس کے لئے وہاں بھی تحصیلدار ہیں)

(تنہ تہ چہا زمین دار نان کار کاشتکار ۔ تنہ تہ چہا بڑہ جکدار
(کیا وہاں بھی زمیندار ۔ مزدور ۔ کسان ہیں ۔ اور کیا وہاں بھی بڑے بڑے علاقہ دار ہیں؟)

تنہ تہ چہا آلتزن رنگہ رنگہ نعمت ۔ کملن لگان بتہ مار
(کیا وہاں بھی بیکار آدمیوں کو گوناگوں کھانے ملتے ہیں ۔ اور کیا وہاں بھی کام کرنے والے بھوکوں مرتے ہیں؟)

تنہ نہ چہا مسکین مرتد نہ بے دین ۔ دیندار یہ دنیا دار
(کیا وہاں بھی غریب انسان مرتد اور بے دین ہے؟ کیا وہاں بھی دیندار صرف زردار ہی تصور ہوتا ہے؟)

تنہ تہ نادار مجرم گنہ گار ۔ بے خطا چہا سرمایہ دار
(کیا وہاں بھی غریب آدمی مجرم اور گنہگار ہے؟ اور کیا بے خطا صرف سرمایہ دار ہے؟)

تنہ تہ چہا تس تھورن پنجرس اندر ۔ یوزیس آسہ گفتار
(کیا وہاں بھی اس کو جیل خانہ میں ڈال دیتے ہیں ۔ جو سچ بولتا ہو؟)

تنہ تہ چہا رذ بوہ زبیٹھ تہ سا ذ ندر ۔ دورہ وان موٹر کار
(کیا وہاں بھی زبان و راز ۔ خوشامدی نفس پرست ۔ موٹر کاروں پر پہرا کرتے ہیں؟)

تنہ تہ چہا گونہ پتہہ بعس دنان راتبہ درئمس دنان دیدار
(کیا وہاں بھی شاعر لوگ رات کو دن، اور جنگل کے زہریلے درخت کو دیار سمجھتے ہیں؟)

تنہ تہ ہجور تنہا بہنہ دُور کو کرن پہکاں محنتہ ہار
(کیا وہاں بھی مجبور لوگوں سے دُور بیٹھ کر مرغیوں کے آگے موتی کے دانے بکھیر دیتا ہے؟)

دوستی کی چمک

ہماری طویل دوستی کی چمک
جو اختلافات سے ناآشنا ہے
کیا چاندنی کا ایک چھینٹا ہے؟
کیا یہ پورے کھلے ہوئے یاسمن کے پھول ہیں؟
ہماری جوان محبت ہمارے دلوں میں بہت عمر پا چکی ہے
ہماری گہری دوستیوں میں کیا یہ ایک روشنیوں کا جھرمٹ ہے
جن میں سے بعض روشنیاں کبھی نہیں بجھ سکتیں
دن لمحوں کی طرح سے جا رہے ہیں
مختصر ترین رستوں پر چلتے ہوئے
کیا یہ محض حسنِ نظر ہے
کیا یہ واقعی ہمارے بہترین دلوں کی خوبی ہے
کیا یہ نچوڑ ہے
ہماری تمام عمر کی محبت کا
کیا یہ لطیف چمک ہے
چاندنی کی
جو لطیف محبت کی ایک علامت ہے

(تلیگو) ٹی وسواسندرما

قاضی عبدالودود

غالب کے خطوط صفیر بلگرامی کے نام

صفیر بلگرامی (۱۲۴۹ تا ۱۳۰۷ھ) غالب کے دوست، صاحب عالم مارہروی کے حقیقی نواسے تھے۔ اُن کی شعر گوئی کا آغاز تو زمانۂ طفلی ہی میں ہو چکا تھا، اور غالب سے تعلق پیدا ہونے کے قبل تین چار استادوں سے اپنے کلام پر اصلاح لے چکے تھے۔ لیکن، جب ۱۲۸۰ھ میں ان کا مارہرہ جانا ہوا تو وہاں انھوں نے "غالب کا چرچا اور اُن کا ذکر بہت پایا"۔ انھیں بھی خواہش ہوئی کہ میں غالب کا شاگرد بنوں اور انھوں نے ایک فارسی خط جس میں غالب سے استدعا کی گئی تھی کہ مجھے حلقۂ تلامذہ میں داخل کیجئے، کچھ فارسی اردو کلام کے ساتھ مارہرہ سے غالب کی خدمت میں بھیجا۔ خط مذکور کے کچھ عبارات یہ ہیں:

"در آب و گِل ایں بیدل کہ نمک مذاق ریختہ اند.. از بدو شعور بہ ارث آبائی وہم بہ ہنجار طبع آزمائی با غزل سرائی سرے دارد۔ امّا ایں شاہدیست شوخ و شنگ کہ در کنار کساں بشکل جا گرم میکند نہ کہ چون من ناکس ہوسش در سر دارد۔ اینہم خوبیِ تقدیر اوست چہ کند مجبور است کہ افسونے چند از کلام بزرگاں خصوصاً جناب غالب معجز بیاں یاد دارم۔ بہ ہزار حیلہ تا لبِ آغوشِ بیاں مے آرم۔ زیادہ ازیں عرصۂ مجال تنگ و حوصلہ فراخ ہنوز در کنارہ گرفتن باقیست و حصول ایں مدعا دشوار تا کہ رشک نظیری و کلیم و غیرت صائب و سلیم ظہوری ہنجار نظامی کردار نجم الدولہ دبیر الملک نوّاب اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ متخلص بہ غالب.. افسونے تازہ نہ برانگیزد و بہ رہنمائی ایں نابلد.. نہ برخیزد... بنا بر اظہار بے استطاعتی خود غزلے چند فارسی و اردو مے رسد با معان نظر دیدہ ایں انگارہ را از رنگ اصلاح جلوۂ تازہ دادہ شود و بعد ازیں ایں گمنام در زمرۂ مستفیداں نگاشتہ آید کہ سر افتخارم بر فلک ساید۔" جلوۂ خضر ص۲۲۶

اس خط کے ساتھ صفیر کے نانا صاحب نے جو سفارشی نظم و نثر لکھی تھی درج ذیل ہے:

"صاحب عالم غفر اللہ الاعظم سلام و دعا با آرزومندیہائے بے حد و انتہا مے رساند و ایں دو بیت حالیہ بخوانند:

اے لعل ز اشعار تو شرمندہ گہرہم ‏ ‏ ‏ مشتاق تو ارباب دول اہل ہنرہم
لختِ جگرم را کہ صفیر است تخلص ‏ ‏ ‏ خواہد ز توفیقِ سخن آں لختِ جگرہم"

غالب نے اس کے جواب میں ایک خط لکھا اور اپنی مثنوی ابر گہربار بھیجی۔ خط جو بہ تاریخ دہم ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ مارہرہ میں ورود ہوا تھا یہ ہے:

مخدوم مکرم میر فرزند احمد صاحب کو سلام پہنچے۔ مجھ کو حضرت پر جبیں فطرت جناب حضرت صاحب عالم سے نسبت اُویسی ہے۔ غائبانہ حاضر کی فہرست میں پہلے میرا نام مرقوم ہے۔ آپ کی طرزِ نگارش نظماً و نثراً درخشندگی جوہر طبع سے خبر دیتی ہے۔ اگر آپ کی طرف سے استصلاح کا کلمہ درمیان نہ آتا تو میں فضولی نہ کرتا۔ باوجود خواہش خدمت کیونکر بجا لاؤں؟ میں یہ چاہتا ہوں کہ میری معلومات آپ پر مجہول نہ رہیں۔ [مجموعہ ایک ورق میں کیوں کر گنجائش پائیں۔ ناگزیر جو اس نظم و نثر میں ہے اس کو عرض کرتا ہوں۔ بسر در آوردن مخلِ معنی، در آوردن کافی، شور در سر انگیختن ٹکسال باہر، نہ سر انگیختن مناسب، نہ بر انگیزد و نہ برخیزد فارسی ہند، برنخیزد و نینگیزد فارسی عجم۔ بر لفظ زائد ادر نون معنی نفی۔ لفظ زائد ما قبل کلمہ چاہیئے۔ نالہ ہا کہ از دلِ ما بر زدہ اند

---

۱ جلوہ ۲ ص۲۲۹۔ ۲ صفیر کے فارسی خط میں ہے "مرا بعرض پابوسی بزرگان بسر در آورد" جلوہ ۲ ص۲۳۶۔ ۳ "شور سودا از سر برانگیختہ" جلوہ ۲ ص۲۲۷۔ ۴ نالہ ہائے چند کہ از دلِ غم پیوند سر زدہ اند" جلوہ ۲ ص۲۲۷

یعنی چہ؟ غیر ذوی الروح بلکہ غیر ذوی العقول کی جمع کی خبر بصیغۂ مفرد رسم ہے۔ پریستان اصل لغت، مخفف اس کا پرستان، پری استعمال تو ہم مخفف، مگر یہ بھی یاد رہے کہ آدم الشعرا رودگی (کذا) سے فخر المتاخرین شیخ علی حزیں تک کسی کے کلام میں پریستان یا پرستان دیکھا نہیں۔

حضرت صاحب قبلہ کی جناب میں میرا سلام عرض کیجئے اور کہئے کہ آپ کا عطوفت نامہ اور ساتھ اس کے چودھری صاحب کا مودّت نامہ پہنچا۔ دونوں نگارشیں جواب طلب نہ تھیں۔ کل میں نے ایک چھاپے کی کتاب کا پارسل جس کا عنوان سیّد فرزند احمد صاحب کے نام کا ہے ارسال کیا ہے۔ آپ بھی بہ نظر اصلاح مشاہدہ کیجئے گا۔ ہاں، پیرومرشد، فارسی کے کلیات کو بھی کبھی آپ دیکھتے ہیں یا نہیں؟ بہ قول انشاء اللہ خاں "یہ مری عمر بھر کی پونجی ہے"

جناب سیّد صفیر زندا احمد صاحب سے التماس ہے کہ حضرت صاحب کو سلام و پیام پہنچا کر حضرتِ شاہ عالم صاحب کو اور اُن کے اخوان کو اور حضرتِ مقبول عالم کو میرا سلام کہئے گا اور جناب چودھری عبدالغفور صاحب کو سلام کہہ کر یہ فرمائیے گا کہ وہ اپنے عم نامدار اور استاد عالی مقدار کو میرا سلام کہیں۔ زحمت تبلیغ سلام و پیام تقدیم خدمت اصلاح کا دست مزد ہے۔ والسّلام، نجات کا طالب، غالب، یوم الخمیس ذی الحجہ و ۱۲ مئی سال حال۔"

صفیر نے اپنے خط کے ساتھ جو کلام اصلاح کے لئے بھیجا تھا، اس میں غالب نے حسب ذیل ترمیم کی تھی:

(۱) خیال روئے تو اے قبلۂ نظر کردم ز دیدنت نظر خویش بہرہ ور کردم
(۲) بلند شد شب ہجراں چو شعلۂ آہم چراغ ماہ خمش گشتہ بود بر کردم

شعر ۱ میں غالب نے "روئے تو اے" کی جگہ "روئے ترا" بنا دیا تھا اور شعر ۲ کے مصرع ۲ کو اس طرح بدل دیا تھا "چراغ مہ بہ فلک مُردہ بود بر کردم"

صفیر نے مثنوی ابر گہربار کے شکریے میں ایک فارسی مثنوی صبح اُمید غالب کو بھیجی، غالب نے اُسے اصلاح سے مزیّن کیا اور خط ذیل صفیر کے نام لکھا:

---

۱ یہ صفیر کے خط کا جواب ہے۔

"مخدوم زادۂ مرتضوی دودماں سعادت و اقبال تواماں مولوی سیّد فرزند احمد صاحب کو فقیر غالب کی دعا پہنچے۔ میں نے استصلاح اشعار میں امتثال امر کیا ہے تو اس واقعے کو یوں سمجھ لیا ہے کہ میں امیرالمومنین کا بوڑھا غلام ہوں، امیر نے اپنی اولاد میں سے ایک صاحبزادہ میرے سپرد کیا ہے (اور حکم دیا ہے) کہ تو اس کے کلام کو دیکھ لیا کر، ورنہ میں کہاں اور یہ ریاضت کہاں؟ (اپنے نانا صاحب کی خدمت میں فقیر کی بندگی عرض کیجئے گا، اگرچہ حضرت میرے ہم عصر ہیں، مگر ان کے ابوآبا کا غلام ہو کر سلام کیا لکھوں؟ مجھ کو ارادت میں ان سے نسبت اویسی ہے اور محبت بھی بے تکلف ویسی ہے جیسی اس معنوی نسبت میں چاہیئے۔ نجات کا طالب) غالب (یوم الخمیس پنجم ذی الحجہ ۱۲۷۰[۱] ہجری)"

اصلاحات اشعار مثنوی صبح اُمید:

(۱) صباحے کہ مستوے اند اہل ہوش بہ دنبال او خور صبوحی بدوش
(۲) چہ ابرے کہ از دوے شب زلف ماہ ز صبح بنا گوش شد پردہ خواہ
(۳) نویسم او در بہار مثنوی بہ ہنجار جادو بیان قوی

شعر ۱ میں 'بدوش' کی جگہ 'فروش'، شعر ۲ میں کہ: ماہ کی جگہ 'کز دوروز گیسو سیاہ'، اور 'پردہ خواہ' کی جگہ 'باج خواہ' اور شعر ۳ کا مصرع ۲ اس طرح: زبانش پُر از منطق پہلوی۔

غالب کا تیسرا خط:

نورچشم لخت جگر زبدۂ اولاد پیغمبر حضرت مولوی سید فرزند احمد [صاحب] زاد مجدہ، اس درویش گوشہ نشین کی دعا قبول فرمائیں۔ بوستانِ خیال کے ترجمے کا عزم اور دو جلدوں کا منطبع ہو جانا مبارک۔ حضرت یہ آپ کا احسان عظیم ہے۔ مجھ پر خصوصاً اور بالغ نظران ہند پر عموماً۔ [جناب میر ولایت علی[۲] صاحب سے بعد ارسال قیمت و محصول دو جلدیں

---

۱ یہ سنہ صریحاً غلط ہے، مراسلت کا آغاز ۱۲۸۰ھ میں ہوا ہے۔ اگر یہ خط ۱۲۸۰ھ کا سمجھا جائے جو قرین قیاس ہے تو تاریخ صحیح نہیں، اس لئے کہ پہلا خط ذی الحجہ کی دسویں کو مارہرہ پہنچا تھا، یہ دوسرا ہے۔

۲ میر ولایت علی اس مطبع کے منتظم تھے جس میں بوستانِ خیال کا ترجمہ طبع ہوا تھا ان کے نام کا ایک خط میں نے رشحات صفیر سے لے کر آثار غالب میں درج کیا ہے۔ اس کا لفافہ اب تک کتب خانۂ مشرقیہ پٹنہ میں موجود ہے۔

مانگی ہیں۔ خدا کرے وہ یہ پارسل پہلے بھیجیں اور یہ رقم تمہارے پاس بعد)
غالب ۸ ذی قعدہ ۱۲۸۱ھ ہجری

چوتھا خط:

"بہ علاقۂ مہر و محبت نورِ چشم و سرورِ دل و بہ رعایت سیادت مخدوم و مطاع مولوی سید فرزند احمد طال بقاؤہ و زاد علاؤہ اس مصرع سے میرا الکنون ضمیر دریافت فرمائیں: بندۂ شاہ شمایم و ثنا خوانِ شما۔[یا رب، وہ کون بزرگ ہیں کہ سودائی کو معمائی سمجھتے ہیں؟ اصل فطرت میں میرا ذہن تاریخ و معما کے ملائم و مناسب نہیں پڑا ہے۔ جوانی میں از راہ شوخی طبع گنتی کے عامیانہ معمے لکھے ہیں۔ وہ مبادی کلیات فارسی میں موجود ہیں۔ تاریخیں اگر ہیں تو مادے اوروں کے ہیں اور نظم فقیر کی ہے۔ یہ کلام نہ بہ طریق کسرِ نفس ہے نہ بسبیلِ اغراق، سچ کہتا ہوں اور سچ لکھتا ہوں۔ اس نامۂ مہر افزا کو دیکھ کر مبادی پرستانِ خیال کی عبارت یاد آئی۔ افسوس ہے کہ اس ہیچ میرز کے اجزائے خطابی اس سودے کی تسوید کے وقت تک آپ نے نہیں سنے تھے، ورنہ اس کے کیا معنی کہ خط میں لکھے جائیں اور کتاب میں اندراج نہ پائیں؟ محمد رضا، برق کا خطاب معلوم تھا تو آپ نے لکھا ہے، حکایت ہے شکایت نہیں۔۔۔۔] پہلی جلد جس کا نام افق الخیال ہے اس کے دیکھنے کا بہت مشتاق ہوں۔ جناب میر ولایت علی صاحب کو تاکید رہے کہ جب اس کا چھاپا تمام ہو بے طلب بھیج دیں اور معاً قیمت لکھ بھیجیں۔[۔۔۔] اشعارِ گہربار دیکھ کر دل بہت خوش ہوا، سب اچھے ہیں مگر جو میرے دل میں اتر گئے ہیں وہ تم کو لکھتا ہوں:

ہائے وہ لب ہلا کے رہ جانا   ابھی کچھ بات کر نہیں آتی

[کیوں حضرت؟ ابھی کچھ کی تحتانی کا دبنا غیر فصیح نہیں؟ کچھ ابھی بات کر نہیں آتی، کیا اس کا نعم البدل نہیں؟]

۱؎ یہ مصرع حافظ کا ہے۔

۲؎ اس کے متعلق صفیر نے حاشیے میں لکھا ہے: "۔۔ بندہ صفیر نے حضرت غالب کو لکھا تھا کہ پٹنہ کے لوگ آپ کے معما اور چیستان کے مشتاق ہیں کہ ان لوگوں نے آپ کو معمے میں کامل سنا ہے۔۔" غالب کے معمے کلیات کے مطبوعہ نسخوں میں نہیں، لیکن قلمی نسخوں میں ہیں جن سے تین معمے کر میں نے مآثرِ غالب میں درج کئے ہیں۔ ۳؎ ی کے دبنے کے متعلق شعرائے ایران و ہند (بقیہ دوسرے کالم پر)

ورق ہیں جوششِ مضمون گریۂ بادل   بہ سان ژالہ ہے ہر نقطۂ کتاب میں آب

در قائل:

کبھی ہوں گرم کبھی سرد حسبِ موقع و وقت   صفیر آگ میں ہوں آگ اور آب میں آب

عارفانہ و موحدانہ مضمون اور بالغانہ الفاظ:

تم سلامت رہو قیامت تک   صحت و لطفِ طبع روز افزوں

نجات کا طالب، غالب، شنبہ ذی القعدہ ۱۲۸۱ھ ہجری"

پانچواں خط:

"نورِ چشم و سرور دل فرزانۂ مرتضوی گہر مولوی سید فرزند احمد صاحب زاد مجدہٗ، اس نسبت عام سے کہ ہم اور آپ مومن ہیں سلام، اور اس نسبت خاص سے کہ آپ میرے دوست روحانی کے فرزند ہیں۔ دعا اور اس نسبت اخص سے کہ آپ میرے خداوند کی اولاد میں سے ہیں بندگی:

میں قائل خدا و نبی و امام ہوں   بندہ خدا کا اور علی کا غلام ہوں

آپ کے دو خطوں کا جواب بسبیل ایجاز لکھا جاتا ہے: دہائی خدا کی مجھے ولایت کی اپیل کی تاب نہیں، نہ تم اپیلانٹ بنو، نہ مجھے رسپانڈنٹ بناؤ۔ لکھ بھیجو کہ صبح بہار کی عبارت فارسی ہے یا اردو اور ماکتب فیہ اس کا کیا ہے۔ (نجات کا طالب) غالب، چہار شنبہ ہفتم ذی الحجہ ۱۲۸۱ھ ہجری۔

۱؎ یہ پانچواں خط مرقع فیض اور جلوۂ خضر جلد ۲ دونوں میں ہیں،

کے مسالک کا حال راقم کے مضمون نکاتِ سخن سے معلوم ہوگا، جو اردو ادب کے حسرت نمبر میں شائع ہوا ہے۔ خود غالب کے اشعار فارسی و اردو میں ی بکثرت دبتی ہے:

نیست در رہروی از سایہ و سرچشمہ گزیر   خامہ رہرو بود و سایہ و سرچشمہ دوات

دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال   ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

۱؎ مرقع فیض جس میں صفیر اور ان کے تلامذہ کے تراجم اور منتخب اشعار ہیں ۱۲۹۵ھ میں طبع ہوا تھا اور اس کے سرورق پر نواب سید تجمل حسین خاں عرف سلطان مرزا المتخلص بہ سلطان شاگرد صفیر کا نام مصنف کی حیثیت سے درج تھا۔ لیکن تنبیہ صفیر بلگرامی میں جو مرقع کا رد ہے سلطان کا ایک خط شامل ہے جس کے مکتوب الیہ ان کے والد ہیں۔ اس خط سے قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ کتاب سلطان نے نہیں لکھی تھی میر صفیر صاحب بلا اطلاع غلام (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

وہ عبارات جو صرف مرقع میں ہیں، قوسین کے اندر ہیں، اور وہ جو صرف جلوہ میں ہیں قلابین کے اندر ہیں۔ اس کے علاوہ اختلافات یہ ہیں: خط ۴: مرقع: نور نظر، جلوہ: نور چشم۔ خط ۵: مرقع: رسپاڈونٹ، جلوہ: رسپانڈنٹ۔ مرقع: چہارشنبہ، جلوہ: چہارشنبہ۔ جلوہ میں کہیں کہیں خط میں عبارات کے بعد نقطے بھی ہیں، یہ بے کار ہیں یا ان سے یہ مراد ہے کہ ان کی جگہ جو الفاظ تھے وہ کسی وجہ سے درج نہیں ہوئے۔ میں نہیں کہہ سکتا۔

صفیر نے جلوہ ۱ ص ۲۲ میں لکھا ہے کہ "جب تک حضرت غالب کے ہوش و حواس درست رہے خط وکتابت جاری رہی۔" لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے صفیر کی زندگی میں ان پانچ خطوں کے علاوہ کوئی خط شائع نہیں ہوا۔ ان کی وفات کے بہت بعد ان کے پوتے جناب سید وصی احمد بلگرامی نے اپنے طویل مقالے، س ش ص میں جو ندیم گیا کے بہار نمبر (بابت ۱۹۳۵ء) میں چھپا تھا، دو خط درج کئے۔ جن میں سے ایک کی نسبت ان کا بیان ہے کہ صفیر نے غالب کو لکھا تھا اور دوسرا اُن کے دعوے کے مطابق غالب کی طرف سے اس کا جواب ہے۔ یہ دونوں خط ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

خط صفیر: "۔۔۔۔ (کذا) ملازمت کے وقت میں نے خواجہ فخرالدین صاحب سخن جن کا دادیہال لکھنؤ اور ننہیال دہلی میں ہے اور غدر کے سال میں بہ عمر چاردہ یا پانزدہ سالگی آرہ میں تشریف لائے اور جناب محمد ابراہیم صاحب خلف مرزا احمد صدیق صاحب کی صاحبزادی سے منسوب ہوئے اور مجھ سے تلمذ کیا اور قصہ مسمّٰی بہ سروشِ سخن[۱] جس کو اُن کی رائے سے درست کرنے کا اتفاق ہوا، سب حال آپ سے بیان کیا تھا، چونکہ اس قصّے کو چھپنا چاہیے اور لکھنؤ بھیجنا منظور نہیں، اس کے سوا حضور سے بڑھ کر کون ہے؟ اس لئے وہ قصہ بھیجتا ہوں۔ حضور اس کو میری تصنیف سمجھ کر بہ نظر تامل بنائیں کہ بڑا مقابلہ ہے اور طبیعت ان کی اچھی ہے۔ چنانچہ آج ہی ایک غزل میرے پاس تنبیہ اصلاح کو آئی ہے، اس کا ایک شعر میرے دل میں کھُب گیا، وہ یہ ہے:

سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر ۔۔۔ ہمیں تو موت[۲] ہی آئی شباب کے بدلے"

جواب غالب: "مولوی سید فرزند احمد۔۔۔ (کذا) اس پیر ہفتاد سالہ کی دعا پہنچے۔ آج میں نے لیٹے لیٹے حساب کیا کہ یہ ستروان برس مجھے جاتا ہے، ہائے

سنین عمر کے ستر ہوئے شمار برس ۔۔۔ بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس

نامۂ محبت افزا کو دیکھ کر آنکھوں میں نور دل میں سرور آیا اور قصّہ سروشِ سخن اس کے دوسرے دن پہنچا۔۔۔ (کذا) قصہ دیکھا، آپ کے جوہر[۳] طبع کی لمعانی اور نیز فکر کی درخشانی بہت جگہ پر پسند آئی، اگرچہ وہ قصہ تو

(بقیہ حاشیہ) کہ ہرگز وحاشا غدری از اں مطلع نیستم از تصنیف خود یا دیگرے از شاگرداں خود بنام غلام طبع نمود۔ نزد غلام مع چند نسخہ مرقع فیض آمدہ گفتند کہ آنچہ نوشتہ ام آنرا قبول نمایند۔ بندہ عرض کردم ۔۔ باعث بدنامی و توہین من خواہد شد، چراکہ کلام دیگر منسوب بخود نمایم بے حیائیست دیک نسخہ ہم ازاں باوجود اصرار شاں ہرگز نزد خود نداشتم۔" ص ۱۳۵۔ تنبیہ صفیر بلگرامی ایک شخص سردار مرزا تخلص بہ آزاد کی طرف منسوب ہے۔ جناب سید وصی احمد بلگرامی نے س ش ص میں لکھا ہے کہ "جناب سخن نے۔۔ لکھی اور ایک فرضی شخص سردار مرزا کے نام سے شائع کی۔" یہ بات قرین قیاس ہے کہ خود سخن اس کے مصنف ہیں، لیکن سردار مرزا ایک فرضی شخص نہیں؛ یہ سخن کے دوستوں میں تھے اور ان کا نام دیوان سخن میں آیا ہے۔ جلوۂ خضر صفیر کی تصنیف ہے۔ جلد ۱ ان کی زندگی میں شائع ہو گئی تھی۔ جلد ۲ کا حصہ ۱ زیر طبع تھا کہ صفیر کا انتقال ہو گیا۔ اس کا حصہ ۳ لکھا گیا تھا یا نہیں۔ اس کی خبر نہیں۔

۱ سروشِ سخن فسانۂ عجائب کے جواب میں لکھا گیا تھا اور اس میں سرور پر اعتراض کئے گئے تھے۔

۲ سخن نے غالب کی زندگی ہی میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ غالب میرے نانا ہوتے ہیں اور میں اُن کا شاگرد ہوں۔ تنبیہ صفیر بلگرامی میں ہے کہ "سنبھالا الخ سخن نے دہلی ہی میں کہا تھا اور غالب نے اسے سن کر انھیں گلے لگا لیا تھا اور آب دیدہ ہو کر کہا تھا، میری جان، ایسا شعر نہ کہا کرو، ابھی تو ہم نے ہوش بھی نہیں سنبھالا دنیا میں کیا دیکھا بھالا، دیکھو عارف ایسے ہی لخت جگر گُل کر دنیا سے ناشاد گیا۔ تم بھی زندگی سے بیزار ہو۔ الغرض نہایت خفا ہوئے اور تاکید کی کہ خبردار، اب جو سنوں گا کہ ایسا شعر کہا ہے تو سید، تیری جان اور اپنے ایمان کی قسم صورت سے بیزار ہو جاؤں گا۔" ص ۵۲

۳ اس سے یہ ثابت کرنا مدنظر ہے کہ کتاب صفیر کی لکھی ہوئی ہے۔

بچوں کے سُلانے کی کہانی ہے۔ مگر محنت کی گئی ہے، ہاں اگر فسانۂ عجائب کا مقابلہ کیا ہے تو کیا کہوں کہ کیا کہا ہے۔ ابھی دیکھتا ہوں، آئندہ اس کی کیفیت سے اطلاع دی جائے گی۔۔۔ (کذا) جابجا لا چار لکھا ہے۔۔۔ (کذا) لا کا لگانا کاتب کی جہالت ہے۔۔۔ (کذا) ہائے خدا کی مار کاتبان نا ہنجار پر، میرا دیوان اور پنج آہنگ اور مہر نیم روز ستیاناس کر کے چھوڑ دیا۔۔۔ (کذا) لو بس اب میں نواب ضیاء الدین خاں سے باتیں کر رہا ہوں، تمہارے خط کے جواب نے اتنی دیر تک اُن کو جکا بٹھا رکھا، اور وہ بھی تم کو سلام اشتیاق آمیز پہنچاتے ہیں۔۔۔۔ (کذا)"

جناب سیّد وصی احمد لکھتے ہیں کہ حضرت غالب کے شعر کا جواب صفیر بلگرامی نے یہ بھیجا:

سنا صفیر یہ کہتے ہیں حضرتِ غالب	بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس
مگر یہ پہلے سے اعدائے دین کی ہے دُعا	خدا کرے مرا غالب جئے ہزار برس"

میں نے نادر خطوطِ غالب کے تبصرے میں جو معاصر پٹنہ میں شائع ہوا تھا، موصوف سے دریافت کیا تھا کہ صفیر و غالب کے خط انھیں کہاں ملے، لیکن، انھوں نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا۔ یہ دونوں خط میری رائے میں جعلی ہیں، اور جعل سازی کی غرض یہ ثابت کرنا ہے کہ سخن صفیر کے شاگرد تھے۔ سخن کو اس سے انکار ہی نہیں تھا، وہ اس کے مدّعی تھے کہ خود صفیر کو اُن سے تلمذ ہے (تنبیہہ صفیر بلگرامی ص۸)۔ اس موقع پر میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ صفیر و سخن میں سے کس کا دعویٰ صحیح ہے" اور خطوطِ زیرِ بحث کو جعلی قرار دینے کی وجہ بیان کرنے پر قناعت کروں گا:

صفیر کے خط میں دہلی جانے اور وہاں غالب سے سخن کے متعلق گفتگو آنے کا ذکر ہے۔ صفیر اوائل ۱۲۸۲ھ میں دہلی گئے ہیں۔ (جلوہ ا ص۲۲۲) اور وہاں دو ڈھائی مہینے ٹھہرے ہیں (جلوہ ۲ ص۲۲۹)، اس سے لازم آتا ہے کہ خط دہلی سے واپسی کے بعد کا ہو، غالب کے خط میں جو ان کی عمر کا ذکر ہے، اس سے اس کا زمانۂ تحریر ۱۲۸۳ھ ثابت ہوتا ہے۔ لیکن سروشِ سخن (قطعات تاریخ طبع اور تاریخ ذاتی جلد ۲ ص۱۷۱) ۱۲۸۱ھ ہی میں لکھنؤ کے مطبع نول کشور نے چھاپ کر شائع کر دیا تھا، اس لئے یہ ممکن نہیں کہ یہ خط اس کے بعد لکھے گئے ہیں جعل کسی ایسے شخص نے بنایا ہے جو سروشِ سخن طبع اوّل کے سالِ انطباع سے ناواقف ہے اور اس بنا پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کے ذمہ دار صفیر نہیں۔ یہ مستبعد ہے کہ وہ اسے نہ جانتے ہوں۔

غالب نے صفیر کے رسالۂ تذکیر و تانیث کے لئے ایک دیباچہ لکھا تھا جو عود ہندی اور اس رسالے کی اشاعت اولیٰ میں موجود ہے۔ صفیر جلوہ ا ص۲۲۲ میں اسے تقریظ کہتے ہیں اور اس کے متعلق تحریر کرتے ہیں کہ میرے دوران قیامِ دہلی میں غالب نے رسالہ دیکھا، بہت تعریف کی اور تقریظ لکھ کر دی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریظ یا دیباچہ اوائل ۱۲۸۲ھ میں حوالۂ قلم ہوا، لیکن علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر میں غالب کا ایک خط جس کے مکتوب الیہ صاحب مارہروی ہیں، شائع ہوا ہے، اس میں مرقوم ہے کہ "دیباچے کا عظیم آباد کو روانہ ہونا معلوم ہوا۔ مگر یہ نہ معلوم ہوا کہ۔۔۔ مولوی سیّد فرزند احمد کو وہ دیباچہ پسند آیا یا نہیں" ص۹۔ یہ خط ۲۶۔ اگست ۱۸۶۶ء کا لکھا ہوا ہے جو ربیع الثانی ۱۲۸۳ھ کے مطابق پڑتی ہے۔

غالب اور ذال فارسی "غالب اور ذال فارسی" (آج کل فروری ۱۹۵۲ء) میں کچھ ایسی باتیں میرے قلم سے نکل گئی ہیں، جن کی تصحیح یا جن میں اضافے کی ضرورت ہے؛ اغلاطِ طباعت بھی بہت ہیں، لیکن ان میں سے بیشتر نظر انداز کر دیئے گئے ہیں: (۱) صفحہ ۱۷، ستون ا، سطر ا و مابعد: غالب نے پنج آہنگ کے باب دوم میں لکھا ہے کہ پذیرفتن، گذاشتن اور گذشتن اور ان کے مشتقات ذ سے ہیں، انھیں د سے لکھنا صحیح نہیں۔ اس کتاب کے بعض حصص غالب کے سفرِ کلکتہ سے پہلے قلم بند ہوئے تھے۔ لیکن اس کا انطباع اس کے بہت بعد ہوا۔ باب ۲ کا زمانۂ تحریر کلکتہ جانے سے قبل بھی ہو، تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے بعد اس میں تصرفات نہیں ہوئے۔ (۲) ص۱۸ س۱۹ "مذرد ص۵" چاہیئے۔ (۳) ص۱۸ س۱: "اگر لے ہوں" چاہیئے۔ (۴) ص۱۸ س۲۳ و ص۲۴: "اسرار۔۔ خود آیا ہے" یہ عبارت حذف کی جائے۔ عطار کا شعر مثال میں پیش کرنا ٹھیک نہیں؛ اس لیے کہ اس میں "خود" ذال سے ہے۔ (۵) ص۱۹ س۱: رومی کا شعر مؤیدہ میں بھی ہے۔ (۶) ص۱۹ س۱۶: المعجم ص۱۳۲ میں رودکی کے اشعار ہیں جن میں نبیذ، دمیذ و خزیذ کا قافیہ آیا ہے۔ شعرا کے بارے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ محض اس بنا پر کہ ان کے یہاں کبھی کبھی دال و ذال کے قوافی کا اختلاط پایا جاتا ہے، یہ لازم نہیں کہ وہ فارسی میں وجود ذال کے قائل ہوں۔ قوافی کا اختلاط اتفاقی ہو سکتا ہے۔ (۷) ص۱۹ س۲۲: میں نے لکھا ہے: "لیکن۔۔ آیا" مگر شاد نامہ مطبوعہ (ٹرنر میکن) میں ایک شعر موجود ہے جس میں عربی لفظ "زیاد" ایک ایسے فارسی لفظ کا قافیہ بنا ہے جو ذال پر ختم ہوتا ہو۔ نولڈیکے نے اس بارے میں وہی بات کہی ہے جو میں نے پہلے لکھی تھی، اور اس کے پیش نظر متعدد قدیم مخطوطات تھے۔ کچھ عجب نہیں اگر شعر ناکورالحاقی ہو یا اس میں کاتب کا تصرف ہو۔ (۸) ص۱۹ س۱۵: "ثمانیہ" چاہیئے۔ (۹) ص۱۹ س۲۲: "گو قافیہ دال شو زہے عالم جود" چاہیئے۔ انوری کی رباعی مؤیدہ میں بھی ہے۔ (۱۰) ص۲ س۵: یہ رباعی مؤیدہ میں بھی ہے۔ (۱۱) ص۲ س۲۳ لطف اللہ کا شعر مؤیدہ میں بھی ہے۔ (۱۲) ص۲ س۲۶: "میگزین ص۲۵" چاہیئے۔ (۱۳) ص۲۱ س۷ "کے نام سہواً" چاہیئے۔ (۱۴) ص۲۱ س۱۰" اس میں قلبسی کے حوالے" چاہیئے۔ (۱۵) ص۲۱ س۱۱ و س۱۱: "اسپند را ندو اسپند ارند دال سے ہیں جیسا کہ" چاہیئے۔

بال مکند مشر

ہندی ادب کا ارتقاء

ہندی ادب کی عمر ایک ہزار برس کے آس پاس ہے۔ ادب کی زندگی کے لئے یہ مدت کافی بھی ہے اور ناکافی بھی۔ اعلیٰ ادب کے ارتقا کے لئے وقت درکار ہے۔ اعلیٰ ادب سے ہماری مراد اُن ادبی تخلیقات سے ہے جن کی دلچسپی دیر تک قائم رہے اور جنہیں پسندِ عوام زندگیٔ دوام بخش دے۔ اور وہ ایک دن میں نہیں لکھی جاتیں۔ ہاں "پراپیگنڈہ لٹریچر" کی دوسری بات ہے۔ کیونکہ اُس کی نشو و نما سیاسیات کے اُتار چڑھاؤ پر منحصر ہوتی ہے ایک ہزار سال کی مدت ادب کی پختگی، زبان کی شستگی اور ہمہ گیری کے لئے کافی ہے۔ اس مدت میں ہندی ادب کے مختلف اضاف نے کافی ترقی کی ہے۔

ہندی ساہتیہ (ادب) کا جنم گیارھویں صدی میں مانا جاتا ہے۔ بارھویں اور تیرھویں صدی کا ہندی ادب سیاسی اور رزمیہ نظموں پر مشتمل ہے۔ "پرتھوی راج راسو" اسی زمانے کی تصنیف ہے۔ چودھویں اور پندرھویں صدی کے ہندی ادب میں دھرم کے نام پر پُرانے عقیدوں کی اندھا دھند تقلید اور سماج کی خامیوں کے خلاف آواز اُٹھائی گئی۔ کبیر۔ دادو، نانک اور دوسرے سنت کویوں نے ایشور بھگتی کے ساتھ ساتھ سماج سدھار کا سندیش دیا۔ سولھویں اور سترھویں صدی کا ابتدائی دَور بھگتی اور شانت رس کی رچناؤں کا دَور تھا۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں شرنگار نے ہندی ادب کو سنوارا۔ اس میں عشق و محبت کی چاشنی آئی جس سے زبان اور ادب کا رنگ روپ نکھرا۔ دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح ہندی ادب کا دورِ اول بھی نظم میں تھا بعد میں نظم کا تنزل شروع ہوا۔ شرنگار (عشقیہ نظموں) سے لوگوں کو نفرت سی ہونے لگی۔ ڈرامے کا رواج کچھ کچھ بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ موجودہ دَور تو زیادہ تر نثر ہی کا دَور ہے۔ پُرانی قدروں کی جگہ نئی قدریں لے رہی ہیں۔ سوشلزم (سامراج واد) فاسزم اور کمیونزم وغیرہ کے سیاسی اثرات سے بھی ہندی ادب اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکا ہے۔

سائنس کی ایجادات مثلاً ریل تار۔ ڈاک وغیرہ نے ہمارے سماجی نظام میں ایک حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ جغرافیائی مسافتیں بہت کم ہو گئی ہیں۔ اِن سب تبدیلیوں کا اثر ہندی ادب پر بھی پڑا ہے۔ اس کا رنگ روپ بھی زمانے کے ساتھ ساتھ بدلا ہے اور بدلتا چلا جا رہا ہے۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۳۹ء کے درمیانی دَور میں ہندی ادب نے بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کی طرف قدم بڑھایا ہے۔

نئے رُجحانات

ہندی میں نیا رجحان شری جے شنکر پرساد کی "کامائنی" سے شروع ہوتا ہے۔ ایک طرح سے "کامائنی" ہندی کے حال اور ماضی کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ "چھایا وادی" اور "رہسیہ وادی" یُگ کی اپنی خوبیوں کے ساتھ نئے نئے اُبھرتے ہوئے رجحانات کی طرف اس نے اشارہ کیا۔ اسی لئے پرساد جی ایک نئے جگ کے رہنما ادیب مانے گئے ہیں۔

"چھایا وادی" بلنے کو اُتار کر ساہتیہ جب کھلے میدان میں آیا تو اُس میں مصنف کی شخصیت ہی ممتاز رہی۔ نیچر کے سہارے سے ہٹ کر خیالات و جذبات صاف اور سیدھے الفاظ میں اُترنے لگے۔ اُس میں اپنے مقصد کے حصول کا رُجحان پیدا ہوا۔ یہ صاف اور بے لاگ اظہارِ خیال ایک بالکل نیا رجحان تھا۔ اس کا اثر آج کے ادب میں بھی جھلکتا نظر آتا ہے اگرچہ اس کی صورت بہت مختلف ہے۔

ادیب پہلے بھی مجبور تھا، دُکھی تھا اور آج بھی ہے۔ نئے رجحانات سے اظہارِ خیال میں صرف اتنی ہی تبدیلی آئی کہ پہلے ادیب رنج و غم دُکھ اور سُکھ کے اظہار میں بے باک اور آزاد تھا اب وہ جھجک محسوس کرتا ہے۔ سماجی ماحول سے متاثر ہو کر اب وہ سوچتا ہے کہ پڑھنے والے اور دیکھنے والے اُسے کیا کہیں گے؟ یہ آگے بڑھنے کی علامت تھی۔ سماج اور ساہتیہ دونوں آگے بڑھے اور ترقی پسندانہ رُجحان کے باعث ادیبوں کے سُر بھی بدلے۔ یہ قدرتی بات تھی۔ یہ تبدیلی صرف ہندی ادب تک ہی محدود نہ تھی ہندوستان کی دوسری صوبائی زبانوں کے ادب پر بھی ان نئے رجحانات کا اثر پڑا۔

میرے خیال میں اگر ترقی پسند ادیب کو سماج کا ٹھیکہ دار کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ترقی پسند ادیب سماج کے سکھ دُکھ کو اپنا سکھ دُکھ سمجھتا ہے۔ آخر سماج بھی تو فرد سے ہی بنتا ہے۔ اب تو سماج اور فرد میں کوئی خاص فرق نہیں رہ گیا۔ یہ حقیقت ترقی پسند ادیب کے دل و دماغ میں پوری طرح گھر کر چکی ہے۔ سماجی اور سیاسی واقعات سے وہ فوراً اثر قبول کرلیتا ہے۔ لیکن اس رجحان کی وجہ سے ایک بہت بڑا نقص اُس میں آچکا ہے جو کھٹکتا ہے۔ ترقی پسند تصنیفوں میں کوتاہی کو دیکھئے۔ نئے تجربے ہیں نئے نئے الفاظ ہیں۔ بحریں بھی نئی ہیں۔ خیال و جذبات بھی نئے ہیں۔ لیکن اُس میں اپیل بہت کم ہے۔ اثر کا فقدان ہے۔ معدودے چند تصنیفوں کو چھوڑ کر دوسری چیزوں کو بھی نہ ہٹنے دیجئے۔ رسالوں میں ہر مہینے چھپنے والی نظموں کو ہی کسوٹی پر کس کر دیکھئے آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ان کی حیثیت محض منظوم نثر کی ہے۔ بہت کم منظوم چیزیں ایسی ملیں گی جن میں کہیں شعریت نظر آئے۔ موجودہ شاعروں کی یہ کمزوری اس قابل نہیں کہ اُس سے آنکھیں بند کرلی جائیں اس پر گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے۔

نئے رجحانات کی چھاپ ادب پر ابھی پوری طرح نہیں لگ سکی ہے۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ محض نظریات کا عکس اُس پر پڑا ہے۔ نثر میں جذبات کی جگہ نفسیات نے لے لی۔ نفسیات کے باعث ادب میں عقل اور استدلال کا بول بالا ہوگیا اور دل پر کئی طرح کی بندشیں لگ گئیں۔

اور ادھر ناول زندگی کے اصول اور زاویۂ نگاہ کے اظہار کا ذریعہ بن کے رہ گیا ہے۔ پنڈت الاچندر جوشی نے اپنے مشہور و معروف ناول "پریت اور چھایا" کا دیباچہ پورے بتیس صفحوں میں لکھا ہے۔ اتنا طویل دیباچہ لکھنے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ "پریت اور چھایا" کے پلاٹ میں الاچندر جی کی عقل خود اتنی اُلجھ گئی کہ ناول کی جذباتی زمین سے وہ خود بہت اُوپر اُٹھ گئے اور اُنھیں خود اس بات کا دھیان نہ رہا کہ وہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ جوشی جی اتنا طویل دیباچہ لکھنے پر بھی اپنے نظریے کی وضاحت نہ کرسکے۔

اسی سلسلے میں مضمون نگاری کے طرز میں بھی کافی تبدیلی آچکی ہے۔ سیاسیات اور فلسفہ سے متعلق Essays کا دھارا میلوں آگے نکل گیا ہے۔ موجودہ اصحابِ فکر میں ڈاکٹر ہزاری پرساد دویدی، شانتی پریہ دویدی، نند دُلارے واجپئی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ سورگیہ آچاریہ رام چندر شکل ایسا مضمون نگار ابھی تک ہندی ادب کو نہیں مل سکا ہے۔

جنگ کے بعد کے زمانے کا ہندی ادب

ہندی ادب میں نئے رجحانات کو نبٹنے اور

دوسری جنگِ عظیم کے بعد ایک طرح کا عصری شعور اور حرکت آگئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ادب کے مختلف شعبوں میں ایک انقلاب انگیز تبدیلی آئی۔ دوسری جنگِ عظیم کے ختم ہوتے ہی ہمارا ملک جہاں سیاسی طور پر آزاد ہُوا وہاں قحط، بیماریاں، فرقہ پرستی، مارکاٹ اور تقسیمِ ہند جیسے خوفناک حادثات نے ہمیں آگھیرا۔ سکھ کم ملا اور دُکھ کے تُند و تیز طوفان نے ہماری عمارت کی بنیاد تک ہلا ڈالی۔ خوشی اور غم۔ انبساط و الم کے اس جھٹپٹے میں ادیب نہ تو کھل کر ہنس ہی سکا اور نہ رونے ہی میں کامیاب ہُوا۔ آنسوؤں کے ساتھ ساتھ تعمیری جذبات ادب کی رُوح میں بس گئے۔ ادب کسی ایک دھارے میں نہ بہہ کر شترِ بے مہار کی طرح آگے بڑھنے لگا۔

بنگال کی زرخیز زمین پر جب قحط کا سایہ پڑا تو کوئی چپ نہ رہ سکا۔ اُس نے مہذب دُنیا کو للکار کر چیلنج کیا

بڑی شمشیر دُہن سی
چھپی کیوں میان میں سا تھی (انچل)

آرٹ اور ادب نے بھی رُخ بدلا۔

کلا آج ہے سویم بنگ کے مکھ میں رو ٹی
کلا آج ہے سویم بنگ کے حسپ نون روٹی (راکیب بھارتیہ آتما)

اسی کے ساتھ سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا۔ میتھلی شرن گپت۔ بچن۔ مہادیوی ورما نے اپنے سُر ملائے۔ "بنگ درشن"۔ "بنگال کا اکال" وغیرہ پستکوں میں ان کے جذبات ملتے ہیں۔

دُوسری جنگِ عظیم کا سایہ ہندوستان کے مشرقی کنارے پر پھیل رہا تھا دیش نے دیکھا کہ ملک و قوم کے جاں باز سپوت سبھاش چندر بوس پردیس میں جا کر اپنے وطن کو قیدِ غلامی سے نجات دلانے کے لئے نوجوں کی تنظیم کر رہے ہیں۔ "آزاد ہند فوج" کا نام دیش واسیوں کے لئے ایک سندیش دینے لگا۔ لوگوں نے دل سے اس تنظیم کا خیر مقدم کیا۔ اُس کے اصول کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے والوں کا نعرہ تھا:

دیپک سے دیپک جلتا ہے
جوت امر ماں کے مندر کی
تم دیپک کی جوت بڑھا دو
بتی کاٹو میرے سر کی (ہری کرشن پریمی)

ادب کو زندگی کی نئی راہ ملی۔ نئی روشنی کے سہارے وہ بھی آگے بڑھا۔ یہ بات بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ کانگرس کی "بھارت چھوڑ دو" تحریک اور ۱۹۴۲ء کے انقلاب نے بھی ہندی ادب کو اچھوتا نہ رہنے دیا۔

ہندی کا ادبِ جدید

ادبِ جدید سے ہمارا مقصد اُس ادب سے ہے جو ابھی حالی ہی میں شائع ہوا ہے۔

پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد سے دو باتیں خاص طور پر ہندی ادب میں ملتی ہیں۔ ادبی دنیا میں جمود اور دھندلا پن۔ ہندی کا میدان جہاں وسیع تر ہوا ہے اس کے ساتھ اس نے کچھ ترقی بھی کی ہے۔ بھوکا پیاسا آرٹسٹ مایوس کن زندگی میں آخر کتنی دیر تک اطمینان کی سانس لے کر ادب کی خدمت کر سکتا ہے پھر بھی زندگی کا ادیب اپنے فرائض کو کسی نہ کسی طرح نبھاتا جا رہا ہے۔ وہ سوچتا ہے

یگ کی گنگا

پاشانوں پر دوڑے گی ہی

لمبی۔ اُونچی

پتھر کو روکے

چٹانوں کو توڑے گی ہی

یگ کی گنگا

سب پرا چین۔ ڈبوئے گی ہی

نئی بستیاں

شانتی نکیتن

نو سنسار بسائے گی ہی (دکیدار ناتھ اگروال)

وہ ادب میں حیات و نور برسنے لگا:۔

سواگت نئے سویرے کا سواگت

سواگت نئے گگن کا

. . . .

لوک بھاونا کے وکاس کی

منگل ولا آئی

مانو کا وشواس اُبھر کر

بنا اُشا انہ ونائی

بالاؤں کی کرنیں لائیں

ابھی اُودے جن جن کا

سواگت نئے گگن کا (شمبھو ناتھ سنگھ)

ہندی کے انقلابی شاعر شری سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا نے بھی "ارچنا" سے ہندی کے ترقی پسند رجحانات کو ہدیۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ اُمید ہے کہ اس سے متاثر ہو کر نئی پود کے ادیب نئے اُفق اور نئی راہیں تلاش کر لیں گے۔

کویتا

کویتا کے میدان میں شری واتسیاین نے "تار سپتک" اور "دوسرا سپتک" کے نام سے سات سات کویوں کی کویتاؤں کے مجموعے نکالے ہیں رامدھاری سنگھ دِنکر کا "کورکشیتر"۔ برہم دیو شاستری کی "آنسو بھری دھرتی"۔ سمترا نندن پنت کی "سورن دھونی" اور "سورن کرن"۔ نرالا کی "نئے پتے" اور "بیلا" بچن کی "ملن یامنی"۔ بال کرشن شرما نوین کی "اپلک"۔ ستیش کی "سویلا"۔ واتسیاین کی "ہری گھاس پر چھن بھر" کافی اچھی کویتا پستکیں ہیں۔

ناول

بہت سے نئے اور پرانے لیکھکوں کے ناول شائع ہوئے ہیں۔ ورنداون لال ورما کا ناول "جھانسی کی رانی" بہت ہی مقبول ہوا ہے "مرگ نینی" سے بھی اُن کو کافی شہرت ملی ہے۔ آچاریہ چتر سین شاستری کے "ویشالی کی نگر وَدھو" کا بھی ادبی حلقوں میں کافی چرچا ہوا ہے۔ نئے لکھنے والوں میں وشنو پربھاکر، ڈاکٹر دیوراج اور رانگے راگھو کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ وشنو پربھاکر کا "ڈھلتی رات" بہت اچھا ناول ہے جو اپنے وقتی خیالات کے پس منظر میں ترقی پسندانہ طوفان لئے ہوئے ہے۔ ڈاکٹر دیوراج کا "پتھ کی کھوج"۔ کرشن چندر کا "طوفان کی کلیاں"۔ واتسیاین کا "ندی کے دیپ"۔ وجے کمار پجاری کا "آتم دان"، منمتھ ناتھ گپت کا "اندھیر نگری" اور "رکھشک بھکشک" اور گورودت کا "بھاؤکتا کا مولیہ" اچھے ناول ہیں۔

افسانہ

افسانے اور کہانیاں زیادہ تر رسالوں میں چھپتے رہتے ہیں۔ مایا چترا۔ سادھنا۔ سرگم۔ رانی وغیرہ کئی رسالے ہیں جن میں کہانیاں ہی چھپتی ہیں۔ واتسیاین کا "جے دول"۔ اُپیندر ناتھ اشک کا "جدائی کی شام کا گیت"۔ شمشیر بہادر سنگھ کا "پلاٹ کا مورچہ" افسانوں کے اچھے مجموعے ہیں۔ اِدھر "سرگم" نے "نیا لیکھک انک" اور "آج" نے "کہانی انک" شائع کر کے کہانی ادب کی کافی خدمت کی ہے۔

نئے لکھنے والوں میں رانگے راگھو، ستندر شرت، کمل جوشی، کماری نرملا ماتھر اور شکنتلا مشرا اچھی ترقی کر رہی ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اِن دنوں بحیثیت مجموعی افسانوی ادب پر جمود کی کیفیت طاری ہے اور مستقبل قریب میں اُس کی ترقی میں شبہ کی کافی گنجائش دکھائی دے رہی ہے۔

ڈرامہ

اس میدان میں کوئی خاص قابلِ تعریف ترقی نہیں ہوئی ہے ہری کرشن پریمی کا "شپتھ" ناٹک اچھا ہے۔ ورنداون لال ورما

نے بھی ناٹک لکھنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ ہیں ناول نویس ہی۔ اپیندرناتھ اشک رام کمار ورما نے کچھ ایکانکی (ایک ایکٹ کے ڈرامے) اچھے لکھے ہیں۔ رام چندر تواری اور وشنو پربھاکر نے گنتی میں بہت ایکانکی لکھے ہیں۔ جیرنجیت اور اودے شنکر بھٹ نے ریڈیو رُوپک اور سنگیت رُوپک بہت اچھے لکھے ہیں۔ سمترانندن پنت۔ گرجا کمار ماتھر۔ جانکی ولبھ شاستری۔ دیوراج دنیش، بھارت بھوشن اگروال کے ریڈیو رُوپک بھی کافی کامیاب ہیں۔

رسالے

ہندی کو "راشٹر بھاشا" کا آسن مل جانے سے ہندی کے رسالوں اور پتروں پترکاؤں کی تعداد کافی بڑھ گئی ہے ہر روز کوئی نہ کوئی رسالہ عالمِ وجود میں آ ہی جاتا ہے۔ لیکن پانچ سات پرچے نکال کر بہت سے رسالے تو ہمیشہ کی نیند سو جاتے ہیں۔ نیا سماج، کلپنا، نئی دھارا، اجنتا، آجکل نیا جیون۔ سرتا۔ راشٹر بھارتی۔ ہنس نونیت۔ ساہتیہ سندیش۔ وشو جیوتی۔ سپتاہک اور آلوچنا نہایت کامیاب رسالے ہیں۔

مقالہ نویسی، یاترا، تنقید و تبصرہ، یادِ رفتگاں، ڈکشنریاں اور سوانح عمری وغیرہ سے متعلق ادب کی تخلیق بھی اچھے پیمانے پر ہو رہی ہے۔

ہندی ادب ابھی نامکمل ہے۔ اس میں انگریزی اور رُوسی ادب کی سی ہمہ گیری اور وسعت نہیں آپائی ہے لیکن ہندی کے ادیب پورے انہماک کے ساتھ اس طرف لگے ہوئے ہیں اُمید کرنی چاہیئے کہ راشٹر بھاشا یا قومی زبان کے مخلص و مداح اس کی آبیاری میں پوری سعی فرمائیں گے تاکہ گیسوئے ہندی منت پذیرِ شانہ نہ رہ کر سارے ہندی جسم کی رعنائی و حُسن میں چار چاند لگا سکے۔

جلوۂ برشگال

فضا ابنِ فیضی

شاخِ گلِ رنگیں میں تابِ یدِ بیضا دیکھ
شبنم کی طراوت سے سبزے کا نکھرنا دیکھ
نکہت کا یہ فوّارہ پھولوں سے اُبلتا دیکھ
مینائے بلوریں میں پگھلا ہوا سونا دیکھ
برسات پھر آئی ہے، ساقیٔ دل آرا دیکھ

مینارۂ نشہ سے دیتے ہیں اذاں میکش
کہہ اُٹھتے ہیں مستی میں یا پیرِ مغاں، میکش
معمورۂ رحمت ہے رہتے ہیں جہاں میکش
بیتِ شرفِ جام و پیمانہ و مینا دیکھ
برسات پھر آئی ہے، ساقیٔ دل آرا دیکھ

شبنم پہ مچلتی ہے مہتاب کی ضو، ساقی
یہ موجِ شعاعِ گُل ہے برق کی رو، ساقی
جاں بخش و نوائے خوش از جامِ شنو، ساقی
آ! فرش پہ سبزے کے ڈھلتی ہوئی صہبا دیکھ
برسات پھر آئی ہے، ساقیٔ دل آرا دیکھ

لبیک صراحی کی، تکبیرِ سبو کی لے
یہ ساغرِ رنگیں میں زمزم سی مبارک مے
یہ حجِ بہاراں کا کیا خوب مہینا ہے
یہ مردہ و عرفاتِ خشتِ خُمِ صہبا دیکھ
برسات پھر آئی ہے ساقیٔ دل آرا دیکھ

بنگال کا باغی شاعر۔ قاضی نذر الاسلام

۱۹۳۰ء کے جون کی ایک اُداس شام تھی۔ ملتان سنٹرل جیل کے تنہائی وارڈ میں نمبر ۲۱ کوٹھڑی کے بنچوں سے لگا سنسان نظروں سے میں اُفق کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سایے گھنے ہو چکے تھے۔ کہیں دور جیل کی دیوار کے باہر سے ایک اونچی کھجور کی چوٹی نظر آ رہی تھی اور اُس میں اُلجھا ہُوا ستر میلا چاند کچھ اس طرح کانپ رہا تھا جیسے کوئی نئی دُلھن شبِ اوّل اپنے محبوب کی خواب گاہ میں جانے سے پیشتر سنگار کر کے آخری مرتبہ شیشے میں اپنا مُنہ دیکھ رہی ہو۔ فضائیں خاموشیوں سے بوجھل ہو رہی تھیں اُس شاعر کے تخیّل کی طرح جس کا ایک مصرع موزوں ہو چکا ہو لیکن دوسرا مصرع ستر پرابابیل کی طرح گرفت میں نہ آ کر اپنی پرواز سے ہواؤں میں کشیدہ کاری کر رہا ہو۔ میرے وارڈ کے سامنے چھوٹی دیوار کے باہر ہسپتال کا وارڈ تھا، وہ وارڈ جس میں تپِ دق کے مریض قیدی رکھے جاتے تھے۔ ہر طرف خاموشی تھی گہری اور بوجھل جس کو پہرے دار کی آواز بیچ بیچ میں توڑ کر اور بھی گہری اور بوجھل کر ڈالتی تھی۔ دفعتاً ہسپتال کے وارڈ سے ایک نوجوان آواز میں کوئی گانے لگا۔ آواز آہستہ آہستہ اُبھرنے لگی۔ گیت کے الفاظ کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگے۔ یہ کوئی بنگالی قیدی تھا جو بنگالی زبان میں ایک گیت گا رہا تھا۔ شروع شروع میں میں نے اس گیت کی طرف کچھ دھیان نہ دیا۔ اپنے ہی خیالوں میں کھویا کسی دور افتادہ کے تصور میں ڈوبا ایک قالیں سا بُن رہا تھا۔ شیرازی نغموں کی طرح رنگین، لطیف اور خمار آلود اور اُن آنکھوں کی طرح غنا آفریں جن کی یاد مجھے اس وقت گھیرے ہوئے تھی۔ بنگالی گیت کے الفاظ میرے تحت الشعور میں ڈوبتے رہے اور مجھے محسوس ہُوا گویا موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ کوئی دُور سے مجھے پکار رہا ہے اور میں ہوں کہ گہری نیند سو رہا ہوں اور ایک نہایت شیریں خواب دیکھ رہا ہوں۔ پکارنے کی یہ آوازیں میرے خواب میں زندہ بانی کر کے چھوٹے چھوٹے پرندوں کی ہزاروں شبیہیں بُن رہی ہیں۔ یہ پرندے بھی چہچہانے لگے اور جیسے میری آنکھ کھُل گئی ہو۔ بنگالی گیت کی آواز صحیح تھی جا رہی تھی اور بیچ بیچ میں گیت کے الفاظ صاف صاف سمجھے جا سکتے تھے۔ وہ گا رہا تھا:

"میرا پیمانۂ زندگی ہمیشہ چھلکتا رہتا ہے
میں قربان گاہ کی آگ ہوں
میں خود ہی آتش ہوں اور خود ہی آتش پرست
میں ہی تخلیق ہوں اور میں ہی تخریب
میں شہر آباد ہوں اور شہرِ خموشاں

. . . .

میں اپنی خودی کے علاوہ کسی کے آگے سر نہیں جھکاتا
میں کوندے کی لپک اور بجلی کی جھپک ہوں

. . . .

میں آتش کا پرکالہ ہوں، اس دُنیا کو جلا کر خاک کر دوں گا
میں وہ قہقہہ ہوں جو روح سے نکلتا ہے
میں اس بوسیدہ سماج کا دشمن اور اس کے لئے خطرۂ عظیم ہوں
میں آفتاب کی تپش ہوں

. . . .

میں بہتے ہوئے پانی کی آواز ہوں، چنچل موجوں کی شیریں لَے گنی
کسی دوشیزہ کی زلفِ پریشاں کا جوڑا ہوں، ترچھی نگاہوں کا تیر ہوں
کسی حسینہ کا اوّلین بوسہ ہوں

. . . .

کسی غم رسیدہ کا دلِ بے قرار ہوں! کسی بیوہ کے دل کی آہ ہوں
کسی ٹوٹے ہوئے دل کی پکار ہوں

میں اُس مسافر کا غم ہوں جو ہمیشہ کے لئے مارا مارا پھر رہا ہو

. . . .

محبوب نے جس دل کو ٹھکرا دیا ہو اُس کی دھڑکن ہوں
کسی مغرور اور غضبناک دل کی بے کسی ہوں۔

. . . .

پہلے بوسے کے بعد دوشیزہ کے جسم میں پیدا ہونے والی تھرتھری ہوں

. . . .

کسی چنچل چیت چور کا عشق ہوں اور اُس کی چوڑی کی میٹھی جھنکار
میرا بچپن اور جوانی دائمی ہے
جو دیہاتی لڑکی جوانی کے بوجھ سے دبی جاتی ہے میں اُس کے دامن کا
پھڑپھڑ ہوں

. . . .

میں ترقی اور پستی کی انتہا ہوں
انسان کی ظفرمندی کا میں نشان ہوں

. . . .

خوں خواری سے میرا جی بھر گیا ہے
میں اُس دن مطمئن ہوں گا جب مظلوموں کی فریاد فضائے آسمانی میں نہ
گونجے گی۔
جب میدانِ جنگ میں تلوار اور خنجر کے خوفناک ترانے نہ سنائی دیں گے۔

. . . .

میں وہ باغی ہوں جو قسمت کے طلسم کو توڑ سکتا ہے
میں ہوں ازلی اور غیرفانی باغی
دنیا کو ٹھکرا کر ایک بار پھر میں تن تنہا سر اٹھا کر اُٹھ کھڑا ہوا ہوں۔"

گیت ختم ہو گیا لیکن رات ختم نہ ہوئی اور میں جہاں کا تہاں جنگلے سے لگا اپنی کوٹھڑی میں بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ عجیب گیت تھا۔ کبھی اس سے پہلے تو اپنے جذبات کی اتنی سچی، سادی اور صحیح تصویر میں نے نہیں دیکھی تھی۔ یہ تو میرے ہی جذبات تھے۔ میرے ہی دل کی آواز تھی۔ کس نے انہیں چرایا۔ بغاوت کی آگ میرے اندر بھی بھڑکی ہوئی تھی۔ میں بھی باغی تھا اور اسی جرم میں جیل کی یاداشت بھگت رہا تھا۔ یہ عمر کا وہ دور تھا جب جذبات طوفانی لہروں کے جھاگ کی طرح دل و دماغ پر اس طرح چھا جاتے ہیں کہ سوچنے کی طاقت بہت کچھ دب جاتی ہے اور انسان جھاگ کے بلبلوں پر قوسِ قزح کے رنگوں میں محو ہو جاتا ہے۔ ان رنگوں کو ٹوٹتے ہوئے بلبلوں کے ترمزی رنگوں کو، کس نے اس ولطافت سے اس یاس کی دنیا میں سمو دیا؟ کس نے میرے اپنے رنگوں کے احساس کو خود میرے ہی اندر اتنی شدت سے جگا دیا؟ میں یہی سوچتا رہا اور سوچتے سوچتے صبح ہو گئی۔

اگلے دن اُس بنگالی قیدی سے ملاقات کا ایک طریقہ نکالا گیا اور معلوم ہوا کہ وہ قاضی نذرالاسلام کی نظم "دردوہی" (رباغی) گا رہا تھا۔ اس طرح پہلی بار قاضی نذرالاسلام سے میرا تعارف ہوا۔

نذرالاسلام آج سے تقریباً پچپن سال پہلے بردوان ضلع کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک معمولی کسان گھرانے میں پیدا ہوا۔ قدرت نے اُسے پالا اور افلاس کے بے رحم ہاتھوں نے اُس کی تربیت کی۔ اسکول اور کالج کی رنگ آمیزیاں اُس کے قرطاسِ زندگی کو میسر نہ آئیں۔ اٹھارہ برس کی عمر میں وہ بھرتی ہو کر جنگِ اوّل کے عراقی میدانوں میں چلا گیا اور سچ پوچھئے تو یہی میدانِ جنگ اُس کے لئے سب سے بڑی تعلیم گاہ ثابت ہوا۔

جب وہ حوالدار بن کر ہندوستان لوٹا تو ملک ایک تاریخی دور میں سے گزر رہا تھا۔ یہاں آزادی کی جدوجہد میں ایک نیا حربہ استعمال کیا جا رہا تھا۔ ۲۲ء کا زمانہ تھا۔ عدم تعاون کی تحریک نے ایک جادو بن کر عوام کے دلوں میں ایک روح پھونک دی تھی۔ "موسم دیوانہ گر" تھا کہ ایک بار پھر خزاں زدہ گلشن کے پتے پتے اور بوٹے بوٹے پر چھا جانے لگا تھا۔ ہر طرف دار و گیر کی صدائیں بلند تھیں اور ان بلند صداؤں کو چیرتے ہوئے سربکف عشاق کے نعرے دیوانہ وار فضاؤں میں گونج رہے تھے۔ نذرالاسلام نے دیکھا کہ جو آگ دل میں چھپا کر وہ لایا ہے اُس کی لپٹیں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں اور سارا ملک قربان گاہ بنا ہوا ہے۔

اس آتش نفس مغنی نے بھی اپنا نغمہ چھیڑا۔ "اگنی بینا" (ساز آتش)، "زہریلی بانسری" وغیرہ مجموعے اُسی زمانے کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان مجموعوں کے نکلتے ہی بنگال کے نوجوانوں نے محسوس کیا کہ اُن کی زبان میں کوئی اُن کے ہی دل کی کچھ باتیں کہہ رہا ہے۔ وہ پنجوں کے بل کھڑے ہمہ تن گوش ہو کر انتظار کرنے لگے کہ وہ اور کیا کہتا ہے۔ اُس نے "دردوہی" (رباغی ایک لمبی نظم) کا نغمہ الاپا۔ پھر کیا تھا۔ تمام بنگال اس مسرت سے اُس مست ناگ کی طرح مست

ہو کر اس نغمے پر ناچنے لگا۔ گلیوں، کوچوں، خفیہ جلسوں اور جلوسوں میں یہ نظم گونجنے لگی۔ جیل کی دیواروں اور کال کوٹھڑی کی تنہائیوں سے اس کے نغمے ٹکرانے لگے۔ ہتھکڑی اور بیڑیوں کی جھنکار میں اس کے سُر بجنے لگے اور پھانسی کے تختوں پر آخری ہچکیوں سے مل کر اس کی الاپ اُڑنے لگی۔

ایک نقّاد نے اس نظم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"جب میں نے نذرالاسلام کی نظم "باغی" پڑھی تو مجھے محسوس ہُوا کہ گزشتہ دس سال سے ہم بنگلہ ادب میں جس انقلاب کے متوقع تھے آج اُس کا آغاز ہو گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ادب میں زندگی اور جوش کا ایک دریا اُمڈ پڑا ہے مسلمانوں نے اب تک اپنی مادری زبان کی خدمت اتنی نہیں کی تھی جتنی ان پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن اب ثابت ہُوا کہ بنگال کی سوئی ہوئی روح کو بیدار کرنے کا سہرا شاید ان ہی کے سر بندھنے والا تھا۔"

(پروفیسر بے کمار سرکار Futurism of Asia)

ہمارے ادب میں "باغی" بلا مبالغہ ایک انوکھی قسم کی چیز ہے لیکن۔ وکٹر ہیوگو ترگنیف۔ سوئن برن اور بائرن کے سے باکمال شعراء نے اس موضوع پر نہایت حسین نظمیں لکھی ہیں۔ لیکن "باغی" کی رفعت اور اُڑان ان سب سے الگ اور اُونچی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس نظم میں خیالات کی پختگی اور صفائی نہیں ہے اور نہ اُس کا نظریۂ زندگی اس میں واضح ہوتا ہے جیسا کہ بعد کی نظموں میں ہے۔ مگر بغاوت کا ایسا حسین، مکمل اور رنگا رنگ مرقع شاید ہی کسی اور جگہ دیکھنا نصیب ہو

نذرالاسلام کی یہ نظم اور اس قسم کی دوسری "باغیانہ" نظمیں پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ان انقلابی مضامین کو اس شاعر نے ادب پارے کیسے بنا دیا؟ تخیل کی یہ رنگینی، تصوّر کی یہ پرواز اور جذبات کا یہ بہاؤ طوفانی ہوتے ہوئے بھی کس طرح حُسن کے سانچے میں ڈھل سکا ہے؟ اس کا باغی یونان کا رستم ہرکلس نہیں ہے، جس کی ٹانگیں آہنی ستونوں سے زیادہ موٹی تھیں بلکہ ہومر کا شکیل اور جمیل ہیرو ایکیلس ہے جس کی تلواریں اُتنی ہی کاٹ تھی جتنی کہ اُس کے مدھ بھرے نینوں میں

کیٹس کی شاعری کو اگر بُت کی شکل میں تصوّر کیا جائے تو وہ ہاتھی دانت کی ایک نہایت حسین مورتی ہوگی۔ جس کو کردکی نہایت لطیف، جچی تلی اور سنبھلی ہوئی جنبشوں سے تراشا گیا ہو۔ جس کے خطوط نہایت پاکیزہ اور جس کے خم لچکیلے ہیں ہوئے پرند کی طرح تُلے ہوئے اور سدھے ہوئے ستار کی طرح نغمہ بدوش ہوں گے نذرالاسلام کی شاعری کا بُت بھی کچھ ایسا ہی ہوگا ماسوا اس کے کہ وہ ہاتھی دانت کا نہ ہو کر جمے ہوئے شعلہ کا ہوگا۔

نذرالاسلام کی زندگی کا یہ دَور جو "باغی" کی اشاعت کے ساتھ شروع ہوتا ہے اُس کے بلوغ کا دَور ہے۔ یہ جوش اور اُمنگ کا زمانہ تھا جس نے بنگال کے نوجوانوں کو بم بارُدی اور دار و رسن کی طرف کھینچا تھا۔ اس سے متاثر ہو کر بنگال کا یہ شاعر "ادبِ جدید" کے پیغمبر کی صورت میں سامنے آیا۔ اُس وقت کا "ادبی بنگال" ٹیگور کی ہمہ گیر شخصیت کے سایے میں پل رہا تھا۔ وہاں کی نظم اور نثر پر ٹیگور کا سکّہ بیٹھا ہوا تھا ہر کہ و مہ ٹیگور کے آفتابِ کمال سے چمک حاصل کر رہا تھا۔ جو اگرچہ تالستائی کی طرح دُکھیوں کے دُکھ سے دُکھی اور ظالموں کے غضب سے غضب ناک تو ضرور تھا لیکن جس کی رُوح سے انتقام کی جگہ محبّت اور شانتی کے لافانی اور ابدی چشمے پھوٹ رہے تھے جس کے نغموں کے پیچھے اودے اودے بادلوں کے کھیل گھنیرے پیڑوں کی چھاؤں اور جھلکتی ہوئی ندیوں کے درمیان مُسکرا رہے تھے۔

نذرالاسلام نے اس سے بغاوت کی اور ہمارے اقدار کو بدلنے کی کوشش کی۔ وہ جوانی کے گیت گاتا ہے کہ زندگی کا دھارا پیچھے کی طرف نہیں بلکہ آگے کی طرف بڑھے۔ وہ نئی تہذیب کے راگ الاپتا ہے جو پُرانے کھنڈروں کو توڑ کر اپنا گھر بناتی ہے۔ ایسی تہذیب نہیں جو آقا اور غلام کے پُرانے رشتے کو مالک اور مزدور کے نئے ناتے میں گوندھتی ہے بلکہ وہ نئی تہذیب جو قوم و مذہب، رنگ و نسل کی سرحدوں کو توڑ کر دنیا کو مساوات اور آزادی کا درس دیتی ہے۔ اس کا نظریہ زندگی کو دائم و قائم گردانتا ہے اور انسان کو اس کا کارساز سمجھتا ہے وہ شباب کا ہم دوش اور انقلاب کا نقیب ہے۔ وہ تغیّر کا حامی اور جمود کا دشمن ہے۔ وہ قدامت کا حریف اور جدّت کا علم بردار ہے۔ وہ قدرت اور سماج کے مظالم کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے۔ وہ عورت کو تقدیس کے منبر پر نہیں بٹھاتا بلکہ جلیس بناتا ہے۔ وہ مجاہد ہے بقول سیّد اختر حسین۔ زندگی کی تلخیوں سے منہ چُرانا بہت آسان ہے اور صوفیوں کی قبا بہت سستے داموں بازار میں مل جاتی ہے لیکن مجاہد کا خونی کفن ہر شخص کے نصیب میں نہیں۔

اس کے ترانے سُن کر دیر تک یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی ہے اور بادلوں میں ایک بجلی تڑپ رہی ہے۔

اس کی نظموں میں تخریبی تڑپ کی ایک ایسی عظمت ہے کہ اس کے سامنے تخلیق بے مایہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ روسی ناول نگار ترگنیف کا وہ لافانی کردار ر[illegible]

Fathers and Children جوکہ اس نے اپنے شاہکار میں پیش کیا ہے۔ گویا ان نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس کی موت پر ایک نقاد کہتا ہے:

"وہ بربادی جو برباد کرتے کرتے خود برباد ہوگئی" نذرالاسلام کا ہیرو بھی تخریب اور تباہی کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا۔ "ستارۂ تخریب" فضا میں ہول اور ہراس کے سوا کچھ باقی نہیں چھوڑتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز مرگئی، مٹ گئی، مرجھا گئی.....

بدیسی حکومت نے بہت چاہا کہ شاعر کی آواز کو بند کردیا جائے۔ چنانچہ اُس کے متعدد مجموعے ضبط کیے گئے اور شاعر کو دو دو بار جیل میں ٹھونسا گیا لیکن نغمے وہاں بھی پھوٹتے تھے اور زبان زد ہوکر بنگال کے گوشے گوشے میں پھیل گئے۔ جیل میں ایک بار اُس نے بھوک ہڑتال کی جس کی خبر پاکر شاعرِ اعظم ٹیگور نے بذریعہ تار اس سے درخواست کی:

"بھوک ہڑتال ترک کیجئے، ہمارے ادب کا آپ سے تقاضا ہے۔" تار بدیں الفاظ واپس کردیا گیا کہ مکتوب الیہ تلاش نہ کیا جا سکا۔

نذرالاسلام کی عظمت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ وہ ابھی جیل ہی میں تھا کہ ٹیگور نے اپنے کلام کے ایک نئے مجموعہ کو جس کا نام "بسنت" ہے اس کے نام سے معنون کیا۔

نذرالاسلام نے باغی کے بعد بھی بہت سی انقلابی نظمیں لکھیں لیکن ان میں سے بیشتر نظمیں ملکی ہیں اُس پایہ کی نہیں جیسی کہ باغی ہے۔ ان نظموں میں غیظ و غضب کا جھاگ، ہیبت اور شکوہ تو ہے لیکن شاعری نہیں۔ شور ہے اور وہ بھی بے حد، طوفان ہے، بادل ہیں، گرج ہے لیکن چمک نہیں اور نہ پانی کی بوندیں کہ اندھیرے میں راستہ مل سکے اور پیاسے کی پیاس بجھ جائے۔

اُس نے خود بھی شاید اسے محسوس کیا کیونکہ اب وہ انقلابی نظمیں نہیں بلکہ ہلکے پھلکے رومانی گیت لکھنے لگا۔ اُسے موسیقی میں اتنا ہی درک ہے جتنا کہ شاعری میں۔ چنانچہ اپنے گیتوں کو وہ خود ہی سُر میں باندھتا اور دوستوں کے مجمع میں گھنٹوں ہی گایا کرتا۔ اُس نے بنگلہ شاعری میں غزل کی صنف ایجاد کی جو بہت مقبول ہوئی۔ بنگلہ زبان میں اردو فارسی کے الفاظ کی چاشنی ملا کر اُس نے بنگال کے رومان پرست طبقے کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ یہ غزلیں گھر گھر گائی جانے لگیں اور ہر نوجوان لڑکا اور لڑکی زیر لب ان کو گنگناتا نظر آنے لگا۔ ان غزلوں میں جوانی کی وارداتیں ہیں اور نوجوانوں کے لئے آزادی محبت کا مطالبہ۔ اس سے پیشتر بنگلہ ادب میں خصوصاً ٹیگور کے زیر اثر ادب میں، عورت کے گرد تقدیس کا ایک ہالہ بنا دیا گیا تھا۔ اُسے عظمت اور پرستش کی "بیدی" پر بٹھا دیا گیا تھا۔ نذرالاسلام نے عورت کو اُس کی اس غیر فطری جگہ سے نجات دلائی اور آدمیوں کی مجلس میں رونق افروز کیا۔ یہاں وہ محبت کرتی ہے، محبت پاتی ہے۔ یہاں اسے خلوت بھی حاصل ہے اور جلوت بھی۔ وہ روتی بھی ہے رُلاتی بھی۔ مجمع میں وہ آنکھ بچا کر مسکراتی ہے اور خلوت میں ظاہری حیا کو ترک کرکے اپنی عریانی کے نوشگفتہ پھولوں سے کسی کی روح کو عطر بیز بھی کرتی ہے۔ غرض اس کے وہاں وہ عورت ہے دیوی نہیں۔

اس نے ایک ہندو لڑکی سے شادی کی جس کی وجہ سے ہندوؤں کا ایک تنگ نظر طبقہ اس سے برگشتہ ہوگیا۔ مسلمان اس سے پہلے ہی نالاں تھے اور اسے کافر کہتے تھے۔ حکومت اسے دشمن سمجھتی ہی تھی اور کسی طرح بھی اس کی روادار نہ تھی۔ نذرالاسلام کو زندگی کے لالے پڑ گئے تھے اور وہ روٹیوں تک کا محتاج ہوگیا۔ اپنی ایک نظم میں وہ اس دور کا ذکر کرتا ہے:

"میں زمانۂ حال کا شاعر ہوں مستقبل کا پیغمبر نہیں
کوئی کہتا ہے کہ آنے والے زمانے میں تجھے کون یاد کرے گا
کوئی کہتا ہے شاعر کو قید و بند سے کیا واسطہ
کوئی کہتا ہے دوبارہ جیل جا وہیں خوب لکھ سکتا ہے
مولوی میرے چہرے پر اسلام کی علامت (داڑھی) نہ پاکر غصے سے اپنی داڑھی نوچنے لگتا ہے۔
ہندو کہتے ہیں اس نے ہندو لڑکی سے شادی کرلی اس لئے یقیناً وہ بت پرست ہے۔
گاندھی جی مجھ پر تشدد پسندی کا الزام لگاتے ہیں
عورتیں کہتی ہیں کہ یہ دشمنِ نسواں ہے اور مرد مجھے عورت پرست بتاتے ہیں
غرض کہ میری جان عذاب میں ہے۔
لوگو! مجھے اس کی پروا نہیں کہ مستقبل مجھے یاد کرے گا یا نہیں
تمنا صرف یہ ہے کہ جو لوگ خلقِ خدا کو بھوکوں تڑپا رہے ہیں، میری خونچکاں تحریریں ان کے لئے پیامِ موت ثابت ہو۔"

اُس وقت نذرالاسلام وہ آندھی بھی سہہ گیا۔ افلاس اُس کا دامنگیر تھا

لیکن گیت اُس کے ہونٹوں سے بہہ رہے تھے۔ یہ ہمارے ادب کی کم نصیبی ہے کہ ریڈیو والوں کے لئے اُسے وہ گیت لکھنے پڑے جو آج بھی بنگال کے بچے بچے کے وردِ زبان ہیں۔ اس ادبی کاوش میں لامحالہ شاعری سے زیادہ موسیقی کو دخل تھا اور یہ شاعر کا نہیں موسیقی کار کا کام تھا جو اب اس کی شاعری پر یکسر غالب ہے۔

اپنے تخلیقی دور کے آخری ایام میں اُس نے "بکھری کے گیتوں" کی ایک بھرمار کر دی تھی۔ گراموفون کمپنیوں کے لئے شاید اس سے زیادہ کسی اور نے گیت نہیں لکھے۔ محبت کے گیت، موسمی گیت، مراحی گیت، رادھا کرشن کے گیت، مکّے مدینے کے گیت، ناچ کے گیت، کھیل کود کے گیت، بچوں کے گیت، ہلکے گیت بھاری گیت، سبزی فروش، پان فروش، عصمت فروش اور دل فروش کے لئے گیت، گیت اور ہر قسم کے گیت اس نے لکھے اور اس تعداد میں لکھے کہ تعجب ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تعداد کے لحاظ سے نذرالاسلام نے جتنے گیت لکھے ہیں دُنیا کے کسی شاعر نے بھی اتنے نہیں لکھے۔ ٹیگور کے مطبوعہ گیتوں اور نظموں کی تعداد دو ہزار سے زیادہ ہے۔ نذرالاسلام کے تمام گیت ابھی تک اکٹھا نہیں ہوئے ہیں لیکن جو کچھ ہوئے ہیں اُن کی تعداد ٹیگور کے گیتوں سے کہیں زیادہ ہے۔

میں یہاں پھر دہرا دوں گا کہ نذرالاسلام کی شاعری میں ایک بے پناہ شور ہے اور ایک طوفانی ہیجان ہے۔ اس میں کپلنگ کے اشعار کی سی جھنکار ہے جس نے اسے حسنِ قبول بخشا تھا لیکن یہ چراگاہ میں مویشیوں کے گلے کی گھنٹیوں کی سی جھرتی آواز بن سکی محض گجر کا شور بن کر رہ گئی۔ اس نے سوتوں کو جگایا، دلوں کو بھی گرمایا۔ لیکن اس گرمی کا بیشتر حصہ مستعار معلوم ہوتا ہے۔ اس کی نظموں کا لمبا لمبا بیانیہ حصہ طبیعتوں پر گراں معلوم ہوتا ہے اس کو پڑھتے جائیے، معلوم ہوتا ہے کہ لفظوں کا ایک سیلاب ہے جو خود بخود اُمڈا چلا آتا ہے اور جس پر قابو پانے کی جگہ خود شاعر اُن کے قابو میں گرفتار بے دست و پا بہا چلا جا رہا ہے۔ لفظ جہاں چاہتے ہیں اُسے لے جاتے ہیں جس چٹان پر چاہتے ہیں اُس کو دے پٹکتے ہیں۔ اور جس جس وادی میں سے چاہتے ہیں گزر جاتے ہیں۔ شاعر ہے کہ بے بس ہے۔ نذرالاسلام کی وولیعت کچھ ایسی ہی ہے جیسی کہ بائرن کو حاصل ہوئی تھی۔ پُر شکوہ، لیکن ناقابلِ اعتبار۔ وہی خام اور بے پناہ شدت، وہی لامختتم اور غیر ارادی بہاؤ، فن کی طرف سے وہی ناقابلِ درگزر بے پروائی، اور سب سے زیادہ تخیل کا وہی جھینا پن اور فکر کا تکلیف دہ فقدان گوئٹے نے جو کچھ بائرن کے متعلق کہا تھا وہ لفظ بہ لفظ نذرالاسلام پر بھی صادق آتا ہے۔ اُس نے کہا تھا:

"جونہی وہ سوچنے کی کوشش کرتا ہے طفلِ نادان بن کر رہ جاتا ہے۔"

"باغی" نظم میں نذرالاسلام نے جو کہا ہے کہ:

"میرا بچپن اور میری جوانی دائمی ہے" وہ اس کے اپنے حال پر صادق آتی ہے۔ پچیس ۲۵ برس تک اُس نے جو کچھ لکھا ہے وہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایسے غیر معمولی ذہین اور صاحبِ کمال لڑکے کی کاوشِ طبع کا نتیجہ ہے جس کا بلوغ ایک مقام پر پہنچ کر رُک گیا ہے اور جو پوری طرح کبھی بالغ ہوا ہی نہیں۔ اُس کے کلام کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کون سی چیز پہلے لکھی گئی ہے اور کون سی بعد میں۔ جو کچھ اُس نے ۳۵ یا ۴۰ برس میں لکھا وہ فنی اعتبار سے اُس سے بالکل بھی مختلف نہیں جو کہ اُس نے ۲۰ یا ۲۵ برس کی عمر میں لکھا تھا۔

اگرچہ نذرالاسلام اپنی انقلابی نظموں کی وجہ سے مقبولِ عام ہوا ہے لیکن شہرتِ دوام اُسے اپنے گیتوں کی وجہ سے ہی حاصل ہوگی۔ اُس کے چند گیت گو اُن کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے، دُنیائے ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

نذرالاسلام کی خیرہ کن اور لاابالی زندگی پر سب سے پہلے ادبار کے بادل اُس وقت محیط ہوئے جب اُس کی محبوب بیوی فالج کا شکار ہو کر فرلیش ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا اور بے فکرا شاعر غموں کے ہجوم میں گرفتار دیدوں، حکیموں حتٰی کہ یوگیوں، فقیروں اور سنیاسیوں کے دروازوں کی خاک چھاننے لگا۔ ایک دن آیا کہ لوگوں نے اسے دیوانوں کی سی باتیں کرتے پایا۔ اور اُسے پاگل خانے پہنچا دیا گیا۔ آج بھی وہ مغربی بنگال یعنی ہندوستانی بنگال کے مضافات میں اپنی لاچار بیوی کے ساتھ دیوانگی کے دن نہایت افلاس اور تنگدستی کے عالم میں گزار رہا ہے۔ بنگال کے کچھ ادیب کبھی کبھی کچھ چندہ کر کے اُس کے مصارف کے لئے بھیج دیتے ہیں۔

نہال سیوہاروی

دارائے حیات سے فریاد

نہال صاحب کے انتقال کے بعد اُن کی یہ نظم شائع ہو رہی ہے ۔ سُن لیا گیا نہال صاحب کا شکوہ اور اُٹھا لئے گئے وہ اس زمین سے جس کا آسمان اربابِ فن پر دوزخ کا دروازہ کھولے رہتا ہے ۔

سچ ہے دارائے حیات شاعر کی فریاد پر بکمالِ دریا دلی اُسے موت تو بخش سکتا ہے لیکن اس کی زندگی کو زندگی عطا نہیں فرما سکتا ۔ بڑی دل نوازی، بڑی مہربانی ! جوش

یارب اس زندانِ گل میں میہماں کب تک رہوں
قیدیوں کی طرح زیرِ آسماں کب تک رہوں

نغمہ سے ہر چند گھٹ جاتی ہے تکلیفِ حیات
نغمہ خوانی کی بھی حد ہے نغمہ خواں کب تک رہوں

میکدے میں دہر کے ہر سمت ہے قحطِ شراب
میکدے کا جب یہ عالم ہو جواں کب تک رہوں

کارواں سالار کب اُٹھے گا گہری نیند سے
فکر مندِ انتشارِ کارواں کب تک رہوں

آنے والا ہے تو آ چکتا نہیں کیوں عہدِ گل
پائمالِ سختیٔ دورِ خزاں کب تک رہوں

کب سے ہوں مصروفِ بازیہائے زنجیرِ گراں
صرفِ بازیہائے زنجیرِ گراں کب تک رہوں

زندگی کی ہر نفس توہین ہوتی ہو جہاں
زندگی کے بخشنے والے وہاں کب تک رہوں

میری ہستی ہے اگر نقدِ گرانِ کائنات
میں بہ عنوانِ متاعِ رائگاں کب تک رہوں

اے خوشی کے چاند سے مکھڑے کہاں تو چھپ گیا
اے الم کی ظلمتو! گرمِ فغاں کب تک رہوں

اوپندر ناتھ اشک

قصبے کے کرکٹ کلب کا افتتاح

افرادِ ڈرامہ

لالہ بھانا مل

سیکرٹری

حاضرین

[سامنے اسٹیج پر کرسیوں کے تین چار تخت ملا کر ایک اونچی چھوٹی سی سٹیج بنی ہوئی ہے جس پہ دری اور چادر بچھی ہوئی ہے اور ایک میز پر کرسی بھی لگی ہے۔ پردہ اٹھنے پر کرسی خالی دکھائی دیتی ہے ہاں تخت پر کرسی میز کے چاروں طرف قصبے کے معزز لوگ تشریف فرما ہیں۔ ناٹک دیکھنے والے ہی جلسے کے حاضرین ہیں۔

پردہ اٹھنے کے کچھ لمحے بعد حاضرین کی طرف کو سٹیج کے بائیں کونے پہ بیٹھا ہوا سوٹ بوٹ پہنے ایک نوجوان اٹھتا ہے۔ یہ کلب کا سیکرٹری ہے]

سیکرٹری (حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے) دوستو! آپ لوگ ہمارے قصبے کے کرکٹ کلب کی اس افتتاحی تقریب پہ جس ذوق شوق سے تشریف لائے ہیں اسے دیکھ کر نہ صرف ہماری حوصلہ افزائی ہوئی ہے بلکہ اس قصبے کے کرکٹ کلب کے شاندار مستقبل کے بارے میں بھی بڑی امید بندھتی ہے۔ آئندہ بھی اگر ہمیں آپ دوستوں کا ایسا ہی تعاون ملا تو یقیناً ہمارے قصبے کا کلب شہر کی کرکٹ ایسوسی ایشنوں سے بازی لے جائے گا۔ اور ایک دن آئے گا جب دنیا کی کرکٹ کے نقشے پر ہمارے قصبے کا نام سنہری حروف میں لکھا دکھائی دے گا (حاضرین تالیاں بجاتے ہیں)

سیکرٹری (تقریر جاری رکھتے ہوئے) دوستو! آپ لوگوں کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ شہر کے ڈیری فارموں کے دانت کھٹے کرنے والے ہمارے "امرت ڈیری فارم" کے مالک دانی ویر شری لالہ بھانا مل جی نے ہمارے کرکٹ کلب کا صدر بن کر اس کا افتتاح فرمانا منظور کر لیا ہے۔ ہمیں امید ہی نہیں یقین ہے کہ جس طرح ان کے ہاتھوں تقریباً خلا میں جنم لے کر امرت ڈیری فارم امر بیل کی طرح بڑھ رہا ہے اسی طرح ہمارا کرکٹ کلب بھی ان کے زیر سایہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے گا۔

(اسٹیج کے دوسرے کونے پہ چھوٹا سا ڈنڈا ہاتھ میں لئے بیٹھے لالہ بھانا مل جی کی طرف اشارہ کر کے) تشریف لائیے لالہ جی!

[بڑی ادا سے سر جھکاتا ہے۔ لالہ جی منہ کی کھینی تھوک کر ہاتھ میں ڈنڈا سنبھالے اٹھتے ہیں اور بڑی شان سے آ کر صدر کی کرسی پر بیٹھتے ہیں۔ سیکرٹری میز کے نیچے رکھا پھولوں کا ہار ان کے گلے میں پہناتا ہے۔ حاضرین تالیاں بجاتے ہیں۔

لحظہ بھر بعد ڈنڈا میز پر رکھ کر لالہ بھانا مل اٹھتے ہیں۔ پھولوں کے ہار کو گلے میں ٹھیک کرتے ہیں اور ایک آدھ بار کھنکھارتے ہیں]

لالہ بھانا مل کے بارے میں مصنف کیا کہے! بس وہ لالہ بھانا مل ہیں جنہوں نے ایک گائے کی ملکیت سے قصبے میں اپنی ڈیری کھولی تھی۔ اور اب جن کی ڈیری میں سو بھینسیں اور پچاس گائیں ہیں اور کریم اور مکھن نکالنے کی مشینیں ہیں۔ اور جنہوں نے شہر کی ڈیریوں کو ناکوں چنے چبوا دئے ہیں اور جو گوبر اٹھانے سے بھینسیں دوہنے تک سب کام خود کرتے رہے ہیں اور کرتے ہیں اور جنہیں اس بات کا فخر بھی کم نہیں ہے۔ کھادی کا کرتا دھوتی پہنے ہوئے، سر پر گاندھی ٹوپی اس طرح ٹکی ہوئی ہے جیسے اسے پہننے کے لئے ہی نہیں بلکہ اس غرض سے رکھ لیا ہو کہ سبھا سوسائٹی میں ننگے سر جانا قصبے میں مذموم خیال کیا جاتا ہے۔

سیکرٹری پھر اپنی جگہ پہ بیٹھتا ہے۔

لالہ جی - بہنو اور دیویو (کھنکھارتے ہیں) آپ لوگوں نے مجھے کرکٹ کلب کا پردھان چن کر میری جو عزت بڑھائی ہے اس کے لئے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ حالانکہ جہاں تک میرا تعلق ہے میں کرکٹ کے مقابلے میں اپنے دیش کے گلی ڈنڈے کو کہیں زیادہ اچھا سمجھتا ہوں (ہنستے ہیں) ان کے دانت بہت

ے چونا کتھا لی سپاری

خوبصورت نہیں۔ سپاری اور چونے سے بنی کھیتی متواتر پھولتے رہنے کے باعث کالے
اور بے ڈھنگے ہو گئے ہیں۔ لیکن ہنستے ہیں تو حاضرین کے لئے ان دانتوں کے درشن
ناگزیر ہیں)

سجنو! لکھو دینا مجھے نہیں آتا۔ اگرچہ آپ دوستوں کی بدولت ڈیری فارمنگ
کی طرح لکچر بازی بھی میرا پیشہ ہوتا جا رہا ہے۔ (ہنستے ہیں) میرے دل میں جو
ٹوٹے پھوٹے خیال آئیں گے اُن کو میں آپ کے سامنے رکھوں گا (ہنستے ہیں) ہمارا
قصبہ شہر کے بہت نزدیک ہے اس لئے یہ ضروری تھا کہ جیسے ہمارا امرت ڈیری فارم
کا شدھ اور پوتر دودھ وہاں جاتا ہے وہاں سے بھی ہمارے قصبے میں کچھ نہ کچھ
آتا۔ ہمارے نوجوان وہاں سے کرکٹ لے آئے (اپنے بے ڈھنگے دانت دکھلاتے ہیں)
ہمارے زمانے میں تو بھائی کرکٹ کوئی جانتا نہ تھا ہم تو گلی ڈنڈا کھیلتے تھے۔ آہاہاہا
ہا..... کیا بڑھیا کھیل ہے گلی ڈنڈا! میں تو اسے کرکٹ کا باپ سمجھتا ہوں۔ مجھے
پورا یقین ہے کہ انگریزوں نے ہمارے گلی ڈنڈے کو دیکھ کر ہی کرکٹ ایجاد کی ہے
ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ انگریزوں نے اپنے ہندسے ہماری سنسکرت کے ہندسوں
کو دیکھ کر بنائے ہیں۔ میں کہتا ہوں ہندسوں پر ہی کیا موقوف ہے نہ جانے وہ لوگ
ہمارے وید پُرانوں سے کیا کیا لے گئے ریل گاڑی۔ ہوائی جہاز۔ بندوق، توپ، تار
ٹیلی فون اور ریڈیو کیا ہمارے یہاں نہیں تھے ضرور تھے۔ (ڈنڈے کو اُٹھا کر ہاتھ
میں لیتے ہیں) ہم لوگوں نے اپنے شاستروں کا کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا اور غیر انہیں
کی بدولت دیکھئے کیا سے کیا بن گئے۔

(ڈنڈے کو میز پر ٹھکورتے ہیں اور پھر وہیں رکھ کر چاروں طرف
نظر دوڑا کر دانت نکوس دیتے ہیں)

لالہ جی۔ (اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے) ادھر سننے میں کہ ایک اور
چیز نکلی ہے۔ کیا کہتے ہیں اسے .... جس سے ہم یہاں بیٹھے دُور کی
چیزوں کو سُن ہی نہیں دیکھ بھی سکتے ہیں۔

سیکرٹری (لقمہ دیتا ہوا) ٹیلی ویژن

لالہ جی۔ ہاں ہاں ٹیلی بجن (دانت دکھاتے ہیں) سالے یہ انگریزی
نام بھی کیا مصیبت ہیں زبان پر ہی نہیں چڑھتے ہیں میں پوچھتا ہوں انگریزوں
نے اس ایجاد میں کیا تیر مارا ہے! مہا بھارت میں سنجے ہستناپور میں بیٹھے۔ بیٹھے
مہاراج دھرت راشٹر کو لڑائی کا حال کیسے بتاتے تھے؟ کوئی کیا بولا؟ کس نے
کیا کیا؟ کون مرا؟ کس نے مارا؟ لڑائی کی ایک ایک بات وہ مہاراج دھرت راشٹر
کو بتاتے تھے۔ میں کہتا ہوں ٹیلی بجن ہی نہیں ٹیلی بجن سے کوئی بڑھیا چیز ان کے
پاس ہو گی۔

سجنو! آج ہم آزاد ہو گئے ہیں۔ ہمارے ہاتھ پاؤں ہی نہیں ہمارے
دماغ بھی انگریزی غلامی سے آزاد ہونے چاہئیں۔ ان کے کرکٹ کو یہاں لانے
کے بدلے کیا یہ اچھا نہ تھا کہ ہم یہاں سے گلی ڈنڈے کی ٹیم لے کر ولایت جاتے۔
خرچ بھی کم اُٹھتا اور مزہ بھی دوگنا آتا۔ اپنے دیسی کھیل ہیں ہی ایسے کہ ہینگ
لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا آئے کم خرچ بالانشین۔ یہی یہ انگریزی کرکٹ۔ تو
اگر بلے، وکٹوں اور ان سالے گریلوں کو کیا کہتے ہیں انھیں جنھیں پنڈلیوں پہ
باندھتے ہیں.......

سیکرٹری (لقمہ دیتے ہوئے) پیڈ..... پیڈ!

لالہ جی۔ ہاں ہاں..... پیڈ پیڈ..... اگر ان سب کو چھوڑ بھی
دیں اور کرکٹ کی صرف گیند لینے جائیں تو پانچ سات روپے سے کم نہ اُٹھیں۔ کیوں
منتری جی؟ (سیکرٹری کی طرف دیکھتے ہیں سیکرٹری تائید میں سر ہلاتا ہے)
(تقریر جاری رکھتے ہوئے) سو سوا سو روپیہ پاس نہ ہو تو کھیل شروع ہی
نہیں کیا جا سکتا۔ اور گلی ڈنڈا..... آہاہاہا..... پانچ پیسوں سے گیند بلے
کے سارے مزے لے لو، نہ ڈھال کی ضرورت نہ زرہ بکتر کی (ہنستے ہیں) یہ پیڈ سالے
زرہ بکتر نہیں تو اور کیا ہیں (ہنستے ہیں) جتنا چاہے پدلو یا پدا لو۔ جن دنوں ہم
کھیلتے تھے۔ جب کبھی ہمارے ہاتھ میں ڈنڈا آ جاتا تھا تو سچ مانئے دو دو دن تک
پداتے تھے۔ کئی بار مخالف میدان چھوڑ جاتے تھے (دانت دکھاتے ہوئے ہنستے ہیں)
اور یہ کرکٹ بھی کوئی کھیل ہے (دونوں ہاتھ ہلا کر دکھاتے ہوئے) گیند روکنے
کے لئے اتنا چوڑا بلا۔ اور یہ گھٹنوں تک گدے جیسے زنخوں کی طرح تھوڑی سی جگہ میں
دوڑتے جاؤ۔ اس کے مقابلے میں گلی ڈنڈا آہاہاہا۔ سارے کا سارا میدان اپنا
جہاں جی چاہے گُلی لگاتے بھاگتے پھرو (ذرا ہنستے ہیں) معاف کیجئے گا منتری جی
ہم کو تو اپنا گلی ڈنڈا آپ کے کرکٹ سے زیادہ پسند ہے۔

(سیکرٹری صاحب کھیسیں نکوس دیتے ہیں)

(لالہ جی رو میں آ کر ہنستے ہیں) پہلی بار جب ہم شہر گئے تو وہاں کرکٹ کا میچ
ہو رہا تھا۔ ہمارا ایک بھتیجا ہے وہ ہمیں زبردستی میچ دکھانے لے گیا۔ کہنے لگا۔
"ولایت سے کھیلنے والے آئے ہیں پھر یہ موقع نہ آئے گا۔" ہم بھی چلے گئے۔ دو
گھنٹے بیٹھے رہے۔ چار بھی نہیں لگے میرے شیروں نے۔ گیند آتا تو ٹھس سے

وہیں رہ جاتا۔ زیادہ زور مارتے آٹھ دس گز اِدھر اُدھر۔ ایک آدھ ہٹ لگی بھی تو دبوچ لی گئی۔ کتنے زور کی لگی ہوگی۔ اس کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔ ہم کو تو نیند آنے لگی۔ ہم ہوتے تو اس پار یا اُس پار۔ (ہنستے ہیں) یہ بھی کوئی کھیل ہے کہ دو گھنٹے میں چار قدم نہ بڑھے۔ ہم پہلے ہی آؤٹ ہو جاتے لیکن ہٹ لگاتے تو گیند میدان کے ادھر نہ رہتا۔ گو جب ہم ٹُل لگاتے تھے تو مجی کس کی مجال کہ دبوچ لے۔ اس کی سب اُنگلیاں نہ ٹوٹ جاتیں۔ ایک بار جب ڈنڈا ہاتھ آتا تو پھر وہی کیفیت ہوتی کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ لیکن اس کے لئے چاہیئے کلائی میں زور اور کلائی میں زور آج کل کے نوجوانوں میں کہاں سے آئے۔ ہم دن میں چار چار سیر دُودھ پی جاتے تھے۔ مکھن ملائی اُوپر سے۔ اور یہ ہمارے نوجوان...... بڑا زور ماریں گے تو چار پیالے چائے پئیں گے (ہنستے ہیں) جس میں چار پیچ دودھ... وہ بھی سپریٹا[1]۔ کس بل آئے تو کہاں سے۔ میرا بھتیجا کہہ رہا تھا کہ ہمارے دیش میں بھی کرکٹ کے بڑے بہادر کھلاڑی ہو گزرے ہیں۔ رانا رنجیت سنگھ تو ایسے زبردست کھلاڑی تھے کہ ولایت والے بھی ان کا لوہا مانتے ہیں۔ انھیں کے نام پر "رانجی ٹرافی" کا کھیل سارے ہندوستان میں کھیلا جاتا ہے۔ ان کے لڑکے دلیپ سنگھ بھی بڑے مشہور کھلاڑی رہے ہیں۔ کیوں نہ ہو، کیوں نہ ہو، ارے وہ شُدھ دُودھ پیتے تھے اور خالص گھی کھاتے تھے۔ آج کل گائے بھینس کا خالص دودھ تو دُور رہا۔ ڈالڈا بھی خالص نہیں ملتا (دانت دکھاتے ہیں) آپ کو معلوم نہیں میں نے ڈیری فارم کھولنے کا فیصلہ کیوں کیا۔ آپ لوگ تو جانتے ہیں کہ ہمارا مان تو اب بھی شہر میں ہے۔ ہمارے بابا تو ساہوکارا کرتے تھے لیکن ہم کو شوق تھا کشتی لڑنے کا۔ صبح چار میل کی دَوڑ لگاتے اور شام کو اکھاڑے جاتے۔ گھر ہمارا چھوٹا سا تھا۔ بھینس تو کیا وہاں بکری بھی نہ پالی جا سکتی تھی۔ اس صورت میں اچھا دُودھ کہاں سے ملتا۔ اور اچھا دودھ گھی نہ ملے۔ تو کشتی کیا لڑی جائے۔ ان دنوں ہماری گلی میں ایک گوالا آتا تھا۔ رام اور سیتا کی سو سو قسمیں کھا کر اُس نے ہمیں یقین دلایا کہ وہ ہمیں خالص دودھ دے گا۔ لیکن ایک دن علی الصباح چار بجے کے قریب میں دَوڑ لگانے کے لئے جا رہا تھا کہ میں نے ایک ڈیری فارم سے اُسے نکلتے ہوئے دیکھ لیا۔ سالا سپریٹا ملاتا تھا ہمیں۔ گردن سے پکڑ کر دو گھونسے اُس کی پیٹھ پر دئے تو بلبلا اُٹھا۔ کہنے لگا۔ "سیٹھ جی۔ آپ کو نہیں

ملاتا سپریٹا۔" میں نے کہا۔ "سالے دوسروں کو ملاتا ہوگا۔ اس حرام کی کمائی سے کیا برکت ہوگی۔" بس صاحب وہ دن سو آج کا دن۔ اس گوالے سے پھر دودھ نہیں لیا۔ اس کے بعد میں آدھ میل چل کر ایک گوالے کے ہاں جانے لگا۔ کچھ دن تو بڑا بڑھیا دُودھ ملا۔ اِتنی موٹی ملائی کی تہ دودھ پر آئی (انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے دکھاتے ہیں کہ کتنی موٹی تہہ آئی تھی) ہم بڑے خوش ہوئے لیکن کچھ دن بعد پیٹ میں گڑبڑ رہنے لگی۔ دودھ کا ذائقہ بھی کچھ بدلا بدلا سا جان پڑا۔ ہم حیران کہ ہے رام کیا بات ہے؟ دودھ ہم اپنے سامنے دوہاتے۔ وہ ہمارے سامنے بالٹی پلٹ کر خالی کر دیتا اور دودھ دوہ کر ہمارے برتن میں ڈال دیتا۔ دو چار بار دودھ پھٹ بھی گیا۔ ہم بڑے چکرائے۔ ایک دن میں علی الصباح دَوڑ لگا رہا تھا اور سچ مانیئے دوڑ لگاتے وقت بڑے دُور کی سوجھتی ہے۔ مجھے خیال آیا کہ اس بالٹی کو جس میں وہ ہمیں دُودھ دوہ کر دیتا ہے اچھی طرح جانچنا چاہیئے دَوڑ سے لَوٹ کر میں دودھ لینے جاتا تھا۔ اس دن جب وہ بالٹی کو خالی کر کے دودھ دوہنے لگا۔ تو میں نے کہا "بھیا۔ ذرا بالٹی تو دکھانا۔" وہ لگا آنا کانی کرنے۔ میں نے بالٹی پر ہاتھ رکھا۔ اُس نے کھینچا۔ اس کھینچا تانی میں بالٹی اوندھی ہو گئی۔ اب کیا دیکھتے ہیں کہ خالی بالٹی سے جھر جھر سنگھاڑے کے آٹے ملے پانی کی دھار بہہ رہی ہے۔ دھت تیرے کی...... دوہرے پیندے کی بالٹی بنا رکھی تھی کم بخت نے۔ گوالا بھی اکھاڑے جاتا تھا۔ اپنی چوڑی پکڑی دیکھے جاتے دیکھ کر اُلجھ پڑا مجھ سے۔ لگا بالٹی چھڑانے۔ لیکن یہ کلائی آج کے کرکٹ کھیلنے والے کی کلائی تو ہے نہیں۔ بالٹی ٹیڑھی ہو گئی پر ہاتھ سے نہ چھوٹی۔ تب میں نے وہی ہاتھ کھینچ کر جو دیا دھوبی پٹڑا تو گوالے صاحب لگے زمین ماپنے۔ میں تو اسے پولیس میں دے دیتا۔ لیکن اس کا بوڑھا باپ میرے پاؤں پڑ گیا اور بھی دو ایک جان پہچان والے وہاں موجود تھے۔ انھوں نے بھی کہا کہ اب معافی مانگتا ہے۔ اس بار بخش دو۔ پھر نہ کرے گا۔ (ہنستے ہیں) جو قدم چھو کر معافی مانگ لے اسے ابھے دان دینا ہمارا پُرانا دھرم ہے۔ تب "جا سالے تیری کرنی تیرے آگے" یہ کہہ کر ہم چلے آئے۔ اب پھر خالص دُودھ گھی کا مسئلہ سامنے آیا۔ ایک گوالا ملا جو اپنی گائے لے کر ہماری گلی میں آنے اور ہمارے برتنوں میں دودھ دوہ کر دینے کو تیار تھا۔ ہم اوپر کی منزل میں رہتے تھے۔ نیچے کا مکان بابا نے کرایہ پر دے رکھا تھا۔ اُوپر سے ہماری بہن بالٹی لٹکا دیتی اور اس میں گوالا دودھ دوہ دیتا۔ کچھ دن بڑا اچھا دودھ ملا۔ ملائی بھی خوب آئی

---

[1] جس دودھ سے مکھن یا بالائی نکل چکی ہو

لیکن پھر ایک دن دیکھا تو محسوس ہوا کہ دودھ کیا یہ تو پانی ہے میرے بھائیوں کو نہ صبح اُٹھنے کا شوق تھا نہ سیر کسرت کا۔ اور گوالا آتا تھا علی الصباح۔ سورج چڑھنے سے کہیں پہلے۔ تب میں نے سی۔ آئی۔ ڈی کرنے کی ٹھانی اور ایک دن اُسے پکڑ لیا گیا۔ ہاتھوں۔ کم بخت سائیکل کی ٹیوب میں پانی بھر لاتا تھا۔ پانی سے بھری ٹیوب اُس کی گردن اور کمر میں انگریزی 8 کا ہندسہ بناتی ہوئی پڑی رہتی تھی۔ اُس کے ساتھ بالٹی لٹکائے ہوئے آتا تھا۔ دیکھنے میں لگتا تھا کہ ہاتھ میں بالٹی لئے چلنے کے بدلے اس نے اسے کمر سے باندھ رکھا ہے۔ دُودھا چھال رہا تھا اس خیال سے ہماری بہن نے مطمئن ہو کر دودھ دوہتے وقت سامنے رہنا چھوڑ دیا بالٹی کی رسّی کو جنگلے سے باندھ کر وہ دوسرے کام میں لگ جاتی تھی۔ گوالا دودھ دوہ کر جب آواز دیتا تو وہ بالٹی کھینچ لیتی۔ جب وہ بالٹی لٹکا کر چلی جاتی تو گوالا دُودھ دوہتے دوہتے بے فکر ہو کر ٹیوب سے پانی اُس میں چھوڑ دیا کرتا۔ پکڑے جانے پر اُس کی جو مرمت میرے ہاتھوں ہوئی ہوگی اُس کا اندازہ آپ لوگ کر سکتے ہیں۔ لیکن اُس دن بے حد افسوس ہوا۔ یہ بات سمجھ میں آگئی کہ شہر میں خواہ اور جو چیز مل جائے خالص دُودھ میسر نہیں ہوتا۔ تب میں نے عزم کیا کہ میں نہ صرف اپنے لئے خالص دودھ کا انتظام کروں گا۔ بلکہ سارے شہر میں دودھ کی ندی بہا دوں گا۔ دل ہی دل میں میں نے اسکیم بنائی اور جا بابا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بابا اپنے کمرے میں ہی کھانا کھولے بیٹھے تھے۔ مجھے ہاتھ جوڑ کھڑے دیکھ کر انھوں نے آنکھیں اُٹھائیں وہ مجھے اوّل درجے کا نالائق اور نکما سمجھتے تھے۔ میں نے کہا۔ بابا آپ نے ہمیشہ مجھے نالائق سمجھا۔ آج میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں بھی آپ کو کچھ کر کے دکھاؤں۔ بابا ہنسے اُن کی آنکھوں میں شبہ کی لکیریں صاف ظاہر تھیں۔ لیکن نہ جانے میرے چہرے پر کیسی سنجیدگی تھی کہ انھوں نے لحظہ بھر بعد پوچھا۔ "ہم بھی جانیں، کیا کرنا چاہتے ہو" میں نے کہا۔ "میں شہر میں نہیں قصبے میں رہنا چاہتا ہوں۔ وہاں کچھ کام کروں گا اور آپ پر بوجھ نہیں بنوں گا۔ آپ مجھے ایک بار ۲۰۰ روپے دے دیجئے۔ میں نے اگر وہ اڑا دیا تو زندگی بھر ایک کوڑی نہ دیجئے گا۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ایسا موقعہ نہ آنے دوں گا۔" میرے بھائیوں نے بابا کو بہتیرا روکا کہ یہ آوارہ ہے۔ سارا روپیہ یار دوستوں کی نذر کر آئے گا۔ لیکن نہ جانے بابا کو میری باتوں کا کیسے یقین ہو گیا۔ انھوں نے مجھے تین سو روپیہ دے دیا اور میں یہاں چلا آیا۔ میں نے ایک گائے پالی اور امرت ڈیری فارم بنایا۔ یہ آپ سب جانتے ہیں۔ مجھے صرف اس بات کی خوشی ہے کہ میں نے نہ صرف اپنے لئے خالص دودھ گھی کا انتظام کیا بلکہ سارے شہر میں امرت کی نہر بہا دی ہے۔ مجھے کچھ افسوس بھی ہے۔ وہ اس بات کا کہ گنگا کے کنارے رہنے والے اس سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ قصبے میں کتنے لوگ ہیں جو امرت ڈیری فارم کی سیواؤں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ لوگوں نے یہ غلط افواہ پھیلا رکھی ہے کہ لالہ جی دودھ شہر کو سپلائی کرتے ہیں اور سپریٹا قصبے میں۔

(ہنستے ہیں اور اپنے سارے دانت دکھاتے ہیں)

ارے بھائی! چار گھر تو ڈائن بھی چھوڑ دیتی ہے۔ کیا میں سپریٹا اپنے پڑوسیوں کو پلاؤں گا۔ سپریٹا ہم بھی نالی میں نہیں بہاتے۔ وہ ایسی انجمنوں میں جاتا ہے جو کمزور بچّوں کو مفت کا دودھ سپلائی کرتی ہیں۔ بیمار بچّے امرت ڈیری فارم کا خالص دودھ پچانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ پچھلے آٹھ برس کے تجربے سے یہ بات بخوبی ثابت ہو گئی ہے۔ لیکن آپ یقین کیجئے۔ امرت ڈیری فارم کا سپریٹا بھی عام ڈیریوں کے خالص دُودھ سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ اب ہم ایک ایسی مشین لگانے والے ہیں جو پلک جھپکتے سب گائے بھینسوں کا دودھ دوہ لے گی۔ گوالوں کے ہاتھ بھی نہ لگیں گے۔ آپ لوگ سائنس پڑھے ہوئے ہیں۔ یہ بات بخوبی جان سکتے ہیں کہ اس سے کتنا فائدہ ہوگا۔ اور کتنا شدھ اور خالص دُودھ آپ لوگوں کو ملے گا۔

سجنو! آپ کرکٹ کلب کھول رہے ہیں۔ میں خوش ہوتا اگر آپ اس کے ساتھ گلی ڈنڈا کلب بھی کھولتے۔ لیکن میں ہمیشہ آپ کے ساتھ ہوں۔ مجھ سے جو خدمت بھی لینا چاہیں اُس کے لئے حاضر ہوں۔ لیکن یہ نہ بھولئے کہ اس وقت تک آپ دوسری بدیسی ٹیموں کو نہیں ہرا سکتے جب تک رانا رنجیت سنگھ اور دلیپ سنگھ ایسے مشہور کھلاڑیوں کی طرح خالص دودھ گھی کا استعمال نہیں کرتے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا نام بھی انھیں کی طرح کرکٹ کی تاریخ میں امر رہے تو شدھ دُودھ گھی مکھن اور ملائی کا استعمال کیجئے۔ یہ چاروں چیزیں شدھ اور خالص ہمارے امرت ڈیری فارم میں ملیں گی۔

(ہاتھ جوڑ کر اور ڈنڈے کو ہاتھ میں لے کر بیٹھتے ہیں۔ اور جیب سے بٹوا نکال کر مزے سے کھینی بنانے لگتے ہیں)

حاضرین تالیاں بجاتے ہیں۔ جن میں کلب کے سیکریٹری کی تالیاں زوردار ہیں۔

تالیاں بجاتے بجاتے سیکریٹری بھی اُٹھتا ہے۔ لمحہ بھر کے لئے

لالہ جی سے مسکوٹ کرتا ہے۔ پھر

سیکرٹری ۔ سجنو! آپ کو یہ سن کر مسرّت ہوگی کہ لالہ جی نے اکیسو ایک روپیہ ہمارے کرکٹ کلب کو دان دیا ہے جس میں سے پانچ کا نوٹ انھوں نے اس وقت مجھے دیا ہے (نوٹ حاضرین کو دکھاتا ہے) اس کے علاوہ ماہوار امداد کا بھی یقین دلایا ہے ۔ ہم ہی نہیں ہمارا سارا قصبہ بلکہ میں تو کہوں گا کہ کرکٹ کی ساری دُنیا لالہ جی کی اس سخاوت کے لئے احسان مند رہے گی انھوں نے ہمیں کچھ قیمتی نصیحتیں بھی کی ہیں ۔ ان کی نصیحتوں پر عمل کرنا ہماری زندگی کا مقصد ہوگا ۔ ہم لالہ جی کو یقین دلاتے ہیں کہ کرکٹ کلب میں گلی ڈنڈا کھیلنے کا پورا پورا انتظام کیا جائے گا ۔ اور کرکٹ کے میدان میں ہفتے کے تین دن گلی ڈنڈے کے میچ ہوا کریں گے لالہ جی کی دُعائیں اور تعاون ہمارے ساتھ رہا تو ہمیں پورا یقین ہے کہ ہم گلی ڈنڈے کی ایک ٹیم انگلستان لے جائیں گے اور خدا نے چاہا تو اس دیسی کھیل کا سکہ یقیناً انگریزوں پر بٹھائیں گے ۔

(حاضرین کی تالیاں اور پردہ گرتا ہے)

تپش گوپال پوری

برسات

مغرب سے گھٹا جھوم کے لہرا کے اُٹھی ہے — لگتا ہے کچھ ایسا کہ فضا جھوم رہی ہے

ہر موجِ صبا بُوئے تمنّا میں بسی ہے — پیمانوں کے محور پہ زمیں گھوم رہی ہے

ہر سانس میں پیغامِ نشاطِ ابدی ہے — اک موجِ طرب دل کو مرے چوم رہی ہے

ایسے میں جو آجاؤ تو برسات منالیں — ایسے میں جو آجاؤ تو برسات منالیں

لو اُمے کی جھڑی لگ گئی گلشن کی فضا میں — پھُولوں کی ہنسی، غنچۂ نورس کا تبسّم

نغمے سے ہیں گُونجے ہوئے بدمست ہوائیں — سبزے کی لہک، بادِ بہاری کا ترنّم

رنگین یہ صبحیں ہیں معطّر ہیں یہ شامیں — جذبات میں طوفان، تمنّا میں تلاطم

ایسے میں جو آجاؤ تو برسات منالیں — ایسے میں جو آجاؤ تو برسات منالیں

یہ دَورِ محبّت ہے بہر حال غنیمت

کیا جانیئے کب آئے گا پھر لمحۂ عشرت

دی ہے غمِ دُنیا نے تبسّم کی اجازت

ایسے میں جو آجاؤ تو برسات منالیں

نیا چین

چین کی حکومت کے
پریذیڈنٹ ماؤزے تنگ

بھارت اور چین کے باھمی تعلقات بہت پرانے ھیں - دونوں ملک ایشیا کی تہزیب کے علمبردار اور امن و امان کے حامی ھیں - حال ھی میں چین میں عوامی حکومت کے قیام کے ساتھ چین کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ھوا ھے اور دونوں ملکوں نے محسوس کیا ھے کہ ایک دوسرے کے پڑوسی ھونے کی حیثیت سے یہ ضروری ھے کہ پرانے باھمی تعلقات کو ازسرنو زندہ کیا جائے چنانچہ گزشتہ چند برس میں متعدد کلچرل ڈیلیگیشن بھارت سے چین گئے ھیں اور چین سے بھارت آئے ھیں -

پیکن کے ایک کنڈر گارٹن
اسکول کے بچے
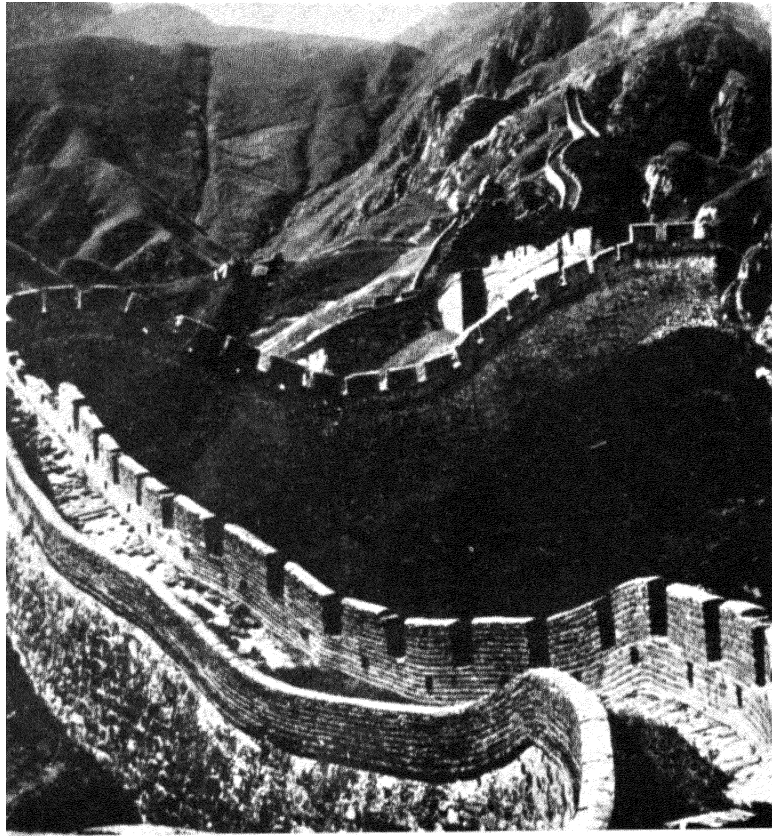
ستره سو میل لمبی دیوار چین کا ایک حصہ
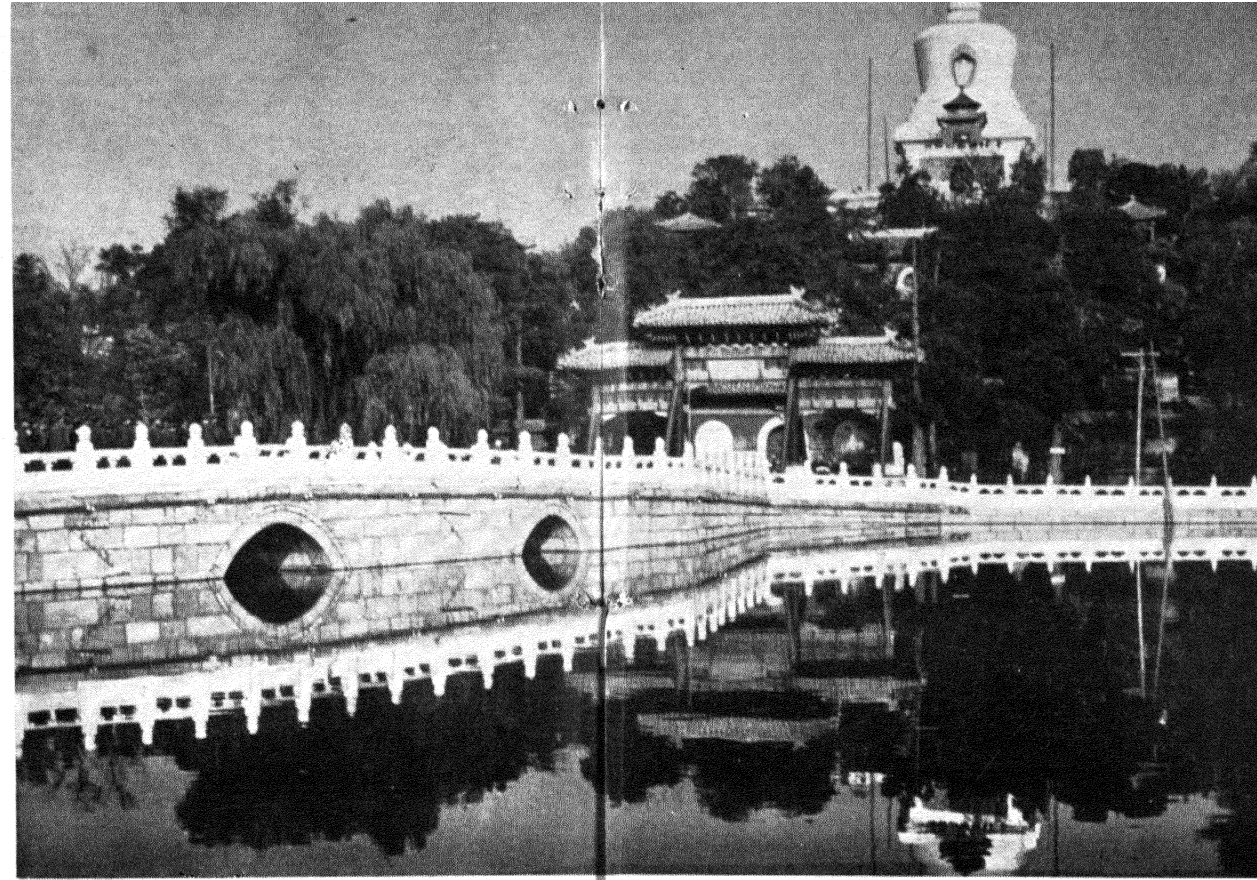
پی ہائی کنگ یوآن جو کسی زمانے میں موسم سرما کا شاہی محل تھا اور اب ایک پبلک پارک ہے -

شنتانگ میں غلے کا ایک کھیت جس کی ۱۹۵۱ء کی پیداوار جنگ سے پہلے کی زیادہ سے زیادہ پیداوار کے برابر تھی

چنکیانگ کے صوبے میں چائے کا کھیت

چنگتو چنکنگ ریلوے حال ہی میں بنائی گئی ہے
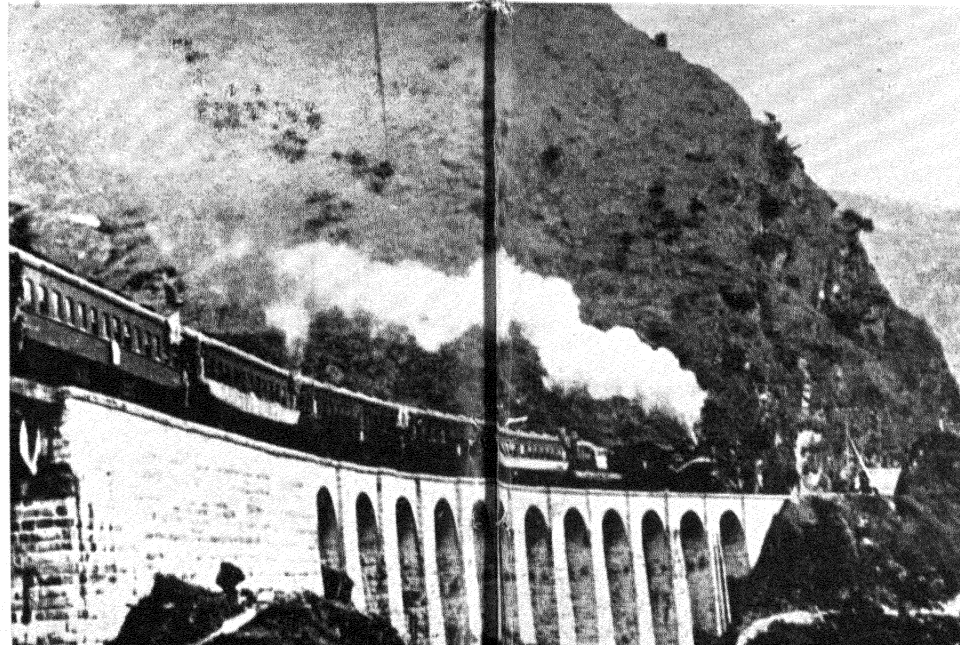
کپاس کا ایک کھیت جس کی اچھی فصل چین کی خوشحالی کی ضامن ہے

ہندوستان
زبانیں
انڈو آرین
دراوڑی
آدی باسی زبانیں
چینی تبتی
وہ علاقہ جہاں ہندی اُردو بولی
جاتی ہے اور ذریعۂ تعلیم ہے
مارواڑی
گجراتی
میواتی
برج بھاشا
پچھمی ہندی
اودھی
مرکزی پہاڑی
بہاری
میتھلی
چھتیس گڑھی
مراٹھی
تیلگو یا
آندھرا
تامل
ملیالم
آسامی
بنگالی
انڈومانی
نکوباری

فراق گورکھپوری

جسم

گلزارِ صباح، رسمساتا ہوا جسم — اک موجِ نشاط مُسکراتا ہوا جسم
ہے گوشش بر آوازِ سکوتِ کونین — بجتا ہوا سازِ گنگناتا ہوا جسم
رگ رگ میں کسک سے تلملاتا ہوا جسم — وہ نرم لوؤں سے جھلملاتا ہوا جسم
پاتا بہ جبیں چٹک رہی ہیں کلیاں — غنچوں کے دل سے دل ملاتا ہوا جسم
سائے میں رنگ و بُو کے پلتا ہوا جسم — گلزار کی کروٹیں بدلتا ہوا جسم
وہ تازہ دمی کہ سانس لے صبحِ بہار — سانچے میں کنوارے پن کے ڈھلتا ہوا جسم
خوشبوئے شباب سے مہکتا ہوا جسم — تحریکِ نمو سے کچھ لہکتا ہوا جسم
اک پردۂ ساز ہے نکھرتا ہوا رُوپ — یہ رنگ یہ نُور یہ چھلکتا ہوا جسم
کلیوں کو بھیرویں سُناتا ہوا جسم — جادو گلزار کا جگاتا ہوا جسم
کھِل آنکھ مچولی کا میانِ دو جہاں — اک طُرفہ طلسم لہلہاتا ہوا جسم
نغمات سا پیچ و تاب کھاتا ہوا جسم — سُر کے گت کے دیئے جلاتا ہوا جسم
سب راگنیاں اُٹھی ہیں آنکھیں ملتی — جادو سنگیت کے جگاتا ہوا جسم
موجِ زرِ سیّال ڈلکتا[1] ہوا جسم — صہبائے جمال سے چھلکتا ہوا جسم
اَنگ اَنگ کے گرد سات رنگوں کی پھبن — رقصِ قوسِ قزح جھلکتا ہوا جسم
خود اپنے رچاؤ سے سنورتا ہوا جسم — خود گرمیٔ حسن سے نکھرتا ہوا جسم
ہر عضو سے اِک شانِ تکلّم پیدا — اعجازِ جمال بات کرتا ہوا جسم
سرتا بہ قدم نظر اُٹھاتا ہوا جسم — ظاہر باطن کے بھید پاتا ہوا جسم
صد جامِ جہاں نما بلوریں اعضا — سنسار کو آئینہ دکھاتا ہوا جسم
نیک و بد کا بھرم اُٹھاتا ہوا جسم — رازِ ہستی کی نبض پاتا ہوا جسم
ہر عشوے میں امتزاجِ خیر و شر ہے — معصوم گُناہ کو بناتا ہوا جسم
نغماتِ بہار کی روانی ہے کہ جسم — اک موجِ نشاطِ ارغوانی ہے کہ جسم
اعضا میں کلی کلی تبسّم کی لَویں — جوبن یہ چمن چمن جوانی ہے کہ جسم

[1] ڈلک۔ یعنی چمک دمک۔ اسی سے ڈلکتا میں نے بنایا ہے یعنی چمکتا دمکتا ہوا جسم (ف)

۵ یہاں بھی "پاتا بہ جبیں" بآسانی لکھا جا سکتا تھا (ادارہ)

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

غزل

کرو جو چاہو ہم سے پوچھنا کیا — ہماری آرزو کیا مُدعا کیا
سمجھ کا پھیر ہے اچھا بُرا سب — جو سچ پوچھو تو اچھا کیا بُرا کیا
کریں سجدہ فقط ہم بہرِ سجدہ — نہیں منظور بندہ کیا خدا کیا
جسے مل جائے تیرے غم کی نعمت — غمِ دنیا سے اُس کو واسطا کیا
ستم دیکھو مجھی سے پُوچھتے ہیں — نصیبِ دشمناں کچھ ہو گیا کیا
اعزا کیوں سرِ بالیں ہیں خاموش — مریضِ غم ابھی سے سو گیا کیا
مرے جاتے ہیں ہم خوفِ فنا سے — نہ ہو مرنا تو جینے میں بُرا کیا
ہمارا کام ہے گھُٹ گھُٹ کے مرنا — وہی جانے جفا کیا ہے وفا کیا
نہ جانے آج کیوں بگڑے ہوئے ہو — کسی نے کان میں کچھ کہہ دیا کیا
وہ وقتِ صبح رخصت ہو رہے ہیں — یہی ہے شامِ غم کی ابتدا کیا
سرِ منبر کوئی جا کر تو دیکھو — ابھی تک ہے درِ میخانہ وا کیا

نہ جینا ہاتھ میں اپنے نہ مرنا
بشر کی ابتدا کیا انتہا کیا

دیوندر ستیارتھی

مراٹھی لوک گیت

مراٹھی لوک گیتوں میں "اووی" کو ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ مہاراشٹر میں چکی پر آٹا یا بیسن پیستے ہوئے یا دال دلتے ہوئے عموماً دو عورتیں آمنے سامنے بیٹھ کر چکی کے ہتھے کو پکڑ کر اس کام میں شامل ہوتی ہیں۔ پو پھٹنے سے بہت پہلے ہی یہ کام شروع ہو جاتا ہے۔ گھر کی کوئی دوسری عورت ساتھ دینے کو موجود نہ ہو تو پڑوسنیں آپس میں ہاتھ بٹاتی ہیں۔ اسی لئے اکثر اووی میں پڑوسن کو مخاطب کیا جاتا ہے۔ پو پھٹنے سے پہلے کا پُرسکون ماحول بھی اووی میں بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا جاتا ہے میکے جانے کے لیے بیتاب ہو کر سسرال میں بہو اپنے بھائی کا انتظار کرتی ہے۔ بہن کا دل بھائی کے انتظار میں امڈ پڑتا ہے۔ کہیں کہیں کوئی پُرانا اعتقاد بھی اووی میں گونتھ دیا جاتا ہے۔ بڑی بہن کو کنکم کی پڑیا پڑی مل جائے تو چھوٹی بہن سوچتی ہے کہ بڑی بہن کے شوہر کی عمر بہت بڑی ہے۔

اووی گاتے ہوئے پنہاریاں آزاد فضا میں سانس لیتی ہیں، ان کی کوششوں کو کوئی شاعری کے نئے تجربات کی داغ بیل کے روپ میں اپنائے، یہ ان کا تقاضا نہیں ہوتا۔ پرانے اووی گیتوں کے ذخیرے میں نئے اووی گیت شامل ہوتے رہتے ہیں۔

کسی کسی اووی میں گاؤں کی بدلتی ہوئی حالت کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ 'گاؤں بگڑ گیا'! — بہت بار اووی کی یہی اٹھان رہتی ہے۔ گاؤں کا چہرہ تو خوبصورت نظر آنا چاہیئے۔ ہر فرد کی چال ڈھال ایسی ہو کہ پورا گاؤں اس پر فخر کر سکے اور خوشی کی پھوار سی پڑتی نظر آئے اسی جذبے سے متاثر ہو کر پنہاریاں اووی گاتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اووی میں برش کے ایک آدھ پچ سے زیادہ کی گنجائش نہیں رہتی

سانے گورو جی کا نام مہاراشٹر کے دیہاتی ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ "استری جیون" کی دو جلدوں میں اووی گیتوں کے دو ہزار پانچ سو بانوے نمونے پیش کرنے کی خدمات انجام دے کر مرحوم سانے گورو جی نے مہاراشٹر کی ہی نہیں کل ہندوستان کی ادبی خدمت انجام دی۔

سانے گورو جی کی تحقیق کے مطابق ساتویں آٹھویں صدی میں چکی پیستے وقت گائی جانے والی اووی کا ذکر ملتا ہے اور جب بارھویں صدی میں مہادھوی مت کے شاعروں نے سب سے پہلے ادبی اووی کی داغ بیل ڈالی، اُنہوں نے دیہاتی شاعری کو اور خصوصاً پنہاریوں کی اووی کو خراجِ تحسین ادا کیا۔

پنہاریاں تو آج بھی دیہاتی شاعری کے آئینے میں اپنا روپ دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھتی ہیں۔ سرگم پر اووی کے بول اچھالتے ہوئے وہ اس میں اپنی روح کی آواز ملا دیتی ہیں۔ اووی زندہ شخصیت کا گیت ہے۔ کبھی قدرت کے خوبصورت چہرے کی جھلک ہی اووی کے لئے کافی سمجھ لی جاتی ہے۔ کبھی کوئی خوشی کی خبر ہی اووی کو جنم دیتی ہے۔ زندگی آگے بڑھتی ہے، اس کے ساتھ اووی منظرِ عام پر آتی ہے۔ زندگی کا نیا تعارف اووی گانے والیوں کو ہمیشہ پسند آتا ہے۔ اسی لئے انگریزی دور کے اولین تعارف کی بات اووی میں آگئی ہے۔

اس مختصر سے تعارف کے ساتھ تیس مراٹھی اوویاں پیش کی جا رہی ہیں

(۱) کنکم کی پُڑیا بڑی بہن کو کہیں سے مل گئی۔
عمر کا لابھ ہوا اس کے پتی کے لیئے!

(۲) پھر اُتر گئے، ندی نالے شانت ہو گئے۔
بہن کو لے جانے کے لیئے اب تک بھائی کیوں نہیں آیا؟

(۳) پڑوسن گھڑی گھڑی آکر پوچھتی ہے۔
میکے سے بیل گاڑی کب آنے والی ہے؟

(۴) دولت نہیں چاہیئے، مہریں نہیں چاہئیں، نہ موتیوں کے ہار

پریم کے آنسوؤں کی دھاریں دے دو، بھائی راجہ !

(۵) پان پھول کافی ہیں، کافی ہیں چاول کے دانے اور سپاری -
نہیں چاہیئے زر دوزی کے کام والا شیلر[۱]، بھائی راجہ

(۶) پو پھٹنے سے ایک پہر رات رہتے کون رانی اودی گا رہی ہے ؟
بیٹے کو سلا رہی ہے، اشا دیدی[۲]

(۷) گاؤں بگڑ گیا - گاؤں کی شوبھا چلی گئی -
بڑے بڑے لوگ لالچ میں پھنس جاتے ہیں -

(۸) عطر دانی ہے، گلاب دانی ہے، پاچو پیٹی[۳] ہے، پیک دانی ہے
شوقین طبع ہے تیری رانی، ارے گوپو بالا !

(۹) سانجھ ہو گئی، دہلیز کی رکشا کرو
جوگن کو بھکشا نہیں دینی چاہیے[۴]

(۱۰) آجکل کی لڑکیوں کو کام نہیں چاہیئے آنکھوں کے سامنے
اُشا دیدی کا دھیان لکھنے کی طرف رہتا ہے -

(۱۱) کچھیلا[۵] بھر بھر کر میں کنکم بانٹوں گی
ننہال میں مامی کے لئے بھیجوں گی

(۱۲) ارے پالنا بھیا، ہمیں تیرا لاڈ ہے -
ننھے کو چین نہیں پڑتی تیرے بغیر -

(۱۳) راجہ بھیّا سے کہو کہ جہاز بندرگاہ پر آ لگا -
الائچی اور لونگ سستے ہو گئے !

(۱۴) انگائی کے گھر منگائی رکھوالی کرتی ہے[۶]
سستی دُکان ہے راستے پر !

(۱۵) پیسنا ختم ہوا، چھاج کے کونے میں رہ گیا
بٹھل اور رکھومائی — ان دونوں زنوں کا میں نے گیت گایا -

(۱۶) پیسنا ختم ہوا، آخری مٹھی ڈالیں -

اسی طرح ہاتھ لگاتی جا، پڑوسن مجھے تیری آس ہے !

(۱۷) پیسنا ختم ہوا، ختم ہوا نہیں کہنا چاہیئے -
سکھی ! میرے سسرال اور میکے میں بھرپور ہے

(۱۸) چکی کرنڈ پتھر کی ہے، مٹھا ہے آنولے کا -
میری سانولی سہیلی کا گلا میٹھا ہے !

(۱۹) چکی کرنڈ پتھر کی ہے، مٹھا ہے پتھر کا،
اوپر چوڑیوں والا ہاتھ ہے اُشا دیدی کا !

(۲۰) ناریل کی باٹی جیسا ہے چکی کا منہ
بالا گھاٹ میں رہتا ہے اس کا کاریگر

(۲۱) پیسنا ختم ہوا، آخری دانے میں گنگا کی آخری دھارائیں
یہیں سے تجھے نمسکار کرتی ہوں، کاشی کے جیوتر لنگ !

(۲۲) دُور سے نظر آتی ہے نانو باکی اوپر کی لال منزل
سینا بائی زچہ ہے، شال کے لال پردے لگائے گئے ہیں -

(۲۳) بالم پٹی کپڑے کا ایک ٹکڑا چونی کی ایک پٹی
درزی واہ وا کر رہا ہے چولی پر !

(۲۴) پالنا میں بیٹھ کر اودیاں گائیں -
سچ مچ کتنا مزہ آتا ہے !

(۲۵) ارے پالنا بھیا تو ہچکولے کھاتا ہے
ہمیں تو حکم دینا ہے اُٹھ جانے کے لئے

(۲۶) لوری بندر پر میڈم چائے پیتی ہے
دیکھو آگن گاڑی آ گئی ریل کی پٹڑیوں پر

(۲۷) لوری بندر پر میڈم بسکٹ کھاتی ہے
آگن گاڑی کا منہ گھوم گیا ریل کی پٹڑیوں پر !

(۲۸) آگن گاڑی، بگن گاڑی، گاڑی کے ڈبے ہی ڈبے ہیں -
بیلوں کے بغیر ہی چل پڑتی ہے ریل کی پٹڑیوں پر !

(۲۹) عطر دانی، گلاب دانی، کانچ کا سبز پیالا
پانی میں بنگلہ بنوایا انگریزوں نے !

پندرھویں اودی میں بٹھل اور رکھومائی کا ذکر آیا ہے - بٹھل کا مندر پنڈھرپور میں ہے - بٹھل کی پتنی - رکھومائی پنڈھرپور کی دیوی ہے -

---

[۱] ایک طرح کا کپڑا - [۲] بڑی بہن - [۳] گلے کا زیور
[۴] شام کے وقت جوگن کو بھکشا دینے سے بچوں کو نظر لگ جاتی ہے -
[۵] کچھیلا میں کئی خانے رہتے ہیں، زیادہ ہوں تو ہر خانے کا ڈھکنا الگ کھلتا ہے -
[۶] انگائی کا مفہوم ہے لوری، منگائی مہمل لفظ ہے -

مراٹھی لوک گیتوں میں اووی کے مختلف بول ایک ہی سلسلے کی کڑیاں معلوم ہوتے ہیں ۔ عوامی جذبات اور احساسات کی ترجمانی اووی کے ننھے سے بول میں بڑی خوبی سے کی جاتی ہے ۔ ہر پرانی اووی کسی نئی اووی کی طرف اشارہ کرتی ہے ۔ چونکہ اووی کو صرف عورتیں ہی گاتی ہیں، اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ اس کی تخلیق میں عورتیں ہی ایک دوسری کا ہاتھ بٹاتی ہیں ۔

ملاحوں کے گیتوں میں ہم مرد کے جذبات سے متعارف ہوتے ہیں ۔ اس صنف کا ایک گیت سنیئے ۔۔

پنچھی بن کر میں ناچونگا، ناچونگا !
ایک ایک پیڑ پر بیٹھونگا بیٹھونگا !
سانجھ سویرے تجھے یاد کرونگا، یاد کرونگا !
ناؤ جیسے ڈولتی ہے ویسے ڈولتا رہونگا ڈولتا رہونگا !
دھیرے دھیرے بادبان پر چڑھ جاؤنگا، چڑھ جاؤنگا !
وہاں چڑھ کر بیٹھا رہونگا، بیٹھا رہونگا !
پربت کھڑی ہے اعلان کرونگا، اعلان کرونگا !
مچھلی بن کر تیری طرف چلونگا، تیری طرف چلونگا !
سانجھ سویرے تیرا پیچھا کرونگا، پیچھا کرونگا !
پتوار پر جھک جاؤنگا، جھک جاؤنگا
تیرے گنتھے ہوئے بال کھل کھل جائینگے، کھل کھل جائینگے !
چاندنی میں تو جھلمل کرے گی، جھلمل کرے گی !

ایک پوجا گیت میں کسانوں کے جذبات یوں ابھرتے ہیں ۔

گاؤں کے باہر پہاڑیوں پر پھول کھل گئے ۔
دیوتاؤں کے دیوتا یہاں اتر آئے ۔
ناریل توڑو، گری نکالو ۔
تلسی ماتا کے سامنے رکھ دو ۔
گاؤں کے باہر پہاڑیوں پر پھول کھل گئے
دھرتی ماتا نیچے اتر آئی

دیوتاؤں کے تصور میں کسان نے دھرتی ماتا کو بھلایا نہیں ۔ دھرتی ماتا نیچے اتر آئی ہے ۔ اس بول میں کسان کے جذبات کی دنیا پنہاں ہے دھرتی ماتا کے بیٹے اس کی خوشی کو صدیوں سے پہچانتے آئے ہیں ۔

بیلے کی خوشبو میں دوشیزاؤں کے گیت ہوا کی لہروں کے ساتھ مچلتے ہیں ۔ وہ گاتی ہیں ۔

ہاتھ میں کنگھی، آنچل میں پھول ۔
مانگ سنوارتے ہوئے ہم آگئے ۔

ایک گیت میں کوئی عورت کہتی ہے کہ اگر کیتکی کے خوشبودار پھول لانے کے لئے اسے سات دن کا راستہ چلنا پڑے جب بھی وہ ضرور جائے گی اس سے مہاراشٹر کی عورتوں کے جذبات کی صحیح ترجمانی ہوتی ہے ۔ کیونکہ ان کے سنگار میں پھولوں کا بہت ہاتھ رہتا ہے ۔ بہت سی عورتوں کے نام بھی تو پھولوں کی یاد دلاتے ہیں ۔ سیونتی، مجوہی، موگرا — یہ پھولوں کے نام ہیں اور بہت سی مائیں اپنی لڑکیوں کے لئے بھی یہی نام چنتی ہیں ۔

دیوکی سیونتی کے پھولوں سے بھگوان کی پوجا کرتی ہے، جبھی تو دیوکی کی کوکھ سے بال گوپال کا جنم ہوا ۔ اس قسم کے نقوش مراٹھی لوک گیتوں کی شان میں اضافہ کرتے ہیں ۔ پڑوسن کے بچے کو دیکھ کر جل بھن کر رہ جانے سے بات نہیں بن سکتی، جیسے مہاراشٹر کی ہر عورت نے اس باریکی کو سمجھ لیا ہے ۔ ایک گیت میں گلی کی عورتیں خوشی سے کسی پڑوسن کے گھر بالک کے جنم پر اکٹھا ہو کر کہتی ہیں — "گوبند کے گھر میں بالک ہوا ۔ سورج نے اسے اشیرباد دیا سکھیو ! اس بالک کے کانوں میں زیور پہناؤ ۔ ہاتھوں میں کڑے، گلے میں مالائیں !" جس کسی گھر میں بالک کا جنم ہوتا ہے وہیں گلی محلے کی عورتیں جمع ہو کر یہ گیت گاتی ہیں ۔ گوبند کی جگہ ہر پڑوسی کا نام بدل کر کام چلا لیا جاتا ہے ۔ اس صنف کے ایک اور گیت میں ماں اپنی زبان سے بالک کے گن گاتی ہے ۔ کتنا سندر ہے بھگوان شنکر کا پھول' ! بھگوان شنکر کا پھول گھر کا یہ نیا مہمان ہی تو ہے جس پر سارا گاؤں اپنی خوشیاں لٹا رہا ہے ۔

پوس کی پونم سے لے کر پانچ راتیں مہاراشٹر کے بعض حصوں میں نغمہ و رقص کی راتیں مانی جاتی ہیں ۔ اس خوشی میں گاؤں کی کنواریاں اور بیاہی ہوئی عورتیں شامل ہوتی ہیں ۔ لوک گیت اور لوک ناچ گلے ملتے ہیں ۔ نئی فصل کا اناج گھر میں موجود ہوتا ہے ۔ گاؤں میں اکثر کوئی گھر چن لیا جاتا ہے جہاں لڑکیاں اور عورتیں سج سنور کر جمع ہوتی ہیں ۔ یہ تیوہار بھگوان کی پوجا سے شروع ہوتا ہے ۔ چاول، ناریل، تل، کاجل اور کنکم وغیرہ سے بھگوان کی پوجا ان گنت صدیوں سے ہوتی آئی ہے ۔ کسی کسی گاؤں میں تو رات رات بھر گیت اور ناچ کی یہ محفل اجتماعی

خوشی کی رنگین تصویر پیش کرتی ہے ۔ اس رنگچے کا انتظار کرتے ایک برس بیت گیا ہر عورت سوچتی ہے، اب یہ تیوہار آیا ہے تو خوشی کے اظہار میں کوئی کسی سے پیچھے کیوں رہے ۔

مہاراشٹر کے کچھ علاقوں میں ایک پھول کھلتا ہے جسے شنکر کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے ۔ اور یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ عورتیں اس پودے کے پھولوں کی مالائیں بنا کر پہننے سے گریز کرتی ہیں ۔ اس کے پس منظر میں ایک روایت ہے جب شنکر اور پاربتی کا بیاہ ہوا تو پاربتی کے بالمقابل شنکر کی عمر بہت زیادہ تھی ۔ چنانچہ لڑکیاں سوچتی ہیں کہ شنکر کے پھول پہننے سے بوڑھا دولہا ملے گا ۔

مہاراشٹر کے لوک گیت مہاراشٹر کی دیہاتی زندگی کی صحیح تصویر پیش کرتے ہیں، مہاراشٹر کی نبضِ حیات سے ان گیتوں نے جو ربط قائم کر رکھا ہے وہی ان کی ہر دل عزیزی کے لئے ذمہ دار ہے ۔ حسن کاری اور فن کے اعتبار سے بھی بہت سے مراٹھی گیت زندگی کی نبض پر انگلی رکھنے نظر آتے ہیں ۔ ان میں قدم قدم پر انسان کی آواز بلند ہوتی ہے اور دھرتی کی طرف بازو پھیلاتی ہے ۔ اس آواز میں محض بیتی صدیوں کی حقیقت ہی نہیں، ان میں حال اور مستقبل کا ساتھ دینے کی صلاحیت بھی موجود ہے ۔

اس مختصر مضمون میں مہاراشٹر کے "پنواڑوں" یعنی رزمیہ گیتوں کے بارے میں کچھ نہیں لکھا جا سکا ۔ مراٹھی لوک گیت کی یہ صنف ایک الگ مضمون کی حامل ہے ۔ ان کے بارے میں یہاں اتنا اشارہ ہی کافی ہے کہ "پنواڑہ" کی تاریخی حیثیت سے مستقبل کا کوئی عظیم شاعر بھی انکار نہیں کر سکے گا ۔ آج بھی جب کوئی گاؤں گاؤں گھومنے والا گویا "پنواڑہ" ہوتا ہے تو سننے والوں کے جذبات میں ایک طوفان نمایاں ہو جاتا ہے کیونکہ "پنواڑہ" میں جنگ اور شجاعت کی جو تصویریں پیش کی جاتی ہیں ان کے نقوش جلال اور کمال کے ترجمان ہوتے ہیں ۔

لیکن سچ پوچھا جائے تو انسان ہمیشہ ایک سکون چاہتا ہے ۔ اس لئے لوک گیتوں میں سب سے زیادہ مقبول گیت وہی ہوتے ہیں جو کسی بھی طرح کے ہیجان سے بے نیاز ہوتے ہیں ۔

آخر میں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ مراٹھی لوک گیتوں کے صحیح خدوخال تو مراٹھی زبان میں ہی نظر آ سکتے ہیں، ترجمے میں بہت سی باریکیاں پیش نہیں کی جا سکتیں پھر ایک بات یہ بھی تو ہے کہ لے اور دُھن سے الگ کر کے ہم ان گیتوں کے ساتھ پورا انصاف نہیں کر سکتے ۔ تاہم جہاں تک دیہاتی شاعری کے نقوش کا تعلق ہے، ترجمے کے بغیر کسی بھی بین الصوبجاتی یا بین الاقوامی مطالعے کا کام نہیں چل سکتا ۔ جدید دور کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ دیہاتی شاعری کا مکمل جائزہ لیا جائے اور اس کی قوتوں کو جدید شاعری میں جذب کیا جائے جس طرح بنگال کے مصوّر جامنی رائے نے بنگال کی دیہاتی مصوّری کو اپنے فن میں جذب کیا اور اُس کا یہ عمل بہت پسند کیا گیا اسی طرح جدید شاعری کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ دیہاتی شاعری انہیں بہت کچھ دے سکتی ہے اور ان گنت صدیوں سے بازو پھیلائے وہ نئے شاعروں کا انتظار کرتی رہی ہے ۔

سیاحتِ ہندوستان کے بعد حکومت ملایا کے ہوم ممبر کے تاثرات

حال ہی میں حکومت ملایا کے ہوم ممبر داتو اون بن جعفر نے کوالالمپور کے میونسپل ہال میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ملایا کو بھارت کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے غیر مذہبی اصولوں پر حکومت قائم کرنی چاہئے ۔ انھوں نے کہا کہ اس امر میں کوئی بھی شبہ نہیں ہے کہ پاکستان ایک مذہبی حکومت ہے اور اُس کی بنیاد مذہبی اصول پر قائم ہے ۔ اس کے برعکس بھارت ایک غیر مذہبی حکومت ہے اور مجھے یقین ہے کہ ملایا کے لئے بہترین راستہ یہی ہے کہ وہ بھارت کی تقلید کرے ۔

مسئلہ کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ پاکستان کے بڑے بڑے حکام نے مجھے جو کچھ کشمیر کے بارے میں بتایا تھا اُس کی وجہ سے میں خاص قسم کے تاثرات لے کر کشمیر گیا ۔ لیکن وہ تمام باتیں شیخ محمد عبداللہ سے ملاقات کرنے اور ریاست کا دورہ کرنے کے بعد غلط ثابت ہوئیں ۔ اور مجھے یقین ہو گیا کہ بھارت سرکار اور شیخ عبداللہ نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ بالکل صحیح اور جائز ہے ۔ داتو بن جعفر نے کہا کہ شیخ عبداللہ اور اُن کی حکومت جو اقدام کشمیر میں کر رہی ہے میں اُن سے کافی متاثر ہوا ۔ خاص طور پر اراضی کاشتکاروں کو منتقل کرنے اور مزارعین کے قرضوں کی تنسیخ سے متعلقہ قوانین قابلِ تحسین ہیں ۔

بدیع مشہدی

نئے تلیگو ادب پر ایک نظر

تلیگو زبان اپنی مٹھاس، شیرینی اور موسیقی کی بنا پر ہندوستان کی زبانوں میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی بنا پر اس کا مقابلہ اطالوی زبان سے کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کی ایک علاقائی زبان ہونے کی حیثیت سے۔ بہت سے لوگوں نے اس کا نام تو سنا ہوگا لیکن آندھرا سے باہر بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہوگا کہ جنوبی ہند کی یہ زبان اپنے دامن میں بلند پایہ ادب کا بہت بڑا ذخیرہ بھی رکھتی ہے اور یہ کہ اس نے موجودہ ادبی نشاۃ ثانیہ میں بہت ہی اہم حصہ لیا ہے۔ اس سلسلے میں اردو داں حضرات کی واقفیت اور بھی زیادہ محدود بلکہ صفر کے برابر ہے۔ چند تلیگو کہانیوں کے ترجمے کے علاوہ کبھی اس بات کی کوشش نہیں کی گئی کہ تلیگو ادب سے اردو داں عوام کو روشناس کرایا جائے۔ میرے خیال میں یہ انتہائی ضروری ہے کہ ہندوستان میں بسنے والی مختلف قومیں ایک دوسرے کی زبان، ادب و کلچر سے پورے طور پر واقف ہوں اس مضمون میں تلیگو ادب کی پوری تاریخ اور اس کے ارتقائی مدارج سے بحث نہیں کی گئی ہے۔ یہاں نئے تلیگو ادب یعنی محض ان تبدیلیوں کا جو انیسویں صدی کے اواخر سے تلیگو ادب میں شروع ہو چکی تھیں۔ سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔ موجودہ تلیگو ادب کے بنیادی عناصر کو اس طور سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو داں عوام کے ذہن میں ان سے متعلق ایک واضح خاکہ ابھر سکے اور وہ ان تبدیلیوں کی رفتار اور نوعیت کو سمجھ سکیں جو گزشتہ ستر اسی برسوں کے دوران میں تلیگو ادب میں رونما ہوتی رہی ہیں۔

ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادب کی طرح موجودہ تلیگو ادب کی ترقی کا دور بھی ۱۸۵۷ء کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ ہندوستان کی جاگیری معشیت اور مغرب کے صنعتی نظام کے تصادم کے نتیجہ کے طور پر ایک طرف یہاں کے سماجی اور معاشی ڈھانچہ میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں تو دوسری طرف اس کا اثر ادب اور دوسرے علوم و فنون کے مروجہ معیار پر بھی گہرا پڑا۔ دور رس نگاہوں نے مغربی ادب کا مطالعہ کیا تو انہیں اپنے ادب کی کم مائیگی اور افلاس کا بری طرح احساس ہوا۔

سر سید اور ان کے رفقا کار کی جو حیثیت اردو ادب میں ہے تقریباً وہی حیثیت تلیگو ادب میں "راؤ بہادر ویرسالنگم" کو حاصل ہے۔ انہیں نئے تلیگو ادب کا امام تسلیم کیا جاتا ہے۔ انہوں نے ادب کا وسیع مطالعہ کیا تھا اور اگرچہ ان کی تعلیم و تربیت قدیم ڈھنگ پر اور قدامت پرستی کے ماحول میں ہوئی تھی، ان کی فطری ذہانت نے انگریزی ادب کی خوبیوں کو آسانی کے ساتھ محسوس کر لیا اور وہ انگریزی ادب کے طرز کو تلیگو ادب میں رائج کرنے کی خواہش کو نہ روک سکے۔ اس طرح تلیگو زبان کا پہلا ناول "راجہ شیکھر چریترمو" Raja Shekhar Charitramu) آپ ہی کے قلم سے نکلا۔ یہ ناول گولڈ اسمتھ کے (Vicar of Wakefield) کے طرز پر لکھا گیا تھا۔ یہ انگریزی سے بالکل ترجمہ تو نہیں لیکن موضوع وہیں سے لیا گیا ہے۔ اس ناول کا ترجمہ انگریزی میں (Fortune's Wheel) کے نام سے ہو چکا ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہندوستانی عورتوں کو سماجی پستی اور مذہب کے ظالمانہ رسوم و قیود سے آزاد کرنے کے لئے راجہ رام موہن رائے کی کوششیں کامیاب ہونی شروع ہو گئی تھیں اور بنگال میں "برہمو سماج" کی تحریک زور و شور سے چل پڑی تھی۔ کٹر مذہبی ماحول میں تربیت پانے کے باوجود "ویرسالنگم" برہمو سماج کی تحریک کی طرف کھنچ گئے۔ وہ برہمو ہو گئے اور سماجی اصلاح کا کام انہوں نے

بہت ہی جوش اور ولولہ کے ساتھ شروع کر دیا - سر سید کی طرح سماجی اصلاح سے متعلق شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو جس پر انہوں نے خامہ فرسائی نہ کی ہو - انہوں نے تعلیم نسواں اور عقد بیوگان کی پُر زور حمایت کی - مذہبی توہمات اور بیہودہ رسم و رواج کے خلاف آواز بلند کی اور سائنٹفک تعلیم کی حمایت میں بہت سے مضامین لکھے - انہوں نے ایسے رسالے نکالے جن میں گھر کی عورتوں کے لئے صحت اور ملکی و غیر ملکی واقعات سے متعلق بے حد مفید مضامین شائع ہوتے تھے - وہ صحیح معنوں میں ایک صاحبِ علم اور شائستہ شخصیت کے مالک تھے - اپنے مزاحیہ اور طنزیہ مضامین میں بھی وہ شاید ہی کبھی بھونڈے مذاق اور غیر شائستہ تمسخر کو راہ دیتے تھے - ان کی تخلیقات اپنے ادبی حُسن کی بنا پر آج بھی پڑھے جانے اور دوسری زبانوں میں ترجمہ کئے جانے کی مستحق ہیں - "ویر سالنگم" نے ہی پہلی بار تلیگو ادب کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی اور حالی کی طرح پہلی سوانح حیات بھی اُن کی ہی کوششوں کا نتیجہ تھی - اُنہوں نے بہت سے افسانے اور بچوں کے لئے قصے بھی لکھے - وہ ادبی مسائل پر اپنے ہمعصروں سے بحث و مباحثہ بھی کرتے رہے - اُنہوں نے تلیگو میں سنسکرت ڈراموں کا ترجمہ کیا اور قواعد اور شعریات سے متعلق بھی بہت کچھ لکھا - تلیگو ادب کی نشاۃ ثانیہ میں انہیں بہت ہی بلند مقام حاصل ہے - قدامت پرستوں کا نقطۂ نظر ان کی تخلیقات کے بارے میں جو بھی رہا ہو - عوام میں انہیں بے حد مقبولیت حاصل رہی -

ویر سالنگم کی طرح پنڈت چلاکا مارتی لکشمی نرسمہام نے بھی اپنی بے شمار تخلیقات سے تلیگو ادب کو مالا مال کیا - انہوں نے بہت سے ڈرامے، انشائیے، ناول، افسانے اور ممتاز شخصیتوں کی زندگی کے حالات لکھے - سارے اندھرا میں ایک ڈرامہ نویس کی حیثیت سے انہیں بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی -

نئے تلیگو ادب کی ارتقا میں "بھاوکوتیوم" کی تحریک کو خاص اہمیت حاصل ہے - یہ ایک ادبی تحریک تھی جس کا دائرہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے محض شاعری تک محدود تھا - اس تحریک کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ چند نوجوان شعرا نے کیٹس اور شیلے کی شاعری سے متاثر ہو کر ان کے طرز پر نظمیں کہنی شروع کیں - ان نظموں کی تکنیک انداز بیان اور ہئیت تو انگریزی شاعری کی ہوتی تھی لیکن موضوع خالصتاً ہندوستانی ہوتا تھا - اس طرح کی نظمیں تلیگو ادب میں بالکل نئی تھیں اور قدامت پرست نقادوں نے انہیں پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا - ان نوجوان شعراء سے پہلے اس طرز کی نظمیں وزینا گرام کے "گروزادا اپا راؤ" لکھ چکے تھے اور اس بنا پر وہ ان کے پیش رَو تھے لیکن وہ چند ہی نظمیں کہہ کر خاموش ہو گئے اور اس لئے نوجوان شعرا کا یہ گروہ ہی "بھاوکوآئم" کے مدرسۂ شاعری کا بانی قرار پایا - اس گروہ کے شعرا میں "رایا پرولو سبا راؤ" جو آج کل عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں شعبۂ تلیگو کے صدر ہیں - سب سے پہلے مشہور ہوئے - "ابوری راما کرشنا راؤ" جو ان دنوں اندھرا یونی ورسٹی میں لیکچرر ہیں اور "باسوا راجو اپا راؤ" کا تعلق بھی اسی گروہ سے ہے - ان شعرا کی نظموں میں شاعری کے مروجہ اور بندھے ٹکے اصولوں سے انحراف کیا گیا تھا اس لئے شروع میں ان کی حد درجہ مخالفت کی گئی لیکن نوجوان شعرا اس سے بد دل اور مایوس نہ ہوئے کیونکہ انہیں بہت سی ممتاز شخصیتوں کی جنہوں نے مغربی علم و ادب کا مطالعہ کیا تھا - ہمت افزائی بھی حاصل ہوتی رہی - آہستہ آہستہ اس گروہ میں بہت سے شعرا شامل ہونے گئے -

"بھاوکوائیوم" کا ترجمہ لیریکل (Lyrical) شاعری کہا جا سکتا ہے - قدیم تلیگو شاعری کے مقابلہ میں یہ زیادہ داخلی موضوع اور بحر کے اعتبار سے زیادہ آزاد، مختصر اور زیادہ رومانی ہے - اس میں شک نہیں کہ قدیم کلاسیکی شاعری میں بھی لیریکل ٹکڑے ہوا کرتے تھے لیکن اکثر نظموں کے موضوع میں ایسے عناصر کی کمی ہوتی تھی جو شاعر کے اپنے تجربات و مشاہدات کا براہ راست نتیجہ ہوں - موضوع اور اس کی قسمیں مقرر کر دی گئی تھیں اور عام طور سے شعرا ان ہی کے مطابق نظمیں کہتے تھے ان کے نزدیک شعری اصول و قواعد ہی فیضان (Inspiration) کا اصل ذریعہ تھے - مجموعی طور پر قدیم تلیگو شعرا اپنے عہد کی زندگی اور ماحول سے متاثر ہونے کی کچھ زیادہ کوشش نہیں کرتے تھے - سیاسی و سماجی واقعات اُن کی تخلیقی قوت پر اثر انداز ہونے سے قاصر رہتے تھے - سماجی ناانصافی و معاشی استحصال کا انہیں کوئی احساس نہ تھا - یہاں تک کہ قومی احساسات بھی اُن کے دلوں کو کبھی بیدار نہ کرتے تھے - یہ سوچنا غلط ہے کہ "بھاوکوائیوم

کی تحریک قدیم کلاسیکی شاعری کی سرے سے مخالف تھی ۔ شاعری کے چند مخصوص قواعد سے انحراف کرنے اور نئی بحروں کے اختیار کرنے کے باوجود اس گروہ کے شعرا کلاسیکی شاعری کے یکسر مخالف نہ تھے ۔ بہت سے شعرا نے اپنی نظموں میں قدیم بحروں کو کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے ۔ یہ تحریک دراصل رومانی شاعری کی تحریک تھی جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے انگلستان کی رومانی شاعری کی تحریک سے بہت ملتی جلتی ہے اور جس کا مقصد تھا کہ تلیگو شاعری کو انسانی احساسات اور فطری جذبات سے قریب تر کیا جائے اور اسے صدیوں کے بندھے ٹکے اصولوں کی آمریت سے نجات دلائی جائے۔ اس نے شاعری میں شدتِ احساس اور اس کے بھرپور طریقِ اظہار پر بہت زیادہ زور دیا ۔ بدقسمتی سے اس گروہ کے بیشتر شعرا وسیع مطالعہ سے محروم ہیں ۔ دنیا کے اہم واقعات اور خیالات و نظریات کی مختلف و متضاد لہروں سے بھی وہ پورے طور پر واقف نہیں ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نقطۂ نظر میں بہت زیادہ وسعت نہیں ۔ ان کے تصورات کی دنیا محدود ہے اور ان کے موضوع کا سرچشمہ بہت جلد خشک ہو جاتا ہے ۔ لیکن بعض شعرا نے اس طرز میں بہت کامیاب اور اچھی نظمیں کہی ہیں اور انہیں ملک میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی ہے ۔ پروفیسر "سُبّا راؤ" بہت سی حسین نظموں کے خالق ہیں اور ان کے مداحین کا حلقہ کافی وسیع ہے ۔ اس تحریک کے موجودہ نوجوان شعرا میں "دیو ولاپالی کرشنا شاستری" سب سے زیادہ مقبول ہیں ۔ انہوں نے بہت سے شعراء کو متاثر کیا ہے اور ان کی تقلید سب سے زیادہ کی گئی ہے لیکن بھاو کوِتوَم کی بہت سی برائیوں سے وہ بھی آزاد نہیں ہیں ۔ یہاں تمام شعراء اور ان کی تخلیقات کا تفصیلی جائزہ لینا ممکن نہیں ۔ اس گروہ کے دوسرے شعراء میں "اداوی باپیراجو" "کے ۔ دی سُبّا راؤ" "نرائن بابو" ۔ "نرا سمہا شاستری" ۔ "پی ۔ وینکٹ رتنم" اور "جی ۔ وینکٹ اچالم" کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ۔ اس گروہ میں خواتین شعرا بھی ہیں جن میں شری متی "ڈی ۔ وسوا سندرم" ۔ "سی ۔ بنگا راما" ۔ "سودامنی" اور "بی ۔ کا نکاما" بہت زیادہ مشہور ہیں ۔

یورپ کی انحطاط پسند شاعری کی طرح "بھاو کوِتوَم" کی تحریک بھی پچیس تیس سال کے بعد قنوطیت' تصور پرستی اور سمبولزم کا شکار ہو کر رہ گئی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے ذہین اور باکمال شعرا خود کو اس گروہ سے وابستہ کرنے میں جھجک محسوس کرتے ہیں ۔

اس گروہ کے علاوہ بہت سے دوسرے شعرا ہیں جنہوں نے اپنی تخلیقات سے تلیگو شاعری کو نئی آب و تاب بخشی ہے ۔ اس سلسلے میں "پنگالی لکشمی کانتم" اور کاتوری وینکیٹوارا راؤ" کے نام سب سے پہلے لیے جاتے ہیں ۔ یہ دونوں اپنی نظمیں مشترکہ نام سے شائع کراتے ہیں ۔ ان کی زبان بے حد سادہ' خوبصورت اور خیالات بہت ہی واضح' صاف اور غیر مبہم ہوتے ہیں ۔

قدامت پرست اور نئے ناقدین ـــــ ان دونوں ہی نے ان کی نظموں کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا ہے ۔ موجودہ شعرا میں "مسٹر جوشوا" ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں ۔ یہ عیسائی ہیں اور ان کی زبان بے حد پیاری ہے ۔ ان کی نظموں میں غیر ضروری الفاظ بالکل نہیں پائے جاتے اور حُسنِ معنیٰ ان کی نمایاں خصوصیت ہے ۔ انہوں نے بہت سی نظمیں کہی ہیں ۔ "فردوسی" ان کی بہت ہی مشہور نظم ہے ۔ یہاں جے پور کے مہاراج ڈاکٹر وکرم دیو ورما کا نام بھی خصوصیت سے لیے جانے کے قابل ہے ۔ یہ سنسکرت' تلیگو اور اڑیا کے بہت بڑے عالم ہیں اور ان تینوں زبانوں میں انہوں نے نظمیں کہی ہیں ۔ تلیگو زبان اور ادب کے سرپرست ہونے کی حیثیت سے بھی اندھرا میں ان کی بہت زیادہ شہرت ہے ۔

نئے تلیگو ادب میں ناول اور مختصر افسانوں نے بھی نمایاں ترقی کی ہے میں لکھ چکا ہوں کہ "ویرسا لنگم" نے تلیگو میں پہلا ناول لکھا تھا ۔ "چلاکاماری لکشمی نرا سمہام" نے بھی بہت سے ناول لکھے ہیں ۔ ان دونوں کے ناول تاریخی اور سماجی ضرورتوں کے تحت لکھے گئے ہیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ ان میں فنی لوازمات کا بھی پورا پورا خیال رکھا گیا ہے ۔ قدیم تاریخی ناولوں میں عام طور سے اساطیری اور غیر فطری عناصر کی شمولیت ضروری سمجھی جاتی تھی لیکن تلیگو ناول سے یہ روایت اب ختم ہو چکی ہے ۔

سماجی مسائل سے متعلق "ویرسا لنگم" کا "راجہ شیکھر چرتر" "چلاکاماری لکشمی نرا سمہام" کا "ہمالتا" اور "کارپورا منجری" "کیٹو راپو وینکٹ شاستری" کا "لکشمی پرسادامو" اور "راج لکشمی" اور "وشوا ناتھا ستیا نرائن" کا "چیلیا لی کانا" خصوصی اہمیت کے مستحق ہیں ۔ جاسوسی ناولوں کی تلیگو میں بھرمار ہے لیکن تفریح سے زیادہ ان

کی کوئی اہمیت نہیں۔ ہندوستان کی تحریک آزادی اور انڈین نیشنل کانگریس سے متعلق بھی تلیگو میں بہت سے ناول لکھے گئے ہیں۔ ان میں "اُنا دا لکشمی نرائن" کا ناول "مالا پلّے" سب سے زیادہ مشہور ہے۔ انگریزی حکومت نے اس ناول کو ضبط کر لیا تھا لیکن اب یہ پابندی اٹھالی گئی ہے۔

تلیگو میں مختصر افسانے سب سے پہلے "گروزادا اپراؤ" نے لکھے۔ "گدی پاتی وینکٹ اچالم"۔ چنتا دکشی تولو" اور "گروزادا اپراؤ" اس وقت تلیگو کے صف اول کے افسانہ نگار ہیں۔ ان کے علاوہ "ایم۔ مرائن شاستری"۔ "اِس سبرامانیا شاستری" اور "اے۔ باپی راجو" کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔

یہ تمام افسانہ نگار مغربی ادیبوں سے متاثر ہیں لیکن انہوں نے بہت ہی خوبصورتی اور فنی چابکدستی کے ساتھ اندھرا کی زندگی کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔

ادبی تنقید پر بھی تلیگو زبان میں بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور آہستہ آہستہ تنقیدی ادب کے سرمائے میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

ایک علاقائی زبان کا ادب ہونے کے باوجود تلیگو ادب اپنے تاریخی ارتقاء کی کمی کو تیزی کے ساتھ پورا کر رہا ہے۔ روز بروز اس کا دامن بلند پایہ تخلیقات سے بھرتا جا رہا ہے اور وہ دن دُور نہیں جب تلیگو ادب ہندوستان ہی نہیں دنیا کے ادب میں ایک اہم مقام حاصل کر لے گا۔

ابرِ رَواں

فطرت کی سچائی کو حاصل نہ کر سکنے پر
ایک آوارہ دل و دماغ کے ساتھ میں محوِ سفر ہوں
پریشانی کے عالم میں میں اِدھر اُدھر گھوم رہا ہوں
لیکن اے ابرِ رواں! تو کس لئے آوارہ ہے
تجھے اپنی عظمت اور قوّت کا بھی احساس نہیں
شاید تو کسی وہم میں مبتلا ہے
تجھ میں تو بے انتہا قوتیں خوابیدہ ہیں

کیا تو حیرت انگیز آسانی کے ساتھ
اپنی تابناک تاریکی کا مظاہرہ نہیں کرتا
اور آفتاب کو اپنے پردے میں نہیں چھپا لیتا
وہی آفتاب جس کی تین دُنیائیں پرستش کرتی ہیں
درحقیقت تجھے اعلیٰ ترین تجلّی بخشی گئی ہے
لیکن تو اپنی عظمت اور قوّت سے بے خبر ہے
شاید تو کسی وہم میں مبتلا ہے

بعض دفعہ تو اپنی شدید قوت کے ساتھ
طوفانی لہریں چھوڑتا ہے
اور بھیانک توپ کی طرح گرجتا ہے
اور یہ جو مسلسل بارش زمین پر ہوتی ہے
کیا تیری عظمت اور بلندی کا ثبوت نہیں
درحقیقت تجھے نہایت اعلیٰ تجلّی بخشی گئی ہے
بعض دفعہ کھیل کے انداز میں
شام کے سائے میں تو چمکتا ہے
تو جنّت کی گلیوں میں ناچتا ہے
مسرت اور خوشی کے مارے
کیا یہ خوشی اور مسرت
تیری دولت اور تیری عظمت نہیں ہے
اس کے باوجود اے ابرِ رواں تو کیوں آوارہ ہے۔

تلوگو (سری رنگم سری نواسا راؤ)

ساغر نظامی

غزل

نہ کشتی ہے نہ فکرِ ناخدا ہے دلِ طوفاں طلب کا آسرا ہے

ہمیں تو خوئے تسلیم و رضا ہے ترے ذوقِ کرم کو کیا ہوا ہے

فروغِ ماہ و انجم اے صبا کیا یہ میرے ماہِ نو کی خاکِ پا ہے

فسونِ حسن کافر پوچھنا کیا لطافت ہے نزاکت ہے ادا ہے

نہیں مَیں کشتۂ آوازِ تنہا زمانہ حلقۂ دامِ صدا ہے

الٰہی خیر ناموسِ وفا کی انہیں بھی فکرِ ناموسِ وفا ہے

کہیں الفاظ سے رُکتے ہیں طوفاں دُعا بھی اک فسونِ ناخدا ہے

سبکسارانِ ساحل جانتے ہیں دلِ ساحل میں کیا طوفاں بپا ہے

نئے طوق و سلاسل ڈھل رہے ہیں نئی آزادیوں کی ابتدا ہے

نہیں یہ نغمۂ شورِ سلاسل بہارِ نو کے قدموں کی صدا ہے

زمانے کی غلامی ہم نفس کیوں؟ زمانہ آدمی کی خاکِ پا ہے

شکایت ہائے سوزِ تشنگی کیوں؟
ابھی ساغر درِ مے خانہ وا ہے

روش صدیقی

نذرِ غالب

عمرِ ابد سے خضر کو بیزار دیکھ کر
خوش ہوں فسونِ نرگسِ بیمار دیکھ کر

کیا جلوہ گاہِ حسرتِ نظارہ ہے بہشت؟
حیراں ہوں صورتِ در و دیوار دیکھ کر

بادہ بہ قدرِ ظرف سہی رسمِ میکدہ
ساقی! نزاکتِ دلِ مَیخوار دیکھ کر

اب جستجوئے دوست کی منزل کہیں بھی ہو
ہم چل پڑے ہیں راہ کو دشوار دیکھ کر

شایانِ جُرمِ عشق نہ تھی قیدِ زندگی
جی شاد ہوگیا رسن و دار دیکھ کر

اب اس سے کیا غرض یہ حرم ہے کہ دَیر ہے
بیٹھے ہیں ہم تو سایۂ دیوار دیکھ کر

اب حشر تک حجاب نشیں ہے نگاہِ شوق
چھپنا تھا رنگِ حسرتِ دیدار دیکھ کر

رازِ فروغِ آخرِ شب کچھ نہ کھل سکا
کیوں خوش ہے شمع صبح کے آثار دیکھ کر

سازِ غزل اُٹھا ہی لیا ہم نے اے روشؔ
اُس چشمِ نیم باز کا اصرار دیکھ کر

اظہر علی فاروقی

پنجابی کا ایک منظوم رومان

پنجاب کی پوربی سرحد ہمارے صوبے کی پچھمی حد میں سمو گئی ہے۔ پنجابی ہمارے پڑوسی ہیں اور ہم اُن کے اور آج تو پنجاب ہم سے اتنا قریب ہو گیا ہے کہ اپنے گھریلو جیون میں پنجاب ہی پنجاب نظر آنے لگا ہے ہمارے گھروں میں پنجابی کپڑوں نے گھر کر لیا ہے۔ لین دین اور بیوپار میں پنجابی ہمارے شریک ہیں اور ہم ان کے سلجھے دار۔ پنجاب اور اردو دو مترادف لفظ ہیں۔ پنجابی اردو پڑھتے بھی ہیں اور لکھتے بھی۔ مگر سچ پوچھئے تو پنجاب کی مادری زبان پنجابی ہے۔ رانجھا نے اپنی محبت کا اظہار پنجابی لفظوں میں کیا تھا۔ ہیر نے اپنی آہوں کو پنجابی کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ پنجابی ایک ادبی زبان ہے جس میں رومان بھی ہے اور تصوّف بھی جہاں "ماہیا" ہے اور ٹپّہ بھی۔ جہاں سنجیدگی ہے اور ظرافت بھی۔ بلّھے شاہ اور وارث شاہ بھی اور امرتا پریتم بھی۔

ایسی حالت میں اگر ہم اپنے ہمسایوں کی زبان سے بے اعتنائی کرتے ہیں روس، انگلینڈ اور امریکی زبانوں سے دلچسپی رکھتے ہیں، مگر پنجابی کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے تو اگر ہماری یہ بد ذوقی نہیں تو ایک اخلاقی ادبی کمزوری ضرور ہے۔ اگر پنجابی ادب کا مطالعہ کریں تو صرف یہی نہیں ہوگا کہ ہم ایک دوسرے کی زبان کے چند لفظ جان جائیں گے اور اگر مُنّی جیسی ننھی بچی ادھ کچلے بولوں میں پوچھے کی "تسی چلے او؟" تو ہم جواب دے سکیں گے "ہیں چلیاں" بلکہ ثقافتی حیثیت سے ایک دوسرے سے قریب تر ہو جائیں گے۔ ہمیں اس بات کا اندازہ ہو سکے گا کہ شلوار اور گھٹنے کے اختلاف کے باوجود ہم ثقافتی اور جذباتی نقطۂ نظر سے ایک دوسرے سے کس درجہ اتحاد رکھتے ہیں۔ ہیر رانجھا اور مرزا صاحباں مسافتی بعد کے باوجود شیریں فرہاد اور لیلیٰ مجنوں سے کس درجہ مماثلت رکھتے ہیں۔ آج کی صحبت میں ہم ایک ایسے ہی منظوم رومان — سسّی پنّوں کا تعارف کرانے کی کوشش کریں گے۔

پنجابی زبان کا منظوم رومان حقیقت ہے یا واقعہ؟ اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ اس منظوم افسانے کے واقعات کچھ اس درجہ غیر معمولی طور پر وجود میں آتے ہیں اور پلاٹ اس طرح ارتقائی منزلیں طے کرتا ہے کہ اس پر محض تخیلی ہونے کا نہ دھوکا بلکہ یقین ہو جاتا ہے۔ ابتدائی افسانوں کے مانند اس کے پلاٹ کی بنیادیں تلاش و جستجو اور غائبانہ عشق پر مبنی ہیں۔ فوق فطری عناصر بھی اپنا کام کرتے ہیں۔ قاری کے توہم پرستانہ عقائد کی تقسیم بھی ہو جاتی ہے۔ شاعر نے ان سب باتوں کو بڑی خوبصورتی اور چابک دستی سے باندھا ہے کہ قاری کے ذہن پر کہیں بھی شک و شبہ کا پرتو بھی نہیں پڑتا اور وہ واقعات کو بالکل حقیقی سمجھ کر دلچسپی لیتا صفحے پر صفحہ الٹتا چلا جاتا ہے۔ شاعر نے واقعات کی لڑیاں اس درجہ فراست اور زیرکی سے ملائی ہیں کہ وہ فضائے آسمانی میں معلّق ہونے کے باوجود ارضی معلوم ہوتا ہے۔

سسّی پنّوں کے کردار اور واقعات کے فرضی ہونے کا یقین اس وقت اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ دوسرے فرضی رومانی افسانوں کے ساتھ اس کا پلاٹ کس درجہ مماثلت رکھتا ہے۔ فسانۂ عجائب اور پدماوت کی طرح اس کا واقعاتی پلاٹ بھی دو حصّوں میں منقسم ہے۔ شہزادہ جان عالم اور راجا رتن سین ہیرامن توتے سے انجمن آرا اور پدماوتی کے حسن و جمال کی داستان سُن کر غائبانہ عاشق ہو جاتے ہیں اور جستجو میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ سسی جب جوان ہوتی ہے اور اس کی رضائی ماں ایک دھوبن اس کے لیے بَر کی تلاش میں متفکر نظر آتی ہے وہ نجومی پنڈت سے پوچھتی ہے تو پنڈت جواب دیتا ہے گھبرانے کی کوئی بات نہیں بہت جلد سسی کی شادی ایک حسین جمیل گبرو جوان

بلوچ پنّوں سے ہو گی۔ سسّی اپنے نادیدہ بَر کے عشق میں مبتلا ہو جاتی ہے اور
جو کام وہاں ہیرا من توتے نے کیا، یہاں نجومی پنڈت ... کرتا ہے۔ سسّی
بے چینی سے ان گھڑیوں کا انتظار کرتی ہے کہ کب اس کا بَر پنّوں اس سے
ملے گا۔ ایک رات وہ اُسے خواب میں بھی دیکھ لیتی ہے اور اُسے یہ بھی
معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ دھوبن کی لڑکی نہیں ہے، بلکہ اس کے اصلی
ماں باپ یہاں سے بہت دُور بڑے امیر کبیر لوگ ہیں۔ چنانچہ وہ چھٹّی
لکھتی ہے اور آخرکار وہاں پہنچ جاتی ہے۔ ماں باپ خوش ہوتے ہیں مگر
نگر توہم پرستی اور نجومیوں کی پیشن گوئی میں اعتقاد باپ کو سسّی سے ملنے
سے مانع ہوتا ہے اور اُسے ڈر ہے کہ اگر اس نے سسّی کو دیکھ لیا تو وہ
اندھا ہو جائے گا، اس لئے سسّی کے لئے وہ الگ ایک نہایت دلکش
محل اور خوبصورت باغ تیار کراتا ہے اور سسّی وہاں اپنے محبوب کے
انتظار میں دن گزارتی ہے۔ بلوچ قافلے تجارتی اغراض سے آتے ہیں
اور چلے جاتے ہیں۔ سسّی اپنے پنّوں کی راہ دیکھتی ہی رہتی ہے۔ آخرکار
ایک دن پنّوں بلوچ سسّی کے باغ میں نادانستہ طور پر داخل ہوتا ہے
اور اس کے پلنگ پر خستگی دور کرنے کے لئے لیٹ کر سو جاتا ہے۔ یہ
واقعہ ہیر رانجھے سے جس قدر ملتا جلتا ہے، اسی قدر اس سے زیادہ
غیر فطری طور پر وجود میں آتا ہے۔ سسّی برہم ہوتی ہے اور اسے سزا
دینا چاہتی ہے، مگر اس کی دبی ہوئی محبّت معجزہ دکھاتی ہے اور اس کا ہاتھ
نہیں اٹھتا، آخر جب اُسے معلوم ہوتا ہے کہ یہی پنّوں ہے تو اس کی برہمی
والہانہ مسرت میں بدل جاتی ہے اور اسے اپنی تقدیر کا یہ ایک ادنیٰ
کرشمہ معلوم ہوتا ہے۔ شاعر بڑی ہوشیاری اور چابک دستی سے
تقدیر کے ان کرشموں کی لڑیاں آئندہ ہونے والے واقعات کے سلسلوں
سے ملا دیتا ہے اور قاری کے ذہن نشین کر دیتا ہے۔

"مینہ اُٹھیا سُکّے بدلوں، بھر بھر چلی بیل" گویا یہ کوئی تعجب کی
بات نہیں ہے یہ تو ایسا ہی ہے جیسے خداوند کریم سُوکھے بادلوں سے
مینہ برسائے اور بیل پھیلے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

سسّی اپنی رضاعی ماں دھوبن کو بتاتی ہے اور وہ خوشی خوشی
اس کا ہاتھ پنّوں کے ہاتھ میں دے دیتی ہے اور اس طرح دو بچھڑے
مل جاتے ہیں۔ نشۂ وصل کی سرشاری میں سسّی اس طرح دعا کرتی ہے:

کرے دعا ایں سسّی ربا! دیہوں نہ چاڑھیں جھب
میں رَج گل سوآں لگ یار دے ماں دیہوں چاڑھیں جھب

(سسّی دعائیں کرتی ہے کہ اے رب! سورج کو جلدی مت نکالنا
میں اچھی طرح یار کے گلے سے لگ کر سوؤں گی۔ اے خدا آج سورج کو نہ نکالنا)

وصال کے بعد والا حصّہ پدماوت میں راگھو چیتن پنڈت اور فسانہ
عجائب میں وزیر زادے کے ہاتھوں پلٹا کھاتا ہے، مگر یہاں نہ پنڈت
ہے اور نہ وزیر زادہ، بلکہ جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ تقدیر کے ہاتھوں۔
ایک سنجوگ اور شدنی امر۔ یعنی پنّوں کا بڑا بھائی وارد ہوتا ہے۔ سسّی
اور دھوبن اس کی خاطر مدارات اور آؤ بھگت میں بڑی تن دہی سے
کام لیتی ہیں۔ مگر جب وہ حرفِ رخصت زبان پر لاتا ہے اور پنّوں کو اپنے
ساتھ لے جانے کا خیال ظاہر کرتا ہے تو سب کے ہاتھوں کے توتے[1] اڑ
جاتے ہیں۔ پنّوں انکار کرتا ہے، سسّی خوشامد کرتی ہے۔ دھوبن اپنے
آنسوؤں کی چادر پھیلا دیتی ہے اور پنّوں کے بھائی کو اس ارادے سے
باز رکھنے کی بھیک مانگتی ہے، لیکن وہ کچھ سننا نہیں چاہتا، آخر اُسے
ایک ترکیب سوجھتی ہے وہ پنّوں کو شراب پلا کر مدہوش کر دیتا ہے اور
جب رات کو سب لوگ سو جاتے ہیں تو اُسے اُٹھا کر اپنے ساتھ لے جاتا
ہے۔ سسّی جب جاگتی ہے اور پنّوں کو غائب پاتی ہے، تو اس کے پیروں
تلے کی زمین نکل جاتی ہے وہ روتی ہے، گڑگڑاتی ہے، چیختی ہے، چلاتی
ہے اور اس کی حالت وہی ہوتی ہے جو پھول کھو جانے کے بعد بکاولی کی
ہوئی تھی۔ وہ اپنی ماں سے پوچھتی ہے اب کیا کیا جائے۔ ماں سمجھاتی
ہے پردیسیوں سے محبّت کرنے کا انجام یہی ہے۔ تم خود ہی جال میں
پھنسی ہو بتاؤ اب میں کیا کروں۔ سسّی جل بھن کر جواب دیتی ہے کاش
تو مجھے جنم دینے والی ماں ہوتی تو ایسا کبھی نہ کہتی اور طنزاً کہتی ہے۔

ماں نی بول اُدھرے بول کے   مرا عاجز جیو نہ ساڑ
آناں جنھاں زخم عشق دا   تنھاں عشق دی مار

(اے ماں طعنے دے دے کر میرے عاجز دل کو نہ ستا، کیا تو نہیں
جانتی جن کو عشق کا زخم ہے، ان پر عشق کی مار ہے ....)

سسّی روتی کلکھوتی پنّوں کی تلاش میں نکل بھاگی۔ سب کہیں
تلاش کیا لیکن اس کا پتہ کہیں نہ لگا۔ آخرکار اس طرح تڑپ تڑپ کر

[1] طوطے؟

اس نے جان دے دی اور ساری کائنات اس کے ماتم میں شریک ہوئی۔

نیچر کو انسانی زندگی میں شریک کرنا شاعر کی جذبۂ فطرت پرستی پر دلیل ہے اور اس نے بے انتہا مبالغے سے کام لیا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے کہ سسی کا غم! کون تھا جو اس میں شریک نہ ہوا ہو۔ باگھ، چیتے۔ گیدڑ لومڑیاں۔ پہاڑے۔ چیتے۔ پلو۔ مور۔ جھاگری ماتم کرتے ہیں۔ ہرنیوں کا دودھ خشک ہو گیا۔ مرغیوں نے بولنا اور مرغوں نے ککڑوں کوں کرنا بند کر دیا۔

دوسری طرف پنّو جب ہوش میں آتا ہے تو وہ سسی کے بغیر ایک لمحہ چین سے نہ رہ سکا اور وہ بھی اس کی تلاش میں نکلا آخر ایک قبرستان پر پہنچا۔ فقیروں اور آجڑیوں سے پوچھا بھائی! یہ کس کی قبر ہے۔ وہ جواب دیتے ہیں۔ ایک بلند قامت۔ دُبلی پتلی نازک حسین خوبصورت لڑکی کی ہے جس کا نام سسی تھا اور جام کی لڑکی تھی۔ فراق یار میں دیوانی ہو کر جان دے دی۔ مرتے دم تک پنّو پنّو کا نام زبان پر تھا۔ پنّو کی نظروں میں دنیا تاریک ہو گئی تفریع و زاری کی اور اپنی محبوبہ کے بغیر جینا حرام سمجھا۔

"ربّا! اساں جنّے آپو آپنے دو جسماں یک جان
جے یک رہے بن یار دے تاں خطا دوہاں ایمان"

(اے ربّ! ہم اپنے اپنے جسم دو رکھتے تھے، مگر جان ایک تھی (ایسی حالت میں) اگر بغیر یار کے ایک رہ جائے تو اس کے ایمان میں خلل ہے)

خدا نے ایسا کیا کہ قبر پھٹی اور پنّو اس میں سما گیا۔

یہ ہیں واقعات جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قصہ محض فرضی ہے جس کے کردار شطرنج کے مہروں کے مانند ایک خانے سے دوسرے خانے میں پہنچتے رہتے ہیں۔ مگر یہ انسانی مہرے تقدیر کے ہاتھوں میں ہیں۔ تقدیر انہیں چڑھاتی ہے، اُچھالتی ہے، اُٹھاتی ہے اور گرا دیتی ہے

ڈاکٹر گوپال سنگھ نے پنجابی ساہتیہ کے اتہاس میں ڈاکٹر موہن سنگھ کا قول نقل کیا ہے ان کا خیال ہے کہ اس رومان کے کردار اصلی ہیں۔ سسی دراصل ششی (शशी) ہے اور اصل کردار بھی چندر یا چندرا ہے۔ پنّو کا اصلی نام پورن ہے اس کے خاندان کے لوگ آج تک ریاست بہاولپور میں رہتے ہیں۔ لیکن یہ خیال کچھ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا

یہ منظوم رومان حافظ برخوردار کی فکر کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے مغل شاہنشاہ شاہجہان اور اورنگ زیب عالمگیر دونوں بادشاہوں کا زمانہ پایا اور غالباً سسی پنّو اوائل سترھویں صدی کی تصنیف ہے۔ حافظ برخوردار پنڈ مسلمانی نامی ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ عربی اور فارسی کی تعلیم اچھی خاصی پائی تھی اور فارسی زبان پر کافی دسترس بھی تھا نجوم سے بھی دلچسپی تھی۔ اس کے علاوہ یوسف زلیخا، مرزا صاحباں دوسرے رومانی منظوم قصے ان کی تصنیفات سے ہیں۔

اس منظوم کارنامے کی تشکیل مثنوی جیسی ہے۔ زبان ٹھیٹھ پنجابی ہے اگرچہ فارسی عربی الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اسلوب نہایت سادہ مگر جذباتی اور جوشیلا ہے۔ صنائع لفظی و معنوی کی بھی رعایت برتی گئی ہے خصوصاً سد ودے (सरदवैय) سے بہت کام لیا گیا ہے یہ صنعت مراعاۃ النظیر اور ایہام دونوں ہی پر مشتمل ہے۔ پنجابی دربار ستمبر ۱۹۲۹ء میں قاضی فضل حق نے حافظ برخوردار کے اسلوب نگارش پر گہری نظر ڈالی ہے اور وہ بھی اس کی محاکات کشی کا اعتراف کرتے ہیں۔ اگرچہ میر حسن اور دیا شنکر نسیم کے مانند تو نہیں پھر بھی بیانات اور کیفیات کی تصویر کشی میں حافظ برخوردار کو کافی مہارت ہے۔ سسی شیر خوار بچی ہے۔ صندوق میں بند بہتے بہتے ایک دھوبی کے گھاٹ پر پہنچتی ہے۔ دھوبی اس کو نکالتا ہے اور جب کھول کر دیکھتا ہے تو اس کی زبان سے بے ساختہ نکل جاتا ہے

اہدی ڈٹھی صورت دھوبیاں سُدھ نہ رہی یا کا

(دھوبیوں نے اس کی صورت دیکھی تو کسی کو سدھ نہ رہی)

"ربّا! ارضوں اُتری پُتلیا یا یہ حُور پری"

(اے رب زمین پر یہ پُتلی اتری ہے یا کوئی حُور یا پری ہے)

بانجھ دھوبن کے دودھ اُتر آنے کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے

سسی دت انگوٹھا چوسیا پیوے دودھ سوا

(سسی نے انگوٹھا چوسا اور دودھ پی لیا)

سانوں آئی یاد اولاد دی کھاریوں بوند پئی

(ہمیں آئی یاد اولاد کی بنجر زمین میں بوند پڑی)

دھونبڑ تھنی نیر اُچھالیا مہر محبّت نال

(دھوبن کے پستان سے دودھ اُچھلا مہر اور محبّت کے ساتھ)

اسی طرح سسی کے حُسن و جمال کی تصویریں ایسی دلفریب پیش کی ہیں کہ میر حسن کی مثنوی کے خاکے آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں۔

اُہدے تر کھّے نین کٹاریاں برہوں چڑھائی سان

(اس کے تیکھے کٹاری کے شل نین برہ کی سان پر چڑھائے گئے)

اُتے دُھپّے ڈِھٹّی لشک دی جیوں بجلی اَس مان

(اور دھوپ میں چمکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے جیسے آسمان پر بجلی)

اُتھّے جھُرمٹ پایا تاریاں جن جھاتی پادے چا

(اور وہاں تاروں نے جھرمٹ لگایا اور گویا چاند جھانک رہا ہے)

اُتے چڑھیا لوڑے رات رات سورج چاہل چاہل چا

(اور چڑھ چڑھ کر ڈھونڈتا ہے رات رات بھر سورج جھل مل جھل مل کرکے)

حافظ برخوردار نے جذباتی کیفیات کے مرقعے بھی بڑی خوبصورتی اور دل فریبی سے پیش کئے ہیں۔ جذبات کشی کی ایسی تصویریں سسی اور پُنّو کے ملاپ کے وقت، سسی اور اس کی ماں دھوبن کا بچھڑنا اور اس کا ملاپ، سسی کی موت کا دردناک منظر اور ایسے ہی دوسرے مواقع پر ملتی ہیں۔

سسی پُنّو کی ایک بات اور ہماری کلاسیکی مثنویوں سے ملتی جلتی ہیں۔ جس طرح مثنوی نگار ہونے والے واقعات کی خبر قاری کو پہلے سے دینے کے لئے چند شعر نظم کرتا ہے تاکہ قاری اس کے لئے تیار ہو جائے بالکل اسی طرح حافظ برخوردار بھی ہونے والے واقعات کا اُٹھان ہی کچھ اس طرح کرتا ہے کہ قاری اس سے واقف ہو جاتا ہے اور وہ "پتا کہیں حکم بناہلا ہے" کا قائل بن کر تسلیم و رضا کا پرستار بن جاتا ہے۔ سسی کے فراق کا پیش منظر اس طرح کھینچا جاتا ہے

سسی دا درد بھنگوڑا اُدّیا جھولے دیندے دکھ

اتے شول بچھائی پوتڑے تکنڑ نہ ملیا موکھ

اس کے دردوں کا پالنا اٹھا۔ جیسے دکھ ہلا رہے ہیں۔ کانٹوں کے پوتڑے اس پر بچھے ہیں پھر بھی اس کا مکھ دیکھنے کو نہ ملا۔۔۔۔)

پلاٹ خواہ آسمان میں جھولتا ہو، یا واقعات غیر فطری ہوں۔ کردار فرضی ہوں یا حقیقی کردار نگاری کا فقدان ہو یا ناقص اور نامکمل۔ مگر اس میں شک نہیں کہ یہ وہ منظوم افسانہ ہے جو عوام کے دلوں کی گہرائیوں میں ایک حقیقت اور اصلیت سے زیادہ اثر کر چکا ہے۔ عوام جب "دھونبڑ تھنی نیر اچھالیا" سناتے ہوں گے اور جب راجا رام کی بات بتلاتے ہوں گے تو آنے والی نسل کو یہ یقین ضرور ہو جائے گا کہ راجا رام خود غرض تھا۔ جس نے اپنی شیر خوار بچی کو دریا میں بہا دیا، اس لئے کہ وہ جاگیر دار تھا، امیر تھا، راجا تھا اور انہیں پیاری ہوتی ہے اپنی جان دھوبن غریب تھی اسی لئے اس کے دل میں رحم تھا اور دیا، جبھی تو پال لیا اس نے سسی کو اور انسان تقدیر کے ہاتھوں کا کھلونا ہے جیسے وہ اچھالتی ہے اور گراتی ہے۔ اور ہم۔۔۔۔؟ اگر صوبائی زبانوں سے دلچسپی دکھائیں گے تو ہم اپنے بین الصوبائی قاری عوام، مزدور اور کسان سے صرف ہم کلام ہی نہیں ہو سکیں گے، بلکہ ان کے دلوں کی گہرائیاں ٹٹول سکیں گے۔ ان کی تہذیبی قدروں کا جائزہ لے سکیں گے ان کی پارٹیوں کا ایک جان دار عضو بن سکیں گے۔ اردو ہو یا ہندی اپنی موجودہ صورت میں اس وقت تک نچلے طبقوں اور عوام کے لئے قابلِ فہم نہیں بن سکتی جب تک ہم صوبائی زبانوں کی نبضیں نہ ٹٹولیں اور ان کے بولنے والوں کی نفسیات کو نہ سمجھ لیں۔ اگر ہم[1] صوبائی زبانوں میں دلچسپی نہیں رکھتے تو جو کچھ ہم کر رہے ہیں ادبی حیثیت سے وہ محض غیر نفسیاتی اور میکانکی ہے۔

---

[1] Problem of Art & Literature

لدّاخی شاعری

لداخ اور لداخی جو کوہ ہمالیہ کی تنگ وادیوں میں مہذب دنیا سے الگ تھلگ گمنامی کی زندگی بسر کر رہے تھے ۱۹۴۸ء میں لداخ پر پاکستانی حملے کے ساتھ ہی صرف مشہور ہی نہیں ہوئے بلکہ سیاسی اہمیت کا مرکز بن گئے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ بین الاقوامی دلچسپی کا مرکز بن گئے، تو زیادہ موزوں ہوگا۔ سیاسی وجوہ سے لداخ کو زمانۂ قدیم سے اہمیت دی جاتی رہی ہے۔ چنانچہ ایک مورخ نے لداخ کو Where Three Empires Meet کا نام دیا ہے۔ بلکہ اب تو چار حکومتوں کا مرکز بن گیا ہے۔ چنانچہ دُنیا اور دُنیا کے لوگ لداخ کے ساتھ لداخیوں سے بھی دلچسپی کا اظہار کرنے لگے ہیں۔

لداخی ایک جداگانہ تہذیب و تمدن کے مالک ہیں۔ اُن کی زبان بھی الگ ہے۔ انھیں اپنی تہذیب پر جو کہ بہت پُرانی ہے بُرا ناز ہے۔ لداخ زمانۂ قدیم سے ایک خود مختار ملک چلا آ رہا ہے۔ جہاں بودھ راجہ حکومت کرتے تھے۔ صرف سوا سو سال ہوئے کہ جموں کی حکومت کے ماتحت آ گیا۔ ۱۹۴۷ء میں کشمیر کی آزادی کے ساتھ ہی لداخ بھی آزاد ہوا ہے۔ یہاں لداخ کی تاریخ یا سیاست پر کچھ لکھنا مطلوب نہیں۔ بلکہ لداخی شاعری کے چند نمونے پیش کرنا مطلوب ہے۔ چنانچہ لداخی شاعری کا وہ نمونہ جس کو ہم اپنی زبان میں "چھگ لُو" کہتے ہیں پیش کرتا ہوں۔

اس نظم کے چار مصرعے ہوتے ہیں قافیہ کی پابندی نہیں ہوتی۔ مگر وزن برابر ہوتا ہے۔ ہر ایک مصرعہ چھ چھ ارکان Syllables کا ہوتا ہے۔ یہ وہ نظمیں ہیں جو ابھی تک معرضِ تحریر میں نہیں آئیں۔ بلکہ مرد اور عورتوں کے حافظے ہی میں موجود ہیں۔ اس قسم کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ایک مختصر بات کہہ کر سننے والے کو بہت کچھ سوچنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ شلاً؎

شوگ ڈونا لا یور ونگ چا دسے تھنگ تھنگ کرمو
لی تھنگ کھورنے لوگ یونگ رنگ پوکورنے می ڈو

ترجمہ۔ اے سفید سارس! تو اپنے پَر مجھے عاریتاً دے دے۔ میں کہیں دُور نہیں جاؤں گا، لی تھنگ گھوم کر واپس آ جاؤں گا۔

کیا نادر تخیل ہے۔ لداخ کی جنوب مشرقی وسیع چراگاہوں میں موسم بہار کے دنوں میں ندیوں کے کنارے عموماً سارس کے جوڑے پائے جاتے ہیں۔ چرواہا جو اپنا ریوڑ چراتا ہے سارس کے جوڑوں کو دیکھ کر اپنی محبوبہ کو یاد کرتا ہے۔ اور اپنی مجبوری سے متاثر ہوتا ہے۔ جو لوگ دام محبت میں گرفتار ہوئے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ محبوب سے ملنے کے لئے کیسے کیسے طریقے سوچتے رہتے ہیں۔ لیکن سارس سے پَر عاریتاً لینا کس قدر اچھوتا خیال ہے — لی تھنگ ایک گاؤں کا نام ہے۔

اسی طرح ہر ایک نظم عشق و محبت کے سوز و گداز اور خلوص جذبات سے لبریز ہے۔ میں یہاں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی اکثر نظمیں عام مرد یا عورتوں کی تصنیف ہیں۔ چند اور منظومات ملاحظہ فرمائیے۔

چا سکدتا بو ما گیب سم بے چا تے کرپو
سنینگ سم شد شُولس یونگ تا ونگ او د زیر ڈول ما

ترجمہ۔ اے سم کے سفید مرغ سحری تو صبح کے وقت اذان نہ دے۔ مبادا میرے اور اود زیر ڈول ما (نام محبوبہ) کے درمیان اظہار جذبات ادھورا ہی رہ جائے۔

ہرتن ڈو زوم گیو میدنا نا ژ هو دی رنگ زوم زوم
شرگیو میدنا گا و ا تھو رنگ سکر تھا شنگ شنگ

ترجمہ۔ ہم آج جس طرح ملے ہیں۔ اگر ہمیشہ نہ مل سکے! کس قدر خوشی ہوتی اگر صبح کا چمکدار سپید ستارہ طلوع ہی نہ ہوتا۔

نیل سا بول موسے گنگ ڈو — سینگ ستم پھر شد چھر شد
چھو زنگ چھر پا میدپی — اُو سنتیں ذل پے بنگس سونگ

ترجمہ۔ نرم نرم بستر پر اٹھا رہ جا۔ بات ہو گیا۔ نہ مینہہ نہ اوس لیکن تکیے بھیگ گئے تھے۔

کھیو دسیم کرسل لدا وا — جن سیم شن بے ما ریب
نا بسیم نرگی ڈود پا — ٹول کیننگ جگ پا میار تو

ترجمہ۔ تمہارا دل جو نورانی چاند کی طرح سپید ہے۔ دوسروں (رقیب) کے تصور کے بادل میں نہ گھر جائے۔ میرا دل تو ریشمی ڈور کی اُس گانٹھ کی طرح ہے جو کھولے سے نہیں کھل سکتی۔

اسی طرح ایک اور صنف نظم بھی ہے جس میں چوٹ اور طعنے ہوتے ہیں۔ لڑکے لڑکیاں الگ الگ ٹولیاں بنا کر عموماً سردیوں کی لمبی راتوں میں باری باری بیت بازی کرتے ہوئے لمبی تانوں والے مخصوص سُروں میں گاتے ہیں۔ اُن کے نمونے یہ ہیں۔

نانگ مین توک چوس تے — گر دے سکیل لانگس پن
تا لو لوب ما چوس تے — گنگ پے یدگ لانگس پن

ترجمہ۔ پچھلے سال پھول سمجھ کر سر کے اوپر لگایا (لداخی مرد اور عورت عموماً پھولوں سے اپنے سروں کو سجاتے ہیں) اس سال تنکا سمجھ کر پاؤں کے نیچے دبا دیا۔

میر ذوب سوسے تُس لا — پوچا نے سنگ نگس بن
ری موسے چدشم یول تے — سور گے تگ نمگ تگ شرگ

ترجمہ۔ جب انگوٹھی نئی تھی تو میں نے انگلی میں پہن لی تھی۔ اب تو نقش و نگار مٹ گئے ہیں جس کی مرضی ہو وہ پہن لے۔

کھیو دنی ٹی جر مین توک — نانی ٹی لین بونگ وا
سو سوسے لس کیس چدتے — چھس کور ننگ دو جل یونگ

ترجمہ۔ تم خوشبودار پھول ہو۔ میں خوشبو کا متوالا بھونرا ہوں یہ تو تقدیر کا رشتہ ہے کہ باغ میں ہم ملتے ہیں۔

اوپر کی چند مثالوں سے مختصراً لداخ کی شاعری کا تعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ گیت نہ جانے کب تصنیف ہوئے لیکن اب لوگوں کی زبان پر ہیں اور لوک گیت کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ نہ جانے ایسے کتنے گیت تصنیف ہوئے اور لوگ آہستہ آہستہ انہیں بھول گئے۔ لیکن دوسری زبانوں کی طرح لداخی زبان کے لئے یہ سرمایہ ایک گنج گراں مایہ ہے۔

عطا کاکوی

سرقہ، توارد، استفادہ

سرقہ، توارد اور استفادہ علمی اصطلاحیں ہیں۔ جو شعر و شاعری سے وابستہ ہیں۔ ایک مضمون یا کوئی تخیل جو پہلے کسی شاعر نے قلم بند کیا ہے اُس کو کسی دوسرے شاعر نے اپنا لیا تو یہ سرقہ کہا جائے گا۔ مضمون کی یہ چوری ہوتی ہی آئی ہے۔ آتش نے کہا کہ ؂

مضموں کا چور ہوتا ہے رسوا جہان میں   چکھتی خراب کرتی ہے مالِ حرام کی

آتش ہی کا قول ہے کہ ؂

ناگوار آتش ہے اپنی ہمتِ مردانہ کو   باندھنا مضمونِ غیر اُتری ہوئی پاپوش ہے

پھر یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ ؂

رہتی ہے فکر تازہ مضامیں کی منتظر   اِس گھر میں آنکلتے ہیں مہماں نئے نئے

شاد کا بھی یہ ادّعا ہے کہ ؂

قلم اپنا مضامینِ کہن منسوخ کرتا ہے   دماغ اپنا ہے تازہ محکمہ قانون سازی کا

لیکن یہ صرف ادّعا ہی ادّعا ہے۔ آتش ہوں یا شاد۔ میر ہوں یا مومن۔ غالب ہوں یا اقبال کوئی بھی یہ دعویٰ کریں کہ اُن کے خیالات اچھوتے ہیں تو یہ غلط بیانی ہوگی۔ عربی کا ایک مقولہ ہے کہ اگلے لوگوں نے پچھلوں کے لئے کچھ نہیں چھوڑا۔ دوسرا مقولہ ہے کہ اگلے لوگوں نے پچھلوں کے لئے بہت کچھ چھوڑا ہے۔ دونوں مقولے حقیقت پر مبنی ہیں۔

پہلے مقولے کے یہ معنی ہوئے کہ اب کوئی جدید خیال باقی نہیں رہا۔ دوسرے مقولے کے یہ معنی ہیں کہ اتنا مواد جمع ہوگیا ہے کہ ان کو نت نئے انداز سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ چراغ سے چراغ جلتے ہی آئے ہیں۔ ادیبوں کا یہ نظریہ ہے کہ کسی شاعر کے مضمون کو لے کر اس کو ترقی یافتہ شکل میں پیش کرنا عیب نہیں۔ یہ استفادہ کی شکل ہوگی۔ توارد یہ ہے کہ نادانستہ طور پر شعراء نے ایک ہی مضمون کو اپنے اپنے طور پر لکھا جس کی ایک دوسرے کو خبر نہ تھی۔ لیکن اس امر کا ثبوت بہم پہنچانا بہت مشکل ہے۔ غالب کا ایک قطعہ ہے کہ ؂

رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو   ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

یہی خیال بعینہٖ ایک انگریزی شاعر Pope کے یہاں موجود ہے۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ Great men think alike یعنی بڑے لوگ یکساں سوچتے ہیں۔ یہ ایک توارد کی مثال ہوئی۔ عرصہ ہوا راقم الحروف نے ایک شعر لکھا تھا ؂

فریب کھائے ہیں اتنے سرابِ ہستی کے   گمانِ ریگ ہے آبِ رواں پہ اے ساقی

ابھی کچھ دن کی بات ہے کہ عندلیب شادانی کا مجموعۂ کلام "نشاطِ رفتہ" دیکھنے کا موقع ملا۔ اس میں ایک شعر نظر سے گزرا ؂

اتنے فریب کھائے ہیں دل نے کہ اب مجھے   ہوتا ہے جوئے آب پہ دھوکا سراب کا

جس وقت میں نے یہ شعر کہا تھا بالکل خالی الذہن ہو کر کہا تھا۔ وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ شادانی کا اس مضمون کا شعر ہے۔ یہ ایک توارد کی مثال ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ کسی اور شاعر نے بھی یہ مضمون قلم بند کیا ہو۔ یا فارسی کے کسی شاعر نے لکھا ہو اُس وقت ذہن میں کوئی بات تھی۔ اور یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ کون سا مضمون کب اور کہاں سے لیا گیا۔ مطالعہ کے وقت بہت سے مضامین دماغ کے کونے میں کہیں چھپ کر رہتے ہیں۔ قوتِ منتخبہ کبھی کبھی ان کو کھینچ کر باہر لے آتی ہے۔ ایک انگریز ادیب کا یہ قول ہے کہ

It is almost impossible for anyone who reads much and reflects a good deal to be able on every occasion to determine whether a thought was author's or his own.

نہ کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اُس کا مضمون اچھوتا ہے۔ نہ یہ کہ اُس نے کسی سے استفادہ نہیں کیا۔ اب لے دے کر یہی بات رہ جاتی ہے کہ اندازِ بیان اور اثر آفرینی کیسی ہے۔ اگر اندازِ بیان اچھوتا ہے اور اس شعر میں تاثیر

کا عنصر زیادہ ہے تو لائقِ تحسین ہے۔ ورنہ نری نقالی ہے یا سرقہ۔ آیئے آج کی صحبت میں آپ کو اُردو شعراء کے کلام کا مطالعہ کرائیں اور یہ دکھائیں کہ کس نے کس سے کیا لیا۔ اور اگلی عمارت پر کس نے کس طرح کی تعمیری ترقی دکھائی۔ اکثر جگہ آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ بعد کے شعراء نے کوئی ترقی نہیں کی۔ بلکہ اصل مضمون سے بھی پست ہی رہے مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

آبرو

دھمکاؤتے ہیں ہم کو کمر باندھ باندھ کر   کھووے ابھی تو جاوے میاں کا نکل بھرم

غالب

ہے کیا جو کس کے باندھئے میری بلا ڈرے   کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

میر

تیز یوں ہی نہ تھی کچھ آتشِ شوق   تھی خبر گرم اُن کے آنے کی

غالب

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی   آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

سودا

بخشش پہ وہ جہاں کی آئی تھی ہمت دہر   لیکن نہ یاں زباں تک حرفِ سوال آیا

غالب

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا   یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

مومن

کیسے گلے رقیب کے کیا طعنِ اقربا!   اپنا ہی دل نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

انور

کیسی حیا، کہاں کی وفا، پاسِ خلق کیا!   ہاں یہ سہی کہ آپ کو آنا یہاں نہ تھا

انور

اِدھر لائیے ذرا دستِ حنائی   پکڑ لیں چور دل کا ہم یہیں سے

داغ

نگہ نکلی نہ دل کی چور زلفِ عنبریں نکلی   اِدھر لا ہاتھ مٹھی کھول یہ چوری یہیں نکلی

میر حسن

کیا ہنسے اب کوئی اور کیا روسکے   دل ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے

داغ

ہنسنا ہے سلیقے کا نہ رونا ہے سلیقے کا   پریشانی میں کوئی کام جی سے ہو نہیں سکتا

بالمکند حضور

جفا کو ہم وفا سمجھے ستم کو ہم کرم سمجھے   اُدھر کچھ وہ دل میں تم سمجھے، اِدھر کچھ دل میں ہم سمجھے

ذوق

ستم کو ہم کرم سمجھے جفا کو ہم وفا سمجھے   جو اس پر بھی نہ وہ سمجھے تو اس بت سے خدا سمجھے

میر

جلد بجھ سوختہ کے پاس سے جانا کیا تھا؟   آگ لینے مگر آئے تھے یہ آنا کیا تھا؟

ذوق

لیتے ہی دل جو عاشقِ دل سوز کا چلے   تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے!

(بقا نے بھی اسی مضمون کا ایک شعر لکھا ہے ؎

سرسری مل کے مرے پاس سے جانا کیا تھا   راہ بس ناپنے آئے تھے یہ آنا کیا تھا؟)

آرزو

جان، تجھ پر کچھ اعتماد نہیں   زندگانی کا کیا بھروسا ہے؟

ذوق

تو ہماری زندگی، پر زندگی کی کیا اُمید   تو ہماری جان لیکن کیا بھروسا جان کا!

مصحفی

لازم ہے تیغ اے ستم آرا لہو پئے   اس میں کمی کرے تو ہمارا لہو پئے

ذوق

کہتے ہے خنجرِ قاتل سے یوں گلو میرا   کمی جو اس میں کرے تو پئے لہو میرا

میر سوز

مُندی گر چشمِ ظاہر دیدۂ بیدار ہو پیدا   در و دیوار سے شکلِ جمالِ یار ہو پیدا!

آتش

دل کے آئینے میں کر جوہرِ پنہاں پیدا   در و دیوار سے ہو صورتِ جاناں پیدا

ہدایت

کہنے کو دل ہے پاس مرے پر کہاں ہے دل   یک قطرہ خوں رہا ہے سو وہ کس حساب میں

آتش

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا   جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

ہدایت

یہ امتحاں نہ کرلے مرے مہرباں عزیز   کوئی جہاں میں تجھ سے بھی رکھتا ہے جاں عزیز

میر

بدنام ہو گئے جانے بھی دو امتحان کو   رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

جرأت

ہم اسیرانِ قفس کیا کہیں خاموش ہیں کیوں
راہ لگ اپنی چل اے بادِ صبا تجھ کو کیا؟

انشا

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

بادشاہ

گلستاں میں جاکر ہر اک گل کو دیکھا
نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بُو ہے

رند

چمن میں بھی کل جاکے دیکھا گلوں کو
نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بُو ہے

امیر مینائی

کنگھی چوٹی سے کسی دم انھیں فرصت ہی نہیں
کیا خبر ہے کہ ہوا حال پریشاں کس کا

داغ

تم کو آشفتہ مزاجوں کی خبر سے کیا کام
تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنا

اسی مضمون کا ایک شعر شادانی کا بھی ہے ؎

اُنھیں آرائشِ گیسو سے مطلب
کوئی دیوانہ ہو جائے بلا سے

سودا

یا تبسم، یا نگہ، یا وعدہ، یا گاہے پیام
کچھ بھی اے خانہ خراب اس دل کے سمجھانے کی طرح

میر

اک نگہ، اک پیام، اک وعدہ
اس میں بھی تم کو ہے تامل سا

قائم

ہوس سے ہم کیا تھا عشق اوّل
وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

میر

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

مصحفی

یار کا صبح پر ہے وعدۂ وصل
ایک شب اور بھی جیے ہی نہیں

نظام رام پوری

کل کا وعدہ کیا پھر اُس نے آج
اور بھی ایک دن جیے ہی نہیں

سودا

ساقی ہے اک تبسمِ گل فرصتِ بہار
ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

میر

یک چشمکِ پیالہ ہے ساقی بہارِ عمر
جھپکی لگی کہ دور یہ آخر ہی ہو چکا

جعفر علی حسرت

محتسب میرے جو بر میں یہ عیاں ہے شیشہ
دیکھ لے آئینۂ دل ہے کہاں ہے شیشہ

مرزا سلیمان شکوہ

کہاں ہے شیشۂ مے محتسب خدا سے ڈر
مری بغل میں چھلکتا ہے آبلہ دل کا

اسی مضمون کا ایک شعر ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی کا بھی ہے ؎

خدا کے سامنے اے محتسب سچ بولنا ہوگا
مرے شیشے میں مے دیکھی ہے یا خونابِ دیکھا ہے

قائم

راہ کے بیچ جو رکھتا ہوں اُسے گھیر کبھو
ہنس کے کہتا ہے کہ اب چھوڑ مجھے پھر کبھو

جرأت

میرے جو اشارے سے رکھا گھیر کسی نے
سو باتیں سنائیں مجھے منہ پھیر کسی نے

ناسخ

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے
آج آتی شبِ فرقت میں تو احساں ہوتا

سید حیدر علی سہل

اے اجل ایک دن آنا ہے ضروری تجھکو
گر شبِ ہجر میں آجائے تو احساں تیرا

میر

اُمیدوارِ وعدۂ دیدار مر چلے
آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا

مصحفی

مدت ہوئی کہ بیٹھے ہیں ہم انتظار میں
کیا جانے آتے آتے قیامت کو کیا ہوا

شاد کا شعر ہے ؎

تکیہ وعدہ پہ ہے سب چپکے پڑے ہیں تہِ خاک
کل قیامت جو نہ آئی تو قیامت سمجھو

سراج اورنگ آبادی

ڈورے نہیں ہیں سرخ تری چشمِ مست میں
شاید چڑھا ہے خون کسی بے گناہ کا

فغاں

بے وجہ کب ہے جامۂ قاتل کا رنگ سرخ
شاید پڑا ہے خون کسی بے گناہ کا

فغاں

اے فغاں دردِ دل سنوں کب تک
اڑ گئی نیند اس فسانے سے

سودا

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے میں

پابند

نہ ہرگز وصل کی شب کو اٹھاؤ زلف تم رخ سے
کہ جوں جوں ہٹتی جاتی ہے سحر کو لاتی جاتی ہے

ولی کاکوری

وصال کی شب سحر تک اُن کو فریب دے دے کے روکے رکھا
تمہارے جلوے کی روشنی ہے ابھی نمودِ سحر نہیں ہے

حالی

دکھانا پڑے گا اُسے زخمِ دل — اگر تیر اُس کا خطا ہو گیا

شاداں ولد عارف

دلِ مضطرب کا ہے اپنے قصور — نشانہ جو اس کا خطا ہو گیا

تعشق

عدم سے دہر میں آنا کسے گوارا تھا — کشاں کشاں مجھے لائی ہے آرزو تیری

بیتاب عظیم آبادی

فریفتہ مجھے عالم کے رنگ و بو نے کیا — بڑا ستم ترے ملنے کی آرزو نے کیا

تعشق

مر کے بدنام کیا نامِ محبت میں نے — منہ پہ کچھ ڈال دو کوئی کہ حیا آتی ہے

شاد

لحد میں کیوں نہ جاؤں منہ چھپائے — بھری محفل سے اُٹھوایا گیا ہوں

مصحفی — دل کے دھڑکوں کا یہ عالم ہے کہ بے منتِ دست
ٹکڑے ہو ہو کے گریبان اُڑا جاتا ہے

تسنیم شاگرد کوثر

جنوں کا اب کے اتنا زور ہے فصلِ بہاری میں
کہ پُرزے پُرزے خود جیب و گریباں ہوتے جاتے ہیں

تعشق

تھا کبھی دورِ اسیرانِ قفس اے صیاد — اب تو اک پھول کو محتاج ہے گلشن کیسا!

مقصود گیاوی

وہ بھی اک دن تھا کہ گلشن میں بسر ہوتی تھی — آج دو پھول کو محتاج ہے تربت میری

تعشق — مجھ سے لاکھوں خاک کے پتلے بنا سکتا ہے تو
میں کہاں سے ایک تیرا سا خدا پیدا کروں

علا — تجھ کو تو میرے جیسے ہیں بندے ہزار ہا
میں کیا کروں کہ تجھ سا خدا دوسرا نہیں

بائے میاں بالا

بے دھڑک بال کھولے نکلے ہو! — شام دیکھو نہ تم سحر دیکھو

حسرت موہانی

بے دھڑک یوں ہی چلے آتے ہو کھولے ہوئے بال — شام دیکھو نہ مری جان سویرا دیکھو

ذوق

فراقِ خلد سے گندم ہے سینہ چاک اب تک — الٰہی ہو نہ وطن سے کوئی غریب جدا

شاد لکھنوی

جگر شگاف قلم پھوٹ کے ہے نیستاں سے — کوئی غریب الٰہی نہ ہو وطن سے الگ

میر

عشق اُن کو ہے جو یار کو اپنے دمِ رفتن — کرتے نہیں غیرت سے خدا کے بھی حوالے

غالب — قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

سودا

آویزہ گہر ہے بناگوشِ یار میں — حیا سرنگوں ہے اس کے مقابل غرۂ صبح

میر — لیتے کروٹ ہل گئے جو کان کے موتی ترے
شرم سے سر در گریباں صبح کے تارے ہوئے

میر — نئے طور سیکھے نکالے ڈھب اور
مگر اور تھے تب، ہوئے ہو اب اور

شاد — بدلی وہ وضع طور سے بے طور ہو گئے
تم تو شباب آتے ہی کچھ اور ہو گئے

میر — کرے کیا کہ دل بھی تو مجبور ہے — زمیں سخت ہے آسماں دور ہے

شاد — ستم ہے آدمی کے واسطے مجبور ہو جانا
زمیں کا سخت ہو جانا، فلک کا دور ہو جانا

اس مضمون کو میر سے بھی پہلے ایک شاعر سجاد عظیم آبادی نے اس طرح قلم بند کیا ہے ؎

سینہ گھٹے ہے غم سے نکلتے نہیں ہے جان بھی — ہائے زمیں بھی سخت ہے، دور ہے آسمان بھی

نہال عظیم آبادی

کہتے ہیں اہلِ خرد جسے فسانہ تیرا — منہ کو پھیرے ہوئے ہنستا ہے دوانہ تیرا

شاد

جسے اہلِ ہوس کہتے ہیں افسانہ آپ کا — ہنستا ہے دیکھ دیکھ کے دیوانہ آپ کا

جعفر علی حسرت:- ہوا سے بال زلفوں کے جو رخساروں پہ ہلتے ہیں
دلِ بیمار اُٹھ بیٹھو کہ دونوں وقت ملتے ہیں

میرحسن : نہ لیٹ اس طرح منہ پر زلف کو بکھرا کے اے ظالم!
ذرا اُٹھ بیٹھ تو اس دم کہ دونوں وقت ملتے ہیں

دونوں وقت ملنے کی حالت کو شادانی نے یوں قلم بند کیا ہے ؎

اے چشم رات دن تجھے رونے سے کام ہے — ملتے ہیں دونوں وقت ذرا تھم کہ شام ہے

آبرو : لگا ہے لگا ہے پیار کی انکھیاں سے کرتے ہو نگاہ
مہرباں ہوتے چلے ہو اب تو یارے اِس قدر

نسیم : آنکھوں میں ہے لحاظ تبسم فزا ہیں لب
شکرِ خدا کہ آج تو کچھ راہ پر ہیں آپ

حسرت

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں — الٰہی! ترکِ الفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں

شادانی

بیکار رہیں یہ ترکِ محبت کی کوششیں — وہ اور یاد آتی ہیں جتنا بھلایئے

حسرت : بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

شادانی : تم پاس ہو اور دل کا یہ عالم ہے کہ توبہ
یہ حال تو جب دُور تھے جب بھی نہ ہوا تھا

میرحسن : وہ تکمہ درخشندہ الماس کا — ستارہ سا مہتاب کے پاس کا

شادانی : بناگوش میں اس کے الماس پارہ — درخشندہ جیسے شفق میں ستارہ

لامعلوم : ہے کوئی بات آج ہونے کو — جی بہت چاہتا ہے رونے کو

شادانی : دل کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے — جی چاہتا ہے رونے کو اکثر

صبا : دل میں اک درد اُٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

شادانی : بیٹھے بیٹھے اُمنڈنے لگتا ہے — دل کو کیا ہو گیا خدا جانے

قائم : ہمنشیں ذکرِ یار کر کچھ آج — اس حکایت سے جی بہلتا ہے

شادانی : دل آج بے حد گھبرا رہا ہے — اے دوست اُن کا کچھ تذکرہ کر

غالب : نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

شادانی : اُف وہ شب رنگ مہکتی ہوئی کافر زلفیں
اپنے بازو پہ جنھیں میں نے مچلتے دیکھا!

لامعلوم : تڑپ تڑپ کے گزاری ہیں ہجر کی راتیں!
گواہ ہیں شکنیں جس قدر ہیں بستر پر!

شادانی : شکنِ بستر و تمنا کی بالش ہے گواہ!
پوچھ لو ان سے فسانہ شبِ تنہائی کا!

آتش : حالِ دل ہوتے ہیں حسرت کی نگاہوں سے عیاں
میری اُس کی گفتگو میں اب زباں خاموش ہے

شادانی : نہ کچھ کہنا نہ سننا اور حالِ دل سمجھ لینا
خموشی ہی محبت کی زباں معلوم ہوتی ہے

غالب : زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے!

شادانی : پڑتی ہے اپنے خونِ تمنا پہ جب نظر
ہوتا ہے دل میں شک کہ خدا ہے بھی یا نہیں

اقبال : نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

شادانی : خموشیوں میں نہاں ہو گئی فغاں میری
زبانِ حال ہے اب اور داستاں میری

حسرت : صحتیں لاکھوں مری بیماریٔ غم پر نثار
جس میں اُٹھے بارہا اُن کی عیادت کے مزے

غالب : خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو تم آئے ہو
فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے

حسرت : وفا تجھ سے اے بے وفا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

غالب : ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

حسرت : آنے لگے نہ پا کے خوار حسرت انھیں بھی ہم سے عار
جن پہ کہ ہم نے سب نثار مال و منال کر دیا

غالب : لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

حسرت : مداوائے دلِ دیوانہ کرتے — یہ کرتے ہم تو کچھ اچھا نہ کرتے

غالب : درد منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

فلاحِ قوم کیلئے رضاکارانہ خدمت

ملک کے تمام باشندوں کو خدمتِ ملک کے مواقع مہیا کرنے کے لئے جلد ہی ایک غیر سیاسی اور رضاکارانہ طور پر سماجی خدمت کرنے والی جماعت قائم کی جا رہی ہے۔ اس جماعت کا نام بھارت سیوک سماج رکھا گیا ہے۔ اور ملک کا ہر بالغ بلا لحاظ مذہب و فرقہ۔ ذات جنس اور جماعتی تعلقات اس سماج کا ممبر بن سکتا ہے۔ البتہ تشدّد، تخریبی سرگرمیوں یا فرقہ وارانہ نفرت میں اعتقاد رکھنے والوں کو اس سماج میں کوئی جگہ نہیں مل سکتی۔

اس جماعت کے قیام کی تجویز پلاننگ کمیشن کی طرف سے کی گئی ہے۔ اور اس کے نظم و عمل کی تفصیل سے متعلق ابھی ایک رسالہ شائع کیا گیا ہے۔ پردھان منتری شری جواہر لال نہرو نے اس رسالے کا دیباچہ لکھا ہے، جس میں اُنھوں نے کہا ہے کہ سماج کا مقصد جمود کے پہاڑ کو چیر دینے والے اشتراکِ عمل کے لئے منکسر جذبات اور سرگرم خواہشات کے ساتھ ملک کے عوام سے رجوع کرنا ہے۔

منصوبہ بندی اور دریائی وادی کی اسکیموں کے وزیر شری گلزاری لال نندہ نے اس رسالہ میں مجوزہ سماج کے اغراض و مقاصد اور ملک کے موجودہ رضاکار اداروں و حکومت سے اس کے تعلق کی تشریح کی ہے۔

ایسے ادارہ کی ضرورت کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ صحت اور کارکردگی کے نہایت معقول مطالبوں کو پورا کرنے کے لئے لوگوں کو جو معیارِ زندگی درکار ہے اس کے لئے اگلے چند سال میں قومی آمدنی موجودہ سطح سے تین گنا سے بھی زیادہ ہونی چاہیئے۔ لیکن بھارت سرکار یا ریاستی حکومتوں کے پاس سرمایہ اس قدر قلیل ہے کہ اُسے کہیں لگانے سے سالانہ قومی آمدنی میں کوئی زیادہ فائدہ نہیں ہو سکتا لیکن ساتھ ہی قوم کے پاس ایک ایسی فاضل قوّت اور غیر استعمال شدہ ذرائع ہیں جنھیں موزوں راستوں پر لگانے سے حکومت کی کوششوں میں بہت زیادہ اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

شری نندہ نے لکھا ہے کہ سرکار کی طرف ملک کے عوام کا رویّہ صدیوں پرانی جہالت اور جمود اور سوسائٹی کے سرگرم عناصر کا رویّہ بہت حد تک انکار، عدم تعاون اور تخریب کا مظہر ہوتا ہے۔ اس سماجی جمود کو لوگوں کی قوت اور رضامندانہ مساعی سے ہی ختم کیا جا سکتا ہے۔ ملک میں آج بھی کئی رضاکار ادارے مفید کام کر رہے ہیں۔ لیکن ایک ملک گیر جماعت کے ذریعے ہر چھوٹے بڑے فرد کو حسبِ توفیق اپنے ملک کی بھلائی کے لئے کام کرنے کا موقع ملے گا۔

بلاشبہ سماج کی سرگرمیاں فلاحِ قوم کے تمام پہلوؤں پر محیط ہوں گی لیکن شروع میں سب سے ضروری امور کو ہی لیا جائے گا اور ان امور میں سب سے بڑا مسئلہ خوراک کا ہے۔ سماج کی دیگر سرگرمیوں میں غیر سماجی رواجوں کے خلاف رائے عامہ کی تنظیم کرنا، پنچایتی مرکز قائم کرنا۔ قومی خدمت کے لئے نوجوانوں کی تنظیم کرنا۔ لوگوں کی شکایتوں کے جلد تر ازالہ کے لئے کوشش کرتے ہوئے عوام اور حکومت کے تعلقات کو بہتر بنانا، سماجی تعلیم۔ بیماری کی روک تھام، انسدادِ ملیریا کی مہم وغیرہ شامل ہیں۔

مجوزہ سماج کے کام کو حتی الوسع لامرکزیت حاصل ہوگی گاؤں اس کا ابتدائی یونٹ ہوگا اور اس کے بعد کی منزلیں ملک کے انتظامیہ صیغوں سے مشابہ ہوں گی۔

سماج کے لئے کام کرنے والوں کو کوئی تنخواہ یا اجرت نہیں ملے گی۔ البتہ پورا وقت کام کرنے والے چند ایسے کارکنوں کو تنخواہ دی جائے گی جن کی اہمیت نمایاں ہو۔ اٹھارہ سال کی عمر کا ہر شخص سماج کا رکن بن سکے گا۔ رکن بننے سے قبل اسے یہ اقرار کرنا ہوگا کہ وہ رضاکارانہ طور پر کام کرنے کے لئے تیار ہے۔ عام طور پر کام کرنے کی میعاد پانچ سال ہوگا۔ بصورت دیگر یہ ایک سال سے کم ہوگی۔ رضاکار پورا وقت کام کرنے یا اپنے فالتو وقت میں کام کرنے کی بنا پر سماج میں شامل ہو سکتے ہیں۔

تشدّد، تخریبی سرگرمیوں یا فرقہ وارانہ نفرت میں اعتقاد رکھنے والوں کو سماج کا رکن نہیں بنایا جائے گا۔ اس کے علاوہ سماج کے ذریعے سیاسی فائدہ یا ذاتی غرض حاصل کرنے والے کو سماج سے خارج کر دیا جائے گا۔ سماج بارہ ارکان پر مشتمل ایک مرکزی بورڈ کے ماتحت ہوگا جس کا انتخاب ۵۰ ارکان پر مشتمل ایک جنرل کونسل کی طرف سے کیا جائے گا۔

راشٹرپتی بھون
میں
عید الفطر
کی
تقریب

راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد عید الفطر کی تقریب پر
راشٹرپتی بھون کے مسلم اسٹاف سے خطاب کر رہے ہیں
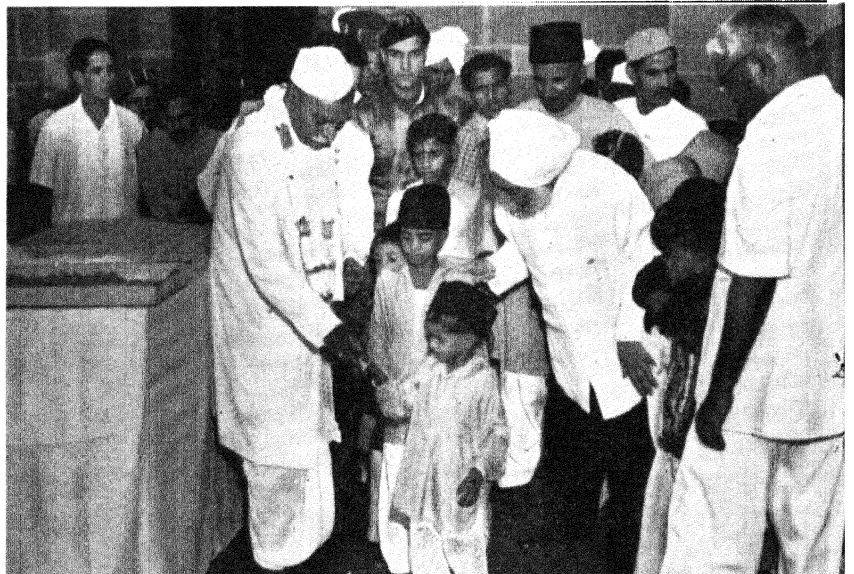
ڈاکٹر راجندر پرشاد راشٹرپتی بھون
کے مسلم اسٹاف کے بچوں میں
مٹھائی بانٹ رہے ہیں -

گھٹا

اُٹھی گھٹا وہ رنگ و بُو کا کارواں لئے ہوئے — جلو میں کائنات کی جوانیاں لئے ہوئے

لئے ہوئے پیامِ جاں ہر ایک رس کی بُوند میں — ہر ایک رس کی بُوند میں پیامِ جاں لئے ہوئے

دُھواں دُھواں لئے ہوئے بلندیوں پہ چرخ کی — بلندیوں پہ چرخ کی دُھواں دُھواں لئے ہوئے

ہر ایک سُو رواں دواں، کبھی یہاں کبھی وہاں — بُتانِ شوخ و شنگ کی سی شوخیاں لئے ہوئے

لئے ہوئے ہواؤں پر سیاہ و سُرخ کشتیاں — ہوائے تُند کشتیوں کے بادباں لئے ہوئے

سیاہیوں کے سلسلے میں تیرگی کی موج میں — جنوں فروش کاکلوں کی داستاں لئے ہوئے

کدھر ہے جوشؔ! بدلیاں رواں ہیں سُوئے میکدہ
سیاہیوں کے حاشیے پہ سُرخیاں لئے ہوئے

جوش

انڈونیشیا

آج تقریباً تین ہزار جزیروں کو انڈونیشیا کے نام سے پکارتے ہیں۔ ان میں ہر قد و قامت کے جزیرے ہیں چھوٹے اور بڑے، آباد و غیر آباد، ہرے بھرے اور بے برگ و بار ان کی آبادی صاف کر دی ہے۔ اور ان جزیروں کا مجموعی رقبہ ۷ لاکھ ۳۰ ہزار مربع میل ہے۔ انڈونیشیا کا لفظ سب سے پہلے ایک جرمن ماہر علم الانسان نے وضع کیا تھا اور اس کے تحت فارموسا، فلپائن، ملایا، مدغاسکر اور ندرلینڈ و لندیزی جزیرے بھی سمجھے جاتے تھے مگر اس نام کا اطلاق اب آخر الذکر جزیروں ہی پر ہے اور ۱۷ اگست ۱۹۴۵ء کے بعد جب منشور اطلانتک کے تحت یہاں جمہوری نظام نافذ ہوا تو یہاں کے باشندوں نے ان سارے جزیروں کو جمہوریۂ انڈونیشیا کے نام سے موسوم کیا۔

انڈونیشیا کے خاص جزیرے سماترا، بورنیو، مدورا اور جاوا ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انڈونیشی علم و فضل و ثقافت کا سب سے بڑا مرکز جاوا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ جاوا کی زمینیں قدرے نشیب میں واقع ہیں اور یہاں ذرائع آبپاشی کو کافی حد تک ترقی حاصل ہوئی ہے۔ یہاں پھل کے باغات اور دھان کے کھیت بے شمار ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ یہاں کی آبادی دیگر جزیروں کی بہ نسبت بہت گھنی ہے اس کا رقبہ مجموعی رقبہ کے ۱/۷ ہے اور مدورا اور جاوا کی آبادی مل کر پانچ کروڑ ہے۔

انڈونیشیا کی پیداوار میں زیادہ تر خام اشیاء اور معدنیات ہیں۔

انڈونیشیا کی مجموعی آبادی میں چھ کروڑ تیس لاکھ مسلمان، بیس لاکھ عیسائی دو لاکھ چینی اور تقریباً تیرہ لاکھ ہندو ہیں۔ مگر ان میں اس درجہ میل ملاپ ہے کہ ان کے مذہب و ملت کے فرق کو بیرونی دنیا نے کبھی محسوس نہیں کیا۔ اس ملک کے مسلمانوں میں حد درجہ رواداری، میانہ روی اور سلامت پسندی ہے۔ انڈونیشیا کے قومی نشان میں سرخ و سپید لکیریں اولوالعزمی اور اخلاص کی دلیل سمجھی جاتی ہیں۔

جمہوریۂ انڈونیشیا کا حکومتی شہر جوگجا کارتا ہے۔ یہ شہر اس ملک کی ساری قومی تحریکوں اور انقلابات کا مرکز رہا ہے جس کے باعث ولندیزیوں کی ۳۵۰ سالہ حکومت ختم کی گئی۔ مگر اس شہر کی رفتارِ زندگی قدرے سست خرام ہے۔ یورپین شہروں جیسی ہو ہڑپ یہاں نہیں۔ انڈونیشی فطرتاً سہل پسند اور خوش و خرم لوگ ہیں اس لئے اُن کی زندگی میں تعجیل و تیز رفتاری کم پائی جاتی ہے مگر ان کا حوصلہ اونچا ہمت بلند ہے اور یہ اپنے نصب العین کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔ انڈونیشیا کی جمہوریہ ایشیا کی ایک کم عمر جمہوریہ ہے۔ اس ملک کا نظم و نسق تمام تر نوجوانوں کے مضبوط ہاتھوں میں ہے۔ عرفِ عام میں انڈونیشیا کو نوجوانوں کا ملک کہتے ہیں۔ آپ اس ملک میں جہاں بھی جائیں۔ بازاروں میں، اسکولوں اور کالجوں میں، سرکاری دفتروں یا سیاسی انجمنوں میں آپ کو یہاں نوجوان ہی نوجوان نظر آئیں گے۔

آزاد انڈونیشیا کی آواز جوگجا کارتا سے برابر سنائی دیتی ہے۔ یہاں کے ریڈیو کے نظام میں تقریباً چالیس افراد ہیں جن میں آدھی تعداد عورتوں کی ہے۔ بیرونی ممالک کے لئے اُن کا نشریہ انگریزی، ولندیزی، فرانسیسی، ہندوستانی، اُردو، چینی عربی اور ترکی زبانوں میں ہوا کرتا ہے۔

اس ملک کی سیاسی پارٹیوں کے لیڈر بھی تقریباً سبھی نوجوان ہیں۔ آج کل وہاں مسلم پارٹی برسر اقتدار ہے۔ اس سے پہلے جمہوریہ سوشلسٹ پارٹی ڈاکٹر شہریار کی قیادت میں سربرآوردہ تھی۔ اس ملک کی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر ڈاکٹر شرف الدین ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں مزدور اور دیگر قومی پارٹیاں مختلف سیاسی عقائد کے تحت مصروف کار ہیں۔ انڈونیشیا پر اُس کے ہمسایہ ملک ہندوستان کا اثر بڑا صاف اور واضح طور پر نمایاں ہوتا ہے۔ یہاں کے دیہاتوں میں سرپنچ اُسی طرح منتخب کئے جاتے ہیں جیسے قدیم زمانے میں یا آج بھی اس ملک میں چُنے جاتے ہیں۔ انڈونیشیا میں بھی طریقۂ پرستش ہندوستان ہی جیسا ہے۔ سن عیسوی کے آغاز میں ہندوستان کے باشندے پہلی بار یہاں پہنچے اور آج تک ان دونوں ملکوں کے ثقافتی تعلقات صاف ظاہر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کالنگا اور پلاوا ہندو نسل کے راجاؤں نے یہاں ایک بہت بڑی سلطنت قائم کی تھی۔ بنگال کے سلیندر نسل کے ایک راجہ نے یہاں ایک سب سے اونچی عمارت تعمیر کرائی جسے بورو بودر کہتے ہیں۔ ۱۲۰۰ء میں مذہب یہاں پہنچا

بارھویں صدی عیسوی میں اسلام کی تبلیغ اِن جزائر میں ہوئی اس کی تبلیغ نہایت ہی پُرامن اور صلح پسندانہ طور پر عمل میں آئی۔

۱۵۹۵ء میں ولندیزی اِن جزیروں میں تجارت کے لئے پہنچے پھر بیوپار کے ساتھ ساتھ ان کا قومی جھنڈا بھی وہاں پہنچ گیا۔ پہلے ولندیزیوں کی حکومت بٹاویا پر ہوئی مگر رفتہ رفتہ وہ تمام جزائر پر قابض ہوگئے۔ ولندیزیوں کی جابرانہ حکومت سے تنگ آکر جاپانیوں کے حملوں کے وقت انڈونیشیا کے باشندوں نے اپنی آزادی کا جھنڈا لہرایا۔ ۱۷۔ اگست ۱۹۴۵ء کو صدرِ جمہوریۂ انڈونیشیا ڈاکٹر سوکارنو نے اپنی آزادی کا اعلان کرتے ہوئے ۱۷ وزراء پر مشتمل ایک کابینہ کا اعلان کیا۔

جمہوریۂ ہند کے حالیہ انتخاب کے منظر و پس منظر کا مطالعہ کرنے ابھی حال ہی میں ایک انڈونیشی وفد ہندوستان آیا تھا۔ اس وفد کے صدر مسٹر سوبھاگیو رکسوڈی پودر تھے جو اُس ملک کے ایک ممتاز سرکاری افسر ہیں۔ اس وفد کے ساتھ ایک خاتون بھی تشریف لائی تھیں۔ تقریباً ایک ماہ تک یہ وفد ہندوستان کے مختلف صوبوں کا دورہ کرتا رہا اور جمہوریۂ ہند کے پہلے انتخاب کے متعلق وفد کے افراد بیحد متاثر ہوئے جیسا کہ اُنھوں نے دہلی اور کلکتہ میں صحافی بیانات دیتے ہوئے بتایا۔

اس وفد کا ایک حصہ جس میں خود اس وفد کے لیڈر رکسوڈی پودر بھی تشریف لائے تھے صوبہ بہار بھی آیا تھا۔ پٹنہ اور آرہ ضلع کے مختلف چناؤ مرکزوں میں اس وفد نے حق نیابت کا تماشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ سرکاری انتظامات سے اس چھوٹے سے وفد کے افراد بیحد متاثر ہوئے اور چلتے وقت اُنھوں نے ایک بڑا ہمت افزا بیان دیا۔

اپنے وفد کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے مسٹر سوبھاگیو رکسوڈی پودر نے یوں فرمایا:-

"ہم ہندوستان کے اس عظیم الشان جمہوری تجربہ کو اور بالغانہ نیابت کے کرشموں کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے آئے ہیں تاکہ ہم اسے بغور دیکھ کر مستقبل قریب میں اپنے ملک کے جمہوری انتخابات کے لئے کچھ مفید معلومات و تجربات حاصل کرسکیں۔ آج ہندوستان اور انڈونیشیا کے سامنے ایک ہی جیسے مسائل درپیش ہیں اور ہمیں انھیں ایک ہی طریقے سے حل کرنا ہے تاکہ جمہوریت کی عمارت کا سنگِ بنیاد صحیح طور پر رکھا جاسکے۔"

آگے چل کر اُنھوں نے فرمایا:-

احسن طباطبائی

ہم لوگ

رہینِ دردِ و غمِ بے قیاس ہیں ہم لوگ ۔۔۔ یہ فخر ہے کہ محبت شناس ہیں ہم لوگ

ہزار بسط جس اجمال میں نمایاں ہیں ۔۔۔ کتابِ دہر کا وہ اقتباس ہیں ہم لوگ

نگاہِ لطف حقیقت سے آشنا کردے ۔۔۔ یقیں عطا ہو رہینِ قیاس ہیں ہم لوگ

ہمارا غم ہمیں سرمایۂ نشاط بھی ہے ۔۔۔ نہ اس پہ جا کہ ابھی کیوں اداس ہیں ہم لوگ

امید یاس نہ بن جائے تیری غفلت سے ۔۔۔ ابھی تو تجھ سے بہ محرومِ یاس ہیں ہم لوگ

ہمارے صبر پہ خود حُسن نے بھی ناز کیا ۔۔۔ وفا سرشتِ محبت اساس ہیں ہم لوگ

ملے نہ دادِ وفا لاکھ ہو وفورِ جفا ۔۔۔ یہ فخر کم ہے کہ اُلفت شناس ہیں ہم لوگ

کرم کا لطف اُٹھائیں ستم سے دُور رہیں ۔۔۔ اگر سپاس یہ ہے ناسپاس ہیں ہم لوگ

ہمارا ذوقِ تمنا ہے حاصلِ ارماں ۔۔۔ کرم کی آس بھی ہے گو اُداس ہیں ہم لوگ

وفا کی حد نہیں ظلم و جفا تو ہیں محدود ۔۔۔ یہ وہم ہے کہ رہینِ ہراس ہیں ہم لوگ

کبھی وفا بھی کرے گا یہی ستم ایجاد ۔۔۔ ابھی جفاؤں پہ محوِ سپاس ہیں ہم لوگ

فراق میں بھی نہ چھوٹے گا اُن کا ساتھ احسن
نظر سے دور سہی دل کے پاس ہیں ہم لوگ

"ہمارے ملک میں خواندگی کے اعداد و شمار ہندوستان سے مقابلتاً زیادہ ہیں۔ ہمارے یہاں سو میں سے پچاس آدمی خواندہ ہیں اور ہندوستان میں صرف چودہ۔"

اس امر کی توقع کرنی نامناسب نہ ہوگی کہ مستقبل میں ہندوستان اور انڈونیشیا قریب سے قریب تر ہوتے جائیں گے تاکہ آزاد ایشیا کی مختلف جمہوریتیں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے خوش و خرم اپنی مشترکہ منزل تک پہونچ سکیں۔

رفتارِ زمانہ

وزیر اعظم کی پریس کانفرنس

پردھان منتری شری جواہر لعل نہرو نے پریس کانفرنس میں یہ اعلان کیا کہ سرکار منافع خوروں کے خلاف سخت کارروائی کرے گی۔ یہ لوگ دیش کے دشمن ہیں اور ان کے ساتھ کسی قسم کی رحم دلی کا برتاؤ نہیں کیا جانا چاہیئے۔ خوراک کے مسئلے کا ذکر کرتے ہوئے شری نہرو نے کہا کہ اس سال بھارت میں گندم کی فصل اچھی ہے اور اناج کی وصولی بھی کافی اچھی ہو رہی ہے۔ کنٹرول کے بارے میں انہوں نے کہا کہ ہماری پالیسی یہ نہیں کہ سارے دیش سے کنٹرول اُٹھا لیئے جائیں۔ ہر ایک صوبے کی صورت حال کو دیکھ کر اس سلسلے میں کوئی قدم اُٹھایا جائے گا۔ کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے پردھان منتری نے کہا کہ مہاراجے کے لئے اپنے وزرا کی رائے ماننا ضروری ہے۔ اور اُسے اپنے وزرا کی وہ رائے بھی ماننی چاہیئے جو اس کے اپنے مفاد کے خلاف ہو اس لئے آئین ساز اسمبلی کو وزرا کی رائے پر شاہی خاندان کو ختم کر دینے کا بھی حق حاصل ہے۔

سویز کے رقبے میں انگریزی فوج

حکومتِ مصر نے ایک بار پھر اپنے اس فیصلے کا اعادہ کیا ہے کہ وہ مغربی ممالک کی مشرقِ وسطیٰ کی حفاظت کی قرارداد کو تب تک منظور نہیں کرے گی جب تک برطانیہ یہ گارنٹی نہیں دے گا کہ سویز کے رقبے سے انگریزی افواج نکال لی جائیں گی۔

اناج پر کنٹرول

بھارت سرکار نے اناج پر سے کنٹرول ہٹانے کی پالیسی کو ایک حد تک قبول کر لیا ہے چنانچہ اس وقت تک مدراس اور بہار میں غذائی کنٹرول ختم کر دیا گیا ہے اور دیگر صوبوں میں حالات کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ وزیر خوراک شری رفیع احمد قدوائی اس سلسلے میں تمام صوبوں کا دورہ کر رہے ہیں۔ یہ بھی تجویز ہے کہ پنجاب وپیپسو اور دہلی کا ایک حلقہ بنا کر یہاں بھی کنٹرول ڈھیلا کر دیا جائے مگر ابھی تک اس باب میں کوئی آخری فیصلہ نہیں ہو سکا۔

شیخ محمد عبداللہ کی تقریر

کشمیر ریڈیو پر عید کا پیغام نشر کرتے ہوئے شیخ محمد عبداللہ نے اعلان کیا کہ بھارت کے جھنڈے کی کشمیر میں اتنی ہی عزّت ہوگی جتنی کہ بھارت کے دوسرے حصّوں میں۔ اور میں یہ بات صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ کشمیر کا جھنڈا ہندوستانی جھنڈے کی جگہ پر نہیں بلکہ مہاراجہ کشمیر کے شخصی جھنڈے کی جگہ پر چنا گیا ہے۔ شیخ صاحب نے یہ بھی کہا کہ آئین ساز اسمبلی کو مہاراجے کی حکومت کو ختم کرنے کا پورا حق ہے۔ سب جمہوریت پسند یہ مانتے ہیں کہ آخری طاقت جنتا کے ہاتھ میں ہے راجاؤں کے ہاتھ میں نہیں اس لئے بنیادی حقوق کو حاصل کرنے کے لئے کشمیر کے عوام بار بار کوشش کرتے آئے ہیں اور اس سلسلے میں بھارت کے لیڈروں سے شروع ہی میں مشورہ لے لیا گیا تھا۔

مقبوضہ کشمیر میں بدنظمی

جموں میں موصول شدہ خبروں کے مطابق نام نہاد آزاد کشمیر کی راجدھانی مظفر آباد میں پاکستانی افواج کی چیرہ دستیوں سے تنگ آکر عوام نے بغاوت کر دی جس پر پاکستانی پولیس نے باغیوں پر گولی چلا دی۔ چھ اشخاص ہلاک اور پندرہ مجروح ہوئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ تین ہزار اشخاص نے تھانے پر حملہ بول دیا۔ مظاہرین نے "پاکستان مردہ باد" اور "ہمیں روٹی دو" کے نعرے لگائے۔ شہر میں کرفیو لگا دیا گیا ہے اور لوگوں کو دھڑا دھڑ گرفتار کیا جا رہا ہے۔

بیٹس ڈنلپ خریدتے وقت
اِن ۳ باتوں کا خیال رکھئے
ڈندانے
ٹریڈ مارک
نام
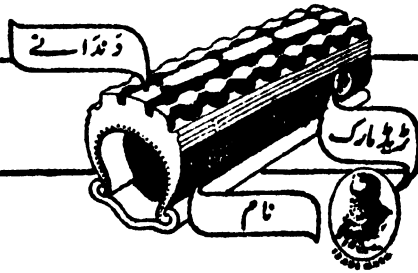
کھانوں کی پسند
صحت کیلئے کیجئے
اچھی صحت اور طاقت کے لئے ہیں موزوں یعنی ملے جلے غذائی اجزاء
والی خوراک کھانی چاہئے۔ جدا جدا کھانوں کے جدا جدا
غذائی اجزاء اس طرح سے ہیں:-
(۱) معدنیات ہڈیوں، دانتوں اور نشوونمائی کیلئے (۲) وٹامن صاف
خون بنانے اور بیماری کی روک تھام کیلئے (۳) پروٹین جسم کے ٹوٹے پھوٹے
حصوں اور پٹھوں کی اصلاح کیلئے (۴) کاربوہائیڈریٹ جسم کو جلدی
"گرمی" پہنچانے کیلئے (۵) چکنائی دیرپا قوت کیلئے۔ اسلئے، آپ کی غذا
موزوں ہونی چاہئے جس میں یہ پانچوں غذائی اجزاء شامل ہوں۔ ڈالڈا
آپ کے لئے ایک نہایت اچھی چکنائی ہے کیونکہ یہ خالص اور قوت بخش ہے
مہربند ڈبوں میں یہ ہمیشہ صاف اور تازہ بھی رہتا ہے۔ موزوں غذا کے بارے میں
مکمل اور مفت صلاح حاصل کرنے کیلئے آج ہی لکھئے۔ یا کبھی بھی:
دی ڈالڈا ایڈوائزری سروس
پوسٹ بکس نمبر ۳۵۳، بمبئی ۱
قوت کیلئے
ڈالڈا
سے کھانا پکائیے
معدنیات
وٹامن
پروٹین
کاربوہائیڈریٹ
چکنائی
DALDA
HYDROGENATED GROUNDNUT AND TIL OIL
HVM. 176-50 UD
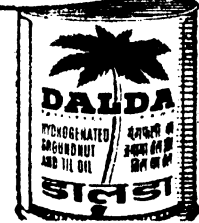
نذیر رحمانی

انعام

بچو! شیر شاہ سُوری کا نام تو تم نے ضرور سُنا ہوگا، اپنے دیش کے پُرانے بادشاہوں میں اس نے معمولی درجے سے ترقی کی اور اپنی لیاقت و ذہانت اور محنت و شجاعت سے بادشاہت کے مرتبے تک پہنچا۔

یہ بادشاہ اپنی رعایا کا بہت خیال رکھتا تھا، اس نے کثرت سے سڑکیں بنوائیں اور ان سڑکوں کے دونوں طرف کنوئیں کھُدوائے اور پھل والے درخت لگوائے۔ تاکہ مسافر کنوئیں سے پانی پئیں۔ درختوں کے پھل کھائیں اور سایے میں بیٹھ کر آرام کرسکیں۔ اس نے عام لوگوں کی بھلائی اور بہتری کے لئے بہت سے قانون و قواعد بھی بنائے۔ گھوڑوں کی پہچان اور گنتی کی آسانی کے لئے انہیں داغنے کا طریقہ بھی اس نے جاری کیا تھا —— اس بادشاہ کے اور حالات تو تم بڑے ہوکر دوسری کتابوں میں پڑھوگے، اس وقت ہم تمہیں اس کے زمانے کا ایک قصہ سُناتے ہیں۔

شیر شاہ اکثر و بیشتر اپنے وزیروں کو ساتھ لے کر شہر اور دیہات کا دَورہ کیا کرتا تھا اور مختصر سا خزانہ بھی اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ دَورے کے وقت وہ ہر قسم کے لوگوں سے ملتا تھا، اُن سے بات چیت کرتا تھا اور ان کا حال احوال پوچھتا تھا، اس نے یہ اصول بھی بنایا تھا کہ جب وہ کسی آدمی کی بات پر خوش ہوتا تھا تو اس کو کچھ انعام دیتا تھا۔

ایسے ہی ایک دَورے کا ذکر ہے کہ شیر شاہ ایک گاؤں سے گزر رہا تھا، اس نے دیکھا کہ ایک بڈھا کسان کھیت کے کنارے شیشم کا پودا لگا رہا ہے۔ بادشاہ نے اپنی سواری رُکوادی اور اس کے قریب جاکر بولا "بڑے میاں! عمر تو تمہاری اتنی گزر چکی، ضعیف و کمزور اس درجہ ہو کہ اُٹھا بیٹھا بھی نہ جاتا ہوگا اور پودا تم وہ لگا رہے ہو جو ایک بڑی مدت کے بعد درخت بنے گا اور برسوں میں پھل دیگا"۔ کسان نے کہا "حضور! یہ درخت میں خود اپنے لئے نہیں لگا رہا ہوں بلکہ دوسرے لوگوں کے فائدے کے لئے لگا رہا ہوں، اسی طرح جیسے مجھ سے پہلے اور آدمیوں نے ایسے درخت لگائے اور مجھ

کو فائدہ پہنچا"۔ شہنشاہ بڈھے کے اس جواب کو سن کر بہت خوش ہوا اور اسے ایک سو روپیہ انعام دیا۔ بڈھا عقلمند اور حاضر جواب تھا، اس نے فوراً کہا۔ "سرکار! آپ تو کہتے تھے کہ یہ درخت برسوں میں پھل دے گا مگر اس نے تو مجھے ابھی ذرا سی ہی دیر میں پھل دے دیا"۔ بڈھے کا یہ جواب بھی شہنشاہ کو پسند آیا اور اس نے سو روپیہ بڈھے کو اور دیا۔ بوڑھا کسان پھر بولا۔ "غریب پرور! یہ درخت زندگی میں صرف ایک بار پھل

دیتا ہے مگر اس نے تو مجھے ابھی اسی وقت دو مرتبہ پھل دلوا دیئے"۔ بڈھے کی اس حاضر جوابی سے شہنشاہ کو پھر ہنسی آ گئی اور اس نے سو روپیہ بڈھے کو اور دیا۔

اس کے بعد شہنشاہ آگے روانہ ہو گیا اور بڈھا کسان شہنشاہ کے جان و مال اور عزت و اقبال کو دعائیں دیتا ہوا پودا لگانے میں مصروف ہو گیا۔

رام لبھایا سوز

لطیفے

(۱)

ایک ظریف نے کسی شخص سے پوچھا کہ سورج مغرب میں کیوں ڈوبتا ہے اور مشرق سے کیوں نکلتا ہے؟

وہ شخص بولا۔ "یہ تو جس بیوقوف سے پوچھو گے بتا دے گا"۔

ظریف نے کہا۔ اس لئے تو آپ سے پوچھ رہا ہوں۔

(۲)

ایک میراسی کسی امیر سے کچھ مانگنے گیا۔ امیر کے چہرے پر اس قدر بال تھے کہ اس کا منہ بمشکل دکھائی دیتا تھا۔ امیر نے بجائے اس کے کہ میراسی کو کچھ دیئے گالیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ اس پر میراسی بولا "آپ ناراض نہ ہوں میں یہی دیکھنا چاہتا تھا کہ آپ بولتے کہاں سے ہیں؟

(۳)

ایک حکیم نے مریض سے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ تم مجھے گدھا سمجھتے ہو"۔
مریض بولا۔ "آپ واقعی بڑے لائق ہیں۔ نبض دیکھ کر دل کی بات بتا دیتے ہیں"۔

(۴)

پہلا شخص۔ "کیا حال ہے"؟
دوسرا شخص۔ "کیا کہوں مر کے بچا ہوں"۔
پہلا شخص۔ "افسوس"۔

(۵)

استاد۔ (شاگرد سے) ایک اور ایک کتنے ہوتے ہیں؟
شاگرد۔ تین
استاد۔ تم بیوقوف ہو۔ فرض کرو تم کو اور مجھ کو ملا دیا جاوے تو کتنے ہوتے؟
شاگرد۔ (جھڑکی سے) جناب دو بیوقوف۔

آج کل

اکتوبر ۱۹۵۲ء

اس شمارے میں

جواہرلال نہرو
جگر مرادآبادی
رشید احمد صدیقی
جوش ملسیانی
سیماب مرحوم
چودھری فیرچنگ
اور
جوش ملیح آبادی

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- بال مکند عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد

جلد ۱۱ —————— نمبر ۳

سالانہ چندہ —— { ہندوستان میں - چھ روپے
پاکستان میں - چھ روپے }

غیر ممالک سے —— نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- —— { ہندوستان میں - آٹھ آنے
پاکستان میں - آٹھ آنے }

اکتوبر ۱۹۵۲ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

ترتیب

بچوں کا آج کل

سیماب اکبر آبادیؒ

غزل

نفیرِ رہنما میں ہے ، نوائے سارباں میں ہے
مری آواز بھی شاملِ درائے کارواں میں ہے

تو ناحق حسرتِ طولانیٔ عمرِ رواں میں ہے
حیاتِ جاوداں ترکِ حیاتِ جاوداں میں ہے

ابھی سے فکرِ گنجائش زمین و آسماں میں ہے
اُٹھے گی پھر وہ دنیا جو حجابِ خاکداں میں ہے

خدا جانے نہیں ہے یا نگاہِ رازداں میں ہے
کہ اک عنوان ہر تارا کتابِ آسماں میں ہے

ہُوں کتنی اُمیدیں، جانے کس کس کی ہوئی ہونگی
ابھی تک بوئے خوں گردِ غبارِ کارواں میں ہے

ملی تو مجھ کو آزادی مگر اِس عالمِ نو میں
قفس ہی کا سا اک عالم فضائے آشیاں میں ہے

بہت مشکل ہُوا دیر و حرم کا متحد ہونا
کہ اب اِک حدِ فاصل بانگِ ناقوس و اذاں میں ہے

مسافر اپنی سعیٔ رائیگاں سے ہو نہ آزردہ
ترا ذوقِ طلب محفوظ سعیٔ رائیگاں میں ہے

رہیں ہشیار، جو آسودہ خاطر ہیں بہاروں میں
کہ بوئے انقلابِ نو ہوائے گلستاں میں ہے

گلستاں لالہ گوں ہے خونِ ناحق سے، مگر اب بھی
وہی پہلی سی رنگینی مزاجِ باغباں میں ہے

زمیں کے انقلاب اب تک ہزاروں آنکھ سے گزرے
نظر اب انتظارِ انقلابِ آسماں میں ہے

دلِ انساں میں پیدا ہو تو انساں طُور بن جائے
مرے سجدوں کی وہ گرمی جو سنگِ آستاں میں ہے

محبت، مشترک اِک قدر ہے ابنائے آدم کی
رواج اس کا ابھی باقی ہے اور سارے جہاں میں ہے

تقاضوں سے ہے محفل گرم، ہم خاموش بیٹھے ہیں
اثر کتنا ہماری نیم گفتہ داستاں میں ہے

بڑھائے جا یونہی گیرائیاں اپنی عقیدت کی
یقیں میں خود وہ آجائے گا کچھ کہ جو گماں میں ہے

خدا وہ دن کرے، برپا ہو محشر اور دیکھوں میں
کہ رودادِ جہاں کی پیشکش میری زباں میں ہے

بھلا دوں کس طرح سیماب صد سالہ تعلق کو
مرا سرمایۂ ماضی ابھی ہندوستاں میں ہے

سنہ ۱۹۲۹ء

غیر مطبوعہ

جواہر لال نہرو

کشمیر

قانوناً و حقیقتاً بھارت و کشمیر کا الحاق مکمل ہے۔ اخلاقی، سیاسی یا آئینی یا کسی بھی لحاظ سے پاکستان کو کشمیر میں کوئی حیثیت حاصل نہیں بھارت نہ صرف اس مسئلے کے روز آغاز سے ہی بلکہ تقسیم ملک کے پہلے سے ہی جموں و کشمیر کے مستقبل کے لئے ریاست کے لوگوں کی مرضی و منظوری سے ہی کوئی اقدام کرنے کا حامی رہا ہے۔

بھارت کی باقی ریاستوں کے مقابلے میں ریاست کشمیر بجا طور پر ایک جداگانہ حیثیت کی حامل ہے اور تکمیل آئین کے وقت ریاستی امور سے متعلقہ وزارت کے وزیر سورگیہ سردار پٹیل نے جموں و کشمیر کو ایک خاص درجہ دینے کی حمایت کی۔

جموں و کشمیر کی ریاست اپنے افلاس و پسماندگی کے باوجود کئی سال سے ایک تفریح گاہ بنی ہوئی ہے۔ سیاسی طور پر یہ ایک جوہڑ کی مانند تھی لیکن زمانے کی رفتار نے یکایک اسے ایک تاریخی دھارے میں بدل دیا اور پے در پے وہاں ایسے واقعات ہوئے کہ قدرتی طور پر لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول ہو گئی۔ ریاست کا معاملہ ایک بین الاقوامی معاملہ بن گیا۔ اس معاملہ میں بھارت کی توجہ اور دلچسپی کہیں زیادہ ہے کیونکہ بھارت اور کشمیر میں ایک ہزار سے زیادہ سال سے تعلقات چلے آ رہے ہیں۔ حال ہی کے واقعات سے یہ دونوں ایک دوسرے کے اور نزدیک ہو گئے ہیں۔

اس پس منظر کے علاوہ جغرافیائی طور پر کشمیر بھارت کا ایک حصہ ہوتے ہوئے قلب ایشیا بھی ہے سالہا سال تک بڑے بڑے قافلے بھارت اور کشمیر سے گزر کر مدھیہ ایشیا تک جاتے رہے ہیں اور اس طرح کئی صدیوں تک کشمیر کے ذریعے بھارت اور مدھیہ ایشیا میں گہرے ثقافتی اور سیاسی تعلقات رہے۔

آج زمانے کے واقعات کا دھارا بہت تیز ہے۔ دنیا کے بعض حصوں میں تو یہ دھارا غضبناک اور طوفان خیز ہے۔ بعض اوقات یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہماری بسر اوقات امن کے ایک پتلے پرت پر ہے کئی بار یہ خدشہ ہوتا ہے کہ یہ پرت تڑخ جائے گا اور بعض اوقات اس میں شگاف بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ حال ہی میں پچھمی ایشیا کی کچھ ریاستوں سے ایسی خبریں آئی ہیں ملکوں کا استحکام کمزور ہو رہا ہے لیکن اس باب میں بھارت قدرے خوش نصیب ہے۔ یہاں کی انتظامیہ مشینری کافی مستحکم اور اس کا رجحان ترقی کی طرف ہے لیکن اس وسیع و عریض دنیا میں کوئی شخص ان شگافوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

بھارت کی عظیم الشان قومی تحریک کے زیر اثر ملک کی دوسری ریاستوں کی طرح اس ریاست میں بھی جاگیردارانہ نظام کے خلاف آواز اٹھی۔ یہ آواز ایک عوامی تحریک بن گئی ایک ایسی تحریک جو اپنی مضبوطی و تنظیم کے لحاظ سے باقی سب ریاستوں کو پیچھے چھوڑ گئی۔ یہ تحریک آل انڈیا اسٹیٹس پیپلز کانفرنس سے وابستہ تھی لہذا یہ بھارت کی قومی تحریک کا ایک حصہ ہو گئی۔ اور اس تحریک کے نتیجہ کے طور پر عوام اور ریاستی حکومتوں میں اکثر کشمکش ہوتی رہی۔

برطانوی حکومت نے ملک کی تقسیم کرتے ہوئے ریاستوں کی صورت کے بارے میں ایک مبہم بیان دیا جس سے ان ریاستوں میں بہت حد تک علیحدگی کے رجحانات کی حوصلہ افزائی ہونے کا امکان پیدا ہوا۔ اس سے بعض حکمرانوں میں کم و بیش خود مختاری اختیار کرنے کا خیال پیدا ہوا چنانچہ ملک کی باگ ڈور سنبھالنے پر جولائی اور اگست ۱۹۴۷ء میں حکومت کو ریاستوں کے مسئلے کا سامنا ہوا۔

اس وقت خوش قسمتی سے اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے سردار پٹیل کی عظیم شخصیت ہمارے درمیان موجود تھی۔ آزادی حاصل ہونے سے قبل

کہ دو تین ہفتوں میں ہی ماسوائے حیدرآباد کشمیر اور چند ایک دیگر چھوٹی ریاستوں کے باقی سب کی سب ریاستیں مملکت ہند سے ملحق ہوگئیں۔ غالباً یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ حیدرآباد کا معاملہ ایک خاص نوعیت کا تھا۔ دیگر چھوٹی ریاستوں کا معاملہ چنداں اہم نہ تھا۔

یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ریاستوں کی ہند یونین میں شمولیت کے سلسلے میں لارڈ مونٹ بیٹن جو اس وقت گورنر جنرل تھے بہت مددگار ثابت ہوئے انہوں نے تمام حکمرانوں پر واضح کر دیا تھا۔ کہ وہ بھارت کے خلاف برطانوی حکومت سے کسی مدد کی آس نہ رکھیں۔ وہ صرف بھارت کی حکومت پر ہی بھروسہ کر سکتے ہیں۔ ان حکمرانوں کی رعایا ان سے مطمئن نہ تھی اور وہ اس صورت حالات میں انقلاب کی خواہشمند تھی۔ اس لئے جب ان کا آخری سہارا برطانوی حکومت بھی ان کو جواب دے گئی تو ان کے پاس سوائے بھارت یونین میں شامل ہو جانے کے اور کوئی چارہ کار نہ رہا۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ بڑی سرعت سے بھارت سے ملحق ہو گئے۔ سب کے سب حکمران تین بنیادی امور یعنی دفاع۔ معاملات خارجہ اور رسل و رسائل کے متعلق یونین کے ساتھ شامل ہوئے تھے۔ اس طرح ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو مملکت ہند عالم وجود میں آئی۔ جس میں حیدرآباد۔ کشمیر اور چند ایک چھوٹی ریاستوں کے علاوہ سب ریاستیں شامل ہو چکی تھیں۔

کشمیر کے معاملے پر ہم نے ۱۵ اگست سے بہت پہلے غالباً وسط جولائی میں غیر رسمی طور پر غور کیا تھا اس وقت ہم نے یہ رائے دی تھی کہ کشمیر کا معاملہ ایک خاص نوعیت کا ہے۔ بھارت سرکار کی عام پالیسی کے بارے میں ریاستوں سے متعلقہ امور کے وزیر سردار پٹیل نے واضح الفاظ میں اعلان کیا تھا۔ کہ شک و شبہ کی صورت میں متعلقہ ریاست کے لوگوں کی رائے کو مقدم سمجھا جائے گا۔ بلاشبہ تمام ریاستیں بھارت یونین کا جزو بننے کی خواہشمند تھیں اس لئے کسی کے صلاح مشورہ کی ضرورت ہرگز نہیں تھی۔ لیکن ہم نے اعلان کیا تھا کہ اگر کسی ریاست کے بارے میں کوئی خدشہ ہوگا تو ہم اس ریاست کے لوگوں کی رائے حاصل کرتے کے اور اس کے پابند ہونگے یہ ایک عام پالیسی تھی جس کا سب ریاستوں پر اطلاق ہوتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی بھی ریاست کے متعلق یہ سوال پیدا ہی نہ ہوا۔

جولائی میں ہم نے غیر رسمی طور پر کشمیر کے معاملے پر غور کیا۔ اس وقت کشمیر کی عوامی جماعت نیشنل کانفرنس اور اس کے رہنماؤں کے علاوہ مہاراجہ کی حکومت کے ساتھ بھی ہمارے تعلقات قائم تھے پھر بھی ہم نے ان دونوں کو یہ رائے دی کہ کشمیر کا معاملہ خاص نوعیت کا ہے۔ اور اس بارے میں کوئی جلد بازی نہیں کرنی چاہیئے۔ اس لئے ریاست کے لوگوں کی رائے جاننے کے عام اصول کا کشمیر پر خاص طور پر اطلاق ہونا چاہیئے۔ یہ فیصلہ ملک کی تقسیم اور حصول آزادی سے پہلے کیا گیا تھا۔ ہم نے واضح کر دیا تھا کہ اگر مہاراجہ اور اس کی حکومت بھی بھارت میں شامل ہونے کے خواہشمند ہونگے تو بھی ہم الحاق کرنے سے قبل ریاست کے لوگوں کی رائے حاصل کرنا پسند کرینگے۔

اس وقت یعنی جولائی ۱۹۴۷ء میں ہمارا خیال تھا کہ اس مقصد کے لئے ریاست میں کسی قسم کی آئین ساز اسمبلی منتخب کی جائیگی اور درمیانی عرصہ کے لئے ہم نے یہ مشورہ دیا کہ بھارت اور پاکستان جو بہت جلد عالم وجود میں آنے والے تھے دونوں کے ساتھ معاہدۂ تعلقات جاریہ کیا جائے۔

اکتوبر ۱۹۴۷ء کے آخری ہفتہ میں اچانک ہی پاکستان کے راستے سے کشمیر پر حملہ ہو گیا۔ پاکستان میں اکثر مرتبہ یہ کہا گیا ہے کہ بھارت نے کشمیر کے لیڈروں کے ساتھ مل کر پونچھ اور ریاست کے دیگر مختلف حصوں میں گڑبڑ پیدا کرنے کی گہری سازش کی تھی۔ کچھ لوگوں نے تو یہ بھی کہا ہے کہ ہمیں اس حملہ کا پہلے سے علم تھا اصلیت یہ ہے کہ جب ہم نے اس حملہ کی خبر پہلی بار سنی تو ہم فرط حیرت سے مبہوت رہ گئے۔ ایک دو روز ہم نے اس معاملہ پر گہرا غور و خوض کیا۔ ہمیں کچھ نہیں سوجھتا تھا کہ ہم کیا کریں۔

ہم ایسی ہی پریشانیوں میں مصروف تھے کہ قبائلی حملہ آوروں کے لوٹ مار آتش زنی اور عورتوں کی آبروریزی کی خبریں آنی شروع ہوئیں اور بھارت کے عوام کے جذبات بھڑک اٹھے۔ اس وقت ریاست جموں و کشمیر کے عوام کے جذبات کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ دریں اثنا ہمیں مہاراجہ کی حکومت اور کشمیر کی مقبول عام تنظیم کی طرف سے امداد اور بھارت میں ادغام کی درخواستیں موصول ہوئیں۔ مجھے یاد ہے کہ غالباً ۲۴ اکتوبر کو ہم تمام دن اس مسئلے پر غور و خوض کرتے رہے۔ بالآخر شام کو اس نتیجہ پر پہنچے کہ کسی صورت سے بھی ہمیں ان درخواستوں کو رد نہ کرنا چاہیئے۔ اور ہمیں ان کی امداد کے لئے جانا چاہیئے۔ لیکن سب سے زیادہ دشواری یہ تھی کہ سوائے ہوائی

راستہ کے ہمارے لئے اور کوئی چارۂ کار نہ تھا اور اس میں بھی یہ شبہ تھا کہ شاید کشمیر کا تنہا ہوائی میدان بھی دشمنوں کے ہاتھوں میں نہ ہو۔ بہرکیف ہم نے امداد کے لئے وہاں پر پہنچنے کا عزم کیا اور فیصلے کے بارہ گھنٹے کے بعد فوجیں ہوائی جہازوں کے ذریعے بھیج دی گئیں۔ خوش قسمتی سے ہماری فوجیں وقت پر جا اتریں۔ اگر کہیں ۲۴ گھنٹے کی اور تاخیر ہو جاتی تو ہوائی میدان دشمنوں کے قبضہ میں چلا جاتا اور ہماری دشواریوں اور مشکلات میں مزید اضافہ کا باعث ہوتا۔ ہماری فوجیں ہوائی میدان میں اتر کر سیدھی حملہ آوروں کے مقابلہ پر جا کر ڈٹ گئیں اور انہیں پیچھے دھکیل دیا۔ ہم ان حملہ آوروں کو محض قبائلی لوگ سمجھتے رہے لیکن درحقیقت پاکستان ان کی ہمت افزائی کر رہا تھا اور مدد دے رہا تھا۔ ابتدا میں ہم نے قبائلیوں کو مار بھگانے کے کام کو معمولی فوجی کارروائیاں خیال کیا تھا۔

ہماری فوجوں کے پہنچنے سے تین چار روز پہلے نہ تو وہاں کوئی حکومت تھی اور نہ کوئی نظم و نسق باقی تھا۔ اور میرے خیال میں وہاں پر پولیس کا بھی کوئی نام و نشان باقی نہ رہا تھا۔ یہ بڑا نازک وقت تھا حملہ آور شہر سری نگر کی طرف یلغار کرتے چلے آ رہے تھے اور سری نگر کے لوگوں کو ان حملہ آوروں سے بچانے کے لئے کوئی بھی نظر نہ آتا تھا۔ ہاں لوگوں ہی نے کمر ہمت باندھی اور نیشنل کانفرنس کے نہتے والنٹیروں نے اپنی جواں مردی سے شہر کو بچایا انہوں نے عوام میں اخلاقی جوش و خروش پیدا کیا اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جب دشمن شہر سری نگر سے دس بارہ میل کے فاصلے پر تھا تو بازار کھلے ہوتے تھے اور کاروبار جاری تھا۔ اس امر سے ایسے نازک وقت میں قومی تحریک اور عوام کی اخلاقی جرأت کا ثبوت ملتا ہے۔ بہرحال ہم نے حملہ آوروں کو اُوڑی تک دھکیل دیا۔ یہ اُوڑی وہی مقام ہے جہاں ایک سال پہلے میں مہاراجہ کی حکومت کا قیدی تھا۔ اچانک اوڑی سے پرے ہماری فوجوں کو معلوم ہوا کہ ان کا ٹکراؤ قبائلیوں سے نہیں ہے بلکہ وہ پاکستان کی مسلح فوجوں سے لڑ رہے ہیں۔ لہٰذا اب چونکہ معاملے کی نوعیت بالکل بدل گئی اس لئے ہماری فوجوں کو کچھ عرصے کے لئے یہیں رکنا پڑا۔ یہ نومبر ۱۹۴۷ء کا واقعہ ہے اور اس وقت سے جموں کسی نہ کسی مقام اور کشمیر کے شمالی اطراف میں لڑائیاں ہوتی رہیں۔ بالآخر دسمبر میں جب ہم نے دیکھا کہ ہمارا مقابلہ پاکستان کی مسلح افواج سے ہوا ہے تو فوراً ہی یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ ممکن ہے یہ معاملہ طول پکڑ جائے اور ہمیں پاکستان سے پوری طرح سے جنگ آزمائی کرنی پڑے۔

ہم نے غالباً دسمبر ۱۹۴۷ء میں اس معاملے کو اقوام متحدہ کے سامنے پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہمارا دعویٰ یہ تھا کہ کچھ قبائلی لوگ پاکستان کے علاقوں میں سے ہو کر ریاست کشمیر کی حدود میں گھس آئے ہیں اور پاکستان نے ان کی امداد کے علاوہ انہیں شہ بھی دی ہے سلامتی کونسل سے ہماری درخواست یہ تھی کہ وہ حکومت پاکستان کو مطلع کر دے کہ وہ ان قبائلیوں کی نہ مدد کرے نہ ان کو شہ دے۔ باقی معاملات کو ہم نے خود ہی سرانجام دینے کا فیصلہ کیا ہم نے براہ راست بھی پاکستان کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا لیکن پاکستان نے شدت سے کہا کہ اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ ہزاروں آدمی پاکستان کے علاقوں میں سے بغیر حکومت پاکستان کے علم میں آئے کیسے گزر گئے۔ بہرکیف حکومت پاکستان کئی ماہ تک اس بات سے انکار کرتی رہی کہ قبائلی اس کی مدد سے اس کے علاقہ سے گزر کر کشمیر پر حملہ آور ہوئے ہیں اور اس کی فوجوں نے کشمیر پر حملہ کرنے میں حصہ لیا ہے لیکن اس کے برعکس ہمارے پاس بے انتہا ثبوت فراہم ہو گئے اور ہمارے محکمہ دفاع کے اشخاص نے دہلی میں ایک عجائب گھر قائم کیا جس میں پاکستان کی فوجوں کا ہاتھ آیا ہوا ہر قسم کا سامان مثلاً سپاہیوں کی ڈائریاں اور تمغہ جات وغیرہ دکھائے گئے۔

۳۱ دسمبر ۱۹۴۸ء کو دونوں فریقین نے جنگ بند کرنے پر سمجھوتہ کیا اور اس دن سے بڑے پیمانے پر کوئی جنگی کارروائی عمل میں نہیں آئی حالانکہ سرحدیں پار کرنے اور دیگر چھوٹے چھوٹے واقعات کافی تعداد میں رونما ہوتے رہے۔ اس کے بعد سے یہ مسئلہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل، کشمیر کمیشن اور اقوام متحدہ کے نمائندوں کے زیر بحث رہا ہے۔

اس مسئلے کو سلجھانے کے لئے آخر میں ڈاکٹر گراہم مقرر کئے گئے جو اب تک یہاں دو بار آ چکے ہیں ہم سے اور حکومت پاکستان سے طویل گفت و شنید کر چکے ہیں اور آج بھی نیویارک میں اس طرح کی بات چیت کی جا رہی ہے انہوں نے اپنی چھان بین کو کشمیر سے فوجوں کو واپس بلانے تک محدود رکھا۔

ڈاکٹر گراہم اپنی تمام مساعی صرف اسی مسئلے پر صرف کر رہے ہیں جسے فوجوں کو واپس بلانے کا مسئلہ کہا جاتا ہے۔ انھوں نے بارہ تجویزیں پیش کی تھیں۔ ان میں سے ہم نے آٹھ منظور کیں۔ ایک یا دو میں ہم کچھ تبدیلی چاہتے تھے۔ ایک یا دو ہم نے منظور نہ کیں۔ ڈاکٹر گراہم نے اپنا کام خلوص اور تحمّل سے کیا ہے۔ ہم خود بھی بڑے تحمّل سے کام لے رہے ہیں اور ہمارے تحمّل کا مقابلہ دوسرے کے تحمّل سے کیا جا سکتا ہے۔

جموّں اور کشمیر سے باقی ریاستوں سے جدا برتاؤ کرنے کی خاص وجوہ تھیں۔

(۱) یہ سارا معاملہ ایک کچّی حالت میں تھا۔ یہ اقوامِ متحدّہ کے سامنے پیش تھا وغیرہ

(۲) ہم نے بالکل شروع ہی سے یہ تسلیم کیا تھا کہ کشمیر کی حیثیت کچھ مختلف ہے

(۳) ہم نے بالکل شروع ہی سے بلکہ ملک کی تقسیم سے قبل بھی بار بار یہ کہا تھا کہ لوگوں کی مرضی اور منظوری کے بغیر جموّں اور کشمیر کے متعلق کوئی اقدام نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ کشمیر نے دفاع مواصلات اور خارجہ معاملات کے بارے میں ہی بھارت سے الحاق کیا۔ یہ کام ان دنوں سردار پٹیل کے ہاتھ میں تھا۔

اس کے بعد آئین کی تکمیل کرتے وقت کشمیر کے لئے اس کی جداگانہ حیثیت پیشِ نظر رہی۔ چنانچہ جموّں و کشمیر کے لئے آئین میں ایک غیر معمولی دفعہ رکھی گئی ہر شخص کو معلوم ہوگا کہ آئین کو حتمی بناتے وقت صورتِ حال کیا تھی۔ دفعہ ۳۷۰ میں بھارت یونین نے اس یونٹ کے تعلقات کی اختصار کے ساتھ وضاحت کر دی ہے۔ اس کے بعد ۲۶ جنوری کو راشٹرپتی نے دفعہ ۳۷۰ کے ضابطہ کے تحت ایک فرمان جاری کیا جس میں آئین کے اس حصہ کے متن کی وضاحت کر دی گئی تھی جو ریاست جموّں و کشمیر پر نافذ ہوتا ہے۔ یہ امر بالکل واضح ہے کہ دفعہ ۳۷۰ کی حیثیت بالکل عارضی ہے اور پورے آئین کو ردّ و بدل کئے بغیر راشٹرپتی کو کسی نوع یا کسی حصہ کو اس میں اضافہ کرنے کا اختیار ہے تاہم آئین میں پرانے اصول کو دہرایا گیا ہے اور اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ جب کوئی تبدیلی یا تبدیلیاں کی جائیں تو اس کی منظوری ریاست جموّں و کشمیر کی آئین ساز اسمبلی سے بھی حاصل کرنی ضروری ہے۔ لیکن آئین بناتے وقت یہ اسمبلی معرضِ وجود میں نہ آئی تھی۔

ابتدا ہی سے ہمارا رویّہ یہ رہا ہے کہ عوام کی مرضی کے خلاف اُن پر کوئی حکم ٹھونسا نہ جائے۔ جب یہ معاملہ ایک بین الاقوامی مسئلہ بن گیا ہے تو ہم ایسی کوئی بات نہیں کرنا چاہتے جو اقوام متحدّہ سے کئے ہوئے وعدوں کے برعکس ہو۔

اس کے بعد کشمیر کی آئین ساز مجلس وجود میں آئی۔ لیکن جب اس اسمبلی کے لئے پہلے الیکشن کا مسئلہ سامنے آیا تو سلامتی کونسل میں بعض ملکوں نے اس کی مخالفت کی۔ اور پاکستان تو اس مسئلے سے بہت ہی چراغ پا ہُوا۔ لیکن کشمیر اور بھارت کے اندرُونی تعلقات میں غیر ممالک کی دست اندازی کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ بہر کیف گذشتہ سال سے کشمیر کی آئینی ساز مجلس قائم ہو گئی ہے اور اس نے بہت سے اہم امور سرانجام دیئے اور بہت سی اصلاحات نافذ کی ہیں۔ پھر یہ اسمبلی ریاست جموّں و کشمیر کے لئے آئین مرتّب کرنے میں مشغول ہو گئی ہے اور ہمیں فوراً ہی موجودہ مسئلے سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ یہ اس گفت و شنید کی روئداد ہے جو حکومت جموّں اور کشمیر کے سربرآوردہ اشخاص، ارکان اور ہمارے درمیان ہوئی ہے۔ ہماری یہ خواہش نہیں ہے کہ ہمارے تعلقات ایسے ہوں جن میں نہ کوئی تبدیلی ہو سکے اور وہ حتمی ہوں۔ لیکن یہ امر بھی اشد ضروری ہے کہ کوئی ایسا قانون وضع نہ ہونا چاہیئے جو ہمارے آئین کے ضابطوں میں نہ کھپ سکے

کشمیر کی آئین ساز مجلس نے زرعی اصلاحات کا مسئلہ نہایت خوبی سے سرانجام دیا ہے۔ ان اصلاحات کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے مالک کے حقوق غصب کر لئے ہیں، یہ بالکل غلط ہے۔ بلکہ اس نے تو ہر مالک کے لئے ۲۲ ۲۔ ایکڑ زمین اور باغات رہنے دیئے ہیں اور باغات کو تو چھوا تک نہیں۔ ان کے علاوہ چراگاہوں وغیرہ کی زمینیں بھی ہیں اور اُن پر مالک ہی قابض ہیں۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ کشمیر میں زمین کی مالکانہ اوسط فی کس دو۔ ایکڑ ہے۔ اس کے مقابلہ میں ۲۲ ۲۔ ایکڑ بہت زیادہ فراخ دلی کا ثبوت ہے۔

ہماری گفت و شنید کے دوران میں یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ یہ ریاست جموں و کشمیر، بھارت ری پبلک کا ایک یونٹ ہے یا ایک آئینی حصّہ ہے اور جبکہ یہ بھارت کا ایک یونٹ تسلیم کر لیا گیا تو وہ بھارت کے علاقوں کا ایک حصّہ بھی بن جاتا ہے اور یہی بنیادی صورت حال ہے۔

اب شہریت کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے اور ہمارے کشمیری دوست شہریت کے دوچار ضمنی امور کے متعلق تشویش میں پڑ گئے ہیں۔ بہت عرصہ گزرا یعنی مہاراجہ کے وقت سے ہی غیر کشمیری کو کشمیر میں زمین خریدنے یا زمین کا ٹھیکہ لینے کی اجازت نہ تھی۔

صحت افزا آب و ہوا کی وجہ سے انگریز لوگ بڑی بھاری تعداد میں کشمیر میں جائدادیں حاصل کر کے رہائش اختیار کرنے لگے تھے۔ مہاراجہ کو اس سے بہت اندیشہ لاحق ہُوا تھا۔ اس لئے مہاراجہ اس بات پر بضد رہے کہ ریاست کے باہر کا کوئی

آدمی وہاں زمین حاصل نہ کرسکے گا۔ اور یہ قانون اب تک رائج ہے۔ موجودہ حکومتِ کشمیر اپنے اس حق کو محفوظ رکھنا چاہتی ہے۔ کیونکہ اُن کو بجا طور پر یہ خوف ہے کہ کشمیر پر وہ لوگ قابض ہو جائیں گے جن کی واحد صفت یہ ہوگی کہ ان کے پاس دولت کی فراوانی ہے۔ ہمارے آئین کی کلاز ۵ کی دفعہ ۱۹ کے تحت ریاست کا موجودہ قانون اور اس ضمن کا کوئی دیگر قانون بالکل جائز ہوگا۔ اس لئے ہم نے منظور کر لیا ہے کہ

ریاست کی مجلس قانون ساز کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ ریاست کے مستقل باشندوں کے حقوق اور مراعات اور خاص کر غیر منقولہ جائدادوں کے حصول، ملازمتوں پر تقرری اور ایسے دیگر معاملات کے بارے میں وضاحت کرسکے اور اُن کے متعلق قانون پاس کرسکے تب تک کے لئے موجودہ قانون کا اطلاق ہوگا۔

کشمیر میں ۱۹۴۷ء کے بعد کے مصائب کے باعث بہت سے لوگ ریاست سے باہر چلے گئے ہیں لیکن وہ واپس آنا چاہتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ہم نے اپنے آئین میں اس ضمن میں ایک قاعدہ سال رواں کے شروع میں پچھلے برس میں مقرر کیا تھا۔ لہٰذا ہم نے طے کیا ہے کہ:-

"ریاست جموں و کشمیر کے وہ مستقل باشندے جو ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران میں یا اس سے قبل ان کے خوف سے پاکستان چلے گئے تھے اور واپس نہیں آسکے۔ ان کے متعلق حقوق شہریت پر حاوی ہونے والے قوانین میں خاص گنجائش رکھی جائے۔ کہ اگر وہ واپس آجائیں تو وہ تمام شہری حقوق و مراعات اور ذمہ داریوں کے حقدار ہوں گے۔"

یہ تسلیم کیا گیا کہ بھارت کے آئین کی دفعہ ۱۳۱ میں جن تنازعات کا ذکر ہے ان کے بارے میں ریاست جموں و کشمیر میں بھی سپریم کورٹ کو اختیار اعلیٰ حاصل ہونا چاہیئے۔ سپریم کورٹ کو ان بنیادی حقوق کے بارے میں بھی جن کا اطلاق ریاست پر ہوگا۔ اختیار حاصل ہونا چاہیئے۔ بھارت سرکار کی جانب سے ہم نے یہ سفارش کی ہے کہ ریاست کا مشاورتی ٹریبونل جسے ہز ہائی نس کے قانونی مشیروں کا بورڈ کہا جاتا ہے، منسوخ کر دیا جائے اور اس کے تمام اختیارات بھارت کی سپریم کورٹ کو تفویض کر دئے جائیں۔ مطلب یہ کہ بھارت کے آئین میں درج شدہ تمام دیوانی اور فوجداری معاملات میں سپریم کورٹ ہی آخری عدالت اپیل ہوگی۔ ریاست کشمیر کے وفد کو اس بارے میں کوئی اعتراض نہیں وہ اس کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں۔ لیکن وہ اس بارے میں تفصیل سے مزید غور کرنے کی مہلت چاہتے ہیں۔

کشمیر کی آئین ساز اسمبلی کے افتتاحی خطبے میں واضح طور پر اس پالیسی کا اعلان کیا گیا تھا جس پر عمل پیرا ہونا مقصود تھا۔ اس موقعے پر ہمیں اس پالیسی پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن اب ریاست کے عوام کی خواہشات کو عملی جامہ پہنانے اور بھارت کے آئین کے نفاذ کے پیش نظر ہم جس سمجھوتے پر پہنچ گئے ہیں اس کے تحت :-

۱۔ ریاست کے سرحکومت کو ریاستی قانون ساز اسمبلی کی سفارش پر راشٹرپتی تسلیم کریں گے (ریاستی قانون ساز اسمبلی کو اختیار ہے کہ وہ جس طریقے سے چاہے سرحکومت منتخب کرے)

۲۔ ریاست کا سرحکومت اس وقت تک اپنے عہدے پر رہیں گے جب تک راشٹرپتی چاہتے ہوں۔

۳۔ سرحکومت اپنا استعفیٰ خود راشٹرپتی کے نام لکھ کر مستعفی ہو سکتا ہے۔

۴۔ سرحکومت پانچ سال تک بر سرِ عہدہ رہے گا۔

قومی پرچم کے بارے میں وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے واضح کیا ہے کہ قومی پرچم کی حیثیت کشمیر میں وہی رہے گی جو بھارت کے دوسرے حصوں میں ہے۔ لیکن کشمیر کی تحریک آزادی اور جذباتی بنا پر وہ اپنا الگ جھنڈا بھی رکھنا چاہتے ہیں۔ بھارت سرکار اس نظریے سے اتفاق کرتی ہے۔

بھارت کے آئین کی دفعہ ۳۵۲ کے تحت بیرونی خطرے یا اندرونی گڑبڑ کی صورت میں راشٹرپتی کو یہ اختیار ہے کہ وہ متعلقہ ریاست میں ہنگامی صورت حال کا اعلان کرے۔ کشمیر کے بارے میں یہ فیصلہ ہوا کہ وہاں پر بھی ریاستی حکومت کی اتفاق رائے سے راشٹرپتی ہنگامی صورت حال کا اعلان کرسکتے ہیں۔

وقت کی ضرورت کے ساتھ ساتھ اس سمجھوتے میں تبدیلی بھی کی جاسکتی ہے قانوناً اور حقیقتاً ریاست جموں و کشمیر بھارت کا ایک حصہ ہے اور ریاست یونین کے ساتھ مکمل طور پر ملحق ہے۔

چونکہ کشمیر نے صرف تین امور کے سلسلے میں بھارت کے ساتھ الحاق کیا ہے اس سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ یہ الحاق مکمل نہیں ہے۔ حقیقتاً صورت یہ نہیں ہے، کشمیر کا الحاق مکمل ہے۔

جوش ملیح آبادی

"مذہبی تصوّرات"

یہ میرے محبوب دوست اور فاضل ادیب و نقّاد مولانا سیّد اختر علی صاحب تلہری کے چند قابلِ قدر اور درخورِ فکر مضامین کا مجموعہ ہے، جسے لکھنؤ کے "سرفراز قومی بک ڈپو" نے شائع کر کے اُردو زبان کی سنجیدہ کتابوں میں جن کی تعداد افسوس کہ، بہت کم ہے، ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

ان مضامین کو جستہ جستہ پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ ہر چند اُن کے بعض مقامات سے، جیسا کہ آگے بیان کیا جائے گا، مجھے اختلاف ہے۔ پھر بھی مجموعی حیثیت سے یہ مجموعہ اُن قارئین کے واسطے جو ٹھوس اور خیال آفریں نکات کی تلاش میں زیادہ تر ناکام رہتے ہیں، ایک نہایت اچھا تحفہ ہے۔

مولانا اختر علی صاحب کی ذہنی تربیت جس گنبدِ خیال میں ہوئی ہے، جن قدامت پرست حلقوں میں اُن کی عمرِ عزیز کے لمحے صرف ہوئے ہیں، جس قسم کے باسی درسیات کی سیلن کے درمیان سے وہ گزرے ہیں، اور جن موروثی داخلی ہواؤں میں اُن کے خیالات نے سانس لینا سیکھا ہے، اُن سب پر نگاہ کر کے جس وقت یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ منقولات و روایات اور اساطیر و وجدانیات سے، ہر چند قطعی لگانہ ہو کر نہ سہی، پھر بھی ایک بہت بڑی قابلِ تعریف حد تک بے نیاز ہو کر ابنائے زمانہ کو اُس "عقلِ تمکین دشمن" کی جانب دعوت دے اور پکار رہے ہیں، جو اُن کے دائرے میں صرف حلقۂ بیرونِ در ہی نہیں، بلکہ ہمیشہ مغضوب و مردود قرار دی گئی ہے تو اختر صاحب کی بے نظیر ژرف نگاہی اور غیر معمولی سلامتی و صحت پر مسرت آمیز حیرت کے سوا دل پر اور کوئی دوسری کیفیت طاری نہیں ہو سکتی۔

اختر صاحب کی تعلیم اور اُن کے ماحول کا تو یہ تقاضا تھا کہ وہ ہمارے تمام ایشیائی صُوفیوں، مرشدوں، ادیبوں اور شاعروں کے مانند معقولات و مشاہدات پر سبّ و شتم کرتے، منقولات و وجدانیات کے گُن گاتے اور تفکّر کی تھکن سے اپنے کو بچاتے ہوئے، تن آسانی کی مسند پر بیٹھ کر، ہر آن اور ہر نفس "عشق" "عشق" کے جنسیاتی نعرے لگاتے دیکھے جاتے۔ لیکن حیرت ہے کہ وہ اسؔ "کوچۂ جاناں" میں بھی بہ ثباتِ عقل و ہوش زندگی بسر کر رہے ہیں، جہاں پہونچ کر اور تو اور، اقبال کا سا "دانائے راز" بھی "مست قلندر" بن کر "یا ہو" "یا ہو" کے نعرے لگاتا اور عشق کو آتشِ نمرود میں کُدواتا پکڑا جاتا ہے۔

یہ سلامتیٔ عقل نہیں تو اور کیا ہے کہ قوّالی کے اُس رنگین خیمے میں، جو طلسمِ ہوش ربا کی جلدوں سے بنایا گیا ہے اور جہاں ع السّلام اے عشقِ خوش سودائے ما" کی ڈھولک آمیز تانوں پر بڑے بڑوں، حتیٰ کہ "عطّاروں" اور "رومیوں" تک پر "حال" کا رقص طاری ہے، اختر صاحب ع السّلام اے عقلِ خوش سودائے ما" کا آوازہ بلند کئے ہوئے ہیں ——— اور در اصل اختر صاحب کی یہ ایک ایسی حکیمانہ توانائی اور رندانہ جسارت ہے کہ وہ اُن تمام افراد کی مبارک باد کے مستحق قرار پاتے ہیں جن کا یہ عقیدۂ راسخ ہے کہ اس تمام کرۂ ارض میں انسانی شرف و مجد اور انسانی عظمت و ناموس کو اگر کسی شے سے وابستہ کیا جا سکتا ہے، تو وہ شے عقل اور محض عقل ہے، اس لئے کہ

ع از زمین تا آسمان عقل است۔

لیکن اسی کے دوش بدوش ایک سخن گسترانہ بات بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس دانائی کے باوصف، یہ دیکھ کر تعجّب ہوتا ہے کہ اختر صاحب اُن مفروضاتی و منقولاتی گوشوں میں بھی جاتے ہیں جہاں کوئی صاحبِ فکر و نظر ہرگز نہیں جایا کرتا۔

ہر چند کہ جب وہ اِن منقولاتی گوشوں کی جانب مُڑتے ہیں، اُس وقت بھی ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ اپنے معقولی تیوروں سے دست بردار ہونے پر ہرگز آمادہ نہیں ہیں، لیکن وہاں پہنچتے ہی اُن کے وہ تیور بُجھ جاتے ہیں اور وہ بھونچکا سے ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے ہیں کہ کہیں کوئی انھیں دیکھ تو نہیں رہا ہے۔

پھر بھی یہ قابلِ قدر بات ہے کہ وہ ان گپھاؤں، ان سقیفوں اور ان گوشوں میں جا کر بالکل کھو نہیں جاتے، وہ وہاں کے در و دیوار پر ناک بھوں چڑھاتے اور اُن گوشوں کے ع "ما مقیمانِ کوئے دل داریم" قسم کے اُن گوشہ نشین دین داروں کو بُری طرح لتاڑتے بھی ہیں جنہوں نے دین کو مسخرا پن بنا رکھا ہے اور جو عقل کی توہین کر کے

بے عقلی (عشق و وجدان) کا مرتبہ بڑھاتے اور علم کو تخت سے اُتار کر جہالت کے سر پر تاج رکھ کر "عشق تمام مصطفےٰ، عقل تمام بولہب" کے نعرے لگا لگا کر ناچتے اور اپنی بھینچی ہوئی خواہشوں سے اُلجھے ہوئے اعصاب کے درد کو نکالتے رہتے ہیں۔

لیکن افسوس کہ اختر صاحب کی "دین داری" کو اُبھارنے والی یہ لے زیادہ اونچی نہیں ہونے پاتی، اور جب وہ "اوپر" کی جانب جاتے ہیں تو ایک احترام آمیز فاصلے پر کھڑے ہو کر یکا یک مؤدب ہو جاتے ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ اختر صاحب دینی گورنمنٹ کے چوکی داروں، مکھیوں، گرداوروں اور پٹواریوں کے خلاف تو بڑے طمطراق کے ساتھ بغاوت کا علم بلند کرتے ہیں، لیکن اس سرکار کے حکّام بالا کی عدالت میں پہونچتے ہی اطاعت کی چپراس باندھ لیتے اور جیسے ہی اس سلطنت کے بادشاہِ جابر کا سامنا ہوتا ہے اُڑ اُڑا کر سجدے میں گر پڑتے ہیں۔

اختر صاحب سے یہ شکوہ ہے کہ وہ خدا کو مانتے ہیں، لیکن منواتے نہیں۔ خود یقین و تسکین کا مزا اڑاتے ہیں لیکن دوستوں کو شریک نہیں کرتے۔ وہ خدا کے باب میں متعدد مخالف و موافق حکماء و متکلمین کے اقوال تو بڑی دریادلی سے پیش کرتے ہیں لیکن (خدا جانے کیوں) اپنی طرف سے وجودِ خدا پر کوئی برہان قائم نہیں کرتے اور بڑے مزے سے آنکھ مار کر یہ کہتے ہوئے دوسری طرف مڑ جاتے ہیں کہ "خدا کے لئے دوسرے مستقل دلائل ہیں، جن کا بالفعل یہاں تذکرہ مقصود نہیں۔" اس بشارتِ "مستقل دلائل" اور اس بلاغتِ "بالفعل" کی داد نہیں دی جا سکتی۔

شکووں کا کچھ جواب نہ جب اُن سے بن پڑا ——— گردن میں مری ڈال دیئے مسکرا کے ہات

اسی کے ساتھ ساتھ اختر صاحب کا یہ دعویٰ کہ خدا کے عقیدے کے بغیر نہ تو زندگی کو "باغائیت و بامعنی" بنایا جا سکتا ہے اور نہ انسانی اخلاق کی تعمیر و تشکیل ہی ہو سکتی ہے۔ صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہے، اس کی بھی اُنھوں نے کوئی دلیل یا کوئی تاریخی نظیر نہیں پیش کی ہے۔

اس دعوے سے، بظاہر، یہ پتا چلتا ہے کہ اختر صاحب کے نزدیک:-

(۱) انسان فطری طور پر نیک بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

(۲) صرف ترغیب و تخویف ہے جو انسان کو راہِ راست پر رکھ سکتی ہے۔

(۳) اور جس وقت تک انسان خدا پرست رہا، اخلاقی عیوب نے اُسے چھوا بھی نہیں۔

اختر صاحب کے اس دعوے کی جانچ کوئی لمبی چوڑی، یا دور کی کوڑی لانے والی بات نہیں — اگر یہ امر ثابت ہو جائے کہ اخلاق کا مدار خدا کے عقیدے پر ہے، تو پھر کسی قسم کی بحث کا موقع باقی نہیں رہے گا۔

نوعِ انسانی کا جس قدر بھی ریکارڈ ہے وہ ہمارے سامنے کھلا ہوا پڑا ہے، اور

کرۂ ارض پر جس دن سے پاک و خبیث روحوں، جنوں، پریوں، بھوتوں، چڑیلوں، چوڑلوں، فرشتوں، جادوگروں، شعبدہ بازوں، پیروں، پیمبروں، اوتاروں، دیویوں، دیوتاؤں اور خداؤں کے تصور کا آغاز و ارتقاء شروع ہوا ہے، اُس دن سے لے کر آج تک کی انسانی تاریخ اس امر کی گواہی دے رہی ہے کہ عین اُس "دورِ زرّیں" میں بھی جب کہ ایمان و ایقان کے رخسار سے جوانی کا خون ٹپکا پڑ رہا تھا، انسانوں کا سوادِ اعظم ہمیشہ اُسی نقطے پر اتنا ہی ضد اور بڑے حوصلے کے ساتھ خیمہ زن رہا جسے "ضلالت" اور "عدوان" کہا جاتا ہے۔ اور اُس وقت بھی آسمانی حکومت نے "شکور" بندوں کی "قلّت" کا رونا رویا اور "آیات" سے رُوگردانی کرنے والوں پر اظہارِ غضب کیا ہے۔

تو یہ خداشناسی اور یہ خداپرستی جب اپنے دورِ شباب میں حیات کی غائیت اور اخلاق کی استواری کے کام نہیں آ سکی تو اپنے دورِ شیب میں کیا کام آ سکے گی؟

اختر صاحب تو یہ فرماتے ہیں کہ خدا پر ایمان لائے بغیر انسانوں میں اخلاقی شعور بیدار ہی نہیں ہو سکتا، لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ بندہ پرور خدا سے تو اُلٹی یہ شکایت ہے، کہ اُس نے اپنے ماننے والوں میں اخلاق کا صحیح تصور پیدا ہی نہیں ہونے دیا۔

فلسفۂ اخلاق کے مباحث میں پڑے بغیر محض معروف یا مذہبی اخلاق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مولانا اختر علی صاحب سے دریافت کرتا ہوں کہ مذاہب جس کو "نیکی" کہتے ہیں، وہ درحقیقت نیکی ہے بھی کہ نہیں؟

انعاموں کے وعدوں، اور عذابوں کی وعیدوں کی بنیاد پر نیکی کا میلان اور بدی سے اجتناب، اس دنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن اخلاق کبھی نہیں ہو سکتا۔

آسمانی بینک کی فکسڈ ڈیپازٹ شاخ میں "اعمالِ صالح" کا روزِ شمار کی میعاد تک کے لئے جمع کرنا اس لالچ میں کہ فی عمل ستّر حوریں بخشی جائیں گی، یہ عمل مارواڑیوں تک کی ناک کاٹ لینے والی سود خواری کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس میں مارواڑیوں تک کی ناک کاٹ لینے والی بات یہ ہے کہ اس سود میں ایک بڑی مقدّس فحاشی کی آمیزش پائی جاتی ہے۔

واضح باد کہ اس نوعیت کی تمام "اخلاقی زندگی" اور اس نہج کا تمام تر تقویٰ دراصل ایک تمام عمر کی مستقل جدوجہد اور ایک تا دمِ مرگ قائم رہنے والی دردناک طیّاری ہے۔ (الف) عذاب سے محفوظ رہنے اور (ب)، ایک ایسی اوباشانہ زندگی بسر کرنے کی جس کی عیّاشیاں کبھی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے سکیں گی۔

میرے فاضل و محبوب دوست مولانا سیّد اختر علی صاحب تلہری جواب دیں کہ کیا خدا کا تصوّر اس قسم کے "افلاطونیات" سے کبھی اپنا دامن نہ بچا سکیگا اور کیا عیاشی کی لمبی چوڑی طیّاریوں کو تقوے کے نام سے نوازے جانے کی عادتِ قبیح کو کبھی ترک کئے جانے کا کوئی امکان پیدا نہیں ہو سکے گا؟

غزل

دوست دشمن سب کا ہے میلان قاتل کی طرف
ایک مظلومی نظر آتی ہے بسمل کی طرف

لطف تھا گرداب کے چکر میں دورِ جام کا
آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا میں نے ساحل کی طرف

خضر نے بھی ہار تھک کر جب رفاقت چھوڑ دی
لے چلی گُم کردہ راہی مجھ کو منزل کی طرف

زخم ہیں تازہ ابھی اس کے الٰہی خیر ہو
پھر وہی قاتل بڑھا آتا ہے بسمل کی طرف

شمع کا آنسو بہانا اس کی فطرت ہے مگر
اک اشارہ بھی ہے اِس میں اہلِ محفل کی طرف

کیوں نہ ہم پیرِ مغاں کی بھی زیارت کر چلیں
راہ مے خانے سے بھی جاتی ہے منزل کی طرف

میں یہ سمجھا اِک سفینہ آگیا میرے لئے
بھولی بھٹکی موج آنکلی تھی ساحل کی طرف

داورِ محشر مرا انصاف اب کیوں کر کرے
خود تو وُہ میری طرف ہے میں ہوں قاتل کی طرف

میرے سوزِ دل کا پروانے کو بھی ہے احترام
پوچھ کر جاتا ہے مجھ سے شمعِ محفل کی طرف

خارِ غم کی جب خلش اے جوشؔ کچھ مٹنے لگی
آسماں نے تیر چھوڑے تاک کر دل کی طرف

ہنسراج رہبر

کروٹ

اس وقت جبکہ میں اپنے جیل کے کمرے میں بیٹھا ہوں مجھے صرف ایک بات یاد آ رہی ہے کہ گرفتاری سے پہلے بھی میں اس طرح ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتا تھا۔ دنیا سے میرا تعلق محض اتنا ہی تھا کہ میں اسے بدل دینا چاہتا تھا کیونکہ زندگی کے جو لوازم ایک انسان کی حیثیت سے مجھے ملنے ضروری تھے، دیس کی غلامی اور کچھ لوگوں کی اجارہ داری کے باعث میں ان سے یکسر محروم تھا۔ لیکن محض چاہنے بھر سے نہ تو دنیا بدل جاتی ہے اور نہ زندگی کے لوازمات حاصل ہو جاتے ہیں بلکہ ناکامی کا احساس زندگی کو اور تلخ بنا دیتا ہے۔ میرا وہ کمرہ بھی جیل کے اس کمرے کی طرح بے کیف اور سونا سونا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ جب کبھی دھوبی کی وہ لڑکی مسکراتی اور اٹھلاتی ہوئی اندر قدم رکھتی تو میرا وہ کمرہ اندھیری رات میں بجلی کی روشنی کی طرح مسرت سے بھر جاتا۔

اس کی چال میں عجیب کشش تھی۔ بے پروائی سے ادھر ادھر لٹکی ہوئی چٹیا اور نزاکت سے ہلتے ہوئے کندھے اس کشش میں شوخی کی آمیزش کر دیتے تھے۔ اس کی چھوٹی سی گھگرا گھٹنوں تک آتی تھی اور اس کے نیچے بجتی ہوئی پازیب ہوا میں ایک میٹھا اور کبھی نہ ختم ہونے والا نغمہ بکھیر دیتی تھی۔ جب میں اس ننھی دوشیزہ کو آتے جاتے دیکھتا اور اس کی پازیب کی مسحور کن جھنکار سنتا تو رقص و سرود سے معمور عشرت افروز دنیا کا احساس ہونے لگتا۔

عمر یہی تیرہ چودہ سال ہوگی۔ گہری کالی آنکھیں شراب کی سی مستی سے لبریز تھیں۔ اسے دیکھ کر مجھے خود نشہ ہونے لگتا یہ میں نے نہ پہلے کبھی محسوس کیا تھا اور نہ اب۔ ہاں یہ سچ ہے کہ وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ اس کے سانولے گالوں سے جن پر کبھی کبھی لمبے لمبے بالوں کی حاسد اور آوارہ لٹیں بھی چھائی رہتی تھیں سرخی جھلکتی تھی، گویا اسے خود برہما نے فرصت کے وقت خود اپنے ہاتھ سے نہایت دلجمعی کے ساتھ سہانی شفق کے ایک خوبصورت ٹکڑے سے تراش کر بنایا تھا اس کے نوخیز شباب میں صبح کا نکھار تھا۔

مجھے اس کا نام جاننے کی بڑی خواہش تھی۔ پوچھنا شاید گستاخی ہوتی اور وہ مجھے بتاتی بھی کہاں؟ میں بیٹھے بیٹھے اندازہ لگاتا اور سوچتا کہ اس کا نام کیا ہو سکتا ہے۔ کوئی ایسا نام ہونا چاہیئے جس میں بیک وقت شوخی، دلکشی، حلاوت اور مسکراہٹ، حسن اور شباب سب عناصر مناسب مقدار میں شامل ہوں۔ پاگل! کہیں ایسا نام بھی ہو سکتا ہے؟ میں آپ ہی آپ کہتا۔ پھر دھوبیوں کے گھر جنہیں حسین جذبات سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ میں یہ سوچ کر چپ ہو جاتا۔ نام جاننے کی حسرت جس تیزی سے دل میں پیدا ہوتی تھی۔ اب اس تیزی سے غائب ہو جاتی۔ دراصل مجھے ڈر محسوس ہوتا کہ اس کے مزدوری پیشہ، ان پڑھ اور غیر متمدن والدین نے اس کا کوئی کریہہ اور نامانوس نام رکھ دیا ہوگا۔

آخر ایک دن مجھے اس نام کا پتہ چل ہی گیا۔ میں کئی مرتبہ کپڑے لینے یا دینے اور اس بہانے اسے دیکھنے کے لئے ان کے مکان پر جایا کرتا تھا۔ گھر میں وہ، ایک بھائی، باپ اور بوڑھی دادی تھی۔ اکثر وہ اور اس کی دادی ہی گھر میں موجود ہوتیں کیونکہ باپ اور بھائی کپڑے دھونے یا کسی دوسرے کام سے باہر گئے ہوتے تھے۔ ایک دن جب میں کپڑے لینے گیا تو صرف اس کی دادی ہی موجود تھی اور وہ چولھے کے پاس بیٹھی کدو چھیل رہی تھی۔

"میرے کپڑے دھل گئے کیا؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہاں بابوجی دھلے رکھے ہیں۔ ابھی دیتی ہوں"۔

بڑھیا ہاتھ کا کام چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی مگر لاکھ ڈھونڈنے

پر بھی اسے کپڑے نہیں ملے ۔ اس لئے پھر بولی ۔

"بابو جی! ذرا ٹھہرو میں لڑکی کو بلاتی ہوں ۔ اس کو معلوم ہے کون سے کپڑے کہاں رکھے ہیں"۔

بڑھیا نے دروازے سے باہر آکر تیکھی مگر میٹھی اور نرم آواز میں پکارا

"رام کلی"

کوئی جواب نہ پاکر وہ پھر بولی ۔ رام کلی! اری رام کلی!!"

بڑھیا نے پھیپھڑوں کا سارا زور صرف کر دیا ۔ لیکن پھر بھی کوئی جواب نہ ملا ۔ اس پر اس کا غصے ہو جانا لازمی تھا ۔ اس کی بھویں تن گئیں اور وہ نہایت کرخت آواز میں چلائی ۔

"کلی' کلی' کلی ۔ کہاں مر گئی ری کلی ——"

"آئی دادی" ایک پڑوس کے مکان سے اس دوشیزہ نے آواز دی ۔ جیسے دادی ناراض ہوتے ہوئے بھی کلی سے تشبیہہ دے رہی تھی ۔ کتنا اچھا تھا یہ نام ۔ اس میں تو وہ سب اوصاف موجود تھے ۔ جو میں سوچا کرتا تھا ۔ میں نے اسے آتے دیکھا اور نہ پازیب کی میٹھی جھنکار ہی سنی صرف اس شاعرانہ تشبیہہ ہی پر غور کرتا رہا ۔ مجھے اس کے آنے کا علم اس وقت ہوا جب اس کی دادی غصے سے بھری آنکھوں سے اسے دیکھ کر بولی "میں کلی کلی کتنے تھک گئی ۔ تو سنتی ہی نہیں گدھے کی جورو"۔

اُف! کتنی بڑی گالی دی اس بوڑھی چڑیل نے ۔ جس کلی پر بھنورا بیٹھتے ہوئے جھجکتا ہے اس پر پتھر پھینکتے ہوئے اس کا دل ذرا بھی نہ پسیجا ۔ لیکن یہ صرف گالی ہی نہ تھی ۔ اس کے کرخت لہجے میں صداقت جھلک رہی تھی کیونکہ دھوبیوں کی برادری میں ہمیشہ ہونے والی شادیوں سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس نوخیز دوشیزہ کو بھی جلد ہی اپنے سے دوگنی' تگنی عمر کے کسی ایسے مرد سے بیاہ دیا جائے گا ۔ جس کا کام میلے کچیلے کپڑوں کی گٹھڑی اٹھا کر گھاٹ پر لے جانا' وہاں سے واپس لانا اور پھر ان ہی کپڑوں کی گٹھڑی لادے لادے لوگوں کی کوٹھیوں اور مکانوں پر بانٹتے پھرنا ہوگا ۔ کیا وہ اس کلی کی نزاکت' نزہت اور ملاحت کی قدر کر سکے گا ۔

شاید کلی بھی اس حقیقت کو سمجھتی تھی کیونکہ اس نے بڑھیا کی گالی کا کوئی جواب نہیں دیا ۔ چنداں برا بھی نہیں منایا ۔ سر جھکائے چپ چاپ کھڑی رہی ۔ داہیں پاؤں کے انگوٹھے سے بایاں پاؤں کھجلانے لگی ۔ اس کا خیال تھا کہ بڑھیا اپنے دل کا غبار نکالنے کے لئے ابھی دو چار گالیاں اور بھی دے گی ۔ مگر ایسا نہیں ہوا ۔ غصہ جلد ہی اتر گیا اور وہ بولی ۔ بابو جی کے کپڑے کہاں ہیں؟ مجھے تو معلوم نہیں ڈھونڈ کر انہیں دے"۔

بڑھیا پھر اپنے کام میں لگ گئی اور کلی اُچک کر کپڑوں کی میز کے پاس آئی ۔ اس نے بنا کسی تذبذب کے اوپر کی تین چار تہیں اٹھا کر ایک طرف رکھ دیں ۔ ان کے نیچے جو کپڑے رکھے تھے وہ اٹھا کر مجھے پکڑا دئے اور میری طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو ۔ مجھے یہ گالی تمہیں نے دلائی ہے اسے کیا معلوم کہ گالی دینے والی بڑھیا اگر اس کی نہ ہوتی تو میں اس کا گلا گھونٹ دیتا ۔

میرے کمرے کی بغل میں جو ایک دوسرا کمرہ تھا اس میں سردار درشن سنگھ رہتا تھا جو بڑا ہی خوش ذوق آدمی تھا اس نے چیخوف کے اس قول کے مطابق کہ اگر ہر ایک آدمی زمین کے اس ٹکڑے کو جو اس کی اپنی ملکیت ہے ۔ خوبصورت بنانے میں اپنی تمام کوشش صرف کر دے' تو یہ دنیا کس قدر حسین دکھائی دینے لگے' سامنے کے آنگن میں پمپ کے پاس ایک اچھی خاصی کیاری بنائی تھی ۔ جس میں دو کیلے کے پیڑ' ایک چنبیلی کا بوٹا اور کچھ سبزی اگا رکھی تھی ۔ چنبیلی کے بوٹے پر اب کلیاں پھوٹ رہی تھیں پہلے جب میں خود کلی کو دیکھتا تھا تبھی اس کے بارے میں سوچتا تھا ۔ اب ان کلیوں کو دیکھ کر بھی اس کی یاد آجاتی تھی اور میں اس چنبیلی کے بوٹے پر نظریں جمائے ہوئے سوچا کرتا تھا ۔

"اس کا نام چنبیلی ہی کیوں نہ ہوا جس پر بہت سی کلیاں لگتی ہیں"

"نہیں" ۔ جواب ملتا ۔ کلی ہی اچھا ہے ۔ چنبیلی پر تو پت جھڑ آتا ہے تب وہ بنا کلیوں اور پتوں کے رہ جاتی ہے"۔

"کلی پر کیا پت جھڑ نہیں آتا؟ اور وہ کونسا ..."

اس پر بھی پت جھڑ آئے گا ۔ یہ خیال مجھے سخت ناگوار گزرتا اور میں سوچنا بند کر دیتا ۔

رام کلی یا صرف کلی ایک دن جب مجھ سے میلے کپڑے لینے آئی تو میں کسی شخص کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا ۔ اُدھر سے نپٹ کر جب میں نے اسے دیکھا تو وہ اسے بوٹے کی کلیاں توڑ توڑ کر اپنے آنچل میں

بھر رہی تھی۔

"ابا۔ تم کلیاں کیوں توڑ رہی ہو۔ سردار مارے گا"۔

"کون سردار"؟ اس نے ایک کلی بوٹے سے توڑتے ہوئے کہا۔

"وہی جو یہاں رہتا ہے"۔ میں نے سردار کے کمرے کی طرف اشارہ کیا

"اونہہ۔ بڑا آیا ہے مارنے والا۔ تم ڈرتے ہو تو نہ توڑو۔ میں تو کسی سردار سے نہیں ڈرتی"۔ اس نے کہا اور ہاتھ کی کلیاں مجھ پر پھینک کر مسکرا دی۔

وہ روز بروز مجھ سے کھلتی جا رہی تھی کہ انہیں دنوں دھلائی کے پیسے میرے ذمے باقی رہنے لگے۔ میری آمدنی کے ذرائع بہت ہی کم اور محدود تھے اور اس وقت تو ہاتھ خاص طور پر تنگ تھا۔ روٹی کا خرچ مشکل سے چلتا۔ اور اکثر ایسا ہو جاتا تھا۔ ایسی حالت میں دھلائی ادھار ہوتی تھی اور پیسے مل جانے پر میں مہینے دو مہینے کے دام یکمشت چکا دیتا تھا۔ کلی کے گھر والے میری اس عادت سے بخوبی واقف تھے اس لئے وہ مجھ سے دھلائی مانگتے نہ تھے۔ مگر کلی نے تو اسے شغل ہی بنا لیا۔ وہ ہمیشہ پیسوں کا تقاضا کرنے آ جاتی اور کہتی۔ "دادی نے کہا ہے ہمارے پیسے دے دو۔

"میرے پاس اس وقت پیسے نہیں ہیں"۔ میں اسے ٹالنے کے خیال سے مسکرا کر کہتا۔ لیکن وہ جانے کی بجائے دروازہ پر کھڑی رہتی اور زور سے کہتی۔ ہیں کیوں نہیں۔ میں تو لے کر جاؤں گی"۔

"لو گی کہاں سے۔ جب میں کہتا ہوں کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں"۔

"واہ جی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہارے پاس بھی پیسے نہ ہوں"۔

اس کی معصومیت پر مجھے ہنسی تو آتی لیکن ضبط کر کے جواب دیتا۔ "کلی! میں پیسے بناتا تھوڑی ہوں"۔

"بناتے نہیں تو اور کیا کرتے ہو"؟

"کیا کرتا ہوں۔ جو سب لوگ کرتے ہیں"۔ میں اس کی طرف دیکھتا اور پھر کہتا۔

"کام کرتا ہوں تو اس کے پیسے ملتے ہیں۔ جب کام نہیں ملتا تو پیسے بھی نہیں ملتے"۔

"کیا کام کرتے ہو تم"؟ وہ واقعی جاننا چاہتی تھی۔

"لکھنے کا کام کرتا ہوں۔ چھاپنے والے مجھ سے کتابیں لکھواتے ہیں اور اس کے پیسے دیتے ہیں"۔

"تو پھر تم بیٹھ کر لکھتے ہی رہا کرو نا"۔

"اس نے یہ بات شاید اس لئے کہی تھی کہ وہ مجھے لکھنے اکثر دیکھا کرتی تھی۔ مگر میں نے جواب دیا۔

"پر آپ ہی لکھنے رہنے سے کیا بنتا ہے؟ اگر تمہیں کوئی دھونے کو کپڑے نہ دے تو کیا اپنے ہی کپڑے دھونے سے پیسے مل سکتے ہیں"؟

اس مثال سے وہ میرا مقصد بآسانی سمجھ گئی۔ اب اس نے بات کا رخ پلٹ کر کہا۔

"اچھا سچ کہتے ہو کہ اس وقت تمہارے پاس ایک بھی پیسہ نہیں"

میں نے جیب کو الٹ کر چاندی کا ایک ٹکڑا نکالا اور اسے ہتھیلی پر رکھ کر کہا۔ "یہ ایک چونی ہے"!

"لاؤ یہی دے دو"۔

"شام کو کھاؤں گا کیا"؟

"اور ہم کیا کھائیں گے۔ ہمیں بھی تو آٹا خریدنا ہے"۔

میں نے چونی اس کے سامنے رکھ دی اور اشارہ کیا۔ لے جاؤ لیکن وہ مسکرائی اور بھاگ گئی۔ اس چمکتی ہوئی چونی کے ساتھ کمرے میں ایک لطافت ـــــ ایک خوشبو بھی چھوڑ گئی۔

میرا خیال تھا کہ اب کلی پیسوں کا تقاضا کرنے نہیں آئے گی لیکن وہ دوسرے ہی دن پھر آ گئی۔ اور آتے ہی بولی۔

"دادی نے کہا ہے۔ ہمارے پیسے دے دو"۔

"میرے پاس پیسے نہیں ہیں" میں نے بنا مسکرائے جواب دیا لیکن میرا یہ انداز اسے پسند نہیں تھا۔ شاید پیسے مانگنے کی بجائے وہ مجھے مسکراتے ہوئے دیکھنے آتی تھی۔ دلکش آنکھوں میں چنچل پن بھر کر بولی

"پیسے نہ ہوں تو کپڑے بھی مت دھلایا کرو"۔

"اچھا اب نہیں دھلاؤں گا"۔ میں مسکرایا۔

"اور دھلانا ضروری ہو تو کہہ دو۔ ہم مفت دھو دیا کریں گے"۔

"مفت"!

"ہاں"۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے مضبوط اور صاف آواز میں کہا۔ "بھلا کیوں"۔ میں نے اسے مزید چھیڑا لیکن اس "کیوں" کا وہ

کیا جواب دیتی - شرما کر بھاگ گئی -

دوسرے دن میں گرفتار ہو گیا - اب کلی نہ کپڑے لینے آتی ہے اور نہ پیسوں کا تقاضا کرنے - اس کا حسین چہرہ اور معصوم باتیں اکثر یاد آجاتی ہیں اور میں سوچنے لگتا ہوں -

" کیا وہ مجھے پیار کرتی تھی ؟ "

جواب ملتا ہے

" نہیں اس کے جوانی بھرے اعضاء میں شباب کروٹیں لے رہا تھا اور وہ محض مشقِ ناز کر رہی تھی "۔

" ہاں " اور " نہیں " کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے - ہیگل کے نظریہ کے مطابق ایک خیال سے دوسرا خیال جنم لیتا ہے - میں ایک فلاسفر کی طرح سوچنے لگتا ہوں اور سوچتا رہتا ہوں کہ کبھی ہماری اجتماعی زندگی میں شباب مچلے گا اور کبھی یہ بھی کروٹ لے گی - ایک عظیم کروٹ " !

صفِ ماتم

ڈاکٹر رشید جہاں

۲۹ جولائی کو ملک کے علمی، ادبی اور سماجی حلقوں میں یہ خبر انتہائی رنج سے سُنی گئی کہ اردو کی مشہور افسانہ نگار ڈاکٹر رشید جہاں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئیں۔

ڈاکٹر رشید جہاں کی موت سے صرف دنیائے ادب ہی کو صدمہ نہیں پہنچا بلکہ سماجی ماحول میں بھی ایک خلا پیدا ہو گیا ہے - ایک بلند پایہ افسانہ نگار ہونے کے علاوہ آپ ایک فرض شناس اور قابل لیڈی ڈاکٹر بھی تھیں اور ایک ایسی لیڈی ڈاکٹر جو اکثر کم استطاعت مریضوں کا علاج اپنی گرہ سے کرتی تھیں - ڈاکٹری آپ کے لئے روپیہ کمانے کا ایک ذریعہ نہ تھا بلکہ ایک مشن کی حیثیت رکھتا تھا - اس دور میں اتنا بڑا وصف اگر نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے -

آپ شیخ عبد اللہ بانی مسلم کالج علی گڑھ کی لڑکی تھیں - اسی کالج سے تعلیم ختم کرنے کے بعد آپ نے ایم - بی - بی - ایس کا امتحان پاس کیا اور اپنے شوہر جناب محمود الظفر کے ساتھ لکھنؤ میں قیام اختیار کیا - یہیں آپ اپنی علمی، ادبی اور سیاسی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئیں - آج سے کچھ مدت پہلے آپ پر سرطان کے موذی مرض کا حملہ ہوا اور آپ اپریشن کے لئے بمبئی تشریف لے گئیں اس وقت یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ مرض پر قابو پا لیا گیا ہے لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا اور مرض بڑھتا ہی گیا - آخر آپ ڈاکٹروں کے مشورے سے اپنے شوہر کے ہمراہ عازمِ ماسکو ہوئیں - کیونکہ وہاں اس مرض کا علاج ترقی کی بہت منزلیں طے کر چکا ہے - لیکن وہ اس وقت وہاں پہنچیں جب بیماری بالکل لا علاج ہو چکی تھی اور وہ وہاں چند دن قیام کرنے کے بعد اپنے عزیزوں، رشتہ داروں، دوستوں اور مداحوں کو داغِ مفارقت دے گئیں - وفات کے وقت آپ کی عمر ۴۶ - ۴۷ برس کے قریب تھی -

چودھری برکت علی

یہ صدمہ ابھی تازہ ہی تھا کہ لاہور سے چودھری برکت علی کے انتقال پر ملال کی اطلاع ملی - چودھری برکت علی اردو کے ان پبلشروں میں تھے جن کا مصنفوں کے دلوں میں بدرجۂ اتم احترام موجود ہے - آپ ایک مرنجاں مرنج انسان تھے اور تمام عمر خاموشی سے اردو کی خدمت انجام دیتے رہے - چودھری برکت علی اور مکتبۂ اردو درحقیقت ایک ہی ادارے کے دو مختلف نام ہیں اور آج کا یا آنے والے دور کا کوئی ادبی مورخ مکتبۂ اردو کی ٹھوس اور جامع خدمات سے انکار نہیں کر سکتا -

" ادب لطیف " ہمارے ریاضِ ادب کا ایک ایسا پودا ہے - جس کی مرتے دم تک چودھری برکت علی نے آبیاری کی - ہمیں یقین ہے کہ یہ رسالہ چودھری صاحب کی یادگار کے طور پر اردو ادب کی بدستور خدمت کرتا رہے گا -

ادارۂ آج کل اس غم میں ادارۂ ادب لطیف کا برابر کا شریک ہے اور دست بہ دعا ہے کہ چودھری صاحب مرحوم کی جلائی ہوئی مشعلیں " مکتبۂ اردو " اور " ادب لطیف " ـــــ دنیائے ادب میں ہمیشہ روشنی برساتی رہیں -

رشید احمد صدیقی

حسرت موہانی

اُن کی گول چھدری داڑھی، ٹھوڑی کی باریک آواز، ٹھوڑی کی چھوٹے تال کی عینک۔ بغیر پھندنے کی ترکی ٹوپی، گھسی پسی چپل، موزوں سے کوئی سروکار نہیں۔ موٹے کھدر کی ملگجی پیوند لگی کا واک سی شیروانی جس کے اکثر بٹن ٹوٹے یا غائب۔ ہاتھ میں بدرنگ سا جوٹ کا ایک جھولا۔ دری تکیہ اور موٹی چادر۔ مختصر بستر۔ ٹیڑھا میڑھا پُرانا چھوٹا سا ایک ٹرنک اور ٹاملوٹ!

یہ تھے حسرت!

لیکن کس قیامت کا یہ آدمی تھا۔ محشر خیال نہیں محشر عمل! جس بات کو اپنے نزدیک حق سمجھتا تھا اُس کو بغیر کسی تامل کے، بغیر گھٹائے بڑھائے، بغیر ہموار کئے، بغیر مصلحت یا موقع کا انتظار کئے، بے ضبط زبان، بغیر پلک جھپکائے، مخاطب فلاطون ہو یا فرعون، اُس کے سامنے کہہ ڈالنا حسرت کے لئے معمولی بات تھی۔ ایسا نڈر، سچا، محبت کرنے والا اور محبت کا گیت گانے والا اب کہاں سے آئے گا۔ کسی سے نہ دبنے والا۔ ہر شخص پر شفقت کرنے والا۔ زبان کا نباض۔ شاعروں کا والی۔ غزل کا امام، ادب کا خدمت گذار ـــــ کیسی سچی بات ایک عزیز نے کہی کہ سیاست کوئلہ کا کاروبار ہے جس میں کسی کا ہاتھ اور بہتوں کا منہ کالا ہوتا ہے، سوائے حسرت کے۔

حسرت شخص کے اعتبار سے خاصے انتہا پسند واقع ہوئے تھے۔ اُن کے ہاں تضاد کی بھی کمی نہیں۔ لیکن اُن کی شاعری میں جو توازن، تازگی اور ترنم ملتا ہے وہ کم شعراء کے نصیب میں آیا ہے۔ مذہب اور سیاست میں کٹر ہونے کے باوجود شاعری میں حسرت کس درجہ شیریں نوا اور شریف النفس اور زندگی میں کیسے درویش صفت اور ترنج امیل تھے۔

حسرت علی گڑھ کالج کے بڑے ذہین اور ہونہار طالب علم تھے۔ انگریز دشمنی میں نکالے گئے۔ علی گڑھ میں سودیشی کپڑے کی دکان رکھ لی۔ غالب پر حاشیہ لکھا، اُردوئے معلّٰی کی ایڈیٹری کرتے رہے اور ان مشغلوں سے جو کچھ رُوکھا پھیکا میسّر آجاتا اُسی پر اکتفا کرتے اور دُنیا کی تمام عیش و کامرانی کو ٹھکراتے۔ فریب و فرعونیت پر گرجتے اور حُسن و عشق کا راگ گاتے رہے۔ کسی صاحب دولت کا زہرہ نہ تھا کہ محبت اور مسکنت کے اس بوریہ نشین اور عزیمت اور صداقت کے اس نقیب و ناخدا سے آنکھ ملا سکے۔ دیسی کُھرتے مٹیالے کاغذ پر اُردو کے مشاہیر کم نصیب گوشہ گیر اور تقریباً بھلائے ہوئے شعراء کے کلام کا انتخاب شائع اور اُن کی خدمات کو اُجاگر کرتے رہے۔

وہ زمانہ علی گڑھ کالج کے بڑے دبدبے اور طنطنے کا دَور تھا۔ کیسے کیسے طلبا یہاں تھے جو بڑے بڑوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے بحیثیت طالب علم حسرت یہاں جس ہیئت کذائی سے تشریف لائے اور جس طرح اُن کا مذاق اُڑایا گیا وہ آج تک زبان زد ہے۔ بازو پر امام ضامن بندھا ہوا مشروع کا پاجامہ۔ ایک بڑا پاندان ساتھ۔ لڑکوں میں خالہ اماں کے نام سے مشہور ہو گئے۔ لیکن یہی حسرت اپنی ذہانت، جرأت اور صداقت میں ایسے کھرے ثابت ہوئے کہ ساتھیوں کی آنکھ کا تارا بن گئے۔ علی گڑھ کالج میں بحیثیت طالب علم، بدیسی حکومت سے سب سے پہلے خالہ اماں ہی نے ٹکر لی۔ کالج میں ہلچل مچ گئی اور حسرت نکالے گئے۔ اُس زمانے میں بغاوت اور آزادی کے علمبردار جنوب میں بال گنگا دھر تلک، مشرق میں اروندگھوش اور شمال میں لالہ لاجپت رائے تھے۔ یو۔ پی میں حسرت نے اِس مشعل کو علی گڑھ سے روشن کیا۔

کسی کا اِس زمانے میں حسرت سے تعلق رکھنا انگریزی حکومت کے قہر و عتاب کا موجب ہوتا تھا۔ لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے علی گڑھ کالج

کہ اچھے سے اچھے طالب علم حسرت کی خدمت میں عقیدے کا نذرانہ پیش کرنے
ضرور حاضر ہوتے۔ اور اس پر فخر کرتے کہ حسرت نے اُن کو اپنے بوریئے پر
بٹھایا شفقت اور محبت کی باتیں کیں، اپنا کلام سنایا۔ اساتذۂ سخن کے کلام
اور شعر و ادب کی باریکیوں اور نزاکتوں سے آشنا کیا۔

گزشتہ ۳۵، ۴۰ سال میں جو لوگ علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہو کر
پبلک لائف میں داخل ہوئے اور نام پیدا کیا۔ اُن میں کوئی ایسا نہیں
جس کو میں نے بہت قریب سے نہ دیکھا ہو اور اُن کو اچھی طرح جانتا پہچانتا
نہ ہوں۔ علی گڑھ میں رہتے بستے ایک عمر ہوئی۔ یہاں کی زندگی کا کونسا
پہلو ایسا ہے جو نظر سے نہ گزرا ہو اور کونسی نعمتیں ہیں جو یہاں میسّر نہیں
آئیں۔ یہاں کے اکثر طالب علم سیاسی عقائد کے بنا پر یہاں سے نکالے
بھی گئے۔ ایسوں کا یہاں سے بیزار ہونا فطری تھا لیکن اس وقت
وہ ہستیاں ایسی یاد آتی ہیں جو یہاں سے جس عقیدے کی بنا پر نکالی گئیں
اُس کی اُنھوں نے تمام عمر پیروی کی۔ ہزار مصیبتیں جھیلیں۔ لیکن اپنے راستے
سے نہ ہٹے۔ اُن میں ایک حسرت ہیں۔ "خالہ جان" کے عہد سے لے کر خاتمہ
بالخیر ہونے تک بے غرضی، جفا طلبی، حق گوئی، خدا ترسی اور آزادی کے
راستہ کو لمحہ بھر کے لئے بھی نہیں چھوڑا۔ کیسے کیسے آلام اور آزمائش سے
گذرے۔ دو چار سال نہیں، نصف صدی سے اوپر۔ لیکن دامن کہیں سے
ملوّث نہیں ہوا۔ نہ اپنی نظر کو نیچی ہونے دیا نہ اپنے عقیدتمندوں کی نظر کو!

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اپنی قید و بند کی زندگی کا حال اُنھوں نے اپنے رسالے "اردوئے
معلّٰی" میں بالاقساط لکھا ہے جس میں اِس عہد کے حالات و حوادث
اور جیل خانے کی زندگی سے متعلق بڑے پتے کی باتیں لکھی ہیں۔ پڑھنے کی
چیز ہے۔

کئی سال ہوئے حسرت نے علی گڑھ میں شعر و شاعری سے متعلق اپنا
نقطۂ نظر ایک مقالے کی شکل میں پیش کیا تھا۔ یونین میں شائقین کا بڑا
اچھا اور ستھرا مجمع تھا۔ حسرت نے بڑی تفصیل اور بڑی قابلیت سے شاعری
کی اقسام بنائی تھیں۔ بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو حسرت سے بڑی
عقیدت رکھتے تھے لیکن حسرت نے ہر طرح کی شاعری پر جس شاعرانہ نقطۂ
نظر اور عالمانہ اندازِ فکر سے جو باتیں بیان کی تھیں اور اُن کے جواز
پر زور دیا تھا۔ ان سے بعض ثقات کی معتقدات کو جھٹکے لگے۔ اُن کو اس پر
تعجب ہوا کہ حسرت جو زندگی میں اتنے خشک اور سپاٹ، مذہبی معتقدات
میں اتنے کٹّر اور سیاسی نقطۂ نظر میں اتنے بے لچک تھے وہ غیر ثقہ شاعری
کی حمایت کیسے کر رہے تھے۔ یہ بات تعجب کی ضرور تھی کہ جو شخص کہیں اور
کسی سے مفاہمت نہ کرتا ہو وہ شاعری میں اتنی ڈھیل دیتا ہو۔ شاعری
میں حسرت کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ شاعری کا معیار شاعری ہی ہے کچھ
اور نہیں۔ ابھی ایک عزیز نے ایک دور دراز مقام سے استصواب
رائے کیا تھا کہ حسرت یا مصحفی کا کلام یونیورسٹی کے نصاب میں داخل
ہونا چاہیئے یا نہیں۔ اس لئے کہ بعضوں کے نزدیک دونوں کے
ہاں فحاشی اور برہنگی ملتی ہے۔ خط پڑھ کر مجھے حسرت ہی کا ایک شعر
بے اختیار یاد آگیا۔

رعنائیِ خیال کو ٹھہرا دیا گناہ
زاہد بھی کس قدر ہے مذاقِ سخن سے دُور

مجھے یہاں اس استفسار پر کچھ کہنا نہیں ہے۔ لیکن اتنا کہہ دینے میں
کوئی مضائقہ بھی نہیں کہ یونیورسٹی میں شاعر اور شاعری سے طلبا کو روشناس
کیا جاتا ہے متفرق اور مخصوص اشعار کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ دوسرے
یہ کہ اُردو غزل گوئی پر ایمان لائے بغیر ہم اپنے شعر و ادب کے معیار و
منزلت سے آشنا نہیں ہو سکتے اور جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے
حسرت شروع سے آخر تک تقریباً نصف صدی سے اوپر اپنے معاصرین
میں سب سے ممتاز، منفرد اور محترم رہے ہیں۔ سب سے بدنام صنفِ
سخن کو سب سے پُر آشوب عہد میں حسرت نے جس طرح بچایا اور سب سے
ممتاز رکھا وہ حسرت کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ چنانچہ میرا خیال ہے
کہ ابھی ایک نامعلوم مدت تک غزل گوئی کے معیار حسرت ہی رہیں گے۔
یہی بات نظم گوئی کے سلسلے میں اقبال کے بارے میں وثوق سے کہی
جا سکتی ہے؛ خود حسرت کی پیروی کوئی کر پائے یا نہیں۔ حسرت کی
غزل گوئی کی پیروی کئے بغیر چارہ نہیں۔ جس یونیورسٹی کے طلباء کے بارے
میں یہ اندیشہ ہو کہ حسرت کی غزل پڑھ کر بد اطوار ہو جائیں گے۔ میری رائے
میں اس یونیورسٹی کو بند اور اس کے اساتذہ کو کچھ اور نہیں تو تعلیم کے
کام سے تو ہمیشہ کے لئے محروم کر دینا چاہیئے۔

کوئی پندرہ سولہ سال اُدھر کی بات ہے، ایک دفعہ سفر میں حسرت کا ساتھ ہو گیا۔ میں دنیا کی ہر تکلیف برداشت کر سکتا ہوں، تھرڈ کلاس کی بھیڑ سے جانبر نہیں ہو سکتا۔ حسرت حسبِ معمول تھرڈ کلاس میں سفر کر رہے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ جس ڈبّہ میں وہ سفر کر رہے تھے اُس کا کیا حال تھا۔ کتنی بھیڑ تھی۔ کیسے لوگ تھے اور کیسا تکلیف دہ موسم تھا۔ لیکن حسرت کے بشرہ یا بات چیت سے مطلق ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ اُن کو شمہ برابر بھی کوئی تکلیف تھی۔ گاڑی ٹھہرتی تو میں پلیٹ فارم پر اُتر کر اُن کو دیکھ آتا۔ جب دیکھتا ہجوم میں اضافہ پاتا۔ مجھے دیکھ پاتے تو ہنس کر پکارتے اور ایسا معلوم ہوتا جیسے اس سے دلچسپ اور آرام دہ سفر اُنھوں نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ ایک دفعہ جا کر دیکھتا ہوں تو اُن کے کندھے پر کسی غریب کی چھوٹی سی بچی جھپکی لگائے ہوئے بیٹھی ہے۔ اور حسرت صاحب اپنی پوٹلی کھولے ہوئے کھانا کھا رہے ہیں۔ اور بچی کو بھی کھلا رہے ہیں۔ میں نے کہا حسرت صاحب یہ کیا ہے۔ کہنے لگے کوئی بات نہیں۔ بھیڑ زیادہ ہو گئی تھی اندیشہ تھا کہ بچی کچل نہ جائے۔ میں نے کہا حسرت صاحب کاش اس وقت آپ کا فوٹو لیا جا سکتا۔ اور اُس کے نیچے لکھ دیا جاتا "ہندوستان میں شاعری" کہنے لگے جی نہیں اس کے نیچے لکھا جاتا "ہندوستان میں بھیک"۔

٭ اُردو پی۔ ایچ۔ ڈی کا زبانی امتحان لینے حسرت علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ اسی سج دھج سے جس کا ذکر کر چکا ہوں۔ سفر خرچ کا بل نام دستخط کے لئے پیش کیا گیا تو بولے یہ فرسٹ کلاس کا کرایہ کیسا۔ میں تو تھرڈ کلاس میں سفر کیا کرتا ہوں۔ دراصل میں دہلی جا رہا تھا۔ پروگرام ایسا رکھا تھا کہ یہاں اُتر پڑوں اور امتحان لے کر آگے بڑھ جاؤں۔ پھر یہ کرایہ کیسا۔ ٹھہرنے کا الاؤنس کیوں۔ طعام و قیام تو آپ کے ہاں رہا۔ بڑی دیر تک بڑے مزے کی رد و قدح ہوتی رہی اور علی گڑھ سے اپنی اُلفت کا اظہار کرتے رہے۔ حسرت بڑے زندہ دل اور خوش گفتار تھے۔ میں نے کہا مولانا یہ روپیہ تو آپ میری خاطر لیں اور میرے ہی اوپر اپنے ہاتھ سے صرف کر دیں۔ بولے ہاں یہ ہو سکتا ہے۔ "بتائیے کیسے؟" میں نے کہا میرے لئے ایک ویسا ہی یونیفارم بنوا دیجئے جیسا کہ آپ پہنتے رہے ہیں۔ بے اختیار ہنس پڑے۔ پھر بولے یونیفارم کیا کیجئے گا۔ میں نے کہا دشمنوں کا خیال ہے کہ آپ اپنے بعد اپنا خلیفہ مجھ ہی کو نامزد کریں گے۔ اُس وقت یہ سجّادہ میرے کام آئے گا۔ بولے خرقہ یا سجّادہ۔ میں نے کہا: خرقہ نہ سجّادہ۔ اِن کا کاروبار سب ہی کرتے ہیں۔ آپ کی یونیفارم میں تو آپ کا خلیفہ خانقاہ بردوش نظر آئے گا۔ بہت محظوظ ہوئے رہ رہ کر ہنستے اور داد دیتے رہے۔×

حسرت ہندوستانی پارلیمنٹ کے ممبر تھے۔ لیکن اُن کے اپنے اندازِ درویشانہ میں کوئی فرق نہ آیا۔ نہ ممبروں کی آرام دہ کشادہ اور پُرفضا قیام گاہ۔ نہ ٹیلیفون نہ موٹر۔ نہ تفریح نہ دعوت نہ دید و بازدید۔ ایک غیر معروف شکستہ مسجد میں چٹائی پر قیام رہتا تھا۔ فرش پر آس پاس اخبارات۔ کاغذات اور فائلیں۔ وقت آیا تو کسی دوکان پر جا کر کھانا کھا لیا۔ کاغذات جھولے میں ڈالے پارلیمنٹ پہنچ گئے۔ راستہ اکثر پیدل ہی طے کرتے۔ اور موقع جان پڑتا تو پارلیمنٹ میں ایسی دوٹوک اور بے لاگ تقریر کرتے کہ در و بام گونج اُٹھتے۔

تم ہی بطرز دچو یاد آورم

دہلی میں ایک نیم سرکاری و سیاسی قسم کا اجتماع تھا۔ بعض اہم اور نازک مسائل زیر بحث تھے۔ شام کو عصرانہ تھا۔ اعیان دا کا برجمع تھے۔ حسرت بھی مدعو تھے۔ ایسے مواقع پر ایسی پارٹیاں صرف چائے پینے پلانے کے لئے نہیں ہوتیں اور باتیں بھی مدِنظر ہوتی ہیں۔ آرائش و زیبائش۔ جاہ و حشم۔ ساز و سامان۔ تکلف و تواضع۔ صاحبانِ ثروت۔ ماہرینِ سیاست، اکابرِ علم و حکمت، اپنے اپنے وزن اور وقار کے ساتھ اور خواتین مع اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے موجود تھیں۔ "فضا آراستہ چمن پیراستہ"۔ اتنے میں ایک طرف سے حسرت نمودار ہوئے۔ اسی سج دھج سے جو صرف ان کی تھی۔ اُسی وقارِ درویشی اور اندازِ قلندری سے جو اُن کا مسلک تھا، اور اُسی شعلہ سامانی و شبنم افشانی کے ساتھ جو اُن کی زندگی تھی۔ مجمع میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔ ہر شخص نے بڑے لطف و احترام سے حسرت کی پذیرائی کی اور دیکھتے دیکھتے وہ سب کی توجہ اور اور تپاک کا مرکز بن گئے۔ شائستہ فقرے۔ لطف کی باتیں۔ عقیدت و محبت کی پیش کش۔ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے یہ تقریب حسرت ہی کے خیر مقدم کے لئے منعقد ہوئی تھی۔ فرمائش شروع ہو گئی۔ حسرت نے

شعر سنانے شروع کر دئے۔ حسرت زیادہ تر اپنا کلام تحت اللفظ سناتے تھے بالکل جیسے باتیں کرتے ہیں۔ مگر معلوم نہیں کیوں کبھی کبھی ترنم بھی فرمانے لگتے جس پر مجھے ہمیشہ ہنسی آجاتی۔ اُن کا ترنم ایسا ہوتا جیسے کوئی معصوم بچہ ترنم کے ہر اصول سے بیگانہ محض ترنم کی نقل کر رہا ہو۔

حسرت اپنا کلام سنا رہے تھے۔ سارے اکابر اُن کے گرد جمع ہوگئے۔ محفل کا رنگ ہی بدل گیا۔ تھوڑی دیر تک ذہن میں کچھ اور باتیں آتی رہیں، اور اپنا اپنا نقش چھوڑتی چلی گئیں۔ سارا گردوپیش جو دولت امارت، اور نفاست کا ترجمان اور آئینہ دار تھا، ایک شخص کی موجودگی سے کیا سے کیا ہو گیا۔ اور اس مردِ درویش کے جلال اور اس کی شاعری کے جلو میں وہ سارا اہتمام کس درجہ سطحی اور ضمنی معلوم ہونے لگا کتنی ایسی باتیں ذہن میں آئیں جن کو باضابطہ اور بامعنی تحریر کا جامہ پہنانا ناممکن معلوم ہونے لگا۔ یکایک اقبال کی ایک نظم کے نقوش تصور میں اُبھرنے لگے اور بے اختیار یاد آنے لگا۔

اُس کا مقامِ بلند اُس کا خیالِ عظیم
اُس کا سرور، اُس کا شوق، اُس کا نیاز اس کا ناز
خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اُس کا دلِ بے نیاز
اُس کی اُمیدیں قلیل، اُس کے مقاصد جلیل
اُس کی ادا دل فریب اُس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو!
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز
نقطۂ پرکارِ حق۔ مردِ خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز
عقل کی منزل ہے وہ، عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیِ محفل ہے وہ
آہ وہ مردانِ حق! وہ عربی شہسوار
حاملِ "خلقِ عظیم" صاحبِ صدق و یقیں
جن کی حکومت سے ہے، فاش یہ رمزِ غریب
سلطنتِ اہلِ دل، فقر ہے شاہی نہیں
جن کی نگاہوں نے کی تربیتِ شرق و غرب
ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

زمینوں کو قابلِ کاشت بنانے کی اسکیم

ساڑھے دس لاکھ ایکڑ زمین کو دو سو چالیس ٹریکٹروں کی مدد سے سات سال کی مدّت میں قابلِ کاشت بنانے کی اسکیم کے مطابق بھارت سرکار کا محکمہ سنٹرل ٹریکٹر آرگنائزیشن عمل درآمد کر رہا ہے۔ اس مدّت کی ابتدا ۵۰-۱۹۴۹ء کی فصل سے شروع ہوئی ہے۔ اس اسکیم کے تحت اُتر پردیش، مدھیہ پردیش، مدھیہ بھارت اور بھوپال کی وہ زمینیں آتی ہیں جو گھاس پھونس سے بھری پڑی ہیں۔

زمینوں کی اصلاح کے لئے کوئی علیحدہ اسکیم موجود نہیں ہے۔ بلکہ اس سلسلہ میں "زیادہ خوراک اُگاؤ" کی مہم کے تحت کچھ اقدامات کئے گئے ہیں۔

(ڈی۔ پی کارمارکر)

شیر جنگ

نشاطِ مُطالعہ

دانتے

مصوّر ہنری ہولی ڈے کی شہرۂ آفاق تخلیق "دانتے اور بی ترچ"
آپ کی نظروں سے گزری ہوگی ۔ دن ڈھل رہا ہے ۔ سورج کی ترچھی کرنیں
فلورنس شہر کے اونچے مکانوں کی چوٹیوں پر سے پھسلتی ہوئی دریا پر اپنا
نقرئی جال پھیلائے ہوئے ہیں ۔ آسمان پر آوارہ بادلوں کے چند چھلے
ہوئے ٹکڑے سُورج سے آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں ۔ جن کا عکس نیچے دریا
میں پُل کے قریب کرنوں کے جال میں پھنسا ہوا دبے ہوئے ارمانوں کی
طرح بھڑک رہا ہے ۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ دانتے کا دل جو کہ موڑ
کے قریب کھڑا ایک ہاتھ سے دریا کے بند پر سہارا لئے اور دوسرے سے
دل کو تھامے اپنی محبوبۂ 'بی ترچ' کو دیکھ رہا ہے ۔ 'بی ترچ' اپنی سہیلی
'مونا وانا' اور ایک دوسری لڑکی کے ہمراہ شاہراہ سے گزر اور بڑی بے التفاتی
کے ساتھ دور اُفق کی طرف دیکھ رہی ہے ۔

یہ تصویر ایک داستان ہے اُس لافانی محبت کی جس کے تخم کی بنیاد
دانتے کے دل میں اُس وقت پڑی تھی جب کہ اُس کی عمر دس سال تھی، اور
'بی ترچ' کی نو سال ۔ تمام عمر دانتے نے اس تخمِ محبت کی آبیاری آنسوؤں
سے کی اور ان آنسوؤں کو گیتوں میں پرو کر ایک ایسا تحفہ دنیائے ادب
کو بخشا جو ابد تک شگفتہ رہے گا ۔ اور جس کی صدائے بازگشت اس کے ہمعصر
حافظ شیرازی کے نغموں کی طرح اُس وقت تک گونجتی رہے گی جب تک کہ
زمانے کا ورق ۔ مقام کی بندشوں سے آزاد "ورق" اس دور کی تمام
کھوئی ہوئی یادوں ، بھولی ہوئی مسکراہٹوں ۔ نیم رس آنسوؤں ۔
نیم وا پیار کی باتوں ۔ ان کہی مُرادوں اور مبہم آہوں کے مرقعے شفق
کے رنگ میں پیش کرتا رہے گا ۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

'بی ترچ' کی عمر ابھی ۲۴ سال کی ہی تھی کہ وہ دانتے کی زندگی کو
ایک لازوال اندھیری رات دے کر ہمیشہ کے لئے دُنیا سے رخصت ہوگئی ۔
دانتے کی محبت ایک خاموش محبت تھی ، جو ابھی ظاہر بھی نہیں ہونے
پائی تھی اور بُلبُل کے ان بچّوں کی طرح پَر تول رہی تھی جو آشیانے سے سر
نکال کر کھلتے ہوئے پھولوں کو دیکھ تو لیتے ہیں لیکن فرطِ ضعف و حیا سے اُڑ نہیں
سکتے کہ قریب جا کر اُسے اپنے نغموں سے رجھا سکتے یا کسی تیز کانٹے کی نوک پر
چھاتی رکھ کر اُس وقت تک رہیں جب تک کہ کانٹا چھاتی کے پار نہ ہو جائے
اور نغمے کے عوض سینے سے خون کی دھار نکل کر پھول کو سُرخ نہ کرے ۔
اب دانتے اپنی زندگی کی اندھیری رات میں بھٹکنے لگا ۔ حسین کائنات
گہنانے لگی اور گھنی رات کی گہرائیوں میں کچھ خواب سے نمودار ہونے لگے ۔
ان خوابوں نے نظموں کی شکل اختیار کر لی اور یہ نظمیں اُس کی زندگی
کے دُکھتے ہوئے سینے میں اس گہرائی سے پیوست ہوگئیں کہ رفتہ رفتہ حد سے
گزرا ہوا درد ، دوا میں تبدیل ہونے لگا ۔ اور اُس کی زندگی کے اُفق پر
ہر طرف ڈوبتے سُورج کی پُر امن شانتی اور رنگینی پھیل گئی ، اور آخر کار ان
نظموں کا ابتدائی مجموعہ "حیاتِ نَو" (Vita Nuova) کے
عنوان سے مرتب ہوا جس میں 'بی ترچ' بی ترچ کے سراپا اور بی ترچ کی
محبّت کے گیت اپنے نقطۂ عروج پر آکر الوہیت اور عبودیت کے درجے تک
پہنچ گئے ۔

اس معراج اور الوہیت کے باوجود اس مجموعے پر ایک ایسا سناٹا
اور ایک ایسا سُونا پن چھایا ہوا ہے گو یا کسی گنجان شہر کی گونجتی گرجتی شاہراہ
کے کنارے پر کوئی غریب الدّیار دُکھا ہوا مولانا روم کا یہ شعر زیر لب پڑھ
رہا ہو ۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند — از جدائی ہا شکایت می کند

اس مجموعے کو مرکز بنا کر دانتے نے ایک اور تخلیق 'الہامی کومیڈی' کو جنم دیا جس نے اُسے زندۂ جاوید بنا دیا۔ اس مجموعے کا اسلوب وہی ہے جس کا تتبع ڈاکٹر اقبال نے اپنی مشہور کتاب 'جاوید نامہ' میں کیا ہے۔ شاعر ورجل کی معیت میں دانتے دوسری دنیاؤں کا سفر کرتا ہے اور 'بی ترچ' کی تلاش میں دوزخ، اعراف اور بہشت وغیرہ کی خاک چھانتا ہے۔ اس کتاب میں محض 'بی ترچ' کی تلاش ہی نہیں ہے بلکہ درصل یہ تلاش ایک بہانہ ہے جس کے ذریعے سے دانتے شاعری کے لباس میں اپنا فلسفہ، اخلاقی تخیل اور معتقدات پیش کرتا ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ کا تمام علم اور تمام فلسفہ اس کتاب میں موجود ہے۔ حتیٰ کہ اس دور کی سیاسیات بھی اس میں جگہ پائے ہوئے ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اطالوی شاعر، بغاوت اور احتجاج کا شاعر ہے جو دُنیا کی بے انصافی کے خلاف اپنے غیظ و غم میں ڈوبے ہوئے قلم کو اپنے خون میں ڈبو کر گویا وثیقۂ ہدایت تحریر کر رہا ہے۔

اُس کی تصویر دیکھئے، دُبلا پتلا، عقاب کا سا تیز چہرہ جس پر ایثار، درشتی، رُوکھے پن اور کلفتوں کے نشان یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ کوئی مجاہد ہے جو سمجھوتہ کرنا نہیں جانتا۔ کارلائل کے الفاظ میں "ایک انتہائی غم آلود چہرہ، ایسا ماتم زدہ اور المناک چہرہ جسے دیکھ کر دل بھر آتا ہے"

شاید دنیا میں دانتے کے علاوہ کوئی بھی ایسا شہرۂ آفاق شاعر نہیں گزرا جس نے ارادتاً اپنے فن کو تعلیم کا ذریعہ بنایا ہو۔ اور جو اپنے اخلاقی، دینی اور دنیوی مسلک کو جسے وہ صحیح سمجھتا ہے اس کی تلقین کے لئے اس طرح شاعری کو استعمال کیا ہو۔

'دانتے الیغری' اطالیہ کے فلورنس شہر میں ایک متموّل اور معزز گھرانے میں ۱۲۶۵ء میں پیدا ہوا، اور ان تمام علوم پر عبور حاصل کیا جو اس وقت تک انسانی دماغ کی دسترس میں تھے۔ اپنے علم کی فضیلت اور خاندانی مرتبت کے بل پر وہ نہایت آسائش کے ساتھ ادبی زندگی گزار سکتا تھا لیکن اس کے عوض اس نے اپنے شہر کی سیاسی زندگی کو اپنایا جو کہ اس وقت افراتفری کے دور سے گزر رہی تھی۔

چونکہ اس کا تعلق وہاں کی جمہوری پارٹی سے تھا، اس لئے اعلیٰ پوپ کی فتح کے بعد اسے جان بچا کر بھاگنا پڑا اور جلاوطنی کی زندگی اختیار کرنا پڑی۔ جلاوطنی کا زمانہ اس کے لئے بڑا سختی کا زمانہ تھا جس کے بارے میں وہ خود کہتا ہے "میں بھاجو نہیں، بلکہ ایک ایسا بھکاری ہو گیا ہوں جو نہ چاہنے پر بھی تقدیر کے لگائے ہوئے چرکوں کا مظاہرہ کرنے پر مجبور ہے ----- میں ایک ایسی کشتی بن کر رہ گیا ہوں جس میں نہ پال ہے اور نہ پتوار اور جو افلاس کی خشک اور تُند ہواؤں کے تھپیڑوں سے اِدھر اُدھر ماری ماری پھر رہی ہے۔ ۔ ۔ ۔"

اُس نے تمام عمر بہادری سے ان سختیوں کا مقابلہ کیا۔ لیکن اپنے عقیدے سے متزلزل نہیں ہوا۔ اس کی تحریروں اور اس کے بے لوچ رویئے سے ناراض ہو کر پوپ نے اس کی غیر حاضری میں اس کے واسطے زندہ جلائے جانے کی سزا مقرر کی، اور یہی مجوزہ سزا اُس کی دائمی جلاوطنی کا باعث بن گئی۔ اور اس جلاوطنی میں ہی اس کا انتقال ہو گیا۔

یہاں ہم اُس دور کی اُلجھی ہوئی سیاست کا تذکرہ نہ کریں گے جو کہ مختلف شہروں کی باہمی رقابتوں، سازشوں، ذاتی اور جماعتی جھگڑوں سے عبارت تھی اور جس کو پوپ اور کلیسائی سامراج کا نامبارک سایہ اور بھی اُلجھائے ہوئے تھا۔ یہاں اتنا ہی کہہ دینا کافی ہو گا کہ دنیا کا یہ ممتاز ترین شاعر شیش محل کا شاعر نہیں تھا بلکہ عوام کا دوست تھا جس نے شروع سے لے کر آخر تک اپنے دور کی سیاست میں عملی حصہ لیا۔ عوامی حقوق کے لئے جنگ کی اور عوام کے دشمنوں کو اپنا ذاتی دشمن تصور کیا۔ اپنے فن کو اُس نے ایک حربے کی طرح استعمال کیا جس کی بے پناہ ضرب سے اس کے دشمن آج بھی اور رہتی دنیا تک واصل جہنم ہیں اور رہیں گے۔

'الہامی کامیڈی' کے اُس حصے میں جہاں دانتے جہنم کا نقشہ پیش کرتا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ اُس دور کے جتنے غدار، جابر، ظالم اور جمہور دشمن لوگ ہیں وہ سب وہاں موجود اور ہولناک عذابوں اور اذیتوں میں مبتلا ہیں۔ اپنے دور کے کلیسائی اقتدار اور کلیسائی سیاست کا یہ سب سے بڑا دشمن ہے۔ چنانچہ اپنے ہم مشربوں کے ساتھ دو پوپوں کو بھی ہم جہنم کی آگ میں جلتا ہوا پاتے ہیں۔ خود بہشت اُن کی حرکات پر غصے سے تمتما رہی ہے، اور سینٹ پیٹر کہہ رہا ہے "ان دونوں نے میری متبرک عبادت گاہ کو خون اور غلاظت کی سنڈاس بنا ڈالا ہے"

کچھ نقادوں نے دانتے کی شاعری کو گھٹیا درجے کی شاعری کہا ہے، کیونکہ اُن کے نزدیک فن کو تبلیغ و تلقین کا ذریعہ نہیں ہونا چاہیئے۔

دانتے اس سے متفق نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اُس فن کو جسے ہم اپنی زندگی کا مدار بناتے ہیں اخلاق اور تاریخی فلسفے کی بنیادوں پر قائم ہونا چاہیئے۔ کیونکہ فن کا مقصد محض قیاس آرائیاں ہی نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد ہے کہ ہم روزمرہ کی زندگی میں اسے استعمال کریں" کسی چیز، کسی جذبے یا کسی تخیل کو خوبصورت لباس میں پیش کرنا اُس کے نزدیک آرٹ نہیں ہے، بلکہ آرٹ ہے کسی خوبصورت چیز، خوبصورت جذبے یا خوبصورت تخیل کو اُس کے صحیح حُسن کے ساتھ پیش کرنا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی تصانیف میں آپ رنگین جملے، زرد اور قرمزی الفاظ نہیں پاتے۔ بلکہ ایک ایسا حُسن پاتے ہیں جس میں وقار ہے جس میں شان ہے اور جس میں الورا، بھوونیشور اور آبو کے مندروں کی سی وجاہت اور تقدس ہے۔

وہ مسائل جو دانتے کے پیش نظر تھے اور اپنی زندہ جاوید تخلیق "الہامی کومیڈی" میں اُسی نے جن کا حل پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہ ایسے مسائل ہیں جو آج بھی سوالیہ علامت کی شکل میں انسانی شعور پر مسلط ہیں۔

ان میں پہلا مسئلہ ہے ایزدی انصاف کا۔ بدی کیوں پھلتی پھولتی ہے؟ معصوم اور بے گناہ کیوں ستائے جاتے ہیں؟ اگر خدا قادر مطلق ہے تو وہ کیوں اپنی طاقت ظالموں کے خلاف اور نیک بندوں کے حق میں استعمال نہیں کرتا؟ دانتے ان سوالوں کے جواب کی تلاش میں جہنم اور جہنم سے اعراف اور بہشت تک پہنچتا ہے۔

یہ سوال ہمارے سامنے آج بھی موجود ہیں۔ دانتے نے اپنی فکر کے مطابق ان کا جواب تلاش کیا لیکن ہم ہیں کہ ان سوالوں سے بیزار اپنی فکر کو ہی جواب دئے بیٹھے ہیں۔

دوسرا اہم مسئلہ، محبت کا مسئلہ ہے۔ مسیحی مذہب نے عورت کے متعلق ایک نیا تخیل پیش کیا تھا۔ اس سے پیشتر ابتدائی یونانی تخیل کے مطابق یورپ میں عورت روزمرہ کی زندگی سے وابستہ ایک ایسی فطری تخلیق تھی جو بقائے حیات اور تسلسل نسل کے لئے ایک لازمی ذریعہ تھی اور بس — ازمنۂ وسطیٰ نے مسیحی تخیل کے زیر اثر اسے روحانی درجہ عطا کیا اور اسی دھن میں بلندیوں میں پہنچا دیا جہاں جنسی تعلقات سے آزاد ہو کر وہ روحانی دُنیا کا تبرک بن کر رہ گئی۔ دانتے کی تمام زندگی اُس کی تمام فنی تخلیق اسی قسم کے تخیل سے منور ہے جس میں نو سالہ لڑکی بی تریچ، کی اتفاقیہ ملاقات اور معصوم محبت کی ضوفشانیاں کارفرما ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ جدید سائیکالوجی محبت اور عورت کے اس تصور کو غیر صحت مند اور غیر فطری گردانتی ہے لیکن جس تاریخی دَور میں یہ تصور پیش کیا گیا تھا اُس کے پیش نظر دانتے نے ایک مکمل عورت کی تصویر میں جو روحانی سرور اور جمالیاتی رنگ بھر دیا ہے، آج بھی ہمارے ذوقِ سلیم کی تسکین کا باعث ہے۔ اور اُس پر نگاہ کر کے ہمیں اس کی عظمت کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔

قرونِ وسطیٰ سے پیشتر جنسی تعلقات کی دنیا میں انفرادی طور پر جذبۂ عشق کے لئے نہ تو کوئی گنجائش تھی اور نہ کوئی جواز ہی۔ یہ تعلقات محض ایک حیوانی خواہش کی تسکین کا موجب سمجھے جاتے تھے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اُس وقت بھی عورت کا حُسن مرد و عورت کے ذوق کی ہم آہنگی، جنسی زندگی کے لطیف ترین و قریب ترین تعلقات ـــــ انسان کے لئے باعثِ کشش رہے ہوں۔ لیکن اُس میں اور جذبۂ عشق میں اتنا ہی بُعد ہے جتنا کہ حیوانی جذبۂ شہوت میں اور انسانی جذبۂ محبت میں ہوتا ہے۔ یعنی دونوں کی ایک ہی بنیاد ہوتے ہوئے بھی حیوان میں یہ جذبہ محض جنسی بھوک کی تسکین تک ہی محدود ہے۔ اور انسان میں ارتقا پا کر اس کے ساتھ ساتھ یہ انسانی شعور اور رُوح کی مسرت کا ذریعہ بھی ہے۔

پچھلے تمام زمانے میں ہر جگہ اور ہندوستان میں آج بھی شادی کے لئے دولہا اور دلہن کا انتخاب اُن کے اختیار میں نہیں بلکہ ماں باپ یا قبیلے کے اختیار میں ہوتا تھا۔ فریقین کو اس انتخاب پر صاد کرتے ہی بن پڑتا تھا۔ ان دو اجنبیوں کا ازدواجی رشتہ ظاہر ہے کہ محبت کی گرہ سے استوار نہیں ہوتا تھا بلکہ بہت سے دیگر امور اس رشتے کے محرک ہوتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ آگے چل کر ان دونوں کے درمیان بسا اوقات کچھ اُنس پیدا ہوجاتا تھا۔ لیکن یہ بھی داخلی کشش کی بناء پر نہیں بلکہ خارجی طور پر ادائے فرض کے جذبے کے تحت پیدا ہوتا تھا۔ جذبۂ عشق ان معنوں میں جن میں کہ آج اس سے مراد لی جاتی ہے، اُس وقت ازدواجی زندگی کی حدود میں داخل نہیں تھا۔ ہندی ادب میں رادھا اور کرشن کا پریم اس کی مسلّمہ شہادت ہے۔ اُس وقت کی شادی کلیتہً ماں باپ کی مرضی پر منحصر ہوتی تھی اور اُن کی مرضی اپنے قبیلے، خاندان، نسب کے مفاد سے وابستہ رہتی تھی، شادی کے معنی تھے فریقین کا مالی یا نسبی طور پر مرتبہ و مفاد نہ کہ دو دلوں کا روحانی اتحاد۔

دوسرے لفظوں میں شادی ایک ایسا سودا تھا جس میں نسبی یا مالی منفعت ہی مقدم طور پر فریقین کے ملحوظِ خاطر رہتی تھی۔ جائداد کا مالک چونکہ مرد ہوتا تھا اور وہی ترکہ بھی چھوڑ سکتا تھا اس لئے اس تمام سودا بازی میں مرد ہی مرکزی حیثیت اختیار کئے ہوئے تھا۔ ذاتی ملکیت کے لئے وارث کی خواہش نے "یک زوجگی" کے ادارے کو پیدا کیا تھا اور یہ ادارہ جوں جوں اہمیت اختیار کرتا گیا اس کے ساتھ ساتھ مرد یعنی جائداد کے مالک کی اہمیت بھی اتنی ہی بڑھتی چلی گئی اور عورت کی حیثیت اپنے خاوند کی جائداد کے لئے ورثا پیدا کرنے والے ایک دل خوش کن اور دلچسپ کھلونے سے زیادہ اور کچھ نہیں رہ گئی تھی۔

اس قسم کے تعلقات میں ظاہر ہے کہ گہری محبت موجود نہیں ہوسکتی تھی، اور نہ عورت کے لئے کسی قسم کی کوئی آزادی ہی کا موقع مل سکتا تھا۔ ذاتی ملکیت کے ادارے نے عورت کو ایک دلچسپ غلام بنا کر چھوڑ دیا۔ اس کی جنسی آزادی جو اُسے اجتماعی یا مادری کُنبے کے ادارے میں حاصل تھی بالکل مفقود ہوگئی۔ کیونکہ اس آزادی میں باپ کے لئے قطعاً ناممکن تھا کہ اپنی جائداد کے وارث کو شناخت کرسکے۔ عورت کی اس غلامی کو شدید اور دوامی بنانے کے لئے مرد نے نئی زنجیریں ایجاد کیں اور مذہب، دینیات، دیوتاؤں، دیویوں، فرشتوں، ثواب۔ عذاب، پتی برت دھرم غرض الٰہیاتی اسلحہ خانے کے وہ ہتھیار بروئے کار لائے گئے جن کی مدد سے نہ صرف جسمانی بلکہ ذہنی طور پر اُسے مستقل کنیز رکھا جاسکے۔

ازمنۂ وسطیٰ کے حساس ادیبوں نے اِس غیر انصافی کو شدید طور پر محسوس کیا اور اس کے خلاف بغاوت کی۔ چنانچہ ادب کا رومانی اسکول اسی بغاوت کا اظہار ہے جس نے عورت کو غلامی کی زمین سے اُٹھا کر الوہیت کے آسمان پر پہنچا دیا۔ حسب اور نسب کی جگہ عشق و محبت کو باہمی تعلقات کی بنیاد قرار دیا، اور جامی کے الفاظ میں

بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامی
کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

عشق کی بندگی کو ہی اوّلین مقام دیا گیا۔ کچھ مفکر اس سے بھی آگے گئے اور اُنھوں نے عورت کے عشق کو جنسی تعلقات سے بھی آزاد کر دیا۔ چنانچہ افلاطون کا فلسفۂ محبت اس کی بیّن مثال ہے جس کی وجہ سے لفظ "افلاطونی محبت"، یعنی غیر جنسی محبت، لغت میں ایک باقاعدہ لفظ کی حیثیت سے شامل ہوگیا۔

دانتے اسی بغاوت اور فلسفے کا علمبردار ہے، اور "الہامی کومیدی" اُس کے اس عقیدے کی ایک نہایت حسین تصویر ہے۔

دنیا کے وہ دو عظیم المرتبت شاعر جو یورپ میں نشاۃِ ثانیہ کے نقیب ثابت ہوئے اُن میں سے پہلا دانتے تھا اور دوسرا 'پیٹ رارک'۔ ان دونوں نے اپنی داخلی زندگی کا ماحصل اور اپنے فن کی انتہائی گہرائی کا مطمحِ نظر جمالِ لاممکن الاتصال ہی کو بنایا۔ دانتے کے لئے 'بی ترچ' اور 'پیٹ رارک' کے لئے 'لورا' دونوں "اپنی حقیقتیں" نہیں جو گوشت پوست کی ہوتی ہوئی بھی دونوں شاعروں کے لئے گوشت پوست کے عمل اور گوشت پوست کے تقاضوں سے آزاد تھیں۔ اگرچہ مرد عورت کے تعلقات کی یہ شکل انتہائی غیر فطری، مہمل اور معقولیت کے خلاف ہے۔ لیکن ان ہر دو شعراء نے جن کی شعوری عظمت اور فنی دیانت داری مسلّمہ ہے۔ جب اس قسم کے غیر فطری تعلقات پر اپنی داخلی زندگی کی تمام بنیادوں کو استوار کیا ہے تو یہ سمجھنے میں وقت نہیں ہوتی کہ اُس تاریک دَور کا یہی تقاضا تھا کہ عورت کو عظمت کے منوانے کے لئے حقیقت کو مجاز کے اور مجاز کو حقیقت کے رنگ میں پیش کیا جائے۔

حافظ شیرازی کے مطالعے سے جو کہ دانتے کا کم و بیش ہم عصر تھا یہ بات اور بھی صاف ہو جاتی ہے۔ حافظ ایک صوفی مسلک اور درویش منش انسان تھا ہر چند اس کا تمام کلام مجازی رنگ میں غرق، شراب اور معشوق کی مستیوں اور شوخیوں سے معمور ہے۔ لیکن یہی شوخیاں اور مستیاں صوفیوں اور درویشوں کی اصلاح میں ایک ایسی دنیا کا نقشہ پیش کرتی ہیں جو اس دنیا کے ظلم و ستم، ریاکاری و بے وفائی اور تصنع سے بہت دور ہے۔

غرض یہ دَور تھا جس میں ہر شاعر اور ہر تخلیقی فن کار اور ہر مفکر یہ کہنے پر مجبور تھا:

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

لیکن یہ دَور دانتے کے بعد زیادہ مدت تک قائم نہیں رہا جس بغاوت

کا علم دانتے نے بلند کیا تھا وہ جلد ہی نشاۃِ ثانیہ کی شکل میں یورپ بھر پر لہرانے
لگا۔ دانتے اس بغاوت کا نقیب تھا اور مصنفؔ "بوکاسیو" اس بغاوت کا
سپاہی۔ اس نے اپنی کہانیوں میں عریاں طور پر پادریوں، کاہنوں، ننوں
امیروں اور امیرزادیوں کے متعلق "چوں بخلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند"
کی صاف صاف تشریح کی ہے۔

بوکاسیو کی 'دسے کے بروں' نامی کتاب سماج کی اُن اخلاقی قدروں
کے خلاف جو کہ مادی قدروں کی کم یابی اور انقباضِ امساک کی پروردہ تھیں
بغاوت کی للکار ہے۔ اس میں صلائے عام ہے کہ "زندہ رہو، مزے اُڑاؤ
اور محبت کرو۔ جنگوں کو ختم کرو، اور اُن سب کو بھی جو جنگ کی ترغیب
دیتے ہیں۔"

کلیسا کے اقتدار کا چراغ جو بوکاسیو کے سے فن کاروں کی شعلہ
نفسیوں سے جھلملا رہا تھا بجھنے سے پہلے ایک بار بھڑکا اور اس کی
سازشوں سے جنوبی فرانس میں ایک بار پھر قتل و غارت کا بازار گرم ہوا۔
اس قتلِ عام کے دوران میں جس میں پندرہ ہزار آدمی عورتیں اور بچے موت کے
گھاٹ اُتارے گئے ایک "دیندار مجاہد" نے کلیسائی حاکم سے پوچھا کہ مومن و
کافر میں کس طرح امتیاز کیا جائے۔ اس نے جواب دیا "تم قتلِ عام کرو، کسی
کو مت چھوڑو۔ خدا اپنے بندے کی خود حفاظت کرے گا۔"

پاپائے روم کے فتوے کے زیر اثر یہ قتل و غارت گری بیس برس تک
جاری رہی، اور تقریباً دس لاکھ انسان تہ تیغ کئے گئے۔

لیکن وہ سامنتی اقتصادی نظام جس کو بچانے کے لئے کلیسا عوام کے
لہو سے ہولی کھیل رہا تھا بچ نہ سکا۔ دانتے اور بوکاسیو نے جس بغاوت
کا علم بلند کیا تھا اُس بغاوت نے اُسے ختم کر دیا۔

اپنے کیتھولک عقیدے اور رومانوی فلسفے کے باوجود دانتے کے فن کو
جو بات ممتاز اور لافانی بناتی ہے وہ ہے اُس کے بدیع تخیل کی تخلیقی ندرت
اور گہرے تاثرات کی انوکھی ستم گری۔ خارجی حقیقتیں ایک انوکھے ڈھنگ سے
اُس کے حواس پر عمل کرتی ہیں۔ تاریخ کا ڈرامہ۔ نیچر کی سرگوشیاں۔ اُلفت اور
نفرت کی دھوپ چھاؤں اور جنسی جذبے کی وہ خطرناک آندھیاں جو کشتِ
امن کو برباد کر ڈالتی ہیں، اُس کے تاثرات کو ایک نادر اور جدید جادوگری
میں مصروف کر دیتی ہیں۔

اس کے معتقدات سے ہم آج کتنا ہی گریز کریں جس میں سفاکی کا عنصر بھی
اُتنا ہی مرنج ہے جتنا کہ رحم اور محبت کا۔ لیکن اس حقیقت کے تسلیم کرنے سے گریز
نہیں کیا جا سکتا کہ شاعری کی روح اپنے لطیف ترین تاثرات اور عمیق ترین جذبات
کے ساتھ جس طرح اس انسان کے اندر موجود تھی ادب کی تاریخ اُس سے
آج تک بے بہرہ ہے۔ نسلِ انسانی کا وہ سب سے بڑا اور سب سے اہم شاعر ہے۔
یہ وہ شاعر ہے جس کے تخیل کی اُڑان اور جس کی انسانی ہمدردی کی پہنائیوں کے
سامنے ہومر، شیکسپیئر اور ملٹن بھی شکستہ بازو چڑیاں معلوم ہوتی ہیں جس خوبی سے وہ
مغزِ معانی کو ایک لفظ میں بند کر دیتا ہے اُس کی مثال کسی ملک کا بھی ادب پیش
نہیں کرتا۔ اور پھر اُس کا بانکپن، اُس کا حسن، اُس کی وسیع ہمدردی اور اُس کی
شدتِ احساس، اُس کی تخلیق میں ایک امتیازی شان پیدا کئے ہوئے ہے۔

اُس کی کفایتِ لفظی ملاحظہ فرمائیے۔ بے کار اور بے مصرف لوگوں
کے متعلق وہ کہتا ہے: "موت سے بھی انہیں کچھ اُمید نہیں اور اُن کی اندھی
زندگی بھی اتنی ادنیٰ ہے کہ اُن میں سے ہر ایک دوسرے کے حالات پر رشک
کھاتا ہے۔ دنیا اُن کی یاد سے گریزاں ہے اور رحم و انصاف اُن سے نالاں۔"

خدا کے انتقام کی بشارت کا یہ شاعر جس وقت کلیوں کے سے نازک
اور بچوں کے سے تبسم، خواب کی سی لطافت رکھنے والے لرزاں لمحاتِ
محبت کا ذکر کرتا ہے تو شیکسپیئر تو کیا خود شاعرہ سافو بھی اُس کے سامنے
سرنگوں نظر آتی ہے۔

جب فرانسسکا اور اُس کے محبوب کی طوفان زدہ روحیں اُس کے
سامنے آتی اور شاعر کی آنکھوں میں ہمدردی کی جھلک پاتی ہیں تو لڑکی بے خود
ہو کر اپنی داستان کہنے لگتی ہے۔

" ایک دن ہم دونوں لینسلوٹ پڑھ رہے تھے کہ
کس طرح محبت نے اُسے مجبور کر دیا تھا۔ ہم دونوں اکیلے
تھے اور ہر قسم کی بدگمانی سے مبرا۔

" اس پڑھائی نے کئی مرتبہ ہماری آنکھوں کو بے اختیار
ملایا اور ہمارے چہروں کے رنگ تبدیل کئے۔ لیکن ایک
لمحہ ایسا آیا جس نے ہمیں بے قابو کر دیا۔

" جب ہم نے پڑھا کہ کس طرح ایک چاہ بھری مسکراہٹ
کو اُس کے محبوب نے چوم لیا تھا، تب اُس نے جسے میں کبھی بھی اپنے
سے الگ نہ ہونے دوں گی لرزتے لرزتے میرا منہ چوم لیا۔
...... اُس دن پھر ہم کتاب آگے نہ پڑھ سکے۔"

عامر الانصاری

انگریزی ادب اور مراکش

انگریزی ادب پر عربی ادب کا بہت قدیم زمانے سے اثر ہے۔ عرب کے نظریات و روایات وہاں کے رسم و رواج سے انگریزی ادب بہت متاثر رہا ہے۔ بلکہ اب تک اُس کا اثر باقی ہے۔ گو انقلاباتِ زمانہ نے اب معاملہ بالکل برعکس کر دیا ہے کہ عربی ادب انگریزی و فرانسیسی سانچوں میں ڈھلنے لگا لیکن سبقت عربی کو ہی حاصل ہے۔ چودھویں صدی عیسوی میں Geoffrey Chaucer ایک انگریزی ادیب نے (جو شاید سب سے پہلا انگریزی شاعر تھا) قطب نما پر ایک رسالہ لکھا تھا۔ اس رسالے کا ماخذ آٹھویں صدی میں لکھی جانے والی ایک عربی کتاب تھی۔ اسی طرح جیفرے کی کتاب "کانٹربری" میں ایسی حکایات موجود ہیں جو یقیناً عربی سے آئی ہیں۔ پرانے عرب مصنفین کا فکر ہیں۔

تتبع و تلاش کے بعد ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ مراکش کے متعلق ابتداءً جس قدر کتابیں انگریزی میں لکھی گئیں اُن کا موضوع عام طور پر انگریزی سفرا کے مشاہدے یا انگریز سیاحوں کے سفرنامے ہیں۔ مشہور ہے کہ سب سے پہلا انگریزی جہاز جو مراکش کی بندرگاہ پر پہنچا وہ Lion ہے۔ یہ جہاز ۱۵۵۱ء میں ساحلِ مراکش پر آیا اور ایک سال کے لگ بھگ یہاں ٹھہر کر واپس ہوا۔ لائن Lion کے ملاحوں میں ایک جیمس تھامس James Thomas نامی ملاح نے اپنے اس سفر کا بہت مختصر سا حال چھوڑا ہے۔ مراکش پر لکھی جانے والی شاید سب سے پہلی انگریزی کتاب یہی ہے۔ جیمس تجارتی تبادلے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہاں کے باشندوں نے ہمارا پُرجوش استقبال کیا کسی قسم کی نفرت یا خوف کے بغیر ہم سے تجارتی مال کا تبادلہ کیا اور یہی تجارتی تبادلہ آئندہ پیدا ہونے والے وسیع تعلقات کی تمہید ثابت ہوا۔ ایک پُرانا انگریز مؤرخ لکھتا ہے کہ انگلستان کے بادشاہ جان John نے ۱۲۰۹ء میں مراکش کے سلطان کے پاس اپنا ایک وفد بھیجا تھا لیکن یہ پہلا سیاسی وفد کچھ کامیاب واپس نہیں آیا۔ اس کی آمد سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ انگلستان اور مراکش میں باہمی مراسم صرف سولہویں صدی کے وسط سے شروع ہوئے۔ یہ اشراف سعدیین کا زمانہ ہے، انہی کے دور میں پہلا انگریزی بیڑا مراکش پہنچا۔ اسی بیڑے کے طفیل دونوں ملکوں میں تجارتی تعلقات قائم ہوئے، جو بالکلیہ اب تک ختم نہیں ہوئے۔ اور اسی تجارتی اتصال سے بعد کو سیاسی تعلقات پیدا ہوئے۔

جیمس کے پچیس سال بعد ایڈمنڈ ہوگن Edmund Hogan مراکش میں انگریزی سفیر بن کر پہنچا۔ یہ پہلا شخص ہے جو سفیر کی حیثیت میں انگلستان سے مراکش آیا۔ اُس نے اپنا سفرنامہ خاصی تفصیل سے لکھا ہے۔ اپنا مراکش پہنچنا، وہاں کے باشندوں کا پُرجوش استقبال، اُن کے اخلاق و عادات کافی وضاحت سے بیان کئے ہیں۔

ایڈمنڈ کے بعد ۱۵۸۰ء میں ایک برطانوی امیر البحر سر فرانسس ڈریک Sir Francis Drake مراکش پہنچا۔ فرانسس دنیا کی سیاحت کے لئے نکلا تھا۔ اسی سفر میں وہ مراکش بھی آیا۔ جب اس کا بیڑا ساحل پہنچا تو کچھ مقامی باشندے کشتیوں میں بیٹھ کر تحقیقات کے لئے آئے۔ ڈریک کا ایک ہمسفر لکھتا ہے کہ ہمارے سردار نے جہاز سے ایک وفد مراکشی سرداروں کے استقبال کے لئے روانہ کیا۔ ہم کو حکم دیا کہ دو سرداروں کو ہم اپنے جہاز پر لے آئیں اور ہمارا ایک آدمی بطور ضمانت اُن کی واپسی تک کنارے ٹھہرا رہے۔ چنانچہ ہم اس طرح دو مراکشی سرداروں کو اپنے جہاز پر لے گئے۔ وہاں اُن کی بہت تعظیم و تکریم کی۔ مختلف قسم کے ہدایا اُن کو پیش کئے۔ اُن پر اچھی طرح واضح کر دیا کہ ہماری آمد دوستانہ تعلقات قائم کرنے اور تجارتی تبادلے کے لئے ہے۔ اُنھوں نے ہماری پیش کش کو بخوشی منظور کر لیا۔ واپسی کے وقت اگلے روز وہ سامان لانے کا وعدہ کیا جس سے وہ تبادلہ کرنا چاہتے تھے۔

۱۵۷۸ء میں زمانے نے نئی کروٹ لی۔ ایسا عظیم الشان واقعہ پیش آیا

جس نے سارے یورپ کے درو دیوار ہلا دیئے۔ مغربی فوجوں کو "قصر کبیر" کی
جنگ میں مکمل فتح حاصل ہوگئی تھی۔ اس واقعہ کے بعد انگلستان میں کسی غیر معروف
مصنف کی ایک کتاب شائع ہوئی۔ کتاب کا موضوع یہی "قصر کبیر" کا واقعہ تھا
مصنف نے حادثے کی صحیح تفصیلات بتائیں، اس کے اسباب بھی تفصیل سے
بیان کئے تھے۔ اس کتاب میں مذکورہ واقعات انہی لوگوں سے نقل کئے گئے
تھے جو خود اس میں شریک تھے اور سارے حالات کو بذاتِ خود بھگت چکے
تھے یا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکے تھے۔

لیکن نمایاں حیثیت رکھنے والی ہنری رابرٹس کی کتاب ہے۔ یہ شخص ۱۵۸۵ء
سے ۱۵۸۹ء تک مراکش میں انگریزی سفیر رہا۔ جب ہنری رابرٹس شہر سافی پہنچا
تو وہاں کے والی نے اس کا بہت اعزاز و اکرام کیا۔ بڑے پیمانے پر اس کی
مہمانداری کا اہتمام کیا۔ شہر کے سب سے بڑے محل میں اس کو ٹھہرایا گیا —
ہنری رابرٹس اس خوش اخلاقی کا بہت معترف ہے۔ یہی نہیں بلکہ جب وہ
انگلستان واپس ہوا تو سلطان نے 'مرزوق الرئیس' نامی ایک سردار کو
اس کے ساتھ انگلستان بھیجا۔

مراکش پر پہلی ادبی کتاب سولہویں صدی کے نصف آخر میں لکھی گئی۔
یہی وہ زمانہ ہے جب انگریزی کا ناولی ادب عروج پر آیا۔ مراکش و انگلستان
میں دوستانہ مراسم قائم تھے۔ یہی تعلقات شاعری و افسانہ نگاری کے عام
موضوع تھے۔ اس لئے مراکش کے متعلق انگریزی میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔
اسٹیج پر ڈرامے کئے گئے۔ ان ڈراموں و افسانوں میں عام طور پر دو موضوع
سامنے ہوتے تھے: "قصر کبیر کا واقعہ" اور "بحری قزاقوں کے کارنامے" شاید
یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سب سے بڑی مراکشی شخصیت جو انگریزی ادب میں ظاہر
ہوئی وہ شکسپیئر کے ہیرو "عطیل" کی شخصیت ہے۔ یہ ڈرامہ شکسپیئر کو شکسپیئر بنانے
میں بہت معاون ہے۔ اس زمانے میں شکسپیئر جس کردار کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا
ہے وہ شکسپیئر کو اپنے جگری دوست جارج ویلکنز سے حاصل ہوا ہے۔ جورج
نے ایک مغربی کردار شکسپیئر کے دماغ میں بٹھا دیا جو عطیل کی صورت میں اس کے
قلم سے نکل آیا۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ شکسپیئر نے یہ کردار "مرزوق الرئیس" سے اخذ
کیا ہو۔ مرزوق الرئیس ۱۵۸۸ء میں مغربی سفیر بن کر انگلستان آیا تھا۔ اس کی
تائید میں کچھ مؤرخ نہایت دلچسپ نکتہ لکھتے ہیں، گو وہ تاریخی درجہ میں نہیں
ہے تاہم لطف سے خالی نہیں ہے کہ لفظ عطیل 'ایدا عطا' سے مشتق ہے۔ 'ایدا عطا' ایک
بربری قبیلہ کا نام ہے۔ مرزوق الرئیس اسی قبیلے کی طرف منسوب تھا۔

سترہویں صدی میں تو مراکش کے متعلق بہت سی انگریزی کتابیں منظر عام
پر آگئیں۔ چنانچہ ۱۶۰۷ء میں جورج ویلکنز کی کتاب شائع ہوئی۔ اس مصنف
کا ابھی اجمالی ذکر آچکا ہے۔ یہ ولیم شکسپیئر کا گہرا دوست تھا۔ اس کے ساتھ
رہنے کا اس کو کافی موقع ملا ہے۔ مشہور ہے کہ شکسپیئر کا معاون و مساعد بھی
رہا ہے۔ اس کی کتاب اس دور کے مراکش کی اچھی تاریخ ہے۔ سلطان احمد منصور
کے عہد اور اس کی موت کے بعد اس کے تینوں بیٹوں کی خانہ جنگیوں کو
اچھی وضاحت سے بتاتی ہے۔ اپنی اس کتاب میں ویلکنز لکھتا ہے کہ جب اسپینی
جنگی بیڑا (اسپینی ارمڈا) جو انگلستان کو فتح کرنے کے لئے آیا تھا شکست کھا کر
بھاگا تو مراکش میں بسنے والے انگریزوں نے جشنِ مسرت منانا چاہا۔ اس کی
سلطان سے اجازت مانگی۔ سلطان نے بخوشی اجازت دیدی۔ لیکن اسپینی سفیر
نے اس میں مزاحمت کی اور عین جشن کے وقت مسلم جماعت کے ساتھ انگریزوں
پر چڑھ آیا۔ بہت سے انگریز زخمی ہوگئے۔ اس حادثے کی خبر سلطان کو
پہنچی تو اس کو سخت غصہ آیا، اس نے قسم کھائی کہ تمام مجرموں کو قتل کرے گا۔
اور اسپین کے بادشاہ کو اس کی اطلاع بھیج دے گا۔

۱۶۰۹ء میں مراکش کی ایک مفصل تاریخ انگریزی میں شائع ہوئی۔ یہ
کتاب بہت اہم ہے اس کا مصنف رابرٹس جمیرس بتایا جاتا ہے۔ مصنف نے
سارے وثائق و مستندات کا بغور مطالعہ کر کے کتاب لکھی تھی۔ اس میں اشراف
سعدیین سے مصنف کے دور تک کی تاریخ ہے۔ اپنی تفصیل اور مصنف کی
باریک نظری کی وجہ سے امتیاز رکھتی ہے۔ کسی شک و شبہ کے بغیر مراکش کی
مستند تاریخ سمجھی جاتی ہے۔ مراکش کے رسم و رواج باشندوں کے اخلاق
و عادات بیان کرنے کے علاوہ ملک میں مروجہ اقتصادی، سیاسی، جنگی،
عدالتی نظاموں پر بھی بحث کی گئی ہے۔ ۱۶۱۳ء میں اس کتاب کا ترجمہ شائع
کیا۔ یہ ترجمہ بھی تاریخی اعتبار سے مستند ہے۔ اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا اس سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ انگلستان
و مراکش کے باہم مراسم سے انگریزی ادب بہت متاثر ہوا۔ انگریز مصنفین کی
توجہات مراکش کی طرف کافی مبذول رہیں۔ جتنی کتابیں لکھی گئیں ان میں
اکثر اب بھی تاریخی اہمیت رکھتی ہیں۔ اب میں سترھویں اٹھارہویں صدی کے
کچھ حالات بیان کروں گا۔ اور اس دور کے چند مشہور مصنفوں کا ذکر کروں گا۔

پہلا نمبر جون اسمت کا ہے۔ یہ ایک فوجی سیاح تھا۔ یورپ کے بہت سے ملکوں میں گیا۔ مشرق قریب اور افریقہ بھی پہنچا۔ مشہور ہے کہ ولایاتِ متحدہ میں بسنے والے انگریزوں کا مقدمۃ الجیش یہی شخص ہے۔ سنہ ۱۶۳۰ء میں اس کی کتاب "حقیقی سفر" شائع ہوئی۔ اس میں مختلف ممالک کی سیاحت کا درج ہے۔ 'جون' ایک سال کے قریب مراکش میں مقیم رہا، اس لئے وہاں کے حالات سے بخوبی واقف ہو گیا تھا۔ سب سے دلچسپ چیز اُس کی کتاب میں شہر "فاس" کا تذکرہ ہے، اچھے انداز میں لکھا ہے۔ لیکن اس سے عمدہ تفصیل ایک دوسری کتاب میں ملتی ہے۔ یہ ولیم لتھگو کا سفرنامہ ہے۔ سنہ ۱۶۳۲ء میں شائع ہوئی جس میں جودر بن عبداللہ کا مراکشی سفیر بن کر انگلستان آنے کا حال درج ہے۔ اُس کے اعزاز و اکرام کا تفصیلی بیان ہے۔ کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جودر بن عبداللہ کی تفصیل بھی ہے۔

لیکن اس صدی میں شائع ہونے والی اہم کتاب "بربری ممالک کی مغرب" ہے۔ اس کا مصنف لانسیلاٹ ایڈیسن ہے۔ یہ کتاب سنہ ۱۶۷۱ء میں آکسفورڈ میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب قیمتی سرمایہ ہے۔ تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ ایک حصے میں اُس عہد کے اہم واقعات کا بیان ہے اور دوسرے حصے میں مراکش کے رسم و رواج اور وہاں کے قوانین کا تذکرہ ہے۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عربی اصطلاحات کی فرہنگ بھی لگی ہوئی ہے۔ اس سلئے اس کی افادیت بہت بڑھ گئی۔

اٹھارھویں صدی کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب اپنے بہترین دور میں داخل ہوا۔ مراکش پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ ان کتابوں کی اتنی کثیر تعداد ہے کہ سب کا ذکر نہیں کیا جا سکتا۔ صرف چند ایک کا ذکر کرتا ہوں۔ چنانچہ ایک کتاب جان ونڈس کی ہے۔ ایک کتاب جان بریتویت کی ہے۔ یہ دونوں برطانوی وفد میں مراکش گئے تھے۔ ونڈس کی کتاب "سفرنامہ مکناس" مؤرخین کے لئے حجّت کا درجہ رکھتی ہے۔ بہت سی مفید معلومات کا خزانہ ہے اس میں سلطان اور سلطان کے محل کی تصویر بھی ہے۔ لیکن بریتویت نے صرف سیاسی حالات کو سامنے رکھا ہے۔ انہی کے ذکر کا اہتمام کیا ہے۔

اس زمانہ کی اہم کتابوں میں تھامس پیلو کا ناول بھی ہے۔ یہ بربری بحری قزاقوں کے پھندے میں پھنس گیا تھا۔ مراکش کے قیام میں مسلمان ہو اور مراکش کی ایک عورت سے شادی کر لی، اور وہیں رہ پڑا۔ شاہی لشکر میں معزز عہدہ مل گیا تھا۔ اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ پھر اس بادشاہ کا انتقال ہو گیا جس کے لشکر میں ملازم تھا۔ اس لئے وہاں کے قیام سے اُکتا کر تیئس سال کے بعد اپنے اصلی وطن انگلستان واپس ہوا۔ وطن پہنچ کر اُس نے مراکش پر ایک کتاب لکھی۔ وہاں کے رسم و رواج کو خوب تفصیل سے بیان کیا۔ یہ کتاب سنہ ۱۷۳۶ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔ اس کے بعد کئی مرتبہ چھپی۔ اب بھی تاریخ کی معتبر کتاب سمجھی جاتی ہے۔ مراکش کے متعلق اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

سنہ ۱۷۸۹ء میں سیدی محمد سلطانِ مراکش نے اپنے بیٹے کے معالجہ کے واسطے ایک انگریز معالج کو بلایا اس کا نام ولیم لمپرائر ہے جبل الطارق میں رہتا تھا۔ چونکہ طبیب شاہی بن کر گیا تھا۔ اس لئے بسہولت اُن سب مقامات پر جا سکا، جہاں دوسرے انگریزوں کا پہنچنا مشکل تھا۔ اس طبیب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مراکش میں "چائے" یہی لایا۔ اسی نے چائے کا رواج دیا۔ اہلِ مراکش آج تک چائے کا حق ادا کرتے ہیں۔ اگرچہ اُن کو یہ یاد نہیں کہ کس شخص نے اُن کو اس سے روشناس کرایا۔

جغرافیائی و تاریخی کتابوں کے علاوہ سیاحوں کے سفرنامے بھی ہمارے لئے بہت مواد فراہم کرتے ہیں۔ مراکش کی سیاحت کرنے والوں نے اپنے سفرناموں میں بہت معلومات چھوڑی ہیں بعض سیاح خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ مثلاً سموئیل پیپس اس نے مراکش کے مختصر قیام میں جو کچھ دیکھا اُس کو اچھی ترتیب سے بیان کیا۔ یہ وہاں کے باشندوں کے اخلاق کے علاوہ اُن کے لباس کی بھی تعریف کرتا ہے۔

جون ڈرائیڈن نے دو قصے ایسے لکھے ہیں جو مراکش سے متاثر ہیں۔ ایک قصہ "ڈان سیبسٹین" ہے۔ یہ سنہ ۱۶۹۰ء میں شائع ہوا۔ اس میں "قصر کبیر" کا واقعہ ہے۔ دوسرا قصہ "فتح غرناطہ" ہے۔ سنہ ۱۶۷۲ء میں شائع ہوا۔ اس کا موضوع بھی اسپینی عربوں سے متعلق ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سترھویں صدی کے انگریزی قصہ گو شعراء میں ایک اور شاعر کا بھی ذکر کر دیا جائے یعنی الیکانہ سیٹل۔ یہ شخص دوسروں کے مقابلے میں گو کم اہمیت رکھتا ہے۔ تاہم اس کا کام بھی قابلِ ذکر ہے۔ اس کی منظوم ٹریجیڈی "ملکۂ مراکش" سنہ ۱۶۷۳ء میں شائع ہوئی، اور لندن میں بہت قبول کی گئی۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ یہ پہلا قصہ تھا جو انگلستان میں ڈسٹنگ

میں فروخت ہوا اور یہی پہلا ناول ہے جو مصور چھاپا گیا۔

اس کے بعد ڈفو نے اپنا مشہور عالم ناول رابنسن کروسو چھاپا۔

اس ناول میں مراکش کے کچھ حالات آئے ہیں۔ مگر یہ حقیقت شاید چھپی ہوئی ہے کہ ڈفو کے اس مشہور عالم ناول کا ماخذ عربی ہی ہے۔ ابن الطفیل اندلسی مفکر کا شاہکار "حی بن یقظان" رابنسن کروسو کا ماخذ ہے۔ رہی یہ بات کہ ابن الطفیل کی فکر ڈفو تک کیسے پہنچا تو بات یہ ہے کہ حی بن یقظان کا عربی متن اڈورڈ پوکاک کی کوشش سے ۱۶۷۱ء میں آکسفورڈ میں چھپا، اور اس کے ۳۷ سال بعد ۱۷۰۸ء میں سیمون اوکلے نے اس کا انگریزی ترجمہ چھاپا۔ یہ ترجمہ سارے یورپ میں مقبول ہوا۔ تقریباً ہر چھوٹے بڑے کے ہاتھ میں پہنچا۔ تعلیم یافتہ طبقے نے ابن الطفیل کے فکر کو خوب سراہا۔ اس لئے کوئی بعید نہیں کہ ڈفو نے ابن الطفیل کے فلسفی فکر کو حی بن یقظان سے چھین کر رابنسن کروسو کو پہنا دیا۔

اور ۱۵۵۱ء میں لائن Lion کے مراکش آنے کے بعد جن مراسم کی بنیاد پڑی تھی وہ بڑھتے ہی گئے۔ تجارتی تعلقات استوار ہونے کے بعد برطانوی و مراکشی حکام میں سیاسی مذاکرے شروع ہوئے۔ اتفاق و اتحاد کی دعوتیں دی گئیں۔ ایک دوسرے کی طرف سے محبتانہ خطوط بھیجے گئے۔ چنانچہ لندن میں آج تک وہ رسائل موجود ہیں، جو سلاطینِ مراکش نے ملوکِ انگلستان یا ملکات کو بھیجے تھے۔ خصوصاً سلطان احمد منصور اور ملکہ الزبتھ کی مراسلت قابلِ ذکر ہے۔ ان میں کئی سال خط و کتابت رہی۔ یہ خطوط صرف رسمی ہی نہ ہوتے تھے۔ بلکہ ان کے ذریعے بہت سے اہم معاملے طے کئے گئے۔ انہی کے واسطے سے معاہدے ہوئے۔ سولھویں اور سترھویں صدی میں ملکہ نے بادشاہ مراکش کے یہاں بہت سے وفد بھیجے۔ اسی طرح مراکش سے انگلستان بہت سے وفد آئے۔ ان میں سے مرزوق الرئیس کا پہلے ذکر آ چکا ہے یہ ۱۵۸۸ء میں آیا اور عبدالواحد بن مسعود عانوری ۱۶۰۰ء میں اور جودر بن عبداللہ ۱۶۳۷ء میں۔ اس کے علاوہ دیگر سفرا بھی آتے رہے — جن کو انگلستان کی طرف سے خوش آمدید کہا جاتا رہا۔ ان سفرا نے انگلستان کے باشندوں پر وہاں کے مصنفوں، شاعروں پر بہت اچھا اثر چھوڑا۔ ایک کتاب لندن میں ۱۶۳۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کا مصنف جودر بن عبداللہ کی آمد کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ یہ شخص بہت شریف ہے، شرفا رسے سے میل جول رکھنا چاہتا ہے۔ ہر قسم کی بداخلاقی سے سخت نفرت کرتا ہے۔ اپنے متعلقین میں کسی کی بداخلاقی برداشت نہیں کر سکتا۔ شراب نوشی سے سخت پرہیز کرتا ہے۔ اپنے صائب الرائے حسنِ تدبیر ہونے کی وجہ سے امورِ سلطنت میں دخیل ہے۔ بہت سے اہم امور اس کی رائے سے سلجھ جاتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

دوسرے مورخین لکھتے ہیں کہ جودر بن عبداللہ کی آمد پر اس کو توپوں سے سلامی دی گئی تھی اور ۱۶۱۲ء میں مولائے زیدان ایک اندرونی بغاوت فرو کر رہا تھا تو انگلستان کے بادشاہ جیمس اوّل نے اپنا ایک قاصد جان ہیرلیسن بھیجا۔ سلطان نے بادشاہ جیمس کے خط کا جواب نومبر ۱۶۱۲ء میں بہت اچھے لفظوں میں دیا۔ سترھویں صدی کے آخر میں بہت سے انگریز مراکش میں حکومت کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ سلطان کی طرف سے معرکوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ ۱۷۲۴ء میں حکومتِ مراکش نے دو سو جوان جبرالٹر فوجی تربیت کے لئے بھیجے۔ اگست ۱۹۲۹ء میں مولائی عبدالرحمٰن نے بادشاہ انگلستان جورج چہارم کو ایک محبتانہ خط لکھا جس میں بہت کچھ دوستانہ جملے تھے۔ غرضیکہ مراکش چودھویں صدی سے انگریزی ادب میں داخل ہوا اور اب تک داخل چلا آتا ہے۔

عبّاس بیگ محشر

آتش نوا شاعرِ بنگال قاضی نذرالاسلام کے نام

اے بُتِ آتشیں نفس، میرے صنم کدے میں آ
برف بجہانِ حیات کو آگ کی زندگی بنا

اپنی نوائے گرم سے قلب کو شعلہ زار کر
آگ لگا دے رُوح میں، سوزِ جگر اُبھار کر

تو نے بتا دیا ہمیں زیست کا نام آگ ہے
سازِ شرارہ ریز کی سانس کا نام راگ ہے

نغمۂ برف ریز ہے، مطربِ مرگ کی نوا
آگ میں جو لگا دے آگ، سازِ حیات کی صدا

باغیٔ آتشیں نوا، ساز بھی تیرا سوز ہے
ساز پہ اُنگلیوں کی ضرب زخمۂ قلب دوز ہے

تُو نے وطن کے خون میں زیست کی گرمیاں بھریں
دوزخِ شعلہ بار تھا تو نے جہاں جہاں بھریں

تو نے غلام زار کو، نعمتِ باغیانہ دی
اپنی نوائے گرم سے، خدمتِ تازیانہ لی

ابر و ہوا کی سرزمیں، آبِ رواں کی سرزمیں
تیری نوائے گرم سے آج ہے کوہِ آتشیں

دار و رسن تجھے عزیز، سُرخ کفن تجھے عزیز
قید و محن تجھے عزیز، حبِّ وطن تجھے عزیز

عِشق ترا وہ عِشق ہے جس میں اُمید ہی اُمید
یاس کی سرحدوں سے دُور، تیرا نشاطِ ذوقِ دید

جرأتِ باغیانہ کا قلب و جگر مجھے بھی دے
اپنی نوائے گرم کا، ایک شرر مجھے بھی دے

امن لکھنوی

لکھنؤ سے دِلّی تک

میرے والد منشی مہادیو پرشاد اُردو میں عاصی اور ہندی میں شمبھو تخلص کرتے تھے۔ منشی شیوراج بہادر اخگر اُن کے احبابِ خصوصی میں تھے جن سے وہ مشورۂ سخن بھی کرتے تھے۔ یہ اس صدی عیسوی کی ابتدا کی بات ہے، جب میری تعلیم شروع ہوئی تھی۔ اخگر صاحب اور ملک الشعرا منشی دوارکا پرشاد اُفق میں کچھ شاعرانہ نوک جھونک بھی رہتی تھی۔ اخگر صاحب کی بینائی آخر عمر میں بالکل ضائع ہوگئی تھی۔ اسی حالت میں وہ میرے محلے غوث نگر کی ایک تقریب میں آئے۔ وہ فرش پر بیٹھنا چاہتے تھے، لوگوں کا اصرار تھا کہ کرسی پر بیٹھیں، اخگر صاحب پر وہ زمانہ بہت سخت گزر رہا تھا، اُنھوں نے فی البدیہہ یہ شعر فرمایا۔

کُرسی پہ غریبوں کو بٹھانا نہیں اچھا ہم خاک نشینوں کو ستانا نہیں اچھا۔

والد مرحوم نے کچھ مدت منشی بال کرشن قمر تلمیذ حضرت امیر مینائی سے بھی اصلاح لی تھی۔ دادا مرحوم منشی گنگا پرشاد نواب سید احمد حسین صاحب (تحسین گنج) کے دیوان تھے۔ مجھے بھی کبھی کبھی ڈیوڑھی پر لے جاتے تھے۔ وہیں حضرت بلیغ نبیرہ حضرت انیس اور حضرت عارف کے درشن ہوئے۔ نواب حامد علی خاں صاحب بھی قریب ہی رہتے تھے اور کبھی کبھی تشریف لاتے تھے۔ اُن کی لکھی ہوئی کتاب جسٹس کرامت حسین کی سوانح عمری میں نے بڑے شوق سے پڑھی نواب صاحب ہی کے یہاں سے موازنہ انیس و دبیر کا جواب المیزان لے کر پڑھا تھا، اُنھیں کے یہاں پہلے پہل محرم کی مجلسیں بھی دیکھیں ان مجلسوں کا انتظام میرے دادا کے سپرد ہوتا تھا۔

۱۹۱۰ء میں، میں امین آباد ہائی اسکول میں پڑھتا تھا۔ اس اسکول کی موجودہ عمارت زیرِ تعمیر تھی۔ اسکول جناب ممتاز حسین کی کوٹھی پر تھا۔ اسی سال مولانا عزیز اُردو ٹیچر مقرر ہوئے۔ پہلے ہی روز انھوں نے مجھے ایک گستاخی کی بنیاد پر ہلکی سی سزا دی، مگر جلد ہی میں اُن کا چہیتا شاگرد بن گیا۔ اسی سال میں نے پہلے پہل چکبست کو اُس جلسہ میں نظم پڑھتے سُنا جو دکھنی افریقہ کے ہندوستانیوں سے ہمدردی کے لئے ہوا تھا۔

صفی لکھنوی سے میری پہلی ملاقات بالکل فدویانہ قسم کی تھی۔ یعنی وہ سشن جج کی عدالت میں منصرم تھے اور میں بحیثیت نقل نویس اُن کے دستخط کرانے گیا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک رہی۔ اُس زمانے میں "سیارہ" نامی ایک روزنامہ لکھنؤ سے جناب شبیر حسن قتیل کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اس میں حضرات عزیز و صفی کی نظمیں اکثر چھپا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی اکبر الہ آبادی کی بھی نظم ہوتی تھی۔ مولانا عزیز نے مجھے اکبر الہ آبادی کا وہ خط دکھایا تھا جس میں یہ شعر درج تھا ؎

سخن میں اور تو اہلِ تمیز ہی ہیں فقط شہید جلوۂ معنیٰ عزیز ہی ہیں فقط

حضرت ثاقب لکھنوی وزیر گنج میں رہتے تھے۔ اُن کے مکان کے سامنے ہی ڈاکٹر شیوراج نرائن سکسینہ کا مکان تھا جن کے پاس میں سیاسی تحریک کے سلسلے میں جایا کرتا تھا اور انھیں کے ذریعے مرزا ثاقب سے نیاز حاصل ہوا۔ چکبست صاحب کے یہاں آنا جانا ادبی سے زیادہ کاروباری نوعیت کا تھا، کیونکہ اُن کے بڑے بھائی میونسپلٹی کے سکریٹری اور بعد کو اگزکٹو افسر ہوگئے تھے، اور میں میونسپلٹی میں ملازم تھا۔

۱۹۲۱ء میں جب میں لکھنؤ کانگریس کمیٹی میں شامل ہوا تو حکیم سید علی آشفتہ اس کمیٹی کے سکریٹری اور نامی صاحب اسسٹنٹ سکریٹری تھے۔ اس لئے کانگریس کے دفتر میں شعر و شاعری کا چرچا رہتا تھا۔

۱۹۲۱ء میں ہی میں نے پہلے پہل مولانا ابوالکلام آزاد کو لکھنؤ میں تقریر کرتے سُنا، اس زمانے میں وہ خالص ادبی انداز میں تقریر کرتے تھے۔ مولانا محمد علی کی تقریر ایک سال پہلے سُن چکا تھا۔ اُس زمانے میں یہ جلسے رفاہِ عام ہال میں یا اس کے احاطے میں ہوا کرتے تھے، کیونکہ

امین الدولہ پارک میں اجازت نہ ملتی تھی۔ ذکی لکھنوی کا کلام سیاسی پلیٹ فارم پر بہت مقبول تھا۔ میں نے پہلے پہل لوکمانیہ تلک کی برسی پر ۱۹۲۰ء کے پبلک جلسے میں نظم پڑھی تھی۔

۱۹۲۲ء میں شیعہ کالج لکھنؤ میں بہت بڑا مشاعرہ ہوا جس میں حضرات صفی، عزیز، چکبست، محشر، اثر، شفیق، بلیغ، جاوید، بہار، توقیر، ذکی وغیرہ شریک ہوئے تھے۔ میں نے اس سے پہلے اتنے بڑے مشاعرے میں کبھی نہیں پڑھا تھا۔ مولانا عزیز بغیر غزل پڑھے چلے گئے تھے۔ بلیغ صاحب اتنے ضعیف تھے کہ مصرع جب اُٹھایا جاتا تھا تب سمجھ میں آتا تھا۔ اس زمانے تک لاؤڈ اسپیکر ہندوستان میں رائج نہیں ہوئے تھے۔ مصرع طرح تھا۔

اگر تم سو گئے کم ہو گا لطف داستاں میرا

اس مشاعرے کے چند مقبول اشعار یہ تھے۔

صفی: خدا کا خوف دل سے مٹ گیا یہ کیا قیامت ہے!
ہوا کیوں مہرباں مجھ پر بتِ نامہرباں میرا
صفی میں اک مسافر ہوں نہ میرا راستہ روکو
سرِ منزل پہنچ کر منتظر ہے کارواں میرا

چکبست: الٰہی خیر ہو میں نے قفس میں خواب دیکھا ہے
کہ شمعِ صحنِ گلشن بن گیا ہے آشیاں میرا
وطن میں بے وطن مجھ کو کیا ہے اک فسوں گر نے
زمیں ہندوستاں کا ہوں نہ ہے ہندوستاں میرا

اثر: کسی کی جستجو میں کھو گیا ہوں آپ میں ایسا
ہر اک رہرو سے کہتا ہوں بتا دو کچھ نشاں میرا
جنونِ عشق میں آزاد ہوں میں ہر دو عالم سے
شعورِ حق و باطل کس لئے ہو پاسباں میرا

آرزو: خموش اے شمع پھر کہنے لگی سوزِ نہاں میرا
زباں پر جب نہ تو قابو بنے کیوں رازداں میرا

ملی ہے قید بال و پر میں کیا محدود آزادی
کہ یہ اُڑتا قفس خود بن گیا ہے آشیاں میرا

بیخود موہانی: تری قدرت سے مرجائے نہ حسرت دل کی
کہیں ٹھہرے نہ تیری آزمائش امتحاں میرا

محشر: غمِ فرقت میں ہر آنسو اک ارماں کا جنازہ ہے
چلا تھا کتنے یوسف ساتھ لے کر کارواں میرا

ان اساتذہ میں سے اب صرف نواب جعفر علی خاں صاحب اثر باقی ہیں۔ خدا اُن کی عمر دراز کرے۔

جناب شیشو پرشاد منور لکھنوی کے چچیرے بھائی ڈاکٹر لکشمی سہائے امین آباد سکول میں میرے مدرس تھے اس لئے کبھی کبھی اُن کے یہاں جاتا تھا۔ منور صاحب کے والد منشی دوارکا پرشاد اُفق کا انتقال ہو چکا تھا۔ البتہ ڈاکٹر صاحب کے والد منشی رام سہائے تمنا سے نیاز حاصل ہوا۔ منور صاحب کے ساتھ نظم پڑھنے کا اتفاق تو ۱۹۲۰ء میں لوکمانیہ تلک کی برسی کے جلسے میں ہوا جس کے صدر پنڈت آنند نرائن مُلّا کے والد پنڈت جگت نرائن مُلّا تھے۔ لیکن اُن سے باقاعدہ تعارف اس مشاعرے میں ہوا، جو اُفق صاحب کے شاگرد منشی بنواری لال شوخ کے اہتمام میں نوبستہ میں ہوا تھا۔ اس زمانے میں میں منشی بچیا نند صاحب وفا لیکچرار لکھنؤ یونیورسٹی سے اصلاح لیتا تھا۔ یہ سلسلہ ۱۹۳۵ء میں اُن کے انتقال فرمانے تک جاری رہا۔ نوبستہ کے مشاعرے میں منشی ماتا پرشاد دنیاں بھی شریک ہوئے تھے۔ جن کی نظمیں "تفریح" اخبار میں شائع ہوا کرتی تھیں۔

۱۹۲۴ء میں سلسلۂ معاش لکھنؤ سے میرٹھ چلا آیا۔ یہاں مولانا ندرت سے نیاز حاصل ہوا۔ اُن کے تلامذہ میں میرا سب سے زیادہ ربط ضبط ڈاکٹر سرماری لال نشتر سے ہوا جنہوں نے اسی سال انتقال فرمایا۔ اُن کا یہ شعر برابر کانوں میں گونجتا رہتا ہے۔

وہ دُنیا تھی جہاں تم بند کرتے تھے زباں میری
یہ محشر ہے یہاں سننی پڑے گی داستاں میری

جناب عیاں میرٹھی سے بھی وہیں نیاز حاصل ہوا۔ نثر نویسوں میں چودھری

رگھبیر نرائن سنگھ صاحب کی وساطت سے پنڈت پیارے لال شرما اور پنڈت گوپی ناتھ سنہا سے ملاقات کا شرف ملا۔ سوتی برہم سروپ خاکؔ تخلص فرماتے تھے اُن کی طبیعت کچھ ایسی تھی کہ جلد ہی ربط ضبط بڑھ گیا۔

۱۹۲۵ء میں میں میرٹھ سے غازی آباد پہنچا۔ اُس زمانے میں حضرت بزم اکبر آبادی وہیں رہتے تھے، اُن کے صاحبزادے نجم آفندی اور بھتیجے نیرؔ اکبر آبادی بھی بسلسلہ ملازمت وہیں تھے۔ نیرؔ کے شاگرد رضا اٹاوی بھی اچھا کہتے تھے۔ بزم صاحب میرے مکان کے بالکل قریب تھے کبھی کبھی غریب خانے پر تشریف لاتے تھے اور بہت کرم فرماتے تھے۔ اس خاندان کی بدولت غازی آباد میں شعر و شاعری کا خاصا چرچا تھا۔ دہلی کے اساتذہ تو مشاعروں میں شریک ہوتے ہی تھے۔ اکبر آباد سے شوخ و میکش، لکھنؤ سے مرزا ثاقب اور ضلع بلند شہر سے فداؔ گلاؤ ٹھوی بھی شرکت کے لئے تشریف لاتے تھے۔ نجم و نیرؔ کا تبادلہ ہوجانے سے بزم صاحب بھی غازی آباد سے چلے گئے۔ اب مشاعروں کا قرعۂ فال میرے نام نکلا۔ بھائی گرسرن لال ادیب بھی لکھنؤ سے آگئے تھے۔ اس لئے ہم دونوں ہاپوڑ۔ میرٹھ اور دہلی سے بُلا کر صحبتیں گرم رکھتے تھے۔ غازی آباد میں اچھے کہنے والوں میں صرف رضا اٹاوی رہ گئے تھے۔ نثر نویسوں میں مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا اچھا پایہ رکھتے تھے۔ وہ بالکل میرے مکان کے سامنے رہتے تھے۔ ہم دونوں میں ارتباط بہت تھا مگر وہ لکھنؤ سکول سے بیزار تھے۔ اس لئے اکثر نوک جھونک رہتی تھی۔ غازی آباد پہنچنے کے بعد میں اکثر دہلی آیا کرتا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے میری ملاقات مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا کے ذریعے ہوئی۔

پنڈت امرناتھ ساحرؔ سے ۱۹۲۵ء میں ایک عجیب انداز میں ملاقات ہوئی تھی، وہ غازی آباد کے یہاں ایک مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے۔ میں نے سیاسی رنگ میں غزل کہی تھی، اُنھوں نے پڑھنے کی اجازت نہ دی۔ مشاعرہ میں ہنگامہ ہوگیا لیکن چودھری رگھبیر نرائن سنگھ اور چودھری مختار سنگھ نے مجمع کا جوش ٹھنڈا کیا۔ پنڈت قدرے کبیدہ خاطر ہوگئے تھے۔ میں نے دلی آکر اُن سے معذرت کی۔ اسی وقت مجھے ایک کتاب عنایت فرمائی۔ جب سے برابر شفیق رہے ۱۹۲۵ء سے میں ہر سال ساحرؔ صاحب کی بزم سخن کے سالانہ جلسوں میں شریک ہوتا تھا۔ میں نے بزم سخن کے جلسے میں جب حضرت بیخودؔ دہلوی کو غزل پڑھتے سنا اُس وقت اُن کی عمر ۶۲ سال کی تھی۔ غازی آباد میں میں نے ادیب کی مدد سے جو مشاعرے کئے اُن میں دہلی سے حضرات کیفیؔ و ساحرؔ و معجزؔ و زارؔ و برقؔ دہشید ابھی شریک ہوئے۔ ایک بار نواب سائلؔ نے بھی سرفراز فرمایا۔ ان حضرات سے مجھے ساحرؔ صاحب کی بزم سخن میں ہی نیاز حاصل ہوا تھا۔ علامہ پنڈت برج موہن دتا تریہ صاحب کیفیؔ سے زیادہ ارتباط اس وقت ہوا جب بھائی ادیب خمخانۂ جاوید کی تالیف میں کیفیؔ صاحب کے اسسٹنٹ مقرر ہوئے۔ غازی آباد ہی میں نے ۱۹۲۶ء کے ایک مشاعرے میں پہلے پہل ساغرؔ نظامی کو پڑھتے سُنا۔ اس مشاعرے کی صدارت بزم اکبر آبادی نے فرمائی تھی۔ علامہ سیماب بھی شریک ہوئے تھے۔ اور اُن کا یہ شعر بہت مقبول ہوا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ بندے میں خدا موجود ہے
تجربہ یہ ہے کہ بندے کو خدا ملتا نہیں

غازی آباد سے میں ہاپوڑ کے مشاعروں میں بھی جایا کرتا تھا۔ جہاں شاگردانِ داغؔ اطہرؔ و فداؔ کی الگ الگ پارٹیاں بنی ہوئی تھیں۔ شاگردانِ فداؔ میں میرے تعلقات فداؔ صاحب کے داماد قابلؔ سے اور موہن لال شفقؔ سے بہت زیادہ تھے۔ قابلؔ صاحب اب پاکستان میں ہیں شفقؔ صاحب نے انتقال فرمایا۔

۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء میں سزایاب ہونے کے بعد میرا عدالتی کام غازی آباد میں بہت کم ہوگیا۔ لالہ دیش بندھو جی سے سیاسی کام کے سلسلے میں میرے مراسم تھے۔ اُن کے ذریعے سے "تیج" اخبار میں جوائنٹ ایڈیٹر ہوکر ۱۹۳۳ء میں دہلی چلا آیا۔ دیش بندھو جی کے چھوٹے بھائی لالہ دھرمپال گپتا وفا اور تیج ویکلی کے ایڈیٹر سیّد ابن الحسن فکر کے انہماک سے ادارۂ تیج کے تحت بھی مشاعرے ہونے لگے۔ ان مشاعروں میں حضرات جوشؔ ملیح آبادی۔ بزمؔ اکبر آبادی صفیؔ لکھنوی۔ ظریفؔ لکھنوی۔ جگرؔ مراد آبادی۔ ساغرؔ نظامی۔ سیماب اکبر آبادی وقتاً فوقتاً شریک ہوتے اور دہلی کے اساتذہ تو شریک ہوتے ہی تھے۔ جوشؔ صاحب نے "کلیم" نامی ماہنامہ نکالا تھا، اور دریا گنج میں قیام فرماتے تھے۔

۱۹۳۵ء میں میں نے اپنی زندگی میں سب سے بڑا مشاعرہ جے پور میں دیکھا رائے پنڈت امرناتھ اٹل وزیر خزانہ ریاست جے پور صدر تھے۔

تین روز تک یہ مشاعرہ جاری رہا۔ غزلوں میں اشعار کم کرائے گئے۔ پھر بھی بہت سے شعرا کو پڑھنے کا موقع نہ ملا۔ دہلی سے حضرات جوش و ساحر و کیفی و معجز و زار و شیدا و منور و غوث، بدایوں سے حضرات تاباں و قمر۔ لکھنؤ سے حضرات وصل بلگرامی و ملّا و سراج و قدیر و آرزو۔ اکبرآباد سے حضرات بزم و سیماب و میکش و ساغر۔ حیدرآباد سے حضرات فانی بدایونی و یگانہ چنگیزی۔ ٹونک سے حضرات یاس و بسمل شرکا میں سے تھے۔ دیگر مشاہیرِ فن میں جگر مرادآبادی۔ ناطق گلاؤ ٹھوی۔ اطہر ہاپوڑی۔ باسط بسوانی قابلِ ذکر ہیں۔

اس مشاعرے کے چند مقبول اشعار یہ تھے۔

آرزو:— اے برق کیوں ابھی سے ہے تو اتنی بیقرار
بنیادِ آشیاں ہے ابھی تو خیال میں

اطہر:— انجامِ عشق اور مآلِ وفا ابھی
اُن کے خیال میں ہے نہ میرے خیال میں

بزم اکبرآبادی:— یا اک جہاں کو بحرِ محبّت میں غرق کر
یا خود ہی ڈوب جا عرقِ انفعال میں

سراج لکھنوی:— کچھ اور مانگنا مرے مشرب میں کفر ہے
لا اپنا ہاتھ دے مرے دستِ سوال میں

سیماب اکبرآبادی:— دل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

فانی بدایونی:— امکانِ معرفت کو سمو کر محال میں
وہ دل میں یوں رہے کہ نہ آئے خیال میں

قدیر لکھنوی:— دیکھا کرو جو روز مرے دل کا آئینہ
لگ جائیں چار چاند تمہارے جمال میں

قمر بدایونی:— وہ کیا کسی کی چشمِ تصوّر میں آئے گا
جس کی مثال بھی نہیں آتی خیال میں

کیفی دہلوی:— جلوے مچل رہے ہیں جو حسن و جمال میں!
ششدر نظر کو کر گئے رنگِ خیال میں!

منشی مہاراج بہادر برق دہلوی بھی اس مشاعرے میں مدعو تھے۔ مگر وہ مکان بنوانے میں مصروف تھے اس لئے شریک نہ ہو سکے۔ اسی کے چند مہینے بعد وہ داغِ مفارقت دے گئے۔ اسی سال انڈین نیشنل کانگریس کی گولڈن جوبلی کے سلسلے میں جابجا مشاعرے ہوئے۔ دہلی کے مشاعرے کا اہتمام میرے سپرد تھا، اور مظفرنگر کے مشاعرے کی صدارت کا فخر مجھے حاصل ہوا۔ اس مشاعرے میں حضرت ساغر نظامی کا کلام نہایت مقبول رہا۔

۱۹۳۶ء میں ساحر صاحب کی بزمِ سخن کی سلور جوبلی بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔ مدّتوں بعد سائل و بیخود ایک بزم میں یک جا نظر آئے۔ مشاعرے کے صدر جناب پنڈت رادھے ناتھ کول صاحب گلشن تلمیذ داغ تھے۔ ان تینوں حضرات کے ماسوا جو شاگردانِ داغ اس بزم میں شریک ہوئے وہ نوح ناروی۔ احسن مارہروی۔ زار دہلوی۔ جوش ملسیانی۔ سیماب اکبرآبادی اور فدا گلاؤ ٹھوی تھے۔ زار صاحب نے طرحی غزل کے ماسوا ایک نظم فرمائی جس میں ابتدا سے اُس وقت تک کے شعرا دہلی کا ذکر تھا جو دیگر اساتذۂ فن جو شریک ہوئے وہ بزم اکبرآبادی۔ قمر بدایونی۔ آزاد انصاری۔ غوث دہلوی اور کیفی دہلوی تھے۔ اس مشاعرے کی کئی نشستیں ہوئیں۔ آخر نشست ۳۱۔ دسمبر ۱۹۳۶ء کو تھی۔ پہلی جنوری کو میں نے ان حضرات کو اس حویلی میں مدعو کیا جس کے ایک حصّے میں میں رہتا تھا۔ یہ حویلی منشی کشن دیال صاحب شاد کی تھی، جو موسیقی اور شاعری دونوں کا شوق رکھتے تھے، اور جن کے والد کا میوزک ہال دہلی میں بہت مشہور تھا۔ یہ نشست بہت کامیاب رہی۔ اس میں حضرات سائل، ساحر و جوش ملیح آبادی و قمر بدایونی و زار دہلوی و نوح ناروی و حرمان خیرآبادی و منور لکھنوی نے شرکت فرمائی۔ اسی سال ڈاکٹر انصاری کی تجہیز و تکفین کے وقت مولانا سمیع اللہ سے میرا تعارف ہوا۔ پھر میں اُن کی دوکان پر آنے جانے لگا۔ جہاں ہر درجے کے شاعر اور ادیب کی نشست برخاست رہتی ہے۔

۱۹۳۷ء میں میں مرضِ تپِ دق میں مبتلا ہوا۔ حیات و موت کی کشمکش کے عالم میں بھائی ادیب کے پاس مظفرنگر چلا گیا جان بچ گئی۔ اب جو واپس آیا تو محلہ ٹوکری والاں پل مٹھائی میں مکان لیا۔ یہاں کی فضا حجتہ صوفی کی طرح شاعرانہ نہ تھی۔ مگر قریب ہی نیشنل پبلک لائبریری کھلی جس کے کرتا دھرتا انوار الحق صاحب حقّی تھے۔ اس لائبریری میں ادبی جلسے ہونے لگے اور پھر اردو ہفتہ منایا جانے لگا۔ یہیں سر رضا علی اور خواجہ محمد شفیع سے میری ملاقات ہوئی۔ ہفتہ میں میرا پروگرام کئی

رونق رہتا تھا۔ کبھی مشاعرہ میں، کبھی بزم مقالہ میں، کبھی بحث و تمحیص میں اور کبھی لطیفہ گوئی میں۔ یہ لائبریری اب بھی ہے۔

خواجہ محمد شفیع سے متعارف ہونے کے بعد میں اُن کے یہاں ہفتہ واری ادبی نشستوں میں شریک ہونے لگا جن میں ادبی اور تفریحی دونوں پہلو ہوتے تھے۔ بھائی ادیب چونکہ مظفر نگر سے کھتولی آگئے تھے۔ لہٰذا میں کھتولی کے سالانہ مشاعروں میں بھی جایا کرتا تھا۔ خواجہ محمد شفیع کی مجلس میں ہی حضرات حفیظ جالندھری اور شمس العلماء مولانا عبدالسلام اور خواجہ عبدالمجید صاحب سے شرف ملاقات حاصل ہوا۔ افتخار الشعراء منشی مہاراج بہادر برق کے شاگرد جناب شیش چند صاحب طالب ہر سال اپنے استاد کی برسی کے سلسلے میں ایک مشاعرہ کرتے ہیں۔ اسی مشاعرے میں پہلے پہل پنڈت بالمکند عرش ملسیانی سے ملاقات ہوئی اور یو۔ پی ایسوسی ایشن کے ایک جلسے میں منشی تلوک چند محروم سے نیاز حاصل ہوا۔ ہارڈنگ لائبریری کے سکریٹری جناب نصیح الدین احمد نے لائبریری میں ایک اُردو مجلس کی بنیاد ڈالی جس میں جناب خواجہ حسن نظامی۔ مُلا واحدی۔ خواجہ محمد شفیع۔ مولانا وحشی اور دوسرے ادیب شریک ہوتے تھے۔ مقالے پڑھے جاتے تھے، اور تنقیدیں ہوتی تھیں۔ نصیح الدین صاحب کے انتقال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اچھی محفلیں ہوتی تھیں۔

۱۹۳۹ء میں انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد سے منتقل ہو کر دہلی آگئی۔ علامہ کیفی سے تو مجھے پہلے ہی نیاز حاصل تھا۔ اُن کے ذریعے مولوی عبدالحق صاحب سے متعارف ہوا۔ اس انجمن کا سالانہ مشاعرہ ٹاؤن ہال دہلی میں ہوا جس میں حاضرین کی وہ کثرت تھی کہ بہت سے شعراء داخلہ کی تاب نہ لاسکے۔ چنانچہ حضرت وصل بلگرامی۔ خیر بہوری۔ آنند نرائن مُلا۔ طالب دہلوی۔ بھائی ادیب اور اُن کے ساتھ میں نے راہِ فرار اختیار کی اور طالب صاحب کے مکان پر مختصر صحبت ہوئی۔ جس میں شاعری سے زیادہ حضرت وصل بلگرامی کے لطیفے دلچسپ تھے۔ نصف شب کے بعد یہ حضرات تو مشاعرے چلے گئے مگر میں گھر چلا آیا۔ پروفیسر راجندر ناتھ شیدا اس اثنا میں لکھنؤ یونیورسٹی سے اوّل درجہ میں ایم اے پاس کر کے دہلی آئے اور ڈاکٹریٹ کے لئے تھیسس لکھنا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں میں نے علامہ کیفی مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے اُن کا تعارف کرایا۔ جناب احمق پھپھوندوی بھی انجمن ترقی اُردو سے وابستہ تھے۔ مجھ پر خاص کرم فرماتے تھے۔ کبھی کبھی غریب خانہ پر بھی تشریف لاتے تھے۔ اِس زمانے میں وار فرنٹ کے مشاعروں کا زور تھا۔ لیکن اِس بارے میں احمق صاحب بھائی ادیب اور میں اس وضع پر آخر تک قائم رہے کہ اِن مشاعروں میں شرکت نہیں کرنی ہے۔ انگریزوں کے خلاف نظمیں کہنے میں احمق صاحب کو کمال حاصل تھا۔ حضرت آغا شاعر کی پہلی برسی میں جناب احسان دانش سے میرا تعارف ہوا۔ ۱۹۴۱ء میں دہلی صوبہ کانگریس کی طرف سے ایک مشاعرہ میرے اہتمام میں ہوا جس میں حضرات جوش و ساغر و مجاز و انور صابری و اظہار رام پوری وغیرہ نے شرکت فرمائی۔ ۱۹۴۲ء میں ساحر صاحب نے رحلت فرمائی۔ اُن کے ماتمی جلسے میں کنور مہندر سنگھ بیدی صاحب سحر نے بھی تقریر فرمائی۔ سحر صاحب کی صدارت میں میں نے اکتوبر ۱۹۴۲ء میں شاعر سبھا میں غزل پڑھی۔ بہ حیثیت شاعر یہیں ان سے ارتباط شروع ہوا۔ کانگریس کی طرف سے جو مشاعرے ہوتے اُن میں میں اُن کو مدعو کرتا، اور یہ مجسٹریٹ ہوتے ہوئے بھی شریک ہوتے۔ ان کے ساتھ فیض جھنجھانوی اور بسمل شاہجہاں پوری بھی ہوتے تھے۔ بسمل صاحب سے میری ملاقات ۱۹۳۵ء میں ہو چکی تھی۔ حضرت آغا شاعر تو ۱۹۳۹ء میں ہی انتقال فرما چکے تھے۔ نواب سائل اور منشی چندی پرشاد شیدا نے ۱۹۴۵ء میں رحلت فرمائی۔ میں ۱۹۴۲ء میں سیاسی تحریک کے سلسلے میں گرفتار ہو کر ۱۹۴۴ء میں رہا ہوا اور ۱۹۴۶ء میں میری نیا چمن ہندی کتاب جس میں چند اُردو شعراء کا تذکرہ ہے دکشن بھارت ہندی پرچار سبھا سے شائع ہوئی۔

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد اور تقسیم ہوا۔ دہلی کی کایا پلٹ ہوئی۔ بہت سے لوگ چلے گئے بہت سے نئے آگئے اور محفلوں کی طرح دہلی کی مجلسوں کا رنگ بھی بدل گیا۔ شعراء کا اندازِ کلام بدلا۔ سامعین کی پسند بدلی۔ شعراء بدلے۔ سامعین بدلے۔ مشاعروں میں تفریحی پہلو غائب ہوا۔ حاضرین کی تعداد بڑھ گئی۔ لال قلعے میں مشاعرے ہوئے۔ مزارِ غالب پر مشاعرے ہوئے۔ مختلف انجمنیں بنیں۔ مختلف ادبی کارکن پیش پیش ہوئے۔ نئے آنے والوں میں حضرت محروم سے تو پہلے ہی نیاز حاصل تھا، پنڈت ہری چند

اختر۔ جناب جگن ناتھ آزاد۔ جناب گوپال متل۔ جناب طالب چکوالی و رعنا جگی سے تعارف ہوا۔ اس پانچ سال میں دن بھی کئی منائے گئے۔ یوم غالب۔ یوم چکبست یوم سپرو۔ ہندی والے تلسی داس کا دن تو مناتے ہی تھے اب اُنھوں نے سور داس کا دن بھی منانا شروع کیا ہے۔ ان تمام مشاعروں اور ادبی صحبتوں کی تفصیل بخوفِ طوالت او مصلحتاً نہیں لکھتا۔ لیکن ان میں مجھ پر جن نشستوں کا سب سے زیادہ گہرا اثر ہوا وہ خواجہ احمد فاروقی کی مدعو کی ہوئی اُردو کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس اور نظریاتی مشاعرہ تھا جس میں چیدہ چیدہ شعراء اور ادیب مدعو تھے۔ کانفرنس کی صدارت خواجہ غلام السیّدین اور نظریاتی مشاعرہ کی صدارت حضرت جوش ملیح آبادی نے فرمائی۔ اس مشاعرہ میں ہر شاعر اپنے کلام سے پہلے اپنا نظریۂ فن پیش کرتا تھا۔

اس ۳۵ سال کے زمانے میں لکھنؤ سے عزیز صفی۔ ثاقب، محشر۔ ناطق۔ بہار۔ بلیغ۔ ذاخر۔ چکبست۔ آرزو۔ توقیر ہمیشہ کے لئے رخصت ہوئے۔ دہلی سے ساحر۔ سائل بنشی کیفی۔ شیدا۔ برق۔ زُتق۔ معجز۔ شور۔ غوث۔ آغا شاعر۔ مضطر۔ ناصر راہی ملکِ عدم ہوئے۔ آگرے کے سیماب و بزم چل بسے۔ لیکن کئی نوجوان شعرا اب مقبولِ بزم ہیں۔ پاکستان سے کہنہ مشق شعرا بھی دہلی آ بسے۔ حضرت جوش ملیح آبادی ادارہ آج کل کے رکن اعلیٰ کی حیثیت سے دہلی آ گئے۔ یعنی اگرچہ بہت سے اساتذہ اُٹھ گئے

پر موجِ سخن سدا ہے باقی   دریا نہیں کا رہتا۔ ساقی

شمیم کرہانی

ایک دروازہ کھُلا

شنیل خاموش بیٹھا تھا۔ اُس کا چہرہ جھُکا ہوا تھا اور آنکھوں میں تیز سُرخی تھی جیسے وہ کئی راتوں کا جاگا ہو۔ کمرے کا دروازہ ہوا سے کھُلتا اور بند ہو جاتا۔ الگنی پہ ٹنگی ہوئی اُس کی کمو کی ساری ہوا کے جھونکوں سے اُڑ اُڑ کر اُس کے مضمحل رخساروں کو چھو رہی تھی۔ اور کمو قریب ہی پلنگ پر اپنے ننھے کو سینے سے لگائے بے چین لیٹی تھی۔ اُسے بے چینی اس بات کی تھی کہ ننھا جلدی سے سو جائے تو وہ اُٹھ کر شنیل کو کھانا دے۔ بارے تھوڑی دیر میں ننھا سو گیا تو وہ بڑی احتیاط سے پلنگ سے اُتری اور دبے پاؤں شنیل کے پاس آکر بولی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"ایں؟"

"میں پوچھتی ہوں، کیا سوچ رہے ہو؟"

"ننھا سو گیا؟"

"ہاں، سو گیا، کھاؤ گے کچھ، لاؤں؟"

"بھوک نہیں۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو، کل سے بھوکے ہو، مُنہ پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں، کہہ تو دیا دفتر کا دھیان چھوڑ دو، شہر میں گڑبڑ ہے۔ چار طرف کرفیو لگا ہوا ہے۔ انسان انسان کے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ گھر سے باہر قدم رکھنا مصیبت ہے، دفتر کیسے جاؤ گے؟"

"مجھے دفتر کی فکر نہیں۔"

"گھر کی فکر سہی؟"

"گھر کی بھی فکر نہیں؟"

"پھر کس کی فکر ہے۔ آخر بتاتے کیوں نہیں۔ مجھ سے کیا پردہ ہے، اور اگر پردہ ہے تو جانے دو نہ بتاؤ۔" کمو کچھ رُوٹھی رُوٹھی سی ہو چلی کہ شنیل نے جھکا ہوا سر اُٹھایا اور کہا۔

"مجھے احمد کی فکر ہے۔"

"کیا ہوا احمد کو؟" کمو کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ شنیل نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔

"احمد کو کچھ نہیں ہوا۔ اُس کی اپنی کلثوم کئی دنوں سے بیمار ہے۔ وہ دہلی ہوئے دفتر میں احمد سے ملاقات ہوئی تھی، بہت پریشان تھا۔ کہہ رہا تھا "کلثوم کو نمونیہ ہو گیا ہے بھائی اور شہر کی حالت خراب ہے، ڈر لگتا ہے کہیں کرفیو نہ لگ جائے میں نے سمجھایا۔" نہیں جی۔ کل پرسوں تک امن ہو جائے گا۔ کرفیو کی نوبت ہی نہیں آئے گی، تم گھبراؤ مت۔" مگر اب سوچتا ہوں۔ احمد کا خطرہ صحیح نکلا، بات بڑھ گئی اور کرفیو لگ ہی گیا۔" اتنا کہہ کے وہ چپ ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر درد اور بے چینی کی لہریں پھر جاگ اُٹھیں اور اس نے سر جھکا لیا۔ کمو جلدی سے شنیل کے پاس بیٹھ کر بولی۔ "اور اُس کے بچے کا کیا حال ہو گا۔ وہ تو دودھ بغیر تڑپ رہا ہو گا ایک ہی ہفتہ تو ہوا، رادھا کے بیاہ میں وہ اپنے ننھے کو لے کر آئی تھی۔ کیسا تندرست اور شریر لڑکا ہے۔ میں نے گود میں لیا تو باجی وہ دودھ ڈھونڈنے لگا۔ کلثوم نے مسکرا کر کہا۔ "دے، دے" میں نے کہا۔ "بھک تیرا دھرم نہ بگڑ جائے گا۔" بولی آس میں دھرم کی کیا بات ہے۔" میں نے کہا۔ "میں ہندو جو ٹھہری۔ بولی۔ "تو کدھر سے ہندو ہے، بتاؤ تو سہی، تجھ میں ہندوپن کی کیا نشانی ہے۔" میں بہت سٹ پٹائی مگر ایک جواب جلدی سے میری سمجھ میں آ گیا۔ میں نے بڑے غرور سے کہا۔ "میرے باپ دادا ہندو تھے"۔ مگر وہ کہنے لگی۔ "اس سے کیا ہوتا ہے، تجھ میں تو ہندوپن کی کوئی نشانی نہیں۔ دیکھ میرے جیسے گال، میرے جیسے بال، میری جیسی آنکھیں میری جیسی گردن اور میری جیسی . . . . . . " اُس نے ذرا بھدّی سی بات کہی۔ میں نے ہنس کے کہا۔ "چپ بھی رہ" مگر وہ بولتی گئی۔ "میری جیسی اُنگلیاں، میری جیسی کمر اور میرے ہی جیسے ہاتھ پاؤں۔ ہم دونوں کی ناکوں اور کانوں میں کیلیں اور بُندے ہیں" اور وہ اپنا مُنہ میرے مُنہ کے پاس لا کر بولی۔ "دیکھ ہم دونوں ایک

طرح سانس لیتے ہیں۔ سانس لینے میں جیسے میرا سینہ نیچے اوپر ہوتا ہے تیرا بھی ہوتا ہے اور........ اور تو بھی اپنے نھنے کو دودھ پلاتی ہے میں بھی، اور ہم دونوں کی چھاتیوں سے جو دودھ نکلتا ہے وہ بھی ہم رنگ ہوتا ہے کہ تیری چھاتی سے سرخ دودھ نکلتا ہے بول۔"

"تو پھر تم نے کیا کہا؟" شنیل نے قدرے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ کمو نے سر پر آنچل کھینچتے ہوئے کہا۔ "میں کیا کہتی۔ میرے پاس اُس کی باتوں کا جواب ہی کیا تھا۔ میں تو بچے سے جان چھڑانے لگی۔ کلثوم نے پھر کہا۔ "دے ہی دے"۔ مجھے بھی ترس آ گیا اور میں نے شلوکا کھسکایا۔ مگر ٹھیک اُسی وقت شور ہوا، میرے ہاتھ رک گئے اور دلہن بنی ہاتھ میں ہار لئے، بہنوں کے سہارے آنگن میں چلی آ رہی تھی۔ سماں بڑے مزے کا تھا۔ میں کھڑی ہو گئی اور دلہن نے جب دولہا کے گلے میں ہار ڈالا تو میرا جی نہ جانے کیسا ہونے لگا۔ میں نے بچے کو دیتے ہوئے کہا۔ "لے بھئی نھنے کو سنبھال، میں چلی۔ کلثوم نے نھنے کو سنبھال لیا اور میں بھاگی بھاگی اپنے گھر آئی۔ نھا جاگ گیا تھا اُسے بہلانے لگی۔" اتنا کہتے کہتے کمو کی سانس تیز ہو گئی اور وہ نظریں نیچی کر کے چپ ہو گئی۔ شنیل نے کہا۔ "پلا کیوں نہ دیا بیچاری کے دودھ نہیں ہوتا، وہ گیّا کا دودھ اپنے نھنے کو پلاتی ہے تو چھاگلوں دودھ رکھ کر کیا کرے گی؟" شنیل کے لہجے میں زندہ دلی تھی۔ کمو نے بھویں تان کر کہا۔ "بڑے آئے ٹوکنے والے" پھر ذرا تھم کے بولی۔ "اُس کا گھر پاس ہوتا تو میں روز اُس کے نھنے کو دودھ پلا دیتی، پھر آجکل تو گھر سے باہر نکلنا مشکل ہے۔ اُس کے نھنے کا کیا حال ہوگا، پھر سوچ کے۔ میرا جی ہلنے لگتا ہے، بھگوان، تباہ کرے گنڈوں کو جو لڑائی جھگڑا کر کے ننھی ننھی جانوں پر مصیبتیں توڑتے ہیں۔ کیوں جی، ان گنڈوں کو پکڑ کر کہیں سمندر پار کیوں نہیں بھیج دیا جاتا کہ شہروں میں شانتی ہو جائے، شریف بہو بیٹیاں ایک دوسرے سے مل جل سکیں اور ہنسی خوشی زندگی بتا سکیں۔" کمو چپ ہو گئی۔ شنیل نے جوش بھرے لہجے میں کہا "تم اب بھی اُن سے مل سکتی ہو۔" کمو نے حیران ہو کر شوہر کو دیکھا۔ عجیب ناممکن سی بات کہہ دی تھی اُس نے، کمو تھوڑی دیر تک شنیل کو گھورتی ہوئی پھر بولی۔ "ہاں میرے لئے تو شہر میں کرفیو آرڈر ہے نہیں" کمو کے لہجے میں قدرے تلخی تھی۔ شنیل کو یہ تلخی بے حد محسوس ہوئی، اُس نے جھکا ہوا سر اور جھکا لیا اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ مصیبت میں بیوی بچے سب کنارا کر لیتے ہیں۔" کمو کو محسوس ہوا جیسے کسی نے اچانک اُس کے سینے پر گھونسہ مار دیا ہو۔ وہ تلملا کے شنیل کے پاس بیٹھ گئی۔ اُس کے چہرے پر غم اور غصّے نے مل کر ایک اندھیرا کی سیاہی پھیلا دی، شنیل نے آہستہ آہستہ بڑبڑانا شروع کیا۔

ہم ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ایک گلی میں جوان ہوئے، ایک اسکول میں پڑھے۔ ایک ساتھ کمانے نکلے اور ایک ہی دفتر میں ملازم ہوئے۔ مگر آج ہم دونوں جدا ہو گئے ہیں، نہیں، جدا کر دئے گئے ہیں۔ ہمارے درمیان کرفیو آرڈر کی فولادی دیوار کھڑی کر دی گئی ہے۔ یہ دیوار ہٹ جاتی تو ہم دونوں بھاگ جاتے گاؤں کی بھولی بھالی پیار کی دنیا میں، پیار کی دنیا کے ہرے بھرے کھیتوں میں، ہنستے گنگناتے تالابوں میں، لہکتے مہکتے آم کے باغوں میں جہاں کوئلیں کوک رہی ہیں اور پپیہے پکار رہے ہیں۔ "پی کہاں، پی کہاں" اتنے کہتے کہتے اُس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کمو کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب وہ کیا کرے۔ وہ بھی تو دو وقتوں سے بھوکی پیاسی تھی۔ اُس کے چہرے پر بھی تو ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، اُس کا دل اور دماغ بھی تو فساد اور کرفیو کے بندھنوں میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ بھی تو قابلِ رحم تھی۔ وہ ایک لمحے تک تو شنیل کی طرف مضطربانہ نظروں سے دیکھتی رہی، پھر اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا آئیں اور اُس کے رخساروں پر آنسوؤں کے موٹے موٹے موتی بہنے لگے اور اُس نے جلدی سے شنیل کے دونوں ہاتھوں کو تھام کر کہا۔

"اچھا تو اُٹھو" اُس کے لہجے میں پختہ عزم کی گہرائی تھی۔

"کہاں؟"

"کلثوم کے گھر۔"

"کیا کہتی ہو؟"

"وہی جو کہہ رہی ہوں۔"

"کمو!"

"میں کچھ نہیں سنتی۔ میں بھی انسان ہوں۔ کل سے تم بھوکے پیاسے ہو، گھر سے باہر جانا چاہتے ہو مگر میرے اور میرے نھنے کے خیال سے باہر قدم نہیں رکھتے۔ ہم دونوں تمہارے راستے میں دیوار بن کر کھڑے ہو گئے ہیں، لو میں اُس دیوار کو ڈھائے دیتی ہوں۔ تم کنجی تالا اُٹھا لاؤ۔ میں نھنے کو سنبھال لیتی ہوں۔ یہ کہہ کے وہ بچے کی طرف بڑھی اور شنیل کچھ حیرت اور کچھ مسرت کی ملی جلی کیفیت لئے اُس کے ساتھ ساتھ بڑھا۔

شام کی سیاہی گہری ہو چکی تھی۔ رات کی دیوی جلدی جلدی اپنے بالوں کو کھول رہی تھی۔ جس سے رات کا اندھیرا سیاہ اور گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ شنیل اور کمو

بچّے کو سنبھالے جب گلی میں اُترے تو بے پناہ سنّاٹے نے اُن کا خیر مقدم کیا۔ میونسپل لیمپ کی روشنی گلی کے آخری موڑ پر اس طرح کانپ رہی تھی جیسے گنڈوں کے سامنے چوراہے پر کھڑی کوئی دوشیزہ تھر تھر کانپ رہی ہو۔

معاً سیٹی کی آواز ہوئی اور پاس ہی مریل سی کُتیا زور سے بھونک اُٹھی۔ کمّو کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا لیکن دوسرے ہی لمحے اُس نے جی کڑا کر کے شنیل کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کیا۔ دونوں کی رفتار میں احتیاط تھی۔ دونوں جیسے پنجوں کے بل چل رہے تھے۔ دونوں جیسے دشمنوں کی گھات سے نکل کر اپنے خیمے میں پہنچ جانا چاہتے تھے۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ خنجروں اور ترولیوں کی زد میں چل رہے ہیں۔ داہنی طرف کوئی خنجروں اور ترولیوں کی زد میں چل رہے ہیں داہنی طرف کوئی خنجر اُٹھا، بائیں طرف کوئی ترولی بلند ہوئی۔ اُوپر سے کوئی بم آیا سامنے سے کسی نے بندوق سر کی، پیچھے سے کسی نے لاٹھی تانی اور شنیل تھم گیا۔ کمّو نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا "کیوں رُک گئے؟" شنیل کوئی جواب نہ دے سکا کشمکش میں کھڑا سوچنے لگا۔ اب وہ کیا کرے، موت کے منہ میں سارے خاندان کو جھونک دینا کہاں کی دانشمندی ہے، وہ تنہا جا سکتا تھا آخر بیوی اور بچّے کو ساتھ لے کر کیوں جا رہا ہے۔ آخر ان بے گناہوں نے کیا کیا ہے کہ اپنے ساتھ ان کو بھی چھُری کی بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ کمّو نے شنیل کو چپ دیکھ کر پھر پوچھا" بولتے کیوں نہیں، کیا بات ہے، کیوں رُک گئے؟" شنیل نے گرفتہ لہجے میں کہا۔ "بات یہ ہے کمّو۔۔۔۔۔۔" وہ ایک لمحے کے لئے رُکا۔ پھر بولا۔ "ہمیں واپس چلنا چاہیئے آگے بہت خطرے ہیں۔" کمّو حیران رہ گئی، ایسی بزدلی کی توقع شنیل سے نہ تھی، اُسے اچانک محسوس ہوا جیسے وہ بہت ذلیل اور نیچے درجے کی عورت ہو کر رہ گئی۔ مرد کی دلیری اور بہادری ہی تو عورت کی ڈھارس، وقار اور فخر کا باعث ہوتی ہے۔ کمّو نے محسوس کیا جیسے کسی نے اُسے ذلیل کر دیا اور وہ جھنجھلا کر بولی۔ "ہمیں پیچھے واپس جانے میں بھی اتنا ہی خطرہ ہے جتنا آگے بڑھنے میں، تو ہم کیوں نہ آگے بڑھیں کہ آگے بڑھ کر مرنے میں اُمید ہے۔" کمّو یہ کہتی ہوئی آگے بڑھی اور شنیل نے محسوس کیا جیسے اُس کی رگوں میں تازہ تازہ خون دوڑ گیا اور اُس میں نئی جان آ گئی۔ وہ پھرتی سے کمّو کے آگے بڑھا اور میانہ روی کے ساتھ بے خوف و خطر چلنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ دونوں میونسپل لیمپ کی روشنی سے بچتے بچاتے سڑک کے پاس آ گئے، اب سوال یہ تھا کہ سڑک کیونکر پار ہو۔ شنیل نے دل میں کہا۔ بس ہمارے درمیان یہ سڑک حائل ہے۔ اگر یہ سڑک پار ہو جائے۔ تو سامنے کی گلی اُس کی منزل ہے۔ معاً کوئی دردناک چیخ سنّاٹے کا دامن چاک کرتی ہوئی اُس کے کانوں تک پہنچی۔ یہ چیخ "جو ہندو تھی نہ مسلمان بلکہ خالص انسان تھی وہ چیخ جس کے سینے میں کسی آدمی نے خنجر پیوست کر دیا تھا، جیسے کسی آدمی نے قتل کر دیا تھا۔ سڑک کا پولیس مین سیٹی بجا کر ایک طرف دوڑ گیا۔ شنیل نے لپک کر کمّو کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور سڑک پر تیزی کے ساتھ چلنے لگا۔

یہ وہی سڑک تھی جو دو دن پہلے ہر خاص و عام کے لئے کھلی ہوئی تھی۔ جس پر دوستوں اور یاروں کی ٹولیاں گلے میں باہیں ڈالے گزرا کرتی تھیں۔ جس پر نازک اندام حسینائیں اپنی ہوش ربا سُبک خرامیوں سے دلوں میں قیامتیں برپا کرتی چلتی تھیں۔ جس پر جنگِ آزادی کے بڑے بڑے سورماؤں کے جلوس پھولوں کی بارش میں گزرا کرتے تھے۔ جس پر کبھی ہندوستان کے انقلابی نوجوانوں نے ستیا گرہ کی تھی۔ کہ اس سڑک کو اجنبی آقاؤں کے قدم کے بار سے چھٹکارا دلایا جائے اور جس پر شنیل اور احمد بارہا ہنستے قہقہے لگاتے گزرتے تھے۔ وہی سڑک آج ایک طلسمی خونی سنّاٹے میں گم تھی۔ وہی سڑک آج دو دلوں کے لئے حدِّ فاصل تھی، وہی سڑک آج ناقابلِ عبور تھی۔ وہی سڑک ہندوستان کے آزاد ہو جانے کے باوجود غلام تھی۔ وہی سڑک جس پر سے آج شنیل آزادوں کی طرح نہیں بلکہ خوفزدہ مجرم کی طرح گزر رہا تھا۔

بارے سڑک پار ہو گئی اور وہ چھوٹا سا کارواں احمد کی گلی میں پہنچ گیا، گلی کا چوتھا مکان احمد کا تھا۔ شنیل نے بڑھ کر دروازے کی کنڈی کھٹ کھٹائی۔ صحن میں کسی کے دبے پاؤں چلنے کی آہٹ محسوس ہوئی۔ شنیل نے پھر کنڈی کھٹ کھٹائی دروازے سے لگے ہوئے کسی انسان نے خوفزدہ لہجے میں دریافت کیا۔ کون ۔۔؟ شنیل نے آواز پہچان کر کہا۔ احمد دروازہ کھولو، میں ہوں شنیل۔

سنسان خونی رات کے بھیانک سنّاٹے میں جب کہ شہر کا ہر دروازہ بند تھا۔ دونوں نے مل کر ایک دروازہ کھولا۔

عبدالمجید حیرت

آئینۂ حیرت

دیکھ کے تیور اُس قاتل کے
ٹکڑے اُڑ جاتے ہیں دِل کے

قسمت کی خوبی تو دیکھو
اور بڑھا غم اُن سے مِل کے

تھی جن سے اُمید دعا کی
رہ گئے ہونٹ الٰہی سِل کے

بیت گئی جب اتنی مدّت
اور سہی کچھ دن مُشکل کے

گلشن کی اس آب و ہوا میں
خوش ہوں گے کیا غُنچے کِھل کے

حال اگر ایسا ہی گزرا
اندیشے ہیں مستقبل کے

سامنے اب تک جتنے آئے
سب وہ دھوکے تھے منزل کے

جب ہو جاتے ہیں بے مصرف
پھینک دیئے جاتے ہیں چھلکے

ماضی کے اذکار نہ چھیڑو
زخم ہرے ہوتے ہیں دِل کے

ڈُوبنے والے بحرِ غم میں
کب محتاج رہے ساحل کے

کیا کہئے، کیوں ہم پہ حیرت
بند ہیں در اُن کی محفل کے

اُن سے امیدِ مہر و مروّت نہیں مجھے
وُہ مہرباں نہیں ہیں تو حیرت نہیں مجھے

اک بات ہے کہ جس سے مجھے اختلاف ہے
کچھ ان کی ذات سے تو عداوت نہیں مجھے

ہوتا ہے کوئی ساتھ تو ہو خوشدلی کے ساتھ
منظور بے دلی کی رفاقت نہیں مجھے

نا واقفانِ رمزِ محبّت کو کیا خبر
تسلیم کیوں کسی کی سیادت نہیں مجھے

اب اور بھی سوا ہیں اسیری کی بندشیں
نالے کی بھی قفس میں اجازت نہیں مجھے

مایوسیوں نے پیکرِ حسرت بنا دیا
اب عرضِ حال کی بھی ضرورت نہیں مجھے

دیکھوں کسی کی زلفِ شکن در شکن کو کیا
اپنے ہی پیچ و تاب سے فرصت نہیں مجھے

گویا کہ خوفِ محشر اگر ہے تو بس نہیں
گویا کہ فکرِ روزِ قیامت نہیں مجھے

میرے تکدّرات کا یہ بھی ہے اک سبب
جس حال میں ہوں اُس پہ قناعت نہیں مجھے

تاراج گلستاں ہے، تو برباد آشیاں
یہ حال دیکھ کر بھی تو عبرت نہیں مجھے

حیرت یہ بندگی ہے کہ توہینِ بندگی
کوتاہیاں ہیں اور ندامت نہیں مجھے

ارشد کاکوی

جمیل مظہری —— ایک مطالعہ

"میری نظر میں شاعری رُوح کی ایک کیفیت
میری نظر میں شاعری لفظ کے کچھ تکلفات" (جمیل مظہری)

دنیائے ادب نے جمیل مظہری کی بے نیازی، بے پروائی اور رُوپوشی کا بار بار شکوہ کیا ہے۔ اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ جمیل بھی اپنے صوبے کی مخصوص روایات کے اسیر ہیں بلکہ پیچھے رہنے کے معاملے میں دس پانچ قدم اور آگے ہیں شاعروں سے گریزاں، چھپنے چھپانے سے بے نیاز اور نام و نمود کی خواہش سے بے پروا۔ یہ بے پروائی اور بے نیازی خود ان کی زندگی کا جزو ہے۔ اُنھوں نے کبھی باقاعدہ لکھنے اور لکھتے رہنے کا سلسلہ نہیں رکھا۔ کبھی جم کر نہیں بیٹھے۔ اس کا اعتراف سبھوں کو ہے کہ وہ اس سے کہیں زیادہ شہرت کے مستحق ہیں جو اب تک ان کے حصے میں آئی ہے لیکن یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ ان کی "عدم شہرت" بھی کچھ کم "مشہور" نہیں۔ ڈاکٹر شادانی کا اُن کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں چھپا چھپا کے رکھتے ہیں غالباً صحیح نہیں۔ انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے عزیزوں، شاگردوں اور قدردانوں کے طفیل منظرِ عام پر آچکا ہے۔ میرے پیشِ نظر ان کا اس قدر مطبوعہ کلام ہے کہ اس سے کم از کم چار مجموعے ترتیب دئے جا سکتے ہیں۔ ان کی شاید ہی دو چار نظمیں اور غزلیں ایسی ہوں جو غیر مطبوعہ ہوں اس لئے "گہہ گہہ خودی و کم کم خوری" کا الزام درست ہو تو ہو "پنہاں خورتی" کی شکایت غیر واجب ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ گلے شکوے کیوں؟ سارے الزامات کی بنیاد سچ پوچھئے تو یہ ہے کہ وہ "قدرِ اول" کے شاعر ہیں اور انھوں نے جو کچھ کہا ہے خوب کہا ہے۔ "شوق کی بار دگر" کا سبب یہی ہے کیونکہ بقول نیاز فتحپوری "جمیل مظہری کے قلم سے درجۂ دوم کی چیز کبھی نہیں نکلی"۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ گلے شکوے بھی نہ ہوتے۔ مجھے تو بڑی مسرت ہے کہ تقاضہ، اصرار، الزام اور شکوے کے اثر سے جمیل مظہری نے خود کو تیرہ بیس کے لئے وقف نہیں کر دیا۔ اور اپنے دل و دماغ کو عروسِ شہرت کے چونچلوں پہ مائل ہونے سے باز رکھا۔ اگر ہم لوگ ایم اسلم کی "ادب سازی" سے عبرت حاصل کریں تو پھر کسی قدرِ اول کے شاعر یا ادیب سے آرڈر دے کر ادب پارے حاصل نہ کریں۔

آیئے سب سے پہلے میں جمیل کی زندگی کا ایک واقعہ سناؤں جو مجھے ایک معتبر ذریعے سے معلوم ہُوا ہے۔ جمیل اُن دنوں کلکتے میں رہتے تھے۔ ایک شب جب کہ گھر کے سارے افراد سوئے ہوئے تھے جمیل نہ جانے کن خیالات میں محو جاگ رہے تھے۔ گرمی کی رات تھی۔ انھوں نے ہاتھ بڑھا کر دریچے کے پردے کو سرکانا چاہا تاکہ ہوا آسکے۔ دو ایک بار بیٹھے ہی بیٹھے کوشش کی لیکن پردہ نہ سرکا۔ اس کا کوئی سرا شاید اُلجھا ہو جمیل جھنجھلا سے گئے اور پردے کو اس زور سے کھینچا کہ وہ مجنوں کا گریبان بن کر دریچے کے ایک سرے پر جھولنے لگا۔ صبح جب ان کے چھوٹے بھائی رضا مظہری سو کر اُٹھے اور پردے کو اس حال میں دیکھا تو سمجھا کہ شاید بچّوں کی حرکت ہو۔ اسی خیال کے تحت انھوں نے ان سے پُوچھا کہ "یہ پردہ کس نے نوچا ہ"۔ جمیل کچھ کچھ جاگ سے چلے تھے۔ سوال سُن کر اُٹھ بیٹھے اور ایک مخصوص جھٹکے کے ساتھ بولے۔ "میں نے! اور اگر میرا بس چلتا تو رات ان دیواروں کو بھی ڈھا دیتا۔"

یہ دیواروں کو ڈھا دینے والی بات کوئی معمولی بات نہیں۔ اس غیر شعوری جملے کی بڑی اہمیت ہے۔ یوں تو جمیل نے صرف دریچے کا پردہ نوچ ڈالا۔ لیکن اگر ہم چاہیں تو اسی دریچے سے اُن کے خیالات و رجحانات کی دھندلی اور غیر واضح سی روشنی ضرور دیکھ سکتے ہیں۔ غالب نے کہا تھا کہ ؎

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

دیکھئے یہاں بھی وہی سر ٹکرانے والی بات ہے۔ غالب کا یہ شعر اور جمیل کا وہ واقعہ دونوں ایک ہی احساس کے نمایندے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے سینے میں کوہ آتش فشاں چھپاتے رکھتے اور ساری عمر سُلگتے رہتے ہیں فلسفہ

---

۵ نگار (لکھنؤ) بابت ماہ دسمبر ۱۹۵۱ء

اس آگ کو ہوا دیتا رہتا ہے۔ یہ احساس زندگی سے ایک قسم کی بیزاری، بے اطمینانی، ایک مبہم سے انتشار اور ایک غیر واضح سی پریشانی کا اظہار کرتا ہے۔ یہ سب فلسفیانہ تفکر اور سوچ بچار کا علیہ ہے۔ دیکھئے ؎

دیتے ہی کہا تھا ساقی نے اس جام میں ہے تلخیٔ خرد
پر مانگ کے واپس کرنے کا موقع ہی نہ تھا پینا ہی پڑا

جہاں زندگی اپنی ہی لغزشوں کے تاسف کا نام ہو وہاں کیسی آگ برستی ہوگی یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ جس بزم میں یا س بزم کو زیادہ دخل ہو، اس بزم میں جی گئے تو کیسے لگے۔ جمیل مظہری کی بھی پہلی نگاہ فلسفیانہ زندگی پر کچھ ایسی ہی پڑی کہ غریب آدم اپنی سادہ لوحی کو بھگت رہا ہے۔ "عدم جرأت انکار" نے اسے کہیں کا نہ رکھا۔

لیکن اسی "قفس" میں دیواروں سے ٹکرانے والے بھی ملیں گے۔ ان کا جنون فارغ نہیں بیٹھتا۔ وہ قیدِ حیات سے مانوس ہوتے نظر نہیں آتے۔ "یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک" کی جنگ ہوتی ہے۔ لیکن زور چلتا ہے تو صرف اپنے گریبان پر۔ جمیل کی شاعری کا مزاج فلسفیانہ ہے اور یہ فلسفہ آغاز میں زندگی اور تخلیق سے بے اطمینانیوں کا اظہار ہے۔ احساس کی الجھن اور تفکر کا تشنج ہے۔

گر خاک ہی ہونا تھا مجھ کو تو خاکِ رہِ صحرا ہوتا
اک کوششِ بیہم تو ہوتی اُٹھتا ہوتا گرتا ہوتا
موتی بننے سے کیا حاصل جب اپنی حقیقت ہی کھو دی
قطرے کے لئے بہتر تھا یہی قلزم بنتا دریا ہوتا

مرا وجود وہ پردہ ہے میں وہ پردہ ہوں — سرک گیا ہے جو کچھ کچھ رُخِ حقیقت سے

ہے تیرے صحرائے آفرینش میں کوئی جائے پناہ ایسی
لگائے بستر جہاں مسافر لُٹا نہ ہو شہرِ آرزو کا

میں اِدھر اُدھر جو بڑھا رہا ہوں ہوس کے دستِ سوال کو
مری زندگی کا یہ طنز ہے تری شانِ بندہ نواز پر

میں سیر کر رہا ہوں اس باغِ زندگی میں — جس کے حسین کانٹے پھولوں میں تل رہے ہیں
وہ اک خلش جسے سمجھا تھا زندگی میں نے — وہ عنفوانِ تمنا وہ ابتدائے جنوں

غرضکہ یہ اور ایسے بہت سے اشعار نظم و غزل شاعر کے اس اضطراب اور درد و کرب کے نمایندے ہیں جن کو ہم سوچ بچار کا نتیجہ کہہ سکتے ہیں۔ احساس کی یہ چبھن شاعر کے لئے کس قدر سامانِ اضطراب ہے۔ اسے یہاں دیکھئے۔ "ہم کون ہیں ہم کیا ہیں"۔۔۔ پوری نظم بحرِ ہستی ہے جس میں احساس کی بے چین لہریں ساحلِ تفکر پر آ آ کر سر ٹپک رہی ہیں۔ دو تین بند سنیئے۔

(۱) ہم کون ہیں۔ ہم کیا ہیں۔ اک غنچۂ رنگیں ہیں۔ رسوا کنِ نکہیں ہیں۔ جو بزمِ عناصر میں اک رات کا مہماں ہو اور سر بگریباں ہو۔ یا عالمِ حیرت میں۔ گہوارۂ فطرت میں۔ ہنسنے کی تمنا ہو۔ کھلنے کی تمنا ہو اور کھل بھی نہ سکتا ہو۔

(۲) ہم کون ہیں ہم کیا ہیں۔ اک برگِ خزاں دیدہ۔ رد کردۂ گلزارے رسوا سرِ بازارے۔ یا سطح پہ دریا کی۔ بہتا ہوا اک تنکا۔ جو رحم پہ موجوں کی۔ ہو گرمِ عمل ہر سو۔ جاتا ہو جو بڑھ بڑھ کر۔ پا بوسیٔ ساحل کو۔ اور جا بھی نہ سکتا ہو۔

اور اب دیکھئے کہ نظم کی تان کہاں ٹوٹتی ہے۔ خوابِ نوشیں سے نیند اُچٹ جانے کے بعد کی سی حیرت ہے۔ تفکر کا نہ کوئی مثبت پہلو ہے نہ منفی۔ ایک استفہامی نوعیت ہے ؎

(۳) ہم کون ہیں ہم کیا ہیں۔ اک سعیٔ پشیماں ہیں۔ اک خوابِ پریشاں ہیں پیدا ہیں نہ پنہاں ہیں۔ بدنام بہ ہستی ہیں۔ ساغر ہیں کہ مستی ہیں۔ بربط ہیں کہ نغمہ ہیں۔ ہم کون ہیں ہم کیا ہیں۔

اِن واضح اشاروں اور کنایوں میں شاعر کا مطالعہ حیات اور اس سے پیدا ہونے والی حیرانیوں کا عکس ہے۔ جمیل کی شاعری بڑی حد تک فلسفیانہ سوچ بچار کا نتیجہ ہے۔ لیکن یہ کتابی فلسفہ نہیں۔ تفکر برائے تفکر نہیں۔ یہ فلسفہ زائیدۂ احساس ہے اس کا تعلق تجرباتِ حیات سے ہے۔ شاعر کی جبینِ احساس سنگِ حیات سے ٹکرائی ہے اور یہ اشعار نہیں بلکہ رگِ احساس سے رستا ہوا لہو ہے۔ اپنی نظم "فسانۂ آدم" میں پہلے تو ذوقِ پرواز کے ایسے ترانے گائے ہیں کہ ؎

بڑھا تو رہ گیا پیچھے مرے زمانۂ حال — رکا تو وقت کی رفتار موڑ دی میں نے
[illegible] آتشِ سوزاں کو کر دیا ٹھنڈا — مچا دی بزمِ عناصر میں کھلبلی میں نے
بہ انقلابِ طبیعت مزاجِ آہن کو — ہوا کی گرمیٔ پرواز بخش دی میں نے
بلندیوں کا تصور بھی رہ گیا پیچھے — پہونچ کے اتنی بلندی پہ سانس لی میں نے

سب بجا، سب صحیح، سب درست لیکن دیکھئے کہ یکایک یہی ذوقِ پرواز کس طرح سلب کر لیا جاتا ہے۔ بازو سمٹ جاتے ہیں۔ بحرِ بیکراں جوئے کم آب بن جاتا ہے اور یہی آدم اپنے حوصلے کے ترانے گاتا ہوا بلندیوں میں پرفشاں ہے کہ یکایک ؎

ٹھٹک گئیں جو نگاہیں قریبِ حجلۂ قدس — پسِ حجابِ ادب یہ صدا سنی میں نے
کہ اے حریفِ مشیت بہ وعدہ گاہِ ازل — ٹھہر ٹھہر تری پرواز دیکھ لی میں نے

متراضِ مشیّت کام کرجاتی ہے۔ یہ کہہ دئے جاتے ہیں اور یہیں سے احساسِ شکست کی راہ کھل جاتی ہے اور خود بقول اُن کے "زندگی اک قید ہے احساسِ ناچاری کے بعد" یہ "احساسِ ناچاری" شاعر کو فرش سے عرش ہی کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ دیکھئے یہاں اِن رُباعیات میں شاعر اپنے تفکّر سے مخاطب ہے ؎

خالق کا عقیدہ اے تفکّر مت چھین بنیا ہے تو عقل سے تحیّر مت چھین
انساں ہے ضعیف اس کی کمزوری سے طاقت کا یہ آخری تصوّر مت چھین

اے فکر متاعِ چشمِ بینا مت چھین پیاسوں سے سراب کا تماشا مت چھین
آسودگیٔ نظر کا ساماں ہے یہی چہروں سے حقیقتوں کے پردا مت چھین

یہ تحیّر، یہ سراب، یہ پردا، یہ گھروندا، دیکھا آپ نے کہ بات کہاں سے کہاں پہونچی کسی قسم کی خود فریبی نہیں ہے۔ مندرجہ ذیل رباعی نہیں انھیں ہدایات کا نتیجہ تو نہیں ؎

رُوٹھی ہوئی قسمت کو منانا ہی پڑا سر اپنا یہاں وہاں جھکانا ہی پڑا
تم تو شاید خدا کے منکر تھے جمیل تم کو بھی مگر خدا بنانا ہی پڑا

نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو۔ شاعر کا فلسفہ اس "اطمینان" کو بھی نہیں بخشتا۔ ملاحظہ ہو ؎

یہ بندگی بھی ہے تسکینِ ذوق کی اک شکل
ہیں اس نظر سے بھی بیزار نہیں ہوں اپنا ہوں

ان کے فلسفوں کا فیصلہ گھوم پھر کر اسی مرکز پر آتا ہے جسے انھوں نے "غرورِ کبریائی" اور "لعنتِ تخلیق" کا نام دیا ہے ؎

تو بن کے بشر کبھی جو اترا ہوتا انساں کی مصیبتوں کو سمجھا ہوتا
بیٹے کی نگاہ جس کا گہوارہ ہو اس درد کو باپ بن کے دیکھا ہوتا

مذکورۂ بالا رباعیوں سے خاص طور پر کسی ایسے واقعے کا اظہار ہوتا ہے جس نے برسوں کی دبی دبائی چنگاریوں کو سلگا کر شعلہ بنا دیا ہے۔ انگریزی کے مایۂ ناز ناول نگار اور شاعر ٹھامس ہارڈی نے اپنے ناولوں اور نظموں میں ایسی "غرورِ کبریائی" کا بار بار ذکر کیا ہے۔ اس غریب کے یہاں بھی احساس کی بڑی مار ہے۔ اپنی کسی نظم میں اُس نے ایک ڈرامائی فضا مہیا کی ہے۔ دنیا کی پریشانیوں اور زندگی کی لعنتوں سے عاجز آکر بنی نوعِ انسان کی ایک جماعت عرش پر خدا کے وہاں جاتی ہے اور اس سے اس کے ظلم وستم کی داد چاہتی ہے۔ لیکن خدا ساری دنیا سے بے خبر ہے۔ ساری فضا سے بیگانہ ہے۔ انسانوں کی یہ جماعت شور کرتی ہے۔ اودھم مچاتی ہے۔ اسے جھنجھوڑتی اور جگاتی ہے تو خدا گہری نیند سے چونکتا ہے۔ اور جب یہ باغی جماعت اس کو اس کی تخلیق کردہ دنیا کا حال سناتی ہے تو وہ بڑی حیرت سے اپنی تخلیق اور اس دنیا کے بارے میں سوالات کرتا ہے۔ کیسی دنیا؟ کس کی تخلیق؟ شاعر کا مدعا یہ ہے کہ وہ اس کائنات کے متعلق سب کچھ بھول چکا ہے۔ یہ احساس جس درجہ بھی باعثِ اذیت ہو کم ہے ؎

مضراب سے تیری حالتِ ساز سُنی شیشے سے صدائے سنگ انداز سُنی
ٹوٹا جو اچانک مرا ساغر کل رات میں نے ترے قہقہے کی آواز سُنی

سینے سے کلیجے کو نکالا تو نے دیکھا مرے صبر کا تماشا تو نے
قصاب کی رُوح جس ترازو میں تُلے شاعر کا بھی دل اسی میں تولا تو نے

جمیل نے انسان اور خدا کے رشتے کو غیر اطمینان بخش پایا اور اس ضمن میں اُن کو شکوہ ہے تو خدا سے، انسان سے نہیں۔ وہ انسان کی سادگی اور فریب خوردگی پر ماتم کناں ہیں۔ یہ سادگی اور فریب خوردگی اجتماعی بھی ہے اور انفرادی بھی جمیل کی رومانی شاعری میں یہی سادگی اور فریب خوردگی اکثر موردِ الزام ہوتی ہے ؎

جہاں ہوا تیز چل رہی تھی وہاں چراغِ وفا جلایا
کسی کا شکوہ نہیں جہاں میں شہید ہوں اپنی سادگی کا
بنا کے اک جنتِ تخیّل طلسم باندھا تھا رنگ و بو کا
لگائی دُنیا نے ایسی ٹھوکر اُچٹ گیا خواب آرزو کا

اسے اجتماعی طور پر ان رباعیوں میں دیکھئے ؎

اے عالمِ کیف وکم کی رونق انسان ہے کون سُنے جو تری ہو حق انسان
یہ کس کو پکارتا ہے رو رو کر تو احمق انسان ہائے احمق انسان

سنتے ہیں کہ عرش تک دُعا جاتی ہے آتی نہیں لوٹ کر تو کیا جاتی ہے
دیتا ہے خدا کی جب دہائی انساں تاروں کی آنکھ ڈبڈبا جاتی ہے

گویا شاعری کی فضا اپنی ہی شکست کی ایک آواز ہے۔ جمیل کی شاعری کا ایک مخصوص مزاج ہے۔ اس میں فلسفے اور شعر کی بڑی آمیزش ہے۔ اس مزاج کو یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ ان کی غزلوں میں نہ تو صرف دل کی باتیں ہوتی ہیں اور نہ صرف دماغ کی بلکہ وہ چیز ہوتی ہے جسے میں نے تفکّر اور احساس کا امتزاج کہا ہے۔ وہ نہ تو صرف نظر کی چوٹ کھا کر دردِ جگر کے اظہار پر اُتر آتے ہیں اور نہ خلا میں تخیّل کے گھوڑے دوڑا کر زمینِ شعر میں خاک اُڑاتے ہیں۔ شاعر پہلے کسی جذبے اور احساس سے متاثر ہوتا ہے۔ اور اس کا فلسفیانہ مذاق اسے خالص فلسفے کے پیکر میں ڈھال دیتا ہے جس سے شعر کا لب ولہجہ بھی بدل جاتا ہے اور اس میں ایک خاص قسم کی عظمت اور شکوہ پیدا ہو جاتا ہے ؎

بعد بہ پیمانۂ تخیل سرود ہر دل میں ہے خودی کا

اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

اندیشہ ہائے فردا شاعر کی زندگی میں   بادل کے چند ٹکڑے بکھرے ہیں چاندنی میں

ہستی ہے جدائی سے قائم جب وصل ہوا تو کچھ بھی نہیں

دریا سے اگر ہوتا نہ جدا قطرہ کیوں کر قطرہ ہوتا

کسی آستانۂ ناز پر بڑی ذلتوں سے ادا ہوا

وہ جو قرض تھا تری بندگی کا مری جبینِ نیاز پہ

اُجالے کے پجاری مضمحل کیوں ہوں اندھیرے سے

کہ یہ تارے نکلتے ہیں تو سورج بھی اُگلتے ہیں

ان چند اشعار پر منحصر نہیں تفکر اور احساس کا لطیف امتزاج ان کے کلام کی مستقل خصوصیت ہے۔ فلسفیانہ تیور ہر جگہ ملتے ہیں۔ "مالن کی بیٹی" پر نظم لکھی جا رہی ہے۔ پھول اور کلیوں کی زبان میں سحر طرازیاں ہو رہی ہیں ؎

جبیں جبیں کے پرو دیتی جاتی ہے دھاگے میں شگفتہ کلیوں کو

دھاگا جو اُلجھ جاتا ہے کبھی ماتھے پہ شکن پڑ جاتی ہے

ایسی ہی رنگا رنگ تصویریں پیش کی جا رہی ہیں کہ شاعر کی فکر کا مخصوص زاویہ سامنے آجاتا ہے ؎

منظر پہ اداسی چھانے سے گلشن میں خزاں آجانے سے

اور پھولوں کے مرجھانے سے دنیا کو سمجھتی جاتی ہے

ایک مخصوص ماحول اور فضا سے فلسفۂ حیات کو اخذ کر لیا۔ نظم "عروسی" لکھی جا رہی ہے ؎

شفق گویا حنائے نو عروسی کا ہے افسانہ   سہانی رات آئی زلف میں کرتی ہوئی شانہ

چلی آتی ہے عطرِ نو عروسی کی لپٹ بھینی   یہ عالم ہو تو پھر کیونکر نہ مچلے ذوقِ گلچینی

کہ پھر دہی مزاج نظم کی فضا پہ چھا جاتا ہے ؎

بنایا دل نے جب قیدِ محبت کو بھی معیادی   تمدن نے بنا اک دام جس کا نام ہے شادی

پرافشانی کی لذت چھین کر صیدِ پرافشاں سے   ملایا سلسلہ اس دام کا سر رشتۂ جاں سے

پالنے میں سوئے ہوئے چھوٹے سے "گلو بابو" ہمارے سامنے یوں آتے ہیں ؎

یہ چھوٹے سے گلّو بابو جو گود میں ماں کی سوتے ہیں

دو کام بس ان کو آتے ہیں یا روتے ہیں یا سوتے ہیں

پھر اُن کی یہ تصویر سامنے آتی ہے ؎

اس ننھی سی چنگاری میں تاثیر کی سوتی دنیا ہے

احساس کا برقی پیکر ہے جذبات کا خاکی پتلا ہے

موضوع کے اعتبار سے ایک بات تو کہنی رہ ہی گئی اور یہ ایک ضروری کڑی ہے۔ فانی کا مشہور شعر ہے ؎

غم کے ٹھوکے کچھ ہوں بلا سے ہم کو جگا تو جاتے ہیں

ہم ہیں ایسے نیند کے ماتے جاگتے ہی سو جاتے ہیں

لیکن جمیل مظہری "جاگتے ہی پھر نہیں سو جاتے"۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کے فلسفے خصوصاً مطالعۂ حیات میں قنوطیت اور مایوسی ہے۔ تخلیق سے وہ مطمئن نہیں ؎

ہم کون ہیں ہم کیا ہیں۔ اک قطرۂ لرزاں ہیں۔ جو برگِ گلستاں پر، یا خارِ بیاباں پر۔ کچھ دیر چمکتا ہے۔ خورشید درخشاں کی بے چین شعاعوں سے، پُر شوق نگاہوں سے، ڈرتا ہو جھجکتا ہو...... وغیرہ

لیکن مطالعۂ حیات کا ردِ عمل شاعر کو نہ صرف تصوف کی طرف مائل کرتا ہے اور نہ پاؤں توڑ کے بیٹھ رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ "جہاں اس کا نہیں ہے" وہ "فکرِ جہاں" کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور عمل کے پیغاموں سے مردہ رگوں میں خونِ حیات دوڑاتا ہے۔ جمیل کی دو نظمیں بعنوان "نالۂ جرس" اس ذیل میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان میں ایک "کاروانِ حریت" کے لئے ہے اور دوسری "کاروانِ ارتقاء کے لیے"۔ ایسی رواں دواں نظمیں اردو میں بہت کم لکھی گئی ہیں۔ عام طور پر رٹے رٹائے ہوئے نعرے ہوتے ہیں۔ شدتِ احساس کا فقدان ہوتا ہے۔ جمیل کی دونوں نظموں میں بلا کی روانی اور گرمی ہے ؎

۱۔ برادرانِ نوجواں عزیزِ کارواں ہو تم   جہانِ پیر کے لئے شبابِ جاوداں ہو تم

بہ نقشِ پائے آسماں بڑھے چلو بڑھے چلو

قسم تمہارے عزم کی، فدا تمہاری شان کے   بڑھا کے ہاتھ توڑ لو ستارے آسمان کے

جھکا دو شاخِ کہکشاں بڑھے چلو، بڑھے چلو

۲۔ ابھی حیات مانگتی ہے بھیک آفتاب سے   ابھی تو خاک لے رہی ہے زندگی سحاب سے

ابھی تو یہ زمیں ہے زیرِ آسماں بڑھے چلو

جلاؤ چاند کا دیا عمل کی بارگاہ میں   بچھاؤ بادلوں کا فرش زندگی کی راہ میں

اڑاؤ دامنِ ہوا کی دھجیاں بڑھے چلو

اول الذکر اقتباس "نالہ جرس کاروانِ حریت کے لئے" سے ہے۔ اور

مؤخرالذکر "نالۂ جرس کاروانِ ارتقاء کے لئے" سے۔ ان میں نہ تو لفاظی ہے نہ خواہ مخواہ کی گھن گرج، ایک چونکا ہوا بیدار شعور نظموں کی فضا پر حاوی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ نظم ہنگامی نہیں۔ اس میں محض وقت کی پکار نہیں، سیاسی، ملی اور انقلابی نعرہ نہیں بلکہ اس میں ایسا مطالبہ ہے جو دوامی ہے۔ ایک نہ ختم ہونے والی جاودانی پکار ہے اور ہر دور کے انسان کے لئے "ارتقاء اور عمل کا پیغام ہے۔ کاروانِ ارتقاء کے لئے جو نظم لکھی گئی ہے وہ زمان و مکان دونوں قیود سے بالاتر ہے۔ اپنی نظم "آدم نو" میں زندگی کا کتنا پرشکوہ اور باعظمت تصور پیش کیا ہے:

یہ مہر تاباں سے کوئی کہہ دے کہ اپنی کرنوں کو گن کے رکھ لے
میں اپنے صحرا کے ذرے ذرے کو خود چمکنا سکھا رہا ہوں
مرا تخیل، مرے ارادے کریں گے فطرت پہ حکمرانی
جہاں فرشتوں کے پر ہیں لرزاں میں اس بلندی پہ جا رہا ہوں

جمیل کو اپنے وقت کے جملہ تقاضوں کا بھی احساس ہے۔ ان کا شعور اور احساس بیدار ہے:

اس انجمن میں ہر ایک دل پر فنا کی افسردگی ہے طاری
جمیل مدفن کی خاموشی میں بس اپنی بنسی بجا رہا ہوں

یہ محض تعلّی نہیں جمیل نے واقعی عمل کے گیت گائے ہیں۔ اخوت اور محبت کا پیغام دیا ہے۔ دعوتِ عزم پیش کیا ہے:

اک آگ لگی ہے دنیا میں گرد اڑتی ہے لو چلتی ہے
مغرب سے لے کر مشرق تک آدم کی کھیتی جلتی ہے
اس آگ کے شعلے تھام چکے بھارت ماتا کے آنچل کو
امید کی نظریں ڈھونڈتی ہیں رحمت کے برستے بادل کو
اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے رحمت کی گھٹا بن جاؤ تم
رحمت کی گھٹا بن جاؤ تم شاعر کی دعا بن جاؤ تم
وہ عزم مزاجِ آہن خود جس کے سانچے میں ڈھلتا ہے
وہ عزم کہ جس کی گرمی سے تلوار کا لوہا گلتا ہے

کتنے چونکے چونکے سے احساسات ہیں۔ ان میں زندگی کا بھرپور احساس ہے۔ جمیل نے قدیم شاعری کی ازکار رفتہ باتوں کو اپنے یہاں مطلق جگہ نہیں دی۔ گل و بلبل کی باتیں ان کے یہاں نہیں۔ شعری معروضات سے وہ مانوس نہیں شاعر اپنے دور کی زندگی سے بیگانہ نہیں۔ نہ اس کے یہاں فراری ذہنیت ہے نہ ایک "دنیائے خواب" بسانے کی آرزو۔ اپنی نظم "شاعر سے" میں اپنے طبقے کو یہ مشورہ دیا ہے:

قصۂ پارینۂ اہلِ تمنا کب تلک — یعنی شرحِ تارِ تارِ زلفِ لیلیٰ کب تلک
کب تلک آخر یہ افسانہ جمالِ یار کا — سونے والے دیکھ تو کیا رنگ ہے گلزار کا

جمیل کی شاعری کا ذکر نامکمل رہے گا اگر ان کے رومانی کلام کا جائزہ نہ لیا جائے۔ مجموعی طور پر ان کی رومانی شاعری کی فضا، اس کا ماحول اس کا پس منظر وہی ہے جو "شکست و فتح"[ل] کا ہے۔ وہی جنون اور خرد کی جنگ، عشق اور فلسفے کا تصادم۔ دل اور دماغ کی تحریر عشق کی چنگاریوں پہ فلسفے کی راکھ۔ کتابِ محبت میں زنجیروں کا فلسفہ۔ وہی سلیمیٰ جو "شکست و فتح" میں نظر آتی ہے۔ ان کی بیشتر نظموں مثلاً "عشقِ ناتمام"، "ادھوری کہانی"، "ان کی فریاد" وغیرہ میں جلوہ گر ہے۔ ان کی عشقیہ شاعری ایک عجیب Complex ہے۔ سلیمیٰ ایک ایسی ہستی ہے جو بیک وقت دل اور دماغ، جنون اور خرد دونوں کی محکوم ہے۔ وہ ایک مجبور مختار ہستی ہے۔ "شکست و فتح" اسی کے قلم سے نکلی ہوئی ایک داستان ہے جسے اس نے اس وقت قلمبند کرنا شروع کیا جبکہ سہاگ کے پھول مرجھا چکے تھے۔ سہاگ اجڑ چکا تھا۔ زندگی اپنی پوری لڑائی ختم کر چکی تھی۔ "ان کی فریاد" کے عنوان سے ایک نظم میں بیوہ کے تاثرات ملاحظہ کیجئے:

ادھر ادھر نظر اٹھے تو سامنے تم ہو
ہلیں ہوا سے جو پردے تو سامنے تم ہو
کروں خدا کو جو سجدے تو سامنے تم ہو
نماز میں نہ ستاؤ۔ ڈرو خدا سے ڈرو۔ مجھے نہ یاد کرو

جو پاس چولھے کے اماں کے ڈر سے جاتی ہوں
تو خود بھی جلتی ہوں سالن کو بھی جلاتی ہوں
نمک سمجھ کے شکر دال میں ملاتی ہوں
نہ یوں دوانہ بناؤ۔ ڈرو خدا سے ڈرو۔ مجھے نہ یاد کرو

یہی مطالبہ ان کی رومانی شاعری کی پوری فضا پر حاوی ہے۔ ان کی عشقیہ شاعری میں "دو دونوں کا مسئلہ نزاعِ عشق و عقل" ہے۔ جذبات کا کھلنڈراپن نہیں ہے

ل یہ جمیل مظہری کی انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے۔ اس افسانے میں عشق اور زندگی سے متعلق بڑے دلچسپ فلسفیانہ مباحث آئے ہیں۔ (ا-ک)

محرومی اور مجبوری کی کہانیاں نہیں ہیں۔ خودی اور خودداری کی جھلک ہے۔

مجھے یہ وہم دل سے دور ہو گی پاس آکے تم — تم سوچتی رہیں قدم بڑھا بڑھا کے تم
نتیجہ یہ ہوا کہ شوق پا سکا نہ کھو سکا — تمہیں وفا نہ آسکی مجھے جنوں نہ ہو سکا

اور یہ سب عقل کی کارفرمائی ہے ؎

بُرا ہو عقل کا کہ عشق کے مزے نہ آسکے — نہ تم فریب کھا سکیں نہ ہم فریب کھا سکے

ان کی رومانی نظمیں ایک Unit ہیں۔ "عشقِ ناتمام" کے چار پانچ اشعار سنئے اور عشق کے اس انجام کو دیکھئے جو بیک وقت کامیاب و ناکامیاب دونوں ہے کیا یہ "شکست و فتح" کی سیلی کی آواز معلوم نہیں ہوتی ؎

حقیقتیں تھیں تلخ اس جہانِ اعتبار کی — ملا سکی نہ زندگی مٹھاس اس میں پیار کی
مزاجِ عشق طرحِ عاشقانہ مانگتا رہا — کہانی مانگتا رہا۔ فسانہ مانگتا رہا
مگر شکن یہ ابروئے زمانہ ہم نہ بن سکے — کہانی ہم نہ دے سکے فسانہ ہم نہ بن سکے

جب دیوانہ خود ہی زنجیروں سے مانوس ہو جائے تو پھر چارۂ کار کیا ہے لیکن احساس کی خلش چین لینے نہیں دیتی ؎

جوانی ایک چھاؤں تھی گذر گئی نکل گئی — ہمارا انتظار کر کے دوپہر بھی ڈھل گئی

اور نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ؎

طبیعتِ نیاز و نازِ تشنہ کام رہ گئی — وہ داستاں جو بن رہی تھی ناتمام رہ گئی

اور یہی ادھورا پن ان کی اس قسم کی تمام نظموں پر حاوی ہے۔ جمیل کی عشقیہ شاعری ایک چونکتے ہوئے سے کچے خواب سے مشابہ ہے۔ آہ و نالہ اور گریہ وزاری نہیں ہے بلکہ فلسفیانہ سوگواری ہے جس نے شعر کا جامہ پہن کر حساس دلوں کے لئے ایک قیامت برپا کر دی ہے۔

جمیل کی نظم "عورت"۔ "دخترِ بنگالہ"۔ "شاہدِ بازار سے" خاص طور پر لائقِ ذکر ہیں۔ "شاہدِ بازار سے" کے حسبِ ذیل اشعار شاعر کے نظریۂ حسن اور فلسفۂ عشق پر پوری روشنی ڈالتے ہیں ؎

زخمِ افکارِ جہاں کے لئے مرہم ہے حسن — غنچۂ دل کے لئے قطرۂ شبنم ہے حسن
جلوۂ شمع بھی ہے سوزشِ پروانہ بھی — حسن کا کام تڑپنا بھی ہے تڑپانا بھی
ہے مزا قیدِ تعلق میں غم و شادی کا — اسی زنجیر میں کچھ لطف ہے آزادی کا
فطرتِ حسن ہے چھپ چھپ کے نمایاں ہونا — اس کو زیبا ہے چراغِ تہِ داماں ہونا

الفاظ کا انتخاب اور مفہوم کے ساتھ ان کا مکمل آہنگ کس درجہ دلپذیر ہے۔ فن کا رکھ رکھاؤ، تشبیہہ کا حسن، بیان کی دلکشی ان کے تمام کلام میں موجود ہے۔ یوں تو جمیل کے یہاں پیٹی پٹائی اور فرسودہ روایاتی باتیں سرے سے نہیں ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ انھوں نے اُردو شاعری میں کچھ نئے حسین تجربے بھی کئے ہیں کچھ نئی راہیں نکالی ہیں جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں ؎

کچھ نہ جمیل اُردو کا سنگار اب ایرانی تلمیحوں سے
پہنے گی بدیسی گہنے کیوں یہ بیٹی بھارت ماتا کی

"پریم بان"۔ "پریم رس"۔ "پریم گیتا" کے عنوانات سے ان کے تاثرات اکثر و بیشتر شائع ہوتے رہتے ہیں جن میں انھوں نے اردو اور ہندی دونوں سہیلیوں کو گلے سے لگایا ہے۔ ہندی تغزل کو اُردو کے بھیس میں بڑے حسن کے ساتھ پیش کیا ہے۔

پوچھو اُس عورت کے دل سے جس کا پیتم پردیس میں ہو
کیوں شام سے مرجھائی رہتی ہیں کلیاں اس کے مالا کی
مت ناؤ اُدھر لے جا مانجھی اس گھاٹ کو میں پہچانتا ہوں
پھونکی تھی وہیں پر میں نے چتا اپنی مرحوم تمنا کی
ساون میں پھٹی پڑتی ہے سکھی، فطرت کی جوانی تیری طرح
جو شاخ ہے لچکی جاتی ہے جو پیڑ ہے جھوما جاتا ہے
سر سے آنچل ڈھل آیا ہے پنگھٹ پر گگری رکھی ہے
اک چپ سی لگی ہے رادھا کو اور سورج چھپتا جاتا ہے
کھڑی ہے مندر میں اک حسینہ سیاہ جوڑا کھلا ہوا ہے
نشیلی آنکھوں میں اک تمنا کنوارے ہونٹوں پہ اک دعا ہے
نہا نکھر کر ہماری رادھا نے آج پہنی ہے دھانی ساری
لٹیں ہیں شانوں پہ بھیگی بھیگی کہ کھیت پر ابر جھومتا ہے

ہندی اور اُردو کا یہ ملاپ، عذرا اور رادھا کا یہ بہناپا کتنا حسین ہے۔ ان نغموں میں تازگی اور شادابی ہے۔ سکون اور ٹھنڈک ہے۔ ہندوستان ان میں جلوہ گر ہے۔ ان میں کوملتا، نرمی اور رس ہے۔ ان نغموں میں گراموفون ریکارڈ کی آواز نہیں۔ سکوتِ شب کی بانسری کی جانگداز لے ہے۔

جمیل مظہری کا ایک مخصوص مکتبۂ فکر ہے۔ ان کا اپنا طرز ہے اور اپنی انفرادیت میں نے کوشش کی ہے کہ اس مقالے میں ان کی فکر کے تمام نمایاں پہلو سامنے آجائیں۔ ان کی شاعری کے مرتبے کا تعین ان فن پاروں سے ہو جاتا ہے جنہیں میں نے بطور حوالہ پیش کیا ہے اور اس نیت سے پیش کیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مثالیں ایک جگہ جمع ہو جائیں۔ تاکہ جمیل مظہری کی شاعری کی پوری نمائندگی ہو جائے۔

پرکاش چند رکھنہ

معزول بادشاہ فاروق

ایک گمنام جنرل محمد نجیب نے پچھلے مہینے مصر کے بادشاہ فاروق کو اپنے سات ماہ کے لڑکے کے حق میں تخت سے اُتر جانے پر مجبور کر دیا — اس سے دنیا کے معزول شدہ بادشاہوں کی فہرست میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا۔ فاروق کو صرف ۶ گھنٹے کی مہلت دی گئی۔ وہ اپنی بیوی۔ بچہ بادشاہ احمد فواد دوم اور تین لڑکیوں کو لے کر شاہی جہاز "محروسا" میں سوار فاروق اپنی جلاوطنی کے لئے روانہ ہو گیا۔ وہ اب بھی اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھ سکتا تھا۔ مصر نے حالانکہ بادشاہ کو نکال دیا لیکن بادشاہت قائم رکھی۔ اس کے علاوہ اُسے اپنے ساتھ دولت اور سامان سے بھرے ہوئے دو صد سے اوپر ٹرنک لے جانے سے نہیں روکا گیا۔ لیکن جب شاہی جھنڈے کو آخری بار اُتار کر فاروق کے حوالے کیا گیا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کے برعکس لوگ خوش تھے۔ سکندریہ اور قاہرہ کی سڑکوں پر فوجیوں کا تالیوں اور نعروں سے استقبال کیا جا رہا تھا۔ سولہ سال پہلے جب فاروق بادشاہ بنا تھا تو لوگوں نے اسی طرح خوشیاں منائی تھیں۔ اُس وقت اپنے نوجوان بادشاہ سے اُن کی بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ لیکن اس مدت میں بادشاہ کی طبیعت میں عیاشی گھر کر چکی تھی۔ عیش و عشرت و آرام کی زندگی میں پڑ کر شاہ فاروق اپنی ۳۲ سال کی عمر سے زیادہ بوڑھا معلوم ہونے لگا تھا۔ حکومت کے معاملات نے نہایت نا صورت اختیار کر لی تھی۔ مصری کسانوں کی حالت روز بروز خراب ہو رہی تھی۔ امیر یا شا طبقہ زیادہ تر نا مناسب طریقوں سے اور بھی امیر ہو رہا تھا۔ ملک مالی طور پر دیوالیہ ہو چکا تھا۔ اور حکومت کا انتظام اور سیاسی زندگی بے ایمانی سے بھرپور تھی۔ سارا ملک عرب اسرائیل جنگ میں ذلت آمیز شکست سے شرمسار تھا۔ اس جنگ میں اسرائیل کی تھوڑی سی فوجوں نے عرب فوجوں کو جن کا ایک بڑا حصہ مصری فوجوں پر مشتمل تھا شکست دی تھی۔ فوجی افسر اس شکست کا باعث یہ بیان کرتے تھے کہ میدان جنگ میں اُنھیں نکمے ہتھیار اور نہ چلنے والا بارود مہیا کیا گیا تھا۔ شاہی محل کا اس بدنام حرکت میں حصہ بیان کیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود غیر جانبدارانہ تحقیقات کو فاروق نے ہر طرح سے دبانے کی کوشش کی۔ پچھلے جنوری کے فسادات کے بعد حالات اور بھی خراب ہو چکے تھے۔ اور ۶ ماہ کی مدت میں کئی وزارتیں بن اور بگڑ چکی تھیں۔ یہ تھے حالات جن میں بغاوت ہوئی اور فاروق کو تخت چھوڑنا پڑا۔

فاروق اس وقت کیپری میں مقیم ہے۔ کیپری اٹلی کا ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ وہ وہاں مطمئن اور خاموش زندگی گزارنے کا خواہش مند ہے —— اخبار نویسوں سے بات چیت کے دوران میں فاروق نے کہا کہ مجھ پر سب سے بڑی مہربانی یہ ہوگی کہ میرے اور میرے بیوی بچوں کے ساتھ عام لوگوں کی طرح سلوک کیا جائے۔ اُس نے کہا کہ میں اب کوئی امیر آدمی نہیں ہوں (فاروق کا شمار دُنیا کے چند بڑے امیر آدمیوں میں ہوتا تھا) یہ غلط ہے کہ میں مصر سے کوئی بڑی دولت اپنے ساتھ لایا ہوں اور نہ ہی میرے پاس کوئی چھپا ہوا خزانہ ہے۔ میرا لڑکا اور تین لڑکیاں ہی میرا خزانہ ہیں۔ اور وہ میرے ساتھ بڑی سادہ زندگی گزاریں گے۔ معلوم ہوتا ہے فاروق نے صدمے کو حوصلے کے ساتھ برداشت کیا ہے۔ اس نے اخبار نویسوں سے کہا کہ میرے یہ کہنے پر کہ میں امیر نہیں ہوں تم ہنس رہے ہو گے۔ لیکن جس شخص کے پاس اتنی دولت رہی ہو اُس کے لئے یہ غریبی ہی ہے۔ فاروق نے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میری بیوی اور مجھ پر جو گزری ہے اس سے ہماری زندگی میں تلخی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ یہ پچھلے چند روز ہمارے لئے فکر اور تشویش سے بھرے ہوئے تھے۔ لیکن اب ہم اس دَور سے گزر چکے ہیں۔ اور صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں نئی زندگی کو آزادی سے گزارنے

کی اجازت دی جائے ۔

ادھر مصر میں حالات بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں ۔ جنرل نجیب نے اعلان کیا ہے کہ وہ سیاسی معاملات میں دخل نہیں دے گا اور اُس کی صرف یہ خواہش ہے کہ حکومت کے انتظام میں "تطہیر" کی جائے ۔ اُس کے بعد وہ حکومت کا انتظام سیاست والوں پر چھوڑ دینا چاہتا ہے ۔ لیکن اصل طاقت اِس وقت جنرل نجیب کے ہاتھوں میں ہے اور مصر کے آئندہ واقعات کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ وہ اُن اختیارات کا کس طرح استعمال کرتا ہے ۔ موجودہ وزیر اعظم علی مہر پاشا ایک آزاد سیاست داں ہے جو جنرل نجیب کی امداد سے وزیر اعظم بنا ہے ۔ لیکن مصر کی سب سے بڑی پارٹی وفد پارٹی ہے ۔ وفد پارٹی کے لیڈر بے ایمانی اور رشوت خوری کے لئے بدنام ہیں ۔ اور "ہتھیاروں کے معاملے" کو دبانے میں اُن کا ہاتھ بیان کیا جاتا ہے ۔ علی مہر نے وفد کے رہنماؤں کو جو کہ یورپ میں موسم گرما کی تعطیل کے لئے گئے ہوئے تھے واپس بُلا لیا ہے ۔ اور وہ اب حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے لئے بے قرار ہیں ۔

وفد کے رہنما نحاس نے اعلان کیا ہے کہ میری پارٹی کا بڑا مقصد "قابض فوج (Occupation Forces) کو نکالنا اور مصر و سوڈان کا الحاق کرانا ہے ۔ اُس نے کہا کہ وفد اب ملک کو آزاد کرانے اور وادی نیل کا اتحاد کرنے کے لئے تیار ہو رہا ہے ۔ کیونکہ صرف وفد ہی ملک کی اصل نمائندہ پارٹی ہے ۔ اس اثنا میں وزیر اعظم علی مہر مصر کی سیاسی پارٹیوں کو درست اور پارلیمنٹری زندگی کے لئے مضبوط پروگرام بنانے کا مشورہ دے رہے ہیں ۔ اور سب پارٹیوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنی "تطہیر" اور اصلاح کریں ۔ جس طرح سے سیاسی پارٹیاں بے ایمان عنصر کو اپنی جماعتوں سے خارج کر رہی ہیں اُس سے جنرل نجیب خوش نہیں ہے ۔ اُس کے خیال میں جمہوری حکومت کے لئے مکمل "تطہیر" سب سے پہلی ضرورت ہے ۔ اُنھوں نے کہا ہے کہ اس مطلب کے لئے ہو سکتا ہے مجھے بذریعہ حکومت سخت دھمکی دینی پڑے ۔ وفد کے اپنے چند لیڈروں کو نکالنے کا ذکر کرتے ہوئے جنرل نجیب نے کہا کہ ایک بڑا نقصان وہ گروہ ابھی تک جُوں کا تُوں ہے ۔ اُس کا اشارہ نحاس ۔ وفد کے جنرل سکرٹری جنرل سراج الدین اور وفد کے دوسرے بڑے لیڈروں کی طرف تھا جنھیں وہ سیاسی زندگی سے نکال دینا چاہتا ہے ۔

اگر جنرل نجیب اختیارات کو اپنے ہاتھوں میں نہ رکھنا چاہے تو اس صورت میں جلد ہی عام چناؤ ہوں گے جس میں وفد کو لازمی طور پر کامیابی ہوگی لیکن نجیب شاید یہ پسند کرے کہ فی الحال حکومت علی مہر کے پاس رہے ۔ تاکہ وفد کے لیڈر حکومت کے حالات کو درست کر سکیں ۔ اور بے ایمان و رشوت خور طبقے سے ملک کو پاک کر دیں ۔ اس صورت میں غالباً چناؤ نا معلوم عرصے کے لئے ملتوی کر دئے جائیں گے ۔ موجودہ پارلیمنٹ کو جس میں وفد کی اکثریت ہے بُلانے کا بھی بہت کم امکان ہے ۔ موجودہ رجحان کے مطابق نجیب کو جو بھی چاہے لوگوں کو اس کے لئے رضامند کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہوگی نجیب نے اس بات کی تردید کی ہے کہ وہ فوجی ڈکٹیٹر شپ قائم کرنا چاہتے ہیں ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ اگر مصر کی پارٹیاں اپنی مکمل تطہیر کرنے میں ناکام رہیں تو شاید اس رائے کو اختیار کرنا ضروری ہو جائے ۔ نجیب فوج کو مضبوط اور سیاسی زندگی کو پاک بنانا چاہتا ہے ۔ طاقت اس وقت فوج کے پاس ہے جو کہ اُس کے قابو میں ہے ۔ ان حالات میں وثوق کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا ۔

مصر میں بغاوت بڑی تیزی کے ساتھ کامیاب ہوئی ۔ انتہائی غریبی میں زندگی بسر کرنے والے لوگ ایسی حکومت چاہتے تھے جو کہ اُن کی حالت کو بہتر بنا سکے ۔

بغاوت کی کہانی کی ابتدا عرب اسرائیل جنگ سے شروع ہوتی ہے ، جب کہ مصر کی فوجوں کو شکست ہوئی ۔ اس شکست کی کئی وجوہ بیان کی گئیں ۔ عرب فوجوں میں باہم اتحاد کی کمی ۔ فوجی افسروں کی ذاتی رنجشیں ۔ نالائق فوجی لیڈر شپ ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ لیکن میدانِ جنگ سے آنے والے سپاہی ایک اور وجہ بیان کرتے تھے ۔ اُنھیں جو بارود دیا گیا تھا وہ نکما تھا ۔ سپاہیوں کو دئے ہوئے ہتھیار کام نہیں کرتے تھے ۔ دشمن پر پھینکے گئے گولے پھٹتے تک نہیں تھے ۔ ان میں سے کئی کانا پھُوسی کرتے رہے ۔ کئی دوسروں نے کھُلے عام الزام لگانے شروع کر دئے ، اور مطالبہ کیا کہ تحقیقات ہونی چاہئے ۔ جلدی ہی یہ مصر کے لوگوں کا سب سے بڑا مطالبہ بن گیا ۔ شاہی محل نے ہمیشہ اس مطالبے کو پولیس اور دوسرے ذریعوں سے دبانے کی کوشش کی ۔ اس سے بادشاہ کی شہرت کو بہت دھکا پہنچا ، اور اس کی ہر دل عزیزی گھٹنے لگی ۔ لوگوں کو یقین ہو گیا

کہ کسی نہ کسی طرح فاروق اور اس کے مصاحب بھی اس بدنام سودے میں شامل تھے۔

جنوری ۱۹۵۰ء میں انتخابات کے بعد جب وفد حکومت قائم ہوئی تو محمد عجمی سرکاری وکیل کو اس واقعے کی تحقیقات کے لئے کہا گیا۔ اُسے اس کام میں ۷ ماہ لگے۔ ۱۹۵۰ء کے آخر میں اخباروں نے اس امر کی افواہیں پھیلانی شروع کر دیں کہ تحقیقات کے مطابق کئی بڑے بڑے سیاسی لیڈر اور فوجی افسر اس "بدنام واقعہ" میں شامل تھے۔ جن میں کئی شاہی مصاحب بھی ہیں۔ وفد لیڈروں نے بادشاہ سے اپنے پرانے بگڑے ہوئے تعلقات کو سنوارنے کے لئے اور اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کے لئے ایک گندی حرکت کی۔ وفد کابینہ نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ سرکاری وکیل کو برخاست کر دیا جائے۔ اس کے بعد حکومت نے چند معمولی لوگوں اور فوجی افسروں کی ایک فہرست شائع کی جنھیں اس "بدنام واقعہ" کے لئے ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ یہ اصلی لوگوں کو بچانے کا ایک طریقہ تھا۔ باقی تمام شہادت کو دبا دیا گیا۔ جو کہ زیادہ تر شاہی مصاحبوں کے خلاف تھی۔ لیکن اس طرح وفد نے اپنے آپ کو بھی اس "بدنام واقعہ" میں لپیٹ کر اپنے نام پر سیاہ دھبہ لگا لیا۔

"اسلحہ کا معاملہ" سیاسی زندگی میں رشوت خوری اور کسانوں میں بڑھتی ہوئی بے چینی نے ایسا ماحول پیدا کر دیا جو کہ بغاوت کے لئے بہت موافق تھا۔ فوجی افسروں میں خاص طور پر بغاوت کے آثار ظاہر تھے۔ ۱۹۵۰ء میں جب شاہ فاروق یورپ کی سیاحت سے واپس آئے تو چند مخالف (اپوزیشن) پارٹیوں نے ایک درخواست میں اُنہیں آگاہ کیا کہ رعایا کی برداشت کی حد ہو چکی ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ ملک میں بغاوت ہو جائے گی جو کہ نہ صرف ناانصاف لوگوں کو تباہ کر دے گی بلکہ ملک کو اقتصادی، اخلاقی اور سیاسی طور پر دیوالیہ بنا دے گی۔ اس درخواست پر سعادت۔ لبرل نیشنلسٹ۔ کونسلسٹ اور دوسرے لیڈروں کے دستخط تھے۔ درخواست میں مطالبہ کیا گیا کہ قانون کا نئے سرے سے احترام کیا جائے اور ملک کو نقصان پہنچانے والوں کو نکال دیا جائے۔

فوجی افسروں کا نوجوان طبقہ خاص طور پر ناخوش تھا۔ وہ فوج اور ملک میں اصلاح کرنے کے لئے بیتاب تھا۔ رشوت خوری اور بے ایمانی کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔ اس گروہ کا لیڈر تھا جنرل نجیب۔ پچھلے سال دسمبر میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے اصلی حالت کا اظہار کیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے حالات کی سنجیدگی کو اچھی طرح نہیں سمجھا۔ فوجی افسروں کے کلب کے صدر کا چناؤ تھا۔ اس عہدہ کے لئے عموماً کمانڈر ان چیف کو چنا جاتا تھا۔ لیکن افسروں نے فیصلہ کیا کہ وہ اس بار جنرل نجیب کو منتخب کریں گے، کمانڈر ان چیف حیدر پاشا جسے کہ بادشاہ کی مصاحبت بھی حاصل تھی، کو نظرانداز کر کے جنرل نجیب کو چن لیا گیا۔ بادشاہ ناراض ہو گیا۔ جب نجیب نے مصری معاملات کے مطابق کلب کے خیالات کا کھلے عام اظہار کرنا شروع کر دیا تو شاہی حکم سے کلب بند کر دیا گیا۔ اس طرح تناؤ بڑھ گیا۔

وزیر اعظم سری پاشا نے موجودہ حالات میں فوجی بغاوت کے خطرے کو بھانپ کر اس سال ماہ جولائی میں یہ تجویز کی جنرل نجیب کو وزیر جنگ مقرر کر دیا جائے۔ بادشاہ نے اس تجویز کو رد کر دیا۔ کیونکہ وہ کسی ایسے شخص کو جو ذاتی طور پر اس کے اتنا خلاف ہو ایسے عہدے پر رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ فاروق کی نظر تھی اپنے بہنوئی اسمٰعیل شیرین پر۔ لیکن سری پاشا جانتا تھا کہ اسمٰعیل شیرین ہر دل عزیز ہونے پر بھی اس عہدے کے لئے فوج کو منظور نہیں ہوگا۔ (اسمٰعیل شیرین کی شادی شہزادی فاذیہ کے ساتھ شاہ ایران سے طلاق دیئے جانے کے بعد ہوئی تھی) اس کے علاوہ وزیر مال کے عہدے کے متعلق بھی فاروق اور سری پاشا میں اختلافات تھے۔ سری پاشا نے بغیر کابینہ کو مکمل کئے استعفیٰ دے دیا۔ بادشاہ نے ہلالی پاشا کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔ ہلالی پاشا نے وزیر جنگ اور مال کے عہدوں پر بادشاہ کے تجویز شدہ اشخاص کو رکھ لیا۔

چوبیس گھنٹوں کے اندر ہی نتیجہ نکل گیا۔ فوجی افسروں نے جنرل نجیب کی رہنمائی میں یہ فیصلہ کیا کہ اب برداشت کی حد ہو چکی اور نجیب کے لئے ذاتی طور پر بھی بہت خطرہ تھا۔ شاہی ناراضگی کا شکار بننے کے بعد اُسے کسی دور دراز ریگستانی چوکی پر لگائے جانے کا ڈر تھا۔ شاید یہ تجویزیں پہلے سے ہی تیار تھیں۔ کیونکہ جیسا کہ حالات نے بعد میں ثابت کیا بغاوت بنا کسی رکاوٹ کے آسانی سے کامیاب ہوئی۔ صبح سویرے ہی فوجی دستوں

نے قاہرہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ ملک کی فوجی اور دوسری ضروری جگہوں پر نجیب کی فوج کا کنٹرول تھا۔ اعلیٰ فوجی افسر اور کمانڈر انچیف گرفتار کر لئے گئے بادشاہ کو فوج اکٹھی کرنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ اسکندریہ کے راس التین محل میں بادشاہ کو پیغام بھیجا گیا کہ وہ علی مہر کو وزیر اعظم اور جنرل نجیب کو کمانڈر انچیف مقرر کر دے۔ فاروق نے بے بسی کے عالم میں کوئی چارہ نہ دیکھ کر یہ مطالبہ مان لیا۔ ہلالی پاشا نے استعفےٰ دے دیا۔ نئی وزارت نے حلف عہدہ اُٹھا لیا۔ یہ جولائی ۲۳ کا واقعہ ہے۔

جنرل نجیب نے بہت توازن سے کام لیا اور غیر ملکی لوگوں کو مکمل حفاظت کا یقین دلایا۔ اس نے اعلان کیا کہ گرفتار شدہ فوجی افسروں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا اور کچھ مدت کے بعد انہیں رہا کر دیا جائے گا۔ اُس دن یعنی ۲۳ جولائی کو قاہرہ کے ریڈیو سے براڈکاسٹ کرتے ہوئے جنرل نجیب نے کہا "مصر نے اپنی تاریخ کا ایک نازک مرحلہ طے کر لیا ہے یہ حد درجے کی بے ایمانی اور ناپائیداری کا زمانہ تھا، اور ان چیزوں نے فوج پر بھی بہت بھاری اثر کیا۔ جن لوگوں نے رشوتیں کھائیں وہ فلسطین کی شکست کے لئے ذمہ دار ہیں۔ لیکن اب ہم نے اپنے آپ کو "پاک" کر لیا ہے۔ اور فوج میں ہمارے معاملات ان لوگوں کے ہاتھوں میں سونپے گئے ہیں جن کی لیاقت، چال چلن اور حب الوطنی پر ہمیں پورا بھروسہ ہے"۔

"تمام مصر اس خبر کا استقبال کرے گا۔ تمام فوج مصر کے مفاد کے لئے قانون کے اندر بغیر کسی غرض کے کام کر رہی ہے"۔ اُس نے کہا۔

بغاوت کا ایک بڑا پہلو یہ ہے کہ اس میں کوئی خون خرابہ نہیں ہوا۔ ایک طرح سے یہ بالکل خاموش بغاوت تھی۔ شہری زندگی میں کسی طرح کی کوئی رکاوٹ نہیں آئی ——— منڈیاں اور بازار روزمرہ کی طرح کام کر رہے تھے۔ ہوائی اور بری آمد و رفت اُسی طرح چلتی رہی۔ بازاروں اور گلیوں میں ہمیشہ کی طرح رونق تھی۔ ہوائی اڈوں پر غیر ملکی جہاز آجا رہے تھے۔ لوگ خوش معلوم ہوتے تھے۔ جنرل نجیب نے قاہرہ کی سڑکوں پر کئی بار کھلی موٹر میں چکر لگایا اور لوگوں نے نعرے لگا کر اُنھیں خوش آمدید کہا۔

فاروق کی ہر دل عزیزی میں کمی ہونے کی وجوہ میں اُس کی ذاتی زندگی کا بڑا ہاتھ تھا۔ تخت پر بیٹھتے وقت وہ بہت ہر دل عزیز تھا۔ اس ہر دلعزیزی کی مدد سے اُس نے آسانی کے ساتھ وفد جیسی بڑی پارٹی کو کافی مدت تک کامیابی سے دبائے رکھا۔ اس کشمکش میں اُس نے طاقت کو چکھا اور اُسے اس کا سواد لپٹ آیا۔ بدقسمتی سے اُس نے اپنی طاقت کو عقلمندی کے ساتھ استعمال نہیں کیا۔ اپنی مرضی کے مطابق اُس نے وزارتوں اور اشخاص کو بنایا اور بگاڑا۔ اس کی حکومت جمہوری اصولوں پر چلنے کی بجائے زیادہ مطلق العنان ہوتی گئی۔ لیکن لوگ بیدار ہو رہے تھے اور بادشاہ کے ذریعے اپنی حالت سدھرنے کی اُمید چھوڑ چکے تھے۔ بدامنی اور بے چینی پھیل رہی تھی۔ بادشاہ کا ہر معاملے میں دخل دینے کا نتیجہ یہ تھا کہ لوگ اُسے ہر غلطی کے لئے ذمہ دار سمجھنے لگے۔ لیکن فاروق کا کافی دخل اپنے مصاحبوں کو بچانے کے لئے ہوتا تھا۔ لوگوں کی خواہشات کا کوئی احترام ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فاروق چاپلوس مصاحبوں سے گھرا ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ سیاست داں اور حکومت کے افسر ایماندار نہیں تھے۔ لیکن بادشاہ کا اثر اس فضا کو درست کرنے میں استعمال کیا جا سکتا تھا۔

ذکر و فکر

غزل
محمد علی خاں اثر

موسمِ گل ہے مگر پھولوں پہ جوبن تو نہیں
باغباں لاکھ گلستاں کہے گلشن تو نہیں

غیر کو جانے دو اپنوں سے وہ دُکھ پہنچا ہے
دوست پر بھی یہ گماں ہوتا ہے دشمن تو نہیں

بجلیاں گرتی ہیں ہر سمت سے شاخِ گل پر
مرکزِ جذب، کہیں میرا نشیمن تو نہیں

آج میخانے میں برپا ہے عجب ہنگامہ
کوئی دیکھے کہ یہاں شیخ و برہمن تو نہیں

گم شدہ قافلے کو ڈھونڈھ رہی ہے منزل
بھیس میں راہنما کے کوئی رہزن تو نہیں

باغباں بھر لیا تو نے جو گلوں سے دامن
گو بھرا اشک سے ہے میرا بھی دامن تو نہیں

عیش و غم نغمہ و نوحہ میں نہیں فرق اثر
نغمے کی لے کو سمجھتا ہوں کہ شیون تو نہیں

سحرِ نظر
نشتر سندیلوی

نگاہوں نگاہوں میں مسحور ہو کر
سپر ڈال دی دل نے مجبور ہو کر

عجب بے نیازی سے عالم کو دیکھا
گدائے محبت نے مغرور ہو کر

نگاہیں اُٹھی ہیں اُدھر ڈرتے ڈرتے
بہت بیقراری سے مجبور ہو کر

مرے جذبۂ عشق کو دیکھتے ہیں:
کبھی پاس آکر، کبھی دُور ہو کر

محبت میں نشتر! یہ مسرور ہونا؟
ہزاروں بلاؤں میں محصور ہو کر

غزل
طالب چکوالی

سُناتی ہے خزاں کچھ اور ہی افسانۂ گلشن
خزاں دیدہ بہارِ بوستاں کچھ اور کہتی ہے

اُنھیں حسنِ بیاں سے کام ہے حسنِ عمل سے کیا
عمل کچھ اور کہتا ہے، زباں کچھ اور کہتی ہے

بزعمِ خود بشر نے فطرتِ انساں بدل ڈالی:
مگر دیکھو تو رودادِ جہاں کچھ اور کہتی ہے

تقاضا اور ہے احبابِ مے خانے کا ساقی سے
اجارہ داریِ پیرِ مغاں کچھ اور کہتی ہے

حیاتِ چند روزہ کے تقاضے اور ہیں مجھ سے
تمنائے حیاتِ جاوداں کچھ اور کہتی ہے

سکونِ ساحلِ دریا کی طالب اور باتیں ہیں
زبانِ موجِ دریائے رواں کچھ اور کہتی ہے

آج کل
بانو طاہرہ سعید

پھر اُن کے در پہ جانے کا ارماں ہے آجکل
پھر اضطرابِ رُوح کا ساماں ہے آجکل

پھر اُلجھنیں پڑی ہیں سکونِ خیال میں
پھر زلفِ یار رُخ پہ پریشاں ہے آجکل

ہاں، اے جنوں نوازِ ہوائے بہار کیا؟
میری طرح سے تو بھی غزلخواں ہے آجکل

پھر وضعِ احتیاط سے اُکتا گیا ہے دل
دستِ جنوں میں اپنا گریباں ہے آجکل

پھر آرہی ہے آہ اسی بے وفا کی یاد
پھر لذتِ تصورِ جاناں ہے آجکل

پھر اُس کی آرزو ہے دلِ چاک چاک میں
سینے میں آہ پھر وہی طوفاں ہے آجکل

کیا پوچھتے ہو کیسے گزرتی ہے زندگی
وحشت ہے ہم ہیں اور بیاباں ہے آجکل

اب طاہرہ خیال میں رنگینیاں کہاں
آباد جو چمن تھا وہ ویراں ہے آجکل

غزل
منظر شہاب

رستے میں تجھ کو دیر ملے یا ملے حرم
اے کاروانِ شوق چلا چل قدم قدم

ناداریاں مری کہ تمھیں کچھ نہ دے سکا
تم نے تو خیر سونپ دی مجھ کو متاعِ غم

مانا کہ سست گام ہے خورشید کی کرن
لیکن ہے کون روک دے جو صبح کے قدم

منظر شہاب کاکلِ "نسرین" سنور چکی
لیکن وہی ہیں گیسوئے دوراں کے پیچ و خم

کیا ہوں میں؟
آر۔ ایس کوثر

تجلیاں مجھے گھیرے ہوئے ہیں سرتاپا
فروغِ حُسن کے جلوؤں میں کھو گیا ہوں میں

یہ جستجو ہے کھُلے مجھ پہ عقدۂ ہستی
ازل سے سوچ رہا ہوں یہی کہ کیا ہوں میں

سنبھل کے سُن مجھے اے دُشمنِ انسانیت و کرم
جہانِ درد کا پُر درد ماجرا ہوں میں

اگر ہوا ابھی تو کیا ہوگا اور جوشِ نمو
کہ ابتدا ہی میں تصویرِ انتہا ہوں میں

یہ انتہائے تغافل کا دور ہے کوثر
سمجھ کے مقصدِ ہستی کو بھولتا ہوں میں

سلام
اُمید ڈبائیوی

اس سے تو دل کی خلش اور بھی بڑھ جائے گی
اے جفا پیشہ تری کاوشِ درماں کو سلام

ظلمتِ شامِ وطن کو ہے ضرورت میری
نور برساتی ہوئی صبحِ غریباں کو سلام

آج ہر شام و سحر کا ہے تقاضا کچھ اور
عارض و گیسو و چشم و لب و دنداں کو سلام

صبح بیدار ہوئی عزمِ سفر جاگ اُٹھا
اب مری سمت سے سوئے ہوئے انساں کو سلام

جس میں اک اشک بھی چھلکا نہ محبت کے لیے
ہمراُس دیدۂ ہمدردیِ شاکیِ ارباں کو سلام

درسِ نفرت کا جو دیتا ہے زمیں والوں کو
ایسے ہندو کو سلام ایسے مسلماں کو سلام

نئی کتابیں اور رسالے

جنون وہوش حضرت جوش ملسیانی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ جسے منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز پبلشرز دہلی نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ ضخامت قریباً ڈھائی سو صفحات۔ سائز ۲۲×۱۸/۸ قیمت چار روپے

جناب جوش ملسیانی دنیائے شاعری کی ایک مسلّم شخصیت ہیں۔ غزل میں آپ کو جو مقام حاصل ہو چکا ہے وہ اس دور کے بہت کم غزل گو شعرا کے حصّے میں آیا ہے۔ دلّی اور لکھنؤ سے سینکڑوں میل دُور رہ کر آپ نے زبان اور بیان پر جو عبور حاصل کیا ہے وہ اہلِ زبان حضرات کے لئے بہت حد تک حیرت کا باعث ہے۔

غزل اس زمانے میں سب سے زیادہ مروّج اور عام صنفِ سخن ہے لیکن وہ جس قدر عام ہے اُسی قدر مشکل بھی ہے۔ یہ وہ میدان ہے جس میں شدید احساس اور زبان پر پوری قدرت رکھے بغیر ایک قدم چلنا مشکل ہے۔ غزل کی جان اُس کی لطافت اور سوز وگداز ہے۔ اگر اس میں یہ بات نہیں تو کتنا اونچا خیال ہی شعر میں کیوں نہ موجود ہو غزل کے اعتبار سے وہ ایک سعیِ ناکام ہے۔ یہی لطافت اور سوز وگداز کا امتزاج جوش صاحب کی غزل کے رگ وپے میں سمایا ہوا ہے اور قدرتِ زبان نے اس کے ساتھ مل کر اُسے ایک جادووانی قدر بخش دی ہے "جنون وہوش" کی غزلوں میں بے خودی حسرت و یاس، رنج وغم اور اُمید کی تابانیاں واضح انداز میں بھی ہیں اور تشبیہ و استعارہ اور اشاریت اور ایمائیت کے پردے میں بھی لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ غزل کی لطافت میں کہیں کوئی کمی واقع ہو گئی ہو۔ ایک اور خوبی جو آپ کی غزلوں میں اوّل سے آخر تک نظر آتی ہے الفاظ کے انتخاب کا حُسن ہے۔ آپ کے الفاظ کی عذوبت، نرمی اور خوشگواری نے آپ کے طرزِ ادا اور اسلوبِ بیان کو بہت طرب انگیز مستانہ اور شوخ بنا دیا ہے۔ ہماری روایتی غزل نتادگی، پراگندگی، مایوسی، حرماں نصیبی اور زندگی سے بیزاری کی کیفیات سے بھری پڑی ہے۔ اس ماحول میں ہر سانس تعلیمِ فنا دیتا چلا آیا ہے۔ یہاں بہار اپنے ساتھ خزاں کی یاد لے کر آتی ہے، اور ہر مسرّت کے جلو میں ایک کاروانِ غم چلتا نظر آتا ہے۔ لہٰذا اگر کسی شاعر کے یہاں ہر سانس تعلیمِ زندگی دینے لگے یا اُسے غم کے پردے میں مسرّت کا چہرہ دکھائی دے تو اس کا کلام یقیناً پڑھنے والے کو چونکا دے گا۔ جوش صاحب کہتے ہیں۔

نویدِ زندگی اے جوش ہر اک سانس ہے مجھکو | اسے بانگِ رحیلِ کارواں سمجھا تو کیا سمجھا
نویدِ زندگی لے کر ہوائے مشکبار آئی | چمن والوں کو مژدہ ہو کہ پھر فصلِ بہار آئی

سیاہیِ شامِ غم کا شکوہ نہیں ہے راہِ طلب میں احباب
یہی اندھیرا بنے گا رہبر اسی سے کچھ روشنی ملے گی

پچھلے چند برس میں ہمارے یہاں ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث بہت زور شور سے چلی اور ہمارے بعض دوستوں نے زندگی کو اس قدر محدود کر دیا کہ ایک مخصوص سیاسی جماعت کے منشور کا نام زندگی رکھ دیا۔ حالانکہ اگر اس معاملے میں ذرا بھی غور سے کام لیا جاتا تو اس قدر طویل بحث کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ کیونکہ "ادب برائے ادب" بالکل اُسی طرح مہمل اور بے معنی چیز ہے جیسے 'تاریخ برائے تاریخ' 'ریاضی برائے ریاضی' 'جغرافیہ برائے جغرافیہ' 'فلسفہ برائے فلسفہ' یا 'سائنس برائے سائنس'۔ زندگی کو اس قدر محدود کر دینے کے بعد اس طبقے نے اس ساری شاعری کو ادب سے "خارج" کر دیا جس کا تعلق اس سیاسی جماعت کے منشور سے نظر نہ آیا، اور اتنا نہ دیکھا کہ وہ زندگی ہی کیا جو چند سیاسی اصول میں قید ہو کر رہ جائے۔ کہاں سیاست کی مصلحتیں اور کہاں زندگی کی بنیادی اور جاودانی قدریں۔ سیاست زندگی کا جزو تو کہی جا سکتی ہے لیکن سیاست اور وہ بھی ایک مخصوص اندازِ فکر کی سیاست خواہ وہ زندگی سے

کتنی بھی قریب کیوں نہ ہو زندگی نہیں کہلا سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر تازہ واردانِ بساطِ ہوائے ادب نے اپنے ادب کے گہرے محاسن کو دیکھنے سے انکار کر دیا۔ یہ ہوا بڑی تیزی سے چلی اور اگر جلد ہی اس کا ردِّ عمل ہمارے ادب میں نمایاں نہ ہو جاتا تو آج ہم اپنی شعر و شاعری میں الجبرے اور جیومیٹری کے مسائل حل کرتے اور تجارتی اُلجھنوں کو سلجھاتے نظر آتے۔ حضرتِ جوش اس نیرنگیٔ دوراں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور یہ کہہ کر کہ

بد ذوقیٔ جہاں سے خاموش ہو گئے سب
ہر طائرِ خوش الحاں منقار زیرِ پَر ہے

آپ نے خاموشی اختیار کرنا چاہی، لیکن نوا را تلخ ترمی زن کے مصداق آپ نے محفل کو گرمانا زیادہ موزوں خیال کیا اور اپنی ایک حسین و جمیل غزل اس شعر پر ختم کی ؎

کوئی جوہری جوش ہو یا نہ ہو   سخنور جواہر اُگلتا رہے

اور اردو شاعری کی خوش قسمتی ہے کہ یہ جواہر اُگلنے کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

ابھی حال ہی میں شاعری کو ناپنے کا ایک عجیب و غریب پیمانہ دیکھنے میں آیا۔ ایک مشہور شاعر اور نقّاد نے علامہ اقبال کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ "اقبال کی شاعری وقت کی آواز نہیں ہے۔ کیونکہ اقبال کی شاعری میں اقبال کے دور کی تصویر نظر نہیں آتی۔ اقبال کا دور گاندھی اور محمد علی کا دور تھا اور اس کی شاعری میں کہیں بھی اُس تحریک کی جھلک نظر نہیں آتی، جو گاندھی اور محمد علی کی ذیر قیادت کانگریس کے نام سے ملک میں چلی۔ اور کل کے مؤرخ کو تاریخِ ہند کی ترتیب کے وقت کلام اقبال سے کچھ مدد نہ مل سکے گی۔" یہ پڑھ کر میری حیرت کی کوئی حد نہ رہی اور میرے لئے یہ سمجھنا مشکل ہو گیا کہ آج فن کاروں کے ایک گروہ کا ذہن کس طرف جا رہا ہے۔ علامہ اقبال نے چالیس پینتالیس برس شاعری کی نذر اس لئے نہیں کئے کہ کل کے مؤرخ کو تاریخِ ہند مرتب کرنے میں مدد مل سکے۔ بلکہ اقبال نے اپنے تاثرات اور محسوسات ہمارے سامنے ایک شاعر کی حیثیت سے پیش کئے ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ وہ تاثرات اپنے دَور سے تعلق نہیں رکھتے یا زندگی سے کسی قدر دُور ہیں۔ ہاں اگر دور سے ہم مراد فقط کانگریس یا ہندوستان کی تاریخ لیں تو واقعی کلام اقبال اس معاملے میں مدد نہ کر سکے گا (اگرچہ اقبال کا کلام ملک کی سیاسی تحریک اور سیاسی رہناؤں کے ذکر سے خالی نہیں) بلکہ اس صورت میں ہمیں اُن مقالات کی جانب رجوع کرنا پڑے گا۔ جو ملک کے روزانہ اخبارات میں ایڈیٹروں کے قلم سے شائع ہوتے رہے۔

اس ساری گفتگو کا مطلب محض اس قدر ہے کہ زندگی رنگا رنگ کی ایک تصویر کا نام ہے۔ تصوّف بھی جس نے شعراء کو اس بات پر اُکسایا کہ وہ زمین سے اپنا دامن چھڑا کر آسمان کی بلندیوں میں پناہ ڈھونڈیں، زندگی ہی کا ایک رُخ ہے۔ لہٰذا زندگی کو چند بندھے ٹکے قواعد میں مقیّد کرنا بذاتِ خود زندگی سے انحراف کرنا ہے۔ زندگی کے گلشن کی بہار آفرینیاں ہزار طرح سے جلوہ نما ہوتی ہیں، کہیں حُسن و عشق کے رنگ میں، کہیں فلسفے کے روپ میں، کہیں وہ سیاست کا پیرہن اختیار کرتی ہیں اور کہیں نفسیات کے قالب میں ڈھلتی ہیں اور یہ سب پہلو حسنِ بیان کا نورانی لباس پہن کر شاعری کی دنیا میں جگمگاتے ہیں۔ انھیں دیکھنے اور ان سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اُس عینک کا استعمال کم کر دیں جو ایک خاص کارخانے سے بن کر آئی ہے اور جس میں خاص رنگ کے شیشے لگے ہیں۔

"جنون و ہوش" بھی اسی عینک کے بغیر دیکھنے کی چیز ہے۔ اس میں حسن و عشق کی رنگینیاں اپنی پوری گہرائی اور گیرائی کے ساتھ موجود ہیں۔ کہیں نہ کہیں اُن سیاسی مسائل کا ذکر بھی ہے، جن سے آج کوئی فن کار الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ طنز و مزاح بھی ہے اور تفکّر کے پہلو بھی۔

میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ حضرتِ جوش کا خاص میدان غزل ہے۔ اس میں آپ کا کمالِ فن اپنے پورے عروج پر نظر آتا ہے۔ اس کڑے دور میں جب کہ جگر مرادآبادی ایسے غزل گو یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ ؎

شاعر نہیں ہے وہ جو غزلخواں ہے آج کل

غزل کی عظمت کو برقرار رکھنا معمولی بات نہیں ہے۔ یہ اپنی پرورش کے لئے خونِ جگر کا تقاضا کرتی ہے۔ صرف خونِ جگر ہی نہیں بلکہ مشاہدے کے رنگ میں متاعِ نظر بھی مانگتی ہے۔ غزل اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک محدود صنفِ سخن ہے اور وہ موضوع اتنا پٹ چکا ہے کہ اب اس میں بات پیدا کرنا بہت بڑی بات ہے۔ ہجر و وصل، سوز و گداز، رندی و مستی، شکوہ و شکایت کی باتوں میں ابتذال سے بچنا اور تغزّل کی حدود سے باہر قدم نہ

نکالنا ایک بڑی سخت منزل ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں جوش صاحب کی غزل پڑھنے والے پر ایک پائدار اور دائمی اثر چھوڑتی ہے۔ عاشق اور معشوق کا رشتہ ایک بہت نازک رشتہ ہے۔ ہمارے متعدد غزل گو شاعروں نے اکثر و بیشتر اس رشتے کی نزاکت کا پورا احساس نہیں کیا۔ عشق یا حسن میں سے کسی ایک کا ذلیل اور بازاری ہونا شعر کی تمکنت کو ختم کر دیتا ہے۔ ہمارے روایتی غزل سراؤں نے نہ اپنا احترام ملحوظ رکھا ہے نہ محبوب کا۔ لیکن جوش صاحب کی غزلیں اس ابتذال سے قطعاً پاک ہیں۔ ان کا عشق فقط غیور ہی نہیں بلکہ اسے اپنے غیور ہونے کا احساس بھی ہے، اور اس کا اظہار جا بجا نظر آتا ہے۔ مثلاً

اب مرے سوزِ محبت سے یہ بیزاری ہے کیوں — پہلے اس شعلے کو بھڑکایا تھا کس نے آپ نے
آپ ہی کو کھولنے ہوں گے مری قسمت کے پیچ — رشتۂ الفت کو الجھایا تھا کس نے آپ نے

عشق نے ہم کو زیارت گاہِ عالم کر دیا — گردشِ غم سے ہو گیا تعمیر کعبہ ایک اور

اب ہم بھی کچھ اظہارِ تمنا نہ کریں گے — وہ روٹھ گئے ہیں تو ہمارا بھی خدا ہے

اے مستِ رعونت یہ جوانی نہ رہے گی — جس حسن پہ نازاں ہے وہ پر تول رہا ہے

کچھ جذبۂ صادق ہو کچھ اخلاصِ ارادت — اس سے ہمیں کیا بحث وہ بت ہے کہ خدا ہے

آپ کیا پوچھتے ہیں قیمتِ خودداریِ دل — ساری دنیا کی بھی دولت مجھے منظور نہیں

روایت اور اس کی عظمت کا دامن جناب جوش بڑی مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں۔ روایت سے اندھا دھند بغاوت متمدن لوگوں اور فن کاروں کا شیوہ نہیں، بلکہ گنواروں کا طریق کار ہے۔ ہماری روایات ہماری مقدس امانتیں ہیں۔ ان سے دور بھاگنا ہی ذہنی افلاس کی علامت ہے۔ کوئی فن کار روایت سے قطع تعلق کر کے خلا میں زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ لیکن محض روایت کا اسیر ہو کر رہ جانا اور نئے تقاضوں سے بالکل آنکھیں بند کر لینا بھی کسی طرح سے مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جوش صاحب نے ماضی کی روایات سے وابستہ رہنے کے باوجود آج کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا اور آپ کی شاعری عصرِ حاضر کی تلخیوں سے خالی نہیں۔ لیکن ان تلخیوں کے ذکر میں بھی آپ نے تغزل کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

گردِ ملال دل پہ نمایاں ہے آج کل — ہر ایک صبح شامِ غریباں ہے آج کل
دورِ خزاں سے سوکھ کے کانٹا ہوئے ہیں پھول — اک خار زار صحنِ گلستاں ہے آج کل
رنگِ چمن اداس کبھی اس قدر نہ تھا — ہر ایک پھول دیدۂ حیراں ہے آج کل
وہ شوق وہ خلوصِ محبت نہیں رہا — بے مائگیِ عشق فراواں ہے آج کل
نظریں بھی انقلاب کے زیرِ اثر ہیں جوش — تاریکیوں کا نام چراغاں ہے آج کل

گردشِ تقدیر کا چکر وہی جاری رہا — کیا مرے طالع میں یا رب کوئی سال اچھا نہیں
اب تمہاری چارہ سازی کا بھرم کھلنے کو ہے — لوگ کہتے ہیں مریضِ غم کا حال اچھا نہیں
بدنصیبی پہ نصیبی ہے مگر اتنی بھی کیا — کوئی دن کوئی مہینہ کوئی سال اچھا نہیں

فغاں ہر دل سے اٹھی لب پہ جانِ بیقرار آئی — قضا آئی قفس والوں کی یا فصلِ بہار آئی

ہوئے وہ مہرباں مجھ پر یہ سب کہنے کی باتیں ہیں — یہی دلسازیاں دم بھر بنا دینے کی باتیں ہیں
سیہ بختی نے کی ہے زندگی تاریک تر اتنی — ہمارے غمکدے میں دن نہیں راتیں ہی راتیں ہیں

مطلع نظر آتا ہے مکدر مجھے اے جوش — بگڑے گی ابھی اور زمانے کی ہوا کیا
گلشن میں بہار آئی کیا جوش نوحے کر — ہر زخم ہوا تازہ ہر داغ ابھر آیا

وطن کی محبت جوش صاحب کی شاعری کا خاص عنصر ہے۔ یہ محبت عشق کے درجے تک پہنچی ہوئی ہے۔ اس موضوع پر آپ نے نظمیں بھی کہی ہیں، اور غزلوں میں اشعار بھی ہیں۔ اس سلسلے میں دو اشعار ملاحظہ کیجئے۔

اے جوش کیا غرض مجھے حور و قصور سے — میرا وطن مرے لئے جنت سے کم نہیں
گلشنِ فردوس سے لے جوش مجھ کو کیا غرض — کم نہیں اس سے مرا ہندوستاں میرے لئے

"جنون و ہوش" کا مکمل ذکر ان چند اشاروں میں ختم نہیں ہو سکتا۔ یہ مجموعہ ایک بحرِ ذخار ہے، اور اس کے تمام پہلوؤں پر بات چیت کرنا اس مختصر سے تبصرے میں ممکن نہیں۔ حضرتِ جوش کا فارسی کلام بھی اس میں درج ہے اور انھوں نے اپنے دوستوں، ہمعصروں اور حضرتِ داغ کی وفات پر جو مرثیے کہے ہیں وہ بھی اس میں شامل ہیں۔ رباعیات و قطعات کا انتخاب بھی اس میں موجود ہے۔ غرضیکہ یہ مجموعہ جناب جوش کی سالہا سال کی عرق ریزی کی پوری طرح نمائندگی کرتا ہے۔ یہ تمام چیزیں جو سراپا شعریت سے لبریز ہیں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں، اور ان کے متعلق فرداً فرداً کسی قسم کا اظہارِ خیال کرنے کے بعوض یہی مناسب ہے کہ اس تبصرے کو جوش صاحب ہی کے شعر پر ختم کر دیا جائے جو ان کی شاعری کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے ؎

ہم نے زمینِ شعر کو زرخیز کر دیا
جو نخل بو دیا وہ گُلِ ریز کر دیا

دھرتی کے تیور مجموعہ ہے تاجور سامری کی نظموں، غزلوں، ڈراموں اور کہانیوں کے انتخاب کا۔ یہ انتخاب اردو کے

چھ ادیبوں نے کیا ہے۔ تاجور صاحب ایک اچھے شاعر، افسانہ نگار اور تمثیل نگار ہیں۔ اور اس مجموعے میں اُن کی نمائندہ تخلیقات شامل ہیں۔

کتاب ۲۲×۱۸/۱۶ سائز کے تقریباً دو سو صفحات پر چھپی ہے۔ کتابت طباعت دیدہ زیب ہے۔ قیمت دو روپے بارہ آنے۔ پبلشرز: رسالہ بیسویں صدی دہلی۔

رازِ حیات جناب شاد اگرالوی کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ ناشر: نظامی پریس بدایوں۔ اس مجموعے کا دیباچہ جناب شاداں بدایونی نے لکھا ہے جس میں آپ لکھتے ہیں: "شاد صاحب کا مذاقِ سلیم فطری ہے اور آپ میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک ہونہار شاعر میں ہونی چاہئیں۔"

رسالے

سالنامہ ادبِ لطیف لاہور۔ اب کے برس پھر ادارۂ ادبِ لطیف نے سالنامہ اپنے روایتی معیار کے ساتھ پیش کیا ہے۔ "ادبِ لطیف" کو ہندوپاکستان کے تمام ممتاز ادیبوں، شاعروں افسانہ نگاروں اور تمثیل نگاروں کا تعاون حاصل ہے، اور یہ سالنامہ اُن تمام فن کاروں کی نمائندہ تخلیقات کا ایک حسین و جمیل مجموعہ ہے۔ سوا سَو صفحات کا یہ ادبی مرقع ایک دائمی اہمیت کا حامل ہے اور اس کے مطالعے سے محروم رہنا اردو ادب کی موجودہ رفتار کے مطالعے سے محروم رہنے کے مرادف ہے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ ناشر: مکتبۂ اردو۔ لاہور

سالنامہ نورنگ کراچی۔ آغا مرغوش قزلباش دہلوی اور اُن کے رفیقوں نے یہ سالنامہ حسبِ دستور بڑی محنت اور کامیابی سے مرتب کیا ہے۔ مقالات، طنز و مزاح، نظم اور افسانے یہ تمام حصے معیاری فن پاروں سے پُر ہیں۔ جن کی تخلیق بھارت اور پاکستان کے سربرآوردہ فن کاروں نے کی ہے۔ "نورنگ" نے بہت تھوڑی مدت میں ترقی کی بڑی منزلیں طے کرلی ہیں۔ اور ادارۂ نورنگ اس کامیابی کے مستحق مبارک باد ہے۔ قیمت پاکستان میں ایک روپیہ چار آنے ہندوستان میں ایک روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ۔ ماہانہ نورنگ۔ کراچی

یو۔ پی اطلاعات (لکھنؤ) کا آزادی نمبر "یو۔ پی اطلاعات" اتر پردیش کی حکومت کا ایک ماہانہ رسالہ ہے جس کا ہر سال جشنِ آزادی کے موقع پر آزادی نمبر شائع ہوتا ہے۔ اس سال بھی یہ نمبر بڑی آب و تاب سے شائع ہوا ہے اور اس کی تکمیل میں ملک کے نامور اہلِ قلم مثلاً سری کے۔ ایم منشی۔ پنڈت آنند نرائن ملّا اور مولینا نیاز فتحپوری نے حصّہ لیا ہے۔ ان کے علاوہ شمیم کرہانی کی نظم "تازہ سحر" فرقت کا مضمون "برج نرائن چکبست" اور محمد احمد صدیقی کا مقالہ "جنگ آزادی میں یو۔ پی کا حصّہ" اس شمارے کی خاص چیزیں ہیں۔ کاغذ، کتابت طباعت معیاری۔ ضخامت ۸۰ صفحات۔ قیمت چار آنے۔ ملنے کا پتہ: پبلی کیشنز بیورو انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ لکھنؤ۔ یو۔ پی۔

بھائی جان (کراچی) کا بچپن نمبر بچوں کے لئے ہندوپاکستان میں جس قدر دلچسپ اور مفید رسائل نکل رہے ہیں، اُن میں "بھائی جان" کو ایک خاص مقام حاصل ہے اس نمبر میں ہندوپاکستان کے مشاہیر شعراء اور ادباء نے اپنے بچپن کے حالات بچوں کی زبان میں قلم بند کئے ہیں۔ جن میں بچوں کے لئے دلچسپی کا سامان بھی موجود ہے اور افادیت کا پہلو بھی۔ اس کے علاوہ نظموں اور کہانیوں کی ایک خاص تعداد شامل ہے۔ اکثر کہانیاں مصوّر ہیں۔ بچوں کے لئے اس شمارے کا مطالعہ ہر اعتبار سے مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ۔ دفتر "بھائی جان"۔ پرنس روڈ۔ کراچی

اقوامِ متحدہ کی طرف سے چاول کا تحفہ

اقوامِ متحدہ کے سیکرٹریٹ کی کمیٹی برائے عسکرانی امداد کے تجارتی دفتر نے چاول کے ۴۳۰ تھیلوں کا ایک تحفہ بھیجا ہے۔ یہ تمام چاول حکومت بمبئی کو اس غرض کے لئے دے دیا گیا ہے کہ وہ اسے ریاست کے قلت زدہ علاقوں میں غریبوں اور ضرورت مندوں میں بانٹ دے۔

رفتارِ زمانہ

—— بھارت سرکار نے اپنے اس فیصلے کا اعلان کیا ہے کہ بھارتی فوج کے آئندہ کمانڈر انچیف لیفٹیننٹ جنرل مہاراج راجندر سنگھ جی ہوں گے — مہاراج راجندر سنگھ جی کی عمر اس وقت ۵۳ سال کی ہے اور دوسری بڑی جنگ میں ڈی۔ ایس۔ او تمغہ پانے والے یہ پہلے ہندوستانی تھے۔ بھارت کے موجودہ کمانڈر انچیف جنرل کے۔ ایم کری آپا ۱۵ جنوری ۱۹۵۳ء کو اپنے عہدے سے سبکدوش ہوں گے۔

—— پنجاب، ہماچل پردیش، پیپسو اور راجستھان کی حکومتوں کے نمائندوں نے ایک مشترکہ سرکاری اجلاس میں یہ فیصلہ کیا کہ بلاس پور کو ہماچل پردیش میں مدغم کر دیا جائے کیوں کہ بلاس پور کو ایک علیحدہ یونٹ کے طور پر رکھنا دیش کے لئے کسی طرح بھی مفید نہیں ہے۔

—— سونی پت (پنجاب) سے دس میل دور دیہاتیوں نے اپنی کوششوں اور روپیہ اور حکومت پنجاب کے انجینیروں کی مدد سے ایک نہر تعمیر کروائی ہے۔ اس نہر کا افتتاح کرتے ہوئے شری رفیع احمد قدوائی نے دیہاتیوں کے اقدام کی دل کھول کر تعریف کی اور حکومت پنجاب کو یقین دلایا کہ تعمیری اسکیموں میں حکومت ہند اس کی ہر ممکن امداد کرے گی۔ بھارت سرکار کی کنٹرول پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے شری قدوائی نے کہا کہ حکومت کی پالیسی کنٹرول کو آہستہ آہستہ ختم کرنے کی ہے۔ اور وہ ایسا انتظام کرے گی کہ زیادہ خوراک پیدا کرنے والے علاقوں میں کنٹرول جلدی ہی اُٹھا لئے جائیں گے۔

—— جموں اور کشمیر یونیورسٹی کے چوتھے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے یونیورسٹی کے چانسلر یوراج کرن سنگھ نے کہا کہ یہ امر شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ آج ہمارا بنیادی کام غریبی، جہالت اور بیماریوں سے لڑنا ہے اور ہمارے مسائل بہت حد تک اقتصادی ہیں۔ ڈگری حاصل کرنے والے نوجوانوں کو مشورہ دیتے ہوئے یوراج نے کہا کہ ہمیں ایمانداری بے غرضی اور حوصلہ مندی کے ساتھ محبت اور پریم کا جھنڈا اُٹھا کر دُنیا میں آگے بڑھنا چاہیئے۔ ہماری کامیابی کا فیصلہ آئندہ نسلیں کریں گی۔ اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ یوراج کرن سنگھ نے بھی اس سال بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی ہے اور جب وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ نے اُن کو ڈگری دے کر مصافحہ کیا تو ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔

—— حکومت پاکستان کے ایک اعلان میں بتایا گیا ہے کہ بھارت اور پاکستان کے مابین پاسپورٹ سسٹم کا نفاذ ۱۵ اکتوبر سے نافذ العمل ہوگا۔ یہ طریقہ موجودہ پرمٹ سسٹم کی جگہ جاری ہوگا۔

—— مصر کی علی مہر حکومت نے ایک فراخدلانہ نئی پالیسی کا اعلان کیا ہے جس میں امیر طبقے پر نئے ٹیکس لگائے گئے ہیں۔ اس سکیم کے تحت غیر ممالک میں روپیہ بھیجنے پر دس فیصدی ٹیکس، منقولہ جائداد اور صنعتی اور تجارتی منافع پر یکم جنوری ۱۹۵۲ء سے ایک فی صدی سے ستر فی صدی ٹیکس بڑھا دیا گیا ہے۔ اس اسکیم کا مقصد امیروں سے روپیہ وصول کر کے اُسے رفاہ عام اور ملک کے ڈیفنس کے لئے خرچ کرنا ہے۔

—— نیپال کی کوئرالہ وزارت کے مستعفی ہو جانے پر کوئی نئی وزارت قائم نہیں ہوسکی۔ کیونکہ نیپال کانگرس کے عہدے داروں میں باہمی پھوٹ بہت زیادہ ہے۔ اور اُن میں سمجھوتے کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے۔ مہاراجہ تربھون نے تمام اختیارات ہاتھ میں لے لئے ہیں اور انتظامات کی دیکھ بھال کے لئے تین مشیر مقرر کر دئے ہیں۔

—— ہانگ کانگ کے برطانوی ذرائع سے یہ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ شنگھائی کے انگریزی جہازوں کے گھاٹ اور موٹرز کے جہاز تعمیر کرنے والے گھاٹ پر حکومت چین کے قابض ہو جانے کے بعد چینیوں نے برطانیہ کی دو سب سے بڑی منقولہ جائدادوں کو بھی اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔ اندازے کے مطابق ان ہر دو گھاٹوں کی قیمت کم وبیش چالیس لاکھ پونڈ ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ چین میں ابھی برطانیہ کی تیس کروڑ پونڈ کی جائداد ہے۔

گرمی میں ...
سردی میں یا ...
HIMALAYA
BOUQUET
SNOW
آپ جہاں کہیں بھی ہوں ...
ہمالیہ
بُکے سنو
استعمال کیجئے
کیونکہ یہ ہندوستانی آب وہوا کیلئے خاص کرکے بنایا گیا ہے
چاہے کیسا بھی موسم ہو۔ آپ ہندوستان
میں کہیں بھی ہوں۔ ہمالیہ بُکے سنو آپکی
جلد کو زیادہ خوبصورت و ملایم رکھے گا۔
اسکی خوشبو بھی دلآویز ہے۔
اِراسمک کا ایک اور عمدہ پراڈکٹ
HBS. 6A-X30 UD
اراسمک کمپنی لمیٹیڈ لنڈن کے لئے ہندوستان میں بنایا گیا

Regd. No. E P - 689

حماقت کا پھل

سعیدہ نکہت

بچو! تم نے سنا ہوگا کہ عقل دنیا کی سب سے بڑی دولت ہے۔ ایک احمق انسان کبھی اپنی زندگی میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ آؤ احمق انسانوں کے بارے میں تمہیں ایک کہانی سنائیں۔

ہندوستان کے سب سے بڑے مغل بادشاہ اکبر کا نام تو تم نے ضرور سنا ہوگا۔ اس کے دربار میں اس زمانے کے تمام بڑے بڑے عالم اور عقلمند لوگ موجود تھے۔ وہ خود بھی بہت عقلمند تھا اور ایسے تمام لوگوں کی جو عقل اور علم کی دولت سے مالا مال تھے، بے حد قدر کرتا تھا۔ عبدالرحیم خانخاناں بیربل اور تان سین کا نام کس نے نہیں سنا۔ یہ سب اس کے دربار سے تعلق رکھتے تھے اور بادشاہ ان کا حد درجہ خیال رکھتا تھا۔ اس کے عہد میں مغل سلطنت نے جتنی ترقی حاصل کی کسی اور بادشاہ کے عہد میں نصیب نہ ہو سکی۔ اس کی حکومت ملک کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک پھیلی ہوئی تھی۔ ستی کی رسم جس میں عورتیں اپنے شوہر کی چتا کے ساتھ جل کر مر جایا کرتی تھیں، پہلی بار اسی نے ختم کی۔ وہ بہت ہی ہنس مکھ اور زندہ دل انسان تھا اور دوسرے بادشاہوں کی طرح ذرا ذرا سی بات پر قتل کا حکم نہیں دیا کرتا تھا۔ اس کے زمانے میں ہندو مسلمان سب لوگ مل جل کر امن، چین اور خوشی کے ساتھ رہتے تھے۔

ایک روز بادشاہ اپنے درباریوں کے ساتھ شکار کو نکلا۔ راستے میں اس کا قیام کچھ دیر کے لئے ایک گاؤں میں ہوا۔ اس گاؤں کے لوگ بہت ہی احمق اور بے وقوف مشہور تھے لیکن اکبر اس بات سے واقف نہ تھا۔ گاؤں والوں کو بادشاہ آنے کی خبر ہوئی تو وہ بے حد خوش ہوئے۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ بادشاہ ان لوگوں کے گاؤں میں آیا تھا۔ ہر گھر میں اس خبر

سے خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ گاؤں والوں نے مل کر سوچنا شروع کیا کہ اس موقعے پر بادشاہ کو کیا تحفہ دینا چاہیے۔ ہر آدمی نے اپنی سمجھ اور عقل کے مطابق اپنی رائے پیش کی۔ یہ گاؤں "بیل" اور "آم" کے پھلوں کے لئے مشہور تھا۔ یہ دونوں پھل یہاں بڑی کثرت سے ملتے تھے۔ خاص طور سے یہاں کے آم بے حد میٹھے اور لذیذ ہوتے تھے۔ لوگوں کی یہی رائے ہوئی کہ یہی دونوں پھل بادشاہ کو تحفے کے طور پر دئے جائیں۔ پھر یہ سوچ کر کہ بیل بہت سخت ہوتا ہے اور اس کو توڑ کر اندر کا گودا نکالنے میں بڑی زحمت ہوتی ہے' یہ بات طے پائی کہ بادشاہ کی خدمت میں صرف آم پیش کئے جائیں۔

جب بہت سے پکے ہوئے آموں کو توڑ کر اور انھیں پانی سے خوب دھو کر ایک جگہ جمع کیا گیا تو گاؤں والوں میں سے ایک نے ایسا سوال کر دیا۔ جس سے سب لوگ چکرا گئے۔ اس نے کہا۔

"اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ سب آم میٹھے ہی ہیں۔ ممکن ہے کہ اس میں سے بعض کم میٹھے اور بالکل کھٹے ہوں۔ ایسی حالت میں بادشاہ کے بگڑ جانے کا خطرہ ہے۔ ہمیں کوئی ایسی ترکیب کرنی چاہیئے کہ بادشاہ کی خدمت میں جتنے آم پیش کئے جائیں' وہ سب کے سب میٹھے ہوں۔

بات ٹھیک تھی لیکن اس کا پتہ کیسے چلایا جائے کہ سب آم میٹھے ہیں۔ ہر آدمی نے اپنے دماغ پر زور دے کر سوچنا شروع کیا لیکن کوئی ترکیب سمجھ میں نہ آتی تھی۔ بادشاہ کو تحفہ دینے کے خیال سے سب لوگوں کو جو خوشی تھی' اس پر جیسے اوس پڑ گئی۔ ہر آدمی کا چہرہ سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔ گاؤں کے تمام لوگ ایک دوسرے کو بے بسی کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ بہت دیر تک پورے مجمع پر خاموشی چھائی رہی۔ آخر میں ایک نے جو گاؤں میں سب سے زیادہ عقل مند سمجھا جاتا تھا۔ یکایک چلا کر کہا۔

"تم لوگ سب بے وقوف ہو۔ یہ کون سی مشکل بات ہے! سب لوگوں کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ سب کی نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں۔ اس نے فخر کے ساتھ کہنا شروع کیا۔

"ہر آم کو تھوڑا سا کاٹ کر چکھ لیا جائے اور کٹے ہوئے ٹکڑے کو پھر اسی طرح چپکا دیا جائے۔ اس طرح آم کی مٹھاس کا پتہ چل جائے گا اور کھٹے آم کا خطرہ نہ رہے گا۔

یہ سن کر سب لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ان کو یہ ترکیب بے حد پسند آئی۔ تمام آموں کو چکھ کر دیکھ لیا گیا اور چکھے ہوئے ٹکڑوں کو آموں پر اس طور سے چپکا دیا گیا کہ وہ کٹے ہوئے معلوم نہ ہوں۔ اس کے بعد گاؤں کے پانچ عقل مند آدمیوں کو چنا گیا۔ ان کے ذمّہ یہ خدمت سپرد کی گئی کہ وہ بادشاہ کی خدمت میں گاؤں والوں کی طرف سے یہ

تحفہ پیش کریں گے

یہ لوگ بادشاہ کے پاس آم لے کر پہنچے تو وہ بے حد خوش ہوا - اس نے اپنے ساتھ کے لوگوں سے کہا -

"دیکھو میری رعایا مجھے کس قدر چاہتی ہے - میں ان لوگوں کو بہت بڑا انعام دوں گا" یہ کہہ کر اُس نے کھانے کے ارادے سے ایک آم اُٹھالیا - آم اُٹھاتے ہی اس کا کٹا ہوا حصہ جس کو چکھ کر گاؤں والوں نے پھر چپکا دیا تھا - بادشاہ کی ہتھیلی پر گر پڑا - اس کو فوراً معلوم ہو گیا کہ سب کے سب آم جوٹھے تھے - اس کے چہرے پر غصہ کے آثار نمودار ہو گئے - غیض و غضب کی حالت میں وہ کوئی حکم دینے والا تھا کہ ایک مصاحب نے ہاتھ باندھ کر کہا -

"جہاں پناہ ! اس گاؤں کے لوگ اپنی حماقت اور بے وقوفی کے لئے دُور دُور مشہور ہیں" -

یہ سن کر بادشاہ کا غصہ کچھ کم ہوا لیکن وہ اس بدتمیزی کے لئے اُن کو سزا دئے بغیر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا - اس نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ انہیں آموں سے ان آدمیوں کو مارا جائے - ان کی یہی سزا ہے - بادشاہ کے حکم کی دیر تھی - بے شمار آم اُن کے سر، چہرے اور گردن پر برسنے لگے - بادشاہ کا رعب غالب تھا - وہاں سے بھاگ بھی نہ سکتے تھے - خوف سے کھڑے تھر تھر کانپ رہے تھے اور آموں کی بارش اُن کے سروں پر ہو رہی تھی - آم پکے ہوئے اور نرم تھے - اس لئے کسی کو زیادہ چوٹ نہیں آئی ایک نے کہا "اچھا ہوا کہ ہم لوگ بیل لے کر نہ آئے - ورنہ آج ہمارے سروں کا خدا حافظ تھا" -

بچو ! تم نے دیکھا - ان کی ذرا سی حماقت نے سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا - اگر وہ عقل سے کام لیتے تو ان کو بادشاہ سے بہت بڑا انعام ملتا - اپنی حماقت کی وجہ سے ان کو مار کھا کر اور ذلیل ہو کر واپس ہونا پڑا -

---

لطیفے

مریض - ڈاکٹر نے کہا تھا کہ میں چھ ہفتوں کے اندر تمہیں اپنے پاؤں پر کھڑا کر دوں گا !

دوست - تو کیا تمہیں اس نے تندرست کر دیا ؟

مریض - صاحب ! اس کا بل ادا کرنے کے لئے مجھے اپنی موٹر فروخت کرنا پڑی اور اب میں پیدل جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہوں -

---

والد - (اپنے صاحبزادے کے متعلق مدرسہ کی رپورٹ پڑھ کر) کیمسٹری سے لے کر چال چلن تک ہر ایک چیز خراب، بولو تمہارا کیا جواب ہے ؟

لڑکا - میری رائے میں تو ماسٹر پر ہتک عزت کا دعوے دائر کر دینا چاہئے -

جگت سنگھ

ماؤسی تنگ

بچو! تم میں شاید بہت سے بچے ایسے ہوں گے۔ جنھوں نے کبھی ماؤسی تنگ کا نام بھی نہ سنا ہوگا۔ آؤ آج ہم تمھیں ان کی زندگی کے کچھ حالات بتائیں۔

چین کی حکومت کے صدر ماؤسی تنگ ہیں۔ گو آپ کی عمر اس وقت اٹھاون (۵۸) سال کے قریب ہے۔ لیکن دیکھنے میں وہ صرف چالیس (۴۰) سال کے معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کا قد ۵ فٹ ۸ انچ ہے جو عام چینی لوگوں کے مقابلے میں قدرے زیادہ ہے۔

آپ کو پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔ یہاں تک کہ جو چیز سامنے آتی ہے اسے پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ آپ کو فلسفہ اور مطالعۂ تاریخ کا بڑا شوق ہے۔ علاوہ اس کے آپ ماشاءاللہ اچھے خاصے شاعر بھی ہیں۔ ان کی یادداشت یا قوّتِ حافظہ بہت قابلِ تعریف ہے۔

آپ نہایت ہی سادہ طبیعت کے انسان ہیں۔ اتنی بڑی حکومت کے صدر ہونے کے باوجود کوئی گھمنڈ نہیں رکھتے۔ ان کا سبھاؤ اب بھی ویسا ہی ہے جیسا اس وقت تھا جب وہ ایک معمولی سپاہی تھے۔ اور صرف پندرہ (۱۵) ڈالر تنخواہ پاتے تھے۔ اُس وقت اُن کی بھدّی اور بالکل سادہ سی وردی ہوتی تھی۔ جس میں جگہ جگہ پر سردی سے بچاؤ کے لئے روئی ٹُھکی ہوتی تھی۔ ایک معمولی سا بستر تھا اور مزیدار بات یہ تھی کہ آپ ایک ٹوٹے ہوئے بکس سے میز کا کام لیتے تھے۔

ماؤسی کی دو خاص عادتیں ہیں ایک تو یہ کہ وہ لال مرچ کا حد سے زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ اور دوم تمباکو پینے میں کمال رکھتے ہیں چنانچہ چینیوں نے ان کے متعلق بہت سے گانے بنائے ہیں۔ جب آپ فوج میں تھے۔ اور تمباکو کی بڑی قلت تھی۔ تو آپ اپنے پائپ میں جنگلی بوٹیاں جلا جلا کر اپنی تسلّی کر لیا کرتے تھے۔ مئی ۱۹۳۸ء میں آپ کو تمباکو نوشی کے لئے پانچ (۵) ڈالر الاؤنس دیا جانے لگا۔

ان کا جنم ۱۸۹۳ء میں صوبہ ہونان کے ایک چھوٹے سے گاؤں شاؤشان میں ہوا تھا۔ ان کے باپ کا نام ماؤجن شنگ تھا۔ جو اَن پڑھ تھا اور اپنا نام بھی بڑی مشکل سے لکھ سکتا

تھے۔ وہ ایک غریب کسان تھا جس کے پاس تھوڑی سی پہاڑی زمین تھی اور جس کی آمدنی بہت قلیل ہونے کے باعث گزر اوقات بڑی مشکل سے ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ادھار لے کر بال بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ اس کے اوپر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ وہ قرض خواہوں کے ڈر سے اپنے وطن عزیز کو بھی چھوڑ بھاگا تھا۔ مگر جب ماؤسی پیدا ہوا اُس وقت اس کا باپ واپس اپنے گاؤں میں آ چکا تھا۔

کسی زمانے میں وہ چاولوں کا بہت بڑا تاجر تھا۔ اس لئے وہ کافی خوشحال تھا۔ اس کا مزاج بڑا تیز تھا۔ مگر جو مزدور اس کے پاس کام کرتے تھے۔ وہ ان کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ گو اپنے بچوں کی دیکھ بھال اور ان کی تعلیم و تربیت کے کام سے وہ بڑا لاپروا تھا۔ مگر "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" کے مصداق ماؤسی شروع بچپن ہی سے بڑا لائق اور سمجھدار مانا جاتا تھا۔ ہاں اس میں ایک خاص نقص ضرور تھا۔ کہ اس کی اپنے والد سے نہیں بنتی تھی۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی جھگڑا چلتا ہی رہتا تھا یہاں تک کہ ماؤسی جب بارہ سال کی عمر کا ہوا۔ تو وہ اپنے باپ کو ایک حکومت اور اپنے آپ کو ایک مخالف پارٹی تصور کرتا تھا۔ چونکہ وہ اپنے باپ سے اکثر کج خلقی سے پیش آتا تھا اس لئے اس کا باپ اسے گالیاں دیتا اور بُرا بھلا کہتا تھا۔ کئی بار ماؤسی نے تنگ آکر اپنے باپ کو یہ کہنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ کہ" ایک باپ کو ہمیشہ رحم دل اور اپنی اولاد کا خیر خواہ ہونا چاہیئے"۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ کہ باپ بیٹے میں کسی معاملے پر بہت لے دے ہوئی۔ جس پر نوجوان ماؤسی گھر سے بھاگ نکلا اور قریب ہی ایک تالاب کے کنارے جا کھڑا ہوا۔ اس کے باپ نے اس کا پیچھا کیا۔ اُسے دیکھ کر جھٹ ہی ماؤسی نے للکار کر کہا۔ "پتاجی! اگر آپ نے میری طرف آنے کی کوشش کی تو میں تالاب میں چھلانگ لگا دوں گا"۔

باپ نے ماؤسی کو مجبور کیا۔ کہ وہ اس ناجائز برتاؤ کی معافی مانگے چنانچہ اس روز ماؤسی نے بڑی عقلمندی سے کام لیا اور فوراً اپنے باپ کے پاؤں پر گر پڑا۔ چنانچہ معافی مانگ لینے کے بعد نہ معلوم اُسے کیا سوجھی وہ فوراً گھر سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اور اپنے گاؤں سے چند ہی میل کی دُوری پر ایک اسکول میں جا داخل ہوا۔ لیکن یہاں بھی اس کی طبیعت نہ لگی کیونکہ اس کے ساتھی اور ہم جماعت بڑے بڑے امیروں کے لڑکے تھے۔ اور یہ ایک معمولی کسان مزدور کا لڑکا تھا۔

اس کے بعد ماؤسی چنگ شاہ شہر کے ایک اسکول میں جا داخل ہوا۔ اس وقت اس کی عمر سولہ (۱۶) سال کی تھی۔ وہاں اُسے اخبارات کے مطالعے کا بھی چسکا پڑ گیا۔ جن کے مطالعے سے اسے ملک کے حالات کا پتہ چلتا رہتا تھا۔ چنانچہ ملک کی محبت نے اس کے من میں اُمنگ پیدا کی۔ اور وہ فوراً ساٹ ڈالر ماہوار پر فوج میں بھرتی ہو گیا۔ لیکن وہ چھ ماہ سے زیادہ فوج میں بھی نہ رہ سکا۔ کچھ مدت اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد آخر پیکنگ کے ایک نارمل اسکول میں بطور ٹیچر ملازم ہو گیا۔ ذاتی سعی و کوشش اور خداداد قابلیت کے لحاظ سے وہاں کے پروفیسر ماؤسی سے بہت پیار کرتے تھے۔ اُسی دوران میں ماؤسی نے کئی بار کوشش کی کہ وہ اپنی فوج بنائے اور ملک کی تکالیف کو دُور کرے۔

۱۹۱۸ء میں ماؤسی کی والدہ وفات پا گئی اب اُس کے باپ نے بہت کوشش کی کہ ماؤسی گھر پر رہے۔ مگر وہ واپس

پیکنگ چلا گیا۔ جہاں اس نے نیشنل یونی ورسٹی اور لائبریری میں ملازمت اختیار کر لی۔ گو اس کی ڈیوٹی پروفیسروں کو اخبارات اور رسالے دینے کی تھی۔ مگر وہ چھپ چھپا کر پہلے چوری چوری تمام اخبارات خود پڑھ لیا کرتا تھا۔ یونی ورسٹی لائبریری کی ملازمت کے دوران میں ہی ایک پروفیسر کی لڑکی سے اس کی محبت ہو گئی۔ چنانچہ ایک سال کے بعد اس سے اس کی شادی بھی ہو گئی۔

۱۹۱۹ء میں ماؤسی شنگھائی جا پہنچا۔ اثنائے سفر میں اتفاق ایسا ہوا کہ کسی مسافر نے اس کے بوٹ چرائے۔ اس وجہ سے اُسے بڑی پریشانی کا سامنا ہوا۔ بچارا ننگے پاؤں کہاں جاتا۔ جیب میں پیسہ نہ تھا کہ دوسرا بوٹ خرید لیتا۔ حُسنِ اتفاق سے اُسے وہیں اس کا ایک پُرانا دوست مل گیا۔ جس نے کچھ مدد کی اور جس نے اس کو ایک بوٹ اور ایک چھتری خرید کر لا دی۔

۲۸ سال کی عمر میں ماؤسی کو کیمونسٹ پارٹی اور اس کے کاموں سے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ اس نے کئی سال کیمونسٹ پارٹی اور اس کے کام کاج کی جدوجہد میں گزار دئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی مصیبتوں کے بعد آخر اکتوبر ۱۹۴۹ء میں وہ ملک چین کا صدر بن گیا۔

سادگی کا یہ حال ہے کہ ابھی تک آپ ایک ٹوٹے ہوئے پرانے مندر میں قیام پذیر ہیں جس کے ایک کمرے کو اپنے حسبِ منشا ٹھیک کرا رکھا ہے۔

۱۹۳۳ء میں ماؤسی نے ایک فلم ایکٹریس سے بھی شادی کر لی تھی۔ جس کے بطن سے اس وقت ۱۱ اور ۹ سال کے دو لڑکے ہیں۔ خدا انہیں عمر بخشے اور اس قابل بنائے کہ وہ اپنے والد کی طرح ذاتی سعی و کوشش اور جدوجہد کے طفیل ملک کے بڑے آدمیوں میں شامل ہو سکیں۔ آمین!

حامد اللہ افسر

پریاں

(۱)

بچّوں سے کھیلنے
چاند والی پریاں آئیں
بچّوں سے کھیلنے
نندیا کے ساتھ میں
چُھپ چُھپ کے آئی ہیں
کلیاں ہیں ہاتھ میں
باغوں سے لائی ہیں
بچّوں سے کھیلنے
چاند والی پریاں آئیں
بچّوں سے کھیلنے

(۲)

سرسوں کے کھیت میں
تاروں کی چھاؤں میں
ندی کی ریت میں
افسرؔ کے گاؤں میں
بچّوں سے کھیلنے
چاند والی پریاں آئیں
بچّوں سے کھیلنے

دیوکی نندن ناصح

دیا سلائی

یہ ننھی سی دیا سلائی جس کی مدد سے صبح سویرے آگ سلگا کر امّی جان نے تمہارے لئے گرم گرم ناشتہ تیار کیا تھا بڑے کام کی چیز ہے - دیا سلائی کی ایجاد سے پہلے لوگ چقماق کے پتھروں اور خشک لکڑیوں کو آپس میں رگڑ کر آگ پیدا کرتے تھے - اس طرح آگ تو جل جاتی تھی لیکن وقت بہت خرچ ہوتا تھا اور تکلیف بھی کافی اٹھانا پڑتی تھی - آج کل تو دیا سلائی کو مصالحے پر رگڑا اور آگ تیار ملتی ہے - کیا تم جانتے ہو یہ دیا سلائی کس طرح بنتی ہے ؟ آؤ آج تمہیں یہ دلچسپ کہانی سنائیں -

یہ کہانی جنگلوں سے شروع ہوتی ہے جہاں دیاسلائی بنانے کے درختوں کو کاٹا جاتا ہے - دنیا بھر میں دیا سلائی بنانے کے لئے سب سے اچھی لکڑی سویڈن کے جنگلوں میں ملتی ہے - ہمارے ملک میں یہ لکڑی آسام کے گھنے جنگلوں سے کاٹ کر دریاؤں میں بہا دی جاتی ہے - پانی میں بہتے بہتے یہ لکڑی کافی نرم ہو جاتی ہے - دیا سلائی اور دیا سلائی کے بکس بنانے کے لئے نرم لکڑی ہی درکار ہوتی ہے - دیا سلائی کے کارخانوں میں

سب سے پہلے مشینوں کی مدد سے ان بڑے بڑے درختوں کو چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹا جاتا ہے - ایک مشین ان ٹکڑوں کو چھیل کر گتے کی موٹائی جتنی لکڑی کی تختیاں سی بنا دیتی ہے - یہ کام اتنی تیزی اور صفائی سے ہوتا ہے کہ دیکھنے والا دنگ رہ جاتا ہے - ایک اور مشین لکڑی کی ان تختیوں سے دیا سلائیاں بناتی ہے - دوسری

طرف ان تختیوں سے دیا سلائی کے بکس بنانے کی مشینیں کام کرتی ہیں - ان دیا سلائیوں کی نمی دور کرنے کے لئے انہیں خاص قسم کی بھٹیوں میں رکھا جاتا ہے - جب یہ دیا سلائیاں سوکھ جاتی ہیں تو انہیں ایک خاص قسم کی مشین میں ڈال دیا جاتا ہے - مشین کے اندر ان دیا سلائیوں کے سروں پر آگ جلانے کا مصالحہ خود بخود لگ جاتا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ باہر آتے تک مشین کے اندر لگے ہوئے پنکھے مصالحے کو سکھا دیتے ہیں - اس کے بعد ان دیا سلائیوں کو بکسوں میں بند کرنے کا کام شروع ہوتا ہے - مشین بکس کو کھولتی ہے، اوپر سے گنتی کی دیا سلائیاں گر کر بکس کو بھر دیتی ہیں اور پھر مشین ہی بکس کو بند

کر دیتی ہے۔ ایک اور مشین بکسوں پر رنگین کاغذ چپکا دیتی ہے۔ ان نیا رنگبکسوں کو ایک مرتبہ پھر خاص بھٹیوں میں رکھا جاتا ہے آخری مشین دیا سلائی کے بکس کے دونوں کناروں پر وہ مصالحہ لگاتی ہے جس پر رگڑنے سے دیا سلائی کی آگ پیدا ہوتی ہے۔ دیا سلائیاں بنانے کا سارا کام مشینوں کی مدد سے کیا جاتا ہے اور بڑے بڑے کارخانے دن میں دیا سلائی کے لاکھوں بکس تیار کر دیتے ہیں۔ مشینوں کی وجہ سے لاگت بھی بہت کم آتی ہے۔ ساٹھ دیا سلائیاں صرف تین پیسے میں بکتی ہیں۔ لو اب ہماری کہانی ختم ہوتی ہے۔ امید ہے ننھی دیا سلائی کا یہ گیت تمہیں پسند آئے گا ؟

میں ہوں ننھی دیا سلائی
پوچھو بھلا کہاں سے آئی

چھوٹے بچو پیارے بچو
میری باتیں غور سے سن لو

میرے دم سے چولھا جلتا
سارے جگ کا کام ہے چلتا

حلوا پوری اور مٹھائی
سب یہ میرے کام ہیں بھائی

سردی جب ہے تمہیں ستاتی
میں ہوں اس کو دور بھگاتی

جنگل کا گھر چھوڑا میں نے
سب سے ناطہ توڑا میں نے

کل پرزوں میں کشٹ[۱] اٹھایا
تب جا کر یہ جیون[۲] پایا

ہنستے ہنستے جل جاتی ہوں
کام تمہارے تب آتی ہوں

چھوٹی ہوں پر کام بڑا ہے
جگ میں میرا نام بڑا ہے

---

[۱] تکلیف۔ [۲] زندگی۔ شکل

لطیفہ

مالک ۔ ارے تم اس طرح کیوں رو رہے ہو ؟

نوکر ۔ آپ کی بیوی نے مجھے مارا ہے !

مالک ۔ تو پھر کیا ہوا تو نے کبھی ہمیں بھی روتے دیکھا ہے ؟

ایس۔ این۔ سادھو

بے جوڑ باتیں

سب سے بڑا مکان ۔ دنیا میں سب سے اونچی عمارت نیویارک میں ہے۔ اس عمارت کا نام "امپائر اسٹیٹ بلڈنگ" ہے۔ اس میں تقریباً چھ ہزار کھڑکیاں ہیں اور ۸۰ ہزار سے زائد آدمی رہتے ہیں۔

دودھ دینے والا درخت ۔ جنوبی امریکہ کے جنگلوں میں ایک قسم کا درخت پایا جاتا ہے۔ جس کا نام "اوڈری" ہے۔ اس درخت سے سفید رنگ کا رس نکلتا ہے۔ جو ذائقے میں دودھ کے مانند ہوتا ہے۔ وہاں کے لوگ اس دودھ کو بڑے مزے سے پیتے ہیں۔

لمبی دُم ۔ جاپان کے جزیرہ شکوکو کے ایک گاؤں شنواره میں بارہ فٹ لمبی دُم والی چڑیاں پائی جاتی ہیں۔ جب یہ چڑیاں چلتی ہیں تو خاص قسم کے ملازم ان کی دُموں کو سنبھال کر ساتھ چلتے ہیں۔ ان کے لئے خاص طور پر اونچے اور تنگ پنجرے بنائے جاتے ہیں تاکہ ان کی دُموں کو نقصان نہ پہنچے۔

لطیفہ :- بیوی۔ تمہارا وہ دوست ناقابل اعتبار تھا ہمارا تولیہ غائب ہے۔
شوہر۔ کونسا تولیہ ؟ کیا کوئی بہت قیمتی تھا ؟
بیوی۔ وہی تو تھا جو تم گرینڈ ہوٹل سے چُرا کر لائے تھے !

آج کل

آٹھ آنے

بر ۱۹۵۲ء

جلد کی خوبصورتی کے لئے

لکس ٹائلیٹ صابن

بہترین ہے"

نروپا رائے
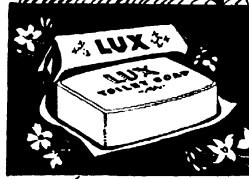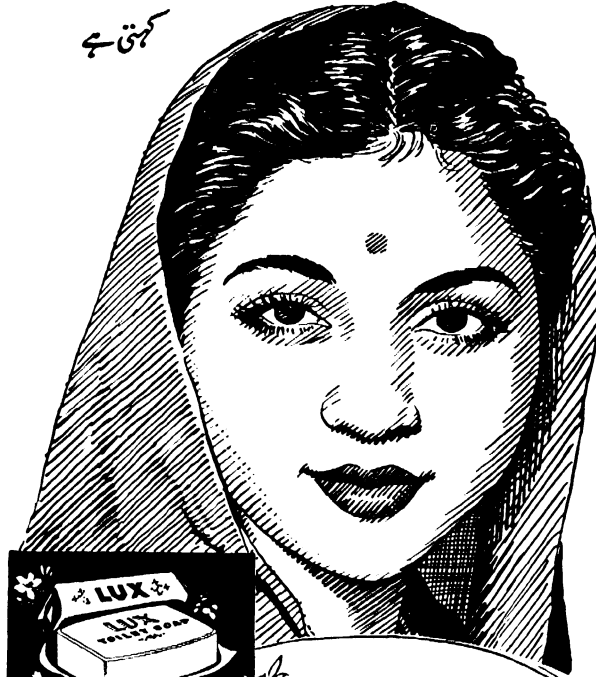
یہ سفید اور خالص صابن، جس کی
خوشبو دلکش ہے، آپ کی
جلد کو بھی دلکش بنائے گا!

فلمی ستاروں کا
حسن بخش صابن

LTS. 333-X30 UD

پہلا سبق
سمجھدار مائیں جانتی ہیں کہ ننھے بچوں
کی زندگی کا پہلا سبق انہیں نونہال پر
پرورش کرنا ہے۔
نونہال معدہ کی تمام خرابیوں کو
دور کرتا ہے۔ ہڈیوں کو مضبوط بناتا ہے۔ اور
دانت نکالنے میں مدد دیتا ہے۔
نونہال
ننھے بچوں کو مضبوط بنانے والا
ان کا دل پسند ٹانک
قیمت فی شیشی بارہ آنے (۱۲/)
نوٹ :۔ بچوں کی پرورش کیلئے کتابچہ "ہمدرد اطفال" مفت طلب فرمائیں۔
ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی
Naunehal
a Hamdard Product

"روزانہ قوت کے لئے ہم
گھر پر ہمیشہ ڈالڈا
سے کھانا پکاتے ہیں"
DALDA
ڈالڈا
ڈالڈا موزوں غذا میں
آپ کے لئے ضروری قوت بخش
چکنائی مہیا کرتا ہے
HVM. 168-50 UD

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- بال مکند عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد

جلد ۱۱ نمبر ۴

سالانہ چندہ:- ہندوستان میں - چھ روپے
پاکستان میں - چھ روپے

غیر ممالک سے:- نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- ہندوستان میں - آٹھ آنے
پاکستان میں - آٹھ آنے

نومبر ۱۹۵۲ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

ترتیب

بچوں کا آج کل

جوش ملیح آبادی

فیضان

خوشا طالع کہ رازِ این و آں بخشا گیا ہم کو
مقامِ فقر میں نازِ شہاں بخشا گیا ہم کو

اجل کی حکمرانی ہے جہاں اُس کنجِ ظلمت میں
نصیبِ خضر و آبِ جاوداں بخشا گیا ہم کو

جہاں شاہوں کو اِذنِ کفش برداری نہیں ملتا
وہاں تاج و نگیں، طبل و نشاں بخشا گیا ہم کو

جہاں قدسی بھی اک جامِ سفالیں کو ترستے ہیں
وہاں پیمانۂ ہفت آسماں بخشا گیا ہم کو

جہاں ہر پنکھڑی اک باغِ جنّت ہے وہاں ساقی
سجا کر طشتِ زر میں گلستاں بخشا گیا ہم کو

کمان و تیر ڈھلتے ہیں جہاں اُس کارخانے میں
خمِ قوس و جمالِ کہکشاں بخشا گیا ہم کو

جمود و شیب کی پرچھائیں بھی جس پر نہیں پڑتی
وہ عزمِ زندہ و قلبِ جواں بخشا گیا ہم کو

عروسِ بادہ خود جس کا طواف اے دوست کرتی ہے
سبک روحی کا وہ رطلِ گراں بخشا گیا ہم کو

خوشا قسمت کہ اس خورشید کے دورِ سیاست میں
مہکتی کاکلوں کا سائباں بخشا گیا ہم کو

بہاراں کے جدید آئینِ جاں پرور کے ایماء سے
گرے جو برق پر وہ آشیاں بخشا گیا ہم کو

بفیضِ عشق اپنے دور کے ہم وہ برہمن ہیں
کہ نظمِ دیر و دامانِ بتاں بخشا گیا ہم کو

یہ کیسی خوش نصیبی ہے کہ ریگستانِ تقویٰ میں
شراب و شعر کا آبِ رواں بخشا گیا ہم کو

نقاب افگندہ ہیں رعنائیاں ذرات و انجم کی
تماشائے زمین و آسماں بخشا گیا ہم کو

بہشت و عرش خود مجرے کو آئے دل کے حجرے میں
نئی معراج، انوکھا ارمغاں بخشا گیا ہم کو

دماغِ کافری نے سینۂ ویراں کو یوں دیکھا
دلِ آسودۂ پیغمبراں بخشا گیا ہم کو

دیارِ عشق میں روشن ہوئیں جب عقل کی شمعیں
سرِ نجبہ افسرِ یونانیاں بخشا گیا ہم کو

حریمِ فکر میں یوں ڈوب کر بیٹھے کہ بالآخر
یقیں جس پر فدا ہو وہ گماں بخشا گیا ہم کو

جلوسِ شوق کے پیچھے چلے اور اتنی مدت تک
کہ اعزازِ امیرِ کارواں بخشا گیا ہم کو

رہے سرکارِ غم کے زیرِ فرماں اس عقیدت سے
کہ خوش نودی میں قلبِ شادماں بخشا گیا ہم کو

جوانی تج کے یوں کی خدمتِ اقطابِ مے خانہ
کہ آخر منصبِ پیرِ مغاں بخشا گیا ہم کو

بحمد اللہ کہ جوشؔ اس بدمذاقی کے زمانے میں
جمیلِ مظہری[1] سا قدرداں بخشا گیا ہم کو

[1] حضرت علامہ جمیلؔ مظہری (پٹنہ)

سید احتشام حسین

آلِ احمد سرور — بہ حیثیت شاعر

اب سے تقریباً اٹھارہ سال پہلے ابتدائی کلام کا مجموعہ "سلسبیل" شائع کرنے کے بعد آلِ احمد سرور پورے طور پر تنقیدِ ادب کی جانب متوجہ ہو گئے اور کچھ دِنوں تک ایک آدھ نظموں کے سوا انھوں نے نثر ہی کو اظہارِ خیال اور پختگیٔ شعور کا ذریعہ بنایا۔ اس لئے سلسبیل کے شاعر سرور اور موجودہ سرور کے درمیان ارتقائے شعور کی ایک طویل زنجیر نظر آتی ہے۔ سلسبیل کی شاعری کو ایک موجِ تاثر کہہ سکتے ہیں جس میں اونچی لہریں اور طوفان نہیں ہیں۔ لیکن تفکّر اور رکھ رکھاؤ کے بعض اشارے جو بعد کی شاعری میں اہمیت اختیار کر گئے یہاں بھی نظر آ جاتے ہیں۔ بیس بائیس سال کی عمر کی شاعری میں رنگینی، کیف اور تحیّر کے عناصر تو ہو سکتے ہیں، لیکن سنجیدگی، بلند خیالی، اور فنی پختگی کی محض جھلک ہی دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ جھلک ہلکی سہی لیکن موجود تھی، اور شاید اسی سے مرعوب ہو کر پروفیسر رشید احمد صدیقی نے سرور کو "بالطبع ذرا توبۃ النصوح قسم کا" انسان کہا تھا۔ ایک طرح کا ضبط سرور کے یہاں ۱۹۳۲ء میں بھی تھا، جب وہ کشمیر کی وادیوں میں گلگشت کر رہے تھے اور آج بھی ہے جب وہ ادب کے پیچیدہ مسائل پر فلسفیانہ اور علمی حیثیت سے غور کر رہے ہیں۔ سلسبیل میں ایک شاعرانہ مزاج ملتا ہے۔ مشاہدہ کی صلاحیت نظر آتی ہے۔ تازگی کی کوشش دکھائی دیتی ہے۔ ان خصوصیات میں سے ہر ایک کا ارتقا بعد میں ہوا۔ خود سرور نے اپنے اس مجموعے کے متعلق اس کے دیباچے میں بعض دلچسپ اشارے کئے ہیں۔

جس درمیانی دور میں سرور تنقیدی مضامین لکھتے رہے وہ بھی اُن کے شاعرانہ مزاج کی تعمیر اور فنی شعور کے ارتقا کا دَور تھا۔ اچھی تخلیق کے لئے اچھے مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور سرور نے مطالعہ ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ مغربی ادبیات کے وسیع اور گہرے مطالعے نے انھیں اُردو شاعری کی روایات سے بدظن نہیں کیا۔ بلکہ اُن کے سمجھنے میں مدد دی۔ اس کا پتہ سلسبیل کے بعد کی شاعری کے سرسری مطالعہ سے بھی چل سکتا ہے۔ مختلف اسالیب اور نظریاتِ فن کے مطالعہ نے اُن کے اسلوب میں پختگی اور اندازِ بیان میں قادر الکلامی کی شان پیدا کر دی ہے۔ یہ بات محض عروض اور معانی و بیان کے مطالعہ سے نہیں حاصل ہوتی بلکہ شعور کی وسعت اور گہرائی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تنقید اور تخلیق ساتھ نہیں چل سکتیں۔ ایک اچھا نقاد اچھا شاعر نہیں ہو سکتا۔ اس کے نفسیاتی اسباب بھی بتائے جاتے ہیں۔ لیکن تقریباً ہر زبان میں ایسے ادیب اور شاعر ملتے ہیں جنھوں نے تنقیدی اور تخلیقی دونوں قسم کے ادبوں کے گیسو سنوارے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ حالات اور مقتضیات کی بنا پر ایک کے مقابلے میں دوسرے کی جانب زیادہ توجہ دی گئی ہو۔ اور بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہو کہ تنقید کی زلفوں کا اسیر شعر کی دیوی کا پجاری نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ کوئی فیصلہ کن دلیل نہیں ہے۔ اردو ادب ہی کی تاریخ میں اس کی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں۔ گذشتہ پانچ چھ سال میں آلِ احمد سرور نے جو شعری سرمایہ پیش کیا ہے وہ اُن کی شاعرانہ اور تخلیقی صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔ یہاں تخلیقی کا مفہوم کسی قدر محدود کرنا ضروری ہوگا۔ کیونکہ سرور کے یہاں وہ بیانیہ شاعری نہیں ملتی جو تخیئلی پیکر تراشتی اور واقعات کو ترتیب دیتی ہے، بلکہ وہ خیال انگیز شاعری پائی جاتی ہے جو تخیّل سے تفکّر کا کام لیتی ہے۔ یہ بھی ایک نوع کی تخلیقی صلاحیت ہے جو طول و عرض میں سطح پر دُور تک پھیلنے کے بجائے اوپر بلندی کی جانب اور نیچے گہرائی کی طرف پھیلتی ہے۔ اس صورتِ حال کو اُن کی قوّتِ نقد کا نتیجہ کہنا بجا نہ ہوگا۔

گذشتہ دس سال میں سرور نے اتنی نظمیں اور غزلیں کہہ لی ہیں کہ اُن سے ایک معقول حجم کا مجموعہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت تک اُن کے

تنقیدی مضامین کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ نظموں کا ایک مجموعہ مدت ہوئی شائع ہوا تھا۔ موجودہ دور کی نظمیں اور غزلیں طویل وقفوں کے بعد اس طرح شائع ہوتی رہیں کہ اُن کا مجموعی تاثر کھو سا گیا ہے۔ اس لئے موجودہ جائزے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ شعر و ادب سے عام دلچسپی لینے والے سرور کے فن اور تصوّرات سے متعارف ہو سکیں۔

سرور دورِ جدید کے اُن شعراء میں سے ہیں جو شاعری کی تمام فنّی تحریکات سے واقف ہونے کے باوجود فنّی حیثیت سے اپنے لئے کلاسکی طرز کو پسند کرتے ہیں۔ مثلاً وہ کسی ادبی مباحثے میں آزاد نظم نگاری کی موافقت میں بحث کریں گے۔ لیکن اُس کا جواز ثابت کرنے میں کسی وقت بھی قدیم اسالیب کے احترام میں کمی نہیں کریں گے۔ جن لوگوں نے سرور کے تنقیدی مضامین کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ قدیم اور جدید کے رَد یا قبول کرنے میں اُن کا روّیہ جذباتی نہیں عقلی ہے۔ وہ قدیم شاعری اور فنِ شعر کی اُن خصوصیات کو اپنانے سے گریز نہیں کرتے جو اثر اور لطف میں اضافہ کرتی ہیں، جو اظہارِ خیال میں مدد دیتی ہیں۔ حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر تنقید ہی میں نہیں شاعری میں بھی اُن کی رہنمائی کرتا رہا ہے۔ کہ قدیم اور جدید محض قدیم اور جدید ہونے کی حیثیت سے قابلِ قبول نہیں ہیں۔ بلکہ تسلسلِ اقدار اور افادیت کے لحاظ سے اہمیت حاصل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ کے دو شعروں کا حوالہ اُن کے یہاں اکثر ملتا ہے۔

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصۂ قدیم و جدید

اور

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اَڑنا منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

لیکن کلاسکی معیاروں سے سرور کی وابستگی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ جدید رومانیت، تشبیہہ اور استعاروں، اشاروں اور کنایوں کے نئے پن کو اپنی شاعری میں جگہ نہیں دیتے۔ اچھے معیار اور پُراثر اسلوب کی یہی دریافت اُن کے تنقیدی شعور کا عطیہ ہے جو جدید اور قدیم دونوں سے قریب ہے اور دونوں کی اضافی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے۔

ابتدائی دور کی شاعری کے بعد سرور کی نظموں اور غزلوں میں دورِ جدید کی وہ آواز سنائی دینے لگتی ہے جو جانی پہچانی ہونے کے باوجود بے حد پیچیدہ ہے۔ اس میں غم، خوشی، اُمنگ، افسردگی، شکست، فتح، بے یقینی اور خود اعتمادی ہر ایک کی آمیزش ہے۔ کبھی یہ نغمے الگ الگ سُروں میں الاپے جاتے ہیں اور کبھی ایک دوسرے میں گھُل مِل جاتے ہیں۔ دورِ جدید کی یہ آواز غمِ محبت اور غمِ روزگار کے بہت سے پہلوؤں سے مل کر بنی ہے۔ اور یہ اُسی وقت بلند ہوتی ہے جب اس غم کو اُکسایا جاتا ہے۔ غم کے لفظ سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس میں رونے دھونے کا ذکر ہوتا ہے۔ بلکہ دردمندی، طلبِ صادق، انفرادی سربلندی اور اجتماعی بہبودی کے جذبات مل کر اس جذبے کو ترتیب دیتے ہیں۔ اس میں مادّی، ذہنی اور روحانی بے چینی کا احساس نظر آتا ہے۔ یہی باتیں بہت سے شاعروں اور ادیبوں کو قنوطیت کی طرف لے جاتی ہیں۔ کیونکہ انھیں اس بے چینی کا احساس تو ہوتا ہے اس کا راز نہیں معلوم ہوتا۔ انھیں اندھیرا تو دکھائی دیتا ہے روشنی کی خبر نہیں ہوتی۔ سرور اس حیثیت سے اُس طبیب سے مشابہ ہیں جو مرض کو سمجھتا ہے۔ صحیح تشخیص کی کوشش کرتا ہے۔ مریض سے ہمدردی رکھتا ہے اور علاج کے طریقوں سے واقف ہے۔ اس لئے مرض کے دور کرنے میں کامیابی ہو یا نہ ہو۔ لیکن اُسے بھروسہ ہے کہ وہ جو نسخہ تجویز کر رہا ہے درست ہے۔ یہ ساری باتیں سرور میں اُسی جاندار تنقیدی شعور کی پیدا کردہ ہیں جس کی تربیت اور تہذیب میں اُنھوں نے ریاضت کی ہے۔

اس بات پر زور دینے کی ضرورت نہیں ہے کہ موجودہ دور نہ صرف ہندوستان بلکہ دُنیا کے بڑے حصے میں مادّی اور روحانی حیثیت سے زیادہ تر انسانوں کے لئے اُلجھن اور بے چینی کا دور ہے۔ مختلف لوگ اپنے شعور کے لحاظ سے اس سے مختلف شکلوں میں عہدہ بر آ ہوتے ہیں۔ مایوسی اور شکست خوردگی زندگی کے مسائل سے گریز۔ حقائق سے چشم پوشی ایک عام طریقہ ہے جس کا اظہار ادب میں مختلف شکلوں میں ہوتا ہے۔ لیکن جن کے پاس علم کی دولت ہے وہ یقین کی منزل پر پہونچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اُس انسانی جدوجہد کا ساتھ دیتے ہیں جو ایک پُر اُمید عقیدے کے بہاؤ میں آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ اُن کے یہاں رجائیت کا جوش ہوتا ہے۔ رجائیت ہوائی قلعہ بنانے کا نام نہیں ہے۔ حقائق سے گریز نہیں ہے۔ ہواؤں سے دامن بچا کر گزرنا نہیں ہے۔ بلکہ انسانی جدوجہد کے اُن پہلوؤں سے ہم آہنگی پیدا کرنا ہے جو عزم اور یقین کی روشنی میں منزل کی طرف لے جانے والی ہیں۔ سرور کی

ذہنی اُلجھنیں اور اُن کا تجزیہ موجودہ دور کے اکثر باشعور تعلیم یافتہ لوگوں کی ذہنی اُلجھنوں سے ملتی جلتی ہیں۔ لیکن اُن کا شعور انھیں اس منزل کی جانب لے جاتا ہے۔ جہاں یقین کے سہارے انسانی کارواں کو جانا ہے — یہ آہنگِ نشاط سرور کی نظموں اور غزلوں کی ایک ایسی خصوصیت ہے جس پر سب سے پہلے نظر پڑتی ہے۔ چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اُمید سرورؔ کے لئے محض ایک سہانا خواب نہیں ہے کشمکش اور جدوجہد کا منطقی نتیجہ ہے۔ ایک غزل کے چند شعر ہیں۔

غمِ جاناں، غمِ دوراں کے ہیں کتنے نشتر　　لیکن اب بھی مرے سینے میں لہو باقی ہے

قیدِ گیسو کے سوا اور ہیں قیدیں کیا کیا　　سرکشی کی ترے عشاق میں خو باقی ہے

جن کا تھا مجھکو جنوں یہ وہ بہاریں تو نہیں　　مری پلکوں میں ابھی اور لہو باقی ہے

آج شعلوں کی لپک ہے، نہ شراروں کا وہ رقص　　خاک میں میری مگر ذوقِ نمو باقی ہے

تلخیٔ زیست کے باوصف یہ کیا ہے کہ ترے　　فکر میں مستیٔ صد جام و سبو باقی ہے

سرورکا انسان کی عظمت پر عقیدہ اس جذبے کا سب سے بڑا محرک ہے۔

کتنے خوابوں کا امیں، کتنے خیالوں کا نقیب　　یوں تو انسان اکیلا نظر آتا ہے مجھے

گرمیں پامال بھی ہو جائیں تو بربادنہیں　　نقش مٹ مٹ کے سنورتا نظر آتا ہے مجھے

جانتا ہوں کہ بڑا سخت گنہ گار ہوں میں　　اس اندھیرے میں اُجالے کا پرستار ہوں میں

اندھیرے میں اُجالے کی یہ پرستاری ایک لمحے کی ترنگ یا خوابناک کیفیت نہیں ہے۔ اس عقیدے کا نتیجہ ہے کہ ع

ہجر کی رات ہوئی ہے تو سحر بھی ہوگی

سرور کا یہ ایک پسندیدہ موضوع ہے، اندھیرے اور روشنی کی پیکار ہیں وہ روشنی کی طرف، یاس اور اُمید کی کشمکش میں اُمید کی طرف اور شبِ تار اور سحر کی آویزش میں سحر کی طرف ہوتے ہیں۔ یہ صورت مسلسل ہمارے سامنے آتی رہتی ہے۔ سرور اسی جذبے سے سرشار ہو کر عمل کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ ذکر وعظ و پند یا اخلاقی درس نہیں۔ بلکہ جبرِ حیات کے سنجیدہ، باہوش اور پُر آگہی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ انسان کی ہزار ہا سال کی جدوجہد نے تہذیب کے محل کھڑے کئے ہیں۔ شہیدوں کی قربانیوں اور عالموں کے باشعور عمل نے زندگی کو برکتوں سے مالا مال کیا ہے لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اس لئے نئے انداز کے شہیدوں اور تجسس کے شیدائیوں کی ضرورت ہے۔ جن بےحس قدامت پرستوں اور قناعت پسندوں کے سینے میں یہ آگ روشن نہیں ہے وہ تہذیب اور علم کے سرمایہ میں کوئی اضافہ نہیں کرسکتے۔ لیکن جنھیں انسان سے محبت ہے اُن کے لئے ہر وقت جدوجہد کا دروازہ کھُلا ہوا ہے۔ سرور نے اپنی ایک بڑی ہی خوبصورت اور معنی خیز نظم میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے۔

سفر آساں تھا تو منزل بھی بڑی روشن تھی　　آج کس درجہ پُراسرار ہیں راہیں اپنی

کتنی پرچھائیاں آتی ہیں تجلی بن کر　　کتنے جلووں سے اُلجھتی ہیں نگاہیں اپنی

کتنے ماضی کے پرستار رُلاتے ہیں مجھے　　دلِ دیوانہ منانے سے کہیں منتا ہے

کب سے پیاسی ہے شہیدوں کے لہو کی دنیا　　اور لہو ہی سے سدا رنگ محل بنتا ہے

یہ لہو سرخیٔ لب، غازۂ رخسار بنا　　ورقِ لالہ بنا، ساغرِ گُلنار بنا

تشنگیٔ دشت کی شبنم سے بھلا کیا بجھتی　　زندگی کے لئے عزمِ رسن و دار بنا

عالمِ نور کے خوابوں سے بہلتے کب تک　　اشک ساں دیدۂ پُرنم میں مچلتے کب تک

آندھیاں تیز بھی، منزل تو دُور بھی　　روشنی لے کے ہم اپنی نہ نکلتے کب تک

وادیوں میں سبزہ پھول جنھیں کس کے لئے　　ہم ہمالہ کی بلندی کے طلبگار ہیں آج

تاج کل عظمتِ انساں کا قدم چومے گا　　کیا اندھیرے سے یونہی برسرِ پیکار ہیں آج؟

ایک اور نظم میں

روشنی عام کرو، فکر و نظر پاک کرو　　یہ جنوں اور ابھی سرکش و بیباک کرو

بستیاں ہمسرِ افلاک بھی ہو سکتی ہیں　　ہمتوں کو تو ذرا ہمسرِ افلاک کرو

نغمے برساؤ کچھ ایسے کہ خزاں چیخ اُٹھے　　اب ہمیشہ کے لئے شب کی ردا چاک کرو

جیسا کہ ابھی کہا گیا یہ سرور کا پسندیدہ اور محبوب موضوع ہے اور اس کی جڑیں اُن کے شعور کی گہرائیوں میں ہیں۔ کیونکہ اُنھوں نے زندگی اور اُس کے مختلف مظاہر کے مطالعہ سے یہی سیکھا ہے کہ عمل اور صحیح، باشعور اور پُرخلوص عمل سے دنیا کا نقشہ بدل سکتا ہے۔ اسی جذبے کے ماتحت اُنھوں نے اپنی ایک تازہ ترین نظم میں ایک قنوطی دوست کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ع

ہجومِ غم سے ہراساں ہے کس لئے اے دوست　　ہر ایک رات کی آخر سحر بھی ہوتی ہے

جہاں سیاہ گھٹاؤں نے دام ڈالے ہیں　　وہیں نمائشِ برق و شرر بھی ہوتی ہے

ہیب، سرد چٹانوں کے سخت سینے سے　　کبھی تراوشِ لعل و گہر بھی ہوتی ہے

جہاں خزاں نے اُجاڑے ہیں رنگ و بُو کے دیار　　وہیں بہار بہشتِ نظر بھی ہوتی ہے

بھڑکنے لگتے ہیں جب شعلہ ہائے جنگ و جدل　　نسیمِ امن و اماں چارہ گر بھی ہوتی ہے

یہ گردِ راہ، یہ ذروں کی موج آوارہ　　جہانِ تازہ کی پیغامبر بھی ہوتی ہے

بڑھے جو رنجِ اسیری تو قید ہے کیا چیز
قفس میں تربیتِ بال و پر بھی ہوتی ہے

حدیثِ غم کا تری سلسلہ دراز سہی
یہ داستان کبھی مختصر بھی ہوتی ہے

ان چند اقتباسات سے اس بات کا اندازہ بھی ہوگا کہ سرور کن تہذیبی قدروں کے لئے جد و جہد کا پیغام دیتے ہیں۔ اُن کی تیز اور حقیقت فہم نگاہ ان قدروں کے پہچاننے میں دھوکا نہیں کھاتی، وہ ایسے پُرفریب مواقع کا پردہ چاک کرنے میں طنز سے کام لیتے ہیں اور بڑی کامیابی سے اپنے نقطۂ نظر کی برتری اور اہمیت جتاتے ہیں۔ چنانچہ اُن کی نظموں میں سے "جب اور اب"، "ابھی تک"، "ریاست اچھی ہے جو غیر مذہبی بھی رہے" اور "بربادی یا آبادی" کا مطالعہ اِس حقیقت کو واضح کر دے گا کہ سرور طنز کا نشتر بھی کس چابک دستی سے چلا سکتے ہیں۔

سرور کی شاعری شخصیتوں، تحریکوں اور تجربوں کا جائزہ لینے میں تخیل سے کام لیتی ہے اور کسی شخصیت، تحریک یا تجربے کے مرکزی نقطے کے گرد تخیل کے جال بنتی ہے۔ اپنے موضوع سے گہری واقفیت کے ساتھ ساتھ وہ جذباتی لگاؤ بھی پیدا کر لیتے ہیں، اسی وجہ سے اُن کی کئی نظموں میں شادابی اور تازہ کاری کا احساس ہوتا ہے۔ اس نکتے کی تفصیل کا موقعہ نہیں ہے اور نہ بہت سے اقتباسات دیئے جا سکتے ہیں۔ پھر بھی وضاحت کے لئے اتنا کہنا ضروری ہے کہ وہ تخیل کی پرواز پر روک رکھنے کے باوجود احساس کی شدّت سے کام لے کر اشاروں ہی اشاروں میں بہت سی معنی خیز باتیں کہہ جاتے ہیں جن کو پھیلا کر کہنے میں اثر کا بھرپور وار نہ پڑتا۔ ایسے مواقع پر وہ بعض اجتماعی تصوّرات کو بھی انفرادیت کے پردے میں بیان کر کے پڑھنے والے کو قریب کھینچ لاتے ہیں۔ اُن کی ایک بہت ہی مکمّل، جامع اور پُرمعنی نظم "سعیِ وفا" اس کی بہت اچھی مثال ہے۔ اس کے سارے اشارے اور کنائے شخصی بھی ہیں اور جماعتی بھی۔ اِس میں خیال کا ارتقا جذباتی بھی ہے منطقی بھی۔ کیفیات کے تنوّع کا یکجا ہو کر نظم بن جانا جہاں ایک طرف اپنے موضوع سے گہری واقفیت کا پتہ دیتا ہے وہاں اسلوب اور اندازِ بیان پر قابو حاصل کر لینے کا مظہر بھی ہے۔ اس نظم میں کل بائیس شعر ہیں جو تین ٹکڑوں میں تقسیم کئے گئے ہیں۔ ان سے شاعر کے ذہن کے تعمیری اور تخلیقی عمل پر روشنی پڑتی ہے، اسے تمام و کمال نقل کر دینا ہی اُس کے حُسن کو واضح کرے گا۔

مجھے بزرگِ مشفق یہی تلقین کرتا ہے
کہ بزمِ ہند میں سعیِ وفا کرنے سے کیا حاصل

مریضِ ناتواں کا حال اب ناگفتنی سمجھو
دوا کرنے سے کیا حاصل، دعا کرنے سے کیا حاصل

حرم کے کار نامے دیر میں مقبول کیا ہوں گے
بتوں کے سامنے ذکرِ خدا کرنے سے کیا حاصل

خزاں میں نغمۂ اہلِ بہاراں کون سنتا ہے
بیاباں میں چمن کا تذکرہ کرنے سے کیا حاصل

سمجھ کر گردِ رہ وہ جھاڑ دیں گے اپنے دامن سے
دل و جاں اُن کے قدموں پر فدا کرنے سے کیا حاصل

یہاں ہر موج کے حلقے میں سو گرداب پنہاں ہیں
سفینہ نذرِ طوفانِ بلا کرنے سے کیا حاصل

جہاں نفرت کی آندھی ہو تعصب کی ہوائیں ہوں
اک ایسے دشت میں خیمہ بپا کرنے سے کیا حاصل

گُلوں کا کیا ہے نذرِ طاقِ نسیاں ہو ہی جائیں گے
شگوفوں کو اسیرِ ابتلا کرنے سے کیا حاصل

حریفوں کی سیاست سے اندھیرا ہی سہی گھر میں
نگاہِ لطفِ شمعِ انجمن کچھ اور کہتی ہے

ہوئی دورِ جنوں میں لاکھ رسوا رسمِ دلداری
کسی یوسف کی بوئے پیرہن کچھ اور کہتی ہے

غبارِ کارواں میں چھپ گئی منزل تو کیا غم ہے
اُفق سے پھوٹتی ننھی کرن کچھ اور کہتی ہے

یہ اودھ کے باغباں گو سبزۂ بیگانہ ٹھہرائیں
عروسِ وادیٔ گنگ و جمن کچھ اور کہتی ہے

اُٹھائی جا رہی ہیں گرچہ میخانے میں دیواریں
مری تہذیب کی رسمِ کہن کچھ اور کہتی ہے

بڑی پُرشور ہے زاغ و زغن کی نغمہ آرائی
مگر جمہور کی طرزِ سخن کچھ اور کہتی ہے

یہ اوجِ بے ستوں، یہ حلقہ ہائے دامِ پرویزی
زبانِ تیشہ، وضعِ کوہکن کچھ اور کہتی ہے

شکوہِ خسروی کیا عزّ و نازِ لعل و گوہر کیا
کہ مجھ سے سنّتِ دار و رسن کچھ اور کہتی ہے

کہاں تک پستیٔ اہلِ وطن پر نوحہ خوانی ہو
حدیثِ عظمتِ اہلِ وطن کچھ اور کہتی ہے

وہی مے آج بھی ہے تاج کے جامِ بلوریں میں
اودھ کی شام کے وہ میکدے آباد ہیں اب بھی

بہاریں میری صدیوں کی چمن بندی کا حاصل ہیں
لبِ تاریخ کو میرے فسانے یاد ہیں اب بھی

"قفس کیا، حلقہ ہائے دام کیا، رنجِ اسیری کیا"
یقیں کی روشنی جاگے تو دل آزاد ہیں اب بھی

بہارِ جنتِ کشمیر سے تا ارضِ کاویری
وطن میں میرے کتنی نکہتیں آباد ہیں اب بھی

یہ صدیوں کی حنا بندی کبھی تو رنگ لائے گی
بہاروں میں مری سعیِ وفا بھی جگمگائے گی

یہ پوری نظم بلند خیالی، اعلیٰ نصب العین، پختگیِ خیال، ترقی پسندی، نئی تعمیر، قدرتِ بیان اور رنگیں نوائی کی بہت اچھی مثال ہے۔ سرور محکم الفاظ سے زیادہ کام لیتے ہیں اور پُرمعنی اشاروں، لطیف استعاروں اور عام فہم ترکیبوں سے وہ فضا پیدا کر لیتے ہیں جس کی ضرورت ہوتی ہے۔

سرور کی متعدد نظموں میں اعتراف کی کیفیت پائی جاتی ہے ۔ یہ بھی ایک نازک اور ذمّہ دارانہ موقع ہوتا ہے جہاں تعلّی اور خاکساری کے درمیان اپنی واقعی ذہنی کش مکش اور عقائد کا اظہار کرنا ہوتا ہے ۔ ان نظموں کی کامیابی یہ ہے کہ پڑھنے والے چاہے شاعر کے ہم خیال نہ ہوں لیکن اُس کی جرأتِ اظہار سے متأثر ہوں ۔ سرور کی کئی دلکش نظمیں اسی زمرے میں آتی ہیں : "میری کہانی"، "یہ آرزو تھی"، "یہ شمع" "پاکستان بننے پر"، "معذرت"، "ڈھاکے کے ایک دوست کو" اور "آدابِ سخن" اِن تمام نظموں میں ایک شخصی غنائی عنصر ہے ۔ مطالعہ، ضبط و تنظیم، تنقیدی شعور حوصلہ مندی نے اُن کے ذہن کی جس طرح تعمیر کی ہے اُس کے عکس ان نظموں میں ملتے ہیں ۔ کہیں کہیں اُنھیں میں اُن کے فنّی عقائد کا پتہ بھی چل جاتا ہے، "نار کے طور سے نور" اور "جذبہ و فکر کا طور" بنا لینے کی خواہش شعور اور اندازِ بیان دونوں کو ظاہر کرتی ہے ۔ عام طور سے سرور کی نظمیں مختصر اور گٹھی ہوئی ہوتی ہیں ۔ ان کے کچھ حصّوں کا اقتباس نظم کے پورے حُسن کو ظاہر نہیں ہونے دیتا ۔ تاہم ایک نظم کے چند شعر مثال کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں، پوری پوری نظموں سے مضمون طویل ہو جائے گا ۔

لوگ کہتے ہیں کہ جرأت نہیں نغمے میں ترے — گرمیِ جوشِ محبّت نہیں نغمے میں ترے
نہ وہ طوفانوں کی شوکت، نہ وہ شعلوں کی لپک — نہ مئے کہنہ کی تیزی نہ وہ بجلی کی چمک
تیرے الفاظ میں جادو تو ہے للکار نہیں — تیری تلوار میں جوہر تو ہے جھنکار نہیں

سوچتا ہوں کہ یہ جذبات کی شورش کے لئے — کیسے چلتی ہے نسیمِ سحری کیسا جانیں
یہ سیاہی کی سپیدی کی لکیروں کے اسیر — کیسے شیشے میں اُترتی ہے پری کیا جانیں

اس مختصر جائزے میں نہ تو تفصیلی جائزے کی گنجائش ہے اور نہ طویل اقتباسات کی ۔ اقتباسات زیادہ تر اس خیال سے دئے گئے ہیں کہ عام طور سے سرور کی نظمیں ایک جگہ نہیں ہیں ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس طرح پوری بات سامنے نہیں آتی ۔

سلسبیل کے دَور میں سرور نے غزلیں بھی لکھی تھیں جن میں کوئی خصوصیت نہ تھی ۔ خود سرور کا خیال تھا کہ ان غزلوں میں اچھے اشعار کے ساتھ معمولی اشعار بھی جگہ پا گئے ہیں جن پر اس ابتدائی مشق کی حالت میں قابو پانا محال ہے ۔ لیکن اِدھر تین چار سال میں سرور نے پھر غزلوں کی طرف توجہ کی ہے اور فنّی نزاکتوں کے احساس کے ساتھ ۔ انھوں نے اپنے مضامین میں متعدد مقامات پر غزلوں پر خیال آرائی کی ہے ۔ اور اُسے تنقیدی نظر سے دیکھا ہے ۔ اس کے حدود کا اندازہ لگایا ہے، اور اُس کی مرصّع کاری کو سراہا ہے ۔ اس لئے جب اُنھوں نے غزل کی طرف توجّہ کی تو اُس میں تغزّل اور کیف کا خاص خیال رکھا ہے ۔ سرور کی غزلیں پڑھ کر کبھی یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص زمین یا کسی خاص قافیہ کے جادو سے متأثر ہو کر لکھ رہے ہیں، ورنہ عام طور سے اُن کی غزلیں شگفتہ، شاداب اور معنوی حُسن سے آراستہ ہوتی ہیں ۔ وہ محض بات میں بات نہیں نکالتے اور نہ غزلوں کو بہت ہی سنجیدہ فلسفیانہ مسائل کے اظہار سے بوجھل بناتے ہیں ۔ جہاں سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسائل آتے بھی ہیں وہاں گفتگو بلیغ اشاروں میں ہو جاتی ہے ۔ چند شعر آپ بھی ملاحظہ کیجئے ۔

مطالبے تو بہت سخت تھے زمانے کے — مگر حقوقِ محبّت کی یاد آ ہی گئی
ہے آج اور ہی کچھ زلفِ تابدار میں خم — بھٹکنے والے کو منزل کا راستا تو ملا
روشن ہوئے جس سے غمِ دنیا کے بھی سائے — ایسے بھی دئے تیرے تصوّر نے جلائے
زُلفوں کو دیا ہے رخِ روشن نے عجب رنگ — جلووں سے ترے اور بھی روشن ہوئے سائے
آخر شب بن ہی گئے وقت کے ماتھے کی کرن — میرے سجدے جو ترے نقشِ قدم تک پہونچے
جب زمانے میں کہیں چشمِ مروّت نہ ملی — غمِ دنیا کے ستائے ترے غم تک پہونچے

اگر چند لفظوں میں سرور کی غزلوں کی خصوصیات کا اظہار کرنا ہو تو ہم معنویت کیف اور ترنّم کے الفاظ استعمال کر سکتے ہیں، یہی وہ عناصر ہیں جن سے غزل غزل بنتی ہے ۔ سرور کا رچا ہوا ذوق، اُن کا تنقیدی شعور، اسالیبِ سخن کی گہری واقفیت، قومی درد، شائستگیِ جذبات اور خوب سے خوب تر کی خواہش، یہ سبھی باتیں اُن کی شاعری پر اثر انداز ہوتی ہیں ۔ زندگی کے مخصوص ترقی پسندانہ نصب العین نے اُن کے یہاں گرمی اور خلوص پیدا کیا ہے ۔ نئے دور کے تقاضوں کو سمجھنا اور سمجھ کر اُنھیں فن کارانہ طور پر شاعری کا جزو بنانا بہت کم شاعروں کو آتا ہے ۔ سرور نے اس کی کوشش کی ہے ۔ ایک جگہ اُنھوں نے خود لکھا ہے : "میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو آنکھیں بند کر کے نئے عنوانات پر طبع آزمائی کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں ۔ جب تک آپ اس قوت اور حقیقت سے واقف نہ ہو جائیں جو ان عنوانات کے پیچھے کام کر رہی ہے، عنوانات پر طبع آزمائی بیکار ہے ۔ ہوائی جہاز یا جوہری بم پر نظم یا افسانہ لکھنا بڑی بات نہیں ۔ بڑی بات اس کو سمجھنا ہے کہ اُن چیزوں نے زندگی کے مفہوم کو کس قدر بدل دیا ہے ۔" سرور کی شاعری کا مطالعہ اُن کے تنقیدی تصوّرات کی روشنی میں کرنا چاہئے ۔ یوں کیف حاصل کرنے کے لئے اُن کی نظمیں اور غزلیں پڑھی جا سکتی ہیں اور سنجیدہ فکر و نظر کے طالب کو وہاں بہت کچھ ملے گا ۔

تلوک چند محروم

کشمیر سے خطاب

صورت گرِ ازل نے صبحِ ازل دکھایا
اپنا کمالِ صنعت، کرکے تجھے نمایاں
تجھ سا نظر نہ آیا روئے زمیں پہ کوئی
گلپوش، گل بداماں، سرتا قدم گلستاں
اے انتخابِ عالم، لے افتخارِ دوراں
اے وادیٔ گل افشاں

شاہوں کے قصر و ایواں اس کو ترس رہے ہیں
جو فیضِ حسنِ فطرت ہے تیرے جھونپڑوں میں
تو ریشمی ردو شالے دنیا کو دے رہا ہے
تیرا جمالِ رنگیں رخشاں ہے چیتھڑوں میں
دورِ خزاں بھی تیرا ہے رشکِ صد بہاراں
اے وادیٔ گل افشاں

نقشِ نانہ ہے تو دنیائے رنگ و بو میں
بے رنگ جس سے رونق حسنِ فرنگ کی ہے
دنیا کے اہلِ ایماں کہتے تھے جس کو جنت
شرمندہ ہو کے تجھ سے روپوش ہو گئی ہے
ورنہ کہیں تو ہوتے آثارِ باغِ رضواں
اے وادیٔ گل افشاں

دریا دلی سے اپنی قدرت نے تجھ کو بخشے
یہ چشمہائے سیمیں، یہ آبشار تیرے
جانِ بہار تیرے باغات اور جنگل
بھر پور سیم و زر سے یہ کوہسار تیرے
کیا تجھ کو احتیاجِ ظلِّ ہوس پناہاں
اے وادیٔ گل افشاں

کس کو نصیب ہے یوں اس زندگی میں جنت
جنت کی زندگی ہے جینا فضا میں تیری
موجِ ہوا یہاں ہے رشکِ دمِ مسیحا
عرفی نے سچ کہا تھا۔ آب و ہوا میں تیری
مرغِ کباب آکر ہو جائے مرغِ پرّاں
اے وادیٔ گل افشاں

نذرِ ہوس پناہاں اب ہو گئے ہیں تیرے دشمن
عزمِ صمیم ہے یہ تیرے فدائیوں کا
اللہ کے کرم سے دن پھر چکے ہیں تیرے
تجھ کو صلہ ملیگا دردآشنائیوں کا
اس پر تلے ہوئے ہیں ہندو ہیں یا مسلماں
اے وادیٔ گل افشاں

گزری مصیبتوں پر یہ کہہ کے مطمئن ہو
سرمایۂ سعادت ہے دردمند ہونا
آئے ہیں خاتمے پر ایامِ نامساعد
تقدیر میں تری ہے اب سربلند ہونا
دھو ڈال اپنے دل سے داغِ ملالِ حرماں
اے وادیٔ گل افشاں

ایران بانو

اجنبی

کوریا کی سرزمین کئی بار خون سے سینچی گئی ہے اور نا معلوم کتنے بار اس سرزمین پر اور خون کی بارش ہو گی۔ اس بھیانک تاریکی میں کبھی کبھی ہلکی ہلکی کرن انسانیت کی بھی نمودار ہوئی ہے۔ موہیا ایک گاؤں کی لڑکی ہے جو محبت، انسانیت اور ایثار کا مجسمہ ہے۔ ابھی چند گھنٹے ہوئے اس گاؤں کی زمین روندی جا چکی ہے۔ موہیا اپنی جھونپڑی میں سہمی بیٹھی تھی کہ اس کے کان میں دور سے کراہنے کی آواز آئی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں۔ مگر انسانیت کا تقاضا تھا کہ مرتے کو پانی دے۔ کل تک اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ سامنے کے دھان کی فصل اپنے بھائی کے ساتھ کاٹ کے گھر لا سکے۔ مگر اس وقت وہ آواز کی طرف قدم بڑھائے چلی جا رہی تھی۔ کسی نیم بسمل کی آواز قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ دبے پاؤں کھیت میں چلی جا رہی تھی۔

دھان کے کھیت جو چند دن ہوئے تیز ہوا کے جھونکوں سے مست بھری انگڑائیاں لیتے تھے جن کی ہر لہر زندگی کا قیام تھی ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سو رہے تھے۔ جن ہاتھوں نے انہیں پال پوس کر پروان چڑھایا تھا وہ کب کے خاموش ہو چکے تھے۔ اب آہنی دیو، فنا ہیوں کے دیوتا ٹینک کی صورت میں نظر آ رہے تھے۔ زمین پہ تو یہ راکشش زندگی کا خون چوس رہے تھے اور آسمان سے بموں کی بارش اس سرزمین کی مانگ کا سیندور چھین رہی تھی۔ وہ سپاہی جو اس تباہی کے دیوتا کے پجاری تھے ہر مسرت کے غنچۂ سربستہ کو ظلم کی چٹکیوں سے دل کھول کر مسل رہے تھے۔

موہیا نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنا ہرا بھرا کھیت اجڑتے دیکھا مگر کیا مجال کہ اُف تک زبان پر لا سکتی۔ بہت سے گاؤں والے اسے چھوڑ کر بھاگے جا رہے تھے۔ اس کی بہن نے ہاتھ جوڑ کر اسے بھی بھاگ نکلنے کو کہا مگر اس باہمت لڑکی نے آن پہ جان کو بھینٹ چڑھانے کی ٹھان لی۔

گاؤں پر سناٹا چھا گیا تھا۔ بڑھتی ہوئی فوجیں گاؤں میں آ چکی تھیں۔ وہ گاؤں والے جو گاؤں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ سہمے ہوئے امید و بیم کی حالت میں خدا کا سہارا لئے بیٹھے تھے۔

موہیا جب جھاڑی کے قریب پہنچی تو ایک آدمی زمین پہ بے حس پڑا دکھائی دیا۔ ایک سپاہی۔ جسم پہ فوجی وردی پھٹی تھی۔ کہیں کہیں خون کے دھبے۔ وہ چپکے سے اس کے قریب گئی۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کی باتیں گھومنے لگیں۔ "مر گیا، نہیں، شاید زندہ ہو، اس کی جان بچانا چاہیئے۔ مگر نہیں— بھائی اور نائیسلان کا کیا ہوگا۔" "نہیں، نہیں۔ نہ خود خطرے میں پڑوں گی نہ اپنے بھائی اور بہن کو مصیبت میں ڈالوں گی۔ اُونھ مر گیا ہوگا۔ یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔" جب وہ اس ذہنی کشمکش میں تھی تو یکایک اس نے اس سپاہی کے ہونٹ ہلتے دیکھے اور اس نے پانی مانگا۔ یہ دیکھتے ہی اس کے خیالات میں انقلاب سا آ گیا۔ وہ گھر جاتے جاتے رک گئی۔

"میں بزدل نہیں ہوں، میں سنگدل نہیں ہوں۔ کوئی دم توڑے۔ اور میں پانی کی ایک بوند بھی نہ دوں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔" وہ گھر کی طرف جھپٹی۔ دونوں بھائی بہن اس کو گھر اٹھا لائے۔

"ارے یہ دیکھو کتنا گہرا زخم ہے۔ تم نہ دیکھتیں تو کب کا مر جاتا۔"

بہن نے سنا مگر خاموش رہی۔

"ہاں سنو۔ مگر اس کو کب تک رکھو گی۔ اگر......"

اس نے پھر سنا۔ اس کے بدن کو ہلکی سی جنبش ہوئی مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔ جب یہ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ سپاہی نے بڑے کرب کے ساتھ کروٹ لی۔ اب موہیا نے اپنے بھائی بہن کو اشارے سے کہا کہ خاموش رہیں اس کو کچھ ہوش آ چلا تھا اور اس نے آنکھیں کھولیں۔ اس کے سامنے کچھ لوگ تھے۔ تین چہرے اس کی طرف متوجہ تھے۔ ان کی توجہ انہماک کا رنگ لئے ہوئے تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ "یہ سب کیا ہے" "میں کہاں ہوں"۔ "یہاں مجھے

کون لایا ؟"

پھر اُس نے پوچھا " میں کہاں ہوں ؟"

موہیا خاموش تھی۔ بھائی نے موہیا کی طرف اشارہ کر کے معصومیت سے کہا۔ " اس نے تمہیں کھیت میں زخمی دیکھا تم کو یہاں لے آئی۔"

سپاہی۔ " ہوں۔ میں اپنی رجمنٹ سے الگ ہو گیا تھا۔ میں جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر کیا ہوا مجھے یاد نہیں۔" موہیا سُن رہی تھی۔ مگر ایک لفظ زبان پر نہ لائی۔ پھر سپاہی نے اپنے زخمی چہرے پر ہاتھ پھیرا اور اپنے جسم پر پٹیاں بندھی پائیں۔ اس کے چہرے پر تشکر کی جھلک تھی۔

سپاہی۔ " میں کیسے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ آپ نے کتنی تکلیف کی۔ کاش میں اس کا کچھ بدل کر سکتا۔"

موہیا۔ خیر، اس کی ضرورت نہیں یہ محض ہمارا فرض تھا۔ کوئی مر رہا ہو، اور ہم نگاہیں پھیر لیں یہ تو نہیں ہو سکتا۔ (دہیمے میں ترشی تھی)

" (خیالات کے ساتھ) نہیں نہیں ہرگز میرا مطلب یہ نہ تھا۔ مجھے معاف کیجئے گا۔ کیا آپ کو میرے الفاظ سے تکلیف ہوئی ؟"

موہیا۔ " نہیں، نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ میری بہن آپ کے لئے کچھ کھانے کے واسطے لا رہی ہے۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ جب وہ باہر سے واپس آئی۔ اُس کا بھائی بھی ساتھ ساتھ آیا۔ دونوں وقت مل چکے تھے۔ رات کی آمد تھی۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ دروازے اچھی طرح بند تھے۔ مزید احتیاط کے لئے دروازہ کے قریب میز اور کرسیوں کا انبار تھا۔

تھائی۔ (سرگوشی سے) بہن سنتی ہو۔

موہیا۔ کیا ہے ؟

تھائی۔ کیا یہ آج اسی گھر میں رہے گا۔

موہیا۔ کیا مطلب ؟ کیا تم چاہتے ہو کہ اسے گھر سے نکال دیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔

تھائی۔ لیکن ان لوگوں کو اگر معلوم ہو گیا تو جانتی ہو کیا ہوگا۔ یہ تو مارا ہی جائے گا اور ہماری جان کے بھی لالے پڑ جائیں گے۔

موہیا۔ یہ ہے تو ٹھیک۔ لیکن مجبوری ہے۔ تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔

گھر پر خاموشی اور تاریکی چھائی تھی۔ کمرے میں ایک شمع ٹمٹما رہی تھی۔ باہر سے گھر سُونا اور تاریک نظر آتا تھا۔ گھر کے اندر بھی سناٹا تھا۔ کبھی کبھی یہ سکوت کا عالم تھائی اور تائیلان کی سرگوشی سے ٹوٹ جاتا تھا۔ موہیا الگ سوچ میں ڈوبی بیٹھی تھی۔ قریب ہی اجنبی پڑا تھا۔ اُسے نیند آنے لگی تھی۔ موہیا کی نظر نامعلوم کیوں اس کے چہرے پہ بار بار پڑ رہی تھی۔ شمع کی روشنی کا بھی وہ مرکز بن گیا تھا۔ اُس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے اور اس کے بھنچے ہوئے ہونٹ اُس کے کرب کا عالم بتا رہے تھے۔ لانے کو تو لے آئی۔ مگر یہ مہمان اس سے سنبھل نہیں رہا تھا۔ جب اُس کی طرف دیکھتی، اُس کے دل میں رحم اور ہمدردی کی امتزاجی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ اسے اب ندامت ہو رہی تھی کہ اس کے ساتھ اس نے بیگانگی کا برتاؤ کیوں کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک شوربے کا پیالہ اُس کے لئے لے آئی۔ آہٹ سے اُس کی آنکھ کھُل گئی۔ اس نے شوربے کا پیالہ اس کے ہونٹوں سے لگا دیا اور کہا " اسے پی لو۔"

سپاہی۔ " میں تمہارے لئے ایک وبالِ جان بن گیا ہوں۔ خیر آج رات کو تو چلا ہی جاؤں گا۔"

موہیا۔ مگر تمہاری حالت تو ایسی نہیں ہے۔ ایسی حالت میں چل پھر سکو گے ؟

سپاہی۔ " کسی طرح چل ہی لوں گا۔"

اس نے کوشش کی کہ وہ اسے بیٹھ کر دکھائے۔ مگر موہیا کے ہاتھ یکدم اُس کے کندھے پر چلے گئے اور اس نے پھر اسے لٹا دیا۔

موہیا۔ میں تمہیں ایسی حالت میں ہرگز نہ جانے دوں گی۔ جانتے ہو کیا ہوگا۔ یا تو جان جائے گی یا قید خانے میں پڑے رہو گے۔

موہیا کو معلوم تھا کہ یہ دُور اندیشی نہیں ہے۔ وہ اپنے لئے اور اپنے بھائی بہن کے لئے خطرہ مول لے رہی ہے مگر اس کے سوا، دوسرا راستہ اُس کے سامنے تھا بھی تو نہیں۔

سپاہی۔ میں کسی طرح چلا ہی جاؤں گا۔ میں اپنے واسطے تم سب کو مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتا۔

جب اُس نے دیکھا کہ وہ جانے کو تُلا ہی ہوا ہے تو اسے ایک ترکیب سوجھی۔

" ہاں سنو، اُوپر دیکھو، تم دیکھ رہے ہو یہ چھت، اصل میں یہ تختہ ہے۔ چھت تو اُوپر ہے۔ اس تختہ اور چھت کے درمیان کافی جگہ ہے۔ ہم اس میں غلہ رکھتے ہیں۔ لیکن اس میں ایک آدمی آرام سے چھپ سکتا ہے۔ یہ دیکھو، یہ

سوراخ اس سے ہوا اور روشنی آسکتی ہے ۔ وہ ہنسا۔

"میں سمجھا مگر سوال تمہارا ہے۔"

موہیا ۔ "اس کی تم فکر نہ کرو۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

سپاہی ۔ "اجنبی"۔ (دونوں ہنسنے لگتے ہیں)

رات بھر اس کی آنکھ نہ لگی۔ کبھی گولیاں چلنے کی، کبھی بھاری ٹینکوں کی آواز سنائی دیتی تھی۔ "بس صبح ہوتے ہی اسے چھپا دوں گی۔"

ان ہی خیالوں میں ڈوبی وہ سو گئی۔

ابھی صبح کی پو بھی نہ پھٹنے پائی تھی کہ کسی نے دروازے کو دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کیا۔ سارا گھر ہل سا گیا۔

ایک بھیانک آواز یہ کہتے سنائی دی۔ "دروازہ کھولو۔"

موہیا نے دروازہ کھول دیا اور الگ ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ دروازہ کھلتے ہی چند قوی ہیکل فوجی داخل ہو گئے۔

"اس گھر کا مالک کون ہے" ؟ ایک بھاری آواز نے کہا۔ کمرے بھر میں وردی پہنے ہوئے فوجی نظر آ رہے تھے۔

موہیا نے بے فکری اور بے پروائی سے کہا۔ "اس گھر میں کوئی مرد نہیں ہے بس ہم تین یہاں رہتے ہیں۔"

اس شخص کے تیوروں پر بل تھے اور وہ تھائی اور تائیلان کو غصے کی نظروں سے گھور رہا تھا۔

"ہو" اس نے عجیب سی آواز نکالی۔ جس پر سارے آدمی گھر کے مختلف حصوں کی کھوج میں مصروف ہو گئے۔

"ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اس گھر میں مشکوک اشیاء تو نہیں ہیں"؟

موہیا کے چہرے سے بے فکری ظاہر ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس پر ذرا بھی اثر نہیں ہے۔ چند ہی لمحوں کے بعد سب فوجی واپس آ گئے۔ ان کو کچھ نہ ملا۔ اس شخص نے پھر گھور کر موہیا کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے ان سب پر شبہ ہے۔

"اس گھر میں کھانے پینے کی اشیاء کا ذخیرہ ہے؟"

موہیا۔ "تھوڑے سے آلو اور مٹھی بھر چاول، بس اور کچھ نہیں۔ تمہارے سپاہیوں نے تو خود ہی دیکھ لیا ہے۔ اگر اب بھی شک ہے تو پھر دیکھ لو۔" موہیا نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ کتنی کامیاب اداکارہ ہے۔ فوجیوں نے ہوا کھوج لگائی۔ ان کو کچھ نہ ملا۔ خالی ہاتھ واپس گئے۔ فوجی اپنی ناکامی سے جھنجھلا گیا تھا۔ چلتے چلتے بھی غصے میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

جب موہیا کو اطمینان ہو گیا کہ اب کوئی خطرہ باقی نہیں ہے۔ اس نے اپنے بھائی اور بہن کو دروازے پر نگرانی کے لئے چھوڑا۔ اور خود جہاں سپاہی چھپا تھا پہونچ گئی۔ موہیا جب اس تنگ و تاریک جگہ پہ پہونچی تو سپاہی کے چہرے پر ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ موہیا نے تختے کو تھوڑا سا ہٹا کر سطح روشن کر دی۔ ہوا کے ایک خوشگوار جھونکے نے سپاہی میں روح پھونک دی۔ سطح کی ہلکی ہلکی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ اب ہشاش بشاش نظر آتا تھا۔ پریشانی کے آثار نہ تھے۔ موہیا کی نرم انگلیاں اس کی کلائی تک گئیں جیسے وہ اس کی نبض دیکھ رہی ہو۔

"اب تو تم اچھے ہو۔ بخار تو بالکل نہیں معلوم ہوتا۔"

سپاہی "میں بالکل اچھا ہوں" (کچھ مسکراہٹ کے ساتھ) "تم پر کیا گذری"

موہیا" کوئی خاص بات نہیں۔ گھر کی تلاشی لی گئی۔ وہ لوگ غلہ اور چھپائی چرائی مشکوک چیزوں کی کھوج میں تھے۔"

سپاہی۔ "پھر کیا ہوا؟"

موہیا۔ ہوتا کیا۔ اپنا سا منہ لئے چلے گئے۔

یکایک موہیا کی نظر اس کے قریب کے پستول پر پڑی۔ اور اس کے چہرے پر ایک دلچسپ تبسم تھا۔

سپاہی۔ ہوں، تو آئے بھی وہ گئے بھی وہ۔ اچھا اب مجھے بہت جلد چل دینا چاہیئے۔ جان بچی، لاکھوں پائے۔ مگر وہ میرا پیچھا ضرور کریں گے۔ شاید کوئی خفیہ تعینات کر دیں۔

موہیا۔ ہو سکتا ہے، ناممکن تو نہیں۔

موہیا بڑے غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ ابھی اس کے چہرے پر زردی ہے اور تکلیف کے آثار بھی باقی ہیں۔

موہیا۔ نہیں آج نہیں۔ تم کل جانا۔ ابھی فی الحال تو خطرہ نظر نہیں آتا۔ کم از کم ایک دن تو آرام کر لو۔

دونوں کے لبوں پر پھر سکوت ثبت سی ہو گئی۔ مگر دونوں کسی خاص احساس سے متاثر نظر آتے تھے۔ اس میں شک نہیں موہیا ہمدردی کی حدوں سے بڑھتی جا رہی تھی اور وہ خود اپنے کو خطرے میں ڈال چکی تھی۔ پھر اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر آج رات ہی کو وہ چلا جائے تو اچھا ہے۔ خطرہ دور ہو جائے گا

اسے اپنے اوپر غصہ سا آنے لگا۔ یہ اس میں تذبذب کیوں پیدا ہو گیا۔ کسی بات پر قائم نہیں۔ کبھی یہ، کبھی وہ۔

سپاہی موہیا کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا۔ وہ کھوئی ہوئی بیٹھی تھی، عجیب محویت کے عالم میں۔ موہیا سپاہی کی زندگی میں پہلی کوریں لڑکی تھی۔ جس سے وہ اتنا بیباکانہ ملا تھا جو بھدا سا خاکہ اُس نے اپنے دماغ میں ایک کوریا کی لڑکی کا بنا رکھا تھا اُسے ویسا تو نہ پایا۔ اس کے دل میں ایک تعریف کا جذبہ گھر کر چکا تھا۔ جرأت اور ہمت کی اُس کے دل میں بڑی قدر تھی۔ لیکن اب اُسے فکر اس بات کی تھی کہ اُس کا اور اُس کے بھائی بہن کا حشر کیا ہو گا۔

سپاہی۔ عجیب بات ہے ہم لوگوں کی۔ عجیب دلچسپ ملاقات ہوئی اور تم میری زبان سے بھی واقف نکلیں۔ اپنی کہہ سکتا ہوں اور تمہاری سن سکتا ہوں۔

موہیا۔ جانتے ہو۔ میرا باپ ایک ٹیچر تھا۔ سمجھے۔

سپاہی۔ تمہیں یہ نہیں معلوم کہ میرا بھائی بھی ٹیچر تھا (دونوں ہنستے ہیں) ہم ایک فارم پر رہتے ہیں۔ ہم لوگ تین ہیں۔ میں، میرا بھائی اور میری بہن بس اور کوئی نہیں۔ بہن کا تمہارا اتنا سن ہے۔ خصلتیں لڑکوں کی سی۔

موہیا۔ اور کچھ۔

سپاہی (کچھ مسکراہٹ کے ساتھ) ہاں تم کچھ تو اس سے ملتی جلتی ہو۔ اس کی نگاہوں میں چھپی ہوئی محبت نظر آتی تھی۔

موہیا۔ تم اپنے گھر کی باتیں کئے جاؤ۔ اپنے کھیت، اپنی بہن، اپنے بھائی کی باتیں۔ ہاں کہتے کیوں نہیں۔

موہیا اس کے قریب آ چکی تھی اور اُس کی باتیں بڑی دلچسپی سے سن رہی تھی۔ اور وہ بھی دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ اس نے اس کے دل میں گھر کر لیا ہے۔ موہیا یہ دیکھ کر کہ کافی دیر ہو گئی ہے۔ چلنے کی تیاری کرنے لگی۔

موہیا۔ اچھا کل پھر ملیں گے۔

سپاہی۔ ہر گھڑی آہٹ پر کان اور در پر نظر رہے گی۔

موہیا مسکرائی اور چلتے چلتے اُس کے ہاتھ کو چھیڑ گئی۔

تمام دن خیریت سے گزر گیا۔ تینوں بھائی بہن بڑی بے چینی سے رات کا انتظار کر رہے تھے۔ رات ہوتے ہی ایک سناٹا سا چھا گیا۔ دُور سے گولیوں اور بموں کی آوازیں کبھی کبھی سنائی دیتی۔ سب دروازے سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ پتا کھڑکا اور دل دھڑکا۔ رات کی ہر گھڑی سکون کا ایک پیام لاتی تھی۔ جب رات اپنے شباب پر آئی تو ان لوگوں کے جان میں جان آئی۔ موہیا نے اپنے بھائی سے کہا کہ دروازے پر نگاہ رکھے اور وہ خود جہاں مہمان سپاہی کو چھپایا تھا جا پہونچی۔

سپاہی۔ کہو سب خیریت ہے۔

موہیا۔ ہوں، دن بھر تو کوئی نہیں آیا۔

سپاہی۔ اچھا، تو اب اجازت ہے۔

موہیا۔ ابھی جلدی کیا ہے۔ رات اور گزر نے دو نا۔ اگر جانے پر تلے ہی ہو تو بارہ بجے چلے جانا۔

سپاہی۔ موہیا۔ تم کتنی اچھی ہو۔ کیا میں تمہیں، تمہاری جرأت، محبت اور اُس سلوک کو کبھی بھول سکتا ہوں۔ آج رات تو رخصت ہونا ہی ہے

دونوں پر سکوت طاری تھا۔ مگر خاموشی گویا تھی۔ کہنے کو تو بہت کچھ تھا۔ لیکن زبان پر کچھ نہ آتا تھا۔ موہیا غم اور ہیجان کا مجسمہ بن گئی تھی۔ یہ کیا تھا۔ کیوں تھا اُس کی نظریں سپاہی کو دیکھے ہی جا رہی تھیں۔ سپاہی خود بھی کھو سا گیا تھا اور اس کی نگاہ اس شمع پر تھی جو جل جل کر پگھل رہی تھی۔

موہیا نے اس خاموشی کو یوں توڑا۔ "گھر یاد آ رہا ہے؟" "نہیں" اس نے اپنا سر ہلا دیا۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب کیف تھا۔ دونوں چپکے چپکے باتیں کرنے لگے۔ اس کے منہ سے بس اتنا ہی نکلا تھا۔ "تم مجھ سے اگر کبھی ملنا چاہو تو......" کہ یکایک کچھ دیکھتے ہی وہ خاموش ہو گیا۔ موہیا بھی ایک دم چونک سی پڑی۔ وہ لپک کر آگے بڑھی اور اس نے تختہ کو کھینچ لیا۔ نیچے دیکھتے ہی اس پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا۔

ایک کثیف اور بد ہیئت فوجی بے رحمی سے اُس کی بہن تائیلان کو شکنجے میں لئے تھا۔ وہ بیچاری اس کے پنجے سے نکلنے کی ہزار کوششیں کر رہی تھی۔ مگر اس کی سعی بے سود ثابت ہوئی۔ ادھر اس کا چھوٹا بھائی اپنی بساط بھر اس کو چھڑانے کی کوشش میں لگا تھا۔ کبھی فوجی کو ٹھوکریں مارتا۔ کبھی منہ سے کاٹ کر زخمی کرتا۔ اس ہاتھا پائی میں وہ بھی زخمی ہو گیا اور اُس کی پیشانی سے خون نکلنے لگا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ تھائے نے اپنی بھرپور طاقت سے ایک بار پھر حملہ کیا۔ فوجی تلملا گیا۔ واقعات بڑی تیزی سے ظہور پذیر ہو رہے تھے۔ آن واحد میں فوجی کے ہاتھ میں ایک آبدار ہتھیار نظر آیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ننھے تھائے کے اوپر بجلی اب گری اور اب گری۔ موہیا ششدر تھی کہ کیا کرے کیا نہ کرے کہ اس کے کانوں میں

پاس سے ایک گولی سن سے نکل گئی۔ اس کو یہ بھی پتہ نہ تھا کہ سپاہی جہاں چھپا تھا وہاں سے نیچے آچکا تھا۔ اور یہ گولی اُسی کے ریوالور سے نکلی تھی۔ وہ حواس کھو چکی تھی۔ گولی کی اس آواز کی برداشت کی تاب اس میں نہ تھی وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ سکی۔ مگر کسی کا مضبوط ہاتھ اسے سہارا دئے ہوئے تھا۔ اُس فوجی کا ہاتھ جو کسی کے خون کے لئے اُٹھا تھا بے حس ہو کر گرا۔ اُس کا سر بھی زمین پر آرہا اور قضا اُس کے سر سے کھیل گئی۔ موہیا کے کان میں پردیسی سپاہی نے کہا۔ "وہ مر گیا" ابھی اُس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ موہیا کے ہوش و حواس جیسے ہی درست ہوئے اُس نے اپنی بہن کو چمٹا لیا۔ وہ غریب اب بھی سہمی ہوئی سسکیاں لے رہی تھی۔ ادھر بھائی کی پیشانی سے خون جاری تھا۔ سپاہی نے یہ دیکھتے ہی اس کی مرہم پٹی کی۔ سپاہی تھائے کو نظرِ تحسین سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے کہا۔ "اس ننھے سپاہی نے کیا کام دکھایا۔ سپاہی اس ننھے جانباز کی پیٹھ ٹھونک رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ موہیا اپنی بہن کو تسکین دینے میں مصروف تھی لیکن یکایک اس نے سپاہی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اب کیا ہوگا۔" سب سے پہلے تو اس لاش کو دفن کرنا چاہیئے کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ اب رات کے بارہ بجے تھے اور لاش کو یہ سب دفن کر چکے تھے۔ مٹی اس طرح ڈال دی تھی کہ ذرا بھی شک نہ ہوتا تھا۔ اب سپاہی نے موہیا کی طرف اور موہیا نے سپاہی کی طرف دیکھا۔

سپاہی۔ موہیا اب مجھے جانا ہی چاہیئے۔ مگر یہاں تم کیا کرو گی؟"

موہیا خاموش رہی اور اپنے بھائی اور بہن کی طرف دیکھنے لگی کہ اُن کی کیا رائے ہے۔ اس کی بہن نے فوراً کہا کہ یہ راز چھپ نہیں سکتا۔ آج نہیں تو کل یہ قتل رنگ لائے گا۔ ہم لوگوں کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ بھائی خاموشی سے اپنی بہن کی تائید کر رہا تھا۔

"پردیسی!" آج پہلی بار موہیا نے اس طرح اس کو پکارا۔ اس کو خود بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کے ایک لفظ میں کتنے معنی پنہاں تھے۔

سپاہی اس کے قریب گیا اور اس کے شانہ پہ ہاتھ رکھ کر بولا۔

"موہیا، میری ایک بات سنو گی؟"

موہیا کے لبوں نے تو نہیں لیکن نگاہوں نے "ہاں" کہہ دی۔

سپاہی۔ اچھا تو سنو، تم بھی ہمارے ساتھ چل رہی ہو۔"

ظفر حسین خان

مہدی علی خان، ذکی، ملک الشعراء

میری عمر کوئی سات آٹھ سال کی ہوگی جب گھر میں ایک انگوٹھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جس پر ایک بڑا سا سُرخ عقیق یمنی جڑا ہوا تھا اور اس پر یہ عبارت کندہ تھی "ملک الشعراء شیخ مہدی علی خاں ۱۲۶۵ھ" اسی کے ساتھ بزرگوں نے بتایا کہ میرے دادا کی مہر ہے جن کا ذکی تخلص تھا اور میرے والد کا نام "ذکی حسین خاں" اسی تخلص پر رکھا گیا تھا۔ مجھے "ملک الشعراء" کے معنے بھی بتائے گئے، حالاتِ زندگی سُنائے گئے اور دو دیوان دکھائے گئے جن میں سے ایک قلمی اور دوسرا چھپا ہوا تھا۔ یہ میرا اپنے جدامجد، ذکی مرحوم سے سب سے پہلا تعارف تھا۔

اس انکشاف پر سات آٹھ سال کے بچے کے تخیل نے جو رنگ بھرا ہوگا وہ ظاہر ہے۔ چنانچہ اب بھی جبکہ نصف صدی کا فاصلہ حائل ہوچکا کچھ دھندلا سا عکس نظر آتا ہے کہ کس طرح باریک کاغذ پر مہر کی عبارت معکوس خط میں لکھ کر دن میں دھوپ اور رات کو لیمپ کے مقابل کاغذ کو پلٹ کر پڑھتا تھا اور کس طرح دل میں مشاعرے کا شوق پیدا ہوا تھا۔ اور اپنی بساط کے موافق کچھ تک بندی کرکے اُسی روز بزرگوں کے سامنے پیش بھی کی تھی لیکن مشیتِ ایزدی میں یہ میری سب سے پہلی اور سب سے آخری شاعری تھی۔ کاتبِ قضا و قدر کا منشا و تحریر جیسا آگے چل کر کھلا، یہ تھا کہ قسمت میں شعر و سخن کے باغ و بہار کی سیر کی جگہ، فلسفے کے بیابان کی خاک چھاننا بدا ہے، جس کا سراب جتنا اس کے قریب جاتے جائیے، اتنا ہی پیچھے ہٹتا جاتا اور ہر بار نیا پیامِ تشنگی دیتا چلا جاتا ہے۔

غرض کہ جتنا زمانہ گزرتا گیا شعر و شاعری سے بُعد ہوتا گیا، کبھی عمرِ رفتہ کو واپس بلانے کے انداز سے، ذکی کے دیوان کی ورق گردانی کر لیتا تھا مگر کارکنانِ مشیت کو یہ بھی ناپسند ہوا چنانچہ دونوں دیوان یکے بعد دیگرے میرے ہاتھوں سے چھین لئے گئے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قلمی دیوان تو میرے عمزاد بھائی ابوالنصر نواب رشید الدین احمد خاں صاحب نے مانگ لیا اور پھر واپس نہ کیا اور دوسرا مطبوعہ دیوان ایک اور دوست کی نذر ہوگیا۔ دونوں بزرگ اب مرحوم ہوگئے۔ چار و ناچار ان کے ساتھ دیوانوں پر بھی فاتحہ پڑھ کے بیٹھ گیا۔

لیکن عمر کے ساتھ دل کی یہ خلش بڑھتی گئی کہ ذکی کا کلام کہیں سے ہاتھ آجائے تو اسے طبع کرا دوں۔ تاکہ ان کا نام مٹنے نہ پائے۔ اتفاق سے ایک روز راجہ صاحب محمود آباد کے دولت کدے پر مولانا حسرت موہانی سے ملاقات ہوگئی یاد دلایا کہ انہوں نے "ذکی ملک الشعراء" پر اردوئے معلّیٰ کا ایک اسپیشل نمبر نکالا تھا جس میں ردیف وار ذکی کے کلام کا انتخاب شائع کیا تھا۔ مولانا موصوف کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں ذکی کا پوتا ہوں، بڑے محبت اور تپاک سے ملے اور وعدہ فرمایا کہ وہ مجھے ذکی کا سارا کلام جو ان کے پاس محفوظ ہے بھیج دیں گے۔ مجھے چاہئے یہ تھا کہ ان کے ہمراہ کانپور چلا جاتا۔ اور دیوان لے آتا لیکن شومئی قسمت نے مکاتبت کافی سمجھی اور انجام یہ ہوا کہ وہ بھی داغ مفارقت کے ساتھ داغ حسرت دے گئے۔ اس کے بعد پتہ چلا کہ ندوۃ العلما کے کتب خانے میں ذکی کا دیوان ہے۔ بے تابانہ منگاکر دیکھا یہ ذکی کے کلام کا انتخاب تھا جس کا مواد اردوئے معلّیٰ کے اسپیشل نمبر سے بھی کم تھا۔ رامپور آکر ریاست کے کتب خانے کو کھنگالا۔ یہاں کچھ نثر کے نایاب موتی تو دستیاب ہوئے لیکن نظم کے جواہر سے یہ خزانہ بھی خالی تھا اس کتب خانے میں داستانوں کی بڑی تقطیع پر پانچ قلمی جلدیں ہیں جو ۴۳۸۸ صفحوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان منشورات کا ذکر اپنے محل پر آگے آئے گا۔

ذکی مرحوم کے کلام کی دستیابی سے بالکل ناامید ہوچکا تھا کہ ایک روز خیال آیا کہ لکھنؤ یونیورسٹی کی لائبریری میں بھی قسمت آزمائی کروں۔ میری مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب مجھے یہاں مطبوعہ کلیاتِ ذکی کا وہ نسخہ جو میرے

پاس تھا اور جو نولکشور پریس لکھنؤ میں چھپا تھا دستیاب ہوا۔ اجازتِ طبع کے بعد اس کو چھپوا دینے کا قصد ہی ہے اگرچہ اب عمر اس منزل پر پہنچ چکی ہے جب نقشِ محبت بھی دل پر بار ہوتا ہے۔ بہر طور جس طرح ہو سکا اس فریضے کو انجام دینے کی کوشش کرونگا۔ اس سے پہلے مناسب معلوم ہوا کہ آج کل کی وساطت سے جو ہندوستان کے ایک نامور شاعر کی نگرانی میں شائع ہو رہا ہے ذکی کی بھولی ہوئی یاد کچھ تازہ کر لوں۔ حیاتِ مستعار کا کچھ اعتبار نہیں۔ کم از کم کچھ نقش تو باقی رہیں جو آئندہ تحقیق کو راہ بنا سکیں۔

پہلے ذکی کی زندگی کے متعلق جو مشہور تذکروں میں حالات درج ملے ہیں اور جو بزرگوں سے سُنے ہیں بیان کرتا ہوں۔ اس کے بعد اُن کے نثر و نظم کے خصوصیات عرض کروں گا اور اخیر میں اُن کے کلام کا نمونہ پیش کیا جائے گا۔

حالاتِ زندگی

خم خانۂ جاوید مؤلفہ لالہ سری رام ایم۔ اے جلد سوم صفحہ ۲۶۴ تا ۲۶۵ میں ملک الشعراء مہدی علی خاں ذکی کے مندرجۂ ذیل حالات پائے جاتے ہیں۔

"شاعر خوش مذاق منشی مہدی علی خاں ذکی خلف شیخ کرامت علی۔ ان کے بزرگ شیخ زادگانِ لکھنو سے تھے مگر اُن کا مولد و مسکن مرادآباد ہے۔ نواب محمد سعید خاں والی ریاست رامپور کے عہد میں برسوں وظیفہ خوار ریاست رہے پھر نواب غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ کے عہد میں لکھنو چلے گئے۔ وہاں جا کر شیخ امام بخش ناسخ کی شاگردی اختیار کی اور نواب صاحب موصوف کی شان میں قصیدہ کہہ کر سنایا خلعت و انعام سے مالا مال ہوئے۔ پھر تھوڑے دنوں کے لئے دہلی آئے۔ ان دنوں نواب مصطفیٰ خاں بہادر متخلص بہ شیفتہ کے یہاں بزم مشاعرہ منعقد ہوئی تھی۔ آپ بھی اس جلسے میں شریک ہو کر موردِ تحسین و آفریں ہوئے۔ مگر ان دنوں دلی اپنے حال میں مبتلا تھی۔ یہاں سے بھی دل برداشتہ ہو کر سہارن پور پہنچے لیکن دل اُچاٹ رہا۔ حیدرآباد دکن چلے گئے۔ وہاں دن رات چاندی سونے کی گنگا جمنا بہتی تھی۔ وہاں اُن کے کمال کی بھی قدر واقعی قدر دانی ہوئی۔ یہ بھی اپنے فن میں استاد مسلم الثبوت تھے نواب ناصر الدولہ نظام الملک بہادر والیٔ ریاست کی مدح میں دو دو عمدہ قصائد کہہ کر پیش کئے جن میں خوب خوب صنعتیں تھیں۔ اُن کو سُن سُن کر اہلِ دربار کیا وہاں کے تمام رؤسا ادب کے ساتھ پیش آنے لگے اور نواب صاحب بہادر نے خلعت سے مالا مال فرمایا۔ آخر کششِ حبِ وطن نے پھر اپنی طرف کھینچا اور مرادآباد آئے۔ چند روز بعد لکھنؤ پہنچ کر قطب الدولہ کی وساطت سے واجد علی شاہ کی سرکار میں ملازم ہوئے اور ملک الشعراء کا خطاب پایا۔ چنانچہ اُن کی مہر میں "ملک الشعراء شیخ مہدی علی خاں ۱۲۶۵ھ" کندہ تھا۔

۱۸۵۷ء کے بعد وطن میں خانہ نشین تھے کہ نواب یوسف علی خاں نے ان کے کمال کا شہرہ سُن کر اپنے دربار میں طلب کیا۔ چنانچہ رامپور چلے گئے اور جب تک نواب "ناظم" زندہ رہے وہیں رہے۔ ان کی وفات کے بعد وہاں سے دلی آگئے اور ۱۲۸۲ھ میں انبالہ پہنچے۔ دو برس کچھ مہینے وہاں قیام کو گزرے تھے کہ پیامِ اجل آپہنچا۔ ماہ ذیقعدہ ۱۲۸۳ھ قضا کی۔ انتخابِ یادگار میں اُن کی تاریخ وفات ۱۲۸۱ھ درج ہے۔ مگر غلط ہے۔ یہ صاحبِ سخن' مورخ بے بدل' فاضل بے مثل' شیریں سخن ظریف اور زود فکر تھے۔ طرزِ سخن نہایت دلفریب اور پسندیدہ ہے۔ ایک رسالہ عروض و قوافی میں مسمی بہ یادگیر ۱۲۶۵ھ میں مرتب کیا تھا۔ کلیاتِ ذکی عرصہ ہوا نولکشور نے اپنے مطبع سے شائع کیا تھا۔

"تذکرہ انتخاب یادگار مصنفہ امیر مینائی مرحوم جس کا ذکر اوپر آچکا ہے" مذکورہ ذیل احوال کا حامل ہے۔

"ذکی شیخ مہدی علی ابن شیخ کرامت علی مرادآبادی حضرت جنت آرام گاہ طاب ثراہ کے عہد میں برسوں اس سرکار فیض آثار کے نمک خوار رہے۔ چندے لکھنؤ چلے گئے پھر حضرت فردوس مکان انار اللہ برہانہ کے عہد میں نوکر ہو کر موردِ افتخار رہے۔ شیخ امام بخش ناسخ کے شاگردوں میں نامور تھے۔ بہتّر برس کی عمر پائی۔ ۱۲۸۱ھ میں انبالہ گئے۔ ذیقعدہ کے مہینے میں انتقال ہوا۔ وہیں دفن ہوئے ..."

۱۲۸۱ھ کو صاحب خم خانۂ جاوید نے غلط قرار دیا ہے۔ اس حساب سے عمر پچھتر سال اور سنہ ولادت ۱۲۰۸ھ مطابق ۹۴-۱۷۹۳ء نکلتا ہے اور اور ماہ و سنہ وفات ذیقعدہ ۱۲۸۳ھ مطابق مارچ ۱۸۶۷ء قرار پاتا ہے

"تذکرہ سخن شعرا" مصنفہ عبدالغفور خاں نساخ میں یہ مختصر حال ملتا ہے۔

"ذکی تخلص شیخ مہدی علی مرادآبادی خلف شیخ کرامت علی واجد علی بادشاہ لکھنؤ نے اُن کو ملک الشعرا کا خطاب دیا تھا۔ صاحب دیوان میں شعرا اچھا کہتے ہیں"

گلستانِ سخن مؤلفہ شہزادہ مرزا قادر بخش بہادر صابر دہلوی میں یہ تذکرہ ہے

"ذکی تخلص محمد مہدی علی ساکن مرادآباد مرد شیریں سخن' ظریف طبع۔ خوش کلام' تیز فکر طرزِ سخن اس کی دل پسند۔ مادۂ تاریخ بہم پہنچانے میں بے مثل و مانند۔ بیشتر لکھنؤ میں رہا۔ اور ارباب کمال کی ملاقات سے فیض یاب ہوا۔

ایک عرصہ ہوا کہ نواب مصطفیٰ خاں بہادر شیفتہ کے مکان میں بزم شعر خوانی منعقد ہوئی تھی۔ اسی اثنا میں یہ سخن سنج بھی دہلی میں وارد تھا۔ راقم نے ایک روز شاعرے میں اس کی صورت سے آشنائی اور اس کے سخن سے دلبستگی بہم پہنچائی۔ اب ایک مدت سے اس گلزمین میں قدم رنجہ نہیں کیا۔ یہ اشعار اس کے نتائج افکار سے مرقوم ہیں"۔

"تذکرۂ خوش معرکہ زیبا" مؤلفہ سعادت خاں ناصر لکھنوی مرتبہ ۱۲۶۲ھ میں جس کا ایک قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو اور دوسرا نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہے ذکی کا نام ناسخ کے شاگردوں میں دیا ہے۔ حال کے تذکرے مثلاً تاریخ اردو رام بابو سکسینہ مذکورہ بالا مستند تذکروں سے ماخوذ ہیں لہذا ان کا اقتباس غیر ضروری سمجھ کر قلم انداز کیا گیا۔ تذکروں میں تخلص ذکی ذال اور زے دونوں سے لکھا ہے لیکن ذال سے صحیح ہے۔

اکثر تذکروں میں ذکی کو ناسخ کا شاگرد بتایا گیا ہے لیکن خاندانی روایات کی شہادت یہ ہے کہ ذکی طبع زاد شاعر تھے چنانچہ غازی الدین حیدر کے زمانے میں جب لکھنؤ پہنچے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ناسخ کی شاگردی اختیار کی۔ اس سے قبل نواب محمد سعید خاں والئ ریاست رامپور کے دربار سے برسوں شاعر کی حیثیت سے وابستہ رہ چکے تھے اور ایک پختہ و بلند پایہ شاعر کی حیثیت سے شہرت کے مالک تھے۔ لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں ناسخ کے وہاں شعر و سخن کی محفلوں میں شریک ہوتے۔ اپنے کلام کی داد لیتے اور دوسروں کے کلام کی داد دیتے تھے۔ ناسخ نہایت محبت سے پیش آتے تھے وہ خود بھی کسی کے شاگرد نہ تھے اور ذاتی تجربہ سے جانتے تھے کہ شاعری ایک خداداد صلاحیت ہے جس کی تخلیق میں استاد کا ہاتھ تک نہیں ہوتا۔

شجرہ نسب براہ راست نواب عظمت اللہ خاں عضد الدولہ یمین الملک جو شاہان مغلیہ کے زمانے میں صوبہ سنبھل مراد آباد کے گورنر تھے پہنچتا ہے۔ حالانکہ خاندان میں نام کے ساتھ "نواب" لکھنے کا عام رواج ہے مگر وہ اگر کوئی لکھتا تھا تو برا مانتے اور منع کرتے تھے۔ ہاں البتہ "خاں" اپنے نام کے ساتھ لکھتے تھے اگرچہ ایک حیثیت سے یہ بھی خطابی ہے اس لئے کہ ہم لوگ شیخ ہیں مگر یہ کثرت استعمال سے نام کا جزو بن گیا ہے

۱۸۵۷ء کے زمانے میں ہماری جائدادیں ضبط ہوئیں اور بعض اراکین خاندان کو نہایت بے رحمی سے سزائے موت دی گئی۔ چنانچہ جیسا کہ مراد آباد کے ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں مذکور ہے نواب مجید الدین احمد خاں (عرف مجو خاں) کو جو ذکی کے عم زاد بھائی تھے، جلتے چونے کے نغار میں دھکیل کر ہلاک کیا گیا۔ ذکی اس شورش کے زمانے میں کپور تھلے میں تھے۔ مہاراجہ کپور تھلہ نے ان کی صفائی میں گواہی دی جب جان بچی اور جائداد کی واگزاری کا حکم ہوا لیکن ہماری اس جائداد کے عوض جو ضبط ہو کر دوسروں کو بطور انعام دی جا چکی تھی ممالک متوسط میں صحرائی جائداد دی جا رہی تھی جس کے لینے سے ذکی نے انکار کیا۔ چنانچہ اسی سلسلے میں وہ گورنر جنرل سے ملنے ملتان جہاں صاحب موصوف دورہ کر رہے تھے گئے ہوئے تھے ایک قدیم غلام ہمرکاب تھا اس نے زہر دے دیا اور نقد و جواہر لے کر بھاگ گیا۔ یہ بھی سنا کہ مقامی عقیدت مندوں نے ذکی کا ایک بہت اچھا مزار تعمیر کرا دیا تھا۔ تذکروں میں ذکی کی وفات انبالے میں دکھائی گئی ہے۔ اس مسئلے کا فیصلہ آثار مزار اگر باقی ہوں تو آسانی ہو سکتا ہے۔ رسالہ "یادگیر" ملتان ہی میں چھپا ہے۔ جائے وفات کی تحقیق کا سلسلہ جاری ہے۔ امید ہے کہ کلیات کے طبع ثانی تک یہ امر قطعی طور پر معلوم ہو جائے گا کہ وفات انبالہ ہوئی یا ملتان میں۔ بتایا یہ بھی جاتا ہے کہ انبالے سے ملتان گئے تھے وہاں اچانک انتقال ہو گیا۔ چنانچہ والد ماجد نے شاہ ایڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی کے موقع پر جب واگزاری جائداد کے متعلق عرضداشت کی تجدید کی ہے تو اس میں ملتان میں وفات پانے اور گورنر جنرل سے ملاقات نہ ہو سکنے کا ذکر ہے۔

تصنیفات ذکی منثورات۔

نثر میں مشہور رسالہ عروض ہے جس کا نام "یادگیر" ہے اس کا ایک نسخہ میرے پاس ہے۔ یہ رسالہ "مطبع ریاض نور ملتان میں بہ اہتمام منشی محمد مہدی حسین خاں چھپا ہے" رسالہ کے دیباچے میں ذکی لکھتے ہیں کہ یہ رسالہ "بعد فراغ تالیف شرح معیار الاشعار" لکھا گیا ہے تاکہ عوام اردو داں کو سہل پیرائے میں فن عروض کے مطالب بتائے جا سکیں۔ شرح معیار الاشعار میرے دیکھنے میں نہیں آئی اور نہ بزرگوں سے کچھ اس کے متعلق سنا ہاں البتہ یہ سنتا تھا کہ انہوں نے نثر میں کچھ داستانیں بھی لکھی ہیں چنانچہ اس کا ثبوت رامپور کے کتب خانے سے ملا۔ انہوں نے پانچ ضخیم داستانوں کا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ میں اس باب میں جناب عرشی مہتمم کتب خانہ مذکور کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے میرے کاوش کی تسکین میں ہر امکانی اعانت فرمائی۔

تیسری داستان کا نام سحر نامہ ہے۔ یہ بھی بوستانِ خیال سے ماخوذ ہے اور ۸۴۳ صفحوں کی ہے۔

چوتھی داستان موسوم بہ طلسم حیرت کدۂ آصفی، ۸۴۰ صفحوں کی داستان ہے۔ اس کی بنا بھی بوستانِ خیال پر ہے

یہ چاروں داستانیں جو بڑی تقطیع پر قلمی خطِ نسخ میں لکھی ہوئی ہیں نواب سیّد محمد سعید خاں بہادر جنّت آرام گاہ، والیِ ریاست رام پور کی فرمائش پر ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء لکھی گئی تھیں۔ ذرا غور کیجئے ایک سال کے اندر ۴۲۶۳ صفحوں کا دفتر قلم بند کر دیا، جب کہ شاید بعض ادبا کے کل زندگی کی کائنات اتنے صفحوں پر محیط ہو، کس دل و دماغ کا پتہ دیتا ہے۔ پھر بعض داستانوں کے آخر میں اپنی پریشان خاطری کی جانب بھی اشارہ کیا ہے۔ طلسم سعید کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں "بناءً علیٰ ہٰذا اس نالائق روزگار نے بجا آوریِ امر خداوند نعمت پر کمرِ ہمت استوار باندھ کر عرصہ میں چار مہینہ اور کئی روز کے قصہ طلسم جام جم۔ بزیادتی و نقصانِ بیش و کم ترجمہ کیا"۔ یہ داستان ۱۱۹۴ صفحوں کی ہے۔

پانچویں داستان مالا باختر ہے۔ یہ ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء نواب کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں کی فرمائش پر لکھی گئی۔ یہ داستان بھی بڑی تقطیع پر ۱۲۶ صفحوں کی ہے۔

طلسم سعید جو ۱۸۴۲ء میں لکھی گئی تھی اور جس کو اب ایک سو دس برس ہونے کو آئے بغیر کسی ارادہ و اہتمام کے ایک صفحہ کھول لینے پر یہ عبارت نظر آئی۔

"اُن میں ایک فقیر کو دیکھا کہ تاج بہت لمبا نوکدار اُن کے سر پر تھا، اور سیلی منکا ٹھنکا۔ ہاتھ گلی میں پڑا ہوا، تسمہ چمڑے کا کمر سے بندھا ہوا، غرفی کھنچی ہوئی، بدن خشک۔ ریش و بروت سفید۔ گرچہ چار ابرو کی صفایہ" (معلوم نہیں یہ "کی" کاتب صاحب کی عنایت ہے یا اُس زمانے میں "چار ابرو کا صفایا" کی جگہ "چار ابرو کی صفایہ" بولتے ہی تھے) صفحات پر نمبر نہیں ہیں۔ اس لئے صفحے کا حوالہ نہیں دے سکتا۔ کتب خانے میں مخطوطات کا ایک علیحدہ رجسٹر ہے جس میں ہر مخطوطا کے صرف کل اوراق کی تعداد درج ہے۔

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ سو برس پہلے کی زبان ہے۔ اِس زمانے کے نثر کے نمونے یہ ہیں۔

(۱) یہ نامہ ہے بندۂ خدا پسر تیرے سکندر کی طرف سے کہ مُدتِ اندک اور زمانہ قلیل میں اہلِ زمین کے ساتھ بے حد رفاقت کی اور اب بھی زمانہائے دراز اور قرنہائے بے شمار، مجاورتِ اہلِ آخرت کرے گا۔ بسوئے والدہ کہ سرائے غربت میں مواصلت اور ملازمت اُس کی سے متمتع نہ ہوئے۔۔۔۔"
(عجائب القصص ترجمہ سیّد باقر حسین ۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۴۰ء، ماخوذ از تاریخ نثر اردو، مرتبہ احسن مارہروی)

(۲) "سیّد فضل علی بن شاکر علی ۔۔۔۔۔ رہنے والے قدیم شاہجہاں آباد کے کہ استاد پڑھانے اور لکھوانے میں بادشاہزادوں کے ہوتے رہے ہیں۔ اور اب بھی اسی خدمت پر بھائی صاحب اعلیٰ درجات اوپر نوکری روزگار بیچ سرکار بادشاہ کے جلوہ گستر ہیں" (مفید الاجسام مصنفہ سیّد فضل علی، ۱۲۵۹ء مطابق ۱۸۴۳ء، ماخوذ از تاریخ نثر اردو)

(۳) "اب سنا چاہیئے کہ ایک روز بندہ اور خواجہ وزیر اور میاں فرخ شاعر کہ یہ دونوں شاعر شاگردِ رشید ناسخ صاحب کے ہیں اور چند احباب اور بھی باہم بیٹھے ہوئے تھے اور وقت شغل انوار سہیلی کے مطالعہ کا تھا، اور اُس کے مصنّف کی فکرِ رسا پر سب نے زبانِ ثنا کھولی تھی" (ترجمہ انوار سہیلی موسوم بہ بستانِ حکمت ۱۲۵۱ھ مطابق ۱۸۳۵ء ماخوذ از داستانِ تاریخ اُردو مصنّفہ حامد حسین قادری)

انوار سہیلی کے اس ترجمے میں جابجا فارسی اور عربی الفاظ و تراکیب مترجم نے بدستور اختیار کر لی ہیں۔ اس لئے کہ اس زمانے کا طرز ہی یہ تھا— اصل یہ ہے کہ اردو نثر میں قدامت کی جھلک سر سیّد احمد خاں تک کے نوشتوں میں پائی جاتی ہے۔ الفاظ کی صحیح و باقاعدہ ترتیب، نذیر احمد اور حالی کے زمانے سے شروع ہوئی اور مولانا شبلی مرحوم نے سب سے پہلے سنجیدہ ادب کا اسکول قائم کیا جس کے روایات پر دار المصنّفین اعظم گڈھ چل رہا ہے۔ سنجیدہ مضامین لکھنے والوں کا اب وہی شائل ہے جو دار المصنّفین کا ہے۔

مذکورۂ بالا قدیم نثر اردو کے نمونوں سے جب ذکی کی تحریرات کا مقابلہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کم و بیش آج کل کی سی منجھی ہوئی زبان بول رہے ہیں جس سے اُن کے ذوقِ سلیم کی پیش بینی کا پتہ چلتا ہے۔

ذکی کی خصوصیاتِ شاعری

ہر زمانے میں شعر کے کچھ مقررہ و مروّجہ محور ہوتے ہیں۔ چنانچہ ذکی کے زمانے میں شاعری کا مدار حسن و عشق، گل و بلبل، نالہ و فریاد، زحمتِ انتظار،

رقابت، وعدہ و پیام، نامہ بری، شبِ وصل و ہجر، ساقی، زاہد وغیرہ پر تھا۔ ہر شاعر انھیں تصوّرات کے تحت طبع آزمائی کرتا۔ نئے نئے معنی آفرینیاں کرتا، اور اچھوتے مضمونوں سے اپنے کلام کو آراستہ کرتا۔ لیکن اگر غور کیجئے تو ہر زمانے کے رائج الوقت تصوّرات شاعری کی تہ میں کچھ ایسی اٹل قدریں پوشیدہ ہوتی ہیں جو ریاضی، منطق اور اخلاق کے بنیادی تصوّرات یا مقولات (Categories) کی طرح زمان و مکان کی قید سے آزاد، ہر ملک، ہر زمانے میں ہر شخص سے خراجِ قبول و تسلیم حاصل کرتی ہیں اور یہ جواہر ہیں انھیں وقتی و عارضی نگینوں میں ملے جلے مل جاتے ہیں۔ حال میں ایک جرمن فلسفی (Pfeiffer) پفائفر نے اپنی معرکہ آرا تصنیف "Zwischen Dichtung Und Philosophie" (درمیانِ شاعری و فلسفہ) میں اِن مسائل پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اِس کتاب کا جرمن سے ابھی کسی زبان میں ترجمہ نہیں ہوا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ اسے اردو کے لباس میں پیش کروں۔ اس لئے کہ یہ کتاب بہتوں کے ذہنی کش مکش کی آئینہ دار ہے۔ لیکن فرصتِ عمل کم، اور کام بہت۔ کوئی کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

یوں تو ماہیتِ شعر کے متعلق صدیوں سے ہر زبان میں موشگافیاں ہوتی آئی ہیں لیکن غور کیجئے تو ان سب کا نچوڑ یہ ہے کہ شاعری نتیجہ ہے دو ذہنی عملوں کے امتزاج کا۔ جن میں سے ایک عمل، حرکتِ صعودی اور دوسرا حرکتِ ہبوطی کا حامل ہے اور شاعری کا سارا مدوجزر اسی ذہنی چڑھاؤ، اُتار کے اندر محدود ہے۔ اس معمّے کے حل کے لئے ذکی کا ایک شعر لیجئے۔

غبارِ قیس میں جاں آگئی ٹھوکر سے لیلیٰ کی
اُڑا جاتا ہے جگنو بن کے ہر ذرّہ بیاباں کا

(۱) عامیانہ اور ٹھیٹ مادی نظر میں صورتِ واقعہ صرف اس قدر ہے کہ ریگستان میں بگولہ اُڑا جا رہا ہے۔

(۲) شاعرانہ نظر عالمِ صوری کی اس مادی مشاہدہ کی زمین سے اُڑ کر عالمِ معنوی کے آسمان پر پہونچتی ہے۔ جہاں وہ اس حقیقت کا تماشا کرتی ہے کہ یہ بگولہ در اصل غبارِ قیس ہے جس کو لیلیٰ کی ٹھوکر کی مسیحائی نے حیاتِ تازہ بخشی ہے۔ چنانچہ غبار کے ذرّے، ذرّے نہیں، بلکہ نورِ حیات سے لبریز جگنو ہیں جو اِدھر اُدھر اُڑے جا رہے ہیں۔

(۳) عالمِ معنوی کی اس بلندی پر پہونچ کر شاعر عالمِ صوری کی جانب پھر اُترتا ہے۔ یعنی اپنے معنوی تاثرات کو شعر کی محسوس شکل میں پیش کرتا ہے۔ یہ سب سے زیادہ کٹھن منزل اور اس کے آرٹ کی جان ہے۔ عالمِ شاعری کا مرکزِ ثقل، مادی دنیا کے مرکزِ ثقل کے برعکس ہے جہاں چڑھنا نسبتاً آسان ہے لیکن اُترنا نہایت مشکل ہے۔ دل و جگر خون کرنا ہوتے ہیں۔ تب کہیں شعر موزوں ہوتا ہے۔ سقراط کے نزدیک فلسفے کا بھی سب سے زیادہ مشکل کام یہی تھا۔ یعنی فلسفے کے تارے آسمان سے توڑ کر زمین پر اُتار لانا۔

(۴) اب عالمِ صوری کے دو مظہر ہوئے، ایک تو وہی بگولہ اور محض بگولہ جو اِدھر آیا اور اُدھر ہوا ہُوا، اور دوسرے ذکی کا شعر جس کو شاعر نے بگولے کے اندر معنویت و موزونیت کی رُوح پھونک کر پیش کیا ہے۔ اِن دونوں کے تقابل سے شعر کا اثر یا اس کی تڑپ کا احساس ہوتا ہے جسے محسوس کر کے شعر کا ہر سننے والا سر دُھننے لگتا ہے۔ شعر اس منزل پر پہونچ کر شاعر کی انفرادی کیفیت کی حد سے نکل کر اب پبلک جنس بن جاتا ہے۔ صورتِ اوّل یعنی بادِ ہوا بگولہ کے مقابلے میں، صورتِ دوم یعنی شعر کو ایک ایسی چٹان سمجھئے کہ جس پر صدیاں گزر جاتی ہیں اور وہ اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔ اس لئے کہ صورتِ دوم کے اندر کچھ دائمی قدریں کارفرما ہیں۔ جو صفحۂ ہستی پر اُس کے ثبات و قیام کی ضامن ہیں۔ وہ قدریں کیا ہیں؟ یہ ایک نہایت دقیق مابعد الطبیعیاتی بحث ہے، جسے کسی اور صحبت کے لئے اُٹھا رکھئے — فی الحال سہولتِ فہم کے لئے اس شکل کو ملحوظ رکھئے۔ اس لئے کہ مسئلہ کے تمام مابعد الطبیعیاتی حقائق و علائق کا ڈھانچا اِس شکل میں آگیا ہے۔

عالمِ معنوی
عالمِ ذہنی
تڑپ
(۱) صورت (مشاہدات)
(۲) صورت (شعر)
عالمِ صوری
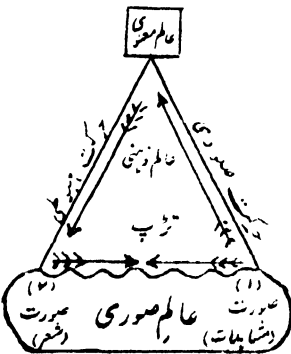
زبان کی صفائی، بندش کی چستی، محاورے کی چاشنی، ذکی کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔ لیکن اُن کا سب سے بڑا کمالِ شاعری تاریخ گوئی ہے۔ نواب ناصر الدولہ نظام الملک والیِ حیدرآباد دکن کی تاجپوشی کے موقع پر ذکی نے ایک قصیدہ فارسی

فارسی میں کہا تھا۔ اس وقت اُن کا قیام کلکتے میں تھا جس کے متعلق ہے کہ "مصنف ہنگام ورود شہر کلکتہ قصیدہ مدح و ایں تاریخ تصنیف کردہ بودند کہ مہتمم اخبار جام جہاں نما ایں ابیات در اخبار چھاپہ کردہ بود ۔۔۔۔" رسالہ یادگار کا نسخہ جو میرے پاس ہے اُس کے حاشیے پر بارہ بیت اور ایک مصرع توشیح قصیدہ کے صنائع و بدائع کی تشریح کے ساتھ قلمی درج ہیں، اُسی کا آخری ٹکڑا اوپر نقل کیا گیا ہے اس قصیدے کی صنعت کا ماحصل یہ ہے کہ (۱) ہر مصرع سے جدا جدا تاریخ نکلتی ہے (۲) ہر بیت کے حروف منقوط و غیر منقوط علیحدہ علیحدہ مادۂ تاریخ کے حامل ہیں۔ (۳) ہر بیت کے مصرع اوّل کے حروف منقوط اور مصرع ثانی کے حروف منقوط سے تاریخ نکلتی ہے (۴) ہر بیت کے مصرع اوّل کے حروف غیر منقوط اور مصرع ثانی کے حروف منقوط مادہ تاریخ بہم پہنچاتے ہیں (۵) صرف یہاں تک بس نہیں بلکہ "ایں امر بمصرعہائے متفقہ بیت بیت مختص نیست بلکہ از مصرع اوّل تا مصرع توشیح بہ ہر مصرع کہ ربط دہند مادہ تاریخ (۱۲۴۴ھ) برمی آید" اسی کے ساتھ چونکہ جلوس ممدوح سترھواں تھا زبر و بینات کے قاعدے سے وہ بھی مادۂ تاریخ نکلتا ہے۔ کلیات میں یہ قصیدہ بہ تفصیل صنائع و بدائع شامل ہے۔

وزن و قافیہ کی پابندی اور دیگر محاسن شعر کو قائم رکھنے کے التزام کے ساتھ ساتھ الفاظ کا ایسا انتخاب کہ قصیدے کے ہر گوشے سے مادہ تاریخ نکلتا ہو، قدرتِ کلام کا ایک حیرت انگیز معجزہ نہیں تو اور کیا ہے؟

آیئے اب محفلِ مشاعرہ برپا ہو۔ دیوان میرے پیشِ نظر نہیں اور نہ مولانا حسرت موہانی کا وہ انتخاب میرے پاس ہے جو اردوئے معلّی میں شائع ہوا تھا۔ اس لئے تذکروں میں دیئے ہوئے شعر اِدھر اُدھر سے سناتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ تذکروں کے شعر، شعریت کے اعتبار سے انتخاب نہیں ہوتے۔ اگر تذکرہ نویس کسی شاعر کا پورا کلام پڑھ کر، نمونہ پیش کرے تو شاید میر ہی کے دیوانوں میں اُلجھ کر رہ جائے اور تذکرہ میر سے آگے نہ بڑھے، اس لئے تذکرہ نویس یہی کرتے ہیں کہ تذکرہ لکھا اور شاعر کے دیوان کے ورق اُلٹ پلٹ کر چند شعر دے دیئے۔ اس پر میری ناواقفیت فن کا اور اضافہ کر لیجئے۔ ان دونوں خرابیوں کے باوجود ذکی کے کلام میں کچھ خوبیاں نظر آئیں تو سمجھ لیجئے کہ ان کا جنسِ سخن سو برس کے بعد بھی کھرا اور بازار کا ترنیف ہے۔

ہوا ہے آفتابِ صبح شعلہ داغِ پنہاں کا
بنا تارِ شعاعی تار تار اپنے گریباں کا

غبارِ قیس میں جاں آ گئی ٹھوکر سے لیلیٰ کی
اُڑا جاتا ہے مجنون کے ہر ذرہ بیاباں کا

سمجھ کر ساقیِ دریا دل ان باتوں کو چھالوں کی
زباں مُنہ کھول دکھاتا ہے ہر اک کانٹا بیاباں کا

بہار آئی ہے فاصد چاہیے وہ گریہ آنسو سے
کہ جائے نامہ کھینچیں یار کو پُرزہ گریباں کا

اسے نامہ بر جو پڑھ کے وہ خط ہو رہیں خموش
زنہار تو سوال نہ کرنا جواب کا

گزرے فراقِ یار میں افسوس یہ بہار
دل پر رہے گا داغ شبِ ماہتاب کا

وحشت ہے آشنا کا زلیخا کے حال سے
آنکھیں بیان کرتی ہیں افسانہ خواب کا

بسے ہوئے تھے دلوں میں ہزار ہا نیرنگ
طلسمِ ہستی موہوم اک بہانہ ہوا

شمعِ گُل ہونے لگی یارانِ محفل اُٹھ گئے
ایک میں رونے کو تنہا انجمن میں رہ گیا

سوچ میں تعبیر کے یوسف کو نیند آنے لگی
ماجرا خوابِ زلیخا کا عجب افسانہ تھا

نفرت نہیں کام دل نہیں جب جُستجو ملا
اپنی تلاش تھی کہ نصیبوں سے تو ملا

جس سے اہلِ جنوں خالی بیاباں رہ گئے
جا بجا اُلجھے ہوئے کانٹوں میں داماں رہ گئے

نہ پائے خستہ جاں مجھ سا جو ڈھونڈے
فلک خورشید کی مشعل جلا کر

خوں ہو دل بے قرار کب تک!
آنسو ہو گلے کا ہار کب تک؟

بُو ہے غنچے میں نہاں یا ترے ہونٹوں پہ ہنسی
قیدِ شیشے میں پری ہے کہ حیا آنکھوں میں

اب سبب کیا ہے کہ کانٹا سا کھٹکتا ہے دل
یہ وہی دل تھا کہ رہتا تھا سدا آنکھوں میں

وحدت ہے درمیاں تو پھر اے دل دوئی کہاں
شوقِ وصال ہے تو سمجھ لے کہ تو نہیں

دیر سے کچھ خبرِ خاطرِ ناشاد نہیں
دل کہاں بھول گیا ہوں یہ مجھے یاد نہیں

شاید چلی ہے جنبشِ دامانِ یار سے
آتی ہے بوئے ناز نسیم بہار سے

گلدستہ بن کے آنکھوں سے گرتے ہیں لختِ دل
یہ ہار گوندھے جاتے ہیں اشکوں کے تار سے

ہم کو ملا کے خاک میں بھی تم ہوئے نہ صاف
دل میں وہی غبار رہے اس خاکسار سے

طرزِ سخن سے رنگ ٹپکتا ہے اے ذکی
گویا زبان دھوئی ہے خونِ ہزار سے

یہ چمن کی خاک میں ہے اثر نمِ اشکِ بلبلِ زار سے
کہ جنوں کی لہر سی اُٹھتی ہے رگِ گُل میں خونِ ہزار سے

محشر نے آکے قبر میں تڑپا دیا مجھے
کس کی خرامِ ناز کا دھوکا ہوا مجھے

زمیں سے لالہ نکلتا ہے داغ کھائے ہوئے
بہارِ عشق کے ہیں یہ بھی گُل کھلائے ہوئے

پیری و عہدِ شباب آہ خرابی میں کٹے
شبِ غم دیکھ چکے، صبحِ الم دیکھ چکے

گتا ہے غمِ فراق، گئے آرزوئے وصل
کیا کیا ہو دل لگی جو کہیں دل لگا رہے

دل ہم سے جدا رہا ہمیشہ
گویا وہ ضمیرِ منفعل ہے

جوگندر پال

تماشا گر سا

شگفتہ چہرہ، شریر آنکھیں اور جھکتی ہوئی کشادہ پیشانی جس پر ہمیشہ بالوں کی ایک لٹ گری ہوتی۔ اُسے دیکھنا تو ایک طرف رہا۔ اُس کے خیال ہی سے لبوں پر مسکراہٹیں ناچنے لگتیں اور ذہن میں کوئی ہلکا پھلکا سا ریکارڈ بجنے لگتا۔

ٹریننگ سنٹر میں گھوش ہمارے ساتھ ہی پڑھایا کرتا تھا طلبأ اور اسٹاف میں وہ یکساں ہر دل عزیز تھا۔ جوں ہی کہ وہ اسٹاف روم میں قدم رکھتا تھکن اور بیزاری دونوں کسی بھوت کی طرح چادر اوڑھ کر آناً فاناً غائب ہو جاتیں۔

"ہیلو، سُنا تم نے۔ چائے کے پیکٹ کی قیمت میں اڑھائی شلنگ کا اضافہ ہو گیا ہے۔ میں تو اب چائے کی بجائے برانڈی پی کر سنٹر آیا کروں گا۔"

کئی پروفیسر مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگتے۔

"برانڈی کا بھاؤ حسبِ معمول ہے"۔ وہ اپنے پائپ میں تمباکو ڈالتا ہوا کہتا: "اگر پرنسپل نے میرے برانڈی پی کر سنٹر آنے پر اعتراض کیا تو میں اُسے افسرانِ اعلیٰ کی اگلی میٹنگ میں کاسٹ آف لِونگ الاؤنس بڑھانے کی سفارش کرنے کے لئے کہوں گا۔"

سب ہنسنے لگتے۔

"مسٹر سنگھ" وہ موہن سنگھ کے پاس آ بیٹھتا، جو ابھی تک لمبا سا منہ بنائے اخبار پر جھکا ہوتا۔ "آخر تم اخبار پڑھتے ہوئے اتنے سنجیدہ کیوں نظر آتے ہو؟"

موہن سنگھ مجبوراً اپنے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ لا کر اپنا سر اوپر اٹھا لیتا۔

"کل جو میں گھر پہنچا وہ اپنا جسم کرسی پر پھیلائے پائپ کا ایک لمبا کش کھینچتے ہوئے کہتا: "تو بیٹھتے ہی بے اختیار ہنسنے لگا۔ میری بیوی حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگی۔ تم بھی ہنسو، میں نے اُسے کہا، بچوں کو بُلا کر انھیں بھی کہو کہ وہ زور زور سے ہنسیں، یقین کرو بھائی، گھر پہنچ کر ان چُپ چاپ تین چہروں کا خیال آتا ہے تو ہنسی روکے نہیں رُکتی، معلوم نہیں ہم پڑھے لکھے لوگ تعلیم کا ماحاصل اپنی ریاکارانہ سنجیدگی کیوں سمجھتے ہیں"۔ وہ اخبار موہن سنگھ سے اپنے ہاتھوں میں لے لیتا اور وہ بیچارہ احمقانہ طور پر ہنستے ہوئے اپنی الجبرا کی کتاب کھول لیتا۔

"مسٹر گھوش، دیکھو تمہاری پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی"۔ ٹھگنا سا بھوٹ کہتا۔ "میں نے نہیں کہا تھا کہ اب کے الیکشن میں چرچل کا ہاتھ بھاری رہے گا؟ تمہیں واقعی لیبر کی شکست پر بہت افسوس ہوگا۔"

"ہونہہ، افسوس، بھلا وہ کیوں؟ جو وہ جیت جاتے تو یقیناً خوشی کا مقام تھا، کیونکہ میں ایک مزدور ہوں، اب جو ٹوری جیت گئے ہیں تو بھی میں خوش ہوں۔ کیونکہ اب میں نے اپنا ایک خوبصورت مکان بنوا رکھا ہے۔ میرا بنک بیلنس بھی کافی ہے، میرا خیال ہے ہر عقلمند انسان کی طرح مجھے بھی ایک ٹوری ہو جانا چاہئیے، نہیں تو ـــــــ"

"ٹرن کوٹ!" سخی اور زرد رو دایا بھائی اُسے ٹوکتا۔

"دنیا کا ہر کامیاب انسان ایک ٹرن کوٹ ہے، میرے بھولے دایا بھائی ـــ اگر میں بھی تمہاری طرح اصول پسند ہوتا تو بے چارگی کی صورت بنائے تمہاری زردی اور کمزوری کا شریک ہوتا۔"

"گُڈ اولڈ گھوش" میں اُس کے پائپ سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا، "میرا خیال تھا کہ انگلستان میں ایک سال کے قیام سے تم پر انگریزی رسومات کا ملمع چڑھ جائے گا۔ لیکن تم تو سر سے پاؤں تک وہی ہو، وہی تماشہ گر سے۔"

"مسٹر پال" وہ متبسم آواز میں جواب دیتا" یہ تو انگلینڈ تھا۔ انسان

دوسرے جہان میں پہنچ کر بھی اپنی فطرت نہیں بدل سکتا، اگرچہ ہم اپنی معصوم فطرت کو مصنوعی عادات کا لباس پہنا کر اسے بڑے فخر سے ڈنر پارٹیوں میں لے جاتے ہیں۔ لیکن دیکھنے والی آنکھ فوراً ہی اس مرصّع لباس کو چاک کر کے ہماری فطرت کو ٹٹول لیتی ہے اور پھر اس انکشاف پر کانٹے چھری سے ایک لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے ہم ایک بھاری سی ہنسی ہنس دیتے ہیں۔ کیا یہ گدھے پن کی انتہا نہیں ہے؟"

"یہ ٹھیک ہے بھائی، لیکن شاید تم بھولتے ہو کہ ماحول کے زیرِ اثر کسی بھی انسان کے لئے کوئی نہ کوئی عادت قبول کر لینا لازم ہے۔"

"مگر ان عادات کو اپنی فطرت کے مطابق ہونے دو۔" وہ فوراً دلیل قبول کرنے سے انکار کر دیتا۔ "تاکہ تمہاری عادات تمہاری فطرت کو مزید اُجاگر کرنے کا ذریعہ ہو جائیں۔ ماحول کے زیرِ اثر اپنی فطرت کو چند مصنوعی عادات سے ڈھانپنا اپنی قدرتی صلاحیتوں کا گلا گھونٹنا ہے۔"

"تم سمجھتے ہو کہ ہم سب واقعی تمہاری باتوں کو بڑے غور سے سُن رہے ہیں؟" کھنہ اُسے چڑانے کی خاطر کہتا گویا اُسے یقین ہوتا کہ اب گھوش گھبرا کر پائپ کے دو تین لمبے کش لگاتے ہوئے چُپ ہو جائے گا۔

"اور تم سمجھتے ہو کہ واقعی میرا مطلب وہی ہے جو کچھ کہ میں کہہ رہا ہوں؟" سب کے قہقہوں کی آواز سے اسٹاف روم گونجنے لگتا، اسی اثنا میں گھنٹی بج جاتی اور وہ بڑے اطمینان سے اپنی کتابوں کو لئے مسکراتے ہوئے اپنی کلاس کی راہ لیتا۔ جہاں اُس کے طلبا بڑی بے صبری سے اُس کے منتظر ہوتے۔

اُس کی موجودگی میں اُس کے طلبا گدگدی سی محسوس کرتے اور اپنے نوجوان چہروں سے بناوٹی متانت کا غبار اُتار کر اپنے اصل روپ میں نظر آنے لگتے۔ اُن کے دلوں میں خود بخود سیکھنے کی خواہش جاگ اُٹھتی۔ مشکل سے مشکل مسئلہ سلجھاتے ہوئے بھی گھوش اس میں مزاح کا رنگ بھر دیتا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا مضمون طلبا کے لئے محض ایک بوجھل فرض نہیں تھا۔ بلکہ ایک ایسا دلچسپ ناول تھا جس کا ہر باب گزشتہ باب سے زیادہ دلچسپ ہوتا ہے۔

وہ اکثر کہا کرتا "میں ایسے ٹیچر کو قطعاً معاف نہیں کر سکتا جو اپنے طلبا کو اُن کی مرضی کے بغیر کچھ سکھانا چاہتا ہے۔"

"اور اگر چند طلبا کو سرے سے ہی اپنی پڑھائی میں دلچسپی نہ ہو تو؟"

"تو ٹیچر کو چاہئے کہ وہ اپنی نوکری سے استعفا دے کر کسی گلی میں نمک تیل کی دوکان کھول لے۔" وہ نہایت آسانی سے جواب دیتا اور اپنا پائپ پھر منہ میں ڈال لیتا۔

پچھلی دفعہ آخری سال کے سنٹر چھوڑنے والے طلبا کے اعزاز میں ٹی پارٹی کے موقع پر وہ ہمارے انگریز وائس پرنسپل مسٹر فرنچ کے جو ہر شخص کو مشکوک نظروں سے دیکھنے کا عادی تھا۔ دائیں پہلو میں بیٹھا بڑی بے تکلفی سے نگار ریسٹوران کے لذیذ سموسے کھانے میں منہمک تھا۔ اُس کے کھانے کی رفتار دیکھ کر مسٹر فرنچ جان بوجھ کر حیران نظر آتے ہوئے کہنے لگا: "مجھے یقین ہے کہ تم یہ سب سموسے ہضم نہیں کر سکو گے۔"

"سموسوں کی تو چھوڑیئے مسٹر فرنچ، مگر آپ کے یہ روغنی الفاظ میرے ہاضمہ کے لئے ضرور بھاری ہیں۔"

ایک خفیف سی مسکراہٹ سے مسٹر فرنچ کے چہرے کے کھچے ہوئے اعصاب میں ایک ہلکا سا ڈھیلا پن آ گیا لیکن فوراً ہی سنبھل کر اُس نے اپنے چہرے میں پہلے سے دوگنا کھچاؤ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنا ہاتھ دائٹ ہاؤس کی خوش نما پیسٹری کی طرف بڑھا دیا۔

اسٹوڈنٹس یونین کا پریذیڈنٹ کرشن چندر اپنے نئے سوٹ میں ملبوس ہمارے پرنسپل ڈاکٹر سینٹ کی بائیں طرف سُکڑا سا بیٹھا تھا اور بڑی نفاست سے آہستہ آہستہ چمچے سے کاٹ کاٹ کر گلاب جامن کھا رہا تھا۔ وہ اب تک بمشکل نصف گلاب جامن ختم کر سکا تھا، گھوش نے سالم گلاب جامن منہ میں پھینکتے ہوئے دور ہی سے آواز دی: "ڈاکٹر، کرشن کو میری طرف بھیج دیجئے، بیچارا آپ کے ساتھ بیٹھا کھاتے ہوئے شرم محسوس کرتا ہے۔"

کرشن نے گھبرا کر جلدی سے باقی ماندہ نصف گلاب جامن اکٹھا ہی منہ میں رکھ لیا۔

چائے کے بعد جب ڈاکٹر سینٹ طلبا کو مخاطب کر چکا تو اُس نے اب گھوش کو بھی کچھ کہنے کو کہا۔ تالیوں کی گونج میں گھوش مسکراتے ہوئے اُٹھا۔

"مسٹر پریذیڈنٹ، رفقا اور طلبا، ڈاکٹر سینٹ کو تو آپ سب سُن ہی چکے، اب مسٹر سنر کو بھی سن لیجئے۔"

سب ہنستے ہوئے ڈاکٹر سینٹ کی طرف دیکھنے لگے اور ڈاکٹر سینٹ مسکراتے ہوئے اپنی عینک کے شیشے صاف کرنے لگا۔

"مجھے یقیناً افسوس نہیں ہے۔" گھوش نے وداع ہونے والے طلبا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا کہ "آج تم سنٹر سے جا رہے ہو۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم میں سے ہر ذہین طالب علم لاشعوری طور پر شروع ہی سے اس دن کا انتظار کر رہا تھا۔ خدا کرے کہ تم سب کامیاب اساتذہ ثابت ہو۔"

"ٹیچر کا کھلا ہوا چہرہ" آخر میں اُس نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا "اُس کے طلبا کی ذہنی صحت کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اُس کے لئے اپنی زردی دُور کرنے کی خاطر ساؤتھ افریقہ کا ایک پکا ہوا سُرخ سیب۔"

"ایسا شخص" میں نے اُس دن ڈاکٹر سینٹ کو کہتے ہوئے سنا "اگر موت کے دھندلکوں میں بھی اتر جائے تو سب مُردے اس کے پائپ کا دھواں ہی سُونگھ کر خوشی سے باؤلے ہوتے ہوئے مسرت کے اس سرچشمے کے ارد گرد ناچنے لگیں۔"

لیکن ایک دن میٹرو میں اُس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھے ہوئے پہلی بار اُس کی نظروں میں بے اطمینانی اور رحمال پھیلتے ہوئے دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا۔ شاید یہ زیادہ پی لینے کا اثر ہو۔ کیونکہ وہ کتنی ہی دیر سے پیئے جا رہا تھا، اور میرے کئی بار وہاں سے اُٹھنے کے لئے اصرار کرنے کے باوجود ہلنے کا نام نہیں لیتا تھا۔

"تم سمجھتے ہو کہ میں بہک رہا ہوں۔ لیکن یقین کرو کہ میں اکثر بہت زیادہ پی کر اپنے آپ کو ہوش میں محسوس کرتا ہوں۔"

"گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو" میں نے کہا "کہ جب تم نہ پیئے ہوئے ہو تو تم نشے میں ہوتے ہو۔"

"ہاں، ٹھیک ہی تو ہے، کیونکہ پی کر ہی میں اپنے آپ کو اصل حالت میں پہچان سکتا ہوں، ورنہ اپنی عام حالت میں تو میری ذات میرے لئے کئی بار اُس قدر اجنبی نظر آتی ہے جتنا کسی ہندوستانی دیہاتی عورت کے لئے اُس کا انگلینڈ ریٹرنڈ لڑکا۔ جسے شروع میں اُس کے بدلے ہوئے اطوار دیکھ کر وہ بھول ہی جاتی ہے کہ یہ تو اُس کا اپنا ہی بیٹا ہے، جسے اُس نے اتنے نازوں سے پالا تھا۔ مجھے اور پی لینے دو، دوست، مجھے مت روکو۔"

مایوسیوں کے سائے اُس کے چہرے میں گہرے ہوتے چلے گئے اور میں مجسمۂ حیرت بنا اُس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ کیا یہ وہی صبح والا گھوش ہے۔

جس کے بے پرواہ قہقہے ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔

"درحقیقت میں اپنی پرائیویٹ زندگی میں جتنا زیادہ رنجیدہ خاطر ہوں، اُتنا ہی زیادہ اپنی پبلک لائف میں مسرور نظر آتا ہوں۔ اپنے غموں کے باوجود میں بیرونی طور پر خوش نظر آنے کا عادی سا ہو گیا ہوں۔"

اُس کی آواز کے خلوص سے متاثر ہو کر میں نے سگریٹ سلگایا اور اُسے بغور سننے لگا۔

"اگرچہ میں دیگر اشخاص کو اپنے آپ کو اصل روپ میں اُجاگر کرنے کی ترغیب دیتا ہوں لیکن خود ایک بدترین ریاکار ہوں — میں ابھی لڑکا ہی تھا کہ اپنے والدین کو ہر وقت غربت کی پریشانیوں میں گھرا ہوا دیکھ کر اکثر تنہائی میں غمناک شکل بنائے بیٹھا رہتا۔ لیکن اسکول میں اپنے ساتھیوں کے درمیان بیٹھا زور زور سے ہنستا، مانو اپنی بیزاری کی تضحیک اُڑا رہا ہوتا — تم لوگ سنٹر کا کام ختم کر کے چھٹی کے وقت گھر جانے کے خیال سے اطمینان کا سانس لیتے ہو اور میں ہر روز گھر کی چار دیواری سے نکل کر اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی دنیا کو دیکھتے ہوئے محسوس کرنے لگتا ہوں کہ باہر کی فضا ہی میرا اصل گھر ہے۔" وہ پائپ سلگانے کے لئے ذرا رک گیا۔

"میری بیوی میلے رنگ کی ایک سُوکھی ہوئی جھگڑالو عورت ہے۔ جسے کھانے، بچے پیدا کرنے اور گھٹیا قسم کے ناول پڑھنے کے سوا اور کسی چیز کا شوق نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مس سینٹ کے بھرے ہوئے تازہ رخساروں کو للچائی نظروں سے دیکھتے ہوئے میں اپنے گھر کے خیال سے اور بھی متنفر ہو جاتا ہوں، میری کہانی ہر موڑ پر ایک نئی شکست کا پیش خیمہ ہے، میرے عزیز دوست۔"

میں ہمہ تن گوش بنے اُسے سنتا رہا۔ تھوڑی دیر کی گمبھیر خاموشی کے بعد یکایک ہنسی کے مارے اُس کا دم اُلٹنے لگا۔

"یہ بھی کیا عجیب مسخرہ پن ہے۔" میں حیرت سے ٹپٹاتے ہوئے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ "تم بھی نرے گاؤدی ہو پال، میرا خیال ہے کہ سنٹر میں نفسیات کی بجائے تم ریاضی پڑھانا شروع کر دو تو اچھے رہو گے، تمہیں میں نے جو کچھ بتایا ہے اُسے کتنی آسانی سے مان گئے ہو۔ میں تو یونہی دلچسپی کے اظہار سے لطف اندوز ہو رہا تھا، گھوش اور مایوسی، ہاہاہا — کتنے متضاد نام ہیں۔"

شرابی قہقہوں کی بوچھاڑ میں اُس نے جلدی سے ایک اور پیگ منہ میں انڈیل لیا۔

"کیا وہ اب بھی واقعی سچ کہہ رہا ہے یا یہ بھی اُس کی تماشہ گری ہے۔"

میں اُس کے ذہن کی تھاہ پانے کے لئے اُس کی آنکھوں میں کتنی ہی دیر بے سود گھورتا رہا۔

راج مہتہ

لیونارڈو دا وِنسی

آرٹسٹ نے ایک لمحہ مادام لِزا کی طرف دیکھا۔ پھر اُن حسین پھولوں کو دیکھا جو پس منظر میں مہک رہے تھے۔ اُن فواروں کو دیکھا جو پانی کے موتی اُگل رہے تھے، اُن سازندوں کو دیکھا جن کے سازوں سے نکلنے والے سُر سحر کی خنک فضاؤں میں رس گھول رہے تھے، اور پھر اُس نے مادام لِزا کے اُن لبوں کو دیکھا جن پر ایک میٹھی مسکراہٹ سورج کی پہلی کرن کی طرح چپکے سے آن بیٹھی تھی —— اُس کے ہاتھ میں بُرش لرز سا گیا۔ سفید اور سپاٹ کینوس نے گویا اُس کا منہ چڑا دیا —— اور اُس نے سوچا یہ مسکراہٹ کتنی حسین اور واضح ہے۔ لیکن اس مسکراہٹ کو جنم دینے والے خطوط کتنے مبہم اور ہلکے ہیں! ——

تین سال تک سازوں کے سُر، پھولوں کی مہک اور فواروں کا ترنم سحر کی فضاؤں میں پھیلتا رہا۔ مادام لِزا مسکراتی رہی اور وہ تصویر بناتا رہا۔ رنگوں کی مناسب ملاوٹ کو دیکھ کر لوگوں کے منہ حیرت اور احترام کے جذبات سے کھُلے رہ گئے۔ لیکن اُس نے بُرش پھینک دیا، ایک مضمحل انداز سے وہ سٹول پر بیٹھ گیا۔ ایک سرد آہ اُس کے سینے میں گھُٹ کر رہ گئی۔ اُس نے کہا "تصویر نامکمل ہے"!

یہ مصوّر جس نے ایک شاہکار تصویر کو نامکمل کہا "لیونارڈو دا ونسی تھا!

ونسی کے چھوٹے سے گاؤں میں اُس کا بچپن گذرا۔ اُس کی ماں ایک کسان خاندان سے تھی۔ لیونارڈو نے سنہرے بال۔ آنکھوں کی چمک اور چہرے کی جاذبیت ماں سے ہی ورثہ میں پائی تھی۔ ان سب چیزوں کے علاوہ ناجائز پیدائش کا الزام بھی اُسے ورثہ میں ملا —— آغازِ شباب میں اُس کی ماں نے ایک وکیل پائرو دا ونسی کے بازوؤں کے حلقہ میں ابدی راحت کے خواب دیکھے تھے، اور اُسے ایک ناجائز بچّے کی ماں بننا پڑا۔ کیونکہ اُس کی شادی رسوم کے مطابق نہ ہوئی تھی —— بچپن ونسی میں گزارنے کے بعد وہ اپنے باپ کے پاس فلورنس چلا گیا۔

اُن دنوں ناجائز پیدائش کو اتنا بُرا نہ سمجھا جاتا تھا۔ پھر بھی اُس کے سوتیلے بھائی اور بہنیں اسی بات کا سہارا لے کر اُسے تنگ کرتے تھے، وہ سب اُس سے حسد کرتے تھے۔ کیونکہ وہ بہت ذہین اور محنتی تھا۔ ریاضی اور موسیقی غیر متعلق سے مضمون ہیں۔ لیکن لیونارڈو کو ریاضی کے فارمولے بھی اتنی ہی اچھی طرح یاد تھے، جتنی اچھی طرح اُسے ساز اور سُر کا احساس تھا —— بچپن ہی سے اُس نے اپنے گرد و نواح کا غور سے مطالعہ شروع کر دیا، اور اپنے احساسات کو ٹھوس بُتوں، ساز کے سُروں اور رنگین تصویروں کا رُوپ دے دیا۔ یہ بُت بھدّے تھے۔ اُس کی آواز اور سُر ہم آہنگ نہ تھے۔ اُن تصویروں کے خطوط بے ڈھنگے اور غیر متناسب تھے۔ پھر بھی یہ سب چیزیں اُس کے شوق اور محنت کی مظہر تھیں۔

تیرہ برس کی عمر میں وہ Verracchio کا شاگرد بن گیا۔ وہ ایک بہت بڑا بُت ساز، ایک اچھا مصوّر اور عالِم تھا۔ دن بھر وہ اپنے اُستاد کے سٹوڈیو میں پتھر تراشتا، نقاشی کرتا اور Verracchio سے نقش و حُسن، رنگ اور سائے کے رموز سمجھنے کی کوشش کرتا، اور جب فلورنس کی گلیوں میں رات کی خنکی اور تاریکی پھیل جاتی، عشرت کدوں میں حریری ملبوس سرسراتے اور حُسن نغمہ و مے سے سرشار، رقص و مستی کے آغوش میں جاسوتا تو لیونارڈو بے چینی سے کروٹیں بدلتا۔ بساطِ فلک پر دمکتے ستاروں کو دیکھتا اور اپنے آوارہ خیالات کو بیجان، پتھروں اور کھُردرے کینوس پر ثبت کرنے کے طریقے سوچتا۔

بارہ برس تک وہ اسی حال میں کام کرتا رہا، سینٹ جیروم Adoraeion of the Magi اور Vergir of The Rocks ——

اسی دَور کی یادگار ہیں۔ ان میں سے دو تصویریں نامکمل ہیں۔

بارہ برس کے اسی تعلیمی دَور میں اُس نے ایک روز محسوس کیا کہ زندگی کو سمجھنے کے لئے رنگ اور سنگ ہی کافی نہیں، دل کی فتنہ سامانیوں کے ساتھ ساتھ ذہنی استدلال کی بھی ضرورت ہے۔ اور اُس کے ساتھیوں نے حیرت سے دیکھا کہ وہ تجربہ گاہ میں Organic Life کا تجزیہ کر رہا ہے۔ وہ سب حیران تھے۔ کہ لیونارڈو دو بالکل متضاد چیزوں، برش اور تیزابی مادّوں والی تجرباتی صراحی کو اکٹھا کرکے کہاں پہنچنا چاہتا ہے؟

فلورنس اُس زمانے میں فن کاروں کا مسکن تھا۔ لیکن یہاں کی زندگی اُسے راس نہیں آئی۔ اپنی نوٹ بُک میں اُس نے لکھا "یہ جگہ دلّالوں، چمڑہ رنگنے والوں، ساہوکاروں اور رسازشیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اور میرے فنّی ذوق کی تکمیل کے لئے تنگ ہے"۔۔۔۔ تیس برس کی عمر میں اُس نے ڈیوک آف میلان کی ملازمت کرلی۔ یہ جگہ پانے میں اُسے کوئی دقّت نہیں ہوئی۔ کیونکہ وہ اب کافی مشہور ہو چکا تھا۔ ملازمت کے لئے جو درخواست اُس نے دی وہ بہت دلچسپ ہے۔ اس میں اُس نے خود کو پُل، بم، عمارتیں اور جنگ کے لئے ڈھکی ہوئی گاڑیاں بنانے کا ماہر انجینئر ظاہر کیا اور بہترین مصوّر اور سنگ تراش ہونے کا دعویٰ کیا، آخر میں اُس نے لکھا، "۔۔۔۔ اگر یہ سب باتیں کسی کو ناممکن یا ناقابلِ عمل معلوم ہوں تو میں آزمائش کے لئے تیار ہوں ۔۔۔"

میلان میں اُسے شاگردوں اور مددگاروں کا کافی عملہ مل گیا، یہاں اُس نے ڈیوک کی داشتہ سیسلیا انگریزیا کی تصویریں بنائیں — شاہی دربار کو سجایا اور اکثر تہواروں پر ڈیوک نے اُسے پارٹیوں کا منتظم بنایا ۔۔۔۔ شمالی اٹلی میں اُس کا قیام بہت اہم گنا جاتا ہے۔ اسی زمانے میں اُس نے ایک بہت بڑا بُت بنانا چاہا جو کبھی مکمل نہ ہوا اور ایک تصویر (آخری طعام) The Last Supper بنائی۔ اس تصویر کا شمار دُنیا کی شاہکار تصویروں میں ہوتا ہے۔

انہی دنوں فرانسیسیوں نے ایلپس کے پہاڑ پار کرلئے اور اُس کے آقا ڈیوک کو گرفتار کرلیا گیا تو لیونارڈو سیزر بورگیا کے ماتحت ملٹری انجینئر کے عہدے پر کام کرنے لگا۔ بہت عرصہ پہلے اُس نے فلورنس کی میونسپلٹی سے کسی جگہ کو مصوّر کرنے کا ٹھیکہ لیا تھا۔ اسی کنٹریکٹ کو پورا کرنے کی غرض سے وہ فلورنس چلا آیا۔ یہیں اُس سے مادام لزا کی تصویر مونا لزا بنائی۔ اُس کی مضطرب روح کو فلورنس کی فضائیں نہ پہلے مطمئن کرسکی تھیں نہ اب ہی اُسے بہلا سکیں، اور وہ رُوم چلا آیا، جہاں اُسے مشہور مصوّر رافیل اور اس کے سرپرست لیو دہم کے طنز و تضحیک کا شکار رہنا پڑا۔

جب وہ روم میں پورے دو برس ضائع کرچکا تھا، اُسے فرانسس اوّل کا دعوت نامہ ملا۔ فرانسس اُس کی فنّی عظمت کا معترف تھا، اُس نے لیونارڈو کو ٹورین کے مقام پر ایک خوبصورت کوٹھی دے دی۔ یہاں آکر اُس نے محسوس کیا، کہ اُس کے ذہن نے اطمینان پالیا ہے۔ یہیں اُس نے اپنی نوٹ بُک میں وہ فقرہ لکھا جس پر فلسفی گھنٹوں بحث کرسکتے ہیں، اُس نے لکھا "۔۔۔۔ میں نے سوچا کہ میں زندہ رہنے کے طریقے تلاش کر رہا ہوں، حقیقتاً میں صرف مرنے کی راہ ڈھونڈ رہا تھا" ۔۔۔۔ اور یہیں ٹورین میں سڑسٹھ برس کی عمر میں وہ لوگوں کی مسکراہٹوں کو لافانی بناکر خود فنا کی گود میں جا سویا ۔۔۔۔ وہ مر گیا، لیکن وہ معصومیت نہ مرسکی، جو اُس نے مریم اور مسیح کے چہروں کے ذریعے کُھردرے پردوں پر بکھیری تھی وہ شگفتگی اور تازگی نہ مرسکی جو اُس نے شاداب پھولوں میں پائی تھی۔ اور جسے اُس نے رنگوں اور خطوط کے حلقہ میں اسیر کردیا تھا ۔۔۔۔

حُسن اور مسرّت لیونارڈو دا ونسی کی زندگی کے محور تھے، دوسرے اکثر مصوّروں کے مقابلے میں وہ بہت خوش تھا۔ شاہوں نے اُس کی خدمات حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ ڈیوک آف میلان کی بہن ازابیلا سے لے کر رقّاصاؤں تک ۔۔۔ سب نے اُس کے لئے موڈل بننا قابلِ فخر سمجھا ۔۔۔۔

اس تمام کامیابی کا صرف ایک راز تھا۔ وہ جو کام کرتا تھا، خلوص اور نیز دل سے کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی تصویروں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں۔ شاید ہی کسی اور مصوّر نے اُس جتنے متنوع موضوع چُنے ہوں۔ جوان لڑکیوں کے گدرائے ہوئے عریاں جسموں اور مردہ انسانوں کی کھوپڑیوں کے درمیان ایک بھیانک فاصلہ ہے لیکن لیونارڈو نے بھیانک کھوپڑیوں کی تصویریں بھی اتنی ہی مہارت سے بنائیں جتنی مہارت سے اُس نے لب و رخسار اور سینے کی مخملیں ڈھلوانوں

سامنے اپنی تصویروں میں سمویا ـــــ انسانی ڈھانچے کی تصویریں جو اُس نے بنائیں اب تک اناٹومی کے نصاب میں دی جاتی ہیں۔

لیونارڈو کی تصویروں کی زیادہ تعداد مریم۔ یسوع اور دوسرے عیسائی راہنماؤں سے متعلق ہے۔ ان میں سب سے زیادہ اہم تصویر ــ "آخری طعام" The Last Supper ہے۔ اس تصویر کی تیاری کے دنوں میں وہ کھانا پینا سب بھول گیا۔ نوٹ بک ہاتھ میں لئے وہ ہر اُس جگہ گیا، جہاں اُسے موڈل ملنے کی اُمید تھی۔ تھیٹر کے اداکاروں سے پھانسی کی سزا پائے ہوئے قیدیوں تک ــــــ سب کے چہروں کا اُس نے مطالعہ کیا۔ اُسے مسیح کی تصویر بنانی تھی، اور اس مقصد کے لئے اُسے ایک ایسا موڈل چاہئیے تھا جس کے چہرے سے سکون، معصومیت اور قدوسیت کے جذبات ہویدا ہوں۔ آخر اُس نے ایک حسین یہودی کو اس تصویر کے لئے چن لیا ـــــ اس تصویر کے رنگ اب مدھم پڑ گئے ہیں۔ لیکن اب بھی اس میں وہ کشش اور مسیحی عقیدت کی رُوح موجود ہے جس کی وجہ سے مسیحی حلقوں میں خصوصاً اور عوام میں عموماً اُس کی اتنی قدر ہے۔

لیونارڈو نے ایک دفعہ کہا تھا: "ہر خوبصورت چیز مرجاتی ہے اور اُسے محفوظ کرنے کا بہترین ذریعہ آرٹ ہے:" اس فقرے کی اہمیت اور سچائی کا احساس ہمیں اُس وقت ہوتا ہے جب ہم اُس کی بنائی ہوئی تصاویر دیکھتے ہیں۔ لیونارڈو کے بکھیرے ہوئے رنگوں کی داستان پڑھتے پڑھتے ہم محسوس کرتے ہیں کہ میٹھی مسکراہٹوں کا خالق ابھی مرا نہیں۔ وہ آج بھی ہمارے درمیان سانس لے رہا ہے ـــــ اور ایک فنکار کی اس سے بڑھ کر کوئی تعریف نہیں ہو سکتی۔

اخترؔ موہانی

آج کل

چرخ پر کالی گھٹاؤں کا سماں ہے آج کل ــ آسمانِ پیر کا بھی دل جواں ہے آج کل

دسترس جذباتِ فطرت پر کہاں ہے آج کل ــ جوشِ ارماں، ضبطِ دل کا امتحاں ہے آج کل

منتشر شیرازۂ شرح و بیاں ہے آج کل ــ نزع کے آغوش میں اپنی زباں ہے آج کل

اپنی بربادی کا کچھ ایسا سماں ہے آج کل ــ ہم زمیں والوں پہ روتا آسماں ہے آج کل

دیکھئے، ہاں وسعتِ ذوقِ تکلم دیکھئے ــ ہر زباں کی بات گویا داستاں ہے آج کل

جب نہیں پہلو میں اپنے وہ بہارِ رنگ و بُو ــ پھر تو یہ فصلِ بہاراں بھی خزاں ہے آج کل

ہرا دا ہے رُوح پرور، ہر نگہ ہے جانستاں ــ حُسن سے رنگیں کسی کی داستاں ہے آج کل

یاد آ آ کر کسی کی، دل دُکھاتی ہے مرا ــ نیسگاں گریۂ اشکِ رواں ہے آج کل

کر دیا ابرِ کرم نے سوز کو سازِ مکاں ــ مجھ کو ہر بجلی چراغِ آشیاں ہے آج کل

فیضِ ساقی سے زمانہ بے پئے سرشار ہے ــ کیف میں ڈوبی فضائے دوجہاں ہے آج کل

رُوح مست و جان مست و عقل مست و ہوش مست ــ مستِ کیفِ بیخودی پیر و جواں ہے آج کل

شیشہ مست و جام مست و بادۂ گلفام مست ــ مست اپنے حال میں پیرِ مغاں ہے آج کل

دیکھئے جس کو چلا آتا ہے سجدے کے لئے ــ سجدہ گاہِ خلق اُن کا آستاں ہے آج کل

گر پڑے دو چار آنسو جس طرف اُٹھی نظر ــ چشمِ تر منجملۂ ابرِ رواں ہے آج کل

کس کو لطفِ آشیاں حاصل نہیں برسات میں
پھر بھی تو اخترؔ خرابِ آشیاں ہے آج کل

۲۰
آل احمد سرور

اردو کے منفرد نقاد سید احتشام حسین
جو مصنف ، ناشر اور قاري کے باهمي رشتے
کا مطالعه کرنے ریاستہائے متحدہ امریکه
تشریف لے گئے هیں - آپ قریباً نو ماه
امریکه میں قیام کریں گے اور تین چار
ماه کے لئے برطانیه اور یورپ کے دوسرے
ملکوں میں جائینگے -
آپ کا مقاله "آل احمد سرور ––
شاعر کي حثیت سے" زیر نظر شمارے
میں ملاحظه فرمائیے -

جنوبی افریقہ میں جدوجہد

جنوبي افریقہ میں غیر منصفانہ نسلي امتیاز کے خلاف ستیہ گرہ کي تحریک کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس میں افریقي اور ہندوستاني عورتیں زور و شور سے حصہ لے رھي ھیں - اس تصویر میں یہ عورتوں کا جتھا ترانسوال میں پرمٹ کے قواعد کي خلاف ورزی کر رہا ہے -
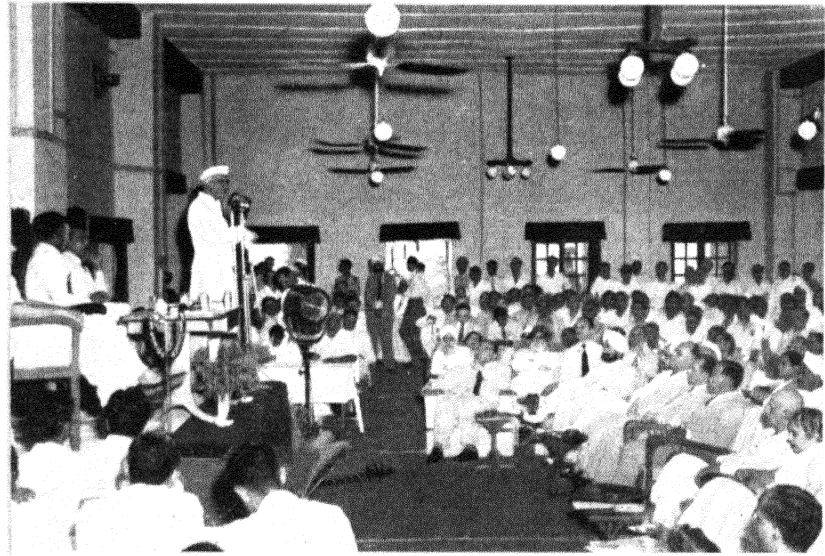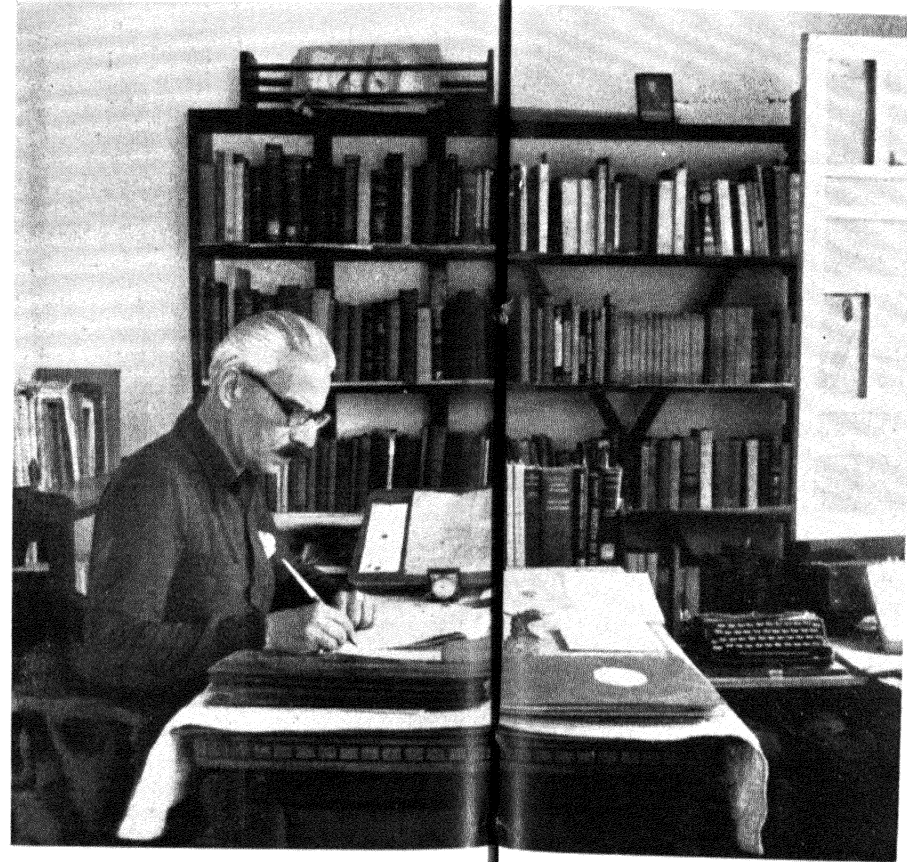
ڈاکٹر کیسکر کشمیر میں

حال ھي میں ڈاکٹر بي. وي. کیسکر وزیر نشر و اطلاعات کشمیر تشریف لے گئے جہاں انھوں نے بھارتي سینا کے جوانوں سے ملاقات کي - تصویر میں آپ بریگیڈیر راجندر سنگھ (مہاویر چکر) کي یادگار پر پھول چڑھا رہے ھیں -

یادگار ذکی ـاب ظفر حسین خان

ذکي مرحوم کے متعلق ا[illegible]سی شمارے میں شائع ہو رہا ہے

حال ھي میں نئي دھلي میں آل انڈیا نیوز پیپرز ایڈیٹرز کانفرنس کا سالانہ اجلاس ھوا - کانفرنس نے پردھان منتري کے اعزاز میں ایک لنچ کا اهتمام کیا - یہ تصویر اسي موقعے پر لي گئي - اس میں پردھان منتري استقبالیہ کمیٹي کے ممبروں کے درمیان کھڑے ھیں - نیچے کي تصویر میں پردھان منتري کانفرنس کے اجلاس میں تقریر کر رہے ھیں - (نیچے بائیں کونے میں) انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ کے وزیر ڈاکٹر بي. وي. کیسکر آل انڈیا نیوز پیپرز ایڈیٹرز کانفرنس سے خطاب کر رہے ھیں -

میسور میں لکڑی کا کام

میسور میں لکڑی کی صنعت فن اور دستکاری کا ایک حسین امتزاج پیش کرتی ہے یہاں کی لکڑی کی بنی ہوئی چیزیں ساری دنیا میں ایک خاص شہرت رکھتی ہیں۔ اس قسم کے کام میں طرح طرح کی لکڑیاں استعمال کی ہیں جو دیش کے مختلف حصوں میں دستیاب ہوتی ہیں۔ یہ ایک ڈبیہ کی تصویر ہے جو صندل کی لکڑی سے بنائی گئی ہے

یہ بھینس گلاب کی لکڑی سے بنائی گئی ہے۔ اسی سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ میسور میں یہ صنعت کتنے عروج کو پہنچی ہوئی ہے۔

بیتاب بریلوی

مُصوّری اور اُس کی پرکھ

تاثرات کے اعتبار سے مُصوّری کا میدان صرف نشاطِ باصرہ تک ہی محدود نہیں کیا جا سکتا۔ درحقیقت صنعتِ تصویر سازی براہِ راست ہمارے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ماہرینِ ذہنیات کی قطعی رائے ہے کہ جو چیز ہمارے مشاہدہ میں آتی ہے اس کے نقوش باصرہ کی وساطت سے ہمارے پردۂ شعور پر من وعن مرتسم ہو جاتے ہیں اور ہم اسی ذہنی تصویر کی مدد سے نہ صرف اس شے سے متعارف ہوتے ہیں بلکہ اس کی ہم جنس و غیر جنس اشیاء میں تمیز کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر شے یا منظر کے ادراک کے احساسات مختلف ہوتے ہیں۔ حُسن کاری ان احساسات کو شدّت و گیرائی سے ہمدوش بھی کرتی ہے اور ہمارے نہاں خانۂ دل میں مختلف النّوع کیفیات پیدا کرنے کی موجب بھی ہوتی ہے۔ انہیں کیفیات کا نام علمائے ہند کی اصطلاح میں رس ہے۔ پس مصوّری کا منشائے حقیقی بھی دیگر فنونِ لطیفہ کی طرح کسی ایک یا دوسرے رس کی تحریک کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ محض نظر نوازی اس فنِ رنگین کی صریحاً توہین ہے۔ کسی تصویر کو دیکھ کر کوئی بھی اسے اچھا یا بُرا تو کہہ سکتا ہے لیکن اس کے حُسن و قبح کی تفاصیل سے بحث کرنے کی صلاحیّت ہر ایک میں نہیں ہوتی۔ جیسے کوئی اچھا شعر سُن کر ایک اُمّی بھی پھڑک اٹھتا ہے لیکن اس کے اوصاف و نقائص تک اس کی رسائی نہیں ہوتی۔ پس جس طرح کسی شعر کے حُسنِ ذاتی سے لطف اندوز ہونے کے لئے زبان اور علم بیان کا وقوف لابدی ہے اسی طرح کسی تصویر کے جمال و کمال، اس کے لب بستہ پیام سے مستفید ہونے کے لئے اسی فنِ لطیف کے بنیادی اصولوں کا ادراک بھی ضروری ہے۔

شعر بعض ارکان کا مجموعہ ہوتا ہے لیکن اس کی روح رواں منتخبہ تخیل کی وہ آوازیں ہیں جو موسیقی کے زیر و بم کے سانچے میں ڈھلی ہوتی ہیں بعینہٖ اسی طرح مصوّری (جسے سراپا شعریت سمجھنا چاہیئے) کی جان بھی ایک نہ ایک مخصوص رس ہوتا ہے جو خطوط اور رنگوں کے قید و بند میں جکڑا رہتا ہے۔

ہر مکمل تصویر کے یہ پانچ بنیادی عناصر ہوتے ہیں (۱) خطوط (۲) وضع و جسامت (۳) اقدار و تضاد (۴) رنگ (۵) عمق و وسعت اور شدّت۔ ان میں سے آخر الذکر دو عناصر کا تعلق کم و بیش رنگوں کی آمیزش اور خطوط کے اوصاف سے ہے۔ ان عناصرِ خمسہ کی اہمیت کو ذہن نشین کئے بغیر کسی تصویر کے محاسن و معائب کو اجاگر کرنا ناممکنات سے ہے۔

دراصل چابکدست مصوّر کا تمام منشائے تخلیق خطوط ہی میں پنہاں رہتا ہے۔ بقیہ عناصر اربعہ اس کی وضاحت کرنے میں بغایت ممد و معاون ہوتے ہیں۔ خط یا لکیر کی تعریف یہ ہے کہ اس میں صرف لمبائی ہوتی ہے موٹائی یا چوڑائی نہیں ہوتی۔ اقلیدس کے اس نظریے کو محض اصطلاحاً تو صحیح تصوّر کیا جا سکتا ہے مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہوتا خطوط کتنے ہی باریک کیوں نہ ہوں کچھ نہ کچھ موٹائی یا چوڑائی لئے ہی رہتے ہیں۔

خطوط

تصویر میں خطوط کی پرکھ ان کی جسامت اور اوصاف سے ہوتی ہے۔ اوصاف کی مظہران کی موٹائی ہوتی ہے۔ خطوط کی کئی قسمیں ہیں:- (۱) سیدھے (۲) ٹیڑھے ترچھے (۳) خمیدہ و دندانہ دار (۴) بیضاوی (۵) خفی و جلی (۶) روشن و تاریک یا مدھم وغیرہ۔ قوس و دوائر کا شمار بھی خطوط ہی میں کیا جاتا ہے۔ سطحوں کے اتّصال سے بھی خطوط خود بخود معرضِ وجود میں آ جاتے ہیں۔ ان کے مختلف اوصاف کے اثرات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ مدھم اور پھیکے خطوط سے نزاکت ٹپکتی ہے بہت سبک یا مبہم لکیریں ضعف و ناپائداری کی حامل ہوتی ہیں۔ خط جتنا گہرا اور روشن ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ قریب کا احساس کراتا ہے۔ خفی و

تاریک خطوط دوری کے مظہر ہوتے ہیں۔ اسی لئے اشیا کے قرب و بعد کو نمایاں کرنے کے لئے خطوط کے ان اوصاف کے اختلافات کا سہارا لیا جاتا ہے۔ بہت گہری لکیریں خود اعتمادی سنجیدگی اور استقلال کی آئینہ دار ہوتی ہیں اور کبھی کبھی قرب و بعد کو بھی آشکارا کرتی ہیں۔

خطوطِ مستقیم لاتعداد زوایا سے کھینچے جا سکتے ہیں۔ مثلاً کھڑے پڑے یا ترچھے وغیرہ۔ سمتوں کے الٹ پھیر سے ان میں اختلاف و افتراق ڈالا جا سکتا ہے۔ مختلف اقسام کے خطوط کے مشاہدہ سے دل و دماغ پر مختلف قسم کے اثرات ہوتے ہیں۔ سیدھی کھڑی لکیر سادگی صفائی جیسی استواری اور استقلال کی ضامن ہوتی ہے۔ پڑے خطوط کے تسلسل سے روانی اور تھم تھم کر کھینچی گئی پڑی لکیروں سے کاہلی اور آرام طلبی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ نیچے سے اوپر کو کھینچے گئے خطوط علوے روح کے حامی ہوتے ہیں۔ اور ناظر کو ہاتھ پکڑ کر فضائی بلندیوں میں لے اڑتے ہیں۔ لیکن اوپر سے نیچے جانے والی لکیروں کا معکوس اثر ہوتا ہے اور وہ ہمیں پستی و مایوسی کی تاریکیوں میں کھینچ لاتی ہیں۔ نیچے سے اوپر جانے والی لکیریں بتدریج پتلی اور مدھم ہوتی چلی جاتی ہیں اور اوپر سے نیچے جانے والی لکیریں ان کے بالکل برعکس ہوتی ہیں۔

ترچھے خطوط کے اثرات کا علاقہ ان کے ترچھے پن کی کمی و بیشی سے ہوتا ہے۔ معمولی ترچھی لکیروں میں محدود قوت و توانائی ہوتی ہے قوس میں حسن و رعنائی و برنائی کا مادّہ زیادہ ہوتا ہے۔ اور اس سے نفاست مترشح ہوتی ہے بے حد ترچھی لکیریں اپنی الجھنوں میں کوئی نہ کوئی راز چھپائے رہتی ہیں۔ ترچھی لکیروں میں نگاہ الجھتی ہے اور نظر پر غیر معمولی زور پڑتا ہے۔ کسی خطِ مستقیم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچنے میں کم سے کم فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ ترچھے اور گنجلک خطوط میں الجھنیں نہ صرف دوری میں اضافہ کرنے کا باعث ہوتی ہیں بلکہ پائے نگاہ کو متزلزل بھی کر دیتی ہیں۔ عمودی خطوط سے صاف طور پر عیاں ہوتا ہے کہ دو متباین قوتیں کھنچ کھنچا کر ایک نقطہ پر ٹھہر گئی ہیں۔ مگر یہ دونوں کبھی مل کر ایک نہیں ہو سکتیں۔ غیر عمودی خطوط کی ملاوٹ سے پہاڑوں کی چوٹیوں اور ناہمواری کا گمان ہوتا ہے۔

کامیاب مصور مختلف النوع خطوط ہی کی مدد سے دیکھنے والوں کو حسبِ منشا متاثر کرنے کا اہتمام کرتا ہے۔ اور ناظر کی نگاہ کو انگلی پکڑ کر اس مقام تک لے جاتا ہے جسے وہ اپنی منزلِ مقصود سمجھ کر گامزن ہوتا ہے۔ دراصل

خطوط کی کشش صحت، موزونیت اور نفاست ہی میں فنکار کی عظمت مضمر ہوتی ہے۔ خطوط کے صحیح مصرف ہی سے جذب و کشش، اثر و تاثیر کو ایک مرکز پر اکٹھا کیا جا سکتا ہے۔

کسی ایک سطح کو دوسری سے ملا کر یا ایک کا سایہ دوسری پر ڈال کر بھی خطوط کو پیدا کیا جا سکتا ہے۔ بہترین خطوط وہ ہوتے ہیں جو تضاد یا رنگوں کے امتزاج سے خود بخود ابھر آتے ہیں۔

وضع و جسامت سطح کے خارجی خطوط سے تصویر کی جسامت متعین ہوتی ہے۔ جسامت کے اختلافات کا انحصار محدودہ رقبہ اور سطح کے خارجی خطوط کے اوصاف پر ہوتا ہے۔ مناظر کی جسامت و وسعت کے دو یا تین حدود ممکن ہیں۔ جسامت اگر سادہ ہو تو دو اور ٹھوس ہو تو تین پہلو ہوتے ہیں جن میں لمبائی چوڑائی اور موٹائی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جسامت اور وضع بالعموم خطوطِ مستقیم سے واضح کی جاتی ہے۔ مربعے مستطیل یا مثلث نما جسامتیں عام طور پر پسند کی جاتی ہیں۔ سطح و سطور کے اوصاف کے مطابق وضع قطع میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے۔

ترچھے خطوط سے بیضاوی، ہلالی، بدری اور قوسی وغیرہ انواع و اقسام کی جسامتیں منصۂ شہود پر لائی جا سکتی ہیں۔ صوری و نسبتی اختلاف کے ساتھ ساتھ سطحی تفاوت سے بھی وضع میں فرق آ سکتا ہے۔ سطح کی بخی بناوٹ سے وضع و جسامت کے اثرات میں رد و بدل ہو سکتا ہے۔ اگر زمین سپاٹ اور چکنی ہے تو وضع و جسامت کا اثر کھدری اور ناہموار سطح کے مقابلے میں بالکل مختلف ہوگا۔

اشکال و صور کے مشاہدہ سے کس نوع کا منظر بہ شعور بیدار ہوتا ہے اور کس قسم کے جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں اس کا اندازہ ان کے تناسب، شباہت اور نقش کردار سے لگایا جا سکتا ہے۔ ایک ایسا مثلث جس کا قاعدہ اس کے طول کے برابر ہو متانت و پائداری کا علمبردار ہوتا ہے۔ متساوی الاضلاع مثلث میں بھی یہی وصف ہوتا ہے مگر اس کی یکسانیت و یک رنگی دلکشی سے عاری ہوتی ہے۔ پڑی مستطیل ارتباط و اختلاط کی اور کھڑی ارتقاء و ارتفاع کی حامل ہوتی ہے۔ پہلی صورت میں نگاہ صرف ایک سمت سے دوسری سمت کو متحرک ہوتی ہے لیکن دوسری میں اوپر کو اٹھتی ہے۔ ہم مرکز قوسی جسامتیں

تسلسل کی امین ہوتی ہیں۔ الغرض سیدھے خطوط کی جسامت سے چستی و صفائی اور ترچھی لکیروں کی جسامتوں سے سستی و بیدلی کا پتہ چلتا ہے۔ ترچھی ٹیڑھی سمتوں میں گامزن ہونے پر مائل نگاہ کو قدم قدم پر لغزش ہوتی ہے اور منزلِ مقصود تک پہنچنے میں توقف ہوتا ہے۔

جسامت جس سطح کا احاطہ کرتی ہے اس کی پیمائش میں فرق پڑنے سے اثرات میں بھی تبدیلی آجاتی ہے۔ اگر وسعت زیادہ ہو تو کشادگی کا اور کم ہو تو انقباض کا احساس ہوتا ہے۔ جب ایک جسامت دوسرے کے قریب ہوتی ہے تو اثرات کا رنگ ہی بدل جاتا ہے۔ سطح کی ناہمواری سے ابھار صفائی اور رعنائی خود کر آتی ہے اور اس کی لطافت و ہمواری سے نزاکت پھوٹ نکلتی ہے۔ قصہ کوتاہ فنکار کے دستور العمل کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ اس کے تمام لوازمات بیک وقت ایک ہی طرح کے جذبات کا محرک ہوتا ہے خطوط کی طرح جسامت بھی نگاہ کی رہبری کرتی ہے۔ اور رفتارِ نگاہ جذبات کی تحریک کی موجب ہوتی ہے۔ اس لئے جسامت کی الجھنیں جذبات میں انتشار پیدا کر دیتی ہیں۔ پس جسامت میں ہمرنگی سے معمولی گریز تو مستحسن ہو سکتا ہے لیکن غیر معمولی تضاد کو ہمیشہ معیوب قرار دیا جاتا ہے۔ سیاہی سفیدی کو اور سفیدی سیاہی کو فروغ یا جلا دیتی ہے۔

اقدار و تضاد

مخالف رنگوں کے پاس پاس ہونے سے دونوں ایک دوسرے پر اس طرح اثر انداز ہوتے ہیں کہ دونوں میں چمک اور شوخی آجاتی ہے۔ یہ چمک یا روشنی تضاد ہی کی رس ہوتی ہے۔ اسی لئے فروغ یا روشنی کی مقدار کو تضاد سے تعبیر کیا جاتا ہے جو بجائے خود اجتماعِ ضدین کا منت کش ہوتا ہے۔

تضاد کی ابتدائی و انتہائی حدود کو دو مخالف رنگوں سے نمایاں کیا جاتا ہے۔ سپید و سیاہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ سیاہی ساری روشنی کو سمیٹ کر اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ جس سے اس کا پھیلاؤ رک جاتا ہے اور سیاہی زیادہ سیاہ نظر آنے لگتی ہے۔ سپیدی ہمہ تن نور ہوتی ہے۔ اس لئے اجالے کے پھیلنے میں سفید زمین سے جس قدر مدد ملتی ہے اتنی کسی دوسری چیز سے نہیں ملتی۔ سیاہ اور سپید رنگوں کے وسط میں بھورے رنگ کو جگہ دی جاتی ہے۔ اس سے رنگوں کی اقدار بڑھ جاتی ہیں۔ بھورا رنگ ہلکا بھی ہوتا ہے اور شوخ بھی۔ نیم سیاہ و سفید سطح کے درمیان ہلکا بھورا اور نیم سفید و سیاہ سطح کے مابین شوخ بھورا رنگ تضاد کے قیام کے لئے افضل و برتر مانا گیا ہے تضاد کو فروغ، ہم آہنگی اور سایہ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور اسے بڑھانے گھٹانے کے لئے سپید و سیاہ متضاد رنگوں کی آمیزش کی جاتی ہے۔ کسی رنگ میں سفیدی شامل کر دینے سے اس کی چمک یا روشنی میں اضافہ ہو جاتا ہے مگر سیاہی ملانے سے جو حل نیا ہوتا ہے اسے سایہ کہا جاتا ہے۔ خطوط سے بھی تضاد پیدا ہوتا ہے۔ پاس پاس کھینچی ہوئی لکیروں سے تضاد میں کمی اور فاصلہ سے کھینچے ہوئے خطوط سے اضافہ ہوتا ہے۔ یہی بات لکیروں کی موٹائی کو گھٹا بڑھا کر بھی ممکن ہو سکتی ہے۔ موٹے خطوط باریک لکیروں کی بہ نسبت دوری کو کم کر کے تضاد کی مقدار گھٹا دیتے ہیں۔

سورج کی روشنی اور تاریکی سے بھی تضاد کا ظہور ہوتا ہے۔ گو روشنی کی قلت و افزائش سے خطوط، وضع اور جسامت کی بناوٹ میں کوئی فرق نہیں آنے پاتا۔ لیکن ان کے رنگ و روغن، حسن و جمال میں فرق پڑ جاتا ہے۔ طلوعِ آفتاب سے پہلے دوپہر اور غروب کے بعد ایک ہی چیز کا نظارہ مختلف کیفیتوں کا مرقع پیش نظر کرتا ہے۔ تاج محل کو لوگ اسی خیال سے مختلف اوقات میں بار بار دیکھتے ہیں اور ہر دفعہ ایک نئے نظارۂ جمیل سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ روشنی کے رخ اور اس کی مقدار کی کمی بیشی سے تضاد میں تبدیلیاں پیدا کرنے سے بھی مطلوبہ اثرات مترتب ہوتے ہیں۔

رنگ پر روشنی کا بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ روشنی رنگ کی کایا ہی پلٹ دیتی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

تیز دھوپ میں ہرے بھرے درخت کے سبز پتے پیلے اور چمکدار دکھائی دیتے ہیں۔ نیلا آسمان رات کی تاریکی میں کالا ہو جاتا ہے۔ وضع و طرح میں سرمو فرق نہ آنے کے باوجود تضاد کی بدولت جو جدت و شوخی آجاتی ہے وہ ہمیشہ مصور کے بنیادی مقاصد کے تابع رہتی ہے اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے مرکزی خیال کو حسن و نور کی خلعت سے مزین کر کے جنتِ نگاہ بنا دیتی ہے۔ اور ہمارے سازِ شعور کے تاروں کو اپنے لمس شیریں سے چھیڑ کر علوئے روح کا سامان فراہم کرتی ہے۔ تضاد میں جو عمق ہوتا ہے وہ حسن و احترام کے جذبات کا محرک ہوتا ہے۔ عمیق ترین تضاد حزن و یاس کی علامت ہے لیکن اگر یہ عنصر سبک اور فرو تر ہو تو کیف و سرور کے دریا بہا دیتا ہے۔ اس سے کنارہ کشی اور گوشہ نشینی کو خیرباد کہنے کی خواہشات کا بھی اظہار

ہوتا ہے۔

شوخی یا رنگوں کی ہم آہنگی کا غلبہ اور چمکیلی روشنی کا اشتراک و اتحاد ڈرامائی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ تضاد کی یک رنگی نہایت تسکین دہ ہوتی ہے اس میں بعد و تذبذب کی جھلک ہوتی ہے۔ مگر اس کی رنگینیاں جدوجہد مخالفت اور تیقن کی شفاف فضاؤں میں کھینچ لے جانے کی سکت رکھتی ہیں اس طرح عیان و مظاہر کے درمیانی فاصلہ اور ان کے تقرب و بعد کو بآسانی دکھایا جا سکتا ہے۔ تضاد کی دوری افتراق کی اور اس کی قربت اتحاد کی علامت ہوتی ہے۔

تضاد کا اجتماع اور اس کا باہمی ربط وضع و جسامت نیز خطوط پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر اس میں اختلافات کی کثرت ہے تو خطوط اُبھر کر بہت زیادہ نمایاں اور جاذب توجہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر اس کے برعکس ربط و ہم آہنگی کا اہتمام ہو تو لکیریں دھندلی اور کھوئی ہوئی سی محسوس ہوتی ہیں۔ رنگوں کے باہمی تعلقات کا بھی تضاد پر کافی اثر پڑتا ہے۔ سیاہ و تاریک پس منظر بھورے رنگ کو فروغ دیتا ہے۔۔ لیکن سفیدی کے مس سے اس میں پھیکا پن آجاتا ہے۔

رنگ فی الاصل نور کی تبدیلی ہیئت ہی سے رنگ کا ظہور ہوتا ہے۔ اسی لئے نور کو رنگوں کا منبع قرار دیا جاتا ہے۔ جھاڑ کے تین پہلوؤں والے شیشے کے ٹکڑے کو سورج کے سامنے کرکے دیکھنے سے قوس قزح کی تمام رنگینیاں آنکھوں میں بھر جاتی ہیں۔ اس سے ثابت ہے کہ رنگوں کا مخرج آفتاب ہے اور تمام بنیادی رنگ جو تعداد میں صرف سات ہیں اسی کی روشنی کی تقسیم سے پیدا ہوتے ہیں۔ گویا آفتاب سرچشمۂ رنگ و نور ہے لیکن آفتاب سے صرف روشنی کی کرنیں پھوٹتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس طور سے بھی روشنی مجموعۂ ہفت رنگ قرار پاتی ہے۔ پس نور کو جاذب و منعکس کرکے ہم بھی اسے تقسیم کر سکتے ہیں۔ جب کوئی چیز روشنی کو تمام و کمال جذب کر لیتی ہے تو وہ کالی دکھائی دینے لگتی ہے۔ لیکن اس سے نور چھننے لگتا ہے تو اس کا رنگ سفید نظر آتا ہے۔ جذب و انعکاس کے جزوی عمل سے رنگینی آتی ہے۔ یعنی اگر روشنی محض جزوی طور پر جذب ہو تو بقیہ حصہ رنگین دکھائی دے گا۔ ہریالی چونکہ ہرے رنگ کو چھوڑ کر روشنی کے بقیہ رنگوں کو جذب کر لیتی ہے اس لئے سبز نظر آتی ہے۔

آفتاب کی وہ شعاعیں جو منعکس ہو کر ہم تک پہنچتی ہیں رنگوں میں ڈوبی ہوتی ہیں۔ باصرہ کو متاثر کرنے والی سب سے پہلی چیز رنگ اور وضع ہی ہوتی ہے اس سے ہم کسی چیز کی شناخت کرتے ہیں۔ شباہت اور اس کی جزئی تفصیل نقشہ اور خط و خال وغیرہ پر ہماری نظر بہت بعد میں جاتی ہے۔ زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا ہو جو رنگ سے نمایاں و متاثر نہ ہو۔ ہم اپنے جذبات و خیالات کا اظہار بھی رنگوں سے کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شعراء کے کلام کی رنگینی ہمارے دلوں میں گھر کر لیتی ہے۔ اور شاید اسی لئے رنگ کو حال کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ہر پھول کا رنگ جداگانہ ہوتا ہے۔ شعراء کا بھی اپنا اپنا رنگ ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ رنگ کے معانی کی وسعتیں اس کی ہمہ گیری کی قائل ہیں۔

ہر رنگ کا ایک خاصہ ہوتا ہے۔ آفتاب کا رنگ زرد ہے۔ پیلے رنگ کو نور کا مترادف قرار دیا جاتا ہے۔ اس سے مسرت ٹپکتی ہے یہی اس کی خاصیت ہے۔ اُودا رنگ تزک و احتشام کا نشان ہے۔ اور نیلا عظمت و احترام کا اسی طرح سرخی کو خدائے جدال و قتال سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اور سرخ رنگ سے غیظ و غضب نیز خطرات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ آگ کا طبعی رنگ نیلا ہے مگر اس کی لپٹوں کو سرخی سے نمایاں کیا جاتا ہے۔

ہمارے حواس پر رنگوں کا اثر ان کے خواص کے مطابق ان چھوٹے چھوٹے مرکوز کو سمیٹنے اور پھیلانے والے شیشوں کے ذریعے سے ہوتا ہے جو ہمارے نظام بصارت کے تاروں میں پیوست ہیں اور جن کا تعلق ہمارے عضو شعور سے ہے۔ یہ بے شمار شیشے تین طرح کے ہوتے ہیں کچھ سرخ اور سبز رنگ کے اثرات قبول کرتے ہیں کچھ پیلے اور نیلے رنگ کے اور کچھ کالے اور سفید رنگ سے متاثر ہوتے ہیں۔ اسی طرح رنگوں کے اوصاف بھی تین ہیں :۔ (۱) رنگت (۲) فروغ اور (۳) تندی یا وزن۔ ان میں سے ہر وصف اپنے مخصوص رنگ میں ہمارے جذبات کی رو پر اثر انداز ہوتا ہے رنگت کی بنا پر ہی رنگوں کی تخصیص ہوتی ہے۔ اصطلاحِ عام میں رنگ اور رنگت متحد المعنی الفاظ ہیں۔ لیکن فنی نقطۂ نگاہ سے رنگت کو رنگ کا جوہر مانا گیا ہے۔ رنگت نیلی، پیلی، کالی یا سفید کسی طرح کی بھی ہو سکتی ہے لیکن رنگ کا تذکرہ اس وقت تک تشنہ رہتا ہے جب تک اس کے فروغ یا وزن وغیرہ کی تفصیل بیان نہ کی جائے۔ ہلکا، نیلا، شوخ، سبز وغیرہ

سے رنگ کی ہی تفصیل مراد ہوتی ہے ۔ بعض رنگتیں ایسی ہوتی ہیں جو دو رنگوں کے
امتزاج سے حاصل ہوتی ہیں اور بعض ایسی جن کا کیمیاوی مرکب بنانا ناممکن
ہے ۔ رنگ رنگین روشنی اور رنگتوں سے دستیاب ہوتے ہیں ۔ اشیار کی
بنیادی رنگتیں تین ہیں (۱) نیلی (۲) لال (۳) پیلی ۔ روشنی کی بنیادی رنگتیں
بھی ہیں (۱) لال (۲) ہری اور (۳) عنابی نیلی ۔ یہ رنگتیں کسی قسم کی ملاوٹ
سے نہیں بن سکتیں مگر ان کو ملا کر دوسری رنگتیں بنائی جاتی ہیں ۔

مختلف رنگوں کی اشیار کی ملاوٹ سے جو تنوع پیدا ہوتا ہے وہ
رنگتوں کی نور کے جذب و اثر کی صلاحیتوں کا رہین ہوتا ہے ۔ جب رنگ برنگ
کی چیزیں اکٹھی ہوتی ہیں تو وہ نور کی شعاعوں کو مختلف رنگوں میں جذب کر کے
اس کی مقدار گھٹا دیتی ہیں جس سے رنگتوں میں فرق پڑ جاتا ہے ۔ روشنی سے
پیدا کی ہوئی رنگتوں میں شعاعوں کا فقدان نہیں ہوتا بلکہ ان کی افراط ہوتی
ہے ۔ مادی اشیار کی رنگتوں شعاعوں کی کمی سے فرق پڑتا ہے ۔ اس کے برعکس
روشنی کی رنگتوں میں ان کی زیادتی ہی سے یہ بات حاصل ہوتی ہے ۔ جس کا مظاہرہ
صرف اسٹیج تک محدود ہے ۔ مادی اشیار اور روشنی کی بنیادی رنگتوں میں
اختلاف پایا جاتا ہے ۔ زرد رنگ مادی اشیار کا بنیادی رنگ ہے اور
ہرا روشنی کا ۔ دونوں صورتوں میں علی الترتیب یہ دونو رنگ کسی ملاوٹ
کا نتیجہ نہیں ہو سکتے ۔ لیکن ایک دوسرے میں ملاوٹ سے حاصل ہو سکتے
ہیں ۔ ملاوٹ سے پیلا رنگ روشنی میں اور ہرا مادی اشیار میں ہویدا ہوتا ہے

مصور صرف مادی اشیار کی رنگتوں کا استعمال کر سکتا ہے ۔ اس
لیے مادی اشیار کی بنیادی رنگتوں اور ان کی مختلف آمیزشوں ہی سے
ہمارا سابقہ پڑ سکتا ہے ۔ اثر و تاثیر کے اعتبار سے اشتعال اور تسکین
ہی رنگتوں کی خاصیت قرار پاتی ہے ۔ سرخ اور سرخی مائل رنگتوں سے اشتعال
اور نیلی اور نیلگوں رنگتوں سے تسکین میسر آتی ہے ۔ سرخ رنگت اپنی شوخی و
شدت کے باعث ہمیشہ پیش پیش رہتی ہے چونکہ پیلی رنگت نور کی مظہر ہے
اور اس سے تازگی و مسرت ٹپکتی ہے اس لیے اس میں سرخی کی آمیزش سے جو
نارنجی رنگ بنتا ہے اس میں بھی یہی خاصیت پائی جاتی ہے ۔ نیلی رنگت سے
دوری اور سکون کا احساس ہوتا ہے ۔ نیلی پیلی کو ملانے سے عنابی رنگ بنتا
ہے یہ رنگ پرسکون مگر نمائشی ہوتا ہے ۔

نظام فطرت میں ہری رنگت کی فراوانی ہے ۔ سبزی سے آنکھوں کو تازگی
اور دل کو سرور ملتا ہے ۔ اگر اس میں نیلا رنگ شامل کر دیا جائے تو اس
کے اثرات میں بغایت اضافہ ہو جاتا ہے ۔ درمیانی رنگت ان رنگتوں کے
اثرات کو نمایاں کرتی ہے جن کو ملا کر وہ طیار کی جاتی ہیں ۔

رنگ جیسا کہ پیشتر کہا جا چکا ہے نور ہی کا پرتو ہے اس لیے رنگ و
نور کا اجتماع ایک فطری چیز ہے ۔ چنانچہ ہر رنگ میں کچھ نہ کچھ فروغ
ہوتا ہے یہی فروغ رنگ اور رنگت کے اختلاف کا ضامن ہے ۔ رنگوں کے
فروغ کی مقدار گھٹائی بڑھائی جا سکتی ہے ۔ اور ان میں اختلاف پیدا
کیا جا سکتا ہے ۔ سپیدی سے فروغ کو بڑھایا اور سیاہی سے گھٹایا جاتا
ہے ۔ وہ رنگت جو انتہائی فروغ کی حامل ہوتی ہے سفید سے نسبتاً زیادہ
سیاہ اور جو کم سے کم فروغ کی مظہر ہوتی ہے کالی کی بہ نسبت زیادہ پرنور
یا منور ہوتی ہے ۔ سپیدی کی آمیزش سے رنگ ہلکا کیا جاتا ہے اور سیاہی
کے استعمال سے تیرگی یا چھاؤں کا ظہور ہوتا ہے ۔ سپیدی ملانے سے رنگت
طرفہ اور مسرت اثر ہو جاتی ہے مگر سیاہی کی آمیزش سے سنجیدگی اور عمق
عود کر آتا ہے ۔ اول الذکر میں لطافت ہوتی ہے اور اس کا اثر سرور آگین
ہوتا ہے لیکن آخر الذکر میں بھاری پن ہوتا ہے جو اداسی کا پہلو لیے رہتا ہے

رنگتوں کا ایک دوسرا وصف شوخی ہے ۔ اس کا تعلق رنگتوں کی مقدار
اور آمیزش سے ہے ۔ رنگتیں ایک دوسری کی معاون کے طور پر بھی استعمال
ہوتی ہیں ۔ اور ان سے شوخی اور کمی میں اضافہ ہو سکتا ہے رنگتوں میں جتنی
زیادہ شوخی ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ وہ جاذب توجہ ہوتی ہیں ۔ شوخی میں
جتنی کمی آتی جاتی ہے ان کی یہ صلاحیت اسی اعتبار سے کم ہوتی جاتی ہے
شوخ رنگ اگر کم رقبہ کو احاطہ کرتا ہے تو دیدہ زیب ہوتا ہے لیکن اس
کا غیر معمولی پھیلاؤ آنکھوں میں کھٹکتا ہے ۔ بالعموم شوخ رنگتیں یکسانیت
کے پھیکے پن کو دور کرنے ہی کے لیے استعمال کی جاتی ہیں ۔ رنگوں کے استعمال
میں فطرت کی متابعت لازم ہے ۔

وزن، تناسب، ربط، لطافت اور ہم آہنگی وغیرہ بھی دو اوصاف
ہیں جو خطوط وضع اور رنگ سب میں مشترک ہیں ۔ تصویر میں وزن دراصل
جذبات ہی کا ہوتا ہے ۔ اگر اسے صحیح طور پر نبھایا جا سکے تو دلکشی میں فرق
نہیں آ سکتا ۔ اپنے اپنے وزن ہی کے مطابق خطوط وضع اور رنگ ہماری
توجہ کو جذب کرتے ہیں ۔ ایک ہی سمت کو کھینچے ہوئے خطوط کی رفتار میں سرعت

آجاتی ہے ۔ یہی خطوط کا وزن ہے ۔ وضع کا وزن اس کی جسامت پر منحصر ہے جسامت جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی وزنی سمجھی جائیگی ۔ کشش کے ساتھ ساتھ وزن بڑھتا ہے ۔ ایک بڑی چیز چھوٹی چیز کی بہ نسبت زیادہ نمایاں نظر آتی ہے ۔ خطوط کا الجھاؤ ان کی سادگی کی بہ نسبت زیادہ توجہ کا مستحق ہوتا ہے اس سے ان کا وزن بڑھ جاتا ہے ۔ توازن قائم رکھنے کا ایک گر یہ بھی ہے کہ جذبات کے اتار چڑھاؤ میں حسب موقع کمی و بیشی روا رکھی جائے ۔ تضاد کے بڑھاؤ گھٹاؤ سے بھی وزن بڑھتا اور گھٹتا ہے ۔ یکساں رنگ کبھی بھلے نہیں معلوم ہوتے ۔ مخالف رنگوں کے استعمال سے ان کی جاذبیت بڑھ جاتی ہے ۔ یکساں جسامتوں کو ایک دوسرے سے پرے رکھ کر توازن قائم کیا جا سکتا ہے ۔ یہی چیز چھوٹی بڑی چیزوں کا فاصلہ کم کر کے بھی مل سکتی ہے ۔

توازن برابر اور نابرابر دونوں طرح کا ہوتا ہے ۔ دونوں سروں پر دو ہموزن اشیاء کے رکھنے سے توازن کی یکسانیت قائم رہتی ہے ۔ لیکن اس کی کثرت دلکشی کی حامل نہیں ہوتی ۔ نابرابر توازن کے حصول کے لئے نابرابر اشیاء کو سروں سے ہٹا کر رکھا جا سکتا ہے ۔ رنگوں کا توازن قائم رکھنے کے لئے مخالف رنگوں کا استعمال کرنا یا یکساں رنگوں کی قربت و دوری میں اضافہ کرنا ضروری ہوتا ہے ۔ خطوط کا وزن کم کرنے کے لئے مخالف سمتوں سے خطوط کھینچے جاتے ہیں ۔

جس طرح موسیقی سُر لَے اور تال کی پابند ہوتی ہے اور اس کے یہ اجزائے ترکیبی ایک سم کے تحت گرداں رہتے ہیں اسی طرح مصوّری کے عناصرِ اربعہ میں بھی ہم آہنگی ہونا ضروری ہے ۔ ہم آہنگی کو شعر کی بحر یا اس کے وزن کے مترادف سمجھنا چاہیئے جو فی الحقیقت ایک معینہ رفتار ہی کا دوسرا نام ہے ۔ ہمارے دل کی دھڑکنیں ـــ سانس کا مدّ و جزر سب ایک قاعدہ کلیّہ کے پابند ہیں اور ان کا درمیانی وقفہ بالکل برابر ہوتا ہے گویا ہماری زندگی کا انحصار بھی بحور و اوزان پر ہے ۔ اس لئے اگر ہم فطرتاً ہم آہنگی کے دلدادہ ہیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ۔

تصویر میں خطوط اور جسامت دونوں کو پہلو بہ پہلو جگہ ملتی ہے لیکن اس سے حسن کاری کا اہتمام نہیں ہوتا ۔ مختصر یہ کہ ہم آہنگی فنِ مصوّری کا سنگِ اساس ہوتے ہوئے بھی بجائے خود اس فنّ لطیف کا بدل نہیں ہو سکتی ۔ بعینہ اسی طرح جیسے آوازوں کی معینہ رفتار کے اعادہ کو لَے دُھن یا ترنّم تو کہا جا سکتا ہے مگر موسیقی کا مرتبہ نہیں دیا جا سکتا حالانکہ اس کے قصرِ بلند کا سنگِ بنیاد یہی لَے یا دُھن ہوتی ہے ۔

تصویر سازی میں پیمانہ کی کمی و بیشی تو ایک اختیاری امر ہے مگر متناسب اعضاء متوازن خطوط اور موزوں رنگوں کے بغیر مصوّر اپنے فریضہ سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا ۔ اسی اتحادِ ثلاثہ سے ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے ۔ ہم آہنگی دو طرح کی ہوتی ہے ایک تو وہ جو وضع و پیمانہ کی یکسانیت کے تابع ہوتی ہے اور دوسری وہ جس میں پیمانہ کو ایک مفروضہ کلیّہ کے تحت بتدریج کم یا زیادہ کیا جاتا ہے اس طور سے پہلی صنف کو وضعی یا اصولی اور دوسری کو غیر وضعی یا بے اصولی کہا جا سکتا ہے ۔ پہلی صنف سے حواشی اور دوسری سے سطح مترتب ہوتی ہے ۔

خطوط اور جسامت جب ایک دوسرے سے قدم ملا کر چلتے ہیں تو وضعی ہم آہنگی معرضِ وجود میں آتی ہے ۔ درمیانی فاصلہ کی برابری سے بھی اسے قائم رکھا جاتا ہے ۔ لیکن اس کی یک رنگی کے نقص کو دور کرنے کے لئے غیر وضعی ہم آہنگی کا سہارا لینا پڑتا ہے ۔ اس تضاد سے وہ بے کیفی و خشکی دور ہو جاتی ہے جو یکسانیت کا خاصہ ہے ۔ سپاہیوں کی مارچ کا جوش و خروش اور رقاصہ کے پاؤں کی لطیف حرکات کی مٹھاس سے ہمارے جذبات پر مختلف النوع اثرات ہوتے ہیں ۔ مصوّر کا منتہائے مقصود ہم آہنگی سے بھی کام لینا ہوتا ہے ۔

تصویر میں متعدد مراکزِ کشش ہوتے ہیں لیکن ان کے مناصب و مدارج کا تعین کرنا بڑی کاریگری کا کام ہے ۔ ان مراکز میں کسے فوقیت دی جائے اور کسے ذیلی حیثیت سے نمایاں کیا جائے اس کا فیصلہ اس اصول پر کیا جاتا ہے کہ جس مخصوص رس یا جذبہ کی تحریک کی خاطر تصویر بنائی گئی ہے اس کی نمایندگی کرنے والی چیز کو افضل رکھا جائے ۔ اور اس کے زیر سایہ اس کے معاونین کو اس اہتمام سے جگہ دی جائے کہ سارے کا سارا منظر آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی تمام تر توجہ اصلی مرکزِ کشش پر مرکوز رہے اور دیگر مراکزِ کشش بھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو سکیں ۔ اس لئے ہم آہنگی میں اختلاف کو اسی حد تک گوارا کیا جاتا ہے ۔ جہاں تک اس سے اُلجھن نہ پیدا ہو ۔ تصویر کا پس منظر ہمارے سامنے ایک موضوع پیش کرتا ہے جو بظاہر اس موضوع سے مختلف ہوتا ہے لیکن اس اختلاف میں بھی گہرا رشتۂ اتحاد پنہاں ہوتا ہے

جیسے ناٹک میں ہم ایک مسلسل کہانی اداکاروں کے چہرے مہرے کی تبدیلیوں میں پڑھتے وقت انواع و اقسام کے پردوں کو بھی دیکھتے رہتے ہیں۔ ان پردوں سے بھی کہانی کی وضاحت وصراحت ہی ہوتی ہے۔

اختلافات کے ذریعے مصوّر کشش پیدا کرتا ہے اور نگاہ کو اصلی منظر کی طرف کھینچ لے جاتا ہے۔ ہماری نظر سطح سے اُٹھ کر نقش پر پڑتی ہے تصویر میں متعدد نقوش ہو سکتے ہیں لیکن جسے اجاگر کرنا مقصود ہوتا ہے اس کی تفصیلات کو بھی نمایاں کرنا پڑتا ہے کبھی کبھی منظورِ نظر کو ایک مخصوص مقام پر فائز کرکے بھی یہ کام لیا جاتا ہے۔ یہ مقام مرکز وسطی سے جتنا قریب ہوگا اتنا ہی اہم ہوگا۔ کسی پیکر تصویر سے دیگر اوضاع کو دُور ہٹا کر یا قریب لاکر بھی اس کی اہمیت کو گھٹایا بڑھایا جا سکتا ہے۔ اس کی جسامت بڑھا کر اس کے وزن میں اضافہ کرکے یا رنگت کو جلا دے کر بھی یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ اجتماعی تصاویر میں سواریوں' آرائش و زیبائش' مقام کی بلندی و پستی' لباس کی نفاست اور حسنِ صورت وغیرہ سے بھی کسی فردِ واحد کو امتیاز و برتری مل سکتی ہے۔ لیکن حفظ مراتب کے احساس کی مظہر حرکات وسکنات کا مظاہرہ کرکے کسی فردِ واحد کو ممتاز بنانا آسان کام نہیں ہے۔

تصاویر میں تضاد کا تنوع ہوتا ہے۔ مگر یہ تنوع متحد المرکز ہونا ضروری ہے۔ جس طرح درخت کا تنہ اور شاخیں سب مل کر پورے درخت کا نقشہ ہمارے سامنے کھینچ کر رکھ دیتے ہیں اسی طرح تصویر کے مختلف مظاہر و مناظر کا اجتماع ایک ہی نقطۂ خیال کی وضاحت میں محو نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں کمتری و برتری کے احساسات کے تاروں کو چھیڑ کر الجھنوں کو سلجھایا اور انتشار و بے قاعدگی کو باقاعدگی و خوش سلیقگی کی نورانی فضاؤں میں گم کر دیا جاتا ہے۔

تناسب کو جملہ فنونِ لطیفہ کی روحِ رواں مانا گیا ہے۔ شعر مختلف مگر موزوں آوازوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ان آوازوں کا درمیانی وقفہ اس درجہ متناسب ہوتا ہے کہ اس سے تسلسل و روانی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دنیائے مصوّری میں یہ تناسب افراد و مناظر کے درمیانی بعد یا فاصلہ سے قائم رہتا ہے۔ جس کے لئے سطح کی تقسیم عمل میں آتی ہے۔ تناسب میں ایک خاص کشش ہوتی ہے جو سطح کے اختلاف سے بڑھ جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ مربع کے مقابلے میں مستطیل زیادہ خوشنما معلوم ہوتی ہے کیونکہ ضلعے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ تناسب میں پیمانہ کی کمی و بیشی سے تنوّع پیدا کیا جا سکتا ہے۔ جس میں سب سے زیادہ کشش ہوتی ہے وہی تناسب بہترین قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن اس میں بھی اختلاف کی کثرت کشش کا خون کر دیتی ہے۔

غزل

وفا کرہانی

غم ہی غم بے شمار کیا کہئے
لطفِ پروردگار کیا کہئے

جب سے دیر و حرم ہوئے تعمیر
عشق ہے بے دیار کیا کہئے

کس نزاکت سے دل دھڑکتا ہے
ہو کے امیدوار کیا کہئے

کتنی مظلوم کتنی ظالم تھی
نگہِ شرمسار کیا کہئے

ذرّے ذرّے کے دل میں ہے بیتاب
عزمِ انجم شکار کیا کہئے

آسماں گیر ہو گئی کیونکر
ایک مشتِ غبار کیا کہئے

آشیانے لُٹے' چمن اُجڑے
کیسی آئی بہار کیا کہئے

ناخدا خود ہو جب تذبذب میں
ناؤ کیونکر ہو پار کیا کہئے

جل رہے ہیں چراغ راہوں میں
شوق کا انتظار کیا کہئے

حق پہ جب آنچ آ رہی ہو وفا
تخت بہتر کہ دار کیا کہئے

ساحر ہوشیار پوری

غزل

عدوئے بدگماں کی داستاں کچھ اور کہتی ہے
مگر تیری نگاہِ خوش بیاں کچھ اور کہتی ہے

خزاں کے دم سے اپنی خوش دلی کا ہے بھرم ورنہ
بہار آتے ہی یادِ آشیاں کچھ اور کہتی ہے

سنو دل سے تو پھر ہر نغمۂ عشرت کے پردے میں
الم کی داستانِ خونچکاں کچھ اور کہتی ہے

نظر اُن کی، زباں اُن کی تعجب ہے کہ اس پر بھی
نظر کچھ اور کہتی ہے، زباں کچھ اور کہتی ہے

ہزار انداز سے اہلِ زمیں اب دام پھیلائیں!
نوائے طائرِ عرش آشیاں کچھ اور کہتی ہے

ترے لُطف و کرم کا معترف ہے اک جہاں لیکن
کسی مجبورِ غم کی داستاں کچھ اور کہتی ہے

خوشا تیری نظر کا امتیازِ جلوت و خلوت
وہاں کچھ اور کہتی تھی یہاں کچھ اور کہتی ہے

گلستاں میں بہارِ گلفشاں آنے سے کیا حاصل
کہ مستقبل کی تصویرِ خزاں کچھ اور کہتی ہے

وہ میرے حال پر ساحر کبھی جو مسکراتے ہیں
تو دل سے اپنی سعیِ رائیگاں کچھ کہتی ہے

غلام ربّانی تاباں

غزل

وہ جانِ شوق بھی جانِ جہاں بھی
مگر اک فتنۂ عصرِ رواں بھی

برایں سازِ وفا و نغمۂ شوق
مجھے بخشا گیا ذوقِ جہاں بھی

ہمیں لب تشنۂ الطافِ ساقی
ہمیں سے گرمیٔ بزمِ فغاں بھی

فقط اک داستاں اپنی حقیقت
حقیقت ہے کسی کی داستاں بھی

امینِ رازِ خار و برق و صرصر
حیاتِ رنگ و بُو کا رازداں بھی

کہانی غم کی بے ربط و تسلسل
اور اُن کی طبعِ نازک پر گراں بھی

وُہ شعلہ ناک کی رگ رگ میں بیتاب
جو بجلی بھی چراغِ آشیاں بھی

کسی کا جلوۂ بے باک تاباں
مرے ذوقِ نظر کا امتحاں بھی

اے۔ حمید ناز جالندھری

وارث شاہ کا ایک کردار

قومی زبان کی اہمیت مسلّم۔ لیکن معاشرے کی روح کو پانے اور سماج کو جنم دینے والے مختلف طبقوں کی ذہنی کیفیات کا جائزہ لینے کے لئے ہمیں مقامی بولیوں کا دست نگر ہونا پڑتا ہے۔ یہ بولیاں یا علاقائی زبانیں اس ارتقا کا واضح پس منظر بناتی ہیں۔ جس کا سلسلہ "اشاروں" اور "غوں غاں" سے شروع ہو کر مرصع و مقفیٰ نثر کی گلگشت نظر وادی اور نظم کی تخیلی کائنات تک پہنچتا ہے۔ اس طرح اگر ادبی نقطۂ نظر سے ان بولیوں کا مطالعہ قومی زبان کو صحیح معنوں میں قومیت کا روپ اور خلوص بخش سکتا ہے تو اس کے ساتھ ہی سماج کی اکثر گتھیوں کو سلجھانے میں بھی مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

یورپ کے ملکوں میں مقامی بولیوں کی اہمیت بدستور تسلیم کی جاتی ہے بلکہ جب سے لسانیاتی تحقیق کا سلسلہ زیادہ وسیع پیمانے پر شروع ہوا ہے۔ محققین ان کے شعر و ادب کی طرف پہلے سے زیادہ متوجہ ہیں۔ قومی زبان کو عوام کے ذہنوں کے قریب لانے اور اسے معاشرے کی اقدار کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لئے ان بولیوں میں نظم کئے گئے قصوں اور کہانیوں کو مختلف قومی زبانوں میں منتقل کرنے کا رواج روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کی مجلس ادبا کی کوششیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مجلس نے مختلف جمہوریتوں کی بولیوں پر تحقیق اور تراجم کے لئے ایک خاص ادارہ قائم کیا ہے جس نے آج تک بیسیوں کتابوں کو از سر نو شائع اور ترجمہ کیا ہے۔

پنجاب کی مجلسی زندگی کے متعلق کسی شخص کا علم اس وقت تک مکمل نہیں سمجھا جا سکتا۔ جب تک کہ وہ پنجابی سے کما حقہٗ واقفیت نہ رکھتا ہو۔ کنارے راوی کے باسیوں کے احساسات کی ترجمانی تبھی ممکن ہے جب فن کار نے بڑ کے گھنے اور چھتنار درخت کے نیچے بیٹھ کر گاتے کسانوں سے ماہیا سنا ہو۔ جب اس نے گھٹنوں گھٹنوں "لنگھے" پہنے دوشیزاؤں کو پانی کی گاگریں بھرتے دیکھا ہو۔ بہر نوع پنجاب کو سمجھنے کے لئے پنجابی کا جاننا اشد ضروری ہے۔ اور پنجابی کو جاننے کے لئے "ہیر وارث شاہ" کا۔

پیشتر اس کے کہ ہم ہیر وارث کا ذکر کریں۔ پنجابی کی ابتدا کے متعلق ایک مختصر سا تبصرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔" پنجابی کو مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ امیر خسرو اس کو لاہوری کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اور ابوالفضل ملتانی کہتے ہیں۔ مغربی مؤرخین نے شمالاً جنوباً ایک خط کھینچ کر مشرقی اور مغربی حصّوں میں اسے تقسیم کر دیا ہے۔ مشرقی حصہ کی زبان کا نام پنجابی رکھا ہے اور مغربی حصّہ کی زبان کا نام لہندا۔ پنجابی کو وہ مغربی ہندی میں شامل کرتے ہیں۔ اور لہندا کو بیرونی دائرہ میں داخل کر کے سندھی اور کشمیری کا رشتہ مانتے ہیں"۔ یہ لکھنے کے بعد حافظ محمود شیرانی مرحوم اہل پنجاب کے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔" اہل پنجاب یہ فرق تسلیم نہیں کرتے ان کا بیان ہے کہ پنجابی اور لہندا ایک ہی چیز ہے مغربی اور مشرقی زبان میں جو فرق ہے۔ وہ اصولی نہیں۔ بلکہ تدریجی اور ضلع کی مقامی خصوصیات کی بنا پر پیدا ہوتا چلا گیا ہے۔ اور یہ تقسیم ہر حال میں ناجائز ہے"۔

جدید تحقیق نے بھی حافظ محمود شیرانی مرحوم کی رائے کو صحیح تسلیم کیا ہے۔ دراصل یورپین محققین کو یہ غلط فہمی پانچ دریاؤں کی موجودگی کی وجہ سے ہوئی۔ انہوں نے مختلف دوآبوں کو الگ الگ وحدتیں تسلیم کیا اور ساتھ ہی مقامی رسم و رواج سے ناواقفیت بھی اسی چیز کا سبب بنی۔

ایشیا کے دوسرے بڑے شاعروں کی طرح وارث شاہ کے زمانہ کے متعلق بھی مختلف رائیں ہیں۔ لیکن اندرونی اور بیرونی شہادتوں کی بنا پر ہمیں شاعر کی طبع اور حالات کے متعلق اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ وارث شاہ ایک سیلانی فقیر تھے۔ فارسی نظم و نثر پر شاہ صاحب کو کافی عبور تھا سعدی کی گلستان' ابوالفضل' سکندر نامہ' نل دمینتی' قرآن سعدین اور دیوان حافظ

جیسی کتابیں مدرسہ میں پڑھیں۔ اس کے علاوہ شاہ صاحب نے اللہ باری، رازق باری، صادق باری، اعظم باری اور طوطی نامہ فارسی کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن میں سے اکثر آج کل ناپید ہیں۔

پنجاب کے بیشتر اضلاع میں گھومے۔ دنیا دیکھی۔ کائنات اور اس کے باسیوں کو سمجھنے کی کوشش کی اور اس طرح عرفان کی اس منزل پر پہنچے جہاں وجدان اور تجربہ ایک ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے عوام کے دل کی دھڑکن کو سنا اسے اپنے شعور کی روشنی سے منوّر کرنے کے بعد بیان کر دیا۔ اپنی کتاب کی نسبت لکھا ہے:۔

گوشے بیٹھ کے ہیر کتاب لکھی یاراں واسطے نال قیاس دے ہیں
پڑھن گبھرو دیس وچ خوشی ہو کے پھل بیجیا واسطے باس دے ہیں
ہور شاعراں چکیاں جھوٹیاں نی غلہ پیسیا وچ خراس دے ہیں
سمجھ بیں عاقل غور فکر کر کے بھید رکھیا وچ بھاس دے ہیں

(میں نے ہیر کو باشعور انداز میں اس لئے لکھا کہ اسے میرے دوست پڑھیں اور ملک کے نوجوان اس پھول کی خوشبو سے اپنے ذہن معطّر کریں۔ میں نے دوسرے شاعروں کی طرح معمولی مشاہدے اور تجربے کی نمائش نہیں کی۔ بلکہ ہر بات کو اچھی طرح جانچنے کے بعد اشاروں میں بیان کیا ہے۔ تاکہ عقلمند اس پر غور کریں)

ماحول فطرتِ انسانی پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ احساس کی کشمکش اور ذہنی نشوونما کے ماحول سے ربط کے طور طریقے کا بیان کوئی وارث شاہ سے سیکھے۔ سنئے صبح کا بیان ہے:۔

ہوئی صبح صادق جدوں آن روشن رکھیں لالیاں آن چھپلانیاں نی
کاروبار وچ ہویا جہان شاغل چرخے کتدیاں اٹھ سوانیاں نی
چڑی چوہکدی نال اٹھ ٹرے راہی پائیندی پیا دودھ دے وچ مدھانیاں نی
گھر بار تاں چکیاں جھوتیاں نی جنہاں تاوناں گھر لکانیاں نی
اٹھ غسل دے واسطے جا دوڑے جیہجاں جنہاں نے رات نوں مانیاں نی

(صبح جب درختوں پر شفق رنگ سرخی اپنی بہار دکھاتی ہے۔ تو ہر کوئی اپنے کاروبار میں مشغول ہو جاتا ہے۔ عورتیں چرخے کاتنے شروع کر دیتی ہیں۔ صبح کے راہی اپنا سفر جاری کر دیتے ہیں۔ کچھ دودھ بلوتی ہیں۔ تو کچھ کھانا پکانے کے لئے آٹا پیسنا شروع کرتی ہیں۔ محبوب کے وصل سے شاد کام غسل کے لئے دوڑتے ہیں)

صبح کا کیسا اچھا سماں باندھا ہے۔ دیہات کی صبح ــــ وارث شاہ نے تفصیل سے بچتے ہوئے بھی ہر چیز کہہ دی ہے۔ الفاظ کا جڑاؤ اور بیان کا زور آپ کو اکثر زبانوں میں ایسا بیان نہیں ملے گا۔

ہیرو اور ہیروئن کے بعد ہیر وارث شاہ کا سب سے نمایاں کردار سہتی ہے۔ سہتی اور جوگی (رانجھا) کی گفتگو کتاب کے ایک طویل حصے پر پھیلی ہوئی ہے۔ کہنے کو تو یہ گفتگو صرف سہتی اور رانجھے تک ہی محدود ہے لیکن دراصل ان مکالموں کی صورت میں وارث شاہ نے پنجاب کی گھریلو زندگی کے متعلق اپنے تجربات کا نچوڑ ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ وارث شاہ نے سہتی کی زبان سے درختوں کی گھنی چھاؤں تلے جھولا جھولتی ہوئی، بھینسوں کا دودھ دوہتی اور گندم کی ہری بالیوں سے کھیلتی ایک تندرست اور حسین دیہاتی دوشیزہ کے دل کی دھڑکنوں کا شمار پیش کیا ہے۔ جو بیک وقت بہن بھی ہے اور نند بھی۔ محبوبہ ہوتے ہوئے بھی ایک عورت ہے۔ اس کی نس نس میں زندگی ہے۔ وہ کمزور ہے۔ لیکن مرد کی کمزوریوں سے آگاہ اخلاقی ضابطے اور سماجی مشکلات جب اسے کسی ایک راستے پر نہیں چلنے دیتے۔ جب سوچ مفلوج ہو جاتی ہے۔ تو وہ دل سے مشورہ کرتی ہے۔ اور پھر کوئی چیز یہاں تک کہ موت کا خوف بھی اسے اس مشورے پر عمل کرنے سے نہیں روک سکتا۔ وہ ایک الھڑ دوشیزہ کی سچی اور بے لاگ تصویر ہے۔ مختلف مواقع پر اس کا ردّ عمل۔ وارث شاہ نے کہیں بھی اسے بے جان نہیں ہونے دیا۔

گو ہیر کے کردار کو اسنوار رکھنے کی کوشش وارث شاہ نے جا بجا کی ہے۔ لیکن اکثر جگہ اس کی محبوبیت غالب آ گئی ہے۔ اس کی عظمت اور وفا کی روح نے جب کبھی جھنجھوڑا لیا۔ کوئی نہ کوئی سماجی الجھن، کوئی نہ کوئی "اخلاقی بند" اسے رام کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

پہلی دفعہ ہمیں اس کی روح کا باغی عنصر اس وقت دکھائی دیتا ہے جب اس کا والد اس کی شادی کھیڑیوں کے ہاں کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ ہیر اپنی والدہ سے جھڑپ لینے کے بعد رانجھے کے پاس آتی ہے اور اس سے کہتی ہے۔

ہیر آکھیا رانجھیا قہر ہویا ایتھوں چل جے اُٹھ کے چلنا ئیں

دونویں اُٹھ لمبڑے راہ پیئے کوئی اساں تے دیس نہ ملنائیں

جدوں جھگڑے وڑی ہیں کھیڑیاں دے کسے اساں نوں مُول نہ گھلنائیں

ماں باپ نے جدوں ویاہ دتا کوئی اساں دا زور نہ چلنائیں

(ہیر رانجھے کو اپنے باپ کے ارادے سے باخبر کرتی ہوئی کہتی ہے - کہ اب وقت ہے - کہ ہم اس دیس کو خیرباد کہہ دیں - کیونکہ شادی کے بعد کوئی ہمیں نہیں ملنے دیگا)

لیکن یہ زور و شور زیادہ دیر قائم نہیں رہتا اور جب رانجھا یہ کہتا ہے -

معلوم ہویا تیرے سخن اُتوں چلے دستی ایں مت کا لیاندے

(تیری باتوں سے پتہ چلتا ہے - کہ تو بے راہوں کی راہ اپنانا چاہتی ہے)

آگ دب جاتی ہے - اور وہ رضائے الٰہی پر شاکر ہو جاتی ہے - ہیر کے کردار کو جابجا شاعر سہارا دیتا معلوم ہوتا ہے - لیکن برخلاف اس کے سہتی کے کردار میں عظمت اور وقار کی جھلک ہے - "باتوں میں گلوں کی خوشبو" کے ساتھ ساتھ تمکنت اور شعور کی ایک لہر بھی ملتی ہے - اس کی محبوبیت کا انداز انفعالی نہیں - نہ ہی اس کی محبوبیت اس سے نسوانیت کا غرور چھینتی ہے - اُس کے سینے میں جلن ہے - لیکن وہ اُسے ماحول کی "تردامنی" کے ہاتھ فروخت نہیں کرتی -

رانجھا جوگی بن کر رنگ پور جا نکلتا ہے - سہتی کی سہیلیوں اور سہتی سے ملاقات ہوتی ہے - کافی دیر تک نوک جھونک رہتی ہے - ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو - کس قدر جاندار ہے -

سہتی تیج کے آکھدی چھڈ جٹا کھوہ سبھ نوالیاں سٹیاں نی

ہور سبھ داناں ٹھگ کھادیاں نی پر ایس ویہڑے وچ جٹیاں نی

ایہ رمز نہ سنی ہے راولا دی رناں جٹیاں ہور سبھ چٹیاں نی

تیری پیری فقیری سبھ کھول دیئے ساڈے نال جے کرے اپٹھیاں نی

کدی وید حکیم بن آوناں ایں گلاں کرنا ایں بھوّاں کٹھیاں نی

اساں اتنی گل معلوم کیتی ایہ جٹیاں ملک دیاں ڈھٹیاں نی

گھر جٹاندے منگ نہ ڈھیوئی منگ ڈھیو خوجیاں ہٹیاں نی

ناراں رمزداراں گلاں تیریاں نی تندے دانگ کھلار کے سٹیاں نی

سُنتے چھیڑ کے ویہڑے دے مگر لادوں پھریں نہد اپٹیاں بھٹیاں نی

جنہاں جٹیاں دے نال اڑی بدھی اتہاں کچھ نہ کھٹیاں کھٹیاں نی

(سہتی رانجھے کی باتوں پر خفا ہو کر اسے ڈانٹتی ہے - اور کہتی ہے - کہ تم نے بہت سی ذاتوں کو لوٹا ہے - لیکن یہاں تمہارے حیلے کام نہیں دیں گے - کیونکہ اس صحن میں جاٹ عورتیں بستی ہیں - اور ساتھ ہی اسے بتاتی ہے - کہ کیا تم نے راولوں کی یہ مثل نہیں سنی کہ عورتیں تو صرف جٹیاں (جاٹ عورتیں) ہی ہیں - باقی تو نام کی عورتیں ہیں - اگر تم ہمارے ساتھ ٹیڑھے چلنے کی کوشش کرو گے - تو نقصان اٹھاؤ گے - اور اس پیری فقیری کا بھانڈا پھوڑ دیا جائے گا -

تم نے آج تک کبھی جاٹوں کے گھر سے بھیک نہیں مانگی - اس لئے تمہیں ان کی عورتوں کا کچھ پتہ نہیں - تم باتیں تو خوب بناتے ہو - لیکن یہ چال یہاں کام نہیں دیں گے - ابھی کُتوں کو چھیڑتی ہوں - تاکہ تمہیں پتہ چل جائے کہ جاٹ عورتوں سے کس طرح بات کرتے ہیں - جنہوں نے جاٹ عورتوں سے ضد باندھی انہوں نے کچھ فائدہ نہ پایا)

لیکن نسوانیت کا غرور اس سے اس کا عورت پن نہیں چھینتا وہ ایک دردمند دل بھی رکھتی ہے - وہ رانجھے کا کاسہ توڑ دیتی ہے لیکن اس کے ماحول کے عطا کردہ وہم اُسے رانجھے کی بد دعاؤں کے سامنے لاچار کر دیتا ہے - وہ تقدیر کا سہارا لیتی ہے -

گیا بھج تقدیر دے نال ٹھوٹھا لے جا قیمت ساتھوں ہٹ دی وے

تقدیر اللہ دی نوں کون موڑے تقدیر پہاڑاں نوں پٹ دی وے

سہتی کی اس گفتگو میں وارث شاہ نے دیہات کے توہم اور بے بنیاد عقیدوں کی ایک جھلک دکھائی ہے - وہ عقیدے جو اس ماحول میں اس درجہ رچ چکے ہیں کہ ایک روایت بن گئے ہیں -

اس کی طبیعت میں ایک الھڑ دوشیزہ کا خمار ہے - جذبات کی ہیجان خیزی کے ساتھ ساتھ ایک متوازن طبع بھی پائی ہے - وہ سب کچھ برداشت کر لیتی ہے - لیکن اس کے کنوارپن پر حملہ اس سے برداشت نہیں ہوتا - وہ رانجھے کی اس گستاخی پر اسے پیٹتی ہے اور اسے دھکے دے کر باہر نکال دیتی ہے -

لیکن جب ہم آگے چلتے ہیں - تو حیرانی ہوتی ہے - کہ وارث شاہ آج

سے کئی سو برس پیشتر بھی تمثیل کے فن سے کس قدر شناسا تھا۔ وہ ماحول کی مطابقت کا کس قدر خیال رکھتا ہے۔ سہتی ہیر کی منت و زاری پر جب دوبارہ جوگی کے لئے خیرات لاتی ہے۔ تو اس کی ذہنی کشمکش رنگ لاتی ہے۔ جوگی اس کی طشت میں لائی ہوئی خیرات کو اپنے جوگ کے بل پر بدل دیتا ہے' سہتی کا رُواں رُواں کانپ اٹھتا ہے۔ اُس کی کمزوری اسے پھر لوٹ دیتی ہے۔ وہ جوگی سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتی ہے۔

وارث شاہ نے اس کردار کو اس کے ماحول اور سماج کے تقاضوں کے درمیان کچھ اس طرح نکھارا ہے کہ اُس کی مثال اکثر زبانوں میں نہیں ملتی۔ اس میں ساوتری کا حوصلہ اور دروپدی کا اخلاق ہے۔ اردو زبان میں مثنوی میر حسن کی مہرالنسا کچھ کچھ اس سے مناسبت رکھتی ہے۔ اردو ناول میں امراؤ جان آدا کا کردار اپنے ماحول کی نمائندگی کے اعتبار سے کچھ کچھ سہتی کے کردار سے ٹکر لیتا ہے۔ لیکن سہتی کا کردار کئی حالتوں میں اس سے بڑھ گیا ہے۔

اجتماعی ترقی کے منصوبے

چودھویں اگست کو جہاں ایک طرف ملک بھر میں یوم آزادی منانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں وہاں نیلو کھیڑی کیمپ میں اجتماعی ترقی کے منصوبوں سے متعلق افسروں کو ان کے مشن اور کام کے بارے میں آخری درس بھی دے دیا گیا۔ اس کیمپ میں ایک دفعہ پھر ہاتھ کی محنت کی قدر و قیمت کی وضاحت کی گئی۔ مجتمع افسروں کو بتایا گیا کہ انہیں کس طرح دیہات کے لوگوں سے مل جل کر دیہات کی اصلاح و ترقی کی تدبیریں کرنا ہے۔ دیہات بھارت کے معاشی نظام کی پشت و پناہ ہیں اور اس نظام کی مضبوطی اور شادکامی کا انحصار دیہات کے کسانوں۔ کاشتکاروں اور زمینداروں پر ہے۔ یہ کاشتکار اور کسان اکثر محنتی اور اپنے اوپر بھروسہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی زندگی۔ ماحول اور قدروں کو جدید زمانہ کے معیاروں کے مطابق بنانے کے لئے بہت سارا کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اجتماعی ترقی کے منصوبے اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہیں۔

نیلو کھیڑی کے کیمپ کا افتتاح پردھان منتری نے ۱۲ر جولائی کو نئی دہلی سے ایک نشری تقریر کے ذریعہ کیا۔ یہ کیمپ مختلف ریاستوں کے افسروں کو اجتماعی ترقی کے منصوبوں سے متعلق تعلیم و تربیت دینے کے لئے شروع کیا گیا تھا۔

شہر کے لوگوں کو اپنے درمیان آتے دیکھ کر گاؤں کے لوگ اکثر شکوک و شبہات کا اظہار کرتے ہیں چنانچہ ان افسروں کو بھی پہلے ہی دن ان شکوک سے سامنا ہوا۔ کھیتوں اور میدانوں میں جا کر عملی کام کرنا ان افسروں کے پروگرام کا نہایت اہم حصہ تھا۔ اب ان افسروں کا ایک گروپ ہاتھوں میں پھاوڑے لئے جو نیلو کھیڑی کے گاؤں میں گیا تو ایک مضبوط اور جفاکش سکھ ان کے گرد ہو گیا اور ان سے طرح طرح کے سوال کرنے لگا۔ ان افسروں نے بتایا کہ وہ اس کے گاؤں میں کھاد کے لئے ایک گڑھا کھودنا چاہتے تھے اور وہ انہیں کوئی جگہ بتائے جہاں گڑھا کھودا جائے۔ وہ سکھ کسان مسکرایا اور اس کی مسکراہٹ میں چھپا ہوا تمسخر بالکل نمایاں تھا۔ چنانچہ اس نے انہیں ایک ایسی جگہ بتائی جو چٹان کی طرح سخت تھی لیکن ان افسروں نے کوئی گریز نہیں کیا وہ آگے بڑھے اور تین دن کے اندر اندر ایک چوبیس فٹ لمبا۔ چھ فٹ گہرا اور تین فٹ چوڑا گڑھا کھود دیا۔

اب اس سکھ کسان کو یہ یقین ہو گیا کہ وہ افسر اس کے رفیق اور مددگار تھے۔ چنانچہ تیسرے دن وہ ان سے بغلگیر ہو گیا اور ان کے مشورے و معاونت میں دلچسپی لینے لگا۔

اب ساتھ کے پانچ گاؤں میں کام شروع ہو چکا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں نالیاں تعمیر ہونے لگیں۔ کنووں کی مرمت ہوئی۔ کھاد کے لئے گڑھے کھودے گئے۔ درخت لگا دئے گئے اور نئے راستے تعمیر کر دئے گئے۔

کوثر چاند پوری

تصویر

موٹر مچھلی کی مانند سڑک پر تیرتی رہی اور اس کے دونوں طرف کھڑی عمارتیں جیسے آگ اُگل رہی ہوں ان کی اونچی چھتوں اور دیواروں پر پھیلی ہوئی دھوپ چنگاریاں سی اُچھال رہی تھی۔ موسم زیادہ گرم تو نہ تھا فروری کا مہینہ تو سردی اور گرمی کے بیچ میں ایک ایسا جزیرہ ہے جس کے ایک طرف برف کی جمی ہوئی سلیں ہوتی ہیں اور دوسری جانب کھولتا ہوا لاوا لیکن اس میں نہ برفیلی اور ٹھٹھرا دینے والی ہوائیں آتی ہیں۔ نہ جسم کو پھونک دینے والی گرم لپٹیں، وہ دونوں کے درمیان حائل ہو جاتا ہے لیکن اس وقت اس کے شعور میں کوئی انگارہ دہک اُٹھا تھا وہ کندھوں پر بال بکھیرے خاموش بیٹھی رہی اور جمیل آدھی آستینوں کی بُش شرٹ پہنے اسٹرنگ گھماتا رہا اس کی گوری کلائیوں پر نیلی رگیں ابھری ہوئی تھیں اور چھوٹے چھوٹے بال ہوا میں لہرا رہے تھے عمارتیں سیدھی قطار بنائے مخالف سمت سے بھاگ رہی تھیں ان کے اس فرار میں کوئی ترتیب نہ تھی، کوئی مقصد نہ تھا بس یونہی بھاگے جا رہی تھیں اور جس وقت موٹر ریگل اسٹوڈیو کے سامنے سڑک کے ایک کنارے آکر رکی تو عمارتوں کی یہ بھاگتی ہوئی قطاریں بھی جم کر رہ گئیں اور یوں محسوس ہوا جیسے سارا شہر اپنی جگہ قائم ہو گیا اسے بسنت پر اپنی ایک سہیلی کو تازہ تصویر بھیجی تھی کتنی التجا آمیز محبت کے ساتھ لکھا تھا اُس نے ——— راشدہ ——— کتنے دن بیت گئے تمہیں دیکھے ہوئے تمہاری صورت دن رات آنکھوں میں پھرتی ہے ——— لال لال ہونٹ اور ان کے بیچ چمکتے ہوئے موتی سے دانت، ابھرے ہوئے سانولے گال، لمبی سیاہ پلکوں سے ڈھکی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں ——— لیکن راشدہ ذرا سی دیر میں تمہاری آنکھیں چھوٹی ہو جاتی ہیں اور ان کی کالی چمکدار پتلیوں پر نیلاہٹ پھیل جاتی ہے کبھی وہ بالکل بھوری ہو جاتی ہیں، اور میں سوچنے لگتی ہوں کیا سچ مچ تمہاری آنکھیں چھوٹی ہیں؟ ——— اور ان کی پتلیوں کا رنگ گہرے سمندر کی طرح نیلا یا بالکل بھورا ہے ——— اور ٹھگنی تو تم کبھی نہ تھیں، تمہارا قد کافی لمبا اور حسین تھا، بھرے ہوئے کولھے اسے نیچے اور اوپر کے دو حصوں میں بانٹ دیتے تھے ——— لیکن اب کبھی کبھی تم بہت ٹھگنی ہو جاتی ہو، اور میں فیصلہ نہیں کر پاتی کہ تم لمبی ہو یا کوتاہ قامت، میں ایک عجیب الجھن میں پڑ جاتی ہوں اور اس الجھن کو مٹانے ہی کے لئے تصویر مانگ رہی ہوں بسنت پر میں اپنا فوٹو تمہیں بھیجوں گی کیا تم اس کے جواب میں اپنی نئی کھنچی ہوئی تصویر مجھے نہ بھیج دو گی۔ جمیل کوئی بہت بڑے مذہبی آدمی بھی نہیں ہیں کہ ناک بھوں چڑھائیں اور پھر تمہیں بے پردہ تھوڑا ہی کروں گی، خوبصورت سے فریم میں لگا کر اس پر ایک رنگین نقاب ڈال دوں گی ——— اور جب اس نے اپنے جیون ساتھی جمیل کو یہ خط دکھایا اور اس نے لال رنگ کی موٹی کمانی کی عینک کے دبیز آئینوں کی اوٹ سے خط کی ٹیڑھی لائنوں کو دیکھنا شروع کیا تو راشدہ اس کے چہرے کو غور سے دیکھتی رہی، اور اس پر بننے اور بگڑنے والے باریک نقوش کا تجزیہ کرتی رہی جمیل نے خط پڑھا وہ مسکرایا اور پھر رانی کی تائید کرتے ہوئے بولا۔

ضرور بھیجنا اپنی تصویر تم! ——— آج ۲۴ر دسمبر ہے کل شام کو ریگل چلیں گے اور تم ایک عمدہ سی تصویر کھنچوا لینا۔ ساڑھی میں تو رانی تمہیں زیادہ پسند نہیں کرتی وہ اسے اپنے ہی حسن کی ایک خصوصیت سمجھتی ہے اور پرانے کپڑوں میں کوئی سوٹ بھی ایسا نہیں جو مجھے بھاتا ہو ——— نیچی گوٹ کے بے ڈھنگے پائنچوں کے غرارے، اور اونچے کرتے جو تمہارے کولھوں کا سارا حُسن غارت کر دیتے ہیں مجھے قطعی ناپسند ہیں، میں آج ہی شاموس کا ایک تھان لے آؤں گا تم ایک شلوار اور قمیص بنوا لینا ایک ہی دن میں یہ نیا سوٹ تیار ہو جائیگا۔ ہلکے گلابی رنگ کا شاموس تمہارے ان سانولے رخساروں کی دمک کچھ اور بڑھا دیگا کیوں ٹھیک ہے نا؟ ——— اور اسی دن تم سفید کرتے پر سرخ رنگ کی شلوار ہی تو پہنے تھیں جب اوپر گہرے نیلے

رنگ کے آسمان پر ستارے جھلملا رہے تھے اور سامنے تالاب کے اس کنارے پر بجلی کے قمقمے چمک رہے تھے، اور ہم پہاڑ پر سڑک کے ایک طرف بیٹھے یہ حسین نظارہ دیکھ رہے تھے، تالاب کا پانی پارے کی طرح شفاف تھا اور بے چین موجیں ایک دوسری سے آگے نکل جانے کی کوشش کر رہی تھیں اور ان کے نیچے آسمان کے ستارے، اور بجلی کے قمقمے ایک عجیب حسن کے ساتھ تھرتھرا رہے تھے، تمہارے ماتھے پر چپکی ہوئی بندی چپکے چپکے ان ستاروں اور قمقموں کی تھرتھراہٹ کا جواب دے رہی تھی اسی وقت پہاڑ کی چوٹی سے چاندنی کھیت کرنے لگی تھی۔ ستاروں اور قمقموں کی چمک پھیکی پڑ گئی تھی لیکن تمہارے ماتھے کی بندی اور دمک اٹھی تھی، سانولا چہرہ ماہتاب کی کرنوں سے تمتمانے لگا تھا، کتنی اچھی تھی وہ شام! —— جمیل نے اس وقت اپنی تجارتی مصروفیت کا بوجھ شعور سے بالکل اتار پھینکا تھا وہ چار سال پہلے والا جمیل بن گیا تھا جب ہی تو آخری جملہ اس نے راشدہ کے حسین گالوں کو چھوتے ہوئے ادا کیا تھا اور راشدہ کی چھاتی میں برسوں کا جما ہوا لاوا پگھلنے لگا تھا جذبات طوفان بن کر رگوں میں پھیل گئے تھے اور آنکھوں کے سامنے ڈھاک کے ہزاروں درخت کھڑے ہو گئے تھے جن پر انگاروں کی مانند لال لال پھول دمک رہے تھے کائنات کی مٹی کی کھوئی ہوئی وہ پھر سے اپنی آغوش میں بھینچ لیا تھا اس نے ایک انگڑائی لے کر سینہ کے مرمریں میناروں کو نمایاں کرتے ہوئے ذرا شوخی کے ساتھ کہا تھا۔

"دیکھیں یاد بھی رہتی ہے آپ کو آج کی یہ بات؟ یاد کیوں نہ رہے گی بھائی! جمیل کے ایک ٹھنڈے بوسہ نے اس وعدہ پر تصدیق کی مہر لگا دی تھی، پھر دیر تک دونوں مسہری پر لیٹے رہے تھے۔ راشدہ نے اسی دن رانی کو خط لکھ دیا تھا جمیل اپنے حساب و کتاب میں مشغول ہو گیا تھا اور وہ لکھنے کی میز پر جا بیٹھی تھی جس کے ایک کونہ پر کچھ تصویریں لگی ہوئی تھیں اور بیچ میں ہلکے سرخ رنگ کا لیٹر پیڈ پڑا تھا۔ اس کے آس پاس چند قلم بکھرے ہوئے تھے یہ تصویریں ایک سال پہلے تو اسے پسند تھی مگر اب ان میں زیادہ کشش نہ رہی تھی عمر کے ساتھ ساتھ جذبات بھی بھاگتے رہتے ہیں، ناچتے ہوئے تیز و تند بگولوں کی طرح اس نے تصویروں پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ ایک تصویر تو نیچے سے اوپر تک سوکھے ہوئے بانس کی نقل کر رہی تھی۔ سر سے لے کر پیر تک سارا جسم ایک ہی قطر اور ایک ہی زاویے میں بڑھتا چلا گیا تھا، بڑے بے ڈول اور بھدے انداز سے ایک اور تصویر جو اس کے برابر ہی رکھی تھی کسی فوجی آدمی کی معلوم ہوتی تھی اس کے سڈول جسم میں طول کے ساتھ عرض اور عمق کا پتہ بھی چل رہا تھا اور بدن مختلف زاویوں میں بڑی خوبصورتی سے تقسیم ہوا تھا اس تصویر کی سب سے بڑی خصوصیت اس میں ایک مخلصانہ الھڑپن کی موجودگی تھی، اور الھڑپن بظاہر کتنا ہی برا ہو اس کے نیچے خلوص اور محبت کی موٹی موٹی تہیں ہوتی ہیں جن میں پختگی، سنجیدگی، اور متانت کا صرف بیج ہوتا ہے، جو لوگ بظاہر نرم ہوتے ہیں وہ موم کی طرح جلد ہی ہر نقش کو قبول کر لیتے ہیں اور ان کے سینہ میں ہمیشہ فولاد کا دل ہوتا ہے راشدہ نے تصویروں کی طرف دیکھا اور پھر خط لکھنے کے لئے میز پر جھک گئی اس کے بالوں کی لٹیں بار بار آنکھوں کا نقاب بن جاتی تھیں۔ اور وہ غصہ کے ساتھ جھٹک کر انہیں پیچھے ڈال دیتی تھی غصہ کی گرمی سے اس کے گال دمک اٹھتے آنکھوں کی سرخی اور گہری ہو جاتی اور چھاتی میں ایک ہلچل سی مچ جاتی ایک بار تو بالوں کا ایک گچھا سانپ کی طرح خم کھا کر اس کی ٹھوڑی کے نیچے آ پڑا تب جمیل نے بھی اس کی طرف دیکھا اور بے اختیار اس کا جی چاہا کہ فوراً میز چھوڑ کر وہ پھر مسہری پر جا لیٹے، لیکن —— کاغذات کے انبار میں اس کی آرزو الجھ کر رہ گئی اور راشدہ خط لکھتی رہی بالوں کی بے چین لٹیں غصہ کی لطیف گرمی کو بھڑکاتی رہیں۔

اور اگلی صبح بڑی پر کیف تھی تیز ہوائیں چل رہی تھیں سورج کی کانپتی ہوئی زرد کرنیں کمرے کے پردوں سے یوں کھیل رہی تھیں جیسے کم سن بچہ ابھی ابھی جاگ کر آیا ہو اور ماں کا آنچل پکڑ کر کھڑا ہو گیا ہو، جمیل سوٹ پہنے صحن میں کھڑا تھا وہ چائے پی کر اب جانے والا تھا۔ رات کی سی کوئی بات بھی اس میں نہ تھی جس طرح دہکتا ہوا انگارہ بجھنے کے بعد ایک سیاہ نقطہ بنا دیتا ہے اسی طرح جمیل کے جذبات ٹھٹھر کر اولے کی شکل اختیار کر چکے تھے کاغذات سے بھرا ہوا بیگ اس کے ہاتھ میں تھا اور پیٹ میں مزیدار پراٹھے اور انڈے گڈمڈ ہو کر تھکی ہوئی قوت ہاضمہ کو چڑھا رہے تھے رگوں میں خون کی روانی حسب معمول اپنے انداز پر تھی۔ اعصاب میں نئے نئے پروگرام رینگ رہے تھے حافظہ نے ناموس کے تھان اور اس کے سوٹ کو کبھی کا جھٹک دیا تھا۔ راشدہ کی نئی تصویر بھی ایک طرف جا پڑی تھی دن گزرتے رہے، رات

اور دن کی فلمیں گھومتی رہیں، بسنت بھی گزر گیا رانی کا پھر ایک خط آ گیا، اس نے نہایت حیرت سے پوچھا تھا ــــ راشدہ تصویر بھیجنا کیوں بھول گئیں تم ؟ اور راشدہ پہلے ہی جلی بھنی بیٹھی تھی اس نے غصہ میں اپنا گریبان پھاڑ ڈالا، اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، اسی وقت جمیل گھر میں داخل ہوا - راشدہ کے رخساروں کی سرخی اب سیاہی میں تبدیل ہونے لگی تھی اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں اور چہرہ بھیانک ہو گیا تھا جمیل یہ حالت دیکھ کر سہم گیا - اس نے جلدی جلدی راشدہ کی آنکھوں میں وہی سرخی اور چھاتی میں وہی ہلچل تلاش کی جس نے اس روز اسے حد درجہ محبوب بنا کر جمیل کے سوئے ہوئے احساس کو جگا دیا تھا لیکن آج تو اس کے غصّہ نے خوبصورتی کے سارے ہی نقوش بگاڑ دئے تھے -

خیر تو ہے ؟ جمیل نے پوچھا

راشدہ اس پر برس پڑی -

آپ کو مجھ سے محبت نہیں ! ــــ آپ جھوٹے وعدوں میں مجھے الجھا دیتے ہیں اب میں جینا نہیں چاہتی، زندگی اس بے بسی کا نام نہیں، ــــ مسلسل فریب کو بھی زندگی نہیں کہتے، آگ جلنی اور گھٹنی کو بھی اس سے کوئی نسبت نہیں، زندگی تو سکون کو کہتے ہیں، اطمینان اور مسرّت کو کہتے ہیں !

جمیل آج بہت ہی زیادہ تھکا ہوا تھا وہ اپنے چند ماتحتوں پر بہت زیادہ خفا ہو کر آیا تھا - راستہ بھر وہ یہی سوچتا آیا تھا کہ ان سب کو الگ ہی کیوں نہ کر دیا جائے زیادہ ضبط بھی بے غیرتی کی علامت ہے غصّہ کے ساتھ حملہ نہ سہی متانت کے ساتھ مدافعت تو انسان کی فطرت میں داخل ہے اور اب راشدہ کی باتوں نے اس کے آخری ارادے کو مضبوط بنا دیا اور راشدہ کے مقابلے میں بھی مدافعت کے لئے آمادہ ہو گیا، اس نے اپنے ذہن میں ایک مورچہ بنا کر کہا -

معلوم نہیں تم کیسی باتیں کیا کرتی ہو ؟

تمہیں پتہ نہیں میں کتنی الجھنوں میں پھنسا رہتا ہوں !

کبھی سوچنا تو چاہیئے تمہیں، میرے سر پر کتنا بوجھ ہے ؟

یہ سارا گھر رکھا ہوا ہے میرے سر پر جس میں تم آرام سے بیٹھی رہتی ہو !

چار نوکر، ایک موٹر، ایک گھر یہ سب میری کھوپڑی پر لدے ہوئے ہیں اور میں اکیلا ایک سنگین ستون کی طرح ان کو اٹھائے کھڑا ہوں معلوم نہیں کس وقت میرے جسم کا ڈھانچہ چرچرا کر بیٹھ جائے !

پانچ سو روپے مہینہ کے مصارف کچھ کم نہیں ہوتے - معلوم نہیں کیونکر میں انہیں پورا کرتا ہوں -

میرا ہی کلیجہ ہے کہ ان سارے دھندوں کو چلا رہا ہوں -

اور اس پر آپ کے پاؤڈر، لپ اسٹک، غازے، سینٹ کی شیشیاں اور تیل کی بوتلیں ــــ

میرے سنگار کی چیزیں بھی اب زبان پر آنے لگیں، میں کہتی ہوں چپ ہو جائیے ان چیزوں کا نام لیا ہے تو ..... راشدہ ڈریسنگ ٹیبل کے پاس جا کھڑی ہوئی اور بنگال ہیر آئل کی بوتل اٹھا کر فرش پر پھینک دی، پھر افغان سنو کی شیشی ــــ اور اس کے بعد ایک ایک کر کے سب چیزیں -

تم یہ کیا کر رہی ہو ؟ ــــ یوں میرا بوجھ ہلکا نہیں ہو گا اور بڑھ جائے گا -

اب میں ان میں سے کوئی چیز استعمال نہیں کروں گی -

شاید تم یہ بھول رہی ہو کہ میں ابھی زندہ ہوں -

ــــ تمہارے سیاہ بالوں کی لٹوں کو سونگھنے اور غازہ ملے ہوئے رخساروں کو چومنے کے لیے !

اور تمہاری زندگی اب ان چیزوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی میرا بس چلے تو میں ابھی اس مکان سے نکل جاؤں تاکہ مکان ہلکا ہو جائے - اور تم آسانی سے اسے اٹھا سکو ــــ یا پھر مکان ہی چھوڑ دو اس میں بھی تو کافی وزن ہے پچھتر روپے مہینہ ! ــــ کتنی بڑی رقم ہے یہ ضرور تمہارا شعور اس سے دبا جا رہا ہو گا ــــ جب ہی تم نے تصویر اور شاموس کے تھان کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا -

اور یہ سنتے ہی جمیل کے منہ سے ایک قہقہہ ابل پڑا ــــ اچھا اب سمجھا میں اس غصّے کی وجہ ــــ معاف کرو راشدہ، میں تو بالکل ہی بھول گیا تھا اس روز کے وعدے کو رانی غریب انتظار ہی انتظار میں سوکھ رہی ہو گی لیکن تمہیں جنگ شروع کرنے سے پہلے کم سے کم مجھے یاد تو دلا دینا چاہیئے تھا، اچانک کسی پر چڑھائی کر دینا تو ٹھیک نہیں -

میں کیوں یاد دلاتی ؟

کوئی حرج نہ تھا !

بالکل تھا۔

آخر پھر اب اسی وقت میں تمہاری تصویر کھنچوا دوں!

نہیں اب ضرورت نہیں، بسنت گزر چکا!

نہیں راشدہ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ اسٹوڈیو تک اپنے لئے نہیں تو میرے لئے، رانی کے لئے!

میں کسی کے لئے نہیں چلوں گی تم سے میری لڑائی ہے اور رانی خوب جانتی ہے کہ لڑائی میں سارے وعدے ٹوٹ جاتے ہیں اور دوسری اخلاقی پابندیاں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔

اچھا میں تم سے صلح کی درخواست کرتا ہوں تمہیں اس وقت چلنا ہی پڑے گا میرے ساتھ!

بہت اصرار کے بعد وہ موٹر میں بیٹھ گئی اور موٹر رنگیل اسٹوڈیو کے سامنے سڑک کے کنارے کھڑی ہو گئی۔ عمارتیں اپنی جگہ قائم ہو گئیں جیسے اس صلح کے بعد فوراً ہی کائنات نے ایک نئی کروٹ لی ہو، عمارتوں نے فرار سے توبہ کرلی ہو۔ دنیا اور انسانیت اپنی جگہ آ گئی ہو جمیل کا دل بدل گیا ہو لیکن راشدہ کے تیوروں میں ابھی آگ جل رہی تھی اس کی پیشانی پر شعلے ناچ رہے تھے چنانچہ جب وہ کیمرے کے سامنے پہنچی ہے اسٹوڈیو کا منیجر جس سے ہمیشہ ہی اس نے ہنس کر باتیں کی تھیں اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ وہ غصہ میں بھری ہوئی ہے۔

طبیعت کیسی ہے آپ کی؟ اس نے پوچھا۔

میں بالکل اچھی ہوں آپ تصویر کھینچئے!

تصویر تو ضرور کھینچوں گا لیکن آپ کے نقش و نگار میں گرمی بھری ہوئی ہے، میں برسوں کے ری ٹچنگ کے بعد بھی انہیں ٹھنڈا نہ کرسکوں گا اور ممکن ہے تصویر میں کچھ بھیانک پن آجائے۔

بات یہ ہے جمیل بولا۔ یہ مجھ سے لڑ پڑی ہیں۔

اچھا یہ بات ہے!

آپ تصویر کھینچئے اور جلد تیار کر دیجئے!

کل سے پہلے تو نہ ہو سکے گی!

کل ہی سہی!

اگلے دن منیجر نے تصویر راشدہ کو دیتے ہوئے کہا

رئیس امروہوی

غزل

قافلے جن کی ہدایت پہ رواں ہوتے ہیں — کسی گمراہ کے قدموں کے نشاں ہوتے ہیں

دلِ وارفتہ! شبِ غم میں کوئی خواب ہی دیکھ — خواب بھی مایۂ بیداریٔ جاں ہوتے ہیں

نفسِ گرمِ عنادل کی حقیقت معلوم — پھول "ہیجانِ تجلّی" سے جواں ہوتے ہیں

کس کو معلوم ان اشکوں کی حقیقت اے دوست — روح کی سمت جو آنکھوں سے رواں ہوتے ہیں

دل پہ یوں چھوڑ گیا سیلِ بلا اپنے نقوش — جس طرح ریت پہ لہروں کے نشاں ہوتے ہیں

گاہے گاہے ترے کوچے سے گزرنے والے — رہ نمایانِ جہاں گذراں ہوتے ہیں

جو بدل دیتے ہیں رفتارِ شب و روز رئیس
عشق ہی کے کچھ اشارات نہاں ہوتے ہیں

دیکھئے میں نہ کہتا تھا کہ تصویر میں بھدا پن پیدا ہو جائے گا۔ یہ دیکھئے آپ کی آنکھیں کتنی پھیل گئی ہیں تیور چڑھے ہوئے ہیں اور نقش و نگار اور نقش و نگار میں حیوانیت بھر گئی ہے! راشدہ نے جلدی سے جملہ پورا کر دیا۔

جی ہاں آپ جانتی ہیں لڑائی تو انسانیت کے نقوش بگاڑ دیتی ہے چہرے کا تو ذکر ہی کیا ہے، آدمی جانور بن جاتا ہے اس میں وحشت اور بربریت کے سوا کچھ رہتا ہی نہیں، ایلورا کی خوبصورتی اور اجنٹا کی دلکشی یہ سب امن ہی کی برکتیں ہیں، منیجر بولتا گیا۔ اس کے لب ولہجہ میں مؤرخ کے قلم کی سی روانی اور خشکی تھی —— مصور اور مؤرخ میں فرق ہی کیا ہے مصور انسان کی شبیہہ بناتا ہے اور مؤرخ انسانیت کی تصویر کھینچتا ہے۔

ذکر و فکر

غزل
محمد عبد الحفیظ

زمیں والوں پہ یورشِ ستم اے آسماں کب تک؟
بہت نازاں ہے تو جس پر وہ دورِ کامراں کب تک؟

کہاں تک باغباں کے ناز اٹھائیں گے چمن والے
رہے گی میہماں گلشن میں یہ برقِ تپاں کب تک!

بدلنا ہو تو رفتار اپنی بدلیں کارواں والے
یوں ہی مڑ مڑ کے میں دیکھوں گا سوئے کارواں کب تک؟

بزورِ فطرتِ آزاد زنداں میں بنا گلشن!
یہ آہ و نالہ و شیون بیادِ آشیاں کب تک؟

بجھانے سے کہیں بجھنے کی ہے یہ آتشِ الفت
ارے او دیدۂ گریاں یہ سعیِ رائیگاں کب تک؟

نگاہوں کو فریبِ فصلِ گل بھی تا کجا دوں گا؟
رہے گا گلشنِ امید بربادِ خزاں کب تک؟

تسلّی قلبِ مضطر کو کہاں تک دوں بتا اے دوست
یوں ہی دیکھوں شبِ فرقت ستاروں کا جہاں کب تک؟

مزا تو جب ہے دوہرائے زمانہ داستاں میری
کہے گا تو زمانے سے حدیثِ دیگراں کب تک؟

ذرا اپنے دلوں میں دردِ انسانی کرو پیدا
وطن والو! گرفتارِ غمِ سود و زیاں کب تک؟

تلقینِ خیر
محمد انشاء الرحمٰن خاں انشا

شکایتِ ستمِ آسماں کو ختم کرو　　بپاسِ عشق، غمِ این و آں کو ختم کرو
مصافِ زیست میں ذوقِ یقیں بڑی شے ہے　　دلوں سے غلبۂ وہم و گماں کو ختم کرو
جنوں میں وسعتِ ہر دو جہاں پہ چھا جاؤ　　تو ان قیودِ زمان و مکاں کو ختم کرو
روش روش پہ بہاروں کا نور برسا کر　　چمن سے ظلمتِ دورِ خزاں کو ختم کرو
بنا کے ذرۂ خاکِ وطن کو تابندہ　　غرورِ مہر و مہ و کہکشاں کو ختم کرو
جہاں میں گر تمہیں آسودگی کی خواہش ہے　　تو ہر خرابیٔ عصرِ رواں کو ختم کرو
قدم قدم پہ لٹا کر خلوص کی دولت　　تعصبات کے نام و نشاں کو ختم کرو
اگر وقار بڑھانا ہے آدمیت کا　　تمیزِ دیدۂ خورد و کلاں کو ختم کرو
جو کچھ بھی کر نہ سکے دردِ بیکسی کا علاج　　اٹھو اور ایسے نظامِ جہاں کو ختم کرو
یہ ظلم و جبر، یہ بندوں کی بندگی تا کے　　خدا کے واسطے اس داستاں کو ختم کرو

غزل
پورن سنگھ ہنر

ایک سننے کی بات لایا ہوں　　شکوۂ التفات لایا ہوں
تحفۂ شیخ و برہمن کے لئے　　آبِ گنگ و فرات لایا ہوں
پھر نہ شاید سنا سکوں تم کو　　لب پہ مشکل سے بات لایا ہوں
دھوم تیرے کرم کی سن کر میں　　آرزوئے نجات لایا ہوں
رشک ہے خود حیات کو جس پر　　وہ طریقِ حیات لایا ہوں
اُن کی محفل سے دل میں رکھنے کو　　نگہِ التفات لایا ہوں
ملک الموت مجھ سے کہتا ہے　　میں پیامِ حیات لایا ہوں
پوچھنا کیا ہے وسعتِ دل کا　　عالمِ بے جہات لایا ہوں
نگہِ صبر سوز کے آگے　　میں شکستِ ثبات لایا ہوں
کچھ تصنع نہیں غزل میں ہنر　　قلب کے واردات لایا ہوں

دُنیائے خودی
مسلم الحریری

دُنیائے خودی میں سانس لی ہے تم نے　　آوازِ حیات کو بھی دی ہے تم نے؟
منزل کی تلاش میں بھٹکنے والو　　اپنی بھی کبھی تلاش کی ہے تم نے؟

سرمایۂ دفترِ جوانی کو پڑھو!　　روداد کتابِ زندگانی کو پڑھو!
مل جائیں گے سینکڑوں ہی عبرت کے سبق　　اوروں کی نہیں، اپنی کہانی کو پڑھو!

سوئی ہے خودی اسے جگاؤ تو سہی!　　بے ہوش ہو، ہوش میں بھی آؤ تو سہی!
تقدیرِ زمانے کی بدل سکتے ہو!　　خود اپنے میں انقلاب لاؤ تو سہی!

غزل
مضطر حیدری

مقامِ فکر و نظر ہے بلند بینوں کو　　زمیں نے چیر دیا ہے فلک کے سینوں کو
مری زمیں کے ستاروں کو آرہا ہے حجاب　　بلندیوں پہ چمکتے ہوئے نگینوں کو
لرز رہا ہے ہر اک پیرِ میکدہ کا غرور　　کہ آج رند چڑھائے ہیں آستینوں کو
مجھے فریبِ اثر دے نہ اب غمِ ہستی　　بہت عزیز میں رکھتا ہوں آبگینوں کو
مری جبیں سے ہی ٹپکے ہوئے یہ موتی ہیں　　زمیں کی کوکھ نے اُگلا ہے جن خزینوں کو

نہیں رموزِ خودی سے وہ آشنا مضطر
ہر ایک در پہ جھکاتے ہیں جو جبینوں کو

جنگجو ڈاکوؤں کی سرکوبی

حصولِ آزادی اور قیامِ جمہوریہ کے بعد ملک میں نئی قدروں اور نئے آدرشوں کو فروغ دینے کی ضرورت پیدا ہوئی۔ چنانچہ پولیس کی اہمیت اور فرائض کے بارے میں کئی ریاستوں کے مکھیہ منتریوں نے نئے نظریوں کی وضاحت کی۔ پولیس سے کہا گیا کہ وہ "مظلوم کے لئے تسکین اور ظالم کے لئے تنبیہ" اور "داخلی امن و امان کے لئے نگراں و محافظ" بنے۔ بھارت کی پولیس نے جو کارنامے سرانجام دئے ہیں وہ اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ عملۂ پولیس میں فرض کا ایک گہرا احساس موجود ہے۔

ان کارناموں کے صلے میں ہی اُنھیں پولیس کا اعلیٰ ترین اعزاز یعنی راشٹرپتی کا میڈل ملا ہے۔ آزادی کے بعد یہ میڈل پولیس کے قریباً تیس ارکان کو مل چکا ہے، ان میں سے چھ سات نے تو فرائض کی انجام دہی میں اپنی جانیں قربان کر دیں، اور باقی نے ذاتی سلامتی کی پروا نہ کرتے ہوئے بڑی جرأت اور جاں نثاری کا ثبوت دیا۔

ان میں اکثر اعزاز جنگجو ڈاکوؤں اور مجرموں سے نمٹنے کے صلے میں دئے گئے۔

اشونی کمار

ڈاکوؤں اور مجرموں سے کامیاب مقابلہ کرنے والوں میں پنجاب پولیس کے معاون انسپکٹر جنرل پنڈت اشونی کمار کی روداد سب سے زیادہ دلپذیر ہے۔ سوراشٹر کے بدنام ڈاکو بھوپت کا پیچھا کرنے میں اُنھوں نے جس جگرداری کا ثبوت دیا اُسے پردھان منتری نے بھی سراہا ہے۔

اشونی کمار کئی بار رضاکارانہ طور پر اپنے آپ کو خطرے میں ڈال چکے ہیں جب وہ فیروزپور میں سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے تو اُن کے ضلع اور اُس کے ساتھ پیپسو کے اضلاع میں ڈاکوؤں کے کئی مسلح گروہ لوٹ مار کر رہے تھے ان میں سے ایک گروہ کی طرف سے تو سولہ بار قتل اور ڈکیتی کی وارداتیں ہو چکی تھیں اور یہ گروہ کئی سال تک پولیس کی گرفت میں نہ آسکا تھا۔ اس کا سرغنہ کیلا عرف کرنیل سنگھ تھا اور اس میں قہر سنگھ و سات آٹھ اور ڈاکو تھے۔ اس سرغنے کو پکڑنے کے لئے اشونی کمار برابر کوشش کرتے رہے آخر جولائی ۱۹۴۹ء میں انھوں نے کیلا کو اُس کے دو ساتھیوں کے ساتھ گرفتار کر لیا۔ اس کے لئے اشونی کمار اپنے ہمراہ ایک پولیس پارٹی لے گئے اور انھوں نے چپ چاپ اس مکان کے گرد گھیرا ڈال دیا جہاں وہ ڈاکو چھپا بیٹھا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک چھوٹی سی پارٹی کے ہمراہ مکان کے اندر چلے گئے۔ انھیں دیکھتے ہی قہر سنگھ نے اپنی بھری ہوئی بندوق اُٹھائی۔ لیکن پیشتر اس کے کہ وہ بندوق چلاتا اشونی کمار اُس پر لپکے اور اُس سے گتھم گتھا ہو گئے۔ قہر سنگھ ایک ہٹا کٹا اور گرانڈیل آدمی تھا لیکن اشونی کمار کے فوراً بعد ان کی پارٹی کے دوسرے ارکان نے ڈاکو سے ہتھیار چھین لئے اور اُسے گرفتار کر لیا۔

ایک بار موگہ میں وہ روز روشن میں ایک ڈاکو سے گتھم گتھا ہو گئے اور سارا نگر یہ مقابلہ دیکھنے آیا۔ واقعہ اس طرح ہوا کہ اشونی کمار کو معلوم ہوا کہ جن چار ڈاکوؤں کا وہ تعاقب کر رہے تھے وہ موگہ کے ایک کھیت میں چھپے ہوئے تھے۔ اشونی کمار اپنی پارٹی کو ساتھ لے کر وہاں پہنچے۔ ڈاکو گولیاں چلا رہے تھے۔ اشونی کمار اور اُن کی پارٹی آگے بڑھتی رہی حتیٰ کہ وہ ڈاکو درختوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے چھپ گئے۔ تعاقب جاری رہا اور گولیاں بھی چلتی رہیں۔ اب اشونی کمار اور ڈاکوؤں میں صرف ایک سو گز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ یہاں اشونی کمار اپنی سلامتی کی پروا کئے بغیر اپنی پارٹی کے ساتھ درختوں کے جھنڈ میں ان ڈاکوؤں پر جا لپکے اور چاروں ڈاکوؤں کا کام تمام کر دیا۔ ان میں سے تین اُڑی کے محاذ کے فوجی بھگوڑے تھے۔ ان سے تین بندوقیں اور دو سو کارتوس برآمد ہوئے۔

ایک اور مقابلے میں اشونی کمار ایک ایسے گروہ سے بھڑ گئے جس نے پنجاب نیشنل بنک کی چالیس ہزار روپیہ کی اشیاء لوٹی تھیں۔ اس کے سرغنہ بلبیر سنگھ نے فیروز پور میں ایک دہشت پھیلا رکھی تھی۔ یہ بلبیر سنگھ تو اپنا پیچھا کرنے والے تمام افسروں کو تباہ کرنے کی بھی ڈینگیں مارا کرتا تھا۔
۱۵۔ نومبر ۱۹۴۹ء کو اشونی کمار کو معلوم ہوا کہ بلبیر سنگھ اور اس کے ساتھی موگہ میں شیشم کے ایک جنگل میں ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ اشونی کمار نے فوراً ایک پولیس پارٹی ہمراہ لی اور اپنے آدمیوں کو اس جنگل سے ڈاکوؤں کو تلاش کرنے کے لئے کہا۔ تھوڑی دیر بعد اس جنگل سے دنادن گولیاں چلنے لگیں اشونی کمار نے اپنی پارٹی کو تین حصوں میں تقسیم کیا اور آگ لگا کر اس کی آڑ میں ڈاکوؤں کی جھاڑی تک جا پہونچے۔ ڈاکو بھی مقابلے پر اُتر آئے اور آمنے سامنے گولیاں چلنے لگیں۔ ایک ڈاکو نے تو اشونی کمار پر بالکل قریب سے وار کیا لیکن خوش قسمتی سے یہ نشانہ چوک گیا اور پھر پولیس نے ایک پہلو سے گولیوں کی ایسی بارش کی کہ سب ڈاکو وہیں چت ہو گئے۔

کانسٹیبل کی جاں بازی

کیلا کو پکڑنے کے وقت ایک پیادہ سپاہی نابر سنگھ نے کمال بہادری اور حاضر دماغی کا ثبوت دیا۔ اس کارنامے کی بدولت اُسے پولیس کا سب سے اعلیٰ اعزاز ملا۔ کیلا اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ ایک گاؤں میں پناہ گزیں تھا۔ نابر سنگھ اور دوسرے سپاہی وہاں گشت پر تھے۔ انھوں نے تین چار آدمیوں کو ساتھ لیا اور کیلا کے مکان پر دھاوا بول دیا۔ کیلا نے مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن نابر سنگھ نے لپک کر اس کے ہتھیار چھین لئے اور کیلا گرفتار ہو گیا۔

دہشت پسندوں سے مڈبھیڑ

پچھمی بنگال میں پولیس کو اکثر دہشت پسندوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔

۲۸۔ مارچ ۱۹۵۰ء کو دہشت پسندوں کے ایک گروہ نے جدید طرز کے فوجی سامان سے لیس ہو کر دن دہاڑے کلکتے کے بازار میں سنٹرل بنک آف انڈیا کی شاخ پر دھاوا بولا۔ انسپکٹر چکرورتی فوراً موقعہ پر پہنچے۔ اور دہشت پسندوں کا پیچھا کیا۔ دہشت پسند گولیاں چلاتے رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے چکرورتی پر بم پھینکا اور دوسرے نے دو بار ان پر گولی چلائی۔ چکرورتی مقابلہ کرتے رہے اور ایک موقعہ پر جب وہ بدمعاش کے قریب تر آئے تو بدمعاش نے اُن پر سنگین سے حملہ کیا۔ خوش قسمتی سے یہ سنگین اُن کی آہنی پیٹی پر لگی اور چکرورتی تھوڑے مقابلے کے بعد بدمعاش کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک اور ڈاکو کو پکڑا جس کے پاس چھ نالی پستول تھا۔

پچھمی بنگال کے ایک اور پولیس انسپکٹر کیلاش پتی دوبے نے ان حملہ آوروں کو پکڑنے میں اپنی جان قربان کر دی جنھوں نے ۲۶۔ فروری کو ڈم ڈم کے ہوائی اڈے پر لیسر یٹ کے چھوٹے خزانہ پر حملہ کیا تھا۔ دوبے کو اُن کی جاں نثاری کے لئے موت کے بعد میڈل ملا۔

زرعی شورش کی سرکوبی

بہار کے ایک گاؤں میں کانسٹیبل ایشور رام نے ایک ایسی واردات کی روک تھام میں جان دی جو شاید ایک زبردست زرعی شورش ثابت ہوتی۔
بہار کے اس گاؤں میں ایک قطعہ آراضی پر ہل چلانے کے بارے میں دو مسلح حریف جماعتوں میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ ایشور رام ایک اسسٹنٹ سب انسپکٹر کے ساتھ گئے اور فریقین کو سمجھا بجھا کر رام کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ایک فریق اپنی ضد پر اڑا رہا۔ اس پر ایشور رام نے انھیں گرفتار کرنے کی دھمکی دی۔ لیکن ضدی فریق نے ان پر ہی حملہ کر دیا اور یہ حملہ جان لیوا ثابت ہوا۔

مضامین نگار حضرات کی خدمت میں گذارش ہے کہ وہ آج کل کے لئے اپنے مضامین بھیجتے وقت اپنے خط میں اس امر کی وضاحت کر دیا کریں کہ وہ سرکاری ملازم ہیں یا نہیں۔

(ادارہ)

شری رام سنہا

انڈونیشیا کی بدیشی تجارت

روایت ہے کہ سیاسی آزادی کے لئے جدوجہد جہاں ختم ہوتی ہے وہاں سے اقتصادی آزادی کے لئے جدوجہد شروع ہو جاتی ہے۔ بیشک یہ جدوجہد خون اور آگ کی حامل نہیں ہوتی لیکن محنت اور قربانی کے تقاضے کسی حالت میں بھی کم نہیں ہوتے۔ صدیوں کی سیاسی محکومی، اقتصادی لوٹ اور مجلسی پس ماندگی کے باعث سیاسی خود مختاری کے باوجود بھی مسائل حل ہونے میں ہی نہیں آتے۔ تعمیری پروگرام کے تمام ارادے اور پلان کسی کروٹ سیدھے نہیں بیٹھتے۔ اقتصادی خوش حالی اور مجلسی بہبودگی کے تعمیری پروگرام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سرمایے کی اشد قلت ہوا کرتی ہے۔ اس سوال کا کہ سرمایہ کہاں سے آئے جواب یا تو ملتا ہی نہیں یا پھر ملتا ہے تو اتنی شرطوں کے ساتھ کہ اُسے قبول کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آج جنوب مشرقی ایشیا کے اُن ممالک میں جہاں صدیوں کے بعد آزادی کا سورج پھر طلوع ہوا ہے۔ تعمیری پروگرام کے منصوبے اور سرمایے کی قلت آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔ اس مضمون میں انڈونیشیا کے تجارتی اور مالی مسائل پر بحث کی گئی ہے۔

موجودہ انڈونیشیا میں جاوا، سماٹرا، بورنیو، سیلے بیز اور دیگر تین ہزار چھوٹے بڑے جزائر شامل ہیں۔ قدرت نے اس خطے کو زرعی اور معدنی پیداوار سے مالامال کر رکھا ہے۔ زرعی پیداوار میں سنکونا (کونین کا ماخذ)، کالی مرچ۔ کپوک۔ ربڑ۔ سیسال۔ ناریل، گنا، کافی، چائے، کھجور، چاول اور تمباکو قابل ذکر ہیں۔ معدنی پیداوار میں قلعی، باکسائٹ (جو ایلومینیم کا ماخذ ہے) اور پٹرول قابل ذکر ہیں۔ بین الاقوامی مارکیٹ میں ان اجناس کی ہمیشہ مانگ رہتی ہے اس لئے ان اجناس کی عالمگیر تجارت میں انڈونیشیا کا حصہ گراں قدر ہے۔ اس کا اندازہ لگانے کے لئے مندرجہ ذیل خاکہ پیش کیا جا رہا ہے۔

انڈونیشیا کی پیداوار کا عالمگیر تجارت میں حصہ (۱۹۳۹ء سے پہلے)

سنکونا کی چھال	۹۱ فیصدی	کالی مرچ	۸۶ فیصدی
کپوک	۷۲ ”	ربڑ	۳۷ ”
سیسال	۳۳ ”	کھوپرا	۲۷ ”
کھجور کا تیل	۲۴ ”	چائے	۱۰ ”
کھانڈ	۱۱ ”	قلعی	۱۷ ”
باکسائیٹ	۷ ”	پٹرول	۳ ”

لیکن اس فراوانی کے باوجود انڈونیشیا کے سامنے کچھ پیچیدہ مسائل بھی ہیں۔ سب سے پہلے آبادی اور سامانِ خوراک میں توازن قائم کرنے کا مسئلہ ہے۔ انڈونیشیا کی آبادی ۷۶۰ لاکھ نفوس ہے۔ اور برما، تھائی لینڈ، ملایا، انڈوچائنا اور فلپائن کی مشمولہ آبادی کے مساوی ہے اور یہ آبادی ہر سال مائل بہ ترقی ہے۔ دوسری طرف چاول جو اشیائے خوردنی میں ممتاز ہے کی پیداوار قریباً ۷۰ لاکھ ٹن ہوتی ہے۔ یہ مقدار ملک کی اندرونی ضروریات پورا کرنے میں قاصر ہے۔ اس لئے ہر سال ۳ لاکھ ٹن چاول باہر سے منگوائے جاتے ہیں اور اس درآمد پر ۴ کروڑ روپے کا صرف اُٹھتا ہے۔ یہاں یہ بتانا بھی موجب دلچسپی ہوگا کہ انڈونیشیا کا سکہ بھی روپیہ کہلاتا ہے اور ہندوستان کے سوا روپیہ کے مساوی ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ انڈونیشیا میں زراعت کے مقابلے میں صنعتوں کی ترقی بحیثیت مجموعی کمزور رہی ہے۔ اس کا باعث یہ تھا کہ جن دنوں انڈونیشیا پر ڈچ حکومت کا اقتدار تھا۔ انڈونیشیا کے مفادات کے خلاف غیر ملکی حکومت کے مفادات کو ترجیح دی جاتی تھی۔ ڈچ حکومت کا مفاد اسی میں تھا کہ انڈونیشیا زرعی پیداوار اور صنعتی خام مال مہیا کرتا رہے، دوسرے لفظوں میں صنعتی پیداوار کا فقدان رہے۔ اور مصنوعات کی ضرورت پوری کرنے کے لئے غیر ملکوں کی بالخصوص ہالینڈ کی منڈی بنا رہے۔ اس لئے انڈونیشیا میں جنگلات صاف کئے گئے۔ آبپاشی کے ذرائع منظم کئے گئے۔ ربڑ اور چائے کی پیداوار پر خاص زور دیا گیا۔ ۱۹۳۱ء کی عالمگیر اقتصادی

بدحالی میں محسوس کیا گیا کہ جب تک ملک میں صنعتوں کو فروغ نہیں دیا جاتا تب تک اقتصادی نظام توازن کا روادار نہیں ہوگا۔ مزید براں آبادی میں بتدریج اضافہ کے باعث زراعت پر آبادی کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا اس لئے بیکاری بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس تحریک کو روکنے کے لئے روزگار کے دیگر ذرائع کو ڈھونڈنا ازبس ضروری ہوتا جا رہا تھا۔ اور اس تلاش کا جواب بھی صنعتوں کا فروغ ہی تھا۔ لیکن صنعتوں کے جامع اور ہمہ گیر فروغ سے غیر ملکی حکومت کے اقتصادی مفادات پر ضرب لگتی تھی اور ایک تجارتی منڈی ہاتھ سے نکل جاتی تھی۔ اس لئے فیصلہ کیا گیا کہ بڑی صنعتیں تو بدیشی سرمایہ کے زیر تحت رہیں اور گھریلو صنعتوں کو ملک میں جاری کیا جائے۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ دوسری عالمگیر جنگ میں ایک طرف تو ہالینڈ کو جو انڈونیشیا پر قابض تھا جرمنی نے مفتوح کر لیا اور دوسری طرف انڈونیشیا پر جاپان کا تسلط ہو گیا۔ اس طرح سیاسی اقتدار میں ایک غیر متوقع انقلاب رونما ہو گیا۔ بعد میں جب جرمنی اور جاپان نے شکست تسلیم کر لی تو انڈونیشیا کے سیاسی مستقبل کا یوں تصفیہ ہوا۔ کہ انڈونیشیا کو پھر سے ہالینڈ کے حوالے کر دیا گیا۔ لیکن انڈونیشیا کے قوم پرستوں نے اس فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ڈچ گورنمنٹ اور قوم پرستوں کے درمیان لڑائی چھڑ گئی۔ بعد میں ہندوستان کی مداخلت پر ڈچ گورنمنٹ نے انڈونیشیا کو آزادی دینا منظور کر لیا۔ یہ تو ہوا کہ جنگ عالمگیر اور جنگ آزادی میں انڈونیشیا میں وسیع پیمانے پر تباہی ہوئی۔ عالمگیر جنگ میں بدیشی تجارت تو ختم ہی ہو گئی تھی۔ چائے اور ربڑ کے باغات اور تیل کے چشمے قریباً مسمار ہو گئے تھے۔ کالی مرچ اور ناریل کی نگہبانی کرنے والا ہی کوئی نہ تھا۔ جاپانی قبضہ کے دوران میں اور پھر جاپان کے خلاف اتحادی مہم میں بھی ملک کو کافی نقصان برداشت کرنا پڑا۔ رہی سہی کسر ڈچ گورنمنٹ کے خلاف جنگ آزادی میں نکل گئی۔ ڈچ گورنمنٹ نے قوم پرستوں کو تنگ کرنے کے لئے انڈونیشیا کی اقتصادی ناکہ بندی کر دی تھی۔ اور قوم پرستوں نے "پھونک دو" کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔ ان سب حادثات کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب ۱۹۴۹ء میں انڈونیشیا کو آزادی حاصل ہوئی تو اس کا اقتصادی نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔

اب ذرا انڈونیشیا کے تجارتی نقشے کو ملاحظہ فرمایئے۔ انڈونیشیا کی ضروریات تین حصوں میں منقسم کی جا سکتی ہیں۔ (۱) سامان خوراک (۲) مصنوعات (۳) مشینری وغیرہ۔ ان اشیاء کی تجارت درآمد آزادی کے بعد دو سالوں میں یوں تھی۔

انڈونیشیا کی تجارت درآمد

(ہزار روپیوں میں)

اشیاء	۱۹۴۹ء	۱۹۵۰ء
۱۔ سامان خوراک		
دودھ، مکھن اور پنیر	۵۲,۲۲۷	۲۷,۱۴۳
چاول	۱۳۳,۲۵۶	۱۴۳,۶۵۶
۲۔ مصنوعات		
ادویات	۳۵,۲۶۸	۴۴,۹۷۲
رنگ	۹,۳۷۹	۱۳,۲۸۱
سوتی دھاگہ	۴۱,۱۲۲	۸۰,۵۳۵
سوتی دھاگہ (کورا)	۲۸,۳۵۳	۸۳,۷۴۶
سوتی دھاگہ (دھلا ہوا)	۵۹,۹۶۵	۷۶,۹۹۲
رنگا ہوا سوت	۱۶۱,۱۸۶	۱۶۸,۰۱۰
کپڑے	۲۷,۹۶۲	۲۰,۷۷۴
بوریاں	۱۶,۰۳۸	۱۸,۹۰۷
کیمیائی کھاد	۱۴,۹۲۲	۱۷,۳۵۵
گھریلو برتن	۷,۵۷۸	۷,۳۲۶
۳۔ مشینری وغیرہ		
صنعتی مشینری	۹۶,۴۳۲	۶۸,۸۷۶
انجن	۲۴,۰۴۰	۲۶,۴۶۴
لوہے اور فولاد کا سامان	۲۲,۶۴۱	۱۶,۰۱۲
لوہے اور فولاد کی نالیاں	۵۳,۳۳۱	۱۶,۵۵۰
پٹرول اور پٹرول کا سامان	۱۱۲,۶۱۹	۱۰۵,۴۳۵
سیمنٹ	۱۷,۸۸۰	۱۱,۷۳۲
کل میزان	۱,۵۷۳,۶۱۲	۱,۵۲۶,۷۹۶

ان اعداد سے عیاں ہوتا ہے کہ انڈونیشیا کی اندرونی ضروریات ہر سال

۱۵۰ کروڑ روپے سے اُوپر جا پہنچتی ہیں۔ اتنی زرکثیر کو بہم کرنا بھی ایک مسئلہ ہے لیکن خوش قسمتی سے انڈونیشیا کی زرعی اور معدنی پیداوار کی بدیشی تجارت اس بوجھ کو برداشت کر سکتی ہے اور برداشت کر رہی ہے۔ اس بدیشی تجارت کا خاکہ یُوں ہے۔

انڈونیشیا کی تجارت برآمد (ہزار روپیوں میں)

اشیاء	۱۹۴۹ء	۱۹۵۰ء
چمڑہ اور کھالیں	۷,۱۲۲	۲۰,۷۸۸
مونگ پھلی	۹,۱۶۴	۲۰,۲۸۳
کھوپرا	۱۱۵,۶۴۷	۲۱۱,۰۰۹
کالی مرچ	۹,۶۵۲	۸۰,۲۶۹
کھانڈ	۱۶,۸۱۶	۱,۴۱۵
کافی	۹,۰۶۵	۵۵,۶۸۹
چائے	۵۳,۰۸۶	۱۰۱,۰۰۲
تمباکو	۵۷,۵۸۲	۸۰,۷۳۴
کھجور کا تیل	۵۹,۹۸۸	۸۱,۷۹۸
ربڑ	۳۴۸,۵۲۹	۱,۱۴۶,۲۷۴
کپوک	۱۳,۶۲۹	۲۰,۸۴۶
پٹرول اور پٹرول کی اشیاء	۴۱۲,۲۰۴	۵۳۸,۶۸۹
قلعی	۱۶۹,۱۰۹	۱۸۵,۲۵۴
کل میزان	۱,۴۷,۵۵۸	۲۷۴۱,۷۴۱

ان اعداد سے ظاہر ہو رہا ہے کہ تجارت برآمد سے حاصل ہونے والی آمدنی ۱۹۴۹ء کے مقابلے میں ۱۹۵۰ء میں قریباً دوگنی ہو گئی۔ تفاصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ ربڑ اور قلعی کی برآمد جنگِ عظیم سے قبل کے مقابلے میں اب زیادہ ہو گئی ہے۔ تیل اور کونین کی برآمد اب مساوی ہو گئی ہے۔ لیکن دیگر اشیاء کی برآمد ابھی تک مقابلتاً بہت پیچھے ہے۔ ان میں سے کھجور کے تیل کی برآمد ۵۰ فیصدی سے کم۔ چائے کی ۳۳ فیصدی سے کم، تمباکو کی ۲۵ فیصدی سے کم اور چائے کی ۱۰ فیصدی سے کم ہے۔ انڈونیشیا کی تجارت برآمد میں ایک اور نمایاں تبدیلی برآمد کی منزلِ مقصود کے خاکے میں ردّوبدل سے تعلق رکھتی ہے۔ ۱۹۳۸ء میں بدیشی تجارت کا رُخ زیادہ تر یورپین ممالک کی طرف ہوتا تھا اور دیگر ممالک کی طرف کم لیکن ۱۹۵۰ء میں بدیشی تجارت میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو ممتاز حیثیت حاصل ہو چکی تھی اور یورپین ممالک کا طرۂ امتیاز ختم ہو چکا ہے۔ تفاصیل یوں ہیں۔

انڈونیشیا کی بدیشی تجارت میں منتخب ممالک کا حصّہ

ملک	۱۹۳۸ درآمد	۱۹۳۸ برآمد	۱۵۰ درآمد	۱۵۰ برآمد
ہالینڈ	۰ر۲۲ فیصدی	۰ر۲۰ فیصدی	۱ر۱۷ فیصدی	۲ر۲۴ فیصدی
برطانیہ	۱ر۸ 〃	۴ر۵ 〃	۳ر۷ 〃	۷ر۳ 〃
جرمنی	۲ر۱۰ 〃	۷ر۳ 〃	۰ر۳ 〃	۹ر۲ 〃
ریاستہائے متحدہ امریکہ	۷ر۹ 〃	۲ر۱۴ 〃	۷ر۲۰ 〃	۲ر۱۶ 〃
ہندوستان	۵ر۲ 〃	۷ر۰ 〃	۵ر۵ 〃	۳ر۰ 〃
برما	۶ر۱ 〃	—	۴ر۴ 〃	—
چین	۸ر۱ 〃	۴ر۱ 〃	۵ر۰ 〃	—
جاپان	۹ر۱۵ 〃	۱ر۳ 〃	۵ر۱۰ 〃	۴ر۱ 〃
ملایا	۰ر۹ 〃	۶ر۱۸ 〃	۷ر۴ 〃	۴ر۳۶ 〃

اس نقشے سے عیاں ہوتا ہے کہ برآمد میں ہالینڈ کا حصہ ابھی تک ممتاز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آزادی سے پہلے سیاسی محکومی کے باعث انڈونیشیا کی بدیشی تجارت ہالینڈ کے ہاتھ میں تھی۔ آزادی کے بعد بھی اس پوزیشن میں نمایاں فرق اس لئے نہیں آیا کہ ہالینڈ اور انڈونیشیا کے مابین سیاسی اور تجارتی معاہدے ہو چکے ہیں۔ برطانیہ اور جرمنی کے ساتھ ہونے والی تجارت بہت کچھ تبدیل ہو چکی ہے اور مائل بہ تنزل ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کا حصہ مقابلتاً اضافے کی طرف مائل ہے۔ ہندوستان کی تجارت بھی پہلے سے بہتر ہو چکی ہے۔ جاپان کے ساتھ ہونے والی تجارت اب کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس سارے نقشے میں ملایا کی حیثیت وضاحت طلب ہے۔ انڈونیشیا کی تجارت برآمد زیادہ تر ملایا کی آزاد بندرگاہ سنگاپور کی معرفت ہوتی ہے۔ اعداد بتاتے ہیں کہ ۱۹۳۸ء کے مقابلے میں ۱۹۵۰ء میں ملایا کے ساتھ ہونے والی برآمد تقریباً دوگنی ہو گئی تھی۔

اس مرحلہ پر تجارت برآمد اور تجارت درآمد کا میزان بتانا بھی ضروری ہو جاتا

ہے جو یوں ہے۔

انڈونیشیا کا میزان تجارت (لاکھ روپیوں میں)

سال	درآمد	برآمد	میزان
۱۹۳۶ء	۲۸۲	۵۹۵	+ ۳۱۳
۱۹۳۷ء	۴۹۱	۹۹۰	+ ۴۹۹
۱۹۳۸ء	۴۷۸	۶۸۷	+ ۲۰۹
۱۹۳۹ء	۴۷۲	۷۷۴	+ ۳۰۲
۱۹۴۰ء	۴۳۳	۹۳۳	+ ۵۰۶
۱۹۴۱ء	۴۷۲	۱۰۸۶	+ ۶۱۴
۱۹۴۶ء	۲۸۱	۱۵۵	- ۱۲۶
۱۹۴۷ء	۸۱۰	۳۳۹	- ۴۷۱
۱۹۴۸ء	۱۱۳۴	۱۰۴۰	- ۹۴
۱۹۴۹ء	۱۵۷۴	۱۴۷۸	- ۹۶
۱۹۵۰ء	۱۵۲۷	۲۷۴۲	+ ۱۲۱۵

اس نقشے سے عیاں ہوتا ہے کہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۱ء تک یعنی انڈونیشیا پر جاپان کے قبضے سے پہلے انڈونیشیا کی بدیشی تجارت ہمیشہ اس کے لئے منافع بخش رہتی تھی۔ جتنا مال باہر سے منگوایا جاتا تھا اس سے کہیں زیادہ باہر بھیجا جاتا تھا۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء تک ملک پر جاپان کا قبضہ رہا اور بدیشی تجارت مفقود ہو گئی۔ اس کے بعد جب جنگِ عظیم ختم ہوئی اور جاپان کو شکست ہوئی تو ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۹ء تک بدیشی تجارت لگاتار خسارہ دکھاتی رہی۔ لیکن سیاسی آزادی کے پہلے سال میں ہی بھر منافع ہوا۔ اس منافعے کا باعث یہ تھا کہ کوریا کی جنگ شروع ہونے کے بعد خام مال کی قیمتیں یکدم چڑھ گئی تھیں اور ان کی عالمگیر مانگ بھی بڑھ گئی تھی۔ بالخصوص ربڑ۔ قلعی اور کھوپرا کی قیمتوں میں حیرت انگیز اضافہ ہوا۔ اس منافعے کے باعث ۱۹۵۰ء کے سونے اور بدیشی تبادلے کے سرمایے میں ۶۵ کروڑ روپے کا اضافہ ہوا۔

نئے مطبوعات

کمار سمبھو شاعرِ اعظم کالی داس کا مشہور شاہکار ہے جس کا ترجمہ اُردو کے نامور شاعر جناب بشیشور پرشاد منور نے کیا ہے۔ منور صاحب ایک شاعر اور مترجم کی حیثیت سے مسلّمہ حیثیت کے مالک ہیں آپ نے اپنے مجموعۂ کلام اور بھگوت گیتا کے اُردو نظم میں ترجمے کے بعد کمار سمبھو کا اُردو نظم میں ترجمہ کر کے ایک بہت بڑا ادبی کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ ترجمہ اوّل سے آخر تک مصنّف اور مترجم کے شاعرانہ کمال کا حامل ہے اور اُردو کے شعری ادب میں ایک جاودانی اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ساری نظم میں ایک مقام بھی ایسا نظر نہیں آتا جہاں پڑھنے والے کو مترجم کی قوتِ نظم کا قائل نہ ہونا پڑے۔

حضرۃ جوشؔ، جنابِ فراقؔ، مسٹر بال کرشن شرما نوین اور ملک کے دوسرے ادیبوں نے اس منظوم ترجمے کو بہت اچھے الفاظ میں سراہا ہے۔ جنابِ فراقؔ لکھتے ہیں۔ ''سنسکرت شاعری کی روح، اس کی فضا، اس کا نظریہ، اس کی وجدانیت اور رنگا رنگ خوبیاں اس منظوم ترجمے میں اس طرح جھلک رہی ہیں جیسے صبح کے آئینہ خانے میں شبستاں جلوہ گر ہو۔''

کتاب $\frac{27 \times 17}{8}$ سائز کے قریباً دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ کاغذ عمدہ کتابت، طباعت دیدہ زیب۔ قیمت پانچ روپے۔ ناشر انجمن ترقیٔ اُردو بک ڈپو، اُردو بازار دہلی۔

قطعات و رباعیاتِ اکبر الٰہ آبادی (حصّہ دوم) یہ بزمِ اکبر کراچی کی تازہ ترین پیشکش ہے۔ اس سے قبل کلامِ اکبر کے تین حصّے اور قطعات و رباعیات کا پہلا حصّہ اہلِ نظر حضرات ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ یہ اس سلسلے کی پانچویں کڑی ہے۔ اس مختصر سے ذکر میں لسان العصر کے کلام کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ جہاں تک بزمِ اکبر کی کوششوں کا تعلق ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ قدر اور قابلِ مبارکباد ہیں۔ کلامِ اکبر بزمِ اکبر کے معرضِ وجود میں آنے سے پہلے نایاب ہو چکا تھا۔ مقامِ شکر ہے کہ اس بزم کی بدولت یہ گم گشتہ دولت پھر ہمارے ہاتھ آگئی ہے۔ ضخامت قریباً ڈیڑھ صد صفحات۔ کاغذ، کتابت، طباعت اعلیٰ درجے کی ہے۔ جلد پختہ اور خوشنما ہے۔ قیمت تین روپے چھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ بزمِ اکبر کراچی ۴۔

آہنگ مجازؔ کا مجموعہ کلام ہے جس کا نیا ایڈیشن آزاد کتاب گھر، کلاں محل دہلی نے شائع کیا ہے۔ مجاز کا شمار عصرِ نو کے محبوب ترین شاعروں میں ہوتا ہے۔ آپ کی شاعری سنگم ہے نئے اور پرانے محاسن کا ایک حسین امتزاج ہے روایت اور جدّت کا۔ اور یہی وہ خوبی ہے جس نے مجاز کو ایک ممتاز مقام دیا ہے۔

آہنگ کا یہ ایڈیشن جو $\frac{22 \times 18}{8}$ سائز کے ۲۱۶ صفحات پر شائع ہوا ہے مجاز کے ۱۹۵۲ء تک کے کہے ہوئے کلام پر مشتمل ہے۔ شروع میں فیض احمد فیض کا دیباچہ شامل ہے جس میں آپ لکھتے ہیں:۔ ''مجاز بنیادی طور پر اور طبعاً غنائی شاعر ہے، اس کے کلام میں خطیب کے نطق کی کڑک نہیں، باغی کے دل کی آگ نہیں، نغمہ سنج کے گلے کا وفور ہے۔ یہی وفور مجاز کے شعر کی سب سے بڑی خوبی ہے اور اس شعر کی کامیابی کا سب سے بڑا امین۔ بیچ کے ایک مختصر سے دَور کے علاوہ مجاز ہمیشہ سے گاتا رہا ہے۔ اس کے نغموں کی نوعیت بدلتی رہی لیکن اُس کے آہنگ میں فرق نہ آیا۔''

جہاں تک کتاب کے حُسنِ ظاہر کا تعلّق ہے آزاد کتاب گھر کا نام ہی اس امر کی ضمانت ہے کہ یہ مجموعہ پیش کرتے وقت اشاعت کے ایک بلند معیار کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ کاغذ، کتابت، طباعت تینوں دیدہ زیب ہیں۔ جلد خوشنما اور رنگیں اور سرورق جاذبِ نظر ہے قیمت چار روپے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی۔

گلشن مجموعہ ہے مسٹر کشور ساہو کی کہانیوں کا جو جناب امانت ہلال نے ہندی سے اُردو میں منتقل کی ہیں۔ کشور ساہو کا نام فلمی دُنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ بیک وقت ایک کامیاب ڈائرکٹر، پروڈیوسر اور ایکٹر ہیں۔ یہ مجموعہ اُن کے ادبی کمالات پر مشتمل ہے۔ ہندی میں اس کے علاوہ آپ کی

متعدد کتابیں چھپ کر قبولِ عام کی سند حاصل کر چکی ہیں۔ زیرِ کتاب نظر کے بھی "ٹیسو پھول" کے نام سے ہندی میں تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اُردو کی دنیا میں آپ پہلی بار قدم رکھ رہے ہیں۔

یہ مجموعہ بارہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ تقریباً تمام افسانے اصلاحی اور اخلاقی پہلو لئے ہوئے ہیں۔ جس کی بدولت ان کی افادیت میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ عالمگیر محبت کا جذبہ ان افسانوں میں شروع سے آخر تک نظر آتا ہے۔ آپ ملک کی ہر قسم کی اجتماعی ترقی کے لئے ہندو مسلم اتحاد کو ایک ضروری بنیاد سمجھتے ہیں۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے صحت مند نظریے اس مجموعے میں جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔

جہاں تک ترجمے کا تعلق ہے امانت ملال صاحب نے بڑی محنت اور کاوش سے ہندی کو اُردو کا لباس پہنایا ہے۔ زبان رواں سلیس اور عام فہم ہے۔ ترجمے کی بڑی خوبی یہ ہے کہ پڑھتے وقت اس پر ترجمے کا گمان نہ ہوا اور مترجم نے اس مشکل مرحلے کو بڑی کامیابی سے عبور کیا ہے۔ ان تمام محاسن کے باعث اس بات کی پوری اُمید کی جاتی ہے کہ اُردو کی ادبی دنیا میں اس کتاب کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات۔ قیمت تین روپے۔ پبلشر ہندوستان چترا، جیمور بمبئی۔

"ساتھی" پٹنہ کا سالنامہ

ترتیب دینے والے:- غلام سرور، ولایت علی
عزیز ہاشمی اور اسد حسنین

"ساتھی" پٹنے کا ایک روزنامہ اخبار ہے جو قومی اور علمی و ادبی حلقوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ زیرِ نظر شمارہ اس کا سالنامہ ہے جسے ادارے نے بڑی محنت سے مرتب کیا ہے اور ہندوستان کے نامور شعراء ادباء اور افسانہ نگار حضرات کا تعاون حاصل کر کے اسے ایک مستقل حیثیت کے ادبی تحفے کی صورت دے دی ہے۔ ادارے میں جن حضرات کے نام نظر آ رہے ہیں یہ بہار میں اُردو کی ترقی کیلئے بے غرض اور ان تھک کام کرنے والے نوجوان ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کی زیرِ نگرانی "ساتھی" مسلسل ترقی کرتا جائے گا اور اس قسم کے خاص نمبر اکثر دیکھنے میں آئیں گے۔ ضخامت قریباً سو صفحات۔ سائز ۳۰×۲۰/۴۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:- دفتر ساتھی روزنامہ پٹنہ ۴

بنتِ راوی کا سالنامہ

یہ خواتین کا ایک پانزدہ روزہ جریدہ ہے۔ جو جناب ابو سعید بزمی مرحوم کی یاد میں لاہور سے محترمہ ادیبہ بزمی، محترمہ سعیدہ اسلم اور محترمہ عقیلہ شاہین کی زیرِ ادارت باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس شمارے میں اُردو کے نامور فن کاروں کے مضامین، نظمیں، غزلیں اور افسانے موجود ہیں۔ ضخامت ۸۴ صفحات قیمت چار آنے۔ ملنے کا پتہ:- اے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور (پاکستان)

غیر ممالک میں بھارتی طلباء

بھارت سرکار کی توجہ بھارتی اخبارات کی اُن آراء کی طرف دلائی گئی ہے جن میں کہا گیا ہے کہ آسٹریلیا کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے والے کچھ بھارتی طلباء نے قابلیت کا ثبوت نہیں دیا۔ ماہ اپریل ۱۹۵۱ء تک بھارت سرکار کی طرف سے کسی بھی طالب علم کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے آسٹریلیا نہیں بھیجا گیا تھا۔ اور اس کے بعد جو تھوڑے بہت طلباء بھیجے گئے اُن کی اچھی رپورٹ ملی۔ بھارت سرکار اس بات کو واضح کر دینا چاہتی ہے۔ کہ حکومت کی طرف سے وظائف کی اسکیموں کے تحت جن طلباء کو سمندر پار ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا جاتا ہے اُن کا انتخاب ہندوستان کے بہترین طلباء میں سے کیا جاتا ہے۔ انتخاب سے پہلے ان اسکیموں کو وسیع پیمانے پر مشتہر کیا جاتا ہے اور انتخاب خاص کمیٹیوں اور بورڈوں کے ذریعے سے عمل میں لایا جاتا ہے۔ یہ طلباء غیر ممالک میں جن پروفیسروں کے تحت کام کرتے ہیں اُنھوں نے ان کی بڑی تعریف کی ہے۔

بھارت سرکار کی طرف سے عام طور پر غیر ممالک میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے جانے والے پرائیویٹ طالب علموں پر کسی قسم کی پابندیاں عائد نہیں کی جاتیں۔ بشرطیکہ انھوں نے منظور شدہ یونیورسٹیوں یا اداروں میں داخل ہونے کی منظوری حاصل کر لی ہو اور تعلیم مکمل کرنے کے لئے اُن کے مالی انتظامات تسلی بخش ہوں۔ ایسے پرائیویٹ طلباء کے لئے بھارت سرکار کی معرفت درخواستیں بھیجنا بھی ضروری نہیں اور وہ عام طور پر غیر ملکوں کے متعلقہ اداروں سے براہِ راست خط و کتابت کے ذریعے سے ہی وہاں داخل ہونے کی منظوری حاصل کر لیتے ہیں۔ اس لئے ایسے طالب علموں کی درخواستوں کی اچھی طرح سے چھان بین کرنا اور متعلقہ نصاب کے لئے اُن کی موزونیت یا غیر موزونیت کا فیصلہ کرنا ان غیر ملکی یونیورسٹیوں یا اداروں کا کام ہے۔

آسٹریلیا کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے والے جن طلباء کے بارے میں یہ خبریں شائع ہوئی ہیں کہ انھوں نے وہاں اپنی قابلیت کا ثبوت نہیں دیا۔ انھیں بھارت سرکار کی طرف سے منتخب کر کے یا سرکار کی کسی اسکیم کے تحت وہاں نہیں بھیجا گیا تھا۔ یہ طلباء وہاں نجی طور پر تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور آسٹریلیا کی یونیورسٹیوں نے انھیں براہ راست خط و کتابت کے نتیجے کے طور پر داخل کیا تھا۔

ہیراکڈ ڈیم

ہیرکڈ کے ارد گرد برسات کے دنوں میں اس قدر بارش ہوتی ہے کہ دریائے مہاندی کا پانی بے محیط ہو جاتا ہے۔ ویسے تو پانی کی بہتات ریاست میں چاول کی فصلوں کے لئے بہت مفید ہے۔ کیونکہ اس سے زمین میں مزروری نمی قائم رہتی ہے۔ لیکن یہ بہتات صرف برسات کے چار ماہ کے بعد ختم ہو جاتی ہے، اور اس عرصہ میں بھی اس کی تقسیم اکثر غیر مساوی ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سال میں آٹھ مہینے پانی کی کمی رہتی ہے اور زمین دوسری فصل پیدا نہیں کر پاتی۔

اڑیسہ میں تین بڑے دریا ہیں۔ مہاندی۔ برہمنی اور بیتارنی۔ یہ تینوں ہر سال دس کروڑ ستر لاکھ ایکڑ فٹ پانی سمندر میں ڈال دیتے ہیں۔ مہاندی مدھیہ پردیش میں ضلع رائے پور کے دکھن پچھم سے سہاوا سے نکلتا ہے۔ اور کل پانچ سو تینتیس میل لمبا ہے۔ اڑیسہ کے دریاؤں کے پانی کو باندھنے اور اس طرح ریاست کی زراعت کا تحفظ کرنے کے متعلق پچھلے قریباً ایک سو سال سے تجویزیں ہو رہی ہیں۔

مہاندی کے پانی سے پورا فائدہ اُٹھانے کے لئے انجینئروں نے اس پر تین بند باندھنے کی تجویز کی تھی۔ ان میں سے سامبل پور کے نزدیک ہیراکڈ ڈیم کو سب سے پہلے تعمیر کرنے کے لئے چُنا گیا ہے۔ کیونکہ اس سے سب سے جلدی نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔

اس ڈیم کے لئے بھارت سرکار کی طرف سے ۴۹-۱۹۴۸ء سے ۵۲-۱۹۵۱ء تک حکومت اڑیسہ کو سولہ کروڑ ستائیس لاکھ روپیہ قرض دیا گیا۔

اس ڈیم کے خاص مشینوں سے پختہ کی گئی مٹی سے مہاندی پر تین میل لمبا بند باندھا جائے گا۔ دریا میں اس بند کی زیادہ سے زیادہ اونچائی ایک سو چھانوے فٹ ہو گی۔ یہ دنیا کے سب سے لمبے پشتوں میں شامل ہو گا۔ اس کے دونوں طرف مٹی کے اونچے اونچے پشتے ہوں گے۔ جن کی بالائی سطح پر پانی کا ذخیرہ کیا جائے گا۔ یہ دونوں پشتے کل سترہ میل لمبے ہوں گے۔

ہیرکڈ جھیل کا علاقہ ڈیڑھ لاکھ ایکڑ ہو گا اور ساحل ایک سو پچپن میل۔ اس جھیل کا پانی استعمال کرتے وقت یہ خیال رکھا جائے گا کہ اس کا ایک تہائی پانی اس میں ہمیشہ رہے۔ تاکہ بجلی گھر کے مسلسل عمل کے لئے کافی پانی میسر رہے۔ ہیراکڈ کے بجلی کے کارخانوں کو نزدیک کے ایسے کارخانوں مثلاً دامودر ویلی اسکیم اور مچ کنڈ سے ملایا جائے گا۔ تاکہ متعلقہ علاقوں کو برابر بجلی ملتی رہے۔

مٹی کے بند اور پشتوں کے لئے جو مٹی کھودی اور بھری جائے گی اُس کے لئے ستر کروڑ مکعب فٹ سے بھی زیادہ مٹی کی ضرورت ہو گی۔ یہ مقدار اتنی ہے کہ اس سے دہلی سے راس کماری تک کے چودہ سو میل پر دس فٹ اونچا اور اوسطاً دس فٹ موٹا مٹی کا بند تیار ہو سکتا ہے۔ مٹی کی اتنی بڑی مقدار کو ہاتھ کی محنت سے ہی حاصل کرنا امر محال ہے۔ اس لئے وہاں ایک وسیع علاقہ میں جدید قسم کی بڑی بڑی مشینیں لگائی گئی ہیں۔ مشینوں کے علاوہ تیس ہزار مزدور بھی کام کر رہے ہیں۔

ہیراکڈ ڈیم کی تعمیر ۱۹۴۸ء میں شروع ہوئی تھی۔ اس تعمیر کی رفتار ترقی اب تک بڑی اچھی رہی ہے۔ مٹی کے وسیع پشتے مکمل ہو چکے ہیں اور نہر کے لئے ساڑھے تین سو میل کھدائی ہو چکی ہے۔

اس منصوبہ کو جون ۱۹۵۶ء میں مکمل کرنے کا پروگرام ہے۔ لیکن امید ہے کہ جون ۱۹۵۵ء تک اتنا کام ہو جائے گا کہ کچھ بجلی اور پانی کی فراہمی ممکن ہو جائے گی۔ ہیراکڈ سے آبپاشی میں جو اضافہ ہو گا اس سے ساڑھے سات لاکھ ٹن مزید اناج اور تین لاکھ ٹن مزید گنا پیدا ہونے کی توقع ہے۔

JUPITER PICTURES
ہزار اداؤں والی
نازنین
۱۰ر اکتوبر سے
اوڈین - نیو دہلی
جوبلی اور کھنہ - دہلی
جے ہند اور نگار - کانپور
نشاط - لکھنؤ
موتی محل - الہ آباد
نشاط ٹاکیز - بنارس
پربھات ٹاکیز - ڈیرہ دون
کنور تھیئیٹرز - مراد آباد
کمار ٹاکیز - بریلی
اور
اس کے علاوہ دوسری
جگہوں پر بھی ریلیز ہو
رہی ہے
جوپیٹر کا شاہکار
رانی
ہندی زبان میں
اداکار
بھانومتی
انوپ کمار
راجہ
وہاب کاشمیری
ڈائرکشن
پرساد
سٹوڈیو: پینچون
جاری کردہ:- آل انڈیا فلم ڈسٹری بیوٹرز دہلی

Regd. No. E P - 689

مضطر لکھوڑوی

بچّوں کا گیت

بھارت کے ہم راج دُلارے
بھارت کی آنکھوں کے تارے
دیش کی مایا دیش کی دَولت
آنکھ کی ٹھنڈک دِل کی راحت
قوم کا جیون قوم کی آشا
اُمّیدوں کی سُندر دُنیا
ہم سے میلے ہم سے دَنگل
ہم سے ہے جَنگل بیں مَنگل
اپنی بہاریں اپنے نظارے
ہرے بھرے یہ کھیت ہمارے
قصبے اور دیہات ہیں اپنے
شہر اور باغات ہیں اپنے
فیکٹریاں اور مِل ہیں اپنے
اپنے ہیں یہ محل اور بنگلے
ہر شے میں ہے رنگِ محبّت
ہر شے پر ہے اپنی حکومت
آگے بڑھیں گے ہو کر یکدل
قدم قدم اور منزِل منزِل

دیش کا بار اُٹھائیں گے ہم
دیش کی شان بڑھائیں گے ہم

ایم۔ اے۔ واحد

کانچ کی آنکھیں

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مچھلیوں کا بادشاہ بہت بیمار ہو گیا۔ تمام سمندری ڈاکٹروں کو بلایا گیا۔ سب نے مل کر بادشاہ کے مرض کو جاننے کی کوشش کی تاکہ مرض کی کچھ دوا کی جا سکے۔ لیکن کسی نے بھی یہ نہ جانا کہ آخر بادشاہ کو کیا مرض ہے۔

ایک مرتبہ تمام مچھلیاں بادشاہ کی بیماری کے متعلق آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ ایک کچھوا بھی قریب ہی پہاڑ کے شگاف سے سر نکالے جھانک رہا تھا۔ کچھوے نے شیخی میں آ کر کہا۔ اگر بادشاہ کو ایک زندہ خرگوش کی آنکھ کھلائی جائے تو وہ دوبارہ کامل صحت مند ہو سکتا ہے۔

کچھوے نے یہ رائے صرف اس لئے ہی نہیں دی تھی کہ وہ اس معاملے کے متعلق سب کچھ جانتا تھا بلکہ وہ اپنے آپ کو سب سے زیادہ عقلمند ثابت کرنا چاہتا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ بادشاہ کا بیٹا بھی ان مچھلیوں کے گروہ میں موجود تھا۔ کچھوے کی بات سنتے ہی وہ تیزی سے تیرتا ہوا گھر پہنچا اور بادشاہ کو یہ خوش خبری سنادی۔ بادشاہ خوش ہوا اور کچھوے کو فوراً حاضر کرنے کا حکم دیا۔
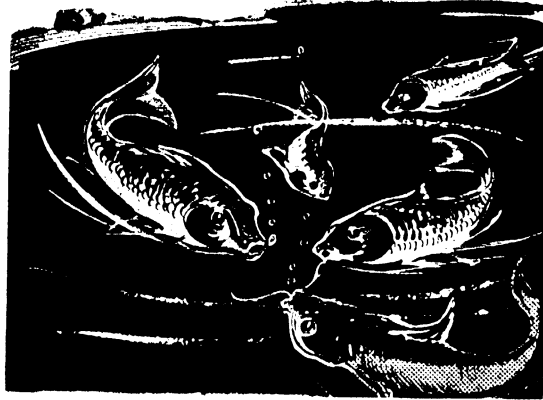
جب کچھوے کو ایلچی نے یہ اطلاع دی کہ بادشاہ نے اسے طلب کیا ہے تو کچھوا بہت ڈرا۔ اپنی دُم اور سر سخت خول میں چھپا لیا اور اس طرح بہانہ کر کے پڑا رہا جیسے وہ سو رہا ہے۔ لیکن بادشاہ کے حکم کی تعمیل ضروری تھی۔ اس لئے وہ بادشاہ کے پاس جانے کے لئے رضامند ہو گیا اور وہ دونوں بہت جلد بادشاہ کے محل میں پہنچ گئے اور کچھوے کو اس مقام پر پہنچا دیا گیا جہاں کہ بادشاہ ایک سمندری گھاس کے بنے ہوئے بستر پر لیٹا تھا۔ بادشاہ بہت زیادہ بیمار دکھائی دے رہا تھا۔ اور اس کے آس پاس ڈاکٹر جمع تھے۔

بادشاہ نے کچھوے کی طرف دیکھا اور کمزور آواز میں کہنے لگا۔ "کہو دوست کیا یہ سچ ہے کہ تم مجھے صحت بخش سکتے ہو"۔ کچھوے نے ڈرتے ہوئے کہا۔ "ہاں سرکار میں نے جو کچھ کہا بالکل سچ ہے"۔ یہ سن کر بادشاہ بہت خوش ہوا اور حکم دیا۔ "فوراً جاؤ! ایک زندہ خرگوش کو پکڑ لاؤ"۔ جب کچھوے نے یہ حکم سنا تو کسی قدر مایوس ہوا کیونکہ ایک زندہ خرگوش کو سمندر کی تہ میں لے جانا آسان کام نہیں تھا لیکن

بادشاہ کے ڈر سے انکار کرنے کی ہمت نہ ہوئی ۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے کہیں ایک شگاف مل جائے اور وہ اپنے آپ چھپالے ۔ پھر دوبارہ کسی کو دکھائی نہ دے ۔ اس خیال کے آتے ہی وہ جلدی جلدی رینگتا ہوا ایک طرف کو چل پڑا ۔

یکایک اسے یاد آیا کہ ایک بار خرگوش کو پہاڑی پر اچھلتے کودتے دیکھا تھا ۔ چنانچہ وہ خرگوش کی تلاش میں روانہ ہوا ۔ وہ رینگتا ہوا سمندر کے باہر نکل گیا اور پہاڑی پر چڑھنا شروع کیا ۔ تھوڑی دیر بعد وہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گیا ۔ میاں کچھوے انتظار میں بیٹھے تھے کہ خرگوش ادھر سے پھدکتا پھدکتا آموجود ہوا ۔

"آداب عرض ہے"۔ خرگوش نے کہا ۔ کچھوے نے جواب دیا "آداب عرض ہے میاں خرگوش ۔ آداب عرض ہے" ۔

"میاں خرگوش تم سمندر سے اتنی دور پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھے کیا کر رہے ہو" کچھوے نے پوچھا ۔ آہو ہو ۔ کچھوے نے کہا "میں صرف اس لئے یہاں آیا ہوں کہ آخر دیکھوں تو یہ ہری بھری دنیا کیسی دکھائی دیتی ہے ۔ اچھا خیر یہ منظر اتنا برا تو نہیں لیکن تمہیں بھی یہ دیکھنا چاہئے کہ کتنے خوبصورت محلات اور کیسے ہرے بھرے باغ ہماری سمندری دنیا میں موجود ہیں" ۔ یہ سن کر خرگوش کے دل میں سمندری دنیا کو دیکھنے کی خواہش گدگدانے لگی ۔ خرگوش نے پوچھا ۔ کیا یہ میرے لئے بہت مشکل ہے کہ میں سمندر کی تہ میں جا کر تمہاری دنیا دیکھ سکوں ؟ "آہو ہو ۔ نہیں نہیں" ۔ کچھوے نے جواب دیا ۔ "اگر تم چاہو تو میں تمہیں اپنی پیٹھ پر بٹھا کر سمندر کی تہ میں لے جاؤں ۔ وہاں تم خود دیکھ لوگے میں نے جو کچھ کہا ہے وہ کس حد تک صحیح ہے ۔ خرگوش کچھوے کی پیٹھ پر سوار پانی میں سے گزرتے ہوئے سمندر کی انتہائی تہ میں جا پہنچا ۔ اور وہاں کی عجیب وغریب چیزوں کو دیکھ کر خوش ہونے لگا ۔ تمام خوبصورت محلات اور باغات کو دیکھ کر بے حد تعجب ہوا ۔

میاں کچھوا خرگوش کو سیدھا بادشاہ کے محل کی طرف لے گیا اور خرگوش سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اس کی پیٹھ پر سے اتر جائے اور اس کا انتظار کرے ۔ کچھوا جاتے جاتے یہ وعدہ بھی کر گیا کہ وہ اپنے بادشاہ کو پوری شان وشوکت کے ساتھ دکھائے گا

لیکن جب کچھوا جا چکا تو خرگوش نے دوسرے کمرے میں دو مچھلیوں کو آپس میں بات چیت کرتے سنا ۔ اس نے اپنے دونوں کان کھڑے کر دئے اور ان کی گفتگو سننے لگا ۔ جب سنا کہ اس کی آنکھیں نکال کر بادشاہ کے سامنے پیش کی جائیں گی تو بہت خوفزدہ ہوا اور گہری سوچ میں مبتلا ہو گیا کہ اس مصیبت سے کیوں کر چھٹکارا پایا جا سکتا ہے ۔

اتنے میں میاں کچھوے واپس لوٹے اور ان کے ساتھ ایک سردار مچھلی بھی تھی ۔ خرگوش فوراً بول اٹھا ۔ "بہت خوب! بہت خوب!! یہاں کی ہر چیز خوبصورت اور بہترین دکھائی دیتی ہے ۔ مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے لیکن ساتھ ساتھ افسوس اس بات کا ہے کہ میں اپنی اصلی

آنکھیں ساتھ نہیں لایا۔ ورنہ آپ کی اس خوبصورت دنیا کی ہر چیز کو اور اچھے طریقے پر دیکھ سکتا۔ تم اس وقت میری جو آنکھیں دیکھ رہے ہو وہ اصلی نہیں بلکہ کانچ کی بنی ہوئی ہیں۔ میں اپنی آنکھوں کو نقصان پہنچنے اور گرد آلود ہونے کا اتنا احتیاط کرتا ہوں کہ ان کو خاص طور پر کسی محفوظ مقام پر رکھ دیتا ہوں اور ان کی بجائے یہ "کانچ کی آنکھیں" پہن لیتا ہوں۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ واقعی یہاں کتنی عجیب و غریب چیزیں دیکھنے کے قابل ہیں تو یقیناً میں اپنی اصلی آنکھیں ساتھ لاتا"۔
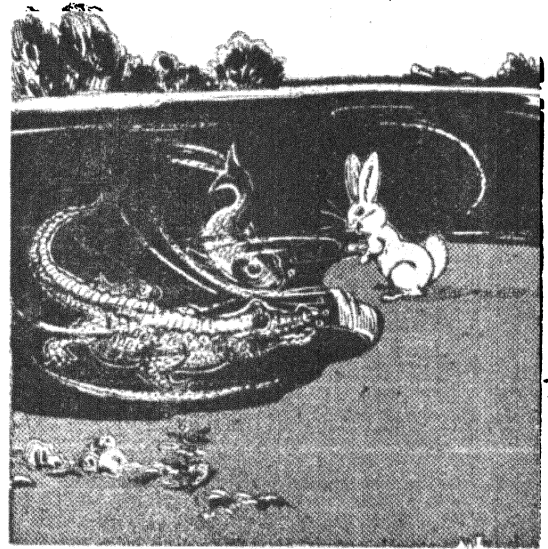
جب کچھوے اور اس کے سردار نے یہ سُنا تو وہ بالکل ناامید ہو گئے کیونکہ حقیقت میں وہ خرگوش کی اصلی آنکھیں نہیں بلکہ کانچ کی آنکھیں تھیں۔

کچھوے نے کہا "میاں خرگوش میں تمہیں کنارے پر واپس لے جاتا ہوں اور تم اپنے گھر جا کر اصلی آنکھیں پہن کر واپس لوٹ آؤ۔ کیونکہ ابھی تو یہاں بہت سی خوبصورت چیزیں دیکھنا باقی ہیں جو تمہاری دنیا میں نہیں۔ اور ہاں تم نے تو ابھی ہمارے بادشاہ کو دیکھا ہی نہیں۔ ان سے مل کر تم بہت خوش ہوگے"۔

خرگوش بھی یہی چاہتا تھا۔ بہت اچھا کہہ کر کچھوے کی پیٹھ پر سوار ہو گیا اور کچھوا تیرتا ہوا سمندر کے کنارے آ پہنچا۔ جوں ہی وہ سمندر کے کنارے پر پہنچے۔ خرگوش نے کچھوے کی پیٹھ پر سے ایک چھلانگ ماری اور تیز دوڑتا ہوا کچھوے کی نظروں سے غائب ہو گیا۔ وہ بہت خوش ہوا کہ کچھوا اس کو اپنے جال میں نہ پھنسا سکا۔ اب خطرہ دُور ہو چکا تھا۔ کچھوے نے خرگوش کا بہت انتظار کیا لیکن وہ پھر کبھی واپس نہ آیا۔ آخر کار کچھوا اپنا سا مُنہ لے کر گھر واپس لوٹ آیا۔

بچو! دیکھا تم نے کہ کچھوا اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ عقلمند ثابت کرنا چاہتا تھا لیکن اسے خرگوش کی چالاکی نے بادشاہ اور دوسرے درباریوں کے سامنے کس قدر شرمندہ کیا۔

پریم داس کا پریم

وقت مقررہ پر پریم داس کے تمام دوست تشریف لائے۔ پریم داس نے اپنے دوستوں کو تمباکو پینے میں مشغول رکھا۔ خود اپنے دوستوں کی جوتیاں سمیٹ کر بازار میں فروخت کر دیں۔ جوتے بیچ کر جو پیسے آئے ان سے اس نے دعوت کے لئے کھانے پینے کی چیزیں خریدیں۔ یار دوستوں کو پُرتکلف دعوت دی گئی۔

گرمی کے دن تھے۔ کڑاکے کی دُھوپ تھی۔ ادھر دوست کھانے میں معروف ہیں اور اُدھر پریم داس پنکھا جھل رہے ہیں۔ دوستوں نے کہا "پریم داس کیوں تکلیف کر رہے ہو۔ رہنے دو پنکھے کو"۔

پریم داس نے جواب میں کہا "کوئی بات نہیں۔ پریم داس کا صرف پریم ہی پریم ہے۔ باقی سب آپ کے جُوتوں کی خیرات"۔

رادھا کرشن ہنڈو

شوکمار

لوکمانیہ بال گنگادھر تلک

بھارت کے جن لیڈروں نے دیش کو آزاد کرانے میں سب سے زیادہ حصہ لیا اور جو صحیح معنوں میں تحریکِ آزادی کے بانی تھے اُن میں لوک مانیہ بال گنگادھر تلک کا نام سب سے پہلے نمبر پر ہے نہ صرف اُنہوں نے یہ نعرہ پہلی مرتبہ لگایا کہ "سوراجیہ ہمارا پیدائشی حق ہے" بلکہ کانگرس کو عوام کی جماعت بنانے میں سب سے زیادہ ہاتھ تلک مہاراج کا ہی تھا۔

آغاز میں کانگرس چند سیاست دانوں کے ہاتھ میں تھی جو سال میں ایک مرتبہ اکٹھے ہو کر چند ریزولیوشن پاس کر دیا کرتے تھے۔ یہ لوکمانیہ ہی تھے جنہوں نے کانگرس کو جنتا کے ہاتھ میں دے کر اُسے ایک جیتی جاگتی جماعت بنا دیا۔ پیارے بچو آج ہم ان کی زندگی کے کچھ سبق آموز حالات آپ کے سامنے رکھیں گے۔

آپ کا جنم ۱۸۵۶ء میں ہوا۔ والد ایک غریب برہمن تھے لیکن تلک کو شروع ہی سے تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا چنانچہ ۱۸۷۶ء میں آپ نے بی۔ اے کا امتحان اوّل درجے میں پاس کیا۔ دیش سیوا کا جذبہ آپ کو گھٹی میں ملا تھا اس لئے آپ نے ایک سکول میں ماسٹر بن کر بچوں کو دیش بھگتی کی تعلیم دینی شروع کی۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے دو اخبار 'کیسری' اور 'مرہٹہ' بھی جاری کر دئے۔ ان اخباروں کو کامیاب بنانے میں آپ کو بہت زیادہ محنت کرنی پڑتی تھی۔ آپ اپنے کندھوں پر ٹائپ اُٹھا کر پریس لے جاتے۔ اخبار چھپنے کے بعد خریداروں کے گھروں میں خود جا کر بانٹتے اور جب تک اخبار کی اشاعت تین ہزار تک نہ پہنچ گئی آپ خریداروں کے پتے بھی اپنے ہاتھ سے لکھتے رہے۔ ان اخباروں کے ذریعے آپ نے عوام میں بیداری اور حب الوطنی کی روح پھونک دی اور یہ سب کچھ آپ کی محنت کا پھل تھا۔ پیارے بچو ہمیں بھی چاہیئے کہ ہم زیادہ محنت کرنے کی عادت ڈالیں۔ زندگی میں کامیاب ہونے کا یہ ایک کلیدی اصول ہے۔

تلک مہاراج میں دوسری بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ جنتا کی سیوا کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ ۱۸۹۲ء میں مہاراشٹر میں قحط پڑا۔ آپ نے قحط زدگان کی سیوا میں رات دن ایک کر دیا

اور اناج کو بھوکوں تک پہنچانے کا کام کرتے رہے۔ ۱۸۹۷ء میں صوبے میں پلیگ کی بیماری پھیلی اُس وقت ہندوستان میں یہ وبا پہلی بار نمودار ہوئی تھی۔ اس لئے لوگوں میں بڑی دہشت پھیلی۔ تلک مہاراج نے گاؤں گاؤں گھومنا اور لوگوں کو دوائیں دینا شروع کر دیا جس سے عوام کو کافی ڈھارس ملی غرضیکہ جب بھی جنتا پر کوئی مصیبت آئی آپ نے اپنی ساری توجہ اس ہی کی طرف لگا دی۔ جس کی وجہ سے آپ عوام میں ہردلعزیز اور مقبول ہوگئے اور اسی وجہ سے آپ کا نام لوک مانیہ پڑ گیا۔ ہم کو بھی تلک مہاراج کی اس خوبی سے سبق حاصل کرنا چاہیئے اور جہاں تک ہوسکے غریب اور لاچار لوگوں کی خدمت کرنی چاہیئے۔

تیسرا بڑا وصف لوک مانیہ تلک میں یہ تھا کہ سچائی کے لیئے اور عوام کی خدمت کرتے ہوئے وہ کسی قسم کا ڈر دل میں نہیں لاتے تھے اور بڑی سے بڑی قربانی کرنے سے نہیں گھبراتے تھے۔ سب سے پہلے ریاست کولہاپور کے برطانوی ریذیڈنٹ کی ایک ناجائز کارروائی کے خلاف آپ نے اپنے اخبار میں آواز اُٹھائی۔ آپ پر اس سلسلے میں ہتک عزّت کا مقدمہ چلا جس میں آپ کو چار ماہ قید کی سزا ملی۔ لوک مانیہ کی جیل یاترا کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ اس کے بعد ۱۸۹۷ء میں کیسری میں شائع شدہ ایک مضمون کی بنا پر آپ کو پھر گرفتار کیا گیا۔ اس مقدمے سے لوگوں میں خوب جوش وخروش پھیلا اور لوگوں نے دل وجان سے اس مقدمے کی پیروی کی مگر حکومت نے آپ کو ڈیڑھ سال قید سخت کی سزا دی۔ حکومت کی طرف سے کوشش کی گئی کہ آپ اس کے خلاف کچھ نہ لکھنے کا اقرار کریں تو آپ کو رہا کر دیا جائے لیکن آپ نے کسی شرط کے تحت رہا ہونے سے انکار کر دیا۔ ۱۹۰۷ء میں تقسیم بنگال کے سلسلے میں آپ نے حکومت کے تشدّد کی مذمت کی اس پر آپ کے خلاف بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا اور کالے پانی کی سزا دی گئی۔ جیل میں آپ پر اس قدر سختیاں کی گئیں کہ دس دنوں میں آپ کا وزن ۱۰ پونڈ کم ہوگیا مگر آپ نے یہ تمام سختیاں ہنستے ہنستے جھیلیں اور ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں چھ سال گزار دئے۔ اسی قید کے دوران میں آپ نے "گیتا رہسیہ" نامی کتاب لکھی جس نے آپ کی قابلیت کی دھاک دُنیا بھر میں بٹھا دی۔

پیارے بچّو یہ قربانی اور تیاگ کا جذبہ ہی ہے جو انسان کی شہرت کو آسمان تک پہنچا دیتا ہے۔ اگر آپ کو بڑا بننا ہے تو عہد کرو کہ سچائی اور اصول کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کرنے سے دریغ نہیں کروگے۔

۱۹۱۹ء میں بھگوان تلک جلیاں والے باغ کے قتل عام کے بعد امرتسر میں کانگرس کے اجلاس میں شامل ہوئے۔ اور ۱۳ رجولائی ۱۹۲۰ء میں ۶۴ سال کی عمر میں سورگباش ہو گئے۔ آپ کی وفات پر ہندوستان کے کونے کونے میں ماتم منایا گیا اور ہڑتال کی گئی۔ ہر سال بھارت میں تلک مہاراج کی برسی منائی جاتی ہے اور اس موقعہ پر آپ کی دیش کے تئیں سیوا اور قربانی کا ذکر ہوتا ہے۔ دراصل ہندوستان کے لئے لوک مانیہ تلک کی خدمات اس قدر زیادہ ہیں کہ وہ بُھلائی نہیں جاسکتیں۔

لطیفہ

موہن۔ آپ ہفتے میں کتنی بار حجامت کرتے ہیں؟

کریم۔ تقریباً ایک سو بار۔

موہن۔ آپ تو مذاق کر رہے ہیں۔

کریم۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں ایک حجام کے پاس ملازم ہوں۔

گدھے کے کان

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جبکہ جنگلی جانوروں کے نام وغیرہ نہیں تھے ۔ سارے جنگل میں شیر حکمرانی کرتا تھا۔ وہی سیاہ وسفید کا مالک تھا۔سب جانور شیر بادشاہ سے بہت ڈرتے تھے ۔

ایک بار بادشاہ کے دل میں خیال آیا کہ سب جانوروں کا کوئی نہ کوئی نام مقرر کر دینا چاہیئے۔تا کہ انہیں بُلانے وغیرہ میں آسانی ہو جائے ۔

بس پھر کیا تھا۔بادشاہ سلامت نے نام رکھنے کے لئے ایک بڑے جشن کا اعلان کر دیا۔ اور حکم دے دیا کہ جو درندہ چرندہ اس موقعے پر حاضر نہیں ہوگا۔اُسے سب کے سامنے قتل کر دیا جائے گا ۔

وقت مقررہ پر سب جانور ایک بڑے جنگل میں اکٹھے ہو گئے۔سب سے پہلے جہاں پناہ نے اپنا نام "شیر" رکھا۔ اپنے وزیر کو "لومڑی" کے نام سے پُکارا ۔اس کے بعد چیتا' ہاتھی۔ریچھ۔گیدڑ۔خرگوش۔بھیڑیا۔گھوڑا۔گدھا۔بندر اور بیل وغیرہ نام مختلف جانوروں کے لیئے تجویز کیئے گئے ۔جب سب جانوروں کو اپنے اپنے نام بتا دئے گئے تو بادشاہ سلامت نے کہا۔"آپ اپنے نام زبانی یاد کرلیں۔کل اسی وقت سب کو اپنے اپنے نام بتانے پڑیں گے ۔اگر کسی کو اپنا نام بھول گیا تو وہ سزا دوں گا کہ ساری عمر یاد کروگے" ۔

اگلے دن سب نے اپنے اپنے نام سُنانے شروع کر دئے چیتا ۔ہاتھی ۔ بندر۔گورخر۔کتّا۔بلّی۔بیل۔گائے۔گھوڑا اور خرگوش وغیرہ سب نے اپنے اپنے نام بتا دئے۔جب گدھے کی باری آئی ۔ تو وہ اپنا نام بھول گیا۔بادشاہ سلامت کے دریافت کرنے پر بھی وہ خاموش کھڑا رہا۔

بادشاہ سلامت نے غصّے میں آکر گدھے کے کانوں کو کھینچنا شروع کر دیا۔جب اس کے کان بالشت بھر لمبے ہو گئے۔تو اُنھوں نے کہا۔"ارے میاں تمہارا نام گدھا ہے ۔تین بار اپنا نام لو"۔

گدھے نے کانوں کو ہاتھ لگا کر تین بار کہا ۔ میں گدھا! میں گدھا!! میں گدھا!!! اور اُس دن کے بعد گدھے کو اپنا نام زبانی یاد ہے ۔ وہ دن اور آج کا دن گدھے کے کان سب جانوروں سے لمبے ہیں ۔ اور کم یادداشت والے شخص کو بھی گالی دیتے ہوئے گدھا کہہ دیا جاتا ہے ۔

عادت

مالکہ:۔ (نئی خادمہ سے) میں بہت کم بولتی ہوں ۔ جب ہاتھ کا اشارہ کروں تو سمجھ لو کہ میں تمہیں بُلا رہی ہوں ۔

نئی خادمہ:۔ مجھے بھی کم بولنے کی عادت ہے ۔ جب سر ہلا دوں تو سمجھ لیجیے کہ میں نہیں آنا چاہتی ۔

رام لبھایا سوز

دو مُفت خورے

دو تھے مفت خورے ـــــ دونوں بڑے چالاک اور چلتے پرزے تھے ۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے خرچ پر اپنا پیٹ پالا کرتے تھے ـــــ اور تھے بھی اس فن میں بڑے ماہر ۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ دونوں کو صبح سے کچھ بھی کھانے کو نہ ملا ۔ وہ بُھوک سے نڈھال ہو رہے تھے ۔ انتہائی کوشش کے باوجود بھی اس دن کوئی شکار نہ پھنسا ۔ دونوں نے غور و خوض کرنا شروع کیا ۔ کچھ دیر کے بعد ایک مُفت خورے نے اُچھل کر کہا ۔

"بس اب تو وارے نیارے ہیں"۔

اور پھر دونوں کچھ دیر تک کُھسر پُھسر کرتے رہے ـــ اور بعد ازاں ایک ہوٹل میں گُھس گئے ۔

بیرے کو آرڈر دیا گیا ۔ الگ الگ میزوں پر طرح طرح کے کھانے چُنے گئے ـــــ اور دونوں نے خُوب شکم سیر ہو کر کھایا ۔

ایک مُفت خورہ دوسرے سے پہلے ہی اُٹھ کر چلا گیا ۔ اور ہوٹل کے مالک کے پاس جا کر بولا "لالہ جی ! باقی پیسے دے دیجئے"۔

ہوٹل کا مالک حیرانی کے عالم میں بولا "باقی پیسے کیسے ؟ آپ نے تو ابھی تک کچھ بھی نہیں دیا"۔ مُفت خورے نے چیخ کر کہا۔ "ابھی تو آپ کو دو کا نوٹ دے کر گیا ہوں ۔ اب آپ کہہ رہے ہیں کہ میں نے کچھ بھی نہیں دیا ۔ اگر مجھے پہلے ہی علم ہوتا کہ تم اس قسم کے بے ایمان آدمی ہو ۔ تو میں ہرگز ہرگز اس جگہ نہ آتا"۔

ہوٹل کا مالک بولا ۔ "بابو صاحب آپ بُھول رہے ہیں ـــ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آپ نے ابھی تک کچھ بھی نہیں دیا"۔

مفت خورہ کہہ رہا تھا کہ میں دو روپے کا نوٹ دے کر گیا ۔ مگر ہوٹل کا مالک اس چیز سے صاف انکار کر رہا تھا ـــ ہوٹل کے اندر جھگڑے کی آوازیں سُن کر بہت سے لوگ ہوٹل میں گُھس آئے ۔

مفت خورے نے لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "دیکھئے صاحب ابھی اِن کو دو کا نوٹ دے کر گیا ہوں ـــ مگر اب یہ اس چیز سے صاف مُکر رہے ہیں ۔

ہوٹل کا مالک اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا ۔ دوسرا مفت خورہ بھی کمرے سے باہر نکل آیا اور ہوٹل کے مالک کے پاس جا کر بولا ۔ "لالہ جی ۔ دیکھنا کہیں اس شور و غل میں میرا پانچ کا نوٹ نہ بُھول جانا"۔

ہوٹل کا مالک بڑا حیران ہوا ۔ اس نے سوچا کہ اگر اس بار بھی کہہ دیا کہ یہ آدمی بھی مجھے نوٹ دے کر نہیں گیا ـــ تو لوگ مجھے ہی جُھوٹا کہیں گے ۔ اس لئے وہ بولا ۔

"آپ فکر مت کریں ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے"۔

چند منٹ بعد دونوں مُفت خورے ہوٹل سے کچھ فاصلے پر آپس میں روپے تقسیم کر رہے تھے

آجکل

دسمبر ۱۹۵۲ء

آٹھ آنے

آپ کے لئے پیش کیا ہم نے
راجکماری
کو چندریکھا میں
ہم نے آپ کے لئے پیش کیا
بھانومتی
کو
نشان اور منگلا میں
ہم نے آپ کے لئے پیش کیا
پشپ ولی
کو
سنسار میں
اور اب ہم پیش کرتے ھیں
پدمنی
کو مسٹر سمپت میں
یہ جیمنی کی تصویر ہے

دِن بہ دِن
ایک نئی دِلکشی،
ایک نئی رونق
Rexona
Rexona
رکسونا صابن کا کیڈُل،
ہی آپ کی جِلد کو زیادہ صاف
اور نرم و نازک رکھے گا۔ رکسونا
ہر روز استعمال کیجئے۔
رکسونا
کیڈُل، آمیز واحد صابن
جِلد کو ملائم بنانے والے تیلوں کے ایک خاص مرکب کا تکنیکی نام
رکسونا پروپرائٹری لیمیٹڈ کیلئے ہندوستان میں بنایا گیا
R.P. 67-60 UD
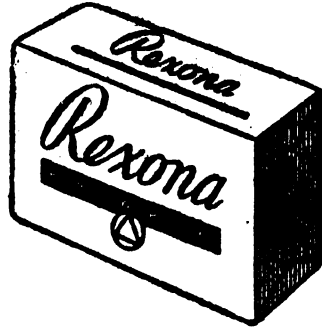
ترتیب

بچّوں کا آج کل

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر ـ جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر ـ بال مکند عرش ملسیانی

جگن ناتھ آزاد

جلد ۱۱ ــــــــ نمبر ۵

سالانہ چندہ ـ { ہندوستان میں ـ چھ روپے
پاکستان میں ـ چھ روپے }

غیر ممالک سے ــــــــ نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ ـ { ہندوستان میں ـ آٹھ آنے
پاکستان میں ـ آٹھ آنے }

دسمبر ۱۹۵۲ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ ـ دہلی

فضاء ابنِ فیضی

حُسن

حُسن کیا! نورِ ذاتِ صفات
ایک منظر نظر فریبِ حیات

حُسن، گلگوں، گداز، مہ پارا
دن کا خورشید، رات کا تارا

حُسن، فطرت کی ایک انگڑائی
کسی آذر کدے کی برنائی

حُسن، مکھڑے کا چاند، زلف کی رات
حُسن ہم آفتاب ہم ظلمات

حُسن، موجِ نسیم، کیفِ شراب
حُسن، لطفِ حیات، جوشِ شباب

حُسن کیا! سروِ قامتِ زیبا
لبِ تسنیم و سایۂ طوبا

حُسن، ظلمت بدوش و آئینہ فام
صبح کاشی کی ہے اودھ کی شام

حُسن، گلفام، یاسمیں تمثال
حُسن، بادِ سحر، نسیمِ شمال

حُسن، نغمہ، سرود، زمزمہ، راگ
کمسنی صبح کی ہے شب کا سہاگ

حُسن، نورس کلی، شگفتہ پھول
زلفِ پُرپیچ و طُرۂ مقتول

حُسن کیا! اسیر گاہِ اہلِ نظر
آشیانے میں بجلیوں کا گزر

حُسن، بنتِ سحاب و دخترِ ماہ
ایک فتنہ شباب کے ہمراہ

حُسن کیا! آبِ زلف و تابشِ رُو
لب کا اعجاز، آنکھ کا جادو

حُسن، سحرِ حلال و سحرِ طلسم
روحِ بجلی کی پھول کا سا جسم

حُسن کیا! شوخیٔ نظر کا کرم
آگ عارض کی گیسوؤں کا خم

حُسن، عارض کا "آتشیں پندار"
فاتحِ غزنوی و سنجر و زار

حُسن! جوشِ نشاطِ رامش و رنگ
نغمۂ ساز و دلنشیں آہنگ

حُسن، آذر کے بتکدے کا خلیل
بزمِ فطرت کا شاہکارِ جلیل

حُسن، تجلی سوادِ سینا کی
چھاؤں گرمی کی دھوپ سرما کی

حُسن، یزداں شکار، قدس فریب
خالقِ غمزۂ فراز و نشیب

حُسن، خوش وضعی و خوش آہنگی
روح کا ساز دل کی سارنگی

حُسن، انسان کا خدا ہونا
سیمِ طفلی، شباب کا سونا

حُسن، کمسن، سبک، ملائم، نرم
شوخیوں کا حریم، شوالۂ شرم

حُسن، معراج ہے عناصر کی
ایک فردوس ہے مناظر کی

حسن، عکسِ جمالِ ساغر و مُل
زعفران و بنفشہ و سنبل

حسن، برسات کا سہانا پن
پھول کی پنکھڑی کا ہلکا پن

حسن، شعر و فسانہ و افسوں
حسن، چشمِ سیہ، لبِ گلگوں

حسن، پازیب، گھونگھرو، خلخال
دامِ زلفِ دراز و دانۂ خال

حسن، محرابِ سینۂ و ابرو
ساعدِ مرمریں، دراز گلو

حسن، فردوسِ اختلاطِ کرم
حسن، زخمِ حیات کا مرہم

حسن، ارمان و آرزو کی اساس
زندگی کا لطیف تر احساس

حسن، دنیا کی نعمتِ ثابت
شہد ہونٹوں کا، آنکھ کا امرت

حسن، طاؤس، تیتری، جگنو
کبک، دراج، فاختہ، آہو

حسن، نارنج و فندق و عناب
غنچۂ انجم و گلِ مہتاب

حسن، مشکیں، ملیح، مہ پارا
شہد، شکّر، شراب، شہ پارا

حسن، خوشبو، خمارِ مے آشام
اوس، بجلی، سحاب، گردشِ جام

حسن، سیماب، سبزہ، سیم بدن
بانکپن، چھب، جھلک، ادائیں، پھبن

حسن، سوز و سرود و ساز و سرور
حسن، عطر و عبیر و عنبر و عود

حسن، نشّہ، نشاط، نوش، نشید
بچپنے کی ادا، شباب کی نیند

حسن، سرمست و سرکش و مخمور
کاجل، افشاں، مسی، حنا، سیندور

حسن، شیشہ، شراب، شمع، شعاع
عربدہ، امن، صلح، جنگ، نزاع

حسن، انگشتری، آئینہ، الماس
اک نئی صبح آفتاب کے پاس

حسن، قطعہ، رباعی، بیت، غزل
مشک، شیراز کی شراب میں حل

حسن، نہرِ زبیدہ، گنگا جل
ثمرِ قندِ حور، سیتا پھل

حسن، انجیلِ تازگیٔ جمال
مصحفِ رخ، صحیفۂ خد و خال

حسن، قرآنِ پاک کا پارا
آیتِ روی و سطرِ زلفِ دوتا

حسن، طلعت میں عرش کا تارا
یا زمیں پر نزول سورج کا

حسن، مہرِ رسالتِ صوری
حسن، نقشِ بلاغتِ نظری

حسن، رازِ درونِ ذات و صفات
شاہدِ زندگی، نگارِ حیات

حسن ہے نورِ قلبِ شاعر کا
چاند ہے مطلعِ مناظر کا

حسن، اک چاشنی حیات کی ہے
چاندنی صحنِ کائنات کی ہے

شکیل الرحمن

سہیل عظیم آبادی کی کہانیاں

۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۵ء تک اُردو کے جو ادیب بہت تیز لکھتے رہے ہیں اور اپنے سماجی ماحول کے ہر لمحہ سے متاثر ہوتے رہتے ہیں اُن میں سہیل عظیم آبادی کا بھی نام لیا جا سکتا ہے۔ سہیل عظیم آبادی نے اس مدت میں جو کہانیاں لکھی ہیں وہ اس لئے بھی اہم ہیں کہ وہ ماحول کی حقیقی تصویریں ہیں اور ان تصویروں میں حقیقی زندگی کے جو راز کھولے گئے ہیں اُن کا احساس پڑھنے والے کو فوراً ہوتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان رازوں سے جو تخلیق ہوتی ہے، پڑھنے والا اسے بھی اسی لمحہ محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح تخلیق میں ماحول کی جو حقیقتیں عیاں کی گئی ہیں انھیں بھی ہم محسوس کرتے ہیں اور ان چھپی ہوئی اور صاف صاف نظر آنے والی حقیقتوں میں جو تخلیق ہوتی ہے اُس کا بھی ہمیں اسی وقت اور اسی لمحہ احساس ہوتا ہے۔ سہیل عظیم آبادی کی کہانیوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے۔ ۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک سہیل عظیم آبادی نے جو کہانیاں لکھی ہیں اُن میں محسوس ہوتا ہے کہ وہ مظلوم انسانوں کی زندگی میں بہت بڑا انقلاب چاہتے ہیں۔ ان کہانیوں میں بڑی وسعت ہے اور انھیں پڑھتے ہوئے ہماری افسانہ نگار سے بہت ساری تمنّائیں وابستہ ہو جاتی ہیں۔

سہیل عظیم آبادی نے صوبہ بہار کے کسانوں اور اونچے طبقے کی کہانیاں لکھی ہیں کشمیر کے بہادر انسانوں کی کہانیاں لکھی ہیں اور حیدرآباد کے اونچے طبقے کی کمزوریوں کی کہانیاں لکھی ہیں۔ اور ان ساری کہانیوں میں جو پھیلاؤ اور زبان کا حسن نظر آتا ہے اور جانے پہچانے ہوئے ماحول کی جو تصویریں نظر آتی ہیں وہ بڑی غنیمت ہیں۔

سہیل صوبہ بہار کے ایک متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ جولائی ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے اور بہت عرصے تک اپنے خاص ماحول یعنی درمیانی طبقہ کے ماحول میں زندہ رہتے۔ چونکہ صوبہ بہار میں یہ طبقہ اپنے خاص رنگ میں بہت دنوں تک قائم نہیں رہ سکا ہے اور سہیل کا شعور زندگی کی رفتار اور حیات کی انگڑائیوں سے برابر متاثر ہو کر بالیدہ بنتا رہا ہے۔ اس لئے وہ اونچے اور نیچے طبقوں کی کشمکش کا اچھی طرح مطالعہ کر سکتے ہیں اور گہری طنز پیدا کر کے حقیقتوں کو عریاں کرتے رہے ہیں۔ ان کی کہانیوں کے دو مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ "الاؤ" مکتبۂ اردو نے شائع کیا تھا اور "نئے پرانے" عبدالحق اکادمی نے چھاپا تھا۔ کچھ کتابیں زیر طبع ہیں۔ "نئے پرانے" میں تقریباً تیرہ کہانیاں ہیں جس میں ان کی وہ کہانی شریک نہیں ہے جس کا نام "نئے پرانے" ہے۔ ان کہانیوں میں "روشنی" "دل کا روگ" "سادھو" "سرملا کا بیاہ" اور "مصنّف کی زندگی" کا نام لینا ضروری ہے۔ اور "الاؤ" کی کہانیوں میں "الاؤ" "اندھیرے اور اُجالے میں" "دو مزدور" "جوار بھاٹا" "چوکیدار" "بے چارہ" "جوانی" "پیٹ کی آگ" اور "بھوک" سہیل کے فن کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ اور ان کے علاوہ ان کہانیوں کا بھی ذکر ضروری ہے جو رسالوں میں شائع ہوئی ہیں اور اب تک کسی مجموعے کی شکل میں نہیں آئی ہیں۔ مثلاً "اندھیارے میں ایک کرن" "ایک سفر" "غیر آسودہ" "دل کا بوجھ" "رنڈیاں" "رانی" "احمد" "دل کی لہریں" اور "زندن" ان کہانیوں کو پڑھنے کے بعد سہیل کے متعلق رائے قائم کرنے میں دشواری نہیں ہوتی ہے۔ یہ ساری کہانیاں ایک سی نہیں ہیں۔ ذہنی ارتقاء کے ساتھ ساتھ ان کی کہانیوں میں ایک سلسلہ نظر آتا ہے جو بے ترتیب نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان افسانوں میں بعض جگہ اونچے طبقے کے مظالم کی داستانیں ہیں اور مزدوروں اور کسانوں کی کمزوریاں اور ان کی دلیری اور محبت ہے۔ بعض افسانوں میں محبت کا پرانا تصور رنگ رہا ہے اور محبت کا نتیجہ موت بنایا گیا ہے۔ بعض افسانوں میں محبت میں ناکامی کا نتیجہ زندگی سے فرار قرار دیا گیا ہے۔ اگر ایک افسانے میں گاندھی جی کے اصولوں کی

تائید کی گئی ہے تو دوسرے افسانے میں کسی جوان کی ہمت کا نقشہ پیش کیا گیا ہے جو کسی طرح پرانی روایات کو ٹھکرا کر نئی باتوں اور نئے اصولوں کو سلام کرتا ہے۔ ایسے موقعوں پر تضاد پیدا ہو جانے کا بڑا خطرہ رہتا ہے۔ سہیل کی کہانیوں میں جو بعض جگہوں پر تضاد نظر آتا ہے وہ اسی کا نتیجہ ہے، چونکہ سہیل زیادہ کھل کر باتیں نہیں کرتے ہیں۔ اس لئے ان کا تضاد بھی بہت کچھ چھپا ہی رہتا ہے۔ "الاؤ" کی ایک کہانی ہے "قیدی" جس میں ایک قیدی اپنی آنکھوں کے سامنے اتیا چار دیکھ کر سر پیٹ کر مر جاتا ہے۔ "نئے پرانے" کی کہانیوں میں ایک کہانی ہے "روشنی" جس میں کسی بھی جاندار کی زندگی تباہ کرنے کو گناہ اور پاپ بتایا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ انسان آخر وقت میں بھگتتا ہے، بندوق سے چڑیا کے شکار کو بھی غلط بتایا گیا ہے۔ اسی مجموعے کی ایک دوسری کہانی "سادھو" میں فراریت کی تعلیم دی گئی ہے۔ ایک آدمی ایک عورت سے محبت کرتا ہے، جب اس عورت کے پیٹ میں بچہ رہ جاتا ہے تو وہ اس سے نفرت کرنے لگتا ہے اور اسے چھوڑ دیتا ہے۔ بنارس میں کچھ عرصے کے بعد اسی عورت سے ملاقات ہوتی ہے جو اس وقت تک طوائف بن چکی ہوتی ہے، اسے دیکھ کر وہ آدمی گھبرا جاتا ہے اور نجات کی خاطر سادھو بن جاتا ہے۔ اس کہانی میں قدم قدم پر فراریت کی تعلیم ہے، اسی مجموعے میں سہیل کی ایک اور کہانی "دل کا روگ" ہے جس میں دو محبت کے دیوانے شادی نہ ہونے کی وجہ سے تپ دق کے مریض بن جاتے ہیں اور دونوں ایک ساتھ دم توڑ دیتے ہیں۔ سہیل عظیم آبادی نے فساد کے دوران میں صرف ایک کہانی "اندھیالے میں ایک کرن" لکھی تھی۔ اس کہانی میں مجھے محسوس ہوا کہ وہ جسے کرن سمجھے ہوئے ہیں وہ اصل ایک تصوراتی کرن ہے اور ایک تاریک لہر ہے۔ سہیل نے اسے کیوں ایک کرن سمجھ لیا یہ کچھ زیادہ غور کرنے کی بات نہیں ہے، اس میں سہیل سے زیادہ ان کے ماحول کا قصور ہے۔

سہیل عظیم آبادی اپنے جن افسانوں میں پرانے سماج کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں، اور تاریک گوشوں کی بہت ساری ننھی منی تصویریں جمع کر دیتے ہیں۔ ان افسانوں میں ہمیں یہ پتہ کہیں نہیں چلتا کہ وہ صرف پرانے سماج کے خلاف آواز بلند کرنا چاہتے ہیں یا ایک دوسرے سماج کی تعمیر بھی چاہتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ وہ پرانی اور گندی روایات کو جھنجھوڑتے ہیں اور کچھ اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کا نقطۂ نظر نہ تو ہمیشہ اصلاحی رہا ہے اور نہ انقلابی۔ سہیل کی کہانیوں میں انقلابی خیالوں کی ہمیشہ کمی محسوس ہوتی ہے۔ انقلابی خیالوں کو لانے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ افسانہ نگار کہانیوں میں تقریر کرنے لگیں۔ یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے کہ کہانیوں میں جو افسانہ نگار تقریر کرنے لگتے ہیں وہ کچھ نہ کچھ انقلابی ضرور ہوتے ہیں۔ خود سہیل کی مشہور کہانی "دل کا بوجھ" دیکھی جا سکتی ہے جو کسی صورت میں بھی انقلابی نہیں ہے۔ لیکن افسانہ نگار ہر جگہ تقریر کرتا ہوا نظر آتا ہے حالانکہ ان کی دوسری کہانیوں میں یہ عیب بالکل نہیں ہے۔ اپنی دوسری کہانیوں میں وہ کبھی تقریر نہیں کرتے۔ حقیقت کو جوں توں پیش کر دیتے ہیں۔ جذبات کی لہروں میں کبھی بہتے نہیں ہیں۔ سہیل کے فن میں پرانی عمارت کو توڑ کر نئی عمارت بنانے کا کوئی نقشہ نہیں ملتا ہے۔ ان کی کہانیاں بعض تلخ حقیقتوں کی تصویریں ضرور پیش کر دیتی ہیں۔ لیکن ان میں حیات کو آگے بڑھانے کا کوئی حوصلہ نظر نہیں آتا۔ فن تصویر کشی ضرور کرتا ہے لیکن حیات کو خوبصورت بنا کر آگے بھی بڑھاتا ہے —— سہیل عظیم آبادی کی کہانیوں میں حیات کی بڑی سچی تصویریں ہوتی ہیں، وہ خلوص اور دیانت داری کا دامن کبھی نہیں چھوڑتے لیکن فن صرف تصویر کشی کا نام نہیں ہے، فن ماحول کے لئے خوبصورت راستے بھی تراشتا ہے اور انسان کو سنوار کر آگے بھی بڑھتا ہے۔ سہیل کے یہاں ابھی تک یہ بات پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ یہ بات صرف سہیل کے یہاں نہیں بلکہ ہندوستان کے چند افسانہ نگاروں کو چھوڑ کر باقی سارے افسانہ نگاروں کے یہاں پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ فسادات کے دور میں حال ہی میں اس کا امتحان ہو چکا ہے، اس امتحان میں چند افسانہ نگاروں کو چھوڑ کر باقی سارے ناکامیاب رہے ہیں۔ اسلوب اور زبان کی مدد سے بعض افسانہ نگاروں نے ایسی ایسی باتیں لکھ ڈالی ہیں جو بہت حیرانگیز ہیں اور خود وہ افسانہ نگار ایسی باتیں اور ایسی تصویریں نہیں بنا سکتے ہیں جو اس ماحول میں تصویر کشی کے علاوہ حیات کو سنوارنا بھی چاہتے تھے، لیکن صرف ہنگاموں اور طوفانوں کی تصویریں پیش کر دینا بڑی بات نہیں ہے۔ ان تصویروں میں ایسے اشارے پیدا کرنا بڑی بات ہے جن اشاروں سے انسان کو نئی شاہراہ نظر آنے لگے۔

سہیل عظیم آبادی کی کہانی "دو مزدور" ایک موڑ ہے، جہاں سے ان کا آرٹ ایک نئے راستے کی طرف گھوم جاتا ہے۔ اگرچہ اس نئے راستے پر ان کا فن اس طرح نہیں دوڑتا ہے جس طرح وہ اپنے پہلے راستے پر دوڑتا رہا ہے۔ صرف ایک موڑ پر آ کر گھوم جاتا ہے اور بس —— یہیں پر چند اچھی کہانیاں سامنے آتی ہیں۔ "الاؤ" "بھوک" "جوار بھاٹا" "سڑک بنتی ہے" اور "زون" وغیرہ —— "دو مزدور" میں بلاقی جبر و بھائی سے مزدور یونین کے خلاف کچھ سننا نہیں چاہتا ہے۔ لیکن اس کی انسان دوستی اور محبت اس سے دور نہیں ہوتی۔ اور وہ ہوٹل والے سے یہ کہتا ہوا چلا جاتا ہے

بڑے میاں! جمرو بھائی کا ناشتہ چائے میرا حساب میں لکھیو"۔ سہیل کی کہانیوں کا اختتامی لمس Finishing touch غضب کا اثر رکھتا ہے۔ "دو مزدور" "بھوک" اور "الاؤ" جیسی کہانیاں مثال کے لئے پیش کی جا سکتی ہیں۔ "زون" "احمد" اور "دل کی لہریں" میں بھی یہ اثر موجود ہے لیکن اتنی خوبصورتی کے ساتھ نہیں ہے جتنی خوبصورتی کے ساتھ سہیل عظیم آبادی نے اپنی پہلی کہانیوں میں پیدا کیا ہے۔ "بھوک" میں انھوں نے رامو کی بھوک کی اچھی تصویر پیش کی ہے۔ رامو لڈو کھا لیتا ہے اور جوان لڑکی کو چھوڑ دیتا ہے۔ "جوار بھاٹا" کو ایک اچھا نفسیاتی تجزیہ کہا جا سکتا ہے۔ "کھوسٹ" بھی ایک اچھی تصویر ہے۔ کشمیر پر ادھر سہیل نے تین کہانیاں لکھی ہیں۔ جن میں "زون" اور "احمد" بڑی اہم کہانیاں ہیں "زون" میں ایک بیوہ لڑکی مرجانا چاہتی ہے۔ لیکن جب اُسے یہ پتہ چلتا ہے کہ اُس کے پیٹ میں بچہ ہے اور یہ بچہ اُس کے مرنے والے شوہر کا ہے تو خوشی سے ناچنے لگتی ہے اور پھر مرنا نہیں چاہتی ہے۔ "احمد" میں تلخ حقیقتوں کے تجزیے میں سہیل عظیم آبادی نے وہ سب کچھ پیش کر دیا ہے جو انھوں نے محسوس کیا ہے اس طرح بہت سی اچھی باتیں بھی آ گئی ہیں اور بہت ایسی باتیں بھی آ گئی ہیں جو نہ ہوتیں تو اچھا تھا۔ تصویر کشی میں فن کار ذرہ ذرہ کا حساب نہیں کرتا ہے وہ اپنے ماحول کو اپنی تخلیق کے قبل پرکھتا ہے۔ تصویر کو کھینچتا ہے لیکن اُس میں ایسی باتیں نہیں آ جاتیں جن سے اس کی تصویر دُھندلی پڑ جائے۔ سہیل کی کہانی "احمد" شروع میں بڑے مزے میں چلتی ہے لیکن راستے میں بہت بار جھٹکے لگتے ہیں۔ اگرچہ کہانی بڑے اچھے طریقے سے ختم ہو جاتی ہے۔ پھر بھی اختتام پر ہمیں راستے کے جھٹکے یاد رہتے ہیں۔

سہیل عظیم آبادی نے عریاں نگاری سے ہمیشہ دامن بچایا ہے۔ وہ گندی باتوں کے بیان سے بہت پرہیز کرتے ہیں۔ ایسے وقت میں جبکہ ہندوستان کے کم و بیش سارے افسانہ نگار عریاں نگاری کی مشق فرما رہے تھے، سہیل کا قلم بہت سنبھل کر آگے بڑھتا رہا اور یہ بڑی بات ہے۔

سہیل عظیم آبادی کبھی اسلوب پرستی اور ابہام پرستی میں گرفتار نہیں رہے اور وہ رہنا بھی نہیں چاہتے ہیں، ان کی پیاری اور خوبصورت زبان سے ان کے فن کو بڑی زندگی ملتی ہے۔ زبان بھی سادہ اور مواد بھی سادہ اور فطرتی ہوتا ہے۔ سہیل کے یہاں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔ وہ غیر ضروری تفصیلات میں پڑنا نہیں چاہتے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ صاف صاف اپنی زبان میں پیش کر دیتے ہیں۔ صاف صاف پیش کر دینے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وہ حقیقت نگاری میں جن باتوں کو چھپانا چاہتے ہیں وہ باتیں بھی صاف طور پر سامنے آ جاتی ہیں، سہیل چونکہ بعض وقت اپنی سادہ زبان کی مدد سے بہت سی چیزیں چھپا لیتے ہیں۔ اس لیے ان کے فن میں بہت ساری باتیں کھل کر سامنے نہیں آتی ہیں۔ پھر بھی سہیل کے فن میں خلوص اور انسانی ہمدردی کا جو جذبہ ملتا ہے۔ وہ بہت غنیمت ہے۔ "زون" اور اُن کی دوسری نئی کہانیاں پڑھتے ہوئے ہم محسوس کر رہے ہیں کہ سہیل نے اپنی طویل خموشی کے بعد پھر لکھنا شروع کر دیا ہے۔ اور آج جو بھی اُن کی نئی کہانیوں میں خوبصورت اور نکھرے ہوئے اشارے نظر آ رہے ہیں وہ ان کا عام رنگ بن جائیں گے۔

بھارت اور ترکی کے درمیان تہذیبی مُعاہدہ

بھارت اور ترکی کی حکومتوں نے دونوں ملکوں کے درمیان تہذیبی معاہدے کی تصدیق کر دی ہے۔ ۹۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو نئی دہلی میں اس معاہدے کی تصدیق سے متعلقہ کاغذات کے تبادلے کی رسم ادا کی گئی۔ بھارت کی طرف سے پروفیسر ہمایوں کبیر اور ترکی کی طرف سے ایم۔ اقدو نے اپنے اپنے ملک کی نمائندگی کے فرائض انجام دیے۔

اس معاہدے پر ۲۹ جون ۱۹۵۱ء کو انقرہ میں ترکی کے وزیر خارجہ ڈاکٹر فاؤد کپرولو اور بھارت کے وزیر تعلیم مولانا آزاد نے دستخط کئے تھے۔

بھارت اور ترکی کے درمیان صدیوں سے ثقافتی تعلقات چلے آ رہے ہیں۔ اس معاہدے کے ذریعے سے ان تعلقات کو مستقبل میں قائم رکھنے اور انھیں ہر ممکن طریقے سے زیادہ مضبوط بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ دونوں حکومتوں نے یونیورسٹی کے اُستادوں اور سائنسی و تہذیبی اداروں کے ممبروں کے باہمی تبادلہ اور ایک ملک کے طالب علموں کو دوسرے ملک میں حصولِ تعلیم کے لئے وظائف دینے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ معاہدے میں اس بات کا ذکر بھی کیا گیا ہے کہ ایک ملک کے سرکاری ملازموں کو دوسرے ملک کے سرکاری، سائنسی، ٹیکنیکل اور صنعتی اداروں میں تربیت دینے کا انتظام کیا جائے گا۔

چندر کرن سون رکسا

آدھا کمرہ

ایک بجتے ہی آفس کے سبھی بابو اور کالے گورے صاحب کرسیاں چھوڑ کر ٹفن روم کے اِردگرد چکّر کاٹنے لگے۔ کسی نے ایک چائے منگائی۔ کسی نے چاپیں اور ٹوسٹ لئے۔ سوال خواہش کا نہیں جیب کے پیسوں کا تھا۔ گھر گرہستی والے کئی لوگ گوشۂ تنہائی میں اپنے ٹفن کیریئر سنبھالے اِدھر اُدھر جا بیٹھے۔ مدھوسودن یوں تو اکیلا ہی تھا اور خوش قسمتی سے اُسے ایسا ہوٹل مل گیا تھا جس کا مالک اُس کے لئے دوپہر کا ناشتہ رکھ دیتا تھا۔ کمرہ خالی ہوتے ہی اُس نے میز پر اپنا ڈبہ کھول کر رکھ لیا۔ کھانا ٹھنڈا تھا اور اُسے بدمزہ سا لگ رہا تھا۔ آلو کے پراٹھے کا پہلا لقمہ ابھی اُس نے مُنہ میں رکھا ہی تھا کہ پیچھے سے کسی نے پُکارا "بھائی صاحب"

آواز نسوانی تھی۔ مدھوسودن نے چونک کر سر اُٹھایا۔ یہ آفس کی نئی ٹائپسٹ مس گوری تھی۔ اِن "بھائی صاحب والیوں" سے مدھوسودن کو بڑی چڑ تھی۔ کالج کی زندگی کے پانچ چھ سالوں میں وہ ایسی کئی بہنوں سے تعارف حاصل کر چکا تھا۔ جو اپنے محبوب کو تا زندگی بھائی صاحب کہتی رہیں۔ ایک ایسی ہی بہن کے پیچھے اُس کا کالج چھوٹا تو آخر کار اُسے انگوٹھا دکھا کر کسی موٹے سیٹھ کی گھروالی بن بیٹھی۔ اور مدھوسودن آج بھی اکیلا تھا۔ اُس نے ایک ترچھی نظر سے مس گوری شرما کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر روکھے لہجے میں کہا "مس شرما! میرا نام مدھوسودن ہے۔ آپ شوق سے مجھے اسی نام سے پُکار سکتی ہیں۔"

"معاف کیجئے گا" مس شرما نے ذرا ملائم لہجے میں جواب دیا۔ "بھائی صاحب کہنے سے اگر آپ کے جذبات کو میں نے ان جانے ہی ٹھیس پہنچائی ہو تو اِس کے لئے معافی چاہتی ہوں" . . . . . اور جملے کو ادھورا ہی چھوڑ کر وہ اپنی اُنگلیاں چٹخانے لگی۔ اُس کا چھوٹا سا دُبلا پتلا اور کچھ محبوبانہ چہرہ جو گھنے بالوں سے دب کر اور بھی ننھا سا دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے پپڑائے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ بہت ہی پریشان معلوم ہوتا تھا۔ ایک دو بار اُس کے ہونٹ پھڑکے۔ لیکن پھر بھی وہ "کچھ کہنے" کی تکلیف کو پورا نہ کر سکے۔ مدھوسودن نے اُسے بیٹھنے تک کے لئے نہیں کہا اور جھٹ پٹ اپنا کھانا ختم کرنے لگا۔ تھوڑی دیر ٹھہر کر اُس نے کہا۔ "بھائی . . . . نہیں مسٹر شرما مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے شریکِ کمرہ **Partner** چلے گئے ہیں اور آج کل آپ اپنے کمرے کے پورے پورے مالک ہیں۔"

"جی۔ سُنا تو میں نے بھی ہے"۔ مدھوسودن نے طنزیہ دریافت کیا۔ "کسی نئے پارٹنر کی درخواست لائی ہیں کیا؟"

گوری کچھ جھجکی۔ پھر جیسے اپنا پورا زور لگا کر بولی "بات کچھ ایسی ہی ہے مسٹر شرما! آپ کے سوا آفس بھر میں کسی کنوارے کے پاس اپنا کمرہ نہیں ہے۔ تقریباً سبھی لوگ یا تو کسی مکان والے کنبے کے سہارے رہتے ہیں یا ہوٹل دکان وغیرہ میں سوتے ہیں۔ دہلی میں اپنی چھت کا ہونا بہت بڑی خوش قسمتی ہے۔ اپنا کمرہ صرف اپنا ہی ہو یہ بھی کسی جنّت سے کم نہیں ہے۔ لیکن میرے خیال میں ہم ایسے سو روپے کی تنخواہ والوں کے لئے پینتیس روپے کرایہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ اگر آپ کو کوئی ایسا حصہ دار ملے جو ہفتے میں ساڑھے پانچ دن ہی ساتھ رہے اور حتی المقدور کوئی تکلیف نہ ہونے دے اور آدھا کرایہ مع بجلی پانی کے پیشگی دے دے تو شاید آپ اُسے اپنے کمرے کے کسی کونے میں جگہ دینے کو تیار ہو ہی جائیں گے۔"

لڑکی کی بات میں مدھوسودن کو کہیں بھی طنز کا پہلو محسوس نہیں ہُوا۔ اس لئے اُس کا مزاج بھی کچھ نرم ہُوا۔ لہجہ بدل کر بولا۔ "ہاں ایسا ہو تو اُس معاملے پر سوچا جا سکتا ہے۔"

گوری نے جلد ہی جواب دیا۔ "نہیں نہیں مسٹر شرما! مہربانی فرما کر آپ میری یہ بات مان ہی لیجئے۔ دیکھئے وہ حصہ دار میں ہی ہوں اور مجھے غازی آباد سے روز آنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر دہلی میں مجھے جگہ نہ ملی تو شاید مجھے نوکری ہی چھوڑنی پڑے۔ اور نوکری چھوڑ کر کھاؤں گی کیا؟ اور اپنے چھوٹے بھائیوں اور بوڑھی ماں کو کیا کھلاؤنگی؟ مجھے جگہ دے کر آپ مجھ پر نہیں بلکہ سارے خاندان پر احسان کریں گے۔"

لیکن شرما کچھ جھجکا پایا۔ "میں تو اکیلا ہوں اور آپ . . . . ."

"یہ تو مجھے پہلے ہی معلوم ہے۔ دیکھئے مسٹر شرما، ضرورت سب کچھ کرا لیتی ہے۔ آپ تو مرد ہیں۔ ایک اجنبی عورت کے ساتھ جب آپ کو رہنا اتنا عجیب لگے تو عورت کی تو کچھ نہ پوچھئے۔ لیکن اس لوک لاج کی وجہ سے نوکری تو چھوڑ نہیں سکتی اور اگر اتنی بھیڑ والی ٹریموں سے مجھے گھر جانا پڑا تو نوکری چھوڑنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ اچھا تو کیا آپ مہربانی فرما کر اس مسئلے پر غور کریں گے میں آفس میں چھٹی ہونے پر پھر ملوں گی۔ ابھی تو بہت سی فائلیں ٹائپ کے لئے پڑی ہیں۔"

اتنا کہہ کر اپنے گھنے بالوں کے جوڑے کو پھر سے لپیٹتی ہوئی گوری باہر چلی گئی۔ مدھوسودن نے آخری لقمہ نگلتے ہوئے سانس لیا اور اپنے آپ سے کہا "واہ ری ہمت۔ یہ ایک دم ماڈرن رومانس ہے۔ دل سے پہلے مکان پر قبضہ کر لو"۔ گوری کی مانگ نے اُسے بھونچکا بنا دیا تھا۔ اگر وہ گوری کو نہ کر دے گا تو وہ اسے بزدل تصوّر کرے گی۔ نہیں۔ مدھوسودن یہ خاصیت اپنے لئے کبھی بھی منظور نہیں کرے گا۔ طالب علمی کی زندگی میں مدھوسودن اُن تیز لڑکوں میں سے تھا جنہیں لڑکیوں کو جھکانے میں مزا آتا تھا۔ آج وہ اس دُبلی پتلی لڑکی سے ڈر جائے گا جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اکیلا ہے اُس کا کمرہ مانگنے سے بھی نہ جھجکی۔ آفس کے باقی تمام وقت میں گوری کی یہ باتیں اُس کے دماغ میں گھومتی رہیں۔ چھٹی ہوتے ہوئے اُس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اگر دوبارہ مس شرما نے کمرے کے لئے مانگ کی تو وہ اسے "ہاں" کہہ دیگا۔ اور اس طرح لڑکے پھنسانے والی لڑکی کو وہ دکھا دے گا کہ سبھی لڑکے اتنے بے وقوف نہیں ہوتے جیسے اُسے اب تک ملتے رہے ہوں گے۔

"مسٹر شرما!" گیٹ پر کھڑی ہوئی گوری نے اُس سے کہا۔ "کیا آپ نے اس بات پر سوچ لیا ہے کہ آپ صرف چار مہینے کے لئے مجھے اپنے کمرے کا ساجھی دار بنائیں گے؟ اتنے دنوں میں میں ضرور ہی کہیں اور انتظام کر لوں گی۔ اور ساتھ رہنے پر آپ دیکھیں گے کہ میں حتی المقدور آپ کو کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گی۔"

"آپ نے میرا کمرہ دیکھا بھی ہے؟" مدھوسودن نے کچھ کھینچ کر کہا۔ گوری جاتی ہوئی بس کے پیچھے لپکی۔ "بلیاراں کی پچھلی سڑک پر پنواڑی کی دکان کے اوپر ہی تو ہے نا!" وہ بس پر چڑھتے ہوئے بولی۔ "تو میں کل آ جاؤں گی۔"

مدھوسودن کے جواب دینے سے پہلے ہی بس چل دی۔

جاڑے کی صبح کے سات بجے تھے۔ مدھوسودن چارپائی پر لیٹا چائے کا انتظار کر رہا تھا۔ نیچے والا پنواڑی اُسے انگیٹھی پر چائے بنا کر دے جاتا تھا۔

"بابوجی! بابوجی!! کواڑ کھولئے، آپ کی بہن جی آئی ہیں۔"

"بہن جی؟" مدھوسودن نے لحاف پھینک دیا اور کوٹ میں بانہیں ڈالتا ہوا باہر آ گیا۔ نیچے جھانکا تو دیکھا کہ تانگے پر سے گوری اُتری ہوئی کھڑی تھی۔ پنواڑی اُس کا سوٹ کیس اور ٹوکری (کنڈی) وغیرہ اُتار رہا تھا۔

"نمستے بھائی صاحب" گوری نے نیچے سے ہی پکارا۔ "ذرا دروازہ تو کھولئے" وہ سینڈل کھٹکھٹاتی زینے پر چڑھ رہی تھی۔

غیر ارادی طور پر مدھوسودن نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ گوری نے دھیمے اور التجا بھرے لہجے میں کہا۔ "اُمید ہے آپ 'بھائی' کہنے سے ناراض نہ ہوئے ہوں گے۔ آخر پڑوسیوں کو اور کیا بتاتی۔ آپ میری 'چچیری' کیسی بھی بہن بتا دیجئے گا۔" اُس نے اندر آ کر کھونٹی پر تھرماس لٹکا دیا۔ پھر کنڈی میں سے پیالہ اور طشتری نکالنے لگی۔ پنواڑی سوٹ کیس رکھ کر چلا گیا تھا۔ مدھوسودن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ گوری سے کن الفاظ میں اور کیا کہے۔ لیکن اُس کے دل میں غصّے کی ایک لہر دَوڑ رہی تھی جسے وہ ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔

"لیجئے، ایک پیالی چائے" گوری نے تھرماس میں سے چائے انڈیل کر کہا۔ "میں تو جلدی میں پی ہی نہ سکی اور ساتھ لیتی آئی۔"

"شکریہ"۔ مدھوسودن نے رُکھائی سے کہا۔ "میری چائے ابھی تیار ہو کر آ جاتی ہے۔ اس تکلیف کے لئے شکریہ۔"

گوری کا بڑھا ہُوا سانولا ہاتھ ذرا سا کانپا۔ پھر رُک گیا۔ مدھوسودن نے دیکھا۔ گوری سہم سی گئی۔ اُسے محسوس ہُوا جیسے اُس نے بہت تیز بات کہہ دی ہو۔ لیکن ان تتلیوں سے بچنے کا راستہ بھی تو یہی ہے کہ کھِلتے پر سے ہی کاٹ دیں۔ اُس نے سلیپر پہنے اور لوٹا اُٹھا کر آنگن میں نکل گیا۔ نل کے پانی سے مُنہ ہاتھ دھویا اور نیچے جا کر چائے پی۔ بنا کام ہی دوکان پر کھڑے کھڑے دو سگریٹیں پھونکیں۔ کوئی دو گھنٹے بعد وہ اُوپر گیا۔ آج اپنے ہی کمرے میں وہ پرائے کی مانند گھس رہا تھا نہیں، نہیں۔ اس جذبے کو وہ پاس بھی نہیں پھٹکنے دے گا۔

اوپر گیا تو دیکھا کہ اتنی دیر میں گوری نے کمرہ صاف کر کے ایک کونے میں اپنا سوٹ کیس اور بکس رکھ دیا تھا۔ بکس پر کپڑا بچھا کر اُس پر کتابیں اور گھڑی رکھ دی تھی۔ بکس میں شاید برتن تھے۔ کیونکہ بارجے کے ایک کونے میں سٹوو اور

دو چار چھوٹے برتن اور پیالے طشتری سجے ہوئے تھے۔ مدھو سودن کے بستر کو بھی اچھی طرح سے جھاڑ کر بچھا دیا تھا۔ یہ سب دیکھ کر وہ دل ہی دل میں مسکرایا شرت کی ہیروئن بننے میں کوئی کسر نہیں ہے۔ پر بھائی میں تو شرت کا نت یا دیو داس ہوں نہیں۔ چائے کا پیالہ ویسے ہی میز پر پڑا تھا اور گوری اپنے گھنے لمبے بالوں میں کنگھی پھیر رہی تھی۔ آواز کو زیادہ سے زیادہ روکھا بنا کر وہ بولا "بستر جھاڑنے کے لئے شکریہ مس گوری۔ لیکن اس کے بعد آپ یہ تکلیف نہ کیا کریں۔ اگر اس طرح میری آزادی کو آپ محدود کر دیں گی۔ تب میرے لئے اس کمرے میں رہنا دشوار ہو جائے گا۔ اور ہاں یہ چائے آپ نے کیوں نہیں پی؟"

گوری نے آہستہ سے جواب دیا۔ "مسٹر مدھو سودن۔ مصیبت میں جو امداد آپ نے مجھے اس چھت کا سہارا دے کر کی ہے اُس کا شکریہ میں زبان سے ادا نہیں کر سکتی۔ اس کے علاوہ آپ نے یہ احسان کر کے میری اور میرے کنبے کی روٹی کی حفاظت بھی کی ہے۔"

"معاف کیجئے، کمرے میں رہنگی تو آدھا کرایہ چکانا ہوگا۔ بس بات ختم۔ جائیے چائے پیجئے۔ میں تو نیچے پی آیا ہوں۔"

گوری چپ رہ گئی۔ بارجہ میں جا کر منڈیر پر بیٹھی۔ اُس نے تھرماس سے نکال کر چائے پی۔ مُنہ صاف کیا۔ بستر میں لپٹی تین چار رنگین چادروں کو پھیلانے لگی۔ چادریں ٹھیک کر کے کرسی پر چڑھ کر کیلیں گاڑیں اور بستر کی رسّی نکال کر بیچ میں اُسے تان دیا۔ قد چھوٹا ہونے سے گوری بڑی مشکل سے اُچک اُچک کر کیلیں گاڑ سکی۔ لیکن مدھو سودن نے دیکھ کر بھی اَن دیکھا کر دیا۔ چپ چاپ شیو کرتا رہا۔

"رات کو چادریں ڈال کر کمرے کے دو حصّے کر لیں گے"۔ گوری نے کہا۔

مدھو سودن نے سر ہلا دیا بولا کچھ نہیں۔ گوری نے آنگن میں جا کر کپڑے بدلے۔ چوٹی کی۔ پھر پرس کھول کر دس کا نوٹ نکالا اور مدھو سودن کی طرف بڑھا دیا۔ اُس نے چپ چاپ ایک روپیہ چھ آنے واپس کر دئے اور نوٹ جیب میں رکھ دیا۔ اُس وقت نو بج رہے تھے۔ مدھو سودن نے تولئے سے مُنہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں کھانا کھانے جا رہا ہوں۔ ادھر سے ہی آفس چلا جاؤں گا۔ یہ چابی لیجئے اور تالا لگا کر آ جائیے۔"

گوری نے سہمی ہوئی آواز سے کہا۔ "اگر بُرا نہ مانیں تو آج کا کھانا یہیں کھا لیجئے۔ ماں نے کافی کھانا ساتھ رکھ دیا ہے۔"

"نہیں، میرا کھانا وہاں بن چکا ہوگا۔ آپ اپنا بچا ہوا کھانا شام کو کام میں لے لیجئے گا۔" یہ کہتا ہوا مدھو سودن نیچے اُتر گیا۔

وہ دل میں بہت خوش تھا۔ اپنی چھبیس برس کی زندگی میں اُس نے اتنی چالاک لڑکی نہ دیکھی تھی جو اس قدر صفائی اور بھولے پن سے نوجوانوں کو پھنسانے کا فن جانتی ہو اور اسے تو اُس نے دکھا ہی دیا کہ سبھی مرد شہد پر مکھی کی طرح نہیں گرتے۔ پھر کوئی شکل و صورت بھی تو ہو۔ اُس نے چلتے چلتے سوچا۔ کالی چڑیل۔ لکڑی سے ہاتھ پاؤں۔ بس ذرا بال خوبصورت ہیں اور آنکھیں بھی اچھی ہیں۔ آفس میں بھی کہیں اس نے مجھے اپنا بھائی ہی نہ بتایا ہو۔ جی.... ایسی بہنوں کو دُور سے سلام جو بن بلائے سر پر سوار ہو جائیں......

اُس کا ہوٹل آ گیا تھا۔

"آپ نے سب جگہ مجھے اپنا بھائی کیوں بتایا؟"

"مسٹر شرما! آپ اتنے غصّے نہ ہوں"۔ گوری نے کہا۔ "یوں تو آپ اور ہم ایک ہی ذات کے ہیں۔ پھر اپنے ملک میں عورت مرد یا تو میاں بیوی ہوتے ہیں یا بھائی بہن....... دوستی کا تعلق ہمارے سماج میں ابھی اتنا آسان کہاں ہے"؟ لیکن اگر آپ کو اس سے دُکھ پہنچا ہو تو مجھے معاف فرما دیجئے۔ اور آپ کہیں تو مکان بھی چھوڑ دوں۔ بھگوان کوئی سہارا تو دیں گے ہی۔ آپ کو بھلا آدمی.......

اور کہتے کہتے گوری رو پڑی۔

مدھو سودن آنسوؤں کو دیکھ کر پسیج تو گیا۔ لیکن اوپر سے سخت بن کر بولا "میں سماج کی جھوٹی روایات کو نہیں مانتا۔ ہم اور آپ ایک ہی مکان میں کرایہ دار ہیں بس۔ خیر جانے دیجئے جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اصل میں اس ہفتے کے کرایہ کے پیسے جو گوری نے صبح دئے تھے۔ خرچ ہو چکے تھے۔ کیونکہ وہ مہینے کے آخری دن تھے۔

گوری مُنہ دھونے چلی گئی۔ لوٹ کر اُس نے سٹوو جلایا۔ چائے بنائی اور بارجہ میں بیٹھ کر چپ چاپ پی۔ پھر وہیں بیٹھی بیٹھی سوئیٹر بننے لگی۔ سٹوو پر کھچڑی بن رہی تھی۔

دہلی میں ایک چھت کا سہارا۔ اگرچہ وہ ایک نوجوان کے ساجھے میں ملا تھا۔ پا کر گوری نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب سے ایک سال پہلے جب اُس کے والد زندہ تھے، وہ الہ آباد یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ اُس نے خواب میں بھی

یہ نہ سوچا تھا کہ اس طرح اُسے ایک غیر جانے پہچانے نوجوان کے ساتھ بھی رہنا پڑ جائے گا۔ اور وہ بی اے پاس کرنے سے پہلے ہی پڑھائی چھوڑ کر سو روپے کی کلرکی کرے گی۔ لیکن آٹھ مہینے تپ دق کا مریض رہ کر گھر کی کل جمع پونجی ڈاکٹروں اور پہاڑی مقامات کی نذر کر کے اُس کا باپ، اُس کی نیم مردہ ماں اور ساتویں اور نویں میں پڑھتے دو لڑکوں کے ساتھ اُسے بھی چھوڑ گئے۔ پہلے کچھ دن تو وہ ایک دم سکتہ کی حالت میں رہ گئی۔ لیکن باپ کی موت کا گہرا صدمہ جب کچھ کم ہوا تو اُس نے دیکھا کہ اُس کی پڑھائی تو اب بالکل چل ہی نہیں سکتی۔ اور ساتھ ہی اگر وہ کوئی روٹی کمانے لائق کام نہیں کرتی تو بھوکوں مرنے کی نوبت آ جائے گی۔ غازی آباد سے بھی تین چار میل دور اُس کا آبائی چھوٹا سا مکان تھا۔ سب لوگ وہیں آ گئے۔

دونوں بھائیوں کو نزدیکی سکول میں داخل کر دیا اور ماں کے غم زدہ دل کو اپنی اعتماد پسندانہ گفتگو سے حوصلہ دے کر گوری نے مرد بننے کی ٹھان لی۔ سگائی اُس کی ہو گئی تھی۔ ماں کا ارادہ تو یہ تھا کہ اپنے دونوں لڑکوں کو قسمت کے حوالے کر کے لڑکی کے ہاتھ پیلے کر دے۔ لیکن گوری نے ایک دم انکار کر دیا۔ کم از کم جب تک ایک لڑکا میٹرک کر کے کچھ کمانے نہ لگ جائے اُس نے نوکری تلاش کی اور تھوڑی سی محنت سے پڑھا کر کی پچیس پچیس روپے کی دو ٹیوشنیں بھی حاصل کر لیں۔

ہونے والے سسرال والوں اور اپنے منگیتر کو اُس نے سارے حالات سے آگاہ کر دیا۔ ساس نے تو سمدھن کی عقل پر پتھر پڑ جانے کی دہائی دی۔ لیکن منگیتر نے جو خط گوری کو لکھا۔ اُس سے گوری کا دل پھول اُٹھا۔ خط میں لکھا تھا:-

تمہارا دردبھرا کڑوا میٹھا خط ملا!

بنا دیکھے ہی تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ تمہارا ساتھی اتنا تنگ دل اور کم ظرف ہے، کہ تمہارے اس کام کو بُرا سمجھ کر تم سے تعلقات منقطع کر لے گا۔ اس کا افسوس تو ہوا کہ پتاجی کی بے وقت وفات سے تمہاری تعلیم بند ہو گئی۔ لیکن وہ تو میرے ساتھ جب تم چاہو گے شروع ہو جائے گی۔ صرف عورت ہونے سے ہی تم اپنے کنبے کا بوجھ اُٹھانے کے ناقابل رہو، ایسا تو میں خواب میں بھی نہیں چاہتا۔ ایک سال تک تو جب تک میرا کورس ختم نہیں ہوتا، شادی کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ بعد میں اگر تم میرے پیسے کو اس گھر کے لئے اچھوت سمجھو تو خود کما کر ماں کی سیوا کر سکتی ہو۔ میں اس میں دخل نہیں دوں گا۔ لیکن دیوی، بلاوجہ پیشانی پر بل مت ڈالو۔ ہم تو آپ کے ہمیشہ کے "موسٹ اوبیڈینٹ" ہیں اور رہیں گے۔

دیوالی پر اگر آؤں تو ملو گی یا نہیں؟

تمہارا ـــــ اجیت

گوری نے اس خط کو ہاتھی دانت کی معطر ڈبی میں بند کر کے بکس میں رکھ چھوڑا۔

دوسرا مسئلہ گوری کے سامنے تین میل تانگے پر یا پیدل ہر روز سٹیشن آنے اور ٹرین پکڑ کر دہلی جانے کا تھا اور اسی طرح لوٹنے کا بھی۔ کچھ دن اُس نے نوکری کر کے دیکھ لیا کہ چھ میل پیدل چل کر دو ٹیوشنیں تو کیا اکیلی نوکری بھی اُس سے نہیں ہو سکے گی۔ تب مجبور ہو کر کہیں جگہ نہ کر اُس نے مدھوسودن کے ساتھ ہی رہنے کا فیصلہ کر لیا۔

بارِ احسان سے دبی ہوئی گوری مدھوسودن کے سبھی چھوٹے موٹے کام کر کے اُسے زیادہ سے زیادہ سہولتیں دے کر اس بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتی تھی لیکن اُس کے پہلے ہی دن کے روکھے پن سے ڈر گئی۔ اگرچہ اُسے اس فاتح نفس نوجوان کی اس بے رُخی سے اُس کے دل میں اُس کے لئے عزت و احترام کا احساس ہی بڑھا۔ اپنے مہربان کی نگاہوں میں کوئی بھی نیچا نہیں ہونا چاہتا۔ گوری نے بھی یہ سوچ کر کہ کہیں اُس کی کسی حرکت میں بے اعتنائی پا کر مدھوسودن اُسے نفرت کی نگاہ سے نہ دیکھنے لگے۔ اپنے افعال پر ایک قسم کا ضابطہ عاید کر دیا۔ وہ منہ اندھیرے اُٹھ جاتی۔ مدھوسودن کے جاگنے سے پہلے ہی جاڑے کے دنوں میں ٹھنڈے پانی سے غسل کر لیتی۔ دبے پاؤں چارپائی اُٹھا کر باہر رکھ دیتی۔ چپکے سے جا کر باورچی خانہ میں چائے بنا کر پیتی اور پھر شال پیٹے وہیں سکڑی سکڑائی بیٹھی رہتی۔ اُس کی نیند نہ کھل جائے اس ڈر سے وہ ٹارچ یا چھوٹی لالٹین کے ذریعے سے ہی اندھیرے کا مسئلہ حل کرتی۔ بجلی نہ جلاتی۔

دِن چڑھے جب مدھوسودن کا چائے والا پنواڑی آ کر آواز دیتا۔ تو وہ دھیرے سے کنڈی کھول دیتی اور پھر باورچی خانہ میں جا کر اپنا مختصر سا کھانا بنانے میں لگ جاتی۔ ایسے با اخلاق نوجوان کی نظر میں جو عورت کو کپڑے کے تھان سے زیادہ وقعت نہ دیتا ہو، اپنی کسی حرکت سے نیچی نہ ہو جائے اس کا ڈر اُسے ہمیشہ لگا رہتا۔ مدھوسودن جب غسل کے لئے جاتا تو اُس مختصر سے وقفے میں کپڑوں اور بالوں کی معمولی سی سجاوٹ ختم کر کے دفتر جانے کے لئے تیار ہو جاتی تھی۔ چوڑی بارڈر کی سفید ساڑھی پہننا اُسے بہت پسند تھا۔ وہ سر میں پھول لگانے کی بھی شوقین تھی۔ لیکن یہاں آ کر اُس نے موٹے کھدر کی دھوتی پہننی شروع کر

دی۔ اگر کبھی دل کرتا تو پھولوں کے گچھے کو لوٹے یا گلاس میں سجا کر کتابوں کی اوٹ میں بارج کے کونے میں رکھ دیتی۔ دفتر دونوں ساتھ ہی جاتے تھے۔ لیکن گوری سب سے پہلے بس کا ٹکٹ خریدتی۔ شام کو اندھیرا ہوتے ہی وہ دونوں ٹیوشن کر کے جس وقت گھر لوٹتی تب عموماً مدھو سودن چابی پنواڑی کو دے کر ٹہلنے گیا ہوتا۔ جلدی جلدی کچھ کھا کر گوری بارج میں جا کر کشیدہ کاری میں لگ جاتی یا بیٹھی بیٹھی اونگھتی رہتی۔ لیکن کمرے میں تبھی آتی جب مدھو سودن سو جاتا۔

کیتلی میں سے پودے چار پیالے ختم کر اور پنواڑی کے ہاتھوں بنے ہوئے بے ڈول بچوڑوں کی پلیٹ پیٹ میں اُتار کر جب پرکاش نے مُنہ چلانے سے چھٹی پائی تو گھوم گھوم کر کمرے کی نئی سجاوٹ کو دیکھنے لگا۔ "یار یہ کیا معاملہ ہے" اُس نے مدھو سودن کی بغل میں گھونسا مارتے ہوئے کہا۔ "یہ کناری دار ساڑھی، یہ لیڈیز شال، یہ بارج میں رکھے سینڈل، تیرا پارٹنر کیا کوئی تھیٹر کا ایکٹر ہے؟ یا پھر کوئی .... بھئی یہ بات ہے تو ہم بھی بنا دیکھے نہیں جائیں گے۔ نکال یار کہاں چھپا دیا ہے؟"

مدھو سودن ہنستا رہا۔

پرکاش نے اُس کا لحاف اُتار کر پھینک دیا۔ پھر اُسے اُٹھاتا ہوا بولا "اُٹھ یار کیا اُسے میرے ڈر سے مکھی بنا کر دیوار میں چپکا دیا ہے، سچ بتا کہاں ہے۔ اگر تیری محبوبہ ہے تو قسم ہے ان بڑ طائی مونچھوں کی، جو بُری نظر سے دیکھوں"۔

مدھو سودن نے اُس کے مُنہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "رام رام! ایسا مت کہو، بڑی اچھی لڑکی ہے۔ بیچاری مصیبت کی ماری ہے۔ اسی لئے کنواری ہوتے ہوئے بھی ....

"ہاں، ہاں۔ اچھی تو ہو گی ہی"۔ پرکاش بات کاٹ کر بولا۔ "اچھی نہ ہوتی تو تجھے کیسے پھانس لیتی۔ پر وہ ہے کہاں؟"

پرکاش کا مذاق نہ سہہ کر مدھو سودن چڑ کر بولا "اپنی ہی ہانک رہا ہے۔ وہ معاملہ نہیں ہے۔ اپنی ہی ذات کی ایک بے باپ کی لڑکی ہے۔ دو بھائی ہیں اور ماں ہے۔ کمانے والا کوئی نہیں۔ لڑکی انٹر پاس ہے اس لئے وہ ہمارے ہی آفس میں ٹائپسٹ ہو گئی۔ گھر غازی آباد سے بھی دُور ایک گاؤں میں ہے۔ اس لئے بیچاری مجبور ہو کر پندرہ دنوں سے یہاں رہتی ہے۔ مطلب میرا ..... کرایہ پر رہتی ہے۔ دہلی میں مکان تو آج کل ملتے نہیں"۔

"ملتے کیوں نہیں"۔ پرکاش نے بڑے بھولے پن سے کہا۔ "ذرا سی جوانی ہو منہ دکھانی ہو، ساڑھی آسمانی ہو۔ زوروں پہ جوانی ہو اور آنکھوں میں پانی ہو۔ دیکھوں پھر کمرہ کیسے نہ ملے۔ یار گوری ہے کہ کالی؟

"دیکھو، مذاق مت کرو"۔ مدھو سودن نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں بھی پہلے یہی سمجھا تھا۔ لیکن لڑکی بڑی با اخلاق ہے۔ ان پندرہ دنوں میں میں نے اُسے آفس میں کسی سے بیکار میں ایک لفظ بھی بولتے نہیں دیکھا۔ اپنے کام سے کام۔ لپ سٹک اور پوڈر تو دُور، میں نے کبھی بالوں میں ٹھیک ڈھنگ سے تیل ڈالتے نہیں دیکھا۔ بہت ہی سیدھے سادے ڈھنگ سے رہتی ہے۔ سب لڑکیاں ایسی ہو جائیں تو انگریزی تعلیم کیوں بدنام ہو"۔

"اوہو! اتنی پسند ہے۔ تب پھر شادی کب کرو گے؟" پرکاش مُنہ بناتے ہوئے بولا۔ "ہے میری ہونے والی بھابی، کہاں ہو؟"

"پھر وہی بدتمیزی۔ وہ تو ہفتے کو دفتر سے ہی گھر چلی جاتی ہے۔ اب کل آفس میں ہی ملے گی۔" مدھو سودن نے سیگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "تیری طرح میں نے بھی اُسے تتلی سمجھا تھا۔ اور اسی ارادے سے اُس کی سادگی کو بھی بُرا مان کر اُس کا ایک دو بار اپمان بھی کر بیٹھا۔ پر اب تو اُن باتوں کو سوچ کر شرم آتی ہے وہ مجھے کتنا بدتمیز سمجھتی ہو گی۔"

"معافی مانگ لی ہوتی۔ آدھے مہینے سے ساتھ رہتے ہو۔ کیا بیچ کا اتنا تکلف بھی دُور نہیں ہوا؟"

"ارے یار! گھر کے کس کونے میں وہ رہتی ہے اس کا تو پتہ نہیں چلتا۔ کب کھاتی ہے۔ کب سوتی ہے، میں تو جان ہی نہیں پاتا۔ بڑی اچھی اور سیدھی لڑکی ہے۔ دل میں رحم آتا ہے کہ اگر باپ نہ مرا ہوتا تو کیوں بیچاری کو نوکری کرنی پڑتی۔ کبھی بھول کر بھی میں نے اُسے اپنی طرف نظر اُٹھاتے نہیں دیکھا۔ ایسی لڑکی سے معافی بھی کیسے مانگی جائے۔"

"تب تو معاملہ سنجیدہ ہے۔" پرکاش نے ذرا رُک کر کہا۔ "وہ لڑکی تجھ سے دل ہی دل میں نفرت کرتی ہے۔ تم نے شروع ہی میں اُس سے روکھا برتاؤ کر کے اُسے اپنی طرف سے شکی بنا دیا۔ نہیں تو تیرے کہنے کے مطابق اتنی اچھی لڑکی یوں ہاتھ سے نکل جاتی۔ بھلی لڑکیاں ملتی کہاں ہیں؟ تیری ذات کی بھی ہے۔ شادی ہو جاتی تو بیٹا عمر بھر چین کی بنسی بجاتے۔ پر اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ (سیگریٹ کا کش لگاتے ہوئے) میں رامیشور سے مل آؤں تب تک تم شیو کر کے طیار ہو جاؤ۔ آج میٹنی شو دیکھیں گے۔ سکنلا

بے نادانی میں۔

پرکاش تو سیٹی بجاتا نیچے اُتر گیا۔ لیکن مدھوسودن کا دل خیالات کی آماجگاہ بن گیا۔ گوری کو وہ بہت اچھی اور سیدھی سادی لڑکی سمجھنے لگا تھا۔ گوری کی نظروں میں کہیں نیچے نہ گر جاؤں اس خیال سے اگر وہ گوری سے کوئی بات کہتا بھی تو بہت ناپ تول کر ـــــ وہ اس سے نفرت کرتی ہے۔ اس لئے اس کی طرف کبھی نہیں تاکتی۔ یہ خیال اُسے بے چین کرنے لگا۔ اور ساتھ ہی پرکاش کا وہ اشارہ بھی بچھو کے ڈنک کی طرح تڑپانے لگا کہ وہ اسی کی ذات کا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو اُسے اپنا زندگی کا ساتھی بنا کر ایک آرام دہ خانگی زندگی بسر کر سکتا تھا۔ لیکن گوری تو اس سے نفرت کرتی ہے۔ گذشتہ واقعات ایک ایک کر کے اُس کی آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔ ممکن ہے پرکاش کی بات ٹھیک ہو۔ ابھی پرسوں ہی تو بس کے ٹکٹ کے پیسے نہ ہونے سے اُس نے کنڈکٹر سے دوسرے دن دینے کا وعدہ کیا۔ لیکن پاس بیٹھے مدھوسودن سے ایک دونی تک اُدھار نہ مانگی۔

موٹے رام پہاڑی کے ہاتھ اُس نے ٹیوشن پر عرضی بھجوائی۔ میرا ہوٹل وہیں کیا میرے ہاتھ نہ بھیج سکتی تھی۔ بھلا بھیجتی کیسے۔ میں نے تو پہلے ہی اُجڈ کی طرح اُس کی چائے تک نہ لی۔ میرے گنوارپن کی بھی کوئی حد ہے۔ موٹے رام سے دونوں وقت چائے بنوا کر پیتا ہوں۔ پر ایک دن بھی اُسے چائے پر نہیں بلایا۔ پھر اُسے یاد آیا کہ گوری اُس کے چائے پیتے وقت کبھی کمرے میں رہتی ہی نہیں۔ اُف، اتنی اچھی لڑکی اُس نے ہاتھ سے کھو دی۔ ایسی سیدھی سادی۔ محنتی۔ شیریں زبان .... یہی نہیں۔ وہ دل سے اُس سے نفرت کرتی ہے۔ وہ کیسے اس کا شبہ دور کرے کہ وہ بے رنگ و بو اور بداخلاق نہیں ہے۔ مدھوسودن پریشانی کی وجہ سے لیٹا نہ رہ سکا۔ اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ گذشتہ ایک ایک برتاؤ۔ ایک ایک بات اُسے تکلیف پہنچا رہا تھا کیسے وہ گذشتہ باتوں کو بھلا کر نئی زندگی کا آغاز کرے۔

دہلی کے پتے پر گوری نے اجیت کا خط منگوایا تھا۔ پوسٹ مین کی ٹِکٹِک کی طرف اُس کے کان لگے تھے۔ آفس کو دیر ہو رہی تھی لیکن وہ دروازے پر کھڑی انتظار کر رہی تھی۔ پہلے سوا نو کے بعد مدھوسودن اکیلا ہی دفتر چلا جاتا تھا۔ لیکن آج بڑی نرمی سے اُس نے پوچھا۔ "مس شرما کیا طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اگر ٹھیک نہ ہو تو آرام کیجئے میں عرضی دے دوں گا۔" گوری نے سہم کر آہستہ سے جواب دیا۔ "نہیں میری ایک سہیلی آنے والی تھی۔ اُس کا انتظار کر رہی ہوں۔"

مدھوسودن نے لہجے کو اور نرم کرتے ہوئے کہا۔ "کہئے تو رکشا لے آؤں اُن سے ملتے ہوئے پھر آفس چلے چلیں گے۔"

گوری ڈر گئی۔ خط اگرچہ اُس کے منگیتر کا ہی آنا تھا۔ پھر بھی اُس نے سوچا۔ میں شادی سے پہلے ہی خط و کتابت کرتی ہوں۔ یہ جان کر وہ اپنے دل میں مجھے کتنا گرا ہوا تصور کریں گے۔ اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "نہیں مسٹر شرما! آپ کیوں لیٹ ہوتے ہیں۔ میں دس بجے تک انتظار کرتی ہوئی پھر آفس چلی جاؤں گی۔ صاحب سے میں دیر میں آنے کو کہہ آئی تھی۔"

بادلِ ناخواستہ مدھوسودن سیڑھیاں اُتر گیا۔ شام کو جب ٹیوشن کر کے گوری واپس آئی تو روزمرہ کے خلاف آج مدھوسودن کمرے میں بیٹھا تھا۔ گوری کو دیکھ کر اُس نے ایک ہلکی سی آہ بھری۔ ماتھے کو دبایا اور سر کو کرسی پر ٹیک دیا۔ گوری نے سمجھ لیا کہ سر میں درد ہے۔ لیکن ہمدردی کا ایک لفظ بھی کہنے کی اُسے ہمت نہ پڑی۔ نہ جانے وہ اسے بھی کہیں عورتوں کی مایا ہی نہ سمجھیں۔ نیچے اُتر کر اُس نے موٹے رام کو بلا کر اسپرین منگائی اور اُسی سے مدھوسودن کو دینے کے لئے کہہ کر آپ چپ چاپ بارچہ میں جا کر چائے بنانے لگی۔

"بابو جی، لو، اسپرین کھا لو۔" موٹے رام نے آکر کہا۔ "آج صبح کو چائے نہیں پی، اسی سے سر میں درد ہوگا۔" مدھوسودن نے آنکھیں کھول کر کہا۔ "تجھے کس نے کہا کہ سر میں درد ہے۔ تیرے ہاتھ کی ردّی چائے پیتے پیتے ہی تو سر میں درد رہنے لگا ہے۔ اتنی مدّت ہوگئی پر چائے بنانا نہ آیا تمہیں۔"

ایک تو وہ دوا لایا۔ روزانہ دونوں وقت چائے بنا کر دیتا ہے۔ اس پر یہ رُعب ـــ "رکھئے نہیں یہ چار روپے مہینہ۔" موٹے رام نے پڑیا میز پر پٹکی اور بولا ـــ "تو بابو آپ کی انگیٹھی اُوپر پہنچا دوں گا۔ خود اچھی بنا کر پی لینا۔"

"ارے بھائی۔ ناراض مت ہو۔ بنا تو تیرے ہی ہاتھ کی ہے۔ بھلا میں کہاں بناتا پھروں گا۔" پُرامید نگاہوں سے مدھوسودن نے بارچہ کی طرف دیکھا۔ گوری چائے بنا کر گھونٹ بھر رہی تھی۔ خود کو سنبھال کر اُس نے بلند آواز میں کہا۔ "یہاں مر بھی جاؤں گا تو کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ جانا

ایک پیالہ۔"

گوری کا گھونٹ کڑوا ہو اٹھا۔ یہ کیسا طنز؟ کیا وہ ایک پیالہ چائے کہنے پر نہ بنا دیتی اور بنا کے وہ کیسے بنا دے؟ اُسے پہلے دن کی چائے کی گفتگو بھولی نہ تھی۔ اُس نے بڑے آرام سے پوچھا۔ "مسٹر شرما۔ ابھی چائے کیتلی میں گرم ہے۔ آپ چاہیں تو ایک پیالہ بنا دوں۔"

"دیجئے نا!" مدھوسودن جلدی سے بولا۔ "آپ تو اکیلے ہی پیئے جا رہی ہیں"۔

گوری نے موٹے رام کے ہاتھ چائے بھجوا دی۔ وہی موٹے کھردرے کتھا چونے سے لتے پتے ہاتھ۔ مدھوسودن کو پینے میں لطف نہ آیا۔

گوری سوئیٹر بن رہی تھی۔ مدھوسودن حیران تھا کہ بھائیوں کے لئے بُن چکی ہے۔ اپنے بھی دو سُئیٹے ہیں۔ اب یہ بڑے سائز کا مردانہ سلیٹی رنگ کا سوئیٹر کس کے لئے؟ اور کیسے سفید مَل میں لپیٹ کر احتیاط سے رکھتی ہے۔ کیا اس کا کوئی محبوب ہے؟ ضرور ہوگا۔ ایسی سلیقہ شعار محنتی لڑکی سے محبت کرنا کوئی بھی خوش قسمتی سمجھیگا۔ لیکن کیا اب مدھوسودن کو کوئی اُمید نہ رکھنی چاہیئے۔ اپنی بے وقوفی سے اُس نے دیر کر دی۔ لیکن کیا وہ کسی اور سے خوبصورتی میں کم ہے۔ اُس نے گوری سے پوچھا "مس شرما! یہ اپنی نازک اُنگلیوں سے آپ کس خوش قسمت کا پل اوور بُن رہی ہیں۔"

اچانک اس نئے لہجے کوسن کر گوری ششدر ہو گئی۔ بات ٹالنے کو وہ روکھی ہنسی ہنس کر بولی۔ "آپ بُنوا لیجئے گا۔ لائیے آپ کو بھی بُن دوں۔"

"نہیں آپ یہی دے دیں۔" مدھوسودن اُس کے نزدیک آ کر بولا۔ "کتنی پیاری بُنائی ہے۔"

گوری نے دھیمے سے کہا۔ "یہی بنائی ڈال دوں گی۔"

"تو آخر آپ یہی کیوں نہ دے دیں۔ کیا یہ کسی بہت عزیز کے لئے بُن رہی ہیں؟"

شرم، تکلیف اور ہچکچاہٹ سے گوری کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ زمین پر نظریں گاڑ کر بولی۔ "مجھے معاف کریں گے مسٹر شرما..... یہ پل اوور میرے ہونے والے شوہر کا ہے۔" اور وہ سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ یہ درویش دل نوجوان اپنے دل میں کیا کہتا ہوگا۔ کہ شادی سے پہلے ہی آنکھیں لڑا بیٹھی ہے۔ اسے کیسے سمجھاؤں۔

"شوہر کا یا بہنوئی کا" مدھوسودن کی آواز خشک ہو گئی۔

"بھائی! میری سگائی تو ہو چکی ہے۔" گوری نے نرمی سے جواب دیا۔

"اچھا۔" مدھوسودن کے دل پر جیسے گھونسا لگا۔ وہ اُٹھ کر کمرے میں آ گیا۔ شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ وہ اپنے دل میں کیا کہتی ہوگی۔ کیسی خلافِ تہذیب بات میرے مُنہ سے نکل گئی۔ میں بھی کتنا بد قسمت ہوں۔ اگر پہلے ہی دیکھ بھال کرتا تو کیا آج یہ میری آنکھوں کے سامنے ہی کسی غیر کی ہو جاتی۔ بیکار کی کھیج سے مدھوسودن کے آنسو نکل آئے۔ لیکن اُسے پہلے سے بھی زیادہ بے لاگ طریقے سے برتاؤ کرنا ہوگا۔ نہیں تو اُس کی نظروں میں میں ایک غنڈے سے زیادہ نہ رہ جاؤں گا۔

مدھوسودن جانے کب سو گیا۔ پر گوری تو اس رات سو ہی نہیں سکی۔ نہیں اب اس کمرے میں وہ اور زیادہ نہیں رہے گی۔ کہیں بھی ہو الگ انتظام کریگی۔ وہ سوچتے ہوں گے۔ صرف دنیا کو دکھانے کے لئے میں کھدر پہنتی ہوں۔ پوڈر، لپ اسٹک اور کریم استعمال نہیں کرتی اور اندر ہی اندر کسی کو چاہتی ہوں۔ ابھی تو وہ غیر مرد ہی ہیں۔ جب تک شادی نہیں ہو جاتی۔

دوسرے دن دونوں ہی ایک دوسرے کو نظریں اُٹھا کر دیکھ نہ سکے۔ شام کو گوری نے ہمّت کر کے کہا۔ "آپ کو ضرورت ہو تو میں یہی پل اوور دے دوں۔ کل تک تیار ہو جائے گا۔"

"شکریہ مس گوری۔ میں کسی کا جوٹھا نہیں کھاتا۔" ارے یہ کیا کہہ گیا وہ۔ دفتر ہی سے وہ دوڑتا ہوا سیڑھیاں اُتر گیا۔ اُس دن رات بھر نہ لوٹا۔ قدسیہ باغ کے ایک کونے میں رات کاٹ دی۔ وہ کیسے معافی مانگے، کیسے اُس کے سامنے جائے۔

سورج کی شعاعوں نے جب زمین پر سے اوس کی چادر تک اُتار لی۔ تب وہ جلنے کیسے ہمّت کر کے گھر کی طرف چلا۔ آفس جانے کے لئے کپڑے بھی بدلنے تھے گھر آ گیا۔ دُور سے ہی اُس نے دیکھا۔ دروازے پر تانگہ کھڑا ہے اور موٹے رام اُوپر سے سوٹ کیس اُتار کر اس میں رکھ رہا ہے۔ کیا گوری جا رہی ہے؟ وہ لپک کر پہنچا۔ گوری سیڑھیاں اُتر رہی تھی۔

پریشانی کی حالت میں مدھوسودن نے پکارا:۔ "گوری۔"

"بھائی..... نہیں نہیں مسٹر شرما۔" گوری نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ "مجھے معاف کرنا۔ آپ کو اتنے دن بہت ہی تکلیف دی۔ پریشانیوں کا تو ٹھکانا ہی نہیں رات مجھے ایک جگہ مل ہی گئی۔ یہ لیجئے بجلی اور کرائے کے پیسے؟"

مدھوسودن کے ہاتھ میں آیا ہوا نوٹ وہیں گر پڑا۔

غزلیات

عطاالرحمٰن کاکوی

ساقی کی چشمِ ناز میں مے کی کمی نہ تھی — یہ اپنا ظرف تھا کہ مجھے بےخودی نہ تھی

دل دیکھنے میں خوش تھا مگر کچھ خوشی نہ تھی — اک طنز تھا زمانے پہ لب پر ہنسی نہ تھی

خالی پیالہ منہ سے لگائے ہوئے ہے — پاسِ ادب تھا بزم کا یہ سادگی نہ تھی

ساقی خدا سے خیر منا اپنی بزم کی — مستوں کو چھیڑنا بھی کوئی دل لگی نہ تھی

زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں تھی وقتِ خواب — تھا چاند دیکھنے کو مگر چاندنی نہ تھی

کس طرح بچتا خرمنِ ہستی عطا کا آج
بجلی کی کوند تھی یہ تمہاری ہنسی نہ تھی

یعقوب عثمانی

خوش فہمیوں کو غور کا یارا نہیں رہا — طوفاں کی زد سے دور کنارا نہیں رہا

بڑھ بڑھ کے ڈھونڈتے ہیں پناہیں نئی نئی — فتنوں کو تیرگی کا سہارا نہیں رہا

بیتابیاں بہلئے تمنا بڑھا گئیں — نقدِ سکوں گنوا کے خسارا نہیں رہا

قائم تھا جس کے دم سے بھرم احتیاج کا — ہمت کو وہ کرم بھی گوارا نہیں رہا

نازاں ہے اپنی فتح پہ اس طرح تو آج — جیسے کوئی حیات کا مارا نہیں رہا

خورشیدِ انقلاب کا آئینہ ہو تو ہو — مژگاں سے گر کے اشک ستارا نہیں رہا

یعقوب لمحے لمحے سے ظاہر ہے بےرخی
ساحل نوازِ وقت کا دھارا نہیں رہا

تلوک چند محروم

ہنسی پھولوں کی، ہو کر گلفشاں کچھ اور کہتی ہے — مگر بلبل بہ اندازِ فغاں کچھ اور کہتی ہے

مرا دل مجھ کو ضبطِ آہ پر مجبور کرتا ہے — زبانِ شعلۂ سوزِ نہاں کچھ اور کہتی ہے

حبابِ بحر کا دم ٹوٹتا ہے اور ساتھ اس کے — نشاطِ رقص میں موجِ رواں کچھ اور کہتی ہے

مسیحا کو ادھر دعویٰ ہے مردوں کے جلانے کا — ادھر نبضِ مریضِ ناتواں کچھ اور کہتی ہے

خلوصِ بےریا کمیاب ہے تہذیبِ حاضر میں — کہ دل میں اور کچھ ہے اور زباں کچھ اور کہتی ہے

مہ و خورشید و انجم کی ضیا باری بجا لیکن — زمیں کی تیرگی اے آسماں! کچھ اور کہتی ہے

مذاقِ عاشقی سے حضرتِ محروم منکر ہیں
مگر رنگینیٔ حسنِ بیاں کچھ اور کہتی ہے

نریش کمار شاد

اک تخیل ہے جو محتاجِ بیاں رہتا ہے — ہائے وہ حسن جو بےنام و نشاں رہتا ہے

رہ گیا ذوقِ تماشہ بھی تماشہ بن کر — ایک عالم مری جانب نگراں رہتا ہے

سب جسے دشمنِ جاں کہتے ہیں وہ دردِ ترا — خون بن کر مری رگ رگ میں رواں رہتا ہے

زندگی گوش برآواز ہوئی ہے جب سے — ہر نفس پر تری آہٹ کا گماں رہتا ہے

یاد آ جاتی ہے جب تیرے تبسم کی ہمیں — دیر تک دل میں چراغاں کا سماں رہتا ہے

موت بھی زیست ہے اس رزم گہِ ہستی میں — بوالہوس ہیں جنہیں اندیشۂ جاں رہتا ہے

اہلِ احساس کو اس درد بھری دنیا میں — اپنے آلام کا احساس کہاں رہتا ہے

واہ کیا شعبدہ ہے شاہدِ فطرت کا جمال — رہ کے نظروں میں بھی نظروں سے نہاں رہتا ہے

میرا احساس ہے یا کوئی جہنم یارب — جو بہر لمحہ دل و جاں میں تپاں رہتا ہے

شاد یہ دل کا فسانہ بھی فسانہ ہے عجب
جو بیاں ہو کے بھی محتاجِ بیاں رہتا ہے

خواجہ احمد فاروقی

غالب کا اُردو دیوان

غالب کا تصحیح کیا ہُوا

غالب کی زندگی میں اُن کے اُردو دیوان کے پانچ ایڈیشن شائع ہوئے تھے

پہلا ایڈیشن ۱۸۴۱ء (۱) دہلی کے قیام نے غالب کی شاعرانہ زندگی پر بڑا اچھا اثر کیا۔ انھوں نے معترضین کے کہنے سننے سے وہ غلط روش چھوڑ دی۔ جس میں "مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا" اور مولوی فضل حق اور مرزا خانی کے اصرار سے اُردو دیوان کا وہ انتخاب بھی کیا جو اب تک رائج ہے۔ یہی انتخاب پہلی مرتبہ سید المطابع سے جو سر سید احمد خاں مرحوم کے بھائی سید محمد خان بہادر نے قائم کیا تھا۔ اکتوبر ۱۸۴۱ء میں شائع ہوا۔ مرزا نے جس دیوان سے انتخاب کیا تھا۔ وہ بھی نسخہ حمیدیہ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

مرزا کے انتخاب کے شروع میں اُن کا فارسی دیباچہ اور نواب ضیا الدین خاں کی وہ تقریظ شامل ہے جو سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید میں نقل کی ہے۔

اس کا ایک نسخہ رام پور کی پبلک لائبریری میں موجود ہے۔ سرورق پر حسبِ ذیل عبارت ہے۔

دیوان اسد اللہ خاں صاحب غالب تخلص
مرزا نوشہ صاحب مشہور کا دیوان دہلی میں سید محمد خان بہادر کے چھاپہ خانہ کے
لیتھو گرافک پریس میں شہر شعبان
۱۲۵۷ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۸۴۱ء کو سید عبد الغفور کے اہتمام
میں چھاپا ہوا[1]

دوسرا ایڈیشن ۱۸۴۷ء (۲) غالب کے اُردو دیوان کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں منشی نور الدین کے مطبع دار السلام حوض قاضی دہلی سے شائع ہوا، اس میں بھی غالب کا فارسی دیباچہ اور نیرِ درخشاں کی تقریظ شامل ہے۔

(۳ و ۴) غدر سے چند روز پہلے مرزا غالب نے اپنے دیوان کا ایک نسخہ خوش خط لکھوا کر نواب یوسف علی خاں والیٔ رام پور کو بھیجا تھا:

غالب منشی شیو نرائن اکبر آبادی کو لکھتے ہیں:۔

"اب تم سنو۔ دیوان ریختہ اتم و اکمل کہاں تھا؟ مگر ہاں میں نے غدر سے پہلے لکھوا کر نواب یوسف علی خاں بہادر کو رام پور بھیجا تھا[1]"

مرزا نے اُسی کی ایک نقل نواب ضیاء الدین احمد خاں کو بھی دی تھی۔

سنہ ۱۸۶۵ء میں مرزا رام پور گئے۔ وہاں میرٹھ کے ایک شخص عظیم الدین احمد کا خط ملا کہ میں آپ کا اُردو دیوان شائع کرنا چاہتا ہوں۔ اجازت دی جائے۔ نواب شیفتہ نے عظیم الدین احمد کی سفارش کی اور کاپیوں کی اصلاح کا ذمہ لیا۔ مرزا غالب عظیم الدین احمد کو نہیں جانتے تھے لیکن شیفتہ کے اصرار سے مجبور ہو کر نواب ضیاء الدین خاں والا قلمی نسخہ میرٹھ بھیج دیا۔

منشی شیو نرائن آرام مالک مطبع مفید خلائق آگرہ کو جب معلوم ہوا کہ مرزا اپنا دیوان میرٹھ میں چھپوا رہے ہیں تو انھوں نے شکایت کا خط لکھا کہ آپ نے گھر کا مطبع چھوڑ کر اپنا دیوان میرٹھ چھپنے کے لئے کیوں بھیجا۔ غالب اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

"میاں، دیوان کے میرٹھ میں چھاپے جانے کی حقیقت سُن لو۔ تب کچھ کلام

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو غالب کی شعر گوئی مقالہ امتیاز علی خاں عرشی ص ۱۱۰ - ۱۱۱

[1] اُردوئے معلیٰ ص ۱۸۳ نیز خطوط غالب ص ۳۰۴

کرو۔ میں رام پور میں تھا کہ ایک خط پہنچا۔ سرنامے پر لکھا تھا:

"عرضداشت عظیم الدین احمد من مقام میرٹھ" واللہ باللہ اگر میں جانتا ہوں کہ عظیم الدین کون ہے اور کیا پیشہ رکھتا ہے۔ بہرحال پڑھا۔ معلوم ہوا کہ ہندی دیوان اپنی سوداگری اور فائدہ اُٹھانے کے واسطے چھاپا چاہتے ہیں خیر۔ چُپ ہو رہا۔ جب میں رام پور سے میرٹھ آیا۔ بھائی مُصطفیٰ خاں صاحب کے ہاں اُترا۔ وہاں منشی ممتاز علی صاحب، میرے قدیم دوست مجھ کو ملے اُنھوں نے کہا کہ اپنا اُردو کا دیوان مجھ کو بھیج دیجئے گا۔ عظیم الدین ایک کتاب فروش اس کو چھاپا چاہتا ہے۔ اب تم سنو۔ دیوانِ ریختہ اتم و اکمل کہاں تھا؟ مگر ہاں، میں نے غدر سے پہلے لکھوا کر نواب یوسف علی خان بہادر کو رام پور بھیج دیا تھا۔ اب جو میں دِلّی سے رام پور جانے لگا تو بھائی ضیاء الدّین خاں صاحب نے مجھ کو تاکید کر دی تھی کہ تم نواب صاحب کی سرکار سے دیوانِ اُردو لے کر، اس کو کسی کاتب سے لکھوا کر مجھ کو بھیج دینا۔ میں نے رام پور میں کاتب سے لکھوا کر بہ سبیلِ ڈاک ضیاء الدّین خاں کو دِلّی بھیج دیا تھا۔ آمدم بر سرِ مدعائے سابق۔ اب جو منشی ممتاز علی صاحب نے مجھ سے کہا تو مجھے یہی کہتے بن آئی کہ اچھا دیوان تو میں ضیا الدّین خاں سے لے کر بھیج دوں گا مگر کاپی کی تصحیح کا ذمّہ کون کرتا ہے؟ نواب مصطفیٰ خاں نے کہا کہ "میں" اب کہو میں کیا کرتا۔ دِلّی آکر ضیاء الدین خاں سے دیوان (لے کر) ایک آدمی کے ہات نواب مصطفیٰ خان کے پاس بھیج دیا۔ اگر میں اپنی خواہش سے چھپواتا تو اپنے گھر کا مطبع چھوڑ کر پرائے چھاپے خانے میں کتاب کیوں بھجواتا؟ آج اسی وقت میں نے تم کو یہ خط لکھا اور اسی وقت بھائی مصطفیٰ خاں صاحب کو ایک خط بھیجا ہے اور ان کو لکھا ہے: اگر چھاپا شروع نہ ہوا ہو، تو نہ چھاپا جائے۔ اور دیوان جلد میرے پاس بھیجا جائے۔ اگر دیوان آ گیا تو فوراً تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ اور اگر وہاں کاپی شروع ہو گئی ہے تو میں ناچار ہوں۔ میرا کچھ قصور نہیں۔ اور اگر (اس) سرگذشت کو بھی سن کر مجھ کو گنہگار ٹھہراؤ تو اچھا، میرا بھائی، میری تقصیر معاف کیجیو۔ رمضان اور عید کا قصہ لگا ہوا ہے۔ یقین ہے کہ کاپی شروع نہ ہوئی ہو اور دیوان میرا میرے پاس آئے اور تم کو پہنچ جائے [1]

غالب کو وہ نسخہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے مل گیا اور انھوں نے اسے پارسل سے منشی شیونرائن کو بھیج دیا۔ ۲۵ جون ۱۸۶۲ء کے خط میں لکھتے ہیں:۔

"صاحب میں تمہارا گنہگار ہوں۔ تمہاری کتاب میں نے دبا رکھی ہے۔ بڑی کوشش اور محنت سے اُس کو وہاں نہ چھپنے دیا اور منگوا لیا۔ آج پیر کے دن ۲۵ جون کو پارسل کی ڈاک میں روانہ کیا ہے۔ لو اب میری تقصیر معاف کرو اور مجھ سے راضی ہو جاؤ اور اپنی رضامندی کی مجھے اطلاع دو۔ یہ کتاب یعنی دیوان ریختہ تم کو میں نے دے ڈالا۔ اب اس کے مالک تم ہو، میں نہیں کہتا کہ چھاپو۔ میں نہیں کہتا کہ نہیں چھاپو۔ جو تمہاری خوشی ہو سو کرو۔ اگر چھاپو تو بیس جلد کا خریدار مجھ کو لکھ لو اور اچھا میرا میاں ذرا تصحیح کا بہت خیال رکھیو [1]

یہ خط اور یہ دیوان پنڈت گوپی ناتھ کنزرو کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ دیوان ہر طرح مکمل تھا۔ ۳ جولائی کے خط میں لکھتے ہیں:

"میاں تمہاری باتوں پر ہنسی آتی ہے۔ یہ دیوان، جو میں نے تم کو بھیجا ہے اتم و اکمل ہے۔ وہ اور کون سی دو چار غزلیں ہیں جو مرزا یوسف علی خاں عزیز کے پاس ہیں اور اس دیوان میں نہیں۔ اس طرف سے آپ خاطر جمع رکھیں کہ کوئی مصرع میرا اس دیوان سے باہر نہیں [2]"

منشی شیونرائن غالباً اس دیوان میں تصویر بھی شائع کرنا چاہتے تھے۔ اس کے متعلق مرزا غالب لکھتے ہیں:

"تصویر میری لے کر کیا کرو گے۔ بے چارہ عزیز کیوں کر کھچوا سکے گا۔ اگر ایسی ہی ضرورت ہے تو مجھ کو لکھو، میں مصور سے کھچوا کر تم کو بھیج دوں، نہ نذر درکار، نہ نیاز، میں تم کو اپنے فرزندوں کے برابر جانتا ہوں۔ اور شکر کی جگہ ہے کہ تم فرزندِ سعادت مند ہو۔" [3]

لیکن یہ دیوان ابھی منشی شیونرائن کے یہاں چھپنا بھی شروع نہیں ہوا تھا کہ غالب نے اس کے چھاپنے کی اجازت محمد حسین خاں مالک مطبع احمدی شاہدرہ دہلی کو دے دی مگر یہ ایڈیشن (۱۸۶۱ء) اتنا غلط چھپا کہ مرزا نے دو دن اور رات کی محنت سے اس کو صحیح کیا اور تصحیح کیا ہوا نسخہ محمد حسین خاں مالک مطبع کو بھیج دیا۔ غالب کے ہاتھ کا درست کیا ہوا یہ نسخہ جو محمد حسین خاں کو بھیجا گیا تھا۔ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں موجود اور محفوظ ہے۔

---

[1] خطوط غالب مرتبہ مہیش پرشاد ص ۴۰۳ - ۴۰۴

[1] خطوط غالب۔ مرتبہ مہیش پرشاد ص ۴۰۴

[2] خطوط غالب ص ۴۰۵ [3] ایضاً

اس کے حاشیہ پر غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ عبارت درج ہے :-

" جناب محمد حسین خاں کو میرا سلام پہنچے۔ دو رات دن کی محنت میں میں نے اس نسخہ کو صحیح کیا ہے۔ غلط نامہ بھی اسی میں درج کر دیا ہے۔ گویا اب غلط نامہ بیکار محض ہو گیا ہے۔ خاتمہ کی عبارت کیا، میرا بیان کیا، میر قمر الدین کا اظہار اب کچھ ضرور نہیں۔ کس واسطے کہ اب یہ کتاب اور مطبع میں چھاپی جائے گی۔ یہ مجلد گویا مسودہ ہے۔ اسی کو بھیج دیجئے۔ غالب ۱۲ " [1]

آخر دیوان پر مرزا غالب کی مہر بھی ہے۔ یہ دیوان جس کی اصلاح مرزا غالب نے کی ہے ۲۰ محرم ۱۲۷۸ھ کو طبع ہوا ہے۔ لکھا ہے :

" در مطبع احمدی باہتمام امو جان طبع شد "

تقریظ کی عبارت نواب محمد ضیاء الدین خاں بہادر نے لکھی ہے۔ اس نسخہ میں مرزا غالب نے مندرجہ ذیل عبارت کاٹ دی ہے :

تیسرا ایڈیشن ۱۸۶۱ء

" داد کا طالب غالب گزارش کرتا ہے کہ یہ دیوان اردو تیسری بار چھاپا گیا ہے۔ مخلص و داد آئین میر قمر الدین کی کارفرمائی اور خان صاحب الطاف نشان محمد حسین خاں کی دانائی مقتضی اس کی ہوئی کہ دس جزو کا رسالہ ساڑھے پانچ جزو میں منطبع ہوا۔ اگرچہ یہ انطباع میری خواہش سے نہیں لیکن ہر کاپی میری نظر سے گزرتی رہی ہے اور اغلاط کی تصحیح ہوتی رہی ہے۔ یقین ہے کہ کسی جگہ حرف غلط نہ رہا ہو۔ مگر ہاں ایک لفظ میری منطق کے خلاف نہ ایک جگہ بلکہ سو جگہ چھاپا گیا ہے۔ کہاں تک بدلتا۔ ناچار جا بجا یوں ہی چھوڑ دیا۔ یعنی کسو بہ کاف مکسور و سین مضموم و واؤ معروف۔ میں نہیں کہتا کہ یہ لفظ صحیح نہیں البتہ فصیح نہیں۔ قافیہ کی رعایت سے اگر لکھا جائے تو عیب نہیں بلکہ وا.نہ (کذا) فصیح بلکہ افصح کسی ہے، واؤ کی جگہ یائے تحتانی میرے دیوان میں ایک جگہ قافیہ کسو بہ واؤ ہے اور سب جگہ کسے بہ یائے تحتانی ہے۔ اس کا اظہار ضرور تھا۔ کوئی یہ نہ کہے کہ یہ کیا آشفتہ بیانی ہے۔ اللہ بس ماسوا ہوس؟

اس دیوان میں قطعات اور رباعیات بھی ہیں۔ ذیل کا قطعہ اور جگہ بھی دیکھا ہے لیکن اس کا چوتھا شعر دیکھنا اچھی طرح یاد نہیں۔ اس وقت حضرت جوش ملسیانی والا ایڈیشن میرے سامنے موجود ہے۔ اس میں یہ شعر درج نہیں ہے [1]

ہے چار شنبہ آخر ماہ صفر چلو
رکھ دیں چمن میں بھر کے مے مشک بو کی ناند
جو آئے جام بھر کے پیئے اور ہو کے مست
سبزے کو روندتا پھرے، پھولوں کو جائے پھاند
غالب یہ کیا بیاں ہے بجز مدح بادشاہ
بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشتۂ خواند
بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلّے حضور میں
ہے جن کے آگے سیم و زر مہر و ماہ ماند
یوں سمجھئے کہ بیچ سے خالی کئے ہوئے
لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

محمد حسین خاں نے یہ نسخہ جس پر مرزا غالب نظر ثانی کر چکے تھے محمد عبدالرحمن خاں مہتمم مطبع نظامی کانپور کو بھی بھیجا تھا [2]

چوتھا ایڈیشن ۱۸۶۲ء

اس طرح دیوان اردو کا تیسرا ایڈیشن جولائی ۱۸۶۱ء میں مطبع احمدی شاہدرہ سے اور چوتھا ایڈیشن جون ۱۸۶۲ء میں مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوا

پانچواں ایڈیشن ۱۸۶۳ء

غالب کے دیوان کا پانچواں ایڈیشن وہ ہے جو منشی شیو نرائن نے ۱۸۶۳ء میں بغیر تقویم کے شائع کیا۔

---

[1] دیوانِ غالب تصحیح کردہ غالب مملوکہ کتب خانۂ آصفیہ

[1] دیوانِ غالب (طبع اول) مرتبہ جوش ملسیانی ص ۲۲۷، ۲۲۸ [2] ذکرِ غالب (طبع ثانی) ص ۱۳۳

محمد مصلح الدین احمد

مصدق

ایرانی عوام کے ہر دلعزیز قائد نے ۱۸۸۱ء میں شاہی خاندان میں آنکھیں کھولیں - لیکن عجب بات یہ ہے کہ ابتدا ہی سے انہوں نے شاہی کے خلاف بغاوت کی - اس عمومیت پسند ایرانی کے خاندان کا شمار ایران کے متمول ترین خاندان میں کیا جاتا ہے - لیکن اس کے باوجود غریبوں کے لئے تڑپنے والا دل اس آہنی انسان کے سینے میں دھڑک رہا ہے - آپ کے والد مرزا ہدایت ایران کے بڑے زمیندار اور تیس سال تک وزیر مالیہ تھے - آپ کے ماموں شہزادے تھے اور آپ کی والدہ محترمہ نجمہ سلطانہ ایک قاچار شہزادی تھیں - ڈاکٹر مصدق کی تعلیم تہران اور سوئٹزرلینڈ میں ہوئی - آپ نے فارسی اور عربی کے کلاسیکل ادب پر عبور حاصل کیا - آپ قومی زبان فارسی کے اتنے شیدائی ہیں - کہ فرانسیسی و انگریزی میں ملکہ رکھنے کے باوجود آپ فارسی ہی میں گفتگو کرنے کو ترجیح دیتے ہیں - آپ آکسفورڈ یونیورسٹی کے ذہین ترین طالب علموں میں سے ہیں - یہیں سے آپنے قانون کی اعلیٰ ترین ڈگری (ایل - ایل - ڈی) حاصل کی - مسٹر ہنری گریڈی سابق امریکی سفیر برائے ایران کے بموجب "مصدق تو غیر معمولی قابلیت کے آدمی ہیں - ان کی تعلیم یورپی جامعات میں ہوئی وہ بہت شائستہ آدمی ہیں اور ایک شریف النسل ایرانی ہیں" - پیرس کے قیام کے دوران میں تین سال تک آپ نے سیاسیات و مالیات کا عمیق مطالعہ کیا -

سیاسی زندگی کا آغاز

آپ نے ایرانی مجلس کے ایک رکن کی حیثیت سے وزارت عظمیٰ تک ترقی کی - آپ پچاس سال سے سیاسیات میں حصہ لے رہے ہیں - شاہ نے جب آپ کو مالیاتی ایجنٹ بنا کر خراسان بھیجا اس وقت آپ کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی - دس سال بعد آپ واپس ہوئے - ۱۹۱۷ء میں وزارت مالیات میں آپ کو نائب معتمد بنا دیا گیا - آپ نے سینکڑوں افسروں کو مالی اور سیاسی اسباب کی بنا پر برطرف کر دیا - جس کے باعث کئی لوگ آپ کے دشمن تھے - ان کی تنخواہیں زیادہ تھیں اور یہ غیر ملکی ایجنٹ تھے - انہیں کم تنخواہوں پر کام کرنا منظور نہ تھا - اس لئے برطرف ہونا پڑا - آپ کو قتل کی دھمکیاں دی گئیں - آخر کار آپ پر گولی چل ہی گئی - لیکن خوش بختی کہ آپ بچ نکلے - جب ایران نے با مجبر برطانیہ سے معاہدہ کیا تو اس کی آپ نے سختی سے مخالفت کی -

۱۹۲۰ء میں آپ کو صوبہ فارس کا گورنر جنرل بنا دیا گیا - ۱۹۲۱ء میں پہلی دفعہ آپ نے مجلس کی نشست کے لئے کوشش کی اور کامیاب ہوئے اس کے بعد آپ اس سے بھی سبکدوش ہوئے کیونکہ انہیں ۱۹۲۲ء میں وزارت مالیہ کی پیشکش کی گئی - بعد میں آذربائیجان کے گورنر جنرل بنا دئے گئے - ۱۹۲۴ء میں پھر مجلس (ایرانی سنات) کے لئے منتخب ہوئے اور ۱۹۲۸ء تک رہے - پھر ۱۹۴۴ء میں تہران کے نائب منتخب ہوئے - آپ نے ہر وقت مجلس میں جو شاہ پرستوں سے بھرپور تھی شاہ کی پرزور مخالفت کی -

کابینی ریکارڈ

۱۹۲۲ء میں جب آپ کو وزیر مالیہ بنا دیا گیا تو آپ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اعلیٰ عہدیداروں کی تنخواہوں میں کمی کی - جس کی وجہ سے تمام اعلیٰ عہدیدار آپ کے مخالف ہو گئے اور دوبارہ آپ پر گولی چلائی گئی - آپ کا خیال تھا کہ اس طرح سے عام لوگوں کے معیار زندگی کو بلند کیا جا سکتا ہے - تودہ پارٹی (کمیونسٹ جماعت) نے آپ کے بڑھتے ہوئے اختیارات کے خلاف احتجاج کیا - ڈاکٹر مصدق بحث کرتے کرتے بیہوش ہو گئے - نتیجتہً احتجاج واپس لے لیا گیا - اسی زمانے میں آپ نے برطانیہ کے خلاف جدوجہد کی اور ایران ایرانیوں کے لئے کا نعرہ لگایا - آپ نے نہ صرف وزیر مالیہ کی حیثیت سے قوم کی خدمت کی بلکہ وزارت خارجہ کی ذمہ داریاں بھی سنبھالیں - چنانچہ بین الاقوامی قانون کے اس ماہر نے ایرانی وزیر خارجہ کی حیثیت میں کئی کارہائے نمایاں انجام دئے آپ محب وطن کی حیثیت سے ایران کو اس کے جائز اور غصب شدہ حقوق واپس دلوانا چاہتے تھے اس لئے برطانوی سفیر سے آپ کے تعلقات کشیدہ

رہے جو ہر طرح سے اپنے مفاد حاصل کرنا چاہتے تھے ۔ اسی وجہ سے ۱۹۴۲ء تک مغربی صحافت پر آپ کا اثر قائم نہ ہو سکا ۔

غیر ملکی اثر کے خلاف جدوجہد

ڈاکٹر مصدق کی خصوصیت ہے کہ وہ صحیح قوم پرور رہنما ہیں جن کے نزدیک ایران اور ایرانیوں کی فلاح مقدم ہے اس لئے آپ ہر اس طاقت کے مخالف ہو جاتے ہیں جو ایران کو ترچھی نگاہوں سے دیکھنے کی کوشش کرے شاہی کی مخالفت بھی آپ نے کی ہے ۔ برطانوی سامراجیت کے تو سب سے بڑے دشمن ہیں ۔ نہ صرف یہ بلکہ اقوام متحدہ اور امریکہ تک کو آپ پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتے کیونکہ ان کے مطابق ان دونوں نے جانبداری سے کام لے کر برطانیہ کی پیٹھ ٹھونکی اور ایران کو دبانا چاہا ۔ آپ کے کہنے کے مطابق "ایران کی تباہی کی ساری ذمہ داری اینگلو ایرانین آئل کمپنی پر ہے اور مسٹر حسین مکی کی تشریح کے بموجب" ایرانی عوام کی تباہ حالی برطانیہ کی استحصال پسندانہ حکمت عملی کا نتیجہ ہے "۔ واقعتاً برطانوی روپے نے مرے پر سو درے کا کام کیا ۔ روس کے آپ اس لئے مخالف ہیں کہ آپ نہیں چاہتے کہ تیل کے چشمے روسیوں کے زیر تصرف آ جائیں ۔ اس لئے آپ نے روس کو مراعات دینے کی مخالفت کی ۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء میں مجلس میں ایک مسودۂ قانون پیش کیا اور ایک بصیرت افروز تقریر کے نتیجے کے طور پر ایران نے قرارداد کو باتفاق آرا منظور کر لیا اگرچہ کہ تودہ پارٹی نے سخت مخالفت کی اور ان کو غدار ٹھہرایا ۔ شاید اس لئے کہ مصدق نے اپنے وطن کو روس کے ہاتھوں بکنے سے انکار کر دیا ۔ ایرانی تیل کے چشمے ہمیشہ ایران کی آزادی کے لئے ایک آزمائش بنے رہے ۔ اور ہر ملک کی للچائی نظریں ان پر پڑتی رہیں ۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء میں روسی و برطانوی فوجوں نے ایران پر قبضہ کر لیا ۔ ایسے نازک موقعہ پر اکیلے مصدق نے بے باکی سے غیر قومی اقتدار کے خلاف آواز بلند کی ۔ ۱۹۴۴ء میں شمالی ایران میں روس کو تیل کی مراعات دینے کے سلسلے میں محب قوم ڈاکٹر مصدق نے بڑی دانشمندی سے ایرانی پارلیمان میں ایک بل منظوری کے لئے پیش کیا ۔ جس کی رو سے کسی بھی ایرانی عہدیدار کو تیل کے متعلق بیرونی ممالک سے گفت و شنید کرنے کا اختیار نہ دینے کی وکالت کی گئی اور اصرار کیا کہ ایسا کرنے کی صورت میں ۸ سال کی سزا دی جائے علاوہ ازیں آپ نے ایران میں ریل بچھانے کے لئے بیرونی کمپنیوں کو ٹھیکہ دینے کی سختی سے مخالفت کی ۔ ڈاکٹر مصدق نے روس کی اس وقت بھی مخالفت کی جبکہ اس نے آذربائیجان پر قبضہ کر لیا ۔ لیکن جنرل علی رزم آرا کے دور میں کئے ہوئے معاہدے ہی کی مدد سے جس کی رو سے کسی بھی بیرونی حملے کی صورت میں روس کو مسلح فوجی مداخلت کا حق حاصل ہے ۔ آپ نے محض اسی معاہدے کی آڑ لے کر برطانیہ کو آبادان سے دست بردار ہونے پر مجبور کیا ۔ اور اب بھی تیل کی صنعت کے پیدا شدہ بحران سے نپٹنے کے لئے جرمنی اور روس کی طرف جانے کا خیال مستحکم معلوم ہوتا ہے ۔ لیکن جب جنرل علی رزم آرا نے سوویٹ ایرانین کمرشیل ٹریٹی پر دستخط ثبت کئے تھے تو آپ نے اس کی سخت مخالفت کی تھی بہرحال جس کسی کی بھی آپ نے تائید یا مخالفت کی وہ محض قوم کی خاطر کی ۔

حتیٰ کہ رضا شاہ پہلوی اول سابق شاہ ایران کے خلاف آپ کی جدوجہد آپ کی حریت نوازی جمہوریت پسندی اور قوم پروری کا نتیجہ تھی ۔ شاہی خاندان میں جنم لینے کے باوجود جمہوری خیالات دماغ پر حاوی ہیں اور عقیدہ ہے کہ ایرانی عوام کا مفاد شاہی کے خاتمے میں مضمر ہے ۔ یہی وہی نصب العین ہے جس کی وہ گزشتہ پچاس سال سے علمبرداری کرتے آ رہے ہیں اور جس کے حصول کے لئے آپ نے رضا شاہ سے ٹکر لی اور جلا وطن ہوئے اور اس کے بعد موجودہ شاہ سے اختلاف کیا اور مستعفی ہوئے تھے ۔ شاہ پرستوں کے ہجوم میں جمہوریت کا نعرہ لگانے والا پہلا فرد یہی تھا ۔ اسی کا ردعمل ۱۹۲۸ء میں بادشاہ کا مصدق کے نام جلا وطنی کا حکم تھا ۔ عوام کے سوئے ہوئے شعور اور غفلت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شہنشاہ نے من مانی کرنے لئے بے لاگ و بے باک نقاد کو دور کرنا چاہا ۔ جب ڈاکٹر مصدق نے دیکھا کہ اس طرح وہ قومی خدمت کے موقع سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے تو انہوں نے شاہی کی مخالفت عارضی طور پر موقوف کر دی جس کے منصوبوں سے بچنے کے لئے دو مرتبہ انہیں محل میں پناہ گزین ہونا پڑا تھا ۔ دو مرتبہ آپ گرفتار بھی ہوئے پہلی دفعہ جنگ عظیم سے رضا شاہ کے ریل کے ٹھیکے برطانیہ کو دینے کے منصوبے کی مخالفت کے باعث اور دوسری مرتبہ ۱۹۴۰ء میں من گھڑت الزامات کے تحت شاہ کے حکم پر آپ کو جیل بھیجا گیا ۔ جب اس کی اطلاع ان کی سالہ سالہ چہیتی صاحبزادی "خدیجہ" کو ہوئی تو وہ بیہوش ہو گئیں اور اعصاب اتنے متاثر ہوئے کہ وہ اب تک زیر علاج ہیں یہ المناک واقعہ ڈاکٹر مصدق کو یاد آتے ہی اضطراباً

بنا دیتا ہے ۔ ۴½ ماہ کی قید میں آپ نے اتنی صعوبتیں برداشت کیں کہ اب تک آپ کی صحت سنبھل نہ سکی ۔ مختصر یہ کہ ڈاکٹر مصدق کی تمام تر جسمانی کمزوری جیل کے ان مصائب کا نتیجہ ہے جو جمہوریت کی خاطر آپ نے جھیلے ۔ بعد ازاں آپ کو رہا کر دیا گیا ۔

وزارتِ عظمیٰ پر انتخاب

گذشتہ ۱۹۴۳ء میں آپ کی پیش کردہ قرارداد کی باتفاق آراء منظوری نے آپ کی مقبولیت و شہرت کو چار چاند لگا دئے اور آپ کا ہم خیال طبقہ پیدا ہو گیا ۔ اس طرح آپ نے اپنی جماعت "قومی محاذ" کی تشکیل کی جس کے آپ قائد ہیں ۔ جب سے وزیر اعظم منتخب ہونے تک آپ نے اس ادارے کی خاموش خدمت انجام دی ۔ اور مظلوم کی ترجمانی کا حق ادا کیا ۔ اگرچہ اس دوران میں آپ کا کابینہ سے تعلق منقطع ہو گیا تاہم آپ مجلس کے رکن منتخب ہوتے رہے ۔ آپ کی جماعت نے ۱۹۵۱ء سے پہلے تک کبھی کوئی نمایاں جماعتی موقف حاصل نہیں کیا حتیٰ کہ جب آپ کو قوم نے وزیر اعظم منتخب کیا تو مجلس میں "قومی محاذ" کے صرف سات نائبین تھے ۔ لیکن اقلیت میں ہونے کے باوجود آپ کی جماعت نے قوم کی صحیح نمایندگی کی ۔ آپ نے وقت کی رفتار کا اندازہ لگا کر پہلے ہی سے تیل کے قومیانے کا خیال مضبوط کیا ۔ اور اینگلو ایرانین آئل کمپنی کے عزائم کا پردہ چاک کیا ۔ اس کی کارگزاریوں اور موجودہ صورت حال کا تجزیہ کیا اور تیل کے قومی ملک قرار دینے کی وکالت کی لیکن اس وقت مجلس میں ایرانی عوام کے صحیح نمائندے نہیں تھے اور نہ ہی کابینہ ایرانی مفاد کا کوئی خیال رکھتی تھی ۔ ایران کی اس بے اندازہ دولت کو ایران کے سینے سے چرا کر اور ایران کو فاقہ کش بنانے والی کمپنی نے اپنے کٹھ پتلیوں کو کابینہ کی کرسی پر لا بٹھایا تھا اس لئے وہ وزراء حق نمک ادا کرتے پڑتے تھے ۔ اور ایران کے داخلی امور میں مداخلت کرنے والی اس کمپنی کے تسلط کے خاتمے کے لئے اٹھائی ہوئی آواز کو حکومت دبانے کی کوشش کرتی رہی ۔ ہر دفعہ ایسے افراد برسر اقتدار لائے جاتے جو کمپنی کے اندھے مقلد اور قدیم نمک خوار ہوتے ۔ چنانچہ ڈاکٹر مصدق سے قبل کی تمام وزارتیں عوام کی ترجمان ہونے کی بجائے کمپنی اور برطانیہ کی ترجمان ہوا کرتی تھیں ۔

تیل کی صنعت اور مصدق ۔ آپ کے وزیر اعظم منتخب ہو جانے کے بعد سب سے اہم مسئلہ تیل کی صنعت کو قومیانے کا تھا ۔ شاید اسی کارنامے کی انجام دہی کے لئے قوم نے آپ کو منتخب کیا تھا ۔ اور شاید اسی مقصد کے لئے آپ کو تاریخ نے جنم دیا تھا ۔ اُن کے اس کارنامے نے انہیں تاریخ عالم میں لافانی کر دیا ہے ۱۹۳۳ء میں اینگلو ایرانین آئل کمپنی اور حکومت ایران کے مابین ایک ۶۰ سالہ معاہدہ ہوا تھا ۔ اور جس کی رو سے کمپنی کو ۱۹۹۳ء تک تیل کی مراعات حاصل ہو گئی تھیں جو دو میقات پر مشتمل تھیں ۔ پہلی میقات ۲۹ اپریل ۱۹۳۳ء تا ۲۹ اپریل ۱۹۶۳ء اور دوسری میقات اگر ۱۹۶۱ء سے شروع ہو تو ۳۲ سال بعد ۱۹۹۳ء میں ختم ہوتی ۔ اس معاہدہ ۱۹۳۳ء (کنونشن) کے باعث کمپنی کو کسا دبازاری جاری رکھنے کی کافی مہلت مل گئی ۔ اور ڈاکٹر مصدق اسی کا انفساخ چاہتے تھے ۔ کیونکہ اس کنونشن کی توثیق قوم کے صحیح نمایندوں نے نہیں کی ۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۵۰ء کے مجلس کے اجلاس میں ڈاکٹر مصدق قائد قومی محاذ نے قومیانے اور ۱۹۳۳ء کے کنونشن کے فسخ کرنے کے متعلق سترہ صفحات پر مشتمل ایک تقریر کی ۔ جس میں کمپنی کے کام کا تفصیلی جائزہ لیا اور حقیقی صورت حال کو بے نقاب کر دیا ۔

ایران میں تیل کی سالانہ پیداوار ہر سال بڑھتی رہی مثلاً ۱۹۳۸ء میں ایک کروڑ تیس لاکھ ٹن تھی جو بعد جنگ ۱۹۴۵ء میں ۵ ارب بیرل تک جا پہنچی ۔ حتیٰ کہ کمپنی کے آخری ایام میں آبادان سے (دنیا کا سب سے بڑا تیل صاف کرنے والا کارخانہ) ۲ کروڑ پچاس لاکھ ٹن خالص پٹرولیم ہر سال نکلتا تھا ۔ تیل کی دوسری ضمنی پیداواروں کا بھی یہی حال تھا ۔ ۱۹۴۷ء میں ان کی مقدار ۱۵ ملین ٹن تھی ۔ اس طرح تیل پیدا کرنے والے ممالک میں ایران کا چوتھا نمبر تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ کمپنی کبھی صحیح اعداد و شمار منظر عام پر نہیں لاتی تھی اس کی طرف سے شائع کردہ بیلنس شیٹ کی نہ کوئی چھان بین ہوتی تھی اور نہ حکومت ایران کی سرکاری توثیق ۔ یہ سب کچھ ایران کو تیل کی آمدنی کے صحیح اندازے سے محروم رکھنے کے لئے کیا گیا ۔ ۲۹ اپریل ۱۹۳۳ء کو ایک کنونشن ہوا اور اس کے بعد ایک ضمیمہ معاہدہ بھی ۔ کنونشن کے دفعہ ۱۰ کی رو سے ۱۹۳۳-۴۷ء سالانہ پیداوار میں سے پہلے ۶۰ لاکھ ٹن کے لئے رائلٹی بحساب ۹ پنس فی ٹن اور ہر زائد ٹن کے لئے بحساب ۶ پنس فی ٹن ادا کرتی رہی ۔ اس میں منافع و محصول دونوں شامل تھے ۔ اس حساب سے کمپنی ۲۲۵۰۰۰ پونڈ سالانہ ادا کرتی رہی اور آئندہ پندرہ سال (۱۹۴۸-۶۲ء) کے لئے کمپنی کو

پہلے ۶۰ لاکھ ٹن کے لئے بحساب ایک شلنگ فی ٹن اور ۹ پنس یا ۳/۴ شلنگ ہر زائد ٹن کے لئے کے حساب سے جملہ منافع، محصول اور متوقع محاصل ملاکر ۳۰۰،۰۰۰ پونڈ دینے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں ایران کو بطور رائلٹی صرف ۷ ملین پونڈ ملے۔ ۱۹۴۸ء میں کمپنی کے بیلنس شیٹ کے بموجب چھ کروڑ ۲ لاکھ پونڈ صرف نفع ہوا۔ جبکہ مسٹر غلام حسین فروہر وزیر مالیہ کے بیان کے مطابق ایران کو صرف ۹۴ لاکھ پونڈ ملے۔ یہ رقم اس رقم کے ۱۲ ویں حصے سے بھی کم ہے جو کمپنی برطانیہ کو ادا کرتی ہے۔ ۱۹۵۰ء میں مرحوم کمپنی نے ۵۰۰ یا ۵۵۰ ملین پونڈ کا صرف نفع کمایا۔ اس بھاری رقم سے ایران کو صرف ۴۵ ملین پونڈ بطور رائلٹی کے ملے (ملین = دس لاکھ) سر گلیڈون نے صیانتی مجلس میں کہا کہ کمپنی کا منافع ۱۱۴ ملین پونڈ سے اونچا رہا اور اتنی ہی رقم کمپنی نے ایران کو اب تک بطور رائلٹی کے ادا کی ہے۔ گویا کمپنی کا صرف ایک سال کا منافع خود برطانیہ کے کہنے کے مطابق (ایران کا حصہ ادا کرنے کے بعد) ایران کو گذشتہ پچاس سال میں ادا کی گئی جملہ رقم کے مساوی ہے۔ ۱۹۴۸ء میں ایران کے قومی موازنہ کا ۱۵٫۶ فیصد حصہ کمپنی کی جانب سے ادا کی جانے والی رائلٹی (بشمول ٹیکس و حصۂ نفع) پر مشتمل تھا جو ۱۹۴۹ء میں گھٹ کر ۱۴٫۹ فیصد ہوگیا۔ جبکہ اس کے برخلاف کمپنی کا اس سال کا منافع ایران کے کل قومی موازنہ کے دگنے سے بھی زیادہ تھا۔ ایران کی قومی آمدنی میں کمپنی کا حصہ آگے چل کر صرف دس فیصد رہ گیا۔ جبکہ کمپنی نے ایران سے جو کچھ لیا (اس کے اپنے اعداد و شمار کے بموجب) ایران کی قومی آمدنی کا ۳۰ فیصد تھا۔ سابق امریکی سفیر برائے ایران ڈاکٹر ہنری گریڈی نے بھی ایک دفعہ نیویارک میں فرمایا تھا موجودہ قیمتوں کے لحاظ سے ۲ سال قبل جولائی میں رائلٹی ۱۴ تا ۱۵ ملین پونڈ تھی اگر معاہدہ کی توثیق ہوجاتی تو ۲۵ تا ۳۰ ملین پونڈ کی زیادہ سے زیادہ توقع تھی۔ جبکہ خود کمپنی کا منافع ہی دس کروڑ پونڈ سے زائد تھا۔ کمپنی صحیح اعداد و شمار سامنے نہیں لائی۔

ڈاکٹر مصدق نے بجا فرمایا تھا "میرے ملک میں تیل کی صنعت برطانوی کوششوں سے نہیں بلکہ میرے ملک کے عوام کے خون اور پسینہ سے قائم ہوئی ہے"۔ انہوں نے صیانتی مجلس میں "بین الاقوامی ادارۂ عمال" کے سروے کے حوالے سے ثابت کیا کہ مزدوروں کے قیام اور صحت کا معیار بہت گرا ہوا ہے۔ ۱۹۳۳ء کے کنونشن کے دفعہ ۱۶ کے فقرے ۳ کی رو سے طے پایا تھا کہ غیر ایرانی ملازمین کو ہر سال پابندی سے کم کیا جائے گا اور ان کی جگہ ممکنہ عجلت کے ساتھ ایرانیوں کو لیا جائے گا۔ اگر اس کے مطابق عمل ہوتا اور ۲ ہزار کے غیر ملکی عملے سے ہر سال ایک سو کو چھانٹ کر ایرانیوں کو موقع دیا جاتا تو کنونشن کے پندرہ سال بعد یعنی ۱۹۴۷ء تک ان کی تعداد گھٹ کر صرف پانچ سو رہ جاتی۔ لیکن اس کے خلاف اس تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ ۱۹۳۳ء کے ۲ ہزار غیر ایرانی ملازمین ۱۹۴۷ء تک ۴۰۰۰ ہو چکے تھے۔ یعنی ابتدائی تعداد کا چوتھائی ہونے کی بجائے دگنے سے بھی زیادہ ہو گئی۔ صرف آبادان کے کارخانے میں ستر ہزار ملازمین ہیں جن میں سے پانچ سو سے زائد برطانوی ماہرین ہیں۔ انگریزوں نے ایرانیوں سے صرف مزدوروں کا کام لیا اصل فنی کام سے انہیں دور ہی رکھا۔ اگر کسی ایرانی ماہر کو موقع بھی دیا گیا تو اس کے ساتھ ناگوار سلوک روا رکھا گیا جس پر ان ایرانیوں نے معمولی کاروبار کرنے کو ترجیح دی۔ اس طرح ان کی صلاحیتوں کو کمپنی نے شل کر دیا جبکہ ایرانی مزدور فلاش تھا ۱۹۴۷ء میں ۴۰۰۰ غیر ایرانی برطانوی ملازمین جن کی تعداد از روئے معاہدہ اس سال تک صرف ۵۰۰ ہونی چاہیئے تھی فی کس ایک سو پونڈ ماہانہ کما رہے تھے اس طرح انہوں نے تقریباً چالیس لاکھ پونڈ کی رقم ہڑپ کرلی جو ایرانیوں کو ملنی تھی۔ سر گلیڈون نے جب صیانتی مجلس میں بڑے فخر سے اس بات کا تذکرہ کیا کہ ہم نے ایرانیوں کو ملازم رکھ کر انہیں بہتر معاشی موقف عطا کیا اور ترقی دی۔ لیکن وہی سر گلیڈون تب ایک لفظ نہ کہہ سکے جب ڈاکٹر مصدق نے پوچھا "اگر یہی صورت حال تھی تو کیا وجہ ہے کہ کمپنی ایک بھی ایرانی ماہر پیدا نہ کر سکی؟ اس مسئلے سے بھی گزر جائیے کمپنی کا دوسرا کارنامہ ملاحظہ فرمایئے کہ کس طرح اس نے ایران کے داخلی سیاسی و سماجی امور میں مداخلت کی کوشش کی۔ ڈاکٹر مصدق نے اس ضمن میں ہیگ اور نیویارک میں دستاویزی ثبوت پیش کرکے برطانوی مندوب کو لاجواب کر دیا۔ برطانیہ نے کمپنی کی آڑ میں پارلیمین کے انتخابات میں دخل اندازی ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اعلیٰ افسروں کو بھی اپنا کٹھ پتلی بنا لیا۔ ۱۹۳۳ء میں تیل کے معاہدے کی توسیع پر غور کرنے کے دوران میں اس نے خلیج فارس میں اپنے جنگی جہاز بھیجے اور ایران کی صیانت کو خطرے میں ڈالا۔ غرض کمپنی نے ایران کا ناک میں دم کر دیا۔ اس نے وہی کھیل ایران میں کھیلا جو ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارت کے بہانے ہندوستان میں کیا۔ اس لئے ڈاکٹر مصدق نے محسوس کیا کہ "میرے صبر و ضبط کی بھی آخر کوئی انتہا ہے ہمیں اپنے ملک کے غریبوں اور افلاس زدہ لوگوں کو غریبی و افلاس

کے چنگل سے چھڑانے کے لئے اپنے تیل کے ذخائر کو مالدار عیش پسند بیرونی افراد سے نجات دلانا ہوگا۔"

بین الاقوامی عدالت انصاف میں نمائندگی

ڈاکٹر مصدق نے صاف طور پر یہ بات واضح کردی کہ یہ ایران کا داخلی مسئلہ ہے اور کسی دوسری طاقت کو اس میں مداخلت کرنے یا اقتدار اعلیٰ کے حق کو چھیننے کا کوئی استحقاق نہیں۔ اور یہ کہ ہم (ایرانی) کمپنی کا معاوضہ جتنا کچھ قانونی طور پر وہ حق رکھتی ہے دینے کو تیار ہیں۔ لیکن برطانیہ نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔ اس راہ کو اختیار کرنے سے برطانیہ نے انکار کیا۔

برطانیہ نے امریکی توسط سے ایران پر دباؤ ڈالنا چاہا۔ چنانچہ ۱۴ مئی ۱۹۵۱ء کو امریکہ نے ایران مشورہ دیا کہ ایران اس معاملہ میں جلدی سے کام نہ لے۔ ڈاکٹر مصدق نے مسٹر ٹرومین کے شخصی پیام کو ایران کے داخلی امور میں مداخلت سے تعبیر کیا جس کی معافی مانگتے ہوئے دوسرے ہی دن امریکی وزیر خارجہ مسٹر اچی سن نے ایران کے پیدائشی حق کو تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد برطانیہ نے ۲۳ مئی کو بھارت سے مصالحت کے لئے کوشش کرنے کی درخواست کی۔ پنڈت نہرو نے ایرانیوں کے حق کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا۔ اس کے بعد برطانیہ نے پھر ہیگ کورٹ کا رُخ کیا۔ ۵ جولائی کو بین الاقوامی عدالت انصاف نے مشورہ دیا کہ کمپنی کے کام میں مداخلت نہ کی جائے۔ تاوقتیکہ بین الاقوامی عدالت اپنے حقِ سماعت کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ دے۔ یہ تنازعہ یاد رہے کہ ایران و برطانیہ کے مابین نہ تھا بلکہ ایران اور کمپنی کا معاملہ تھا۔ برطانیہ نے اپنے آپ کو فریق کی حیثیت دینے کی کوشش کی۔ ایرانی حکومت نے ۲۸ مئی کو عدالت کے حقِ سماعت پر اعتراض کیا۔ باوجود اس کے جب عدالت نے عارضی فیصلہ ۵ جولائی کو صادر کیا تو ۹ جولائی کو ایران نے اعلان کیا کہ وہ اس فیصلے کے تابع نہیں۔ اس کے بعد دوسری مرتبہ ۱۹۵۲ء میں یہ مسئلہ دوبارہ زیر بحث آیا یعنی عدالت نے اپنے اختیارِ سماعت پر بحث کی۔ اس میں مصدق نے شرکت کی اس لئے نہیں کہ بحث میں حصہ لیں بلکہ اس لئے کہ عدالت کے اختیارِ سماعت کو چیلنج کریں۔ آپ اپنے ساتھ دستاویزات کے ۲ تھیلے بھی لے گئے۔ اور ثبوت کے طور پر عدالت کے آگے پیش کئے۔ ۷ جولائی ۱۹۵۲ء کو اپنے حقِ سماعت کے بارے میں فیصلہ دیا کہ ایران اپنی تیل کی صنعت کو قومیانے میں حق بجانب تھا اور یہ کہ اُسے (عدالت کو) اس مسئلہ پر بحث کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں"۔ عدالت کے پندرہ ججوں میں سے ۹ نے تائید کی پانچ نے مخالفت کی اور ایک جج مسٹر بی۔ این راؤ غیر حاضر رہے۔ امریکی، فرانسیسی اور برطانوی ججوں نے خلاف تجویز لکھی بہر حال عدالت نے حقائق کو تسلیم کر لیا ایران نے عدالت کے اس فیصلہ کا خیر مقدم کیا اور اس خوشی میں سارے ایران میں ایک دن کے لئے خصوصی تعطیل دی گئی۔ اسی دن مصدق بھی دوبارہ برسر اقتدار آگئے تھے۔

عالمی بنک کی تجاویز مصدق کی نظر میں

برطانیہ کے اشارے پر عالمی بنک نے چند تجاویز ایران کے آگے پیش کیں چونکہ یہ منصفانہ اساس پر نہ تھیں اس لئے ڈاکٹر مصدق انہیں قبول نہ کر سکتے تھے۔ بنک کے نمایندوں سے مصدق نے اس لئے گفتگو کی کہ وہ کوئی معقول حل پیش کریں گے اور اس طرح ایران کے معاشی مسائل کے حل کرنے میں مدد ملے گی۔ اس کی رو سے ایران کی قومی صنعت میں برطانیہ یا کمپنی کو مساوی شریک تسلیم کرنا پڑتا تھا کیونکہ ۱۱ فروری ۱۹۵۲ء کو عالمی بنک کے رابرٹ گارنر کے فُس نے کہا کہ ایران تیل کی صنعت کا نفع ۵۰٪ لے اور عالمی بنک ٹیکنیکل امداد کے ادارہ کی مدد سے صنعت چلائے گا گویا نہ صرف کمپنی کو نفع میں مساوی شریک بنا لیا جائے گا بلکہ برطانوی افراد کو ایک نئے واسطے سے دوبارہ ایران پر ٹھونسا جائے گا اور ایرانیوں کے حق کو پامال کیا جائے گا۔ جب اس سرزمین میں رہنے بسنے والوں کو اس کے سینے سے نکلنے والی دولت پر پورا حق نہیں پہنچتا تو کس طرح اس سے ہزاروں میل دور رہنے والی قوم کا اس پر کوئی حق ہو سکتا ہے؟ اس لئے ڈاکٹر مصدق نے ۷ مارچ ۱۹۵۲ء کو ان تجاویز کو مسترد کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ "یہ مفید نہیں ہیں" عالمی بنک اور ادارہ ٹیکنیکل معاونت کا کام ہے کہ پسماندہ ملکوں میں تعمیری کاموں کے لئے مالی و فنی امداد پہنچائی جائے۔ لیکن اقوام متحدہ کی ان دو خصوصی ایجنسیوں نے اپنے فریضے کے ادا کرنے کو بالائے طاق رکھ کر ایشیائی اقوام کو اپنے حقیقی موقف اور مقاصد سے آگاہ کر دیا۔ ایران ایسے پسماندہ ملک کو جس نے اپنی تیل کی صنعت کو قومیا کر حقیقی آزادی کی طرف ایک ٹھوس قدم اٹھایا ہے اپنی آزادی کی تعمیر کے لئے ہر طرح کی مالی و فنی امداد ملنی چاہئے تھی تاکہ وہ اپنے قومی ذرائع سے استفادہ کر سکے۔ امریکہ نے بھی جمہوریت و آزادی

کے محافظ ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود ایران کی غیر مشروط مالی امداد سے احتراز کیا۔ اس لئے ۱۲ راگست ۱۹۵۲ء کو حسین مکی علی پارسا اور علی مرتضیٰ جرمنی پہنچے تاکہ ۴۰۰ ماہرین فن حاصل کر سکیں اور صنعت کو پورے زور کے ساتھ جاری رکھا جا سکے۔ جرمن ماہر مالیات ڈاکٹر شافٹ کی خدمات حاصل کی جا رہی ہیں تاکہ مالی دشواریوں پر قابو پا سکیں۔ اسی اثنا میں مسٹر ٹرومین نے ٹرومین چرچل مشترکہ تجاویز ڈاکٹر مصدق کو روانہ کیں جس میں تیل کی تقسیم کمپنی کے ذریعے کروانے کا وعدہ کیا گیا تھا اور ساتھ ہی کمپنی کو اگلا موقف عطا کرنے کی سعی کی گئی تھی۔ ایسی کوئی پیشکش بھی ایران کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتی خواہ اس کے ساتھ کتنے ہی کروڑ ڈالر کیوں نہ منسلک ہوں ان میں کہا گیا ہے کہ ان تجاویز کی منظوری کی صورت میں امریکہ ایران کو ایک کروڑ ڈالر کی فوری امداد دے گا تاکہ وہ مالی دشواریوں پر قابو پا سکے۔ ۳۱ راگست ۱۹۵۲ء کو ڈاکٹر مصدق نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ ایک ایرانی افسر کاظم جیبی نے تبصرہ کیا اگر ایران نے مرحوم کمپنی کی ایک کروڑ پونڈ کی پیشکش کو قبول نہیں کیا تو وہ یقیناً اپنے آپ کو ایک کروڑ ڈالر کے معاوضے میں فروخت نہیں کرے گا۔

وزارتِ جنگ و خصوصی اختیارات

ڈاکٹر مصدق کو اپنے مشن کی تکمیل میں جو امر مانع محسوس ہوتا تھا وہ تھا اختیارات کلی کا اُن کے ہاتھوں میں نہ ہونا اور وزارتِ جنگ کے قلمدان کا ان کے تحت نہ ہونا۔ داخلی سیاسیات پر کنٹرول اور مشن کی تکمیل کے لئے دونوں کو اپنے ہاتھوں میں لینا مصلحت وقت تھی۔ آپ نے مجلس سے خصوصی اختیارات اور شاہ سے وزارتِ جنگ کا قلمدان مانگا۔ جب دونوں نے اس میں ہچکچاہٹ کی تو ۳ رجولائی ۱۹۵۲ء کو شاہ کے پاس استعفیٰ روانہ فرمایا اور لکھا کہ میرا استعفیٰ اس بات کی علامت نہیں کہ میری حکومت کام کرنے کے قابل نہیں رہی بلکہ اس کا مقصد عوام کی توجہ ملک کی سیاسی صورت حال کی طرف مبذول کروانا اور فوری کارروائی کی ضرورت محسوس کروانا ہے"۔ شاہِ ایران نے مصدق کو وزیر جنگ بنانا پسند نہ کیا اور قوام السلطنۃ کو تشکیلِ وزارت کی دعوت دے دی۔

لیکن مصدق کے استعفیٰ کے ساتھ ہی ایران کے طول و عرض میں قوام السلطنۃ کے خلاف مظاہرے ہونے لگے۔ آخر ۶ رجولائی ۱۹۵۲ء کو قوام السلطنۃ نے استعفیٰ دے دیا۔ ۷ رجولائی کو ایران کے دونوں ایوانوں نے متفقہ طور پر مصدق کو وزیر اعظم منتخب کیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ قوم نے جہاں مصدق کے دوبارہ وزیر اعظم ہونے کی اطلاع سُنی۔ وہیں ۷ رجولائی کو بین الاقوامی عدالت انصاف کا فیصلہ بھی سنا کہ ایران اپنے رویے میں حق بجانب ہے اور یہ کہ اُسے (عدالت کو) اس ضمن میں اختیارِ سماعت ہرگز حاصل نہیں۔ اس دل خوش کن خبر نے خونیوں کو چوکنا کر دیا۔ ڈاکٹر مصدق اب صرف خصوصی اختیارات کے مالک ہیں بلکہ وزیر جنگ بھی۔

مبشر علی صدیقی

مُلّا رموزی

اردو کے ایک مشہور مزاح نگار اور گلابی اردو کے موجد محمد صدیق صاحب عرف مُلّا رموزی ۱ر جنوری ۱۹۵۲ء کو اس جہان سے کوچ کر گئے۔ اور اس طرح اردو ادبا و شعرا کی صف میں ایک اور جگہ مستقل طور پر خالی ہو گئی جو شاید ہی آئندہ پر ہو سکے۔ میں نے ملا رموزی کی انشا پردازی کے تمام ادوار بغور دیکھے ہیں۔ اور اردو مزاح نگاری کی تاریخ میں اُن کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی انشا پردازی کا پہلا دور تو وہ تھا جب وہ اپنی گلابی اردو میں علی گڑھ کالج یا بیرا خبار اور ننھے میاں کی والدہ کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ ان کی مزاح نگاری[1] میں بعض اوقات ہمیں ایسی طنز کا پتہ چلتا ہے جو زہرناکی کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ اس دور میں انہوں نے رسالہ "صدق" میں مستقل طور پر مضامین لکھے ہیں۔ بیشتر مضامین میں علامہ سیماب اکبرآبادی کا ذکر خیر ہوتا تھا۔ ذاتیات کی بنا پر رموزی طرح طرح کے الزامات سیماب اکبرآبادی پر لگاتے تھے ان الزامات کے جوابات سیماب مرحوم کے تلامذہ اپنے اخبارات اور رسائل میں ضرور دیتے تھے لیکن عوام زیادہ تر رموزی کی گلابی اردو کو پڑھتے تھے اور لطف اندوز ہوتے تھے۔ دیکھئے خود رموزی نے مرنے سے چند ماہ پیشتر اس کا اعتراف اپنے ایک مضمون میں کس طرح کیا ہے "اب ذرا[2] سی روداد سیماب و رموزی سن لیجئے۔ ۱۹۲۱ء یا اس سے کچھ آگے پیچھے زمانے میں حضرت علامہ مع ساغر نظامی بھوپال تشریف لائے۔ میں شروع ہی سے شعر و مشاعرہ کا جانی دشمن تھا۔ اس لئے میں ان کے کسی ایک اجتماع میں شریک نہ ہوا...... بات آئی گئی ہو گئی۔ حضرت علامہ بھوپال سے چلے بھی گئے۔ مگر کچھ دن بعد نہایت خفیہ اور سازشی انداز سے ان لوگوں نے مجھ پر کچھ ایسے غیر محسوس اور کہیں محسوس اثرات ڈلوائے کہ میں حضرت ساغر و سیماب کی مخالفت اخباروں میں کروں۔ ان اثرات میں بعض اثرات میری اس وقت کی مالی بے بسی کے حق میں اثر انداز ہونے والے تھے۔ اس لئے میں نے بے وجہ حضرت سیماب و ساغر کی مخالفت میں بے شمار اخبارات اور رسالوں میں لکھنا شروع کر دیا۔ جس کے جواب میں حضرت سیماب اور تمام سیمابی دنیا نے میرے خلاف بھی کسر نہ اٹھا رکھی۔ واقعہ یہ تھا۔ اب ۱۹۲۸ء میں علی گڑھ کالج میں ایک آل انڈیا ادبی اجتماع ہوتا ہے جس کے محرک مایۂ نازش بزرگ پروفیسر علامہ احسن مارہروی تھے۔ اس اجتماع میں ہندوستان بھر کے چوٹی کے شعرا و ادبا شریک ہوئے اور نظر بد کے نشان کے طور پر مُلّا رموزی صاحب بھی — میں حضرتِ احسن کی خدمت میں ان کے بنگلے روز جاتا تھا۔ ایک دن احسن قبلہ نے مجھ سے خدا جانے کن جادو بھرے الفاظ میں فرمایا کہ

"بھائی سیماب میرے ہاں آنے کو ہیں۔ لیکن تم کو میری اس سفید داڑھی کی لاج رکھنا ہو گی۔ اس لئے بغیر تامل کے مجھ بوڑھے کے کہنے پر سیماب سے گلے مل لو۔ اور آج سے تم دونوں اپنے مخالفانہ مضامین کو بند کر دو"۔ میں بالکل ساکت سا ہو کر رہ گیا کہ حضرت سیماب تشریف لائے۔ احسن قبلہ میرے کمرہ سے باہر گئے اور اُن سے بھی کچھ ایسا ہی کہا ہو گا۔ چند منٹ بعد حضرت احسن سیماب صاحب کا ہاتھ پکڑے میرے پاس لائے اور فرمایا کہ اٹھو اور اپنے بھائی کے گلے سے لگ جاؤ۔ میں فوراً اٹھا۔ سیماب صاحب نے کافی مسکراتے ہوئے مجھے

---

[1] مزاح ایک جامع لفظ ہے۔ ایک طرف اس میں طنز شامل ہے (بشرطیکہ وہ مزاحیہ پیرائے میں ہو) اور دوسری طرف ہجو بشرطیکہ اس نے گالی گلوچ کی شکل اختیار نہ کر لی ہو اور زبان بالکل عامیانہ نہ ہو گئی ہو

[2] رسالہ سیماب دہلی۔ جنوری ۵۲ء صفحہ ۴۱ و ۴۲

کافی بھیجا اور فرمایا کہ ـــــــ "اتنے بھی دُبلے ــ" آجکل کے زمانہ میں غلطی کا اعتراف کرلینا کافی اہمیت رکھتا ہے ۔ مُلّا رموزی کی اس صاف گوئی سے سیماب اسکول کے تمام حضرات اب غالباً مطمئن ہو جائیں گے ۔ کیونکہ ان کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے سیماب مرحوم کے خلاف مضامین مالی منفعت کے لئے لکھے تھے ۔ اور بعد کو شدت کے ساتھ اس کو محسوس بھی کیا تھا ۔ رموزی کی نثر نگاری کا دوسرا دَور وہ ہے جس میں ننھّے میاں کی والدہ نے ننھے میاں کی والدہ نمبر ایک اور نمبر دو کی شکل اختیار کرلی ہے ۔ ان کی مستقل تصانیف زیادہ تر پہلے ہی دَور سے تعلق رکھتی ہیں ۔ دوسرے دَور میں ان کے متفرق مضامین خصوصاً مختلف ایڈیٹر صاحبان کے نام خطوط ہیں ۔ اس وقت ہمارے سامنے ان کے وہ خطوط ہیں جو انہوں نے رسالہ "ہمدرد صحت" دہلی کے ایڈیٹر صاحب کو مختلف اوقات میں لکھے تھے ۔ یہ خطوط "ہمدرد صحت" میں شائع ہو چکے ہیں ۔ مُلّا صاحب بلا تکلیف شربت روح افزا اور مفرح مشکین کی فرمائش کرتے ہیں ۔ اور ایڈیٹر صاحب کو اپنی بیوی نمبر ۲ کے گلابی دوپٹے کی قسم دلا کر ان کی دواؤں کی تعریف کرتے ہیں ۔ تیسرا دَور ان کے آخری زمانہ کی تحریروں کا ہے ۔ یہاں ننھے میاں کی والدہ نمبر ایک اور دو کی جگہ بیوی نمبر ایک گلستاں نمبر ۲ زعفران خانم اور پھر اسی طرح بیوی نمبر تین وغیرہ نے لے لی ہے ۔ گلابی اُردو کا زور اس دَور میں قدرے کم ہو گیا ہے ۔ بیویوں کا اپنے مضامین میں اس طرح پروپیگنڈا کرنا دو اور موجودہ مزاح نگاروں پر بھی عائد ہوتا ہے یعنی شوکت تھانوی (جو اب صرف قاضی جی بن کر رہ گئے ہیں) اور عظیم بیگ چغتائی مرحوم ۔ یہ درست ہے کہ بیوی یا بیگم کا ذکر رشید احمد صدیقی پطرس اور فرحت اللہ بیگ نے بھی کیا ہے لیکن اس بری طرح نہیں جیسا کہ اوّل الذکر مزاح نگاروں نے ' اس لئے یہ چیز ان کے یہاں کھٹکتی ہے ۔ ایک اور خصوصیت ان کے اس دَور کے مضامین کی ملک کی زبوں حالی کا ذکر کرنا بھی ہے ۔

مُلّا رموزی کی ظرافت چونکہ ابتدائی ظرافت ہے ۔ لہٰذا ادبیات اردو کی تاریخ میں اس کی اہمیت ہے اور رہے گی ۔ ہم اسے اعلیٰ پائے کی ظرافت نہیں کہہ سکتے ۔ اوّل تو اس لئے کہ ان کا سارا کھیل چند الفاظ کے متبادر معنی پر منحصر ہوتا ہے ۔ دوسرے اس لئے کہ وہ بار بار کی دُہرائی ہوئی چیزیں پیش کرتے ہیں ۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ مذاق ہی مذاق میں بعض اوقات بڑے کام کی باتیں کہہ جاتے ہیں ۔ ان کے مضامین میں اصلاحی پہلو بہت نمایاں ہوتا ہے ۔ ان کے یہاں چند الفاظ اور فقرے مخصوص ہیں جو کہ قریب قریب ہر مضمون میں یکے بعد دیگرے دُہرا دیئے جاتے ہیں ۔ مثلاً علی گڑھ کالج ننھے میاں کی والدہ ۔ بیوی نمبر ایک اور بیوی نمبر دو ' کسان ۔ ریل وغیرہ رموزی ذاتی چیزیں ضرورت سے زیادہ پیش کرتے ہیں ۔ وہ ایک درجن کتابوں سے زاید کے مصنّف ہیں ۔ کچھ کتابوں کے نام یہ ہیں :۔ شادی زندگی ۔ صبح لطافت ' عورت ذات ' لاٹھی اور بھینس وغیرہ ۔ رموزی فطرتاً قدامت پسند واقع ہوئے ہیں ۔ لہٰذا ہر نئی چیز کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ۔ وہ نازک اندامان کالج اور علی گڑھ کالج سے کچھ مطمئن نہیں ہیں ۔ بلکہ کالج کے طلبا سے بہت خفا معلوم ہوتے ہیں اکبر نے پانیر اخبار کا مذاق خوب اڑایا تھا ۔ وہ وقت کی چیز تھی رموزی اب اگر ایسا کرتے ہیں تو "مشتے بعد از جنگ" کا مصداق ہے ۔ اس کا زمانہ گزر گیا ۔ ان کی بعض کتابوں میں بھرتی کی چیزیں بہت ہوتی ہیں مثلاً ان کی کتاب "شادی" میں ایک مہمل سہرا کتاب کے آخر میں بغیر کسی خاص وجہ کے درج ہے ۔ پروفیسر آل احمد سرور کا خیال ہے کہ مُلّا رموزی کی سوجھ بوجھ اچھی ہے ۔ مگر ان کی یہ سوجھ بوجھ مستعار خیالات میں دب کر رہ جاتی ہے ۔ مغالطہ بھی ان کو بہت زیادہ ہے ۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں "بھلا یہ انٹرنس پاس کیا جانیں ابوالکلام آزاد کی ادبی عظمت کو اور یہ ایف ۔ اے پاس کیا پہچانیں مولوی ظفر علی خاں کی بہار آفریں انشا پردازی کو اور یہ بی ۔ اے پاس کیا محسوس کریں مُلّا رموزی کی لطافت نگاری کو" بعض اوقات وہ ایک ہی چیز کی مختلف کیفیات بہت اچھی طرح بیان کرتے ہیں ۔ "کھانسی" کی مختلف کیفیتیں ملاحظہ ہوں "بعض کے دونوں شانے اُٹھ کر کانوں تک آجاتے ہیں ۔ جب کھانسی پوری ہوتی ہے ۔ بعض کی کھانسی اس وقت تک پوری نہیں ہوتی جب تک انہیں مرادآباد کا اُگالدان پیش نہ کیا جائے ۔ بعض کی کھانسی کے درمیان اس قسم کے جھٹکے آتے ہیں جن سے ان کے مرحوم ہو جانے کا خطرہ اٹل ہوتا ہے ۔ بعض کے نزدیک وہ کھانسی کھانسی نہیں جس کے ترنّم کا سلسلہ مغرب سے صبح کی اذان تک اس طرح جاری نہ رہے کہ ماں باپ تک دُعا کریں کہ اے خدا اسے ہیا

سے اُٹھا لے یا اس کی کھانسی بند کر" مُلّا رموزی حالانکہ مشاعروں کے موافق نہ تھے لیکن انہوں نے غزلیں لکھی ہیں - ان میں مزاحیہ رنگ نمایاں ہے - اپنا تخلص تلاش کرنے کے متعلق وہ اپنے آخری ایام کے ایک مضمون بعنوان "مولانا حسرت کے ساتھ تین سال" میں لکھتے ہیں - پس ایسے مفلس ماحول دماغی میں مجھ فطری نقّاد و موجد کے لیئے ممکن نہ تھا کہ میں بھی کسی مشہور شاعر کے تخلص کو اپنا لوں - اس لیئے جدید تخلص وضع کرنے کی فکر میں دار العلوم کی پندرہ بیس دن کی چھٹیاں تشریف لے آئیں اور میں بھوپال روانہ ہوا کہ مجھے ریل میں خیال کہ میرے فارسی کے استاد حضرت مولوی محمد خاں صاحب مرحوم نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ تخلص کو سہ حرفی ہونا چاہیئے جو ہر بحر میں کھپ سکے مثلاً زکی وغیرہ - بس اس کے یاد آتے ہی میں نے اپنا تخلص "غشی" رکھا اور ساتھ ہی بھوپال تک ایک ڈیڑھ آدھی ترچھی غزل بھی عرض کر لی"- اسی مضمون میں مولانا حسرت سے اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں "خدمات' ناکامیابیوں' حوادث اور مصائب کے برداشت کی جو فولادی ہمّت میں نے مولانا میں پائی اب کسی دوسرے میں پا بھی نہ سکوں گا - خلاصہ یہ کہ اخلاقیات میں وہ اس بلند ترمقام کے انسان تھے جہاں خدا پرستی اور خوفِ خدا کے سوا دنیا کی کوئی تحریک ان کو متاثر نہ کرسکتی تھی - اس کے لیئے ان کے کلام کو غور سے ملاحظہ فرمائیے"۔

غرضیکہ رموزی مزاح نگاری میں جس رنگ کے موجد تھے وہ رنگ ان کے ساتھ ختم بھی ہوگیا - ارضِ بھوپال کا یہ گلابی اردو لکھنے والا اپنا نام ہمیشہ کے لیئے تاریخ اردو ادب میں چھوڑ گیا ہے -

---

رضا نقوی

مشعل

لو وقت کی سانسیں پھول گئیں' لو سر سے ڈھلا خونیں آنچل
رخسارِ تمدّن زرد ہوا' بازوئے سیاست ہو گئے شل
کیوں! میں نے کہا تھا - یا کہ نہیں اب بجھ نہ سکیگی یہ مشعل

اس کوششِ پیہم کے صدقے ہر پھونک میں تو کچھ تیز ہوئی
رفتہ رفتہ دھیمے دھیمے مشعل کی ضو کچھ تیز ہوئی
ہر سانس میں جتنی گرمی تھی اتنے ہی بجھے جذباتِ عمل

کوشش کی اس ناکامی پر آخر حیرت کیوں آتی ہے
چہرہ کیوں اُترا اُترا ہے جبیں کیوں میلی میلی ہے
آؤ آؤ ہم سے سُن لو عقدہ یہ نہیں ہے لاینحل

برسوں برسوں صدیوں صدیوں جب دل کو گھُلایا جاتا ہے
اور زخمِ جگر کو ہنس ہنس کر ناسور بنایا جاتا ہے
خوں کے آنسو بنتے رہتے ہو جاتی ہیں جب آنکھیں بوجھل

جب دل کے سلگتے چولھے میں شاعر کی تمنّا پلتی ہے
سنسار کی اندھی نگری میں تب شمعِ بصیرت جلتی ہے،
شاعر کی زباں بن جاتی ہے اس وقت محبّت کی مشعل

مشعل کی شعاعوں کے اندر وہ نورِ حقیقت رقصاں ہے
تاریکیٔ دوراں کے اوپر جو روزِ ازل سے خنداں ہے
وہ نور کہ جس کی ایک کرن ظلمت کے لئے فرمانِ اجل

اس نور کو گل کرنے کے لیئے سو راہ نکالی جاتی ہے
طوفاں اُٹھائے جاتے ہیں تاریکی پالی جاتی ہے
سازش کے مگر سارے بازو ہو جاتے ہیں آخر خود ہی شل

اک روز اسی مشعل کی ضیا ہر دل میں اُجالا کر دے گی
رفتہ رفتہ بڑھتے بڑھتے دنیا میں سویرا کر دے گی
کروٹ لے کر اُٹھ بیٹھے گی تقدیرِ امم تعمیرِ ملل

تخلیق کے روشن مقصد کی تصویر نظر آجائے گی
آدم کے پریشاں خوابوں کی تعبیر نظر آجائے گی
کھیتی پہ خدا کی برسے گا انساں کے عزائم کا بادل

آسٹریلیا کے “آئي بس” پرندے جو ٹڈیوں کو کھاتے ھیں

آسٹریلین “رائل سپونبل”

“ولي ویگ ٹیل” اپنے گھونسلے میں

“ککو” ماں اور بچہ

آسٹریلیا کا ”ہنی ییٹر“ اپنے بچوں کو چوگا دیتے ہوئے
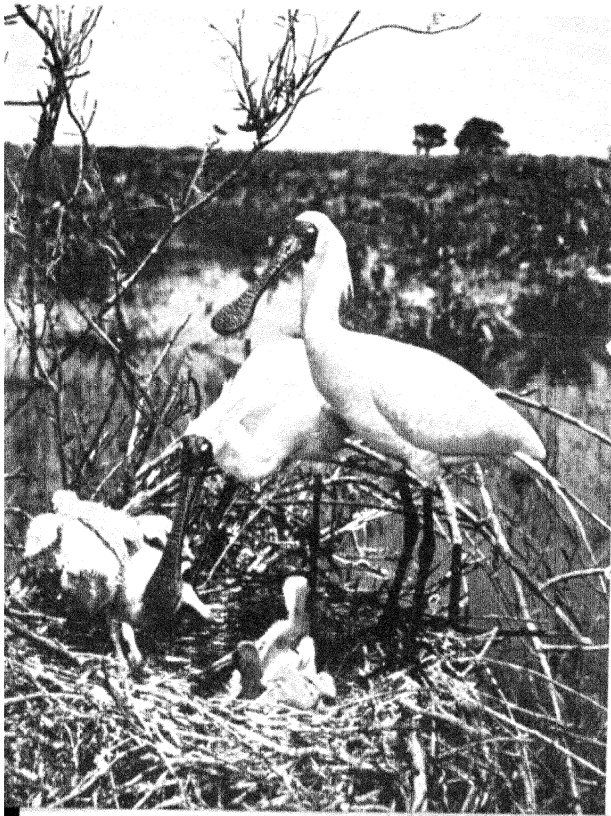
”بلیو کرین“ کے بچے اپنے ماں باپ کی واپسی کے انتظار میں

”سپونبل“ جوڑا اپنے پریوار کے ساتھ
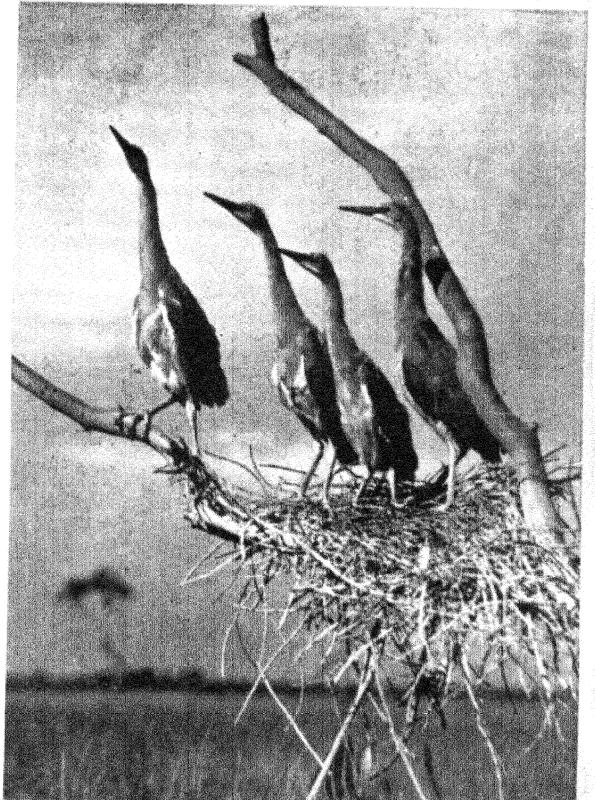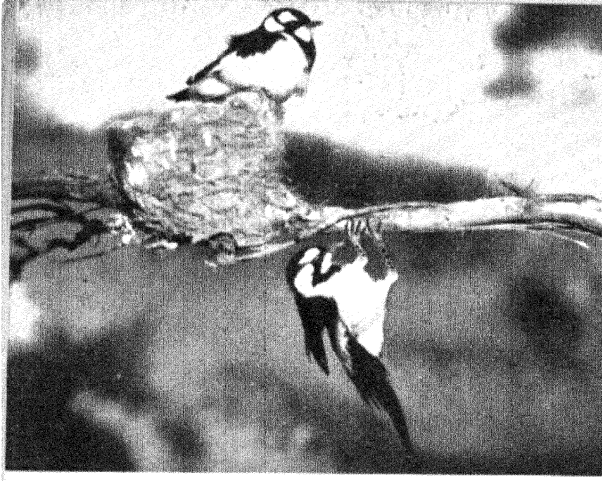
”میگ پائی لارک“ جوڑا اپنے گھونسلے میں

← ”فروڈا امایت“ آسٹریلیا کا ایک رات کے وقت اُڑنے والا پرندہ

”آئی بس“ پرندہ ٹڈیوں اور کھیت کے کیڑوں کا شکار کرتے ہوئے

← ”بوچر“ پریوار کا بھوجن کال

”آئی بس“ پرندے کا مارنا قانوناً ممنوع ہے
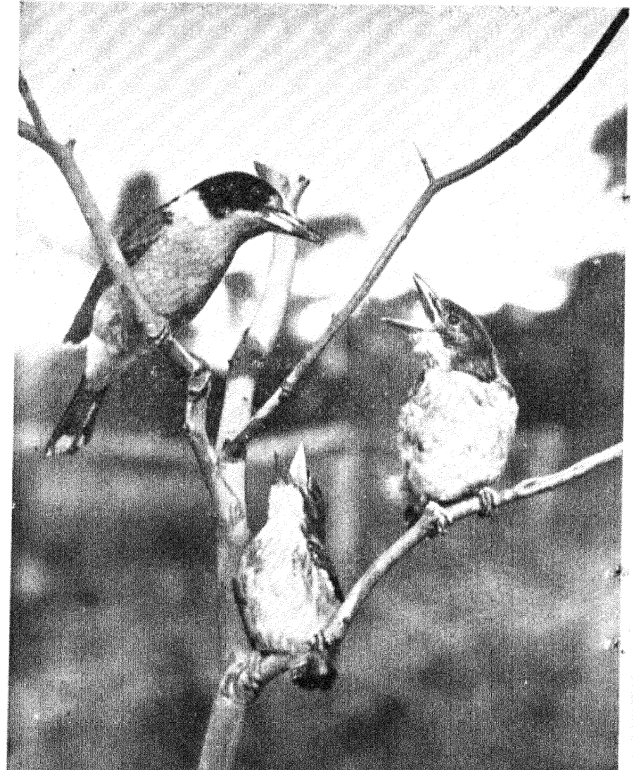
تہران میں ہندوستانی سفیر ہزایکسیلینسی ڈاکٹر تاراچند کی ہزایکسیلینسی ڈاکٹر مصدق وزیراعظم ایران سے ملاقات -
ڈاکٹر تارا چند بائیں جانب اور ڈاکٹر مصدق سامنے تشریف فرما ہیں
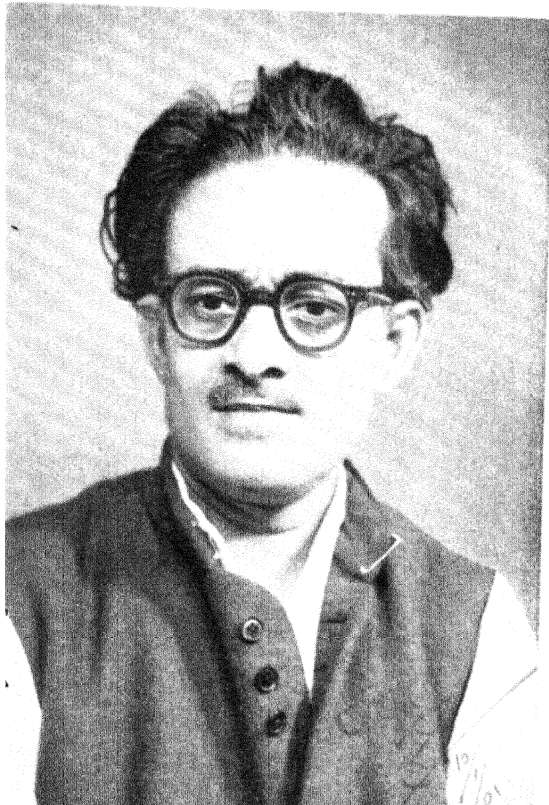
سہیل عظیم آبادی

شکیل الرحمن
جن کا مقالہ "سہیل عظیم آبادی کی کہانیاں" زیر نظر شمارے میں شائع ہو رہا ہے

اقبال کی فارسی شاعری کا ترجمہ

اصل نظم (فارسی) — اقبال

ترجمہ (ہندستانی) — سردار جعفری

محاورہ مابین خدا و انسان

خدا

جہاں را زیک آب و گل آفریدم
تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولادِ ناب آفریدم
تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہالِ چمن را
قفس ساختی طائرِ نغمہ زن را

انسان

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم
سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

قطعہ

سحر می گفت بلبل باغباں را
درایں گِل جز نہالِ غم نہ گیرد
بہ پیری مے رسد خارِ بیاباں
و لے گل چوں جواں گردد بمیرد

شعر

گفتند جہانِ من آیا بتو می سازد
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

خدا اور انسان

خدا، انسان سے

میں نے بنایا اک مٹی اور پانی سے سنسار
تُو نے بنائے مصر اور ترکی، ایران اور تتار
میں نے دھرتی کے پیٹ سے لوہا کیا تھا پیدا
تُو نے ڈھالے تیر اور خنجر، نیزے اور تلوار
تو نے کاٹی شاخ ہری اور پھلتے پیڑ گرائے
گاتے پنچھی کے لئے، پنجرے تو نے بنائے

انسان خدا سے

تو نے رات بنائی مالک میں نے دیئے جلائے
تو نے مٹی پیدا کی اور میں نے پیالے بنائے
تو نے بخشے دھرتی کو جنگل، پربت، ویرانے
میں نے ہنستے باغ سجائے، رنگیں پھول کھلائے
زہر سے میں تریاق بناؤں پتھر سے آئینہ
(کون بڑا ہے تو یا میں؟ اے مالک سچ سچ کہنا)

قطعہ

بھور بھئے بلبل مالی کو اپنا گیت سُنائے
تیرے باغ کی مٹی دُکھ کے پودے کو راس آئے
(کیسا ظلم ہے) جنگل کا کانٹا تو بوڑھا ہوئے
پھول پہ جیسے آئے جوانی ویسے ہی کمہلائے

شعر

"میری دُنیا راس نہ آئی؟" (کیوں ہے گریباں چاک)
"نا ہیں مالک" "اچھا اس کو کر دے مٹا کر خاک"

سی۔ بی۔ میموزیہ

ہندوستان کا مسئلۂ آبادی

کرۂ زمین پر انسانی وجود کے لئے مسئلہ آبادی ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ یہ انسان کی زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہے خواہ وہ سماجی ہو خواہ ذاتی۔ خواہ وہ قومی ہو خواہ بین الاقوامی۔ مختلف خاندانوں کی صحت اور خوشی پر اور مختلف اقوام کی سماجی ترقی پر اس کا گہرا اثر ہے۔ دنیا کا امن بھی اس کے اثر سے مبرا نہیں ہے کیونکہ مسئلہ آبادی سے پیدا شدہ پیچیدگیاں جنگ کا باعث ہو سکتی ہیں۔ مسئلہ آبادی ہماری اقتصادی دقتوں کی جڑ ہے۔ اتنی اہمیت کے باوجود بھی ہمارے انسانی ذرائع نظر انداز کر دئے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے لئے لوگوں کی تعداد زمین کی وسعت، معدنیات اور جنگلات کی نسبت زیادہ اہم ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی آبادی ضرورت سے زیادہ ہے۔ یہ سوال قابل غور ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ آبادی فی مربع میل کیا ہے۔ اور پھر زمین کی زرخیزی، آب و ہوا، صنعتی ترقی، معیار زندگی اور اقتصادی ذرائع پر بھی غور کرنا ہوگا۔ یہ چیز یاد رکھنی چاہیئے کہ کوئی بھی ملک ضرورت سے زیادہ آباد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ قدرت نے آبادی فی مربع میل کی کوئی حد مقرر نہیں کی ہے۔ اگر کسی ملک کے باشندے اس کے ذرائع پر بسر نہ کر سکیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی آبادی ضرورت سے زیادہ ہے۔ جرمنی، فرانس اور جاپان کی صنعتی ترقی کو دیکھتے ہوئے ان ممالک کے لئے ایسا نہیں کہا جا سکتا۔ سائنس کی نئی ایجادات و اختراعات کا استعمال کر کے ان ممالک نے اپنی زراعت میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے اور وہ اپنی موجودہ آبادیوں سے بھی کہیں زیادہ آبادی کو رکھنے کے قابل ہیں۔ اگر یہ چیز ان ممالک کے لئے صحیح ہے تو ہندوستان کے لئے غلط نہیں ہو سکتی کیونکہ ہندوستان بھی مختلف اقسام کے اناج، خام اشیا اور مختلف معدنیات پیدا کر سکتا ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ ہندوستان اپنی موجودہ پیداوار کا دس گنا پیدا کر سکتا ہے ضرورت صرف اس چیز کی ہے کہ نئے طریقوں کا استعمال کیا جائے۔ آرنلڈ لیپٹن نے لکھا ہے۔

یہ بڑا ملک جس میں اس قدر آبادی ہے صحیح راستہ پر چل کر موجودہ آبادی سے دوگنی آبادی کو نہایت اچھی طرح ضروریات زندگی مہیا کر سکتا ہے۔

اسی طرح سر وسوکیسوریا کے بموجب "اچھے حالات میں ایک باقاعدہ قومی پالیسی پر چل کر سائنس کی نئی ایجادات۔ نئی مشینوں اور تجارت کے نئے قوانین کا استعمال کر کے زراعتی اور صنعتی لحاظ سے ہندوستان کی پیداوار اگلے دس سال میں دوگنی اور پندرہ سال میں تین گنی ہو سکتی ہے"۔

اور بھی کئی حقائق اس امر کو ثابت کرتے ہیں کہ ہندوستان کی کم پیداوار کی وجہ قدرتی نہیں ہے بلکہ ہماری اپنی غلطیوں میں پوشیدہ ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہندوستان کی آبادی ضرورت سے زیادہ ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے ملک کی آبادی مقابلتاً زیادہ ہے۔ اگر کسی ملک میں ایسی وجوہ کے باعث جن کو دور کیا جا سکے موجودہ آبادی کے لئے کافی دولت یا روزگار کے ذرائع نہ ہوں تو اس کی آبادی مقابلتاً زیادہ کہی جا سکتی ہے۔ ایسی وجوہات ناخواندگی، بدانتظامی، باہمی تنازعات، صنعتی ترقی کی نظر اندازی، لازمی تعلیم کی غیر موجودگی، صنعتی، زراعتی اور تجارتی تربیت کی کمی اور پیداوار کے قدیم طریقوں کا استعمال وغیرہ ہیں۔ یہی مسائل ہندوستان کے درپیش ہیں۔ ہندوستان کے قدرتی ذرائع لامحدود ہیں۔ آبادی میں مختلف خوبیاں مخفی ہیں لیکن پھر بھی معیار زندگی نیچا ہے۔ اس لئے ہندوستان میں آبادی صرف مقابلتاً زیادہ ہے کیونکہ قدرتی اور انسانی ذرائع کا مکمل فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے۔ یہ امر ہندوستان کے علاوہ کئی دیگر ممالک کے لئے بھی ٹھیک ہی ہے۔ جب تک ایسے کروڑوں انسان موجود ہیں جو کہ قابلیت، طاقت اور

مرضی کے باوجود بھی بے روزگار ہیں۔ جب تک کروڑوں انسانوں کو ٹھیک تنخواہیں نہیں ملتی اور جب تک کروڑوں انسانوں کو ضروریاتِ زندگی میسر نہیں ہیں وہ ملک مقابلتاً گنجان آباد کہلائے گا۔

آبادی کا دباؤ

ہندوستان میں ۱۹۴۷ء میں فی مربع میل آبادی ۲۵۵ تھی جبکہ بلجیم میں ۷۰۸ (۱۹۴۷ء)، انگلینڈ اور ویلز میں ۷۰۳ (۱۹۴۷ء)، ہالینڈ میں ۷۳۹، جاپان میں ۲۵۰ (۱۹۴۷ء)، ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ۴۷.۳ (۱۹۴۷ء) جرمنی میں ۲۸۳ (۱۹۳۹ء) اور پاکستان میں ۲۰۰ (۱۹۴۷ء) تھی۔ فی مربع میل آبادی سے کسی ملک کی اقتصادی حالت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ مثلاً بلجیم کی فی مربع میل آبادی ۷۰۸ یعنی مغربی بنگال کی فی مربع میل آبادی سے کچھ ہی کم ہے لیکن بلجیم کے عوام کا معیارِ زندگی مغربی بنگال کے معیار سے کہیں زیادہ ہے۔ اسی طرح انگلینڈ اور ویلز کی آبادی فی مربع میل ۷۰۳ ہے جبکہ امریکہ میں فی مربع میل آبادی صرف ۴۷.۳ ہے لیکن موخر الذکر بہت ہی خوشحال ہے۔

ہندوستان میں مختلف جگہوں پر فی مربع میل آبادی مختلف ہے۔ یہ دریائے گنگا کی گھاٹی میں، مشرقی پنجاب اور جنوبی ہند (ساحل مالابار) میں سب سے زیادہ ہے اور بیرونی ریگستان اور پہاڑی خطوں میں سب سے کم۔ شمالی بنگال کے کچھ حصوں میں اوسط آبادی ۱۰۰۰ فی مربع میل سے بھی زیادہ ہے جبکہ آسام اور راجستھان میں ایسے علاقے ہیں جہاں آبادی ۲ کس فی مربع میل سے بھی کم ہے۔

آبادی میں صنفی تناسب

صنفی لحاظ سے آبادی کی تقسیم کا اقتصادی حالات پر گہرا اثر ہے کیونکہ شادیوں اور بچوں کی پیدائش پر اثر انداز ہونے کے باعث یہ مزدوروں کی دستیابی پر گہرا اثر رکھتی ہے۔ ہندوستان میں صنفی تناسب ٹھیک نہیں ہے۔ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی بہت کمی ہے۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں ایک ہزار مردوں کے مقابلے میں عورتیں صرف ۹۴۶ ہیں جبکہ ۱۹۴۱ء میں ۹۴۳، ۱۹۳۱ء میں ۹۴۰، ۱۹۲۱ء میں ۹۴۵، ۱۹۱۱ء میں ۹۵۳، ۱۹۰۱ء میں ۹۶۳، ۱۸۹۱ء میں ۹۵۸ اور ۱۸۸۱ء میں ۹۵۴ تھیں۔ خاص بات یہ ہے کہ عورتوں کی تعداد کم ہی ہوتی جا رہی ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ مختلف سماجی زمروں کے لوگوں میں صنفی نسبت مختلف ہے۔ مثلاً ہندوستان کی بڑی اقوام میں عورتوں کی تعداد کم ترین ہے۔ سکھوں میں ۱۰۰ مردوں کے مقابلے میں صرف ۸۰ عورتیں ہیں جبکہ ہندوؤں اور عیسائیوں میں عورتوں کی تعداد ۱۰۰ مردوں کے مقابلے میں ۹۵، جینیوں اور پارسیوں میں ۹۴ اور مسلمانوں میں ۹۰ ہے۔ یہ کمی ہندوستان کے تمام بڑے صوبجات میں آشکارا ہے۔ ایسی ریاستیں جن میں مردوں کے مقابلے میں عورتیں زیادہ ہیں صرف مدراس (۱۰۰۴) اڑیسہ (۱۰۲۳) اور ٹراونکور کوچین (۱۰۰۷، ۱۰۰۰) ہیں، عورتوں کی سب سے زیادہ کمی مشرقی پنجاب اور مغربی بنگال میں ہے جہاں کہ ۱۰۰۰ مردوں کے مقابلہ میں عورتیں بالترتیب ۸۶۳ اور ۸۶۱ ہیں۔ جیسے ہی ہم ہندوستان میں جنوب اور مشرق سے شمال اور مغرب کی طرف جاتے ہیں عورتوں کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے۔

اکثر عورتوں میں اموات کی شرح مردوں کے مقابلے میں کم ہوتی ہے کیونکہ قدرت نے ان میں امراض کا مقابلہ کرنے کے ذرائع زیادہ بنائے ہیں۔ ہندوستان میں اگرچہ لڑکوں کی پیدائش کی شرح لڑکیوں کی پیدائش کی شرح کے مقابلے میں زیادہ ہے لیکن لڑکیاں پیدائشی لحاظ سے لڑکوں کی نسبت زیادہ مضبوط ہیں۔ انجمن بین الاقوامی کے اعداد و شمار کے بموجب تمام ممالک میں عمر کی ہر منزل پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ عورتوں کی زندگی کا بقیہ حصہ مردوں کی زندگی کے بقیہ حصے کی نسبت زیادہ سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ چیز ہندوستان پر عاید نہیں ہوتی کیونکہ یہاں پر ۴۰ سال کی عمر تک عورتوں میں بچے کی پیدائش کے دوران میں موت کی شرح خاص کر زیادہ ہے۔ ہندوستان میں بارہ سال کی عمر تک میں لڑکیوں کی اموات کی شرح لڑکوں کی اموات کی شرح سے کم ہے۔ لیکن ۱۲ سال سے لے کر ۴۵ سال کی عمر تک جبکہ بچے ہوتے ہیں عورتوں کی تعداد گھٹ جاتی ہے۔ اور اس طرح عورتوں کی تعداد مردوں کی تعداد کے مقابلے میں کم رہ جاتی ہے۔ بچوں کی پیدائش کے دوران میں خاص کر ۲۵ سے ۳۵ سال تک عورتیں موت کا شکار ہو جاتی ہیں جو کہ پہلے بچوں کی پیدائش میں جسمانی گراوٹ کے باعث ہو جاتی ہے۔

ہندوستان کے صنعتی شہروں میں مردوں کی تعداد عورتوں کی تعداد سے بہت ہی زیادہ ہے۔ ۱۹۴۱ء میں ۱۰۰۰ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد کلکتہ میں صرف ۴۶۴، بمبئی میں ۵۸۱ اور ہوڑہ میں ۵۵۰ تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہندوستانی مزدور اپنے کنبوں کو شہروں میں نہیں لاتے اور عورتوں کو شہری صنعتوں میں ملازمت کم ملتی ہے۔ یورپ میں اس کے برعکس شہروں میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہے۔ دس اور بیس سال کی عمر

کے دوران میں لڑکیاں گھروں میں ملازمت کے لیے اور بطور کلرک وغیرہ بھرتی کے لئے شہروں میں آجاتی ہیں ۔ ۵۰ سال کی عمر کے بعد وہ پھر دیہاتوں میں چلی جاتی ہیں ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مرد عورتوں کے مقابلے میں زیادہ جلدی کام کے ناقابل ہو جاتے ہیں ۔

ہمارے ملک میں کئی سماجی پابندیوں کے باعث اکثر گھروں کی عورتوں کی ایک بہت بڑی تعداد صرف گھر بار کے کاروبار میں اپنا وقت صرف کر دیتی ہے اور بہت ہی کم عورتیں دولت کی پیداوار میں حصہ دار بنتی ہیں ۔ اس لئے تمام آبادی کا بار برسر روزگار ۳۰ فیصدی آبادی پر پڑتا ہے ۔ اس کے مقابلے میں فرانس میں ۶۱ فیصدی (۱۹۴۶ء) اشخاص، انگلینڈ اور ویلز میں ۶۵ فیصدی (۱۹۳۷ء)، سویڈن میں ۶۶ فیصدی (۱۹۳۸ء)، کینیڈا میں ۶۳ فیصدی (۱۹۳۸ء)، اٹلی میں ۵۹ فیصدی (۱۹۳۶ء) اور ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ۶۵ فیصدی اشخاص دولت کی پیداوار میں حصہ لیتے ہیں ۔ اس چیز کا ملک کے معیار زندگی پر بہت برا اثر پڑتا ہے ۔

آبادی کا شہری اور دیہاتی تناسب

شہری اور دیہاتی آبادیوں میں تناسب کی بہت اہمیت ہے ۔ ہر ملک کی اقتصادی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی شہری آبادی میں اضافہ دیکھا جاتا ہے ۔ ہمارے ملک میں دیہاتی آبادی کی اس قدر زیادتی ملک کی اقتصادی بدحالی کی علامت ہے ۔ اس سے عیاں ہے کہ ہم تجارت، ٹرانسپورٹ اور صنعت کی ترقی میں دیگر تہذیب یافتہ ممالک سے بہت پیچھے ہیں ۔ شہری اور دیہاتی آبادیوں کا تناسب ایک اور نقطۂ نظر سے بھی اہم ہے ۔ یہ قومی اخلاق پر روشنی ڈالتا ہے ۔ دیہاتی لوگ کاہل، دقیانوسی اور توہم پرست ہوتے ہیں یا یوں کہیے کہ ان کے خیالات ساکن ہوتے ہیں ۔ دیہات ترقی کی مشین کو پیچھے کھینچتے ہیں ۔ شہری پن صنعتی اور تجارتی ترقی، سائنس ، علم و فنون کی خوشحالی کا نتیجہ ہوتا ہے ۔ اس لئے شہری لوگ چست، محنتی اور متحرک ہوتے ہیں ۔ شہروں سے ہی ترقی پسند خیالات اور تہذیب پھیلتی ہے ۔ ہمارے ہاں شہروں کی کم تعداد ظاہر کرتی ہے کہ ہمارے ہاں اقتصادی ترقی کے چشموں کی کمی ہے ۔

یہ ٹھیک ہی ہے کہ ہندوستان دیہات میں آباد ہے ۔ ہندوستان میں ۵ لاکھ دیہات ہیں اور ہر دیہات کی اوسط آبادی ۵۱۷ ہے ۔ دیہاتوں میں گھرے ہوئے مکانات کی تعداد ۴،۹۶،۳۴،۶۶ ہے یعنی فی گاؤں مکانات کی اوسط تعداد ۱۰۱ ہے اور ہر مکان میں ۵٫۱ کس رہتے ہیں ۔ ۱۸۷۲ء میں ہندوستان کے ۸٫۷ فیصدی اشخاص شہروں میں آباد تھے ۔ ۱۸۹۱ء میں تعداد ۹٫۴ فیصدی ۱۹۱۱ء میں ۹٫۳ فیصدی، ۱۹۲۱ء میں ۱۰٫۲ فیصدی، ۱۹۳۱ء میں ۱۱ فیصدی اور ۱۹۴۱ء میں ۱۲٫۸ فیصدی تھی ۔ یعنی ہندوستان کے اب بھی قریب ۸۷ فیصدی عوام دیہاتوں میں رہتے ہیں ۔ مغرب میں حالات اس کے برعکس ہیں ۔ مغربی ممالک میں شہری آبادی بہت زیادہ ہے ۔ یہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ۶۵ فیصدی، سویڈن میں ۳۲ فیصدی، اٹلی میں ۱۷ فیصدی، جرمنی میں ۵۶ فیصدی، فرانس میں ۴۲ فیصدی، انگلینڈ اور ویلز میں ۷۷ فیصدی، آسٹریا میں ۵۴ فیصدی، کینیڈا میں ۴۱ فیصدی اور جاپان میں ۴۶ فیصدی ہے ۔

پیشے کے لحاظ سے آبادی کی تقسیم

پیشہ وار آبادی کی تقسیم سماجی حالات اور تبدیلیوں پر روشنی ڈالتی ہے اور اس سے ملک کی صنعتی ترقی کا بھی بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے ۔ دیہاتوں میں اس قدر آبادی زراعتی پیشہ کی وسعت کا ثبوت ہے ۔ صدیوں سے کاشتکاری ہی بہت بڑی آبادی کا واحد پیشہ رہا ہے ۔ ۱۸۹۱ء میں ۶۱ فیصدی لوگوں کا گزر کاشتکاری پر تھا ۔ ۱۹۱۱ء میں ۷۲ فیصدی، ۱۹۲۱ء میں ۷۳ فیصدی ۱۹۳۱ء میں ۷۵ فیصدی اور ۴۹-۱۹۴۸ء میں ۶۸ فیصدی اشخاص کاشتکاری پر گزر کر رہے تھے ۔ صنعتیں بہت ہی کم ہیں ۔ اور بڑے شہروں تک ہی محدود ہیں ۔ ان میں آبادی کا بہت ہی کم حصہ کام کرتا ہے ۔

نیشنل انکم کمیٹی نے ۴۹-۱۹۴۸ء میں مختلف پیشوں کے لوگوں کے بارے میں مندرجہ ذیل اعداد و شمار اکھٹا کئے

پیشہ	ان پر اوقات گزر کرنے والوں کی تعداد ۴۹-۱۹۴۸ء میں	فیصدی تعداد	۱۹۳۱ء میں فیصدی تعداد
حیوانات اور نباتات سے متعلقہ پیشہ	۹۰٫۵۳۷ ہزار	۶۸٫۲	۶۵٫۸
	۹۰٫۵۳۷ ہزار	۶۸٫۲	۶۵٫۸
معدنیات سے متعلقہ	۶۳۳ ہزار	۰٫۵	۰٫۲
صنعت	۱۸۰۱۹ ہزار	۱۳٫۶	۱۰٫۳
ٹرانسپورٹ	۹۴۴۸ ہزار	۱٫۸	۱٫۶
تجارت	۸۲۵۰ ہزار	۶٫۲	۵٫۵
نہروں وغیرہ پر	۱۹۰۹ ہزار	۱٫۴	۰٫۱

پیشہ	۱۹۴۸-۴۹ء میں	فیصدی تعداد	۱۹۳۱ء میں فیصدی تعداد
فنون	۵۰۴۴ ہزار	۳٫۸	۱٫۶
سرکاری انتظام	۱۶۹۷ ہزار	۱٫۳	۰٫۶
گھریلو نوکری	۴۱۹۴ ہزار	۳٫۲	۷٫۵
متفرق پیشہ	"	"	"
	۱۳۲۷۳۱ ہزار	۱۰۰٫۰	۱۰۰٫۰

ان اعداد و شمار سے عیاں ہے کہ مختلف پیشوں کے لحاظ سے آبادی کی تقسیم نہایت غیر موزوں ہے۔ ملکی انتظام میں اور فنون میں صرف ۳ فیصدی آبادی حصہ دار ہے۔ اس سے ناخواندگی کی زیادتی کا پتہ چلتا ہے۔ اس ملک کی اقتصادی حالت یقینی طور پر ہی خستہ حال ہوگی جہاں پر کہ آبادی کا بہت بڑا حصہ ایک ایسے پیشہ میں مشغول ہے جو کہ پرانا اور بدحال ہو چکا ہے۔ ہمارے ملک میں قحطوں، غربت اور کمی کی وجہ بھی یہی ہے۔ جب تک اقتصادی حالات اسی طرح رہی ملک کی حالت خراب ہی رہے گی۔

شرح پیدائش اور شرح موت

شرح پیدائش فی سال فی ہزار اشخاص کے حساب سے مقرر کی جاتی ہے۔ ۱۹۴۰ء تک ہندوستان میں شرح پیدائش ۳۲ پر ساکن تھی ۱۹۴۵ء میں یہ ۲۸ اور ۱۹۴۹ء میں ۲۶ رہ گئی۔ دوسرے ممالک کے اعداد و شمار اس طرح ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ ۱۷٫۲ (۱۹۳۹ء) یونائٹیڈ کنگڈم ۱۶٫۳ (۱۹۳۹ء) مصر ۴۳٫۴ (۱۹۳۸ء) فرانس ۱۵٫۹ (۱۹۴۱ء) اٹلی ۲۰٫۵ (۱۹۴۱ء) بلجیم ۱۴٫۸ (۱۹۴۱ء) جرمنی ۱۹٫۲ (۱۹۴۱ء) سویڈن ۱۹٫۳ (۱۹۴۱ء) اور ڈنمارک ۲۱٫۴ (۱۹۴۱ء)

ان اعداد و شمار سے عیاں ہے کہ مصر کے علاوہ باقی تمام تہذیب یافتہ ممالک میں سے ہندوستان میں شرح پیدائش سب سے زیادہ ہے۔ اس کی اہم وجوہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) قریب ہر شخص جس کی عمر قابل شادی ہے شادی شدہ ہے۔ زیادہ تر لڑکیوں کی شادی ۲۰ سال سے کم کی عمر میں ہی ہو جاتی ہے اور ۳۰ سال کی عمر سے پہلے ہی وہ مائیں بن جاتی ہیں۔

(۲) شادیاں بہت ہی کم عمر میں ہو جاتی ہیں۔ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے بموجب اگر بیوی کی عمر ۱۵ سے ۲۰ سال کے درمیان ہو تو اوسط گھرانے میں سات بچے ہوتے ہیں۔ ۲۰ سے ۲۵ سال تک عمر ہونے پر ۵٫۴ بچے اور ۲۵ سے ۳۰ سال کی عمر ہونے پر ۱٫۴ بچے ہوتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ بیوی کی عمر جتنی زیادہ ہوگی بچے اتنے ہی کم ہوں گے۔ ہندوستان میں ۱۵ سے ۲۰ سال تک کی عمر کی عورتوں کے بچے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ ۲۰ اور ۳۰ سال کے درمیان بھی بچے زیادہ ہوتے ہیں لیکن اول الذکر عمر کی عورتوں سے کم۔ ۳۰ سال کی عمر سے زیادہ عورتوں کے بچے بہت ہی کم ہوتے ہیں اور ۴۵ سال کی عمر میں قریب بالکل نہیں ہوتے۔ ہندوستان میں ایک عورت کے اوسط سات بچے ہوتے ہیں انگلینڈ میں ۳٫۴، جرمنی میں ۴٫۳، اٹلی میں ۴٫۹ اور پولینڈ میں ۲٫۶۔

(۳) ایڈیم سمتھ کے بموجب ہماری غریبی اور نیچا معیارِ زندگی بھی پیدائش کی اونچی شرح کا ذمہ دار ہے۔ غریب گھرانے کی عورتوں کے بچے زیادہ ہوتے ہیں یہ امر بخوبی واضح ہے کہ بچوں کی زیادہ پیدائش کا جھکاؤ ان اشخاص میں زیادہ ہے جہاں کہ بچوں کے والدین یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا معیارِ زندگی ہمارے معیار زندگی سے زیادہ کم نہیں ہو سکتا۔

(۴) ناخواندگی بھی اونچی شرح پیدائش کی ذمہ دار ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ناخواندہ اقتصادی طور پر بدحال اور نیچے درجے کے گھرانوں میں بچے زیادہ ہوتے ہیں۔ دیہاتی شرح پیدائش شہری شرح پیدائش سے ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے۔

شرح موت

جہاں شرح پیدائش زیادہ ہے وہاں شرح موت بھی بہت زیادہ ہے۔ یہ ۳۰ فی ہزار ہے۔ یعنی ہر سال ایک کروڑ اشخاص لقمۂ اجل ہو جاتے ہیں ۱۹۴۱ء میں ہندوستان کی شرح موت ۲۲ فی ہزار اور ۱۹۴۹ء میں ۱۵٫۶ فی ہزار تھی۔ لیکن یہ تخمینہ کم تھے۔ ہندوستان کی شرح موت یقیناً بہت ہی زیادہ ہے۔ اعداد و شمار ملاحظہ ہوں۔ ہندوستان کی شرح موت ۲۲ فی ہزار۔ کینیڈا ۹٫۶، جرمنی ۱۲٫۳، فرانس ۱۵٫۳، یونائیٹیڈ کنگڈم ۱۲٫۲، ریاستہائے متحدہ امریکہ ۱۰٫۶، جاپان ۱۴٫۰، آسٹریلیا ۱۰٫۹، نیوزی لینڈ ۹٫۷ اور مصر ۲۷٫۲۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ اموات ایک سال سے کم عمر کے بچوں کی۔ بچے کی پیدائش کے دوران میں ماؤں کی اور ایسی عورتوں کی ہوتی ہے جو بچہ پیدا کر سکتی ہیں۔ جتنے بچے ہوتے ہیں ان میں ایک چوتھائی پہلے ہی سال لقمۂ اجل ہو جاتے ہیں۔ ان میں آدھی اموات پہلے ہی مہینے ہو جاتی ہیں اور ۶۰ فیصدی پہلے

ہی ہفتہ - کسی سال کی اموات کی تعداد میں سے ۱۰ سال سے کم عمر والوں کی تعداد قریب ۴۹ فیصدی ہوتی ہے -

عورتیں زیادہ ۱۴ اور ۳۰ سال کے درمیان بچے کی پیدائش کے دوران میں لقمۂ اجل ہوتی ہیں - بھور کمیٹی کے بموجب بچے کی پیدائش کے دوران میں ہر سال قریب ۲ لاکھ عورتیں مر جاتی ہیں اور قریب ۴۰ لاکھ مختلف امراض میں مبتلا ہو جاتی ہیں - عورتوں کی اس طرح اموات ہمارے ملک میں آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جرمنی اور جنوبی افریقہ کی نسبت پانچ گنی، ریاستہائے متحدہ امریکہ کی نسبت ۳ گنی، انگلینڈ - ویلز اور سوئٹزرلینڈ کی نسبت ۶۸ گنی اور فرانس - سویڈن - جاپان - اٹلی - ناروے اور ڈنمارک کی نسبت ۱۲ گنی ہیں -

ہندوستان میں اوسط عمر صرف ۲۷ سال ہے جبکہ یہ نیوزی لینڈ ۶۷ سال، سویڈن اور ناروے میں ۶۳ سال، یونائیٹڈ کنگڈم میں ۶۲ سال کینیڈا میں ۶۰ سال، فرانس میں ۵۷ سال اور جاپان میں ۴۳ سال ہے - اوسط عمر اس قدر کم ہونے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ کام کرنے والوں کی تعداد کم ہو جاتی ہے اور ایسے بچوں کی تعداد جن کی زندگی دوسروں پر منحصر ہو بڑھ جاتی ہے

ہندوستان میں دوسرے ممالک کی طرح بہت سے ایسے اشخاص ہیں جو کہ جسمانی یا دماغی کمیوں کے باعث سوسائٹی کے لئے ایک بار ہیں -

ہندوستان میں پاگل اور اندھوں کی تعداد کے اعداد و شمار صحیح نہیں ملتے کیونکہ ایسے انسانوں کو جو کہ کمزور دماغ ہوتے ہیں پاگلوں میں اور جزوی طور پر اندھوں کو مکمل طور پر اندھوں میں شمار کر لیا جاتا ہے - اندھے پن کی کمیٹی کے بموجب ۱۹۴۷ء میں ہندوستان میں اندھوں کی تعداد قریب ۲۰ لاکھ تھی اور جزوی طور پر اندھوں کی تعداد اس سے تگنی - یعنی ہر ہزار اشخاص میں سے قریب ۳ اندھے - ایک بڑی تعداد بچپن میں ہی مکمل اندھی یا جزوی طور پر اندھی ہو جاتی ہے - ہندوستان میں کوڑھ کے مریضوں کی تعداد دس لاکھ کے قریب ہے جبکہ تمام دنیا میں ایسے مریضوں کی تعداد تیس لاکھ کے قریب ہے - صنفی امراض میں مبتلا اشخاص کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے - راجکماری امرت کور کے بموجب ” ہر ہزار اشخاص میں ۷۰ آتشک سوزاک وغیرہ صنفی امراض میں مبتلا ہیں - قریب ۱۵ لاکھ اشخاص ہر سال حادثات، سانپ کے کاٹنے اور دیگر وجوہات کے باعث مر جاتے ہیں - اس قدر مصیبت کی وجہ ہمارے ملک میں میڈیکل سائنس کی کم ترقی میں پوشیدہ ہے -

ہندوستان میں ہر ۱۰۰۰ اشخاص میں سے ۲ ایسے دماغی امراض میں مبتلا ہیں جنہیں ہسپتال میں رکھنے کی ضرورت ہے - تمام ملک میں ایسے اشخاص کی تعداد کم سے کم ۸ لاکھ ہے -

ہندوستان ایک امیر ملک ہے جس کے باشندے غریب ہیں - ضرورت اس چیز کی ہے کہ معیارِ زندگی بلند کیا جائے -

ضرورت صرف اس چیز کی نہیں ہے کہ زیادہ تعداد کو روکا جائے بلکہ اس چیز کی بھی ہے کہ درجہ بھی اعلیٰ بنایا جائے - ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ایسے اشخاص میں پیدائش کو روکا جائے جو کہ یقینی طور پر نقص دار ہیں - پاگلوں، ملزموں اور دیگر امراض میں مبتلا اشخاص کو یا تو الگ اداروں میں رکھا جائے جہاں وہ صنفی تعلق سے الگ رہ سکیں یا ان کی قوت ولادت کو ختم کر دیا جائے - دوسری چیز یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کی اولاد کی پیدائش کے طریقے استعمال کئے جائیں -

اس لئے آبادی کا مسئلہ حل کرنے کے لئے چار باتیں کرنی چاہئیں -

(۱) برتھ کنٹرول کے طریقوں کا زیادہ استعمال

(۲) بچوں کا معیار بلند کرنے کے لئے بالاالذکر دونوں طریقوں کا استعمال

(۳) اقتصادی ترقی جس سے معیارِ زندگی بلند ہو اور بیروزگاری دور ہو

(۴) پیشوں کی بہتر تقسیم جس سے اقتصادی حالت میں بہتری پیدا ہو -

(”ماڈرن ریویو“ سے ماخوذ) مترجمہ بھگوت سروپ گوئل

زکی انور

سنگم

پنڈت بھولے ناتھ شاستری کی ناٹک منڈلی دھرم اور آرٹ کی خدمت کے لئے وقف تھی۔ دھرم کی خدمت کچھ زیادہ اور آرٹ کی اُس سے کچھ کم۔ کھانے کمانے کا سلسلہ وہاں نہ تھا۔ پنڈت بھولے ناتھ شاستری خود ایک مالدار زمین دار اور موسیقی کے ماہر تھے۔ اور اُن کی ناٹک منڈلی میں کام کرنے والے بھی منجھے ہوئے فن کار ہونے کے علاوہ گھر کے ایسے خوش حال تھے کہ وہ کھانے پہننے اور دوسرے اخراجات کے لئے بھی گھر سے غلّہ اور پیسے لے آیا کرتے تھے۔ ناٹک منڈلی کے پردہ کھینچنے والوں۔ اسٹیج سجانے والے اور اس قسم کے دوسرے ملازموں کی تنخواہیں اور ناٹک کے اخراجات اُس رقم سے پورے ہو جاتے تھے جو رقم تماشہ ختم ہونے پر آرتی کی تھالی میں آتی تھی۔ کبھی کبھی پنڈت بھولے ناتھ شاستری کو اپنے ذاتی پیسے بھی ناٹک منڈلی میں لگا دینا پڑتے تھے۔ پر ایسا موقع کم ہی آتا تھا۔ پنڈت بھولے ناتھ شاستری اور اُن کی ناٹک منڈلی کا نام اتنا کھل گیا تھا کہ پنڈت جی جس گاؤں میں بھی جاتے، گاؤں کے لوگ بڑے چاؤ سے انھیں وہاں ناٹک کھیلنے کی دعوت دیتے اور جب پنڈت جی وہاں رام لیلا۔ راس لیلا اور دوسرے مذہبی ناٹک دکھلاتے تو گاؤں والے جی کھول کر آرتی کی تھالی میں بھینٹ دیتے۔

پنڈت ہری شنکر شاستری، پنڈت بھولے ناتھ شاستری کا اکلوتا بیٹا اور ناٹک منڈلی کا منیجر تھا۔ اُسے پنڈت جی نے ایف اے تک کی تعلیم بھی دلوائی تھی۔ وہ بڑا ہی ذہین اور سمجھ دار لڑکا تھا۔ اُس میں منیجری کی ساری صلاحیتیں موجود تھیں اور پنڈت جی اُسے بہت پیار کرتے تھے۔

ناٹک منڈلی کا ماحول بالکل مذہبی اور فنی تھا۔ وہاں یا تو شری رام چندر جی کی خدا ترسی اور قربانیوں کا چرچا ہوتا یا سیتا جی کی تقدیس کی باتیں ہوتیں۔ یا شری کرشن جی کی بانسری کی حد سے زیادہ روحانی تانوں کا تذکرہ ہوتا۔ یا پھر مہا دیو جی کی تپسیا اور رقص کی۔ لیکن ایسے ماحول میں بھی ہری شنکر باضابطہ ہو کر اخبار پڑھتا، دوسری کتابیں پڑھتا، اور کبھی کبھی سیاسی جلسوں میں چلا جاتا، اور کبھی کبھی سنیما دیکھ آتا۔ یہ باتیں پنڈت جی کو ذرا سی ناگوار تو ضرور معلوم ہوتیں۔ لیکن ہری شنکر کے اتنے سارے گُنوں کے نزدیک اُس کی یہ باتیں پنڈت جی کے نزدیک اتنی غیر اہم تھیں کہ انھوں نے ہمیشہ نظر انداز کر دیا۔

پنڈت بھولے ناتھ شاستری کی موت کے بعد اُن کی ساری جائداد کے علاوہ ناٹک منڈلی کا بھی ہری شنکر مالک ہوا۔

کچھ دنوں تک تو ناٹک منڈلی بدستور پنڈت جی کی قائم کی ہوئی ڈگر پر چلتی رہی۔ لیکن رفتہ رفتہ ہری شنکر نے اُس میں تبدیلیاں شروع کر دیں، اور ناٹک منڈلی کا اب نام دھر دیا گیا "شری شاستری ناٹک منڈلی"۔

اور پھر ہری شنکر شدّت سے یہ محسوس کرنے لگا شری رام چندر جی میں بے پناہ خدا ترسی کا جذبہ کے علاوہ حکمرانی کی اعلیٰ قابلیتیں بھی تھیں۔ سیتا جی کی زندگی تقدیس کے علاوہ بہترین ازدواجی زندگی گزارنے کا راستہ بھی بتاتی ہے۔ شری کرشن جی کی حد سے زیادہ روحانی بانسری کی تانوں سے زیادہ اہم اُن کا جاگا ہوا سیاسی شعور تھا۔ اور مہا دیو جی کی تپسیا اور اُن کے اعلیٰ رقصوں سے زیادہ اہم اُن کی زندگی کی کہانی کا پس منظر تھا کہ وہ ادھا کی شکل میں قدیم ہندوستانی تہذیب کو، وقت کے حکمراں کے قتل کر دینے کے باوجود اپنے کندھوں پر ڈھوئے ڈھوئے پھرے۔ ویسے تو مردہ تہذیب اُن کے کندھوں پر سلامت نہ رہ سکی اور سڑگل کر گر گئی۔ لیکن ہندوستان کی تہذیب بے مثال اور امر تھی، اُسے اُس کے قدر دانوں نے پھر بھی زندہ رکھا، اور مہا دیو جی کو پھر اُن کی محبوب تہذیب رادھا ہی کی شکل میں ہمالیہ کی وادیوں میں مل گئی۔

ہری شنکر نے وقت کے بہترین ادیبوں اور شاعروں کی خدمات حاصل کیں اور اُن سے اپنے مطالعوں کے انوسار نئے نئے ناٹک لکھوا کر کھیلے۔

مگر گاؤں میں اُس کے نئے ناٹک بُری طرح پٹنے لگے۔ آرتی کی تھالی میں محض چند آنے آتے اور کسی دن تو آرتی کی تھالی گھوم پھر کر خالی خولی واپس آجاتی۔ ایک تو ناٹک دیکھنے والے ہی اب بہت کم ہوتے تھے۔ جو تھے بھی وہ تماشہ ختم ہونے پر آرتی کی تھالی میں پیسے دینے کے بدلے مُنہ بنا کر اُٹھتے منہ بچکا کر چلے جاتے۔ جاتے وقت اُن کے دلوں میں پنڈت بھوسے ناتھ شاستری کی یاد تازہ ہو جاتی اور وہ افسوس کرتے کہ اب وہ بات کہاں؟ اور وہ اتنے قابل باپ کے ایسے ناقابل بیٹے پر محض افسوس کر کے رہ جاتے۔ ممکن تھا اگر انھیں پنڈت بھوسے ناتھ شاستری سے غیر معمولی عقیدت نہ ہوتی تو وہ اٹ پٹانگ تماشے دکھلانے پر ہری شنکر کو گالیاں بھی دے دیتے۔

یہ دیکھ کر کہ گاؤں میں لوگوں کا چاؤ بالکل ختم ہو چکا ہے ہری شنکر نے شہر میں ناٹک کھیلنے کا ارادہ کیا۔ لیکن شہر میں ناٹک کھیلنے کے لئے اُسے اچھے اچھے سازوں کی ضرورت تھی اور یہ سب کچھ اُس نے اپنی تھوڑی سی زمین بیچ کر پورا کر لیا۔

کافی بھاگ دوڑ اور انتظار کے بعد شری شاستری ناٹک منڈلی "شاستری تھیئٹرس" کی شکل میں شہر پہنچا۔ چھ آنے سے لے کر تین روپے تک کی ٹکٹ پر شاستری تھیئٹرس کا پہلا کھیل "ہماری امر سنسکرتی" دکھلایا گیا۔ اور وہ کچھ اس قدر مقبول ہُوا کہ دوسرے دن ہری شنکر کو اُن کی ہلکی پھلکی گالیاں سننا پڑیں۔ جنہیں ہال میں کم جگہ ہونے کی وجہ سے ٹکٹ نہیں مل سکی۔ لیکن گالیاں سن کر ہری شنکر کے چہرے پر ایک خاص قسم کی چمک نمودار ہو گئی تھی۔ جس میں روشن مستقبل اور کامیابی کے رنگ صاف نمایاں تھے۔

اب شاستری تھیئٹرس کے فن کاروں کو معقول معاوضہ ملنے لگا تھا اور شاید معاوضہ ہی ملنے کے کارن اُن کا فن اور بھی نکھرنے لگا تھا۔

ہری شنکر جس شہر میں تھیئٹر لے کر جاتا۔ اپنے بہت سارے مداح، دوست اور عقیدت مند پیدا کر لیتا۔ ایک شہر میں ہری شنکر کو کچھ ایسے مداح، دوست اور عقیدت مند ملے۔ جنہوں نے اُسے بتایا کہ تھیئٹر کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو اور کتنے ہی اچھے اداکاروں کے ساتھ کتنے ہی اچھے ناٹک کیوں نہ اسٹیج کئے جائیں پبلک کا ذوق اس طرف سے ہٹ چکا ہے اور وہ جلد ہی اُکتا جاتے ہیں۔ انھوں نے ہری شنکر کو رائے دی کہ زمانے کی ہوا کے ساتھ چلنا چاہیئے۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ وہ اپنے نایاب ڈراموں کی فلمیں بنائے کیوں کہ اُس کے پاس بہترین فن کار بھی تو موجود تھے۔

بات تو بہت ہی معقول تھی اور خود ہری شنکر نے بھی ایسی بات کئی بار سوچی تھی۔ لیکن اتنی رقم کہاں سے آسکتی تھی؟ یہ سوال ہمیشہ ہری شنکر کے ذہن میں اُٹھتا اور جواب نہ پا کر بیٹھ جاتا۔ لیکن اب اُس کے مدّاحوں، دوستوں اور عقیدت مندوں نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ سب اُس کے شریک کار رہیں گے اور ہری شنکر نے بھی اپنی ساری جائیداد فروخت کر کے "دی شاستری فلمس لمیٹڈ" کی بنا ڈال دی۔

"دی شاستری فلمس لمیٹڈ" کی اوّلین فلم "کرشن اعظم" کی ساری کاغذی تیاریاں مکمل ہوئیں۔ پھر فلموں سے متعلق کچے مال کی فراہمی بھی شروع ہو گئی۔ لیکن سب سے اہم مسئلہ تھا ہیروئن اور ہیرو کے چناؤ کا۔ یہ مسئلہ اتنا اہم نہ ہوتا اگر سارے فن کار ایک پر ایک نہ ہوتے یا اگر پنڈت بھوسے ناتھ شاستری ہمیشہ اپنے بیٹے کو یہ ہدایت نہ کرتے ہوتے کہ وہ سارے فن کاروں کو ایک نظر سے دیکھے۔

اس میں شک نہیں کہ ہری شنکر ریکھا کو ذرا مختلف نظر سے دیکھا کرتا تھا لیکن یہ مختلف نظر نہ تو امتیازی تھی اور نہ ہی اُس کا یہ مطلب تھا کہ ریکھا کا فن سب سے اعلیٰ تھا۔ بلکہ وہ مختلف نظر تو محض پیار کی نظر تھی۔ ہری شنکر ریکھا کے علاوہ بھی سارے فن کاروں سے پیار کرتا تھا۔ لیکن دوسرے فن کاروں سے پیار اور ریکھا سے پیار میں کیا فرق تھا اس بات کو شروع میں ہری شنکر نے تو سمجھا ہی نہیں اور جب سمجھ گیا تو نظر انداز کر دیا اور جب نظر انداز بھی نہ کر سکا تو محض سوچا کرنے لگا۔

لیکن وہاں ریکھا سے اچھی اداکارائیں بھی تھیں اور ریکھا بھی بہتوں سے اچھی اداکارہ تھی۔ اور یہ فیصلہ کرنا حقیقتاً بہت محال تھا کہ کس کو، کس پر اور کیوں ترجیح دی جائے۔ ریکھا کے بارے میں یہ سوچتے ہوئے ہری شنکر کو ہمیشہ اپنے باپ کی، فنکاروں کو ایک نظر سے دیکھنے والی بات یاد آجاتی۔ اور اُسے یہ خوف بھی ہوتا کہ اگر وہ ریکھا کی طرف داری کر بھی دے تو اُس کے دل کا چور پکڑا جائے گا۔

بہت سوچ بچار کے بعد "دی شاستری فلمس لمیٹڈ" کے سارے شرکاء نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ وہ مقابلے کا ایک ہفتہ منائیں جس میں سارے فن کار ایک ہفتہ بس اداکاری ہی کرتے رہیں۔ اور اُن کی اداکاری پر ایک منتخبہ بورڈ نظر رکھے اور جس کی اداکاری جیسی ہو اُسے ویسا ہی کردار دیا جائے۔

گو یہ فیصلہ ذرا مضحکہ خیز تھا لیکن اس کے علاوہ کوئی اور چارہ بھی تو نہیں تھا۔ چنانچہ ایک دن سارے فن کاروں کو جمع کر کے دی شاستری فلمس لمیٹڈ کے دوسرے شرکاء کی رائے سے ہری شنکر نے یہ فیصلہ سنا دیا۔ سارے فن کاروں نے بھی اس فیصلے کو سراہا اور اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ اور یہ طے ہو گیا کہ کل صبح سے مقابلے کا ہفتہ

شروع ہو جائے گا۔

لیکن سامنے بیٹھی ہوئی ریکھا نے بڑی اداس آواز میں ہری شنکر سے پوچھا۔

"کیا مقابلے کا ہفتہ کچھ دنوں بعد شروع نہیں کیا جا سکتا؟"

"کیوں؟" ہری شنکر چونکا اور سارے لوگ ریکھا کی طرف دیکھنے لگے۔

"میں ادھر تقریباً ایک مہینے سے کچھ بیمار سی ہوں" ریکھا کھانسی اور پھر کہنے لگی۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ بات کیا ہے؟ دن میں کسی وقت تھوڑا بخار آجاتا ہے اور طبیعت تو ہر وقت نڈھال رہتی ہے۔ ذہن تو خالی خالی سا رہتا ہے۔ جسم بھی ہر وقت تھکا تھکا اور پریشان سا رہتا ہے۔ آپ لوگ جانتے ہیں کہ میرا محبوب فن رقص ہے۔ اور میں رقص ہی کا سہارا لے کر مقابلے میں میدان مارنے کی امید کر سکتی تھی۔ لیکن مجھ سے ناچا تو بالکل نہیں جا سکتا۔" وہ پھر کھانسنے لگی۔ ہری شنکر اسے بہت گھبرائی ہوئی نظر سے دیکھتے دیکھتے بولا۔

"تقریباً کتنے دنوں تک مقابلے کا ہفتہ روک دیا جائے"؟

"میں کیسے کہوں" ریکھا مسکرائی۔ "بلکہ اب تو میں یہ بھی سوچتی ہوں کہ مقابلے کا ہفتہ رکوانا بھی درست نہیں۔ میرا جسم جس تیزی سے گر رہا ہے۔ میں تو ایسا سمجھتی ہوں کہ دو چار دنوں میں پلنگ سے لگ جاؤں گی۔"

"پر آپ نے آج تک کسی سے ذکر نہیں کیا؟" ہری شنکر نے کہا۔ "لیکن اس میں مایوس ہونے کی کیا بات ہے۔ ممکن ہوا تو مقابلے کا ہفتہ چند دنوں کے لئے روک دیا جائے گا۔"

"نہیں۔" ریکھا کچھ اور کہتی۔ مگر اس پر کھانسی کا کچھ ایسا دورہ پڑا کہ وہ آگے نہ کہہ سکی۔

"آپ کیا کہہ رہی تھیں؟" ہری شنکر نے پوچھا۔

میں یہ عرض کر رہی تھی کہ" ریکھا کہنے لگی "میں نے بغیر سوچے سمجھے محض جذبات میں مقابلے کا ہفتہ رکوانے کی اپیل کر دی تھی۔ لیکن میں نے جو سوچا تو محض میرے لئے انتظام میں گڑبڑی ہو جانا مجھے پسند نہیں اور یہ چیز ایک طرح سے میرے ساتھ رعایت ہوگی۔ اور رعایت کو میں اپنی توہین سمجھتی ہوں۔"

"رعایت نہیں ریکھا دیوی!" ہری شنکر نے کہا۔ "آپ کو فلم میں شامل کرنا تو سب کے لئے مفید ہے"۔

"لیکن یہ بھی تو نہیں کہا جا سکتا کہ میں کب تک صحت مند ہو سکوں گی۔" ریکھا بولی۔

"نہیں۔" ہری شنکر نے ذرا زور دے کر کہا۔ "مقابلے کا ہفتہ کچھ دنوں کے لئے روک دینا ہی ٹھیک ہوگا۔"

"جی نہیں۔" ریکھا نے بھی زور سے کہا۔ "میں اپنے ساتھ کسی قسم کی بھی رعایت کو اپنی کمزوری سے منسوب کرتی ہوں۔ آپ لاکھ کہیں مقابلے کے ہفتے کی تاریخ بڑھانا میرے لئے رعایت ہی کہی جائے گی۔ فن کار کی سب سے بڑی طاقت اس کا فن ہوتی ہے۔ اپنے فن کے علاوہ کسی اور چیز کا سہارا لینا فن کار کی موت ہے۔ میں اپنی اپیل بڑی ندامت کے ساتھ واپس لیتے ہوئے عرض کرتی ہوں کہ اگر مقابلے کے ہفتے کی تاریخ بڑھا بھی دی گئی تو میں اس بات کو اپنی توہین سمجھتے ہوئے مقابلے میں شریک نہ ہوں گی ــــ یہ میرا آخری اور قطعی فیصلہ ہے۔"

ریکھا اٹھی اور کھانستی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

اور دوسرے روز سے مقابلے کا ہفتہ شروع ہو گیا۔ مکان کا کونہ کونہ فن کے بہترین نمونے پیش کرنے لگا۔ کہیں سے دل گداز نغمے پھوٹ رہے ہیں تو کہیں سے تھاک تھئی تھئی۔ دل فریب رقص پیش کئے جا رہے ہیں۔ کسی طرف نزاع کا دلچسپ منظر نظر آ رہا ہے تو کہیں دو بھائیوں کے درمیان تخت و تاج کے لئے دو بدو جنگ ہو رہی ہے۔ کہیں پریم رس میں ڈوبی ہوئی باتیں ہو رہی ہیں۔ تو کوئی فراق کی آگ میں جل رہا ہے اور کوئی پریتم کے بچھڑ جانے سے پاگل ہو گیا ہے۔ پورنیما تو کچھ اس طرح پاگل ہو گئی کہ لوگوں کو کبھی کبھی یہ شک ہوتا کہ کہیں وہ سچ مچ تو پاگل نہیں ہو گئی! اور اس کا بہترین پاگل پن سبھوں کو یہ مان لینے پر مجبور کر رہا تھا۔ کہ وہ ضرور میدان مار لے گی۔ اور "دی شاستری فلمس لمیٹڈ" کی اولین فلم "کرشنِ اعظم" کی ہیروئن ہوگی۔

ہری شنکر مقابلے کے ہفتے سے کچھ بھی دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ وہ تو بس دن رات ریکھا کی پلنگ سے لگا، کرسی پر بیٹھا رہتا تھا۔ اور اب اسے اس بات کی فکر بھی نہیں رہ گئی تھی کہ لوگ اس کے دل کا چور پکڑ لیں گے کہ اسے ریکھا سے پیار ہے۔

محض پانچ چھ دنوں ہی میں ریکھا سچ مچ پلنگ سے لگ کر رہ گئی تھی۔ علاج ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر بدلے جا رہے تھے۔ علاج بدلا جا رہا تھا۔ لیکن ریکھا کا مرض بڑھتا ہی جاتا تھا۔ اب ہر لمحہ وہ کھانسی سے پریشان رہنے لگی تھی۔ دن میں کئی بار منہ سے خون آ جاتا۔ آنکھوں تلے سیاہ گہرا حلقہ بن گیا تھا۔ چہرے پر مردنی سی چھا گئی تھی۔ اور ریکھا کا گداز اور گدرایا ہوا جسم اگر سوکھ نہ سکا تھا تو اس میں اب نمایاں

فرق مزید پیدا ہو چکا تھا۔ اور اب ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ گو اُس کے پھیپھڑے ابھی تندرست تھے۔ لیکن بیماری کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیئے اور ریکھا کو جلد ہی کسی سینی ٹوریم میں داخل کر دیا جائے تاکہ مناسب علاج ہو سکے۔ لیکن اب ریکھا اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ اپنے ناخن کو دبا کر یہ دیکھنے کے لئے کہ اُس کے بدن میں کتنا خون ہے؟ اُسے اپنے ہاتھ بھی دوسروں سے اُٹھوا کر نظر کے سامنے لانا پڑتا۔ اور ایسی حالت میں اُسے کہیں اور لے جانا مناسب نہ تھا۔

ہری شنکر نے سوچا تھا کہ ریکھا کو تھوڑی بہت بھی طاقت آ جائے گی۔ اور مقابلے کا ہفتہ بھی جب تک ختم ہی ہو جائے۔ پھر اطمینان سے اُسے لے کر کسی پہاڑی پر چلا جائے گا۔

مقابلے کے ہفتے کا آخری دن آ گیا۔

پہلے ہری شنکر نے سوچا تھا کہ مقابلے کے ہفتے کا آخری دن خوب دھوم دھام سے منایا جائے گا۔ شام کے وقت شہر کے مشہور معزز لوگ اور فلمی ہستیوں اور دوسرے فن کاروں کو مدعو کیا جائے گا۔ ایک چھوٹا سا کنسرٹ ہوگا۔ ایک اچھی سی پارٹی ہوگی۔ پھر ہفتہ بھر کی اداکاری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے "دی شاستری فلمس لمیٹڈ" کی اولین فلم "کرشن اعظم" کے لئے ہیرو، ہیروئن اور دوسرے کرداروں کا انتخاب ہو جائے گا۔ اور پھر فلم کی مہورت بھی ہو جائے گی۔

لیکن پچھلی رات سے جو وہ ریکھا کی پلنگ کے پاس بیٹھا تھا تو ایک پل کے لئے بھی جدا نہ ہو سکا تھا۔ صبح وہیں بیٹھے بیٹھے اُس نے منہ ہاتھ دھوئے بغیر اُس نے چائے پی تھی اور بس! یہاں تک کہ ریکھا کے کمرے سے لگے ہوئے میک اپ کا کمرہ تھا مگر اُس نے اپنے بکھرے بال بھی نہیں سنوارے تھے۔

پچھلی رات سے ہی ریکھا زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اُسے ایک پل کے لئے بھی چین نصیب نہیں تھا۔ کبھی اُسے اتنی گرمی لگتی کہ بجلی کا پنکھا اُس کی آخری رفتار سے کھول دیا جاتا اور سر پر برف کی تھیلی رکھی جانے لگتی۔ اور اب کبھی اُسے اتنی سردی لگتی کہ اُسے چادر اور پھر لحاف اڑھا دیا جاتا۔ پھر جلد ہی وہ بوکھلا جاتی۔ لحاف کے اندر بڑی بے تابی سے کلبلانے لگتی۔ اُس کا چہرہ کھول دیا جاتا۔ تھوڑی دیر تک وہ حد سے زیادہ پریشان سی نظر آتی اور پھر خون کی ایک قے کر دیتی۔ پھر کچھ دیر کے لئے بے حس و حرکت سی پڑی رہتی۔

دن میں کئی بار ڈاکٹر آ چکے تھے۔ مگر ڈاکٹر مسیحائی تو جانتے نہیں تھے، آتے، سٹیتھسکوپ لگاتے۔ نبض دیکھتے اور پھر ہری شنکر کو تسلی دے کر چلے جاتے

دن میں محض ہری شنکر کی تسلی ہی کے لئے کیلشیم کی ایک سوئی لگائی گئی تھی۔ لیکن سوئی لگانے کے بعد ہی ریکھا کی حالت اتنی کربناک ہو گئی تھی کہ اب جو کبھی کبھی دل کی دھڑکن بند ہوتی ہوئی سی محسوس ہوتی اور ڈاکٹر بجھتی ہوئی شمع کو محض کچھ دیر کے لئے جلتی رکھنے کے لئے "کورامن" دینا چاہتے تو ریکھا بڑی گلوگیر آواز سے سماجت کرتی اور ایشور کا واسطہ دے کر ڈاکٹر کو سوئی لگانے سے روک دیتی ہری شنکر سے بھی ریکھا کی وہ بے چینی دیکھی نہ گئی تھی جو سوئی لگانے کے بعد ہو گئی تھی۔ اور اب وہ بھی سوئی لگانے سے ڈاکٹر کو منع کرتا تھا۔ کیونکہ اُسے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ ریکھا اگر چند گھنٹوں کی نہیں تو چند دنوں کی مہمان ہے۔ ایسی حالت میں اُس کی تکلیفوں میں مزید اضافہ کرنے سے کیا حاصل؟

شام ہونے کو آئی تھی۔ ابھی ابھی شہر کا ایک مشہور ڈاکٹر آیا تھا اور ریکھا کو دیکھنے کے بعد نرس کو کچھ ضروری ہدایتیں کر کے اور ہری شنکر کو تسلی دے کر جا چکا تھا۔ ریکھا بے ہوش سی پڑی تھی۔ اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق سارے لوگ اُس کے کمرے سے ہٹا دئے گئے تھے۔ البتہ ڈاکٹر کی ہدایت سے مجبور نرس اور اپنے دل کے تقاضوں سے مجبور ہری شنکر کمرے میں موجود تھے۔

نرس ایک کنارے کوچ پر پڑی اونگھ رہی تھی۔ اور ہری شنکر، ریکھا کی پلنگ کے سرہانے کرسی پر بیٹھا اٹ پٹانگ باتیں سوچ رہا تھا۔

ہری شنکر سوچ رہا تھا۔ انسان ترقی کی کتنی منزلیں ہی کیوں نہ طے کر لے وہ قدرت کے ہاتھوں کا ایک حقیر کھلونا ہی ہے۔ اُسے اپنے بارے میں خیال آیا کہ وہ کیا تھا؟ کیا سے کیا بنا اور پھر کیا سے کیا بننے والا تھا۔ لیکن قدرت کے ایک بالکل معمولی اور روزمرہ کے فعل کے بعد وہ کیا سے کیا ہو کر رہ جائے گا؟ اب وہ اپنے دل کو مزید جھوٹی تسلی دینا نہیں چاہتا تھا۔ اور اُس نے اپنے آپ سے اعتراف کر لیا تھا کہ اُسے ریکھا سے پیار ہے ـــ بے پناہ پیار! پھر کیا ریکھا کی موت کے بعد اُس کے دل کے ولولے بدستور سلامت رہ سکیں گے؟ اور اس سوال کے جواب میں اُس کے لبوں پر ایک ایسی مسکراہٹ پھیل گئی۔ جس میں موت کی سی اُداسی تھی۔ اُس نے سوچا کہ ریکھا کی موت کے بعد بھی وہ ایسی ہی مسکراہٹ مسکرا سکے گا۔ لیکن مسکراہٹوں کی موت کی سی اُداسیاں اُس کے لبوں پر سے پھیل کر سارے ماحول میں چھا جائے گی اور وہ ساری زندگی انہیں اداسیوں میں گھٹتا رہے گا۔

ہری شنکر نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کرسی کے تکئے سے سر ٹیک لیا۔

اور کافی دیر تک وہ ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں سوچتا رہا اور اُلجھتا رہا اور یہ سب کچھ سوچتے سوچتے اُس کے لبوں پہ ایک بار پھر ویسی ہی اُداس مسکراہٹ پھیل گئی۔ اب کے وہ مسکراہٹ اُداس بھی تھی، تلخ بھی اور اُس میں ایک گہرا طنز تھا۔ ہری شنکر کی آنکھیں کھل گئیں۔ سامنے پلنگ پر ریکھا اب تک آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔ وہ ریکھا کی طرف خوب غور سے دیکھنے لگا۔ ریکھا کیا سے کیا ہو چکی تھی۔ قدرت کی فن کاری کا حسین اور شاہکار نمونہ ایک پژمردہ پھول سا ہو کر رہ گیا تھا۔ ہری شنکر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے گھبرا کر نرس کی طرف دیکھا۔ وہ کرسی پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ ہری شنکر نے جلدی سے رومال نکال کر اپنے آنسو پونچھ لئے۔

ریکھا کے جسم میں ذرا سی حرکت ہوئی اور ہری شنکر غور سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ ریکھا نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اور اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے نکل کر اُس کے گالوں پر آ گئے۔ اور کچھ دیر تک ریشمی گالوں پر پھسلتے رہنے کے بعد تکیے پر گر کر جذب ہو گئے۔

"میرے پاس آؤ" ریکھا نے اتنی نحیف آواز میں کہا کہ نرس بھی نہیں سُن سکی۔ البتہ اور پاس آنے کے لئے جب ہری شنکر نے کرسی کھسکائی تو نرس کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ دوڑ کر ریکھا کے پاس آ گئی۔

"کیا بات ہے؟" نرس ریکھا پر جھک گئی۔

"ذرا باہر چلی جاؤ۔" ریکھا نے بڑی تکلیف سے رُک رُک کر کہا۔

نرس باہر چلی گئی تو ریکھا نے ہری شنکر کی طرف بڑی حسرت سے دیکھ کر کہا:- "میرے پاس آؤ شنکر۔"

شنکر نے کرسی ذرا اور پاس کھسکا لی۔

"میرے ہی پلنگ پر بیٹھ جاؤ شنکر۔" ریکھا جیسے کراہی

شنکر کرسی سے اُٹھ کر اُس کی پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اُسی وقت ریکھا پر پھر کھانسی کا دورہ ہوا اور کافی دیر تک کھانسی رہنے کے بعد وہ بے دم سی ہو گئی۔ اور جب اُسے ذرا سکون ہوا۔ تو وہ بالکل رندھی ہوئی آواز میں کہنے لگی

"شنکر آج زندگی میں پہلی بار میں تمہارا نام لے کر اور تمہیں "تم" سے مخاطب کر رہی ہوں، تم بُرا تو نہیں مان رہے ہو؟"

شنکر اس بات کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ البتہ اُس کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے ٹپک کر ریکھا کے گالوں پر گر گئے۔ ریکھا نے بہت کسمانے اور بڑی کوشش کرنے کے بعد اپنا ہاتھ ہلایا اور ہری شنکر کے آنسو اپنے انگوٹھے میں لگا کر ماتھے پر لگا لیا۔

ہری شنکر یہ دیکھ کر بالکل خوش نہیں ہوا کہ ریکھا میں کم سے کم اب اتنی سکت ضرور آ گئی ہے کہ اُس نے اپنے ہاتھ سے معمولی سا کام لے لیا۔ بلکہ یہ دیکھ کر ہری شنکر اور بھی بوکھلا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ شمع بجھنے سے پہلے ایک بار تیز جلنے لگتی ہے۔ ہری شنکر کا دل دھک دھک کرنے لگا کہ شاید اب اُس کی زندگی کی شمع بجھنے والی ہے۔ اور اب اُس کے دل کا کونا کونا اندھیرا ہو جائے گا۔ اُس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو گرنے لگے۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" اب کے ریکھا ذرا صاف آواز میں بولی۔ تو ہری شنکر کی گھبراہٹ اور بھی بڑھ گئی۔ اُس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ لیکن ریکھا اُس کی طرف بدستور جواب طلب نظروں سے دیکھتی رہی۔

"ریکھا—" ہری شنکر رُک رُک کر کہنے لگا۔ "دنیا میں کچھ سوالوں کا جواب زبان سے نہیں دیا جا سکتا۔"

"لیکن میں ایک بار تمہاری زبان سے سننا چاہتی ہوں شنکر!۔" اُس کی آواز میں التجا کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

"ریکھا— مجھے تم سے پیار ہے۔" ہری شنکر نے بے ساختہ کہہ دیا۔

ریکھا اُس کی طرف حد سے زیادہ پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ پھر وہ مسکرانے لگی اور اُس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

"ریکھا—" ہری شنکر نے کراہنے کے انداز میں دہرایا۔ "مجھے تم سے پیار ہے۔"

"شنکر۔" اب کے ریکھا نے شنکر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چوم لیا۔ "اب میری آتما کو چین نصیب ہوا۔"

"ریکھا۔" شنکر چیخا۔ لیکن یک لخت ریکھا کا ہاتھ بالکل ڈھیلا پڑ گیا۔ اور اُس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور وہ جلدی جلدی سانس لینے لگی۔

"ریکھا—" ہری شنکر نے اب کے اتنی زور سے پکارا کہ پہلے نرس اور پھر دوسرے لوگ دھڑا دھڑ ریکھا کے کمرے میں گھس آئے۔

ریکھا بڑی بے چینی سے ہچکیاں لے رہی تھی۔ اور کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ البتہ پورنیما کا پاگل پن یک لخت دُور ہو گیا۔ اور اُس نے جلدی سے ڈاکٹر کو فون کیا۔ لیکن وہ ریسیور رکھ کر لوٹی بھی نہ تھی کہ موت کی

صرف ایک حقیر ہچکی نے ساری گہما گہمی ختم کر دی۔

"ریکھا ۔" ہری شنکر اور بھی زور سے چیخا۔ مگر اب وہاں محبت کی پکار کا جواب دینے والا ہی کون تھا؟ ہری شنکر کی پکار دیواروں سے ٹکرا کر چور چور ہو گئی۔

ہری شنکر آہستہ سے ریکھا کے چہرے پر جھکا۔ اور اُس کے ماتھے کو چوم لیا۔

اور ایک بے پناہ اور حد سے زیادہ اُداس خاموشی سارے ماحول پر مسلط ہو گئی اور پورنیما نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ریکھا کی چادر اُس کے سر تک تان دی۔ اور پھر ہری شنکر کا بازو تھام کر اُسے باہر لے چلنے لگی۔ اُن کے ساتھ ہی سارے لوگ کمرے سے باہر نکل گئے۔

شام ہو چکی تھی۔ مکان میں تمام تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ کسی نے بجلی کے بٹن دبائے اور مکان کا کونا کونا اُجالا ہو گیا۔ لیکن شنکر کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اُس کے دل کی تاریکی میں اب کبھی ایک کرن بھی نہیں پھوٹے گی۔

ڈاکٹر جلد ہی آ گیا۔ مگر ماحول کی کرب ناک خاموشی دیکھ کر وہ سب کچھ سمجھ گیا۔ ریکھا کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اُس کے قدم ٹھٹھک گئے۔ اور وہ بھی وہیں ایک خالی کُرسی پر بیٹھ گیا۔

ایک طویل عرصے تک خاموشی چھائی رہی اور خاموشی کی طوالت یوں بڑھتی جا رہی تھی جیسے اب یہ خاموشی لامتناہی ہو کر رہ جائے گی اور جیسے ریکھا کی موت کے ساتھ ساتھ مکان کی ساری گہما گہمی مر جائے گی۔

اچانک ریکھا کے کمرے کی بغل کے میک اپ کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ سبھوں کی نظریں اُس طرف اُٹھ گئیں اور وہ اُس طرف یوں دیکھنے لگے جیسے وہ جادو کا کھیل دیکھ رہے ہوں۔

پھر سبھوں کے لبوں پر حد سے زیادہ حسین مسکراہٹ پھیل گئی۔

سب کے سب یوں متحیر ہو گئے تھے کہ اُن میں سے کسی کے مُنہ سے کوئی آواز تک نہیں نکل رہی تھی۔ بس وہ مسکرائے جا رہے تھے۔

"میرا خیال ہے اب اداکاری کے مقابلے کا فیصلہ سُنا دینا چاہیئے" ـــــ بنی سنوری اور دُلھن کی طرح سجی ہوئی ریکھا نے مسکرا کر کہا۔

اور جب اُس کی نظر مسکراتے ہوئے ہری شنکر پر پڑی۔ جس کی پلکوں میں اب تک آنسو کے قطرے پھنسے ہوئے تڑپ رہے تھے تو ریکھا نے ٹھیک ایک نئی نویلی دُلھن کی طرح شرما کر گردن جھکا لی۔

ہری شنکر نے محسوس کیا کہ ریکھا کی بہترین اداکاری 'اداکاری اور حقیقت کا سنگم تھی۔

محوی صدیقی لکھنوی

نادر شاہ کی عمّان پر فوج کشی

آخری اہم تاریخی تحقیقات

یہ اہم تاریخی مضمون یورپ کے ایک فاضل مضمون نگار لارنس لوکھارٹ نے انگریزی زبان میں بڑی محنت سے لکھ کر چند سال پہلے لندن کے ایک رسالے میں شائع کیا تھا۔ فارسی زبان میں اس کا ترجمہ ایران کے ایک ادیب نے کیا۔ جنہوں نے اپنا نام "رنامور" لکھا ہے۔ اور یہ مقالہ تہران کے مشہور علمی ماہنامہ "مہر" جلد ۴ شمارہ ۱۱ میں شائع ہوا۔ اس خاص موضوع پر نئی تحقیق کا حامل ہے۔ اس لئے میں نے اسے اردو میں ترجمہ کیا۔ کیونکہ اس کا تعلق (لگاؤ) انگریزوں کی اس سیاست جو ہندوستان پر قبضہ کرنے کے لئے انہوں نے اختیار کر رکھی تھی، اور آخر کار وہ کامیاب ہوئے۔ یہ مضمون کسی قدر خشک ضرور ہے۔ مگر امید ہے کہ اپنے افادی اور معلوماتی لحاظ سے خاص دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔

ایران کے اس نامور بادشاہ نے جو نادر شاہ افشار کے نام سے تاریخی دنیا میں شہرت رکھتا ہے، جو جو لڑائیاں لڑیں، جہاں جہاں فوجی حملے کئے، اور جو فتوحات حاصل کیں۔ ہمارے ہاتھوں اور معلومات تک اُن کی تفصیل پہنچ چکی ہے —— میرزا مہدی خاں ایسا زبردست واقعہ نگار ہمیشہ اس کی خدمت میں موجود رہتا تھا۔ وہ اسی کام پر مقرر تھا۔ کہ ہر واقعے کو لکھتا رہے۔ وہ ان حادثوں اور واقعات کے سلسلے میں چھوٹی چھوٹی باتوں تک کو تحریر میں لے آتا ہے۔ پھر بھی اس مشرقی ایرانی شاہنشاہ کی تاریخ حیات کے چند گوشے ہماری نظروں سے اوجھل ہو کر رہ گئے ہیں۔ جن پر اب نئی تحقیق روشنی ڈالتی ہے۔ اور ابہام کے تاریک پردوں کو ہٹا کر حقیقت کو اجاگر کرتی ہے۔ مسقط اور عمان کے شبہ جزیرہ[1] پر ایرانی لشکر کی حملہ آوری کا مسئلہ بھی ایک ایسا ہی مسئلہ ہے، جس کے بارے میں ہمیں بہت کم معلومات بہم پہنچی ہیں۔ اور جو کچھ پہنچی ہیں وہ بھی اکثر و بیشتر ناہموار اور ناراست ماخذوں سے لی گئی ہیں، اس وجہ سے یا تو ان میں مبالغہ ہے، یعنی بات کو بہت بڑھا کر بیان کیا ہے، یا فضول اور خرافات باتیں زیادہ شامل ہیں، جو اعتبار کے قابل نہیں، یا صحیح و اصل سرچشمہ (ماخذ) ناپید اور نایاب ہے۔ آخر آخر میں انگریز مستشرقین اور لندن کے (مدرسۃ السنۂ مشرقیہ) مشرقی زبانوں کے مدرسہ ارکان کی تلاش اور کوشش سے ماخذوں کا ایک ایسا ذخیرہ اور سلسلہ ہاتھ لگا ہے، جس کے وجود سے اب تک کوئی بھی آگاہ نہ تھا۔ یہ چند دستاویزیں اور اسناد ہیں۔ جو ایسٹ انڈیا کمپنی[2] (شرکت ہندوستان شرقی) کی تحریروں میں ہاتھ آئی ہیں۔ اور جو بغیر کسی درمیانی واسطے کے یہ بتاتی ہیں کہ انگریزوں کی سیاست کا عمان سے کیا لگاؤ تھا۔ یہ کاغذات انہیں کے بارے میں ہیں۔

اس کمپنی کا نمائندہ (ایجنٹ) بذات خود مسقط میں رہتا تھا۔ یہ کمپنی ابتدا میں ایک تجارتی کمپنی کے عنوان سے ہندوستان میں قائم ہوئی۔ مگر کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ مختلف ذریعوں، قسم قسم کے حیلوں اور طرح طرح کے ناموں سے ہندوستان کی حکومتوں کو ایک ایک کر کے ہڑپ کر کے پورے ملک

---

[1] شبہ جزیرہ یا جزیرہ نما فن جغرافیہ میں وہ زمین کا بڑا حصہ (ملک) جو تین طرف سے سمندروں سے گھرا ہو۔ [2] جدید عربی، فارسی زبانوں میں کمپنی کو شرکت کہتے ہیں

پر قبضہ کرلیا - اور اس نادر طریقے سے اس شرکت نے ہندوستان کو برطانیۂ عظمیٰ کی حکومت اور دولت کا مستقر (ٹھکانا) بنا دیا - برطانیہ کی سیاست کا دارومدار مشرق ہی پر تھا - اس وجہ سے نادرشاہ کا اس طرح نمایاں ہونا اور فتوحات کا حاصل کرنا کمپنی کے لیے پریشان خاطری کا سبب بن گیا تھا - وہ بڑے غور و فکر سے اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھتی تھی خصوصاً اس کی نگاہ اس پر لگی ہوئی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو' ایرانی فوجیں عمان کے فتح کرنے میں کامیاب ہوجائیں' جو ہندوستان کا دروازہ شمار کیا جاتا ہے - اور نادرشاہ کی یہ کامیابی کمپنی کے فائدوں اور مصلحتوں کو خطرے میں نہ ڈال دے -

اسی سبب سے اور سچی دلی لگاؤ کی بنا پر کمپنی کا جو نمائندہ مسقط میں رہتا تھا' وہ پوری فکر و غور سے نادرشاہ کی لشکر کشی کی رفتار کو اپنی رپورٹ میں درج کرتا ہے - اس نمایندے کی تحریریں بڑی توجہ کے ساتھ لندن کے مرکزی ادارے میں پڑھی اور محفوظ رکھی جاتی تھیں - اور اب تک موجود ہیں -

دوسری طرف نادرشاہ کا وقائع نگار میرزا مہدی خاں تھا - اس نے محض اس نظر سے کہ نادرشاہ بذاتِ خود میدانِ جنگ میں شریک اور موجود نہ تھا - اس سپاہ کشی کا حال اپنی کتاب "درّۂ نادری" میں تفصیل کے ساتھ نہ لکھا' بلکہ صرف اشاروں پر اکتفا کی ہے - بعد کے دوسرے ایرانی تاریخ لکھنے والوں نے بھی کسی اور صحیح و لائقِ توجہ ماخذ تک دسترس نہ پائی - اس وجہ سے ایرانی لشکر کا حملہ عمان پر نادرشاہ کے زمانے میں پوری طور سے واضح اور روشن نہ ہوا - اور اب یہ جو نیا اور معتبر نادر و نایاب ماخذ یورپ کے مشرق شناس عالموں کی کوشش اور کاوش کی بدولت ہاتھ آیا ہے - اور اب شائع بھی ہوگیا ہے' اس موضوع کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے' اسی اہمیت کی بنا پر ذیل کا مقالہ (جو اس باب میں آخری تحقیقات پر مبنی اور حاوی ہے) تاریخ سے دلچسپی اور تحقیق و ریسرچ کا ذوق رکھنے والوں کے لئے ہم پیش کرتے ہیں - یہ مقالہ صرف اسی بنا پر اہم نہیں کہ عمان اور ایران میں باہم جو لڑائیاں ہوئی ہیں' ان کا ایک صحیح اور اعتبار کے قابل ماخذ ہے اور جو خوش نصیبی سے ہمیں دستیاب ہوگیا ہے بلکہ بعض نہایت اہم اور جاذبِ توجہ نکتے اس میں نظر آتے ہیں - جو ہمارے لئے بہت زیادہ اور غیر معمولی طور پر بیش قیمت ہیں -

نادرشاہ کا واقعہ نگار میرزا مہدی خاں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۴ء تک

کے زمانے میں "عمان پر ایرانی لشکر کشی" کا حال اجمال اور اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہے اور اس بارے میں وہ ہمارے ہاتھوں تک بہت کم معلومات پہنچاتا ہے - اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں - ایک یہ کہ نادرشاہ کی لڑائیوں کا اصلی مرکز اور میدان عمان نہ تھا - دوسرے یہ کہ خود نادرشاہ ان معرکوں میں شریک اور میدانِ جنگ میں حاضر نہ تھا - کیونکہ اس جنگ کے دوران میں اس کا سپہ سالار فارس کا بیگلر بیگی محمد تقی خاں شیرازی تھا - عمان کے معرکوں اور واقعات کا بڑا حصّہ اسی سے تعلق رکھتا ہے پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ تنہا فانی ہی وہ مؤرخ ہے جو اپنے فارس نامے میں "عمان پر ایرانی لشکر کشی" کا ذکر کرتا ہے - مگر بہت تھوڑا ذکر کر کے ختم کر دیتا ہے -

دوسری طرف عربی اور یورپ کے ماخذ ہیں' جو اس بارے میں بہت زیادہ معلومات بہم پہنچاتے ہیں - یورپ کے ان تاریخ نویسوں میں جو نادرشاہ کے زمانے میں تھے' اور جو اس جنگ کی رفتار قریب سے دیکھ رہے تھے - اس کمپنی کا وہ نمایندہ یا سفیر بھی ہے' جو اس وقت خلیج فارس میں رہا کرتا تھا - اس نامہ نگار نے جہاں تک اور جو کچھ اطلاعیں بہم پہنچائیں اور وہ لکھی ہوئی باقی رہ گئی ہیں - ہنوز کسی نے اُن سے فائدہ نہیں اٹھایا - نادرشاہ کے تاریخ نگار اور وہ اہلِ قلم جنہوں نے "عمان پر نادرشاہ کی فوج کشی" پر کچھ لکھا ہے' ان میں سے کوئی ایک بھی نہ اس ماخذ سے کچھ لیتا ہے اور نہ اس کا حوالہ دیتا ہے - "ج اوتر" جو اس زمانے میں بصرے میں مقیم تھا - اپنی کتاب "ایران و ترکی میں سیاحت" کے اندر مذکورہ واقعہ کی جانب اشارہ کرتا ہے' مگر جو اطلاعات پیش کرتا ہے - نہ تو وہ کامل ہیں اور نہ بھروسے کے قابل - البتہ جو معلومات کارسٹن نیبور' اپنی کتاب "عمان کی تاریخ اور جغرافیے سے متعلق" میں جو کچھ پیش کرتا ہے' وہ معتبر اور زیادہ گہری ہیں' مگر یہ مصنّف نادرشاہ کا ہم عصر نہ تھا -

ایک کتاب (۱۰۵۶ء تا ۱۲۳۷ء میں مشرقی افریقہ کی تاریخ و جغرافیہ اور تجارت سے متعلق اسناد اور معلومات) نامی نظر سے گزری ہے یہ شارل گیبیان کی لکھی ہوئی ہے - اس کتاب کی ایک فصل ہے "(مشرقی افریقہ کے ساتھ عمان کے روابط) اس میں اس موضوع سے متعلق بہت سی مفید معلومات درج ہیں - اور یہ سب معلومات عربی کی ایک قلمی کتاب سے لی گئی ہیں - جو ایک شیخ کی تصنیف ہے - اس شیخ کا نام ابو سلیمان بن محمد بن امیر بن رشید ہے - یہ نادر کتاب (حکومت بمبئی کے منتخبات) کے

چوبیسویں نمبر میں شائع ہوئی ہے ۔ اس نمبر میں کئی مقالے ہیں ان میں ایک مقالے کا عنوان ہے ۔

(۱) "حکومت عمّان کے مختصر تاریخی حالات سے متعلق مختصر یادداشتوں کے اقتباس"

مقالہ نگار کا نام رابرٹ ٹائلر ہے ۔ دوسرے مقالے کا عنوان ہے

(۲) "حکومت عمّان سے متعلق مختصر یادداشتیں"

اس کا لکھنے والا فرانسس وارڈن ہے ۔ مگر ان دونوں میں سے ایک شخص بھی (عمّان پر نادر شاہ کی لشکر کشی) کے بارے میں کچھ نہیں لکھتا تاہم ٹائلر کی جغرافیائی اطلاعات میں بعض مفید معلومات ملتی ہیں ۔

(۳)۔ اس موضوع پر انگریزی زبان میں سب سے اہم اور بڑی کتاب جو موجود ہے ۔ اس کتاب کا نام ہے "عمّان کے اماموں اور سادات کی تاریخ" یہ پوری کی پوری کتاب "عربی کی ایک کتاب کا انگریزی ترجمہ ہے ۔ جو "ج ' پ باجلر" نے کیا تھا اور ۱۸۷۱ء میں جمعیّت یا کلہوٹ نے چھپوا کر شائع کیا ہے ۔ اس عربی کتاب کا مصنّف سلیل بن رازق ہے ' اس نے نہایت پھیلاؤ اور تفصیل کے ساتھ (عمّان پر ایرانی فوجوں کے حملے) کا حال تحریر کیا ہے ۔ لیکن اس کے بیان کئے ہوئے معلومات کو بڑی احتیاط اور سوچ بچار کے بعد لینا چاہیے ۔ اس لئے کہ یہ شخص عادتاً فضول گو تھا ۔ اس نے ہر موقع اور ہر مقام پر فضول بکواس کا رستہ اختیار کیا ہے ۔ اس وجہ سے یہ شخص جو واقعات اور حالات بیان کرتا ہے ' وہ بھروسے اور سچ ماننے کے لائق نہیں ہیں ۔

جن ارباب قلم نے سب سے اخیر میں اس موضوع پر قلم اٹھایا اور کوئی کتاب تالیف کی ہے ' ان میں ذیل کے اشخاص ذکر کے قابل ہیں ۔

(۴)۔ ۱ ۔ میجر (یا لفٹنٹ کرنل) آف راس ۔ اس نے ۱۸۸۲ء تا ۱۸۸۳ء کی اپنی رپورٹ کے دوران میں (خلیج فارس میں اسکان کی تشکیل اور مسقط کی سیاسی حیثیت ۱۸۲۸ء سے لے کر ۱۸۸۲ء تک کا تاریخچہ) تحریر کیا ہے اس میں عمّان کے حالات بھی بیان کرتا ہے ' لیکن اس کا ماخذ بھی وہی سلیل بن عبدالرزاق کی کتاب ہے ' جس کا اوپر ذکر گزر چکا ہے ۔

(۵)۔ کرنل س ' ب ' مائلز ۔ اس کی کتاب کا نام ہے (ممالک و طوائف خلیج فارس) یہ ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئی ہے ۔ اس مصنّف نے بھی عمّان پر ایران کی لشکر کشی کے بارے میں وہی باتیں لکھی ہیں ۔ جو راڈجر نے سلیل بن عبدالرزاق سے لی ہیں ۔ گویا راڈجر کا بیان ہی پورا پورا دہرا دیا ہے ۔

(۶) ۔ کلمان ہوور نے بھی اپنی کتاب میں جس کا نام ہے "تاریخچہ اعراب" عمّان پر ایرانی لشکر کشی کے بارے میں مختصر معلومات پیش کی ہیں ' مگر یہ بھی تمام تر سلیل بن رازق کے بیانات کی نقل ہیں ' اس کے سوا کچھ نہیں ۔

(۷) ۔ گرا ہمان نے مسقط کے عنوان سے اسلامی دائرۃ المعارف (اسلامک انسائیکلوپیڈیا) کی تیسری جلد میں ایک مقالہ دیا ہے اس مقالے میں بھی اس واقعے سے متعلق مختصر اشارے دئے ہیں ' مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام تحریروں میں تنہا سلیل بن رازق پر اعتماد اور اسی پر استفادہ کیا ہے ' اس وجہ سے اس مقالے پر بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے ۔

۸ ۔ رہیسیڈ روڈٹ ۔ اس کی تحقیقات کا بڑا حصہ ابوسعید سے تعلق رکھتا ہے ' مگر اس سے پہلے زمانے کے واقعات کی نسبت بھی اہم اطلاعیں پیش کرتا ہے ۔ وہ احمد بن سعید کی پیشقدمی اور اقتدار حاصل کرنے کے لئے اس نے جو کوششیں کیں ۔ ان کی کامیابی کے اسباب پورے پھیلاؤ کے ساتھ بیان کرتا ہے ۔ اس مصنّف نے جن جن کتابی ماخذوں اور سرچشموں تک رسائی پائی ہے ' ان کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے ۔ مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کی تحریروں کا نہ وہ کہیں حوالہ دیتا اور نہ کوئی ذکر کرتا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے متعلق کچھ علم اور اطلاع ہی نہیں رکھتا ہے ۔

راقم یہ چاہتا ہے کہ اس مقالے کی تحریر میں "شرکت ہندوستان مشرقی" کے نمائندوں کی تحریروں اور سلیل بن رازق ' اور نیبور گیہاں سب کے بیانوں کو سامنے رکھ کر اور ان سب کو ناپ تول کر جانچ پڑتال کر کے نادر شاہ کی عمّان پر بحری فوج کشی کی نپی تلی حقیقت کا پتہ چلائے اور ان کو پیش کرے ۔

شاہ سلطان حسین کے زمانے میں جو بذات خود بہت شریف اور اچھا مگر اپنے سیاسی حالات کے لحاظ سے کمزور تھا ' خلیج فارس میں حکومت ایران کی سیادت (سرداری) اور سیاسی اقتدار پر ایک کاری ضرب پڑی ۔ وہ قبائلی عرب جو اس خلیج کے دونوں ساحلی حصّوں میں رہتے تھے ۔ ان سے یہ سلطان بھی مل گیا ' اور ان کی اہمیت کچھ اور بڑھ گئی ۔

مسقط کے عرب امام سلطان بن سیف کے زیر احکام تھے یہ امام ۱۷۱۱ء سے ۱۷۱۸ء تک حکومت کرتا رہا ۔ یہ عرب زبردست اور

قابلِ توجہ جنگی جہازوں کے مالک تھے - اور ان جہازوں کے ذریعے ۱۷۱۷ء میں ان عربوں نے بحرین کو اپنے فوجی حملوں اور تجارتی دوڑ دھوپ کا مرکز بنایا۔ جزائرِ بحرین تقریباً سو سال کی طویل مدت تک ایران کی شاہنشاہی کا ایک حصہ اور اس کی ایک نوآبادی تھے - بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ عمّان کے عرب زیادہ مدت تک بحرین میں نہ رہے - ان کی واپسی کے بعد بحرین کا علاقہ شیخ جبارہ کے ہاتھ آ گیا - یہ شیخ عربوں کے قبیلہ ہوالا کا ایک مقتدر رئیس اور برائے نام حکومتِ ایران کا تابع تھا - مگر حقیقت میں مستقل تھا - اسے حکومتِ اصفہان کے ساتھ ذرا بھی لگاؤ نہ تھا -

جیسے ہی نادر شاہ نے حکومتِ ایران کی باگ اپنے ہاتھ میں لی - اس نے بھانپ لیا خلیج فارس کے حالات وہاں کے باشندوں کے اطوار اور امورِ سلطنت کے ذمہ دار برداشت اور درگزر کے قابل نہیں - اس نے ساحل پر رہنے والے عربوں کو اپنا تابعِ فرمان بنانے کے لئے بہت زیادہ مؤثر تدبیریں اختیار کیں ضروری کارروائیاں عمل میں لایا - مگر بہت جلد اس نے اندازہ کر لیا کہ جب تک بحری طاقت کا مالک نہ ہوگا اپنی پیشِ نظر تجویزوں کو چلانے اور آگے بڑھانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا - اسی لئے وہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور ہالینڈ سے چند جہاز خریدنے پر آمادہ ہو گیا۔

نادر شاہ کا سب سے پہلا حملہ ماہ مئی ۱۷۳۵ء میں بحری جہازات کے ذریعے بصرے پر قبضہ کرنے کے لئے ہوا مگر ناکام رہا - دوسرے سال ایران کا لطیف خاں دریا بیگی (امیر البحر) بحرین کو ہوالا عربوں کے قبضے سے نکال لینے میں کامیاب ہو گیا - یہ حملہ اس موقع کے لگ بھگ ہوا جبکہ شیخ جبارہ مکہ معظمہ کی زیارت کے لئے گیا ہوا تھا -

نادر ہوالا عربوں پر غالب آنے کے بعد لطیف خاں دریا بیگی کے متواتر تجاویز کے نتیجے میں اور مزید فتوحات کی امید میں رہا - یعنی اس نے عمّان کو بھی تسخیر کر لینا چاہا - یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ نادر شاہ پورے طور پر سمجھ چکا تھا کہ جب تک مسقط اور عربستان کے تمام بندر اس کے ہاتھ میں نہ آجائیں وہ یہ امید نہیں رکھ سکتا تھا کہ خلیج فارس میں ایرانی سیاست کو مستقل اقتدار اور استقرار حاصل ہو سکے گا -

خوش نصیبی اور حُسنِ اتفاق کہ ۱۷۳۶ء میں اچانک کچھ معاملات نادر کی خواہش کے موافق سرزمینِ عمّان پر ظہور میں آئے - سیف بن سلطان کے نامعقول سلوک نے اس کی پیروی کرنے والوں کے درمیان تنفر پیدا کر دیا آخرکار ۱۷۳۶ء میں یہ باہمی نفرت ایک انقلاب پر ختم ہوئی - سیف کمرانی لشکر کو جو آمادۂ انقلاب تھا روکنے کی تیاری میں تھا وہ اس کا سر کچل دینا چاہتا تھا - مگر اُن کے اقدام کو ذرا بھی نہ روک سکا - سیف اس ہنگامے میں مغلوب اور اقتدار سے محروم ہو گیا - اب اس نے نادر شاہ کی جانب رُخ کیا اور اس سے مدد چاہی -

اِدھر نادر شاہ افغانستان کے قبائل کیک زئی پر حملے کی ابتدائی منزلیں طے کر چکا تھا - تمام ضروری جنگ کا سامان تیار تھا، فوجیں روانگی کے لئے آمادہ اور شاہی حکم کے انتظار ہی میں تھیں - اس نے سیف کا یہ پیام پاکر اس نادر موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا - بلکہ نہایت عجلت کے ساتھ اس سے پورا فائدہ اٹھایا - محمد تقی خاں شیرازی، بیگلر بیگی کے نام تاکیدی احکام صادر فرمائے کہ خلیج کے تمام جہازوں کو ضروری سامان سے تیار کر کے بظاہر امیر سیف کی امداد کے لئے اور در اصل عمّان پر قبضہ کرنے کے لئے جلد روانہ ہو -

جنوری ۱۷۳۷ء میں شرکتِ ہند مشرقی کے نمایندے کو جو کامران میں رہتا تھا، خبر پہنچی کہ نادر شاہ عمّان پر لشکر بھیجنا چاہتا ہے - نمایندہ مذکور نے لندن کے مرکزی ادارے کو ان حالات کی اطلاع دے کر یہ بھی لکھا کہ "ممکن ہے نادر شاہ کا مقصد امام سیف کو بے وقوف بنانا اور اس کی سلطنت پر قبضہ کرنا نہ ہو" - مگر کمپنی کے نمایندے نے جس انداز سے اظہارِ خیال کیا تھا، اس سے یہ اندیشہ ضرور پیدا ہوتا تھا کہ ایسا نہ ہو نادر شاہ کا یہ اقدام کامیابی پر ہو اور صرف امام کے دشمنوں سے اس کا انتقام لینا ہی نہ ہو -

دولتِ ایران کے جہاز مارچ ۱۷۳۷ء کی تیسری تاریخ سے لے کر چودھویں تک بوشہر سے کامران پہنچ گئے -

ان جہازوں کی کمان لطیف خاں کے ذمے تھی جو اپنا علم بلند کئے ہوئے تھا - علم کی زمین سفید تھی اور اس پر ایرانیوں کی سرخ رنگ کی تلوار کڑھی ہوئی تھی - دولتِ ایران کے اس بیڑے میں چار بڑے جہاز تھے - دو چھوٹے جہاز اور دو چھوٹی کشتیاں - کپتان لطیف خاں کے جہاز کا نام فتح شاہ تھا - یہ جہاز اس سے ایک سال پہلے دسمبر کے مہینے میں ایرانی حکومت نے شرکتِ ہند شرقی

سے خرید اتھا۔ پہلے اس کا نام "کوئن" تھا۔

ایران کے دوسرے بڑے جنگی جہاز کا نام "فورتا ہیرلانڈ نیز" تھا۔ یہ انگلستان کا بنا ہوا تھا۔ دولتِ ایران نے یہ جہاز اس جنگ سے پہلے جبراً اپنی قاہرانہ قوت کے بل پر کمپنی سے خرید لیا تھا۔ اس جہاز کے کپتان کا نام کوک تھا۔ یہ اور اس کا ایک اور ہم کار کافی سامانِ جنگ کے ساتھ ان دونوں انگریزی جہازوں پر مامور تھے۔ ان پر حکومتِ ایران کا قبضہ ہو جانے کے بعد کوک اور اس کا ساتھی دونوں دولتِ ایران کے ملازم ہو گئے۔ یہ دونوں اب الگ الگ ایک ایک ایرانی جہاز کے کپتان اور سردار مقرر ہوئے۔ ان جہازوں کے اور سارے ملاح اور کام کرنے والے قبیلہ ہوالا اور دوسرے ساحلی قبائل کے عرب تھے۔

ایرانی بیڑے نے پانچ ہزار جانباز سپاہی اور پندرہ سو گھوڑے سوار کئے اور ۱۲ اپریل کو کامران سے لنگر اٹھایا۔ چار روز بعد یہ سپاہ خورفکان میں لنگر انداز ہوا۔ یہ مقام راس موزاندم کے جنوب میں چھ ہزار میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ لطیف خاں نے تھوڑی سی ایرانی فوج خورفکان میں اتار کر شمال کی جانب کوچ کیا۔ راس موزاندم سے آگے بڑھ کر خلیج جلفار میں اتر پڑا۔ یہاں لطیف خاں اور امام سیف بن سلطان دونوں کی ملاقات ہوئی۔ یہ مشہور ہے کہ دو ہزار روپیہ (تقریباً ۲۰۰ ۴ پونڈ) امام سیف نے سردار ایرانی کو پیش کئے۔

قبیلہ ہوالا کا رئیس شیخ رما اپنی اطاعت کا اعلان پہلے ہی کر چکا تھا۔ لطیف خاں نے چند آدمی فوجی محافظ کے نام سے جلفار میں مقرر کئے اس کے بعد وہ اپنی سپاہ کو لے کر سیف اور اس کے ماننے والوں کے ساتھ ملک کے اندرونی حصے میں بڑھا۔ وہ اب بوالعرب بن مبارالعرب کی جانب جا رہا تھا۔ یہ شخص اگرچہ امام سیف کا رشتہ دار تھا۔ مگر یہی امام کے مخالفوں کا سردار بھی تھا۔ بوالعرب بھی مقام یزداری سے پوری تیاری کے ساتھ شمال کی جانب روانہ ہوا۔ مقام قلیح السمینی میں جو مقام بیرامی کے قریب واقع ہے دونوں فوجوں میں مقابلہ ہوا۔ متحدہ فوجوں کو کامل جیت ہوئی اور بوالعرب نے شکست کھائی۔ اب متحدہ لشکر اور مقامات الجوف وغیرہ کو اپنے قبضے اور تصرف میں لے آیا۔ لیکن یہ کامیابی اور پیش قدمی زیادہ دیرپا اور استوار نہ ثابت ہوئی۔ کیونکہ امام سیف اور لطیف خاں میں جھگڑا ہو گیا۔ لطیف خاں کا رویہ اور سلوک امام سیف کے ساتھ ایسا تھا جیسے ایک بڑے فاتح کا جو تمام ملک اور مملکت کو جیت کر اپنے قبضے میں لا چکا ہو۔ وہ سیف کا احترام اور لحاظ ذرا بھی ملحوظ نہ رکھتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانیوں اور امام سیف کے اتحاد اور دوستی کی بنیاد پاش پاش ہو گئی۔ اور ماہ جون میں لطیف خاں کو کامران واپس آنا پڑا۔ وہاں والے اس کی فاتحانہ آمد پر بہت مسرور ہوئے۔ اس کے اعزاز میں تمام شہر میں چراغاں کیا گیا اور خوب جشن منائے گئے۔

تقی خاں بیگلر بیگی پہلے ہی کامران پہنچ چکا تھا۔ اس نے پوری کمان لطیف خاں سے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ لیکن اس کی بخیلی اور بے جا کفایت شعاری نے کام کرنے والوں میں بہت زیادہ نفرت اور بد دلی پیدا کر دی۔ بحری فوجیں باقاعدہ تنخواہیں نہیں پا رہی تھیں۔ سخت تکلیف اور تنگی میں گرفتار تھیں ایرانی سپاہ نے لطیف خاں دریا بیگی کے حضور میں سخت اعتراض اور شکایت کی۔ اس نے وعدہ کیا کہ بیگلر بیگی کے واپس جاتے ہی وہ تمام خسارے کو پورا اور نقصان کی تلافی کر دے گا۔

اس سال کے موسم گرما اور موسم خزاں میں جنگی کارروائیاں موقوف رہیں۔ کوئی پیش قدمی عمل میں نہ آئی۔ ماہ نومبر میں ایران کے بحریہ نے اپنی کمی اور خرابیوں کو دور کیا اور اپنے کو پوری طور پر طیار کر لیا۔ ظاہری حالات سے ایسا پایا جاتا ہے کہ تقریباً اسی زمانے میں نادرشاہ نے بیگلر بیگی کے نام تاکیدی فرمان صادر کیا کہ عمان میں لشکر کشی کو فوراً طیار کرے۔ اور اس کو سخت تنبیہ کی۔ کہ اپریل ہی میں جنگی کارروائیوں کا سلسلہ کیوں جاری نہ رکھا۔

یہ تھا پہلا حملہ نادرشاہ کا جو اس جزیرہ نما پر ہوا۔

کمیونٹی پراجیکٹ

اِن دنوں ہرطرف کمیونٹی پراجیکٹ کا ذکر سننے میں آرہا ہے۔ آیئے ذرا دیکھیں کہ یہ پراجیکٹ کیا ہے اور ملک کی اقتصادی اور سماجی ترقی میں اسے کہاں تک دخل حاصل ہے۔

سرکار کے پنج سالہ پلان کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں حرکت پیدا ہو۔ پانی اور بجلی کی بہم رسانی کے لئے کثیر المقاصد اسکیمیں عمل میں لائی جائیں دریاؤں کی طغیانیوں پر قابو پا لیا جائے۔ کارخانے اوزار بنائیں، پیداوار کے ذرائع میں اضافہ کریں اور لوگوں کے استعمال کی چیزیں روز افزوں تعداد میں مہیا کریں۔ نقل وحمل کے ذرائع ایسے ہوں کہ وہ چیزوں کو بآسانی ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا سکیں۔ مختلف طبقوں میں تبدیلیٔ خیالات ہو سکے اور کمیونٹی پراجیکٹ زیرِ عمل آسکے۔ یہ عوام کا ایک پراجیکٹ ہے جو عوام ہی کی خاطر عوام نے بنایا ہے آخر یہ کمیونٹی پراجیکٹ کیا ہے اور اس کے مقاصد کیا ہیں؟

ہندوستان کی تازہ مردم شماری کے مطابق دیہات کی آبادی مجموعی آبادی کا ۸۲٫۵ فیصدی ہے۔ ب[illegible] شہری آبادی ہے۔ جمہوریت کی بنیاد اکثریت پر ہوتی ہے۔ ہندوستان ایک جمہوری ریپبلک بننے کا عہد کر چکا ہے اس لئے یہاں تعداد ایک وزن رکھتی ہے۔ اس اصول کے مطابق دیہاتی آبادی اس بات کی مستحق ہے کہ حکومت اس کی طرف خاص توجہ کرے اور اس کے ساتھ ترجیحی سلوک کرے۔

تقریباً گزشتہ دو سو برس سے ہمارے یہاں دیہات سے شہروں کی جانب آدمی اور سامان کی یکطرفہ درآمد رہی ہے۔ ان شہروں میں سے جنہیں غیر ملکی حاکموں نے بسایا اور جن میں عدالتوں، مجسٹریٹوں، وکیلوں، مہاجنوں، پولیس اور اس سے ملتے جلتے متعدد دوسرے کام کاج کے لوگوں کا اثر غالب رہا، دیہات کی طرف عملی طور پر کچھ نہیں کیا۔ ان شہروں نے عوام کی بہتری کے کام میں کوئی حصہ نہیں لیا بلکہ اس کے برعکس یہ دیہاتی طبقوں کی بدولت پرورش پاتے رہے۔ کمیونٹی پراجیکٹ کو اگر واقعی سماج کے لئے پراجیکٹ بننا ہے تو اس کا حلقۂ اثر زیادہ تر دیہات میں رہنے والے لوگوں تک محدود رکھنا پڑے گا۔

اس وقت ملک میں بھوک، بیماری اور جہالت کا دَور دورہ ہے۔ چونکہ دیہات والوں میں قوتِ خرید کم ہے اس لئے یہ تباہی زیادہ تر انھیں کے حصے میں آرہی ہے۔ اگر کمیونٹی پراجیکٹ کی بنیاد آزادی پر رکھنا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ تو ان بنیادی لعنتوں کو بالکل ختم کرنا ہوگا۔ دیہاتیوں پر بالعموم یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ بے وقوف، جھگڑالو اور رجعت پسندی کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ ایک بھوکے آدمی کے لئے جس کے پاس کوئی کام نہ ہو، وقت کاٹنا بھی مصیبت ہے محض خود حفاظتی کے لئے وہ اپنے اندر ایک مصنوعی دنیا تعمیر کرتا ہے۔ اور باہر کی دُنیا کے دروازے اپنے اوپر بند کر لیتا ہے۔

اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ایک دیہاتی کے دل میں سماج کا صحیح احساس پیدا کریں تو یہ ضروری ہے کہ اس کی صحت اچھی ہو، اسے کافی خوراک ملے۔ کافی کپڑے ملیں اور رہنے کو موزوں مکان ملے۔ اس کے علاوہ اسے تفریحی لمحات میسّر آنے چاہئیں تاکہ وہ دن بھر کے کام اور سماج کی زندگی کے لئے اپنے آپ کو تازہ دم کر سکے۔ یہ سب کچھ ممکن ہے بشرطیکہ دیہاتی اتنا زیادہ پیدا کر سکے کہ اچھی طرح سے اپنا پیٹ بھرنے کے بعد اس کے پاس کچھ بچ بھی جائے۔ تاکہ وہ اس سے وہ سہولیات حاصل کر سکے جو اس کی باقی ضروریات کے لئے لازمی ہیں۔

جس کمیونٹی پراجیکٹ کا تصوّر حکومت ہند نے پیش کیا ہے۔ اس کی تشکیل میں پہلی شرطیہ قرار دی گئی ہے کہ پیداوار میں اضافہ کیا جائے تاکہ دیہاتی زندگی کی بنیادی ضروریات پوری کی جا سکیں۔ یہاں حکومت ہند کے اس مسودے کا ایک حصہ پیش کرنا جو اس نے کمیونٹی پراجیکٹ کے متعلق طیار

کیا ہے بے محل نہ ہوگا۔ اور وہ یہ ہے:۔

"کمیونٹی پراجیکٹ کا مقصد یہ ہے کہ وہ اس انتظام میں جو زندہ رہنے کے حق کے تحت پراجیکٹ کے رقبے میں رہنے والے مردوں، بچوں اور عورتوں کے لئے ہے ایک رہنمایانہ حیثیت اختیار کرے۔ پروگرام کے ابتدائی مرحلوں میں خوراک ایک ایسا جزو ہے جسے اس مقصد کے حصول کے لئے اولین اہمیت دی جائے۔"

وہ سرگرمیاں جو اس مقصد کو حل کریں گی اور جنہیں سب پہ ترجیح دی جائے گی یہ ہیں:۔

الف۔ زراعت اور اس سے ملحقہ کام:۔

۱۔ غیر استعمال شدہ اور بنجر زمین کی بازیابی

۲۔ زراعت کے لئے نہروں، ٹیوب ویلوں، کنوؤں، تالابوں دریاؤں، جھیلوں اور چشموں سے پانی بہم پہنچانا۔

۳۔ اچھے بیجوں کی فراہمی

۴۔ ترقی یافتہ زرعی تکنیک کا استعمال

۵۔ مویشیوں کے علاج کی امداد کی موجودگی

۶۔ ترقی یافتہ اوزاروں اور زرعی طریقوں کی فراہمی

۷۔ مال کی کھپت اور قرض کی آسانیوں کی فراہمی

۸۔ مویشی خانوں کے لئے نسلی مرکزوں کی فراہمی

۹۔ ملک میں مچھلی کے کاروبار کی ترقی

۱۰۔ خوراک کی از سرِ نو تنظیم

۱۱۔ پھلوں اور سبزیوں کی کاشت میں ترقی

۱۲۔ زمینی تحقیق اور کھاد کی فراہمی

۱۳۔ علم الاشجار کی فراہمی (جس میں جنگل لگانے کا کام بھی شامل ہے۔

۱۴۔ نتائج کے تخمینے کی فراہمی

ب۔ رسل و رسائل

۱۔ سڑکوں کی تعمیر

۲۔ سڑکوں پر مشینی رسل و رسائل کی حوصلہ افزائی

۳۔ مویشیوں کی نقل و حمل میں ترقی

ج۔ تعلیم

۱۔ ابتدائی جماعتوں میں جبری اور مفت تعلیم

۲۔ ہائی اور مڈل اسکولوں کا قیام

۳۔ سماجی تعلیم اور لائبریریوں کا قیام

د۔ صحت

۱۔ صفائی اور صحت عامہ کے اقدامات

۲۔ مریضوں کے لئے طبی امداد کی فراہمی

۳۔ حاملہ عورتوں کی، بچوں کی پیدائش سے پہلے اور بعد کی احتیاط

۴۔ نرسوں کی خدمات کی فراہمی

ہ۔ تربیت

۱۔ موجودہ کاریگروں کے معیار میں ترقی کے لئے رِفریشر کورس۔

۲۔ مزارعوں کی تربیت

۳۔ کام پھیلانے کے لئے معاونوں کی تربیت

۴۔ سپروائزروں کی تربیت

۵۔ کاریگروں کی تربیت

۶۔ انتظامیہ اسٹاف کی تربیت

۷۔ صحت کے کارکنوں کی تربیت

۸۔ پروجیکٹوں کے ایگزیکٹیو افسروں کی تربیت

و۔ روزگار

۱۔ بڑے اور چھوٹے پیشوں کے طور پر گھریلو صنعتوں اور دستکاریوں کی حوصلہ افزائی

۲۔ فالتو آدمیوں کو کام پر لگانے کے لئے متوسط یا چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی حوصلہ افزائی، تاکہ مقامی ضروریات پوری ہو سکیں یا پروجیکٹ کے علاقے سے باہر سامان بھیجا جا سکے۔

۳۔ طے شدہ تقسیم، تجارت، امدادی اور عوامی بہبود کی سروسز کے ذریعے سے روزگار بہم پہنچانے کے کام کی حوصلہ افزائی

ص ۔ مکانات کی فراہمی

۱۔ دیہات میں مکانات کی فراہمی کے لئے ترقی یافتہ تکنیک اور نقشوں کا استعمال ۔

۲۔ شہری علاقوں میں مکانات کی فراہمی

ح ۔ سماجی بہبود

۱۔ مقامی جوہر اور تمدن پر مبنی سماجی تفریح کا انتظام

۲۔ تعلیم و تفریح کے لئے دید و شنید کی مدد کا انتظام

۳۔ مقامی اور کھیلوں کی دوسری سرگرمیوں کی تنظیم

۴۔ میلوں کا انتظام

۵۔ کوآپریٹو اور خود امدادی تحریکوں کی تنظیم

منتہائے مقصود

عوامی بہبود کا ملک تضاد ہے اس ملک کا، جہاں استبداد کی حکومت ہو۔ اس ملک میں فقط پالیسیوں کو مرکز سے وابستہ کیا جاتا ہے ۔ جہاں تک انھیں عملی جامہ پہنانے کا تعلق ہے ۔ ان میں لامرکزیت اپنی انتہا کو پہنچائی جاتی ہے ۔ حتیٰ کہ آخرکار ایک فرد بھی یہ ذمہ داری نبھانے میں پوری طرح شریک ہوتا ہے ۔ ایک ایسے ملک میں فرد کو مکمل آزادی ہے کہ وہ جس طرح چاہے زندگی بسر کرے ۔ ہاں جب ایک فرد کی آزادی دوسرے فرد کی آزادی سے ٹکرائے گی یا اس کا قومی مفادات سے تصادم ہوگا تو حکومت اس وقت مداخلت کرے گی تاکہ یہ طے کر سکے کہ مجموعی انداز سے زندگی کی صورت کیا ہوگی ۔ اس کے بعد اس اسے سانچے میں ڈھالنے کا کام لوگوں کے ہی سپرد کر دیا جائے گا ۔ جہاں سماج کی طرف سے درمیانی کریڈٹ مہارت یافتہ تکنیک اور رہنمائی میسر نہ آسکے گی وہاں یہ حکومت کی طرف سے بہم پہنچائے گی ۔ منظم مجرموں کے ساتھ موزوں سلوک کرنے کا کام بھی حکومت کے ذمے ہوگا ۔ عوامی بہبود کا ملک اگر اس بلند سطح پر آسکے تو حکومت کنٹرول کرنے اور ایگزیکٹو نوعیت کے بہت کم کام اپنے ذمے لے گی ۔

اگر پراجیکٹ کو کامیابی حاصل ہو تو پھر عمل ہی کو اہمیت حاصل ہوگی ۔ باتیں بے سود ہو کر رہ جائیں گی ۔ آتش بیاں سیاست دانوں کو جو محض زبانی بیانوں کے سہارے ہی میدان مار لیا کرتے ہیں کسی اور دنیا کا رُخ کرنا پڑے گا ۔ اور یا اگر وہ یہاں رہیں گے تو انھیں اپنے آپ کو عمل کے سانچے میں ڈھالنا ہوگا ۔ آج پاور پالیٹکس کے کھیل میں جس عام شخص کو استعمال کیا جا رہا ہے اس کے نقطۂ نگاہ سے یہ کام ایک بہت بڑا کارنامہ ہوگا ۔

کمیونٹی پراجیکٹ کا مقصد یہ ہے کہ وہ اس کام کی تکمیل کے معاملے میں ایک پیش رو کا کام کرے ۔ تاکہ انسان کو خود مختاری حاصل ہو سکے اور سماج کا منظم رجحانِ طبع حکومت کی رگوں میں تازہ لہو دوڑا سکے ۔

ہندوستان اور امریکہ کا تکنیکی تعاون

کمیونٹی پراجیکٹ کی اسکیم کو تمام انسپریشن بڑودہ، مدراس، اٹاوہ گورکھپور کی اسکیموں اور نوآبادکاری کی شہری اور دیہاتی قسم کی مشترکہ ترقیوں کی آماجگاہوں مثلاً نیلوکھیڑی اور شہری ترقیوں مثلاً فریدآباد اور دوسرے ان سے ملتے جلتے کئی تجربوں سے حاصل ہوا ہے ۔

مندرجہ بالا اسکیموں میں سے کوئی بھی اپنی اپنی جگہ پوری طرح سے مکمل نہیں ہے ۔ کمیونٹی پراجیکٹ بھارت اور دوسرے ملکوں میں کئے ہوئے وسیع تجربات کے امتزاج کی ایک کوشش ہے ۔

ملک کے موجودہ اقتصادی مرحلے پر کمیونٹی پراجیکٹ اسکیم کی عملی صورت انڈو ۔ یو ۔ ایس ٹیکنیکل پراجیکٹ کوآپریشن معاہدے کی بدولت ممکن ہوگئی ہے ۔ اس معاہدے کے تحت ہندوستان کی تمام ریاستوں میں پچپن پراجیکٹ شروع کرائے گئے ہیں ۔ اس اسکیم میں سولہ ہزار پانچ سو گاؤں جن کی آبادی تقریباً ایک کروڑ بیس لاکھ ہے، شامل ہیں ۔ اس ضمن میں خصوصاً زرعی میدان میں امریکہ کے تجربات بہت وسیع ہیں ۔ امریکی حکومت ہمیں مدد دینے پر آمادہ ہے ۔ اس نے ہمارے ذرائع میں جن کی بدولت ہم نے متعدد پراجیکٹ شروع کر دئے ہیں وسعت دینے کے لئے ہمیں مالی، مادی اور تکنیکی امداد کی پیشکش کی ہے ۔

ہمیں موجودہ پراجیکٹوں کو تین برس کی مدت میں مکمل کرنا ہے ۔ لوگوں کی آمدنی میں جو یقینی طور پر اضافہ ہوگا ۔ اس سے ریاستوں کے ذرائع بڑھیں گے جس کے نتیجے کے طور پر پراجیکٹس والے علاقوں میں مزید آسانیاں پھیلا دی جائیں گی ۔

عوام کے خادم

بھارت کے عوام نے یہ عزم کیا ہے کہ ہم اپنے دیش کو اپنے اور اپنے بچوں کے لئے ایک عوامی بہبود کا دیش بنائیں گے ۔ ایسے دیش میں ہم یہی توقع کرتے ہیں کہ یہاں کی حکومت عوام کی حکومت ہوگی ۔ اور یہاں عوام کی ایسی ہی حکومت ہے جو عوام نے خود اپنے لئے چُنی ۔ حکومت کے ملازم موجود ہیں جنہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ عوام کی خدمت کریں ۔ انھیں اب خادم ہی بننا ہے ۔ وہ اب کسی غیر ملکی حکومت کے افسر نہیں ہیں

جو غیر ملکی حکمرانوں کے کارندوں کے طور پر کام کرتے ہوں اور اپنے گنبدوں میں بیٹھ کر ہدایات جاری کرتے ہوں۔ اب انھیں میدان میں آ کر اور عوام کے ساتھ مل کر ان کے کاموں کو مکمل کرنا ہے۔ انھیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ تمام محکموں میں اس طرح کام کریں بالخصوص کمیونٹی پراجیکٹ کے نظام میں جہاں حکومت کے خادموں اور عوام کے سامنے اپنی نیک نیتی اور جذبۂ رفاقت کو امتحان میں ڈالنے کے لئے ایک نیا میدانِ عمل موجود ہے۔

اب گاؤں میں رہنے والے کسی شخص کو پولیس کے سپاہی یا مجسٹریٹ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اب اسے سرکاری فارموں سے بھی جو نمائشی مرکزوں کا کام دینے کے لئے بنائے گئے ہیں وحشت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ پولیس، مجسٹریٹ اور نظام کے سپرنٹنڈنٹ کو حکم دیا ہے کہ وہ سپروائزروں اور درمیانی سٹاف کی مدد حاصل کر کے دیہات میں جائیں اور لوگوں کے خادموں کی طرح سے کام کریں۔ اب یہ گاؤں کے لوگوں ہی کا کام ہے کہ وہ ان سرکاری ایجنسیوں کو جو انھیں کے خرچ پر انھیں کی خدمت کے لئے قائم کی گئی ہیں صحیح طور پر استعمال کریں۔

عوام سے سرکار کی توقعات

بھارت کے سے لمبے چوڑے دیش میں پچیس پراجیکٹوں کی حیثیت جو ساری آبادی کے بیسویں حصے پر اثر انداز ہو رہے ہیں بہت ہی کم ہے۔ اور اس کے باوجود اس اسکیم پر تقریباً چالیس کروڑ روپیہ خرچ آ رہا ہے۔ بنیادی سہولیات کے معیار کا سادگی کے باوجود تقاضا یہ ہے کہ اس کے لئے اسی کروڑ روپیہ اور خرچ کیا جائے امید نہیں کہ یہ روپیہ بھی کافی ثابت ہو۔ اگر اس اسکیم کو پھیلانے کے لئے اس میں بیس گنا اضافہ کیا جائے تو خرچ بھی بیس گنا بڑھ جائے گا۔ آخر یہ روپیہ کہاں سے آئے گا۔

ناسک سیکورٹی پریس سے تو چھپے ہوئے نوٹ آنے سے رہے۔ نہ ہی ہم امریکہ یا دنیا کے دوسرے ملکوں سے خواہ وہ کتنے ہی امیر اور فیاض کیوں نہ ہوں یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ مسلسل ہماری مدد کرتے چلے جائیں گے۔ اگر عوام کو اپنے ملک کی از سرِ نو تعمیر کرنا ہے اور اسکیم کا مطلب یہ ہے کہ سارے دیش میں پیداوار بڑھے اور یہ اسکیم محض ایک نمائشی چیز بن کے نہ رہ جائے تو لوگوں کو اپنے پیروں پر خود کھڑا کرنا ہوگا۔

بھارت کی زمین آج جو کچھ پیدا کرتی ہے وہ دوسرے ملکوں کی زمین کی پیداوار کا ایک تہائی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہماری زمین کم زرخیز ہے یا ہمارے عوام کم محنتی یا کم ذہین ہیں۔ اگر ہمیں بھارت کی از سرِ نو تعمیر کے لئے روپیہ فراہم کرنا ہے تو ہمیں اپنی زمین سے زیادہ اگانا چاہیئے۔ یہ اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ پراجیکٹ کے رقبوں میں کام کرنے والے کسان ان زرعی ذرائع کا پورا پورا فائدہ اٹھائیں جن کی تشکیل کمیونٹی پراجیکٹ میں کی گئی ہے۔

عوام اس حالت میں زیادہ محنت کر سکتے ہیں جبکہ ان کی صحت اچھی ہو۔ اچھی صحت کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ان تمام مدافعتی اقدامات کو زیرِ عمل لائیں جو پراجیکٹ کے علاقے میں صحت کی ایجنسیوں نے مقرر کئے ہیں۔

پیداوار کو صحیح طور پر بڑھانے والی چیز تو مسرت ہے۔ روح کی یہ بالیدگی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ عوام تعلیم بالغاں اور تفریح کے متعلق ان تمام اقدامات کو زیرِ عمل لائیں جن کی پراجیکٹ کے علاقوں میں منافع بخش پیمانے پر تشکیل کی گئی ہے۔ اور اس طرح سے اپنے معیار کو اونچا کریں۔

بھارت کا ایک مزارع سال میں تقریباً چھ مہینے بالکل فارغ رہتا ہے۔ جن کے پاس زمین نہیں ہے وہ سال میں تقریباً آٹھ مہینے بیکار رہتے ہیں۔ اگر اس فرصت کے وقت کا چوتھا حصہ بھی سڑکیں اور اسکول بنانے، گاؤں کی نالیوں کی حالت سدھارنے، پارک، کھیل کے میدان اور چراگاہیں بنانے، کھاد کے لئے گڑھے کھودنے اور زندگی کی دوسری ہزاروں ضروریات کی طرف توجہ کرنے میں صرف کیا جائے تو پراجیکٹ کے رقبے کے لئے سرکار کے محدود مالی ذرائع خود بخود کئی گنا بڑھ جائیں گے۔

یہاں اس پرانی کہانی کو نہ دہرایا جائے۔ مشہور کہانی یہ ہے کہ ایک دفعہ ایک بادشاہ نے اپنی رعایا کو حکم دیا کہ وہ گاؤں کے تالاب کو دودھ سے بھر دیں۔ ہر شخص کے لئے یہ حکم تھا کہ وہ صبح کے وقت دودھ کا ایک گلاس تالاب میں ڈال جائے۔ جب تالاب بھر گیا تو یہ دیکھا گیا کہ وہ تالاب سارا پانی سے بھرا ہوا ہے کیونکہ ہر شخص اس امید میں صرف پانی ہی کا ایک گلاس لے آیا تھا کہ باقی لوگ تو دودھ لائیں گے ہی۔

اب اس قسم کے پرانے بادشاہ نہیں رہے۔ آج عوام اپنے بادشاہ آپ ہیں۔ وہ اپنا ذخیرہ بھی خود ہی ہیں۔ اب تو عوام کو خود ہی دودھ پیدا کرنا ہے اور اپنے تالاب کو اس سے بھرنا ہے۔ سرکار تو محض وہ طریقہ کار عوام کے سپرد کر سکتی ہے۔ جس سے دودھ پیدا کیا جا سکتا ہے اور تالاب کھودا جا سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کی توقع نہیں کرنا چاہیئے اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے زیادہ توقع کی بھی

نہیں جا سکتی۔ اگرچہ ہمارے ذرائع حقیقتاً بے پایاں ہیں۔ لیکن ابھی تک انھیں ہاتھ نہیں لگایا گیا۔ لوگوں کو اپنی مدد خود کرنا ہوگی۔ سرکار تو صرف یہ کر سکتی ہے کہ وہ ایک کام کو شروع کر دے۔

گاؤں ــ قطعی مالک

بھارت کے لئے کمیونٹی پراجیکٹوں کا پروگرام ایک اقتصادی حیثیت بھی رکھتا ہے اور نئی جمہوریت کا اظہار بھی ہے۔

بھارت آج کل ہر سال اپنی ضروریات کے مطابق اناج خریدنے کے لئے غیر ملکی تبادلے میں تین سو کروڑ روپیہ دیتا ہے۔ اب جو پچپن کمیونٹی پراجیکٹ جاری کئے گئے ہیں اُن کے سات گنا اخراجات سے یہ روپیہ زیادہ ہے۔ گندم یا چاول کا ہر فالتو من جو کمیونٹی ڈیویلپمینٹ کے ذریعے سے پیدا ہوگا۔ اس بھاری دباؤ کو کم کرے گا۔ جو اس وقت دیش کے مالی ذرائع پر ہے۔

اس تین سو کروڑ روپے کی جو اناج خریدنے میں صرف ہوتا ہے، کلی یا اس کے کچھ حصے کی بچت کا مطلب یہ ہے کہ یہ روپیہ اس صنعت کی ترقی پر خرچ کیا جا سکتا ہے۔ جس کی آج دیش کو ضرورت ہے اور جو عوام کے استعمال کی زیادہ چیزیں پیدا کر سکتی ہے۔

یہی سبب ہے کہ پنج سالہ پلان میں زیادہ اناج اُگاؤ کو اتنی زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اناج بنیادی چیز ہے۔ بھارت جیسے ایک بڑے ملک میں اقتصادی استحکام کی بنیادیں مضبوط زرعی پیداوار پر ہونا چاہئیں۔ اتفاقیہ طور پر یہ بات تمام ملکوں میں صحیح ہے جن میں امریکہ بھی شامل ہے اور جس کی بلند پایہ ترقی یافتہ زراعت اس بات کی ضامن ہے کہ وہ اناج اور خام مال بھی پیدا کرے اور صنعتی اشیاء کے لئے منڈی بھی۔

کمیونٹی پراجیکٹ کا پروگرام محض اقتصادی ہونے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے۔ اس کی حدود بہت دُور دُور تک جاتی ہیں اور لاکھوں لوگوں کو سماجی مواقع بہم پہنچانا اس پروگرام میں شامل ہے۔

جوں جوں اسکیم ترقی کرتی جائے گی، دیہات کے لوگ یہ سمجھتے جائیں گے کہ جمہوری حکومت سے دوستانہ تعاون مراد ہے نہ کہ کسی قسم کا جبر، جیسا کہ ماضی میں ہوتا تھا۔ وہ دیکھیں گے کہ ڈاکٹر، مویشیوں کا معالج، سینیٹری انسپکٹر، زرعی سپرنٹنڈنٹ اور پولیس کا سپاہی محض ان کی مدد کرنے کے لئے ہیں۔ دیہاتی کو یہ معلوم ہوگا کہ اس کے مشوروں کو وزن دیا جاتا ہے۔ اور انجام کار اپنے مستقبل کو بنانے والا وہ خود ہی ہے۔

تو گویا قطعی تجزیہ یہ ہے کہ دیہاتی خود ہی سماجی ترقی کا ضامن ہے۔ اسے ایک بار اپنے مواقع کا علم ہونا چاہیئے۔ وہ اپنی زندگی کا قطعی ڈھانچہ خود بنائے گا۔ وہ اپنے مفاد کے لئے اپنا فالتو وقت، فالتو کمائی اور تمام دلچسپیاں وقف کر دے گا۔ یہ بات دنیا کے کئی ملکوں میں صحیح ثابت ہو چکی ہے اور ہندوستان کے ابتدائی پراجیکٹوں میں بھی اس کی صداقت کا ثبوت مل چکا ہے۔

وسیع توافق

- مضبوط لوگ بیٹھے اس کی تکمیل کر سکتے ہیں۔
- اس کی تکمیل کے لئے مضبوط لوگ بیٹھوں کی تربیت کی جا سکتی ہے۔
- ایسے حالات پیدا کئے جا سکتے ہیں جن سے اس کی تکمیل ہو سکے۔

یہ ہیں عقیدے کے تین اصول، جنہوں نے وہ عظیم کام کرنے پر اُبھارا جسے کمیونٹی پراجیکٹ کہتے ہیں۔ مختلف پہلوؤں اور رنگوں کے نظریات آسمان میں شگاف ڈال سکتے ہیں لیکن بھوک بیماری اور جہالت کا علاج منتروں، نالہ و فریاد اور الزامات تراشنے سے نہیں ہو سکتا۔ دنیا بہت اونچ نیچ اور خون خرابہ دیکھ چکی ہے۔ اور انسان آج پہلے کی نسبت کہیں زیادہ خوف زدہ ہو چکا ہے اس بنیادی خوف کو رفع کرنا ہی ہے۔ یہ خوف رفع ہو سکتا ہے۔ کیونکہ آج جب کہ سائنس تک ہمیں دسترس حاصل ہے تو ہم جو چاہیں، حاصل کر سکتے ہیں۔

بھارت کے جن ذرائع کو ابھی تک ہاتھ نہیں لگایا گیا ہے۔ وہ بے حد و بے شمار ہیں۔ یہ ذرائع زندگی کی حرکت میں آنے کے لئے بے تاب ہیں۔ لیکن الہ دین کا چراغ اس عقل و خرد کی دنیا میں جادو کے کارنامے نہیں دکھا سکتا صرف محنت شاقہ ہی یہ کارنامے دکھا سکتی ہے۔ اس ملک کے عظیم عوام کی نسلوں کی محنت ہی پر رام راج کی بنیاد قائم تھی۔

اگر ہمیں اپنی عظمت کو واپس لانا ہے تو کئی نسلوں کو سخت محنت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دینا چاہیئے۔ پردھان منتری نے آج سے چند سال پہلے جب یہ کہا تھا کہ "یہ نسل سخت محنت کے لئے وقف ہو چکی ہے۔" تو ان کا یہی مطلب تھا۔

بھارت مشکلات کے کئی زمانوں میں یہ چراغِ راہ دکھاتا رہا۔ اگر اسے

ایک منظم طریقے سے از سرِ نو تعمیر کرنا ہے تو اسے دوسرے کئی ملکوں کے لئے مثال قائم کرنا ہوگی اور ممکن ہے اسے وہ چابی مل جائے جس سے عالمی حکومت کے دروازے کا تالا کھل سکے۔ عالمی حکومت سے مراد وہ "نئی دنیا" ہے جسے ابھی معرضِ وجود میں آنا ہے۔ اگر گوتم بدھ اور شنکر آچاریہ، نانک اور کبیر اور اشوک اور اکبر کی سرزمین اس کے علاوہ کوئی اور راہ اختیار کرے گی تو وہ اپنے ساتھ بے وفائی کرے گی۔

کمیونٹی پراجکیٹ کا ماٹو ہے "انسان تک رسائی"۔ جس حد تک یہ پراجکیٹ اپنے اس منزل کے قریب آئے گی اس حد تک اسے کامیابی حاصل ہوگی۔ اور یہ اس حد تک ناکامیاب ہوگی جس حد تک یہ "آدمی" کو پیچھے چھوڑ دیگی اور اشیاء کو آگے لانے کی کوشش کرے گی۔

آدمی کی تخلیق مسرت اور محبت سے ہوتی ہے۔ وہ اپنے مضبوط رگ پٹھوں کی محنت سے اپنا قد بُت حاصل کرتا ہے اور معرفت کی بدولت اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے۔ اس معرفت میں جسمانی، ذہنی اور روحانی معرفت شامل ہے۔ ہر شخص کو سڑک کے یہ تمام مراحل طے کرنا پڑتے ہیں۔ اس کے لئے کوئی مختصر راستہ نہیں ہے۔ اس لمبی سڑک پر کمیونٹی پراجکیٹ کو پہلا قدم تصوّر کیا گیا ہے۔ اس سڑک کو عوام خود بنائیں گے، خود اس پر سفر کریں گے اور خود انہی کی کوششوں سے یہ سڑک بڑھتی چلی جائے گی۔

معلومات

۱۔ ۱۹۵۲ء کی پہلی چھ ماہی میں بھارت کی سپلائی کی ۲۵ ہزار سات سو انیس مشینیں طیّار ہوئیں۔ گذشتہ سال اِن مشینوں کی تعداد ۴۴ ہزار ۴ سو اٹھتی تھی ۱۹۴۴ء میں سپلائی کی صرف چھ ہزار ایک سو بارہ مشینیں طیّار ہوئی تھیں۔

۲۔ بھارت میں ۴۴-۱۹۴۳ء میں دو لاکھ اُناسی ہزار نو سو مویشی مہلک بیماریوں سے ہلاک ہوئے۔ لیکن ۵۲-۱۹۵۱ء میں یہ تعداد گھٹ کر ۹۵ ہزار ۱۸ رہ گئی ہے۔

۳۔ اس سال حصولِ گندم کے سلسلے میں سات لاکھ اٹھتر ہزار تین سو ٹن گندم وصول ہوتی ہے۔ جو مقررہ مقدار سے ایک لاکھ ٹن زیادہ ہے۔

۴۔ ۵۲-۱۹۵۱ء میں ترقی کی اسکیموں پر تین ارب سترہ کروڑ روپیہ خرچ کیا گیا ہے۔ یہ رقم مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے کل محاصل نو ارب دس کروڑ اٹھتر لاکھ روپے کے ایک تہائی حصّے سے بھی زائد ہے۔

۵۔ بھارت میں تقریباً دو ارب چھہتر کروڑ ایکڑ فٹ سالانہ بارش ہوتی ہے۔ اس میں سے تقریباً ایک ارب بتیس کروڑ ایکڑ فٹ دریاؤں اور سمندروں میں بہہ جاتی ہے۔

۶۔ ۵۰-۱۹۴۹ء میں بھارتی ریلوں میں بغیر ٹکٹ سفر کرنے والے مسافروں سے ایک کروڑ ۳۷ لاکھ روپیہ وصول کیا گیا تھا۔ لیکن ۱۹۵۰-۵۱ء میں یہ رقم گھٹ کر ایک کروڑ اکہتر لاکھ روپے رہ گئی تھی۔

۷۔ گذشتہ سال بھارت کی ریلوں کے لئے اکیاسی کروڑ اٹھاسی لاکھ روپے کا سامان خریدا گیا تھا۔ اس مقدار میں سے تریسٹھ کروڑ بائیس لاکھ روپے کا سامان بھارت ہی کا طیّار کردہ تھا۔

۸۔ ۵۲-۱۹۵۱ء میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے محاصل کی مجموعی رقم نو ارب دس کروڑ اٹھتر لاکھ روپے تھی۔ اور مجموعی اخراجات آٹھ ارب چوبیس کروڑ چھ لاکھ روپے تھے۔

۹۔ مدراس میں انڈوں کی سالانہ پیداوار پچیس کروڑ پچاس لاکھ ہے اور ٹراونکور کوچین میں صرفہ کی سب سے زیادہ اوسط ۱۹ انڈے فی کس ہے لیکن مدھیہ پردیش میں صرفہ کی سب سے کم اوسط پانچ انڈے سالانہ ہے۔

نئی کتابیں اور رسالے

ہم لوگ

پبلشرز لاجپت رائے اینڈ سنز اُردو بازار دہلی۔
مصنف:۔ ہنس راج رہبر۔ ضخامت ۲۰۶ صفحات

تقطیع $\frac{۲۰×۳۰}{۱۶}$ ۔کتابت، طباعت گوارا۔ جلد، جلد پوش عمدہ ۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے ۔ یہ کتاب ہنس راج رہبر کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ "اپنی بات" کے عنوان سے رہبر نے اس کتاب کا ایک مختصر پیش لفظ لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے افسانوں کا پس منظر اور خود اپنے کردار پر روشنی ڈالی ہے۔ سماجی بربریت کا رفنا وہ ہر افسانے میں روتے ہیں لیکن اس کے لئے خود اُن کا قول ذمہ دار رہا ہے۔ وہ فرماتے ہیں "تلخی مرے کردار کا اور میری تحریر کا حصہ بن چکی ہے" ۔ رہبر کی زندگی تلخیوں کا ایک گمبھیر تجربہ ہے، انھیں تلخیوں کو اس نے اپنی تخلیقات میں کسی نہ کسی رُوپ سے اُجاگر کیا ہے۔ رہبر کے مزاج میں صلح پسندی کم ہے اور اپنی بات پر اڑنے کی عادت زیادہ۔ یہ عادت اس لحاظ سے مستحسن ہے کہ اس میں خلوص ہے، دیانت ہے۔ یہی چیز آپ کو اُن کے بیشتر افسانوں میں ملے گی۔ کہیں کہیں سماج پر اُن کی تنقید توازن کی حدوں سے متجاوز ہوگئی ہے۔ لیکن ایسی باتیں تو ہر مصنف کے ہاں ملیں گی۔ رہبر سماجی اور سیاسی شعور سے بہت اچھی حد تک بہرہ ور ہے۔ اسی وجہ سے اس کے بیان میں خلوص کے سہارے ایک مٹھاس، ایک شیرینی اور اس کے ساتھ ساتھ ہلکی سی چبھن پائی جاتی ہے۔ اس کتاب میں 'ہم لوگ'، 'دو زخم' ہمارے پسندیدہ افسانے ہیں۔ یہ کتاب ہمارے افسانوی ادب میں ایک اچھا اور قابل قدر اضافہ ہے۔

برق و باراں

مصنف ۔ احسن احمد اشک ۔قرآن منزل ڈھاکہ۔
ضخامت ۱۰۲ صفحات ۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے

کتابت، طباعت، جلد، جلد پوش، اوسط ۔ ضخامت کے لحاظ سے قیمت زیادہ ہے کتاب کے آغاز میں رضا علی وحشت کا پیش لفظ اور عندلیب شادانی کا تعارف شامل ہے۔ دونوں سخنوروں نے مصنف کو دادِ سخن دی ہے۔ اشک کی نظموں کے اس مجموعے سے مترشح ہوتا ہے کہ آپ خود اپنے اس شعر پر عمل پیرا ہیں

کوشش یہ ہے کہ ایک نیا راستہ بنے
چلتے ہیں ہٹ کے رہگذرِ کارواں سے ہم

لیکن نیا راستہ بنانا کوئی آسان کام نہیں اور یہی وجہ ہے کہ آپ کہیں کہیں بھٹک بھی گئے ہیں ۔ فرماتے ہیں۔

مگر افسوس فطرت نے مجھے شاعر بنا ڈالا
نہیں تو اشک اپنی آرزوؤں کا خدا ہوتا

گویا شاعر اپنی آرزوؤں کا خدا نہیں ہوتا۔ اگر یہ سعادت شاعر کو بھی حاصل نہیں تو پھر کس کو حاصل ہے۔ کلامِ اشک میں خوش کلامی کے نمونے اکثر و بیشتر ملنے کے باوجود فنی اغلاط اور خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ صفحہ ۸۲ پر نظم کے پہلے بند میں لبتا، پھرتا اور رہتا اور صفحہ ۹۸ پر راہیں اور بلائیں ایطائے جلی کی جلی مثالیں ہیں۔ کچھ پسندیدہ شعر بھی ملاحظہ فرمایئے۔

نگاہِ ناز جھکی اور رہ گئی جھک کر
سوالِ شوق کا کوئی جواب ہو نہ سکا

شبلِ غبارِ راہ چل وقت کے قافلے کے ساتھ
تیرے لئے رُکے گی کیوں گردشِ چرخِ چنبری

مجھے نیند آگئی تھی راہ کی ٹھنڈی ہواؤں میں
میں اک واماندہ ہوں پوچھو حدیثِ کارواں مجھ سے
مرے دل کی تمنّا طرّۂ دستارِ گلچیں ہو
اور اس پر یہ قیامت داد مانگے باغباں مجھ سے

آپ کا بچّہ۔ اُس کی صحت اور پرورش

مصنف۔ ڈاکٹر پی راج مونگا۔ ناشر مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر دہلی۔ قیمت تین روپے تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۲۲۸۔ کتابت، طباعت، جلد، جلد پوشش اوسط۔

اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ کتاب نہایت مفید ہے۔ ہندوستان میں لاکھوں بچے چھوٹی عمر میں موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ فاضل مصنف نے بڑی محنت سے بچے کی پرورش اور صحت کے باب میں مفید معلومات اور ہدایات ایک جگہ جمع کر کے رکھ دی ہیں۔ چنانچہ بچے کی ولادت اور ولادت سے پہلے جو احتیاط ضروری ہے اُسے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد بچّے کے کپڑے، غسل، دانت نکلنا، عادات بیماری میں دیکھ بھال، خاص غذاؤں کے طیّار کرنے کے طریقے وغیرہ مختلف عنوانات پہ سیر حاصل تفاصیل مہیا کی گئی ہیں۔ طرزِ بیان نہایت سلیس اور سادہ ہے جس سے کتاب کی عوامی افادیت بڑھ گئی ہے۔

رسالے

نقوش۔ افسانہ نمبر

ضخامت ۴۰۰ صفحات۔ کتابت، طباعت دیدہ زیب ہے۔ یہ حسین و جمیل نمبر ادارۂ نقوش کی خوش ذوقی کا ایک اور اعلیٰ نمونہ ہے۔ ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء کا یہ شمارہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ ترتیب پر نظر دوڑایئے۔ افسانوی ادب سے متعلق آپ کو سب کچھ ملے گا۔ طویل مختصر افسانے، مختصر افسانے، رپورتاژ، تراجم اور مقالات۔ ہندوستان اور پاکستان کے بیشتر اچھا لکھنے والے نقوش کی محفل میں موجود ہیں۔ نئے لکھنے والے بھی ہیں اور پرانے بھی۔ تین طویل مختصر افسانے احمد ندیم قاسمی، علی عبّاس حسینی، تسنیم سلیم چھتاری۔ تینوں نام معیار کی ضمانت ہیں۔ ان کے علاوہ افسانوں اور مقالات وغیرہ کی تعداد ۳۷ ہے۔ منٹو، حیات اللہ انصاری، عزیز احمد، ممتاز مفتی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، قرۃ العین حیدر، کرشن چندر، خواجہ احمد عبّاس، شفیق الرحمٰن، ممتاز شیریں، انتظار حسین، ل۔ احمد، گویا تقریباً ہر اچھا افسانہ نگار موجود ہے۔ وقار عظیم اور محمد حسن عسکری کے مقالے بھی شاملِ اشاعت ہیں۔

اُردو ادب کے تخلیقی حصّے میں افسانے کی عمر تو بہت چھوٹی ہے مگر مقبولیت کے لحاظ سے یہ دوسری اصناف سے دو قدم آگے ہی ہے پیچھے نہیں۔ آج کل ہمارا افسانہ، سماجی اور سیاسی شعور کی منزلوں میں ہے۔ ہمارے فن کار اب دقیانوسی باتوں کا رونا کم روتے ہیں۔ زندگی کے حقائق زیادہ بیان کرتے ہیں۔ ایسے ادب سے ہی زندگی سنورتی ہے۔ چنانچہ زیرِ تبصرہ شمارے کے اکثر و بیشتر افسانے ایسے افسانے ہیں جو ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک کڑی ثابت ہوں گے اور جیتِ ابدی پائیں گے ہمارے افسانہ نگاروں نے زندگی کی صداقت اور فن کی لطافت کو شیر و شکر کر دیا ہے اور ہم فخر سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ادب پر جمود کا غلبہ نہیں۔ ہمارے ادیبوں کی تخلیقات اس مقام پر پہنچ گئی ہیں جہاں روایت سجدہ ریز اور جدّت حلقہ بگوش ہے۔ ’کوئی مسافر کوئی منتظر‘ ’بارہ برس بعد‘ ’نیلا نشان‘ اور ’یہ حادثے‘ اچھے افسانے ہیں محمد علی ردولوی کا اندازِ بیان اور نکھری ہوئی زبان ’دُور کے نشانے میں‘ اپنے پورے ٹھاٹھ پر ہے۔ ’شاہد لطیف کی شادی‘ اخلاق احمد صاحب نے خطوں سے اچھی خاصی کہانی مرتّب کر لی ہے۔ کہانی کی کہانی اور رپورتاژ کا رپورتاژ۔ عصمت کے خط اس میں بھی اپنی فطری شوخی اور طرّاری لئے ہوئے ہیں۔ رسالے میں اچھی اچھی تصویریں بھی ہیں لکھنے والوں اور لکھنے والیوں کی، جن میں سے اکثر پر نگاہ جم کے رہ جاتی ہے۔ محمد طفیل صاحب مدیر نقوش اس خاص نمبر کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں

ماہ نامہ ناول

ملنے کا پتہ۔ ماہ نامہ ناول۔ ہال اسٹریٹ صدر کراچی ۳

اس ماہ نامہ کے تین شمارے نمبر ۳، ۴ اور ۵ شائع ہوئے ہیں ”سنہری خنجر“ مترجم شفاعت محمود فاروقی۔ ”خزانہ“ ترجمہ از محمود فاروقی اور ”آوارہ گرد“ ترجمہ مسعود علی۔ ہر مہینے ایک پورے ناول کا شائع کرنا بڑی ہمّت کا کام ہے۔ سالانہ چندہ پندرہ روپے ہے۔ ایک کاپی کی قیمت ڈیڑھ روپے۔ گویا ایک سال میں بارہ ناول پندرہ روپے میں مل سکتے ہیں۔ ماہ ناموں میں یہ جدّت ابھی تک پہلے نہیں دیکھی گئی۔

رفتارِ زمانہ

اقوامِ متحدہ کا آزادی کا چارٹر

متحدہ اقوام کی اسمبلی کے طریقۂ کار سے اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ مختلف ممالک اسے اپنے ذاتی اغراض کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن شخصی آزادی کے باب میں متحدہ اقوام کی اسمبلی نے جو چارٹر طے کیا ہے اُس سے کسی قوم کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اس چارٹر کی رُو سے دنیا کے ہر فرد و بشر کو چاہے وہ گورا ہے یا کالا، بوڑھا ہے یا جوان، عورت ہے یا مرد، ہندو ہے یا مسلمان، آرین ہے یا منگولین بالکل یکساں شخصی حقوق حاصل ہیں اور امتیازی سلوک کو بالکل ناممکن بنا دیا گیا ہے۔ یقیناً یہ چارٹر ترقی کی نئی راہیں کھول دیتا ہے اور اس کے عمل میں آجانے سے باہمی جھگڑے اور جنگ کے خطرات خود بخود اپنی موت مر جائیں گے۔ ۱۰ دسمبر کو دنیا کے طول و عرض میں اقوام متحدہ کے چارٹر کی ساتویں سالگرہ منائی جا رہی ہے۔ بھارت چارٹر کے اصول کا پوری طرح پابند رہا ہے۔ اس لئے بھارت بھر میں یہ دن پورے جوش و خروش سے منایا جائے گا اور اس دن آزادی کے چارٹر کو دُہرایا جائے گا۔

پنڈت نہرو کا دورۂ حیدرآباد

حیدرآباد کے ایک بھاری پبلک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے بھارت کے پردھان منتری پنڈت جواہرلال نہرو نے کہا کہ جب تک دیش کے کروڑوں باشندے ملک کی مجلسی اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانے میں فرداً فرداً اپنا حصہ ادا نہیں کریں گے تب تک ملک ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتا۔ کمیونٹی پراجیکٹ کا ذکر کرتے ہوئے پردھان منتری نے کہا کہ اگرچہ اس کی بنیاد حکومت کی طرف سے رکھی گئی ہے لیکن اس کا پہلا مقصد جنتا کی طرف سے جاری کی جانے والی منصوبوں کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔

کشمیر کی ترقی کے لئے پنج سالہ پلان

بھارت کے پلاننگ کمیشن نے کشمیر کی ترقی کے لئے ایک پانچ سال کی اسکیم منظور کی ہے۔ اس اسکیم کے مطابق کل دس کروڑ روپیہ خرچ کیا جائے گا جس میں سے سات کروڑ روپیہ بھارت سرکار امداد کے طور پر دے گی۔ اس کے علاوہ مرکزی حکومت بانہال سرنگ بنانے میں بھی مدد دیگی۔ اس سرنگ کے تعمیر ہو جانے سے جموں اور سری نگر میں فاصلہ ۲۰ میل کم ہو جائے گا۔ اسکیم میں آبپاشی، بجلی، سڑکوں کی تعمیر، زراعت، تعلیم اور صحت وغیرہ شامل ہیں۔ اسکیم کی تفصیل پر کشمیر سرکار کے نمائندوں نائب وزیراعظم بخشی غلام محمد، وزیر مالیات منتری گردھاری لال ڈوگرہ اور پلاننگ کمیشن کے ممبران میں بات چیت ہوئی۔ اسکیم کو عمل میں لانے کے لئے ایک باقاعدہ پروگرام مرتب کیا گیا۔ ابتدائی کام بہت جلد شروع کر دیا جائے گا۔

روسی مزدوروں کی طرف سے خوراک کا تحفہ

رُوس کی مزدور یونینیوں کی مرکزی جماعت نے بھارتی ریڈ کراس سوسائٹی کی صدر شریمتی راجکماری امرت کور کو مدراس اور دوسرے قحط زدہ علاقوں کے لئے بہت سی چیزیں پیش کیں۔ ان اشیاء میں دس ہزار ٹن گندم، پانچ ہزار ٹن چاول، پانچ لاکھ جمے ہوئے دودھ کے ڈبے اور اڑھائی لاکھ روپے ہیں۔

مزدوروں کے سدھار کی طرف ایک اور قدم

مزدوروں کی حالت سدھارنے کے لئے بھارت سرکار پوری کوشش کر رہی ہے۔ ایک بڑی کمی یہ تھی کہ مزدوروں کو اچھے مکان میسر نہیں تھے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ہند سرکار کے محکمہ تعمیرات نے ایک اسکیم طیار کی ہے جس کے مطابق سال ۵۳-۱۹۵۲ء میں سات کروڑ روپے کی لاگت سے ۲۸۵۰۰ مکان بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ہر مکان میں ایک کمرہ، رسوئی، غسل خانہ اور برآمدہ ہوگا۔ اُمید کی جاتی ہے کہ حکومت کی ان کوششوں سے مزدوروں کی حالت سُدھر جائے گی۔

ایران کا مسئلہ

ایران اور برطانیہ کے مابین کشیدگی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ ہر دو ممالک کے سفارتی تعلقات بھی ٹوٹ گئے ہیں۔ اور لندن میں مقیم ایرانی سفارت خانہ کے نمائندے بہت جلد واپس آجائیں گے۔ امریکہ نے ایک بار پھر دونوں دیشوں سے اپیل کی ہے کہ وہ تیل کے جھگڑے کو حل کرنے کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔
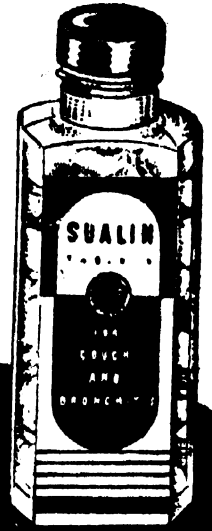
گرمی میں ...
سردی میں یا ...
Erasmic
HIMALAYA BOUQUET SNOW
آپ جہاں کہیں بھی ہوں ...
ہمالیہ
بکے سنو
استعمال کیجئے
کیونکہ یہ ہندوستانی آب وہوا کیلئے خاص کرکے بنایا گیا ہے
چاہے کیسا بھی موسم ہو۔ آپ ہندوستان میں کہیں بھی ہوں۔ ہمالیہ بکے سنو آپکی
جلد کو زیادہ خوبصورت و ملایم رکھے گا۔ اسکی خوشبو بھی دلآویز ہے۔
اراسمک کا ایک اور عمدہ پراڈکٹ
HBS. 6 A-X30 UD
اراسمک کمپنی لیمیٹڈ لنڈن کے لئے ہندوستان میں بنایا گیا

Regd. No. E P - 689

فیض لدھیانوی

احمقانہ کھیل کُود

مت کبھی اُونچے درختوں پر چڑھو   کھیلنے میں عقل سے بھی کام لو
چوٹ کھا بیٹھو کہیں ایسا نہ ہو   شاخ ٹوٹے پاؤں پھسلے گر پڑو
پیارے بچّو! اس حماقت سے بچو

چلتی گاڑی کا بھلا کیا اعتبار   دوڑ کر چڑھتا ہے جو اس پر سوار
یک بیک گرتا ہے وہ بے اختیار   گر کے ہوتا ہے مصیبت کا شکار
پیارے بچّو! اس حماقت سے بچو

تیرنے کا شوق اچھّا ہے مگر   گہرا پانی ہے نہایت پُر خطر
اس طرف جائے جو کوئی بے ہنر   زندگی اپنی گنوائے ڈوب کر
پیارے بچّو! اس حماقت سے بچو

جو اُڑاتا ہے منڈیروں پر پتنگ   آپ اپنی جان سے کرتا ہے جنگ
بے وقوفی اُس کی لاتی ہے یہ رنگ   صحن میں گرتا ہے ہو جاتا ہے لنگ
پیارے بچّو! اس حماقت سے بچو

بے دھڑک ہو کر چلانا سائیکل   ہاتھ ہینڈل سے اُٹھانا بے محل
موڑ سے ٹانگا اگر آئے نکل   کھاؤ گے ٹکر گرو گے سر کے بل
پیارے بچّو! اس حماقت سے بچو

چھیڑنا بجلی کے تاروں کو فضول   یاد رکھو سخت مہلک ہے یہ بھول
تم سمجھ سکتے نہیں برقی اصول   کانپ اُٹھیگی بدن کی چول چول
پیارے بچّو! اس حماقت سے بچو (شاباش)

سعیدہ بانو

سانپ سے شہزادہ

ندی میں زوروں سے باڑھ آجانے کی وجہ سے بہت سے بسے بسائے گھر اُجڑ گئے تھے۔ اچھے اچھے لوگ بے گھر ہو گئے تھے۔ اور اسی حالت میں وہ اِدھر اُدھر مارے مارے پھر رہے تھے۔

انہیں لوگوں میں ایک بوڑھا بھی تھا اور اس کی بڑھیا بھی۔ اُس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ جو بوڑھاپے میں اُن کا سہارا بنتا۔ انہیں اپنے گھر کے بہ جانے کا اتنا غم نہ تھا جتنا کہ اولاد نہ ہونے کا۔

دونوں نے بہت بار خدا سے اولاد چاہی مگر نیلی چھتری والے نے اُسے اولاد سے محروم ہی رکھا ایک دن بُڑھیا نے بوڑھے سے کہا۔

دیکھو جی اب ہمارا آخری وقت ہے۔ ہمارے ہاتھ پاؤں سب جواب دینے پڑ لگے ہوئے ہیں۔ اور اس آخری وقت میں کون ہمیں سہارا دے گا۔ اور کون ہماری خدمت کرے گا۔ اس لئے تم کہیں سے ایک لڑکا تلاش کر کے گود لے لو۔

دوسرے دن بوڑھا لڑکے کی تلاش میں گھر سے نکلا اور سارا دن اِدھر اُدھر خاک چھانتا رہا۔ لیکن لڑکا اُسے کہیں بھی نہ ملا۔

آخر تھک کر وہ ایک بڑے سے درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گیا۔

ابھی اسے بیٹھے چند ہی لمحے ہوئے تھے کہ ایک چھوٹا سا سانپ کا بچہ رینگتا ہوا بوڑھے کے قریب آیا۔ بوڑھا پہلے تو اسے دیکھ کر خوف زدہ ہوا لیکن جب اسے اطمینان ہو گیا کہ یہ کاٹے گا نہیں تب اس نے اٹھا کر اسے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اور گھر کی راہ لی۔

بُڑھیا خوش تھی۔ سانپ کا بچہ ہی سہی، گھر میں دو سے تین تو ہوئے۔ دونوں نے بڑے لاڈ پیار سے اُسے پوسا پالا۔ وہ آہستہ آہستہ بڑھتا گیا، بڑھتا گیا اور ایک دن جب وہ جوان ہو گیا تو اس نے بوڑھے سے کہا۔ ابّا میں اب جوان ہو گیا ہوں۔ میری شادی شہزادی سے کر دیجئے۔"

بوڑھے کو اس کی نرالی باتیں سُن کر بڑی حیرت ہوئی۔ اور چند لمحے کچھ سوچنے کے بعد بولا "بیٹا بھلا تم کو کون اپنی لڑکی دے گا۔ تم جو سانپ ٹھہرے"۔

"ابّا آپ فکر نہ کیجئے" سانپ کہنے لگا۔ میں راجہ ہی کی لڑکی سے شادی کروں گا۔ آپ ایک بار جا کر بات چیت تو چلائیے۔

بوڑھا اور گھبرایا۔ اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھنے لگا

"آپ فکر نہ کریں آبا جان" — سانپ نے اسے یُوں گھورتے ہوئے دیکھ کر کہا — بادشاہ جو بھی فرمائش کرے گا۔ وہ تمام کی تمام چیزیں اُسے مل جائیں گی۔

بوڑھا ڈرتے ڈرتے بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوا۔ اور اس نے اپنے لڑکے کے لئے شہزادی مانگی۔

بادشاہ یہ سُن کر آگ بگولا ہو گیا اور آنکھیں لال ہو گئیں۔ اور وہ چلّایا — تمہاری یہ مجال ایک ادنےٰ سا آدمی بادشاہ سے اس کی بیٹی مانگ رہا ہے"۔

"جی ہاں — بوڑھا پھر بولا" — اس کے بدلے چاہے آپ جو بھی مانگیں ہم دینے کو تیار ہوں" —

راجہ منٹوں سوچتے رہنے کے بعد یہ سمجھ کر یہ شاید پاگل ہو گیا ہے کہنے لگا۔ اچھّا راتوں رات سامنے کے جنگل کو صاف کر دو اور اس میں گیہوں بو دو۔ اور اس کی روٹی پکا کر میرے پاس لے آؤ۔ تب کہیں تم جا کر شہزادی کو پا سکو گے" —

بوڑھا خراماں خراماں گھر لوٹا۔ راجہ نے سمجھا بلا ٹلی۔ گھر پہنچ کر بوڑھے نے سانپ سے کل قصّہ کہہ سنایا۔ وہ سُن کر خوب ہنسا اور ہنستے ہنستے ہی بولا — "ابّا یہ تو بالکل معمولی بات ہے۔ یہ تو منٹوں کا کام ہے۔ آپ بے فکر رہئے ابھی سب ہو جاتا ہے"۔

اور جب وہ سو کر صبح کو اٹھا تو اس نے دیکھا۔ جنگل کی جگہ کھیت ہی کھیت ہے اور اس میں گیہوں کی فصل لگی ہوئی ہے بالیاں بالکل پک گئی ہیں۔ وہ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

ابھی وہ بستر ہی پر پڑا تھا کہ بڑھیا نے گیہوں کی چند روٹیاں پکا کر اُسے لا کر دیں۔ وہ خوشی خوشی اٹھا اور روٹی کو لے کر بادشاہ کے محل میں پہنچا اور روٹی بادشاہ کے حوالے کی اور پھر بولا "آپ کی شرط پوری ہو گئی۔ اب میرے لڑکے کی شادی شہزادی سے کر دیجئے" —

"لیکن ایک شرط اور باقی ہے" — بادشاہ نے کہا "ہمارے محل سے اپنے گھر تک ایک سونے کی سڑک بنوا دو اور سڑک کے دونوں طرف اچھے اچھے پھلوں کے درخت لگوا دو۔ اور ان پیڑوں سے سونے کے پھل توڑ کر ہمارے لئے لے آؤ۔ پھر شہزادی تمہاری ہو رہے۔

بوڑھا بادشاہ کی اوٹ پٹانگ باتیں سُن کر بہت گھبرایا۔ اور غمگین سا چہرہ لے کر گھر واپس آیا۔

بوڑھے کو غمگین دیکھ کر سانپ نے پوچھا۔ آپ اتنے اُداس کیوں ہیں ابّا —؟

بوڑھے نے بادشاہ کی دوسری شرط بھی اسے کہہ دی۔ سانپ سنتے ہی پھر ہنسا۔ اور اب کی ہنستے ہی اس کے مُنہ سے ایک لعل گرا۔ جس کی روشنی سے سارا گھر جگمگا اُٹھا۔ بوڑھا اسے لے کر بہت خوش ہوا۔ اور غور سے اُسے دیکھنے لگا۔

— "ابّا میں یہ بھی شرط فوراً ہی پوری کر دوں گا" — سانپ کہنے لگا۔ تب بادشاہ کے غرور کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ یہ شرط تو

پہلی سے بھی زیادہ معمولی ہے ۔

اور بوڑھا خوشی خوشی کھانا کھا کر سو رہا ۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ اس کے مکان سے راجہ کے محل تک سونے کی سڑک چمک رہی تھی اور اس کے دونوں طرف طرح طرح کے خوبصورت پھل کے درخت سونے کے پھلوں سے لدے ہوئے جھوم رہے تھے ۔

بادشاہ ابھی آنکھ ہی مل رہا تھا کہ وہ پھل لے کر بادشاہ کے پاس جا حاضر ہوا - اور وہ اب کوئی بہانہ نہ بنا سکا - اور شادی کی منظوری دے دی ۔

بوڑھے نے سانپ کے سر پر بڑے پیار سے سہرا باندھا اور اسے دولھا بنا کر براتیوں کے ساتھ محل کی طرف گیا - بارات بڑے دھوم دھام سے وہاں پہنچی - لیکن جب لوگوں نے دولھے کی بجائے پالکی پر ایک سانپ کو بیٹھا دیکھا تو سب لوگ بہت گھبرائے اور بادشاہ کا دماغ چکرانے لگا ۔

ابھی وہ کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ بادشاہ کے درباری چلائے — اگر اس سے شہزادی کی شادی نہ ہوئی تو یہ سارے خاندان کی جان لے لے گا"۔

شاہی طریقہ پر سانپ کی شادی شہزادی سے ہو گئی اور بیٹا بہو کو ساتھ لے کر بوڑھا گھر واپس لوٹا - لیکن یہ کیا ؟ اس کے گھر کی جگہ شاہی محل ایسا ایک دوسرا محل کھڑا تھا - اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا - لیکن پالکی میں سانپ کی جگہ ایک خوبصورت شہزادہ بیٹھا مسکرا رہا تھا ۔

رادھا کرشن ہنڈو

مہاتما بدھ اور ایک بڑھیا

ایک دن کا ذکر ہے کہ ایک بوڑھی جس کا ایک اکلوتا بیٹا مر چکا تھا مہاتما بدھ کے پاس چلی گئی - بوڑھی نے آہ و زاری کرتے ہوئے مہاتما بدھ سے کہا کہ وہ اس کے لڑکے کو زندہ کر دے - مہاتما بدھ نے جواب میں کہا کہ اگر تم کسی ایسے گھر میں سے جس میں آج تک کوئی نہ مرا ہو کچھ سرسوں کے بیج لادے تو میں تمہارے لڑکے کو زندہ کر دوں گا ۔

لڑکے کے پریم میں متوالی —— بڑھیا سرسوں کے بیج ڈھونڈنے کے لئے چل پڑی - بہت خاک چھانی لیکن ایسا کوئی گھر نہیں ملا جہاں کوئی مرا ہی نہ ہو - اور وہاں ملے بھی کیسے ۔

بڑھیا آخیر نا امید ہو کر مہاتما بدھ کے پاس واپس چلی آئی اور ان سے کہا "مہاراج مجھے کوئی بھی ایسا گھر نہیں ملا جہاں پہ کہ آج تک کوئی مرا ہی نہ ہو" ۔

مہاتما بدھ نے کہا "بوڑھی دیکھ لیا - کوئی بھی ایسا گھر نہیں جہاں کوئی نہ کوئی آدمی ضرور مرا ہو" - موت ایک قانونِ قدرت ہے - اس کا کوئی علاج نہیں ۔

لطیفہ

اُستاد - بتاؤ ساجن مُرغزار کے کیا معنی ہیں ؟

ساجن - مرغزار ایسی زمین کو کہتے ہیں جہاں مُرغے کثرت سے پیدا ہوتے ہوں ۔

شمیم شبیریں

خبریں بھیجنے کے نئے اور پُرانے طریقے

۱- پہلا طریقہ تو یہ تھا کہ تھوڑی تھوڑی دُور پر چوکیاں قائم تھیں - جس میں ہرکارے رہتے تھے - ایک جگہ سے ایک ہرکارہ روانہ ہوتا تو دوسری چوکی پر پہنچ کر دوسرا ہرکارہ ڈاک لے کر روانہ ہوجاتا تھا - اسی طرح سے خبریں پہنچ جاتی تھیں -

۲- کسی اونچی پہاڑی پر آگ جلا دیتے تھے جب دوسری جگہ کے لوگ اسے دیکھتے تو وہ بھی اسی قسم کی آگ جلا دیتے تھے - اس طرح سے وہ جلد از جلد خبر بھیج سکتے تھے - لیکن اس میں مخصوص خبر کے لئے اس قسم کی آگ جلائی جاتی تھی - مثلاً کچھ میں صرف دھوئاں ہوتا تو اس کا دوسرا مطلب ہوتا اور اگر شعلے اُٹھتے تو اس کا دوسرا مطلب سمجھا جاتا تھا - لیکن پھر بھی اس میں دیر اور دقّت دونوں باتیں موجود تھیں -

۳- کچھ لوگ ایک جگہ جمع ہو کر بہت زور زور سے ڈھول بجاتے تھے - اس میں مختلف قسم کی آوازوں کے لئے مختلف اشارے تھے - تم سمجھ سکتے ہو کہ ان طریقوں میں کتنی دقّت اور کیسی دشواری ہوتی تھی - ساتھ ساتھ تمہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے - انسان کو جب بھی کوئی ضرورت پیش آئی اس نے ضرور کوئی نہ کوئی راستہ معلوم کر لیا -

لہٰذا اب ضرورت تھی کہ اس میں آسانی پیدا کی جائے - آج کل دنیا میں جتنے حیرت انگیز اور تباہ کن آلات ایجاد ہوئے ہیں یہ سب ضرورت کے مرہون منّت ہیں - زمانہ جنگ میں کیسے کیسے ایجاد کئے گئے -

ہاں تو سب سے پہلے ۱۸۳۷ء میں ایک امریکن نے ٹیلیگراف ایجاد کیا اس کا نام مورس تھا - اس کی ایجاد کردہ مشین کے ذریعے ایک منٹ میں پانچ الفاظ بھیجے جاتے تھے - اس میں انگریزی الفاظ کی مخصوص آوازیں مقرر کی گئی ہیں - مثال کے طور پر صرف (ہے) "ایس" کی پانچ اور "او" کی تین مختلف آوازیں تھیں -

دنیا کا سب سے پہلا ٹیلیفون ۱۸۷۶ء میں ایجاد ہوا - اس کا موجد ایک انگریز تھا جس کا نام "الگزنڈر گرام بل" تھا اس نے سب سے پہلے اپنے دوست تھامس وبیسٹن سے بات چیت کی جو اس سے سو میل کے فاصلے پر تھا -

اس کے بعد اٹلی کے ایک باشندے نے بغیر تار کے خبر بھیجنے کا طریقہ ایجاد کر کے ساری دنیا میں تہلکہ برپا کر دیا - اس نے سالہا سال سائنس کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد آخر کار ۱۹۰۱ء میں وائرلیس ایجاد کیا جس کے ذریعے ہم دنیا کے کسی گوشے کے انسان سے بغیر تار کے آسانی سے بات چیت کر سکتے تھے - اس کا نام مارکونی تھا -

آج کل ایک عرب نے ایک ایسا ٹیلیفون ایجاد کیا ہے کہ اگر کوئی کسی سے بات کرنا چاہے اور وہ آدمی نہ رہے تو وہ ٹیلیفون خود بول دیتا ہے -

اطہر پرویز

جان بچی لاکھوں پائے

بدھو میاں نکلے ساری دنیا کی سیر کرنے، سوچا کہ اس کے لئے چاہے کتنی ہی جان جوکھم کا سامنا کرنا پڑے۔ مگر وہ تو یہی سوچ رہے تھے۔ کہ بس اب تو سیر کرنی ہی ہے!! اب تو سیر کرکے ہی دم لیں گے۔ پھر یہ بھی کہ ساری سیر و تفریح پیدل ہی ہوگی۔

ابھی بدھو میاں کچھ دُور ہی نکلے تھے کہ پہلے پٹھانوں کی بستی آئی۔ یہ تو بدھو میاں نے پہلے ہی سن رکھا تھا کہ خان لوگ بڑے مہماں نواز ہوتے ہیں۔ یہ خیال آتے ہی بدھو میاں خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ انھوں نے سوچا چلو سیر کی سیر اور کھانا مفت۔ بدھو میاں سرائے میں جاکر ٹھہر گئے۔

شام کو سردار خاں کا وہاں جانا ہوا تو دیکھا کہ سرائے میں بدھو میاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ بس پھر کیا تھا۔ انھوں نے گرجدار آواز میں کہا ــــ

"خو تم امارا مہمان ہے، ہم ابی تمہارے لئے کھانا لاتا ہے۔"

یہاں یہ حال کہ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، بدھو میاں اسی انتظار میں تھے کہ کہیں سے شام کے کھانے کا انتظام ہو جائے۔

اب سردار خاں تو دعوت دے کر کھانا لانے گھر چلے گئے۔ اتنے میں ایک اور خان کا اُدھر سے گزر ہوا۔ انھوں نے سرائے میں نووارد کو دیکھا تو بولے

"خو، کیا نام ہے تمہارا؟"

"شیخ بدھو۔"

"اچھا تو تمہارا نام شیخ بدھو ہے ــ تو شیخ بدھو خاں آج تم امارا مہمان ہے۔ ام تمہارے لئے کھانا لینے جاتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور ذرا سی دیر میں کھانا لے کر آموجود ہوا۔

شیخ بدھو کو بھوک تو لگی تھی اُنھوں نے جلدی جلدی کھانا کھانا شروع کر دیا۔ ذرا سی دیر میں سردار خاں بھی آموجود ہوئے۔ اب جو انھوں نے دیکھا کہ بدھو میاں پہلے ہی کھانے پر ہاتھ صاف کر رہے ہیں تو وہ ایک دم آگ بگولا ہو گئے، غصّے میں بولے۔

"خو، تم امارا مہمان ہو کر دوسرے کا کھانا کھاتا ہے۔ ام تم کو جان سے مار دے گا۔" پہلے تو شیخ بدھو یہ سُن کر مسکرائے، وہ سمجھے کہ خان مذاق کر رہا ہے مگر پھر جو غور سے دیکھا تو سردار خاں چاقو تیز کر رہا تھا۔

"تم نے امارا بے عزتی کر دی ہے، ام تمہاری جان مار دے گا۔"

اب تو بدھو خاں کو جاڑے میں پسینہ ہی چھوٹ گیا۔ جیسے موت سامنے کھڑی ہو گئی ہو۔ گھبرا کر دوسرے سردار سے بولے "تم ہم کو خان سے بچاؤ۔ تمہارے کھانے کی وجہ سے ہم پر یہ مصیبت آگئی۔"

مگر خان نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا۔ "بدھو خاں، تم اس کے ہاتھوں شہید ہو جاؤ۔ جب سردار خاں کا کوئی مہمان آجائے گا۔ تو ہم اس کے ساتھ وہی سلوک کرے گا جو یہ تمہارے ساتھ کر رہا ہے۔ ہم تمہارے خون کا بدلہ ضرور لے گا۔"

یہ سننا تھا کہ بدھو خاں کے سارے اوسان جاتے رہے۔ اور اب جو سرائے سے سر پر پیر رکھ کر بھاگے تو پھر ان کو دنیا کی سیر کا خیال بھی چھوڑنا پڑا اور سیدھے گھر پہنچے اور جب سے یہ مثل مشہور ہو گئی۔

جان بچی، لاکھوں پائے   خیر سے بدھو گھر کو آئے

رام لبھایا سوز

سونے کی تھالی

قدیم زمانے کی بات ہے کہ بنارس میں ایک بہت بڑا مندر تھا۔ جہاں بہت سے لوگ روزانہ عبادت کے لئے آیا کرتے تھے۔ ایک صبح کا ذکر ہے کہ وہاں کے پجاریوں کو مندر کے صحن میں ایک خالص سونے کی تھالی ملی۔ جس کے اوپر مندرجہ ذیل عبارت کندہ تھی۔

" یہ اُسے دی جائے جو مخلوق کا سچا ہمدرد ہے "

پجاریوں نے فوراً سمجھ لیا کہ یہ پرماتما کی طرف سے ایک انعام ہے۔ اس لئے انھوں نے سب لوگوں کو یہ واقعہ سنایا۔ سبھی آدمی سونے کی تھالی کو حاصل کرنے کے لئے مندر میں پہنچ گئے۔ تمام لوگوں نے اپنی ہمدردی اور خلوص کا ثبوت دینے کے لئے پجاریوں کو من گھڑت واقعے سنانے شروع کر دیئے۔ مگر پجاریوں کی نظر میں کوئی ایسا شخص نہ آیا جو اس تھالی کا مستحق ہو سکے۔

ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔ مگر پجاری کسی بھی شخص کا انتخاب نہ کر سکے۔ اچانک ایک دن ایک شخص مندر کے احاطے میں وارد ہوا اور آ کر کہا کہ اُس نے اپنی جائیداد کا بہت بڑا حصہ غریبوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ چنانچہ پجاریوں نے فیصلہ کیا کہ اس شخص کو سونے کی تھالی دے دی جائے۔ اُس شخص نے ہاتھ بڑھا کر جونہی تھالی کو لیا سونے کی تھالی فوراً لوہے کی تھالی میں تبدیل ہو گئی۔ وہ آدمی ڈر کے مارے کانپنے لگا اور تھالی اُس کے ہاتھ سے گر پڑی اور زمین کو چھوتے ہی پھر سونے کی بن گئی۔

پجاری سمجھ گئے کہ اُن کا انتخاب درست نہیں — اس طرح

پجاریوں نے تین بار مختلف آدمیوں کو سونے کی تھالی دی۔ مگر ہر بار وہ لوہے کی تھالی میں تبدیل ہو گئی۔ ایک دن ایک سادہ لوح دہقان مندر میں آیا۔ اُسے اس عجیب و غریب انعام کا بالکل علم نہ تھا بلکہ وہ تو اس مندر میں عبادت کی غرض سے آیا تھا۔ جونہی وہ مندر کے دروازے پر پہنچا۔ اُس نے دیکھا کہ مندر کے باہر بہت سے لولے لنگڑے اور اندھے خیرات مانگ رہے ہیں۔ اُس کا دل انسانی ہمدردی کا منبع تھا۔ اُس نے ایک اندھے کا ہاتھ پکڑا اور بولا۔

" اے بھائی اس مصیبت کو صبر کے ساتھ جھیلو۔ پرماتما بڑا اچھا ہے۔ تمہارے دُکھ کا ضرور خاتمہ ہوگا۔"

اور تب وہ دہقان مندر میں داخل ہوگیا۔ اُس نے دیکھا کہ مندر میں بہت سے لوگ اپنے اچھے کارناموں کا ذکر پجاریوں سے کر رہے ہیں۔ ایک نظر شناس پجاری کی نگاہ اس دہقان پہ پڑی اور اُسے ایسا معلوم ہُوا کہ اس سونے کی تھالی کا یہی حقدار ہے چنانچہ اُس نے دہقان کو اپنے پاس بُلایا اور تھالی اُس کی طرف بڑھائی۔ دہقان کچھ سمجھ نہ سکا۔ مگر اُس نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اور تھالی لے لی۔ جونہی تھالی اُس نے پکڑی۔ تھالی کی چمک پہلے سے تیس گنا ہوگئی۔ ہر طرف واہ واہ کی صدا بلند ہوئی۔ پجاریوں کے چہرے پر مسرت کی لہریں دوڑ گئیں۔ کیونکہ انھوں نے تھالی کو اُس کے اصلی

حقدار کے حوالے کردیا تھا۔

مندر کے پجاریوں نے دہقان کو بتایا کہ یہ تحفہ اُس کے لئے پرماتما کی طرف سے ہے۔ کیونکہ اُس کا دل ہمدردی اور محبت سے معمور ہے۔

تمام لوگوں نے اس سے سبق حاصل کیا اور بغیر کسی انعام کی اُمید کئے اچھے کام کرنے شروع کردیئے۔

حامد اللہ افسر

ندّی کا سفر

ندیا! دھیرے دھیرے چلنا

نیّا میری ڈوب نہ جائے

جنگل بن سے ہو کے نکلنا

چھاؤں کا چھپر سا چھائے

چھوڑ دے یہ رہ رہ کے مچلنا

ڈر کے مارے جی گھبرائے

اِتنی دُور ابھی ہے چلنا

کوئی ڈھونڈے بھی تو نہ پائے

Printed at the United Press, Delhi and published by the Director, Publications Division, Ministry of Information & Broadcasting, Govt. of India, Old Secretariat, Delhi.

Regd. No. D.—21

آجکل

جنوری ۱۹۵۳ء

آٹھ آنے

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- بال مکند عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد

جلد ۱۱ ——— نمبر ۶

سالانہ چندہ —— { ہندوستان میں - چھ روپے
پاکستان میں - چھ روپے }
غیر ممالک سے —— نو شلنگ یا ایک ڈالر
فی پرچہ —— { ہندوستان میں - آٹھ آنے
پاکستان میں - آٹھ آنے }

جنوری سنہ ۱۹۵۳ء

ترتیب

پبلیکیشنز ڈویژن - پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

شمیم کرہانی

اہنسا

طویل رزمیہ نظم "تلاشِ سحر" کا ایک ٹکڑا

اہنسا عمل کا وہ محکم پیام
منظّم معیشت کا جس سے نظام

اہنسا بکفِ گل، بدامن بہار
اہنسا چمن بندِ بلبل و نہار

اہنسا تشدد کا وہ عزم پاک
کہ جس کی حرارت سے طوفاں ہلاک

اہنسا وہ احساسِ روحِ غیور
جو فاقوں میں رکھتا ہے محوِ سرور

اہنسا وہ روشن صداقت کا چاند
چمک جس سے جھوٹے چراغوں کی ماند

اہنسا وہ ضبطِ غضب کا شعور
جو کرتا ہے انساں کو شعلے سے نور

اہنسا وہ معراجِ حق آگہی
جہاں نقشِ باطل ہے شاہنشہی

اہنسا مربّی، اہنسا شفیق
اہنسا مسافر کی یار و رفیق

اہنسا وہ سیراب کُن آبجو
جو صحرا کو بخشے مذاقِ نمو

اہنسا وہ تمکینِ اہلِ نیاز
کرے خاکساروں کو جو سرفراز

اہنسا وہ ضبطِ خودی کی لگن
کرے جو کبوتر کو شاہیں شکن

اہنسا وہ دیوارِ فانوس کی
محافظ ہے جو شمعِ ناموس کی

اہنسا محبّت کے سینے کی آگ
اہنسا حیا کی دُلھن کا سہاگ

اہنسا عزیمت کی تلوار ہے
اہنسا نہتوں کا ہتھیار ہے

اہنسا عمل کا وہ احساسِ تیز — رہا ہے کشت زاروں میں جو تخم ریز
اہنسا کے ماتھے پہ دیکھی جو دھوپ — تو رحمت نے دھارا سحابوں کا روپ
اہنسا وہ دُھن عزمِ بیتاب کی — زمیں جس نے سرسبز و شاداب کی
اہنسا کرے جو تشدّد کو رام — جو بجلی سے لے آبیاری کا کام
اہنسا کے ماتھے کا خونیں عرق — زمیں کو بناتا ہے زرّیں ورق
اہنسا کہ جو دھوپ میں دُکھ بھرے — تو بنجر کی مٹّی کو سونا کرے
اہنسا وہ تسکین جمہور کی — جو تعبیر ہے خوابِ مزدُور کی
اہنسا سے صورت پذیر ہے خاک — اہنسا سے گردش میں ہے گل گر کا چاک
اہنسا نے بن میں کھلائے ہیں گُل — اہنسا نے دریا پہ باندھے ہیں پُل
اہنسا وہ مزدُور کے دل کا دُود — جو دیتا ہے صنعت کو رفتِ وجود
اہنسا وہ چرخے کا آہنگِ مست — مشینی تکبّر کو دے جو شکست
اہنسا نے تردیدِ آلات کی — مشینوں نے اشیا کی بہتات کی
اُن اشیا نے آگے بڑھایا قدم — کشادہ کیا جارحانہ عَلَم
بڑھی چار سُو لاگ بیوپار کی — ضرورت ہوئی تازہ بازار کی
ہوس ملک گیری کی بڑھنے لگی — نئی سان تیغوں پہ چڑھنے لگی
بنا ڈالے ہنسا نے ایٹم کے بم — کہ چھا جائیں بازارِ عالم پہ ہم
بموں سے ہوا زہر بو نے لگی — زمیں تخت و تاراج ہونے لگی
شرر بن کے اُڑنے لگے رنگ و بُو — اہنسا کی آنکھوں سے ٹپکا لہو
اہنسا مدارائے جنگ و فراق — اہنسا علاجِ فساد و نفاق
اہنسا ہے تفسیرِ لاتخزنُو — اہنسا ہے تشریحِ لاتفسدُو
اہنسا ہے اک لحنِ مردانِ صف — اہنسا ہے اک نعرۂ لاتخف

اہنسا ہے احساسِ غیرت کا نام — اہنسا ہے آپ اپنی عزت کا نام
اہنسا ہے قندیلِ عرفانِ دل — اہنسا ہے شمعِ شبستانِ دل
اہنسا خرد کے ہمالہ کا اوج — اہنسا خودی کے سمندر کی موج
اہنسا دوامی، اہنسا قدیم — اہنسا پیامِ رحیم و کریم
اہنسا کہیں سوزِ مقصود کو — کہ گل کر دے جو نارِ نمرود کو
اہنسا کی ہمت وہ ضربِ کلیم — جو کج رو کو بخشے رہِ مستقیم
اہنسا وہ محبوس سیتا کی لاج — جو راون کی نگری کو دے رام راج
اہنسا حصولِ رضائے حبیب — اہنسا تمنائے دار و صلیب
اہنسا وہ جرأت کی بے باک لہر — کہ سقراط ہنس ہنس کے پیتا ہے زہر
اہنسا ہے انساں کی خیر خواہ — پیمبرؐ کا اندازِ ہجرت گواہ
اہنسا وہ مردِ خدا کی حیات — لڑے تشنہ لب جو کنارِ فرات
اہنسا محبت کا آئین ہے — اہنسا وفادار کا دین ہے
اہنسا کے آگے بہ ہنگامِ جنگ — گلوں سے ملائم ہیں تیر و تفنگ
پہاڑوں کو جنبش ہو کانپے زمیں — اہنسا کے قدموں کو جنبش نہیں
اہنسا نے بے تیغ و گرز و کمند — کیا کامرانی کا پرچم بلند
اہنسا نے بے جور و ظلم و ستم — دیا ہند کے سر کو تاجِ حشم
اہنسا نے بے ضرب و زخم و گزند — کٹے پارہ پارہ غلامی کے بند
اہنسا کی محفل میں مسند نہ تخت — نہ قاقم کے پردے نہ ریشم کے رخت
اہنسا محل ہے نہ باغِ ارم — شہادت میں "شیوگاؤں" کا آشرم

اور اس آشرم کا وہ مردِ فقیر
حق آگاہ و دانا و روشن ضمیر

جمیل مہدی

حسرت اور تہذیبِ عاشقی

تُو نے حسرت کی عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی
تجھ سے پہلے اعتبارِ شانِ رُسوائی نہ تھا

اُردو غزل گوئی کی خاطر حسرت موہانی کے ایثار و محنت کی قدر و قیمت اور "غزل" کی نشاۃ الثانیہ میں اُن کی خدمت اور مقام کا تعین دراصل بڑا مشکل اور دقّت طلب کام ہے۔ جہاں تک اُن کی مجرّد شاعری کے سوال کا تعلق ہے اس نے غزل کے علاوہ اور کسی دوسری صنف کو قابلِ توجہّ نہیں سمجھا۔ وہ خود بھی اور دوسرے خالص غزل گو شعراء کی طرح غزل کے علاوہ اور دوسری اصنافِ شاعری کو "اچھوت" سمجھتے رہے۔

غزل میں بھی حسرت کی شمولیت کے باوجود اس زمانے میں کسی وسعت یا امکان کا اضافہ نہیں ہُوا۔ اُن کی ذات کی وجہ سے اس کے اندر کسی مزید کیفیت اور ترقی نے جنم نہیں لیا۔ اُن کی شاعری پر بھی جُرأت، مومن، مصحفی، میر اور قائم وغیرہ کی چھاپ واضح طور پہ دکھائی دیتی ہے۔ گو مجنوں گورکھپوری کے خیال میں "یہ سایہ دُور سے پڑتا ہے" اور مولانا نیاز فتحپوری کے بقول قریب سے، بلکہ "انھیں کے الفاظ میں حسرت اور مصحفی کا تقابل کیا جائے تو ہم یقیناً مصحفی کو بہتر شاعر قرار دیں گے"۔ اس کے باوجود حسرت کی شخصیت اگر تاریخِ ادبِ اُردو سے نکال دی جائے تو جو خلاء پیدا ہوتا ہے وہ آسانی سے نہیں بھر سکتا۔

حسرت کی تمام تر شاعری عشقیہ شاعری ہے، خواہ وہ خود اُس کی حدیں "عارفانہ" اور "ناصحانہ" حد تک وسیع کر دیں وہ بہرحال عاشقانہ ہی رہے گی۔ اس میں اسلوب اور ٹیکنیک کے اعتبار سے کوئی بھی نئی بات نہیں لیکن اس کے باوجود اس میں کوئی ایسی خصوصیت ضرور ہے جس نے انھیں ناقابلِ فراموش بنا دیا ہے۔

حسرت موہانی وہ آخری انعام ہے جو انیسویں صدی نے رخصت ہوتے ہوئے اُردو شاعری کو اپنی خصوصیات کے ساتھ بخشا، اُن کی خدمات، اُن کی شاعری اور اُن کا ذہنی تار و پود سب کا سب پُرانے رشتوں میں مربوط نظر آتا ہے۔ انھوں نے اُردو غزل کو پیدا نہیں کیا اُس کی ہمدردانہ عیادت کی ہے، انھوں نے گیسوئے اُردو کو جو اقبال کے وقت تک "منّت پذیرِ شانہ" تھی اپنی ہمّت اور حوصلے کے مطابق سنوارا اور خوبصورت بنایا ہے۔ انھوں نے "غزل" کی دلکشی کو اُجاگر اور اُس کے خوبصورت چہرے پر پڑے ہوئے میل اور کیچڑ کو صاف کیا ہے۔ اُن کی شاعری ایک سوچے اور سمجھے ہوئے فیصلے کا اظہار ہے۔ یہ فیصلہ انھوں نے غزل کی نامقبولیت اور اس میں شہدے پن کے جذبات داخل ہو جانے کے پیشِ نظر بڑے آڑے اور اہم وقت پر کیا تھا۔ اسی فیصلے کا اظہار ایک طرف تو اردوئے معلیٰ کی صورت میں ہُوا اور دوسری طرف حسرت کی شاعری کی شکل میں۔ مقصد دونوں کا ایک تھا اور وہ یہ کہ "بگڑے مزاج اور بھٹکے ہوئے مذاق کی اصلاح کی جائے"۔ ایک طرف تو انھوں نے نہ معلوم کتنے نیک نام اور گمنام غزل گو شعراء کے دیوان صحت اور اہتمام کے ساتھ بڑی محنت اور جان کاہی کے بعد شائع کئے غزل کا ایک معیار اور حدّ مقرر کی، اس معیار کو اپنانے کی دعوت دی۔ دوسری طرف انھوں نے اپنی "غزل" کو ثبوت اور مثال بنایا۔ اس میں جو پھیکاپن، بدمزگی اور لاش کی سردی داخل ہو گئی ہے اسے دُور کر کے سرشاری، تازگی اور حرارت سے ہمکنار کیا۔ اس میں اپنے "تجربہ" اور "واردات" دونوں کو شخصی طور پہ پیش کیا۔ اُن کی شاعری میں اُن کی شخصیت اور جذبے کی انفرادیت اتنی رسی اور بسی ہوئی ہے کہ وہ شروع سے آخر تک ایک خاص قسم کے عشق اور اس عشق کا ایک "منفرد ردِّ عمل" معلوم ہوتی ہے۔

اُن کی اس شاعری میں "جسمانی اہتزاز" اور "کارمردانہ" کا امتزاج ہے کُھل کھیلنے اور دیوانہ ہو جانے کی تمنّائیں ہیں، وہ عام عشقیہ جذبہ ہے جو ہر عاشق کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن اُن کے عشق کا عرصہ، اُس کے طور طریق اُس کی فضا اور اُس کی چہل پہل، گھر، بالاخانے اور محفل کے بجائے گھر کے کمرے

اور صحن میں منتقل ہو گئی ہے، اُن کی شاعری میں عشق کی گھاتوں اور "اظہار" کی ماردھاڑوں کے لئے بزم اور محفل کی جگہ "تقریب" اور "تیوہار" مواقع بنتے ہیں۔ بس یہی "انقلاب" برپا کرنے کے لئے وہ آسمان سے اُترے تھے، یہ نسبتاً مہذب اور شریفانہ فضا جو حسرت نے تخلیق کی اُردو شاعری کا تقاضا تھی۔ اس وقت اگر یہ تقاضا پورا نہ ہوتا تو حالی کے الفاظ میں "شاعر جہنم کو بھرتے" یا نہ بھرتے اُردو غزل جہنم رسید ضرور ہو جاتی۔

حسرت کے یہاں یہ فضا اُن کے ہمہ گیر مطالعے اور غزل کو پرکھنے کے مذاق کے علاوہ خود اُن کی حسن کارانہ صلاحیتوں کی بنا پر بھی پیدا ہوئی۔ یہ فضا اِن سے بہت پہلے بھی کچھ دنوں کے لئے اپنی جھلک دکھاتی ہے۔ لیکن حسرت کے یہاں اس میں ایک نئی طرح کا ولولہ، ایک نو دریافت مسرت اور سرشاری کا ادراک محض اس وجہ سے ہے کہ وہ اپنے زمانے کے دو مشہور غزل گو شعراء امیرؔ اور داغؔ کے مقابلے میں گھر کی چیز معلوم ہوتی ہے۔

داغؔ، امیرؔ، مضطرؔ خیرآبادی، ریاضؔ اور کسی حد تک شادؔ عظیم آبادی وہ شاعر ہیں جن کا حسرت کے زمانہ میں طوطی بول رہا تھا۔ ان میں شادؔ کو چھوڑ کر باقی شاعروں نے غزل کی جو فضا اور معیار قائم کیا تھا اور اپنے زمانہ کے شاعرانہ مذاق کی جس تربیت میں حصہ لیا تھا وہ چٹخاروں، لذت کوشی اور سستی جذباتیت سے بھرپور تھا۔ اس میں تمناؤں، ارمانوں، آرزوؤں اور ولولوں سے شاعروں تک سب برہنہ نظر آتے تھے یہ برہنگی اور عریانی جس کا ردِ عمل حسرت کی شاعری میں شروع ہوا اپنی جگہ زیادہ دل کش، مہذب اور پاکیزہ تھی اِس لئے عوام و خواص کی نگاہیں اس کی جانب اُٹھ گئیں۔

نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے
پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

ہونا جو ہے وہ ہوگا شبِ وصل میں مزہ
ہوگا حضور آپ کی شرم و حیا سے کیا

باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی
بھیجنا ہیں ایک کمسن کے لئے

کوئی مُنہ چوم لے گا اس نہیں پر
شکن رہ جائے گی یونہی جبیں پر

انشا مُے رازِ عشق میں گو ذلتیں ہوئیں
لیکن اُسے جتا تو دیا جان تو گیا

اور کمسنی کھیل رہی ہے ابھی کیا رکھا ہے
آسرا آسرے والوں نے لگا رکھا ہے

جیسے اشعار کے مقابلے میں جب حسرت کی محتاط، مہذب اور جذباتی کسک سے بھرپور یہ آواز گونجی۔

معلوم سب ہے پوچھتے ہو پھر بھی مدعا
اب تم سے دل کی بات کہیں کیا زباں سے ہم

دل میں کیا کیا ہوسِ دید بڑھائی نہ گئی
رُوبرو اُن کے مگر آنکھ اُٹھائی نہ گئی

آج سن کر میرے نالوں کو براہِ التفات
زیرِ لب اُس نے بھی کھینچی ایک آہِ التفات

اُمید نہیں اُن سے ملاقات کی ہر چند
آنکھوں سے مگر شوقِ تماشا نہیں جاتا

شوق جب حد سے گذر جائے تو ہوتا ہے یہی
ورنہ ہم اور کرمِ یار کی پروا نہ کریں

تاثیرِ برقِ حسن جو اُن کے سخن میں تھی
اک لرزشِ خفی مرے سارے بدن میں تھی

تو اُس زمانے کی غیر محتاط، عامیانہ اور مبتذل شاعری جس میں ہوسناکی، بے راہی، دھمک اور زلزلہ پوشیدہ تھا یکایک چونک اُٹھی اور اس بھرپور، پرسکون اور رواں نغمے کی طرف اُس کے کان بے اختیار لگ گئے جو کلاسیکل ادب کے سیکڑوں سالہ تجرباتی نچوڑ کو ساتھ لئے اسکول اور جماعت کے فرق سے علیحدہ ہو کر بلند ہو رہا تھا۔

ہرچند اس شاعری میں کوئی نئی بات نہیں تھی، کوئی نیا جذبہ نہ تھا، کوئی نیا پیغام نہ تھا لیکن اس کے اندر ایک ایسا ٹھہراؤ، ایسی دل کشی، پاکیزگی اور لب و لہجے میں ایسی باضابطہ احتیاط تھی جس نے غزل کی طرف سے اس نفرت اور بدگمانی کو بہت حد تک کم کر دیا جو کچھ تو حالیؔ کی سرتوڑ مخالفت اور کچھ اُردو غزل کے بے جان اور نڈھال ہو جانے کے بعد نوجوان نسل میں تیزی کے ساتھ پھیل رہی تھی۔ انہوں نے "غزل" میں جو کاٹ چھانٹ کی، جو تراش خراش اور سلیقگیٔ داخل کی اس کا تعلق جذبات اور جذبے کی نوعیت بدل دینے سے ہے، انھوں نے جذبات کے اس بہاؤ پر پابندی عائد کی جو اخلاق اور جائز و ناجائز کی تفریق کو پس پشت ڈال کر جہاں تہاں پھوٹ بہا تھا۔ اس سیلاب کے آگے اخلاقی قدروں کی کوئی اہمیت نہ تھی نہ اجتماعی اور سماجی ممنوعات کی۔ ویسے اگر حسرتؔ کی شاعری کو الگ نکال کر دیکھا اور پرکھا جائے تو اُن کی شاعری پر وقت اور زمانے کی پرچھائیاں تک دکھائی نہیں دیتیں۔ سیاست اور اجتماعی محرکات سے تو انھوں نے خود کو قصداً علیحدہ رکھا تھا۔ وہ چھان پھٹک کر ایسے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں جنہیں سیاسی مجاز "ذو معنی" بھی نہیں کہا جا سکتا۔ انھوں نے خود مجھ سے اپنے مشہور ترین شعر

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
کیا طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

کے متعلق یہ کہا تھا کہ "اصل مصرعہ میں نے یوں کہا تھا

رمضان کے روزے بھی چکی کی مشقت بھی

لیکن بعد میں اس کو بدل لیا۔" ان کی کلیات میں سے اگر تلک، گاندھی، مانٹیگو بینٹ، سوتیت، اشتراکیت، ڈاکٹر انصاری اور ابو الکلام وغیرہ نام جو عہدِ حاضر کی طرف اشارہ کرتے ہیں نکال دئے جائیں تو انھیں کسی بھی پُرانے دَور کے شاعر کے ساتھ ملا کر پڑھا جا سکتا ہے۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ اگر اُن کی شاعری کو اس دَور میں شامل کر کے پڑھا جائے جو داغ اور امیر سے پہلے تھا تو داغ اور امیر کا دَور ان کے بعد کا دور معلوم ہونے لگتا ہے۔ "یہ چیزیں حسرت نے کانٹ چھانٹ کر کے کم کیں۔ جذبات کے اس دھارے پر اُنھوں نے بندھ لگایا۔" اگر یہ بات ایک ناظر کے ذہن نشین نہ ہو تو اس دَور کے ساتھ ملا کر پڑھنے میں داغ اور امیر "اس کو بڑھانے اور وسیع کرنے والے" معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی محتاط شوخی، معاملات اور واردات کا اظہار، عشق کا شدید جاؤ انھیں مومن، جرأت اور مصحفی سے الگ ہی نہیں ہونے دیتا۔ ایک زبان و بیان کا نازک سا فرق ہے جو حسرت اور ان پچھلے شاعروں کے درمیان حدِّ فاصل کا کام دیتا ہے۔

ان کی شاعری اس سستی لذتیت کو محدود کرتی ہے جو وبائی امراض کی مانند بڑھتی جا رہی تھی، اس جیخ پکار کو مدھم کرتی ہے جو "جستے دارد" تک پہونچ چکی تھی۔ مخاطبت کی اس بے حجابی کو کم کرتی ہے جو عاشق و معشوق کے درمیان ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی۔ انھوں نے دوپٹہ، لباس، شرم اور جسم کا ذکر بڑی خوشگوار سنجیدگی اور عشقیہ ہیجان کا ذکر بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ کیا ہے۔ ان کے یہاں

پھر شام ہی سے کیوں ڈ چلے تھے چھڑا کے ہاتھ ___ دُکھتی رہی جو اُن کی کلائی تمام شب

گھر سے ہر وقت نکل آتے ہو کھولے ہوئے بال ___ شام دیکھو نہ مری جان سویرا دیکھو

سامنے سب کے مناسب نہیں ہم پر یہ عتاب ___ سر سے ڈھل جائے نہ غصّے میں دوپٹہ دیکھو

مرے دعویٔ بے نیازی کو سُن کر ___ ہنسے وہ کہ "پھر التجا کیجئے گا"

وہ شرمائے بیٹھے ہیں گردن جھکائے ___ غضب ہو گیا اک نظر دیکھ لینا

وہ کیوں بگڑے مرے شورِ فغاں سے ___ شکایت اُن سے تھی یا آسماں سے

اندھیرے میں وہ آ پیٹے تھے پہلے کس کے دھوکے میں ___ کہ جب آخر مجھے دیکھا تو شرما کے کہا تم ہو

جیسے "داغ مارکہ" اشعار محض زمانے کی "پسند" کے پیشِ نظر ہی دکھائی دیتے ہیں۔ اگر وہ کلیتاً اپنے آپ کو اس رنگِ سخن سے علیحدہ کر کے خود اپنے شخصی عشق کا اظہار ہی کافی سمجھنے لگتے تو انھیں بڑے سنگین خطرے سے دوچار ہونا پڑتا جو اس زمانے میں انھیں مردود اور متعود تک بنا سکتا تھا۔

خود اُن کے یہاں، اُن کی حسبِ پسند جب یہ تمام موضوع نظم ہوئے ہیں تو اُن کی شان اور دلربائی ہی دوسری ہو جاتی۔ اور اُن کے یہ اشعار ایک جیتے جاگتے اور سانس لیتے ہوئے عشق کا مظہر اور جوان دھڑکنوں کے درمیان لرزتے ہوئے دل کی بازگشت بن جاتے ہیں۔ اُن کے پڑھنے سے کچھ ایسے سیدھے سچّے اور واقعاتی مناظر نظروں کے سامنے اُجاگر ہوتے ہیں کہ ایک عام ناظر بھی اُن کی تاثیر اور دل کشی کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

وہ بے نقاب ہوئے بھی تو کیا ہوا کہ ہے ___ ہجومِ حسن کے پردے نقاب کے بدلے

ہم سے ہر چند وہ ظاہر میں خفا ہیں لیکن ___ کوششِ پرسشِ حالات چلی جاتی ہے

بے تابیوں سے چھپ نہ سکا ماجرائے دل ___ آخر حضورِ یار بھی مذکور کر دیا

مجھے گرمِ نظارہ دیکھا تو ہنس کر ___ وہ بولے کہ اس کی اجازت نہیں ہے

دیکھنا بھی تو انھیں دُور سے دیکھا کرنا ___ شیوۂ عشق نہیں حسن کو رُسوا کرنا

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا ___ کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنّا کر دیا

مجبوریٔ سوال سے اس چشمِ ناز میں ___ منظوریوں کا رنگ عیاں ہے حیا کے بعد

آہ کتنا وہ ترا پاکے مجھے گرمِ نظر ___ ایسی باتوں سے نہ ہو جاؤں میں بدنام کہیں

اے عشق کی بے تابی کیا وہ تری خواہش تھی ___ جس پر انھیں غصّہ ہے انکار بھی حیرت بھی

بزمِ اغیار میں ہر چند وہ بے گانہ رہے ___ ہاتھ چپکے سے مگر میرا دبا کر چھوڑا

ایسی ہی قسم کے اشعار ہیں جن کے پیشِ نظر اُن کی شاعری کو "بنتِ عم" سے متعلق کیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کے اشعار کی گہری واقعیت اور براہِ راست تاثر کسی نہ کسی حقیقت کو اس پردۂ زنگاری میں دیکھنے کی تمنّا پر اُکساتے ہیں۔ یہ اشعار جس قسم کی ساعتوں کو، جتنے جذباتی لمس کو اور جس طرب ناک ماحول کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں۔ ان پر جس قسم کے ضبط اور کوشش کی پرچھائیاں محسوس ہوتی ہیں وہ اُن کے اس عشق کی غمّاز ہیں جس میں انھوں نے اپنی وضع کو "پارسا" اور اس عشق کو "پاکباز" بتایا ہے۔

دیارِ شوق میں برپا ہے اب تک اے حسرت ___ وہ وضعِ پارسا اس کی وہ عشقِ پاکباز اس کا

اگر اس عشق کو پاکباز اور اس وضع کو پارسا مان بھی لیا جائے تب بھی اُن کی طبیعت کی شوخی اور اُن کی حسن پرست فطرت اور ہر جائی قسم کے عشق سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے اس نجی عشق کو پاکباز رکھ کر دوسری جگہ "سیرابی" حاصل کی ہو۔ ان کی پوری شاعری میں کئی قسم کی آہٹیں ہیں۔ کئی قسم کے

تنفّس اس میں سنائی دیتے ہیں۔ اس میں عشقِ پاکبازانہ کے ساتھ "ہوس" اور "حسن پرستی" کا ذکر بھی کھلے بندوں پایا جاتا ہے۔ ان کی تمام تر شاعری

کچھ فائدہ حسرت نہ ہوا ضبطِ ہوس کا — پوشیدہ محبت نہ رہی سوزشِ بشر کی

تفسیر ہی نہیں اس میں ایک آدھ افسانہ ایسا بھی ہے جس پر انھیں خود کو جھلاوے بھی دینا پڑتے ہیں۔

کیا حسن پرستی بھی کوئی جرم ہے حسرت — ہو نہ وہ جو اخلاق کی تنقید کڑی ہے۔ اور

باوجود ادعائے اتقاء حسرت مجھے — آج تک عہدِ ہوس کا وہ فسانہ یاد ہے

جہاں تک اُن کی خوش مذاقی اور حسن پرست فطرت کا تعلق ہے تو وہ ۶۲ سال کی اس عمر میں جبکہ عام طور پر دل اور اُس کے جذبات میں ٹھہراؤ اور سکون پیدا ہوجاتا ہے۔ "ہیرا پھیری" سے باز نہیں رہے۔ بیگم حسرت کے انتقال کے بعد اُن کی کلیات میں تھوڑی دور تک افسردگی، گھبراہٹ اور ایسے پرسوز المناک جذبات کے ساتھ اُن کی جدائی کا احساس ملتا ہے۔

غیر ممکن ہے ترے بعد ہوس — دل کسی اور سے لگانے کی

اب نہ دل ہے نہ ذخیرۂ شوق — توڑ دوں کنجیاں خزانے کی

بعد اب اُن کے کیا ہوئی حسرت — دلفریبی ترے فسانے کی — اور

عاشقی کا حوصلہ بے کار ہے تیرے بغیر — آرزو کی زندگی دشوار ہے تیرے بغیر

کاروبارِ عاشقی کی وہ تن آسانی کہاں — دل پہ ذوقِ شاعری اک بار ہے تیرے بغیر

لیکن اپنی حسن پرست طبیعت کی بدولت تھوڑے ہی دنوں بعد وہ پھر کاروبارِ عاشقی میں مشغول ہوجاتے ہیں اور "قرض کی پینی" کی زلفِ گرہ گیر کے گرفتار

لاریب کہ اس حسنِ ستمگار کی شوخی — موجب ہے مرے زہد کی رسوائی نظری کا

ساتھ اس کے جو ہم آئے تھے بیروت سے حسرت — یہ روگ نتیجہ ہے اسی ہمسفری کا

اور

ہم رات کو اٹلی کے حسینوں کی کہانی — سنتے رہے رنگینیٔ "زوبا" کی زبانی

ہونٹوں کے قریب آئی جو وہ زلفِ معنبر — جھٹ چوم لیا ہم نے طبیعت ہی تو مانی

بہرحال حسرت کی غزل کا یہ رنگ، اُن کی شخصیت میں رچا ہوا یہ لب و لہجہ محتاط شوخی اور سوچے سمجھے ہوئے معیار کو پیش کرنے کا فیصلہ اُردو شاعری پر بہت جلد چھا گیا اور اُردو غزل جو صدیوں کی مسافت طے کرنے کے بعد شاید تکان اور کمزوری کے باعث ہانپ رہی تھی نیا خون اور نیا سہارا پا کر آگے بڑھنے لگی۔ جہاں تک حسرت کی ہمت اور پہونچ کا تعلق تھا وہ اس کے ساتھ رہے۔ اس کے ساتھ نباہتے گئے۔ لیکن جب نئے موڑ پر اُردو غزل جگر، فراق، فانی، یگانہ، سیماب، جوش اور دوسرے تازہ دم اور پُرجوش نوجوانوں کے قافلے سے دوچار ہوئی تو حسرت کا کام ختم ہوگیا اور وہ اپنی ریاضت سے کمائی ہوئی میراث کو ان لوگوں کے سپرد کرکے علیحدہ ہوگئے۔ ویسے آخیر وقت تک اُن کی شاعری کی تکوین لہجے اور جذبات کی یکسانیت میں خلل نہیں پڑا۔ لیکن انھوں نے ان نئی تبدیلیوں سے سمجھوتہ کرنا گوارا نہیں کیا جو بڑی تیزی کے ساتھ غزل میں ان نوجوان شعراء کے ہاتھوں پیدا ہو رہی تھیں۔ وہ سمجھوتہ کرنے کے سخت مخالف تھے۔ اُن کی شاعری سے لے کر زندگی تک ایک ہی اٹل فیصلہ کے محور پر گھومتی نظر آتی ہے۔

حسرت کے تقریباً سبھی پڑھنے والوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اُن کے کلام میں گرمی حقیقت اور ذاتی جذبات کا سہارا اُن کی شاعری کے نصفِ اوّل پر ہی دم توڑ دیتا ہے اس کے بعد اُن کی شاعری روایت، مشغلہ، خانہ پُری اور قافیہ پیمائی تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ کئی آدمیوں نے تو ان کی اس شاعری کو "تبرک" اور مشاعروں کی "وا" کہنے پر اکتفا کیا ہے اور کئی آدمیوں نے اُن کے اس ضعف اور اضمحلال پر حیرت زدگی کا اظہار ذرا کھل کر کیا ہے۔

اُن کی اس "شاعری" کے ضعف اور اضمحلال کا باعث خود اُن کی ذات نہیں ہے، زمانے کی تبدیلیاں اور شعور کی ترقی ہے۔ ہر زمانے کے لحاظ سے واقعات اور تحریکات کی قدر و قیمت متعین ہوتی ہے۔ اُن کی شاعری میں کوئی نئی بات اور کوئی نیا تجربہ تو شاید کبھی بھی نہیں تھا۔ انھوں نے سب سے بڑا کام یہی کیا تھا کہ وقت کی آواز سے اپنی آواز کو الگ کر لیا۔ لیکن وہ زمانے کا ساتھ بہت دور تک نہیں دے سکے۔ غزل کا ساتھ انھوں نے آخر وقت تک دیا ہے، مرتے مرتے بھی وہ غزل کہتے رہے۔ لیکن غزل کی تکوین، اُس کے دائرے، اُس کے شعور اور لب و لہجے میں جو تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ انھوں نے اُن میں سے کسی کو قبول نہیں کیا۔

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد — جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

ملتے ہیں اس ادا سے کہ گویا خفا نہیں — کیا آپ کی نگاہ سے میں آشنا نہیں

سب غلط کہتے تھے لطفِ یار کو وجہِ سکوں — دردِ دل اُس نے تو حسرت اور دونا کر دیا

یاد کر وہ دن کہ تیرا کوئی سودائی نہ تھا — باوجودِ حسن تو آگاہِ رعنائی نہ تھا

اس درجہ دل پذیر ہے آہنگِ نغمہ کیوں — پنہاں لباسِ در میں تری صدا ہے کیا

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام — دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

بدلِ لذّتِ آزار کہاں سے لاؤں
اب تجھے اے ستمِ یار کہاں سے لاؤں

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

وغیرہ کے مقابلے میں وقت کا ترقی یافتہ شعور جو عشقیہ اشعار پیش کر رہا تھا وہ یہ تھے وہ کریں بھی تو کن الفاظ میں قسمت کا گلہ
جن کو تیری نگہِ لطف نے برباد کیا

مرا ذوق بھی مرا شوق بھی ہے بلند سطحِ عوام سے
ترا ہجر بھی ترا وصل بھی مرے دردِ دل کی دوا نہیں

اللہ رے اس گلشنِ ایجاد کا عالم
جو صید کا عالم وہی صیاد کا عالم

دیوانہ وار دوڑ کے کوئی لپٹ نہ جائے
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا نہ کیجئے

پیامِ زیرِ لب ایسا کہ کچھ سُنا نہ گیا
اشارہ پاتے ہی انگڑائی لی رہا نہ گیا

اس پرسشِ کرم پہ تو آنسو نکل پڑے
کیا تو وہی خلوص سراپا ہے آج بھی

کسی کی بزمِ طرب میں حیات بٹتی تھی
اُمیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی

تھی یوں تو شامِ ہجر مگر پچھلی رات کو
وہ دردِ اُٹھا فراقؔ کہ میں مسکرا دیا

مستقل ہیں عشق کے آداب یہ طے ہو چکا
حُسن کا آئینِ نو کیا ہو یہ سوچا جائے گا

یہ نوبت بھی شریکِ حسن ہو جاتی تو کیا ہوتا
کہ اس کی قدر دیوانے تصوّر بھی غنیمت ہے

اللہ رے اعتمادِ محبت کہ آج بھی
ہر درد کی دوا ہیں وہ اچھا کئے بغیر

ابتدائے زندگی، انتہائے زندگی
آپ کے خیال سے، آپ کے خیال میں

یہی وجہ ہے کہ اُردو غزل جب اپنے نئے لباس، نئی خوبصورتی، خود اعتمادی اور وقار کے ساتھ حسرت کی باوضع اور پارسا شاعری کے مقابل کھڑی ہوئی۔ تو اُن کی شاعری کا رنگ اُترا ہُوا سا معلوم ہونے لگا۔

ان کی کلیات کے پورے مطالعہ کے بعد یہ بات قطعی طور پر ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ وہ ذہنی طور پر غزل کی آگے بڑھتی ہوئی اور زمانے کے ساتھ ہم آہنگ ہو جانے کی خواہش سے مکمل طور پر آگاہ نہیں تھے۔ حسرت کی شاعری جب شروع ہوئی تو غزل زمانے اور ماحول سے بچھڑ گئی تھی، اس کے بہاؤ اور رفتار میں خلل پڑ گیا تھا۔ اس میں بڑا خطرناک ٹھیراؤ اور عفونت پیدا ہو چکی تھی۔ اس میں چاؤ چونچلوں، ہوس کارانہ لذّت، پست جنسی خواہشات، سستی تفریح اور چٹخارہ لینے کی عادت خس و خاشاک بن کر شامل ہو گئی تھی۔ حسرت نے غزل کی اس بے چارگی کو محسوس کیا۔ اس کی مظلومیت کی داد دی۔ اس کے ساتھ بڑے پیار اور ہمدردی کا برتاؤ کیا۔ انھوں نے اس غزل کو جس میں ایک عام جسم کے سستے جذبات سے ہانپنے کی آواز سما گئی تھی۔ از سرِ نو تر و تازہ اور خوشگوار بنایا۔ اسے ضبط اور سلیقے کا سبق دیا۔ اس کی خواہشوں میں نظم پیدا کیا۔ خود اپنی شاعری کے ذریعے سے انھوں نے ایک ایسے سرمست اور سرشارِ عشق کی تخلیق کی، جو رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں خواہش کے ارتکاب کے بجائے خواہش کے اظہار تک محدود ہے۔

حسرت کی اسی محنت اور چارہ سازی نے غزل میں ہمت پیدا کی، اس میں پر و بال لگائے، اسے ایک نئی طاقت بخشی۔ لیکن جب غزل نے تیزی کے ساتھ زمانے کے تعاقب میں اپنا سفر شروع کیا تو خود حسرت اس کے ساتھ نہیں چل سکے، اس نے خود حسرت کو پیچھے چھوڑ دیا۔ جب حسرت کی کلیات شائع ہوئی تو آج کے اوسط درجے کے طالب علم کا مُنہ بھی حیرت کے ساتھ کھلا رہ گیا کیونکہ اس کی فہرست میں غزل کے ساتھ ٹھمریاں بھی زینتِ قرطاس نظر آتی ہیں۔

یہ پیچھے رہ جانے کی عادت حسرت کی زندگی کے ساتھ ہمیشہ وابستہ رہی انھوں نے اپنی سیاسی زندگی کی ہر نئی کروٹ پر اس کا ثبوت پیش کیا ہے۔ انھوں نے ہر نئی اور اُبھرتی ہوئی تحریک کو اپنے کندھوں کا سہارا دے کر اُٹھایا اور اُس کے پروان چڑھ جانے کے بعد خود اس سے علیحدہ ہو گئے۔ اُن کی شاعری کی عمر بہت طویل نہیں ہے۔ وہ بہت دنوں تک اس دور کے ساتھ نہیں کھپ سکے گی۔ اس کا شمار اور دوسرے کلاسیکل شاعروں کے کلام کے ساتھ کیا جائے گا۔ لیکن انھوں نے اُردو شاعری کے ساتھ جو برتاؤ کیا ہے اس میں جو کاٹ چھانٹ اور تراوش کی ہے اسے عشق کا جو معصوم تصوّر دیا ہے عشق کو کھل کھیلنے اور دیوانہ ہو جانے کے بجائے احترام کرنے کی جو تعلیم دی ہے شاعری میں نئے سرے سے جو حوصلہ اور زندگی پیدا کی ہے۔ بات کرنے کا جو اچھوتا ڈھنگ پیش کیا ہے اس نے حسرت کے نام کو تاریخ میں لافانی قلم سے لکھ دیا ہے جس کی تحریر تاریخ کے صفحات سے کھُرچی اور مٹائی نہیں جا سکتی۔

نصیر الدین ہاشمی

حیدر آباد کی قدیم ادبی محفلیں

حیدر آباد آج سے تقریباً چار سو سال پہلے آباد ہوا تھا اس کی ادبی محفلوں اور علمی صحبتوں کا تذکرہ ضخیم مقالوں میں قلمبند ہو سکتا ہے یہاں ہم مختصر طور پر مختلف دور کا تذکرہ سناتے ہیں ۔

پہلے قطب شاہی دور کی داستان سُنائی جاتی ہے ۔ ہم کو یہ معلوم ہے کہ قطب شاہی بادشاہ خود صاحب علم بھی تھے اور علم و ہنر کے سرپرست اور قدر دان بھی ۔ ان کے دربار نہ صرف شاہی شان و شوکت کے دربار ہوتے تھے بلکہ وہ علم و فن ۔ ادب و شعر کی محفلیں بھی ہوا کرتی تھیں ۔ محمد قلی قطب شاہ نے جہاں شہر حیدر آباد کی آبادی اور چہل پہل کی طرف توجہ کی وہاں علمی رونق کے لیے بھی اس کا زمانہ یادگار رہے ۔ میر محمد مومن استرآبادی ۔ مرزا محمد امین سیبستانی ۔ میرک معین الدین سبزواری کی وجہ سے اکثر علمی اور ادبی محفلیں ہوتی تھیں اور قابل ترین اشخاص اس میں حصہ لیتے تھے ۔

سلطان محمد قلی کا جانشین سلطان محمد جو اس کا داماد اور بھتیجا بھی تھا مکہ مسجد کی تعمیر کی وجہ سے ہمیشہ تاریخ میں زندہ رہے گا ۔ سلطان محمد کو علم و فن سے خاص دلچسپی تھی ۔ اس کا زمانہ ادبی محفلوں اور علمی مجلسوں کے باعث ہی شہرت رکھتا ہے ۔ اس کے فرزند عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں ادبی محفلوں کی جو ترقی ہوئی اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ رات رات بھر خود بادشاہ کی موجودگی میں مشاعرہ ہوتا تھا منگل کے دن جو عام طور سے تعطیل کا دن ہوتا تھا بادشاہ کا مشغلہ صرف یہ تھا کہ شعر و سخن سے لطف اندوز ہوا کرے اور قدما کے کلام پر تنقید اور تبصرہ عمل میں آئے ۔ اس کے زمانہ کے مشاہیر علما میں علامہ ابن خاتون ۔ مولانا حسین آملی اور ملا محمود عبدالحکیم اور علامہ نظام الدین احمد وغیرہ قابلِ ذکر ہیں علامہ ابن خاتون اگرچہ وزیر اعظم کی اہم خدمت پر مامور تھے مگر اس کے ساتھ درس و تدریس تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہتا تھا ان کا دولت خانہ ایک طرف حکومت قطب شاہی کا باب حکومت تھا تو دوسری طرف تصنیف و تالیف درس و تدریس کی وجہ سے دارالترجمہ اور یونیورسٹی بنا ہوا تھا رات دن علمی اور ادبی محفلیں منعقد ہوتی رہتیں ۔ بحث و مباحثہ کا بازار گرم رہتا ۔ نہ صرف عربی فارسی اور دکھنی شاعری پروان چڑھی بلکہ تاریخ، فلسفہ ریاضی اور منطق اور ادب کی کتابیں بھی مرتب ہوتی تھیں ۔ اس موقع پر یہ بھی یاد رہے کہ اس زمانہ میں صرف فارسی اور دکھنی کی سرپرستی نہیں ہوتی تھی بلکہ ساتھ ساتھ تلنگی ادب کی بھی سرپرستی ہوتی رہی ۔ اس دور کے کئی تلنگی شعرا سے ہم واقف ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ تلنگی ادب کا سنہرا دور دراصل قطب شاہی بادشاہوں کا زمانہ ہے ۔

قطب شاہی دور کا ایک امیر امین الملک تھا ۔ اس کا باغ آج بھی سرکاری زچگی خانہ کی صورت میں موجود ہے ۔ اس امیر کا متوسل ایک تلنگی شاعر پونی گنٹی تلنگنا اپنی ایک تلنگی نظم میں لکھتا ہے ۔

> "میرے جسم پر خوشبوئیں لگائی گئیں ۔ ایک نہایت عمدہ کیسری رنگ کی شال کندھوں پر ڈالی گئی ۔ جواہرات کا ایک ڈبہ جس میں کئی لعل تھے مجھے دیا گیا اور اس کے بعد نظم سُنانے کی فرمائش کی گئی" ۔

سلاطین قطب شاہی کے آخری بادشاہ ابوالحسن تاناشاہ کے زمانہ میں بھی علمی صحبتیں، ادبی محفلیں بدستور باقی تھیں ۔ بادشاہ اور امرا کی علمی سرپرستی اور ادبی قدر دانی ہوتی تھی ۔ شعرا اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی ہوا کرتی تھی ۔ ان کے قصر اور ایوان نہ صرف دولت و ثروت کے خزانے تھے بلکہ علم و فن اور شاعری اور ادب کے مرکز بھی بنے ہوئے تھے ۔

قطب شاہی دور کے بعد کچھ عرصہ تک حیدر آباد کی علمی محفلوں

اور ادبی مجلسوں پر اوس پڑ گئی مگر پھر بارھویں صدی ہجری سے علمی چہل پہل اور ادبی رونق دوبالا ہو گئی - ارسطو جاہ - شمس الامراء - مہاراجہ چندو لال کی قدر دانی اور داد دہش سے علمی چمن کی آبیاری ہونے لگی بازار علم پر رونق آگئی اور شعر و سخن کی ایک نئی بستی آباد ہو گئی -

ارسطو جاہ کے دربار سے تقریباً دو سو شعراء وابستہ تھے - ان کے قصائد اور تاریخی قطعات ضخیم مجموعہ کی صورت میں آج تک باقی ہیں اور ادب کا انمول خزانہ ہیں - ارسطو جاہ کا ایوان علامہ ابن خاتون کی طرح ایک طرف حکومت کا باب حکومت بنا ہوا تھا تو دوسری طرف شعراء اور کی وجہ سے بزم شعر و سخن اور محفل ادب بھی ہوتا تھا - شمس الامراء جو جاگیرات پائیگاہ کے امیر اور مغربی زبانوں میں انگریزی اور فرانسیسی سے بھی واقف تھے ایک دار الترجمہ قائم کیا تھا جہاں سائنس کی کتابیں ترجمہ ہوتیں طبع ہوتیں اور ان کی تعلیم ان کے مدرسہ فخریہ میں ہوتی تھی - شمس الامراء کے گرد و پیش شعراء - ادیبوں فلاسفر - مؤرخ اور ریاضی دانوں کا جمگھٹا ہوتا تھا جس میں ہندو مسلم انگریز اور فرانسیسی شامل تھے - مہاراجہ چندو لال کا دربار بعد مغرب لگتا تھا جس میں فارسی اور اردو کے بلند پایہ شعراء جمع ہوتے ایران کے فارسی گو شعراء کے ساتھ شمالی ہند اور دکن کے اردو کے نامور شعراء بھی ہوتے تھے - مشاعرے ہوا کرتے تنقیدیں ہوتیں اور مناظرے ہوتے تھے - مہاراجہ نے شعراء کو بیش قرار ماہوار تنخواہ جاری کی تھی - چنانچہ ہزار ہزار پانچ پانچ سو روپیہ ان کو تنخواہ ملتی تھی -

اس زمانے کے اکثر امیر اور جاگیردار یہ ضروری سمجھتے تھے کہ اگر ایک طرف فوج کے لئے اہل سیف بہادر اور شجیع مرد میدان جمع کئے جائیں تو دوسری طرف علم و فن کی ترقی کے لئے شعراء اور اہل ہند کی سرپرستی ہوتی رہے - ایسے بیسیوں اصحاب کے نام پیش کئے جا سکتے ہیں - مگر یہاں ہم صرف دو نام پیش کرتے ہیں ایک راجہ شیو پرشاد جن کے مداحی قصیدے مجموع المداح میں محمد یوسف خاں صبحی نے جمع کئے ہیں اور دوسرے محمد سبحان خان جن کے رزم اور بزم کے حالات مرزا محسن "محسن" نے اوصاف سبحان خان کے نام سے نظم میں لکھے - اس زمانے کے ایک صاحب فن امیر عبد الولی عزلت کو یہاں فراموش نہیں کیا جا سکتا جو شاعری - موسیقی اور مصوری میں کمال رکھتے اور ان فنون کی تعلیم دیتے تھے - ان کا مکان ہر وقت محفل شعر و سخن بزم طرب و نشاط اور تصویر گاہ بنا رہتا تھا - اور نو اور اس زمانہ کی مشہور ڈیرہ دار طوائف ماہ لقا بائی چندا کا ذکر بھی اسی لئے ضروری ہے کہ اس کا دولت کدہ ہمیشہ ادبی محفل بنا رہتا تھا - اس نے اپنی سرپرستی سے جو تاریخ دکن مرتب کرائی تھی وہ آج تک تاریخ دل افروز کے نام سے موجود ہے - اور معتبر تاریخوں میں شمار ہوتی ہے - وہ پہلی صاحب دیوان شاعرہ تھی - اس کے یہاں روزانہ سہ پہر میں محفل ادب منعقد ہوتی تھی اس وقت کے اکثر شعراء اور اہل فن جمع ہوکے داد سخن لیتے - مغرب تک یہ محفل رہتی شام کو ان سب کو پر تکلف ضیافت دی جاتی - روز یہی ہوتا تھا -

اب ہم اور آگے بڑھتے ہیں - آج سے تقریباً پچاس سال پہلے کا ذکر سناتے ہیں اگرچہ اس زمانہ میں ہر طرف قدیم مشرقی تہذیب اور مشرقی کلچر کی جگہ مغربی اور انگریزی تہذیب اور کلچر کی آمیزش شروع ہو گئی تھی - اس لئے قدیم مشرقی محفلوں اور قدیم علمی مجلسوں کا رنگ بھی تبدیل ہونے لگا تھا - اس زمانہ کی ادبی محفلوں کا تذکرہ ہم چند عنوان کے تحت سناتے ہیں

مشاعرے

اس دور کے مشاعروں میں مہاراجہ کشن پرشاد کے مشاعرے خاص طور پر قابل تذکرہ ہیں - مہاراجہ کے پاس اولاً پیشکاری کے زمانہ ہی سے مشاعروں کی ابتدا ہو گئی تھی - اس کے بعد جب مدار المہامی سرفراز ہوئی تو ان میں اور زیادہ شان و شوکت پیدا ہو گئی - دیوانی کے بعد جب صدارت عظمی پر آپ کا تقرر ہوا تو پھر سے ان مشاعروں میں بھی رونق آ گئی - آپ کے یہاں فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں کلام سنایا جاتا - غزلیں اور نظمیں پڑھی جاتیں - ہر زمانہ میں مشہور اور قابل اساتذہ سخن جمع ہوتے اور کلام کی داد دیتے رہے -

مہاراجہ کے مشاعروں کے بعد حضرت فیض کے سالانہ عرس کا مشاعرہ قابل ذکر ہے - اس میں حضرت فیض کے شاگرد اور دوسرے شعراء حصہ لیا کرتے تھے اور سالانہ ان کے کلام کا مجموعہ بھی شائع ہوتا تھا - فیض کے شاگردوں میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے - خصوصیت سے بہاری لال رمز اور سینیل پرشاد خرم قابل تذکرہ ہیں - رمز کا انتقال بھی عرس کے موقعہ پر ہوا تھا - معروف علی شاہ کے عرس کا مشاعرہ بھی مشہور تھا اور آج تک اس کا سلسلہ جاری ہے - شمس العلماء نواب عزیز جنگ مرحوم کے دولت کدہ پر بھی اکثر

مشاعرہ نما محفلیں ہوتی تھیں جس میں حیدرآباد کے مشہور اساتذہ سخن شوق، ترکی، محوی، ناظم، جلیل وغیرہ حصہ لیا کرتے تھے ۔ ان کے علاوہ بعض عرسوں کی تقریب پر اور بعض جگہ بلا عرس کی تقریب کے مشاعرے ہوتے تھے ۔ جن میں حیدرآباد اور باہر کے شعراء حصہ لیا کرتے ۔ پہلے تو صرف غزلوں کا رواج تھا مگر اس کے بعد نظمیں بھی مشاعروں میں پڑھی جانے لگیں ۔

مرحوم نظام آصف جاہ سادس کی چہل سالہ جوبلی کے موقع پر جو مشاعرہ باغ عام میں منعقد ہوا تھا وہ خصوصیت سے اس لئے قابل تذکرہ ہے کہ اس میں پبلک سے صرف شعراء ہی کو داخلے کی اجازت تھی ۔ آصف یار الملک ایک کہنہ مشق شاعر جن کا تخلص ذریہ تھا اور شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس مشاعرہ کے صدر ہوئے تھے ۔

انجمن ۔

اس دور کے دوسرے ادبی محفلوں میں علمی انجمنوں کا تذکرہ ضروری ہے ۔ جن میں ہفتہ وار ۔ پندرہ روزہ اور ماہوار ادبی اور علمی موضوع پر تقریریں ہوتیں اور مضمون سنائے جاتے تھے ۔ ایسی کئی ایک انجمنیں تھیں ۔ یہاں ہم چند کا ذکر کرتے ہیں ۔

۱۔ اقبال کلب ۔ یہ بڑی مشہور انجمن تھی اور عرصۂ دراز تک علم کی خدمت کرتی رہی اس کے علمی اور ادبی جلسے اس کلب میں ہوتے تھے وہ اس کلب اس مکان میں تھا جہاں اب دفتر رجسٹرار بلدہ ہے یعنی معظم جاہی مارکٹ کے قریب ۔ پہلی مرتبہ جب مولوی شبلی حیدرآباد آئے تھے تو یہاں ہی قیام کیا تھا اقبال کلب کے جلسے بڑے مشہور تھے ۔ جب مولوی محب حسین نے تعلیم نسواں اور پردہ کی مخالفت میں آواز بلند کی تھی تو اسی انجمن کے ذریعہ سے اپنا کام شروع کیا تھا ۔ مہینوں بلکہ برسوں پردہ کی مخالفت پر تبصرے، گرما گرم تقریریں اور مباحثے ہوتے رہے ۔

۲۔ انجمن معارف ۔ ایک دوسری انجمن تھی اس کے صدر حیدرآباد کے مشہور لیڈر ملا عبدالقیوم مرحوم تھے ۔ انجمن کے ارکان میں حیدرآباد کا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ شامل تھا ۔ جن کے دلوں میں ملک کی خدمت کا پرجوش جذبہ اور علم کی ترقی کا ذوق و شوق تھا ۔ مولوی مرتضیٰ مرحوم ۔ مولوی اکبر علی مرحوم اور حضرت کیفی مرحوم وغیرہ اس کے سرگرم ممبر تھے ۔

۳۔ انجمن ثمرۃ الادب ۔ یہ دراصل مدرسہ دارالعلوم کی یونین تھی ۔ پہلی مرتبہ ۱۳۲۴ھ میں چند سال تک علمی اور ادبی کام کرنے کے بعد بند ہو گئی ۔ دوسری مرتبہ ۱۹۱۷ء میں اس کی دوبارہ زندگی ہوئی ۔ اس مرتبہ ہفتہ وار علمی جلسوں کے ساتھ ساتھ ماہوار علمی جلسے ہوتے رہے ۔ ان میں حیدرآباد اور شمالی ہند کے مشاہیر نے تقریریں فرمائیں ۔ انجمن کی جانب سے ایک ادبی رسالہ ثمرۃ الادب کے نام سے شائع ہوتا تھا ۔ اس مرتبہ تقریباً چار سال تک انجمن کی معتمدی کے فرائض میرے ذمے تھے ۔ جب عثمانیہ یونیورسٹی کی یونین قائم ہو گئی تو انجمن ثمرۃ الادب اور اس کا کتب خانہ وغیرہ یونین میں ختم ہو گیا ۔ جدید حیدرآباد کی ادبی تعمیر میں اس انجمن کا بھی نمایاں حصہ رہا ہے ۔

۴۔ عثمانیہ ریڈنگ روم ۔ اس انجمن کے بانی چند معزز ہندو اصحاب تھے ۔ مگر دوسری انجمنوں کی طرح اس کے ممبران میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے ۔ انجمن کا دارالمطالعہ تھا ۔ ماہوار علمی جلسے ہوا کرتے تھے ۔

ان انجمنوں کے علاوہ کئی علمی اور ادبی انجمنیں تھیں جن کا تذکرہ طوالت کا موجب ہوگا ۔ ان مستقل انجمنوں کے علاوہ بعض علم دوست اور مشاہیر اردو جو سرکاری ملازمت میں شامل تھے مثلاً خدا بخش خاں ۔ مولوی عزیز مرزا ۔ نواب محسن الملک ۔ نواب عماد الملک وغیرہ کے اہتمام میں اکثر و بیشتر علمی اور ادبی جلسے ہوا کرتے تھے جس میں علم دوست پبلک شریک ہوتی اور شمالی ہند کا کوئی نامور ادیب اور اردو کا بہی خواہ کسی نہ کسی موضوع پر اردو میں تقریر کرتا تھا ۔

جس طرح امراء دکن میں ارسطو جاہ ۔ شمس الامراء ۔ مہاراجہ چندولال کی ادبی محفلیں یاد رہیں گی اسی طرح مہاراجہ کشن پرشاد ۔ نواب ظفر جنگ حسام یار جنگ خاں خاناں وغیرہ کئی جاگیردار ایسے تھے جن کے گرد و پیش ہر وقت شعراء اور ادیبوں کا مجمع ہوتا تھا اور فرصت کے اوقات میں شعر و شاعری اور ادبی مباحث ہوا کرتے ان ادبی محفلوں کا تذکرہ کرنے کے لئے طویل وقت کی ضرورت ہے ۔

مہاراجہ کشن پرشاد کے یہاں پنڈت رتن ناتھ سرشار ملازم تھے ۔ ان کے علاوہ غبار، محوی، فانی، ہوش، عالی، بیگم، ضیاء، فرحت وغیرہ بیسیوں شعراء جمع رہا کرتے تھے ۔ ظفر جنگ مرحوم وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے سیاروں کے دیکھنے کے لئے بہت بڑی دوربین طلب فرمائی تھی اور آج حیدرآباد کی رصدگاہ میں وہی سب سے بڑی دوربین ہے ۔ بہر حال ان

امیروں اور جاگیرداروں کے دولت خانے اہلِ علم اور اصحابِ فن سے ہر وقت رونق رہتی تھی۔ کبھی شعر و شاعری۔ کبھی ناول اور افسانے۔ کبھی تاریخ اور سیر۔ غرض مختلف موضوع پر گفتگو ہوتی۔ علمی مباحث، بذلہ سنجی، سنجیدہ مذاق سے محفل کا رنگ دوبالا ہوا کرتا تھا۔

امیروں اور جاگیرداروں کی طرح کئی سرکاری اعلیٰ عہدہ داروں کے مکانات اکثر و بیشتر علمی اور ادبی محفل کا رنگ اختیار کرتے تھے۔ ان کی ذاتی علمی قابلیت اور ادبی ذوق و شوق کے باعث اصحابِ دانش اور صاحبانِ علم کا ان کے یہاں مجمع ہوتا تھا۔ حیدرآباد اور ہندوستان کی سیاست کے علاوہ ادبی اور علمی موضوع پر گفتگو ہوا کرتی تعطیلات میں صبح تا شام اور دوسرے ایام میں بعد مغرب ایسی محفلیں ہوتی تھیں۔ اس قسم کی دلچسپ علمی صحبتوں کا مفصل تذکرہ طوالت کا موجب ہوگا۔ ایسے ادبی محفلوں نے جو ادب پیدا کیا ہے اس کی صراحت بھی دشوار ہے لیکن ایک آدھ واقعہ کا اظہار ضروری ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ مولوی عزیز مرزا مرحوم نے مولوی سید علی حیدر طباطبائی سے خواہش کی تھی کہ انگلستان کے مشہور شاعر ٹامس گرے کی "ایلے جی" کا ترجمہ کیا جائے اس فرمائش پر طباطبائی مرحوم نے "گورِ غریباں" کے نام سے اس کا ترجمہ کیا تھا جو اردو نظم کے ذخیرہ میں بیش بہا اضافہ سمجھا جاتا ہے۔ اور طباطبائی کے شہ کاروں میں شمار ہوتا ہے۔ اسی قسم کی ادبی محفلوں کے باعث ظفر علی خاں نے اپنی کتابیں تصنیف کیں۔ مولانا ڈاکٹر عبدالحق نے مقدمے لکھے۔ شرر اور سرشار نے ناولیں لکھیں۔ محب حسین نے عورتوں کی تعلیم اور پردہ کی مخالفت کا بیڑا اٹھایا۔ اس طرح شاعروں کے مکان شعر و شاعری کے لحاظ سے ہمیشہ ادبی محفل بنے رہے۔ توفیق، داغ، کیفی، جلیل اور طباطبائی وغیرہ کے مکان ادبی گہوارے بنے ہوئے تھے۔ بہرحال یہ ماضی کی ایک طویل داستان ہے جو اب صرف تاریخ کے اوراق پر باقی رہ گئی ہے۔

سہیل عظیم آبادی

راستے میں

لاری تیزی کے ساتھ سمٹر گیا جانے والی سڑک پر بھاگتی جارہی تھی۔

ڈرائیور کے پہلو والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی انترِ پورہ سبٹ خاتون ہر طرف نظر گھما گھما کر دیکھ رہی تھی۔ جنگل، پہاڑیاں، کھیت، میدان، ندی اور اونچی نیچی زمین۔ ہر چیز اُس کے لئے دل چسپ تھی۔ جہاں کہیں اُسے دو چار آدمی راستہ چلتے یا کھڑے باتیں کرتے نظر آتے تو وہ انھیں اس طرح دیکھتی جیسے جو کچھ وہ جاننا چاہتی ہے۔ وہ سب کچھ ان ہی چند آدمیوں میں ہے۔ اور اگر کہیں دو چار گھر نظر آجاتے تو جیسے وہ بے چین ہوجاتی، جیسے بہت دنوں پر پردیس سے لوٹ کر آنے والا اپنے گھر کو دیکھ کر بے چین ہو جائے۔ تھوڑی دیر پہلے جب وہ ایک چھوٹے سے گاؤں سے گذری تھی تو بڑی بے چینی کے ساتھ اپنی سیٹ پر پہلو بدلنے لگی تھی۔ آخر اُس سے ضبط نہ ہو سکا تو اس نے ڈرائیور سے ذرا گاڑی روکنے کو کہا۔ تاکہ وہ اس گاؤں کی تصویر لے سکے۔ لیکن ڈرائیور نے گاڑی نہیں روکی اور اُسے بتایا کہ ابھی بہت راستہ باقی ہے اور راستے میں دو ندیاں ملتی ہیں جن کو پار کرنا پڑے گا۔ پہلی ندی کا رود تو سوکھی ہوئی ہے اور لاری اُس میں اُتر کر پار ہو جاتی ہے۔ لیکن دوسری ندی کوئل میں تھوڑا پانی ہے اور ندی کے اندر پتھر کے ٹکڑے بہت ہیں۔ اس لئے مسافروں کو اُتر کر ندی پار کرنا پڑتا ہے۔ پھر دوسری لاری پر سوار ہو کر سمڈیگا جانا ہوتا ہے اور اس میں بھی کافی دیر لگ جاتی ہے۔ اس لئے سورج ڈوبنے سے پہلے اُسے کوئل ندی کے اُس کنارے پر پہنچ جانا ہے تاکہ اندھیرے میں مسافروں کو تکلیف نہ ہو۔ اور اُن کی کوئی چیز ضائع نہ ہو۔ اور اجنبی خاتون جو سوئٹزرلینڈ سے چھوٹا ناگ پور کے اراؤں، منڈا اور کھڑیا نسل کے لوگوں کے حالات کا مطالعہ کرنے آئی تھی، ذرا گھبرا سی گئی تھی کہ وہ ندی کیسے پار کرے گی۔ اور اس نے پیچھے کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے محکمہ تعلیم کے افسر سے انگریزی میں پوچھا تھا کہ وہاں ناؤ ہے یا نہیں۔ اور اس نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ تیرنا بالکل نہیں جانتی اور محکمہ تعلیم کے افسر نے مسکراتے ہوئے اُسے بتایا تھا کہ ان دنوں ندی میں پانی بہت کم ہوتا ہے۔ اور سارے مسافر بڑی آسانی کے ساتھ پار اُتر جاتے ہیں۔ جب ندی میں پانی زیادہ ہوتا ہے تو ناؤ بھی ہوتی ہے۔ اور جب برسات کے دنوں میں ندی میں طوفان کی کیفیت ہوتی ہے تو لاری چلنا ہی بند ہو جاتی ہے۔ یہ سوال ہی ختم ہو جاتا ہے۔ تب کہیں سوئس خاتون کو تھوڑا اطمینان ہوا تھا۔ اور اُس نے بڑی حیرت کے ساتھ پوچھا تھا۔

"یہاں ڈانڈی نہیں ہوتی؟"

محکمہ تعلیم کا افسر خود بھی ڈانڈی کے بارے میں نہیں جانتا تھا کہ کیا چیز ہے لیکن اُس نے مسکرا کر کہا تھا

"نہیں مادام، ادھر ڈانڈی کا رواج نہیں ہے"

سوئس خاتون کو بڑی مایوسی ہوئی اور محکمہ تعلیم کے افسر سے اُس نے کہا

"مسٹر! میں اجنبی ہوں، آپ میری مدد کیجیے گا۔"

اور محکمہ تعلیم کے افسر نے مُسکرا کر کہا

"بڑی خوشی کے ساتھ۔"

اور سوئس خاتون پہلے تو اپنی زبان میں کچھ بڑبڑائی۔ پھر اس سے ڈرائیور کی شکایت کی کہ وہ اس گاؤں کی تصویر لینا چاہتی تھی لیکن لاری ڈرائیور نے نہیں رکی اور اسے یہ بھی بتایا کہ سوئٹزرلینڈ سے چل کر صرف اس علاقے کے آدی باسیوں کے بارے میں معلومات جمع کرنے آئی ہے۔ رانچی میں رہ کر بہت کچھ حالات جمع کر چکی ہے۔ لیکن اب وہ گاؤں میں گھوم کر اُن کے حالات بہت نزدیک سے جاننا چاہتی ہے، اُس نے یہ بھی بتایا کہ وہ آدی باسیوں کے بارے میں سوئٹزرلینڈ جا کر ایک کتاب لکھے گی۔ اور محکمہ تعلیم کا افسر اُس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔

جب چھوٹے سے ایک گاؤں کے پاس لاری یکایک رُک گئی اور ڈرائیور نے پھر اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی اور گاڑی نہیں چلی۔ اور ڈرائیور اُتر کر انجن کو دیکھنے لگا۔ تو سوئس خاتون بھی اُتر گئی۔ اور ڈرائیور سے کچھ کہے بغیر اپنا کیمرہ

لے کر تیزی سے گاؤں کی طرف چلی۔ پھر اُسے یکایک خیال آیا کہ وہ گاؤں والوں کی باتیں نہیں سمجھ سکے گی۔ تو تیزی کے ساتھ واپس آئی اور محکمہ تعلیم کے افسر سے بڑی لجاجت کے ساتھ گاؤں تک اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ یہ گاؤں محض چند قدم آگے تھا۔ محکمہ تعلیم کا افسر اُس کے ساتھ ہو لیا۔ ایک تو اس لئے کہ ڈرائیور نے اعلان کر دیا تھا کہ انجن کسی وجہ سے بند ہو گیا ہے اور اس کے درست ہونے میں کم سے کم پندرہ منٹ کی دیر ہوگی۔ اور اتنی دیر لاری میں بیٹھے رہنے سے کھلی ہوا میں ٹہلنا زیادہ بہتر تھا۔ دوسرے یہ کہ سوئس خاتون تیس سال سے کچھ زیادہ عمر ہونے پر بھی کافی دل کشی کی مالک تھی۔ اس کا ہلکا گلابی مائل سفید رنگ، چمکیلی نیلی آنکھیں، بھرے بھرے گال، لال لال ہونٹ اور سنہرے ریشم جیسے لچھوں والے شانوں پر کھیلتے ہوئے بال بے حد خوب صورت تھے۔

محکمہ تعلیم کے افسر نے چلتے چلتے اُس سے پوچھ لیا کہ وہ سمڈیگا میں کتنے دن ٹھہرے گی اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ پانچ چھ دن اس علاقے میں رہے گا اور پانچ سال سے سارے ضلعے میں گھومتے رہنے کی وجہ سے یہاں کے لوگوں کو اور اُن کے حالات کو کافی طور پر جانتا ہے اور اُسے جس قسم کی مدد کی ضرورت ہوگی، دے گا۔ اور سوئس خاتون نے بڑے دل فریب انداز میں مسکرا کر اُس کا شکریہ ادا کیا۔ اور چلتے چلتے محکمہ تعلیم کے افسر نے اُسے یہ بھی بتا دیا کہ وہ سمڈیگا کے ڈاک بنگلے میں ٹھہرے گا۔ اور اُس سے سوال کر بیٹھا کہ وہ سمڈیگا میں کہاں ٹھہرے گی۔ سمڈیگا میں باہر کے آدمیوں کے لئے سوائے ڈاک بنگلے کے ٹھہرنے کی کوئی دوسری جگہ نہیں۔ اور خاتون نے جب اُسے بتایا کہ وہ پہلے ہی انتظام کر چکی ہے اور سام ٹولی کیتھولک مشن میں ٹھہرے گی تو محکمہ تعلیم کے افسر کو بڑی مایوسی سی ہوئی اور پل بھر کے لئے اُس کا جی چاہا کہ راستے ہی میں واپس چلا جائے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ خاتون نے یہ بھی کہا کہ جب اُس سے ملاقات ہو گئی ہے تو اس کے معلومات اور تجربے سے کچھ فائدہ اُٹھانا چاہتی ہے۔ وہ مشن میں ضرور ٹھہرے گی۔ لیکن اس افسر کے ساتھ کچھ اسکولوں میں چلے گی۔ گاؤں کے لوگوں کے حالات دریافت کرے گی، اُن کی زندگی کو قریب سے دیکھے گی۔ اور محکمہ تعلیم کے افسر کو جیسے ڈوبتے وقت تنکے کا سہارا مل گیا۔

دونوں جلد ہی چھوٹے سے گاؤں میں پہنچ گئے۔ کچھ آدی باسی بچے سڑک کے کنارے مٹی میں کھیل رہے تھے۔ سوئس خاتون نے جلدی سے اپنا کیمرہ ٹھیک کیا۔ اور اُن بچوں کی تصویریں لے لی۔ پھر بچے بھی دو اجنبی آدمیوں کو دیکھ کر اُن کے پاس جمع ہو گئے۔ پھر کچھ عورتیں اور کچھ مرد۔ یہ لوگ سڑک کے کنارے رہنے کی وجہ سے ایسی چیزوں کے عادی ہو گئے تھے۔ سوئس خاتون نے باری باری کئی تصویریں لیں اور اپنا بٹوہ نکال کر بچوں میں کچھ پیسے بانٹے۔ عورتیں ہنسنے لگیں، مرد خوش ہوئے اور بچے پیسے پا کر اُچھلنے لگے۔ ایک بچے نے آگے بڑھ کر کیمرے کو ہاتھ لگایا۔ لیکن سوئس خاتون نے کیمرے کو ہٹاتے ہوئے کہا

"نہ۔ نہ"

اور بچہ ہٹ گیا۔ وہ پھر محکمہ تعلیم کے افسر سے باتیں کرنے لگی۔ اسی بیچ لاری بھی درست ہو گئی اور ہارن دینے کے بعد چل پڑی۔ جب قریب آ گئی تو دونوں اُس میں اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ رہے اور بچوں نے خوشی میں تالیاں بجائیں۔

اب سوئس خاتون محکمہ تعلیم کے افسر سے بے تکلف ہوتی جا رہی تھی۔ اور دونوں برابر باتیں کرتے جا رہے تھے۔ خاتون اب اُس کی طرف مڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ اور ہر بات مسکرا کر پوچھتی اور ہر بات کا جواب مسکرا کر دے رہی تھی۔ محکمہ تعلیم کے افسر کو آدی باسیوں کے بارے میں جتنی باتیں معلوم تھیں۔ سوئس خاتون کو بتاتا جا رہا تھا۔ اور سوئس خاتون مسکرا مسکرا کر نئے سوال کرتی جا رہی تھی اور محکمہ تعلیم کے افسر کے بغل میں بیٹھا ہوا بوڑھا بنگالی ڈاکٹر ناک بھوں چڑھا رہا تھا اور ڈاکٹر کے پاس بیٹھی ہوئی جوان اسکول مسٹرس بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ کبھی وہ باہر کی طرف دیکھنے لگ جاتی اور کبھی ان دونوں کی باتیں سننے لگ جاتی۔ کبھی وہ سوئس خاتون کو دیکھتی اور کبھی محکمہ تعلیم کے افسر کی طرف۔ جیسے اُسے دونوں سے شکایت تھی۔ آخر اُن دونوں میں سے کوئی بھی اس کی طرف کیوں مخاطب نہیں ہوتا۔ عورت ہونے کے لحاظ سے یہ اُس کا حق تھا کہ سوئس خاتون اُس سے باتیں کرتی۔ پھر یہ کہ وہ عیسائی اور آدی باسی بھی تھی اور وہ اپنے دیس سے چل کر آدی باسیوں کے بارے میں کچھ جاننے کو آئی تھی اور آدی باسی ہونے کی وجہ سے وہ محکمہ تعلیم کے افسر سے زیادہ اور صحیح باتیں بتا سکتی تھی۔ لیکن سوئس خاتون محکمہ تعلیم کے افسر سے باتیں کر رہی تھی اور بہت ہی گھل مل کر اور بے تکلفی کے ساتھ۔ اُسے محکمہ تعلیم کے افسر سے بھی شاید اسی قسم کی شکایت تھی کہ وہ اس سے کیوں باتیں نہیں کرتا۔ وہ ہندستانی تھی، اس کا تعلق بھی تعلیم سے تھا اور یقینی طور پر سوئس خاتون سے کم عمر تھی۔ کم سے کم چھ سات برس چھوٹی۔ پھر یہ کہ وہ اسے پہلے سے جانتی تھی کہ وہ اسکولوں کا انسپکٹر تھا۔ لیکن وہ اس وقت اُس کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ شاید پہچان بھی نہیں رہا تھا۔ حالانکہ ایک دن وہ اس کے گھر پر کھانا کھا چکا تھا جب وہ ایک اسکول کا معائنہ کرنے گیا تھا اور کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ تو

اُس کے بھائی نے جو اس مڈل اسکول کا ہیڈ ماسٹر تھا، انسپکٹر کو اپنے گھر کھانا کھلایا تھا۔ اس وقت وہ اس سے ہنس ہنس کر باتیں کر چکا تھا۔ لیکن آج ایک ڈیڑھ سال کے بعد ہی اُسے پہچان بھی نہیں رہا تھا۔ اُسے دونوں سے ذرا اُلجھن ہونے لگی اور وہ دونوں برابر باتیں کرتے رہے اور مسٹرس اُلجھتی رہی۔

آخر لاری ایک بڑے سے گاؤں میں آکر رُکی۔ سڑک کے ایک کنارے پر تھانہ تھا اور دوسری طرف ہسپتال اور اُس کے پاس ہی ڈاک بنگلہ۔ بوڑھا بنگالی ڈاکٹر اُتر گیا۔ اب درمیان کے خانے میں صرف دو آدمی تھے۔ ایک تو اسکول کی مسٹرس اور دوسرا وہ محکمہ تعلیم کا انسپکٹر۔ گاڑی رُکتے ہی عادت کے مطابق سوئس خاتون چاروں طرف دیکھتی رہی۔ اور محکمہ تعلیم کے افسر نے ایک نظر اسکول مسٹرس کو دیکھا اور جیسے ہی لاری آگے بڑھی۔ سوئس خاتون پھر اس کی طرف مخاطب ہو گئی۔ اور دونوں باتیں کرنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سوئس خاتون فیصلہ کر چکی تھی کہ پانچ سال میں محکمہ تعلیم کے اس افسر نے جو کچھ معلومات حاصل کی ہیں اُسے نچوڑ لے اور جیسے محکمہ تعلیم کا افسر بھی اس کے لئے تیار تھا کہ وہ سب کچھ بتا دے گا۔ آخر اسکول کی مسٹرس سے ضبط نہ ہو سکا اور انتظار میں رہی۔ اور جیسے ہی سوئس خاتون ذرا چپ ہو کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ وہ بولی۔

"سر! آپ سمڈیگا جا رہے ہیں؟"

اور افسر کو جواب دینا ہی پڑا

"ہاں۔"

مسٹرس نے پھر سوال کر دیا۔

"آپ وہاں کتنے دن رہیں گے؟"

اور محکمہ تعلیم کے افسر کو پھر جواب دینا ہی پڑا۔

"چار پانچ دن"۔

حالانکہ وہ دل ہی دل میں اُس پر غصے ہوا۔ خواہ مخواہ بیچ میں ٹپک پڑی۔ اس وقت وہ سوئس خاتون سے مزے مزے کی باتیں کر رہا تھا۔ اور نہ جانے اُس کا دماغ کہاں کہاں کی سیر کر رہا تھا۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں مسٹرس اپنی باتیں نہ شروع کر دے اور سوئس خاتون اس سے باتیں کرتا دیکھ کر دوسری طرف متوجہ ہو جائے۔ لیکن سوئس خاتون پھر جلد ہی اُس کی طرف متوجہ ہو گئی اور اس نے مزے لے لے کر حالات بتانا شروع کئے۔ آدی باسیوں کی روزانہ زندگی، محنت مزدوری اور جفاکشی۔ شام کے وقت ہنڈیا اور ناچ۔ شادی، بیاہ۔ جنسی تعلقات، ساری باتیں۔ صحیح اور غلط دونوں جو مشہور تھیں۔ سوئس خاتون بڑے غور سے سن رہی تھی اور مسکراتی جا رہی تھی۔ محکمہ تعلیم کا افسر بولتا جا رہا تھا اور پگھلتا جا رہا تھا۔ سوئس خاتون اپنے بڑے تھیلے میں سے کچھ نکالنے لگی۔ موقع پا کر اسکول مسٹرس نے پھر سوال کرنا چاہا۔

"سر!......"

لیکن اس نے اُس کی بات کاٹ دی اور بڑی روکھائی سے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا

"اچھا۔ اچھا۔ سمڈیگا پہنچ کر باتیں کر لینا۔"

سوئس خاتون نے بیگ میں سے ڈبہ نکالا۔ اس میں سے ٹافی نکالی۔ چار ٹافی محکمہ تعلیم کے افسر کو دی جو شکریہ ادا کر کے اُس نے لے لیا۔ اور چار ٹافی اپنے لئے رکھ کر ڈبہ پھر تھیلے میں رکھ دیا۔ اسکول مسٹرس رُوکھا جواب سن کر باہر کی طرف دیکھنے لگی۔ اور لاری چلتی رہی۔ پھر سوئس خاتون اور محکمہ تعلیم کے افسر میں باتیں شروع ہوئیں اور ہوتی رہیں۔ اور جب ایک چھوٹا سا پتر آیا اور لاری سال کھو کے جنگل میں گھسی تو دونوں ذرا چپ ہوئے۔ لیکن پھر فوراً ہی جنگل کے بارے میں باتیں ہونے لگیں اور محکمہ تعلیم کے افسر نے اُسے بتانا شروع کیا۔ کہ اب چھوٹا ناگ پور میں جنگل بہت کٹ گئے۔ ہزاری باغ، پلاموں اور سنگ بھوم کے ضلعوں میں کچھ جنگل باقی ہیں۔ مان بھوم اور رانچی میں تو کہیں کہیں بس نام کے لئے یا یادگار کے طور پر جنگل نظر آ جاتے ہیں۔ اور سوئس خاتون نے سوال کر دیا تھا کہ جنگلوں کے کٹ جانے سے تو آدی باسیوں کی زندگی پر ضرور بہت زیادہ اثر پڑا ہوگا۔ اور محکمہ تعلیم کے افسر نے اُسے بتانا شروع کر دیا تھا کہ جن علاقوں میں جنگل کٹ چکے ہیں وہاں کے رہنے والے تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ خاص کر عیسائی مشنریوں نے بڑا کام کیا ہے۔ رانچی ضلع میں اسی فیصد سے زیادہ اسکول مشن کے ماتحت چل رہے ہیں۔ اس قسم کی باتوں میں چھوٹا سا پتر ختم ہو گیا اور سامنے سوکھی ہوئی کارو ندی نظر آنے لگی۔ ندی میں پانی کے بدلے ریت ہی ریت تھی۔

ڈرائیور نے لاری ندی میں اُتار دی اور لاری ریت میں "ہائیں ہائیں" کرتی ہوئی بہت ہی آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ جدھر بھی نظر اُٹھتی تھی ریت ہی ریت تھی بیچ میں پانی کی ایک پتلی سی دھار تھی۔ جس کے کنارے پر دو تین بگلے بیٹھے تھے اور وہ موٹر کی ہائیں ہائیں سنتے ہی اُڑ گئے۔ اور سوئس خاتون کے مُنہ سے بے ساختہ اپنی زبان میں کچھ جملے نکل گئے جسے کوئی بھی نہیں سمجھ سکا۔

لاری دوسرے کنارے پر پہنچی اور تھوڑی دیر کے لئے رُک گئی۔ سارے مسافر اُتر کر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے۔ لاری کا کلینر بالٹی لے کر ندی میں سے پانی لانے کو دَوڑا۔ تھوڑی دیر کے لئے نئی زندگی پیدا ہو گئی۔ لاری میں سے نکل کر کوئی آدمی انگڑائی لے رہا تھا اور کوئی بدن سیدھا کر رہا تھا۔ سمبل، پیپل اور برگد کے درختوں کے سائے میں لوگ اِدھر اُدھر پھرنے لگے۔ سوئس خاتون نے جلدی جلدی دو تین تصویریں لیں۔ ندی کی تصویر، لاری اور ڈرائیور کی تصویر۔ اُونچے اُونچے درختوں کی تصویر اور محکمہ تعلیم کے افسر کی تصویر۔ اور محکمہ تعلیم کا افسر جیسے کھل اُٹھا اور مسکرانے لگا۔

تھوڑی دیر میں ڈرائیور پھر اپنی جگہ پر بیٹھ کر ہارن بجانے لگا۔ مسافر جا کر اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے اور لاری سمڈیگا کی طرف چل پڑی۔ ابھی لاری کارو ندی پار ہوئی تھی اور اسے کوئل ندی کے کنارے تک جانا تھا۔ دوری بھی کم نہ تھی اور کوئل ندی کو پار کر کے مسافروں کو دوسری لاری پر بیٹھنا تھا۔ اور کچھ دیر بھی ہو چکی تھی۔ ڈرائیور کو سورج ڈوبنے سے پہلے ہی اس کنارے پر پہنچ جانا تھا۔ لاری تیزی کے ساتھ سنسان سڑک پر جا رہی تھی۔ اور محکمہ تعلیم کے افسر کو ڈرائیور پر غصہ آ رہا تھا۔ سوئس خاتون ذرا ندی کے کنارے آگے تک بڑھ کر دیکھنا چاہتی تھی۔ اور محکمہ تعلیم کا افسر بھی چاہتا تھا کہ وہ بھی سوئس خاتون کے ساتھ دُور تک تنہائی میں چلا جائے اور باتیں کرے۔ لیکن ڈرائیور! نہ اُسے اس بات کا خیال تھا کہ سوئس خاتون اپنے ملک سے چل کر چھوٹا ناگ پور کے آدی باسیوں کو دیکھنے آئی ہے اور نہ اُسے محکمہ تعلیم کے افسر کا کچھ خیال تھا۔ جو سوئس خاتون کی دل جوئیوں میں مصروف تھا۔ بس اُسے ایک ہی خیال تھا کہ کسی طرح بھی سورج ڈوبنے سے پہلے لاری کو کوئل ندی کے کنارے پہنچا دے۔

لاری سنسان راستے پر تیزی کے ساتھ جا رہی تھی اور محکمہ تعلیم کا افسر اور سوئس خاتون اپنی چھپی ہوئی خواہشوں کو دل میں دبائے باتیں کرنے میں مشغول تھے۔ وہ پھر سوال کرتی جا رہی تھی اور وہ بتاتا جا رہا تھا۔ کہ اِن آدی باسیوں کی زندگی کتنی سخت ہے۔ بچپن میں ماں باپ کی محبت نہیں پاتے۔ کیونکہ ماں باپ کو زندہ رہنے کے لئے کڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ اور جیسے ذرا عقل آنے لگتی ہے۔ کام کرنا پڑتا ہے۔ غریبی عام ہے۔ محنت مزدوری کے سوا زندگی کا کوئی دوسرا سہارا نہیں۔ جو لوگ عیسائی ہو گئے ہیں اور تعلیم پا چکے ہیں۔ وہی کہیں چھوٹی موٹی ملازمتیں کرتے ہیں۔ ورنہ عام طور پر مزدوری کرنے پر مجبور ہیں۔ خواہ اپنے گھر پر رہیں یا باہر جائیں۔۔۔۔۔ اور

سوئس خاتون ہمدردی کا اظہار کرنے لگی۔ اور اسکول مسٹرس بڑی بے چینی کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اگر محکمہ تعلیم کے افسر کا بس چلتا تو سوئس خاتون کو اپنے پاس بُلا لیتا اور اسکول مسٹرس کو لاری سے باہر پھینک دیتا۔ لیکن اس کا موقع ہی نہ تھا۔ اور وہ سوئس خاتون سے باتیں کرتا ہی رہا۔

آدی باسیوں کی مزدوری کا جب ذکر نکل آیا تو محکمہ تعلیم کے افسر نے سوئس خاتون کو بتانا شروع کیا کہ آدی باسی کھیت میں مزدوری سے لے کر شہر میں رکشا کھینچنے تک، اور جھریا اور دھنباد میں کوئلے کی کانوں میں کام کرنے سے لے کر آسام کے چائے کے باغوں تک میں مزدوری کرنے جاتے ہیں۔ کوئلے کی کانوں میں دب کر مرتے ہیں اور آسام میں ملیریا کا شکار ہوتے ہیں۔ بڑے حوصلوں سے آسام جاتے ہیں کہ وہاں سے کما کر واپس آئیں گے اور گھر بسائیں گے۔ لیکن آسام سے واپس آنا انھیں کبھی نصیب نہیں ہوتا۔ نہ کبھی اُن کے پاس اتنی رقم ہوتی ہے کہ گھر واپس آئیں اور نہ کبھی واپس آتے ہیں۔ سوئس خاتون دلچسپی کے ساتھ ساری باتیں سنتی اور ہمدردی ظاہر کرتی رہی اور دونوں باتیں کرتے رہے۔

ڈرائیور تیز لاری ہانکتا ہوا سورج ڈوبنے سے بہت پہلے کوئل ندی کے اس کنارے پہنچ گیا اور سارے مسافر لاری سے اُتر پڑے۔ محکمہ تعلیم کے افسر نے چپراسی کو ہدایت کر دی کہ اپنے سامان کے ساتھ ساتھ سوئس خاتون کا بھی سارا سامان اُتروائے۔ اور حفاظت سے رکھوائے۔ قلیوں کی کمی نہ تھی۔ ہر موٹر کے آنے کے وقت گاؤں سے آدمی آ جایا کرتے تھے اور مسافروں کا سامان اِدھر سے اُدھر پہنچا کر کچھ پیسے کما لیا کرتے تھے۔ کبھی کوئی مسافر جوتے اُتار کر ندی میں اُترنا پسند نہیں کرتا۔ تو اسے بھی کندھے پر بٹھا کر ندی کے دوسرے کنارے پر پہنچا دیا کرتے تھے اور زیادہ پیسے کما لیا کرتے تھے۔

سمڈیگا سے مسافروں کو لے کر ابھی لاری نہیں آئی تھی۔ اور اس کنارے کا سامان دوسرے کنارے پر جانے لگا تھا۔ سوئس خاتون لاری سے اُتر کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔ ندی کے کنارے ایک چھوٹی سی پہاڑی۔ بڑے بڑے درخت، کافی چوڑی ندی اور اس میں کہیں کہیں ٹیلے اور پتھر کے بڑے بڑے چٹان۔ مسافروں کا سامان لے کر ندی میں اُتر جانا اور پار ہو جانا۔ لیکن سوئس خاتون سوچ میں پڑ گئی تھی کہ وہ گھٹنے بھر پانی میں کس طرح اُتر کر ندی پار کر سکے گی۔ اتنے میں دو نوجوان اُس کے پاس کھڑے ہو گئے۔ اور ایک نے ہنس کر اُس سے کہا۔

"میم ساب! ہم تو را او' پار پہنچاب۔"

سوئس خاتون کچھ بھی نہیں سمجھ سکی۔ اتنی دیر میں محکمہ تعلیم کا افسر اپنے چپڑاسی کو ہدایت دے کر آ گیا۔ اور اُس نے اُسے سمجھایا۔ وہ بہت خوش ہوئی دونو نوجوان دیہات میں بسنے والے آدی باسیوں کے سچے نمایندے تھے۔ کالا رنگ، چوڑے سینے، لمبے لمبے بال، مانگ نکلی ہوئی۔ ایک نے سر کے چاروں طرف لال ریشمی فیتہ باندھ رکھا تھا اور دوسرے نے گھانس کی بنائی ہوئی کلغی پہن رکھی تھی۔ دونوں کے گلے میں موتیوں کی مالا تھی اور کمر میں گمسریا۔ ایک ذرا لمبا تھا اور دوسرا اُس سے ناٹا۔ سوئس خاتون دونوں کو غور سے دیکھنے لگی۔ ایک اُن میں بڑا ہنسوڑ تھا اور دوسرا سنجیدہ۔ ایک کے ہاتھ میں بانسری تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں کمان۔ اور سر کے بالوں میں پانچ چھ تیر قرینے سے سجائے ہوئے خاتون نے سب سے پہلے تو اپنا کیمرہ نکالا۔ اور جلدی جلدی اُن دونوں کی تین رُخ سے تین تصویریں لے لیں۔ پھر اُن کے بازوؤں پر ندی پار ہونے کو طیار ہو گئی۔

دونوں نوجوان بیٹھ گئے اور ایک نے دوسرے کے مونڈھے پر مضبوطی سے ہاتھ رکھا۔ کرسی طیار ہو گئی۔ سوئس خاتون نوجوان کے بازوؤں پر بیٹھ رہی اور دونوں ہاتھوں سے دونوں کے سر کو پکڑ لیا۔ پھر وہ دونوں سنبھل کر اُٹھے اور ندی کی طرف بڑھے تو سوئس خاتون نے محکمہ تعلیم کے افسر کی طرف اپنا کیمرہ بڑھا دیا۔ اور بولی کہ ایک تصویر اسی حال میں لے لے۔ محکمہ تعلیم کے افسر نے تصویر لے لی اور دونوں نوجوان آہستہ آہستہ پانی میں اُتر گئے۔ خاتون بھی برابر ہنستی رہی اور محکمہ تعلیم کا افسر بھی ہنستا رہا۔ پھر جوتے موزے اُتار پتلون اوپر چڑھا کر وہ بھی پیچھے پیچھے پانی میں اُتر گیا۔

ندی میں پانی کم تھا۔ اُس پار پہنچنے میں کسی کو کوئی دقت نہیں ہوئی۔ سوئس خاتون نے بٹوے سے دو روپے نکال کر نوجوانوں کو دئے۔ اور وہ دونوں خوشی سے جیسے اُچھلنے لگے۔ خاتون، نوجوانوں کی بے فکری سے بہت متاثر ہوئی اور جب محکمہ تعلیم کا افسر پاس آ گیا۔ تو بولی

"یہ لوگ کتنے آزاد، خوش اور بے فکر ہیں۔"

اور محکمہ تعلیم کے افسر نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا

"آزاد اور خوش کم اور بے فکر زیادہ ہیں۔"

خاتون نے اپنی نوٹ بک نکال کر دونوں کا نام لکھا۔ ایک کا نام برسا تھا اور دوسرے کا بھاگو۔ دونوں نے اس سے تصویر کی فرمائش کی۔ اور اُس نے بھیجنے کا وعدہ کیا۔ اور اُن کے پتے بھی لکھ لئے۔

برسا بڑا ہنسوڑ تھا اور اُس کے نس نس میں چلبلا پن تھا۔ ایک پل بھی وہ ایک طرح سے کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ محکمہ تعلیم کا افسر علاقے میں پانچ برس سے تھا۔ لیکن اس نے کبھی اتنا زندہ دل آدی باسی نوجوان نہیں دیکھا تھا۔ وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے سوئس خاتون کو بھول کر برسا کو دیکھتا رہ گیا۔ اور اُسے یکایک یاد آیا کہ رانچی میں اُس کے بنگلے میں ایک اور مالی کی ضرورت ہے اور اگر برسا رانچی چلنے پر طیار ہو جائے تو بہت ہی اچھا ہو۔ اور اس نے برسا سے سوال کر دیا۔

"برسا! نوکری کرے گا۔ میرے ساتھ رانچی چلے گا۔ میرے لگان میں کام کرے گا؟ تم کو تیس روپیہ مہینہ ملے گا۔"

اور برسا کے چہرے کا رنگ یکایک بدل گیا۔ جیسے ہنستا ہوا پھول یکایک مُرجھا گیا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اور بولا۔

"ناصاحب! لگان میں کام کرے نا جا بو۔"

بھاگو بھی اس کے ساتھ ساتھ ہی ذرا ہٹ گیا۔ اور بولا۔

"ناساب! لگان میں کام نا کر بو۔ آسام نا جا بو۔"

محکمہ تعلیم کے افسر نے گھبرا کر کہا

"نہیں، نہیں آسام نہیں، ارے رانچی میں۔"

لیکن برسا نے فوراً جواب دیا۔

"ناصاحب! توں ہو ڈیپو کے صاحب لکھے کا۔؟"

وہ اور دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور اُس کے ساتھ بھاگو بھی۔ اور وہ بولا۔

"ناساب! چا لگان میں کام کرے نا جا بو۔ آسام نا جا بو۔ ہمرا ئے باپ سب اسام جائے کے مو، گیلک۔ ہم نا جا بو۔ ہم نا جا بو"

محکمہ تعلیم کے افسر نے سمجھ لیا۔ کہ دونوں کو غلط فہمی ہوئی۔ دونوں یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ انھیں بھرتی کر کے آسام بھیجنا چاہتا ہے۔ وہ دونوں کی غلط فہمی دور کرنا اور اصل بات سمجھانا چاہتا تھا۔ اُس نے پکارا۔

"برسا سُن تو!"

لیکن برسا نے اور پیچھے ہٹ کر کہا

"نا صاحب، ہم نا جا یو۔نا۔نا۔"

اور وہ اور بھی پیچھے ہٹتا گیا۔ محکمہ تعلیم کا افسر اُس کی طرف آگے بڑھا لیکن اُس کا بڑھنا تھا کہ برسا اور بہاگو تیز تیز چلنے لگے اور جیسے ہی محکمہ تعلیم کا افسر ذرا اور آگے بڑھا۔ وہ دونوں تیزی کے ساتھ کھیتوں میں اُتر گئے اور جھاڑی کی طرف بھاگے اور بھاگتے چلے گئے۔

محکمہ تعلیم کے افسر نے مڑ کر دیکھا۔ سوئس خاتون بھاگتے ہوئے دونوں نوجوانوں کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ محکمہ تعلیم کے افسر نے اُسے دیکھ کر ایک کھوکھلا قہقہہ لگایا اور بولا۔

"مادام! یہ لوگ ڈرے ہوئے ہیں اور باہر والوں سے ڈرتے ہیں۔"

منڈلیگا جانے والی لاری آ چکی تھی۔ اس پر سارا سامان لد چکا تھا۔ کچھ مسافر بیٹھ چکے تھے! کچھ بیٹھ رہے تھے اور ڈوبتا ہوا لال لال سورج ندی پر اپنی آخری کرنیں پھیلا رہا تھا۔ برسا اور بہاگو جھاڑی کی طرف تیزی کے ساتھ چلے جا رہے تھے۔

سڈنی میں بھارتی فن کی نمائش

آسٹریلیا کے شہر سڈنی میں بھارتی فن (آرٹ) کی نمائش کا افتتاح ۱۳ر نومبر ۱۹۵۲ء کو نیو ساؤتھ ویلز کے قائم مقام گورنر جنرل رائٹ آنریبل سی، ای مارٹن نے پانچسو سے زائد سرکردہ اصحاب کی موجودگی میں کیا۔ اس نمائش کا انتظام بھارت سرکار کی وزارتِ تعلیم کے سرکردگی آل انڈیا فائن آرٹس اینڈ کرافٹس سوسائٹی نئی دہلی نے کیا ہے۔ بھارت کے موجودہ فن کاروں کی مصوری کے نمونوں کے علاوہ قدیم فن تعمیر و سنگ تراشی کے ایسے نمونے بھی اس نمائش میں پیش کئے گئے ہیں۔ جن سے بھارت کے تاریخی و تہذیبی پس منظر پر روشنی پڑتی ہے۔

آسٹریلیا میں مقیم بھارتی ہائی کمشنر شری دلیپ سنگھ جی نے اس موقع پر اظہارِ خیالات کرتے ہوئے کہا کہ اس نمائش کا انتظام بھارت اور آسٹریلیا کے اچھے تعلقات کو زیادہ مضبوط بنانے کے لئے کیا گیا ہے۔ انھوں نے سڈنی کی نیشنل آرٹ گیلری کے ٹرسٹیوں کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے (ٹرسٹیوں نے) اس نمائش کے انعقاد کے لئے نہ صرف جگہ مہیا کی بلکہ منتظموں کو ہر ممکن مدد بھی دی۔

رائٹ آنریبل مارٹن نے اپنی افتتاحی تقریر میں شری جواہر لال نہرو کی تحریروں کے اقتباسات کے حوالے سے کسی قوم کی زندگی میں فن کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ شری نہرو نے فن کی اہمیت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے۔ اس سے بہتر موجودہ زمانے کا کوئی اور شخص نہیں لکھ سکتا۔" بھارت میں پچھلے سال کی اپنی آمد کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے شری نہرو کی مہمان نوازی اور حسنِ سلوک کے لئے شکریہ ادا کیا۔ آرٹ گیلری کے پریزیڈنٹ مسٹر جے والڈ ہاؤس نے بھی اس موقعے پر اپنی تقریر میں کہا۔ کہ یہ نمائش نہ صرف بھارت کے ماضی و حال بلکہ مستقبل کی بھی آئینہ دار ہے۔"

آسٹریلوی مقالہ نویس میجل براؤن نے اس نمائش پر ایک مضمون میں لکھا ہے کہ بھارت کے فن کاروں نے آسٹریلوی فن کاروں کے مقابلے میں لوگوں کی زندگی کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ مضمون مذکور میں اُن بھارتی فن کاروں کی زندگی کے مختصر حالات بھی شائع کئے گئے ہیں۔ جن کے فن کے نمونے اس نمائش میں پیش کئے گئے ہیں۔

فراق گورکھپوری

رُباعیاں

(بیماری کے بستر سے)

حضرتِ فراق گورکھپوری اگست کے آغاز سے ے کر ڈھائی مہینے تک بہت سخت بیمار رہے۔ بیک وقت دو مہلک امراض کے حملے اُن پر ہوئے۔ شروع اکتوبر میں آپ کان پور کے اُرسلا ہارسمین میموریل ہسپتال کے ایک اسپیشل پرائیویٹ وارڈ میں داخل ہوگئے۔ مشہور ترین ڈاکٹروں کے مشورے سے نشتر کا انتظام ہوا شکر ہے کہ نشتر کامیاب رہا۔ اگرچہ نشتر کے بعد ایک رات تک حضرت فراق کی حالت بہت نازک رہی۔ ۱۷ اکتوبر سے حضرت فراق کی حالت ایسی ہوگئی کہ وہ بستر پر چت لیٹے لیٹے تکیوں کے سہارے کچھ لکھ سکیں۔ یہ رباعیاں بیماری کے زمانے اور قیامِ ہسپتال کی یادگار ہیں۔ مقامِ مسرت ہے کہ آپ اب شفایاب ہو کر الہ آباد میں واپس آچکے ہیں (ادارہ)

اے ماتئ کائنات مجھ میں آجا
اے رازِ صفات و ذات مجھ میں آجا
سوتا سنسار جھلملاتے تارے
اب بھیگ چلی ہے رات مجھ میں آجا

صحرا میں زماں مکاں کے کھو جاتی ہیں
صدیوں بیدار رہ کے سو جاتی ہیں
اکثر سوچا کیا ہوں خلوت میں فراق
تہذیبیں کیوں غروب ہو جاتی ہیں

کھوئی ہوئی ہستی کا بہم ہو جانا
آزادِ فریبِ کیف و کم ہو جانا
تو رازِ حیات پوچھتا ہے مجھ سے
وہ راز ہے شائستۂ غم ہو جانا

کھلتا نہیں یہ بھید ہے کیا، بات ہے کیا
الہام نہیں اس کو کہ سمجھیں اِلقا
تخلیقِ سخن کے وقت کانوں میں فراق
اکثر پرِ جبریل کی آتی ہے صدا

یہ تیری خوشی بھی ہے فقط خوش فہمی[1]
کیوں چاشنیٔ غم کی ہو ہستی میں کمی
سنسار میں جس چیز کو چھو دیتا ہوں
مل جاتی ہے فراق اشکوں کی نمی

اک دن شاعر حریمِ قدرت میں گیا
ان گنت[2] مشیتوں کو جانچا، پرکھا
اور اُن میں آخری مشیت یہ تھی
انساں کا مشیتوں پہ قابو پانا

ہر ساز سے ہوتی نہیں یہ دھن پیدا
ہوتا ہے قسمتوں سے یہ گُن پیدا
گہوارۂ تہذیب میں صدیوں پل کر
ہوتا ہے حیات میں توازن پیدا

قبل اس کے کہ ہو فیصلۂ خیر و شر
جینے کا ثبوت دے زمانے کو بشر
بے حس کردارِ نیک سے موت بھلی
نامرد اخلاق سے جرائم بہتر

۱۔ یہ قافیہ جائز نہیں ۲۔ 'گنت' میں نون مفتوح ہے (ادارہ)

گو بزمِ سخن میں آپ لائے تشریف
خوش ہوں گے سُن کے قافیہ اور ردیف
اس کا کیا کیجئے گا اے حاکمِ وقت
احساسِ لطیف سے جو ہو گی تکلیف

واعظ تری جنّت ہے فقط وہم و گماں
ہے رُوکشِ فردوسِ بریں باغِ جہاں
تو اِس کو فریبِ رنگ و بُو کہتا ہے
تنکا بھی ہے اس باغ کا رشکِ رگِ جاں

الفاظ کے پردوں میں کرو اس کا یقیں
لیتی ہے سانس نظمِ شاعر کی زمیں
آہستہ گنگناؤ میرے اشعار
ڈر ہے نہ مرے خواب کچل جائیں کہیں

اے شیخ مآلِ زُہد و تقویٰ معلوم
دنیا ہی نہ ہاتھ آئی تو عقبیٰ معلوم
انکار ہے ماسوائے اللہ سے تجھے
خاموش کہ ماسوائے دُنیا معلوم

عورت رُوحِ روانِ تہذیبِ بشر
ہے پرتوِ رُخ جلوہ دہِ قلب و جگر
عورت کی وہ ذات ہے ازل سے جو فراق
ہستی کو لئے جاتی ہے آگے، اُدھر

اک حلقۂ نور تھا ابد کا منظر
آویزاں بے شمار خورشید و قمر
تا حدِّ نظر سلسلۂ موجودات
ہر شے سے اُبھر رہی تھی تاریخِ بشر

اِک راز سے کر رہا ہوں تجھ کو آگاہ
ممنوع و حرام کچھ نہیں ہے واللہ
جس کام میں محویّت کامل نہ رہے
اے دوست سمجھ لے کہ ہے وہ کامِ گناہ

تُو بزمِ سخن میں نغمہ خواں ہوتا ہے
مطرب مجھے کچھ اور گماں ہوتا ہے
نغماتِ خوش آہنگ کے ہر پردے میں
اک سازِ سکوتِ بیکراں ہوتا ہے

پاتے جانا ہے اور نہ کھوتے جانا
ہنستے جانا ہے اور نہ روتے جانا
اوّل اور آخری پیامِ تہذیب
انسان کو انسان ہے ہوتے جانا

شاعر کے تصوّرات ہیں کتنے حسیں
اک عالمِ رنگ و نور رقصاں ہے کہیں
جیسے دمِ صبح لہلہاتی کرنیں
جب چوم رہی ہوں وہ ہمالہ کی جبیں

ہنگامۂ روزگار دم لیتے ہیں
سنسار کا ہم بھید بھرم لیتے ہیں
یہ لمحے وہ ہیں جب دلِ شاعر میں فراق
کچھ رمز و کنایاتِ جنم لیتے ہیں

تین سال پہلے

قرونِ وسطیٰ میں راجستھان بالخصوص میواڑ نے ایسی شخصیتوں کو جنم دیا ہے جن کی بہادری، عظمت اور شجاعت کے کارناموں نے تمام ادوار کے معاصرین اور مستقبل کی نسلوں کے تخیّل کو جِلا بخشی ہے اور اُن سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔ افسانوی تلوار والے باپا راول، فاتح رانا کُمبھا، بے مثال مقدس پجارن میرا، عصمت شعار پدمنی جس کی محبت اور عقیدت نے اپنی قربانی ہی میں معراج حاصل لیا، بہادر اور آدرشی انسان رانا پرتاپ، نامور جرنیل راجہ مان سنگھ، شور برد کا اس انڈو اسلامک دور کی گوناگوں شخصیت مرزا راجہ جے سنگھ، یہ تابناک ستاروں کا ایک ایسا جھرمٹ ہیں جس سے روشنی اور اندھیرے کی ملی جلی وسیع فضا جگمگا رہی ہے۔ اس کے بعد کا دور ایک دردناک تضاد کا دور ہے کیونکہ اس دور میں اقت کی جگہ ٹالمٹول نے لی اور ان لوگوں کو افغان اور مرہٹہ لٹیروں کے جتھوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بُری طرح سے ستائے ہوئے راجشاہی نظام کو سکون اور اطمینان کے ساتھ کمپنی سرکار کے دامن میں پناہ لینا پڑی۔ دیہاتی علاقے جن کی جڑیں جاگیردارانہ نظام میں پیوست تھیں اپنی گزشتہ عظمت کے سہارے زندگی بسر کرتے ہوئے اور اپنے مقامی سرداروں کے سامنے سر جھکاتے ہوئے ہر گزرتے دور کو ایک خاموش جذبۂ تسلیم و رضا کے ساتھ دیکھتے رہے۔ تاآنکہ بیسویں صدی نے اپنی روشنی میں ایک آہستہ رَو تبدیلی کا مشاہدہ کیا۔ اور وقت نے تاریخ کے اوراق میں نئی عبارت لکھنا شروع کی۔ اب راجستھان کے پردۂ تاریخ پر ایسی شخصیتیں اُبھرنا شروع ہوئیں جن کی سیاست دانی اور انتظامی قابلیت مسلّم حیثیت رکھتی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ پڑوسی برطانوی ہند کی جمہوری طاقتوں سے بھی لگاؤ پیدا ہوا اور آزادی اور حبِّ وطن کے جذبے سے سرشار ہو کر اس کے نوجوانوں نے اُن تمام محاسن کے درمیان جو یہاں کے لوگوں کی زندگی کو ایک یگانہ پن کے مختصر رشتے میں جکڑے ہوئے تھے جمہوریت کی داغ بیل ڈالنا شروع کر دی۔ جمہوریت کی ابتدا جے پور بیکانیر اور جودھپور میں ہوئی۔ لیکن جمہوریت کے ان ننھے ننھے بچّوں کو عارضی دَور و کرب کی وہ تمام اذیتیں اُٹھانا پڑیں جو ہر بچّے کو دانتوں کی پیدائش کے وقت برداشت کرنا پڑتی ہیں۔

۲۔ اسی تبدیلی کے وقت جب کہ کٹک اور ناگپور کے فتوحات ابھی تازہ تھے اور جوناگڑھ کی کامیابی کا ڈنکا ملک میں بج رہا تھا۔ سردار پٹیل پہلی بار دسمبر ۱۹۴۷ء میں مہاراجہ جے پور کی سلور جوبلی کی تقریبات میں شرکت کے لئے جے پور تشریف لے گئے۔ مجھے اس امر کی حقیقت میں کوئی شک نہیں کہ تاریخ کے اس سارے پس منظر کا جسے میں نے یہاں مختصر طور پر بیان کرنے کی ایک سعیِ ناکام کی ہے سردار مرحوم نے ذہنی طور پر مکمّل جائزہ لے لیا۔ اس جائزے کا نتیجہ بہت جلد ہمارے سامنے آ گیا، کیونکہ اُن کے ریاستی یکجہتی کے پروگرام میں میسور ماڈل پر متحدہ راجستھان کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے اُن تمام بڑی ریاستوں کے انتظامی امور ہیں ۔ ہو گئے جن کے باہمی ملاپ سے راجپوتانہ کی تشکیل عمل میں آئی تھی۔ لیکن جیسا کہ ہونا چاہیئے تھا اس ماڈل کو عملی صورت دینے کے مشکلات بہت جلد اُبھر آئے۔ اسی اثنا میں چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو باہمی طور پر ملانے کا کام بھی جاری رہا۔ اگرچہ متحدہ راجستھان کی تصویر ہر لحظہ سردار کے پیشِ نظر رہی لیکن حالات کی ضرورت اور محتاط رویہ اس امر کا متقاضی تھا کہ وقتی طور پر راجاؤں کی جذباتی کیفیت اور غیر پختہ سیاسی صورتِ حال کے ساتھ جو اِن علاقوں پر مسلط تھی سمجھوتہ کر لیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب جمہوریت نے جے پور، بیکانیر اور جودھپور کی ریاستوں میں تیز گامی دکھائی تو راجستھان کی پہلی متحدہ ریاست اودے پور کے نامور شاہی خاندان کی قیادت میں قائم ہوئی۔

۳۔ راجستھان کی ترقّی کی راہ میں جو سردار پٹیل نے اس کے لئے متعین کر دی تھی دوسرا سنگِ میل وہ تھا جب وہ جنوری ۱۹۴۹ء میں اودے پور تشریف لے گئے۔ اودے پور سے چتوڑ اور واپسی کے اسپیشل ٹرین کے سفر

ہی میں راجستھان کانگریس کے اربعہ عناصر شری جے نرائن ویاس، شری مانکیہ لال ورما، شری گوکل بھائی اور پنڈت ہیرالال شاستری کے ساتھ باہمی مشاورت سے عظیم تر راجستھان کے قیام کے بنیادی امور طے ہو گئے۔ چتوڑ میں آپ کی تشریف آوری اس حقیقت کی مظہر تھی کہ آپ کے دل و دماغ پر راجستھان کی بہادری اور حبِ وطن کے عظیم اتہاس کا گہرا اثر ہے۔ اس کے علاوہ اس سے سردار کے دماغ کے اُس اہم تصوّر کی بھی ایک جھلک نمایاں ہوتی جس میں نئے راجستھان کا نقشہ واضح صورت اختیار کر چکا تھا۔ چتوڑ کی مقدّس سرزمین کے لئے سردار کے دل میں جو احترام تھا اُس کے اثرات اُن کے چہرے پر اس وقت بخوبی دیکھے جا سکتے تھے۔ جب وہ قدم بہ قدم ایک مقدّس مقام سے دوسرے مقدّس مقام کی طرف بڑھے۔ اس احترام کی معراج یہ تھی کہ آپ نے اس مقام کو عصرِ حاضر کی ایک ناشائستہ ضرورت، پولیس ٹریننگ اسکول سے جو ایک گم شدہ خواب کی خاموشیوں کے درمیان موجود تھا نجات دلانے کی واجب التعمیل ہدایت جاری کر دی۔ جب آپ اپنے بائیں جانب ماؤنٹ آبو کا مشاہدہ کرتے ہوئے اس کی فصیل پہ کھڑے ہوئے اور آپ نے راجستھان کی پہاڑیوں اور ریت کے ٹیلوں کے اُس پار دل کی نگاہوں سے ہندوستان کی ناقابلِ تسخیر سرحدوں کا جائزہ لیا تو آپ میری جانب متوجّہ ہوئے اور تفصیل سے راجستھان کی جنگی اہمیت کا ذکر کیا اور بتایا کہ ہندوستان کی ترقّی کے محافظ کے طور پر راجستھان کی کیا اہمیت ہے اور کس طرح متحدہ راجستھان کا خواب جو رانا پرتاپ نے دیکھا تھا، ایک حقیقت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ میں بخوبی جانتا تھا کہ آپ کے دل و دماغ تاریخِ چتوڑ کے مسحور کن مناظر سے خاص طور پر متاثر ہوئے ہیں۔ چنانچہ اُدے پور میں جو آپ نے تقریر کی اُس کا جذبات کے ساتھ گہرا تعلق تھا۔

۴۔ اودے پور میں آپ کی اس تشریف آوری کے بعد ڈھائی مہینے کا ایک ایسا دور شروع ہو گیا جسے راجستھان میں شدید سیاسی سرگرمی، حکمرانوں کے ساتھ ماہرانہ گفت و شنید اور با مشقت اور با احتیاط تیاریوں کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ قوم کے ایک نئے معمار کے انسپریشن کی بدولت گزشتہ دور کے ایک ہیرو کا محبوب خواب ایک حقیقت میں تبدیل ہو گیا اور راجستھان کی نئی ریاست معرضِ وجود میں آ گئی۔ جس کی سالگرہ ہم آج کے ہتمم بالشان روز منا رہے ہیں۔ جے پور کے سٹی پیلیس کے بارونق اور تاریخی مجمع کا منظر میرے ذہن میں ہمیشہ تازہ رہے گا۔ شاہی خاندان کے ایک فرزند جنہیں راج پرمکھ کے طور پر حلف دلایا گیا ہے، الحاق کرنے والی ریاستوں کے راجوں کا اپنے اپنے مخصوص لباس میں اجتماع، سفید کھدر میں ملبوس مقامی کانگریسی سیاست دان، ان کے ساتھ جاگیردارانہ نظام کے باقی ماندہ نمائندے، ریاستی وزارت کے مستعد، پُر جوش لیکن وفا شعار افسر اور پرانے درباری رسوم کے علامات مل جل کر اس موقعے کو ایک رونق اور ایک امتیازی کیفیت بخش رہے تھے لیکن ان سب سے بلندی پر سادہ اور صاف کپڑوں میں ملبوس ہندوستان کے اتحاد اور یک جہتی کے معمار کی قدآور اور جاذب شخصیت تھی۔ موزوں اور رسمی الفاظ میں آپ نے نئی ریاست کے راج پرمکھ کو مقررہ حلف دلوایا۔ اس کے بعد نئے چیف منسٹر نے وفاداری اور رازداری کا حلف لیا اور عالمگیر مسرّت و شادمانی کے عالم میں سمستہ راجستھان معرضِ وجود میں آیا جس کی پُشت پر ایک قابلِ فخر ماضی تھا اور سامنے ایک تابناک مستقبل۔

لیکن یہ مسرّت دراصل دوگونہ مسرّت تھی۔ نئی ریاست کی پیدائش کے علاوہ یہ مسرّت سردار کے موت سے بال بال بچ نکلنے کی مسرّت بھی تھی۔ کیونکہ ایک شام پہلے اُس طیارے کو جس میں آپ سفر کر رہے تھے دہلی سے جے پور آتے ہوئے حادثہ پیش آ گیا تھا۔ جب مسلسل چار گھنٹے تک سردار کے متعلق کچھ علم نہ ہو سکا تو سارے دیش پر مایوسی، تشویش اور افسردگی کا عالم طاری ہو گیا۔ مگر جب اس امر کی اطلاع ملی کہ سردار بالکل خیریت سے ہیں تو شدید طور پر اضطراب میں پھنسی ہوئی قوم کی ذہنی کیفیت بالکل دوسری جانب منتقل ہو گئی اور غم و اندوہ کی جگہ اُسی شدّت کے ساتھ انبساط و شادمانی نے لے لی۔ اس حادثے سے بچ نکلنے کی داستان اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے سے نشر کر دی گئی۔ قوم راجستھان کی خوشی میں نہ صرف اُس کے جنم ہی پر شریک نہ ہوئی بلکہ اس مردِ مجاہد کے بچ نکلنے کی خوش خبری پر بھی جس نے بھارت کی رجواڑہ شاہی کو ملکی اتحاد کے عوامی ڈھانچے میں سمونے کا معجزہ دکھایا تھا، اور بد نظمی اور بدانتظامی کی اُن تمام طاقتوں کو جنہوں نے برطانوی اقتدارِ اعلیٰ کے رختِ سفر باندھتے پر سر اُٹھایا تھا راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

آج وقت ہے کہ راجستھان کے رہنما اُس تاریخی لمحے کی ایک جھلک کو اپنے قابو میں کریں اور اُن اُمیدوں اور توقّعات کو یاد کریں۔ جو اُس لمحے نے نوزائیدہ ریاست کے عوام کے سامنے رکھے تھے۔ انھیں اس وقت ایک سوال کا جواب دینا چاہیئے: کیا وہ تقریب راجستھان کے شایانِ شان تھی اور کیا ہم اُس تقریب کے شایانِ شان ہیں۔ اس جواب اور اس کے خلوص پر اُن امیدوں اور وعدوں کے پورا ہونے کا انحصار ہے۔

شکیلہ اختر

میں ہوں اپنی شکست کی آواز

بھرا بھرا یا گھر تھا سارے لوگ مدت کے بعد بڑی بیگم کی خدمت کے لئے ایک بار پھر اکٹھے ہوئے تھے، مگر صرف ایک بڑی بیگم کے نہ رہنے سے گھر میں وہ رونق ہی نہ تھی۔ وہ گونجتی ہوئی پُر وقار آواز اب کہیں بھی سُنائی نہ دیتی تھی اور برآمدے میں چوکی کا فرش بڑی بیگم کے بغیر اُجاڑ نظر آتا تھا۔ بڑی دُلھن ایک زمانے پر ساس کی بیماری کے بہانے سُسرال آئی تھیں۔ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ تر اپنے میکے ہی رہا کرتی تھیں اور کبھی کبھار گئیں بھی تو اپنے میاں کے ساتھ ان کی نوکری پر۔ سُسرال جب بھی آئیں دو چار دنوں کے لئے اور وہ بھی مہمانوں کی طرح۔ ان کے بچّے تو اس گھر کو اپنا گھر بھی نہ سمجھتے تھے گھبرائے گھبرائے اور شرمائے ہوئے سے رہتے تھے۔ بڑی دُلہن خود ہی سسرال کے گھرانے سے بہت گھبرایا کرتی تھی۔ اور بڑی بیگم سے ان کا مزاج بھی مختلف تھا۔ امیر گھرانے کی اکلوتی بیٹی جو اپنے ماں باپ کے ہاتھوں کا پھپھولا تھی بھلا وہ ساس سُسر سے دبنا کیا جانتی؟ اور وہ بھی ہر گھڑی کی نکتہ چینی "اُلٹا آنچل مت اوڑھو" "اس گھر میں ٹیڑھی مانگ نہیں نکالی جائے گی۔" پیروں میں حد سے حد چپل پسند کیا جا سکتا ہے۔ جوتا پہن کر سپاہی والی چال شریفوں کے گھرانے کی نہیں" اور اتنی حد بندیوں میں کون رہنا چاہتا؟ بچاری منجھلی دُلہن کو فیشن سے غرض ہی کیا تھی۔ اور چھوٹی دُلہن کو ساس کی خوشی کے لئے سب کچھ کرنا تھا۔ دُور کے میاں ماں کو خوش رکھ کر ہی تو زمینداری کے کل سفید و سیاہ کے مالک بنے ہوئے تھے اور بڑی بیگم کو ناخوش رکھ کر ایک دن بھی اس گھر میں نباہ ہو سکتا تھا مگر بڑی دُلھن کو اس سیاست سے کوئی غرض نہ تھی وہ میاں کی نوکری پر جگہ جگہ گھوم کر دنیا کو دیکھ چکی تھیں۔ اُن کی بڑی لڑکی آئی۔ اے میں تھی اور چھوٹی لڑکی ناہید میٹرک میں، سب سے بڑا لڑکا انور بی۔ اے میں تھا اور چھوٹا سرور ساتویں میں۔ یہی مختصر سا خاندان بڑی دُلہن کا تھا۔ بڑی بیگم کے لئے سب سے بڑا کو فت ثریا اور ناہید کا اسکول اور کالج میں پڑھنا تھا، اپنے بڑے لڑکے اطہر علی کے پاس انہوں نے کتنے ہی خط لکھے کہ "خدا کے لئے شرافت اور خاندان کا نام مت اُچھالو۔ لڑکی کا گُن اس کی سیرت ہے، تہذیب اور شائستگی سکھاؤ بیرسٹری پڑھا کر کمانے کی ضرورت نہیں ہے" مگر اطہر علی بیوی کے سامنے دم نہ مار سکتے تھے، پھر وہ بھی زمانے کو سمجھتے ہوئے بہت نہیں تو تھوڑی ہی سہی مگر تعلیم کو ضروری چیز جانتے تھے اور بڑی بیگم اطہر علی کی لڑکیوں کو یاد کر کے دل مسوس لیتیں "ہائے ثریا اور پروین میں پھر فرق ہی کون سا رہا۔ بس یہی ایک کہ ثریا کا خُون سادات کا ہے"۔ "اللہ اپنا رحم کرے" وہ ایک تھکی ہوئی ٹھنڈی سانس لے کر کہتیں۔ "بھلا اپنی بسما میں کس بات کی کمی ہے؟ اردو فارسی عربی وہ سب آخر گھر ہی پر پڑھ رہی ہے نہ؟ انگریزی بھی تھوڑا بہت سیکھ ہی رہی ہے پھر اسکول میں لڑکیوں کو جربانک بنانے سے کیا فائدہ۔ مگر ہاں وہ جو پروین کی ماں آ آ کر کے اپنی بیٹی کو گانا سکھاتی ہیں وہ البتہ نہیں جانتی"۔ بڑی بیگم کی موت کا منجھلی دُلہن پر اثر زیادہ تھا۔ چھوٹی دلہن بڑی جذباتی تھیں بات بات پر اُن کی آنکھیں اُبل پڑتی تھیں، بڑی بیگم نے ہمیشہ بہوؤں کو بیٹی کی طرح سمجھا بھی تھا وہ کہتی ہی تھیں کہ بہوؤں کو پا کر بیٹی کے نہ رہنے کا غم میں بھول گئی۔ ہزار ڈانٹ ڈپٹ سہی مگر پھر بھی محبت بھری نظر —— اور اب وہی پیار بھری نگاہوں کے لئے جی ترس رہا تھا۔ بڑی دُلہن کو ساس اور سُسرال سے کبھی واسطہ ہی نہ رہا تھا۔ انسانی ہمدردی ضرور تھی مگر اس سے زیادہ انھیں اس بات کا افسوس تھا کہ ہم لوگوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ جنم بھر ہم لوگ اس گھر سے باہر رہے مگر ترکہ تینوں بھائیوں کا برابر ہی لگا۔ پھر منجھلی دلہن کو برابر کے حصے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ایک اکیلا ریاض اور کہاں اُن کے چار چار بچے" دلی تکلیف کے ساتھ وہ اندر ہی اندر پکتی رہتیں مگر ماسوائے اشارے کنایے کے کھل کر بول نہ سکتی تھیں۔ اطہر علی کو بیوی کی محبت کے ساتھ خاندان اور ماں کی عزّت کا بھی خیال تھا۔ وہ بیوی

کی تیکھی نگاہوں کو پہچان رہے تھے۔ دو چار دنوں تک تو خاموش رہے۔ آخر ایک دن سب کے سامنے گھما پھرا کر انہوں نے بیوی کو سُنا ہی دیا کہ "اماں کی وصیّت جان سے زیادہ عزیز ہے" دوسرے مجھلی دلہن اور ریاض کے ہاتھ میں بھیک کا ٹھیکرا نہیں پکڑایا جا سکتا تھا"۔ اور ایسے مہذب گھرانے سے اس طرح کی اُمید بھی کی جا سکتی تھی۔ منظہر علی تو ہمیشہ ہی سے اپنی دونوں بچیاں سیما اور سُہیلہ کی طرح ریاض کو بھی اپنا ہی لڑکا سمجھتے آئے تھے' اور بڑی بیگم نے اگرچہ مخصوص طور پر کبھی اس بات کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن وہ اپنے مرحوم بچے اظہر علی کی ایک آخری نشانی کو حد سے زیادہ چاہتی تھیں وہ ریاض کی چُلبلی اور ضدی طبیعت ہی سے ہمیشہ مشکوک رہیں اور اسی لئے اُنہوں نے ریاض کو اپنے سامنے ہی ماسٹروں کو رکھ کر پرائیویٹ طور پر میٹرک کا امتحان دلوایا اور اب اتنی کم سنی ہی میں وہ لڑکا میڈیکل کے پہلے سال میں تھا۔ ڈاکٹری کی اعلےٰ تعلیم کے لئے دادی اور چچا کی تو دلی تمنّا تھی کہ وہ کہیں باہر بھیجا جاتا۔ مگر اب تو جانے کے نام ہی سے وحشت ہونے لگتی تھی۔ جیسے بھی رہے مرحوم کی نشانی اللہ سلامت تو رکھے بڑی بیگم کی بس یہی ایک دُعا تھی۔ ریاض میاں تو دادی اماں کی آنکھوں کا تارا بنے رہتے۔ مگر ہزار خوبی پر وہی ایک پرانا عیب تھا۔ جس کو بڑی بیگم کسی صورت میں بھی پسند نہ کر سکتی تھیں۔ اور آخر دم تک بس وہی کانٹا ان کے دل میں چُبھتا رہا کہ ریاض' اسلم کے بچّوں سے چھپ چُھپ کر ملتا ہی کیوں ہے آخر"؟ بچّہ سے سیانا ہوا اور سیانا سے ماشا اللہ اب جوان ہونے کو آیا تھا مگر اسلم کے گھر کے بغیر جیسے اس کو چین ہی نہ ملتا تھا۔ بہانے پر بہانے کرتا' دوپہر اور رات کو چھپ کر جاتا' برستے ہوئے پانی میں چپکے سے نکل جاتا۔ مگر دادی اماں کو آخر پتہ چل ہی جاتا۔ اور صاحبزادے کی یہ چال اُن کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اور کبھی کبھی تو وہ اس قدر گھبرا اٹھتیں کہ ان کا دل چاہتا کہ کالج کبھی بند ہی نہ ہو اور اچھا ہے کہ ریاض گھر سے باہر شہر ہی میں رہے۔ اور اب تو ڈانٹ ڈپٹ کا زمانہ بھی نہ رہا تھا۔ بھلا جو سیانا لڑکا بڑوں کے تیور بھی نہ پہچان سکے تو پھر اس کے آگے زبان خالی کرنا مناسب نہ تھا۔ منجھلی دلہن بڑی بیگم کے چہرے کی جھرّیوں میں چمکتی ہوئی بجلیوں کو دیکھ دیکھ کر لرز اٹھتیں۔ لاکھ سمجھاتیں مگر ریاض معصوم ہنسی ہنس کر ماں کو بہلا دیتا۔ امّی جان۔ اس گھر کے بعد آخر جاؤں تو کہاں

ایک ہی جگہ بند رہنے سے طبیعت جو گھبرا جاتی ہے۔ اسلم چچا کے یہاں ٹینس لان ہے پھر ان کے لڑکے شوکت' اقبال اور پرویز ہیں۔ ان سے باتیں ہوتی ہیں پھر پرویز میرا کلاس فیلو بھی تو ہے"۔ بڑی بیگم بے حد دوربین تھیں وہ زبان سے تو کچھ نہ کہتیں مگر ہر چیز کا بڑی خاموشی سے جائزہ لیتی رہتی تھیں' وہ ایک قابل اور تجربہ کار مالی کی طرح سیما کو سینچ رہی تھیں۔ جو تہذیب تعلیم اور سلیقہ وہ اس کو سکھا رہی تھیں وہ ایک اعلیٰ شائستہ اور اونچے گھرانے کا طرۂ امتیاز تھا وہ ہر اونچی اور نیچی بات کا خیال رکھتیں۔ مگر جو چیز انہیں ہر گھڑی سیما میں کھٹکتی رہتی تھی وہ اس کی جذباتی طبیعت تھی جو اس کو اپنی ماں سے ورثہ میں ملی تھی اور بڑی بیگم اس بات کو اچھی طرح سے جانتی تھیں کہ جذبات کے طوفان میں ساری چیزیں بڑی آسانی سے بہہ جا سکتی ہیں۔ ریاض ضدّی تھا اور اتنی حدبندیوں اور دباؤ پر بھی اس کی روح دب دب کر اُبھر ہی جاتی تھی۔ اور انہی دونوں بچّوں کے مستقبل کے خیال نے بڑی بیگم کو جینے جی کبھی چین نہ لینے دیا۔ ریاض کو سیما اور سہیلہ دونوں اپنی بہنوں کی طرح عزیز تھیں وہ ایک ساتھ بڑھے اور پلے تھے ایک ہی تہذیب کے سانچے اور ایک ماحول کے پروردہ تھے۔ مگر ایک ہی راستے پر ساتھ چلتے چلتے بھی ریاض کبھی کبھی بہک جاتا تھا اس کو جہاں بہت سی پرانی باتیں پسند تھیں وہاں نئی تہذیب اور زندگی کی نئی لہروں کو بھی وہ عزیز رکھتا تھا۔ سیما اور سہیلہ کو بہت زمانے تک اپنی سگی بہن ہی سمجھتا رہا تھا اور ابھی تک اپنے دماغ میں جمے ہوئے بچپن کے اس نقش کو وہ دور نہ کر سکا تھا۔ وہ سیما کو چھیڑنے کے لئے ہمیشہ "بلی" کہہ کر پکارتا اور جب بھی وہ چھٹیوں میں گھر آتا اپنی "بلی" اور سہیلہ کے لئے ٹوفی کے پیکٹ اور لیمن چُوس ضرور لاتا۔ مگر ان سات پیکٹوں پر سہیلہ یہ کہہ کر قبضہ جما لیتی کہ "ہونہہ" جیسے باجی ابھی تک بچہ ہی ہیں کہ ـــ اور بڑی بیگم مُسکرانے لگتیں" ہاں بیٹا ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے سُہیلہ۔ سیما کے لئے کتابیں لایا کرو۔ کشیدہ کی سوئیاں' سوئیٹر بننے کے لئے اُون لا دیا کرو۔ بھلا اب وہ بچّہ تھوڑی ہی ہے"۔ ریاض جب بھی آتا اس کو تاکید تھی کہ سیما کی پڑھائی کا جائزہ لے لیا کرے۔ اور کون کون سی کتابوں کی ضرورت ہے وہ اپنی پسند سے بتائے۔ اور کبھی کبھی دادی اماں کو دکھانے کی غرض سے وہ سیما کو پڑھانے لگتا۔ لالٹین کی روشنی کتابوں پر پڑتی رہتی اور میز کے دوسرے سرے پر سیما کے آگے بیٹھ کر وہ آہستہ سے کہتا۔ ہاں رے بلّی تو ذرا زور سے پڑھتی جا' جب تک میں اپنی اس کتاب کو ختم کر ڈالوں۔ اور پڑھنے

پڑھتے بھی وہ چپکے سے بول اٹھتا - مگر دیکھو رے بی اس طرح سے پڑھنا بھی کوئی پڑھنا ہے آج مولوی صاحب نہیں آئے کل ابا جان کو انگریزی پڑھانے کی چھٹی نہ ملی - ماسٹر رکھ لو سمجھیں ؟ دیکھو پارو میٹرک میں پہنچ رہی ہے اور ایک بچاری تم ہو کہ بس انگریزی کی انہی دو چار کتابوں کو پڑھ کر سمجھتی ہو کہ میں بھی انگریزی جان گئی" - اچھا تو سُن لو - وہ سرگوشی میں کہتا - دادی اماں کو بہلا پھسلا کر راضی کر لے پھر پارو کے ساتھ مل کر پڑھا کر - ہائے میری اچھی سی دادی اماں کب اسلم چچا کے گھرانے سے خوش ہوں گی" - ریاض بڑے حسرت سے ٹھنڈی سانس لے کر کہتا اور سیما اس کی ایسی باتوں کو سن کر بجھ جاتی تھی پروین اس سے اچھی تھی پروین کو سب ہی اچھا کہتے تھے مگر اس بچاری کے اختیار میں کیا تھا وہ تو کھلے دریچے کے پاس بیٹھ بھی نہ سکتی تھی اور ایک پروین تھی جس کو وہ دو ماسٹر پڑھانے کو آتے تھے - تو پھر آپ ہی مجھ کو پڑھا دیا کیجئے نا ؟ میں آپ کے جانے کے بعد بھی سبق یاد کرتی رہوں گی" - ہوں جیسے کہ میں تجھے ایک ہی بار سب کچھ گھول کر پلا دوں گا کہ" تو پھر آپ پروین کو کیسے پڑھاتے ہیں" ؟ سیما نے دبی تکلیف کے ساتھ کہا - اور تجھے یہ کہا کس نے ؟ ریاض اس اچانک حملے سے گھبرا گیا - کسی نے بھی نہیں - سلیے پھوپھی کے یہاں پروین ملی تھی اسی نے کہا کہ ریاض بھیا سے پڑھنے میں بہت مزہ ملتی ہے" - تو پھر دادی اماں سے نہ کہنا سمجھی بی - اچھا تو روز مجھ سے انگلش پڑھ لیا کر" - ریاض نے جب سیما سے سمجھوتہ کر لیا تو اس کے دل پر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا - بھولی بھالی سی معصوم سیما اس کی کتنی پیاری بہن تھی —— معصوم ہنسی ہنسنے والی سیما کو بہلا دا دے دینا کوئی مشکل نہ تھا مگر ثریا کی شوخ نگاہوں سے ریاض اپنے کو بچا نہ سکتا تھا - جیسے ہر گھڑی ثریا کو اس کی ٹوہ لگی ہی رہتی تھی" کہاں تھے بھائی جان ؟ ابھی دادی اماں آپ کو ڈھونڈ رہی تھیں" اور وہ جان جان کر دادی اماں کے پاس کسی نہ کسی بہانے سے ریاض کو بٹھائے رکھتی - بزرگوں کی خدمت سے عظمت ہے" ہاں بس یاد رکھئے گا" - دادی اماں کا مرض بڑھتا ہی گیا اور آپ دن کے ساتھ ساتھ رات کی بھی ڈیوٹی لگا دی گئی تھی - پوتے، پوتیاں، بہو اور بیٹے ہر وقت دادی اماں کی دیکھ بھال میں لگے رہتے تھے اور جب ایک مہینہ کی لمبی خدمات کے بعد بھی بچاری بڑی بیگم رحلت کر گئیں تو دوسرے دن اپنے آنسوؤں کو پونچھتی ہوئی ثریا ریاض کے کمرے میں جا کر بولی - لیجئے آپ کرتے پھرئیے جی بھر کے سیر سپاٹے - قصہ ختم ہو گیا - مگر ثریا نے جب ریاض کی روتے روتے ہوئے سوجی ہوئی آنکھوں کو دیکھا تو اس کا جی دکھ گیا - تو پھر کہیں اور نہ جایا کیجئے میرے بھیا - کسی دوسرے کو ہمارے غم سے کوئی غرض بھی ہے ؟ اسلم چچا کے گھر سے تو کوئی تعزیت کے لئے بھی نہیں آیا - وہ لوگ اپنے کو بہت بڑا جو سمجھتے ہیں" اور ریاض اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ثریا کو صرف تکتا رہا - اس کے لرزتے ہوئے لب کتنے نازک تھے - اور جھومتی ہوئی گھٹاؤں کی طرح اس کی سیاہ آنکھوں میں کہاں سے اچانک اتنی کشش بھر گئی تھی - اس کی روتی ہوئی آنکھیں یکدم سے جھک گئیں - پارو، ناہید اور ثریا ابھی تک اس کی زندگی کے پردے پر بس یہی تین تصویریں ابھر سکی تھیں - سیما کی تصویر میں وہ رنگ پر رنگ بھرتا چلا گیا - مگر وہ بھولی سی سیما اس کے لئے ایک ننھی سی عزیز بہن "کے سوا اور کچھ نہ بن سکی، لیکن وہ ثریا کی شوخ نگاہوں کے تعاقب سے بےچین ہو جاتا تھا اور اس کی طنزیہ ہنسی کے نشتر اس کی روح کی گہرائیوں میں اتر جاتے تھے' اور پھر اس کا جی چاہتا کہ کوئی ٹھنڈے ٹھنڈے مرہم کا پھاہا اس کے ان تازہ رستے ہوئے زخموں پر رکھ دیتا —— پُرسکون ٹھنڈا پھاہا - اور اچانک صبح صادق کا سنولایا سا لطیف اجالا اس کو یاد آ جاتا - اور نشہ برساتی ہوئی آنکھیں اس کے تصور میں کہیں دور سے جھلک پڑتیں - آپ ہی آپ پھر اس کی آنکھیں بند ہو جاتیں اور گھنگھریالے دراز بالوں کا خیال آتے ہی اس کا سارا اضطراب مٹ جاتا -

اطہر علی صاحب چھٹی ختم ہوتے ہی واپس چلے گئے مگر بڑی دلہن نے اتنے دنوں میں یہ بات محسوس کر لی تھی کہ اپنے ہی گھر میں یہاں کے آسامی اور رعیتیں میں ان کا کوئی بھی اثر نہیں ہے اور بہت سے لوگ تو ان کو مالکنی کی حیثیت سے پہچانتے تک نہیں' اور یہی بیگانگی بڑی دلہن کو بُری طرح سے کھلنے لگی تھی - بس یہاں جو کچھ تھیں وہ بڑی بیگم کے لئے چھوٹی دلہن تھیں اور ایسے تو منجھلی دلہن کو بھی لوگ سلام کر لیتے تھے' اور اب بڑی بیگم کی جگہ خالی پڑی تھی بڑی دلہن میں اگرچہ بڑی بیگم سا رعب دبدبہ نہ تھا - مگر مزاج تو اعلیٰ تھا - صلاحیت اور واقفیت تو تھی اور اسی لئے کچھ دنوں تک انہوں نے اپنا یہاں رہنا مناسب سمجھا - چھوٹی دلہن نے بڑی بیگم کی چابیوں کا گچھا بڑی دلہن کو تھماتے ہوئے کہا - "بڑی بھابی اماں جان کے بعد اس گھر میں آپ ہی ہیں - اب سارا انتظام آپ دیکھئے - میں اور منجھلی بھابی آپ کی خدمت کے لئے ہر گھڑی حاضر ہیں - اس طرح سے چھوٹے مالک مظہر علی کی حکمت عملی سے ایک اٹھتا ہوا

طوفان دب کر رہ گیا۔

ریاض کو دادی اماں کی موت کے بعد ان کی چاہت کا صحیح احساس ہوا وہ محبت بھری نصیحتیں اس کو یاد آنے لگتیں۔ اور اس کے دل میں کبھی کبھی اک ٹیس سی اٹھ جاتی کہ اس نے اپنی پیاری دادی اماں کو کتنی تکلیف پہنچائی تھی۔ اور اس کا جی چاہتا کہ دادی اماں کی روح کو ہی خوشی پہنچائے۔ اور اس خوشی کے لئے وہ اپنے گرد رنگین سے رنگین اور مضبوط سے مضبوط تر جالے بنتا۔ گھنٹوں کمرے میں بند پڑا رہتا۔ کئی بار ناہید کی جھکی جھکی شرمیلی نگاہوں سے اس کی نگاہیں ٹکرا چکی تھیں۔ دبلی پتلی خوبصورت لڑکی اپنی خاموشی اور گھبرائی ہوئی نظروں میں بہت سی باتیں اس سے کہہ جاتی۔ وہ گھر بھر سے الگ تھلگ رہتی لیکن اس دوری میں بھی قریب تر کھینچ لینے والی کتنی کشش تھی؟ وہ ادھر ادھر دیکھتا "ناہید کہاں ہے"؟ کہیں پڑھ رہی ہوگی چھپ کے۔ بڑی دلہن زیر لب مسکرا دیتیں اور وہ ناہید کو ڈھونڈ کر کہتا "بھئی تمہارے امتحان میں ابھی زمانہ باقی ہے ابھی سے پڑھ کر تو سب کچھ بھول جاؤ گی" اور ناہید اس کو اسی خاموشی سے تکتی ہوئی رہ جاتی ––– بھائی جان۔ رہنے بھی دیجئے اپنی باتیں۔ ہر کسی کو آپ سا مہربان ٹیچر نہیں مل سکتا۔ غریب ناہید ابھی سے نہ پڑھے گی تو پھر اچانک اس پر کسی کی مہربانی ہو جائے گی اور یہ نشتر سیدھا ریاض کے دل میں اتر جاتا تھا۔ بھائی جان کہتے ہوئے ثریا بڑی پیاری لگتی تھی۔ سیب جیسا رنگ آپ ہی آپ گلنار ہو جاتا اور یاقوتی لبوں پر بھائی جان کا لفظ پھسل پھسل پڑتا تھا۔ اور چمکتی ہوئی بجلی کی طرح ثریا کو کہیں قرار نہ ملتا تھا۔ وہ ریاض کے کمرے میں پہنچ جاتی' کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتی۔ الماری کھول کھول کر جائزہ لیتی۔ تکیہ اور سرہانہ اٹھا اٹھا کر ڈھونڈتی۔ پھر آپ ہی آپ ہنس پڑتی' نہیں ملنا بھائی جان ––– اور ریاض کی آنکھوں میں بھی ہنسی ناچنے لگتی۔ "کس چیز کی تلاش ہے تم کو؟ کچھ بھی نہیں ––– یہی ذرا ڈھونڈ رہی تھی میں ––– شاید کسی ایک ہی دل مل جائے کہیں پر" ––– "بڑی شریر ہے تو ثریا"۔ ریاض کھکھلا کر ہنس پڑتا دادی اماں زندہ ہوتیں تو ابھی سر پر جوتیاں پڑنے لگتیں' شکر کرو وہ نہیں ہیں۔

"شکر میں کروں کہ آپ؟ سیما کہتی ہے کہ بھائی جان پہلے طرح طرح کے بہانے سوچا کرتے تھے ––– اور اب؟ گن گاؤ جی۔ اللہ میاں کے گن گاؤ" اور ریاض سوچنے لگتا کہ یہ ثریا اب اس کو پاگل کر دے گی اس کا ہر اک ایک ہی تان پر جا کر ٹوٹتا ہے۔ جالے اس کے چاروں طرف تنتے چلے گئے۔ دو دنوں تک وہ گھر سے باہر نہ نکلا مگر تیسرے دن انور ریکٹ لے کر جاتے ہوئے دیکھ کر اس کی روح بھی چیخ اٹھی اور ایک ہی جھٹکے سے ساری زنجیریں کڑکڑا کر ٹوٹ گئیں اور اس وقت آسمان کی بلندیوں پر سے دادی اماں کے آنسو بھی ٹپک پڑے ہوں گے۔

انور کی فطرت ناہید سے بہت ملتی جلتی تھی وہی اضطرابی آنکھیں' خاموش طبیعت اور تبسم زیر لب' نکھرتا ہوا اجلا سا رنگ اور خوبصورت پیشانی۔ اس کو شاعری سے گہری دلچسپی تھی۔ غالب کا دیوان وہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا اور شعر و ادب کا گہرا مطالعہ اس کا محبوب مشغلہ تھا ––– مگر ہنس مکھ اور ملنسار انور کبھی کبھی گھنٹوں ایسی گہری سنجیدگی میں غرق ہو جاتا تھا جیسے وہ دنیا میں کسی کا نہ تھا اور کوئی بھی اس کا اپنا نہیں۔ اور اب تک کوئی بھی اس کو پہچان نہ سکا تھا' وہ ناہید کی طرح الگ تھلگ نہیں بلکہ سب میں مل جل کر رہنا پسند کرتا تھا خاموش طبیعت کے باوجود وہ سب کی باتوں میں دلچسپی لیا کرتا تھا۔ مگر ہنستے کھیلتے یہ اچانک اس کو کیا ہو جاتا تھا۔

دادی اماں کا بیسواں گزر چکا تھا۔ غم کے بادل ایک حد تک چھنٹ چکے تھے۔ بوڑھی دادی اماں کا سوگ ہی کتنے دنوں کا تھا؟ ––– اور زندگی کا یہ پہلا موقع تھا کہ خاندان بھر کے لوگ ایک جگہ جمع ہوئے تھے۔ وہ بھی گھر کے اندر انہیں دیکھنے کون آتا تھا؟ کبھی کبھار دور کے رشتہ دار ملنے آ جاتے اور کبھی کبھی اسلم چچا کے لڑکے باہر آ جاتے تھے گھر کے اندر لڑکیوں کا ان سے پردہ تھا۔ پھر کسی کو کیا خبر؟ کھلی چھت پر چاندنی رات میں "اوپیننیں" کھیلا جاتا اور دل کے چور اسی میں پکڑے جاتے تھے۔ ثریا انور کو "نکما شاعر" کہہ دیتی اور ریاض "تھکا ہوا مسافر" اور کھویا ہوا نغمہ تھا۔ ناہید بولنے سے پہلے اپنے الفاظ کو خوب جانچ لیتی اور جب وہ ریاض کو "ادھورا سپنا" اور "ٹوٹا ہوا مضراب" کہتی تو دبے دبے قہقہے لگتے آخر ایک بار سیما نے جی کڑا کر کے ریاض کو "چور" کہہ دیا اور ثریا کے پیٹ میں ہنستے ہنستے بل پڑ پڑ گئے۔ "چور؟ کس کا چور سیمی؟ یار دل کا؟ ––– یا ہمارا؟ آخر تم نے کچھ سوچ ہی کر تو کہا ہوگا" اور سیما بولنے کے بعد سوچتی کہ اس نے ایسا کیوں کہہ دیا تھا؟ اور جب سیما چور بنی تو ریاض اور انور دونوں ہی سٹپٹا گئے۔ ناہید نے کہا "تاروں کی

چاندنی" ثریا بولی" ہائے بچاری" ریاض نے کہا "گڑیا" اور انور بولا "شاعر کا تخیل" اور سب کو چھوڑ کر سیما نے انور ہی کو چور بنایا — اسی رات انور کی چوری ریاض پر کھلی اور ایک بہت بڑا سا بوجھ اس کے سر سے اترتا ہوا محسوس ہوا - انور کی نگاہوں کو وہ اب تک سمجھ نہ سکا تھا - مگر خود اس کے لئے الجھاوے پر الجھاوے بڑھتے جارہے تھے - اور سچ مچ ایک تھکے ہوئے مسافر کی طرح وہ کسی ایک منزل پر دم لینے کو بے قرار تھا -

شام کا سناٹا ہر طرف چھا گیا تھا لڑکیاں کوٹھے کے اوپر باتیں کررہی تھیں انور باغ میں اکیلا کچھ لکھ رہا تھا - کھلائی بُوا جلدی میں لپکتی ہوئی باہر کی طرف سے آئیں اور چھوٹی دلہن سے چپکے چپکے باتیں کرتی رہیں - چھوٹی دلہن کے چہرے کے تناؤ سے اُن کے مزاج کی برہمی کا پتہ چل رہا تھا - انہوں نے بڑی تلخی سے کہا - کھلائی بُوا - تم اپنی لڑکیوں کے ساتھ ساتھ رہا کرو زمانہ بہت بُرا ہے - کوئی کچھ کرے تم کو غرض نہیں - بھلا ماں کا اثر بیٹی پر کیسے نہ پڑے گا ؟ مگر منجھلی بھابی نے تو آنکھ پر پٹی باندھ لی ہے اچھا ہے بیٹھی دیکھتی رہیں گی بیٹے کا تماشہ ! میرا کیا ہے ؟ آنکھ سے دیکھ کر کوئی مکھی نہیں نگل سکتا - جاؤ منجھلی بھابی سے کہو کہ ریاض میاں پارو بی بی کو بیٹھے پڑھا رہے ہیں - ارے میرا کیا انہی کا جائے گا"۔

منجھلی دلہن نے کھلائی بُوا اور چھوٹی دلہن کی باتیں سرگوشیوں میں سُن لی تھیں - ایک ٹھنڈی سی سانس بھری اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے - دل پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہ رہا تھا آہستہ سے ریاض کے کمرے میں گئیں — وہاں اندھیرے کمرے میں دریچے پر بیٹھی ہوئی ثریا اسلم میاں کے گھر کو تک رہی تھی "کیا ہے بیٹی ثریا" - منجھلی دلہن ڈوبی ہوئی آواز میں بولیں "کچھ نہیں منجھلی اماں - بھائی جان بہت دیر سے پارو کے یہاں گئے ہیں' دیکھ رہی ہوں کہ اب وہ شاید آتے ہی ہوں گے" ثریا کی گلوگیر آواز کانپی اور کمرے کے اندھیرے میں ہر طرف ایک شکستگی سی چھا رہی تھی -

---

ہندنوین

تہران میں ہندوستانی سفارت خانے کا ایک جریدہ

ہندوستان کے آزاد ہونے سے پہلے ایران کے باشندے عام طور پر ہندوستان کے حالات سے بے خبر تھے اور بڑی حد تک یہی حال ہمارا بھی تھا چنانچہ اس نئے دور میں جب ہمارے سفارت خانے بیرونی ملکوں میں قائم ہوئے تو انہوں نے اس لاعلمی کو دور کرنے کا کام بھی شروع کیا - ہندنوین بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے - یہ ہفتہ وار رسالہ ہے جو تہران کے ہندوستانی سفارت خانے نے فارسی میں شائع کرنا شروع کیا ہے - اس کا مقصد ایک طرف ہندوستان اور ایران کے ان قدیم علمی اور تمدنی رشتوں کی تجدید کرنا ہے جو پچھلے سو برس میں بڑی حد تک منقطع ہو گئے تھے اور دوسری طرف ایرانیوں کو ہندوستان کے علمی اور تمدنی حالات سے باخبر کرنا ہے - اس وقت ہمارے پیش نظر اس رسالہ کے تین شمارے ہیں -

"ہندنوین" کے پہلے شمارے کی ابتدا مولانا ابوالکلام آزاد کے مضمون "روابط باستانی ایران وہند" سے ہوتی ہے - دراصل یہ مضمون نہیں ہے بلکہ مولانا ابوالکلام آزاد کی وہ تقریر ہے جو موصوف نے ایران کے حالیہ دورے کے موقعے پر ایرانیوں کے ایک بہت بڑے علم دوست مجمع کے سامنے کی تھی اور جو بے حد مقبول ہوئی تھی -

ایک دوسرے شمارے میں علی گڑھ یونیورسٹی کے متعلق ایک جامع مضمون شائع ہوا ہے - اس مضمون میں سرسید کی تعلیمی تحریک کا ذکر کرتے ہوئے ان کی علمی مساعی کو سراہا گیا ہے -

"تیسرے شمارے میں گاندھی جی کے متعلق ایک مضمون ہے جس میں ان کی سیاسی زندگی سے ایرانیوں کو روشناس کیا گیا ہے اور اس شمارے میں ایک اور جگہ گاندھی جی کے اقوال نقل کئے گئے ہیں -

یہ ایک مصوّر رسالہ ہے جو ٹائپ میں شائع ہوتا ہے - اور اس میں ایران و ہندوستان کے متعلق تصویریں بھی ہوتی ہیں - طباعت دیدہ زیب ہوتی ہے -

امریکہ کا صدارتی انتخاب

حال ھي میں امریکہ کا صدارتي انتخاب ھوا جس میں ملک نے جنرل آئزن ھاور کو اپنا پریزیڈنٹ اور رچرڈ نکسن کو وائس پریزیڈنٹ چنا

جنرل ڈوائٹ ڈي آئزن ھاور
امریکہ کے نئے صدر

رچرڈ نکسن
امریکہ کے نئے نائب صدر

جناب جوش
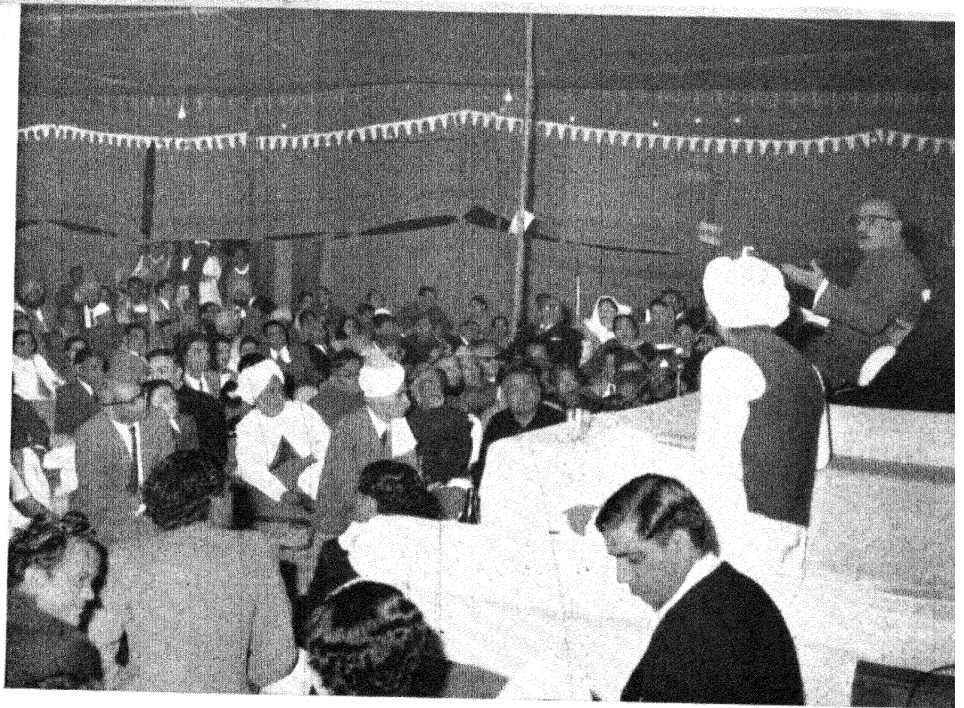
انڈو پاکستان مشاعرے کا ایک رخ - حضرۃ جوش ملیح آبادی اپنا کلام سنا رہے ہیں

انڈو پاکستان مشاعرہ

۱۵ ، ۱۶ نومبر کو چیمسفورڈ کلب دہلی میں ایک انڈو پ
مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت پہلے دن لالہ یودھراج چ
پنجاب نیشنل بنک نے اور دوسرے دن آنریبل ڈاکٹر کیلا
کاٹجو نے کی - مشاعرے میں پردھان منتری شری جواھر
بھی تشریف لائے - پاکستان سے جناب عندلیب شادانی سید
جعفری اور جناب قتیل شفائی نے شرکت کی -

مشاعرے کا ایک اور رخ - حاضرین ہمہ تن گوش ہیں

ملک کے نامور سائنسدان اور نامور شاعر ڈاکٹر ایس - ایس
اپنا کلام سنا رہے ہیں
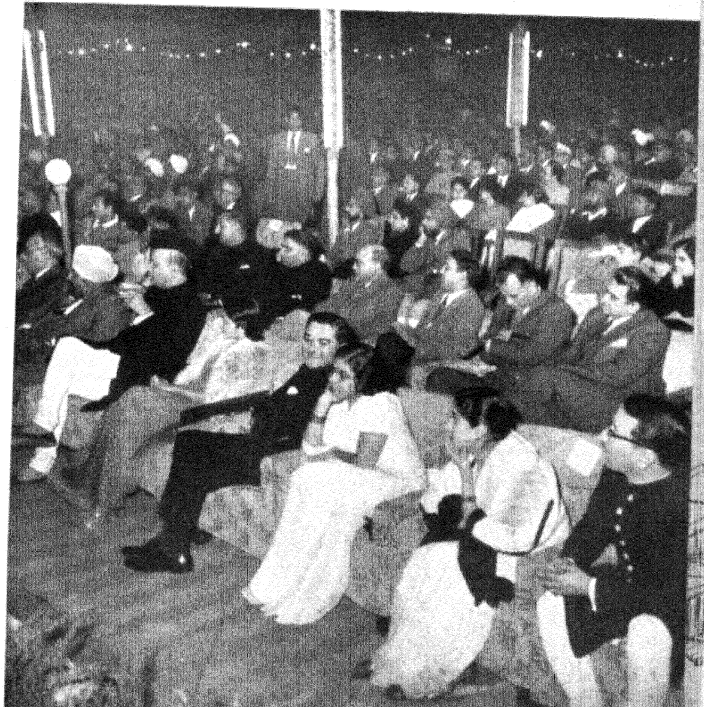
جناب عندلیب شادانی اپنا کلام پڑھ رہے ہیں

ل پڑھ رہے ہیں

مشاعرے کی ایک اور جھلک - صوفے پر بیٹھے ہوئے بائیں سے دائیں
ہزایکسیلینسی ڈاکٹر نجیب اللہ خان شری جواہر لال نہرو
لالہ یودھ راج ہزایکسیلینسی مسٹر شعیب قریشی
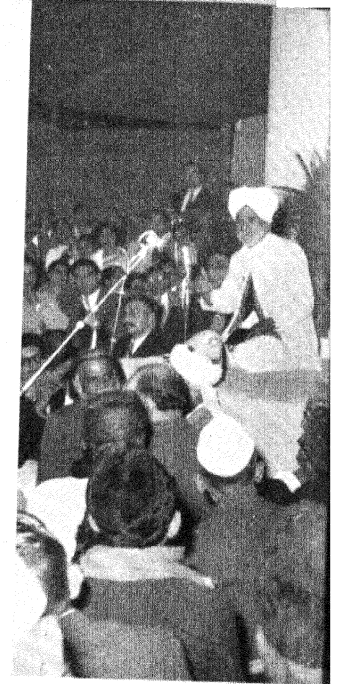
سید محمد جعفری جو مشاعرہ گاہ کو قہقہہ‌زار بنا رہے ہیں
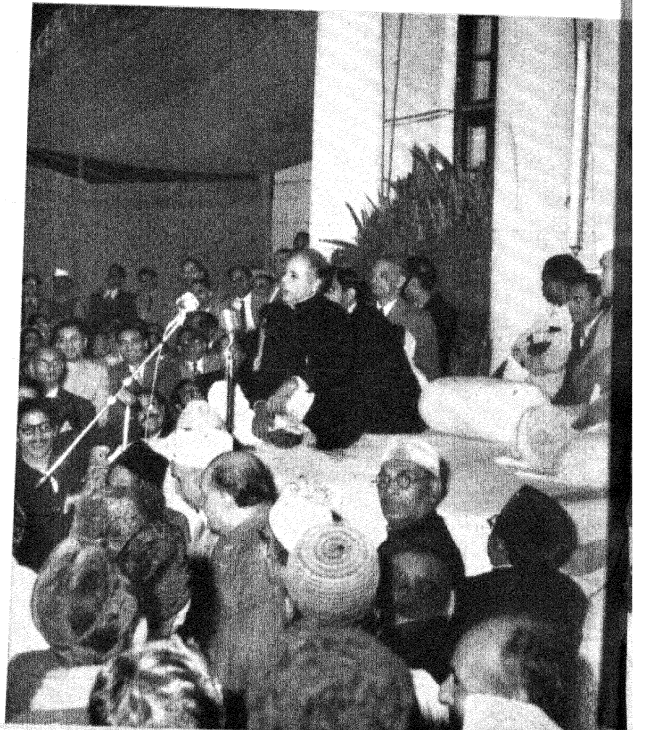
ونو منکڈ

آپ کے متعلق
جناب ہریش چندر کیلا کا مقالہ
صفحہ ۳۳ پر ملاحظہ فرمائیے

نیچے

شاعر جمالیات حضرت فراق
گورکھپوری دوران علالت
میں

بائیں طرف :- جناب فراق اسپتال
میں نشتر کے ایک ہفتہ بعد

دائیں طرف :- اسپتال میں نشتر
لگ چکنے کے بعد شدت کرب سے
نیم بیہوشی کے عالم میں -

ہریش چندر کیلا

ونومنکڈ
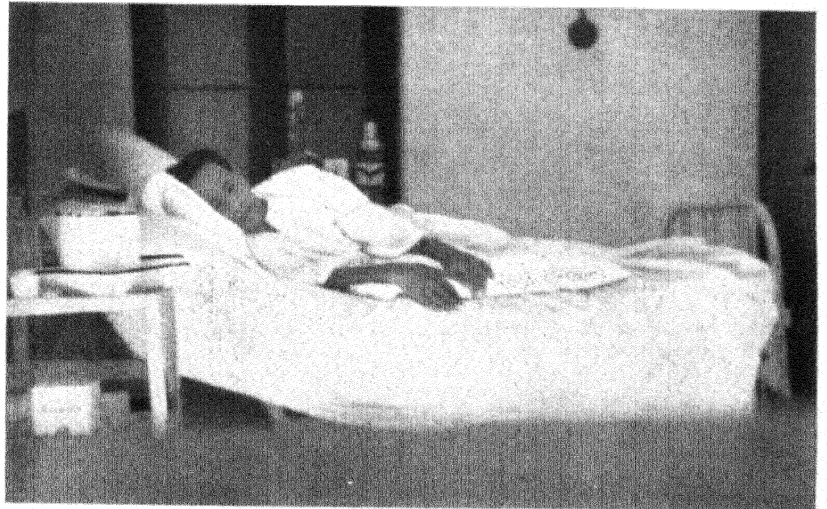
یہ مضمون ادارے کی فرمائش پر چند ماہ پہلے لکھا گیا تھا۔ اس کے بعد منکڈ نے پاکستان کے خلاف دہلی ٹیسٹ میں اپنے جوہر دکھائے۔ انھوں نے ۱۳ وکٹ لئے۔ لکھنؤ میں اُن کی غیر حاضری اس قدر اثر انداز ہوئی کہ پاکستان کی ٹیم نے لکھنؤ ٹیسٹ میں ہندوستانی ٹیم کو ہرا دیا۔ بمبئی کے ٹیسٹ میچ میں منکڈ پھر ہندوستانی ٹیم کی کامیابی کے لئے بڑی حد تک ذمّے دار تھے۔ اسی میچ کے دوران میں انھوں نے ۲۳ ٹیسٹ میچوں میں ایک سو وکٹیں لینے اور ایک ہزار دوڑیں بنانے کا ریکارڈ قائم کیا۔ دنیا میں کسی نے اب تک اتنے کم ٹیسٹ میچوں میں یہ دہری عزّت حاصل نہیں کی۔ (ادارہ)

ونومنکڈ گزشتہ سولہ سال سے ہندوستان کی کرکٹ میں چمک رہے ہیں جب میں نے پہلے پہل اُن کو کلکتے میں ۳۷-۱۹۳۸ء میں دیکھا۔ تو وہ ٹیسٹ کرکٹ میں آئے ہی تھے۔ میچ ' لارڈ ٹینسو کی ٹیم کے خلاف تھا اور وجے مرچنٹ پہلی بار ہندوستانی ٹیم کے کپتان مقرر ہوئے تھے۔ ٹیم میں امرناتھ، محمد نثار، امر سنگھ اور مشتاق علی جیسے نامور کھلاڑی کھیل رہے تھے اور اُن کی طرف سے ہارڈ سٹاف پوپ، ایلف گوور اور ایڈرچ جیسے ولایت کے مشہور کھلاڑی تھے۔ تیسرا ان آفیشل ٹیسٹ تھا اور دل چسپ ٹکر کی اُمید تھی۔ ایڈن گارڈنز کی گراؤنڈ کی ایک بھی سیٹ خالی نہیں تھی۔

ہنڈلکر کے دس رن بنا کر آؤٹ ہو جانے پہ ونومنکڈ باری لینے آئے اور آتے ہی ایسی مستعدی سے کھیلنے لگے کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ وہ چاروں طرف جاندار ہاتھ مارتے تھے اور تیزی سے اسکور کرتے تھے۔ جو کچھ اُن کے بارے میں اخباروں میں پڑھ رکھا تھا۔ حرف بحرف ٹھیک نکلا۔ اس میچ میں انھوں نے ۵۵ رن بنائے اور ٹیم کو ۲۵۰ رن کا لمبا سکور بنانے میں مدد دی۔ اُن دنوں یہ بات مشہور تھی کہ منکڈ ۵۰ رن سے کم پہ کبھی آؤٹ نہیں ہوئے۔ اس سے پہلے بمبئی کے ٹیسٹ میں ۸۸ رن بنا چکے تھے اور اُسی سال اپنی زندگی کا سب سے لمبا اسکور نواں نگر کی طرف سے کھیلتے ہوئے بنایا تھا۔ یہ ۱۸۵ رن کا تھا۔ اسی اسکور کی بناء پر وہ ہندوستانی ٹیم میں لئے گئے تھے

اگرچہ اُن دنوں منکڈ باؤلنگ بھی کرتے تھے لیکن بیٹسمین کی حیثیت سے ہی ٹیسٹ ٹیم میں لئے جاتے تھے۔ لیکن دو چار سال میں باؤلنگ کا پلڑا بھاری ہو گیا۔ پھر تو ہر میچ میں وکٹ پر وکٹ لیتے نظر آنے لگے۔ وہ اپنی قسم کے ایک ہی باؤلر ہیں۔ دو چار سال میں یہ بھی مسلّم ہو گیا کہ وہ ہندوستان کے سب سے سمجھ دار باؤلر ہیں اور اُن کے چناؤ کے بغیر کوئی بھی ٹیم مکمل نہیں سمجھی جاتی۔ اس وقت اُن کا دُنیا کے پہلے دو تین باؤلروں میں شمار ہو سکتا ہے۔ اور باؤلنگ، بیٹنگ اور فیلڈنگ کے تینوں شعبوں کی مجموعی قابلیت کو سامنے رکھ کر دعوےٰ کیا جا سکتا ہے کہ وہ دُنیا کے پہلے تین چار آل راؤنڈروں میں سے ہیں۔ اس وقت اس سلسلے میں صرف فرینک ووریل، ملز، واٹکنز اور پھڈکر کے نام ذہن میں آتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ووریل کی طرح وہ بائیں ہاتھ سے گیند پھینکتے ہیں اور دائیں ہاتھ سے بیٹنگ کرتے ہیں۔ وہ لینگ جینلتھ کے ماسٹر ہیں اور بیٹسمین کے رجحان کے مطابق گیند کو آگے پیچھے پھینکتے رہتے ہیں۔ اُن کی گیند کی اڑان بھی کئی بار بیٹسمین کو چکّر میں ڈال دیتی ہے۔

کچھ مدّت سے باؤلنگ زیادہ کرنے کے سبب ونو کا بیٹنگ کچھ کمزور پڑ گیا ہے اور کئی سال تک اُن کو اس میں نمایاں کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن ابھی ابھی وہ لارڈز کے ٹیسٹ میں ایسا کھیلے جس کا جواب نہیں۔ انھوں نے ۱۸۴ رن بنائے اور انگلینڈ کے بہترین باؤلروں کو پریشان کر دیا۔ وہ اس وقت آؤٹ ہوئے۔ جب بالکل تھک چکے تھے۔ اُن کا یہ اسکور ہندوستانی کرکٹ کا نیا ریکارڈ ہے۔ آج تک کسی بھی ہندوستانی کھلاڑی نے انگلینڈ کے خلاف آفیشل ٹیسٹ کھیلتے ہوئے اتنا اسکور نہیں بنایا۔ اگر اب وہ کرکٹ سے علیحدگی اختیار بھی کر لیں تو بھی اُن کا نام اس کھیل کی تاریخ میں رہے گا۔

ونومنکڈ ہندوستان کی طرف سے ۲۰ ٹیسٹ کھیل چکے ہیں جو کہ

جوکہ ہزارے کی تعداد سے دو ہی کم ہیں۔ مرچنٹ اور امرناتھ دونو نے منکڈ سے کم ٹیسٹ کھیلے ہیں۔ آپ نے ٹیسٹوں میں تین سینکڑے بنائے ہیں۔ دو آسٹریلیا میں ملبورن میں اور ایک حال ہی میں لارڈز کے میدان میں ۱۹۴۶ء کے ہندوستانی ٹیم کے بیرونجات کے دورے میں وہ ایک لحاظ سے سب سے کامیاب کھلاڑی ثابت ہوئے۔ انھوں نے ایک ہزار رن بنائے اور سو سے زیادہ وکٹ لئے۔ اس کو کرکٹرز ڈبل کہتے ہیں۔ وزڈن (کرکٹ کی ہر سال چھپنے والی مشہور کتاب) نے اُن کی ان لفظوں میں تعریف کی ہے۔

”وینو منکڈ اس سال (۱۹۴۶ء) کے بہترین آل راؤنڈر (کھیل کے دو یا تین شعبوں میں چمکنے والے) ہیں۔ ۱۹۴۸ء سے لے کر آج تک ویسٹ انڈیز کے مشہور کھلاڑی لیری کانسٹینٹائن کے علاوہ کسی بھی دورہ کرنے والی ٹیم کے کھلاڑی نے کرکٹرز ڈبل حاصل نہیں کیا۔ .... بیٹنگ میں ایک ہی پوزیشن پر نہ جانے اور باؤلنگ کی بھاری ذمّے داری کے باوجود بھی منکڈ نے اپنی قابلیت دکھا دی۔ سات بار انھوں نے کسی دوسرے کھلاڑی کے سلمنے کھیلتے ہوئے سو سو رن بنائے اور باؤلنگ میں ولایت کے بیٹسمینوں کے لئے معمّہ ہی بنے رہے۔ وہ قریباً ہر قسم کی وکٹ پر اچھی گیند پھینکتے رہے اور گیلی وکٹ (ایسی وکٹ جس پر بارش کا اثر ہو) پر تو اُن کی گیند پر کھیلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر اُن کے ساتھی فیلڈنگ میں ذرا اور ہوشیاری (قابلیت) دکھاتے تو اُن کے دورے کا ریکارڈ اور بھی اچھا رہتا۔“

وینو منکڈ سوراشٹر کے رہنے والے ہیں اور اس صوبے کے چوتھے کھلاڑی ہیں جنھوں نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہے۔ پہلے تھے رانجی، دوسرے اُن کے بھتیجے دلیپ سنگھ جی، تیسرے امر سنگھ اور چوتھے منکڈ۔ ویسے تو ان میں سے ہر ایک میں اپنی اپنی بات تھی لیکن مجموعی قابلیت کے خیال سے شاید منکڈ سب سے آگے ہیں۔

منکڈ بچپن سے ہی اس کھیل کے دلدادہ تھے۔ وہ اسکولوں کی کرکٹ میں جلدی ہی نام پا گئے اور وہیں اُن کا نام وینو پڑا۔ اصل نام ملونت رائے مانکڑ ہے۔ ۱۸ برس کی عمر میں انھوں نے اپنی پہلی ٹیسٹ سنچری مدراس میں بنائی۔ دنیا میں چند ہی ایسے کھلاڑی ہیں جو اِس عمر میں بین الاقوامی کرکٹ میں آ گئے ہوں۔ آسٹریلیا کے نیل ہاروے بالکل اسی عمر میں ٹیسٹ کرکٹ میں آ گئے تھے اور مانجریکر اور مودی کی عمر بیس کے لگ بھگ تھی۔

وینو کا جسم گھٹا ہوا، مضبوط اور دل شیر کا ہے۔ وہ کسی حالت میں بھی حوصلہ نہیں ہارتے اور برابر جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔ لارڈز کے ٹیسٹ میں وہ تین روز تک لگاتار کھیلتے رہے۔ پہلے باؤلنگ کرتے رہے اور پھر تقریباً دو دن تک بیٹنگ۔ وہ کئی سال سے لگاتار گرمیوں اور سردیوں میں کھیلتے رہے ہیں۔ چار سال سے ہر سال کوئی نہ کوئی ٹیم باہر سے ہندوستان آتی رہی ہے اور وینو منکڈ سب کے خلاف کھیلے ہیں اور پھر دورہ ختم ہوتے ہی وہ انگلینڈ چلے جاتے ہیں اور پروفیشنل کی حیثیت سے کرکٹ کھیلتے ہیں۔ اس وقت وہ ہسٹنگڈن کلب کے مہمان بن کر لیگ کے میچ کھیل رہے ہیں۔

اُن کی عمر اس وقت ۳۵ سال کی ہے اور وہ کرکٹ سے ریٹائر ہونے کی سوچ رہے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اس کھیل کو الوداع کہہ رہے ہیں۔ وہ سوائے بین الاقوامی کرکٹ کے ہر قسم کی کرکٹ کھیلیں گے۔ وجہ انھوں نے وہی دی ہے جو سب سمجھدار کھلاڑی دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نئے آدمیوں کو بھی موقع ملنا چاہیئے۔ لیکن ایک بات اور بھی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ کھلاڑی کو بالکل اسی وقت ریٹائر ہو جانا چاہیئے جب اُس کی شہرت چوٹی تک پہنچ چکی ہو۔ بشرطیکہ وہ ابھی نوعمر نہ ہو۔

منکڈ صرف اچھے کھلاڑی ہی نہیں بلکہ کھیل کے ماہر اُستاد بھی ہیں وہ کئی جگہ کوچنگ کر چکے ہیں۔ مانجریکر اُنھیں کا بنایا ہوا ہے۔ وہ ہزارے کی طرح اسکولوں کی کرکٹ میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ اگر کرکٹ کا بورڈ ایسا انتظام کر سکے کہ وہ ہندوستان کے کھیل کے سینٹروں کا دورہ کر سکے، اور وہاں تھوڑا تھوڑا قیام کر کے نئے کھلاڑیوں کو آگے لائیں تو ہندوستان کی کرکٹ پر بڑا احسان ہوگا۔

منکڈ شادی شدہ ہیں۔ بیوی کا نام ہے منورما منکڈ۔ دو بچّے ہیں اٹل اور اشوک۔ ایک چھ سال کا ہے دوسرا سات کا۔ دونوں کو ابھی سے اس کھیل کا شوق ہے۔

رشید حسن خان

تنقید جدید کا ایک پہلو
(اور زبان و ادب پر اس کے اثرات)

تنقید جدید میں تصورات و نظریات پر گفتگو کی جاتی ہے یا کبھی ہئیت پر جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ دور جدید کی اردو شاعری پر مغرب کی بیانیہ شاعری کا کافی اثر ہے ۔ جس سے انتقاد میں نفس تصور پر توجہ مرکوز رہتی ہے ۔ لیکن بڑا سبب یہ ہے کہ نئے شعرا و ناقدین مختلف مفروضات کے باعث اس ہفت خواں کو سر کرنا کچھ مناسب نہیں سمجھتے ۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج شعری سرمایے کے دفتر اسکول کے طلبا کی مشقی کاپیاں ہو کر رہ گئے ہیں ۔ زبان و بیان کی ثانوی حیثیت بھی نہیں بلکہ ان کی طرف توجہ کرنا تیسرے درجے کے قدامت زدہ افراد کا کام سمجھا جاتا ہے ۔ ہر وہ شاعر جس کی پیشانی پر ترقی پسندی کا خانہ ساز لیبل لگا ہوا ہے اس کا سرمایۂ شعریات ادب العالیہ کا ایک جزو بنایا جاتا ہے ۔ اور ثبوت میں اس کے یہاں شعوری و لاشعوری تحقیقی و اضافی غرضکہ موجود و غیر موجود ساری صلاحتیں پیش کر دی جاتی ہیں لیکن یہ قطعاً نہیں دیکھا جاتا کہ جو بات کہی گئی ہے وہ کس طرح ادا ہوئی ۔ جس کے باعث زبان اور بیان میں متعدد مستقل نقائص جڑ پکڑتے جا رہے ہیں ۔ اور یہ سب کچھ ان ناقدین کی حمایت بے جا کے سہارے ہو رہا ہے جن کے تنقیدی فرمودات ہمیشہ ارسطو یا میتھو آرنلڈ کے حوالوں سے گراں بار ہوتے ہیں ۔

اساتذہ زبان و بیان کا ہر قدم پر لحاظ رکھتے تھے ۔ وہ مفہوم سے زیادہ طرز ادا کو دیکھتے تھے اور سختی سے اس بات کی پابندی کی جاتی تھی کہ زبان کا کوئی ایسا پہلو مجروح نہ ہو جس سے اساسی طور پر کوئی نقصان پہنچے یا بیان کا کوئی ایسا اسلوب نہ اختیار کیا جائے جو صوتی و صوری لطافت کو مجروح کر سکے ۔ لہٰذا وہ لوگ ادبی ریاضت میں بے حد کاوش کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ ان کو کسی خیال کے ادا کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوتی تھی ۔ اور وہ محض اس مشق و مزاولت کے باعث معمولی سے معمولی خیال کو اس طرح ادا کر دیتے تھے کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ تخئیل یا معنیٰ آفرینی کا ساتھ دے سکتے ۔

نئے ناقدین کے یک طرفہ انتقاد کے باعث ذہنوں سے زبان و بیان پر کسی گرفت کا خیال مطلق نکل گیا ہے ۔ اور یہ لوگ مطمئن ہیں کہ اس شکست و ریخت پر ہماری صفوں میں سے کوئی صاحب نظر نظر اٹھانے والا نہیں ۔ لہٰذا خوب داد بہ سلیقگی دی جاتی ہے ۔ ہر وہ شخص جس کے پاس کسی کالج کی ڈگری ہے ۔ یا کسی جماعت کا منشور ۔ وہ اپنی یتیم و بے بسر تخلیقات کو اس ادعا کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ میں اصول شکنی کا مرتکب ہوں ۔ ایک گروہ ہے جو بے خوف و خطر ترقی پسندی کے لیبل لگاتے ہوئے اپنے جراحت زدہ شعری سرمایہ کو آفاقی ادب کا ایک حصہ بنا کر پیش کرتا ہے ۔ اور ناقدین محض ہم مشربیت کے باعث اس پوچ بیانی کی زیادہ سے زیادہ داد دیتے ہیں ۔ اس کی دیکھا دیکھی وہ نو رسیدہ افراد جن کی نظر فکر فی الوقت ایک تنگ سے دائرہ ہی کے اندر محبوس ہوتی ہے جب اس پذیرائی مطلق کو دیکھتے ہیں تو اس نعمت بے دریغ کی طرف بے اختیار بڑھتے ہیں ۔ جذبہ سہل پسندی نے ان کے ذہنوں میں یہ تصور راسخ کر دیا ہے کہ محض کالج کی تعلیم ادیب و شاعر بنانے کے لئے کافی ہوتی ہے ۔ اس کے علاوہ کسی کاوش کی ضرورت نہیں ۔ ادب القدما جاگیردارانہ دور کی پیداوار ہے ۔ اور زبان و بیان کے ضابطے محض لایعنی سی بات نتیجہ یہ ہے کہ وہ افراد جن کے پاس تخئیلات و تصورات کے ذخیرے ہیں محض عدم مشق کی بنا پر ان کے اچھے اچھے مرقعے نقش ناتمام کی حد سے آگے نہیں بڑھ پاتے ۔

تنقید وہ حربہ ہے جس سے ادبی بے راہ روی کو ہر قدم پر روکا جا سکتا ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ قدیم طرز نقد صرف لفظی بازی گری پر مشتمل تھا ۔ غالباً اس رعایت سے نئے اسلوب تنقید میں زبان و بیان کو مطلق نظر انداز کر

دیا گیا۔ بڑے بڑے رفیع المرتبت ناقدین کی کتابیں تنقیدی نظریات سے سرتاسر بھری ہوئی ہیں۔ لیکن ان میں زبان و بیان کا کہیں ذکر نہیں۔ اگر کہیں تذکرہ ہے بھی تو محض حسن داستان کی خاطر۔ یعنی اگر کہیں کسی اعتراض سے مجبور ہو کر اس پہلو کا ذکر ہوتا بھی ہے تو صرف ایک اصول کی تکرار تک۔ جب کسی کتاب پر خامہ فرسائی کی جاتی ہے تو اس کا موضوع صرف متعینہ اصول ہوتے ہیں۔ اور کبھی اس طرف توجہ نہیں کرتے کہ زبان و بیان کے اعتبار سے اس کا کیا عالم ہے۔ شاعر کے لاشعور کا تجزیہ کریں گے۔ اس کے ماحول کا تجزیہ کریں گے ادب اور سماج کے ضابطے وضع کریں گے۔ لیکن لسانی تجزیہ کا کہیں تذکرہ نہ ہوگا۔

اگر زیادہ غور کیا جائے تو ایک بات صاف طور پر سامنے آتی ہے۔ ترقی پسند تحریک شروع ہی سے ایک "مرکب تحریک" کی حیثیت سے بڑھی۔ یعنی اس میں صرف ادبی نظریات یا لٹریری اضافوں کا سوال نہیں تھا۔ بلکہ ادبیت سے زیادہ سیاست کار فرما تھی۔ اس کی بیرونی نوعیت ضرور ادبی تھی۔ لیکن دراصل وہ ایک طویل پروگرام کا جز تھی۔ ترقی پسند تحریک کو مارکسزم کے ادبی اصولوں کی تبلیغ کا آلہ بنایا گیا۔ اس لئے اس کے اصولوں میں ادب کی مستقل اور دوامی قدروں کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ ادب کا یہ مفہوم متعین کیا گیا کہ وہ صرف خیالات و واقعات کی نشر و اشاعت کا ایک ذریعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نقطۂ نظر کو زبان و بیان سے کیا تعلق ہو سکتا تھا۔ جب ادب کا وہی کام ہے جو فلم یا ریڈیائی نشریات کا ہونا ہے۔ تو پھر اس میں لسانی و بیانی گراں فروشیوں کا گزر کہاں یہی نقطۂ نظر تھا جس کو سامنے رکھ کر ترقی پسند ناقدین نے زبان و بیان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ اور نہ کبھی اپنے مجہول الکیفیت پرستاروں کو اس طرف متوجہ کیا۔

ادب کے کسی حصے کا سیاسیات سے ہم آہنگ ہونا علم و برحق۔ لیکن ادیبوں کا "اناؤنسر" یا "سرخ فوج کے سپاہی" بن جانا ادبیت سے کوسوں دور ہے۔ سیاست ذاتی یا جماعتی خیالات کی ترجمانی ہے اور ادب آفاقی حقیقتوں کا اظہار۔ اگر سانچہ چھوٹا بنایا جائے تو چیز کبھی بڑی نہیں بن سکتی۔

اس یک طرفہ طرز نقد کا یہ نتیجہ ہوا کہ نئے شعرا نے زبان و بیان کو ثانوی چیز نہیں بلکہ ایک فرسودہ کشتنی چیز سمجھ کر اپنی "مہذب حدود" سے خارج کر دیا۔ نئے ادب کے پاسبانوں نے ابتدا میں اصولاً کم اور مصلحتاً زیادہ ان لوگوں کے "آوارۂ حدود دنیا" ہو جانے کی ہمت افزائی کی۔ اب یہ ایک رسم بن گئی۔ لہٰذا اسلوب و زبان جو شعر کا لباس ہیں اور درحقیقت اسی کی عظمت کے ضامن۔ ان کو حتی الامکان مسخ کرنا کمال فن کاری سمجھ لیا گیا۔ اس طرح ان شعرا نے اپنے جذبۂ سہل پسندی کو تسکین دینے کے ساتھ ساتھ اپنی کم نظری و جہالت کی بھی پردہ پوشی کا مستقل اصولی سامان فراہم کر لیا۔ نتیجتاً ان کی شعری تخلیقات کا وہی حشر ہوا جو طلبا کے ہاتھوں سیاسی تحریکات کا ہوتا ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ نیا ادب ابھی اپنے تجرباتی دور سے ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکا۔

تنقید کا یہ انداز کہ صرف چند اصولوں کا تذکرہ کر کے کسی شاعر کے کلام کو اس پر منطبق کر دیا جائے۔ یا کسی شاعر کے کلام کو ان کا سہارا لے کر دائرہ ادب سے خارج کر دیا جائے۔ کسی اعتبار سے مستحسن نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ جہاں مواد و ہیئت کے مخصوص تصورات سے بحث کی جائے وہاں لسانی حیثیت بھی پیش نظر رہنی چاہئے۔

ترقی پسند ناقدین کا یہ طرز انتقاد جس میں مجموعی طور پر حکم لگا دیا جاتا ہے۔ اصولی طور پر قطعاً غلط ہے۔ نظم و غزل دونوں کے اعتبار سے نظم کو لیجئے — مختصر نظم کا مرکزی مفہوم مفرد ہوتا ہے۔ جس میں ارتقائے خیال یا ترتیب خیال کے لئے چند خارجی اجزا آمیز کئے جاتے ہیں۔ وہ خارجی اجزا اس مفرد خیال کی بایں طور حاشیہ آرائی کرتے ہیں کہ وہ خیال ایک خاص ترتیب سے پوری نظم میں ادا ہو جاتا ہے۔ ایک کامیاب نظم کے لئے ضروری ہے کہ اس کے سارے اشعار مل کر مجموعی طور پر مفہوم کو مکمل کریں یعنی تمام اشعار متانت لہجہ اور توازن ترکیبی کے ساتھ منسلک ہوں اگر درمیان میں سے ایک شعر بھی صوتی یا معنوی اعتبار سے دھیما ہو یا تیز تو نظم کی صحت مند تکمیل نہ ہو سکے گی۔

اس اعتبار سے نظم کے سب اشعار کا متوازن ہونا ضروری ہے۔ اشعار کا باہمی تناسب متعدد خارجی چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یعنی مفہوم کے اعتبار سے ان میں صوتی ہم آہنگی پائی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک شعر میں پست الفاظ ہوں اور دوسرے میں بلند۔ نظم کے مرکزی مفہوم کی نسبت سے الفاظ و تراکیب کا انتخاب ہو۔ غرضیکہ ایک مختصر اچھی نظم کا انحصار اس کے مفرد اشعار کے حسن پر منحصر ہوتا ہے۔ نئے ناقدین ان اجزا کا تحلیل و تجزیہ کبھی نہیں کرتے۔ بلکہ وہ چند اصولوں کی تکرار ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

جس کے نتیجے میں نئی نسل کے شاعر انقلاب و تغیر کے کتابی و سماعی نظریات کو
زیادہ سے زیادہ تیزی و بلند آہنگی کے ساتھ نظمانے کی کوشش کرتے ہیں۔
چونکہ ان کی نظر نظم کے اس بلند مفہوم پر نہیں ہوتی نیز ان کے جماعتی ناقدین اس
پہلو پر زحمت نظر بھی گوارا نہیں کرتے۔ اس لئے ان کی نظمیں چیختے ہوئے
الفاظ کا مجموعہ اور جراحت زدہ اشعار کا مرکب ہوتی ہیں جو کبھی کسی عنوان
سے ادب العالیہ کا جزو نہیں بن سکتیں۔

مثال کے طور ایک مشہور ترقی پسند شاعر کے مجموعۂ کلام (جو حال ہی
میں بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا ہے) سے چند مثالیں پیش کرتا
ہوں۔ جس سے اعتراض مقصود نہیں کیونکہ یہ "صنعت" وہاں اتنی فراوانی
سے پائی جاتی ہے جتنی امانت کے یہاں ضلع جگت۔ بلکہ صرف یہ دکھانا ہے
کہ نئے ادب کے پرجوش مبلغین زبان و بیان کے ساتھ کیا سلوک کر رہے
ہیں۔ اور ناقدین کی یک طرفگی یا مصلحت اندیشی کتنے بدنما داغوں کی
پرورش کر رہی ہے۔

اپنی نظروں کو مئے عشق سے صیقل کر کے — کر لئے گنبد گردوں میں بھی روزن میں نے
میں نے قطرے میں بھی سیلاب کی جھنکار سنی — میں نے ذرّے کے دہن میں بھی زباں دیکھی ہے
چپ چاپ خلاؤں میں ظلمت نے علم کھولے — سوچوں کے سمندر میں آنے لگے ہچکولے
جب سوچوں کی میزانوں پر رازوں کے موتی تلتے ہیں — ارمانوں کے ویرانوں پر جب عشق کے شہپر کھلتے ہیں

نظروں کو مئے عشق سے صیقل کرنا حد درجہ مضحکہ خیز بات ہے۔ قطرے
میں "سیلاب کی جھنکار" وہی غیر قابو یافتہ جذباتیت ہے۔ دوسرے مصرعے کی
متانت اور پہلے مصرعے کی "ہیجانیت" میں کیا تعلق ہے۔ دوسرے مصرعہ کے
سارے متناسب الفاظ و سلاست ادا پر "جھنکار" نے پانی پھیر دیا۔
کتنی طفلانہ تعبیر ہے۔ کہ صدائے سیلاب کو ہاتھی بنا کر اس کی جھنکار کو
ایک قطرے کے اندر پنہاں کیا گیا ہے۔ تیسرے شعر میں "سوچوں کے سمندر"
بڑا سوقیانہ انداز بیان ہے۔ جس کی صوتی کیفیت سامعہ خراشی کرتی ہے
یہی حال پانچویں شعر کا ہے۔

بل کھا کے لپکتی ہیں بگولوں کی قطاریں — چلتی ہیں ہواؤں کی لپکتی ہوئی دھاریں
وہ پربت پر ہے اک بدلی کا سایہ — اندھیرا جنگلوں میں سنسنایا
ہواؤں میں کھلبلی مچی غبار چھٹ کے رہ گئے — مرے خیال کے کھنڈر الٹ پلٹ کے رہ گئے
خامشی کا طلسم ٹوٹ گیا — اور فضاؤں کا رعشہ چھوٹ گیا
ایک مرکز پہ گھماؤں کا نظام کونین — کہ کسی کا بھی نہیں دعوئ شاہی تسلیم

اندھیرے کے لئے سنسنانا کسی اعتبار سے بھی موزوں نہیں ہو سکتا
بلکہ یہ تو اندھیرے کی پرہیبت استیعابی کیفیت کے منافی ہے۔ غبار کو جمع لانا
اور خیالوں کو کھنڈر سے تعبیر کرنا کوئی اچھی بات نہیں۔ تعبیر غلط نہ سہی لیکن
فصاحت و شعریت سے قطعاً معرا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں جتنے کریہہ الصوت
الفاظ جمع ہو گئے ہیں ان سے سلاست پناہ مانگتی ہے۔ اسی طرح رعشہ چھوٹ
جانا اور نظام کونین کے ایک مرکز پر لانے کو "گھمانا" سے تزئین دینا شیوۂ کار
آگہی کے منافی ہے۔

صفت کے استعمال میں ہمیشہ اس بات کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ وہ
موصوف سے کسی اعتبار سے تطابق رکھتی ہو۔ مرادفات میں استعمالاً بڑا فرق
ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جو صفت ایک لفظ کے لئے ہو وہ اسی معنی کے دوسرے
لفظ کے لئے بھی مناسب ہو۔ اس لئے جب تک شاعر کے ذہن میں یہ فرق محفوظ
نہیں ہوگا اس وقت تک مفہوم و بیان کوئی بھی فصیح و پرکار نہیں ہو سکتا۔ نئے
شعرا کم از کم مرادف الفاظ کے محل استعمال اور ان کے باہمی تباین سے بڑی
حد تک ناواقف ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اچھی خاصی نظم یا بند مضحکہ خیز ہو
جاتا ہے جس کا صحیح اندازہ ذیل کی مثالوں سے ہوگا۔

ایک بار اور بھی برسے گا چھما چھم بادل — ایک بار اور بھی تقدیر زمیں چمکے گی
گھناؤنی ہے پُر اسرار ہے فضا ساری — تصورات پہ اک کپکپی سی ہے طاری
ع ۔ بگولے رقص میں ہیں دشت کپکپاتا ہے
پھٹی بدلی میں سورج مسکرایا — چھوا بادل کو اور سونا بنایا
رقص کے ساتھ اگر ساز کی جھنکار نہ ہو — تو اک الجھی ہوئی زنجیر ہے بے فن سلیم

بادل کے برسنے کو چھما چھم نہیں کہتے۔ یہ لفظ بجتے ہوئے زیور کے لئے
آتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ زیور کی جھنکار اور بادل کی صدائے باراں یا گرج میں
کوئی نسبت نہیں۔ اسی طرح فضا میں ظلمت کی کثرت کو اس کے گھناؤنے ہونے
سے متعلق کرنا ہے۔ گھناؤنا ایسی کراہت کے لئے لاتے ہیں جو عدم پاکیزگی کے
کے باعث پیدا ہوتی ہو۔ رات کی صفت پُر اسرار تو صحیح ہے لیکن گھناؤنی
درست نہیں اور یہ اسی سہل پسندی اور جہالت کا کرشمہ ہے۔ اسی طرح دشت
کا کپکپانا ہے۔ کپکپی (رکا نپنا نہیں) جسم کے لئے مخصوص ہے۔ دشت کے لئے
کبھی نہیں لاتے۔ یہی بد مذاقی پھٹی بدلی میں موجود ہے۔ آخری شعر میں فن سلیم

سب سے زیادہ خلاف مذاق سلیم ہے - فن کے لئے سلیم بہ طور صفت کبھی نہیں لاتے یہ ذوق، طبع، مزاج، فطرت اور مذاق وغیرہ کے ساتھ آتا ہے یعنی ان الفاظ کے ساتھ جن سے حس کا تعلق ہو - فن کو اس سے کوئی تعلق نہیں - عدم تناسب الفاظ کی چند مزید امثلہ دیکھئے - ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں بیشتر حصہ عمدہ ہے لیکن صرف ایک غیر مناسب لفظ یا ترکیب نے حصہ غالب کی بھی آبرو ریزی کر دی ہے اور جو قابل عبرت ہے -

ریزۂ سنگ سہی پھول کی نازک پتی   تودۂ خاک سہی پیکر ابن آدم
ذرۂ ریگ سہی قلب کا ایوان حسین   قطرۂ بحر سہی وسعت ہر دو عالم
یہ جہاں خواب سہی ایک پریشان سا خواب   جس کی تعبیر ہے اک تیرہ و تاریک خلا
جس کی پہنائی میں اڑتے ہیں وہ ننگے بھنگے   نوع انساں کے کلیجے ہیں فقط جن کی غذا

یہ ایک ہی نظم کے دو بند ہیں - پہلا بند الفاظ و مقصود کے اعتبار سے خوب ہے - چاروں مصرعوں میں ایک تناسب ہے - دوسرے بند کا پہلا شعر بھی اسی طرح ہے - تینوں اشعار میں نہایت شستہ فارسی تراکیب ہیں - جن سے ایک خاص رنگ قائم ہو جاتا ہے - لیکن چوتھے شعر میں "ننگے بھنگے" نظم کرکے شاعر نے پوری نظم کو تناسب صوری و صوتی سے عاری کر دیا - دوسرے بند کے تیسرے مصرعہ کو پڑھتے ہی سابق کے صوتی احساس پر ایک ضرب سی لگتی ہے - اور معاً ان شعروں کا سارا حسن و تفکر خاک میں مل جاتا ہے - [illegible] مصرعوں میں کتنے حسین و تراشیدہ الفاظ ہیں اور ایک مصرعہ میں کتنے کریہہ و ناموزوں الفاظ موجود ہیں - جیسے کہنے والے کو خوش مذاقی یا شعر کے آہنگ سے کوئی لگاؤ ہی نہیں -

تری ہی دین سہی قوت نشارہ نشکار   سلگ رہا ہے مگر میرا عزم طور آثار
مرا کلام ہے مری تڑپ کا آئینہ دار
عمل کے دشت میں جب عزم دندنائے گا   افق پہ نجم سحر جب نقاب اٹھائے گا
تو میری شعلہ مزاجی کو چین آئے گا

ذرا غور کیجئے کہ ایک طرف تو قوت نشارہ نشکار، عزم طور آثار، آئینہ دار، شعلہ مزاجی، نجم سحر جیسی بلیغ فارسی ترکیبیں ہیں - دوسری طرف اسی کے پہلو بہ پہلو "عزم دندنائے گا" بھی موجود ہے پانچ مصرعوں کی ساری دلکشی ایک مصرعہ کے "دندنانے" سے ذبح ہو گئی - کوئی حد ہے اس بد مذاقی و حرکات مذبوحی کی معلوم ہوتا ہے شاعر کو فصاحت و لطافت سے کوئی بہرہ ہی نہیں اور اس کی نظر میں شعر کی صوتی حیثیت کچھ نہیں -

نظم کی چند مثالیں آپ نے دیکھیں ان سے اندازہ ہوا ہوگا کہ صرف ہئیت کے تجربات اور مواد کی "سماجیت" پر زور دینے اور زبان و بیان کے پہلو کو نظر انداز کر دینے سے اچھی خاصی نظمیں یا بند کتنے ناقابل التفات ہو گئے لیکن ناقدین کرام اس پہلو پر کوئی توجہ نہیں کریں گے - ان کی نظر میں "عمل کے دشت میں عزم کا دندنانا" ایک سماجی کشاکش سے واقف اور رزم حیات میں حصہ لینے والے جان فروش کی شدت احساس کا نتیجہ ہے اور بس - شعر کی صورت کتنی مسخ ہو گئی اور اس کے اندر سے شعریت فنا ہو گئی انہیں اس سے کوئی سروکار نہیں - نظم کے اندر بہر حال جمہوری عناصر موجود ہیں لہذا وہ بہت عمدہ کارنامہ ہے - جب ناقدین کا یہ اسلوب ہو تو شاعر کو کیا پڑی ہے کہ وہ خواہ مخواہ مصیبت میں مبتلا ہو - لفظوں کی بے مصرف گردان کرے، اسماء و صفات کا محل استعمال مرادفات کا باہمی فرق اور روزمرہ کی معلومات کی بلا حصول لے - اور اس طرح ایک خاص مدت تک شعر کہنے کے بجائے شعر کہنے کی کوشش کی جائے -

نظم تو پھر بھی ایک وسیع الذیل صنف سخن ہے - اور بعض معمولی خامیاں اس کی وسعت میں جذب بھی ہو سکتی ہیں - لیکن غزل ایک ایسی صنف ہے جس میں ہلکی سی خامی بھی گوارا نہیں ہو سکتی - غزل کے اشعار کا حسن اس کے الفاظ پر منحصر ہوتا ہے - خیال کتنا ہی بلند و لطیف ہو - لیکن اگر اس کے ادا کرنے کے لئے موزوں الفاظ میسر نہ آئیں تو ساری لطافت و رفعت ختم ہو جاتی ہے - غزل کے ایک شعر میں اتنی بسیط معنویت پنہاں ہوتی ہے جتنی ایک طویل نظم میں سما سکے - غزلیہ اشعار کا یہ ایجاز منفرد محض انتخاب الفاظ سے متعلق ہے - اس میں حسن ایجاز کے ساتھ ساتھ اس کی مجموعی تکمیل حسن بندش اور صوتی ہم آہنگی پر منحصر ہوتی ہے اسی لئے اس کا ہر لفظ ادائے مفہوم کے اعتبار سے تو ایک اشارہ یا علامت کی حیثیت رکھتا ہے - اور صوتی اعتبار سے تال کا کام دیتا ہے - اسی لئے اس کا سارا خارجی حسن انتخاب و ترتیب الفاظ سے متعلق ہے -

نئے شاعر چونکہ مشق سخن کو تضیع اوقات سمجھتے ہیں اور مختلف الفاظ کے فرق مراتب میں ان کی معلومات صفر کے درجے میں ہوتی ہیں - اس لئے کسی نئے شاعر کا مجموعہ اٹھا لیجئے - اس میں غزلوں کا معقول حصہ ہوگا - لیکن غزلیں عموماً نامعقول ہوں گی -

لطف یہ ہے کہ غزل جس کو بجا طور پر مثل آبگینہ نازک کہا جاتا ہے - اور

جس کی لطافت و لوچ کی قسم کھائی جا سکتی ہے - جدید تنقید سے غیر متعلق سی ہے -
یہ حضرات جب بھی کسی ایسے مجموعے پر گفتگو کرتے ہیں - جس میں نظمیں اور غزلیں دونوں
ہوں تو غزل کے حصے نظر انداز کر دیتے ہیں - حالانکہ وہ سب سے زیادہ فکر و
نظر کی کارگاہ ہے - چونکہ اس کے حسن کا بیشتر انحصار الفاظ پر ہے - لہذا اصولی
طور پر اس حصے میں مفہوم و تخیل سے زیادہ ، زبان و بیان کو زیر بحث آنا چاہئے
جو ترقی پسندوں کی شریعت میں جائز نہیں - ترقی پسند ناقدین کی چشم پوشی کے
باعث نئے شاعر قدرت غزل یا حسن تغزل سے محروم ہونے جا رہے ہیں -

اگلے وقتوں کے لوگ باوجود ساری برائیوں کے الفاظ کے برمحل صرف اور
ان کے انتخاب پر اتنے قابو یافتہ ہوتے تھے کہ ان کی بے بات کی بات بھی کسی نہ کسی
اعتبار سے دلکشی رکھتی تھی - ان لوگوں کے کلام کا وہ حصہ جس کو "زبان کی شاعری"
کہا جاتا ہے - دیکھئے یعنی الفاظ کا صحیح استعمال کرشمۂ نظر بندی ہی نہیں سحر حلال
بھی پیدا کر دیتا ہے - اس میں شک نہیں کہ وہ لوگ صرف لفظی ہیر پھیر کے ہو کر رہ
گئے تھے - جو بجائے خود غلط ہے - اس کو کبھی اچھا نہیں کہا جا سکتا - اور نہ
اس کی کوئی تاویل ہی کی جا سکتی ہے - لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ ان کی اس
محدودیت میں بھی ایک انداز شاعرانہ پنہاں ہوتا تھا - نئے شعرا اس ضد
میں اس کے برخلاف چلے - یعنی انہوں نے وقت سے پہلے بالغ ہونا چاہا اس شان
کے ساتھ کہ سرو سامان پاس نہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی طرح "دولت مستعجل"
بھی حاصل نہ کر سکے - ہاں اپنے لئے غلط فروشیوں کا پشتارہ ضرور تیار کر لیا -
اور ترقی پسندی کے لئے بہت سے داغ فراہم کر دئے - مذکورۂ صدر دیوان ہی کے
حصہ غزلیات سے چند اشعار نقل کرتا ہوں -

زمانہ ہو چکا اس اولیں ڈھیبڑ کو لیکن — سنائی دے رہی ہے تیری نظروں کی پکار اب تک
یہ اندھیری رات، یہ بوسیدہ کٹیا اور آپ — کاش پلکوں پر اٹھا سکتے چراغ خانہ ہم
یہ میرے دل میں ترا عکس جھلملاتا ہے — کہ جیسے بین ستارے گھلا کر پلا دئے تو نے
یہ پھول بھی تو اسی ڈھول سے اگے ہیں ندیم — مرا خدا مری دنیا کا رہنے والا ہے
یہ میرے ذہن میں ہے عزم انقلاب رواں — کہ جھٹپٹے میں لپکتی ہوئی غزالہ ہے
شوق سجود تیری دین، ذوق قصور میرا دین — ترے گماں میں کیا کروں اپنی حقیقتوں کو صنم
میں ابتدائی سکھوں کے سہارے جی لوں گا — مرے دکھوں کی کوئی انتہا نہیں نہ سہی
نہیں ہیں سرد ابھی حوصلے اڑانوں کے — وہ میری ذات سے بھی ماورا نہیں نہ سہی
تمہارے دعوئ برتری کی بقا کا ضامن ہے در حقیقت — مری امنگوں کا نرم ہونا مرے ارادوں کا خام ہونا
چمن کے بھیس میں بکھرے ہوئے ہیں ویرانے — مرے خدا کی حقیقت مرا خدا جانے
جہاں پناہ مجھے بازوؤں میں لے لیجے — مری تلاش میں ہیں گردشیں زمانے کی

اشعار مندرجہ بالا سے اندازہ ہوگا کہ عدم تناسب الفاظ اور صفات کے
غلط استعمال نے کتنی مجہولیت پیدا کر دی ہے - اولیں ڈھیبڑ" "ستارے گھلا کر پلانا
پھولوں کا ڈھول سے اگنا" کتنی مہمل باتیں ہیں - معلوم ہوتا ہے کہنے والے کو
فصاحت و مذاق سلیم کی کوئی رعایت مد نظر نہیں - بجائے ڈھول کے خاک بھی آ سکتا
تھا - لیکن شاعر کے پندار ترقی پسندی کی تسکین شاید نہ ہوتی ؟ کیونکہ اس طرح
شعر میں کوئی بداعت پیدا نہیں ہو سکتی تھی -

تصادم کا ترجمہ ڈھیبڑ بجا سہی لیکن کیا غزل کے اس شعر میں بھی ؟ انقلاب
کو غزالہ سے تشبیہ دی ہے لیکن عدم تناسب کی بنا پر تشبیہ پھبتی ہو گئی - اس
طرح ابتدائی سکھوں، اڑانوں کے حوصلے امنگوں کا نرم ہونا، ویرانوں کا بکھرا ہونا
یہ سب ایسی محض خامیاں ہیں جن کو کوئی بھی خوش ذوق گوارا نہیں کر سکتا - محبوب
کو جہاں پناہ کہنا بھی اسی قبیل سے ہے - ان لوگوں کو صفات و تعبیرات میں اتنا
بھی سلیقہ نہیں جتنا ایک کمہار کو مٹی کے برتن بنانے کا ہوتا ہے - وہ بھی ایک
حسن تناسب کا خیال ضرور رکھتا ہے - لیکن یہاں تو ہر چیز "معرا" ہے -

اس کے بعد ناقدین کی یہ روش کہ وہ صرف اصولیات و کلیات سے
سروکار رکھتے ہیں اور انہیں کو بار بار دہراتے ہیں حد درجہ خطرناک اور
عافیت آشوب ہے -

ترقی پسند ناقدین کا ایک اسلوب نقد یہ ہے کہ وہ جب کسی مجموعہ
پر تنقید فرماتے ہیں تو سب سے پہلے یہ بات متعین کرنے کی کوشش کرتے
ہیں کہ اس کے زادہ ہائے فکر میں ان کی مفروضہ ترقی پسندی کے عناصر کس حد
تک پائے جاتے ہیں - اسی نسبت سے اس کی اچھائی برائی کا فیصلہ کیا جاتا
ہے - اگر اس مجموعے کے اندر کچھ حصے ایسے ہیں جو ان کے معیار افادیت پر
صادق آ سکیں تو وہ ادیب صاحب شعور ہے اور اس کی سفارشات سرمایۂ
نازش - یہ حضرات اس طرف کوئی نظر نہیں کرتے کہ اس کے اندر لسانی اعتبار
سے کیا بلندیاں یا پستیاں ہیں - جس کے باعث شعراء کے نزدیک صرف
موضوع کی اہمیت صحیح ہے اور باقی سب ثانوی چیزیں ہیں - وہ صرف محاذ پر
زور دیتے ہیں اور اسلوب ادا پر کاوش نہیں کرتے -

وہ افراد جو بالعموم زبان و بیان پر زور دیتے ہیں وہ ہیں جن کی عمریں

۵۰ سال سے متجاوز ہیں اور قدیم مکتبی تعلیم پائے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ اس زمانے میں پیدا ہوتے جس کو یہ لوگ سرمایہ داری کے شباب کا دور کہتے ہیں۔ اور اس دور کی تخلیقات میں کرشمۂ رجعت پرستی کو کسی نہ کسی حد تک ضرور شامل سمجھتے ہیں۔ لہذا جب بھی کوئی ایسا قدامت زدہ شخص ان پر حرف گیری کرتا ہے تو یہ لوگ اس کی بات کو اس کے "پرعفونت ماحول" کے اثرات سمجھ کر یا سمجھا کر قابل التفات نہیں سمجھتے۔ وہ ناقدین جو ان کی برادری سے متعلق ہیں وہ مختلف وجوہ کی بنا پر اس کوچے میں قدم رکھنا نہیں چاہتے۔ ان کو ادب و سماج کے تعلقات سلجھانے سے ہی فرصت نہیں۔ لہذا نہایت آزادی و فراخدلی سے زبان و بیان کا پوسٹ مارٹم کیا جا رہا ہے۔ ہر شخص کا گھر بار اس کے دوستوں کی مجلس زبان کا دارالضرب ہے۔ جہاں ادبی و لسانی تعریفات کے طومار تیار کئے جاتے ہیں۔ اور جب وہ جنس مغلوب پیش کی جاتی ہے تو اہل نظر اس شاعر کا سرہ کی طرف انگلی اٹھانا بھی ادب کے خلاف سمجھتے ہیں۔ آفاقیت کی دہائی دے دے کر اس کے سانچے کو شکستہ کرتے رہتے ہیں۔ اگر بغیر کسی کاوش کے آدمی ترقی پسند بن سکتا ہو تو برا بھی کیا ہے اور اس حماقت کو کون پسند کرنے لگا کہ محض "کم خرچ بالانشین" اصحاب میں شامل ہونے کے لئے برسوں ذہنی کاوش کی جائے۔ ادب، لغت کا مطالعہ کیا جائے اور زبان کے وسیع دفتر کا جائزہ لیا جائے۔

اس رجحان نے جہاں ترقی پسند ادب کو اپنے مرتبے سے گرادیا وہاں سب سے بڑی دو خرابیاں مزید پیدا کر دیں۔ ایک تو یہ کہ نفس زبان جگہ جگہ سے مجروح ہو گئی۔ نئے شاعروں میں سے بیشتر مشرقیات سے قطعاً نابلد ہوتے ہیں۔ اور قدیم ادبی سرمایے سے بھی گریزاں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ زبان جس کو شائستہ بنانے میں قدمانے خون جگر صرف کیا اس کی اس طرح خبر لی گئی کہ بعض وقت اندیشہ ہوتا ہے کہ اس کی صورت شناسی بھی ممکن ہو سکے گی۔

جب موضوعات میں وسعت پیدا ہوتی ہے تو اس نسبت سے قواعد و ضوابط اور اسالیب میں بھی وسعت پیدا ہوتی ہے' یا پیدا کی جاتی ہے۔ ایسا بہت ضروری ہے۔ لیکن اس فرض کو ادا کرتے وقت یہ نکتہ ضرور پیش نظر رہنا چاہیئے۔ کہ بے اصولی کوئی اصول نہیں۔ مگر کوئی اختراع کی جائے تو اس کو شعوری ہونا چاہیئے۔ یعنی یہ کہ اس کے سارے متعلقات پر نظر ہو۔ لسانیات سے واقفیت ہو۔ ورنہ غیر شعوری تراش خراش یا واقفکارانہ دراز دستی بجائے وسعت پیدا کرنے کے صورت کو مسخ کر دے گی۔

دوسری بڑی خرابی یہ ہوئی کہ ناقدین کی یک طرفہ روش کے باعث وہ لوگ جو ترقی پسند نظریات ادب سے پوری طرح متفق نہیں تھے اس طوائف الملوکی کو دیکھ کر اور زیادہ مشکوک ہو گئے۔ ان لوگوں نے سمجھ لیا کہ ترقی پسندی کا بیشتر حصہ محض سہل پسندی کا اقتضا ہے اور یہ کہ ان لوگوں کو ادب کے لسانی پہلو سے کوئی دلچسپی نہیں۔ نئے شعرا غلط روش پر چلتے رہتے لیکن ارباب نقد و اہل نظر اگر اس پر انگشت نمائی کرتے رہتے اور ایسے تمام حصوں کو بالتعین یا بالتصریح اپنے دائرے سے خارج کر دیتے تو یہ تشکیک نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔ کیونکہ بے راہ رو افراد کی کسی زمانے میں کمی نہیں رہی۔ لیکن ان کو درخور اعتنا کبھی نہیں سمجھا گیا۔ ستم تو یہ ہوا کہ ان لوگوں کی بے راہ روی پر کسی نے چشم نمائی نہیں کی۔ یہ ضرور کہتے رہے کہ نیا ادب قدیم ادب کی اچھائیوں کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن صرف ایک اصول بیان کر دینے سے تو کچھ نہیں ہوتا۔ جب تک اس اصول کو برتا نہ جائے۔ ناقدین نے یہی روش اختیار کی کہ جب کسی کے کلام پر گفتگو کرنے کا موقعہ آیا تو اس پہلو کو قطعاً بچا گئے۔ جیسے کہ اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔ ان کے اس ماورائی طرز نے ذہنوں میں یہ بات راسخ کر دی کہ ترقی پسندی بے راہ روی کا دوسرا نام ہے۔ اور اس کی ساری ذمہ داری ناقدین کے گروہ پر ہے۔

اگر ترقی پسند ناقدین اس طرف توجہ کریں اور ایمانداری کے ساتھ جماعتی مراعات کا لحاظ کئے بغیر نقد و نظر سے کام لیں تو شکوک کا بڑا حصہ ختم ہو سکتا ہے اور بہت سے ان افراد کی ہمدردیاں بھی حاصل ہو سکتی ہیں جو ادبی اعتبار سے اتنی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں جتنی بہت سے لوگوں کو حاصل کرنا مشکل ہے اور اس طرح صالح ترقی پسندی کی ترویج زیادہ کامیابی سے ہو سکے گی۔

سخاوت مرزا اکبرآبادی

اشرف خاں دہلوی

اشرف خاں نام، "خاں" تخلص، ولد محمد علی خاں وزیر دہلی مصحفی لکھنوی کے خاص تلامذہ میں سے تھے اور بڑے باکمال شاعر گزرے ہیں۔ لالہ سری رام دہلوی نے اپنے تذکرہ خمخانہ جاوید میں مختصر طور پر اس طرح تعرف کرایا ہے۔

"خاں اشرف خاں نام تھا، دہلوی الاصل" تھے پھر لکھنؤ چلے گئے، جب دہلی میں رہتے تھے تو انجمن مشاعرہ ترتیب دیتے تھے، غلام ہمدانی مصحفی سے فنِ شعر میں مستفید ہوئے اور نمونتہً صرف چار شعر لکھے ہیں جو یہ ہیں ؎

رہی کچھ تھوڑی سی وحشت کی ہوا میرے بعد — پہلے ہی وحشی ہوا قیس ہوا میرے بعد
تو ابھی سے تو نہ اس بت کی طرفداری کر — مجھ سے ہو جائیو اے دل نہ جدا میرے بعد
اس برائی کے سزاوار ہمیں ہیں پیارے — گالیاں کس کو سناؤ گے بھلا میرے بعد
اے خاں غم فراق میں تم زہر کھا مرو — اس کے سوا نہیں کوئی تدبیر دوسری

مگر خاں کے خود استاد مصحفی نے اپنے تذکرہ ریاض الفصحا میں اپنے شاگرد خاں کے حالات بہ نسبت مؤلف خمخانہ جاوید کے ذرا تفصیل سے لکھے ہیں اور ان کے پورے نام اور اب وجد کے نام وغیرہ کا بھی اس طرح اشارہ کیا ہے۔

خاں، اشرف علی خاں، خاں تخلص ولد محمد علی خاں
وزیر دہلی ابن محمد روشن خاں مخاطب بہ نواب روشن الدولہ
قوم افغان، خٹک، بزرگانش سکنہ شاہجہان آباد
خودش بہ لکھنؤ تولد و نشو و نما یافتہ، فقیر با والدش از
زمانۂ ملازمت صاحب عالم مرزا سلیمان شکوہ بہادر
از مناسبت کہ مرد شجاع و خوش تقریر ہمیشہ مقرب
سلاطین بودہ است الحال در سرکار جناب عالی را
سواران بنارس عز و امتیازے تمامی دارد، در فن
سپاہ گری بہ سواری و در نیزہ بازی یکہ روزگار
چوں گفتن شعر دلش بہ سوئے خود کشیدہ، باشارہ پدر
خود در حلقۂ تلامذۂ فقیر درآمدہ، در مشق چہار پنج سال
از ہمسران خود گوئے سبقت بردہ، حق تعالیٰ زندہ دارد
یقین کہ بے مثل خواہد بود عمرش بست و پنج سالہ است

از دوست ؎

الفت میں جفا کار وہ پرُفن نظر آیا — سمجھے تھے جسے دوست وہ دشمن نظر آیا
نام تیرا ہے گو کہ اشرف خاں — سب سے بدتر جہان میں تو ہے
میں نکل آیا کہاں دستِ دل ناشاد سے — مردم ہمسایہ نالاں ہیں میری فریاد سے
دیوانگی میں بھی مجھے اتنا تو ہوش ہے — تصویر کی پسند تو تیری پسند کی
ہر بات پہ کہتے ہو کہ دیوانہ ہے یہ بھی — ہر بات پہ گالی کوئی یارانہ ہے یہ بھی
کبھی کاٹا گلا خنجر سے گہ تیغِ دو آبی سے — مجھے قاتل نے مارا دیکھنا کس کس خرابی سے

مختصر یہ کہ استاد مصحفی کہتے ہیں کہ ان کے عزیز شاگرد کا نام اشرف علی خاں تھا، ان کے والد، جد محمد علی خاں شاہ دہلی کے وزیر تھے جو فرزند تھے محمد روشن خاں المخاطب بہ نواب روشن الدولہ کے اور حسب بیان "خاں" روشن خاں فرزند تھے اچھے خاں کے اور وہ صوفی بیرخاں کے۔ آبا و اجداد دہلی کے رہنے والے تھے اور افغان قبیلہ خٹک سے تعلق رکھتے تھے۔ اشرف علی خاں لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی صاحب عالم مرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت کے زمانہ میں مصحفی کی ان کے والد سے شناسائی ہوئی۔ "خاں" نے اپنے والد کے ایما سے مصحفی کی شاگردی اختیار کی ترتیب تذکرہ ریاض الفصحا (۱۲۲۱ھ / ۱۲۳۶ھ) کے وقت ان کی عمر ۲۵ سال کی تھی اور چار پانچ سال تک مصحفی سے اصلاح لیتے رہے۔ اس لحاظ سے ان کی تاریخ ولادت (اوائل تیرھویں صدی ہجری) ہے

علم درسی سے فارغ ہونے کے بعد "خاں" مرزا سلیمان کے پاس بنارس کی فوج کے سواروں میں ملازم ہو گئے۔ اور اپنی شجاعت و بہادری کے جوہر

دکھاتے ۔ فنون سپہ گری، نیزہ بازی اور گھوڑے کی سواری میں طاق تھے ساتھ ہی ساتھ مشق سخن بھی جاری تھی۔ اس شہسوار میدان شجاعت و شعر و سخن کو اپنا گھوڑا بھی بڑا پیارا تھا، چنانچہ اپنے گھوڑے موسومہ "ناگ روپ" کی اس طرح تعریف کی ہے ؎

تیز تھا اس قدر وہ رشکِ قمر — گویا اس کے نہیں کٹے ہیں پر
کھاوے جس جا پہ کاوے وہ گھوڑا — ماہِ کامل ہو اس زمین پہ نیا

خان صاحب جب گھوڑے کو دوڑاتے تھے تو ٹھٹ کے ٹھٹ جمع ہو جایا کرتے تھے جس کا ایک نقشہ خان نے اپنی نظم ناگ روپ میں کھینچا ہے "تاریخ قطعہ وفات اسپ ناگ روپ" بھی کہی اور اس طرح ماتم کیا ؎

قلم لے کر نیا میں شب کو یارو — لگا تاریخ توسن جب میں کہنے
سمجھ کر اس کو جولاں بولا ہاتف — گیا یہ برق وش جنت میں رب کے

خان کے والد ماجد کا انتقال ۱۲۴۳ھ میں ہوا۔ خان نے حسب ذیل "تاریخ وفات" کی عنوان یہ ہے۔ "تاریخ وفات جناب قبلہ گاہی دین فقیر محمد علی خان ابن محمد روشن الدولہ ابن اچھے خاں ابن صوفی میر خاں ؎

کروں فکر تاریخ کا کیا بیاں میں — عدم بھی عجائب فزا کا مکاں ہے
جناں کا الف لیلے بولا یہ ہاتف — محمد علی خاں بسیر جناں ہے

۱۲۴۴-۱ = ۱۲۴۳ھ

گویا خاں کے والد کا انتقال مصحفی کی وفات کے تین سال بعد ہوا اپنے استاد مصحفی کی تاریخ وفات بھی کہی ۔

بہر سیرِ حسنِ حوران بہشت — مصحفی نے قصدِ جنت جب کیا
مجھ سے ہاتف نے کہا اے خاں وہیں — برج خاکی میں ہوا گھر ماہ کا

۱۲۴۰ھ

اس اعتبار سے استاد مصحفی سے دس بارہ سال تک تلمذ حاصل رہا۔

معاصرین :۔ لکھنؤ میں مصحفی کے سینکڑوں شاگرد تھے مگر ان میں مولانا آزاد نے آبحیات میں لکھا ہے "کہ شیخ صاحب کے شاگردوں میں منتظر اور گرم دو چلتے طمنچے تھے" اور یہ بھی خان مرحوم کی طرح نواب سلیمان شکوہ کی سرکار میں توپخانہ کی خدمت رکھتے تھے ۔ انہوں نے زبان سے تدبیروں سے معرکوں سے (بمقابلہ انشاء) استادی کے مورچے باندھے ۔ ایک مثنوی لکھ کر "گرم طمانچہ" نام رکھا وغیرہ ۔

غرض خاں بھی مصحفی کے اور شاگردوں کی طرح اپنے استاد اور انشاءاللہ خاں انشاء کی معرکہ آرائیوں میں شریک رہے ہونگے ۔

خان کا کلام صاف و شستہ، محاورہ روزمرہ، نازک خیال اور لطیف تشبیہات سے مالا مال ہے ۔ خود مصحفی کی یہ رائے ہے کہ "در مشق چہار پنج سال از ہمسران خود گوئے سبقت بردہ، حق تعالیٰ زندہ دارد یقین کہ بے مثل خواہد بود"۔ ان کے استاد مصحفی خود کو میر اور میرزا کا ہمسر مانتے ہیں، ان کے شاگرد رشید نے خان نے بھی سودا پر چوٹ کی ہے ؎

حیف اے حضرتِ خاں عہد میں میرے وہ نہیں
شعر سن کر میرے سودا کو بھی سودا ہوتا

مگر خان کا شمار متاخرین شعر لکھنؤ نہیں ہے ۔ اور ان کے کلام میں سودا کی سی شان و شکوہ اور چستی بندش کم ہے ۔ ہم کسی اور موقع پر ان کے کلام پر کافی روشنی ڈال سکیں گے ۔ اس مختصر میں گنجائش نہیں ۔

غرض خاں صاحب رنگین طبیعت اور خوش مزاج اور باربا ش تھے، فرنگی محل لکھنؤ کی ایک طوائف چہاردہ سالہ کی تعریف میں بھی ایک نظم اور ایک قطعہ تاریخ کہا ہے ۔ قطعہ تاریخ یہ ہے ؎

کہی میں نے تاریخ ثمرن کی جب — کہا دوستوں نے یہ با صد تپاک
کہا اس نے صد آفریں تجھ کو خاں — سنی جس نے آ ثمرن خاک پاک

۱۲۳۹ھ

حیدر آباد میں ایک مشہور طوائف ماہ لقا بائی چندا گزری ہے اس کے حسن اور اس کی شوخی و طراری اور حاضر جوابی کے بڑے بڑے امراء اور شعراء فریفتہ تھے اور دہلی و لکھنؤ و آگرہ تو حسین اور خوش گلو، شوخ مزاج تیز و طرار طوائفین کے مرکز تھے ۔ عورتوں کا روزمرہ زبان کا چٹخارہ اور حاضر جوابی کا اثر شعراء پر بھی پڑا ہے ۔ غبی سے غبی دلدادہ بھی جب ان سے بات کرتا ہوگا تو کیا اس کے ذہن کو جلا نہ ہوتی ہوگی ؟ میاں رنگین نے تو سینکڑوں طوائفوں کی تعریف کی ہے ۔

اشرف علی خاں کی تاریخ وفات ہمدست نہ ہوسکی۔ "خمخانہ جاوید" جو آخری ضخیم تذکرہ ہے مختصر حال ہے، جس کا ماخذ تذکرۂ گلشن بے خار شیفتہ ہے ۔ اور تاریخ وفات نہیں، مؤلف مذکور نے یہ لکھا ہے کہ یہ دہلوی الاصل تھے پھر لکھنؤ چلے گئے ۔ مگر مصحفی نے لکھا ہے کہ ان

کے والد دہلی سے لکھنؤ آگئے تھے اور مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں ملازم تھے۔ جو گویا اس وقت دہلی والوں کے ملجا و ماوا تھے، خاں صاحب زیرِ تذکرہ لکھنؤ ہی میں پیدا ہوئے۔ اور ملازمت کی وجہ سے ان کی عمر کا بڑا حصہ لکھنؤ ہی میں گزرا۔ مؤلف تذکرہ گلستان بے خزاں لکھتا ہے کہ "خاں تخلص اشرف خاں" نام، لکھنؤ مامن، دہلی سکونت کا مقام جب سفر سے وطن کو آتے محفل مشاعرہ ترتیب دی جاتی اس لحاظ سے خاں صاحب آخری زمانہ میں دہلی آگئے ہوں اور لکھنؤ آتے جاتے رہتے ہوں گے۔
خاں نے اپنے اس دیوان جلد اوّل میں اپنے دوست احباب کے تاریخی قطعات ۱۲۴۶ھ تک درج کئے ہیں، اور بلحاظ سنہ کتابت دیوان زیر بحث خاں ۱۲۵۸ھ میں دہلی میں بقیدِ حیات تھے اور یہی زمانہ غالب ذوق، مومن وغیرہ کا ہے۔

تصانیف - خاں مرحوم کے دو دیوان اردو میں ہیں۔ پچھلے دیوان کا ایک قلمی خوش خط نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں ہے، جس کے صفحات ۳۹۵ اور ہر صفحہ پر تیرہ بیت ہیں۔ کاغذ بادامی پتلا ہے، افسوس یہ ہے کہ کچھ ناقص الاول ہے۔ جملہ اشعار پانچ ہزار سے زیادہ ہیں، اور یہ مصنف کے زمانۂ حیات کا قلمی نسخہ ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے۔

تمام شد دیوان اول تصنیف حضرت جناب خاں صاحب قبلہ اشرف خاں صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ ولد محمد علی خاں بن محمد روشن خاں بخطاب روشن الدولہ ساکن شاہجہان آباد بتاریخ یازدہم شعبان ۱۲۵۸ھ ہجری بروز شنبہ وقت دوپہر تمام شد (نام کاتب درج نہیں)

خاں کا دوسرا دیوان سبحان اللہ خاں اورنٹیل لائبریری جامعہ علی گڑھ میں ہے۔ چونکہ فہرست مخزونہ کتب خانہ آصفیہ میں سنہ کتابت درج نہیں اس لئے اس وقت اس کے اشعار اور قدامت کا اندازہ نہیں کیا جا سکا۔
غرض خاں کا کارنامۂ حیات ہندوستان کے دو مشہور کتب خانوں میں محفوظ ہے۔ اس کے سوا کسی اور تصنیف کا پتہ نہیں چلا۔
کاتب نے قضا کا املا قزا، اور بدظن کا بدزن لکھ دیا ہے۔
ہم یہاں خاں صاحب کے کلام سے ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے کچھ انتخاب پیش کرتے ہیں استاد مصحفی مرحوم نے جو انتخاب دیا ہے۔ وہ ان کا ابتدائی کلام ہے۔

وصف اس کا میں نے لکھا ہے شبِ مہتاب میں — کس صفائی سے بندھا مضمون ترے رخسار کا
گر گئی نظروں سے بجلی شب جو مِیں یاد آگیا — تیری گردن میں چمکنا موتیوں کے ہار کا
ہیرے آگے ہے ثنائے گل عبث اے عندلیب — منہ نہیں دیکھا ہے کیا اس غیرت گلزار کا
خط سے اس کے روئے رنگیں پر ہوئی دونی بہار — اس چمن میں مرتبہ عالی ہے گل سے خار کا
میں بھی ایک شیریں دہن کا شیفتہ تھا لیکہ خاں — کوہکن نے مجھ سے سیکھا کھودنا کہسار کا
کس تجلی پر ہے بالا آج گوشہ یار کا — ہالۂ مہتاب ہے رخنہ ہر اک دیوار کا
گر کبھی سرمہ سے کام اس نے لیا تلوار کا — اک زمانہ سے نیا ہے طور اس خونخوار کا

شعلۂ حسن ترا شمع فروزاں کی مثال — رونقِ گورِ غریباں نہ ہوا تھا سو نہ ہوا

مکھڑا کھلا صنم کا بندِ نقاب ٹوٹا — شکر خدا کہ اس کا ہم سے حجاب ٹوٹا
قسمت کی خوبی دیکھو جب آیا دور اپنا — ٹکر سبو کی کھا کر جام شراب ٹوٹا
وقفے کی جا نہ تھی کیا یہ بزم بحر امکاں — شیشہ شتاب تیرا کیوں اے حباب ٹوٹا
شاید خبر سنی ہے آنے کی اس کی تو نے — جو تار گریہ کا رے چشم پُر آب ٹوٹا
اس نے بھی ایک دلبر اچھا سے دکھایا — اس طرح اس صنم کا کفرِ شباب ٹوٹا
وہ ہار ہو گیا تھا میرے گلے کا مجھ سے — اس ہاتھ کا جو گجرا ہنگام خواب ٹوٹا

آج گردوں سے ستارے یہ گرے پڑتے ہیں — تو نے ماتھے پہ چنا یار یہ افشاں کیسا
سامنا نوح کے طوفان سے ہے دیکھیں تو — جوش پر آئے تو وہ دیدۂ گریاں کیسا
چودھویں رات لب بام پہ آیا ظالم — لے کے منہ رہ گیا اپنا مہِ تاباں کیسا

کس کی زلفوں کی لہر آئی تھی یہ دل کو کہ میں — آج دریا پہ جو مضطر شکل موج آب تھا

بے زبانوں سے ہوا حل کارِ مشکل دیکھ لو — دُوربیں نزدیک کر دیتی ہے نقشہ دُور کا

لاکھ کھینچے آپ کو پروانہ دار شمع پر — پاوے گا ہرگز نہ رتبہ حضرت منصور کا

اس کے کوچے میں غل مچائے جا — ہاں دلا یاد تو دلائے جا
روٹھ کر تو چلا تو ہی مجھ سے — منہ تو اپنا مجھے دکھائے جا
بیٹھنا ہے جو اس کے پاس دلا — جو ستم وہ کرے اٹھائے جا
آتشِ غم! مزا میں پاتا ہوں — ابھی دل کو مِرے جلائے جا
اے فلک نام چاہیے مجھ کو — آسیا کی طرح پھر آئے جا
میرے زخموں کو ہے اسی میں خوشی — گل خوبی تو مسکرائے جا
ہم بھی سینہ سپر کئے ہیں کھڑے — تیر مژگاں کو تو لگائے جا
کبھی تو دن پھریں گے میرے بھی — اے صبا خاک تو اڑائے جا
تیرے دل میں ہو کاش یونہی اثر — مجھ کو ہنس ہنس کے تو رلائے جا

مرد آبی کو تلاطم سے ہے کیا خوف بھلا
ساکن آب بناتے نہیں گھر پانی میں

اللہ اللہ اے ضیاء وساقیِ جاناں تیرا شوق
خار کو سمجھے ہے صحرا میں ہر ایک دیوانہ شمع

میرے پہلو میں ہے وہ البیلا
کیا چنبیلی کے ہار سے ہے غرض

کیا جاوے ترا وحشیٔ دیگر چمن میں
ہر موج ہوا بنتی ہے زنجیر چمن میں

صدقے آواز کے دل کو مرے بھائی آواز
کس پری چہرہ نے یہ مجھ کو سنائی آواز

ایک عیار تھا شب مجھ کو وہ پہچان گیا
میں نے سو طرح سے بدلنے میں بنائی آواز

بیٹھے ہو منہ کو ڈھانپ کے جو تم کھڑے کھڑے
اے خاں تمہاری آنکھ بتاؤں کہاں لڑے

اس گلبدن کی نازکی کا کیا بیاں کروں
اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ سے پھولوں کے جو کڑے

مجنوں سے نجد میں یہی کہتے تھے سب غزال
لیلیٰ ابھی گئی ہے یہاں سے کھڑے کھڑے

بے اختیار یاد تو آتا ہے میری جاں
جب ایسی شکل راہ میں آگے نظر پڑے

سینہ میں اس طرح سے ہے اس دل کو اضطراب
جوں [illegible] سے رہے ہے کھڑا نعرہ زن کھڑے

وہ بیوفا بھی رو دیا مرا حال دیکھ کر
یارو میان خاک میری لاش جب گڑے

ناداں تو تاکھوتا ہے کس واسطے بھلا
اے خاں نہ جا تو یار کے در پر کھڑے کھڑے

عارسی آوے تجھے سامنے اس کے جانی
صورت آئینہ ہو جس میں تو پانی پانی

نہیں کھیو رمضاں میں تری واری روزہ
لاکھ روزے ہیں ترا ایک ہزاری روزہ

کبھی دیکھا ترچھی نگاہ سے کبھی مسکرا کے ہنسا دیا
کبھی مار تیغ کو تان کر کبھی زخم دل کا سلا دیا

غزلوں کے علاوہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک مختصر سا ذکر یہ ہے۔

(۱) مخمس بر غزل مصحفی ۔ دو دن سے وہ شکل اپنی دکھاتا نہیں مجھ کو

(۲) " " " خیال یار جو شب میرا ہمکنار رہا
تمام رات میں اس کے گلے کا ہار رہا

(۳) مخمس بر غزل مرزا سودا ۔ بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے

(۴) دو مسدس واسوخت

(۵) وصف سراپا معشوق

(۶) مختصر نظم در تعریف اسپ خود نامش ناگ روپ

(۷) " " " " طوائف فرنگی محل چاردہ سالہ نام سمرن خاک پاک

رباعیات ۔ تین چار صفحات ۔ نمونہ یہ ہے

کیا غم ہے جو تم نے غم اٹھائے اے خان
مایوس کبھی نہ ہونا اس سے اے خان
اک پل میں گدا کو چاہے کر دے وہ شاہ
کچھ دیر نہیں ہے اس کو دیتے اے خان

نوٹ ۔ دکن میں لفظ خاں پیارے دوست کے معنی میں استعمال ہوتا ہے
ایک شاعر محمدی خان' خان تخلص' دکن کے رہنے والے تھے' جنھوں نے دہلی کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ اور سعادت یار خان رنگین کے شاگرد تھے' اور اشرف خاں زیر تذکرہ کے معاصر تھے ۔ تیسرے خاں ایک اور گزرے ہیں جن کا نام عبداللہ خاں تخلص خاں تھا ۔ (دیکھئے تذکرہ شعراء سخن نساخ ص۔)

کتابیات :۔

(۱) خمخانہ جاوید' مؤلفہ لالہ سری رام دہلوی ۔۔

(۲) ریاض الفصحا مؤلفہ مصحفی' مطبوعہ انجمن ترقی اردو

(۳) گلستان بےخزاں ۔ حکیم قطب الدین باطن' اکبر آبادی

(۴) دیوان خاں حصہ اول' مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ

(۵) تذکرہ شعراء سخن ۔ عبدالغفور خاں نساخ ۔

(۶) آبحیات' مؤلفہ محمد حسین آزاد مرحوم ۔۔

(۷) فہرست کتب خانہ سبحان اللہ خاں لائبریری' علیگڈھ قلمی کتب خانہ آصفیہ

راشٹرپتی کی طرف سے شاہ افغانستان کو مبارکباد

ہز میجسٹی شاہِ افغانستان کو سالگرہ کی تقریب کے سلسلے میں راشٹرپتی نے شاہ موصوف کو مبارکباد کا حسب ذیل پیغام بھیجا ہے۔
"میں یور میجسٹی کی سالگرہ کی تقریب پر اپنی پُرخلوص مبارکباد کی تجدید کرتا ہوں اور یور میجسٹی کی ذاتی بہبود اور رعایا کی خوشحالی اور فارغ البالی کے لئے نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔"

ذکر و فکر

تیغ الہ آبادی:-

کتنے جانسوز مراحل سے گذر کر دل نے
کس قدر سلسلۂ سود و زیاں دیکھے ہیں

ڈوبتی رات کے سہمے ہوئے کتنے تارے
جھومتی صبح کے آنچل میں نہاں دیکھے ہیں

ٹوٹتے ساز، بکھرتے ہوئے نغموں کے قریب
چوٹ کھائی ہوئی قسمت کے نشاں دیکھے ہیں

جس سیاست کو تھا بیمار تفکر سے عناد
اُس کی قدروں میں تضادوں کے بیاں دیکھے ہیں

موت کو جس کے تصور سے پسینہ آجائے
زیست کے دوش پہ وہ بارِ گراں دیکھے ہیں

وقت کے تُند سمندر میں ہر اک دھارے نے
کتنے خنجر مری گردن پہ رواں دیکھے ہیں

پھر بھی اے حُسنِ جنوں، کیفِ جنوں، جوشِ جنوں
کب مہ و سال نے یوں عزمِ جواں دیکھے ہیں

سابقہ کس سے پڑا ہے ابھی طوفانوں کو؟
ہاں ابھی موت نے انساں کہاں دیکھے ہیں؟

حیات لکھنوی:-

غم سے جب خوگر طبیعت ہوگئی
ہر مصیبت عین راحت ہوگئی

تم نے جب چاہا نگاہیں پھیر لیں
تم نے جب چاہا قیامت ہوگئی

میری جانب ہنس کے دیکھا آپ نے
زندگی کی کچھ تو قیمت ہوگئی

کہہ کے یہ رخصت ہوا بیمارِ غم
روز کے جھگڑوں سے فرصت ہوگئی

ہجر کی شب کاٹنے کو کاٹ دی
شمع کی سی اپنی حالت ہوگئی

دیکھ کر رنگِ بہارِ زندگی
قوتِ پرواز رخصت ہوگئی

اُس نے پھر دیکھا مری جانب حیات
پھر مجھے جینے کی حسرت ہوگئی

قمر رئیسی الہ آبادی:-

عقل و دانش سے چلے وہم و گماں تک پہنچے
اے نئے ذہنِ رسا ہم بھی کہاں تک پہنچے

بحث کے واسطے ہم اس نے ٹلیّا رنہیں
بات چھیڑنے پہ خدا جانے کہاں تک پہنچے

وسعتِ اشک بھلا سمجھے زمانہ کیوں کر
کوئی کس طرح ستاروں کے جہاں تک پہنچے

درِ محبوب کہاں اور خدا خانہ کہاں
کس کی چوکھٹ سے اٹھے کس کے مکاں تک پہنچے

مسکراتا بھی نہیں اب میں قمر اس ڈر سے
مسکراہٹ نہ کہیں آہ و فغاں تک پہنچے

الطاف مشہدی:-

آج کا انساں بہت مجبور ہے
زندہ رہ کر زندگی سے دور ہے

خون سے لکھی ہوئی تاریخ پر
آدمی کیوں اس قدر مغرور ہے

زندگی اور آج کے انسان کی
وقت کے سینے کا اک ناسور ہے

بند ہے شیشوں میں انساں کا لہو
میکدے کا یہ نیا دستور ہے

پھول کیوں لائے تبسم ہونٹ پر
باغباں کو جب یہی منظور ہے

اختر لکھنوی:-

اپنے خوابیدہ مقدر کو جگا لوں تو ہنسوں
اپنی بگڑی ہوئی باتوں کو بنالوں تو ہنسوں

کیوں ابھی ہنسنے پہ مجبور ہمیں کرتے ہو
اُن کو رودادِ الم اپنی سنالوں تو ہنسوں

چشم گریاں ہے ابھی اشک بہانے پہ بضد
دل کے بھڑکے ہوئے شعلوں کو بجھا لوں تو ہنسوں

اُف یہ طوفانِ حوادث، یہ گھٹائیں، یہ دھواں
اپنی کشتی کو کنارے سے لگا لوں تو ہنسوں

منموہن تلخ:-

ہوش میں جب ہوا ہوں، دیکھا ہے
دوستوں کی نگاہ میں کھٹکا ہوں

زندگی سے نباہ کرنی ہے
مجھ کو احساس ہے کہ جیتا ہوں

گھر ہی کا جہاں خیال تھا
میں انھیں راستوں میں بھٹکا ہوں

دوستی کا کوئی فریب ہی دے
زندگی میں اب اتنا تنہا ہوں

میں نے غم کو بھی غم نہیں سمجھا
دوستوں سا سلوک کرتا ہوں

آج کا درد مجھ سے پوچھ نہ دوست
جس کو جو جی میں آئے کہتا ہوں

اشرف ابرایانی:-

ملی دادِ وحشت مجھے ہر کسی سے
بڑے کام نکلے ہیں دیوانگی سے

کسی کی تمنا میں جی جی کے مرنا
یہی کچھ ملا ہے مجھے زندگی سے

یہ کس کے تبسم سے سیکھا ہے کھلنا
کوئی جا کے پوچھے چمن میں کلی سے

محبت کا سب کو یقیں ہو چلا ہے
مجھے اور دیکھا کرو بے رُخی سے

سیہ خانۂ دل کو پُر نور کر دو
چھپاتے ہو کیوں روئے تاباں ابھی سے

غلام احمد فرقت

جانے کی عجلت

کوئی لکھ پتی کاہل بھی اگر چاہے تو جاڑے کی ایک بھرپور رات سو کر "ہضم" نہیں کر سکتا چہ جائیکہ ہم جو گرمیوں کی ننھی ننھی راتوں میں بھی ۹ بجے رات سے اُٹھ پڑنے کے عادی ہیں۔ بہرحال جب ۴ بجے سویرے ہماری آنکھ کھلی تو ہم نے لحاف کے اندر منہ ڈالے ڈالے کہا۔

— اماں میر صاحب! یار آج جامعہ نگر چلنا ہے

میر صاحب برابر ہی دوسرے پلنگ پر بیٹھے تھے۔ ایسا معلوم ہوا جیسے ہماری آواز سُن کر سُوں کھسیٹ گئے۔

ہم نے کہا۔ یار۔ اگر نہ چلنے والے ہو تو ابھی سویرا ہے۔ صاف صاف کہہ دو۔ ورنہ معاملہ کھٹائی میں ڈالنے سے کیا نتیجہ

— سناٹا

ہم - واللہ کیا سُوں کھسیٹی ہے۔ جیسے سو ہی تو رہے ہو!!

میر صاحب۔ (غنودگی میں) اونہیں تو!

ہم - اماں۔ تو پھر اُٹھو نا! آخر کب تک سوتے رہو گے؟

میر صاحب (غنودگی میں) صبح تک!!

ہم - صبح تو ہوگئی!

— سناٹا۔

ہم - تمہارے یہاں سویرا کب ہوتا ہے؟

میر صاحب۔ (غنودگی میں) سویرے

ہم - تو سویرا تو ہوگیا۔ چار بجنے کو ہیں۔ اس کے بعد پانچ بجیں گے اور پھر چھ بج جائیں گے۔

میر صاحب (بڑبڑاتے ہوئے) اس کے بعد سات۔ پھر آٹھ

ہم - آٹھ کیا — ؟ کیا ۸ بجے چلنے کا ارادہ ہے آٹھ تو بڑی دیر میں بجیں گے

میر صاحب۔ ہاں!

ہم - پھر کیا آٹھ بجے چلو گے —— بڑی دیر ہو جائے گی!

میر صاحب۔ نہیں

ہم - کیا بسیں آٹھ بجے چھٹتی ہیں؟

(سناٹا)

ہم - بولو۔ پہلی بس کے بجے چھٹتی ہے - ۸ بجے؟

میر صاحب۔ ہاں۔

ہم - تو پھر کیا ارادہ ہے؟

— سناٹا —

ہم - تو پھر کیا فیصلہ کیا؟ چلو گے یا نہیں

میر صاحب۔ "ہاں"

ہم - اماں - میر صاحب - واللہ یہ کیا ہاں نہیں لگا رکھی ہے — کوئی ایک بات کہو - تو پھر ہم شیو کریں نا!!

میر صاحب۔ ہاں۔

میر صاحب جب ۸ بجے سو کر اُٹھے تو ہم نہائے دھوئے، شیو کیے پینٹ پہن کر بالکل تیار کھڑے تھے۔

میر صاحب۔ (آنکھ ملتے ہوئے) اتنے سویرے کہاں چلے؟

(یہ سُن کر ہمارے آگ ہی تو لگ گئی۔ دل چاہا کہ اپنا اور میر صاحب کا خون پانی ایک کر دیں)

ہم نے کہا۔ یار۔ ابھی تم ہی نے تو کہا تھا کہ ۸ بجے جامعہ نگر چلیں گے!

میر صاحب۔ میں نے اگر کہا ہوگا تو اٹھنے کے بارے میں کہا ہوگا!

ہم - تو پھر کیا نہیں چلو گے؟

میر صاحب۔ چلیں گے کیوں نہیں!

ہم - تو پھر چلو۔

میر صاحب - چلنے میں کیا رکھا ہے -

ہم - کیا کہا ؟ تو کیا نہیں چلو گے

میر صاحب - مطلب یہ کہ چلنے میں کیا دیر لگتی ہے ! حوائج ضروری سے فارغ ہوئے، بال کترواتے، نہائے، جوتے پر پالش کی اور چل دئے -

ہم - کیا بات کہی ہے ! یار یہ تو تم نے اپنا دن بھر کا پروگرام بنا دیا -

میر صاحب - دن بھر کی بھی خوب کہی ! کام ہی کیا ہے ؟ لیٹرین - جامع مسجد باتھ روم - شوٹ اور پھر بس میں بیٹھ - چل چل چنبیلی باغ میں -

اچھا نواب - اب چلنے کو تو کہنا چاہئے کہ ہم بالکل تیار ہی ہیں مگر اب ہم کو لوٹا ملنا چاہئے

ہم - لے لو نا - یہیں کہیں ہوگا !!

میر صاحب - اب تم ہی ڈھونڈ دو یار - ورنہ پھر بگڑو گے کہ بلا سبب دیر کرا دی -

ہم - (لوٹا اٹھا کر) لیجئے - یہ لوٹا اور بس سیدھے اپنے مرکز کی طرف مائل بپرواز ہو جائیے -

میر صاحب - لو ٹوتھ پیسٹ تو رہ ہی گیا - ذرا دیکھنا - تمہاری میز پر تو نہیں ہے -

ہم - نہیں - ادھر نہیں ہے -

میر صاحب - تو ذرا اٹھ کر دوسری طرف دیکھ لو - نہیں تو یہی کہو گے کہ ان کی وجہ سے دیر ہو گئی -

ہم - وہ دیکھو ---- تمہاری سرخ کتاب کے نیچے دبا فاؤں فاؤں کر رہا ہے -

میر صاحب - ابھی اس کا برش بھی تو تلاش کرنا ہے !

ہم - برش کہاں رکھا تھا ؟

میر صاحب - یہیں کہیں رکھا ہوگا -

ہم - یہاں کہاں ؟

میر صاحب - مطلب یہ ہے کہ یہیں کسی طاق واق پر ہوگا - کل رات کو میز پر دکھائی پڑا تھا - اس وقت زیادہ سے زیادہ کسی الماری کے خانہ میں ہوگا نہیں تو بازار سے دوسرا آجائے گا - کون بڑی قیمتی چیز ہے ؟ یہ سن کر ہماری روح ہی تو فنا ہو گئی - ہم نے دیکھا کہ وہ پلنگ کے پائے کے نیچے دبا پڑا ہے - ہم نے اسے اٹھا کر میر صاحب کو دیتے ہوئے کہا -

"لو یہ برش بھی لو اور جاؤ" -

میر صاحب - جاتے جاتے جائیں گے -

ہم - اور ہاں - دیکھو یار - جس مہم پر جا رہے ہو وہ شارٹ ہینڈ میں سر ہونا چاہئے -

میر صاحب - بہرحال اس کا وعدہ نہیں کر سکتا - اب یہاں سے منزل مقصود تک پہنچتے پہنچتے ٹائپ ہو کر شارٹ ہینڈ ہو جائے تو تمہاری قسمت ورنہ بظاہر آثار تو لانگ ہینڈ والے معلوم ہوتے ہیں - بہرصورت ہم کو تو کام سے کام -

ہم - اچھا تو جاؤ تو سہی -

میر صاحب - بھیا - یہ سب تمہارے کان میں پیشگی اس سبب سے ڈال دیا کہ بعد میں تم ہی کہو گے کہ ان کی وجہ سے دیر ہو گئی !!

میر صاحب تو تقریباً آدھ گھنٹہ کے بعد لیٹرین سے واپس آئے اور ہم اپنی بنیاں نوچتے رہے -

میر صاحب - (دور سے) لیجئے حضرت آ گئے -

ہم - سبحان اللہ - پورے آدھ گھنٹہ بعد تشریف لائے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہم آ گئے - گویا بڑے سویرے پلٹے -

میر صاحب - بھائی جان ! ہر ایک آدمی کے اتار چڑھاؤ یکساں نہیں ہوتے کوئی نہ ہونے پر بھی قانع ہے اور کوئی بہت زیادہ ہونے پر بھی دست طمع دراز رکھتا ہے -

ہم - تو اب کیا ارادے ہیں ؟

میر صاحب - کچھ نہیں جامع نگر چلنے کے ہیں - مگر دانت مانجھنے کی مہلت تو دینا ہی ہوگی -

ہم - تو دانت مانجھو نا !!

میر صاحب - دانت کاہے سے مانجھیں - جب ٹوتھ پیسٹ بھی تو ہوا

ہم - ٹوتھ پیسٹ کیا ہوا ؟

میر صاحب - ہاتھ میں لئے لئے تمہارے سامنے بھولے سے لیٹرین چلے گئے تھے جب وہاں گر پڑا تو خیال آیا کہ یار بڑی چوک ہو گئی -

ہم - تو پھر اب!

میر صاحب - اب کیا دوسرا آ جائے گا -

ہم - وہ کب؟

میر صاحب - ابھی دوکانیں کھلنے پر یا پھر جامع مسجد شیو کرنے جائیں گے اُدھر سے پلٹتیوں سے لیتے ہوئے چلے آئیں گے

میر صاحب پورے تین گھنٹے بعد جامع مسجد سے پلٹے اور قبل اس کے کہ ہم ان سے بازپرس کریں کہ اتنی دیر کہاں لگائی - دیکھتے ہی منہ بگاڑ کر بولے

میر صاحب - واللہ تمہارے خوف کے سبب آج ٹھیک سے بال بھی نہ کٹروا پائے -

ہم - تو پھر کیا ۳ گھنٹے تک آپ جھک مارتے رہے -

میر صاحب - تو یہاں سے جامع مسجد کتنی دور ہے قبلہ!!

ہم - زیادہ سے زیادہ ایک فرلانگ -

میر صاحب - اچھا چلئے آپ ہی کا کہنا صحیح --- اب آیئے حساب کر لیجئے - یہاں سے جامع مسجد آدھ گھنٹہ - کہئے ہاں - اس کے بعد بال کٹروائی دو گھنٹے تو بہر صورت رکھئے ہی گا --- اس کے بعد جامع مسجد سے یہاں تک سرپٹ واپسی کے لئے آدھ گھنٹہ اور رکھ لیجئے - ہوئے تین گھنٹے کہ نہیں!

ہم - جی ہاں - خیر صاحب صبر کیا - مگر یہ تو بتائیے کہ اب کیا ہو چاہیے

میر صاحب - اب رہ کیا گیا --- ابھی جوتا اُتار کر پالش کرتے ہیں اور پھر غسل کے بعد ع مرا ہندوستان ہے اور میں ہوں -

ہم - پہلے نہا لو پھر جوتے پر پالش کر لینا -

میر صاحب - یار نہانے کے بعد اگر جوتے پر پالش کرنے بیٹھے تو طبیعت میں اضمحلال پیدا ہو جائے گا اور تم کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ اسی کی وجہ سے دیر ہو گئی -

ہم - کیا بات کہی ہے! گویا آپ جوتے پر پالش کرنے کیا بیٹھیں گے جوتے تناول فرمانے بیٹھیں گے -

میر صاحب - چلو تم بھی کیا کہو گے کہ کسی جی حضوری سے سابقہ پڑا تھا --- اچھا ذرا بڑھ کر ادھر سے صابن دان اٹھا دو اور چل دیں ہم نہانے

ہم - صابن دان کہاں ہے؟

میر صاحب - دیکھ لو نا! اگر کسی طاق واق پر نہیں تو اس سامنے والی ٹٹی کو ذرا اُتارنا اور دیکھنا - اس میں ضرور ہو گا!

ہم - تو اس میں تو کہیں نظر نہیں آتا -

میر صاحب - کہیں ایسا کہئے گا بھی نہیں - ابھی کل ہی تو بازار سے پیرس سوپ کی بٹی خریدی ہے -

ہم - جی ہاں --- اس میں نہیں ہے!

میر صاحب - تو پھر تلاش کرنا پڑے گا - کیوں کہ اب تو اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ اس وقت دوبارہ خرید کر لائی جائے - بہر حال تم بستر کے سرہانے دیکھنا شروع کرو - میں زمین وہیں میں اور الماری پر دیکھے لیتا ہوں -

میر صاحب - (زور سے) اے لو - یہ کیا - یہاں ایسے زمین پر میاں صابن صاحب اوندھے پڑے ہیں - قسم قرآن کی اگر اس وقت یہ نہ ملتا تو تم سے پورا پورا سوا روپیہ قرض لے کر اور اس کے نہ ملنے کی ضد میں اسی وقت جا کر بازار سے نئی بٹی لے آتا - اس سے بارہا کہا - ابے میز پر رہ - مگر آنکھ بچی اور یہ زمین پر -

ہم - تو یار! اب تو اپنی جگہ سے ہلو -

میر صاحب - اچھا صاحب - لیجئے چل دئے - آپ بھی کہیں گے کہ کس بھوت سے سابقہ پڑا ہے -

میر صاحب - (تھوڑی دور سے واپس آ کر) اماں! ہاں - ذرا لینا تو یہ جامع مسجد پر روپیہ تڑایا تھا پیسے جیب ہی میں پڑے رہ گئے - ذرا ان کو دیکھ لو --- میں ابھی آیا بلکہ ذرا گننا تو --- کتنے ہیں؟ دیکھو یہ چونی کھوٹی معلوم ہوتی ہے -

ہم - بھائی صاحب - آپ نہانے جائیے - میں گن لوں گا - اور کھری کھوٹی بھی پرکھ لوں گا -

میر صاحب - اماں - ہم تو سمجھتے ہیں کہ تم جامعہ نگر کیا جا رہے ہو سری نگر وری نگر جا رہے ہو -

ہم - اجی سری نگر نہیں ہم جہنم جا رہے ہیں - مگر آپ تو اپنی جگہ سے ہلیں!

میر صاحب - (غسل خانے کی طرف گنگناتے ہوئے) خدا کے گھر بھی نہ جائیں گے بے بُلائے ہوئے - چند منٹ کے بعد پھر جو ہم کمرے کے دروازے کی طرف

منہ اٹھا کر دیکھتے ہیں تو میر صاحب جُوں کے تُوں کھڑے کہہ رہے ہیں ذرا اس انگلی پر سے تولیہ تو دینا — ورنہ پھر تم ہی شکایت کروگے کہ ان کی وجہ سے دیر ہوگئی —

ہم نے دانت پیستے ہوئے کہا - ہت ترے کاہل کی -

بیس منٹ کے بعد میر صاحب تولیا ڈالے پھر اسی طرح واپس آگئے۔

ہم - اماں - نہا آئے

میر صاحب - نہائے تو نہیں - البتہ دانت سب کے سب مانجھ ڈالے -

ہم - تو پھر یہ آدھ گھنٹہ تک کیا کرتے رہے -

میر صاحب - یار - پہلے تو ایک دم غسل خانے کے اندر پہنچ کر غسل خانے کے کواڑ اندر سے بند کرلئے - پھر جھٹ کپڑے اُتار کر کھونٹی پر ٹانگے اس کے بعد لُٹیا لی - ٹب کا نل کھولا' بالٹی بھری اور پھر سوچتے رہے کہ جسم پر پانی ڈالیں یا نہ ڈالیں - آخر میں یہی فیصلہ کرنا پڑا کہ اس وقت غسل کا ارادہ ملتوی کردیں کیونکہ اوّل تو جان جوکھم کا معاملہ ہے - دوسرے تم کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ اِن کی وجہ سے دیر ہوگئی -

"ہت تمہارے کاہل کی" (ہم نے دانت پیستے ہوئے کہا - اچھا تو اب چلتے ہو -

میر صاحب - اماں - اُس وقت سے برابر چل نہیں رہے ہیں تو اور کیا کر رہے ہیں - تم نے ایک منٹ بیٹھنے بھی دیا !

ہم - اچھا بس اب کپڑے بدلنا شروع کر دیجئے -

میر صاحب - بہت بہتر ہے - مگر آپ بھی ہماری گھڑی تلاش کرکے وقت دیکھنا شروع کر دیجئے کہ اس وقت بجا کیا ہے ؟

ہم - گھڑی کہاں ہے ؟

میر صاحب - اگر تکیے کے نیچے نہیں تو کسی شیروانی کی جیب میں ہوگی بشرطیکہ حمام میں نہ رہ گئی ہو -

ہم - لو - مل گئی - تکیہ ہی کے نیچے تھی — اچھا ہاں تو اس وقت ۱۱ بجنے میں دس منٹ باقی ہیں -

میر صاحب - تو اس کے معنے یہ کہ ابھی ناشتہ کا وقت ہے کیونکہ گرمیوں میں آٹھ بارہ بجے سے پہلے نہیں بجتے -

ہم - اور جاڑوں میں گویا بارہ کے بعد بجتے ہیں -

میر صاحب - اماں - مطلب یہ ہے کہ جاڑوں کے آٹھ اور گرمیوں میں صبح کے پانچ تقریباً ایک ہی وقت میں بجتے ہیں اور ہم آج کل چونکہ ۸ بجے اُٹھ بیٹھتے ہیں اس لئے گویا گرمیوں کے پانچ بجے اٹھنے والوں میں بہ آسانی ہماری بھرتی ہو سکتی ہے -

ہم - بہرحال اب ناشتہ راستہ ہی میں ہوگا -

میر صاحب - یہ اچھی کہی - گھر پر تو بروقت دانہ گھاس ایک وقت نہیں اچھا تو لپک کر بازار سے ایک درجن کیلے ہی لے لو - اس درمیان میں اپنے دونوں جُوتوں پر ایک ساتھ پالش سے فارغ ہوا جاتا ہوں بلکہ موزوں سمیت جوتا بھی پہن لوں گا -

ہم - گویا آپ صرف جوتے کی پالش میں اتنی زیادہ دیر لگائیں گے -

میر صاحب - اچھا تو آپ پالش کیجئے - میں کیلے لے کر چشم زدن میں حاضر ہوتا ہوں - مگر دیکھو یار - جوتے کو اول تو خوب برش سے صاف کر لینا - پھر اگر ممکن ہو تو کپڑے سے پونچھ لینا - اچھا تو پھر بندہ چلا - خدا حافظ -

ہم - پانچ منٹ سے زیادہ نہ لگائیے گا - وقت بالکل تھوڑا ہے -

میر صاحب - جی ہاں - میں نے بھی بچپن میں پڑھا تھا کہ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں - اور یہ ٹکڑا بچپن سے اب تک اس خاکسار کو بھی فرفر یاد ہے -

— اچھا فی امان اللہ - (تین چار منٹ بعد)

میر صاحب - اماں - ہاں - چلتے چلاتے ایک بات ضروری یہ کہنا تھی کہ جوتوں میں ذرا اندر ہاتھ ڈال کر گئے ہاتھوں یہ بھی دیکھ لینا کہ کوئی کیل تو نہیں ہے کیونکہ دو روز سے ایک کیل میرے دائیں پیر میں چُبھ رہی ہے -

— مجھے مل نہیں رہی تھی شاید تمہیں مل جائے -

ہم - (بگڑ کر) اماں - اب تمہارے ساتھ جانے والے کی ایسی تیسی -

میر صاحب - گرم نہ ہو — یار — ابھی آیا — (میر صاحب چل دئے)

۵½ بجے شام تک ہم میر صاحب کا جاگ کر انتظار کرتے رہے اس کے بعد سوٹ پہنے پہنے اور پلنگ پر بیٹھے بیٹھے سو گئے - اور تقریباً ۶½ بجے شام کو جب ہماری آنکھ کھلی تو کیا دیکھا کہ بغل میں تو کیلوں کے اُدھڑے ہوئے چھلکوں پر نہیں چتی وار کیلے رکھے ہوئے ہیں اور اُن پر ایک پرچہ لکھا رکھا ہے -

"ریگل سینما میں ۶½ بجے تک پھاٹک پر تمہارا انتظار رہے گا دونوں ٹکٹوں کے دام احتیاطاً جیب میں ڈالتے لانا" -

دیو پرکاش نائر

انڈونیشیا کے دیہات

جاگتے ایشیا کے نونہالوں میں "ریاستہائے متحدہ انڈونیشیا" بھی ایک ہے۔ بھارت اور انڈونیشیا کی سامراج واد کے خلاف لڑائی نے دونوں کو ایک مضبوط کڑی میں باندھ دیا ہے۔ انڈونیشیا دُنیا کا دہ اسلامی دیش ہے۔ جس نے بھارت کی طرح مذہب کو فرد کے انفرادی معاملے کی حیثیت دی ہے۔ اور اپنے دستور کو مذہب سے بالاتر رکھا ہے۔ یہ بات دونوں ملکوں کے تعلقات کو فطری طور پر اور بھی گہرا بنا دیتی ہے۔

انڈونیشیا میں جاوا، سماٹرا، مدورا، ڈچ، بورنیو وغیرہ ٹاپو ہیں۔ جو ہمارے جنوب مشرق میں ملایا کے جنوب سے ہوتے ہوئے مشرق کی طرف پھیلے ہوئے ہیں

انڈونیشیا کا رقبہ ۷ر۳۵ر۰۰۰ مربع میل ہے اور ۱۹۳۰ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ۶ر۱ کروڑ ہے۔ اندازہ ہے کہ آج کل اس کی آبادی سات کروڑ کے لگ بھگ ہوگی۔ آبادی کا ۹۷ر۴ فیصدی انڈونیشین لوگ ہیں اور ۲ر۵ فیصدی غیر ملکی، جن میں یورپین اور چینی بھی شامل ہیں جغرافیائی حالات کی تبدیلی کی وجہ سے کہیں کم اور کہیں زیادہ لوگ بسے ہوئے ہیں۔ شمالی سمندر کے کنارے کے ساتھ ساتھ ایک مربع کلومیٹر میں پانچ چھ سو کے قریب لوگ آباد ہیں۔ بورنیا جیسے علاقے میں ہر مربع کلومیٹر میں صرف تین آدمی ہی رہتے ہیں۔ جاوا، سماٹرا جیسے علاقوں سے جہاں آبادی بے حد بڑھ گئی ہے۔ لوگ اُن علاقوں میں چلے گئے ہیں جہاں آبادی کم ہے۔ جیسے جنوبی سماٹرا اور سیلی بیس میں۔ انڈونیشیا کے لوگ کافی مضبوط ہوتے ہیں بہت سی خوفناک بیماریاں عام ہونے کے باوجود بھی ان کی آبادی میں لاکھ کے قریب ہر سال بڑھ جاتی ہے۔ انڈونیشیا میں زیادہ تر دو قومیں بستی ہیں۔ ملایا لوگ مغرب میں اور "پاپوا" لوگ مشرق میں۔ ملایا لوگوں کی بہت سی قومیں ہیں جیسے باٹک، اگا جا اور ڈچک وغیرہ

انڈونیشیا کے اسّی فیصدی لوگ دیہات میں رہتے ہیں۔ اور زیادہ تر کھیتی کرتے ہیں۔ باقی چھوٹے چھوٹے کاریگر، پرچون فروش اور مزدور وغیرہ ہیں۔ جن لوگوں کو دیہات میں کام نہیں ملتا۔ وہ شہروں اور قصبوں میں چلے جاتے ہیں۔

یہاں دو طرح کی کھیتی ہوتی ہے۔ ایک تو عام طرح کی کھیتی، اور دوسری بڑے بڑے کھیتوں (پلانٹیشن) میں ربڑ چائے وغیرہ کی کھیتی۔ یہ پلانٹیشن زیادہ تر ڈچ لوگوں کے ہاتھ میں ہیں۔ اور عام طرح کی کھیتی انڈونیشین لوگوں کے ہاتھ میں۔ لوگ زیادہ تر چاول بوتے ہیں۔ جو فصلی زمین کا ۴۵ فیصدی ہے۔ باقی ۲۳ فیصدی زمین میں مکئی، ۹ فیصدی میں دالیں، ۲ فیصدی میں تمباکو اور باقی زمین میں دوسری فصلیں بوئی جاتی ہیں۔ پلانٹیشنوں میں زیادہ تر ربڑ، گنا، کافی، چائے، سنکونا وغیرہ بوئے جاتے ہیں۔

مذکورہ بالا پیداوار کے علاوہ ڈچ، بورنیو، سیلی بیس، سراوک اور جاوا کے کنوئیں حال ہی میں بہت اہمیت حاصل کر گئے ہیں اور دنیا کا تین فیصدی یہیں سے نکالا جاتا ہے۔ سنکونا مرچ، مسالحے، ربڑ، ناریل کی چیزیں پیٹرول، ٹین، کافی، کھانڈ، چائے وغیرہ بھی انڈونیشیا میں بہتات سے پیدا ہوتے ہیں۔ انڈونیشیا کی تجارت زیادہ تر یورپ، امریکہ اور ایشیائی ملکوں سے ہے۔

جاوا کے دیہات ایک طرح سے ایک بہت بڑے کنبے سے مشابہ ہوتے ہیں۔ عام طور پر ایک گاؤں میں سَو سے پانچ سو تک گھر ہوتے ہیں۔ ہر کنبہ الگ الگ گھروں میں رہتا ہے۔ ایک گھر میں ماں باپ اور اُن کے بچے ہی نظر آتے ہیں۔ دوسرے ٹاپوؤں کے کچھ حصّوں میں کئی بڑے بڑے مکان بھی ہیں۔ جن میں چار سے آٹھ کنبے تک اکٹھے رہتے ہیں۔ لیکن یہ جائنٹ فیملی سسٹم اب مٹتا جا رہا ہے۔ ہر مکان کے گرد ایک باغ ہوتا ہے جس میں ناریل اور پھلوں کے پیڑ ہوتے ہیں۔ یا سبزیاں بوئی جاتی ہیں۔ اکثر مکان لکڑی اور بانس کے بنے

ہوئے ہیں۔ کھاتے پیتے لوگوں کے مکان اینٹوں کے ہوتے ہیں۔
تقریباً ہر گاؤں میں ایک لنگار یا عبادت کرنے کی جگہ ہوتی ہے۔ جہاں لوگ قرآن شریف کی قرأت کرتے ہیں۔ مسجد وہاں ہوتی ہے جہاں قبیلے یا سب قبیلے کا سردار رہتا ہے۔ مذہبی معاملوں میں جو سردار ہوتا ہے اُسے پین ہُولو کہتے ہیں۔ شادیاں اور طلاق مسجد میں ہی ہوتے ہیں اور اسی پر مسجد کی آمدنی کا انحصار ہوتا ہے۔ بہت سے دیہات میں چار جماعتوں کے اسکول ہیں لیکن اُن کی تعداد اطمینان بخش نہیں ہے۔

ایک دیہات کو دوسرے دیہات کے ساتھ ملانے کے لئے راستے اور سڑکیں وغیرہ ہیں۔ لیکن جو گاؤں دریاؤں کے کنارے پر واقع ہیں وہاں آنے جانے کا ذریعہ صرف دریا ہی ہیں گاؤں کے لوگ سب مل جل کر رہتے ہیں۔ ذات پات کا رواج نہیں ہے۔ سماج کے الگ الگ طبقوں میں کوئی بڑا فرق نہیں ہے۔ کوئی بھی پڑھا لکھا مزدور گاؤں کا سردار چنا جا سکتا ہے۔ اور سردار کا لڑکا اگر لوگوں کو پسند نہیں تو اُسے سردار کی گدی نہیں ملتی۔ ایک پیشے سے دوسرے پیشے میں جانا بھی مشکل نہیں۔ بالی میں ایک طرح کی ذات پات ہے۔ پجاری برہمن اور کھتری تروانگ کہلاتے ہیں۔ لیکن وہ عام سماج سے الگ تھلگ نہیں رہتے۔ تروانگ بالی کی آبادی کا سولھواں حصہ ہیں۔ وہ مُردوں کو بہت دھوم دھام سے جلاتے ہیں۔

اور اس پر اُن کا کافی خرچ ہوتا ہے۔
شادی بیاہ کے معاملوں میں ذات پات کی کوئی رُکاوٹ نہیں ہے گاؤں کا سردار ایک مزدور کی لڑکی سے بیاہ رچا سکتا ہے۔ سوائے اُن صوبوں کے جہاں قبیلوں میں بیاہ ہوتا ہے کوئی شخص کسی بھی لڑکی سے شادی کر سکتا ہے۔ اسلامی حصّوں میں ایک سے زیادہ بیوی رکھنے کی اجازت ہے۔ لیکن بہت کم لوگ ہیں جو ایسا کرتے ہیں۔ ایک سے زیادہ شوہر رکھنے کا رواج کہیں نہیں ملتا۔ سماٹرا کے ایک صوبے میں عورت کنبے کی سردار ہوتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ رواج ختم ہو رہا ہے۔ بچپن کی شادی کا رواج نہیں ہے۔

دیہات میں عام طور پر مسلمان آباد ہیں۔ لیکن کئی صوبے ایسے ہیں جہاں عیسائیوں کی تعداد زیادہ ہے جیسا کہ شمالی سیلی بیس میں۔ تاپانولی (سماٹرا) میں ہندو دھرم کے آثار اب بھی ملتے ہیں۔ رامائن اور مہابھارت کی کہانی عام طور پر انڈونیشیا میں جانا جاتا ہے۔ وہاں سب مذہبوں میں ایک دوسرے کے لئے احترام کا جذبہ ملتا ہے۔

جنوری ۱۹۵۰ء تک آزادی سے پہلے انڈونیشیا کے دیہات کی تنظیم کچھ اس [illegible] تھی۔
گاؤں کے سردار کو لورا دیسا کہتے تھے جس کے ماتحت چھوٹے چھوٹے گاؤں کے سردار ہوتے تھے جو پاہو کہلاتے تھے۔ پندرہ دیہات کو ملا کر ایک چھوٹا

ضلع بنتا تھا، جس کا سردار ویدانا کہلاتا تھا۔ چار سے پانچ چھوٹے ضلعے بنا کر ضلع بنتا تھا، جس کا اپنا سردار ہوتا تھا۔ چار سے پانچ ضلعے ملا کر ریجنسی بنتی تھی۔ جس کا سردار بوپاٹی کہلاتا تھا۔ چار پانچ ریجنسیوں سے ایک ریذیڈنٹ شپ بنتی تھی۔ جس کے ہر بڑے حاکم کو ریذیڈنٹ کہتے تھے۔ چار یا پانچ ریذیڈنٹ شپوں کے ملنے سے ایک صوبہ بنتا تھا، جس کا حاکم گورنر ہوتا تھا۔

دوسری جنگِ عظیم سے پہلے انڈونیشیا کے دیہاتوں کا سب سے بڑا افسر بوپاٹی ہوتا تھا۔ اسے سرکار متعین کرتی تھی۔ یہ لوگ عام طور پر پرانے اور مشہور کنبوں میں سے چُنے جاتے تھے اور باپ کے بعد بیٹا مقرر ہوتا تھا۔ ضلعے اور سب ضلعے کے سرداروں کو بھی سرکار ہی متعین کرتی تھی۔ اس کے بعد انھیں خاص اسکولوں میں ٹریننگ دی جاتی تھی۔ گاؤں کا سردار اُن لوگوں کی رائے سے چُنا جاتا تھا۔ جن کا گاؤں کی دھان کی ساجھی کھیتی میں حصّہ ہوتا تھا۔ لیکن چناؤ کے بعد بوپاٹی کی منظوری ضروری تھی۔ گاؤں کے سردار کی آمدنی اپنے دھان کے کھیتوں کی فصل اور انکم ٹیکس کے آٹھ فیصدی حصے پر منحصر تھی۔ اُس کی مدد کے لئے ایک سیکرٹری، دو سردار اور تین چار اردلی ہوتے تھے۔ پانچ ہفتوں میں ایک بار گاؤں کے بااختیار لوگ وراودیا کی صدارت میں میٹنگ کرتے تھے۔ جس میں طرح طرح کے معاملوں پر بحث ہوتی تھی۔ جیسے سڑکوں، پلوں، منڈی، زمین کو پانی دینے کے ذرائع کی دیکھ بھال، رات کے پہرے کا انتظام، مدرسوں کی عمارتوں کی حفاظت فصل کے دنوں میں دیوی سری (دھان کی دیوی) کی پوجا کے تیوہار کا بندوبست، لوگوں تک سرکاری احکام کا پہنچانا، دیہات کا خرچ وغیرہ جب یہ لوگ ایک رائے پر پہنچ جاتے تو پھر سرکار کی منظوری لی جاتی تھی۔

دیہات میں دو قسم کے مقامی ادارے ملتے ہیں۔ دیسی لمبنگ دیہاتی زراعتی بنک) اور دیسی بنک (دیہاتی بنک)، زراعتی بنکوں میں آپ چاول کی فصل کے بچے ہوئے حصے کو دے سکتے ہیں۔ اور قلت کے وقتوں میں دیہاتی لوگ یہاں سے اناج اُدھار لے سکتے ہیں۔ لوٹاتے وقت سود بھی انھیں اناج کی صورت میں دینا پڑتا ہے۔ یہ بنک کسانوں کی اپنی محنت سے قائم کئے گئے ہیں۔ بنک کو چلانے والے، جنہیں نفع کا حصّہ ملتا ہے۔ تین کسان ہوتے ہیں اور چوتھا گاؤں کا سردار۔ حساب کتاب رکھنے کے لئے ایک تجربہ کار آدمی تعینات کیا جاتا ہے۔ تجارت کے بڑھنے اور سکّے کے پھیلاؤ کے سبب بہت سے زراعتی بنک بند ہو گئے ہیں۔ دیہاتی بنک لوگوں کو پیسے اُدھار دیتے ہیں۔ شروع شروع میں یہ بنک لوگوں کے چندے سے چلے، پر اب اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے ہیں۔ اور لوگوں کے پیسے واپس کر دئے گئے ہیں۔ ان بنکوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔

تعاون اور ہمدردی کا جذبہ دیہاتی لوگوں میں بہت ہے۔ جب کوئی مکان بنانا ہوتا ہے فصل کاٹنی ہوتی ہے، کسی تیوہار کا انتظام کرنا ہوتا ہے۔ یا جب کوئی مر جاتا ہے تو سب اکھٹے ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے سے لڑنے یا ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کہیں نہیں ہوتی۔

سیاسی نقطۂ نظر سے تو دیہاتیوں کا باہر کی دُنیا کے ساتھ کوئی خاص رشتہ نہیں ہے، پھر بھی اقتصادی رشتہ ضرور ہے۔ اور اس رشتے کی گہرائی کسی علاقے کی اقتصادی اہمیت پر منحصر ہے۔ تہذیبی رشتہ قصبوں اور شہروں میں آنے جانے سے قائم ہے۔ جو لوگ پیسے جمع کر کے مکہ مدینہ یا دوسرے کسی ملک سے ہو آتے ہیں۔ وہ ایک وسیع نظریہ لے کر آتے ہیں۔

دیہاتی علاقے میں تعلیم بالغاں

رائے دینے کا حق صحیح طور پر استعمال کیا جائے۔ اس کے لئے لوگوں کو پڑھانے کی سخت ضرورت ہے۔ اور جو لوگ انڈونیشیا میں جمہوری حکومت قائم کرنے کی سوچتے رہے ہیں۔ انھوں نے اس سوال کی طرف دھیان دینے کی کافی کوشش کی ہے۔

تعلیمِ بالغاں کے کام کی جنہوں نے پہلے پہل تنظیم کی۔ وہ زیادہ تر سیاسی اور سماجی رہنما تھے۔ جیسے مسٹر برج ننگراٹ، ڈاکٹر ستاما، محمدی جاہ اور آر، کے کارسینی۔

پہلے پہل ہر منسٹری نے دیہات سدھار سے متعلق اپنا اپنا الگ پروگرام بنایا۔ آجکل سب محکمے مل جل کر پروگرام بنا رہے ہیں۔

اُستادوں کو دو مہینے کی ٹریننگ دے کر اُنھیں کام میں لکھنا سکھانے کے کام پر مقرر کیا گیا ہے۔ جہاں تک ممکن ہُوا، ہر دیہات میں دو اُستاد رکھے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ کارخانوں، جیلوں، دفتروں، فوج اور مدرسوں میں تعلیم بالغاں کے شعبے کھولے گئے ہیں۔ ساتھ ہی غیر سرکاری ادارے بھی اس طرح کے شعبے چلا رہے ہیں۔

لکھنا سکھانے کے علاوہ عام معلومات دینے کے لئے بھی جماعتیں کھولی گئی ہیں۔ یہ تین طرح کی ہیں۔ پہلی اُن طلباء کے لئے، جنہیں پرائمری سکول میں پڑھنے کے بعد کہیں اور تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔

یہ کورس ایک سال کا ہے ۔ دوسری جماعت اُن سرکاری ملازمین کے لئے ہے جنہوں نے صرف پرائمری پاس کی ہے ۔ چھ مہینے کا کورس ہر ضلعے کے ہیڈ کوارٹر میں چلایا جاتا ہے ۔ یہ کورس اُن افسروں کے تجربے کی بنیاد پر بنایا جاتا ہے جو سماج کے نیچ میں رہتے ہیں ۔ جن سرکاری ملازموں نے سیکنڈری اسکول پاس کیا ہوتا ہے اُن کے لئے بھی چھ مہینے کے کورس کی تیسری جماعت ہے پڑھانے والے یا تو یونیورسٹی کے گریجوئیٹ ہوتے ہیں یا اپنے مضمون کے اُستاد

تعلیم بالغاں کے کام میں جو مشکلات سامنے آئی ہیں ۔ وہ درج ذیل ہیں ۔

۱ ۔ انڈونیشیا کے ۹۰ فیصدی لوگ ان پڑھ ہیں ۔

۲ ۔ غریبی کی وجہ سے لوگ اپنی مالی حالت سدھارنے میں پڑھنے کی نسبت زیادہ دلچسپی لیتے ہیں ۔ یہ یاد رہے کہ لڑائی سے پہلے ہی حالت بہت خراب تھی اور جاپان کے قبضے کے دنوں میں اور بھی خراب ہو گئی ۔

۳ ۔ لوگ انجان ہیں ۔ اس لئے وہ پڑھنے کی اہمیت نہیں سمجھتے ۔

۴ ۔ زیادہ تر لوگوں کو سماجی اور سیاسی معاملوں میں کوئی دلچسپی نہیں ۔

حالات کو سدھارنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ گاؤں کو ہر پہلو سے آگے بڑھانے کی کوشش کی جائے ۔ اس سے ہی لوگوں کی ذہنی اور اقتصادی حالت سدھرے گی ۔

کافی تعداد میں لائبریریاں کھولنے کی تیاری ہو رہی ہے ۔ ابھی پرانی پبلک لائبریریوں کی جانچ پڑتال کی جا رہی ہے ۔ اور اُن میں سے کچھ کو نئے سانچے میں ڈھالا جا رہا ہے ۔ چھپائی کے ذرائع اور کاغذ کی کمی کے سبب ابھی کافی دقت ہے ۔

جس طرح کی لائبریریاں بنانے کا خیال ہے ۔ اُن کا خاکہ نیچے دیا جا رہا ہے

۱ ۔ گاؤں کی لائبریریاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عام سکولوں کے طلباء کے لئے

۲ ۔ پرائمری لائبریریاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پرائمری سکول پاس لوگوں کے لئے

۳ ۔ سیکنڈری لائبریریاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سیکنڈری سکول پاس لوگوں کے لئے

۴ ۔ بڑی لائبریریاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یونیورسٹی کے طلباء کے لئے

گاؤں کے اُن بالغوں میں سے اُستاد چنے جاتے ہیں جنہوں نے کم از کم چھ سالی کی پرائمری تعلیم حاصل کی ہے ۔ انھیں کام پر بھیجنے سے پہلے دو ہفتوں کی ٹریننگ دی جاتی ہے کہ وہ کیسے پڑھائیں ۔ کیسے گاؤں سے تعلق پیدا کریں ۔ اور اس تحریک کو کیسے چلائیں ۔

اِس سے متعلق تمام اخراجات مرکزی سرکار برداشت کرتی ہے ۔ ہمیں یقین ہے کہ سمجھدار اور بے غرض لیڈروں کی رہنمائی میں انڈونیشیا کے گاؤں بہت جلد خاطر خواہ ترقی کر جائیں گے ۔ (مترجمہ ۔ جنگ کمار احساس)

کابل میں بھارتی سنگیت

افغانستان کے بادشاہ ہز میجسٹی ظاہر شاہ کے محل میں اکتوبر ۱۹۵۲ء کے مہینے میں نغمہ و سرود کی ایک محفل کا انتظام کیا گیا ۔ جس میں پنڈت اونکار ناتھ ٹھاکر اور اُن کے ساتھیوں نے بھارتی سنگیت پیش کیا ۔ شاہ افغانستان کے علاوہ شاہی خاندان کے دوسرے افراد بھی محفل میں شریک ہوئے ۔

بھارتی سفیر شری روپ چند نے شاہ افغانستان سے بھارتی موسیقاروں کا تعارف کرایا جو افغانستان کے تمدنی حالات کا مطالعہ کرنے کے لئے پندرہ روزہ دَورے پر یہاں آئے ہوئے ہیں ۔ شاہِ افغانستان نے اس موقعہ پر بھارت اور افغانستان کے قدیم تہذیبی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے دونوں ملکوں کے فنِ موسیقی کی گہری تحقیق پر زور دیا ۔ پنڈت اونکار ناتھ نے اپنی جوابی تقریر میں کہا کہ بھارت اور افغانستان کے فنِ موسیقی میں بڑی مشابہت ہے ۔

پنڈت اونکار ناتھ نے بھارت کے قدیم فنِ موسیقی کے جو نمونے پیش کئے ، اُن کی بڑی داد دی گئی ۔ مشہور موسیقار گوپال کرشن نے وائلن بجائی جسے بہت پسند کیا گیا ۔

محفل کے اختتام پر شاہ افغانستان نے کہا ۔ " اس رات کی یاد کبھی نہیں بھولے گی ۔ " آپ نے پنڈت اونکار ناتھ کو ان کی فنی تکمیل پر مبارکباد دی ۔

نئی کتابیں اور رسالے

دیوانِ غالب مع شرح

مرتبہ جناب جوش ملسیانی (تیسرا ایڈیشن) سائز ۲۲×۳۶/۱۶ ضخامت ۴۴۸ صفحات قیمت پانچ روپے۔ اس سے قبل اس کتاب کے دو ایڈیشن نہایت قلیل مدت میں شائع ہوکر مقبولِ خاص و عام ہو چکے ہیں۔ اب یہ نیا ایڈیشن مصنف کی نظرِ ثانی اور قابلِ قدر اضافوں کے ساتھ میسرز آتما رام اینڈ سنز پبلشرز کشمیری گیٹ دہلی نے شائع کیا ہے۔ چونکہ اس کتاب کی شرح و ترتیب میں کالجوں کے اردو خواں طالب علموں کی ضروریات کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے، اس لئے ہندوپاکستان کے اردو پروفیسروں، مشاہیرِ ادب اور اہلِ ذوق نے اس ادبی کاوش کو بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا ہے اور نہایت اچھے الفاظ میں اسے سراہا ہے۔ یہ کتاب دہلی یونیورسٹی اور جامعہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نصاب میں بھی شامل ہے۔

گونگے معمار

جناب خورشید عادل منیر کے افسانوں کا مجموعہ ہے جو مکتبہ شعاعیں کشمیری گیٹ دہلی نے شائع کیا ہے۔ منیر صاحب ایک اچھے افسانہ نگار ہیں۔ یہ کتاب اُن کے گیارہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ کتابت اچھی ہے لیکن طباعت کی خرابی نے اس خوبی کو برقرار نہیں رہنے دیا۔ ضخامت قریباً سو صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔

مطالعے اور جائزے

جناب راجندر ناتھ شیدا کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ شیدا صاحب کا شمار ہمارے ملک کے اُن مستند نقادوں میں ہے جنہوں نے ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ جہاں نئے رجحانات کے ساتھ آپ کی ذہنی وابستگی بہت مضبوط ہے، وہاں ماضی کی صحت مند ادبی روایات کا دامن بھی آپ نے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ آپ ادب اور ادیب کے شعور کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد کسی موضوع پر قلم اُٹھاتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ اُن کی بات خاص وزن رکھتی ہے۔ آپ کا یہ مجموعۂ مضامین آج سے بہت پہلے چھپ جانا چاہیئے تھا اور اب اس کے بعد ہم متوقع ہیں کہ جناب شیدا اپنا نیا مجموعہ منظرِ عام پر لانے میں اتنی تاخیر سے کام نہ لیں گے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے پبلشرز مکتبہ جامعہ لمٹیڈ جامعہ نگر دہلی

ڈائن اور دوسرے افسانے

محترمہ شکیلہ اختر کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ شکیلہ اختر اُردو کی ایک منفرد افسانہ نگار ہیں۔ آپ کے افسانے ہمارے سماجی ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں، اور آپ عوام کے گھریلو واقعات کو نہایت فنکارانہ انداز سے اپنے افسانوں میں پیش کرتی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب آپ کے بارہ افسانوں پر مشتمل ہے جن میں ہماری سماجی زندگی کئی پہلوؤں سے اپنی جھلک دکھاتی نظر آتی ہے

قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ ادب رمنہ روڈ پٹنہ۔

اُردو زبان ہماری

یہ ایک مسدس ہے جو جناب مسعود اختر جمال نے لکھا ہے۔ نظم کے عنوان ہی سے ظاہر ہے کہ اس میں کیا ہوگا۔ ۲۰×۲۷/۸ سائز کے بتیس صفحات کا یہ کتابچہ کتاب گھر جہاں آباد رائے بریلی یوپی سے مل سکتا ہے۔ قیمت آٹھ آنے۔

موصولات

۱۔ ماحول "حرکت و حیات نمبر"
ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ ماحول اُردو بازار دہلی

۲۔ رسالہ کاکل بمبئی
ملنے کا پتہ:۔ ۹۶ سیکری بھون، والکیشور روڈ، بمبئی

۳۔ رسالہ نشیمن
ملنے کا پتہ:۔ اُردو سوسائٹی (مٹیا برج) کلکتہ ۲۴

۴۔ محرم نمبر اخبار سرفراز لکھنؤ
ملنے کا پتہ:۔ دفتر اخبار سرفراز لکھنؤ

رفتارِ زمانہ

خوراک کا مسئلہ

بھارت کے وزیر خوراک شری رفیع احمد قدوائی نے پارلیمنٹ میں خوراک کے متعلق بھارت سرکار کی پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ موٹے اناج کے ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں لانے میں پابندیاں ابھی جاری رکھی جائیں گی لیکن جن صوبوں میں اناج کم ہوگا وہاں کی حکومتیں مرکزی گورنمنٹ کی اجازت سے زیادہ اناج والے صوبوں سے اناج منگوا سکیں گی۔ آپ نے یہ بھی اعلان کیا کہ چاول اور گیہوں سے ابھی کنٹرول نہیں ہٹایا جائے گا۔ اپنی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے شری قدوائی نے کہا کہ بھارت سرکار نے حال ہی میں مختلف صوبوں میں کنٹرول کی پابندیوں کو کچھ نرم کیا ہے۔ حکومت نہایت غور سے تمام حالات کا جائزہ لے رہی ہے اور اس کی یہ کوشش ہے کہ اناج کی قیمتیں کسی حالت میں بھی بڑھنے نہ پائیں اس لئے اس ضمن میں جلد بازی سے کام نہیں لیا جائے گا اور تمام پہلوؤں پر غور کرکے ہی کوئی نیا قدم اٹھایا جائے گا۔

کشمیر میں صدر ریاست کا انتخاب

یوں تو شیخ محمد عبداللہ کے ریاست جموں و کشمیر کے وزیر اعظم بننے کے ساتھ ہی ریاست میں جمہوریت کا دور دورہ ہو گیا تھا اور اسے صحیح طور پر عوامی حکومت کہا جا سکتا ہے لیکن ریاست کے ساتھ مہاراجہ کی حکومت کو جو برائے نام وابستگی چلی آتی تھی ریاست کے باشندوں نے شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کے تدبر سے اسے بھی ختم کر دیا ہے۔ اب ریاست جموں و کشمیر بھارت کے اندر ایک مکمل جمہوری ریاست بن گئی ہے۔ کشمیر کے پہلے صدر ریاست شری کرن سنگھ مہاراجہ ہری سنگھ کے بیٹے ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ ریاست کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے منتخب ہوئے ہیں۔ ۱۷ نومبر ۱۹۵۲ء کو انہوں نے سری نگر میں صدر ریاست کے عہدے کا حلف اٹھایا۔ حلف اٹھانے کے بعد ایک مختصر سی تقریر میں شری کرن سنگھ نے کہا کہ وہ ریاست کی زیادہ سے زیادہ تندہی سے خدمت کرکے اپنے فرائض کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے
آپ نے شیخ عبداللہ اور دوسرے اراکین حکومت کو خراجِ تحسین پیش کیا جن کی کوششوں سے ریاست نے ہر پہلو میں شاندار ترقی کی ہے۔

کوریا کا مسئلہ

دنیا بھر کے دیشوں میں ایک غیر جانبدار، انصاف پسند اور مکمل جمہوریت اور سیکولر سٹیٹ ہونے کے باعث بھارت کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ بھارت کسی قسم کی پارٹی بازی کا شکار نہیں۔ وہ متحدہ اقوام کی اسمبلی میں بھی ہر ایک قرارداد کے حُسن و قبح پر غور کرکے اپنی پالیسی کا فیصلہ کرتا ہے۔ اُسے اس امر کی بھی پروا نہیں کہ اس کے کسی اقدام سے امریکہ ناراض ہوتا ہے یا روس سے خراجِ تحسین وصول ہوتا ہے۔ یہی باعث ہے کہ جب دنیا کے ممالک کسی ایک مقام پر اکٹھے نہیں ہو سکتے تو اُن کی نگاہیں بھارت کی جانب اٹھتی ہیں۔ کوریا کے سوال پر پچھلے کئی برس سے اتحادی ممالک اور کمیونسٹ دیشوں میں کھینچا تانی جاری ہے اور باوجود ہزار جتن کے وہ کسی ایک نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ اس موقعے پر کئی حلقوں نے بھارت پر زور ڈالا کہ وہ اس مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لے اور کوئی ایسا فارمولا پیش کرے جسے امریکہ اور روس دونوں منظور کر سکیں۔ بھارت تو چاہتا ہی ہے کہ کوئی ایسا راستہ تلاش کر لیا جائے جس سے سنسار بھر میں امن اور شانتی کا دور دورہ ہو اور تمام تفرقات مٹ جائیں۔ چنانچہ متحدہ اقوام کی اسمبلی کے اجلاس میں اس نے کوریا کے باب میں ایک ریزولیوشن پیش کیا ہے۔ امید ہے کہ تمام ممالک اس ریزولیوشن پر غور کریں گے اور کوریا کے جھگڑے کا کوئی خاطر خواہ حل نکل آئے گا۔

کامن ویلتھ ممالک کی کانفرنس

لنڈن میں کامن ویلتھ ممالک کے وزرائے اعظم کی کانفرنس میں اپنی مصروفیات کے باعث بھارت کے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو حصہ نہیں لے سکیں گے لیکن اس میں بھارت کی نمائندگی وزیر اقتصادیات شری سی۔ ڈی دیشمکھ اور برطانیہ میں بھارت کے سفیر شری جی۔ بی کھیر کریں گے۔

بھارت کے دیہات میں نئی سڑکیں

وزارتِ رسل و رسائل کی کارکردگی کے متعلق شری لال بہادر شاستری کی نشری تقریر

ریلوے اور ٹرانسپورٹ (رسل و رسائل) کے وزیر شری لال بہادر شاستری نے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ایک نشری تقریر میں کہا کہ رسل و رسائل کے انتظامات کو ہماری روزمرہ کی ضروریات کی بہم رسانی سے گہرا تعلق ہے۔ مرکزی وزارتِ رسل و رسائل کے پروگرام کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس وزارت کا تعلق سڑکوں کی ترقی، سڑکوں کے ذریعے سے باربرداری، باربرداری کے اندرونی آبی ذرائع، کانڈلا کی بڑی بندرگاہوں، جہاز رانی، روشنی کے میناروں اور سیاحوں کی آمدورفت سے ہے۔ سڑکیں باربرداری کا سب سے پرانا ذریعہ ہیں۔ اقتصادی نقطۂ نگاہ سے تمام قسم کی سڑکوں کی متوازن ترقی ضروری ہے۔ مئی ۱۹۵۲ء سے سڑکوں کی ترقی کے پروگرام کا پانچ سالہ پلان سے گہرا ربط پیدا کر دیا گیا ہے۔ سڑکوں کی قومی شاہراہوں، ریاستی شاہراہوں اور اضلاع و دیہات کی سڑکوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مرکزی حکومت نے قومی شاہراہوں کی تعمیر اور مرمت کی ذمہ داری اپنے اوپر لی ہے۔ قومی شاہراہوں کی عبوری اسکیم پر یکم اپریل ۱۹۴۷ء کو عمل شروع کیا گیا تھا۔ قومی شاہراہوں کے ذریعے سے بھارت کے طول و عرض کو ملانے کے لئے کل ۱۳۴۰۰ میل کی سڑکیں تعمیر کرنے کی ضرورت ہے۔ اس وقت قومی شاہراہوں کی دیکھ بھال پر ۲½ کروڑ روپیہ سالانہ خرچ آتے ہیں اور اُن کی ترقی کے لئے ۱۹۵۵-۵۶ء کو ختم ہونے والی پانچ سال کی مدّت میں ۲۴ کروڑ روپے خرچ کرنے کی تجویز ہے۔ مرکزی حکومت ریاستی شاہراہوں کی ترقی کے لئے بھی تقریباً پانچ کروڑ روپے سالانہ خرچ کرتی ہے۔ اس میں سے ایک کروڑ روپے کی رقم آئندہ پانچ سالوں میں کوآپریٹو بنیادوں پر دیہات میں سڑکیں تعمیر کرنے پر خرچ کی جائے گی۔ اس خرچ کا تیسرا حصّہ دیہات کے لوگ رضاکارانہ محنت یا مالی مدد کی صورت میں برداشت کریں گے۔ اپنی مدد آپ کرنا حصولِ کامیابی کا بہترین ذریعہ ہے۔ اور دیہات کے لوگوں کو چاہیئے کہ وہ اس اسکیم سے فائدہ اُٹھا کر گاؤں میں سڑکوں کی تعمیر میں حصّہ لیں اور اس طرح اپنی اور اپنے ملک کی حفاظت کریں۔

ریلوں کے ذریعے سے باربرداری پر زیادہ زور دیئے جانے کا نتیجہ یہ بھی ہُوا کہ دریاؤں کے ذریعے سے باربرداری کے پُرانے و سستے طریقے کو نظر انداز کر دیا گیا۔ حکومت کی پالیسی باربرداری کے تمام ذرائع کو ایسے طریقے سے ترقی دینا ہے کہ وہ اپنے اپنے دائرے میں مؤثّر ثابت ہو سکیں۔ اتر پردیش، پچھمی بنگال، بہار اور آسام کی ریاستی سرکاروں کے اتفاق سے گنگا برہم پتر واٹر ٹرانسپورٹ بورڈ قائم کیا گیا ہے جو اِن دریاؤں کے ذریعے سے نقل و حمل کی ترقی کی کوشش کرے گا۔

ہم اکثر یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارے ملک کا بڑا لمبا ساحل سمندر سے ملتا ہے۔ پُرانے وقتوں میں بھارتی مال جہازوں کے ذریعے سے دُور دراز ملکوں کو لے جایا کرتے تھے۔ ۱۹۵۰-۵۱ء میں بھارت نے صرف اناج کی درآمد کے لئے غیر ملکی جہازوں کا ۵۰ کروڑ روپے کرایہ ادا کیا۔ اس لئے بھارت میں صنعتِ جہاز سازی کی ترقی بہت ضروری ہے۔ بھارت سرکار کے اقدامات کے نتیجے کے طور پر بھارت میں جہازوں کا مجموعی وزن ۴ لاکھ ٹن سے اوپر پہنچ چکا ہے اور تقریباً تمام ساحلی تجارت اب بھارتی جہازوں کے ذریعے سے ہی ہوتی ہے۔ منصوبہ بندی کے کمیشن نے جہاز سازی کے لئے ۱۵ کروڑ روپے خرچ کرنے کی سفارش کی ہے۔ اس سے بھارت میں جہازوں کا مجموعی وزن چھ لاکھ ٹن تک پہنچ جائے گا۔ پانچ سالہ پلان کے دوران میں بندرگاہوں کی ترقی کے لئے ۲۸ کروڑ روپے خرچ کئے

جائیں گے۔ بمبئی، کوچین، مدراس، وساکھاپٹم اور کلکتہ کے علاوہ اب بھارت کی چھوٹی بڑی بندرگاہ کانڈلا بنائی جارہی ہے۔ یہ بندرگاہ ۱۹۵۵ء کے اخیر تک طیار ہو جائے گی اور کسی حد تک کراچی کی بندرگاہ کے چلے جانے سے ہونے والے نقصان کو پورا کرے گی۔ اس کے علاوہ بھارت میں تقریباً ۲۰۰ چھوٹی بندرگاہیں ہیں۔ ان پر ریاستی سرکاروں کا کنٹرول ہے۔ ان بندرگاہوں اور بڑی بندرگاہوں کی ترقی کے کام میں ربط پیدا کرنے کے لئے ایک قومی بورڈ قائم کیا گیا ہے۔ سیر و سیاحت کا موضوع بھی لوگوں کی دلچسپی کا مرکز ہے۔ پچھلے سال اٹھارہ ہزار غیر ملکی سیاح بھارت آئے۔ لیکن ہم اُن کی تعداد میں مزید اضافہ چاہتے ہیں۔ قدرتی مناظر اور تاریخ دونوں کے نقطۂ نگاہ سے ہی بھارت سیّاحوں کے لئے بڑی کشش رکھتا ہے۔ غیر ملکی سیّاحوں کی آمد سے ہمیں غیر ملکی سکہ حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ پچھلے سال انھوں نے بھارت میں تقریباً ایک کروڑ روپے خرچ کئے۔ سیاحوں کی سہولت کے لئے وزارتِ رسل و رسائل نے ضروری واقفیت بہم پہنچانے والے کئی چھوٹے چھوٹے پمفلٹ شائع کئے ہیں اور غیر ملکوں میں نمائش کے لئے فلمیں طیار کی گئی ہیں۔

وزیرِ موصوف نے مزید کہا کہ ملک میں تین لاکھ دس ہزار بسیں، لاریاں اور ٹرک ہیں۔ بسوں اور لاریوں کا ملک کے باربرداری کے دوسرے اندرونی ذرائع اور خاص کر ریلوے سے جہاں تک تعلق ہے۔ اس سے اتنے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں کہ ان میں ربط پیدا کرنے کے لیے مرکز و مختلف ریاستوں کے ٹرانسپورٹ وزیروں کی کانفرنس ہر سال بُلانا مفید ثابت ہوا ہے۔ دہلی اور اُس کی نواحی آبادیوں میں اس وقت دہلی ٹرانسپورٹ سروس کی ۳۰۵ بسیں چل رہی ہیں۔ چار سال پیشتر جب حکومت نے ایک ٹرانسپورٹ کمپنی سے انتظام اپنے ہاتھوں میں لیا تھا تو ان بسوں کی تعداد ۱۸۹ تھی۔ سروس کے معیار کو بلند کرنے کی لگاتار کوشش کی جارہی ہے اور دہلی کے شہریوں کو جلد از جلد مؤثر سہولتیں بہم پہنچانے کی کوشش کی جائے گی۔ آسام میں زلزلہ و سیلاب سے پیدا شدہ صورتِ حال کا مطالعہ کرنے کے لئے مرکزی سرکار نے جو افسر وہاں بھیجے تھے انھوں نے تیزپور و اُتری لکھیم پور کے علاقے میں چار میں سے تین دریاؤں پر پُل تعمیر کرنے کی سفارش کی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے قبائلی علاقوں میں سڑکوں کی ترقی کے بارے میں سفارشات پیش کی ہیں۔ حکومت نے انھیں منظور کر لیا ہے اور مذکورہ پُل تعمیر کئے جانے کا نصف خرچ برداشت کرنے کی پیشکش کی ہے۔

بھارت سرکار ملک کی زرعی و صنعتی ترقی اور لوگوں کا معیارِ زندگی بلند کرنے کے پروگرام پر قائم ہے۔ لیکن باربرداری کے معقول انتظامات کے بغیر اس پروگرام کو عملی شکل نہیں دی جاسکتی۔ پیداوار میں اضافہ اور ملک بھر میں اس کی تقسیم کے لئے یہ ضروری ہے کہ پیداوار کے مختلف مراکز کو مزید ضروری سامان پہنچانے کے لئے باربرداری کے مختلف ذرائع کو کام میں لایا جائے۔ کابینہ کے تین وزیروں اور کچھ متعلقہ وزارتوں کے نمائندوں پر مشتمل مرکزی ٹرانسپورٹ بورڈ کے فرائض میں یہ بات شامل ہے کہ ملک کی معاشی ترقی کی ضروریات کے مطابق باربرداری کے مختلف ذرائع کی ترقی کو عمل میں لایا جائے اور ان میں ربط قائم رکھا جائے۔

آخر میں آپ نے کہا کہ پانچ سال کی مدّت میں ٹرانسپورٹ کی ترقی سے متعلقہ منصوبوں پر ایک کروڑ روپے سے زائد رقم صرف کی جائے گی۔ اور اس سے ملک میں کسی حد تک باربرداری کی زیادہ مؤثر، کم خرچ اور زیادہ جامع سہولتیں میسّر آجائیں گی۔

چترنجن ریلوے ورکشاپ

چترنجن کے کارخانے میں ریلوے انجنوں کے پرزے جوڑنے کا کام اس وقت جس رفتار سے جاری ہے اگر اس میں کوئی فرق نہ آیا تو ۱۹۵۳ء میں وہاں ہر ہفتے ایک ریلوے انجن تیار کیا جا سکے گا۔ اب تک زیادہ بوجھ کھینچنے والے ڈبلیو جی قسم کے ۴۲ ریلوے انجن تیار کئے جا چکے ہیں اور مزید دو انجن جلد ہی تیار ہو جائیں گے۔ اس انجن کا نمونہ بھارتی ٹیکنیکل ماہرین کی اختراع تھا اور شروع میں اس کے پرزے برطانیہ میں تیار کئے گئے۔ یہ بھاپ سے چلنے والا جدید قسم کا انجن ہے اس کا وزن تقریباً ۲۰۷ ٹن ہوتا ہے۔ اور یہ ہموار راستہ پر زیادہ سے زیادہ ۲ ہزار ٹن وزن کم از کم ۳۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کھینچ سکتا ہے۔ اس کا شمار مال ڈھونے بہترین انجنوں میں ہوتا ہے۔

ڈبلیو پی قسم کا ریلوے انجن مسافر گاڑیوں کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے اس قسم کے تین سو انجن اس وقت بڑی ریلوے لائنوں پر ایکسپریس و ڈاک گاڑیوں کے ساتھ استعمال کئے جا رہے ہیں۔ ڈبلیو جی انجن کی طرح اس انجن کے نمونے کا خاکہ بھی مرکزی اسٹینڈرڈ دفتر میں تیار کیا گیا تھا۔ اس نمونہ کا پہلا انجن امریکہ میں بالڈون ورکشاپ میں تیار کیا گیا اور آزمائش کے بعد اس قسم کے بہت سے انجنوں کے خریدنے کا آرڈر دیا گیا۔ یہ انجن آسانی سے ۵۰-۷۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل سکتا ہے اس کی زیادہ سے زیادہ رفتار ۸۵ میل فی گھنٹہ ہے لیکن حفاظت کے نقطہ نگاہ سے اس وقت بھارت کی ریلوے لائنوں پر اس کی رفتار ۶۰ میل فی گھنٹہ تک رکھی گئی ہے۔

چترنجن میں تیار کئے جانے والے ہر ریلوے انجن کے ۵۳۴۹ پرزے ہوتے ہیں ان میں آدھے سے زیادہ پرزے اب بھارت میں تیار کئے جاتے ہیں۔ چترنجن کا کارخانہ اور اس سے متعلقہ دفاتر دس لاکھ سے زاید مربع فٹ کے رقبہ پر قائم کئے گئے ہیں اور اس میں مختلف قسم کی ایک ہزار مشینیں کام کر رہی ہیں۔ ان میں ۹۵ فیصدی مشینری ایسی ہے جو برطانیہ سے منگوائی گئی ہے۔ باقی کی مشینوں میں کچھ بھارت کی تیار کردہ ہیں اور کم لاگت کی کچھ مشینری امریکہ و کینیڈا سے منگوائی گئی ہے۔ کارخانے میں اس وقت تین ہزار سے زاید اشخاص ملازم ہیں جن میں دو سو سپروائزر (نگران) بھی شامل ہیں۔ چھ غیر ملکی ٹیکنیکل ماہرین ہیں جو محض مشاورتی حیثیت میں کام کرتے ہیں۔ سارے کارخانہ کو کل اٹھارہ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر حصے کا انچارج ایک فورمین ہے۔ یہ کارخانہ سندری سے حاصل کردہ بجلی سے چلتا ہے۔

۱۹۳۷ء میں ایکس بی قسم کا ایک ریلوے ۵۰-۵۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہا تھا کہ بیہٹا کے نزدیک وہ پٹڑی سے اتر گیا اور اس سے بھاری جانی نقصان ہوا۔ تحقیقات پر معلوم ہوا ہے کہ یہ حادثہ انجن کی پیچیدہ حرکتوں کی وجہ سے رونما ہوا جن سے موڑوں پر پٹڑی ٹیڑھی ہو گئی تھی۔ ریلوے انجنوں کی حرکت کے بارے میں تحقیق کے نتیجہ کے طور پر بھارتی نقشہ کش اب کسی ریلوے انجن کے خاکہ کی تیاری کے دوران ہی یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اس کے چلنے سے ریلوے لائن پر کیا اثر پڑے گا اس لئے اب کسی انجن کی حرکت کے دباؤ سے کسی موڑ پر پٹڑی کے ٹیڑھا ہو جانے کا خطرہ نہیں رہے گا۔

اس وقت تمام تحقیق زیادہ سے زیادہ بوجھ کھینچنے والے ایسے انجن تیار کرنے پر مرکوز ہے جو وزن میں ہلکے ہوں اور ان کے چلنے سے حادثہ پیش آنے کا خطرہ بھی نہ ہو۔ بھاری انجنوں کے استعمال سے پٹڑیوں اور پلوں کی دیکھ بھال پر زیادہ خرچ آتا ہے بھارت کی ریلوے لائنوں پر چلنے والے انجنوں کی اقسام کی تعداد میں کمی کرنے کے بارے میں بھی تحقیق جاری ہے۔ کیونکہ زیادہ قسموں کے انجنوں کے چلنے سے ان کی دیکھ بھال و مرمت کا کام بھی زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ دس سال پیشتر بھارت میں پانچ سو مختلف اقسام کے انجن چل رہے تھے لیکن اس وقت شنٹنگ سے لے کر ایکسپریس گاڑیوں کو کھینچنے تک کے لئے ۷۷ قسم کے انجن استعمال کئے جا رہے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ آئندہ ۱۵ سال میں صرف ۵ قسم کے انجن رہ جائیں گے اور ان دیکھ بھال کا کام آسان ہو جائے گا

جس مقام پر اس وقت چترنجن کا قصبہ آباد ہو گیا ہے وہ تین سال پیشتر ایک وسیع اونچی نیچی جگہ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اسے موجودہ شکل دینے پر دو کروڑ اینٹیں ستر ہزار ٹن سیمنٹ، ۱۵۰۰ ٹن لکڑی گیارہ ہزار ٹن فولاد اور ۲۰ ہزار گیلن روغن صرف ہوا ہے۔ سارے قصبہ کی سڑکوں کی مجموعی لمبائی ۶۸ میل ہے ان میں ۳۰ میل کی سڑکیں پختہ ہیں۔ قصبہ کا رقبہ ۴۲۰۰ ایکڑ سے زیادہ ہے اور اس کی تیاری پر تقریباً ۲ کروڑ چھ لاکھ ستر ہزار روپیہ خرچ ہوتا ہے۔

"عوامی بہبود کی اسٹیٹ" کے نظریہ کے مطابق چترنجن میں کارکنوں کو جو سہولتیں بہم پہنچائی گئی ہیں وہ بھارت میں کسی اور صنعت میں کام کرنے والوں کو حاصل نہیں ہیں۔

لکڑی کی پائداری

تجربات سے ثابت ہوا ہے کہ بھارت میں تعمیراتی اغراض کے لئے فولاد کی جگہ پر لکڑی بھی کام میں آسکتی ہے کیونکہ لکڑی پائداری میں فولاد کے برابر ہے۔ اس کے علاوہ لکڑی میں حرارت سے پھیلنے اور انتقال حرارت کا مادہ بھی بہت کم پایا جاتا ہے۔ برقی رَو کو روکنے کی کافی قوت موجود ہوتی ہے اور کیمیائی اجزا سے بھی کم گلتی اور سڑتی ہے۔ انہیں خوبیوں کی وجہ سے ریلوں کی پٹڑیوں کے نیچے کسی دھات کی بجائے لکڑی کے سلیپر استعمال کئے جاتے ہیں اور یہی وہ اسباب ہیں جن کے باعث آج امریکہ دنیا میں سب سے زیادہ لکڑی پیدا اور صرف کرتا ہے اور لکڑی کی یہ مقداریں فولاد کے برابر ہوتی ہیں۔

بھارت میں لکڑی کی سالانہ پیداوار تقریباً بیس لاکھ ٹن ہے لیکن قدرتی پائیدار لکڑی کی پیداوار بہت محدود ہے اسی وجہ سے دو کروڑ ستر لاکھ روپیہ کی ساگوان لکڑی بھارت میں درآمد کرنی پڑتی ہے۔

فاریسٹ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ دہرہ دون میں تجربات سے معلوم ہوا ہے کہ ہر درخت کی لکڑی کا اندرونی حصہ قدرتاً پائیدار نہیں ہوتا۔ اسی لئے ریلوے سلیپر خاص خاص قسم کی لکڑی کے بنائے جاتے ہیں۔

یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ کیمیاوی اشیائے کے ذریعہ لکڑی کو باقی لکڑی کے مقابلہ میں چار پانچ گنا زیادہ پائیدار بنایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ دنیا کے بعض ترقی یافتہ ملکوں نے ریلوے، بجلی اور دیگر ترقیوں کے پہلو بہ پہلو لکڑی کے تحفظ پر بھی توجہ صرف کی ہے۔ آج امریکہ میں لکڑی کو محفوظ کرنے کے تین سَو کارخانے موجود ہیں۔

اس وقت بھارت میں لکڑی کو کیمیاوی اشیا سے محفوظ اور دیرپا بنانے کی ایک درجن مشینیں کام کر رہی ہیں۔ اس تعداد میں سے چھ کارخانے کوئلہ کے مرکب سے ریلوے سلیپر اور دیگر عمارتی لکڑی کو پائیدار بنانے کا کام کر رہے ہیں۔ باقی چھ کارخانے "ایسکیو" مرکب سے لکڑی کو دیرپا بناتے ہیں اس مرکب کو آج سے بیس سال پہلے فاریسٹ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ڈیرہ دون نے لکڑی کے تحفظ کے سلسلہ میں تیار کیا تھا۔

بھارت میں لکڑی کے تحفظ کے سلسلہ میں روغن کوئلہ کا مرکب اور "ایسکیو" مرکب استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن "ایسکیو" مرکب کی تیاری کا دارومدار ناروے اور سویڈن سے سنکھیا کے پنٹوکسائڈ کی فراہمی پر ہے۔ لیکن کشمیر میں جو خام سنکھیا دریافت ہوا ہے اس کی بدولت سنکھیا کا پنٹوکسائیڈ بھارت ہی میں تیار ہو سکے گا۔ اس کے علاوہ کلکتہ میں چاندی صاف کرنے کے کارخانہ کا فضلہ بھی اس سلسلہ میں کارآمد ہو سکتا ہے۔

لکڑی کے تحفظ کے طریقے

سوکھی یا گیلی لکڑی کو کمانے کے مختلف طریقے رائج ہیں اور آج کل تازہ گرائے ہوئے درخت یا بانس کے لئے پانی میں حل ہونے والا تحفظی مرکب استعمال کیا جاتا ہے جس کے لئے دس سے بیس پونڈ تک کا دباؤ درکار ہے۔ اور اس کی بدولت لکڑی کو کمانے کا کام ایک گھریلو دستکاری بھی بن سکتی ہے۔

لکڑی کو کمانے کے سلسلہ میں مذکورہ انسٹی ٹیوٹ نے کھلے ہوئے مقامات پر استعمال ہونے والی لکڑی کے لئے پانی میں حل ہونے والے مرکبات کے استعمال کی سفارش کی ہے۔ چونکہ محفوظ کی ہوئی لکڑی چار پانچ گنا زیادہ پائدار ہوتی ہے اس لئے ان طریقوں کو بروئے کار لانے سے ملک میں عمارتی لکڑی کے محدود وسائل کے تحفظ میں مدد ملیگی۔ اسکے علاوہ چھال کی لکڑی، اندرونی ناپائیدار لکڑی بھی ضائع نہیں ہوگی۔

لکڑی کو محفوظ کرنے کے سلسلہ میں پلاننگ کمیشن نے بھی اپنے جنگلات کے باب میں بہت زور دیا ہے اور ملک میں لکڑی کو محفوظ کرنے کے کارخانوں کے قیام کی اہمیت کو ظاہر کیا ہے۔ بلکہ اتر پردیش کی حکومت نے اپنے پانچ سالہ منصوبہ میں مذکورہ امور کے لئے کارخانے کھولنا بھی شامل کر لیا ہے۔

Regd. No. E P - 689

فرشتہ خصلت

واہ رے شیخ جی

ایک تھے شیخ صاحب۔ اُن کے پڑوسی نے کبوتر پالے۔ شروع شروع میں تو اس کے پاس گنتی کے چند کبوتر تھے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ کبوتروں کی تعداد بڑھتی ہی گئی۔ اور بہت ہی تھوڑی مُدّت میں بہت سے کبوتر ہو گئے۔

اکثر ایسا ہوتا کہ شام کے وقت کبوتر شیخ صاحب کے مکان کی منڈیر پر بیٹھے رہ جاتے تھے۔ اُن کا پڑوسی ان کبوتروں کو ڈھیلے پھینک پھینک کر اُڑایا کرتا تھا تاکہ وہ ڈربے میں گھس جائیں۔ ڈھیلے اور پتھر کے ٹکڑے کبھی شیخ صاحب کے یہاں اور کبھی دوسرے پڑوسیوں کے یہاں گرتے تھے۔ لوگ اس سے بہت تنگ آ گئے۔

ایک دن ایسا ہوا کہ شیخ صاحب کو چوٹ لگ گئی اور اُن کا سر پھوٹ گیا۔ دوسرے پڑوسیوں کو یہ سُن کر خوشی ہوئی اور انھوں نے سمجھا کہ اب وُہ کبوتر والے سے ضرور جھگڑیں گے اور اُسے سزا دلا کر رہیں گے۔

آن کی آن میں لوگوں کا ایک خاصہ مجمع اکٹھا ہو گیا۔ سب کے سب انہیں اشتعال دلانے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر وہ بالکل ہی خاموش تھے۔ اُن کی مرہم پٹّی کی گئی۔ اس کے بعد اُنھوں نے نوکر سے ایک لاٹھی منگوائی اور باہر نکلے۔

شیخ جی اپنے پڑوسی کے یہاں لاٹھی ہاتھ میں لئے پہنچے اور اُسے بُلایا۔ پڑوسی کی خوف کے مارے بُری حالت تھی۔ وہ نزدیک آنے سے ڈرا۔ اُنھوں نے بڑی نرمی سے اُسے کہا ——

"ارے بھائی! آتے کیوں نہیں؟ آؤ بھی تو۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں"۔

اُن کی گفتگو کے انداز سے اُسے ہمّت ہوئی اور وہ نزدیک آیا۔ شیخ جی نے اُسے لاٹھی دیتے ہوئے کہا —— "یہ لو! آیندہ کبوتروں کو لاٹھی کے اشارے سے اُڑایا کرو۔ ڈھیلے اور پتھر پھینک کر دوسروں کو تکلیف دینا ٹھیک نہیں"۔

محمد شفیع الدین نیر

جاڑے کا زمانہ

ہر سال پلٹ کر آتا ہے کیا خوب زمانہ جاڑے کا
اِک رنگ نیا دکھلاتا ہے کیا خوب زمانہ جاڑے کا

ٹھنڈک سے ہاتھ اکڑتے ہیں، سردی سے دانت کڑکتے ہیں
بس ناک چنے چبواتا ہے کیا خوب زمانہ جاڑے کا

اُونی کوٹ اور اُونی مفلر، اُونی کرتا، اُونی چسٹر
آ کر ہم کو دِلواتا ہے کیا خوب زمانہ جاڑے کا

قہوے کی پیالی چلتی ہے، خوب اِس پر جان مچلتی ہے
چائے سے دِل گرماتا ہے کیا خوب زمانہ جاڑے کا

اب روئی رانی بنتی ہے اور اُون کی دیوی تنتی ہے
دونوں کو راج رچاتا ہے کیا خوب زمانہ جاڑے کا
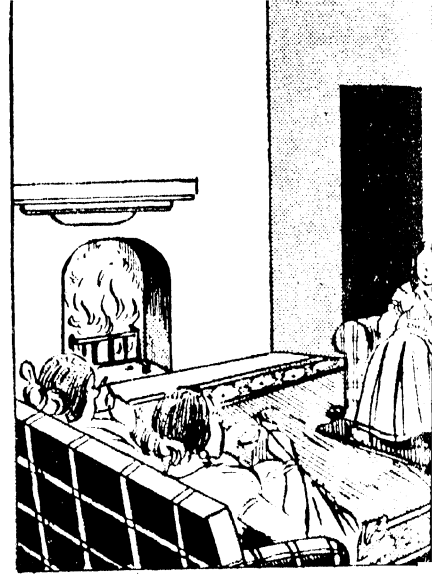
چلتی ہیں ہوائیں سر سر سر، دل کانپتے ہیں جس سے تھر تھر

تنگی کا ناچ نچاتا ہے کیا خوب زمانہ جاڑے کا

گو بیٹھے ہیں سُکڑے سُکڑے، ہیں لب پر سردی کے دُکھڑے

پھر بھی ہم سب کو بھاتا ہے کیا خوب زمانہ جاڑے کا

گدّا، توشک، دوہر، فرغل، روئی کا لبادہ اور کمری

یہ سب کپڑے سلواتا ہے کیا خوب زمانہ جاڑے کا

ہرچند کہ ہاتھ ٹھٹھرتے ہیں، نیّر کو مشکل پڑتی ہے

پھر بھی نظمیں لکھواتا ہے کیا خوب زمانہ جاڑے کا

تین داماد

ایک چینی کہانی

بہت دنوں کی بات ہے ایک آدمی تھا - اس کی تین لڑکیاں تھیں -
ایک لڑکی جو سب سے بڑی تھی اس کی شادی ایک سرکاری افسر کے ساتھ ہو گئی - دوسری کا بیاہ ایک فوجی کرنیل کے ساتھ ہو گیا - تیسری نے ایک کسان سے شادی کر لی - تینوں اپنے اپنے گھر میں خوب سُکھی تھیں -

ایک تیوہار کے موقع پر تینوں داماد سسر کے یہاں پہنچے - کسان داماد پیدل چل کر پہنچا اور دوسروں سے ذرا جلدی پہنچ گیا - وہ دروازے میں داخل ہونے کو ہی تھا کہ سب سے بڑا افسر داماد پالکی میں بیٹھا آ پہنچا اور کسان داماد سے بولا ٹھہرو ٹھہرو! میں افسر ہوں، میں تم سے بڑا ہوں - مکان کے اندر داخل ہونے کا سب سے پہلا میرا حق ہے

ان دونوں میں بحث چل ہی رہی تھی کہ فوجی داماد بھی گھوڑے پر سوار آ پہنچا - اور دونوں کو لڑتے دیکھ کر بولا - آپس میں جھگڑتے کیوں ہو اپنے اپنے ادھیکار کے بارے میں اپنی دلیلوں کے ساتھ ایک ایک چھند بنا کر دکھاؤ - جس کی دلیل بلوان ہو گی وہ سب سے پہلے اندر جا سکے گا - چھند میں تین باتوں کا دھیان رکھنا پڑے گا -

(۱) تمہارے سر کے اوپر کیا ہے ؟

(۲) جو پد تمہیں حاصل ہے اُسے تم نے کیسے کمایا ؟

(۳) تم کس پر سوار ہو کر آئے ؟

تینوں داماد اس بات پر راضی ہو گئے -

سب سے بڑا داماد جو افسر تھا بولا :-

مری پالکی کی چھت گول
مری پڑھائی میرا مول
مجھے اٹھاتے چار جواں
بیچ میں میں، میں ہوں بھگوان

دوسرا بولا :-

لوہے کی ٹوپی میری گول
بیچ لڑائی میرا مول
گھوڑ سوار یہ میرا مان
اس پر بیٹھا میں بھگوان

کسان داماد بولا :-

میری گھاس کی ٹوپی گول
ڈٹ کر کام میرا ہے مول
میری ٹانگیں میرا مان
میرے پیچھے دو بھگوان

دونوں داماد یہ سُن کر ہنس پڑے اور بولے بے شک ہم ہار گئے آپ پہلے جا سکتے ہیں -

اندر پہنچ کر کھانے کے معاملے میں پھر جھگڑا ہو پڑا ۔ افسر داماد بولا ۔ پہلے مجھے کھانا پروسنا چاہئے ۔ کسان داماد بولا ۔ پہلے مجھ کو ملنا چاہئے کیونکہ میں پہلے آیا ہوں ۔ دونوں کو جھگڑتے دیکھ کر فوجی داماد بولا ۔ پھر سے چھند بنا کر کیوں نہیں جھگڑا مٹا لیتے ؟ تینوں راضی ہو گئے ۔ سب سے بڑا بولا :۔

میں افسر میں ہوں بلوان
سب لوگوں میں میری شان
پیسے کا ہے مجھ میں زور
لکشمی کھنچتی میری اور

فوجی داماد بولا :۔

ادھر تیر تو ادھر کمان
بڑی فوج کا میں بھگوان
ٹیڑھی آنکھوں دیکھوں کاش
پڑی ملے پھر اس کی لاش

کسان داماد بولا :۔

لے ہل بیل نہ جوتوں کھیت
بھوک مرو سب پھانکو ریت

دونوں داماد خوب زور سے ہنسے اور بولے اس بار بھی تم جیت گئے ۔

تینوں کو باری باری سے کھانا پروسا گیا ۔ تینوں نے ابھی کھانا شروع بھی نہیں کیا تھا کہ مکان میں آگ لگ گئی اور ان کے سسر صاحب پانی کی بالٹی لے کر آگ بجھانے دوڑے ۔

افسر داماد تھالی پر بیٹھا بیٹھا چلایا :۔

"دوڑو نوکر آگ بجھاؤ"

فوجی داماد بولا :۔

"چلو سپاہی پانی لاؤ"

کسان داماد بولا :۔

بے مطلب مت شور مچاؤ
سسر لگ رہے کچھ شرماؤ
اٹھا بالٹی آگ بجھاؤ
میری نقل کرو لو آؤ

دونوں میں سے کوئی نہ اٹھا ۔ کسان داماد اور سسر نے مل کر آگ بجھائی اور سنتے ہیں کہ وہ آدمی مرتے وقت اپنی ساری دولت چھوٹی بیٹی کے نام کر گیا جو کسان کو بیاہی تھی ۔

(نیا ہند)

لطیفے

ماسٹر ۔ شبیر اور شتر میں کیا فرق ہے ؟
شاگرد ۔ کچھ نہیں صرف درمیانی حرف میں تھوڑی سی تبدیلی ہے ی اور ت کی ۔

کملا ۔ کیوں رمیش تمہیں اسکول کب اچھا لگتا ہے ؟
رمیش ۔ جب کہ وہ بند ہو ۔

صاحب ۔ (فقیر سے) جا ! موٹا تازہ ہٹا کٹا ہے محنت مزدوری کر ۔
فقیر ۔ صاحب ! میں نے تو صرف پیسہ مانگا تھا ۔ مشورہ کب مانگا

استاد ۔ براعظم کی تعریف کرو ؟
شاگرد ۔ براعظم حرف تہجی کے ان بڑے بڑے حرفوں سے بنا ہے جس سے اللہ اور محمدؐ کے نام بنتے ہیں ۔

سعیدہ نکہت

شیشے کی کہانی

بچو! آج شیشہ ہماری زندگی میں بہت ہی اہم چیز ہو کر رہ گیا ہے۔ مکان، گھڑی، آئینہ، عینک، کھانے کے برتن —— غرض دُنیا کی کون سی چیز ہے۔ جس میں شیشہ استعمال نہ کیا جاتا ہو! مفید اور کارآمد ہونے کے ساتھ ساتھ یہ اتنا سستا ہے کہ غریب سے غریب انسان بھی اس کو استعمال کر سکتا ہے۔ آج شیشے کی اہمیت اتنی بڑھ گئی ہے کہ ہم لوگ اس کے بغیر رہنے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن ہزاروں سال قبل ایک زمانہ تھا جب لوگ اس کے نام سے بھی واقف نہ تھے۔ اُس زمانے میں شیشے کے بغیر لوگوں کو کتنی تکلیف اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس کا اندازہ ہم لوگ آج نہیں کر سکتے۔ اس وقت روشنی کے لئے وہ مکان کی دیوار یا چھت میں بڑے بڑے سوراخ کر دیتے تھے۔ لیکن جب بارش ہوتی تھی۔ تو اس سے بچنے کے لئے ان کو کسی چیز سے ڈھک دینا پڑتا تھا۔ جس کی وجہ سے مکان میں اندھیرا پھیل جاتا تھا۔ اس طرح لوگوں کو بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ شیشے کی وجہ سے اب یہ مصیبت دُور ہو چکی ہے۔
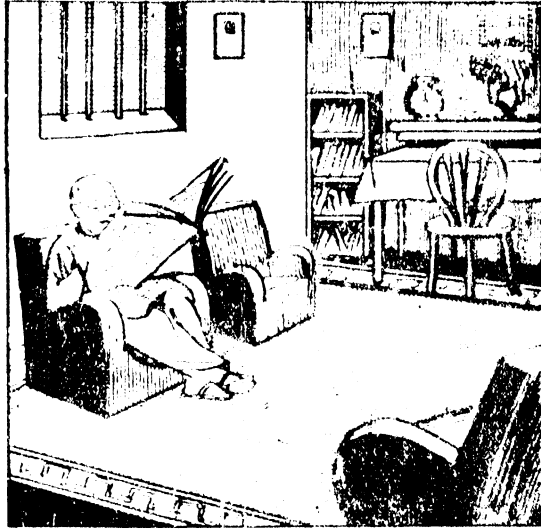
شیشہ بنانے کا فن پہلی بار مشرق ہی میں دریافت کیا گیا۔ یوروپ والوں نے یہ فن یہیں کے لوگوں سے سیکھا۔ اور اس کی قیمت سونے اور چاندی سے بھی زیادہ ہوا کرتی تھی۔ اس وقت امیر لوگ ہی اس کو استعمال کر سکتے تھے۔

شیشہ بہت ہی معمولی چیز یعنی ریت سے بنتا ہے۔ صاف شیشہ بنانے کے لئے ایسی ریت کی ضرورت ہوتی ہے جس میں لوہا بھی شامل ہو۔ رنگین

شیشہ بھی ایسی ہی ریت سے بن سکتا ہے۔ صاف، چکنا اور خوش نما شیشہ بنانے کے لئے ریت میں دوسری چیزیں بھی ملا دی جاتی ہیں۔ مثلاً سوڈا، چونا، لیڈ وغیرہ۔ مختلف قسم کے شیشے بنانے کے لئے ریت میں اور دوسری مختلف چیزیں بھی ملا دی جاتی ہیں۔

شیشہ بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ریت، سوڈا اور چونا۔ ان تمام چیزوں کو ملا کر ایک برتن میں رکھ دیا جاتا ہے۔

اس کے بعد اس کو خوب گرم کیا جاتا ہے۔ چند گھنٹے تیز آنچ پر رہنے کے بعد یہ رقیق مادے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور اس وقت یہ اس قابل ہوتا ہے کہ اس سے ہر ناپ اور ہر شکل کی چیز بنائی جا سکے۔

شیشہ بنانے والے کا ہنر بہت ہی حیرت انگیز ہوتا ہے۔ وہ اپنی کاریگری سے شیشے کو بڑے سے بڑے مرتبان سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی شیشی تک کی شکل دے سکتا ہے۔ شیشے کے برتن اور

دوسری چیزیں بنانے میں بہت سی مشینوں سے بھی کام لیا جا سکتا ہے۔

جب لوگ شیشہ بنانا نہیں جانتے تھے۔ اس وقت کسی دھات کو خوب صاف کر کے اور اس میں چمک پیدا کرنے کے بعد آئینہ کا مصرف لیتے تھے۔ اب آئینے شیشے کے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اچھا آئینہ بنانے کے لئے بہت ہی عمدہ شیشے کی ضرورت ہوتی ہے۔

شیشے کی بعض چیزیں مثلاً عینک، دوربین وغیرہ کے بنانے میں بڑی محنت اور احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی قیمت بہت زیادہ ہوتی ہے۔

آج ہماری زندگی میں شیشے کی ضرورت اتنی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ کوئی بھی انسان اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس میں ایک ہی خامی ہے کہ یہ بہت آسانی کے ساتھ ٹوٹ جاتا ہے۔ اس خامی کو دور کرنے کی بہت سی کوششیں کی گئی ہیں، لیکن ابھی تک پوری کامیابی حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ ایک زمانہ آ سکتا ہے جب کہ شیشہ بھی لوہے یا کسی دوسری دھات کی طرح مستحکم اور پائیدار ہوا کرے گا۔

محمد شوکت علی

لطیفے

لڑکا (باپ سے) اباجان! اگر میری وجہ سے آپ کو ایک روپیہ نفع ہو جائے تو کیا آپ مجھ سے خوش نہ ہوں گے؟

باپ۔ کیوں نہیں بیٹا! ضرور خوش ہوں گے۔

لڑکا۔ آپ نے کہا تھا کہ اگر امتحان میں کامیاب ہو جاؤ گے تو تمہیں ایک روپیہ دیں گے؟

باپ۔ بے شک بیٹا۔

لڑکا۔ تو وہ روپیہ اپنے پاس رکھ لیجئے

باپ۔ کیوں؟

لڑکا۔ اس لئے کہ میں امتحان میں فیل ہو گیا ہوں۔

(۲)

خریدار۔ اس بچھڑے کی کتنی قیمت ہے؟

مالک۔ پانچ سو اسی روپے۔

خریدار۔ اتنی قیمت؟

مالک۔ اسی روپے کا بچھڑا ہے اور اس نے پانچ سو روپے کے نوٹ کھالئے ہیں۔

لڑائی کے بعد

شہناز ہاشمی

سامنے والے گھنے درخت پر ایک نیلے پروں والی چڑیا رہا کرتی تھی۔ کئی سال سے وہ ننوا تر اپنا گھونسلا اسی درخت پر بناتی تھی۔ میں برآمدے میں بیٹھ کر کہانیوں کی کتاب پڑھتے پڑھتے ایک نظر اس چڑیا پر بھی ڈال لیتی تھی۔ جو ہمیشہ کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتی تھی۔ اس کے نیلے نیلے بازو دھوپ میں خوب چمکتے تھے۔ اس سال وہ پھر اسی درخت پر اپنا گھونسلا بنانے آئی لیکن اس نے دیکھا کہ اس کی اپنی شاخ پر ایک اور چھوٹی سی چڑیا بیٹھی ہے جس کے پَر بھورے رنگ کے ہیں۔ اس کی چونچ میں گھاس کے تنکے اور تھوڑی سی اُون تھی۔ نیلی چڑیا نے پوچھا۔

"تم یہاں کیوں آئیں"؟

"اپنا گھونسلا بنانے آئی ہوں"۔ بھوری چڑیا نے جواب دیا۔

"تمہارا گھونسلا کیسا؟ یہ تو میری جگہ ہے"۔

"تو کیا ہوا"۔

"تو یہ ہوا کہ تمہیں یہاں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ ہمیشہ سے میری جگہ ہے"۔

"نہیں تو" بھوری چڑیا نے کہا۔ "یہ تمہاری جگہ بالکل نہیں ہے۔ اس سال میں پہلے یہاں آئی ہوں۔ تم تو ابھی ابھی آئی ہو۔ جو آیا پہلے اس کا حق بھی پہلے۔ دیکھو میں ابھی اپنا گھونسلا بناتی ہوں"۔ اُس نے اُون اور تنکے نیلی چڑیا کو دکھائے۔

"میں تین سال سے اسی پیڑ پر رہتی ہوں" نیلی چڑیا نے پَر پُھلا کر کہا۔ "اب کی بار آئی تو تمہیں یہاں بیٹھے دیکھا"۔

"ہاں اور اب میں یہیں رہوں گی"۔

"اچھی کہی۔ جو پہلے آتا ہے اس کا حق پہلے ہونا چاہیئے"۔ نیلی چڑیا کو بہت غصّہ آرہا تھا۔

"یہی تو میں بھی کہتی ہوں" بھوری چڑیا نے ہنس کر کہا

یہ سُنتے ہی نیلی چڑیا نے بھوری چڑیا کو زور سے دھکا دیا اور اس کی چونچ میں سے تنکے چھیننے لگی۔ اور پھر دونوں میں زبردست لڑائی چھڑ گئی۔ دونوں چلّا رہی تھیں۔

"یہ میری جگہ ہے"

"نہیں یہ میری جگہ ہے"

"چُپ رہو"۔

"تم خود چُپ رہو"۔

ایک بلّی نے دُور سے ان کی لڑائی کی آواز سُنی۔ وہ ان کے قریب آگئی۔ چڑیاں بلّی کو دیکھ کر بہت خوف زدہ ہوگئیں۔ بلّی غرّائی۔

"یہ جگہ تم دونوں میں سے کسی کو بھی نہیں مل سکتی"۔

یہ کہہ کر بلّی نے دونوں چڑیوں کو اپنے دونوں پنجوں میں پکڑ لیا۔

"یہ جگہ تمہاری نہیں ہے" بلّی نے نیلی چڑیا سے کہا۔ "اس سال تم بہت دیر سے آئیں"۔ اتنا کہہ کر بلّی مزے سے اسے ہڑپ کر گئی۔

"اور تمہیں بھی یہ جگہ نہیں مل سکتی"۔ بلّی بھوری چڑیا سے مخاطب ہوئی۔ "پچھلے سال اس درخت پر نیلی چڑیا رہتی تھی۔ تم یہاں کیسے آگئیں؟ میں تمہیں بھی کیوں زندہ رہنے دوں"؟ بات ختم کرکے بلّی نے بھوری چڑیا کو بھی نوالہ بنایا اور اطمینان سے اپنا راستہ لیا۔

فروری ۱۹۵۳ء

آٹھ آنے

سونے پر مینا کاری (سالارجنگ میوزیم حیدرآباد)

ڈالڈا وناسپتی کیونکر
آپ کی قیمت خرید کا بہترین معاوضہ ہے؟

"رام نے پھر گول کیا!"

"رام تمہاری تندرستی کا راز کیا ہے؟"

"کھانا پکانے کی بہترین چکنائی یعنے ڈالڈا"

"اہا، یہ کھانا ڈالڈا سے پکا ہے، میرے لئے ضروری قوت مجھے اس سے حاصل ہوگی۔"

کھیل کود میں میرے لئے ضروری قوت مجھے ڈالڈا سے حاصل ہوتی ہے...
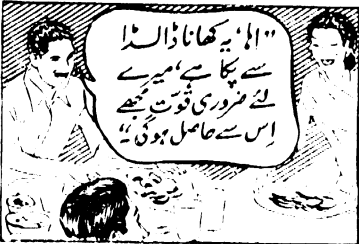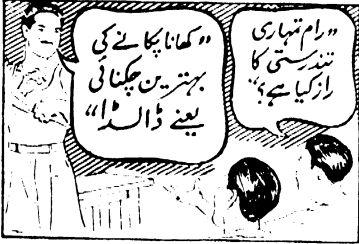
گوشت کھانا کیا لازمی ہے؟
مفت صلاح کیلئے آج ہی یا ابھی ہی لکھئے
دی ڈالڈا ایڈوائزری سروس
پوسٹ بکس نمبر ۳۵۳ بمبئی ۱
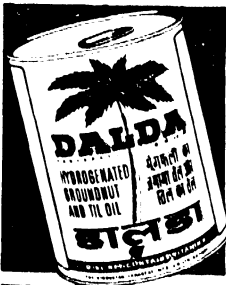
کامیابی کیلئے تندرست رہنا صرف کھلاڑیوں کیلئے ہی ضروری نہیں ہے۔ صحت اور قوت تو ہم سب کیلئے ضروری ہیں۔ اس بات کا خیال رکھئے کہ آپ کے گھر والوں کو قوت بخش چکنائی مہیا ہو جو ڈاکٹری اصول سے ہم سب کیلئے ضروری ہے۔ اور ڈالڈا سے اپنا کھانا پکانا بھولئے نہیں۔

ڈالڈا

کھانا پکانے کی چکنائی جس سے آپکی صحت درست رہتی ہے

HVM. 186-X52 UD

اُردُو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر: —— جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر: —— بال مکند عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد

جلد ۱۱ —— نمبر ۷

سالانہ چندہ: —— ہندوستان میں - چھ رُوپے
پاکستان میں - چھ رُوپے

غیر ممالک سے: —— نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ: —— ہندوستان میں - آٹھ آنے
پاکستان میں - آٹھ آنے

فروری سنہ ۱۹۵۳ء

ترتیب

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

جوش ملیح آبادی

عقل و عشق

نہ جانے کب صباحِ ناز ہوگی زرفشاں، ساقی
ابھی تو چرخ پہ ہے صبحِ کاذب کا سماں ساقی

غریبِ شہر ہوں، گوش و زباں سے کام لوں کیوں کر
نہ کوئی دیدہ ور ساقی، نہ کوئی نکتہ داں ساقی

وہاں معقولیت کی اور پرسش ہو یہ ناممکن
جہاں مجذوبیت ہے دولتِ کون و مکاں ساقی

مسلّم ہو جہاں توقیر ہیجان و تشنّج کی
وہاں تسکینِ غور و فکر کی حرمت کہاں ساقی

روایاتِ کہن کی آستینِ تنگ چھننے کو
رُخِ افکار پر ڈالی گئی ہیں جھرّیاں ساقی

کہیں بہتر ہے دانائی سے کوئے عشق و مستی میں
وہ نادانی، اُڑا دے عقل کی جو دھجّیاں ساقی

وہاں اک جرم ہے انفاسِ حکمت کی گہرباری
جہاں گونجا ہوا ہے حرفِ ایماں کا دھواں ساقی

قبائے عشق میں یزداں، عبائے عقل میں شیطاں
متاعِ اہلِ ایماں ہیں یہ کفر اندیشیاں ساقی

اِلٰہ و اہرمن، مرغ و سلیماں، آدم و حوّا
مقدّس واہموں کی دیکھ تو خلّاقیاں ساقی

تصوّر بولتا ہے ایک جسمِ نازنیں بن کر
معاذ اللہ فریبِ نفس کی پرچھائیاں ساقی

یہ مانا سخت پیاسا ہوں مگر آنکھیں نہیں پھوٹیں
کہوں کیوں کر سرابِ مردہ کو آبِ رواں ساقی

حدیثِ عقل کی آواز کانوں تک نہیں آتی
وہ شورش ہے فسونِ حلقۂ روحانیاں ساقی

یہ چرچے ہیں وہاں عرشِ بریں سے نور اترتا ہے
تھرک اٹھتی ہیں ڈھولک پر جہاں درویشیاں ساقی

انھیں کیا علم جو اک جست میں جاتے ہیں مولیٰ تک
کہ صد ہا سال میں کھلتا ہے اک سرِ نہاں ساقی

قیامت ہے خودی کا دیوتا بھی یہ نہیں کہتا
کہ اے انسان تو خود ہے خدائے این و آں ساقی

پہن کر مغربی داناؤں کی سر سے بڑی ٹوپی
نیا ملّا سناتا ہے پرانی داستاں ساقی

یہ ناممکن کہ قدموں کو ملا کر کوئے دانش میں
چلیں نیٹشے و حلاّج و ہیوم و برگساں ساقی

قیامت ہے کہ اب بھی اس خراباتِ مسائل میں
نئے دھج سے پرانا عشق ہے پیرِ مغاں ساقی

وہی عشقِ سبک سر عقل کی جو خیر سے ضد ہے
جسے مطلق نہیں اندازۂ سود و زیاں ساقی

وہی عشقِ فریب انگیز جس کے دام میں آ کر
دمِ اژدر پکڑ لیتا ہے طفلِ ناتواں ساقی

وہی نا آشنائے آگہی عشقِ جنوں پرور
لئے پھرتا ہے اک مدت سے جو تیر و کماں ساقی

وہی عشق و جنوں جس کی بدولت دیرِ مستی میں
بجاتی ہے تمنا گھنٹیوں پر گھنٹیاں ساقی

وہی عشقِ غلط اندیش جس کے اک اشارے پر
خوشی سے زہر کھا لیتے ہیں لاکھوں نوجواں ساقی

لباسِ عشق میں وہ ضبط ہے یہ کون سمجھے گا
نہیں جس عشق کی دستِ فراست میں عناں ساقی

بہت کم لوگ واقف ہیں کہ عشقِ پختہ و بالغ
نہالِ عقل کی ہے ایک شاخِ مے چکاں ساقی

خوشی سے آتشِ نمرود میں جو عشق کودا تھا
اسے حاصل تھی علم و عقل کی تاب و تواں ساقی

نہیں لیتا ہے پیرِ عقل سے جب اذنِ جولانی
تو بن جاتا ہے طفلِ عشق سیلِ بے اماں ساقی

یہ کیسی تیرہ بختی ہے کہ بے خوف و خطر اب بھی
یقیں کے شیشۂ مرمر پہ رقصاں ہے گماں ساقی

خرد کے یاورِ انصار ڈھونڈے سے نہیں ملتے
جنوں کی پشت پر ہے لشکرِ لاہوتیاں ساقی

چراغِ خانۂ بقراط ہے وہ قافلہ جس نے
قلندر کو بنایا ہے امیرِ کارواں ساقی

چڑھے بیٹھے ہیں کب سے آسمانوں پر جہاں والے
زمیں پر لے رہا ہے کروٹیں رازِ جہاں ساقی

کبھی گونگے ستاروں سے نہ یوں سرگوشیاں کرتے
سمجھ سکتے اگر احباب ذرّوں کی زباں ساقی

تھکے جب غور کرنے سے تو شاخِ فکر سے کٹ کر
بنایا قبۂ وجدانیت پر آشیاں ساقی

جب اُکتائے دماغِ رازجُو کے قصرِ سنگیں سے
بنائے شرقیوں نے دل میں شیشے کے مکاں ساقی

عبادت کے منادی، راہِ جودت میں حدی خواں ہیں
لگائے طرّہ ہائے افسرِ یونانیاں ساقی

نہ جانے بربطِ حکمت پہ کب مضراب دوڑے گی
ابھی تو حکم راں ہے شورِ ناقوس و اذاں ساقی

کسے سمجھاؤں کن الفاظ میں اور کس توقع پر
کہ نورِ عقل سے روشن ہے یہ سارا جہاں ساقی

کہ دانش صرف دانش ہے لباسِ مردمِ کامل
کہ حکمت صرف حکمت ہے کلاہِ مقبلاں ساقی

دیارِ عشق آزاد ایک منڈی ہے شراروں کی
فرازِ عقل پر ہے ماہ و پروین کی دکاں ساقی

بس اک تو داد دے سکتا ہے میری اس تباہی کی
کہ میں بیدار ہوں سوتے ہوؤں کے درمیاں ساقی

یہ ہند و پاک کیا، کُل ایشیاء اک خواب آیا ہے
یہ تیرا جوشِ بیداری کو لے جائے کہاں ساقی

م - ر

سوالاتِ عبدالکریم

غالب کی زندگی میں "قاطع برہان" کے معرکے کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہ گویا نقطۂ عروج تھا، اس قلمی اور لسانی جہاد کا، جو وہ عمر بھر ہندستانی فارسی نویسوں کے خلاف کرتے رہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کتاب اُن کے اس دعوے کا دستاویزی ثبوت ہے، کہ ہندوستان کے فارسی لغت نویس، خود غلط نویس ہیں۔ اور دوسروں کو گمراہ کرنے والے۔

"قاطع برہان" کے جواب میں منجملہ اور کتابوں کے ایک کتاب "محرق قاطع برہان" لکھی گئی تھی۔ اس کے مصنف سیّد سعادت علی تھے۔ غالب اور اُن کے دوستوں کی طرف سے اس کے جواب میں تین رسالے شائع ہوئے۔ مولوی نجف علی خاں نے "دافع ہذیان" فارسی میں لکھا۔ "لطائف غیبی" خود مرزا نے اردو میں لکھ کے اپنے شاگرد میاں داد خاں سیاح کے نام سے شائع کیا۔ تیسرا ایک مختصر مضمون "سوالاتِ عبدالکریم" کے نام سے تھا۔ "لطائف غیبی" پر میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ اس مضمون میں "سوالاتِ عبدالکریم" کا تعارف مقصود ہے۔

یہ مضمون آٹھ صفحوں پر مشتمل ہے۔ صفحے کا سائز ½ ۱۰" × ۷" اور حوض کا ۹" × ۵" ہے۔ علیحدہ سرورق اور ترقیمہ دونوں نہیں دیئے گئے۔ کم از کم اس کے جو دو نسخے میری نظر سے گذرے ہیں، ان میں یہی صورت ہے۔ مضمون کا عنوان بھی کہیں نہیں لکھا ہے۔ البتہ غالب نے کئی جگہ "سوالاتِ عبدالکریم" کے نام سے اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور چونکہ جیسا کہ اس کے آغاز ہی میں لکھا ہے، یہ چند سوال "عبدالکریم" کی طرف سے ہیں، اس لئے یہ نام غیر موزوں بھی نہیں۔ مطبع کا نام بھی کہیں نہیں چھپا ہے۔ لیکن چونکہ دوسرے دونوں رسالے اکمل المطابع میں چھپے تھے اور غالب کی اپنی اور ان کے احباب کی تحریریں بھی اسی مطبع میں چھپیں، اس لئے گمانِ غالب ہے، کہ یہ بھی اسی جگہ چھپا ہو گا۔ اگرچہ مطبوعہ مضمون میں تو کہیں نہیں لکھا ہے لیکن سنِ اشاعت یقیناً ۱۲۸۱ھ ہے، کیونکہ مرزا نے متعدد خطوں میں اس کا ذکر کیا ہے۔ من جملہ مندرجہ ذیل تین اقتباس ملاحظہ ہوں:

(۱) "ہاں ہاں "محرق قاطع" کا تمہارے پاس پہنچنا ع
کامے کہ خواستم ز خدا شد میسّرم۔ میں اس خرافات کا جواب کیا لکھتا مگر ہاں، سخن فہم دوستوں کو غصّہ آگیا۔ ایک صاحب نے فارسی عبارت میں اس کے عیوب ظاہر کئے۔ دو طالب علموں نے اُردو زبان میں دو رسالے جدا جدا لکھے..... دافع ہذیان۔ سوالات۔ لطائفِ غیبی تینوں نسخے ایک پارسل میں اس خط کے ساتھ روانہ ہوتے ہیں۔"
(۲۸- نومبر ۱۸۶۴ء بنام حبیب اللہ خاں ذکا۔ اُردوئے معلی صفحہ ۲۷-۲۸)

(۲) "ایک مولوی نجف علی صاحب ہیں۔ باوجود فضیلت علم عربی و فارسی میں ان کا نظیر نہیں۔ وہ جو ایک شخص مجہول الحال نے، اہل دہلی میں سے، میرے کلام کی تردید میں کتاب تصنیف کی ہے، مسمّیٰ بہ محرقِ قاطع برہان۔ انہوں نے اس کی توہین اور مسودہ کی تفضیح میں دو جزو کا ایک نسخہ مختصر لکھا ہے۔ اور ایک طالب علم مسمّی بہ عبدالکریم نے سعادت علی مؤلف محرق قاطع سے سوالات کئے ہیں اور ایک محضر اس نے بفتوائے علمائے شہر مرتّب کیا ہے ایک میرے دوست نے بصرفِ زر اس کو چھپوایا ہے۔ ایک نسخہ اس کا آج اسی خط کے ساتھ بسبیل پارسل ارسال کیا ہے۔"
(۱۲۸۱ھ بنام خواجہ غلام غوث خاں بیخبر۔ اُردوئے معلی صفحہ ۲۱۳)

(۳) "محرق قاطع برہان، میرے پاس موجود ہے، مجھ سے منگوا لو۔ میں ہر موقع پر خطا اور زلّتِ مؤلف کا اشارہ کر دوں گا۔ تم ہر فقرے کو بغور دیکھو اور بے ربطیٔ الفاظ اور لغویتِ معانی کو میزانِ نظر میں تولو عامی نہیں ہو، عالم ہو۔ آخر مولوی نجف علی صاحب نے بھی تو اپنی قوّتِ عاقلہ سے، بے اعانتِ غیر، محرق کے جامے کی دھجیاں اڑائی ہیں۔ تمہارے پاس دو نسخے، ایک دافع ہذیان، ایک سوالاتِ عبدالکریم

مع استفتاء و اثبات دستخطی علماء دہلی موجود ہیں۔" (۱۸۶۵ء)
بنام غلام حسین قدر بلگرامی (اردوئے معلی صفحہ ۱۴۱)

ان تینوں عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ "سوالات" کا نسخہ لطائف غیبی سے پہلے شائع ہوا تھا۔ میرے خیال میں پہلی عبارت میں تینوں رسالوں کا نام ان کے زمانۂ اشاعت کی ترتیب کے مطابق ہے۔ دوسری اور تیسری عبارت سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس وقت تک صرف دافع ہذیان اور سوالات چھپے تھے۔ کیونکہ اگر لطائف غیبی بھی چھپ چکی ہوتی، تو وہ اسے بھی ضرور بھجر اور قدر کے پاس روانہ کر دیتے۔ غرض کہ سوالات والا رسالہ، دافع ہذیان کے بعد اور لطائف غیبی سے پہلے شائع ہوا۔ اور یہ دونوں ۱۲۸۱ھ میں چھپے تھے۔

محرق قاطع برہان کے مصنف سید سعادت علی صاحب ریذیڈنٹ راجپوتانہ کے دفتر میں سررشتہ دار رہے تھے۔ اور غالباً دفتر کی فارسی نوشت و خواند اُن کے ذمے تھی۔ قدرتاً انہیں فارسی دانی کا دعویٰ تھا۔ جب وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو انہوں نے حدائق العجائب کے نام سے ایک کتاب تالیف کی، جس میں انہوں نے ایسے ہندی لفظوں کی فہرست دی، جو اردو میں مستعمل ہیں، اور ان کے بالمقابل ان کے ہم معنی فارسی اور عربی کے الفاظ درج کئے۔ فارسی الفاظ کے لئے اُن کے ماخذ برہان قاطع، فرہنگ رشیدی، غیاث اللغات، شمس اللغات وغیرہ تھے۔ میرزا نے قاطع برہان میں، برہان قاطع کے ۴۲۸ الفاظ پر اعتراض کیا ہے اور اس کے مؤلف کی غلط فہمی اور مہمل نویسی کا خاکہ اڑایا ہے۔ ان میں ۴۲ کلمے ایسے ہیں، جو سید سعادت علی صاحب نے اپنی کتاب میں لئے تھے۔ قدرتی طور پر انہیں قاطع برہان کا جواب دینا ہی چاہیئے تھا۔ کیونکہ میرزا کا اعتراض نہ صرف مولوی محمد حسین مؤلف برہان قاطع ہی وارد ہوتا تھا، بلکہ سید سعادت علی پر بھی جنہوں نے یہ ۴۲ لفظ برہان قاطع سے اپنی کتاب میں نقل کر کے ان کی درستی پر گویا مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔ محرق قاطع برہان ورق انہیں ۴۲ لفظوں کو درست ثابت کرنے کی کوشش ہے۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ۹۶ صفحوں کو محیط ہے اور محرم ۱۲۸۰ھ میں مطبع احمدی شاہدرہ دہلی میں چھپ کر شائع ہوئی تھی۔

"سوالات عبدالکریم" سے مراد سید سعادت علی کو خفیف کرنا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ جو شخص قدم قدم پر ایسی فاش غلطیاں کرتا ہے، اس کا میرزا غالب کے مرتبے کے فارسی دان کے مقابلے میں آنا کتنا مضحکہ خیز فعل ہے۔

اب میں مختصر طور پر ترتیب وار یہ سوال درج کرتا ہوں۔

(۱) پہلا سوال:

سید سعادت علی صاحب اپنی کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"پیش ازیں چندسالے کتاب مسمیٰ بحدائق العجائب تالیف کردہ بودم۔"

اعتراض: یہ چندسالے کیا ترکیب ہے؟ چند سال کہئے یا سالے چند۔ سعدی کہتا ہے ع چارپائے بروکتابے چند۔ چندسالے کی سند اساتذہ کے کلام سے مہیا فرمائیں۔

(۲) دوسرا سوال

یہ سوال دراصل تین سوالوں پر مشتمل ہے۔

(۱) سید سعادت علی صاحب نے لکھا تھا: "باوجود ایں کثرت، چوں ہمہ لغت باہم ترتیب حروف تہجی، از اول لغت تا آخرش، جا بجائے باب و فصل بتقدیم و تاخیر مرقوم شدند۔"

اعتراض: جب تک ترتیب کے قبل بائے موحدہ نہ آئے۔ ترتیب متعلق فعل نہیں ہو سکتا۔

(۲) پھر سید صاحب نے رقم فرمایا تھا: "احدی از فرہنگ نویسان چنیں عرق ریزی در ترتیب نگردیدہ"

اعتراض: نگردیدہ غلط محض، یہاں نکردہ چاہیئے۔ نگردیدہ فعل لازمی کے ساتھ احدے کیسے ربط پا سکتا ہے؟

(۳) سید صاحب موصوف ایک جگہ لکھتے ہیں:

"بدوں از کتب لغت، مندرجۂ اشعار اسناد اساتذۂ سخنوران اہل زبان ایران"

اس پر متعدد اعتراض کئے گئے ہیں۔ پہلے یہ کہ سب کسرے مہمل ہیں۔ دوسرے اساتذۂ سخنوران کیا ترکیب ہے؟ اساتذہ بھی جمع اور سخنوراں بھی جمع۔ اگر اساتذۂ سخنور ہوتا، تو ہم اسے مرکب توصیفی ہی سمجھ لیتے۔ موجودہ صورت میں اسے مرکب اضافی ماننا پڑتا ہے اور اس کے معنی ہوں گے، سخنوروں کے استاذ، جو نہ مقصود ہے نہ بامحل۔ پھر سخنوران اہل زبان ایران کیا ترکیب ہے؟ اہل زبان اور ایران میں ایک حشو محض ہے۔

(۳) تیسرا سوال:

سید صاحب نے ایک معرکے کا فقرہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

"خالی ضمیر خردمندان حق گزیں، دقیقہ رس سخن شناس، مقلدان اساتذۂ سخنوران

اہلِ زبانِ پیشین خواہد بود"

اعتراض = "سوالات" کی اصل عبارت ملاحظہ ہو:

"حالی مضاف ضمیر مضاف الیہ، پھر ضمیر مضاف خردمنداں مضاف الیہ، حق گزیں صفت، دقیقہ رس صفت در صفت، سخن شناس علی ہذا القیاس۔ اب احقر کی تقریر سنیئے۔ حالی کا کسرہ اضافی، ضمیر کا کسرہ اضافی، خردمنداں کا کسرہ توصیفی، حق گزیں اور دقیقہ رس کا کسرہ قائم مقام واو عاطفہ۔ یہاں تک تو میں سمجھ لیا۔ اب حق شناس کی سین کو موقوف پڑھوں، تو سارے فقرے کو اپنے مابعد سے ربط باقی نہیں رہتا اور اگر متحرک پڑھوں، تو اس کو توصیفی نہیں کہہ سکتا۔ ناچار اضافی کہوں اور سخن شناس کو مضاف ٹھہراؤں اور مقلداں کو مضاف الیہ بناؤں۔ سخن شناس مقلداں کے کوئی معنی پوچھے تو کیا بتاؤں؟ مقلداں کا کسرہ بے شبہ اضافی ہے۔ مقلدانِ اساتذہ یعنی اساتذہ کی تقلید کرنے والے۔ لیکن وہاں تو اساتذۂ سخنوراں ہے۔ اس کا حاصل وہ ہے جو میں اوپر لکھ آیا ہوں (یعنی سوال ۲ میں۔ م۔ ر) اس صورت میں ہندی اس طولانی فقرے کی یہ ہوئی: سخنوروں کے استادوں کے مقلدوں کے سخن شناس۔ پھر یہاں بھی تو حضرت کو سکوت نہیں۔ سخنوروں کے آگے اہلِ زبان، اس کو کہاں کھپاؤں۔ خیر اس کو بھی آپ کے پیچھے کی عبارت میں بزور ٹھونس دیا۔ پیشین کو کہاں گھسیڑوں۔ کچھ فرمائیے، کچھ بتائیے تاکہ آپ کا یہ خادم کشاکش سے نجات پائے۔"

(۴) چوتھا سوال =

مولف محرق قاطع برہان نے لکھا تھا =

"صاحب فرہنگ جہانگیری، در زمانش آمد شد از ایران در رواج زبانِ پارسی و شاید از شعرائے کلیم ہم بود"

اعتراض = اس پر دو اعتراض ہیں۔ ایران سے آمد و رفت، غوریوں کے آنے کے ساتھ شروع ہوگئی تھی۔ اس لئے یہ لکھنا کہ یہ صاحب فرہنگِ جہانگیری کے زمانے سے ہوئی غلط ہے۔ لیکن اصلی اعتراض یہ ہے کہ آمد شد کا مضاف کہاں ہے؟

(۵) پانچواں سوال =

سیّد صاحب لکھتے ہیں: "ریخ چیشم زخم وغیرہ آنہا کہ بہ احباب مجلسِ انس کہ مخاطب اند، نرسد"

اعتراض = یہاں دو سوال کئے گئے ہیں۔

(۱) "ریخ چیشم زخم آنہا" کافی تھا۔ یہ "وغیرہ" بیچ میں کیوں لائے؟ اور اس کا مصرف کیا ہے؟

(۲) مجلسِ انس کے آگے "یہ کاف" کیسا ہے؟

(۶) چھٹا سوال =

سیّد سعادت علی صاحب نے فشار کو درست ثابت کرنے کے لئے مولوی روم (رح) کے حوالے سے یہ شعر لکھا تھا ؎

این چہ کفر است، این چہ ژاژ است و فشار
پنبہ اندر دہانِ خود بفشار

اعتراض = اس شعر کو موزوں پڑھنا ناممکن ہے۔ یہ دونوں مصرعے ہم وزن نہیں۔

(۷) ساتواں سوال =

سیّد صاحب موصوف کا فقرہ ہے =

"از حکومت دزداں را گیرد۔ و مال از انہا ستیدہ می گزرد و دزداں از ین سبب مال بوُے می دہند کہ اگر ندہیم، مارا فیصلہ خواہد کنانید"

اعتراض = اس مختصر عبارت میں تین تین غلطیاں ہیں۔

(۱) از حکومت کمال باہر، یہاں بحکومت چاہیئے۔

(۲) ستیدہ غلط فارسی ہے۔ مصدر ستدن (بفتحتین و فتح دال) اس سے مفعول ستدہ بنے گا۔ ستیدہ جب ہو کہ مصدر ستیدن ہو۔ زبانِ فارسی میں ایسا کوئی مصدر نہیں۔

(۳) دزداں صیغۂ جمع، مارا صیغۂ جمع۔ ان کے لئے فعل ندہیم چاہیئے، نہ کہ ندہم۔

(۸) آٹھواں سوال =

مصنف محرق قاطع برہان کا فقرہ ہے:

"در مثال بہ اندراج لفظ فراز و لفظ عین تقلیداً مرزا اسداللہ غالب ترکیب داده نگاشت"

اعتراض = یاد رہے کہ اس اعتراض کی بنیاد یہ ہے کہ برہان قاطع میں فراز کو اضداد میں سے لکھا تھا یعنی اس کے معنی دونوں کھولنا اور بند کرنا ہیں۔ غالب نے قاطع برہان میں لکھا کہ یہ کلمۂ اضداد میں سے نہیں۔ اس کے معنی صرف بند کرنا ہیں۔ اسی بحث میں سیّد سعادت علی صاحب نے مندرجہ بالا فقرہ لکھا ہے۔ اس پر "سوالاتِ عبدالکریم" میں لکھا ہے کہ اس فقرے میں دو غلطیاں ہیں ایک معنی کی ایک لفظ کی۔ معنی کی یہ کہ لفظ کثیر المعنی کو اضداد میں شمار کیا

گیا ہے۔ کثیر المعنی اور چیز ہے اور مشترک المعنی اور۔

لفظ کی غلطی یہ ہے کہ "تقلیداً مرزا اسد اللہ غالب" لکھا ہے۔ فارسی میں "بہ تقلیدِ فلاں" کہیں گے اور عربی قاعدے کے مطابق تقلیداً الفلاں لکھیں گے۔ "تقلیداً فلاں" غلط محض ہے۔

(۹) نواں سوال:

میرزا نے قاطع برہان میں ایک جگہ "سیرابی بیان" کی ترکیب لکھی ہے۔ سیّد سعادت علی صاحب نے اسے غلط ٹھہرایا ہے اور فرماتے ہیں کہ صرف اس آدمی یا اس جانور کو سیراب کہتے ہیں جس نے پیٹ بھر کر پانی پیا ہو یا اس کھیتی کو جسے خوب پانی دیا گیا ہو۔ اسی مقام پر انہوں نے اوشاں کو ضمیر جمع غائب قرار دیا ہے۔

اعتراض: (۱) "سیرابیٔ بیان" استعارہ ہے اور استعارہ نہ صرف جائز بلکہ حسنِ کلام کی بنیاد۔ سند ملاحظہ ہو۔

ے نمود گوہر سیراب در بناگوشش — جو شبنمی کہ کشد برگِ گل در آغوشش

ے بود از فیضِ معنی ہائے سیراب — رواں در جدولِ اوراق او آب

اگر آپ سیرابیٔ بیان غلط ٹھہراتے ہیں تو سیرابیٔ گوہر اور سیرابیٔ معنی بھی غلط ہونگے

(۲) ضمیر جمع غائب اوشاں نہیں بلکہ صرف شاں ہے۔ اوشاں کی سند ازروئے نظم و نثر اساتذہ عنایت کیجئے۔

(۱۰) دسواں سوال: مؤلف برہان قاطع نے بپسودن (مع بائی موحدہ) کو نعت مستقل لکھا تھا۔ میرزا نے اعتراض کیا کہ بائی موحدہ کا استعمال مصدر کے ساتھ غلط ہے۔ اصلی لفظ پسودن (بغیر بائی موحدہ) ہے۔ اس پر سید سعادت علی صاحب لکھتے ہیں۔

"بپسودن بہ بائی فارسی نہ در فرہنگ جہانگیری و فرہنگ رشیدی و در مؤید الفضلا و مدار الافاضل دیدیم۔"

اعتراض: نون نافیہ ابتدائے عبارت میں اور "در" کا لفظ دو جگہ اور پھر دو ظرف ذکر کرکے واؤ عاطفہ اور اس کے آگے مزید دو ظرف۔ سب غلط ہیں۔

اس کے معاً بعد سید صاحب موصوف نے یہ فقرہ لکھا تھا ے

"گمان ندارند کہ برائے بائی موحدہ بر آورندگانِ کتاب از راہِ نصیحت زیادہ کردہ باشند"

"سوالات" میں اس پر دو اعتراض ہیں۔ اول یہ کہ گمان کے بعد کاف کیسا ہے اور اس کے معنی کیا ہیں؟ دوسرے "برآورندگانِ کتاب" سے کون لوگ مراد ہیں؟ نہ مؤلف برآورندۂ کتاب ہو سکتا ہے، نہ کاتب۔ اس کے معنی کیا ہیں اور اس کی سند کیا ہے؟

(۱۱) گیارھواں سوال

سیّد صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے:

"ندانم کہ مرزا اسد اللہ غالب بکہ رہبری بائی موحدۂ اصلی بپیما دیدن و بپسودن را زایدہ انگاشتند۔"

اعتراض: اس فقرے سے متعلق سوالات میں لکھا ہے "کہ رہبری" کے کیا معنی ہیں؟ یا "بکدام رہبری" لکھئے یا "برہبری کہ"۔ سبحان اللہ! اس تحریر پر دعوئ تالیف و تصنیف کرنا اور پھر جناب حضرت غالب مدظلہ العالی سے پوچھنا کہ بائی بپیما دیدن اور بپسودن کو کس راہ سے زایدہ جانا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ خاص بپیمادن کی موحدہ ہی کو حرف اصلی سمجھا جائے یا جتنے مضارع ہیں اور یہ ہزار در ہزار ہیں، ان سب پر جو بائی موحدہ لاتے ہیں، عموماً ان سب کو حرف اصلی اور جزوِ کلمہ قرار دیا جائے؟ مزید یہ کہ چونکہ حرف اصلی کا حذف دستور نہیں، پس جب بپیمادن لفظ مستقل ٹھہرا، تو پیمادن بغیر بائی اصلی مہمل سمجھا جائے گا یا مخفف؟

(۱۲) بارھواں سوال:

ایک جگہ سید صاحب نے "مردمانِ دور و دراز" لکھا تھا۔

اعتراض: دور و دراز راہ کی صفت ہے، نہ کہ مردماں کی۔ مردماں کی صفت دُور تو شاید کسی طرح مان بھی لی جائے۔ لیکن یہ دراز کا عطف کیسا؟ کیا اس سے لمبے قد کے لوگ مراد ہیں۔

(۱۳) تیرھواں سوال:

محرق قاطع برہان میں ایک جگہ لکھا ہے:

"ما سخن فہمانِ انصاف گزیں حق پسند را تکلیفِ دعوت نمی دہیم"

اس پر اعتراض کیا ہے کہ "ما" کی خبر "نمی دہیم" مسموع اور مقبول۔ یہ نمی دہیم کہاں کی بولی ہے؟

اسی صفحہ پر مصنف محرق قاطع برہان نے لفظ "خندستان" استعمال کیا ہے۔ معترض نے اس کی سند طلب کی ہے۔ پھر لکھا تھا۔

"بہر دیدنِ تماشائے خندۂ خویش آناں مانند نقاصاں می طلبانند"

اس پر عبدالکریم صاحب لکھتے ہیں کہ "آناں" کے آگے لفظ "را" جو مفعول کی علامت ہے، کیوں نہیں لکھا اور "می طلبد" کی جگہ "می طلبانند" کیوں لکھا؟ تصدیہ کی کیا ضرورت تھی؟

(۱۴) چودھواں سوال :

سید صاحب نے اپنی کتاب میں ایک جگہ یہ تین فقرے لکھے ہیں :-

(۱) از سر بہ ہمبری دیگر کتاب رفع گرد دیدہ۔

(۲) ایں ہمساں می ماند

(۳) دیدہ ورانِ انصاف و حقیقت بدیں صنعت می خسنند و حمقا ظاہر بیں می سرائید۔

مولف سوالات ان سے متعلق لکھتا ہے کہ ان تینوں فقروں کی غلطی ظاہر ہے۔

(۱) یہاں "ہمبری" مقابلے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ قطع نظر اس لفظ کی غرابت کے کھینچ تان کے زیادہ سے زیادہ اس کے معنی ہمدوشی اور ہمسری کے ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں "ہمبری" افادۂ معنی برابری کرے گا۔ مقابلہ ضدیت چاہتا ہے، نہ کہ مثلیت۔

(۲) یہاں "می ماند" کی جگہ "بداں می ماند" یا "بداں ماند" چاہیئے۔

(۳) "دیدہ ورانِ انصاف و حقیقت" ترکیب بے معنی ہے۔

اور "حمقا ظاہر بیں" کے کیا معنی ہیں؟ حمقا کے آگے تحتانی یا ہمزہ ہو، تو ظاہر بیں اس کی صفت بن سکتی ہے، اس کے بغیر یہ جملہ غلط ہے۔

لیکن سب سے بڑھ کر فقرے کے آخر میں "می سرائید" کا استعمال ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ می گویند کے معنی میں آیا ہے۔ اب جب تک اس کے بعد کاف اور تقریر نہ ہو، فقرہ غیر مکمل اور بے معنی ہے۔ "می سرایند" یا "می گویند" چہ؟

(۱۵) پندرھواں سوال :

جامع برہان قاطع، مولوی محمد حسین دکنی، نہ پیر طریقت، نہ شیخ وقت، نہ مفتی، نہ عالم، نہ مجتہد۔ اگر میرزا غالب نے اس سے متعلق چند کلمے ظرافت آمیز لکھے تھے، تو آپ کو اتنا تاؤ کیوں آیا کہ آپ آپے سے باہر ہو کر میرزا صاحب کو ایسی فحش گالیاں دینے لگے؟

(۱۶) سولھواں سوال :

آپ خود سنی ہیں، لیکن آپ کے برادرِ حقیقی میر ارادت علی صاحب امامی مذہب کے پیرو ہیں اور مسلک اسلامیہ میں سبِّ صحابہ کا استحسان بلکہ وجوب مشہور ہے۔ آپ کو مولوی محمد حسین دکنی کے خلاف میرزا غالب کے چند فقروں پر تو اتنا غصہ آیا، لیکن خلفائے راشدین کے خلاف اپنے بھائی صاحب کے سبّ و شتم پر آپ کی رگِ حمیت جوش میں نہ آئی۔

یہ ہیں سولہ سوال جنہیں سوالاتِ عبدالکریم کا نام دیا گیا ہے۔ یہ رسالے کے صفحہ ۷ پر ختم ہوتے ہیں۔

یہاں ایک غلطی کی طرف اشارہ کر دوں۔ مضمون میں کاتب کی غلطی کی وجہ سے چودھویں سوال کے بعد عنوان میں پندرھویں کی جگہ "سوال سولھواں" لکھ دیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر میں "سوال سترھواں" ہے، حالانکہ دراصل بالجملہ صرف سولہ سوال ہیں۔

جو اعتراض کئے گئے ہیں۔ ان سے متعلق کچھ لکھنا بے سود ہے۔ اگر ہم بہت رعایت سے کام لیں، تو بعض غلطیوں کو کاتب کے اعمال نامے میں لکھ سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس نے نکردہ کی جگہ نگردیدہ (سوال ۲)، ستدہ کی جگہ ستیدہ اور ندیم کی جگہ ندہم (سوال ۸) اور دیہیم کی جگہ دہم (سوال ۱۳) لکھ دیا ہو۔ لیکن باقی جو سوالات اور اعتراض ہیں، وہ بالکل درست ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود سید سعادت علی صاحب کا مبلغِ علم کتنا تھا اور میرزا غالب کو کس اہلیت کے لوگوں سے واسطہ پڑا تھا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ بڑے بڑے عالم بھی ان لغو گویوں اور پوچ نویسوں کو غالب کا حریف خیال کرتے تھے۔ کیا خوب کہا ہے ؎

غالب سوختہ جاں را چہ بگفتار آری
بدیارے کہ ندانند نظیری ز قتیل

(۲)

سب سے آخر میں یعنی صفحہ ۸ پر عنوان ہے "استفتا از جانب سایل"۔ اور اس کے نیچے دو سوال ہیں۔

پہلا سوال ہے :

"قواعدِ مقررہ فارسی کے مطابق صیغۂ امر کے بعد مجرد الف افادۂ معنی فاعلیت کرتا ہے اور اسم جامد کے آگے الف نون مفید معنی جمع ہے۔ الف نون سے معنی فاعل کے لینے کا قصد کرنا ناشی غفلت سے ہے یا نہیں۔"

اس کے نیچے مندرجہ ذیل اصحاب کے جواب الگ الگ درج ہیں اور سب

اس سے اتفاق کیا ہے کہ اسم جامد کے بعد الف نون اکثر مفید معنی جمع آتا ہے، فاعلیت کے معنی ہرگز نہیں دیتا۔

محمد سعادت علی، ملازم گورنمنٹ اسکول دہلی

خدابخش، مدرس نورمل اسکول

محمد نصیر الدین، متعلق نورمل سکول دہلی

محمد لطف حسین، مدرس مدرسہ سرکاری

محمد فضل اللہ

نجف علی

دوسرا سوال ہے :

" رواں و دواں و افتاں و خیزاں یعنی صیغہ ہائے امر کے آگے الف نون جو آتا ہے، وہ حالیہ کہلاتا ہے۔ الف نون حالیہ کے وجود کا منکر مسلمات جمہور کا منکر ہے یا نہیں"

مندرجہ صدر اصحاب ہی نے اس کے جواب میں لکھا ہے، کہ امر کے بعد الف نون حالیہ آتا ہے۔ غالب نے دونوں سوالوں کے جواب میں یہ لکھا ہے :

" فارسی میں الف نون تین قسم کا ہے۔ اگر لفظ جامد کے آگے آئے تو یا زائد ہے یا جمع کا۔ اور صیغہ ہائے امر کے بعد حالیہ ہے عموماً۔

فقط داد کا طالب غالب "

رسالہ یہیں ختم ہو جاتا ہے۔

یہ دونوں سوال سید سعادت علی صاحب کے دعووں میں ہیں، جو انہوں نے محرق قاطع برہان میں کئے تھے۔

(۳)

میں نے "ذکر غالب" میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور اب بھی میرا یہی خیال ہے، کہ یہ رسالہ کاملاً میرزا غالب کے رشحۂ قلم کا ممنون نہیں، تو کم از کم اس کی تصنیف میں ان کا بہت زیادہ ہاتھ ہے۔

سب سے اول اس رسالے کا شگفتہ اور مزاحیہ طرز تحریر ہے، جو میرزا کی نگارش کا طرۂ امتیاز ہے۔ میں نے ایک طولانی اقتباس تیسرے سوال کے تحت دیا ہے۔ اگرچہ اس کے آخر میں ظرافت، رکاکت کی حد تک پہنچ گئی ہے لیکن یہ غالب سے بعید نہیں، خصوصاً جب کہ وہ اسے اپنے نام نہیں چھاپ رہے تھے۔

اس کے علاوہ کچھ اور عبارتیں بھی ملاحظہ ہوں۔ فرماتے ہیں :

" آپ کے اقوال کو وہ سمجھے، جس نے حضرت سلیمان کو خواب میں دیکھا ہو۔ میرا کیا منہ، جو حضرت کے مدعا کا استنباط کر سکوں۔

من ندیدم شبے سلیماں را

چہ شناسم زبانِ مرغاں را "

ایک جگہ سید سعادت علی صاحب کے "می سرانید" کے استعمال پر لکھا ہے اور دیکھئے ایک ایک لفظ کس کی شوخیٔ تحریر کا غماز ہے :

" جس مجمع میں یہ صفحہ دیکھا جاتا تھا، ایک شخص ظریف حاضر تھا۔ اس نے سب کو ڈانٹا اور کہا کہ تم لوگ نادان ہو، جناب منشی صاحب نے "می ستانید" کی جگہ "می سرانید" لکھا ہے۔ ہم سب نے کہا یہ امر سند طلب ہے۔ سرودن کے دو معنی ہیں، گانا اور کہنا۔ تعریف کرنا کس طرح مسلم ہو سکتا ہے۔ اس ظریف نے کہا کہ سنو ہندی میں تعریف کرنے کو سراہنا کہتے ہیں۔ منشی جی نے اردوئے تفریس می سرانید لکھا ہے۔ ہم نے کہا، اگر یوں تھا تو می سراہند چاہیئے تھا، نہ می سرانید۔ ظریف نے کہا، کہ منشی جی پیرو ہیں، دکنی کے، جس نے برہانِ قاطع میں اڑنگ کو، اژنگ، اور ارجنگ اور ارژنگ اور ارسنگ اور ارغنگ لکھا ہے، منشی جی نے بھی می سراہند کو می سرانید لکھ دیا، تو کیا غضب کیا۔ منشی صاحب تمہارے قدموں کی قسم، اس مجمع میں بہ نسبت آپ کی فارسی عبارت کے وہ لطائف ذوق انگیز درمیان آئے ہیں کہ سب اہلِ محفل ہنسی کے مارے مر مر جاتے تھے۔ آخر کو بالاتفاق رائے ہمہ گر یہ ٹھہری کہ فرہنگ نویسوں نے فارسی کو سات قسم پر منقسم کیا ہے، ان اقسام سبعہ میں سے ساتویں فارسی سغدی ہے، منشی سعادت علی نے آٹھویں فارسی نکالی ہے، اس کا نام جُنگندی ہے۔"

مضمون کے آخر میں لکھا ہے :

" میں نے ایک دن نواب صاحب محتشم الیہ (یعنی غالب) سے پوچھا، کہ آپ نے منشی سعادت علی صاحب کی بد زبانی کا جواب کیوں نہ دیا۔ حضرت نے فرمایا، کہ بھائی اگر راہ چلتے سڑک پر گدھا تم کو لات مار بیٹھے، تو کیا تم بھی بہ سبیل تلافی سڑک پر

جھڑ جاؤ گے اور گدھے کو لات مارو گے۔ میں نے کہا کہ ہرگز نہیں۔ حضرت نے ارشاد کیا کہ پھر میں منشی جی کے خرافات کا جواب کیوں دوں"۔

مولانا حالی نے میرزا کا یہ لطیفہ مولوی امین الدین امین مصنف قاطع القاطع سے متعلق لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

"مولوی امین الدین کی کتاب قاطع قاطع کا جواب میرزا نے کچھ نہیں دیا کیونکہ اس میں فحش اور ناشائستہ الفاظ کثرت سے تھے کسی نے کہا، حضرت! آپ نے اس کا کچھ جواب نہیں لکھا۔ میرزا نے کہا۔ "اگر کوئی گدھا تمہارے لات مارے، تو کیا تم اس کے لات مارو گے۔" (یادگار غالب صفحہ ۴۲)

دوسرا ثبوت اس تحریر کے میرزا کے قلم سے ہونے کا یہ ہے کہ اس میں میرزا کی ایک خاص روش عام طور پر ملتی ہے۔ میرزا کی یہ عام عادت ہے کہ وہ کسی کو "آپ" سے خطاب کرتے کرتے "تم" لکھنے لگتے ہیں۔ اُردوئے معلیٰ اور مکاتیب غالب کے خطوں میں اس کی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں۔ نواب فردوس مکان اور نواب خلد آشیان تک کے خطوں میں وہ اپنے قلم کو نہیں سنبھال سکے، دوسروں کا تو کیا ذکر ہے۔ "سوالات عبدالکریم" میں بھی قدم قدم پر یہی انداز ہے۔ ابھی آپ کہہ کے گفتگو رہے ہیں کہ تم تک پہنچ جاتے ہیں۔

ایک اور نمایاں بات اس مضمون میں سید سعادت علی صاحب کے نام کو ہمیشہ منشی کے ساتھ لکھنے کی ہے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ وہ سید ہیں۔ چنانچہ جہاں ان کے بھائی کا نام لکھا ہے، وہاں "میر ارادت علی صاحب" لکھا ہے لیکن اس کے باوجود اُن کے نام کے ساتھ میر یا سید بھولے سے بھی نہیں لکھا۔ اُردوئے معلیٰ اور لطائف غیبی میں بھی جہاں کہیں اُن کا ذکر آیا ہے منشی سعادت علی ہی لکھا ہے۔ ان ہی سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عین ممکن ہے کہ یہ مضمون بھی میرزا نے خود لکھ کے عبدالکریم کے نام سے شائع کر دیا ہو۔

چاول کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے تجربے

ملک میں چاول کی پیداوار سے متعلقہ مرکزی تحقیقی ادارہ نے ۵۲-۱۹۵۱ء میں ہر پہلو سے ترقی کی ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں سے فراہم کردہ چاول کی ۲½ ہزار سے زائد مختلف اقسام پر اس امر کے تجربے کئے جا رہے ہیں کہ ان میں سے کون کون سی اقسام بھارت میں اچھی طرح نشوونما پا سکتی ہیں۔ چاولوں کی پانچ ایسی اقسام کا انتخاب کیا گیا ہے جن کی فصل ۱۴۵ دنوں میں تیار ہو جاتی ہے۔ پچھلی تین فصلوں میں ان کی پیداواری صلاحیت مقامی اقسام سے زیادہ ثابت ہوئی ہے۔ اب جاپان اور بھارت کے مختلف قسموں کے چاول کی پیوند کاری کے تجربے کئے جا رہے ہیں۔ تجربوں سے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ پودے لگانے کے لئے پانی دینے سے پیشتر امونیم سلفیٹ ڈالنے سے یا سطح زمین سے نیچے دو تین انچ کی گہرائی پر پودے کی جڑوں کے نزدیک گولیوں کی شکل میں کھاد ڈالنے سے دھان کی فی ایکڑ پیداوار میں قابل قدر اضافہ ہو سکتا ہے۔ کاشت کی لاگت کو کم کرنے کے لئے مذکورہ طریقے سے کھاد ڈالنے کا کام کچھ جاپانی مشینوں سے لیا جا رہا ہے۔ کیمیائی کھوج کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ بیجوں کو پوٹاشیم ہائیڈروجن سلفیٹ وغیرہ کے ہلکے حل میں بھگو دینے سے بھی پیداوار میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

مذکورہ ادارے میں چاول کی فصل کو نقصان پہنچانے والی بیماریوں کے بارے میں بھی ضروری تحقیق کی جاتی ہے۔ چاول کی آٹھ ایسی اقسام کا انتخاب کیا گیا ہے جن پر ان بیماریوں کا اثر نہیں ہوتا۔

مختار الدین آرزو

میرزا غالب سے ایک ملاقات

"سیرِ دہلی" شیخ محمد ریاض الدین امجد کا مختصر سا سفرنامہ ہے جس کا دوسرا تاریخی نام "سرورِ ریاض" ہے جس سے ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۱ء) کے اعداد نکلتے ہیں۔ یہ ۶۴ صفحات کی مختصر سی کتاب ہے جو مطبع حیدری واقع آگرہ کٹرہ حاجی محمد حسن مرحوم باہتمام مرزا علی حسین طبع ہوئی۔ ابتدا میں مصنف کی تمہید ہے، آخر میں آغا حسین کی تقریظ، اور حاتم علی مہر، مرزا عنایت علی ماہ، عزیز الدین اکرم تجلّی کے تاریخی قطعات درج ہیں۔

سفر کی غرض و غایت خود مسافر ہی سے سنیے:

"مدت سے دل میں شوق تھا کہ دلّی سے جو متھرا سے قریب ہے کچھ بعید نہیں جائیں اور شہر کو آنکھوں سے کہ قابلِ دید ہے دیکھ آئیں زمانۂ انقلاب سے پہلے ایک میری چھوٹی بھابھی...... مولوی نیاز علی سلمہ، بذریعہ عہدہ سب ڈپٹی انسپکٹرس کے سررشتہ تعلیم میں تھوڑے عرصہ تک بہت لطف کے ساتھ دہلی میں قیام پذیر تھے...... لیکن جب موقع ہاتھ نہ لگا بے سدھ پا بیٹھا رہا، علاوہ اس کے کسی نے یہ خبر سنائی کہ تبدیلی ان کی ضلع رُھتک میں عمل میں آئی۔ بعد اس کے فتنہ و فساد نے سر اٹھایا، مجبور بیٹھا رہا قدم نہ ہلایا..... آخر کار جب آتشِ فتنہ و فساد مندفع ہو کر زمانہ اصلی وضع پر آیا تو دل نے بیٹھے بٹھائے وہی ولولہ اٹھایا اور اس عرصہ میں یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کو افسر نے ان کو دہلی میں مدرس مدرسہ تعلیم المسلمین مقرر فرمایا ہے، الحاصل یہ ارادہ مصمم ہوا کہ اسی ۱۸۶۰ء کی تعطیلِ محرم میں جاؤں اور دلّی دیکھ آؤں، ہرچند یہ بھی خیال آیا کہ اب شہر اُجڑ گیا ہے ویسا نہیں رہا، جانا بے کار ہے، پھر سوچا کہ خدا تصوّر کو سلامت رکھے، ویرانہ کو دیکھیں گے آبادی کا تصوّر کریں گے۔ آدمی کم ہو گئے ہوں گے مکانات تو وہی رہے ہوں گے...... الغرض جب یہ قصہ مسلّم ہو چکا تو پھر یہ سوجھی کہ دلّی جاؤ گے کیا کیا لاؤ گے، کسی دن کوئی کہے گا کہ دلّی سے کچھ لائے یا ویسے ہی چلے آئے تو کیا کہو گے اس لئے یہ تجویز ہوئی کہ دلّی میں جو کچھ دیکھوں اور سنوں وہ لکھ کر احباب کی نذر کر دوں، خصوصاً..... مولوی روح اللہ، یہ صدر دیوان اضلاع مغربی و مشرقی کے وکیل ہیں، ان کو بطریق تحفہ اور ہدیہ کے دوں اور کہوں کہ بھئی دلّی سے آئے ہیں اور یہ تحفہ لائے ہیں۔"

مصنّف کے متعلق کوئی اطلاع نہ مل سکی۔ اسی سفرنامے سے جو کچھ معلوم ہو سکا وہ یہ ہے، پورا نام ریاض الدین امجد ہے، معلوم نہیں امجد تخلص ہے یا کیا، غزلوں میں تو ریاض تخلص ملتا ہے، ممکن ہے دونوں تخلص ہوں۔ اصل وطن سندیلہ تھا، قیام متھرا میں تھا، ان کے چھوٹے بھائی مولوی نیاز علی دہلی کے سررشتہ تعلیم میں سب انسپکٹر تھے۔ پھر ۱۸۶۰ء میں مدرس مدرسۂ تعلیم المعلّمین مقرر ہوئے۔ کتاب کی نثر میں بڑی شوخی اور رنگینی ہے۔ خوبصورت لڑکیوں، طوائفوں، کسبیوں کا ذکر بڑے ذوق و شوق، بڑے خلوص اور بے حد دلچسپی سے کرتے ہیں اور صفحے کا صفحہ اس "ذکرِ انور" پر خرچ کر دیتے ہیں۔ راقم کی رائے میں تو اس سفرنامے سے سب سے اچھی روشنی اس بات پر پڑتی ہے کہ ۱۸۶۰ء میں دہلی کی مشہور طوائفیں کون سی تھیں اور ان کا رنگ ڈھنگ طور طریقہ، پوشاک اور وضع قطع کیا تھی۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ سفرنامہ کی ترتیب کے وقت مصنّف شباب کی مستیوں سے سرشار تھا اور عبارت کی رنگینی اور شوخی کی اصل وجہ یہی ہے۔ کتاب میں رواجِ زمانہ کے مطابق اشعار بھی کثرت سے نقل کئے ہیں، یہ زیادہ تر خواجہ وزیر کے ہیں، اس سے ان کی وزیر سے دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے علاوہ مرزا اعظم، ناسخ، خواجہ درد، انیس، آتش، نظیر کے اشعار بھی درج کئے ہیں۔ دہلی میں انھوں نے دس دن قیام کیا، جن جن لوگوں سے ان کی ملاقات ہوئی، ان میں حکیم عبد الرحیم، مولوی قطب الدین، خواجہ علی احمد، میر بادشاہ صاحب منصف سکندرآباد، حافظ عبد الصمد، بدر الدین، علی خاں مہرکن، نقشی قابلِ ذکر ہیں۔

مذکورہ بالا اصحاب کے سوا مصنّف نے جن کا ذکر سب سے زیادہ تفصیل سے کیا ہے وہ مرزا غالب ہیں۔ ان کا ذکر کتاب میں تین مقامات پر آیا ہے۔ دو جگہ ان سے اپنی ملاقات کا حال بیان کیا ہے اور ایک جگہ صرف سرسری سا ذکر ملتا ہے۔

مرزا غالب سے مصنّف کی دو ملاقاتیں انھیں کے گھر پر ہوئی تھیں، شعر و سخن کے چرچے ہو رہے تھے، انھیں ہنستے بولتے، اُٹھتے بیٹھتے دیکھا تھا اور جو کچھ محسوس کیا تھا اُسے ضبطِ تحریر میں لے آئے تھے۔ اب تک جن لوگوں سے مرزا کی ملاقات کا حال معلوم ہوا ہے، اس میں یہ ملاقات اور اس کے اندراجات سب سے قدیم ہیں، اس لئے بہت اہم ہیں۔

اب اس تمہید کے بعد خود مصنّف سے مرزا غالب کی ملاقات کا حال سنیئے:۔

" بیان قلعہ معلیٰ میں جانے کا اور جناب مستغنی عن الالقاب مرزا اسداللہ خاں غالب دام افضالکم کی ملاقات سے لطف اُٹھانے کا۔"

" چھبیسویں جولائی (سنہ ۱۸۶۰ء مطابق ۶ محرم سنہ ۱۲۷۷ھ) کو صبح کو اُٹھا، دہلی کے قلعے میں اکبرآبادی دروازے سے پہنچا، یہاں پہلے چھوٹے چھوٹے کچّے پکّے مکان ہندوستانی طور کے غریبوں نے اور بڑے بڑے انگریزی وضع کے بادشاہ زادوں اور امیروں نے بنائے تھے۔ ہر طرح کا تکلّف تھا، خوب سجا تھا لیکن بہ نظرِ صفائی ان کو سرکار ابد اقتدار نے مسمار کر دیا۔ میدان ہموار کر دیا۔ . . . . وہاں سے کلکتہ دروازہ سے نکل کر سرن داس کے باغیچہ کے نیچے ہو کر نئے پل کے اوپر پہنچا . . . . . بعد اس کے ہوا کھاتے ہوئے بادل پورہ میں گیا، پھر منصور علی خاں کی حویلی میں کہ اب بھی وہاں عمارت وسیع اور مکانات رفیع دروازہ عالیشان مکلف مکان صحن کشادہ صاف گلی کوچہ شفّاف موجود ہیں لیکن آدمی مفقود ہیں، ہوتا ہوا بیگم کے باغ میں آیا۔ یہ باغ بہت آراستہ پیراستہ پایا، اب 'کمپنی باغ' اس کا نام ہے۔ کیف کا مقام ہے . . . . . . ہر طرف آبشاریں رواں ہیں، روشوں کے کناروں پر دوب لگائی ہے اپنی رنگت جمائی ہے۔ غرضکہ آم اور جامن اور مولسری کے پُرانے پُرانے پیڑ تھے اور نیچے درختوں کے گرے ہوئے پھولوں کے ڈھیر تھے۔ خدا بخش نے دو چار سو پھول اُٹھائے، ایک ہار گوندھا تین گجرے بنائے اور تھوڑے سے مرزا نوشاہ کے مکان پر جس کا ذکر آئے گا، گر پڑے، سو وہیں چھوڑ آئے۔ وہاں سے خواص پورہ میں جہاں عوام لوگوں کی بستی تھی اور علی الخصوص میاں نیاز علی نے پہلے پہل یہاں سکونت کی حویلی لی تھی پہونچا، وہاں سے سرائے میں آیا یہاں تین دروازے عالی شان ہیں اور ایک دروازہ ہے اس میں خدا بخش خیّاط کی دوکان ہے۔ اب بھی پانچ چار وہاں بڑے بڑے مکان ہیں، پھر چاندنی چوک میں ہوتا ہوا بلّی ماروں میں ہو کر شیر افگن خاں کی بارہ دری میں جہاں نواب اسداللہ خاں غالب عرف مرزا نوشاہ رہتے تھے، گیا۔ مرزا کی ملاقات سے شرف یاب سعادت ہوا۔ سبحان اللہ ذات جامع الکمالات کے اوصاف خارج از شرح و بیان ہیں۔ بہ سرآمد زمان، دانان شیرازہ صفاہاں ہیں۔ منتخبات روزگار۔ نفیس الطبع قدیم الوضع، عالی وقار، والا تبار، ناخدائے سفینۂ سخن وری، دریکتائے بحرِ معنی پروری آسمان زمین ذی کمالی، نردبان بام نازک خیالی، مجموعہ اوراق خرد مندی، شیرازۂ اجزائے جدید معنی بندی، مہر سپہر بلاغت، اسد بیشۂ فصاحت، رشکِ انوری، روشن طالب، حق تو یہ ہے کہ شعرائے ماضی و حال ہر فن شاعری میں غالب،

قد میانہ نہیں بلکہ دراز، اکبرآباد کے سارے انداز کرتے ہوئے سفید کچھ سیاہ ڈاڑھی کے بال، گورے چٹّے خوب صورت بدرجہ کمال، لدنرالت سهوین بلدہ غنة طالعاً وعنهام فصاحتہ متقاطراً، میاں نیاز علی نے میری طرف اشارہ کیا کہ یہ بھی شاعر

---

۵ مصنّف انقلاب کے چند ہی سال بعد دہلی گئے تھے، وہاں عمارتوں اور اشخاص پر تباہی و اضمحلال کے اثرات بہت گہرے تھے، ایک جگہ اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ " سچ پوچھو تو یہاں ہر ماہ محرم ہے، ہر دم تازہ غم و الم ہے۔ اب بھی قدیم مکانوں میں مجلسیں ہوتی ہیں جیسے حامد علی خاں اور عالیہ بیگم کے یہاں، سو وہاں بے سرو سامانی ہے، بڑی پریشانی ہے، جہاں بڑی تیاری کے علم تھے اب اُن کا نشان بھی نظر نہیں آتا۔ یوسف مرزا اور حسین مرزا کے یہاں افسردگی ہے۔ کسی دن کو محفل قرینے سے ہوتی ہے، وہی بقول جناب فیض مآب اسداللہ خاں کے، ارے بھئی، مرثیہ لکھیں تو کیک کا لکھیں، نوحہ کیجیے تو دو کا کیجیے، جب تمام شہر برباد ہو کر بگڑ جائے تو کیا خاک بن آئے " ص۔ ۴۴

ہیں، اس فن میں کچھ کچھ ماہر ہیں۔ فرمایا کہ کچھ سنائیے، طبع کے جوہر دکھائیے۔ غرضکہ ہیچمداں نے دو غزلیں ایک فارسی دوسری اُردو کی سنائیں، مرزا نے ستائشیں جس کے سزاوار نہ تھا فرمائیں۔

غزل فارسی

شنیدم از صبا مے آید اینک شہسوارِ من — زباں دادم کہ برخیزد بہ تعظیمش غبارِ من

نمی آید صبا اکنوں ز مدّت بر مزارِ من — غبارِ خاطرِ او گشت شاید ایں غبارِ من

گداز اے باغباں ما را گماں دزدی مبر ظالم — کہ گلہا نیستند ایں لختِ دل اندر کنارِ من

بدامادی سخن پرداز آں نو کتخدا ہستم — عروسِ فکر ہر شب مے نشیند در کنارِ من

ریاضؔ از آرزوئے وصلِ آں گل چاک گر دیدم

کہ ایں سودا چو آتش سوخت آخر مشتِ خارِ من

غزل اُردو

پھر وہ آئے گھر میں مجھ ناکام کے — کٹ گئے دن گردشِ ایام کے

وہ اُٹھے پہلو سے ہم بیٹھے رہے — دل کو، سینہ کو، جگر کو تھام کے

لائے ہاتھوں ہاتھ اہلِ کارواں — ورنہ ہم تھے ایک دو ہی گام کے

ہاتھ اُٹھاؤ رہبرو بانِ قافلہ — اور ہیں ہم ایک دو ہی گام کے

عشق جس کو ہے وہی انسان ہے — ورنہ یہ سب آدمی ہیں نام کے

یہ صدائے قیس تھی اور جذبِ شوق — ناقۂ لیلیٰ کو ٹھہرا تھام کے

تپ سے اک فرحت ہے تیرے عشق میں — ولولے ہیں انجرے سرسام کے

خوب لکھی ہے غزل تم نے ریاضؔ

کیوں نہ ہو قابل ہو تم انعام کے

اور اسی غزل میں مرزا کے ایک شعر میں دوسرا اپنا شعر ملا کر چار مصرعوں کا قطعہ بنایا تھا، خیر وہ بھی سنایا تھا: قطعہ

اب نہیں ہیں آپ کے مصرف کے ہم — رات کے دن کے، نہ صبح و شام کے

عشق نے غالبؔ نکمّا کر دیا — ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

جب یہ زبان پر لایا تو مرزا نے برجستہ فرمایا کہ اسے بھی چپ رہو، یوں کہو کہ "ضعف نے غالب نکمّا کر دیا" یا "دہر نے غالب نکمّا کر دیا"۔ عشق کیسا عاشقی کا وہ زمانہ نہ رہا۔ پھر ارشاد کیا کہ ریختی زبان میں اچھے معنی نکالتے ہو خاصے شعر ڈھالتے ہو، الحاصل دلّی کے ثقات، لکھنؤ کے حضرات ہندو مسلمان پیر و جوان بلکہ ایک لڑکا بھی خیرآباد کا رہنے والا آفت کا پرکالہ، مولوی فضل حق کا نواسا سن میں ذرا سی قطبی میر پڑھتا، بات بات پر لڑتا جھگڑتا، حاشیہ نشینانِ بساطِ ادب یعنی اہلِ کمال سب کے سب تھے۔ بعدہٗ مرزا نے تین بند مرثیہ کے اپنی تصنیف کے سنائے، لوگ روئے پیٹے چلّائے، وہ بند میں نے طلب کیے، مرزا نے اپنے دستِ خاص سے لکھ دیئے۔

مرثیہ

ہاں اے نفسِ بادِ سحر شعلہ فشاں ہو — اے دجلۂ خوں چشمِ ملائک سے رواں ہو

اے زمزمۂ قُم لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو — اے ماتمیانِ شہِ معصوم کہاں ہو

بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی

اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تابِ سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو — ماتم میں شہِ دیں کے ہیں، سودا نہیں ہم کو

گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو — گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو

یہ جو مدّت سے بچا ہے

کیا خیمۂ شبیر سے رتبہ میں سوا ہے

کچھ اور بھی عالم نظر آتا ہے جہاں کا — کچھ اور ہی نقشا ہے دل و چشم و زباں کا

کیسا فلک اور مہرِ جہاں تاب کہاں کا — ہوگا دلِ بے تاب کسی سوختہ جاں کا

اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے

گرتا نہیں اس رو سے کہو برق نہیں ہے

(۲)

(دوبارہ حاضر ہونا اسداللہ خاں غالب کی خدمت میں)

یکم اگست سنہ ۱۸۶۰ء (۱۲ محرم سنہ ۱۲۷۷ھ) جناب مستغنی عن الالقاب اسداللہ خاں غالب کے مکان پر آیا۔ انھوں نے اگلے پچھلے آگرے کے باشندوں اور میلوں کا تذکرہ فرمایا۔ فارسی کا دیوان دیوان دکھایا اور میر طالب علی اور میر خیرالدین حسین اور منوّر علی شاہ اور مرزا تقی بیگ کوتوال اور دیگر عمّال کے جلسوں کا جو آگرہ میں گزرے ہیں، جس عہد میں یہ بھی آگرے میں تھے، سنایا۔ دیر تک حاضر رہا اور دل

مرزا خود فرماتے تھے کہ یہ حصّہ دبیر کا ہے وہ مرثیہ گوئی میں فوق لے گیا ہے۔ ہم سے آگے نہ چلا، ناتمام رہ گیا۔ (سیر دہلی: ۲۱-۲۷)

میں یہ کہا کہ کیا خدا کی قدرت ہے۔ زمانہ کہیں جوہر سے خالی نہیں رہتا دو چار اہلِ کمال سب جگہ موجود ہیں۔ زمانِ ماتقدم میں کیسے کیسے فاضل اجل، شاعر بے بدل اس شہر میں ہوتے گئے اور اس خلوت کدے میں سوتے گئے۔ اب صرف مرزا کا دم ہے سو خدا قائم رکھے، اس شہر میں دائم رکھے۔" (سیر دہلی)

اب اس تحریر کے متعلق بعض قابلِ ذکر باتیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

"بیگم کا باغ، اس کا نام ملکہ کا باغ بھی ہے۔ یہ باغ جہاں آرا بیگم نے سنہ ۱۰۶۰ھ میں بنوایا تھا۔ جو چاندنی چوک کے بازار میں گھنٹہ گھر کے سامنے ہے۔ بعد میں میونسپل کمیٹی کے دفاتر یہاں کی عمارتوں میں آ گئے تھے۔ اس لئے لوگ اسے 'کمیٹی باغ' بھی کہتے ہیں۔ تفصیل کے لئے دیکھئے۔ واقعات دار الحکومت دہلی ۲/۲۲۹

شیر افگن کی بارہ دری، ---- محلہ بلی ماراں میں متعدد گلیاں اور حویلیاں ہیں۔ داہنی طرف گلی سوداگران، حویلی حسام الدین حیدر۔ یہیں سے قاسم جان کی گلی کو راستہ جاتا ہے۔ بارہ دری شیر افگن بھی یہیں پر ہے، بارہ دری اب نہیں رہی، گلی اسی نام سے مشہور ہے۔ واقعات ۲/۲۱۰۔ بلی ماراں کے لئے دیکھئے: ۲۳۸

ریاض کی فارسی و اردو کی غزلیں نہایت معمولی ہیں اور اگر واقعی غالب نے ستائش کیا معنی، پوری غزلیں سن بھی لیں تو ان کی مہمان نوازی اور اُن کے اعلیٰ اخلاق کی یہ کھلی دلیل ہے۔

مرزا آخر میں اپنے مصرع 'عشق نے غالب نکما کر دیا' میں عشق کو 'ضعف' سے بدل دیا کرتے تھے، برکات حسن دہلوی کے ساتھ بھی ایسا ہی قصہ ہوا تھا۔

مرزا نے سننے کو غزل تو سن لی لیکن ان دو جملوں میں نہایت خوبصورت تنقید بھی کر دی کہ رعایتِ زبان رعایتِ لفظی، میں اچھے معنی نکالتے ہو خاصے شعر ڈھالتے ہو۔

مرثیہ کے یہ تین بند صفیر بلگرامی نے بھی درج کئے ہیں لیکن ریاض کو تقدم زمان حاصل ہے، اس سے اس مرثیہ کا زمانہ تصنیف سنہ ۱۸۶۵ء یا اس سے پہلے ہو جاتا ہے دبیر کی مرثیہ نگاری اور اس کی فوقیت کا اظہار یہاں بھی موجود ہے۔ حیرت ہے کہ وہ انیس کا نام نہیں لیتے۔ صفیر کے سامنے اگر وہ دبیر کا نام لیتے ہیں تو اس کے تو کچھ وجوہ اور ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہاں تو کسی تاویل کی گنجائش نہیں۔

سنہ ۱۸۶۳ء تک مرزا کا دیوان فارسی صرف ایک ہی بار شائع ہوا تھا۔ اس لئے مرزا نے ریاض احمد کو اپنے دیوان فارسی کی پہلی اشاعت (۱۸۴۵ء) دکھائی ہوگی۔

میر طالب علی، خیر الدین حسین، منور علی شاہ، مرزا تقی بیگ، ان احباب کا اس وقت کچھ پتا نہ چل سکا۔

شاعروں کی تصویر والے ڈاک کے ٹکٹوں کی مقبولیت

مہاتما گاندھی کے یومِ پیدائش کے موقع پر ڈاک کے ٹکٹوں کا ایک سلسلہ جاری کیا گیا تھا جن پر بلند پایہ شاعروں کی تصویریں تھیں اور ان ٹکٹوں کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس موقع پر زیادہ دلچسپی پیدا کرنے کی غرض سے محکمۂ ڈاک اور تار نے 'یومِ اول' کے لفافے اور فولڈر بھی جاری کئے تھے۔

ان فولڈروں (تہہ ہونے والے لفافوں) کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اجراء کے چند گھنٹوں کے اندر اندر تمام ملک میں دس ہزار کے قریب فولڈر فروخت ہو گئے تھے۔ ان کی طباعت بہت دلکش ہے۔ ان کے اوپر کرشن جی اور گوپیوں کی تصویریں چار رنگوں میں چھپی ہوئی ہیں۔ فولڈروں پر ڈاک کے ٹکٹوں کے اندر شاعروں کی تصویریں چھپی ہوئی ہیں۔ اور تصویر کے ساتھ ہی ہر شاعر کی سوانح عمری کا خلاصہ اور بیت بھی چھاپا گیا ہے۔ فولڈر کی قیمت دو روپے ہے۔ چونکہ ان فولڈروں کے لئے عوام کا مطالبہ بڑھ رہا ہے۔ اس لئے محکمۂ ڈاک اور تار نے ان کو دوبارہ چھاپ کر جاری کر دیا ہے۔

سردار جعفری

غزل

(ہند پاک مشاعرے کے موقع پر کہی گئی)

پھر شمیمِ گُل نویدِ جاں فزا لائی ہے آج
میرے گلشن میں بہارِ رفتہ پھر آئی ہے آج

پھر اُٹھا ہے وادیٔ گنگا سے ابرِ نو بہار
سمتِ راوی سے ہوائے مہرباں آئی ہے آج

آج پھر ہے اتّحادِ شیشہ و ساغر کا دَور
محفلِ رنداں میں جشنِ بادہ پیمائی ہے آج

چشمِ ساقی تجھ میں سارا میکدہ آباد ہے
قامتِ رعنا میں مَوجِ مے کی انگڑائی ہے آج

کھُل گئے ہیں اشتیاقِ دید میں آنکھوں کے در
دوستوں کی خانۂ دل میں پذیرائی ہے آج

"آ ملے ہیں سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک"
شور ہے محفل میں دیوانوں کی بن آئی ہے آج

پھر وہی گلیاں وہی اگلا طوافِ کوئے دوست
عشق کو مژدہ کہ پھر سامانِ رُسوائی ہے آج

کون ہے جس سے سنبھالا جائے گا میرا جنوں
خود ہی پائے شوق کو زنجیر پہنائی ہے آج

ڈر رہا ہوں جان و تن کو پھونک ڈالے گی یہ آگ
میرے سینے میں جو ضبطِ غم نے بھڑکائی ہے آج

آج بیباکی میں ہے اہلِ خرد کی مصلحت
سرفروشی ہی میں اہلِ دل کی دانائی ہے آج

مُسکرائے زخمِ دل، ہنسنے لگے سینے کے داغ
رُوحِ استبداد کیسی کیسی شرمائی ہے آج

خونِ ناحق لالۂ و گل بن کے پھوٹا خاک سے
تیشہ زن کے خوں سے دشت و دَر کی زیبائی ہے آج

کہہ دو صیّادوں سے، گلچینوں کو کر دو ہوشیار
فصلِ گُل نے دُور تک زنجیر پھیلائی ہے آج

ہاں یہی ہے روزِ محشر، ہاں یہی روزِ حساب
تیری رُسوائی ہے اب یا میری رُسوائی ہے آج

پھر ہے میناروں پہ رعشہ، پھر ہیں گنبد سرنگوں
پھر نوا شاعر کی ایوانوں سے ٹکرائی ہے آج

آج پھر قدموں پہ میرے جھک رہی ہے کائنات
میرے قبضے میں جہانِ نوکِ دارائی ہے آج

خاک پر جھکتی نہیں افلاک پر رُکتی نہیں
جو نگہ تقدیرِ عالم کی تماشائی ہے آج

ایک ساحل ہے کہ اُبھرا ہے بھنور کی گود سے
ایک کشتی ہے کہ طوفانوں سے ٹکرائی ہے آج

رنگِ مے، حسنِ نگاراں، جشنِ گل، فصلِ بہار
ہند کی رُوحِ جواں شعروں میں کھنچ آئی ہے آج

جل اُٹھا نبضوں میں خوں روشن ہوئے دل میں چراغ
شاعرِ آتش نوا نے آگ برسائی ہے آج

جارج ہیسٹنگز ٹرز

سنگریزے

واٹرلو اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر سات پر زینٹ سے میری خوب گرماگرم بحث ہوئی اور پھر نوبت تُو تُو مَیں مَیں تک جا پہنچی۔ اس منحوس واقعہ کے بعد جو ہم ایک دوسرے سے الگ ہوئے تو پورے پانچ برس کے بعد بالکل اتفاقیہ طور سے ہماری ملاقات ہوئی۔

اس واقعہ کے دو دن بعد ہی وہ رینس چلی گئی اور میں اس کی مخالف سمت میں مشرق کی طرف روانہ ہو گیا۔ خندقوں میں بیٹھے بیٹھے اپنی قسمت کو کوستے ہوئے میں اس کی ایک ایک بات کو لے کر مغزپچی کرتا رہتا۔

ادھر کچھ مدت سے میں دل ہی دل میں زینٹ کے سامنے اپنی شادی کی تجویز رکھنے کے متعلق غور کر رہا تھا اور واٹرلو میں اگر بدقسمتی سے وہ واقعہ پیش نہ آتا تو عین ممکن تھا کہ اب تک یہ مرحلہ طے بھی ہو چکا ہوتا۔ لیکن نہ جانے کس دھن میں میں اس سے اُلجھ پڑا اور نتیجے کے طور پر مجھے ہاتھ ملتے رہ جانا پڑا۔ دو تین روز بعد میں نے بار رسائے سے خط کے ذریعے اس سے پوچھنے کی کوشش بھی کی کہ وہ جو ہم آپس میں جھگڑ پڑے تھے آخر اس کی وجہ کیا تھی؟ کس بنا پر ہم میں جھگڑا ہوا تھا —— یہ بات ہزار کوشش کے باوجود مجھے یاد نہ آ رہی تھی۔ دراصل کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم بھولی ہوئی بات کو جس قدر یاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں ہم اسے اور بھی بھولتے چلے جاتے ہیں۔ ہمیں وہ واقعات کس طرح یاد نہیں آتے' بالکل یہی بات آج میرے ساتھ ہو رہی تھی۔

زینٹ سے میری ہمیشہ کسی نہ کسی بات پر جھڑپ ہو جایا کرتی تھی۔ بچپن میں ہم دونوں سمندر کے کنارے سفید' چمکیلی ریت پر کھیلا کرتے تھے اور تقریباً ہر روز ہم دونوں میں کسی نہ کسی بات پر جھگڑا ہو جاتا تھا۔ اکثر ان جھگڑوں کی وجہ اتنی معمولی ہوتی تھی کہ کم از کم مجھے تو بعد ازاں کچھ بھی یاد نہ رہتا تھا۔ اور اس حالت میں مجھے اپنے اوپر ہی جھنجلاہٹ ہوتی تھی لیکن پھر بھی جھگڑے کے بعد کون شکست مانے' یہ مسئلہ ہمارے لئے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ اگرچہ اس وقت ہم بچے تھے لیکن پھر بھی ہم میں خود پسندی کا مادہ بدرجہ اتم موجود تھا اور یہی وجہ تھی کہ آخر میں ہمیں صلح کی ایک نئی ترکیب ڈھونڈنا پڑی۔ اس سلسلہ میں ہم دونوں نے وعدہ بھی کر لیا کہ دونوں میں سے جو بھی صلح کرنا چاہتا وہ چپ چاپ دوسرے کے ہاتھ میں دو چھوٹے چھوٹے سنگریزے رکھ دیتا۔ بس دونوں میں صلح ہو جاتی۔ خواہ مخواہ صفائیاں پیش کرنے کے بجائے صلح کا یہ طریقہ بلاشبہ سب سے اچھا تھا۔

لیکن بچپن کی معصومیت عمر کے ساتھ ہی غائب ہو جاتی ہے اور شاید یہی وجہ تھی کہ زینٹ نے میرے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا۔ میں بھی مسلسل جنگی حالات کی وجہ سے سب کچھ بھول گیا۔

جنگ ختم ہوئی۔ دوسرے خوش نصیب لوگوں کی طرح میں بھی میدان جنگ سے صحیح و سلامت لوٹ آیا۔ دورانِ جنگ کے ان پانچ سالوں مجھے کسی بھی حادثہ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ شاید خدا کی خاص نظرِ عنایت تھی مجھ پر! لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اب میں پہلے والا جارج نہیں رہ گیا تھا۔ کافی تبدیلی آ چکی تھی مجھ میں۔

میدانِ جنگ سے گھر لوٹنے کے بعد ملازمت کی تلاش کرنے کے بجائے میں نے "گر بچویٹی" کی ساری رقم خرچ کر ڈالی۔ لیکن جونہی وہ رقم ختم ہوئی ملازمت کا خیال مجھے بے طرح ستانے لگا۔ مصیبت تو یہ تھی کہ مجھے کسی قسم کا کوئی ہنر نہ آتا تھا۔ اور نہ ہی کسی طرح کے روزگار سے واقفیت تھی۔ ایک پبلک ہائی اسکول میں میں نے تھوڑی بہت تعلیم حاصل کی تھی لیکن زمانۂ امن میں میری اس تعلیم کی قدر کرنے کے لئے دنیا تیار نہ تھی۔ میرے تنہا رشتہ دار میرے چچا کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا اور میرے لئے جو ایک بنگلہ وہ چھوڑ گئے تھے وہ بھی بدقسمتی سے دورانِ جنگ میں بمباری سے تباہ ہو چکا تھا۔

آخر میں دوسرے امیدواروں کی طرح مَیں بھی اخباروں میں "ضرورت ہے"

کا کالم دیکھنے لگا۔ یوں تو ایک متوسط طبقے کے ایک باعزت گھرانے میں پیدا ہونے
کی وجہ سے کوئی چھوٹی موٹی ملازمت کرنے میں مجھے ندامت ہونی چاہیئے تھی لیکن
جنگ کے بعد کے ناساعد حالات نے میرے اس طرح کے عام احساسات کو بالکل
ختم کر دیا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ میں نے دل ہی دل میں تہیّہ کر لیا کہ ملازمت
چاہے جیسی بھی ہو، اگر اس میں ایمان کی گنجائش ہوتی تو میں اسے ضرور قبول
کر لوں گا۔

لیکن جوں جوں میری بینک کی پونجی کم ہوتی گئی میرے خیالات میں بھی
تبدیلی آتی گئی۔ آہستہ آہستہ دل میں یہ خیال آنے لگا کہ ملازمت کا ایمان سے
کوئی تعلق نہیں ہے۔ جب ساری دنیا ہی بے ایمان ہے تو تنہا میرے ایمان دار
ہونے سے کیا ہو سکتا ہے؟ اسی طرح کے ان گنت خیالات اب میرے دل میں
اٹھنے لگے تھے۔

آخر کار ایک دن میرے پاس کل سات پونڈ آٹھ شلنگ باقی رہ گئے
تھے۔ اسی دن ایک اخبار کے اشتہار نے میری توجہ اپنی طرف کھینچی۔ لکھا تھا۔

"ضرورت ہے ایک ہوشیار 'پارلرمین' کی جو موٹر بھی چلا سکتا ہو۔ چھوٹے
موٹے ضروری کام بھی اسے کرنے ہوں گے۔ تنخواہ بھرپور"۔

آخر میں مشتہر کا نام اور پتہ درج تھا۔ میرے پاس کوئی خاص سامان
تو تھا نہیں۔ فوراً ایک چھوٹے سے بیگ میں ضروری سامان رکھ کر میں
بس اسٹینڈ کی طرف چل دیا۔ میں ابھی تھوڑی دور ہی گیا ہوں گا کہ یکایک
میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ بغیر پہلے سے اطلاع دئے یا درخواست بھیجے
اس طرح کسی کے ہاں جانا مناسب نہیں ہے۔ ممکن ہے انہوں نے اب تک
کسی امیدوار کو منتخب کر لیا ہو۔ اگر یہ بات ہوئی تو پھر بھلا وہ مجھے سفر خرچ
کیا دیں گے؟ لیکن اب اس مسئلہ پر زیادہ غور لاحاصل تھا کیونکہ میں اپنا
سفر شروع کر چکا تھا۔

ان خیالات میں ڈوبتا ابھرتا چلا جا رہا تھا کہ بس کنڈکٹر نے ایک
گلابی رنگ کے بنگلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا — "یہی ہے وہ
بنگلہ جہاں آپ جانا چاہتے ہیں"۔

اس کے بعد بس چلی گئی اور اپنی حماقت پر دل ہی دل میں شرمندگی
محسوس کرتے ہوئے میں اس بنگلہ کی طرف بڑھا۔

میں یہ سوچتے ہوئے آگے بڑھتا جا رہا تھا کہ وہ ضرور مجھ سے تجربے
اور سرٹیفیکٹوں کے بارے میں پوچھیں گے۔ بد قسمتی سے مجھے کسی بات کا تجربہ
نہیں تھا۔ اپنے شناختی کارڈ اور ایک اسکول کے سرٹیفیکٹ کے علاوہ میں
اور کچھ بھی پیش کرنے سے معذور تھا۔ وہ بنگلہ قریب آتا جا رہا تھا۔ ایک
خیال آتا کہ حماقت کی انتہا ہو گئی اب اور آگے مت جاؤ لیکن پھر فوراً دوسرا خیال
آتا کہ اتنی دور آ کر بھی اگر تم بغیر کوشش کئے لوٹ جاؤ گے تو دنیا تمہیں بیوقوف
ہی کہے گی۔ آخر میں اسی فیصلہ پر پہنچا کہ جو کچھ ہونا ہوگا وہ تو ہوگا ہی۔
کم از کم کوشش تو کرنی ہی چاہئے ورنہ شاید بعد میں پچھتانا پڑے۔

دروازے پر پہنچ کر میں نے گھنٹی بجائی۔

تقریباً ساٹھ برس کی عمر کے ایک بھاری بھرکم شخص نے دروازہ کھولا
اس کی سفید، بارعب، نوکیلی مونچھیں اور چمکتی ہوئی چکنی چاند سے میں کافی متاثر
ہوا —— بڑے عجز کے ساتھ میں نے پوچھا — "جناب میں پارلرمین کی
ملازمت کے سلسلہ میں حاضر ہوا ہوں۔ اگر کسی کا تقرر نہ ہوا ہو تو ...."

میری طرف لمحہ بھر تک دیکھنے کے بعد اس نے کہا "اندر آ جایئے مجھے
میجر جنرل کرکس کہتے ہیں" لفظ 'میجر جنرل' سنتے ہی میں ایک دم چونک کر اٹنشن
ہو گیا لیکن پھر جلدی ہی میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اب میں سپاہی نہیں
تھا۔ لحظہ بھر کے لئے میں کپکپا اٹھا۔

ان کے پیچھے پیچھے میں ایک چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں پہنچا۔
آرام کرسی پر پڑی ہوئی مسز کرکس میری طرف دیکھنے لگیں۔ میں کس غرض سے
آیا ہوں، یہ بات میجر صاحب سے معلوم ہوتے ہی بڑے منہ بھرے لہجے میں
انہوں نے پوچھا "کیا نام ہے تمہارا"؟

"جارج ہیتھ وام"! میں نے کہا۔

جنرل صاحب بڑی تیکھی نظر سے میری طرف دیکھنے لگے۔

"پچھلے چھ برس تک میں ایک سپاہی تھا" ان کی ان نظروں کی تاب
نہ لا کر میں جلدی سے کہہ گیا۔

"سپاہی تھے تم؟ کہاں"؟

"برما میں جناب"!

"اچھا کیا تم موٹر کار چلا سکتے ہو"؟

"جی ہاں، اچھی طرح"

"لیکن پارلرمین کا کام تو ابھی تمہیں سیکھنا ہی ہوگا"؟

"جی ہاں"

"بیٹھئے" مسز کریکس بولیں — "ریتم کو پانچ منٹ تک دوسرے کمرے میں بیٹھنے دیجئے۔ تب تک ہم اس سلسلے میں کچھ طے کر لیں گے"۔

دوسرے کمرے میں میرے لئے جنرل صاحب نے ایک کرسی سرکا دی اور ڈرائنگ روم کی طرف لوٹتے ہوئے انہوں نے کہا — "تمہیں زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑے گا"۔

میں ابھی موجودہ حالات پر غور کر ہی رہا تھا کہ یکایک میرے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ میرے متعلق ان دونوں کی گفتگو صاف سُنائی دے رہی تھی مسز کریکس کہہ رہی تھیں — "اس شخص کے متعلق جب ہم کچھ بھی نہیں جانتے تو اسے انکار ہی کیوں نہ کر دیں۔

اس پر جنرل صاحب کی آواز سُنائی دی — "میری رائے میں محکمۂ فوج سے پوشیدہ طور پر اس کے بارے میں پوچھا جائے"۔

"دیکھنے کو تو کسی مہذب گھرانے کا معلوم ہوتا ہے"۔

"لیکن اس میں حرج ہی کیا ہے؟ پارلرمین کی ملازمت کے لئے صرف غیر مہذب لوگ ہی درخواست دیں، ایسا تو کوئی قانون نہیں ہے"۔

"لیکن پیارے اس نے تنخواہ کے متعلق تو ہم سے کچھ کہا ہی نہیں کیا ایک پارلرمین کے متعلق یہ بات انوکھی نہیں ہے"؟

"ممکن ہے! لیکن مہذب ہونے کی وجہ سے یہ بالکل قدرتی امر بھی ہے۔ خیر یہ تو بتاؤ۔ ہمیں اشتہار دئے اتنے دن ہو گئے، تمہارے پاس اب تک کل کتنی درخواستیں آئی ہیں۔ یہی پہلا امیدوار ہے نا؟

لیکن اصل میں اگر وہ کسی مہذب گھرانے کا ہی ہوا تو اس سے کام لینے میں ہمیں بہت دقتیں ہوں گی"۔

اس کی تم کوئی پرواہ نہ کرو پیاری، ایک بار میرا ویٹ مین بھی اسی طرح مہذب گھرانے کا ایک فرد تھا۔ اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے"۔

یہ سب سُنتے ہوئے میں ہر لحہ ایک عجیب اُلجھن میں گرفتار ہوتا جا رہا تھا۔ ایک طرف چوری چوری ان کی باتیں سننے میں مجھے ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی اور دوسری طرف ان کے پاس جا کر صاف لفظوں میں یہ سب کہنے کی مجھ میں ہمت نہ ہو رہی تھی۔ میں عجیب مخمصے میں گرفتار تھا لیکن جنرل صاحب اور ان کی بیوی کو اس کا احساس تک نہ تھا۔

مسز کریکس کہہ رہی تھیں — یہ بھی ایک مصیبت ہو گی کہ اُسے شروع سے سب کچھ سکھانا پڑے گا"۔

"مانتا ہوں، لیکن پھر بھی ایک بناوٹی پارلرمین کی بہ نسبت یہ نوآموز کہیں بہتر رہے گا" جنرل صاحب میری حمایت کر رہے تھے۔

"اور اگر وہ سچ مچ کسی مہذب گھرانے کا ہوا تو مارتھا کے ساتھ باورچی خانے میں بیٹھنے سے تو اس کی نانی مر جائے گی"۔ ٹھیک اسی وقت میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ یہ حالت اب ناقابل برداشت تھی۔ جنرل صاحب بڑی سنجیدگی سے بولے "اندر آجاؤ"

"جناب معاف کیجئے گا لیکن آپ مجھے کسی دوسرے کمرے میں بٹھا دیں۔ یہاں اس کمرے میں مجھے آپ کی تمام باتیں صاف صاف سُنائی دے رہی ہیں"۔

لحہ بھر کے لئے جنرل صاحب میری طرف دیکھتے رہے۔ پھر توپ دغنے کے سے گرج دار لہجے میں بولے۔ "بس پیاری! یہی پارلرمین ٹھیک رہے گا دیکھو ریتم۔ تمہیں ہر ہفتے چار پونڈ ملا کریں گے۔ کوئی اعتراض تو نہیں تمہیں؟ اور ہاں تمہیں اپنا سامان بھی تو لانا ہو گا"۔

"بڑے انکسار کے ساتھ میں نے انہیں بتایا کہ میں پوری طرح طیار ہو کر آیا ہوں"۔

"تب وہ بولے — پورے رجائیت پسند معلوم ہوتے ہو! خیر ٹھیک ہے"

اس طرح میری پارلرمین کی ملازمت شروع ہو گئی۔ میاں بیوی بہت اچھے تھے۔ پارلرمین کا کام میں نے بہت جلد سیکھ لیا۔ کبھی کبھی مجھ سے غلطی بھی ہو جاتی لیکن جنرل صاحب اور ان کی بیوی صرف مسکرا کر ٹال جاتے۔ اب وہ مجھے ریتم کے بجائے جارج کہنے لگے تھے لیکن پھر بھی میں ان کے لئے پارلرمین سے زیادہ اور کچھ نہ تھا۔

رات کے ڈنر سے فارغ ہو کر میں سنیما یا ناٹک دیکھنے چلا جاتا یا باورچی خانہ میں بیٹھ کر مارتھا سے گپ شپ کرتا رہتا۔ یہی میرا معمول تھا۔

مارتھا اس خاندان کی ایک پرانی خادمہ تھی۔ کسی زمانہ میں وہ بہت اچھا کھانا پکاتی تھی لیکن اب اس کا کہنا تھا کہ اس راشننگ کے ناپ تول کے زمانہ میں تو معمولی کھانا بنانا بھی آسان کام نہیں ہوتا۔ اچھا کھانا کیسے

بن سکتا ہے؟ یہ سب ہوتے ہوتے بھی جہاں تک اس سے ممکن تھا وہ اچھا کھانا ہی بناتی تھی۔ اس کی عمر ساٹھ پینسٹھ کے قریب ہو گی۔ میدان جنگ سے لوٹا ہوا سپاہی ہونے کی وجہ سے میں اس کی نظر میں ایک قابل احترام ہستی تھا۔ وقت ملنے پر ہم دونوں شطرنج کھیلتے۔ ایک بار میں نے اسے سینما دکھانے کا بھی گناہ کیا تھا۔ ہالی ووڈ کی کوئی عشقیہ فلم تھی۔ بھلا اس عمر میں اسے عشق کس طرح پسند آسکتا تھا۔ وہ مجھ پر بے طرح خفا ہوئی اور بولی "کس قدر بیہودہ فلم ہے یہ! حکومت کو ایسی فلموں پر پابندی لگا دینی چاہیئے۔" اور وہ غصہ میں سینما گھر سے اٹھ کر چلی آئی تھی۔ اس واقعہ کے بعد وہ پھر کبھی میرے ساتھ سینما دیکھنے کے لئے رضامند نہیں ہوئی۔

مطلب یہ ہے کہ کریکس خاندان میں میرے دن بڑے مزے سے گزر رہے تھے۔ مارتھا سے میں کافی گھل مل گیا تھا۔ چھوٹے بچے کی طرح وہ مجھ سے پیار کرتی تھی۔ دوپہر کو کبھی کبھی میں کار لے کر جنرل صاحب کو گالف لنکس پر پہنچا آتا۔

ایک دن مسز کریکس نے مجھ سے کہا ــــ جارج آج رات کو ہمارے یہاں دو مہمان آنے والے ہیں۔ کھانا وہ یہیں کھائیں گے۔ تم ڈنر اور ڈرنکس کا انتظام کر لینا۔"

ٹھیک سات بجنے میں بیس منٹ پر گھنٹی بجی۔ میں مہمانوں کے خیر مقدم کے لئے آگے بڑھا۔ ان کے ساتھ ڈرائنگ روم کی روشنی میں پہنچتے ہی میرے تعجب کی انتہا نہ رہی کیونکہ آنے والے خوبصورت نوجوان کے ساتھ میری زینٹ تھی۔ شاید اس نے مجھے پہچانا نہیں تھا۔ برما میں پانچ برس گزرنے کی وجہ سے شاید مجھ میں تبدیلی آگئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے ان سے تعارف کی درخواست کی۔

"مس ریڈر" زینٹ نے کہا۔

"مسٹر تھارپ" نوجوان بولا۔ تب جا کر کہیں مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ میرے منہ سے ایک گہرا سانس نکل گیا گویا میرے سر پر سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔ ان کے منہ سے مسز اینڈ مسٹر تھارپ سن کر میں ان کے ساتھ کس طرح پیش آتا، اس کا میں آج بھی تصور نہیں کر سکتا۔ خیر ان کے جواب سے میری پریشانی کچھ دور ہوئی۔

"پیاری زینٹ! میں سوچ رہا تھا کہ میں اسے بھول گیا ہوں لیکن میں اسے بھولا نہیں تھا۔ وہ مجھے پہچان نہیں سکی۔ یہ سوچ کر میں اس وقت خدا کا لاکھ لاکھ شکر بجا لایا۔ مہمانوں کو اندر بٹھلا کر میں نے مسز کریکس کو ان کی آمد کی اطلاع دے دی۔

باورچی خانہ میں لوٹ کر میں نے اپنے ماتھے پر ہاتھ لگا کر دیکھا۔ ماتھا پسینے سے تر تھا۔ دل بڑے زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں ایک عجیب و غریب قسم کا ارتعاش محسوس کر رہا تھا۔ رہ رہ کر مجھے اس بات کا ڈر محسوس ہو رہا تھا کہ آج کی ان غیر متوقع حالات سے میں سے میں کس طرح صحیح و سلامت نکل سکوں گا؟ زینٹ اگر مجھے پہچان لے تو؟ ممکن ہے کہ وہ پہلی نظر میں پہچان نہ سکی ہو لیکن شاید میری باتوں اور میرے انداز گفتگو سے بھانڈہ پھوٹے بغیر نہ رہے گا۔ وہ ضرور ہی مجھے پہچان لے گی۔ میں نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا لیکن انسان اپنے میں ہونے والی تبدیلی کو نہیں دیکھ سکتا۔

ٹرے میں سامان رکھ کر میں ڈرائنگ روم کی طرف مڑا۔ اس وقت مجھے اپنے بچاؤ کی ایک ہی صورت نظر آئی اور وہ یہ کہ جنرل صاحب اور مسز کریکس مجھے جارج کہتے تھے، ریتم نہیں۔ اور جارج بے شمار ہو سکتے ہیں۔ اس طرح خیالات میں الجھا ہوا میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔

"شکریہ جارج" جنرل صاحب نے کہا ــــ ٹرے یہاں رکھ دو۔ باقی سب ہم کر لیں گے"۔

اس طرح میرا کام اور بھی آسان ہو گیا ہے۔

مسز کریکس سے گفتگو میں مصروف رہنے کے باعث زینٹ کا دھیان میری طرف نہیں تھا۔ اس سے مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ ہمت باندھ کر میں اس کے ساتھ آئے ہوئے اس نوجوان کی طرف دیکھنے لگا۔

زینٹ سے اس کا کیسے تعارف ہوا؟ کہیں دونوں شادی کا فیصلہ کرنے کے بعد یہاں نہ آئے ہوں؟ اس طرح کے لاتعداد شکوک مجھے پریشان کرنے لگے۔ کسی طرح میں اپنے آپ کو سمجھا سکوں، میں نے سوچا۔ اگر انہوں نے شادی کی بات طے بھی کر لی ہو تو میری بلا سے۔ بھلا مجھے کیا پڑی ہے؟ میں تو صرف ایک معمولی ملازم ہوں۔ مجھے ان کے بارے میں کچھ سوچنے کا کیا حق ہے؟ پھر بھی اس وقت میرا دماغ سن ہوا جا رہا تھا۔

باورچی خانے میں داخل ہوتے ہی مجھے مارتھا کے یہ الفاظ سنائی دئے ــــ "سوپ تیار ہے جارج"۔

دوسرا ٹرے لے کر میں ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا۔ مجھے رہ رہ کر ڈر لگ رہا تھا کہ اب کی بار زینٹ مجھے ضرور پہچان لے گی اور کہے گی "کتنی تبدیلی آ گئی ہے جارج تم میں! میں تو سچ مچ تمہیں پہچان ہی نہیں سکی" اور نہ جانے کیا کیا

کہہ گئی وہ! ان باتوں کے متعلق دل ہی دل میں غور کرتے ہوئے میں نے آہستہ سے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا، اور کھانا تیار ہو جانے کی اطلاع دی۔

ڈرائنگ روم میں جب سب لوگ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے تو میں زینٹ کے سوپ کا پیالہ رکھنے کے لئے جھکا۔ مجھے ایک جانی پہچانی خوشبو کا احساس ہوا زینٹ آج بھی وہی عطر لگا کر آئی تھی۔ عطر کی بھینی بھینی خوشبو مجھے بے چین کرنے لگی۔

کھانا کھاتے وقت ان کی گفتگو سے مجھے معلوم ہوا کہ زینٹ کے ساتھ آیا ہوا نوجوان جنرل صاحب کا بھتیجا تھا۔ اور جنرل صاحب اس سے چنداں خوش نہیں تھے اور زینٹ اب بھی اپنی خالہ ہی کے یہاں رہتی تھی۔

کھانا کھا کر جب وہ لوگ ڈرائنگ روم میں چلے گئے تو میں کافی تیار کرنے لگا۔ زینٹ کہہ رہی تھی — "آپ خوش قسمت ہیں جو آج کل کے حالات میں بھی آپ کو پارلر مین مل گیا ہے۔ کیسا آدمی ہے؟ معلوم تو اچھا ہوتا ہے"۔

"ابھی تجربہ نہیں ہے بیچارے کو، لیکن پھر بھی ہے سینکڑوں میں ایک بہت اچھا آدمی مل گیا ہے" — مسز کریکس نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

پینے کو کافی رکھ کر جب میں کچن میں داخل ہوا تو میری عقل کچھ کام نہ کر رہی تھی۔ خود کو دھوکے میں رکھنے سے اب کوئی فائدہ نہ تھا۔ اب میں اس بات کو بخوبی سمجھ گیا تھا کہ میں اب بھی پہلے کی طرح زینٹ کے عشق میں گرفتار تھا۔

مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے مجھے پہچانا کیوں نہیں میرا جانا پہچانا لہجہ بھی وہ بھول گئی تھی۔ رہ رہ کر مجھے صرف اسی بات پر تعجب ہو رہا تھا کہ میں پاگل کیوں نہیں ہو گیا۔ میرے ہاتھ سے کوئی نقصان کیوں نہیں ہوا؟

اپنی اس ملازمت سے میں بالکل مطمئن تھا کیونکہ زینٹ سے قطع تعلق کے بعد میری تمام آرزوئیں خاک میں مل گئی تھیں۔ زینٹ کس وجہ سے مجھ سے روٹھ کر چلی گئی تھی، یہ مجھے آج تک معلوم نہ ہو سکا تھا۔ لیکن اب اس سے کچھ حاصل نہ تھا۔ میرا تو اب نظریہ یہ تھا کہ اگر خدا نے انسان کو قوت یادداشت نہ دی ہوتی تو وہ بہت خوش و خرم رہتا۔

"اوہو! مارتھا، کیا تم شطرنج کھیلنا چاہتی ہو؟"

شطرنج کھیلے بغیر مارتھا کو نیند نہ آتی تھی۔ اس کے بے حد اصرار کی وجہ سے میں شطرنج کھیلنے کے لئے تیار ہو گیا اور آج پہلی بار مارتھا نے مجھے مات دی۔

"دیکھو جارج! تم تو کہتے تھے کہ میں عمر بھر نہیں مات نہ دے سکوں گی۔ مجھے شطرنج کھیلنا ہی نہیں آتا" اور اپنی جیت سے خوش ہو کر وہ سونے کے لئے چلی گئی۔

مہمانوں کے رخصت ہونے کا وقت آ گیا۔

ہال کمرے میں جا کر میں نے زینٹ کا کھانے کے وقت اتار کر رکھا ہوا کوٹ اٹھا کر اس کا کالر چوم لیا۔ اس حالت میں اگر کوئی مجھے دیکھتا تو نہ جانے اپنے دل میں کیا سوچتا۔

جنرل صاحب اور مسز کریکس کو خدا حافظ کہتے ہوئے زینٹ بولی "آپ کے ساتھ میرا وقت بہت اچھا گزرا ہے"۔

"ہاں بہت لطف آیا۔ میں تو آج بے حد خوش ہوں" نوجوان نے کہا۔

نہ جانے کیوں مجھے اس سے حسد ہونے لگا۔ زینٹ کو کوٹ پہناتے ہوئے میرا دل جیسے رو رو کر مجھ سے کہہ رہا تھا کہ بس اپنی زینٹ کی یہ آخری زیارت ہی سمجھو۔

زینٹ کو آج اپنی آسٹن کار میں پہنچانا میری قسمت میں نہیں تھا میں نے بڑے احترام سے سامنے کا پھاٹک کھول دیا اور وہ دونوں باہر نکلے۔

کار میں بیٹھتے ہوئے زینٹ کا رومال ہاتھ سے نیچے گر پڑا۔ نوجوان کار اسٹارٹ کرنے میں مصروف تھا اس لئے اس کا دھیان ادھر نہیں گیا۔ میں نے لپک کر رومال اٹھا کر اسے دے دیا۔ اپنی پیاری زینٹ کی یہ معمولی سی خدمت اس وقت مجھے بہت بھلی ہوئی۔

"شکریہ!" اس نے کہا اور جیسے مجھے کچھ دینے کے لئے اپنا ہاتھ باہر نکالا۔

اچانک اس وقت مجھے یاد آیا کہ میں ایک ملازم ہوں، پارلر مین ہوں۔

میں نے آہستہ سے ہاتھ آگے بڑھا دیا اور اس نے میرے ہاتھ میں کچھ رکھ دیا۔ مارے شرم کے میں زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ خوش قسمتی سے وہاں اندھیرا تھا ورنہ جنرل صاحب سوچتے کہ ایک ادنٰے ملازم کو انعام لیتے ہوئے اس طرح شرمانے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔

نوجوان نے زینٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا — "بٹلر کو ٹپ دے رہی ہو زینٹ"!

ہاں! ٹپ دے کر میں نے کوئی گناہ تو نہیں کیا؟ زینٹ نے شیریں لہجے میں کہا۔

کار اسٹارٹ ہوئی اور میں نے اپنی مٹھی کو کھول کر دیکھا۔ میرے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ میرے ہاتھ میں دو چھوٹے چھوٹے سنگریزے تھے۔

(مترجمہ۔ پرکاش پنڈت)

تنویر احمد علوی

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ اور خطوطِ غالب

غالب کی زندگی سرتاسر ایک ڈرامائی ٹریجڈی ہے، اور اس ٹریجڈی کا سب سے زیادہ الم انگیز حصہ حیاتِ غالب کا وہ باب ہے جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے متعلق ہے۔

غالب آگرے میں پیدا ہوئے تھے۔ مگر اُن کی عمر کا زیادہ تر حصہ دہلی میں گذرا۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ڈراما مرحوم دہلی کی دم توڑتی ہوئی تہذیب کے اسٹیج پر اور لال قلعے کی مٹتی ہوئی عظمت کے سائے میں کھیلا گیا۔ غالب جب اکبرآباد (آگرہ) کو چھوڑ کر جہاں آباد (دلی) آئے تو اس گُل کدۂ دیرینہ میں خزاں آ چکی تھی۔ اکبر شاہ ثانی لال قلعہ میں تخت نشین تھے۔ مگر دورِ اکبری کا جاہ و جلال اور آلِ بابر کی عظمت اور سطوت گذرے ہوئے وقت کی کہانی تھی۔ تاہم مغل عہد کے اس دور آخر میں دہلی کے اندر علما و فضلا شعرا اور ادبا کا ایک ایسا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا جسے دیکھ کر دربارِ اکبری کے نورتنوں اور عہدِ شاہجہاں کے جواہر پاروں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ آگرے کو چھوڑ کر غالب کا ہمیشہ کے لئے دہلی میں سکونت اختیار کر لینا سسرال کی رنگ رلیوں ہی کی وجہ سے نہیں بلکہ ان مغتنم انسانوں کے درمیان رہنے اور ان کی صحبت سے لطف اُٹھانے کے لئے بھی تھا، جن کی سوسائٹی کو یقیناً غالب ایسے قدر شناس و نکتہ سنج انسان کی طبیعت نے نعمتِ غیر مترقبہ سمجھا ہو گا۔ مگر اس نعمتِ غیر مترقبہ سے قطع نظر شادی کے بعد کے کچھ ابتدائی ایام کو چھوڑ کر دلی کی زندگی میں غالب کو کبھی دلی سکون اور اطمینان نصیب نہیں ہوا۔ وہ رئیس زادے تھے اور دلی کے رئیس زادوں میں رہ کر اپنی زندگی کو اپنی خاندانی عزت و وقار کے شایانِ شان گزارنا چاہتے تھے۔ مگر آمدنی کفایت نہ کرتی تھی اور اس کے نتیجے میں وہ ہمیشہ مقروض رہتے تھے۔ علاوہ ازیں اُن کا بہت سا وقت اور روپیہ اپنی خاندانی پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں دوڑ دھوپ اور بلادِ شرقیہ کے سفر میں ضائع ہو گیا۔ اور جس میں انجام کار اُنھیں بُری طرح ناکامی ہوئی۔ اس طرف سے مایوس ہو کر اُنھوں نے دوسرے راستے اختیار کئے۔ روسائے عہد اور سلاطینِ وقت کے لئے قصیدے اور تہنیت نامے لکھے اور اپنے آپ کو ان کے دامنِ دولت اور دربار سے وابستہ کر لینے کی سعی کی۔ دہلی دربار سے بھی اپنے تعلقات کو بڑھایا۔ لال قلعہ اس وقت کی ادبی انجمن تھی اور غالب بھی کبھی نہ کبھی اور کسی نہ کسی حیلے سے وہاں ضرور جاتے رہے ہوں گے۔ مگر قلعہ سے ان کا باقاعدہ اور مستقل تعلق اس وقت ہوا جب کہ بہادر شاہ ظفر کی جانب سے انہیں خطاب کیا گیا اور پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ کے عوض فارسی زبان میں خاندانِ تیموری کی تاریخ لکھنے کی خدمت ان کے سپرد ہوئی۔ ذوق کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ان کے شاگرد بھی ہو گئے۔ اگرچہ اس وقت بادشاہ کی مالی حالت بہت سقیم تھی تاہم جس حد تک بھی ممکن تھا وہ ان کی عزت فرمائی اور قدر افزائی کرتے رہتے تھے۔ مگر غالب نے ہمیشہ اسے اپنے فن اور اپنی حیثیت سے کم سمجھا اور ناقدرئ زمانہ کے شاکی رہے۔ ویسے بھی وہ قلعہ کے مستقبل کی طرف سے مایوس تھے۔ چنانچہ اپنے خط میں لکھتے ہیں "کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے اسے دوام کہاں کیا معلوم ہے اب کے نہ ہو اور اب کے ہو تو آئندہ نہ ہو"۔ بہر حال جلد ہی وہ وقت بھی آ گیا اور انقلاب کے ایک ہی جھونکے نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی صورت میں بزمِ تیموری کی اس آخری شمع کو بھی گل کر دیا۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

اور اس قیامت کے اندھیرے میں وقت کے بے رحم ہاتھوں نے ہمیشہ کے لئے اس بساط ہی اُلٹ دیا جو اپنی تمام بے رونقی اور بے رنگی کے باوجود غالب کے لئے دامانِ باغبان و کفِ گل فروش سے کم نہ تھی۔

لال قلعے کی بزم کا درہم برہم ہونا غالب کے لئے غیر متوقع نہ سہی تب بھی غدر ان کے لئے کوئی معمولی سیاسی انقلاب نہیں تھا بلکہ اس ماحول کی سرتاسر تباہی اور ان تہذیبی قدروں کی مکمل بربادی تھی جو غالب کو اپنی زندگی

سے زیادہ عزیز تھیں۔

غالب کی زندگی اگرچہ اس طوفانِ مرگ و ممات سے بچ گئی مگر گھر کا وہ تمام اثاثہ و اسباب لُٹ گیا (جو اس وقت ان کے پاس نہیں تھا) اور اسی کے ساتھ آئندہ کی امیدیں بھی منقطع ہوگئیں۔ اس ہنگامے کے دوران میں دلّی صرف چند مہینے باغی سپاہیوں کے ہاتھوں میں رہی اس کے بعد اس پر دوبارہ انگریزی فوجوں کا قبضہ ہوگیا۔ تمام شہر ایک کیمپ اور چھاؤنی بن گیا۔ قدم قدم پر پہرے بیٹھ گئے جگہ جگہ پھانسیاں گڑ گئیں۔ اور اسی کے ساتھ نادر شاہی قتلِ عام اور لُوٹ مار کی خونی تاریخ دہرائی گئی غالب اس وقت جس مکان میں رہ رہے تھے وہ چونکہ خاندانِ شریفی کے مکانات سے متصل تھا اس لیے اس کی حفاظت مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہیوں نے کی۔ غالب نے اس کا ذکر اپنے ایک خط میں اس طرح کیا ہے۔

"مہاراجہ نے صاحبانِ عالیشان سے وعدہ لے لیا تھا کہ بر وقت غارت دہلی یہ لوگ بچے رہیں۔ چنانچہ بعد فتح کے مہاراجہ کے یہاں آکر بیٹھ گئے اور یہ کوچہ محفوظ رہا ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں مبالغہ نہ جاننا امیر غریب سب نکل گئے اور جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے جاگیردار و پنشن دار اور اہلِ حرفہ کوئی بھی نہیں بچا مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے اور باز پُرس و گیر و دار میں مبتلا ہیں"۔

غالب خود بھی قلعہ کے ملازم تھے مگر نئے نہیں پُرانے۔ گزشتہ دس سال سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے کی خدمت پر مامور تھے اور اس دورِ پُر آشوب میں اگرچہ انہوں نے بربنائے مصلحت کسی مجلس میں حصہ نہیں لیا تھا تاہم اشعار کی خدمت برابر بجا لاتے رہے اور اس ہنگامے کے بعد اپنی بے گناہی پر نظر رکھتے ہوئے شہر سے نکل نہیں گئے۔ چنانچہ اپنے اسی خط میں آگے چل کر انہوں نے ان حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے "میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں پائی گئی لہذا طلبی نہیں ہوئی ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں میری کیا حقیقت تھی غرض کہ اپنے گھر میں بیٹھا ہوں دروازہ سے باہر نہیں نکل سکتا"۔

پہلی جنگِ آزادی کے اس طوفان کے فوراً بعد غالب کی نظر اپنے اور انگریزی سرکار کے تعلق پر سب سے پہلے اس لئے پڑی کہ وقت بڑا نازک تھا گناہگاروں کے ساتھ بے گناہ اور مجرموں کے ساتھ معصوم بھی سزا پا رہے تھے جرنیلی بندوبست تھا غالب اس ہنگامے سے تو بچ گئے تھے مگر خطرے سے باہر نہ تھے اور پھر اسبابِ معیشت کے لئے اب سوائے انگریزی سرکار کی پنشن کے کوئی دوسرا سہارا کہیں نظر تک نہ آتا تھا ایک دوسرے خط میں اسی متوقع خطرے کی طرف اشارہ موجود ہے۔

"روپوش ہوں حُکام جانتے ہیں کہ کہاں ہے مگر نہ باز پُرس و دار و گیر میں آیا نہ میں نے اپنی طرف سے قصد ملاقات کیا با ایں ہمہ ایمن بھی نہیں ہوں" یہ چند سطریں بھی اسی سلسلے کی دوسری کڑیاں ہیں۔

یہ عجوہ خانہ کوچی اور گریز پائی اور بے اطمینانی کا گمان آپ کو مجھ پر ہے اور اس کا رنج ہے یہ کسی نے خلاف واقعہ آپ سے کہا ہے میں معہ زن و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزمِ خون کا شناور رہا ہوں نہ دروازے سے باہر قدم رکھا نہ پکڑا گیا نہ نکالا گیا نہ قید ہوا نہ مارا گیا"۔

یہ سب کچھ تھا مگر غالب کا اپنی بے گناہی پر یقین غلط اور آئندہ کے اندیشے بالکل صحیح تھے حکام کی خاموشی بے معنی نہ تھی۔ غالب کے لئے یہ ایک راز تھا جس کو جاننے کے لئے وہ بے چین تھے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کی یہ ذہنی خلفشار اور مالی دشواریاں بڑھتی جا رہی تھیں۔

مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں۔ "نہ جزا نہ سزا نہ نفرین نہ آفرین نہ عدل نہ ظلم نہ لطف نہ قہر"۔ انہیں کو ایک دوسرے خط میں لکھا گیا ہے۔ بوڑھا، ناتواں، مفلس قرضدار کانوں کا بہرہ قسمت کا بے بہرہ زیست سے بیزار مرگ کا امیدوار" آخر حکام کی اس آزردگیٔ غیر سبب کا سبب بھی معلوم ہو گیا اور پتہ چلا کہ انگریزی حکام غالب کو بے قصور و بے خطا نہیں سمجھتے بلکہ باغیوں کا دوست اور ہم نوا گردانتے ہیں۔ اور اپنے خیال کے سبب اور ثبوت کے طور پر ان سکّوں کو پیش کرتے ہیں جو بہادر شاہ کے لئے کہے گئے تھے۔ مگر وہ غالب کے نہیں ذوق کے کہے ہوئے تھے اور ہنگامہ دار و گیر کے زمانے سے بہت پہلے بادشاہ کی اصل تخت نشینی کے وقت پیش کئے گئے تھے۔ غالب نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے "سکّہ کا وار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا یا گراب کس کو کہوں کس سے گواہ لاؤں یہ دونوں سکّے ایک وقت میں کہے گئے ہیں یعنی جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے تو ذوق نے یہ سکّے کہہ کر گزارنے بادشاہ نے پسند کئے اور مولوی محمد باقر نے جو ذوق کے معتقدین میں تھے دلی اردو اخبار میں یہ دونو سکّے چھاپے اب

یہ دونوں تمغے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گزارے ہوئے ثابت ہوئے ہیں نے ہرچند قلمرو ہند میں دہلی اردو اخبار کا یہ پرچہ ڈھونڈا لیکن ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبّہ مجھ پر یہ لگا پنشن بھی گئی اور وہ ریاست کا نام و نشان خلعت و دربار بھی مٹا۔"

غالب کے لیئے خاندانی عزت اور ذاتی ملازمت کا یہ نقصان ناقابل برداشت بن گیا وہ اسے اپنے کیرکٹر پر ایک زبردست دھبّہ سمجھتے ہیں اس کا حال و ملال خود ان کی اپنی زبانی سے سنیئے ___ "سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا اور پورا خلعت جیغہ سرپیچ مالائے مروارید معہ زین رقوم جواہر کے پاتا تھا اب بدنام ہو گیا ہوں اور ایک بہت بڑا دھبّہ لگ گیا ہے"۔

دراصل مرزا کے لیئے یہ خاندانی اعزاز ہی کا سوال ہی نہیں معشیت کے اسباب کا بھی سوال تھا ___ "وہ عزت وہ ربط و ضبط جو ہم رئیس زادوں کا تھا وہ اب کہاں روٹی کا ٹکڑا ہی مل جائے تو غنیمت ہے"۔ ہر وقت غالب کے لئے سخت مصیبت کا وقت تھا زمانہ ان سے برسر امتحان تھا نہ کوئی امید بر آتی تھی نہ کوئی صورت نظر آتی تھی پھر بھی وہ حکام تک رسائی حاصل کرنے اور اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے برابر ہاتھ پیر مارتے رہے۔ دوسروں سے سفارشیں کرائیں خود قصیدے لکھ لکھ کر بھیجے۔ زمانہ دارو گیر اور کچھ بعد کے حالات سے متعلق اپنی ایک نثری تصنیف دستنبو کی طباعت کے وقت چند خاص نسخے تیار کرائے اور ان کی طلائی الواح مرتب کرا کے حکام انگریزی کو بطور تحفہ بھیجیں خود خیام و دربار میں حاضریاں دیں مگر کہیں پرسش نہ ہوتی۔ فریزر نے ملنے سے انکار کر دیا اور کہا جب تم غدر کے دوران میں باغیوں کی خوشامد کیا کرتے تھے تو پھر اب ہم سے کیوں ملنا چاہتے ہو۔ یہ جوابات اس شخص کو سننے پڑے اور اپنی خودداری کی یہ توہین اس انسان نے برداشت کی جو بندگی میں بھی اپنے آپ کو اتنا آزاد اور خودبین رکھنا چاہتا تھا کہ اگر در کعبہ بھی خود اس کی پذیرائی کے لیئے وا نہ ہو تو وہ الٹا پھر آئے۔ آخر حکام کی اس بیزاری و تلخ گفتاری اور اپنی اس ناکامی و نامرادی سے غالب کی طبیعت جھک ہو گئی اور وہ جھنجلا اٹھے ___ "میں نے سکہ نہیں کہا اور اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا یہ گناہ نہیں اگر گناہ بھی ہے تو ایسا سنگین گناہ نہیں کہ ملکۂ معظمہ کا اشتہار بھی اسے نہ مٹا سکے۔

سبحان اللہ گولہ انداز کا گولہ بارود بنانا توپیں لگانا اور بینک گھر اور میگزین لوٹنا تو معاف ہو جائے مگر شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں"۔

اس وقت میں کہ غالب پنشن سے مایوس ہو چکے تھے اور اس کے علاوہ معشیت کے دوسرے تمام راستے بھی بند تھے۔ نواب رامپور نے ان کی بڑی دستگیری کی نہ صرف یہ کہ انہیں ان کے یہاں سے سو روپیہ ماہوار وظیفہ ملنے لگا بلکہ انہیں کی سفارش سے انگریزی حکام کے خیالات غالب کے بارے میں بدلے اور پنشن کے دوبارہ جاری ہونے کی صورت نظر آئی۔

غالب کی زندگی میں سرکاری پنشن کی ضبطی اور واگذاری کا معاملہ ہی ایسا نہ تھا جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے تعلق رکھتا تھا اور جس نے اس کے بعد غالب کی زندگی کو گوناگوں آلام اور مصائب کا شکار بنا دیا تھا بلکہ اس ہنگامے کے نتیجے میں شہر اور اہل شہر کی وہ تباہی اور بربادی بھی تھی جسے ضعیف اور ناتواں غالب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا اور جس نے ان کی زندگی کے ان لمحوں کو موت سے بدتر بنا دیا۔ یہ ہنگامہ ایک ایسا خوفناک زلزلہ تھا جس نے شہر اور اہل شہر پر یکبارگی قیامت صغرا نازل کر کے ہی دم نہیں بلکہ مدت تک اس کے جھٹکے برابر محسوس ہوتے رہے اور ارضی و سماوی آفتیں بھی اس کی تباہی اور بربادی میں اضافہ کرتی رہیں۔ اس مسلسل تباہی و مستقل بربادی کا دردانگیز خاکہ غالب نے اپنے خط میں اس طرح کھینچا ہے ___ "اس شہر پر پانچ لشکروں کا حملہ پے بہ پے ہوا پہلا حملہ باغیوں کا جس میں شہر کا اعتبار لٹا دوسرا خاکیوں کا اس میں جان و مال عزت و ناموس مکان و مکیں و آسمان و زمین اور آثار ہستی سراسر لٹ گئے تیسرا لشکر کال کا جس میں ہزارہا آدمی بھوکے مرے چوتھا لشکر ہیضہ کا جس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا اس میں تاب و طاقت نہ پائی اس لشکر نے اب تک شہر سے کوچ نہیں کیا ہے"۔ اس ہنگامے کے بعد کافی مدت شہر انگریزی فوج کی چھاؤنی بنا رہا اور اہل شہر کو کہیں اور کسی طرح امان نہ تھی پناہ نہ تھی انگریزی حکام ان سے بری طرح اپنی ابتدائی شکست اور شرمندگی کا بدلہ لے رہے تھے غالب نے ان دردناک واقعات کا حال اپنے قلم کو خون دل میں ڈبو ڈبو کر لکھا ہے۔

"ہے ہے! کیوں کر لکھوں کہ حکیم رضی الدین خاں کو ایک خاکی نے گولی ماری اور احمد حسین خاں ان کے بھائی اسی دن مارے گئے۔ طالع یار خاں کے دو بیٹے رخصت لے کر آئے تھے۔ غدر[1] کے سبب نہ جا سکے یہیں رہے بعد فتح دہلی کے

---

[1] افسوس کہ غالب بھی اس جنگ آزادی کے ہنگامے کو 'غدر' کہتے ہیں۔ ع۔م

دونوں بے گناہوں کو پھانسی ملی۔ میر چھوٹم نے بھی پھانسی پائی"۔ حکیم غلام نجف خاں کو لکھا خصوصاً اس فتنہ و آشوب میں تو میرا کوئی جاننے والا نہ بچے گا"۔ یوسف مرزا کے نام خط اور بھی رقت انگیز ہے ۔۔۔ "میرا حال سوائے میرے خدا کے کوئی نہیں جانتا آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتا ہے عقل جاتی رہتی ہے اگر اس ہجومِ غم میں میری قوتِ متفکرہ میں فرق آ گیا ہو تو کیا عجب ہے بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے پوچھو غم کیا ہے غمِ مرگ، غمِ فراق، غمِ رزق، غمِ عزت غمِ مرگ میں قلعۂ نامبارک سے قطع نظر کر کے اہل شہر کو گنتا ہوں مظفر الدولہ میر ناصر الدین، مرزا عاشور بیگ، میرا بھانجہ اس کا بیٹا مرزا احمد انیس برس کا مصطفےٰ خاں اور اس کے دو بیٹے .... کیا میں ان کو عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا .... انہیں کہاں سے لاؤں .... غمِ فراق حسین مرزا یوسف، مرزا میر مہدی، میر سرفراز حسین، میرن صاحب خدا ان کو جیتا رکھے کاش یہ ہوتا جہاں ہوتے خوش رہتے گھر ان کے بے چراغ اور وہ خود آوارہ"۔ سچ تو یہ ہے کہ غالب کو اپنے دوستوں اور عزیزوں کی موت اور مصائب کا غم اپنی تباہی اور بے رونقی سے بھی زیادہ تھا مرزا حاتم علی مہر کو لکھا ہے "کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں اپنی تباہی اور بے رونقی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو غم مجھ کو ہے اس کا حال تو معلوم مگر اس غم کی طرف اشارہ کرتا ہوں کہ انگریز کی قوم میں جوان روسیاہ کالوں کے ہاتھوں سے قتل ہوئے اس میں کوئی میرا امیدگاہ تھا کوئی میرا شفیق تھا کوئی میرا دوست تھا کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد اور ہندوستانیوں میں کچھ عزیز کچھ دوست کچھ معشوق تو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو زندگی اس کی کیونکر نہ دشوار ہو"۔ اس غم مرگ کے بعد غم فراق کا ایک اور منظر دیکھئے ۔۔۔ "وہی میں ہوں وہی بالاخانہ ہے سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے وہ میر سرفراز حسین آئے وہ یوسف مرزا آئے وہ یوسف علی خاں آئے مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا۔ بچھڑے ہوؤں میں کچھ نام گنے ہیں۔ للہ اللہ ہزاروں کا ماتم دار ہوں میں مروں گا تو مجھے کون روئے گا"۔ حقیقت یہ ہے کہ غدر کے بعد غالب کے لئے زندگی کا تمام تر ماحول اور دلّی کے زمین و آسمان کچھ اس طرح بدل گئے کہ خود انہیں یہ احساس ہونے لگا کہ انہیں اپنی زندگی میں دوبارہ جنم لینا پڑا ہے ۔۔۔ "وہ ایک جنم تھا .... بعد مدّت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا .... اور صورت اس جنم کی مثل پہلے جنم کے ہے مگر اب وہ زمانہ نہ وہ اشخاص نہ معاملات نہ وہ اختلاط نہ انبساط"۔ اور اس طرح اس دوسرے جنم میں سوائے اس کے کہ غالب کا سلسلۂ حیات پہلی زندگی سے منقطع نہیں ہوا مگر اور سب کچھ بدل گیا بلکہ درہم برہم ہو گیا۔ غالب نے آلام روزگار کا ہمیشہ مردانہ وار مقابلہ کیا تھا ان میں غم کے لئے برداشت ہی نہیں طلب بھی پائی جاتی تھی۔ واقعہ کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو زندگی انہیں پھر بھی عزیز رہتی تھی اور وہ ہمیشہ تاب لاتے ہی بنے گی غالب کہتے نظر آتے تھے مگر اب زندگی ان سے بُری طرح انتقام لینے پر آمادہ تھی ۔۔۔ "حضرت سچ تو یہ ہے کہ غم ہائے روزگار نے ہم کو گھیر لیا ہے سانس نہیں لے سکتا اتنا تنگ کر دیا ہے۔ وہ گھر کی رونق کو ایک ہنگامہ پر موقوف سمجھتے تھے۔ مگر اس ہنگامہ میں گھر کو وہ آگ لگی کہ جو تھا جل گیا اور جو کچھ رہ گیا تھا وہ جلتا جا رہا تھا وہ تہذیب دم توڑ رہی تھی وہ دلی ختم ہو رہی تھی اور وہ تمام آثار مٹ رہے تھے جن کا نام مغل دور تھا اور جو خود غالب کی زندگی میں سمٹ آئے تھے اور اس کاروانِ رفتہ کا یہ آخری مسافر اس تباہی اور بربادی پر تنہا ماتم سرائی اور مرثیہ خوانی کرنے کے لئے زندہ تھا ۔۔۔ "سال حال جمعہ کے دن ابوظفر سراج الدین بادشاہ قیدِ فرنگ و قیدِ جسم سے آزاد ہوئے"۔ اور ان کی دلی .... "آغا باقر کا امام باڑہ اس سے علاوہ کہ خداوند کا عزا خانہ ہے ایک بنائے قدیم رفیع مشہور اس کے انہدام کا کس کو غم نہ ہوگا .... اس سے بڑھ کر یہ بات کہ گوروں کا بارک بھی شہر میں بنے گا اور قلعہ کے آگے جہاں لال ڈگی ہے ایک میدان نکالا جائے گا۔ آج نثار خاں کے چھتے کے مکان ڈھینے شروع ہو گئے ہیں کیوں میں دلّی کے ویرانہ سے خوش نہ ہوں جب اہلِ شہر ہی نہ رہے تو شہر کو کیا چولھے میں ڈالوں"۔ ایک دوسرے خط میں شہر کی بربادی پر اس طرح ماتم کیا ہے "یہاں شہر ڈھے رہا ہے بڑے بڑے نامی بازار، خاص بازار، اردو بازار، خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا پتہ بھی نہیں کہاں تھے۔ صاحبان امکنہ و دکاکین نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دوکان کہاں۔ برسات بھر مینہ نہیں برسا اب تیشہ و کلند کی طغیانی سے مکان گر گئے .... مصیبت اعظم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہو گیا لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہو گئے پرسوں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا جامع مسجد سے راج گھاٹ تک بے مبالغہ ایک صحرائے لق و دق ہے اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا زندگی گراں ہے اور موت ارزاں"۔

اس طوفانِ بلا اور اس مرگ انبوہ میں اس جشن کا ذکر نہیں جس میں غالب کو بادلِ ناخواستہ حصہ لینا پڑا تھا نہ اس چراغان کا بیان ہے جس میں انہوں نے اپنے خونِ دل اور اشکِ غم کو جلایا تھا۔

بہرحال ان خطوں میں غدر اور بعد از غدر کی کوئی مربوط اور مفصل تاریخ تو نہیں ہے مگر وہ سب کچھ ہے جس کے ذکر سے تاریخ کے صفحات خالی ہیں اور جسے خود غالب نے اپنی بوڑھی اور پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ غالب اس کے بعد بھی زندہ رہے مگر اب انہیں زندہ رہنے کی نہیں مرنے کی تمنا تھی۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے

آسٹریلیا میں بھارتی فن کی نمائش

سڈنی (آسٹریلیا) میں بھارتی آرٹ کی نمائش ۱۵ نومبر کو ختم ہوگئی۔ یہ نمائش ۳ نومبر کو شروع ہوئی تھی اور نئی دہلی کی آل انڈیا فائن آرٹس اینڈ کرافٹس سوسائٹی نے بھارت کی وزارت تعلیم کے اہتمام اس سے متعلقہ تمام انتظامات کئے تھے۔ آسٹریلیا کے اخبارات اور لوگوں نے اسے بہت پسند کیا ہے۔ شری سوشیل سرکار اور شری شوکمار بوس اس نمائش کے لئے بھارت سے تین سو فوٹو اور تصاویر لے کر آسٹریلیا گئے۔ سڈنی مارننگ ہیرلڈ نے لکھا ہے کہ بھارتی فن کی اس نمائش نے بھارت کی آتما کی ترجمانی کی ہے۔ نمائش میں ایک سو سے زاید بھارتی فن کاروں کے نمونے پیش کئے گئے۔

مشہور آسٹریلوی مقالہ نویس مسٹر میچل براؤن نے ۱۱ نومبر کو ایک نشری تقریر میں کہا کہ آسٹریلیا کے ہزارہا باشندوں نے اس نمائش کو دیکھا ہے۔ لوگوں کی یہ دلچسپی اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ نمائش ہر جگہ کامیاب ثابت ہوگی۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ بھارتی فن کی اگلی نمائش ملبورن میں ہوگی۔

سڈنی کی قومی آرٹ گیلری کے صدر بی۔ جے واٹرہاؤس نے کہا ہے کہ اس نمائش میں فن کے جو نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ وہ بھارت کے ماضی، حال و مستقبل کے آئینہ دار ہیں۔

کرنل جے ایم پرنٹس نے ایک نشری تقریر میں کہا ہے کہ اس نمائش کے ذریعہ بھارت کے موجودہ حالات کی تصویر ہمارے سامنے پیش کی گئی ہے۔ دوسرے ملکوں کے ساتھ تہذیبی تعلقات کو مضبوط بنانے کی اہمیت بیان کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ جغرافیائی لحاظ سے آسٹریلیا کا شمار بھی ایشیائی اقوام میں کیا جا سکتا ہے۔ آسٹریلیا کے لئے ہمسایہ ملک کو اچھی طرح سمجھنا لازمی ہے اور بھارت کو سمجھنے میں جتنی مدد ہمیں اس نمائش کو دیکھنے سے مل سکتی ہے اتنی شاید ایک ہزار کتابوں کے مطالعہ سے بھی نہ مل سکے۔ کوئی اور دیش بھارت کی روحانی قدروں کا مقابلہ نہیں کر سکا اور بھارت کو ہم جتنا زیادہ سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ اس سے ہماری تہذیب اتنی زیادہ ترقی کرے گی۔

راجندر راجن

کاشش

وُہ ایک تھرڈ کلاس کے ڈبے میں ہانپتا ہوا داخل ہُوا۔ بیشتر مُسافر لمبی تانے سو رہے تھے۔ دو چار خوش باش نوجوان بھاری بھاری کمبلوں میں کانوں تک لپٹے ہوئے تاش کھیل رہے تھے۔ ایک صاحب آدھے لیٹے آدھے بیٹھے کسی کتاب کے مطالعے میں محو تھے۔ اُن کا انہماک ظاہر کرتا تھا کہ کتاب کافی سے زیادہ دل چسپ ہے۔ کچھ مسافر جو نسبتاً کم حیثیت دکھائی دیتے تھے اور جن کو بنچوں پر جگہ نہ مل سکی تھی فرش پر ہی بستر بکس وغیرہ جوڑ کر اُن پہ اُونگھ رہے تھے۔ ڈبہ کھچا کھچ بھرا تھا۔ اُس نے داخل ہوتے ہی ڈبے کے طول و عرض پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور بیٹھنے کی جگہ نہ پاکر چپ چاپ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوگیا، گویا کوئی تصویر ہو یا خود مصوّر۔ وہ شاید اپنا تمام سفر یونہی کھڑے کھڑے گزار دیتا مگر اتفاق سے پڑھنے والے صاحب کی دلچسپ کتاب ختم ہوگئی۔ انھوں نے کتاب احتیاط سے تکیے کے نیچے رکھ دی اور نگاہ اُٹھا کے دیکھا تو اس تصویر نما انسان کو سامنے کھڑا پایا۔ اُس کے پریشان بالوں اور ہلکے بھورے رنگ کے سوٹ میں جو وہ پہنے تھا ایک عجیب ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ وہ ٹکٹکی لگائے چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یا شاید چھت کے پار، دُور بہت دُور، مالکِ دو جہاں کی طرف۔

کتاب والے مُسافر نے بڑھ کر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اُس کی محویت ٹوٹ گئی گویا کوئی خواب سے اچانک بیدار ہو اُٹھے۔ بدحواسی کے عالم میں اُس نے اپنے گرد و پیش دیکھا تو اُسے یاد آیا کہ وہ ریل گاڑی میں سفر کر رہا ہے۔ چنانچہ مسافر کے اشارے پر وہ سیدھا ہوکر اُس کے برابر بیٹھ گیا۔ مسافر حیران تھا۔ عجیب انسان ہے، شکریے تک کا روادار نہیں۔ تاہم مزید دل چسپی کا اظہار کرتے ہوئے مسافر نے اُس کی منزلِ مقصود کے متعلق سوال کیا۔ بڑی بڑی گہری جھیلوں ایسی اُداس آنکھیں مسافر کی طرف مڑیں۔ چند لمحے سکوت کا عالم رہا گویا دُور گہری جھیلوں کے کنارے پر کہیں کسی اُداس بلبل کا المیہ ترانہ سنائی دے رہا ہو۔ مسافر اس غیر متوقع سناٹے سے گھبرا گیا۔ چنانچہ اُس نے اپنا سوال دہرایا۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں جھپک گئیں اور پتلے پتلے خشک ہونٹ ہلے "الہ آباد"۔ مسافر نے مزید کریدنے کی کوشش نہ کی۔ اُسے ڈر تھا کہیں اُس کی باتیں اس غم زدہ انسان کے محیطِ غم میں تلاطم نہ بپا کر دیں۔ اُس نے دیکھا وہ بار بار کوٹ کی جیب سے ایک کاغذ نکالتا ہے غور سے دیکھتا ہے اور پھر جیب میں ٹھونس لیتا ہے۔ ایسا کرنے میں اُس کے ہونٹوں سے اک آہ نکل جاتی۔ کوئی آنسو اُس کی آنکھوں میں چھلکتا اور پلکوں کے کنارے پہ جھمک جاتا۔

وہ خیالات میں غرق سر جھکائے بیٹھا تھا، رات بہت آچکی تھی۔ اُس کی پلکیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ تصوّر میں دُھندلی تصویریں ناچنے لگیں۔ اور جب کتاب والے مسافر نے اُسے خیر باد کہی تو وہ محوِ خواب تھا۔

گاڑی الہ آباد اسٹیشن پہ رُکی۔ وہ گاڑی سے نیچے اُترا۔ ایک لمحے کے لئے اُس کی نظروں میں ایک برس پہلے کا وہ سماں پھر گیا جب وہ تین ماہ کی لمبی رخصت ختم کرکے واپس جا رہا تھا۔ رات ہی کا وقت تھا۔ ایسی ہی چہل پہل تھی۔ یہی گہما گہمی تھی ایسے ہی شور بپا تھا اور یونہی ایک گاڑی طیّار کھڑی تھی۔ جیسے گھر اور گھر کی تمام دلچسپیوں سے دُور دفتر کی خشک زندگی کے سپرد کرنے کے لئے گھر کا ہر فرد اُسے الوداع کہنے کے لئے اسٹیشن پہ آیا ہوا تھا۔ اُس کی بوڑھی ماں جس کی آنکھوں میں جذبات کی کشمکش سے آنسو چھلک رہے تھے۔ اُس کا چھوٹا بھائی مہیش جسے وہ نئی بائیسکل بھیجنے کا وعدہ کر رہا تھا۔ اُس کی بہن اور دونوں بھانجے۔ اُس کا بھائی رام چرن اور پیاری بھابی۔ وہ اکثر بھابی کو چھیڑنے کے لئے کہا کرتا تھا۔ "بھابی، جب تمہارے ہاں چاند سا بیٹا ہوگا تو ہمیں کیا کھلاؤ گی؟" بھابی شرما جاتی۔ اس پہ ماں اُسے جھڑکتی تو بھابی نیچی نظروں سے کہہ دیتی۔ "ماں جی آپ خفا کیوں ہوتی ہیں۔ جیوتی تو میرا پیارا دیور ہے۔ میں اُس کی بات کا بُرا تھوڑا ہی مانتی ہوں"۔ ماں فرطِ محبّت سے بہو کو گلے لگا لیتی۔

آج وہ رُخصت ہو رہا تھا۔ اس لئے آج وہی مرکزِ نگاہ تھا اُس چھوٹی سی دُنیا کا۔ ہر کوئی اُس کی توجہ اپنی طرف دلانا چاہتا تھا۔ اور وہ سب سے ہم کلام تھا۔ اُس نے چھوٹے بھانجے کی ہتھیلی پر دو چاندی کے سکّے رکھے جنہیں وہ شریر لڑکا بار بار گرا دیتا اور وہ بار بار اُٹھا کر اُس کی ہتھیلی پہ رکھ دیتا۔ وہ مہیش کو پڑھائی میں دھیان

لگانے کی نصیحت کر رہا تھا۔ بہن اور بھابی اُسے اپنی خیر و عافیت سے آگاہ کرنے کی تاکید کر رہی تھی۔ ماں اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھے سمجھا رہی تھی کہ بیٹا پردیس میں اپنی صحت کا ہر طرح سے خیال رکھنا۔ ذرا بھی تکلیف ہو تو اطّلاع دینا۔ میں سو سو بلائیں لوں گی اپنے لاڈلے کی۔" رام چرن بھیا کہہ رہا تھا: "بھائی، خوب کھاؤ پیو، موج اُڑاؤ۔ تمہیں گھر کی کیا چنتا ہے۔ میں جو موجود ہوں، سب سنبھال لوں گا۔" ماں نے محبّت اور عقیدت کے ملے جُلے جذبے سے رام چرن کی طرف دیکھا۔ رام چرن سب بہن بھائیوں سے بڑھ کر محبت سے پیش آتا تھا۔ ماں کا ہر حکم بجا لاتا تھا۔ سچ مچ کوشلیا کا لعل تھا وہ۔ کتنی یگانگت تھی دونوں بھائیوں میں۔ ماں انھیں رام لکشمن کی جوڑی کہہ کر پکارا کرتی تھی۔

مگر آج — آج وہی گھر ماتم کدہ بنا ہو گا۔ اُس گھر کی تمام مسرتیں چھین لی گئیں رام چرن چل بسا تھا۔ قدرت کے اس بھونڈے مذاق کا مطلب اُس کے فہم سے بالا تھا۔ تقدیر نے آن کی آن میں بڑھیا کا چمن جلا کر راکھ کر ڈالا، اُس کے ہاتھ رحم کے لئے بھی نہ اُٹھ سکے۔ کیوں؟ آخر کیوں خدا نے انسان کو اس قدر مجبور بنا رکھا ہے؟ کم از کم اُس بڑھیا نے تو قدرت کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ پھر اُس غریب کی خوشی اُسے کیوں نہ بھائی میری پیاری ماں — میری جان سے عزیز بھابی — اور اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تانتا بندھ گیا۔ اُس نے جیب سے تار نکالا جسے وہ کم از کم سو بار پڑھ چکا تھا۔ وہی منحوس الفاظ تھے۔ "جلد پہنچو، رام چرن چل بسا"۔

وہ اسٹیشن سے باہر آیا۔ ہر طرف ڈراؤنا سنّاٹا طاری تھا۔ کبھی کبھی سرگوشیوں کی سی مدّھم آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔ بکّے تانگوں کی ایک قطار کھڑی تھی۔ وہ چپ چاپ ایک تانگے میں سوار ہو گیا اور تانگے والے کو اپنی منزلِ مقصود بتا دی۔ تانگہ روانہ ہو گیا۔ اور وہ ماحول سے بے نیاز اپنی سوچ میں غرق زندہ لاش کی طرح بیٹھا رہا۔ اچانک اُس کی نگاہ راستے پر جا پڑی۔ اُس نے دیکھا، تانگہ عجیب و غریب راستوں سے گزر رہا ہے۔ جو اُس نے کبھی بچپن کے خوابوں میں بھی نہ دیکھے تھے اور پھر ایکدم اُن کا محلہ آ گیا۔ تانگہ رُک گیا۔ وہ تانگے سے نیچے اُترا اور تنگ و تاریک گلی میں سے ہوتا ہُوا اپنے مکان کے دروازے تک جا پہنچا۔ مکان پر قبرستان کا سا سکوت طاری تھا۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ بہت ضبط کرنے پر بھی اُس کے آنسو نہ رُک سکے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں اُس کی چیخیں بھی سُنائی دینے لگیں۔

رونے کی آواز سن کر گھر کے سب لوگ اُس کے گرد جمع ہو گئے۔ ماں، بہن بھابی اور رام چرن بھیا — ہاں رام چرن بھیا! تو کیا رام چرن زندہ ہے؟ اُس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا تھا۔ اُس کا سر چکرانے لگا۔ کچھ دیر بُت بنا رام چرن کو دیکھا کیا اور پھر یک لخت جیسے سمندر میں لہر اُٹھے۔ وہ بڑھا اور رام چرن بھیا سے لپٹ گیا۔ ماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کہنے لگی۔ روتا کیوں ہے۔ یہی نا کہ نوکری جاتی رہی۔ پھر کیا ہُوا، تیرا بھائی جو موجود ہے۔ تجھے کس بات کی فکر ہے۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں کہ اچھا ہی ہُوا۔ خواہ مخواہ مجھے ہر وقت تیری پردیس کی چنتا ہی لگی رہتی تھی —" ماں نہ جانے اور کیا کہتی رہی مگر اُس نے سُنا ہی نہیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ چنانچہ اُس نے اپنی کلائی پر چٹکی لی۔ نہیں، وہ خواب نہیں دیکھ رہا تھا۔ اُس نے آنسو پونچھ ڈالے اور کوٹ کی جیب سے تار نکال کر بھیا کو دیا۔ رام چرن نے تار پڑھا تو اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

"یہ سب گنپتی کی شرارت ہے۔ مقدمہ ہار گیا ہے نا، امی سے۔ مگر میں بھی بچّہ جی کو ایسے ناکوں چنے چبواؤں گا کہ چھٹّی کا دودھ یاد آ جائے۔" ماں نے یہ سارا حال سُنا تو اُس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اپنے بیٹے کی سو سو بلائیں لیں۔ رام چرن سے ہی تو میری دُنیا آباد ہے۔ اُس کی طرف کوئی آنکھ اُٹھا کے دیکھے تو دیدے پھوڑ دوں اُس کے، یہ مُوا گنپتی مجھے ملے تو جیتا نہ چھوڑوں گی۔

پھر ماں جیوتی سے مخاطب ہوئی۔ "کچھ دیر آرام کر لو بیٹا۔ بہت تھک گئے ہو میرے لعل"

"بھیا کو سلامت دیکھ کر میری سب تکان دُور ہو گئی ماں۔ میں کل واپس جاؤں گا"

"اتنی بھی کیا جلدی ہے بیٹا۔ کبھی کبھار تو تم آتے ہو۔ ایک دو روز ٹھہر جاؤ"۔

رام چرن نے زور سے اُس کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا: "چلو راجہ اندر چلو"۔

اُسے یوں محسوس ہُوا گویا تمام کائنات ایکدم گھوم گئی ہے۔ اور ساتھ ہی اُس کا سر بھی گھومنے لگا۔ اور پھر ایک جھٹکا سا لگا۔ گاڑی رُک گئی۔

ہر طرف شور بپا تھا۔ کھلبلی سی مچی ہوئی تھی معلوم ہوتا تھا کہ ایک طوفان ہے۔ جس کے ڈر سے لوگ ادھر اُدھر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اُس نے نیم خوابی کے عالم میں یہ سب کچھ دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن گھنٹی کی کرخت آواز کب سونے دیتی تھی اُسے با دلِ ناخواستہ آنکھیں کھولنی پڑیں۔ اچانک اُس کی نگاہ سامنے بورڈ پر پڑی۔ جلی حروف میں لکھا تھا — الہ آباد۔

لفٹیننٹ کرنل ٹي. آر. رائے

لفٹیننٹ کرنل اندر جیت سنگھ بوتالیہ
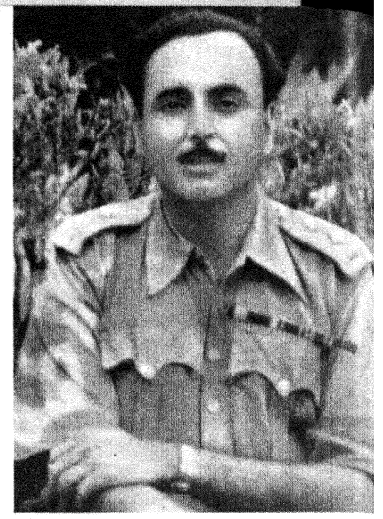
بریگیڈیر محمد عثمان

بریگیڈیر عثمان کي قبر پر اُن کے بھائي مسٹر محمد سبحان اور میجر غفران فاتحہ پڑھ رہے ہیں
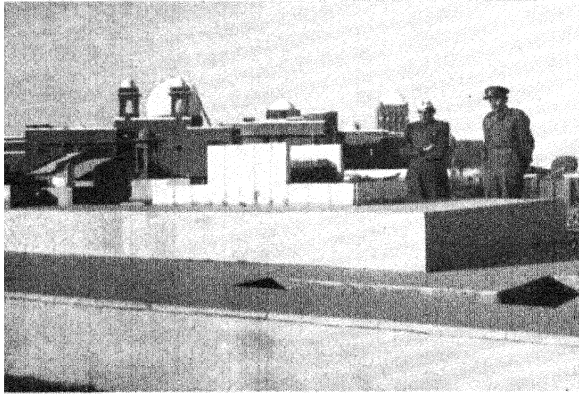
کشمیر کے محاذ پر جان دینے والے تین بہادروں لفٹیننٹ کرنل ٹي. آر. رائے ، لفٹیننٹ کرنل اندرجیت سنگھ بوتالیہ اور بریگیڈیر محمد عثمان کي یاد میں پچھلے دنوں راشٹرپتي بھون میں ایک خاص تقریب منائي گئي جس میں ان شہیدوں کے لواحقین کو راشٹرپتي نے مہاویر چکر کا تمغہ عطا کیا - نیچے (بائیں تصویر میں) بریگیڈیر عثمان کے چھوٹے بھائي مسٹر ایم. سبحان راشٹرپتي سے ایم. وي. سي. تمغہ لے رہے ہیں - (درمیان میں) لفٹیننٹ کرنل بوتالیہ کي بیوہ مسز شیلا بوتالیہ راشٹرپتي سے ایم. وي. سي. تمغہ لے رہی ہیں - (دائیں طرف) لفٹیننٹ کرنل رائے کي بیوہ مسز شیلا رائے راشٹرپتي سے ایم. وی. سي. تمغہ لے رہی ہیں -
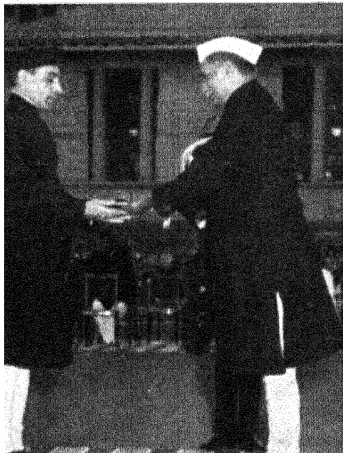
مہاتما بدھ کے
دو چیلوں کے پھول
ابدی آرام گاہ میں

مہاتما بدھ کے دو چیلوں ساری پتا اور مہاموگالانا کے پھول حال ہی میں سانچی کے مقام پر چیتیہ گری وہارا میں رکھ دئیے گئے - اس موقعے پر بھارت سے باہر کے نامی بودھوں نے شرکت کی -
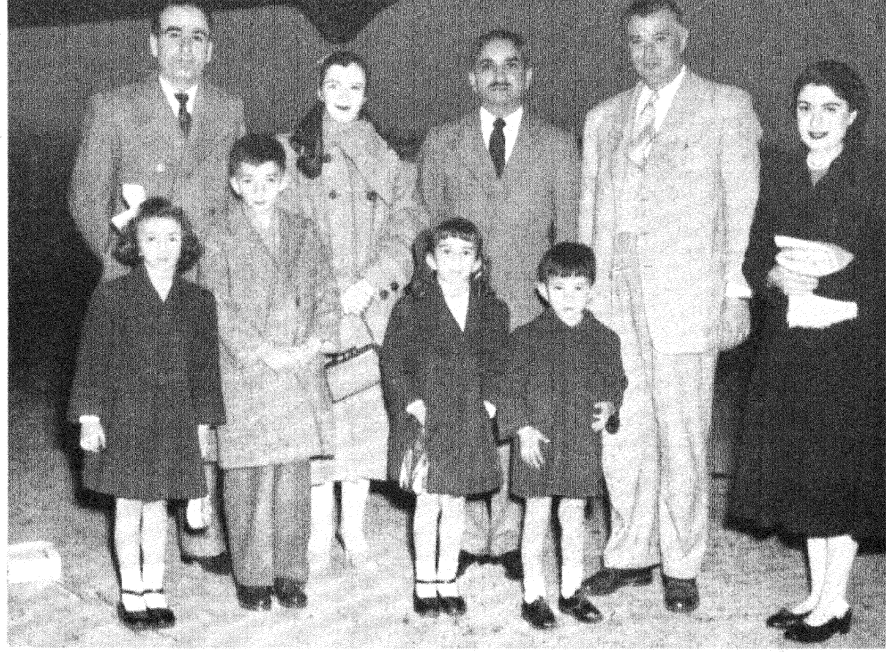
شام کے سفیر برائے ہند مسٹر لطفی بسطامی حال ہی میں اپنی بیوی بچوں سمیت بھارت تشریف لے آئے - پالم کے ہوائی اڈے پر شامی لیگیشن کے شافی افیئرز اور شری آئی. ایس. چوپڑہ نے آپ کا استقبال کیا -

برٹش ایسٹ افریقہ سے طلبہ کی ایک جماعت ، جو ہندوستان کے تاریخی مقامات کو دیکھنے اور یہاں کے لیڈروں سے ملاقات کرنے کے لئے ہندوستان آئی ہوئی ہے -
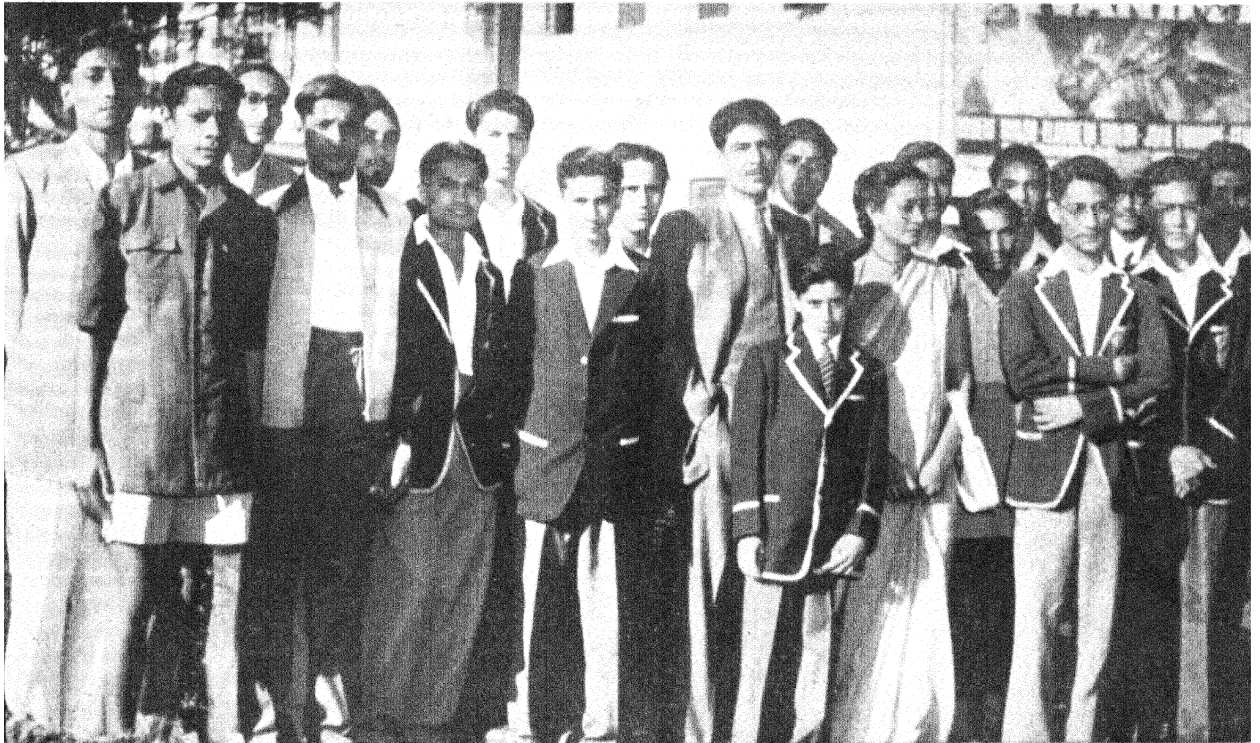
سانچي ميں نيا تعمير شدہ چيتيہ گري وهارا

لداخ کے لاما هز هولي نيس کوشک بکولا
اس موقع پر تقرير کر رهے هيں -

برما کے پردهان منتري آنريبل يونو دونوں چيلوں کے مقدس پهول اپنے سر پر رکهے
جلوس ميں شريک هيں - جلوس ميں ان کے علاوہ شري جواهر لال نهرو اور
ڈاکٹر ايس. پي. مکرجي پردهان مها بودهي سوسائٹي آف انڈيا بهي نظر آرهے هيں

"سوالات عبدالکریم" کے دو صفحے

اِس کتاب کے متعلق ایک سیرحاصل مقالہ زیر نظر شمارے میں ملاحظہ فرمائیے۔

برجموہن دتاتریہ کیفی

یہ لوگ

غم گساران قوم ہیں یہ لوگ — جاں نثاران قوم ہیں یہ لوگ

دیس کے دُکھ سے یہ تڑپتے ہیں — دل فگاران قوم ہیں یہ لوگ

سروری کو سمجھتے ہیں خدمت — خاکسارانِ قوم ہیں یہ لوگ

فرض کو یہ سمجھتے ہیں مذہب — ذمّہ دارانِ قوم ہیں یہ لوگ

قابلِ قدر اِن کے منصوبے — سحر کارانِ قوم ہیں یہ لوگ

اِن سے ہی کھلنی ہے کلی دل کی — کہ بہارانِ قوم ہیں یہ لوگ

اِن کے دم سے کھلا ہے یہ گلشن — بادوبارانِ قوم ہیں یہ لوگ

اِن سے پھیلیگی عام خوشحالی — مایہ دارانِ قوم ہیں یہ لوگ

اجنبی اِن سے قیدِ ملّت و دیں — رُستگارانِ قوم ہیں یہ لوگ

دُور و نزدیک اِن کی شہرت ہے — نامدارانِ قوم ہیں یہ لوگ

ہے تدبّر سے اِن کے دُنیا دنگ — ہوشیارانِ قوم ہیں یہ لوگ

چاہ اِن کی ہے غیر ملکوں میں — طرحدارانِ قوم ہیں یہ لوگ

جانے کیا اِن کو سمجھے ہو کیفی
ارے یارانِ قوم ہیں یہ لوگ

حسن عسکری

غالب کی فارسی اور تنقیص و ارادت

غالب ایک ہنگامہ آرا تھے۔ ان کی یہ ہنگامہ آرائی شائبہ خود پرستی کے ساتھ کہیں کہیں اخلاقی حدود سے باہر ہوتے ہوئے بھی بے مقصد اور بیکار نہ تھی۔ یعنی اس نے یادگار غالب، سخندان فارس اور شعر العجم کے لئے کچھ دھندلے خاکے بے ربط مواد تاع تحریک کی صورت میں پیش کر کے کچھ ایسے قلم پیدا کئے جو تقلید کی سخت بندشوں سے آزاد ہو کر کسی حد تک ارادت سے متاثر نظر آتے ہیں۔ یعنی حالی، آزاد اور شبلی ایک ایسے دور کے بڑے نمائندے ہیں جس پہ ارادت کا اثر غالب ہے یہی وجہ ہے کہ کہیں کہیں ان لوگوں کی تنقیدیں صاف ستھرے فیصلوں سے عاجز ہیں شلاً مولانا محمد حسین آزاد ایک مقام پر ذوق کے متعلق فرماتے ہیں کہ

"اپنے پیارے اور پیار کرنے والے بزرگ کی ہر بات پیاری ہوتی ہے لیکن نہیں اس شعر کے پتلے کا ایک رونگٹا بھی بیکار نہ تھا اکثر نئے ایجاد و اختراع ان کے ارادے میں تھے اور بعض بعض ارادے شروع ہوئے مگر ناتمام رہے کیونکہ بادشاہ کی فرمائشیں دم لینے کی مہلت نہ دیتی تھیں اور تماشہ یہ کہ بادشاہ بھی ایجاد کا بادشاہ تھا۔ آتنا تھا کہ بات نکالتا مگر اسے سمیٹ نہ سکتا تھا اس کا کیا ہوا انہیں سنبھالنا پڑتا تھا"۔

ممکن ہے کہ یہ رائے غالب کی جدت پسندی کو سامنے رکھتے ہوئے پیش کی گئی ہو چونکہ آزاد کو ذوق سے ایک قلبی لگاؤ تھا لہذا اس لگاؤ نے انہیں مجبور کیا کہ وہ ذوق کو کسی نہ کسی طرح ابھاریں۔ لیکن جب انہوں نے ذوق کو ابھارا تو خواہ مخواہ بہادر شاہ کا پہلو دبنے لگا یعنی بہادر شاہ کی کچھ کمزوریاں ذوق کی جدت پسندی کے افسانہ سے ظاہر ہو گئیں۔ اس نازک موقعہ پر انہوں نے بہادر شاہ کو بھی نامراد نہیں رکھا اور یہ کہہ کر کہ

"بادشاہ بھی ایجاد کا بادشاہ تھا" بادشاہ کی بزرگی پر بھی دو پھول چڑھا دئے اسی طرح مولانا شبلی شعر العجم میں فرماتے ہیں۔

"سلطان محمود کو ایاز سے جو محبت تھی اگرچہ حد سے متجاوز تھی لیکن ہوس کا شائبہ نہ تھا ایک دن بزم عیش میں بادہ و جام کا دور تھا۔ محمود خلاف عادت معمول سے زیادہ پی کر بدمست ہو گیا اسی حالت میں ایاز پر نظر پڑی اس کی شکن در شکن زلفیں چہرہ پر بکھری ہوئی تھیں محمود نے بے اختیار اس کے گلے میں ہاتھ ڈال دئے لیکن فوراً سنبھل گیا اور جوش تقویٰ میں آ کر ایاز کو حکم دیا زلفیں کاٹ کر رکھ دے۔ ایاز نے فوراً حکم کی تعمیل کی"۔

محبت حد سے متجاوز تھی۔ لیکن اس میں ہوس کا شائبہ نہیں تھا۔ بادہ و جام کا دور، گلے میں ہاتھوں کا ڈال دینا، حالت مے نوشی میں جوش تقویٰ غیظ و غضب کا نزول اپنے نفس پر نہیں بلکہ ایاز غریب کے نفس پر، اتنی متضاد باتوں کے ہوتے ہوئے مولانا نے محمود کے تقویٰ کو سراہا ہے یہ ایک قلبی لگاؤ ہے جو بہت سی عریاں کمزوریوں کو دیکھتے ہوئے بھی من مانے فیصلے صادر کر دیتا ہے۔

اسی طرح مولانا حالی بھی کہیں کہیں اپنے قلبی لگاؤ کو چھپانے میں ناکامیاب ہوتے ہیں شلاً (یادگار غالب میں)

"ایک شخص پارسی نژاد جس کا نام آتش پرستی کے زمانہ میں ہرمزد تھا بعد مسلمان ہونے کے عبد الصمد رکھا گیا۔ مرزا کے پاس اول آگرے میں اور پھر دلی میں مقیم رہا مرزا نے اس سے فارسی زبان میں کسی قدر بصیرت پیدا کی اگرچہ کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ مجھ کو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے اور عبد الصمد محض ایک فرضی نام ہے"۔

جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا کو کس عمر میں اس کی صحبت میسر آئی اور کس قدر قلیل مدت اس کی صحبت میں گزری تو عبد الصمد اور اس کی تعلیم کا عدم وجود برابر ہو جاتا ہے اس لئے مرزا کا یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ مجھ کو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے۔ ملا عبد الصمد علاوہ فارسی زبان کے

جو اس کی مادری زبان اور اس کی قوم کی مذہبی زبان تھی عربی زبان کا بھی جیسا کہ مرزا نے لکھا ہے بہت بڑا فاضل تھا اگرچہ مرزا کو اس کی صحبت بہت کم میسّر مگر مرزا جیسے جوہر قابل کو صغر سن میں ایسے شفیق کامل اور جامع اللسانین استاد کا مل جانا ان نوادر اتفاق میں سے تھا جو بہت کم واقع ہوتے ہیں"۔

مولانا حالی کی اس تحقیقات پر قاضی عبد الودود (بیرسٹر پٹنہ) نے علی گڑھ میگزین غالب نمبر میں کافی پھیلاؤ کے ساتھ تنقید کی ہے جس سے عبد الصمد کی استادی کا افسانہ بے بنیاد ثابت ہو جاتا ہے۔ یہ ایک موٹی سی بات ہے کہ جب مولانا حالی نے غالب کی زبان سے یہ سن لیا کہ عبد الصمد کے استاد ہونے کی کہانی فرضی ہے تو پھر اس کہانی کو اپنی طرف سے کچھ اور رنگ روپ دینے کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ اگر غالب کو عبد الصمد کی شخصیت سے اُبھارا جا سکتا ہے تو وہ عبد الصمد کی شخصیت سے ابھار کھانے کی حتی المقدور کوشش کرتے ہیں۔ اگر مبداء فیاض کا سہارا لے کر وہ غالب کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں تو مبداء فیاض کا سہارا لینے لگتے ہیں یا اگر کوئی اور سہارا ملتا ہے تو اس کو بھی اپنا لیتے ہیں چاہے اس سہارے کی قیمت غالب کی جنبش زبان کے بعد کچھ ہو یا نہ ہو۔ یہ کمزوریاں ہیں جو ایک دَور کی یادگار ہیں۔ مگر ان کے ہوتے ہوتے یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ حالی نے غالب کے پیچیدہ فن اور پیچیدہ شخصیت کو کافی سلجھا کر پیش کیا اور اپنے مقصد میں پوری طرح سے کامیاب ہوئے انہوں نے غالب کی شہرت میں کافی اضافہ کیا۔ ان کی یادگار غالب نے ایک خلوت نشین فن کا پردہ اٹھا کر سب سے بڑا کام یہ کیا کہ انگریزی داں طبقے میں غالب کے مداح اور سراہنے والے کافی پیدا کئے لیکن شہرت کے اس رنگ روپ نے غالب کی شخصیت اور فن کے تاریک پہلوؤں کو بھی سامنے لانے کی خواہش کچھ ذہنوں میں پیدا کی لہذا بعض لوگوں نے غالب کے نقائص کے پلندوں کو کھولنے میں بھی کافی عرق ریزی سے کام لیا ہے چونکہ مشہور اور بڑی شخصیتوں کے نقائص کا تلاش کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوتا مگر اس دلچسپی کو سنجیدگی سے آزاد نہیں ہونا چاہئے اس نکتہ کی وضاحت کے لئے غالب کا ایک خط ملاحظہ ہو۔

"اس رقعے میں ایک میزان پیش کرتا ہوں حضرت صاحب ان صاحبوں کے کلام کو یعنی ہندیوں کے اشعار کو قتیل اور واقف سے بیدل اور ناصر علی تک اس میزان میں تولیں میزان یہ ہے رودکی و فردوسی سے لے کر خاقانی اور سنائی اور انوری وغیرہم تک ایک گروہ ان حضرات کا کلام تھوڑے تھوڑے تفاوت سے ایک ڈھنگ پر ہے پھر حضرت سعدی طرز خاص کے موجد ہوئے سعدی و جامی و ہلالی یہ اشخاص متعدد نہیں۔ فغانی ایک اور شیوۂ خاص کا مبدع ہوا خیالہائے نازک و معنی بلند لایا اس شیوہ کی تکمیل کی ظہوری و نظیری و عرفی و نوعی نے سبحان اللہ غالب سخن میں جان پڑ گئی اس روش کو بعد اس کے صاحبان طبع نے سلاست کا چربہ دیا صائب و کلیم و سلیم و قدسی و حکیم شفائی اس زمرے میں ہیں رودکی و اسدی و فردوسی یہ شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا اور سعدی کے طرز نے بسبب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا فغانی کا انداز پھیلا اور اس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے ۔

تو اب طرزیں تین ٹھہریں ۔ ۱۔ خاقانی اور اس کے اقران ۔ ۲۔ ظہوری اور اس کے امثال ۔ ۳۔ صائب اور اس کے نظائر خالصاً للہ ممتاز و اختر وغیرہم کا کلام ان تین طرزوں میں سے کس طرز پر ہے ۔ بے شبہ فرماؤ گے کہ یہ طرز اور ہی ہے بس تو ہم نے جانا کہ یہ طرز چوتھی ہے کیا کہنا ہے ۔ خوب طرز ہے اچھی طرز ہے مگر فارسی نہیں ہے ہندی ہے دارالضرب شاہی کا سکہ نہیں ہے ٹکسال باہر ہے داد داد انصاف انصاف"

غالب کے ان تصوّرات میں فارسی شعر و ادب کی ترقی کا وہ خاکہ ہے جس کی تفصیل کسی حد تک شعر العجم ہے ۔ ان میں فارسی کے اسالیب بیان کی ترقی کی ترتیب اور ان کے باریک فرقوں کو اس سلیقہ سے پیش کیا ہے کہ افسانۂ ترقی و تخلیق کی اہمیت کافی واضح ہو جاتی ہے اور اس بات کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں رہتا کہ ایرانی ادب کے ماضی کو انہوں نے کس نظر سے دیکھا تھا ۔ لیکن یہ بھی صاف ہے کہ وہ اپنے دور کے ایرانی ماحول میں ہونے والے باریک لسانی تجربات سے بھی واقف نہیں تھے لہذا قاضی عبد الودود صاحب کا یہ اعتراض اپنے مقام پر ٹھیک ہے کہ

" غالب کی نظم و نثر کا ان کے کسی ہمعصر ایرانی مثلاً یغما کی نظم و نثر سے مقابلہ کیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ غالب اپنے عہد کے مخصوص ایرانی محاورات اور روزمرّہ سے بہت کم واقف ہیں"

اس میں شک نہیں ہے کہ غالب کے دعوے اس نکتہ پر غور کئے بغیر ہوتے ہیں اس نکتہ پر مولانا آزاد نے کافی غور کیا ہے وہ بھی جب جبکہ انہوں نے ایرانی ماحول کو بچشم خود دیکھا ۔ غالب نے چونکہ ہندوستانی ماحول سے باہر

نکل کر ایران کو کبھی نہیں دیکھا لہذا روزمرہ اور محاورات کی ان باریک تبدیلیوں کو
جو زمان ومکان کے ساتھ ساتھ ہوتی رہتی ہیں وہ نہیں سمجھ سکے ہاں ان کے
فارسی کلام اور ہندوستانی فارسی گو اساتذہ کے کلام میں جو ایک باریک فرق
نظر آتا ہے اس پر ان کی نظر بڑی شدت سے پڑتی ہے لہذا اسی بناء پر
وہ بڑی آزادی سے کہہ دیتے ہیں کہ "یہ ہندی ہے دار الضرب شاہی کا سکہ
نہیں ہے ٹکسال باہر ہے" کاش وہ ایران جاتے اور وہاں پر ذرا ٹھنڈے دل
سے اس دور کے ایرانی ماحول کو دیکھتے تو انہیں جیسے ہندوستانیوں کا اور اپنا
فرق نظر آ گیا اسی طرح سے اپنا اور اس دور کے ایرانیوں کا باریک فرق بھی
نظر آجاتا اور ان کے ذہن سے شاید یہ وہم نکل جاتا کہ وہ ہندوستان میں بیٹھ
کر ایرانی ذہن کی پوری پوری عکاسی کر سکتے ہیں ۔ لیکن یہ غالب کی پیش کی
ہوئی میزان میں ایک گنجائش ترقی ہے جس کا ہونا کوئی خاص بات نہیں ۔ اس
لئے کہ کوئی انسان ذہانت کا اتنا بڑا ٹھیکیدار نہیں ہو سکتا کہ اس کے کسی
تصور میں کبھی کوئی کمی ہی نظر نہ آئے ۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں اپنی کمیوں کا
بھی کہیں کہیں ذکر کیا ہے اس کا انداز چاہے شاعرانہ ہی کیوں نہ ہو مثلاً
وہ کہتے ہیں ۔

"میری طبیعت سروش غیبی سے شروع میں ہی خوب کہتی اور اچھی چیزوں
کو ڈھونڈھ لیتی تھی ۔ لیکن اپنی آزاد روی کی وجہ سے کبھی کبھی ان لوگوں کے پیچھے
ہو لیتا تھا جو راستے سے ناواقف تھے اور اپنی ناتجربہ کاری سے ان کی کج روی
کو ان کی مستانہ چال خیال کرتا تھا اسی تگاپو میں ان لوگوں کو جو مجھ سے آگے
نکل گئے تھے اپنی ہمراہی کی قابلیت مجھ میں دیکھ کے مجھ پر رحم آیا اور مہربان
ہو گئے اور میری آوارہ گردی پر ترس کھا کے نہایت شفقت سے مجھ کو دیکھنے
لگے شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بے راہ روی سے مجھ کو مطلع کیا طالب آملی
نے اور عرفی شیرازی نے ایک ایسی زہر آلود نظر مجھ پر ڈالی جس کی وجہ سے وہ
کج روی کا مادہ جو میرے پاؤں میں تھا جل گیا ظہوری نے نہایت محبت سے ایک
تعویذ میرے بازو پر اور کچھ توشہ میری کمر میں باندھا اور نظیری نے اپنی خاص
رفتار مجھ کو سکھلائی ۔"

اس عبارت میں انہوں نے سروش غیبی کے اک روایتی اشارہ کے ساتھ
اپنی ذہانت کا اظہار کر کے اپنی ترقی کا ایک شاعرانہ خاکہ پیش کر دیا ہے جس
میں اپنی کمزوریوں کا اظہار کیا ہے اور مایہ ناز ایرانی اسالیب بیان کو گنا کر
یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ میں نے ان سب کی خصوصیات کو جذب کر کے اپنا ایک
نیا اسلوب بیان اختیار کیا ہے ۔ لیکن قاضی عبد الودود صاحب فرماتے ہیں ۔

" غالب کی باقاعدہ تعلیم زیادہ نہیں ہوئی اور بعد کے ذاتی مطالعہ سے
جو استاد کی رہنمائی کے بغیر ہوا ان کی بنیادی کمزوریاں دور نہ ہو سکیں" ۔

اور یہی نہیں اس میں بھی کچھ اضافہ فرماتے ہیں ۔

" ان میں اعوجاج ذہن' ضعف حافظہ' خود پرستی' ناتواں بینی' بے پروائی' سہل
انگاری اور ضد انتہائی درجہ کی ہے اور جن طبائع میں یہ خصوصیات پائی جائیں نہیں
تحقیق سے کچھ سروکار نہیں ہو سکتا" ۔

" غالب اپنی زبان سے اپنے کو محقق اکمل' اور ہمہ دان عدیم النظیر کہیں
اور اپنے منزہ عن الخطا ہونے کا اعلان کریں ان کے مداح انہیں شہنشاہ ممالک
علوم عربی و فارسی کا لقب دیں لیکن ان کے معلومات اتنے قلیل ان کے اغلاط اتنے
مختلف الانواع اور کثیر التعداد ہیں کہ بزم محققین کی صف نعال میں بھی ان کے لئے
جگہ نکالنی مشکل ہے" ۔

یہ بات ضرور ہے کہ مولانا آزاد کی لسانی بحثوں میں دلائل کی جو نفسیاتی و علمی
کیفیت ہے وہ غالب کے یہاں نہیں دیکھنے میں آتی ۔ لیکن پھر بھی غالب نے ان
بحثوں کو چھیڑ کر شخصیت پرستی اور مرعوبیت کے خلاف کچھ مواد ضرور پیدا کیا
ان کی باقاعدہ تعلیم نہ ہونے کا اعتراض بھی تقلیدی تصورات کی پیداوار ہے ورنہ
کمیاں تو کل والوں کی آج والوں کو' اور آج والوں کی کل آنے والوں کو ضرور نظر
آئیں گی چاہے استاد کی دستوری خصوصیات کو کسی سانچہ میں ڈھال دیا جائے
اس کے بعد ان کی نفسیاتی کمزوریوں کو گنا کر یہ کہا گیا ہے کہ ایسے انسان کا تحقیقات
سے کوئی سروکار ہی نہیں ہو سکتا ۔ ان کی سب سے بڑی تحقیقات تو یہ ہے کہ انہوں
نے سینکڑوں اسالیب بیان کو جذب کر کے ایک جدید اسلوب پیش کیا ۔ ان پر
ایک یہ بھی اعتراض ہے کہ انہوں نے اپنی زبان سے اپنی تعریف کے پل باندھ دئے
ہیں غالب میں یہ مادہ ہے' کمی بیشی کی بات دوسری ہے مگر اس سے شاید کوئی انسان
بچ پاتا ہو ؟ تو پھر غالب کو ہی کیسے فرشتہ بنا دیا جائے ۔ حالانکہ غالب کی
خود ستائی کے لئے ماحول نے بھی کچھ مواد پیدا کیا ہے یعنی جب فحش گالیوں سے
اس کا تعارف کرایا جاتا ہے اور توہین آمیز تحریروں کا سیلاب اس کو چاروں
طرف سے گھیر لیتا ہے تو وہ بھی نعرۂ رئیس ابن رئیس کے ساتھ اپنی تعریف کے
راگ الاپنے لگتا ہے ۔ قلیل معلومات اور اغلاط یہ ایک ایسا نکتہ ہے جس کے

دامن میں ایک بہت بڑا افسانۂ انفرادیت و انانیت چھپا ہوا ہے یعنی ایک مشہور آدمی کی بہت سی غلطیوں کو گنانے والا ضرور مختلف علوم و فنون کا ماہر ہوگا۔ یہ نکتہ خواہ مخواہ لوگوں کے ذہن میں قابلِ غور بن جاتا ہے ورنہ کمیاں اور غلطیاں روایات اور دستور کی پرستش سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہیں' چونکہ لفظ و معانی انسان کی نفسیاتی کیفیتوں کی دستوری و روایتی یادگاریں ہیں ان کے پیچھے شخصیتیں گردش کرتی ہوئی نظر آتی ہیں اس حقیقت کی نقاب کشائی مولانا آزاد نے سخندانِ فارس میں کافی اچھی طرح سے کی ہے مثلاً کہتے ہیں کہ

"پرتغال ایک قسم کا رنگترہ ہوتا ہے اس کا پودا (ایران میں) پرتگال سے آیا تھا وہی نام پرتغال ہو گیا۔ منشی ایران میں کسی کو کہیں تو اس کے لفظی معنی انشاپرداز سمجھے جائیں گے جہاں یہاں (ہندوستان میں) منشی کہتے ہیں وہاں اسے میرزا کہتے ہیں۔ گاؤتکیہ ہندوستانی فارسی ہے' ایران میں متکا کہتے ہیں۔ دست پناہ ہندوستانی فارسی ہے وہاں (ایران میں آتشگیر کہتے ہیں)

اسی طرح سے ہندوستان اور ایران میں الفاظ کی دستوری و رواجی کیفیتوں پر بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

"تجربہ اور مشاہدہ نے قانون بنایا کہ اکثر الفاظ ابتدا میں لچر اور غلط شمار ہوتے ہیں پھر اگر محاورہ نے انہیں منظور کر لیا اور خواص نے زبان میں جگہ دی اور نظم و نثر نے تحریری سند دے دی تو وہی غلط سلط لفظ مستقل لغت ہو کر اجزائے زبان ہو جاتے ہیں اور جو تبدیلی کہ کوتاہی تکلم یا غلطی مخرج سمجھی جاتی تھی وہی ایک عرصہ کے بعد تحلیل و تبادل کا قاعدہ ہو جاتی ہے اور اس سے یہ قاعدہ نکلا کہ ملک سخن میں کوئی لفظ صحیح نہیں کوئی لفظ غلط نہیں جس پر قبول عام اور رواج عام مہر کر دے وہ ایک لفظ صحیح ہے یہ نہ ہو تو صحیح بھی مردود ہے"

جب یہ ایک حقیقت ہے کہ الفاظ و معانی کے پیچھے رواج اور مشہور شخصیتیں گردش کرتی ہوئی نظر آتی ہیں یعنی فلاں لفظ کو فلاں مشہور شاعر یا ادیب نے استعمال کیا ہے۔ فلاں صاحب نے فلاں لفظ کو زبر سے لکھا ہے فلاں نے زیر سے لکھا ہے۔ اس نقطۂ نظر کے ماتحت برہان میں بھی کمیاں ہو سکتی ہیں اور غالب میں بھی لہٰذا قاضی صاحب نے غالب اور برہان پر جو لمبی چوڑی بحث کی ہے اس کے کچھ نقطوں کا جواب تو اوپر ہی ہو چکا' مگر کچھ دلچسپ نکتے ملاحظہ ہوں مثلاً

"سلک لآلی کی بحث میں غالب نے لکھا ہے کہ برہان لفظ لولو بمعنی مروارید سے واقف نہیں قاطع صفحہ ۸۱ حالانکہ اس کے بیان اول کی دسویں سطر ہی میں آب کے تحت یہ الفاظ ہیں کنایہ لولو و جواہر با تو غالب نے برہان کو محض جا بجا سے پڑھا ہے یا بالارادہ برہان کی تحقیر کی غرض سے یہ لکھا ہے کہ وہ لفظ لولو بمعنی مروارید سے واقف نہیں"

لیکن غالب کے متعلق خود فرماتے ہیں

"پہلوی' پہلوی قدیم' دری وغیرہ کے صحیح مفاہیم کا غالب کو علم نہیں اور ان ناموں کو بڑی بے احتیاطی سے استعمال کرتے ہیں ایران کی مقامی بولیوں اور بول چال کی زبان سے انہیں شاید ہی واقفیت ہو"۔

(غالب نے) "ہندوستانی لغات کو فارسی کہا ہے اور فارسی کو ہندوستانی' ہندوستانی فارسی کو ایرانی' اور ایرانی فارسی کو ہندوستانی سمجھتے ہیں"۔

"عربی جملے اور ترکیبیں بناتے ہیں تو ان میں فاحش غلطی ہوتی ہے نامۂ غالب میں عس المحققین اپنا خطاب تجویز کیا ہے عاس المحققین صحیح ہے"۔

ہو سکتا ہے کہ یہ غلطیاں اپنے مقام پر غلطیاں ہی ہوں لیکن ذہن میں یہ سوال خواہ مخواہ اٹھنے لگتا ہے کہ کہیں ان تصورات میں وہی تحقیر کا افسانہ تو نہیں چھپا ہوا ہے جو برہان کے لئے غالب کے یہاں ہے؟ یہ کیسے اطمینان ہو کہ یہ چیز وہاں تو ہے مگر یہاں نہیں ہے؟ اسی طرح سے ایک دوسری جگہ قاضی صاحب نے فرمایا ہے کہ

"فن قافیہ کے متعلق ان کے معلومات بہت ناقص ہیں اس فن کی مستند کتابیں شاید ہی ان کی نظر سے گزری ہوں یہ بات روی قافیہ کے آخری حرف اصلی یا اس کے قائم مقام کو کہتے ہیں ان میں عمر بھر معلوم نہ ہوئی عیوب قافیہ کے بارے میں جو کچھ انہوں نے لکھا ہے بیشتر غلط ہے"

"غالب عروض سے بہت ہی محدود واقفیت رکھتے ہیں حالی نے جو ان کی عروض دانی کا دعوےٰ کیا ہے وہ بالکل بے بنیاد ہے یہ بھی صحیح نہیں کہ انہوں نے کسی مشکل زمین میں قصیدہ کہا ہے"۔

یہ کچھ ایسے اعتراضات ہیں جن کی کمزوری قاضی صاحب کی تحریروں سے ہی ثابت ہو جاتی ہے مثلاً

"خان آرزو اور عبدالرشید زرد شتیوں کے مذہبی ادب اور ایران کی قدیم زبانوں سے ناواقف تھے انہیں وخر کی کوئی ایسی سند جو ان کے نزدیک قابل اعتبار ہو نہ ملی اس کے وجود ہی کے منکر ہو گئے"۔

حالانکہ ان لوگوں کو قاضی صاحب غالب کے مقابلہ میں زیادہ اچھا

محقق سمجھتے ہیں لیکن ان کے اندر بھی کمی نکل آئی ایک جگہ پیش کیا گیا ہے۔
" انجمن آرائے ناصری میں شگفت کو مکسور الکاف لکھا ہے اور آخر میں وہی عبارت ہے جو سروری نے فتحہ وضمۂ کاف کے بارے میں تحریر کی ہے فتحۂ کاف کی مثال میں سنائی اور ضمہ کی مثال میں سعدی کا شعر پیش کیا ہے مؤخر الذکر میں شگفتم نہفتم کا قافیہ ہے۔ فن قافیہ سے انجمن آرا کا مصنف بھی ناواقف معلوم ہوتا ہے۔
اس عبارت میں چار بڑی شخصیتوں کا ذکر آیا ہے جن میں کھلا ہوا اختلاف ہے اور اختلاف بھی ایک کمی ہے چونکہ اس سے ان مشہور شخصیتوں میں سے اگر ایک کو صحیح مان لیا جائے تو تین صاحبان کی معلومات پر ضرب لگتی ہے لہذا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شہرت کمیوں کے خاتمہ کی دعوے دار نہیں ہو سکتی بلکہ افسانۂ تخلیق و ترقی کمیوں میں ہی چھپا ہوا ہے تو پھر یہ ایک خوش فہمی ہے جو غالب کے یہاں بھی اس طرح نمودار ہوتی ہے۔

گر شعر و سخن بدہر آئین بودی — دیوان مرا شہرت پرویں بودی
غالب اگر این فنِ سخن دیں بودی — آں دیں را ایزدی کتاب ایں بودی

مگر اسی کے ساتھ اعتماد فن کی یہ نرالی تصویر جو زندگی کو گود میں لئے ہوئے ہے کس کی جنبش قلم کی پیداوار ہے؟

تازہ دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن — ایں مے از قحط خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوج قبولے بودہ است — شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

ہیگ میں مہاتما گاندھی کے بت کی نقاب کشائی

نیدرلینڈ کے وزیر اعظم ڈاکٹر ڈبلیو ڈریس نے ۱۳ر نومبر کو ہیگ میں مہاتما گاندھی کے بت کی نقاب کشائی کی رسم ادا کی۔ اس تقریب میں اعلےٰ سرکاری افسروں، ڈپلومیٹک نمائندوں، اخبار نویسوں اور مقامی ہندوستانیوں پر مشتمل دو سو سے زاید سرکردہ اصحاب شامل ہوئے۔ کانسی سے تیار کردہ یہ بت بھارت کی طرف سے ہیگ میں "دپیس پیلیس" (ایوان امن) کے لئے پیش کیا گیا ہے۔ جہاں بین الاقوامی کورٹ آف جسٹس کے اجلاس منعقد ہوتے ہیں۔

کارنیگی فاؤنڈیشن کے صدر ڈاکٹر ایس آر ڈیماچی نے یہ تحفہ قبول کرتے ہوئے کہا کہ مہاتما گاندھی صحیح معنوں میں عالمگیر شہری تھے۔ اگر دنیا کی تمام اقوام ان کے اصولوں پر عمل شروع کر دیں تو تمام بین الاقوامی تنازعات کا فیصلہ بین الاقوامی عدالت کی اس عمارت میں کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر ڈریس نے اپنی تقریر میں کہا کہ نہ صرف بھارت بلکہ تمام دنیا مہاتما گاندھی کی تعلیمات سے مستفید ہو سکتی ہے۔ یہ امر نہایت موزوں ہے کہ امن کے دیوتا کا بت بین الاقوامی عدالت کی عمارت میں رکھا جا رہا ہے۔ پرماتما کرے کہ دنیا کے تمام لوگ مہاتما گاندھی کی تعلیم سے سبق سیکھیں۔

بھارتی سفیر شری چکرورتی نے وزیر اعظم نیدرلینڈ کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے بت کی رسم نقاب کشائی ادا کی بھارتی سفارت خانے کی طرف سے اس موقعہ پر مہاتما گاندھی کے حالات زندگی و تعلیمات کے بارے میں ایک دل پذیر پمفلٹ تقسیم کیا گیا۔ تقریب میں مہمانوں کی خاطر تواضع بھی کی گئی۔

بیادِ ہندوستان

یہ نظم ہز ایکسیلنسی ڈاکٹر تاراچند سفیرِ ہند مقیم تہران کی اصفہان میں تشریف آوری پر کہی گئی۔ یہ اصفہان کے مشہور اخبار سپنتا میں ۱۱ نومبر ۱۹۵۲ء کو شائع ہوئی تھی۔ اس کے مصنف ایران کے مشہور شاعر عبدالحسین ہیں۔ نظم طویل ہے۔ صرف ضروری اقتباس شائع کیا جاتا ہے۔ فارسی زبان میں ذیل کا نوٹ خود مصنف کی طرف سے ہے۔

ہفتہ گذشتہ موقعی کہ دکتر تاراچند سفیرِ کبیرِ ہند را در فرودگاہ اصفہان ملاقات کردم کہ عازم شیراز بود و از ہند صحبت شد بیاد روزگار خوشی کہ در آنجا گذراندہ ام پس از مراجعت این چکامہ را سرودم و بہ ہمیں مناسبت تقدیم ایشان می نمایم

فسردہ روانم غمِ دوستانم — غمِ دوستانم فسردہ روانم
برافراشت از ہجرِ ہندم بگردن — بکشتیٔ فکرت ہمی باد بانم

غمِ رنج یاراں گراں تر نماید — زرنجی کہ بردم من از دشمنانم
مرا جانِ دل داشت سرمست و خرّم — بسی رنگ و بو جادو آں گلستانم

فسردہ روانم چو بینم بہ حیلت — مگس وار گردم دغل دوستانم
دریغا کہ تا آمدم سوی ایراں — جہاں کرد درخانہ بیجا نمانم

دغل دوستانم چو آیند گردم — بہ پندار آناں بسی ناتوانم
مرا طوطیٔ ہند شکر شکن بد — ولی تلخ کامی بد از بلبلانم

بسی ناتوانم بہ حیلت، ولیکن — بصدق و صفا ہمچو پیل دمانم
خوشا گر سوی ہند افتد گذارم — بجاناں برم ارمغاں نیمہ جانم

زصدق و صفا بس بود یادگارم — چو پیل آید از یادِ ہندوستانم
خوشا گر ندای برآید زہندم — سمندِ سعادت شود ہم عنانم

زہندوستاں ہر زماں یاد آرم — اگر در غم و عسرتم، شادمانم
بملکی کہ اہلِ دلی ہست آنجا — زبانِ دل آنجا بود ترجمانم

از آں سرزمین وفا و محبت — جز از مہر و نیکی ندیدم مغانم
ہنوزم بود گوش جاں پر ز آوا — ز گیتا و گیتای برہمنانم

چو یک جرعہ نوشیدم از آبِ گنگا — خروش آمد از قلزم بیکرانم
بگیرم چو دامانِ ہمیالیا را — بگرید بدامانش چشمِ روانم

خروشی کہ گہ از پیامِ کرشنا — گہ از رام و سیتا بزد داستانم
سپنتا نشاں گیر و از ہند گوید — خوش آنجا شود محو نام و نشانم

(جنابِ آقائے) عبدالحسین سپنتا ۱۳ آبان ۱۳۳۱ اصفہان

شری رام سرنا

اسرائیل کی صنعتی ترقّی

اہلِ یہود آج سے دو ہزار سال پہلے مصر سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔ ان دو ہزار برسوں میں یہ غریب الوطن لوگ ایک ایسے خطۂ زمین کی تلاش میں سرگرداں رہے جو ان کا قومی گھر بن سکے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ملک ہوگا جہاں یہودی نہ گئے ہوں۔ لیکن انہیں کوئی ایسا ملک نہ ملا جسے وہ اپنا کہہ سکیں۔ شاید ہی کوئی علم یا فن ہوگا جس میں یہودی پیش پیش نہ رہے ہوں لیکن یہ سب دانش مندیاں انہیں مستقل طور پر کہیں آباد نہ کر سکیں۔ اس دوران میں ایسی تجویزیں سننے میں آتی تھیں کہ یہودیوں کو امریکن ممالک میں آباد کر دیا جائے۔ لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہا۔ دوسری طرف ہٹلر اور دیگر دشمنانِ یہود کی بدولت لاکھوں کی تعداد میں اہلِ یہود موت کے گھاٹ اتارے گئے یا اذیتیں سہتے رہے۔

آخر دو ہزار سال کی جلا وطنی کے بعد ۱۹۴۸ء میں اہلِ یہود اچانک ایک ملک کے والی ہو گئے۔ اس ملک کو پہلے فلسطین (Palestine) کہا جاتا تھا۔ ۱۹۱۴ء کی عالمگیر جنگ کے بعد لیگ آف نیشنز نے فلسطین کو انگریزوں کی سرپرستی میں رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ بعد میں یہودیوں کی عرضداشت پر برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر بالفور (Mr. Balfour) نے اعلان کیا تھا کہ یہودیوں کو فلسطین میں آباد کرنے کی سہولیات مہیا کی جائیں گی۔ اس اعلان کے مطابق ہر سال یہودیوں کی ایک مقررہ تعداد فلسطین میں بسائی جاتی تھی۔ دوسری عالمگیر جنگ (۱۹۳۹-۴۵ء) کے دوران میں یورپ کے یہودیوں کو بے انتہا مظالم برداشت کرنے پڑے تھے۔ اس لئے فلسطین میں یہودیوں کی ریاست قائم کرنے کی تحریک کو انجمن اقوام متحدہ میں پیش کیا گیا۔ فلسطین کے عربوں نے اور پڑوسی عرب ممالک کی حکومتوں نے اس فیصلے کے خلاف پر زور احتجاج کیا۔ لیکن ۱۹۴۸ء میں فلسطین کو دو حصّوں میں بانٹ دیا گیا۔ جو حصہ یہودیوں کو ملا اس کا نام اسرائیل رکھا گیا۔ لیکن اسرائیل کے قیام کے بعد بھی اہل یہود کے مسائل ختم نہ ہو سکے۔ سب سے پہلے تو عرب ممالک کے ساتھ نبرد آزمائی کا سوال تھا۔ ایک طرف تو مصر۔ عراق سعودی عرب۔ شام۔ شرق اردن وغیرہ عرب ممالک تھے۔ اور دوسری طرف اکیلا اسرائیل۔ اس جنگ پر اسرائیل کا اندازاً ۱۱ کروڑ پونڈ صرف اٹھا تھا۔ لیکن چار دن کی ریاست اسرائیل کی پشت پر دنیا بھر کے اہلِ یہود تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ غیر ممالک میں رہنے والے یہودیوں نے اسرائیل کو ½ ۱۲ کروڑ پونڈ کی رقم بطور امداد بہم پہنچائی تھی۔ بعد میں اقوام متحدہ کی وساطت سے فریقین میں عارضی صلح ہو گئی۔ لیکن اعصابی جنگ ابھی تک برقرار ہے۔ اس لئے فوجی تیاریوں پر زر کثیر خرچ ہو رہا ہے۔

مہاجرین کا مسئلہ

دوسرا مسئلہ تھا دنیا بھر کے شرنارتھی یہودیوں کو اسرائیل میں آباد کرنا۔ آغاز میں ہی اسرائیل کی حکومت نے اعلان کر دیا تھا کہ اسرائیل کو دنیا بھر میں بکھرے ہوئے اور غریب الوطن یہودیوں کا قومی گھر بنایا جائے گا۔ ابتدا جرمنی کے یہودیوں سے ہوئی کیونکہ انہیں ہٹلر شاہی کے عتاب سے بہت مصائب برداشت کرنے پڑے تھے۔ پھر پولینڈ۔ روس اور مرکزی یورپ کے یہودیوں کی بھاری تعداد آئی۔ بعد میں بلقان ممالک اور دیگر یورپین ممالک سے۔ پھر وسط مشرق اور شمالی افریقہ سے۔ اور آخر میں ایشیائی ممالک سے۔ دسمبر ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے یہودیوں کی آبادی سات لاکھ سے کچھ اوپر تھی۔ لیکن تین سال کے بعد آبادی میں دوگنا اضافہ ہو گیا۔

شرنارتھی یہودیوں کی آمد سے وابستہ سوال تھا ان کی آبادکاری پر خرچ ایک سرکاری اندازے کے مطابق فی کس یہودی شرنارتھی کی اسرائیل میں نوآبادکاری پر ۲۵۰۰ پونڈ خرچ ہوتے ہیں۔ اس خرچ میں سکونت۔ آمد و رفت اور دیگر لوازم شامل ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ آغاز میں یورپ سے آنے والے شرنارتھیوں کا ۲۰ فی صدی حصہ اپنے ساتھ بقدر ضرورت سرمایہ بھی لاتا تھا اور اپنی نوآبادکاری پر ہونے والے خرچ کا کفیل ہوتا تھا۔ لیکن جب سے وسط مشرق اور شمالی افریقہ

سے شرنارتھیوں کی آمد شروع ہوتی ہے اپنا سرمایہ ساتھ لانے والوں کی تعداد کم ہوکر ۵۰ء فی صدی رہ گئی ہے۔ اس حساب سے تمام یہودی شرنارتھیوں کو آباد کرنے پر حکومت کو ایک گراں قدر سرمایہ خرچ کرنا پڑے گا۔

سامانِ خوراک کی قلت

شرنارتھیوں کی لگاتار آمد کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ سامان خوراک کی شدید قلت واقع ہوگئی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اسرائیل میں اس وقت کل آبادی کا ۴/۵ حصہ شہری آبادی پر مشتمل ہے اور ۱/۵ دیہاتی آبادی پر۔ یہاں یہ بتانا بھی موجب دلچسپی ہوگا کہ عرب ممالک اور اسرائیل کے مابین جنگ ہونے پر اسرائیل سے گیارہ لاکھ عربوں کو ہجرت کرنی پڑی تھی۔ یہ عرب آبادی زیادہ تر دیہاتی تھی اور زراعت میں مشغول تھی۔ عربوں کی ہجرت کے بعد اسرائیل میں دیہاتی اور شہری آبادی کا توازن درہم برہم ہوگیا۔ کیونکہ باہر سے آنے والے یہودی صنعتی علاقوں سے آرہے تھے اور ان سے کاشتکاری کی توقع کرنا بے سود تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کاشتکاری گھٹنے لگی۔ بعد میں مشرقی ممالک سے آنے والے یہودیوں نے زراعت کو اختیار تو کیا ہے۔ لیکن ابھی تک حالات پہلی سطح پر نہیں آسکے۔ اب بھی ۲۵۰ ہزار ایکڑ اراضی کاشتکاری کے زیر تحت نہیں لائی جا سکی۔ بدیں وجہ اسرائیل کو سامانِ خوراک مہیا کرنے کے لئے درآمد کا سہارا لینا پڑ رہا ہے۔

تجارتی خسارہ

سامان خوراک کے علاوہ دیگر ضروریات کی درآمد کا بوجھ بھی بھیانک حد تک بڑھ چکا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسرائیل کے قیام سے پہلے بھی فلسطین میں درآمد کی مقدار برآمد سے کئی گنا زیادہ تھی۔ اور اس کمی کو پورا کرنا مشکل ہو رہا تھا لیکن آج تو یہ حالت اور بھی دگرگوں ہو چکی ہے۔ یہاں اسرائیل کی بدیشی تجارت کا خاکہ پیش کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ خاکہ یوں ہے

	تجارت درآمد	تجارت برآمد	میزان
سنہ ۱۹۳۷ء	۷۹۰ لاکھ ڈالر	۳۲۰ لاکھ ڈالر	۴۷۰ لاکھ ڈالر
سنہ ۱۹۴۸ء	۹۶۰ "	۵۰ "	۹۱۰ "
سنہ ۱۹۴۹ء	۳۲۱۰ "	۴۰۰ "	۲۸۱۰ "
سنہ ۱۹۵۰ء	۲۸۷۰ "	۳۷۰ "	۲۵۰۰ "
سنہ ۱۹۵۱ء	۳۴۳۰ "	۴۷۰ "	۲۹۶۰ "

اس نقشے سے عیاں ہوتا ہے کہ بدیشی تجارت میں لگاتار خسارہ اسرائیل کے اقتصادی نظام کی کمر توڑ رہا ہے۔ اسرائیل قائم ہونے کے بعد ابتدائی دور میں غیر ممالک کے یہودیوں اور یہودیوں کی انجمنوں نے قرضوں یا تحفوں کی شکل میں جو امداد بھیجی تھی اس سے تجارتی خسارہ پورا کرنے کا کام بھی لیا گیا۔ لیکن اب آہستہ آہستہ یہ تمام راستے بند ہوتے جا رہے ہیں اور حکومت اسرائیل کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لئے صرف ایک ہی راہ ہے اور وہ ہے اسرائیل کی صنعتی ترقی خیال رہے کہ اسرائیل بھی ایشیا کے دیگر ممالک کی مانند دراصل زراعی نظام کا ملک ہے۔ صنعتی نظام کا ملک نہیں۔ اسرائیل قائم ہونے پر اہل یہود کو ورثہ میں جو کچھ ملا تھا وہ صحرائے نجف اور یروشلم کے مذہبی کھنڈر تھے۔ صنعتوں کا تو فقدان تھا۔

صنعتی پلان

اسرائیل کی حکومت نے صنعتی ترقی کے پلان کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا (۱) صنعتی پروگرام۔ (۲) تعمیری پروگرام۔ (۳) زراعتی پروگرام صنعتی پروگرام کا شمارہ یوں ہے۔

صنعتوں کی نوعیت	خرچ کا اندازہ
کپڑے	۲۶،۰۰۰،۰۰۰ ڈالر
دھاتوں کے کارخانے	۱۶،۰۰۰،۰۰۰ "
خوراک اور تمباکو	۱۱،۵۰۰،۰۰۰ "
عمارتی سامان اور لکڑی	۶،۰۰۰،۰۰۰ "
ادویہ	۴،۵۰۰،۰۰۰ "
کاغذ	۲،۰۰۰،۰۰۰
شیشے کا سامان	۱،۰۰۰،۰۰۰
متفرق	۳،۵۰۰،۰۰۰
میزان	۷۰،۵۰۰،۰۰۰

ان تجاویز کے علاوہ یروشلم میں جوتے بنانے کی ایک نئی فیکٹری قائم کی گئی ہے۔ جہاں شروع سے لے کر آخر تک مشینوں کے ذریعے سے کام ہوتا ہے۔ طل ابیب (Tel Aviv) اور حیفہ کے درمیان ربڑ کے ٹائر تیار تیار کرنے کی ایک فیکٹری قائم کی جا رہی ہے۔ امریکہ کی مشہور فرم قیصر فریزر

(Kaiser Fraiser) کی طرف سے حیفہ میں موٹریں تیار کرنے کا کارخانہ کھولا گیا ہے۔ اس کارخانے میں تیار ہونے والی موٹر گاڑیاں اسرائیل کی ضروریات پورا کرنے کے علاوہ دیگر ممالک کو بھی بھیجی جا رہی ہیں۔ سیمنٹ کے دو بہت بڑے کارخانے بھی قائم کئے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بجلی کی موٹریں۔ لوہے کی نالیاں اور کنکریٹ کی نالیاں تیار کرنے والے کارخانے بھی بنائے جا رہے ہیں جیفہ میں تیل صاف کرنے کا کارخانہ کھولا جا چکا ہے۔ بجلی کا سامان تیار کرنے کے لئے ہالینڈ کی ایک کمپنی نے اپنی شاخ کھول دی ہے۔ لیکن صنعتی ترقی کا کوئی بھی پلان محض کارخانے قائم کر دینے سے مکمل نہیں ہو جایا کرتا۔ اس کے لئے لوازم کا مہیا کرنا بھی ازبس ضروری ہوتا ہے۔ ان صنعتی لوازم میں ڈاک خانوں، تارگھروں، ریلوں، سڑکوں، بندرگاہوں اور جہازوں وغیرہ کو شامل کیا جاتا ہے۔ اسرائیل سرکار بھی ان ضروریات سے غافل نہیں۔ صنعتی ترقی کے پلان میں ان مدّوں کا جو جائزہ تیار کیا گیا ہے وہ یوں ہے۔

نوعیت	خرچ کا اندازہ
ڈاک خانوں۔ تارگھروں وغیرہ پر	۱۲،۰۰۰،۰۰۰ ڈالر
موٹر گاڑیوں کی ٹرانسپورٹ پر	۲۰،۰۰۰،۰۰۰ "
ریلوے لائنوں پر	۹،۰۰۰،۰۰۰ "
بندرگاہوں پر	۲۰،۰۰۰،۰۰۰ "
جہازوں کی خرید پر	۵،۰۰۰،۰۰۰ "
میزان	۶۶،۰۰۰،۰۰۰ "

زراعتی دائرے میں اسرائیل کے دریاؤں سے بجلی پیدا کرنے کی تجاویز بھی زیر غور ہیں۔ ان اسکیموں سے نہ صرف بجلی پیدا ہو سکے گی بلکہ آبپاشی کے لئے پانی بھی دستیاب ہو سکے گا۔ اس وقت اسرائیل میں صرف ۷۵،۰۰۰ ایکڑ میں آبپاشی ہو سکتی ہے۔ جب یہ اسکیم مکمل ہو جائے گی تو صحرائے نجف کا حلیہ ہی بدل جائے گا اور آبپاشی میں بہت زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔ اس اسکیم کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے ۵۲،۶۴۰،۰۰۰ ڈالر خرچ ہوں گے۔

معدنیات

صنعتی ترقی کے لئے معدنیات بھی ازبس ضروری ہوتی ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے اسرائیل میں معدنیات کی کمی ہے۔ جنوبی افریقہ کی مانند نہ تو وہاں سونے اور ہیروں کی کانیں دستیاب ہو سکی ہیں۔ نہ عرب ممالک کی مانند وہاں تیل دستیاب ہو سکا ہے۔ حالانکہ پڑوس کے سعودی عرب، عراق اور کویت میں تیل کے دریا بہہ رہے ہیں۔ گو معدنیات کے ماہرین کا قیاس ہے کہ نجف کے علاقے میں تیل مل سکتا ہے۔ لیکن ابھی تک اس سلسلے میں ہر سعی ناکام رہی ہے۔ اسرائیل میں لوہا اور کوئلہ بھی نہیں۔ اس لئے ملک کو صنعتیں چلانے کے لئے ان اشیاء کو باہر ہی سے منگوانا پڑے گا اور یہ بات اس کی صنعتی ترقی میں ہمیشہ رکاوٹ بنی رہے گی۔ اتنا ضرور ہے کہ اسرائیل کے جنوبی خطے میں کچھ ایسی معدنیات پائی گئی ہیں جو لوہے اور تیل کی طرح بیش قیمت اور اہم تو نہیں لیکن فائدہ بخش ضرور ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ نجف میں فاسفیٹ (Phosphates) کافی مقدار میں پایا گیا ہے۔ بدیں وجہ حیفہ میں اس فاسفیٹ سے کیمیائی کھاد تیار کرنے کا ایک کارخانہ تیار کیا گیا ہے۔ اسی طرح نجف میں بڑھیا قسم کی سلی کیٹ ریت (Silicate Sand) پائی گئی ہے۔ یہ ریت شیشے کا سامان تیار کرنے کے کام آتی ہے۔ ابھی تک حیفہ میں شیشے کا ایک کارخانہ تھا جو اس ریت کو بلجیم سے منگواتا تھا۔ اب نہ صرف بلجیم سے ریت کی درآمد بند ہو رہی ہے بلکہ شیشے کا ایک اور کارخانہ بھی قائم کیا جا رہا ہے۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ اسرائیل میں چینی کا سامان تیار کرنے کی صورت بھی پیدا ہو چکی ہے۔ کیونکہ اس کے لئے جس مٹی کی اشد ضرورت ہوا کرتی ہے وہ اسرائیل میں دستیاب ہو گئی ہے سب سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ اسرائیل میں تانبے کی کانیں بھی ڈھونڈ نکالی گئی ہیں۔

سرمایہ

صنعتوں کے تین اشیاء کی بنیادی ضرورت لاحق ہوا کرتی ہے۔ (۱) سرمایہ (۲) مشینری (۳) کاریگر۔ اسرائیل کے پاس کاریگر تو ہیں لیکن سرمایہ بھی نہیں اور مشینری بھی نہیں۔ اس مشکل کو عبور کرنے میں اسرائیل کی نجات پنہاں ہے۔ خیال رہے کہ پچھلی جنگ عظیم (۴۵-۱۹۳۹) کے دوران میں جب فلسطین انگریزوں کے زیر سایہ تھا تو ہندوستان کی طرح فلسطین کے حساب میں بھی برطانیہ کے ذمہ اسٹرلنگ قرضوں کی رقم کثیر جمع ہو گئی تھی۔ لیکن آج وہ اندوختہ قریب قریب بے باک ہو چکا ہے اس لئے بدیشی ملکوں سے سرمایہ حاصل کیا جا رہا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اسرائیل نے ۳۱ر دسمبر ۱۹۵۱ء تک بدیشی قرضوں کی شکل میں کل ۲۱۶۸ لاکھ ڈالر حاصل کئے تھے۔ ان میں سے امریکہ کے (Export Import Bank) نے جنوری ۱۹۴۹ء میں

۱۰۰۰ لاکھ ڈالر دئیے تھے - اور یہ رقم ۵۳-۱۹۵۲ء میں بے باک ہو جانی چاہئیے تھی اس کے علاوہ اس بنک کی طرف سے ۳۰۵ لاکھ ڈالر کا ایک اور قرضہ دسمبر ۱۹۵۰ء میں دیا گیا تھا - اس قرضے کو ۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۵ء تک کی مدت میں بے باک کیا جانا پڑے گا - ۱۹۵۱ء میں اسرائیلی سرکار کی طرف سے امریکہ میں "آزادی کی ہنڈیاں" (Independence Bond) جاری کی گئی تھیں - ان سے کل ۵۰۰ لاکھ ڈالر دستیاب ہوئے تھے - انہیں ۱۹۶۶ء تک بے باک کرنا ہوگا

مزید برآں فرانس سے ۸۶ لاکھ ڈالر کا قرضہ لیا گیا تھا جو ۱۹۵۶ء تک بے باک کرنا ہوگا - اس کے علاوہ غیر ممالک سے کچھ ایسے قرضے بھی لئے گئے تھے جو بدیشی سکوں میں تھے - ان کی تفصیل یوں ہے -

سوئٹزرلینڈ سے — ۲۱ لاکھ فرانک

بلجیم سے — ۹۹۷ " فرانک

ہالینڈ سے — ۱۱۳ " گلڈر

برطانیہ سے — ۲۵۷ " پونڈ

بدیشی امداد میں اہل یہود کو امریکہ نے بیشتر مالی امداد دی ہے - حال ہی میں ایک اور ماخذ بھی نمودار ہوا ہے - ایک سرکاری اعلان میں بتایا گیا ہے کہ مغربی جرمنی کی حکومت نے اسرائیل کو ۲۵۰۰ لاکھ پونڈ دینے منظور کئے ہیں - یہ رقم ان نقصانات کا بدلہ ہوگی جو جرمنی میں یہودیوں کو ہٹلر کی نازی گورنمنٹ کے ہاتھوں برداشت کرنے پڑے تھے - یہ رقم اشیاء کی شکل میں ادا کی جائے گی -

بیرونی امداد کے علاوہ ملک کے اندرونی ذرائع سے بھی سرمایہ حاصل کرنے کی تجاویز زیر غور ہیں - ایک تجویز تو یہ ہے کہ ملک میں جائیدادوں پر ۱۰ فیصدی جائیداد ٹیکس نافذ کیا جائے - مزید برآں ۲۹ جون ۱۹۵۲ء کو اعلان کیا گیا تھا کہ اسرائیلی سرکار ایک لازمی قرضہ (Compulsory Loan) کی اسکیم بھی نافذ کرے گی - اس قرضے کی اسکیم سے اندازاً ۲۵۰ لاکھ پونڈ وصول ہوں گے اس اسکیم کے ماتحت موجودہ سرکاری نوٹوں کو بدل کر نئے نوٹ جاری کئے جائیں گے جن کی قیمت ۱۰ فیصدی کم ہوگی - اس طرح جو رقم وصول ہوگی اُسے ۱۵ سالہ سرٹیفکیٹ کی صورت میں بے باک کیا جائے گا -

صنعتی ترقی کے متعلق اسرائیل کی یہ پیش قدمی قابل ستایش ہے - خیال رہے کہ ۳۰ سال پہلے اسرائیل (سابق فلسطین) میں موجودہ طرز کی صنعتوں کا کلیتاً فقدان تھا - لیکن آج صورت مختلف ہے - اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱۹۵۰ء میں ۲۰۰۰ لاکھ پونڈ کی اشیا اسرائیل کے کارخانوں اور ورکشاپوں میں تیار کی گئی تھیں - اور اسرائیل کے صنعتی اداروں میں اس وقت قریباً ایک لاکھ نفوس کام کر رہے ہیں - یہ اندازہ لگانا اتنا مشکل نہیں کہ جب اسرائیل کا مجوزہ صنعتی پلان تکمیل پذیر ہو جائے گا - تو ملک میں صنعتوں کا جال بچھ جائے گا اور صنعتی پیداوار کئی گنا بڑھ جائے گی - آثار بتاتے ہیں کہ وسط مشرق کے اُفق پر یہ نیا ستارہ ایک روشن مستقبل کا حامل ہے -

کسی حد تک یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اسرائیل کا قیام اہل یہودیوں کی ایک پرانی پیش گوئی کا مرہون منّت ہے - لیکن اسرائیل کا مستقبل اہل یہودیوں کی تعمیری صلاحیتوں کے لئے ایک کھلا چیلنج ہے - یہودی قوم کو فخر حاصل ہے کہ وہ مشہور عالم سائنس دان اور حساب دان آئین سٹائین (Ein Stein) کمیونزم کے بانی کارل مارکس (Karl Marx) روس کے انقلابی سیاست دان لینن (Lenin) برطانیہ کے وزیر اعظم ڈسرائیلی (Disraeli) مشہور فلسفی فراسٹ (Fraust) اور جنگ (Jung) اور شہرہ آفاق اخبار نویس لارڈ راد میئر (Lord Rather Mayer) ایسے روشن ضمیر سپوت پیدا کر سکتی ہے - جو قوم دو ہزار سال تک نت نئے مصائب و مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرتی رہی ہے وہ قوم صحرا کو گلستان بنانے کی تاب اور لیاقت کیوں نہیں رکھتی اہل یہودیوں کا مستقبل بحیثیت قوم اسی کام پر منحصر ہے -

اختر قادری

یہ مانجھی!

یہ خستہ حال سفینہ! یہ شورشِ طوفاں
جھپٹتی لہر، ٹھمکتی ہوا، بپھرتے نہنگ
اُمید و بیم کی اُلجھن، حیات و موت کی جنگ
پہنچنا ساحل مقصود تک نہیں آساں!

انہیں کا کام ہے یہ، جن کے حوصلے ہیں بلند
ہے جن کا قلب و نظر عزم و شوق سے آباد
جو رکھتے ہیں نفسِ گرم، بازوئے فولاد
سکون سے کہیں بڑھ کر جنہیں خطر ہے پسند

یہ دھان پان، گل اندام، نازنیں بانکے
کمر لچکتی ہے موجِ نسیم سے جن کی
مرے نصیب! یہ مشکل کا وقت یہ مانجھی
کلیجہ جن کا دھڑکتا ہے شورِ طوفاں سے

ضعیف ہاتھوں کو پتوار تھامنا ہے آج
کہ زن قماش جوانوں سے سامنا ہے آج

ادیب سہارنپوری

غزل

یہ زندگی۔ یہ اندھیرے ارے معاذ اللہ
نہ جانے کیا ہو۔ اگر تم نہ ہو مرے ہمراہ

حیاتِ تازہ ہے جس انقلاب کے ہمراہ
ہر ایک چیز اب اس کے لئے ہے چشم براہ

ترا جمالِ تبسم۔ تری حسین نگاہ
کبھی نمودِ سحر ہے مجھے۔ کبھی شب ماہ

مری ہی طرح۔ ترے دل کا چین بھی ہے تباہ
تری نگاہ کی محتاط رنجشیں ہیں گواہ

گزر رہا ہوں جگر چیرتا اندھیروں کے
کرن کی طرح مرے ساتھ ہے وہ نگاہ

یہ غم سہے گا۔ کہاں تک ترا دلِ معصوم
بہت کٹھن ہے محبت میں انتظار کی راہ

ہجوم سب سے زیادہ اسی کے در پہ رہا
اگرچہ حُسن پرستی۔ ثواب ہے نہ گناہ

ہمیں وہ رنج دئیے پے بہ پے زمانے نے
کہ دل میں امن و مسرت کو مل سکی نہ پناہ

یہ رازِ لغزشِ آدم نے آشکار کیا
گناہ گار وہی ہے جو کر سکے نہ گناہ

ہوا یہ پہلے پہل دیکھ کر نہیں محسوس
کہ جانے کب سے تمہاری ہی منتظر تھی نگاہ

گناہِ عشق سے بڑھ کر نہیں ہے کارِ ثواب
ہم اس کے بعد کوئی اور کر سکے نہ گناہ

پھرے ہے کرتا ادیب اب یہاں وہاں شکوے
غریب کھیل سمجھتا تھا مہوشوں سے نباہ

تاجور سامری

کھوکھلا وقار

خوبصورتی اور آرائش کون پسند نہیں کرتا۔ پھر وہ تو فن کار تھا۔ حسن، سجاوٹ اور نفاست سے مناسبت ہونا اُس کے لیئے ایک قدرتی بات تھی۔ اُس کا اُٹھنا بیٹھنا ایسے لوگوں میں تھا جو سوسائٹی میں معزز خیال کیئے جاتے ہیں۔ یعنی کالج کے پروفیسر، اخبار اور ادبی رسالوں کے ایڈیٹر اور ادیب و شاعر۔ جیب میں چاہے دوّنی چاہئے کے لیئے نہ بھی ہو، مگر سر پہ تیل، کلین شیو اور صاف سُوٹ تو ضرور چاہیئے تاکہ وقار قائم رہے۔ مگر عجیب اتفاق تھا کہ جیسے جیسے اُس نے اپنی پُرانی باطنی اور ذہنی کینچلی اُتار پھینکی اور ظاہری پہناوے میں بھی تبدیلی لایا، اُس کا ہاتھ تنگ ہی ہوتا گیا۔ نیا عقیدہ اپناتے ہی اُس کی اقتصادی مشکلات میں گرفتار ہو گیا، مگر اُس نے اپنے کھوکھلے وقار کو قائم رکھنے کی کوشش میں خوب ہاتھ پاؤں مارے۔ اپنے دوستوں اور چھوٹے بھائی کے پُرانے دھرانے سوٹ ہی ٹھیک ٹھاک کر کے اپنے کو اپ ٹو ڈیٹ بنانے لگا، اور خیالی پلاؤ ذرا تیزی سے پکنے لگے۔ وہ سوچتا اور امیدیں باندھتا کہ اب جو کہانی ہندی رسالے میں چھپے گی اُس کا معاوضہ پچیس روپے تو کہیں نہیں گیا۔ اس طرح دو تین ہندی رسالوں میں کہانیاں چھپیں گی اور معاوضے کے روپے سے ایک اچھا سوٹ بنوایا جائے گا۔ ورنہ نئی کتاب کی رائلٹی تو فوراً اسی کار نیک میں صرف کروں گا۔ مگر اُس کے امیدوں کے جال میں کوئی چِڑیا نہ پھنسی۔ ہندی رسالوں سے تو اُس کی کہانیاں اس نوٹ کے ساتھ واپس آجاتیں کہ اُن میں شرنگار رس ہے ہی نہیں۔ ذرا پریم پیار کی رنگینی ہوتی تو چھپ جاتیں۔ وہ بھنّا جاتا، کیونکہ وہ پریم پیار کی رنگینی لاتا کہاں سے؟ پریم نام کی چِڑیا تو کبھی اُس کی زندگی میں آہی نہ سکی تھی۔ اور جب سے وہ حقیقت پسند ہُوا تھا، تجربے سے باہر کی چیز کو اپنے ادب میں سمو ہی نہیں سکتا تھا۔

اور اگر کوئی رسالہ کسی کہانی کو منظور بھی کر لیتا، تو روپے یا تو امید سے بہت ہی کم آتے، یا اتنی دیر سے ملتے کہ سُوٹ کی اُمید کچا دُھاگا کر ٹوٹ کر رہ جاتی۔ کتاب کی رائلٹی بھی ڈھول کا تار بنی رہتی اور وہ پبلشروں کو بد معاملگی پر گالیاں دیتا ـــ کم از کم ڈیڑھ برس سے یہ چکر چلا رہا تھا۔ نومبر بیت گیا۔ سردی چمکنے لگی۔ اُس کے پاس گرم سوٹ نہیں تھا۔ اور دوستوں کی محفل میں اس عالم میں جانا اُسے اپنی توہین محسوس ہوتی تھی۔ اس کے پاس بہت پہلے کا ایک اوورکوٹ اور ایک چھوٹا گرم کوٹ تھا، ایک پُرانی سی گرم پتلون بھی۔ مگر یہ خود اُس کی نظر میں اب گھٹیا چیزیں تھیں۔ دوست احباب کب کیڑے نکالنے سے باز آئیں گے! خاص طور پہ وہ لمبا تڑنگا ہنسوڑ تیج بھان تو مارے طنزیہ تیروں کے اُس بوسیدہ سُوٹ کے ساتھ اس کھوکھلے وقار کو بھی چھلنی کر دے گا۔ اس خوف سے وہ ٹھنڈی پتلون اور ٹھنڈی بُشرٹ پہنے ہی بزم احباب میں جاتا۔ لوٹتے ہوئے رات ہو جاتی اور آنا بھی شہر سے دو میل دُور باہر ہوتا۔ سردی سے دانت بجتے، بدن سرد کپکپیوں اور جھرجھریوں سے اینٹھنے لگتا، اور وہ پھر خیالی پلاؤ کے ذائقے چکھنے شروع کر دیتا۔ اب کی! اب کی ضرور۔! بس اُس کہانی کے پیسے آتے ہی گرم کوٹ تو بنوا ہی لوں گا۔ اکثر دوست احباب سردی کا ذکر کرتے تو وہ اُن کی آنکھوں میں ایک ذلّت آمیز جھلک ضرور پاتا۔ اور وہ تیج بھان کی مسکراتی ہوئی تیز آنکھیں تو اُسے مارے ہی ڈالتیں۔ گھر آتا تو کھونٹی سے ٹنگے ہوئے اوورکوٹ اور پُرانے سوٹ پہ بلا ارادہ اُس کا ہاتھ پڑ جاتا، اور ساتھ ہی کھوکھلا وقار کانسی کی تھالی کی طرح بج اُٹھتا۔ ارے رے..... کیا کرتے ہو، پرانے کپڑے گندے اور بدبودار..... اور غیر ارادی طور پہ وہ ہاتھ کو جھٹک کے الگ کر لیتا۔ جیسے اُس کا ہاتھ بے خیالی میں کسی گندی چیز پہ پڑ گیا ہو ــ اور یہ گندگی کا احساس اُس کے دماغ پہ سوار ہو گیا تھا ـــ وہ چلّا کر کہتا ـــ "یہ کیا مصیبت ہے؟ گھر میں صفائی کا ذرا خیال نہیں۔ کم بخت عجب دیکھو......" یہ چیخ پکار سن کر اُس کی ماں رسوئی سے کام چھوڑ کر گھبرائی سی آجاتی۔ اُس کا چھوٹا بھائی دوڑا آتا۔ ان کو دیکھ کر وہ کھسیا سا جاتا، اور پسور کر کہتا میرا مطلب ہے، یہ گندے کپڑے آخر کب تک یہاں پڑے رہیں گے، دے کیوں نہیں دیتے بھنگی کو، ان کو میری آنکھوں سے دُور کر دو، ورنہ میں آگ لگا دوں گا ـ یہ کہہ کر وہ اپنے ٹھنڈے اور سرد مہر سے بستر میں گھس کر مُنہ سر لپیٹ لیتا۔ دھیرے

دھیرے اُس کا بستر گرم ہو جاتا، اور وہ مُنہ نکال کر دیکھتا تو دیئے کو جلتا پاتا، اوور وہ اوورکوٹ اور پُرانا سُوٹ .... اُسے سامنے ٹنگے نظر آتے، اور وہ بھنّا کر پھر لحاف میں مُنہ لپیٹ کر پڑ جاتا۔

ایک شام اُس نے دیکھا ــــ تیج بھان بار بار اپنے صاف گرم کوٹ کا کالر اُوپر کو چڑھانے کی کوشش کرتا۔ آخرکار اُس کا بھید کھل گیا۔ ڈی پیٹھے کا لڑکا قمیض پہنے تھا اور کوٹ کا کالر بھی پھٹا ہوا تھا ...... اور اُس کے ساتھ بیٹھا پروفیسر چھپکلی اپنی پتلون کے ہپ پر لگے پیوند کو بار بار چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بات کا رُخ بدلنے کی کوشش کرتا ــــ اور وہ "اپنے ٹھنڈے مگر بے داغ اور بے نقص سوٹ پر نازاں رہا۔ لوٹتے وقت رات بلا کی ٹھنڈی ہو گئی تھی اور وہ بڑی کوفت اور مصیبت کے عالم میں گھر پہنچا۔ راستے میں اُس نے طے کر لیا تھا کہ کل اور نہیں تو کم از کم اُس گرم کوٹ کو ڈرائی کلین کرا لوں گا .... وہ تیج بھان کے کوٹ سے تو اچھا ہی ہے کم بخت! اور پتلون بھی پروفیسر چھپکلی کی پیوندلگی پتلون سے کم از کم اس معاملے میں اچھی ہے کہ اُس میں کہیں پیوند نہیں ...... یقیناً وہ ایک اچھا سوٹ بن سکتا ہے۔ ذرا رنگ کروا لوں گا۔ بالکل نیا دکھائی دے گا۔

خیالی پلاؤ کے ذائقے اُس کو ذہنی تسکین دے رہے تھے۔ اُس کی چال میں تیزی اور بدن میں ایک خوشگوار گرمی پیدا ہو گئی تھی۔ گھر آیا اور کمرے میں داخل ہُوا تو کھونٹی ویران تھی۔ اُس نے اپنی آنکھوں کو ہاتھوں سے ملا اور پھر آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ کھونٹی کو واقعی خالی پایا۔ اُس نے سوچا، کل جو ماں کو جھاڑ بتائی تھی، کہیں اُس نے وہ سُوٹ مہتر کو نہ دے دیا ہو! یہ تو ایک حماقت کی بات ہو گی۔ اگر اس نے مہتر کو بخش دیا وہ سُوٹ! ــــ اچھا بھلا سوٹ تھا، اور وہ اوورکوٹ بھی تو دکھائی نہیں دیتا۔ کہاں غائب ہو گیا یہ سب کچھ؟ ــــ اس نے چلّا کر ماں کو آواز دی وہ گھبرائی سی رسوئی میں داخل ہوئی۔

"اب کیا ہے، وہ پُرانی پتلون اور اوورکوٹ تو اب دے دیا!"

"ہائیں! دے دیا؟" اُس نے بالکل چیخ کر کہا۔

"اور کیا! تمہیں کہتے تھے۔ مگر"

"میں اگر مگر نہیں سننا چاہتا ــ اور وہ اوورکوٹ؟"

"وہ ــ وہ چھوٹے سے پوچھنا۔ آؤ کھانا کھا لو، ٹھنڈا ہو رہا ہے ــــ وہ پرسوں لوٹے گا ــ" اُس کی ماں نے جلدی سے بات ختم کرنے کی کوشش کی۔

وہ بھنّا گیا۔ اور اپنی آخری اُمید کو دو پیٹ کر بغیر کھانا کھائے ہی اپنے ٹھنڈے بستر میں گھس گیا۔ اُسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ بھاری بھاری برف کے ڈلوں میں دبا دیا گیا ہو۔ اُس کی ماں اُس کی عادت کو جانتی تھی، اس لئے بغیر کچھ کہے چلی گئی اور وہ دھیرے دھیرے گرم ہو کر سو گیا۔

دوسرے دن اُسے پندرہ روپے کا ایک منی آرڈر کہانی کے معاوضے کے طور پر ایک ہندی رسالے کی طرف سے ملا۔ امیدوں نے پھر اُسے سہارا دیا، مگر پندرہ روپے تو صرف سلائی کے ہوں گے، کپڑا؟ ــ پھر ناامیدی نے سر اُٹھایا ہی تھا کہ ایک چمکدار ضرب نے مایوسی کا پھن کچل دیا ــ پندرہ روپوں میں کباڑیوں سے کام ہو سکتا ہے۔ کھوکھلے وقار نے جھنجھلا کر کہا۔ ارے یہ بے ہودگی ہے، مُردوں کے کپڑے ہوتے ہیں وہ! ..... اور ضرورت کے احساس نے اُس کو بھی زخمی کر دیا ..... سبھی اتنے سوٹ نہیں پہن سکتے؟ کیا عجب، وہ لوگ بھی ... اُس کا ارادہ پکّا ہو گیا۔

دن ڈھلے وہ پُرانے کپڑوں کی دوکان میں گھس گیا۔ کئی لوگ اپنی اپنی پسند کی چیزوں کے بھاؤ تاؤ کر رہے تھے .... ایک جگہ آ کر وہ رُک گیا۔ ہینگر پر ایک سوٹ ٹنگ رہا تھا، ڈرائی کلین کیا ہُوا۔ بٹن اور کالر پر بلبل کی کڑھی ہوئی تصویر اُس کے پُرانے سوٹ سے ملتی تھی۔

اجی ہٹاؤ، وہ یہاں کہاں؟ وہ تو مہتر کو بخش دیا گیا۔

"یہ امریکن سُوٹ ہے" اُس نے اشتباہ کو ختم کر دیا۔

"کیوں صاحب، کیا دام ہیں اس سوٹ کے؟"

"تیرہ روپے ــ نہ کم نہ زیادہ۔"

"اور رعایت؟"

"ساڑھے بارہ تو مجھے اس کے کل مل رہے تھے۔ بہت محنت کی ہے اس پر۔"

اس نے زیادہ بحث میں نہ پڑتے ہوئے پندرہ کے نوٹ نکالے اور دو روپے واپس لے کر سوٹ لے لیا۔ اور گھر آ کر پہلے صابن سے خوب مل کر نہایا، سر میں آملے کا تیل ڈالا۔ اتنے میں اُس کا چھوٹا بھائی ایک بہت اچھا سا صاف اوورکوٹ پہنے مسکراتا ہوا آیا۔

اُس نے حیرت سے کہا۔ "یہ اوورکوٹ کہاں سے اڑایا اُستاد؟"

"اپنا ہی ہے، ڈرائی کلین کرا لیا تھا۔"

شام کو دوستوں کی محفل میں گیا۔ تو اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ کھوکھلا وقار ابھی زخمی تھا۔ سب اُس کے نئے سوٹ کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

محمد حسن

مرزا رُسوا کی شخصیت

"امراؤ جان ادا" کے مصنف کے بارے میں ہمارا علم بڑا محدود ہے۔ جو شخص اودھ کی سماجی زندگی کے اس قدر متنوع اور مختلف پہلوؤں کو یکساں طور پر پوری طاقت اور شدّت کے ساتھ پیش کر سکے یقیناً اس کے مشاہدے اور تجربات کا میدان بھی بڑا وسیع ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ امراؤ جان ادا تاریخ نہیں ناول ہے۔ اور اس میں حقیقت کی پرچھائیاں افسانوی انداز میں نظر آتی ہیں۔ لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مرزا رسوا کی شخصیت اور اُن کی زندگی بھی انھیں افسانوی پرچھائیوں سے تعمیر ہوئی ہے۔

تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ عہدِ جدید نے اُن کے عظیم شاہکار "امراؤ جان ادا" کا صحیح ادبی مقام پہچاننے کے باوجود مصنف کے سوانح حیات کے بارے میں کچھ توجہ نہ کی۔ میں نے جو معلومات فراہم کی ہیں اُن کے ذرائع محدود ہیں۔ ان میں سے کچھ باتیں پرانے لکھنؤ اور اس کی ادبیات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات سے دستیاب ہوئی ہیں اور کچھ قدیم اُردو جرائد کے فائلوں سے یہ معلومات انتہائی تشنہ ہیں اور تصویر کی محض کچھ جھلکیاں پیش کرتی ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ کچھ عرصے میں میں اس تصویر کو زیادہ واضح اور مکمل صورت میں پیش کرسکوں گا۔

مرزا رسوا کا اصل نام مرزا محمد ہادی تھا، اور یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ رُسوا اُن کا تخلّص بھی نہ تھا۔ انھوں نے غزلوں میں مرزا تخلّص کیا ہے۔ لیکن اس دَور کی تہذیب اور دستورِ اخلاق کے لحاظ سے "امراؤ جان ادا" ناول لکھتے ہوئے اُسے انھوں نے اپنے نام سے منسوب کرنا مناسب نہ سمجھا اور ایک فرضی نام مرزا رُسوا اختیار کیا، لیکن یہ بات بہت جلد معلوم ہوگئی کہ یہ ناول مرزا محمد ہادی کی تصنیف ہے، اور اس کے بعد وہ رسوا ہی کے نام سے مشہور ہوگئے۔ اس بات کی کئی شہادتیں موجود ہیں کہ مرزا نے مرزا رسوا کے نام سے ایک فرضی کردار ایجاد کرنے کی کوشش کی تھی۔ امراؤ جان ادا کے بعد ان مرزا رسوا کی داستان انتقاماً امراؤ جان ادا کے فرضی نام سے لکھی گئی "اُم تار رُسوا" کے نام سے چھپی۔

اس سے ظاہر ہے کہ امراؤ جان ادا اور مرزا رسوا دونوں ابتداءً فرضی کردار تھے۔ بعد کو رسوا مرزا محمد ہادی کا تخلّص قرار پا گیا، اور امراؤ جان ادا کو لوگوں نے ایک تہذیب یافتہ اور تعلیم یافتہ طوائف سمجھ کر مرزا رسوا کی داستان کو اس کی تصنیف قرار دے دیا اور اس افسانے کی بنا پر مرزا محمد ہادی رسوا کے بارے میں مختلف روایتیں باور کرلیں۔ مثلاً یہ کہ وہ ایک فرانسیسی عورت کے عشق میں بے قرار رہتے تھے جو انھیں چھوڑ کر فرانس چلی گئی تھی اور واپس آنے کا وعدہ کر گئی تھی۔ ان افسانوں کی حقیقت اسی قدر ہے جتنی خود امراؤ جان ادا کی۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ لوگوں نے افسانے پر حقیقت کا گمان کرلیا ہو۔ مشہور ہے کہ لوگ جارج ایلیٹ کی رُمولا کو حقیقی کردار سمجھ کر فلورنس میں اس کا مکان ڈھونڈا کرتے تھے۔ اردو ادب کی تاریخ میں یہ بھی کوئی نئی بات نہیں ہے کہ کسی مصنف نے دستورِ تہذیب کے لحاظ سے ناول اور افسانوں کو اپنے نام کی بجائے فرضی نام سے لکھا ہو۔ امانت لکھنوی نے اندر سبھا کی تصنیف میں استاد کے تخلّص سے کام لیا ہے اور اسے اپنے نام سے منسوب نہیں کیا۔ حالانکہ آخر میں یہ پردہ اُٹھ گیا۔

بچپنے ہی میں مرزا کے سر سے والدین کا سایہ اُٹھ گیا تھا۔ چچا اور چچی نے اُن کی پرورش کی مگر ان دونوں بزرگوں کا بھی انتقال ہوگیا اور مرزا تنہا رہ گئے۔ اس زمانے میں اسکول میں پڑھتے تھے۔ عُسرت کے باوجود تعلیم ترک کی اور جاری رہی۔ پڑھتے رہے اور اسباب خانہ داری فروخت کر کے بسر کرتے رہے۔ مرزا کے ایک قریبی دوست سید افتخار حسین صاحب نے لکھا ہے کہ ایک میم صاحبہ اُن کی چچی کے ہاں آیا کرتی تھیں جو بعد کو لکھنؤ سے باہر چلی گئی تھیں۔

اُن کو جب مرزا کا حال معلوم ہوا تو اُنھیں بہت رنج ہوا اور انھوں نے کچھ مدد کرنا چاہی۔ مگر مرزا کی غیرت نے قبول نہ کیا وہ وقتاً فوقتاً لفافے میں رکھ کر کچھ نوٹ بھیج دیا کرتی تھیں، مگر کبھی اپنا نام اور پتہ نہیں لکھا کہ مبادا مرزا واپس کردیں، اس طرح مرزا نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ فرانسیسی خاتون کا جو قصہ مرزا کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے ممکن ہے وہ اسی واقعے کا ایک عکس ہو اور اس میں شک نہیں کہ جب مرزا نے امراؤ جان ادا کے نام سے فرضی مرزا رسوا کی کہانی لکھی تو اس کی ترتیب میں یقیناً اس حادثے کا شدید عکس رہا ہوگا۔

انٹرنس کے بعد مرزا نے کل اثاثہ فروخت کرکے کتابیں خریدیں اور ضروری اشیا فراہم کرکے رڑکی کالج میں داخل ہوگئے، اور اوورسیری کا امتحان پاس کرلیا، کوئٹے میں تعینات ہوئے ستّر روپیہ تنخواہ اور بیس روپیہ الاؤنس ملتا تھا۔ مرزا کی اس دور کی زندگی کا عکس اُن کے ناول شریف زادہ میں ملتا ہے اور مرزا جعفر حسین کا کردار حقیقی ہے۔

مرزا کا خرچ نہایت محدود تھا۔ لہٰذا نوّے روپیہ ماہوار میں روپے پس انداز ہونے لگے۔ اسی اثنا میں سائنس کا شوق پیدا ہوا۔ مرزا کی شخصیت میں یک طرفی اور یکسوئی بے انتہا تھی، اُن کا انداز فکر بڑا رومانوی تھا۔ وہ جس جذبے کا شکار ہوتے تھے اُسے انتہا تک پہنچا دیتے تھے۔ لہٰذا سائنس کے شوق میں چھ مہینے کی چھٹی لی اور لکھنؤ چلے آئے۔ یہاں پس ماندہ روپے سے بمبئی سے سائنس کے آلات منگائے۔ سید افتخار حسین نے مرزا کے مطالعے کا حال اس طرح بیان کیا ہے کہ "دال چاول لکڑی خرید کر مکان میں رکھی اور دروازہ اندر سے مقفل کر لیا۔ صرف بہشتی اور مہتر کے آنے پر کھلتا تھا۔ جب بھوک نے ستایا کھچڑی چڑھا دی جیسی بُری بھلی پکی کھالی۔ چھ مہینے اسی استغراق کے ساتھ سائنس کا مطالعہ جاری رہا، چھٹی ختم ہوئی تو استعفیٰ بھیج دیا۔"

جب سارا پس ماندہ روپیہ ختم ہوگیا تو مجبوراً دروازہ کھولا اور ملازمت کی تلاش ہوئی۔ کرسچین کالجیٹ اسکول میں جو اب لکھنؤ کرسچین کالج ہے پچیس روپے ماہوار پر ہیڈ مولوی مقرر ہوئے۔ بعد کو پرائیویٹ طور پر ایک ٹیچر کی حیثیت سے پنجاب یونیورسٹی سے ایف اے اور بی اے کے امتحانات پاس کئے۔

ان کے بی اے پاس کرنے کا ایک لطیفہ مشہور ہے۔ اس زمانے میں انگریزی دانی اس قدر عام نہیں ہوئی تھی، اور بی۔ اے کی ڈگری ایک کارنامہ سمجھی جاتی تھی۔ ایک مسلمان صاحب سے کسی محفل میں ملاقات ہوئی۔ یہ حضرت یو۔ پی میں پہلے مسلمان گریجویٹ تھے اور سر سید احمد خاں نے انھیں مبارکباد کا تار بھی بھیجا تھا، مرزا سے کہیں کچھ بحث ہوئی۔ انھوں نے طنزاً کہا کہ "مرزا صاحب میں بی اے ہوں۔ بی اے کرنا کوئی کھیل نہیں ہے" وغیرہ وغیرہ۔ مرزا کو جوش آگیا دو چار ہجویہ شعر ان کے حسب نسب کے بارے میں کہے، اور خود بی اے پاس کرنے کا تہیّہ کرلیا۔

مرزا صاحب بی اے کا پرائیویٹ امتحان دینے لاہور پہنچے مگر قیام کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ مرزا صاحب کا بیان تھا کہ "جب اسٹیشن پر پہنچے اور تانگے والے نے پوچھا کہ صاحب کہاں لے چلیں تو یہ خیال آیا کہ ٹھہرنے کا کوئی انتظام تو کیا ہی نہیں ہے۔ ہم نے کہا بازار لے چلو۔ جب تانگہ بازار سے گزر رہا تھا تو طوائفوں کے کوٹھے نظر پڑے۔ مرزا نے سامان اُتروا کر ایک کوٹھے کی راہ لی۔ طوائف نے جو دیکھا کہ ایک صاحب مع بستر اور ساز و سامان کے چلے آتے ہیں تو اُس نے حال پوچھا، جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ بی اے کا امتحان دینے کی غرض سے آئے ہیں تو اُس نے اپنے ہاں ٹھہرایا، جب تک وہاں قیام رہا اُس نے گانا بجانا موقوف کردیا، کہ ان کی پڑھائی میں خلل نہ ہو۔ بے حد خاطر تواضع کی اور جب چلتے وقت مرزا نے کچھ معاوضہ دینا چاہا تو اُس نے نہایت سختی سے انکار کیا۔ مرزا نے ساٹھ روپے اُس کے بستر پر پھینک کر چلے آئے۔

بی۔ اے پاس کرنے کے بعد مرزا ہیڈ مولوی سے باقاعدہ ٹیچر ہوگئے۔ مرزا کی انگریزی کی استعداد بہت اچھی تھی۔ چنانچہ افتخار حسین صاحب لکھتے ہیں کہ جب میں کالج میں تھا تو فارسی کورس کا جو انگریزی ترجمہ مرزا نے شائع کیا تھا وہ بہترین ترجمہ سمجھا جاتا تھا۔ مرزا ترقی کرتے کرتے سو روپیہ تنخواہ پانے لگے۔ نہ جانے کس وجہ سے قرضدار ہوگئے تھے۔ اس لئے آدھی تنخواہ اس قرضے کی ادائیگی میں چلی جاتی تھی۔ کرائے کا مکان کالج کے قریب تھا، جو اب بھی موجود ہے دو بیویاں تھیں اور ایک لڑکا تھا۔

مرزا کی دوسری شادی کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ ان کی دوسری بیوی نہایت مالدار اور لکھ پتی تھیں۔ قدیم بیگمات اودھ کی تہذیب اور رسم و رواج کی قائل تھیں۔ ان کی جائداد بھی کافی تھی اور مال و دولت بھی۔ خود پروفیسر مسعود حسن رضوی کا بیان ہے کہ ایک وسیع اور شاندار مکان

ہیں مرزا صاحب سے ملاقات ہوئی جو راجہ کے بازار میں تھا۔ اس کا بڑا شاہانہ پھاٹک تھا اور مکان بھی انتہائی پُرفضا تھا۔ یہ مرزا صاحب کا اپنا مکان تھا جو اور اس وقت تمام جائیداد اور اثاثہ ختم کر چکنے کے بعد وہی ایک مکان رہ گیا تھا۔

مرزا کو جہیز میں اثاثہ اور جائداد کے علاوہ سواری کے لئے ایک گھوڑا بھی ملا تھا۔ اس کے علاوہ جمعرات کے روز ان پر سے صدقہ اُتارا جاتا تھا۔ اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ سسرال سے ایک ماما ایک خوان میں ضروری سامان لے کر آتی تھی۔ بھجنگے اور کوے بھی ہوتے تھے۔ مرزا صاحب کلاس میں پڑھا رہے ہیں وہ مع ساز و سامان کے اندر چلی آئی۔ مرزا صاحب نے کتاب اُلٹ کر میز پر رکھی اور لڑکوں سے کہا "دو منٹ ٹھہر جائیے۔ میرے اوپر سے ذرا صدقہ اُتر جائے۔" کرسی ذرا الگ کر لی۔ اور ماما نے پہلے بھجنگے مٹھی میں پکڑ کر اُن کے سر کے چاروں طرف گھمائے۔ تصدق کئے اور چھوڑ دئے کوا اُن کے سر پر تصدق کیا اور چھوڑ دیا۔ وہ تمام رسوم ادا کر چکی تو مرزا صاحب نے کتاب کھولی اور جہاں سے چھوڑا تھا اس سے آگے پڑھانا شروع کیا۔

مرزا نے کسی عالم میں بھی روپیہ کی پروا نہیں کی۔ کرسچین کالج کی ملازمت سے چھٹی لے کر حیدرآباد چلے گئے۔ وہاں کافی مرفہ الحال ہو گئے تھے۔ چنانچہ جب وہاں سے واپس ہوئے ہیں تو سیکنڈ کلاس میں آئے اور بڑے اہتمام سے رکاب گنج کی ہوادار منزل میں مقیم ہوئے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی کا بیان ہے کہ جب وہ اور مرزا عصفی مرحوم ان سے ملنے ہوادار منزل پہنچے تو بالائی حصے میں مقیم تھے۔ بڑا وسیع کمرہ تھا ایک کونے میں ٹاٹ بچھا ہوا تھا اور اس پر مرزا بیٹھے ہوئے تھے، دو دریاں اس کے برابر غالباً آنے جانے والوں کے لئے بچھا دی گئی تھیں۔ حیدرآباد سے واپس آنے کے تھوڑے ہی عرصے بعد کا یہ نقشہ کافی عبرت ناک ہے۔

مرزا چھٹی لے کر حیدرآباد گئے تو اپنی جگہ عارضی طور پر کسی اور صاحب کو مقرر کرا گئے۔ اُنھوں نے چھ مہینے میں کچھ ایسی چال چلی کہ مرزا کی نوکری جاتی رہی اور اُن کا تقرر ہو گیا اور اُنھوں نے پچاس روپیہ ماہوار قبول کر لئے۔ جب مرزا کو پتہ چلا تو لکھنؤ آئے۔ پرنسپل نے کہا کہ اگر آپ اس جگہ پر آنا چاہتے ہیں تو ہم پچاس روپیہ ماہوار سے زیادہ نہ دیں گے۔ مرزا نے پچاس روپے ہی قبول کر لئے اور اُن کی تنخواہ سو سے گھٹ کر پچاس رہ گئی۔

پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ سے قرضے کی ادائگی کی رقم نکال کر جو کچھ بچتا تھا اس میں سارا خاندان گزر بسر کرتا تھا۔ خود مرزا کی حالت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ علم ہئیت پڑھنے کا شوق تھا۔ خود پڑھتے تھے اور نئی نئی صورتیں نکالتے تھے۔ ایک بار ایک قاعدہ ایجاد کیا اور افتخار حسین صاحب کو بتایا۔ اُنھوں نے اس سے بہتر ایک قاعدہ بتایا جو ڈفرنشل کیلکولس کا تھا۔ مرزا نے پوچھا کس کتاب سے حاصل کیا، اُنھوں نے نام بتایا مرزا نے نوٹ کر لیا اسی طرح علم ہئیت اور سائنس کی مختلف کتابوں کے نام وقتاً فوقتاً نوٹ کرتے رہے۔ تنخواہ ملی تو پچیس روپے قرض کے نکل گئے۔ باقی پچیس کی کتابیں خرید لیں۔ چار روپے کتب فروش سے اُدھار کر لئے۔ گھر آئے تو بیوی نے تنخواہ کا حال پوچھا۔ سارا حساب بتا دیا اور کہنے لگے "خدا نے رزق کا وعدہ کیا ہے دیگا۔ اس وقت کتابوں کی ضرورت تھی لے آیا۔" مرزا کی غیرت یہ بھی گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ کسی سے کتابیں بھی مستعار لیں۔

اب لگے ہاتھوں رزق کا حال بھی سُن لیجئے۔ اپنے ایک عزیز شاگرد کے مکان پر رات کے دو بجے کے قریب پہنچے۔ دستک دی۔ ان کے والد چونکہ طبابت بھی کرتے تھے۔ لہٰذا یہ سمجھے کہ خدانخواستہ مرزا صاحب کے ہاں کسی کی طبیعت خراب ہے۔ باہر آئے تو ماجرا پوچھا۔ مرزا صاحب نے نہایت برجستگی سے کہا کہ ہمارے ہاں تین دن سے کھانا نہیں پکا تھا آج کہیں سے کچھ انتظام ہو گیا تو بیگم نے کہا کہ لاؤ میٹھے چاول پکا لیں۔ خیال آیا کہ ہمارا شاگرد میٹھے چاول بڑے شوق سے کھاتا ہے لاؤ اسے بھی بلا لائیں۔ اسی کو بُلانے چلا آیا۔ مرزا کی لاابالی طبیعت اس بات کے اعتراف میں کوئی عار محسوس نہ کرتی تھی کہ ان کے ہاں کھانا نہیں پکا ہے۔ لیکن دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانا اُن کی غیرت کے خلاف تھا۔

اسی طرح کرسچین کالجیٹ اسکول کا ایک قصہ ہے ایک روز بہت خوش خوش کلاس میں آئے لڑکوں نے پوچھا تو کہنے لگے آج ہم بہت خوش ہیں اللہ تعالیٰ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ کئی روز سے ہمارے ہاں کھانا نہیں پکا تھا۔ کل مہادیو پرشاد ناول فروش (جو لکھنؤ کے مشہور کتب فروش سمجھے جاتے تھے) مل گیا۔ کہنے لگا آج کل جاسوسی اور خونی ناولوں کی بہت مانگ ہے۔ خونی قاتل۔ خونی عاشق وغیرہ نکل چکے ہیں، آپ خونی جورو لکھ دیجئے۔ میں نے

کہا اچھا تو دوں گا مگر سو روپیہ لوں گا، وہ راضی ہو گیا۔ میں نے کل لکھنا شروع کیا۔ رات بھر لکھا، صبح اس کو ناول کا مسودہ دے کر اور روپیہ لے کر آ رہا ہوں۔"

مرزا کی عسرت تنگ دستی اور لاابالی پن کا یہ واقعہ مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے ایک دوست کے ساتھ علم ہیئت کی ایک کتاب خریدنے چوک کے کسی کباڑیئے کے یہاں جا رہے تھے۔ راستے میں ایک دوست ملے اُنھوں نے خیریت پوچھی۔ مرزا نے رسمًا جواب دیا۔ انھوں نے کہا لڑکا تو اچھا ہے مرزا نے کہا "وہ کہیں چلے گئے ہیں۔" پوچھا کیوں؟ کہنے لگے کہ وہ اپنے اخراجات کے لئے زیادہ چاہتے تھے، میں کفیل نہ ہو سکا، اس لئے انھوں نے میرے ساتھ رہنا پسند نہ کیا اور چلے گئے۔" پوچھا کسی سے دریافت کیا؟ کہنے لگے دو ایک صاحبوں سے کہا تو تھا۔" ان کے دوست حیرت سے اُن کا منہ تکنے لگے کہ دو مہینے سے برابر روزانہ ملاقات ہوتی تھی، پھر بھی مرزا نے اس واقعے کا ذکر اُن سے نہ کیا تھا۔

مرزا کے ذوق شوق کا عجیب عالم تھا۔ کبھی ایک طرزِ زندگی کی طرف رجحان ہوتا تھا کبھی دوسرے۔ اور جس طرف رغبت ہوتی تھی بے پناہ ہوتی تھی۔ جب تک اس شے کا ذوق شوق رہتا دوسری تمام چیزوں سے توجہ ہٹ جاتی تھی۔ کبھی مذہبیات کا زور شور ہوا تو اس قدر کہ مناظرے کرنے لگے اور اصول مناظرہ پر ایک رسالہ بھی تصنیف کیا۔ اسی زمانے کا تذکرہ ہے کہ پنجشنبہ کے روز کسی صاحب کو گولہ گنج میں ملے، انھوں نے دریافت کیا "مرزا صاحب! کہاں سے تشریف لا رہے ہیں"! مرزا صاحب نے نہایت خفگی سے جواب دیا "کہاں سے کیا معنی؟ حضرت، آج تو جمعرات ہے۔ آج اس وقت محلا میں سوائے درگاہ حضرت عبّاس کے اور کہاں سے آ سکتا ہوں۔" گویا کوئی اور امکان سرے سے ہو ہی نہیں سکتا۔ حالانکہ جب رنگ رلیوں کا زمانہ تھا جو ہمہ وقت طوائفوں اور اربابِ نشاط کے درمیان میں گزرتا تھا اور اسی ماحول سے کام تھا۔ لوگ اس زمانے کا حال بتاتے ہیں کہ شہر بھر کے شرابی، جوارے، لُچّے اور آوارہ ان کو گھیرے رہتے تھے، اور مرزا صاحب مست اور خوش تھے۔

مختلف علوم کے بارے میں بھی اُن کا یہی رویّہ تھا۔ کبھی فلسفے کی طرف رجحان ہو گیا تو سارا وقت اسی پر صرف ہوا۔ کبھی عربی کی طرف میلان ہوا تو عربی پڑھ ڈالی۔ کبھی علم ہیئت کبھی شاعری اور ناول نگاری، کبھی سائنس کبھی ریاضی اور حساب تو کبھی مسمریزم۔

فلسفہ کا ذوق ہوا تو "الحکم" نامی ایک رسالہ نکالا۔ اس رسالے میں اعلیٰ نظریاتی مضامین چھاپے، اسی زمانے کا تذکرہ ہے کہ لکھنؤ میں اُردو انسائیکلو پیڈیا مرتب کرنے کی تجویز ہوئی۔ مہاراجہ صاحب محمود آباد نے ڈیڑھ لاکھ روپیہ دینے کا وعدہ کیا۔ مختلف علوم سے متعلق کمیٹیاں بنا دی گئیں۔ فلسفہ کی کمیٹی کے صدر مرزا رسوا اور سکریٹری مولوی عبدالماجد فلسفی دریا بادی مقرر ہوئے۔ مہاراجہ صاحب نے اُن سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی۔ لہٰذا عبدالماجد صاحب ان کو اپنے ساتھ لے کر مہاراجہ صاحب سے ملانے گئے مہاراجہ صاحب نے پوچھا "آپ کی تعریف کیجئے۔"

مولانا عبدالماجد نے بتایا کہ آپ مرزا رسوا صاحب ہیں۔

اس سے پہلے کہ مہاراجہ صاحب کچھ اور کہتے یا اپنی مسرّت کا بھی اظہار کر پاتے، مرزا رسوا نے کہا "اور آپ کی تعریف کیجیے۔"

کہنے کو تو مولانا عبدالماجد صاحب نے کہہ دیا کہ آپ مہاراجہ صاحب محمود آباد ہیں۔" مگر دل ہی دل میں مہاراجہ صاحب سے بڑے شرمندہ ہوئے۔ کہ مرزا نے ایک لمحے کے لئے بھی نہیں بخشا اور بالکل مساویانہ سلوک کیا۔

ایک صحبت میں موسیقی کا تذکرہ چھڑا، کہنے لگے "ہاں موسیقی مجھے ضرور سیکھنا ہے، کیونکہ ہم لوگوں میں اس وقت تک علم کامل نہیں سمجھا جاتا جب تک موسیقی نہ جانتا ہو۔" "ہم لوگوں" سے مرزا کی مراد کیا تھی؟ مسلمانوں یا کسی مذہبی عقیدے کے گروہ سے نہیں ہو سکتی۔ ممکن ہے یہ اشارہ فلسفی ہونے کی طرف ہو، کیونکہ بو علی سینا کو محض اس وجہ سے عالم اور حکیم نہیں مانا گیا تھا کہ اسے موسیقی نہیں آتی تھی اور اسی لئے اس نے موسیقی میں دسترس بہم پہنچائی، ایک آلہ ایجاد کیا جو اس کے نام کی رعایت سے سینائی اور بعد کو شہنائی کہلایا۔

بہرحال مرزا صاحب نے بڑے شد و مد سے موسیقی سیکھنا شروع کی اور ایک استاد کو ملازم رکھا جو لکھنؤ کے کسی مشہور گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اُس کا بیان تھا کہ بڑے بڑے اچھے گویّے ان باریکیوں کو نہیں پہنچ پاتے جنھیں مرزا چھ مہینے کی تحصیل کے بعد سمجھنے لگے تھے، اور گاتے گاتے ٹوک دیتے تھے۔

ایک بار مسعود حسن صاحب رضوی مرزا سے ملنے گئے مرزا صاحب نے

اپنے موسیقی کے شوق کا تذکرہ کیا، کہنے لگے "مجھے ان دنوں بڑا باکمال اُستاد مل گیا ہے۔ اس کے باکمال ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنے کو باکمال نہیں سمجھتا۔ وہ مغلیہ دربار کے شاہی گویّے کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے اس کے بزرگوں میں سے کسی نے اکبر یا ہمایوں کی پیدائش کے موقعے پر جو گیا کا ترانہ گایا تھا وہ گیت مجھے یاد ہے اور اسے میں گلے سے بھی ادا کر سکتا ہوں اور انگلیوں سے بھی۔ مرزا صاحب نے وہ بول تحت اللفظ میں سنا بھی دیے تھے، اور یہ کہا تھا کہ شبوں کا زمانہ ہے ورنہ میں آپ کو گا کر سناتا۔ مسعود صاحب نے کہا: "مرزا صاحب وہ بول مجھے بھی لکھا دیجیے۔" مرزا صاحب نے بہ لطائف الحیل ٹال دیا۔ کہنے لگے پھر کبھی لکھ لیجئے گا۔ اس کے دو ہفتے بعد مرزا احمد ہادی عزیز لکھنوی رکاب گنج میں مسعود حسن صاحب رضوی کو ملے ان سے مرزا رسوا کا تذکرہ آیا۔ کہنے لگے "مرزا رسوا صاحب کہتے تھے کہ مسعود صاحب ان بولوں کو لکھے لیتے تھے۔ بھلا بتائیے، آپ بھی غضب کئے دیتے تھے اُن کی عمر بھر کی کمائی اُن سے لے رہے تھے!"

انسانی فطرت کا یہ بھی ایک عجیب پہلو ہے۔ ایک ایسا شخص جس نے کبھی بخل نہیں کیا اتنی ذرا سی بات کو محسوس کر سکتا تھا۔ ان کی فیاضی، بے حسی اور لاابالی پن کے بہت سے قصّے مشہور ہیں۔ جن صاحب نے اُن کی غیر حاضری میں اُن کی ملازمت پر قبضہ کر لیا تھا اُن کا ذکر اُنھوں نے کبھی بُرے پیرائے میں نہیں کیا۔ بلکہ اس واقعے کا ذکر بھی نہ کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک صاحب نے جن کا نام محمد تقی تھا اور جن کے باپ مرزا صاحب کے والد کے ہم نام تھے اُن کی بی، اے کی ڈگری پر قبضہ کر لیا اور چرا کر لے گئے مگر انھوں نے کبھی شکایت نہیں کی۔ لوگ اُن کے علم و فضل پر حیرت کرتے تو وہ کہتے کہ تم لوگ محنت نہیں کرتے ورنہ یہ کچھ مشکل نہیں ہے۔

مرزا جعفر حسین مرحوم (جن کا تذکرہ شریف زادے میں آیا ہے) کہتے تھے کہ مرزا کے کام محیّر العقول تھے۔ اگر کسی کے سامنے بیان کریں تو مشکل سے باور کرے گا۔ خود میرے گھر پر بیٹھے تھے سامنے علم ہیئت سے متعلق کوئی آلہ رکھا ہوا ہے اور ایک صاحب سے علم ہیئت پر بحث ہو رہی ہے اور دو ناول ذات شریف اور شریف زادہ لکھتے جاتے ہیں۔ کبھی ایک ناول کی کچھ سطریں لکھیں کبھی دوسرے کی۔ یہ تینوں کام وہ بآسانی ایک ساتھ کرتے تھے۔

مرزا رسوا کی شاعری پر بہت کم لوگوں نے توجہ کی ہے۔ مرزا اچھے غزل گو تھے اور کلام پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاتا ہے کہ امراؤ جان ادا کے مشاعرے کی تمام تر غزلیں انھوں نے کہی ہیں اور ہر غزل میں علیحدہ رنگ قائم رکھنے کی کوشش کی ہے جس شخص کے نام سے غزل لکھی اسی کی شخصیت اور اُس کے مزاج سے مطابقت کا لحاظ رکھا کسی محفل میں کوئی نوّاب زادے بار بار خواجہ وزیر کا یہ شعر پڑھتے تھے اور مبالغے کے ساتھ تعریف کرتے تھے۔

ادا سے جھک کے ملتے ہو نگہ سے قتل کرتے ہو
ستم ایجاد ہو ناوک لگاتے ہو کماں ہو کر

جی حضوری مصاحبین ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ نوّاب زادے نے کہا کہ "کماں ہو کر" کا قافیہ تو اس سے بہتر باندھنا ناممکن ہے۔ مرزا رسوا نے ان کی قطع کلام کیا اور کہا کہ آخر خواجہ وزیر بھی انسان ہی تھے اور اب بھی ایسے لوگ ہیں جو اس سے بہتر اس قافیے کو صرف کر سکتے ہیں۔ چنانچہ قلم دوات لے کر بیٹھے ۲۵ اشعار کی غزل اس بحر میں کہی اور چار پانچ اشعار میں یہ قافیہ باندھا۔ ایک شعر یہ تھا۔

حیا کی شوخیوں سے اُٹھتے اُٹھتے جھک گئیں نظریں
مری قسمت سے اُن کے تیر بھی آئے کماں ہو کر

داغ کی مشہور غزل کا شعر ہے۔

زیرِ دیوار ذرا جھانک کے تم دیکھو تو لو
ناتواں کرتے ہیں دل تھام کے آہیں کیونکر

مرزا نے اسی بحر میں غزل کہی۔ دونوں مطلعوں کی رنگینی ملاحظہ ہو۔

ہم نشینوں سے چھپا کر تمھیں چاہیں کیونکر
چھپ سکیں گی یہ محبت کی نگاہیں کیونکر
ضد بھی اک وضع ہے چاہت وہ نباہیں کیونکر
جو اُنھیں چاہے بھلا وہ اُسے چاہیں کیونکر

اس غزل کے چند اور اشعار یہ ہیں۔

راہ ہر اک کی جدا اور ہر اک طالب یار — دیکھیں اس کوچے میں ملتی ہیں یہ راہیں کیونکر
خانۂ آئینہ بھی اُن کا مُقابل نکلا — دیکھیں لڑتی ہیں نگاہوں سے نگاہیں کیونکر

اور اس شعر میں بڑی ندرتِ فکر اور اُپج کا ثبوت دیا ہے، اور ردیف اپنے مطلب

اُلٹ ہٹ کر نئی راہ پیدا کی ہے۔

دم آخر مری بالیں پہ نہ لاؤ اس کو
دیکھی جائیں گی یہ حسرت کی نگاہیں کیوں کر

افتخار حسین صاحب کا بیان ہے کہ مرزا کی غزلوں کی تعداد کئی سو تھی۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی کے نزدیک خود مرزا صاحب نے کہا تھا کہ میری غزلوں کی تعداد کئی ہزار تک پہنچ گئی ہے۔ کوئی انتخاب کر کے چھاپے تو کم از کم چار مجموعے نکل آئیں گے۔ بہرحال مرزا صاحب کو شاعری سے بڑا شغف تھا انھوں نے اپنی غزلیں جمع نہیں کی تھیں۔ ایک بار کسی نے اُن سے پوچھا کہ آپ نے اپنا کلام اکٹھا کیا، مرزا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کہنے لگے دیوان مُرتب کیا دو سو صفحات سے زیادہ کا ہوا۔ جب دوسری شے کا دور شروع ہوا دیوان سے توجہ ہٹ گئی۔ ایک روز بنئے کے ہاں سے کچھ منگایا، اس کے ورق میں پُڑیا بندھ کر آئی تو طاق پر دیکھا۔ دیوان ندارد۔ بنئے کے ہاں دوڑے گئے۔ چند ورق باقی تھے۔ بقیہ کی پُڑیاں بندھ گئیں۔ معلوم ہوا کہ صاحبزادے نے ردی سمجھ کر دو پیسے سیر بیچ ڈالا۔

مرزا اپنے دیوان کے بارے میں کہتے تھے کہ کسی کا دیوان اشرفیوں میں بکا اور میرا دیوان دو پیسے سیر بہرحال جو حصّہ امراؤ جان ادا اور دوسری تصانیف میں محفوظ ہے اس سے اُن کی سلاست زبان۔ ندرتِ فکر اور قدرتِ کلام کا اندازہ ہوتا ہے۔

مرزا بڑے بذلہ سنج تھے۔ اُن کے مذاق میں بھی بڑی کیفیت اور لطف تھا۔ کوئی صاحب مرزا کے پاس اپنی ایک رباعی اصلاح کے لئے لے گئے۔ مرزا نے انکار کیا۔ جب اُنھوں نے بہت اصرار کیا تو مرزا صاحب نے اس پر غور کیا۔ تین مصرعوں میں جوانی کی کیفیت نظم کی گئی تھی کہ ہم جوانی میں ایسے تھے چوتھا مصرعہ یہ تھا:

پیری نے کہا کہ خواب دیکھا ہوگا

مرزا نے کہا، شاعری ایک لفظ کی ہوتی ہے۔ اگر ایک لفظ مناسب ہے تو شعر کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔ اول تین مصرعے ٹھیک ہیں۔ چوتھے مصرعے میں پیری کا لفظ مناسب نہیں ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ اصلاح فرما دیجئے۔ انھوں نے قلم اُٹھا کر پیری کی جگہ بیوی لکھ دیا۔ اس پر بڑا قہقہہ ہوا۔

مرزا کی زندگی اس قسم کے نہ جانے کتنے پُرلطف واقعات اور رنگا رنگ لطائف سے پُر ہے۔ میں ان کو سید افتخار حسین سابق سیشن جج کان پور، سید مسعود حسن رضوی۔ سید یوسف حسین موسوی اور پُرانے رسالوں کے کچھ فائلوں کی مدد سے جمع کر سکا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ آئندہ میں اس سلسلے کو تکمیل تک پہنچا سکوں گا۔ اُردو ادیبوں میں مرزا کی گونا گوں شخصیت ہمارے سوانح نگاروں اور نقادوں کی توجہ کی مستحق ہے، اور ممکن ہے ہم اُن کے حالات کی مدد سے ہم نہ صرف ایک رنگین داستانِ حیات ہی کی نقاب کشائی کریں بلکہ مرزا کے فن اور اس دور کے سماجی ماحول کے مطالعے میں بھی ان کے کام سے مدد لے سکیں۔

معلومات و اعداد

۱۔ ۵۲-۱۹۵۱ء میں بھارت سے ۹۳ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے کی چائے غیر ممالک کو بھیجی گئی۔ اس کے مقابلے میں ۵۱-۱۹۵۰ء میں اسی کروڑ بیالیس لاکھ روپے کی چائے بھارت سے برآمد ہوئی تھی۔

۲۔ مرکزی حکومت دو برسوں میں (۵۲-۱۹۵۱ء) کی قلت خوراک کی امداد کے سلسلے میں مختلف ریاستوں کو ایک کروڑ پچاسی ہزار روپے کی رقم دے چکی ہے۔

۳۔ ۵۲-۱۹۵۱ء میں غیر منقولہ جائداد پر انکم ٹیکس کی رقم تیس کروڑ بیس لاکھ روپے ہوتی ہے جبکہ ۵۱-۱۹۵۰ء میں یہ رقم بائیس کروڑ اکیاسی لاکھ روپے تھی۔

۴۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں بھارت میں نو لاکھ پینسٹھ ہزار ٹن مٹی کا تیل خرچ ہوا۔

۵۔ بھارت نے مخلوط اقتصادی پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ چنانچہ حکومت کے حصص کی رقم بارہ ارب روپے ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں نجی حصّہ داروں کی رقم پندرہ ارب روپے ہے

ذکر و فکر

حشرِ جذبات — ثاقب کانپوری

دل کو مرے نیرنگیٔ محفل سے نہیں کام
اس راحلۂ غم کو مراحل سے نہیں کام

دے اور کسی کو یہ فریبِ رہِ منزل
منزل ہوں میں خود ہی مجھے منزل سے نہیں کام

راہیں مری آزاد نگاہیں مری آزاد
آوارگیٔ عشق کو محمل سے نہیں کام

کیوں توڑ دیا اس نے محبت کی حدوں کو
دل مورد الزام ہے اب دل سے نہیں کام

ہر قید سے آزاد ہے دیوانگیٔ شوق
وحشت کو مری طوق و سلاسل سے نہیں کام

بیکار ہے اس کے لئے ساحل کی ہر آواز
جو ڈوب رہا ہو اُسے ساحل سے نہیں کام

وہ بے خود و سرشارِ محبت ہے ازل سے
ثاقب کو غمِ عشق کے حاصل سے نہیں کام

غزل — آثم فردوسی

آج ہم پر جو التفات نہیں
اے غمِ دل یہ کوئی بات نہیں

اہلِ گلشن بتاؤ کیا یہ بہار
سازشِ فتنۂ حیات نہیں

تیرے وعدوں پہ اور جی لیتے
زندگی کو مگر ثبات نہیں

جام و مینا میں چاند تاروں میں
کس جگہ جلوہ گرِ حیات نہیں

دل کے کتنے قریب ہیں وہ لوگ
جن سے اُمیدِ التفات نہیں

میکدہ ہے یہاں پہ اے آثم
زندگی ہے غمِ حیات نہیں

ذوقِ پرواز — چندر پرکاش شرما

غم نہیں، آہ نہیں، سوز نہیں، ساز نہیں
عشق اک راز تو ہے پردہ درِ راز نہیں

ہمسفیر دل سے کہیں آگے ہے منزل اپنی
صحنِ گلشن ہی فقط حاصلِ پرواز نہیں

خود تری آنکھوں نے حل کر دیئے عقدے دل کے
مجھ سے پوشیدہ محبت کا کوئی راز نہیں

آہ کرتے ہوئے اس خوف سے گھبراتا ہوں
کہ زمانہ تو کہیں گوش بر آواز نہیں

جاؤں تو جاؤں کہاں قیدِ قفس سے چھٹ کر
ذوقِ پرواز تو ہے مقصدِ پرواز نہیں

دل کی دھڑکن کو اسی غم سے دبا رکھا ہے
کوئی مونس نہیں ہمدم نہیں دمساز نہیں

گو بظاہر تو نہیں جوشِ محبت میں کمی
ہاں مگر دل کے تڑپنے کا وہ انداز نہیں

اتنا مانوسِ قفس ہو گیا دل اے جوہر
کہ مجھے شکوۂ کوتاہیٔ پرواز نہیں

میری برسات — وارث کرمانی

یہ سبزۂ نوخیز یہ گھنگھور گھٹائیں
یہ بادۂ گلرنگ یہ مدہوش ہوائیں

یہ سازِ مسرت سے ہم آہنگ نظارے
یہ نشۂ مستی میں شرابور فضائیں

یہ کیف میں بھیگے ہوئے لمحاتِ سکوں بخش
یہ عطر میں ڈوبی ہوئی سرشار ہوائیں

اے یارِ خوش اندام و خوش انداز و خوش آواز
یہ تیری گہر ریز و گہر بیز صدائیں

اے دلبر و دلدار و دل آرا و دل آرام
یہ میری جنوں خیز و جنوں پاش ادائیں

زلفوں میں لئے غالیہ و مشک کی خوشبو
آنکھوں میں غزالانِ تتاری کی ادائیں

تجھ کو مرے اس نطقِ گہربار کی سوگند
اس منظرِ شاداب سے آ لطف اٹھائیں

یہ جلتی ہوئی سانس یہ بہکے ہوئے جذبات
آ زیست کو معصوم گناہوں سے سجائیں

آ تازہ کریں رسم و رہِ حافظ و خیام
آ رومی و سعدی کا مذاق آج اڑائیں

یہ رنگِ بہارِ گل و نسریں بھی ہے کیا خوب
آ یومِ بہارِ گل و نسریں بھی منائیں

یہ جام و سبو تیرے ہیں یہ دور ہے تیرا
اب بھول گئے لوگ سلیمٰی کی وفائیں

بھر بھر کے قدح ہائے گلاب و مئے گلگوں
اس وادیٔ پرکیف کو فردوس بنائیں

ہر گھونٹ میں ہو کوثر و تسنیم کی لذّت
ہر شے میں کراماتِ مسیحا نظر آئیں

پھر بیٹھ کے اک ساتھ کسی شاخ کے نیچے
ہم اپنی کوئی تازہ غزل تجھ کو سنائیں

غزل جدید — اکرم دہلوی

اکرم یہ ذکرِ عشق یہ دورانِ انقلاب
تجھ کو کہے گا کون غزل خوانِ انقلاب

شیرازۂ حواس یکایک بکھر گیا
دیکھا وہ ہم نے خواب پریشانِ انقلاب

نظمِ قدیم لرزہ بر اندام کیوں نہ ہو
جوشِ جنوں ہے سلسلہ جنبانِ انقلاب

اندر ہی اندر آگ کا دریا ہے موجزن
ظاہر میں یوں خموش ہے طوفانِ انقلاب

درماں پذیر ہو کے رہے گا غمِ حیات
اے ناشناسِ منزلِ پایانِ انقلاب

روحِ روانِ زیست ہے سرگرمیٔ عمل
سعیٔ جنوں ہے خاصۂ خاصانِ انقلاب

ہے ہو گیا نہ ختم اندھیرا حیات کا؟
وہ دیکھ اُفق پہ مہرِ درخشانِ انقلاب

اکرم بساطِ غم نہ اُلٹ دوں تو بات کیا
مضمر مری غزل میں ہے سامانِ انقلاب

کوریا میں صلح کرانے کے لئے بھارت کی مخلصانہ کوششیں

کوریا کے بارے میں اتحادی سبھا کے سامنے پیش کردہ بھارتی تجاویز پر دنیا کے مختلف اخبارات نے رائے زنی کی ہے۔

امریکی اخبارات کی رائے

نیویارک ہیرلڈ ٹریبیون نے لکھا ہے کہ بھارتی ڈیلی گیشن نے بڑی محنت اور سوچ وچار کے بعد یہ تجاویز مرتب کی ہیں۔ امریکنوں نے جلد بازی میں ان کی مخالفت شروع کر دی تھی لیکن برطانوی وزیر خارجہ مسٹر ایڈن کے رویہ نے ان تجاویز پر ہمدردانہ غور کا امکان پیدا کر دیا ہے۔ مسٹر ایڈن کا خیال ہے کہ بھارتی ریزولیوشن میں جنگی قیدیوں کو جبراً واپس نہ بھیجنے کا اصول تسلیم کر لیا گیا ہے اور مغربی طاقتوں کو تفاصیل کے بارے میں ضد سے کام نہیں لینا چاہیئے انہوں نے اس امر کی وضاحت طلب کی ہے کہ جو قیدی واپس اپنے ملک کو جانے پر رضامند نہ ہوں۔ ان کی آبادکاری کے لئے کیا ذرائع اختیار کئے جائیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ انتظام مذکورہ تجاویز میں کسی قسم کی بنیادی تبدیلی عمل میں لائے بغیر کیا جا سکتا ہے۔ امریکی ڈیلیگیشن کی نظروں میں اس بات کو خاص اہمیت حاصل ہے کہ تجاویز ہر لحاظ سے واضح ہوں اور ان میں کسی قسم کا ابہام یا دھندلا پن نہیں ہونا چاہیئے۔

واشنگٹن پوسٹ نے لکھا ہے کہ کوریا کے مسئلہ کا حل تلاش کرنے میں بھارت کی مخلصانہ کوششوں پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ بھارتی ریزولیوشن میں جنگی قیدیوں کے تبادلہ کے سوال پر ادارہ اقوام متحدہ کے نظریہ کو ملحوظ رکھا گیا ہے لیکن ساتھ ہی اس امر کا خیال رکھا گیا ہے کہ ان تجاویز کی منظوری سے کمیونسٹوں کو شرمسار نہ ہونا پڑے۔ تجاویز میں کچھ خامیاں بھی ہیں جنہیں ضروری ترامیم کے ذریعے دور کیا جا سکتا ہے۔ حکومت امریکہ کو ضد سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ کچھ ترامیم سے بھارتی تجاویز کو قابل عمل بنا دیا جائے تو کمیونسٹوں کو بھی یہ تجاویز قبول کرنی پڑیں گی ورنہ دنیا کی رائے عامہ جنگی قیدیوں کے تبادلہ کے سوال پر ان کے اعتراضات کو جنگ جاری رکھنے کے بہانہ سے زیادہ اہمیت نہیں دے گی۔

نیویارک ٹائمز رقمطراز ہے کہ کئی خامیوں کے باوجود بھارتی ریزولیوشن میں مسئلہ کوریا کا حل تلاش کرنے میں آگے کی طرف قدم بڑھایا گیا ہے۔ یہ ریزولیوشن غالباً پیکن سرکار کی رائے معلوم کرنے کے بعد مرتب کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس کی کامیابی کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا تاہم بھارت کی کوششیں قابل تعریف ہیں۔ بھارت کے قیدیوں کے جبری تبادلے کے بارے میں کمیونسٹوں کے نظریہ کو مسترد کر کے آزاد ملکوں کی پوزیشن کو مضبوط بنایا ہے لیکن بھارتی ریزولیوشن میں ان اصولوں کو عملی جامہ پہنانے کے بارے میں کچھ خامیاں موجود ہیں۔ تاہم اس پر گہرا غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے کہ اس سے کوریا کی جنگ کو ختم کرنے کا کوئی باعزت طریقہ نکل آئے۔

برطانیہ کے اخبارات کی رائے

برطانیہ کے مشہور اخبار مانچسٹر گارڈین نے اس موضوع پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بھارتی تجاویز نے دونوں اطراف کے لئے قابل قبول سمجھوتہ کی امید پیدا کر دی ہے۔ جنگی قیدیوں سے متعلقہ کئی امور پر یہ تجاویز غیر واضح ہیں۔ اگر کمیونسٹ حقیقتاً صلح کے خواہاں ہیں تو وہ اپنا وقار قائم رکھتے ہوئے بھی ان تجاویز کو قبول کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں شری مینن کی کوششیں قابل ستائش ہیں۔

نیوسٹیٹسمین اینڈ نیشن نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ مسئلہ کوریا کا حل تلاش کرنے کے لئے نئے سرے سے شری نہرو کی کوششوں کا مدعا نہ صرف کوریا میں لڑائی ختم کرنا بلکہ خود اتحادی سبھا کو تباہی سے بچانا بھی ہے خوش قسمتی سے ان کوششوں کی کامیابی کے کچھ امکانات موجود ہیں۔ مشکل یہ

ہے کہ اتحادی سبھا میں امریکی ڈیلی گیٹ کوئی واضح نقطۂ نگاہ قائم کرنے سے پیشتر امریکہ کے نئے صدر کے دورۂ کوریا کے تاثرات کا انتظار کرنا چاہتے ہیں ۔

جاپانی اخبارات کے تبصرے

جاپان کے چار اہم اخبارات "مینچی" "یومی اوری" "نیپون ٹائمز" اور "نیہون کے زائی" نے اپنے مقالات افتتاحیہ میں بھارت کی تجویز کی تائید کی ہے اخبار "مینچی" رقمطراز ہے کہ اگر بھارت کی تجویز کو نظر انداز کر دیا گیا تو یہ امر قابل افسوس ہوگا اور صلح کوریا کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند اور التوائے جنگ کے امکانات بالکل معدوم ہو جائیں گے ۔

اہم تجارتی روزنامہ اخبار "نیہون کے زائی" نے لکھا ہے کہ اگر تجویز ادھوری ہے تو بھی متعلقہ جماعتیں آئندہ مذاکرات کے لئے اسے بنیاد قرار دے سکتی ہیں ۔" بشرطیکہ وہ خلوص سے التوائے جنگ کی خواہش مند ہوں ۔

"یومی اوری" نے بھی تجویز کی متعدد دفعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اقوام متحدہ اس تجویز کو قبول کرے یا رد کرے لیکن جنگ کوریا کے مستقبل پر اس کا سنگین اثر پڑے گا ۔

آسٹریلیا کی آراء

آسٹریلیا کے وزیر امور خارجہ مسٹر آر۔ جی کیسی نے ایک بیان میں کہا ہے کہ بھارتی وفد نے ادارۂ اقوام متحدہ کے مذاکرات میں ایک ممتاز جگہ حاصل کر لی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی بین الاقوامی پالیسی کی بنا پر اپنے آپ کو نہ تو جمہوری ملکوں کے ساتھ اور نہ ہی کمیونسٹ ممالک سے وابستہ کیا ہے ۔ یہ ایک کھلا ہوا راز ہے کہ بھارت پیکن میں اپنے سفارتخانے کی بدولت کمیونسٹ چین کی حکومت کے خیالات کا اندازہ لگا سکتا ہے حق تو یہ ہے کہ یہی ایک ذریعہ ہے جو جمہوری اور کمیونسٹ ممالک کے درمیان قائم ہے ۔

سڈنی کا اخبار "ڈیلی ٹیلیگراف" اپنے مقالۂ افتتاحیہ میں لکھتا ہے کہ بھارت نے صلح کوریا کا تعطل ختم کرنے کے لئے جس ریزولیوشن کی تجویز پیش کی ہے جمہوری ممالک کو اسے قبول کر لینا چاہیے ۔

سڈنی سن اپنے مقالہ میں "بھارت کی تجویز رہنمائی کر سکتی ہے" کے عنوان سے لکھتا ہے کہ امریکہ نے صلح کوریا کا تعطل ختم کرنے کے متعلق بھارت کی گفت و شنید کو رد کر دیا تھا اس کے باعث آسٹریلیا کے لوگوں کو بہت مایوسی ہوئی ۔

اخبار مذکور لکھتا ہے کہ فریقین کے خیالات کچھ ہی کیوں نہ ہوں مگر اس قضیہ کو ختم کرنے کے لئے تجویز پر بھارت کی جو پر خلوص خیر سگالی اور سچی کوشش ظاہر ہوتی ہے وہ ضرور قائم رہے گی ۔ اس قسم کے معاملات میں جمہوری اور کمیونسٹوں ممالک کے درمیان بھارت کی حیثیت ایک پل جیسی ہے اور ایک ایشیائی قوم ہونے کی وجہ سے قدرتی طور پر اس کے خیالات میں بہت کافی وزن بھی ہے ۔

سڈنی مارننگ ہیرلڈ اپنے مقالہ افتتاحیہ میں "بھارتی تجویز کی تردید میں امریکہ کی جلدبازی" کے عنوان کے تحت رقم طراز ہے کہ ایک ایسی تجویز کو فوری طور پر رد کرنا جسے ایشیا کی ایک سربرآوردہ طاقت کی حمایت حاصل ہو اس بین الاقوامی بحث کی نیک نیتی کے متعلق شک و شبہ پیدا کرتا ہے جس میں کسی بھی آزاد تجویز کا گلا پیدائش کے وقت ہی دوسربرآوردہ ممالک میں سے ایک گھونٹ دیتا ہے ۔ اگر امریکہ روس کے نقش قدم پر چل کر اپنے رویہ میں سختی اختیار کرتا ہے تو یہ امر ظاہر ہے کہ دنیا جنگ کوریا کا اختتام کبھی بھی نہیں دیکھے گی ۔

جرمن اخبارات کے تبصرے

میونخ کا اخبار "سوڈ ڈیشی زیٹنگ" لکھتا ہے کہ یہ تجویز خصوصی توجہ کے لائق ہے کیونکہ یہ یاد رکھا جا سکتا ہے کہ پیکن اور ماسکو کے خیالات کو بھارت سرکار سے زیادہ بہتر کوئی بھی ملک نہیں سمجھ سکتا ہے ۔ اس کے علاوہ جب بھارت نے ایشیا کی ۱۳ سلطنتوں کی تعاون کرتے ہوئے جنگ کوریا کو ختم کرنے کا حل تلاش کرنے کے لئے اس قدر جد و جہد کی ہے تو کوئی بھی ملک اس سے زیادہ دیانتدار ثابت نہیں ہو سکتا ۔

برما کے اخبارات کے تبصرے

برما کا انگریزی روزانہ اخبار "نیو ٹائمز آف برما" نے اپنے مقالہ افتتاحیہ میں جنگ کوریا میں قیدیوں کے مسئلہ پر بھارت کی تجویز قبول کرنے کی اپیل کی ہے

سیلون کا تبصرہ

ٹائمز آف سیلون اپنی اشاعت میں رقمطراز ہے ۔ کہ اگرچہ کوریا میں جلد صلح کی توقعات کو پان من جان کی گفت و شنید نے الٹ پلٹ کر دیا ہے ۔ لیکن قیدیوں کے تبادلہ سے متعلق بھارت کی تجویز نے اس سلسلہ میں ایک امید کی کرن پیدا کر دی ہے ۔

ع ۔ م

نئی کتابیں

مطالعۂ غالب

مصنّفہ مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی۔
ناشر۔ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ۔

ضخامت ۱۱۲ صفحے۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، کتابت، طباعت عمدہ، جلد اور جلد پوش خوبصورت
قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

یہ کتاب غالبیات میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ جناب اثر لکھنوی ان چند بزرگوں میں سے ہیں جو وسعتِ علم و مطالعہ کی بناء پر مغتنمات میں سے ہیں۔ شعر کے محاسن و معائب پر آپ بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔ اپنی رائے ظاہر کرنے میں انتہائی دیانت داری سے کام لیتے ہیں۔ اس کتاب میں آپ نے غالب کے بہت سے اشعار پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ شارحین سے جہاں جہاں اختلاف ہے بڑی خوش اسلوبی سے اُسے ظاہر کیا ہے۔ آپ میر کے دلدادہ ہیں اور اس کتاب میں بھی بلکہ جگہ اس کا اظہار ملتا ہے۔ غالب کے اشعار کے معائب بیان کرتے ہوئے آپ نے اس بات کو صاف صاف لکھ دیا ہے کہ اس سے غالب کی منقصت مقصود نہیں۔ یہ حقیقت بھی ہے۔ بہرحال آپ نے 'مطالعۂ غالب' جس گہری نظر سے کیا ہے۔ اُس کے نتائج اس کتاب میں درج فرما دئے ہیں۔ آخر میں غالب کی غزلوں کا ایک حسین انتخاب بھی شاملِ کتاب ہے۔ بے معنی واہ واہ کرنے والے غالب پرستوں سے مرزا صاحب میں زیادہ قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے غالب کے اشعار کا ایک ایسا سنجیدہ مطالعہ اور محاکمہ پیش کیا ہے جو غالب کے معتقدوں کے لئے دعوتِ فکر و نظر ہے۔

تہذیبِ مودت

نجم آفندی کے قطعات و رباعیات کا مجموعہ ہے۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ:۔ مہتمم زاویۂ ادب ۱۳۴ - بیرون دبیرپورہ حیدرآباد دکن۔ پاکٹ سائز ۱۴۴ صفحات

ترقّی پسندوں کے نام

یہ بھی نجم آفندی صاحب کی مختلف نظموں کا ایک مجموعہ ہے۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ وہی جو اوپر درج ہے۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۶۴ صفحوں پر مشتمل ہے۔

نجم آفندی سمجھ بوجھ کر شعر کہنے والے ہیں۔ آپ کے کلام میں خلوص ہے، ایک خاص معیارِ اخلاق کے آپ علمبردار ہیں۔ اول الذکر کتاب کی دو رباعیاں ملاحظہ فرمائیے۔

آرائشِ مودت و قیافہ کر لو — تیار کوئی اور لفافہ کر لو
ہر ایک گناہِ نو کی تکمیل کے بعد — سامانِ تقدّس میں اضافہ کر لو

اُٹھا نہ قدم عمل کا بڑھنے کے لئے — ہمت کی بلندیوں پر چڑھنے کے لئے
مولا کا ہر اک معرکۂ علم و عمل — سنتے رہے ہم درود پڑھنے کے لئے

دوسری کتاب میں رباعیات، بچّوں کے لئے دلچسپ نظمیں، دوہے، مختلف غزلوں کا انتخاب جن میں پیامِ عمل ہے ہوسنا کی نہیں، شامل ہیں۔ ان نظموں کی زبان بڑی پیاری اور میٹھی ہے۔ حسنِ قوافی کا لطف ہے، بیان کی خوش اسلوبی کا مزہ ہے۔ فنّی اعتبار سے بھی کلام اتنا پاکیزہ ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ آخر میں "ہندوستان" کے عنوان سے آپ کی مشہور و معروف نظم درج ہے۔ اس کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے۔

ہر شورما نے جس کی چوکھٹ پہ باج رکھا — مغلوں نے جس کے سر پر انمول تاج رکھا
چلتا رہا ہے جس کا بے روک ٹوک چکّر — ہے آج یونین کا جھنڈا اشوک چکّر
گنگا ہے جس نگر میں راوی ہے تاپتی ہے — میٹھے سُروں میں جس کی دھرتی الاپتی ہے
چرنوں میں سر جھکائے اُونچا ہمالیہ ہے — آکاش کا بھی جس نے دامن دبا لیا ہے

اشوک چکّر، تاپتی اور ہمالیہ کے مقید قافیے ان اشعار میں شاعر کے صوتی ادراک پر دال ہیں۔ ساری نظم اس خوبی سے بھری پڑی ہے۔ یہ دونوں کتابیں جن پر کسی پارٹی یا گروہ کا لیبل نہیں، حسنِ ظاہر کی حامل نہ سہی، حسنِ باطن کی دولت سے مالا مال اور شعری ادب میں ایک اچھا اضافہ ہیں۔

گاندھی بابا کی کہانی

ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی۔ مصنّفہ قدسیہ بیگم زیدی
قیمت پانچ روپے

بچّوں کے لئے یہ حسین و جمیل کتاب شائع کر کے مکتبہ جامعہ نے اردو کے طالب علموں پر بڑا احسان کیا ہے۔ پیش لفظ پنڈت جواہر لال نہرو نے لکھا ہے۔ کتاب مصوّر ہے

کتابت، طباعت اور کاغذ نہایت عمدہ ہے۔ جلد اور جلد پوش نہایت دیدہ زیب ہے۔ جہاتما گاندھی کی زندگی نہایت آسان زبان اور سبق آموز پیرائے میں لکھی گئی ہے۔ مصنفہ اور ناشر دونوں قابل مبارکباد ہیں۔ اس کتاب کو ہر لائبریری کی زینت بنانا چاہیئے۔

چال باز سپاہی
ان تھک جان
مین مین بانو

بچوں کے لئے یہ تینوں کتابیں قدسیہ بیگم زیدی صاحبہ نے لکھی ہیں اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی نے شائع کی ہیں۔ کتابیں مصور ہیں اور حسنِ ظاہر سے بدرجۂ اتم آراستہ ہیں۔ ہر کتاب کی قیمت دس آنے ہے۔ سبق آموز اور دلچسپ پیرائے میں بالترتیب دیمک، چیونٹی اور شہد کی مکھی کا حال ان کتابوں میں درج ہے۔

موصولات

زندگی کی لہر۔ ناشر مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ دہلی۔ قیمت تین روپے۔ یہ کتاب چینی مصنفہ ساؤ منگ کے مشہور ناول Moving Force. کا اُردو ترجمہ ہے۔ ترجمہ محمد خلیق ایم اے نے کیا ہے۔

بہترین ادب ۱۹۵۱ء۔ ناشر مکتبۂ شاہراہ دہلی۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے ۲۰×۳۰/۱۶ کی تقطیع کے ۳۹۸ صفحات، جلد، جلد پوش، کتابت، طباعت عمدہ۔ ۱۹۵۱ء کے اُردو ادب کا انتخاب اس کتاب میں درج ہے۔

ملکار۔ ناشر مکتبۂ جدید لمیٹڈ دہلی۔ قیمت دو روپے چار آنے۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۴۴ صفحات، جلد، جلد پوش، کتابت، طباعت، عمدہ۔ نریش کمار شاد نے مختلف ممالک کے آٹھ انقلابی شاعروں کے کلام کا منظوم ترجمہ اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ کتاب مصور ہے۔

انمول جواہر۔ شمیم ندوی نے اپنے مطالعے کے کچھ نقوش اس کتاب میں جمع کئے ہیں۔ ان میں ابوالکلام آزاد، آغا حشر کاشمیری، تاثیر، شبلی وغیرہم کے نتائجِ افکار کے اقتباسات ہیں۔ قیمت ۱۲؍۔ مرتب سے ڈاک بنگلہ روڈ۔ ڈالٹن گنج۔ پلامو۔ بہار کے پتے سے مل سکتی ہے۔

رموزِ خطابت۔ از عزیز الدین احمد۔ ملنے کا پتہ: حیدر اینڈ سنس بکسیلرز مچھلی کمان حیدر آباد دکن۔ قیمت ۱۲؍۔ مقدمہ از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور صدر چادر گھاٹ کالج۔ نفسِ مضمون کے اعتبار سے یہ کتاب اُردو میں اپنی قسم کی چند کتابوں میں سے ہے۔

نئی صبح۔ ضیا فتح آبادی کی نظموں کا مجموعہ۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ ماہنامہ سیماب دہلی۔

رفتارِ زمانہ

پنج سالہ اسکیم منظور

بھارت پارلیمنٹ میں پانچ سالہ سکیم کو بھاری کثرت رائے سے منظور کر لیا گیا ہے۔ تین دن کی بحث کا جواب دیتے ہوئے وزیرِ خزانہ شری چنتامن دیش مکھ نے کہا کہ اس اسکیم کا اصلی مقصد جنگ اور ملک کی تقسیم سے پیدا شدہ مُضر اثرات کو دُور کر کے ملک کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانا ہے۔ اس اسکیم میں دیش کی بہت جلد صنعتی ترقی کی طرف بڑھنے کی بنیاد رکھ دی گئی ہے اور اس امر میں کوئی شک نہیں کہ پانچ سال تک بھارت بہت حد تک اپنی ضروریات کو مہیا کرنے میں خود کفیل ہو جائے گا۔ شری دیش مکھ نے یہ بھی واضح کیا کہ اس اسکیم کی تیاری میں مُلک کی تمام سیاسی پارٹیوں سے مشورہ کیا گیا تھا۔ انھوں نے اُمید ظاہر کی کہ اس اہم اور انتہائی ضروری کام میں تمام پارٹیاں تعاون کریں گی۔

مسئلۂ کشمیر اور انیگلو امریکی قرارداد

بھارت سرکار نے حفاظتی کونسل کو باقاعدہ اطلاع دے دی ہے کہ کشمیر کے متعلق انیگلو امریکی قرارداد کو بھارت ہر حالت میں نامنظور کر دے گا۔ اس سلسلے میں سیکورٹی کونسل میں تقریر کرتے ہوئے شریمتی وجے لکشمی پنڈت نے اس امر کا اعلان کیا اور کہا کہ بھارت سرکار اس مسئلے کا پُرامن حل ڈھونڈنے میں پورا تعاون دے گی۔ لیکن جہاں تک بنیادی اصول کا تعلق ہے ہم اس سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹ سکتے

بھارت میں خوراک کی بہتر پوزیشن

بھارت کے وزیرِ خوراک شری رفیع احمد قدوائی نے خوراک کے مسئلے پر پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ ملک میں چاول کی پیداوار اتنی بڑھ گئی ہے کہ چاول کی ضرورت ملک کی پیداوار سے ہی پوری ہو جائے گی اور آئندہ سال باہر سے پچھلے برسوں کی نسبت بہت کم اناج منگوایا جائے گا۔ بھارت سرکار کی یہ خواہش ہے کہ ملک میں اناج کی پیداوار اتنی بڑھ جائے کہ باہر سے منگوانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے پچھلے چھ مہینے کی بہ نسبت ملک میں خوراک کی صورتِ حال بہت بہتر ہو گئی ہے اور توقع ہے کہ آئندہ پوزیشن اس سے بھی اچھی ہو جائے گی لیکن ابھی باہر سے گیہوں باجرہ اور چاول منگوائے جائیں گے۔

مسئلۂ کشمیر پر ترکی اخبار کی رائے

انقرہ (ترکی) کے اخبار "علوس" نے اپنی ایک اشاعت میں مسئلۂ کشمیر پر ایک مضمون سپردِ قلم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگرچہ اتحادی سبھا مسئلۂ کشمیر کا حل تلاش کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے لیکن خود کشمیر نے اپنی از سرِ نو تنظیم کا کام مکمل کر لیا ہے اور بھارتی یونین میں اپنے لئے موزوں مقام حاصل کر لیا ہے۔ شری جواہر لال نہرو اور شیخ عبداللہ میں اس امر پہ سمجھوتہ ہو چکا ہے کہ بھارتی یونین کا حصہ ہوتے ہوئے کشمیر کو امورِ داخلہ میں آزادی حاصل ہو گی۔ اب ریاست میں موروثی حکومت کو ختم کر کے نئی عوامی حکومت کے قیام کا اعلان کیا گیا ہے اور سابق مہاراجہ کے بیٹے کو صدرِ ریاست منتخب کیا ہے۔ اس کے علاوہ نئی زرعی اصلاحات کے نفاذ نے کشمیر کا نقشہ بدل دیا ہے۔ بھارت اور پاکستان کے جھگڑے پر حفاظتی کونسل کا ذکر کرتے ہوئے اخبار مذکور نے لکھا ہے کہ اتحادی سبھا نے کشمیر میں پاکستانی فوجوں کے داخلہ کو ناجائز سمجھنے کے باوجود ابھی تک بھارت سرکار کے مطالبے کے مطابق انھیں غیر مشروط طور پر پیچھے ہٹنے کا حکم نہیں دیا۔ اتحادی سبھا کے مقرر کردہ ثالثوں نے بھارت اور پاکستان دونوں کی فوجوں کی واپسی کی تجاویز پیش کیں، لیکن بھارت سرکار اسے قبول نہیں کر سکتی تھی۔ بھارت سرکار کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ اس معاملے میں پاکستان کو مساوی درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ بھارت کے پردھان منتری شری نہرو کا یہ دعویٰ ہے کہ پاکستانی فوج حملہ آور کی حیثیت میں کشمیر میں داخل ہوئی تھی جبکہ وہاں بھارتی فوجوں کی موجودگی ہر لحاظ سے جائز ہے۔ جب پاکستان نے ریاست پر حملہ کیا۔ اُس وقت مہاراجہ کشمیر نے اپنی ریاست کو بھارت میں شامل کرنے کے معاہدے پر دستخط کر دئے۔ اس لحاظ سے کشمیر کا بھارت سے مکمل الحاق ہو چکا ہے اور اسی لئے شری نہرو کشمیر میں بھارتی فوجوں کے داخلہ کو قانوناً جائز قرار دیتے ہیں۔

ریڈیو کی ترقی کی اسکیم

بھارت میں براڈکاسٹنگ کو ترقی دینے کے لئے پنجسالہ اسکیم مکمل کر لی گئی ہے یہ اسکیم درجہ الف، ب اور ج کی ریاستوں پر حاوی ہوگی۔ اس پر کل تین کروڑ باون لاکھ روپیہ خرچ ہوگا۔ اور یہ سال ۵۶-۱۹۵۵ء تک تکمیل کو پہنچ جائے گی۔ اور اس کے تحت مندرجہ ذیل کام سرانجام دینے کے لئے روپیہ مہیا کیا گیا ہے۔

۱۔ بمبئی، کلکتہ اور مدراس میں ایک ایک بڑی طاقت کا شارٹ ویو ٹرانسمٹر نصب کرنا۔

۲۔ بمبئی، احمد آباد، کلکتہ، جالندھر، الہ آباد اور بنگلور میں ایک ایک بڑی طاقت کا میڈیم ویو ٹرانسمٹر لگانا۔

۳۔ ناگ پور، گوہاٹی، مدراس، اندور اور حیدرآباد میں ایک ایک درمیانہ طاقت کا میڈیم ویو ٹرانسمٹر لگانا۔

۴۔ پونا۔ جے پور۔ جودھپور، گوالیار اور راجکوٹ میں ایک ایک چھوٹی طاقت کا میڈیم ویو ٹرانسمٹر نصب کرنا۔

۵۔ کلکتہ اور مدراس میں سٹوڈیو کی عمارتیں تعمیر کرنا اور نئی دہلی کے براڈکاسٹنگ ہاؤس کو توسیع دینا۔

۶۔ موجودہ ریڈیو اسٹیشنوں کو مزید سہولتیں مہیا کرنا۔

بھارت اور پاکستان کے تعلقات پر ایرانی اخبار کا تبصرہ

تہران کے مشہور روزانہ اخبار "کسریٰ" نے 'امن اور ایشیا' کے موضوع پر ایک مضمون حوالۂ قلم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بھارت اور پاکستان کے دوستانہ تعلقات پورے ایشیا کے لئے مفید ہوں گے۔ مضمون میں پاکستان کے لیڈروں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ اپنا موجودہ طرزِ عمل ترک کر دیں۔

بھارت کے طرزِ عمل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے "ہمیں یقین ہے کہ بھارت پاکستان کو زک پہنچانے کی کوئی خواہش نہیں رکھتا اور اس نے ہمیشہ پاکستان سے مخلصانہ اور دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی رضامندی کا اظہار کیا ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ برِعظم ہندوستان کی تقسیم اور بھارت اور پاکستان کے قیام کے بعد بھارت اور پاکستان کے تعلقات میں کشیدگی رہی ہے۔ لیکن ہمارا مشاہدہ ہے کہ بھارتی رہنما ہر اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں جو انہیں پاکستان کو بھارت کی دوستی کا اطمینان دلانے کے لئے ملتا ہے۔"

پرجا پریشد کی تحریک

بھارت کے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ بھارت سرکار اور جموں و کشمیر سرکار میں سمجھوتے کی وجہ سے جموں میں پرجا پریشد کی تحریک بھارت سرکار اور اس پارلیمنٹ کے اتنے ہی خلاف ہے جتنی ریاست جموں و کشمیر کی سرکار کے خلاف۔ پردھان منتری نے یہ بھی کہا کہ پرجا پریشد کی تحریک پُرامن نہیں ہے۔

بھارت اور پاکستان کے کرکٹ ٹیسٹ میچ

بھارت اور پاکستان کے مابین کرکٹ ٹیسٹ میچ کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہو گئے۔ پانچ ٹیسٹ میچوں میں سے دو میں بھارت کی جیت ہوئی، ایک میں پاکستان کامیاب ہوا اور دو میچ برابر رہے۔ اس طرح بھارت نے "ربر" جیت لیا۔ کلکتے کے میچ میں بھارت کے چوبیس سالہ نوجوان کھلاڑی دیپک شودھن نے اپنے پہلے ٹیسٹ میچ میں سنچری بنا کر شائقین سے داد حاصل کی۔ اس سلسلے میں ایک پارٹی میں تقریر کرتے ہوئے پاکستانی ٹیم کے کپتان کاردار نے بھارت کی پُرخلوص مہمان نوازی کے لئے شکریہ ادا کیا اور دیپک شودھن کو اس کے شاندار کھیل کے لئے مبارکباد دی۔

مولانا حفظ الرحمٰن کا مسلمانوں کو مشورہ

جمعیت العلماء کے لیڈر مولانا حفظ الرحمٰن نے اکولہ میں تقریر کرتے ہوئے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ سیاسیات میں تنگ نظری کو چھوڑ کر وسیع النظری کو اپنا نصب العین بنائیں۔ فرقہ پرست جماعتوں کی مذمت کرتے ہوئے مولانا نے کہا کہ صرف بھارت ہی نہیں بلکہ مشرق کے کسی دیش میں بھی مذہب کے نام پر کوئی حکومت نہیں چل سکتی، اس لئے مسلمانوں کو فرقہ وارانہ نقطۂ نگاہ ترک کر کے ترقی پسند بننا چاہیئے۔

کامن ویلتھ کانفرنس

لندن میں کامن ویلتھ ممالک کی اقتصادی کانفرنس میں اہم فیصلے کئے گئے۔ پہلا فیصلہ یہ ہوا کہ کامن ویلتھ دیشوں میں ڈالروں کو حاصل کرنے اور بچت کی اسکیموں کو مالی تعاون دینے کے لئے ایک کامن ویلتھ بنک قائم کیا جائے۔ ایک دوسرے فیصلے میں ترقی کی اسکیموں میں امداد دینے کے لئے امریکہ سے اپیل کی جائے گی۔

بھارت کو خراجِ تحسین

جاپان کے توکائی یونیورسٹی کے سیاسیات کے پروفیسر تاکے شی نے دہلی میں ایک تقریر کرتے ہوئے کہا کہ جاپان اور دوسرے ممالک کو بھارت کے موجودہ جمہوری نظام سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ آپ نے مزید کہا کہ بھارت کے زرّیں اصول دنیا بھر کے لئے شمعِ ہدایت ہیں اور ان سے کافی تعلیم حاصل کی جا سکتی ہے۔

رُوپیہ لگانے کی آسان اور محفوظ ترین مد

بیشک آپ اپنا سرمایہ بڑھانا چاہتے ہیں اور ایسا کون نہیں چاہتا خاصکر جب اس منافع پر انکم ٹیکس معاف ہو۔ پس آپ نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ خریدتے رہیئے۔ ان پر لگائے ہوئے ہر ایک سو روپیے بارہ سال کے بعد ڈیڑھ سو روپے ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ سرٹیفکیٹوں کو پوری میعاد تک رہنے دیں تو ان پر ۴¼ فیصدی سالانہ سود ملتا ہے۔ یہ شرح سود واقعی کافی زیادہ ہے جس قدر بھی ہو سکے خریدیئے۔ لیکن ان سرٹیفکیٹوں کو حتےّ الوسع قبل از میعاد نہیں بھنایئے۔ یاد رکھئے ان پر ہمیشہ اچھا سود ملتا رہتا ہے اور انکی قیمت بڑھتی رہتی ہے۔ آپ اور آپکے گھر والے اپنی معمولی بچت سے بھی ایک معقول سرمایہ اکٹھا کر سکتے ہیں۔

یہ سرٹیفکیٹ ڈاکخانوں سے ۵، ۱۰، ۵۰، ۱۰۰، ۵۰۰، ۱۰۰۰ اور ۵۰۰۰ رُوپے کی رقموں میں ملتے ہیں۔

۱۲ سالہ نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ

یہ سرٹیفکیٹ بموجب نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ قواعد ۱۹۴۴ (بمعہ اصلاحات) جاری ہیں۔ مزید تفصیلات اور قواعد کیلئے نیشنل سیونگز کمشنر، گارٹن کاسل شملہ۔ ۳ یا اپنے صوبائی نیشنل سیونگز آفیسر کو لکھئے۔

AC 438

Regd. No. E P - 689

حمید الماس

چندا

چندا تیری جوت نرالی   جیسے سُندرتا کی تھالی

سُرخ شفق کی ڈوبی لالی
دیکھ کے تیری سُندر چھایا
جاگ پڑی ہیں سوتی آنکھیں
بھاگ گئی ہے نیند کی مایا
جھوم کے ساری دھرتی گاتی
سا رے گا ما سا رے گا ما
چندا تیری جوت نرالی
جیسے سُندرتا کی تھالی

پربت کی چوٹی سے اُبھرا
ساگر کی لہروں پہ ناچا
کھیتوں کی ہریالی دمکی
جھوم اُٹھا ہر مست نظارا
دیکھ کے شِیتل شِیتل کرنیں
کوئل نے یہ گیت الاپا!
چندا تیری جوت نرالی
جیسے سُندرتا کی تھالی

دُور گگن کے رہنے والے!
مجھ کو اپنے پاس بُلا لے
تاروں کی دُنیا میں آ کر
گاؤں گا میں گیت نرالے
گیت کی میٹھی تانیں سُن کر
جاگ پڑیں گے سونے والے
چندا تیری جوت نرالی
جیسے سُندرتا کی تھالی

وی - رام چندرا ریڈی

چینی بچے

چین ہمارا پڑوسی ہے - ہمارے دیش اور چین کے درمیان آج ہی سے نہیں بلکہ سینکڑوں سالوں سے دوستانہ تعلقات ہیں۔ تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ اس دوستی کی بنیاد چھٹی صدی میں رکھی گئی - ایک طرف چین والوں کو ہندوستان کی بہت سی باتوں نے متاثر کیا تو دوسری طرف ہندوستان نے بھی چین سے بہت کچھ سیکھا - چین سے بڑے بڑے عالم اور سیاح ہندوستان آئے - ہیون سانگ اور فاہیان کا نام تو تم نے اپنی تاریخ کی کتاب میں پڑھا ہی ہوگا - بس ایسے ہی کئی سیاح ہندوستان آئے جنہوں نے چین کے رشتہ کو ہندوستان کے ساتھ مضبوط کیا ـــــ آؤ آج ہم تمہیں تمہارے ننھے ننھے چینی دوستوں سے ملائیں -

بچے ہر کسی کو پیارے لگتے ہیں - اسی لئے چین میں جب کسی کی شادی ہو چکتی ہے تو میاں اور بیوی کی بھی بڑی خواہش یہی ہوتی ہے کہ ان کے جلد بچے پیدا ہوں - اس کے علاوہ وہ دیوی کے مندر جا کر منتیں مانگتے اور دیوی کے پرانے جوتے لا کر ان کی پوجا کرتے ہیں - جب ان کی خواہش پوری ہو جاتی ہے تو ویسا ہی ایک جوڑا جوتا بنوا کر مندر پر چڑھاتے ہیں - جب ماں باپ کے دل کی مراد پوری ہو جاتی ہے اور ان کے گھر ایک ننھا جنم لیتا ہے تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا - پیدا ہوتے ہی بچے کے بازو پر لال ڈورا باندھا جاتا ہے - چینیوں کا خیال ہے کہ اس طرح بازو نہ باندھنے سے بچہ بڑا ہو کر ضدی نکلے گا - بری نظر بھوت پریت اور بیماری سے بچانے کے لئے بچے کی گردن میں بھی ایک لال ڈورا باندھ کر اس میں کئی چھوٹی چھوٹی چیزیں لٹکائی جاتی ہیں - چینی بچے کے پہلے کپڑے کسی ستر یا اسی سال کے بوڑھے کے پرانے کپڑوں سے بنتے ہیں - ماں باپ خیال کرتے ہیں کہ ایسا کرنے سے بچے کی عمر زیادہ ہوتی ہے -

چھ برس کی عمر تک بچے کے کھیل کود کا زمانہ ہوتا ہے - جب بچہ چھ برس کا ہو جاتا ہے - تو اسے اسکول بھیج دیا جاتا ہے - پہلی بار جب بچہ اسکول جاتا ہے تو اپنے استاد کے لئے کوئی نہ کوئی تحفہ لے جاتا ہے - تعلیم شروع کرنے سے پہلے وہ مندر جا کر تین مرتبہ سر جھکاتا ہے اور آداب بجا لاتا ہے - اور اسی طرح تین بار اپنے استاد کو بھی سلام کرتا ہے - اسکول میں بچے کو چار ہزار شکلیں سیکھنی پڑتی ہیں - جن سے کہ چینی زبان کے لفظ بنتے ہیں - چینی زبان اردو کی طرح نہ داہنی سے بائیں کو لکھی جاتی ہے نہ انگریزی

کی طرح بائیں سے دائیں کو بلکہ یہ اوپر سے نیچے کی طرف لکھی جاتی ہے ۔ چینی بچے لکھنے کے لئے تمہاری طرح قلم نہیں بلکہ برش استعمال کرتے ہیں ۔

چینی اپنے بچوں کی تربیت کا خاص خیال رکھتے ہیں ۔ بچپن سے بچوں کو ملنے جلنے سلام کرنے ' کسی کا انتظار کرنے ' کمرے میں داخل ہونے ' کسی کے سامنے کوئی چیز پیش کرنے غرض ہر قسم کے آداب اچھی طرح سکھائے جاتے ہیں ۔ لڑکپن ہی میں انہیں ہر قسم کی تکلیف سہنے اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے ـــــ چینی بچوں کو جو سب سے پہلا سبق دیا جاتا ہے ۔ وہ محبت کا سبق ہے ۔ انہیں اپنے دیس سے محبت ' انسانیت سے محبت ' ساری دنیا کے لوگوں سے محبت ' اور دنیا کے امن سے محبت سکھائی جاتی ہے ۔ انہیں بتادیا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ جھوٹ ' لڑائی ' جھگڑے سے نفرت کریں اور کبھی کسی کا دل نہ دکھائیں کیونکہ اس سے ایشور ناخوش ہوتا ہے چینی بچوں میں بڑا نظم و ضبط پایا جاتا ہے ۔ پڑھائی ' کھیلوں ' جلوسوں غرض ہر کسی جگہ بڑی سلیقگی اور صاف ستھرا پن پایا جاتا ہے ۔ وہ جب اسکولوں سے نکلتے ہیں تو دوہری قطار کی شکل میں نکلتے ہیں ۔

نئے چین کے بچے تعلیم اور ترقی کی دوڑ میں دوسرے دیشوں کے بچوں سے کسی طرح پیچھے نہیں ۔ اس وقت سارے چین میں کوئی (۲۰،۰۰۰) سرکاری اور پرائیویٹ نرسری اسکول ہیں ۔ جن میں بچوں کی ہر طرح تربیت کی جاتی ہے

چینی بچے اپنی دبی ہوئی ناک ' پھیلے ہوئے منہ اور چندھی آنکھوں کی وجہ سے ہمیں عجیب نظر آتے ہیں ۔ اور تو اور تم تو ان کے نام بھی سن کر شاید ہنسنے لگو اور سوچو کہ "واہ ! بڑے عجیب نام ہیں" لیکن بھئی اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے ۔ وہاں کے نام ہی ایسے ہوتے ہیں ۔ تمہارے نام بھی اگر کوئی چینی بچہ سن لے تو وہ بھی اسے عجیب و غریب معلوم ہوں گے ۔

چانگ مے چین ایک لڑکی کا نام ہے اور ہنگ چنگ کوی ایک لڑکے کا ـــــ چیانگ مے چین (لڑکی) کا کرتہ ٹخنوں تک آتا ہے اس کے اوپر وہ ایک چھوٹا سا کوٹ پہنتی ہے ۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کو پیٹھ پر باندھ لیتی ہے ۔ اسے اس کام میں اتنی مہارت ہے کہ بچہ پیٹھ پر بندھا ہوتا ہے اور وہ اپنی امی کی مدد کرتی ہے یا باہر جاکر کھیلتی کودتی ہے ۔ ہنگ چنگ کوی (لڑکا) لمبا چغہ یا پتلون قمیض پہنتا ہے اور سرخ اسکارف باندھتا ہے ۔

جب چینی عوام کا کوئی مہمان چین میں داخل ہوتا ہے تو سب سے پہلے اس کی ملاقات چینی بچوں سے ہوتی ہے جو اپنے رنگ برنگے کپڑوں میں بڑے ہی سندر لگتے ہیں ۔

چینیوں کے یہاں گیند بلا اور فٹ بال کی قسم کے کھیل نہیں ۔ ان کے کھیل اور ہی ہوتے ہیں ۔ ایک کھیل میں چھوٹے چھوٹے لکڑی کے ٹکڑوں کو کسی چیز کا نشانہ بنایا جاتا ہے ۔ آنکھ مچولی چینی بچوں کا بڑا دل پسند کھیل ہے یہ لٹو بھی بڑے شوق سے گھماتے ہیں ۔ ان کے لٹو بانس کے ہوتے ہیں جن کو گھمانے سے خوب آواز ہوتی ہے ۔ چین میں پتنگ اڑانے کا بھی بڑا رواج ہے ۔ بہار کے موسم میں نہ صرف چھوٹے بچے بلکہ بڑے بوڑھے سب ہی پتنگ اڑاتے ہیں ۔ چینیوں کے پتنگ کے داؤ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں ـــــ شٹل کاک یا "چڑیوں کا کھیل" لڑکیوں میں بڑا مقبول ہے لیکن یہ شٹل کاک ریکٹ سے نہیں بلکہ پیر سے ٹھوکر لگا کر کھیلتی ہیں ۔

ایم - اے - واحد

سبز پری

میری کامیابی کا پہلا دن تھا - جماعت سوم میں درجۂ اوّل سے کامیاب ہوا - تمام گھر میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں - ماں مجھے بار بار اپنے پاس بلا کر پیار کر رہی تھیں - شفیق آپا دفتر سے آتے وقت میرے لئے ایک رنگین موٹر لے آئے اور یہ کہہ کر دیا۔ "دیکھو بیٹا! اگر تم ہر سال اسی طرح درجہ اوّل میں کامیاب ہوئے تو ہم تمہیں مدرسہ جانے کے لئے ایک چھوٹی بائیسکل لا دیں گے -

شام ہوئی تو مجھے نئے کپڑے پہنائے گئے - ناہید باجی نے اپنا اسنو اور پوڈر لگا کر مجھے تیار کر دیا - ورنہ کہاں کا اسنو کدھر کا پوڈر؟ وہ تو ہمیشہ ایک دو چپت ہی رسید کیا کرتی تھی - میں آئینے میں اپنی صورت دیکھ ہی رہا تھا کہ عزیز، عابد اور ممتاز آدھمکے - اب ہم شام کے کھانے کے لئے بیٹھ گئے - ایک تو دوستوں کی موجودگی - دوسرے کامیابی کی خوشی اور تیسری بات یہ کہ دسترخوان پر بہترین میٹھے کھانے موجود تھے - بس تو میں معمول سے کچھ زیادہ ہی کھا گیا -

دوستوں کو رخصت کر کے اباجی کے پلنگ پر سو رہا - روز تو ابا یہ کہہ کر مجھے ٹال دیتے کہ جاؤ! اپنی ماں کے پاس سو رہو - لیکن آج انہوں نے بھی کچھ نہ کہا - آنکھ لگتے ہی میں بہت جلد خوابوں کی دنیا میں کھو گیا - دیکھتا کیا ہوں کہ ایک سبز پری میرے بستر کے قریب کھڑی اپنے رنگین پکھوئے ہلا رہی ہے - مجھے بیدار پاکر اس نے کہا "پریوں کی شہزادی نے تمہاری کامیابی کی خوشی میں بادلوں کی دنیا میں ایک شاندار دعوت ترتیب دی ہے - اور تمہیں یاد فرمایا ہے" میں مارے خوشی کے پھولا نہ سما رہا تھا - وہی نئے کپڑے پہنے اور جانے کے لئے تیار ہو گیا - اس اچھی پری نے پھر کہا "یاد رکھو! اگر تم نے مجھے چھونے کی ذرا بھی کوشش کی تو بلندی سے زمین پر دھکیل دئے جاؤ گے"۔

اب میں اس پری کے پیچھے پیچھے فضا میں اڑنے لگا - وہ بلند ہوتی گئی اور میں بھی ہوا میں تیرتا رہا - حتےٰ کہ ہم بادلوں میں پہنچ گئے - سفید بادل کے بڑے سے ٹکڑے پر مختلف رنگ کی پریاں راگ رنگ میں مشغول تھیں - ان کے درمیان ایک نہایت خوبصورت پری قیمتی لباس پہنے تخت پر بیٹھی ہوئی تھیں - ہمارے پہنچتے ہی تمام

پریاں شہزادی کے ارد گرد جمع ہوگئیں ۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے سامنے ہر موسم کے پھلوں اور میوہ جات کے ڈھیر لگا دیئے گئے ۔ سب نے مل کر خوب کھایا ۔

دعوت کے خاتمے پر تمام پریوں نے شہزادی کے حکم سے ایک خوبصورت ناچ دکھایا ۔ ناچ کے دوران میں وہ لوگ کبھی بادلوں میں چھپتے نکلتے ۔ فضا میں دبتے اُبھرتے عجیب خوشنما منظر پیدا کر رہے تھے ۔ جب ناچ ختم ہوا تو شہزادی نے سبز پری کو حکم دیا کہ وہ مجھے اپنے بستر پر چھوڑ آئے ۔ گو کہ میرا دل اس رنگین دنیا کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن میں خود بخود سبز پری کے ساتھ کھنچا نیچے اُتر رہا تھا ۔

میں نے غور سے دیکھا ۔ سبز پری بے حد خوبصورت تھی اور اس کے نازک پکھوٹے قوس وقزح کے سات رنگوں سے بھرے تھے ۔ جنہیں دیکھ کر مجھے یکا یک خیال ہوا کہ کیوں نہ میں انہیں ذرا چھو کر دیکھوں ۔ ایک لمحہ کے لئے سب کچھ بھول گیا اور لپک کر دونوں ہاتھ پکھوٹوں کی طرف بڑھائے ۔ جونہی میرے ہاتھ پری کو لگے وہ غائب ہوگئی اور میری نگاہوں میں تاریکی چھا گئی ۔ میں لڑکھڑاتا ہوا تیزی کے ساتھ زمین کی طرف آ رہا تھا ۔ جیسے ہی میں زمین پر گرا میری نیند بیدار ہوگئی اور میں نے اپنے آپ کو فرش پر پڑا ہوا پایا ۔

حواس ٹھکانے ہوئے تو تب مجھے احساس ہوا کہ میں دراصل آسمان کی بلندی سے زمین پر نہیں گرا تھا بلکہ صرف اپنے پلنگ سے فرش پر آ رہا تھا ۔ اب میرے ہاتھ میں پری کے پکھوٹے نہیں بلکہ تکیہ کے دو کونے ہیں اور میں تکیے پر سوار ——!!!

دیویندر ناتھ

لطیفے

اُستاد ۔ (موہن سے) بتاؤ آدم خور کون ہوتا ہے ؟

موہن ۔ پتہ نہیں جناب ۔

اُستاد ۔ اگر تم اپنے ماں باپ کو کھا جاؤ تو تم کیا کہلاؤ گے ؟

موہن ۔ یتیم

ایک آدمی ۔ (دوسرے سے) میں تمام دُنیا کی سیر کر چکا ہوں ۔

دوسرا آدمی ۔ تب تو آپ دُنیا کے جغرافیے سے پُوری طرح واقف ہونگے ؟

پہلا آدمی ۔ بے شک جغرافیہ ایک بہت بڑا شہر ہے ۔ مگر مجھے صرف چند ہی دن رہنے کا موقع ملا ۔ اس لئے اچھی طرح سیر نہ کر سکا ۔

دکاندار ۔ (دوسرے سے) کیا اشتہار بازی سے کوئی نتیجہ بھی برآمد ہوتا ہے ؟

دُوسرا ۔ یقیناً ۔ پرسوں ہی ہم نے ایک چوکیدار کے لئے اشتہار دیا اور کل ہی چوری ہوگئی ۔

احسن حامد

یہ سکّے

میں اپنے کمرے میں بیٹھا بڑے اطمینان سے پڑھ رہا تھا کہ میری چھوٹی بہن شوکت اندر آگئی۔ دیکھ کر روح فنا ہوگئی۔ جانتا تھا کہ بس اب پڑھائی ہو چکی مگر آج اس کے تیور کچھ بدلے ہوئے تھے۔ وہ میرے پاس آکر چپ کھڑی ہوگئی اور بولی "جب دیکھو جب یہی بہانہ کہ ٹوٹے ہوئے پیسے نہیں۔ کبھی ایک کا نوٹ ہے کبھی پانچ کا اور کبھی دس کا"۔ میں نے پوچھا کہ بات کیا ہے جو اس قدر غصّے ہو۔ کہنے لگی آپا پیسے نہیں دتیں آپ چل کر دلوا دیجئے۔ یا پھر خود دیجئے۔

"ارے بھائی میرے پاس پیسے کہاں" میں نے کہا "ہم سے پرانے زمانے کے لوگ ہی مزے میں تھے۔ ان پیسوں نے تو ساری دنیا کو تنگ کر ڈالا"۔

"مگر وہ کیسے؟" اس نے پوچھا۔

میں "یہ چکر ہی نہ تھا اس زمانے میں۔ نہ روپے تھے اور نہ پیسے اور مزے کی بات یہ ہے کہ دنیا والوں کا کام بھی خوب چلتا تھا"۔

شوکت "ہائیں! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بالکل غلط۔ یہ گپیں زیادہ نہ اڑایا کیجئے بھائی جان بری بات ہے"۔

میں۔ "ارے سنو تو میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں"۔

شوکت "مگر میں نہیں مان سکتی۔ امین بھائی کے پاس تو بہت سے پرانے زمانے کے سکّے ہیں۔ اس روز وہ بتا رہے تھے کہ ان کے پاس اکبر تک کے زمانے کے روپے اور اٹھنیاں ہیں۔ اور آپ کہہ رہے ہیں کہ پہلے سکّے نہیں ہوتے تھے۔ کچھ آتا جاتا تو ہے نہیں اور لگے مجھے بہکانے"۔

میں۔ اچھا چلو بھئی یہی مان لیا کہ کچھ نہیں آتا۔ مگر تم ایک بات بتاؤ۔ وہ یہ کہ اکبر کے زمانے سے پہلے بھی تو آخر کوئی زمانہ تھا۔ دنیا کوئی اکبر کے وقت سے تھوڑی شروع ہوتی ہے۔ اس کو تو سینکڑوں ہزاروں کیا لاکھوں برس گزر گئے ہیں۔

شوکت یہ سن کر چپ ہوگئی۔ جیسے اس کی سمجھ میں یہ بات آگئی ہو۔ مگر تھوڑی دیر بعد اس نے پھر ایک سوال کر ڈالا۔

شوکت - اچھا بھائی جان! تو پھر یہ بتائیے کہ اگر پُرانے زمانے میں
روپے نہیں ہوتے تھے تو پھر دنیا والوں کا کام کیسے چلتا تھا
لوگ اپنی ضرورت کی چیزیں کیسے خریدتے تھے ؟
میں - خریدنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی - انسان کو اب سے
لاکھوں سال پہلے صرف تین چیزوں کی ضرورت ہوتی تھی کھانے
پہننے اور رہنے کے لئے جگہ کی - سو کھانے کے لئے لاتعداد
پھل اور جنگلی جانور موجود تھے - تن ڈھانکنے کے لئے کھالوں
کی اور پتوں کی کوئی کمی نہیں تھی اور رہنے کے لئے پہاڑوں کے
غار تھے - ہزاروں سال تک لوگ اسی طرح گزر کرتے رہے -
مگر اس ہزاروں سال کی مدّت میں انسان نے آہستہ آہستہ
ترقّی کرلی - جنگلی پھل پھلواری کھانے کے بجائے خود جوت
بو کر کھانا شروع کر دیا - پتے اور کھالیں چھوڑ کر موٹا جھوٹا
کپڑا بننا سیکھ لیا - جنگلی جانوروں کے ڈر سے محفوظ مکان
بنا لئے - کنکر پتھروں کی مدد سے شکار کھیلنے کے عوض
تیر کمان اور بھالوں کا استعمال سیکھ لیا - غرض یوں سمجھو
جیسے جیسے انسان ترقّی کرتا رہا ویسے ویسے ضرورتیں بھی
بڑھتی رہیں"۔

شوکت "تو پھر بھائی جان لوگوں نے چیزیں خریدنے کے لئے
روپے پیسے بنانا شروع کر دئے"۔

میں "ابھی کہاں سے - ابھی تو روپے پیسوں کی ضرورت نہ پڑی
اور نہ ہی اُن کا نام تھا"۔

شوکت "مگر پھر کسان ہل کیسے خریدتے تھے - شکاری تیر کمان
کہاں سے لاتے تھے - کپڑا بننے والوں کے پاس روئی کہاں
سے آجاتی تھی - ان سب کو تو ان چیزوں کے خریدنے کے
لئے روپیوں کی ضرورت پڑتی ہی ہو گی"۔

میں "سنو! ہوتا یہ تھا کہ کوئی شکار کھیلتا اور کوئی ہتھیار بناتا تھا
اور پھر دونوں شکار تقسیم کر لیتے کوئی ہل بناتا کوئی کھیتی باڑی
کرتا اور آپس میں غلّہ بانٹ لیتے - غرض ہر آدمی الگ الگ اپنا
کام کرتا - جس کو جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ دوسرے کے
پاس جاتا اور اپنی چیز کے بدلے میں اس کی بنائی ہوئی چیز لے
لیتا اور اس طرح ایک دوسرے کی مدد سے سب کا کام نکل
جاتا تھا"۔

شوکت "مگر اس طرح تو اب بھی کام چل سکتا ہے - پھر روپے
پیسوں کی کیا ضرورت ہے"۔

میں "نہیں اب اس چیز کے بدلے چیز سے کام نہیں چل سکتا ہے
پہلے چونکہ گنی چُنی ضرورتیں تھیں اس لئے لین دین کی ضرورت بھی
کبھی کبھی ہی پڑتی تھی - مگر اب ضرورتوں کے ساتھ ساتھ لین دین
بھی بڑھ گیا - اس لئے چیز کے بدلے چیزیں بڑی مشکلیں
ہوں گی - اور بھئی ہم سے پہلے جو لوگ تھے انہوں نے بھی یہ
دقتیں محسوس کیں اسی لئے تو سکوں کا رواج ہوا"۔

شوکت "مگر میری سمجھ میں آتا نہیں کہ اس میں کیا مشکلیں تھیں -
سیدھا سادہ آسان طریقہ معلوم ہوتا ہے -

میں "دیکھو ابھی سمجھ میں آجاتا ہے بس ایک منٹ کے لئے یہ فرض
کرلو کہ ہم تم دونوں ایسی دنیا میں ہیں جہاں روپے پیسوں
کا رواج نہیں - اور پھر یہ بھی مان لو کہ میرے پاس اناج ہے
اور تمہارے پاس کپڑا - تم کو اناج کی ضرورت پڑتی ہے - تم
میرے پاس آؤگی اور کہوگی کہ بھئی یہ کپڑا لے لو اور مجھے اناج
دو - اور اگر مجھے کپڑے کی ضرورت نہیں بلکہ جوتوں کی ہے تو
پھر کیا ہوگا؟

شوکت تھوڑی دیر بیٹھی سوچتی رہی اس کے بعد بولی "پہلے

میں موچی کے پاس جاؤں گی - موچی سے جوتا لوں گی - اور پھر جوتا لاکر
آپ کو دوں گی پھر کہیں جاکر مجھے آپ سے اناج ملے گا - پھر
پیسوں گی، گوندھوں گی، پکاؤں گی اور پھر کھاؤں گی"۔

مَیں - "مذاق مت شروع کرو - یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ موچی کو بھی
تمہارے کپڑے کی ضرورت نہ ہو تو پھر کیا کھاؤ گی"۔

شوکت - "ارے یہ تو مَیں نے سوچا ہی نہیں، پھر تو سچ مچ بڑی مشکل
ہو جائیگی -

مَیں - "بس اِن ہی مشکلوں سے بچنے کے لئے سکّے بنے - جن کی وجہ
سے لین دین میں بڑی آسانی ہو گئی - اب روپے کی مدد سے
تم اناج بھی خرید سکتی ہو اور مَیں جوتے بھی"۔

شوکت "- مگر بھائی جان! ان کم بخت نوٹوں کی کیا ضرورت تھی؟
جن کی وجہ سے آپا اتنی آسانی سے بہانہ بنا لیتی ہیں"۔

مَیں - "ہاں بھئی یہ بھی سُن لو - جب تجارت بڑھی، ہزاروں لاکھوں
بیوپار ہونے لگا تو ان بھاری دھاتوں کے سکّوں کو لادے
لادے گھومنا وبالِ جان بن گیا - اسی سے سمجھ لو کہ اگر کسی
کو بیس ہزار روپے کا مال خریدنا ہے تو اس کے لئے ضروری
تھا کہ وہ چھ من بوجھ لادے لادے گھومے اور چھ من
بھی جب ہوتا ہے جب روپے روپے والے سکّے ہوں"۔

شوکت - "تو یہ بات ہے"۔

مَیں - "اب تشریف لے جائیے، کہانی ختم"۔

شوکت - "مگر بھائی جان پیسے"؟

مَیں - "پیسے ہضم"۔

—— سالز بری کے بڑے گرجے میں تین سو پینسٹھ (۳۶۵)
کھڑکیاں ہیں -

بی جینت کمار

کیا تم جانتے ہو ـــ کہ

—— دُنیا کی سب سے لمبی دیوار چین میں ہے جسے "دیوارِ چین" کہتے
ہیں اس کی لمبائی ۱۲۵۰ میل ہے -

—— دُنیا کا سب سے پُرانا اخبار "پیکنگ گزٹ" ہے -

—— دُنیا کی سب سے لمبی سُرنگ "پیرنیز" یورپ میں ہے جس کی
لمبائی ۲۵ میل ہے -

—— دنیا کا سب سے خوبصورت شہر "پیرس" ہے - جس کو
"عروس عالم" کہتے ہیں -

—— دُنیا کا سب سے بڑا تجارتی مرکز شکاگو ہے -

—— انسان کا دل ایک منٹ میں بہتّر مرتبہ حرکت کرتا ہے -

—— آدمی کے جسم میں ۵۰۰ پٹھے اور ۲۰۶ مختلف قسم کی ہڈیاں
ہوتی ہیں -

—— انسان کے سر پر عموماً ایک لاکھ چالیس ہزار بال ہوتے ہیں -

—— ہندوستان میں بجلی سے چلنے والی ریل گاڑی (الیکٹرک ٹرین)
۱۹۲۵ء میں بوری بندر اور کُرلا کے درمیان چلی تھی -

—— دُنیا کا سب سے بڑا عجائب گھر لنڈن میں ہے جو برٹش میوزیم
کے نام سے مشہور ہے -

—— لنڈن میں ۷۰۰ گلیاں، ۴۴۳ سینما کی ٹاکیز اور ۳۰۰ سے
زائد ریلوے اسٹیشن ہیں -

—— سر فرانسس ڈریک پہلا انگریز تھا جس نے کُل دنیا کا
چکر لگایا تھا -

آج کل

اپریل ۱۹۵۳ء

ترتیب

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل
دہلی

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- پال مکند عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد

جلد ۱۱ —— نمبر ۹

سالانہ چندہ:- ہندوستان میں:- چھ روپے
پاکستان میں:- چھ روپے

غیر ممالک سے:- نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- ہندوستان میں - آٹھ آنے
پاکستان میں - آٹھ آنے

اپریل ۱۹۵۳ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

مانی جائسی

شاعر کا مذہب

نگاہوں میں ہے اب تک منظرِ صبحِ ازل اے دل — یکایک وا درِ مے خانہ ہائے راز ہو جانا
وہ جوشِ فیض، وہ پیہم صلائے عام ساقی کا — وہ پیاسے مے کشوں کا گوش بر آواز ہو جانا

اُدھر شیشے تھے مشروباتِ رنگا رنگ سے مملو — اِدھر انواعِ مخلوقات شامل مے گساروں میں
فرشتے، آدمی، جن، عالمِ ایجاد کی ہر شے — بڑا مجمع تھا، اور شاعر بھی تھا اُمیدواروں میں

عطائے دستِ قسّامِ ازل کی حد بیاں کیا ہو — ملی سب کو بقدرِ ظرف، جس مے کش نے جو چاہی
مسرّت، اِبتلا، حُسنِ نمایاں، خوبیٔ باطن — متاعِ دیں، فلاحِ دُنیوی، درویشی و شاہی

بھرا ہر فردِ موجودات نے پیمانۂ قسمت — نہ باقی بوند بھر مے تھی نہ کوئی جام خالی تھا
بچا لی تھی مگر ساقی نے دو شیشوں میں تھوڑی سی — اور اُمیدِ کرم میں ایک مردِ لااُبالی تھا

شرابِ دردِ دل تھی جلوہ گر اِک آبگینے میں — جھلک تھی دوسرے میں بادۂ حق آشنائی کی
وہ مردِ لااُبالی، شاعرِ محرومِ قسمت تھا — نظر پڑتی تھی اب جس پر خدا کی اور خدائی کی

کیا ممزوج ان دونوں شرابوں کو جو ساقی نے — ہوئے تازہ مشامِ خلق بُوئے روح پرور سے
ہوائیں عطر برسانے لگیں اس طرح شاعر پر — فلک سے فصلِ گُل میں جیسے شبنم پھول پر برسے

اُٹھا کر شیشہ پھر ساقی نے یہ ارشاد فرمایا — اِدھر لا جام اپنا، اے کہ تیرا نام مانی ہے
یہ وہ شے ہے کہ پینا جس کا ہے خونِ جگر پینا — مگر یہ یاد رکھ ہر قطرہ دریائے معانی ہے

مُبارک ہو تجھے اے شاعرِ رنگیں نوا لے جا — یہی حصّہ تری قسمت کا ہے اور تیرا مشرب ہے
یہ تیری زندگی ہے بلکہ تیری زیست کا حاصل — یہ تیری رہبرِ مقصود، یعنی تیرا مذہب ہے

سوئے ساقی چلا پیمانہ لے کر اس طرح مانی — کہ اطمینان صدقے ہو گیا اُس کی اداؤں پر
اِدھر لبریز تھا شاعر کا ساغر ان شرابوں سے — تبسّم اُس طرف شاعر کا چھایا تھا فضاؤں پر

عرش ملسیانی

غزل

غم کی نوا طرب کی صدا جُرم ہو گئی
جینے کی ایک ایک ادا جُرم ہو گئی

ہونے لگی ہے اہلِ وفا سے بھی باز پُرس
ناقدریٔ جہاں سے وفا جُرم ہو گئی

ایسی ہوا چلی چمنستانِ دہر میں
گُل بوئے نسیم و صبا جُرم ہو گئی

جو دل ہے پاک و صاف وہی نامراد ہے
پاکیزگیٔ قلبِ صفا جُرم ہو گئی

اک رہ گئی تھی مذہبِ انسانیت کی بات
وہ بات بھی بفضلِ خدا جُرم ہو گئی

اس درجہ بڑھ گئے ہیں خدایانِ ظلم و جَور
بندوں کی آرزوئے بقا جُرم ہو گئی

مظلوم کی دُعائیں اثر مانتے ہیں سب
لیکن یہ کیا ہُوا کہ دُعا جُرم ہو گئی

دردِ غمِ حیات کے بڑھنے کا غم نہیں
رونا تو ہے کہ اس کی دوا جُرم ہو گئی

اس درجہ حکمِ ضبطِ فغاں ہے کہ ان دنوں
سازِ دلِ حزیں کی صدا جُرم ہو گئی

اُس تمکنت پہ حُسن کی رونا پڑے گا عرش
جس تمکنت کے دم سے حیا جُرم ہو گئی

سیّد اطہر حسین جعفری

عراق کا ایک غیر معروف فرقہ — مندائی

یزیدیوں اور دیگر چھوٹے فرقوں کی طرح جو دنیا سے الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے گمنامی کی حالت میں پڑے ہیں مندائیوں کی حالت سے بھی بہت سے لوگ اب تک واقف نہیں ہیں۔ اور اس عدم شہرت کا پردہ اس وجہ سے اور بھی گہرا ہوتا جاتا ہے کہ خود اہلِ فرقہ اپنے مذہبی عقائد اور رسم و رواج کو دوسروں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر اتفاق سے کوئی شخص اُن کی عبادت کے طریقوں اور اُن کے معبودوں کے بارے میں سوال کرے تو اُس کا جواب نہایت مبہم الفاظ میں دیتے ہیں۔ عبادت کے لیے " ایک خدا کے قایل تو ضرور ہیں لیکن یہ کہ وہ خدا ہے کیسا ؟ یا یہ کہ اس کے علاوہ اور بھی خدا مثلاً چاند، سورج، ستارے وغیرہ ہیں یا نہیں، اس کے جواب دینے سے گریز کرتے ہیں۔ یہ بپتسمہ دینے والے سینٹ یوحنا کے پیرو عیسائی جنہیں مقامی لوگ صبا، صُبّی اور عربی مصنفین صبئیو کہتے ہیں اصل میں صابئین (قدیم ستارہ پرست) نہیں بلکہ مندائی ہیں۔ صُبّا لفظ صُبّ سے مشتق ہے جس کے معنی انڈیلنا (پانی) یا دھونا ہیں۔ جس سے اُن کی ایک مخصوص رسمِ غسل (نہانے کے وقت سر پہ پانی ڈالنا یا کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا) پر روشنی پڑتی ہے۔ اوّل اوّل اس فرقے کا ظہور حرّان واقع ملک شام میں ہوا۔ قرونِ وسطیٰ میں لوگ انھیں غلطی سے ستارہ پرست سمجھتے تھے۔ بعدازاں جب اس فرقے کے بعض روشن افراد نے مذہبی شعار اختیار کی جس پر عیسائیت کا گہرا رنگ چڑھا ہوا تھا تو کچھ سے کچھ ہو گئے۔

یہ لوگ (صُبّا) معادن (عمّارہ) ناصریّہ۔ بصرہ۔ مُحمّرہ اور ناصریّہ العجمی (اہواز) کے درمیان کے مربع دلدلی میدان کے دیہات اور قصبات میں پائے جاتے ہیں۔ ایسی ہی سرزمین میں جہاں آبِ رواں ہمیشہ موجود رہتا ہے گاؤں کے بالکل کنارے ان صُبّوں کی آبادی ملے گی جہاں وہ اپنے نجّاری اور حدّادی کے پیشے میں مشغول رہتے ہیں۔ اُن کی ایک صنعت مشہور (ایک قسم کی کشتی جس کے دونوں سرے بلند اور اوپر کو اُٹھے ہوتے ہیں) ہے جو دلدلی زمین میں اُگے ہوئے نرکٹوں کی صفوں کو چیرتی ہوئی نہایت درجہ تیزی سے پانی میں چلتی ہے۔ بعض قدیم سیّاحوں نے … (بلم) کشتیوں کی بنی ہوئی بھدّی رائفلوں اور پستولوں کا ذکر کیا ہے جو اصل میں انہی صبّیوں کی دستکاری کا نمونہ ہیں کیونکہ معادن کے قصبوں میں عربی نجّار (بڑھئی) یا حدّاد (لوہار) بہت ہی کم ہیں۔

ان کی دوسری صنعت جس نے کچھ ہی مدّت قبل درجۂ شہرت حاصل کیا ہے۔ چاندی سونے کے ظروف پر نقّاشی کا کام ہے۔ اس صنعت کے جاننے والے معدودے چند ہیں جن میں سے بعض نے گزشتہ (اوّل) جنگِ عظیم کے موقع پر برطانوی فوجوں کے ہاتھ اپنے مصنوعات بیچ بیچ کر خوب ہی روپیہ کمایا تھا۔ یہ لوگ چاندی یا سونے کے ظروف اور زیورات مثلاً چائے کے برتن سیگریٹ کیس۔ چھڑی کی موٹھ، بٹن، کنگھی، انگوٹھی وغیرہ پر قدرتی مناظر کے نقوش یا تصویریں کندہ کر کے ایک قسم کی سیاہ دھات سے بھر دیتے ہیں اور اس خوبی سے کہ معلوم ہوتا ہے فوٹو کے کیمرے سے عکس لیا گیا ہے یوں تو اس قسم کا کام ہر صبّی زرگر بناتا ہے لیکن قصبۂ عمّارہ کے دو مشہور زرگر اس صنعت میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام شیخ ظہرون اور دوسرے کا عبدالحسن ہے۔ ان کی استادانہ نقّاشی اور ہاتھ کی صفائی قابلِ تحسین و تمجید ہے۔ چنانچہ شیخ ظہرون نے کسی زمانے میں سیگریٹ کیس کے ڈھکنے پر شہزادۂ ویلز کی تصویر نقش کر کے تحفے کے طور پر شہزادۂ موصوف کی خدمت میں بھیجی تھی جو ولایت میں نہایت درجہ پسند کی گئی۔ اسی طرح جب سر پرسی کوکس ہائی کمشنر عراق اپنے عہدے سے سبکدوش ہو کر ولایت جا رہے تھے تو اہلِ عراق کی جانب سے جو یادگار پیش کی گئی تھی۔ وہ خالص سونے کا بنا ہوا زبیدہ خاتون کا مقبرہ (نقل) تھا جو اسی قسم کی نقّاشی سے مزیّن تھا جسے اس صنعت کا بہترین نمونہ سمجھنا چاہیئے۔

عراق میں صبّیوں کی مجموعی تعداد پندرہ اور بیس ہزار کے درمیان ہوگی۔ اوّل جنگِ عظیم کے بعد بعض نے ترکِ وطن کیا اور موصل اور کرکوک وغیرہ میں جا کر آباد ہوئے اور کئی بمبئی چلے آئے۔ اب اس ترقّی کے زمانے میں اُن کے لڑکے تحصیلِ علم کی غرض سے مدرسہ جانے لگے ہیں جن کا شمار ذکی اور ذہین طلبہ میں ہوتا ہے۔ ایک لڑکے

نے مدّت ہوئی۔ مدرسے کے علمی مدارج طے کرنے کے بعد ٹریننگ کالج میں داخل ہو کر معلّمی کی سند بھی حاصل کر لی تھی۔ اور یہ وہ شرف ہے جو غالباً ایک ہزار سال کے اندر اس قوم کے کسی فرد کو حاصل نہیں ہُوا۔

گو اس فرقے کے ابتدائی حالات بالکل تاریکی میں ہیں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ یہ لوگ نہایت قدیم زمانے سے انہی دلدلوں میں رہتے چلے آئے ہیں۔ معادن کے وحشی قبائل کے درمیان اتنے عرصۂ دراز تک ان صبیّوں کا قیام محض اس وجہ سے رہ سکا کہ اُن (قبائل) کے نجّاری اور حدّادی کے جملہ کام انہی صبیّوں کی بدولت چلتے ہیں۔

جیسا کہ اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے صُبّی اپنے مذہبی عقاید کو دوسروں کے سامنے بیان کرتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ چنانچہ ایک زمانے میں جب عراق کے مشہور اخبار "اوقات العراق" کے ایک نمایندے نے چند صبّیوں سے بعض سوالات اُن کے مذہب کے متعلق کئے تو اُن کے جوابات انھوں نے بجبر و اکراہ دئے جو ناظرین کی تفریحِ طبع کے لئے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

ایک نے کہا "ہم حضرت یحییٰ بن زکریا کے معتقد ہیں جو ہمارے مذہب کے سچّے رسول اور پیشوا ہیں۔ اس سچّے نبی کا ظہور یسوع مسیح سے بیالیس[۴۲] سال قبل شاہ فلیت کے زمانے میں ہُوا تھا۔ انھوں نے اردونے کے بنا کردہ یروشلم کو تباہ کر دیا۔ قوم یہود کو جس نے انھیں (کسی زمانے میں) قتل کیا تھا۔ ساری دنیا میں منتشر کر دیا اور عالمِ نور کی طرف مراجعت سے پہلے اپنے مذہبی اصول کی تبلیغ کے لئے تین سو ساٹھ پیغمبر دنیا میں روانہ کئے۔ چند صدیوں کے بعد دمشق اُن کے تابعین کے اسقفِ اعلیٰ کا مستقر بن گیا۔ اس ایک شہر میں اُن کی چار سو عبادت گاہیں تھیں۔ احتیاطاً ان کو یہاں سے عمّارہ اور عمّارہ سے خوزستان کو منتقل ہونا پڑا۔ ہم اپنے اعمال اپنی مقدّس کتاب سدرہ کے احکام کے مطابق بجا لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم نے اپنے رسول کی دو سنّتیں اختیار کی ہیں۔ ایک غسل تعمید (بپتسمہ) دوسری سر اور داڑھی کے بالوں کا رکھنا۔ غسل جس کے لئے آبِ رواں مخصوص ہے ہر خرد و بزرگ پر واجب ہے۔ غسل دیتے وقت ہمارا اسقف سات عدد سفید رنگ کے کپڑے پہنتا ہے۔ بچّے کو پہلا غسل ہمارا شیخ (اسقف) دیتا ہے۔ اور جب وہ جوان ہو جاتا ہے تو خود متعدد بار غسل تعمید لیتا ہے"۔ جب یہ سوال کیا گیا کہ تمہارا خدا کون ہے؟ تو جواب دیا "وہی جو یہودیوں کا خدا ہے، عیسائیوں کا خدا ہے مسلمانوں کا خدا ہے"۔ لیکن مزید تحقیق سے پتہ چلا کہ صُبّی دراصل تثلیث کے قائل ہیں جس میں پیرا رَبّ (عشقِ اعظم) اَیَا ضِوا مرتّبا (انتر لامع اعظم) اور مَنَا رَبّہ (روحِ جلالِ اعظم) شامل ہیں۔ ان میں سے آخری امتیازی درجہ رکھتا ہے۔ اور جو حَیَاءِ قَدمَہٗ (حیاتِ قدیمہ) کا سرچشمہ اور اس فرقے کا حقیقی خدا اور اُن کی دعاؤں کا مرجع ہے۔ اسی خدا سے یُوشامن کا وجود ہُوا۔ جسے حَیَاء ثنین (حیاتِ ثانیہ) کہتے ہیں۔ اس کے بعد مَنْدَا دَحَیَاء (رسول یا منادیٔ حیات) ہُوا۔ چنانچہ یہی مَنْدَا اس فرقۂ منداؤں کا ماخذ ہے۔ ان کے اعتقاد میں مَنْدَا دَحَیَا بہت ہی جلیل القدر ہے۔ اس لئے کہ وہی ان کا مُصلح اور شفیع ہے۔ مَنْدَا کا درجہ ان کے نزدیک وہی ہے جو حضرت عیسیٰؑ کا نصرانیوں کے نزدیک ہے۔ حَیَاءِ ثنین کا بیٹا حَیَاءِ ثلثائی (حیاتِ ثالثہ) ہے جسے اَیَا ثُوثر یا بہِر جلالت بھی کہتے ہیں۔ اس کے بیٹے پتاحیل نے زمین اور انسان کو پیدا کیا۔

اس سوال کے جواب میں کہ آیا تم حیاتِ اُخروی اور دوزخ کے بھی قایل ہو؟ کہا۔ "ہمارے اعتقاد کے مطابق گناہگاروں کی تعذیب کے لئے تین دوزخیں ہیں۔ (غالباً آسمانی) اور چار زمینی غار ہیں۔ ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ حَیَاءِ ثلثائی اپنے میزان میں اُن لوگوں کے اعمال تولتا ہے جو پلٹ کر اُس کے پاس جاتے ہیں"۔ جب پوچھا گیا کہ تمہارے ہم مذہب زمین کے گول ہونے کے قائل ہیں؟ تو کہا۔ "نہیں ہمارے خیال میں زمین چپٹی ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ آسمان ایک سمندر ہے جس میں ستارے تیرتے رہتے ہیں۔ اور قطب تارا وسطی آفتاب ہے۔ ہماری کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ دُنیا (۴۸۰۰۰۰) سال تک رہے گی۔

منداُیوں کا عقیدہ ہے کہ دیگر مذاہب کے جملہ انبیاء جھوٹے ہیں۔ اس دعویٰ کی دلیل یہ بیان کرتے ہیں کہ چونکہ ہر فرقہ خود اپنے ہی رسول کا معتقد ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ بھی اپنے رسولوں کے علاوہ دوسروں کو نہیں مانتے۔ اس سوال پر کہ اُن کا پیشوائے اعظم کون ہے؟ جواب دیا "اوّل درجہ غنزیورا Bishop کا ہے۔ اس کے بعد طرمیدہ Priest ہے جسے شیخ کہا جاتا ہے اور اس کے بعد شکنزہ Deacon ہے"۔ "ان میں سے ہر ایک کو شادی کرنے کا حق حاصل ہے۔ مردوں کے علاوہ عورتیں بھی مذہبی پیشوا ہو سکتی ہیں۔ ہماری جملہ مذہبی رسوم کے موقع پر اور خاص کر متوثہ (غسلِ تعمید) کے وقت برہنہ یا ننگا رہنا ضروری ہے۔ ہماری عبادت گاہیں بالکل مختصر سی ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ بعض اسقفوں کے لئے مخصوص ہیں۔ عوام باہر کھڑے رہتے ہیں۔ عبادت گاہ کا آبِ رواں کے قریب رہنا لازمی ہے۔ عبادت کے وقت ہم اپنا رُخ قطب کی طرف رکھتے ہیں۔ ہمارا یوم الرّاحت اتوار ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے یہاں چند عیدیں ہیں۔ ہم نماز دن میں تین مرتبہ پڑھتے ہیں"۔

بعض دیگر سوالوں کے جواب میں کہا "ہمارا مذہبی قانون سر کے بال کٹوانے سے منع کرتا ہے۔ لیکن ہم میں بعض ایسے بھی ہیں جو اس قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں اس لئے کہ اُن سے اس کی پابندی نہیں ہو سکتی۔ لیکن داڑھی کے بال کبھی کوئی نہیں کٹواتا۔ ہم دوسروں کو اپنے مذہب میں لانے کی کوشش نہیں کرتے۔ لیکن اس امر میں ضرور کوشاں رہتے ہیں کہ ہمارے مذہب کا کوئی شخص دوسرے میں نہ جانے پائے۔ کوئی شخص اور خاص کر عورت اگر اتفاق سے دوسرا مذہب اختیار کرے لیکن پھر تائب ہو کر ہمارے حلقے میں نہ آجائے تو اُس کے قتل میں ہم دریغ نہیں کرتے۔ ہم غیر قوموں کے ساتھ مزاحمت روا نہیں رکھتے۔ لیکن اگر کوئی شخص دوسرے فرقے کا ہم میں شریک ہونا چاہے تو اُسے شادی کے لئے اپنی لڑکی دینے میں تامل نہیں کرتے۔ محض عیسائی ہمارے مذہب میں شریک ہو سکتے ہیں۔ آعشاد (شط العرب کے قریب کی جدید آبادی) میں ہماری جماعت کی تعداد اتنی کم ہے کہ ہم اپنے لئے کوئی عبادت گاہ تعمیر نہیں کرا سکتے۔ ہم میں سے ہر شخص اپنی مقدس کتاب (سدرا) رکھ سکتا ہے۔ لیکن ایسے افراد شاذونادر ہی ہوں گے جن کے پاس کتاب ہو یا وہ اُسے پڑھ بھی سکیں۔ بعض مقامات پر ہمارے مخصوص مدرسے بھی ہیں جن میں لڑکوں کو کتاب مقدس کی تعلیم دی جاتی ہے۔"

اس سوال پر کہ کیا تم اپنی کتاب دکھا سکتے ہو؟ جواب دیا "افسوس ہے کہ میرے پاس نہیں ہے۔ لیکن اپنی مخصوص تحریر کا نمونہ دکھا سکتا ہوں" چنانچہ جب اُس نے نمونہ پیش کیا تو کہا گیا کہ یہ تو اسیریائی طرز تحریر سے بہت مشابہ ہے تو کہا "ہاں یہاں ایک اسیریائی شخص تھا جو ہماری کتاب کو ہم سے بہتر پڑھ سکتا تھا۔ لیکن یہ خط ارامی ہے ہم لوگ آپس میں اسی زبان میں بات چیت کر سکتے ہیں۔ گو ہمارے مذہبی قوانین سخت ہیں لیکن ہم تاحدِ امکان اُن کی پابندی کی کوشش کرتے ہیں۔ عیسائی ہم سے زیادہ معقول پسند ہیں۔ جب وہ کچھ کرتے ہیں تو یہ سمجھ کر کہ ایسا کرنا قرین عقل ہے۔ اُن کے یہاں ہمارے یہاں سے زیادہ آزادئ عمل ہے۔"

معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے مذہب کے اصول اہل بابل کے مذہب سے لئے ہیں۔ چنانچہ ان کے اکثر نام بھی بابل کے دیوتاؤں کے ناموں پر ہوتے ہیں۔ باوجود چند در چند قیود کے ان کے مذہب کو عراق کے تینوں رائج الوقت مذہبوں کا عطر مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔

ان کی مخصوص عید کا وہی زمانہ ہے جو یہود کی عید الفصح یا عیسائیوں کی عید القیامہ Easter کا زمانہ ہوتا ہے۔ سوائے اس مخصوص عید کے موقع کے وہ تمام سال گوشت نہیں کھاتے مگر ہاں مچھلی کھا لیتے ہیں۔ صرف اس عید کے دن گوشت کھا لینے کے بعد بھی وہ تین دن تک گھر کے اندر ہی رہتے ہیں۔ اس کے بعد دریا کے کنارے جا کر رسمی غسل کرتے ہیں۔

غسل تعمید کی طرح اُن کی شادیاں بھی دریا ہی کے کنارے ہوتی ہیں اس لئے کہ اُن کا پادری دولہا۔ دلھن دونوں کے سروں کو پانی میں غوطہ دیتا ہے۔ اس کے بعد اُن کے جسم پر پانی ڈالتا ہے۔

اُن کی کتابیں (مذہبی) عام طور سے قلمی ہیں جن کی کتابت کا بھی عجیب انداز ہے۔ نصف صفحے سے شروع کرتے ہیں اور آخر تک لکھ لاتے ہیں۔ اس کے بعد صفحے کو اُلٹ کر پھر بقیہ نصف صفحے سے شروع کر کے آخر تک لکھ لاتے ہیں۔ عبارت دونوں طرف یکساں ہوتی ہے۔ اس لئے کہ کتاب ہمیشہ پانی کے چشمے کے قریب بیٹھ کر پڑھی جاتی ہے۔ دو پادری چشمے کے ادھر اُدھر بیٹھتے ہیں۔ بیچ میں کتاب معلق رکھی جاتی ہے اور ان میں سے ہر ایک ایک ہی عبارت کو اپنی اپنی جانب سے پڑھتا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ اس صورت سے پڑھنے سے یہ فائدہ ہے کہ اگر قراءت میں کوئی غلطی ہوئی تو پانی میں بہ کر چلی جائے گی۔

علاوہ مخصوص عید کے نوروز کی شام کو بھی خوشی مناتے ہیں بلکہ شب بیداری کرتے ہیں اور حاکم ناسوتی کے نام پر قربانی بھی کرتے ہیں۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ کسی نہ کسی زمانے میں یزیدیوں کے ساتھ جو موصل کے شمال میں پائے جاتے ہیں، کچھ نہ کچھ اُن کا تعلق ضرور رہا ہے۔

ہر صبّی کے پاس سفید رنگ کا ایک خاص لباس ہوتا ہے جو غسل تعمید کے دن پہنا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک یہ لباس اس درجہ متبرک ہوتا ہے کہ اُسی سے کفن کا کام بھی لیتے ہیں تاکہ یوم جزا خدائے عالم ناسوت (شیطان) کے سامنے اُسی لباس میں حاضر ہوں۔ عید بزرگ کے سلسلے میں سال جدید کی پہلی شام کو یہ لوگ اپنے عارضی خیموں کے اندر مٹی کی دیوار کا ایک مذبح طیار کرتے ہیں جس کے اندر بیٹھ کر تیل میں جو کا آٹا خمیر کر کے ٹکیاں پکاتے ہیں جو لہا عموماً مذبح کے قریب ہی ہوتا ہے۔ ٹکیاں طیار ہو جانے کے بعد ایک کبوتر ذبح کیا جاتا ہے۔ جس کے خون کے چار چار قطرے ہر ٹکی پر اس طور سے ڈالے جاتے ہیں کہ صلیب کی شکل بن جائے اس کے بعد مذہبی کتاب پڑھی جاتی ہے اور ان کے علاوہ ٹکیوں کو اپنے مریدوں کے حلقے میں بانٹتے ہیں اور ہر ایک کے منہ میں ایک ٹکی دیتے جاتے ہیں۔ اس کے بعد قربانی والا کبوتر مذبح کی پشت پر دفن کر دیا جاتا ہے۔ یہ رسم ہر سال دن میں ادا کی جاتی ہے اور شہر عمارہ میں اس کے لئے دریائے دجلہ کا کنارہ مخصوص ہے۔

صبّی قد کے لمبے چوڑے ہوتے ہیں اور عام طور پر لمبی لمبی داڑھیاں رکھتے ہیں۔ یہ بڑے صلح پسند، محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں اور عام طور سے مویشی پالتے ہیں۔ ان کے قدیم لباس اور وضع قطع میں بہت ہی کم تغیر واقع ہوا ہے اور قریب قریب اُسی شکل کے ہیں جیسے اُن کے قدیم بطریق تھے۔

جاں نثار اختر

۲۵ دسمبر[1]

(صفیہ کے نام)

مجاز کی بہن اور جاں نثار اختر کی بیگم محترمہ صفیہ طویل مدّت تک بیمار رہیں اور حال ہی میں اُن کا انتقال ہوگیا۔ اس صدمۂ جانکاہ سے پہلے یہ نظم لکھی گئی تھی۔ مرحومہ اب اس دُنیا میں نہیں۔ اس نظم کی رقّت اب اور بھی بڑھ گئی ہے۔ مرحومہ حمیدیہ کالج بھوپال میں پروفیسر تھیں۔ کئی مہینے علیل رہیں اور لکھنؤ میں انتقال فرمایا۔ ہمیں جاں نثار اختر اور مرحومہ کے لواحقین سے پوری ہمدردی ہے اور اُن کا غم خود ہمارا غم ہے کیونکہ مرحومہ آج کل کے ممتاز مضمون نگاروں میں سے تھیں۔ (ادارہ)

یہ ترے پیار کی خوشبو سے مہکتی ہوئی رات\
اپنے سینے میں چھپائے ترے دل کی دھڑکن\
آج پھر تیری ادا سے مرے پاس آئی ہے

کتنے لمحے کہ تری پیار بھری نظروں نے\
کس سلیقے سے سجائی مرے دل کی محفل\
کس قرینے سے سکھایا مجھے جینے کا شعور

اپنی آنکھوں میں تری زلف کا ڈالے کاجل\
اپنی پلکوں پہ سجائے ہوئے ارمانوں کے خواب\
اپنے آنچل پہ تمنّا کے ستارے ٹانکے

کتنے لمحے کہ حسیں، نرم، سبک آنچل سے\
تو نے بڑھ کر مرے ماتھے کا پسینہ پونچھا\
چاندنی بن گئی راہوں کی کڑی دھوپ مجھے

رات کی زلف پہ پھر سے تری افشاں جھلکی\
نرم کرنیں ہیں کہ پھیلی ہوئی باہیں تیری\
میرے آغوش میں پھر چاند اُتر آیا ہے

کتنے لمحے کہ غمِ زیست کے طوفانوں میں\
زندگانی کی جلائے ہوئے باغی مشعل\
تو مرا عزمِ جواں بن کے مرے ساتھ رہی

گنگناتی ہوئی یادوں کی لَویں جاگ اُٹھیں\
کتنے گذرے ہوئے لمحوں کے چمکتے جگنو\
دل کو ہالے میں لئے ناچ رہے ہیں کب سے

کتنے لمحے کہ غمِ دل سے اُبھر کر ہم نے\
اک نئی صبحِ محبّت کی لگن اپنائی\
ساری دُنیا کے لئے سارے زمانے کے لئے

کتنے لمحے کہ تری زلف کے سائے کے تلے\
غرق ہو کر تری آنکھوں کے حسیں ساغر میں\
غمِ دوراں سے بہت دور گذارے ہیں نے

انہی لمحوں کے گُل آویزہ شراروں کا تجھے\
گوندھ کر آج کوئی ہار پنہاؤں[2] آجا\
چوم کر مانگ تری، تجھ کو سجادوں آجا

[1] ۲۵ر دسمبر ہماری شادی کی یادگار تاریخ ہے۔ اختر

[2] پہنانا کی جگہ پنہانا عام طور پر بولا جاتا ہے۔ اور اس لئے میں اس لفظ کا استعمال جائز سمجھتا ہوں۔ اختر

پنج سالہ پلان

(گزشتہ سے پیوستہ)

زراعت

فاضل پیداوار کے لئے مطمحات

پلان میں فاضل پیداوار کے سلسلہ میں مطمحات ریاستی حکومتوں کے ساتھ بحث و تمحیص کے بعد قائم کئے گئے ہیں پہلے ان کو ۱۹۵۱ء میں مرتب کیا گیا اور اس سال تفصیل کے ساتھ غور و خوض کیا گیا۔ اگرچہ مطمح کی مقدار ستر لاکھ بیس ہزار ٹن مقرر ہوتی ہے لیکن تجارتی فصلوں کی طرف پیداوار کا رجحان ہو جانے کے خیال سے پلان کے دوران تکمیل ساٹھ لاکھ پچاس ہزار ٹن اضافے کی ہے۔ اس کمی کو دور کرنے کے لئے "زیادہ خوراک پیدا کرو" مہم کی انکوائری کمیٹی نے کچھ پروگراموں کی سفارش کی ہے۔ چنانچہ پیداواری پروگرام کے تحت ریاستی حکومتوں کو ایک ارب پچیس کروڑ روپیہ کے صرف سے ساٹھ لاکھ ٹن خوراک کی پیداوار حاصل کرنی پڑے گی۔ اس کے علاوہ پلاننگ کمیشن نے فاضل پیداوار کے لئے کچھ نسلی اسکیمیں بھی تجویز کی ہیں ان ذیلی پروگراموں کی تفصیلات ریاستی حکومتوں کے مشورے سے مرتب کی جائیں گی۔ زراعت کے لئے اب تک جو مالی امداد زیر غور تھی پلان میں اس سے کہیں زیادہ مقدار مقرر کی گئی ہے۔

تجارتی فصلیں

تجارتی فصلوں کی پیداوار کے لئے جو مطمح مقرر کیا گیا وہ اجلاس خوراک کی اس وقت کی قیمتوں پر مبنی ہے جب اس کا خاکہ پہلی دفعہ مرتب ہوا تھا۔ یہ بھی اغلب ہے کہ ان فصلوں کی پیداوار پر خوراک کی پیداواری کی بجائے قیمتیں اثر انداز ہوں۔ لہذا پلان میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ قیمتیں پیداوار پر بُرا اثر نہ ڈالیں۔

گاؤں سے پلاننگ کا آغاز

پلان میں جو مطمحات قائم کئے گئے ہیں درحقیقت ان کا نقطہ آغاز وہ منصوبہ بندی ہے جو گاؤں سے شروع ہوتی ہے ریاستوں میں مطمحات کو ضلعوں اور ضلعوں کے سب ڈویژنوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ہر فارم اور ہر گاؤں وہ فصل پیدا کرے جس سے وہ اپنے وسائل کی بدولت زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

زرعی پیداوار کی مذکورہ تجاویز کے علاوہ کمیشن نے زمین کے تحفظ زرعی پیداوار کی فروخت زراعت کے لئے مالی امداد۔ ڈائری فارم اور باغبانی وغیرہ کے متعلق بھی سفارشات پیش کی ہیں۔

ماہی گیری

ماہی گیری کے متعلق متعدد امور کی سفارشات پیش کرتے ہوئے اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ زرعی اسکولوں اور کالجوں میں زراعت کی تعلیم کے ساتھ ہی ماہی پروری کی تعلیم بھی دی جائے۔ سمندری ماہی گیری کے سلسلے میں پلان میں خلیج بنگال اور بحیرہ عرب میں ماہی گیری کے لئے جدید طرز کی کشتیوں اور جہازوں کے استعمال کی سفارش کی ہے پلان میں اس توقع کا اظہار بھی کیا گیا ہے کہ مجوزہ اسکیموں کی بدولت ۵۶-۱۹۵۵ء تک پیداوار میں پچاس فیصدی کا اضافہ ہو جائے گا۔

جنگل

جنگلوں کے متعلق پلان میں بتایا گیا ہے کہ ایسے علاقوں میں دوبارہ جنگل بانی کرنے پر فوری توجہ کی ضرورت ہے جہاں سے جنگلات کو صاف کر دیا گیا اور اس میں وہ چار ارب ایکڑ زمینداری کے جنگلات بھی ہیں جو حال ہی میں ریاستی حکومتوں کے زیر اختیار دئے گئے ہیں۔ گاؤں میں ایندھن کے لئے جنگل بانی کو فروغ دینے کے ساتھ ہی ساتھ پتھر کے کوئلے کے استعمال کو ترقی دی جائے تاکہ کھاد کے لئے گوبر کی بچت ہو سکے۔

توقع ہے کہ پلان کی تکمیل تک عمارتی لکڑی کی فراہمی میں تقریباً گیارہ

فیصدی کا اضافہ ہو جائے گا۔ چونکہ عمارتی لکڑی کی مانگ میں بہت تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اس لئے پلان میں کمائی ہوئی لکڑی کے استعمال کو فروغ دینے پر بھی زور دیا گیا ہے ۔

ایندھن اور عمارتی لکڑی فراہم کرنے کے علاوہ جنگلوں کی ترقی دیا سلائی، پلائی ووڈ اور کاغذ وغیرہ کی صنعتوں کے لئے بھی سہولت اور ترقی کا باعث ہوگی اس میں لاکھ اور بڑ وغیرہ کی برآمد میں اضافہ کے امکانات پائے جاتے ہیں ۔

اجتماعی ترقی اور دیہات کی توسیع

دیہاتی ترقی کے پیش نظر ۱۹۵۲ء میں اجتماعی ترقی کے پروگرام کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ چنانچہ اجتماعی ترقی کی ہر اسکیم کے تحت تین سو گاؤں ہوں گے۔ جن کا رقبہ ساڑھے چار سو سے پانچ سو مربع میل زیر کاشت رقبہ تقریباً ڈیڑھ لاکھ ایکڑ اور آبادی دو لاکھ کے قریب ہوگی۔ اسکیم کے علاقے کو ترقی کے تین بلاکوں میں تقسیم کر دیا جائے گا اور ایک بلاک میں تقریباً ایک سو گاؤں شامل ہوں گے۔ ۱۹۵۲ء میں جو پروگرام شروع ہوا ہے اس میں ایک کروڑ پچاس لاکھ کی آبادی شامل ہے۔ اجتماعی اسکیم زراعت اور متعلقات، رسل و رسائل، تعلیم، صحت، ضمنی روزگار، مکانات کی تعمیر و فراہمی، تربیت اور سماجی بہبود جیسے امور شامل ہیں ۔

پروگرام کی کامیابی کے لئے عوام کا تعاون اشد ضروری ہے چنانچہ پروجیکٹ ایگزیکٹو آفیسر کی امداد کے لئے غیر سرکاری افراد کی پروجیکٹ ایڈوائزری کمیٹی اور بھارت سیوک سماج دیہاتیوں کا تعاون حاصل کرنے کے لئے قائم کئے جائیں گے۔ ایک پروجیکٹ پر تین سال کی مدت میں پینسٹھ لاکھ روپے کے اخراجات کا اندازہ لگایا گیا ہے ان میں شہری اقامتوں کے سلسلے میں اخراجات شامل نہیں ہیں اس رقم میں چھ لاکھ ۵۳ ہزار روپے کے ڈالر بھی شامل ہوں گے ۔

اجتماعی ترقی کے پروگرام کی مالی ذمہ داریاں مرکزی اور ریاستی حکومتوں پر عائد ہوتی ہیں ابتدائی اخراجات میں مرکزی حکومت کا حصہ ۷۵ فیصدی اور ریاستی حکومت کا حصہ پچاس فی صدی رہے گا اور مسلسل اخراجات میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے حصے مساوی رہیں گے ۔

توسیع کی قومی سروس

"زیادہ خوراک پیدا کرو" مہم کی انکوائری کمیٹی نے دیہاتی کام کی توسیع کے لئے ایک قومی تنظیم قائم کرنے کی سفارش کی ہے۔ یہ تنظیم کسانوں کو ان کی دیہاتی زندگی میں رابطہ پیدا کرنے میں مدد دے گی۔ پلان کے زمانہ تکمیل میں قریباً ایک لاکھ بیس ہزار گاؤں اس تنظیم کے تحت آجائیں گے اور زرعی پیداوار کی افزائش کے پروگرام میں اس سے بہت مدد ملے گی ۔

خوراک کے متعلق پالیسی

پلان کی کامیاب تعمیل کے لئے خوراک کی ایک نہایت واضح پالیسی لازمی شرط ہے قیمتوں کے کم یا زیادہ ہونے کا انحصار اجناس خوراک کی قیمتوں پر ہے ان کی قیمتیں گراں ہونے کے باعث مجموعی طور پر لوازمات زندگی اور پیداوار کی قیمتوں میں اضافہ بالضرور ہو جاتا ہے۔ حالانکہ زمانہ جنگ میں قلت کے باعث خوراک پر کنٹرول کا طریقہ رائج ہوا۔ تاہم ایک منصوبہ بند اقتصادیات میں کنٹرول سے تعمیری اغراض پورے ہوتے ہیں مثلاً بہت غریب طبقوں کے لئے کم سے کم صرفہ کے معیاروں کا تحفظ کھاتے پیتے لوگوں میں حد سے زیادہ یا نمائشی صرفہ کی روک تھام اور ملک کے پروگرام میں سرمایہ کاری کے لئے بے روزگار اشخاص کی براہ راست کھپت کی آسانیاں میسر ہوتی ہیں ۔

کمیشن کے خیال میں ملک میں خوراک کی جس کمی کو پورا کرنا ہے پیداوار اور صرفہ کے تخمینوں کی بنیادوں پر اس کا براہ راست تعین ناممکن ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ گزشتہ برسوں میں اوسطاً ۳۰ لاکھ ٹن اجناس خوراک ملک میں آیا اور ۱۹۴۸ء سے اب تک درآمد اجناس خوراک کی قیمت سات ارب پچاس کروڑ روپیہ بیٹھتی ہے ۔

خوراک کی پالیسی کا مقصد

کمیشن نے بیان کیا کہ خوراک کی پالیسی کا مقصد یہ ہے کہ پلان کی تکمیل کے زمانہ میں ملکی پیداوار میں اضافہ ہو۔ قابل فروخت فالتو اجناس میں زیادتی ہو اور اجناس خوراک کی درآمدی ضرورت کو آہستہ آہستہ دور کرنے کی غرض سے فالتو مقدار کی تقسیم بھی مساوی ہو۔ چونکہ خوراک کی پیداوار میں اضافے کی جد و جہد کچھ مدت کے بعد ہی پھل لائے گی اس لئے پالیسی کی بنیاد بھی اس خیال پر مبنی ہونی چاہئے کہ قلت اور کمی کچھ عرصہ برابر قائم رہیں گے خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ پلان کے تحت بڑے پیمانہ پر سرمایہ کاری کی توقع ہے۔ پلان کی تکمیل کے زمانہ میں راشن بندی تحصیل غلہ اور کم سے کم مقدار میں اجناس خوراک کی درآمد کو خوراک کے کنٹرولوں کے مضبوط طریقہ کار کو قائم رکھنے کا ایک تنہا وسیلہ تصور کرنا چاہیئے ۔

خوراک کی پالیسی کے اثرات براہ راست سرمایہ کاری کے پروگرام پر پڑتے ہیں لہذا جس قدر خوراک کی رسد زیادہ ہوگی اور جتنے زیادہ مؤثر طریقے پر اسے کام میں لایا جائے گا قوم اپنی سرمایہ کاری کی کوششوں کو اسی قدر زیادہ کامیاب بنا سکے گی کیونکہ خوراک ہی ان مزدوروں کی قوت قائم رکھنے کا ایک تنہا وسیلہ ہے جو تعمیری سامان کی پیداوار اور ساتھ سامان تیار کرنے میں لگائے جاتے ہیں۔ منصوبہ ترقیات کے لئے بشرط ضرورت قرضوں یا افراط زر سے سرمایہ پورا کرنے کا انحصار ایک مناسب غذائی پالیسی پر ہے قرضوں یا افراط زر کی ایسی تدبیر کی راہ میں جو چیز حائل ہے وہ سرمایہ حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہیں بلکہ بڑی رقموں کی آمدنی کا وہ خطرہ ہے جس سے کرنسی کا پھیلاؤ بڑھے گا اور مجموعی طور پر معاشیات میں ابتری پیدا ہونے کا امکان ہوگا۔ جس حد تک ان امور پر کنٹرول رکھا جائے گا اور اجناس خوراک و دیگر لازمی اجناس کی معقول قیمتوں پر رسد رسانی اور تقسیم ہوگی اس حد تک قرضوں یا افراط زر سے سرمایہ پورا کرنے کا انتظام روزگار فراہم کرنے کے لئے کیا جا سکتا ہے۔

اناج پر کنٹرول کی ضرورت

مندرجہ بالا حقائق کے پیش نظر یہ بہتر خیال کیا گیا ہے کہ خوراک کے کنٹرول کا بنیادی نظام منصوبہ کے عرصہ کے دوران برقرار رکھا جائے ہماری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ جب تک ہمارے ملک میں اناج کی پیداوار میں منصوبے میں ظاہر کئے گئے نظریہ کے مطابق ۷۵ لاکھ ٹن یا اس کے لگ بھگ اضافہ نہ ہو جائے۔ تب تک یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ ملک اپنی جائز ضروریات پوری کرنے کے لئے خوراک کی مناسب اور یقینی بہم رسانی کے قابل ہو گیا ہے۔ جب خوراک کی پیداوار مقررہ حد تک بڑھا لی جائے گی۔ اور ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصوں کو فوراً اناج بہم پہنچانے کے لئے نقل و حمل کی آسانیاں پیدا کر لی جائیں گی تب کنٹرول نرم کر دئے جائیں گے یا ان کی شکل بدل دی جائے گی۔ کنٹرول کس حد تک نرم کئے جا سکیں گے یا ان میں کیا تبدیلیاں کی جا سکیں گی اس کا انحصار اس سرمایہ پر ہوگا جو اس وقت صرف کرنا زیر تجویز ہوگا۔

مختلف ریاستوں میں مختلف مقررہ حد سے بڑے شہروں اور قصبوں میں راشن بندی حکماً جاری رکھنی ہوگی نیز ٹراونکور کوچین جیسے انتہائی قلت والے علاقوں کی ضروریات کا خیال رکھنا بھی لازم ہوگا۔ دیگر علاقوں کے لئے عام حالات میں غیر سرکاری راشن بندی کے ذریعے سے کنٹرول شدہ تقسیم کا طریقہ جاری رکھنا ہوگا۔ اناج کی فراہمی یا تو اجارہ داری کے طریقے سے یا لگان کی کی صورت میں ہو جائے گی۔ جیسا کہ مقامی حالات میں مناسب ہوگا۔ فالتو اناج والی ریاستوں سے زیادہ سے زیادہ اناج حاصل کرنے کے انتظامات کرنے ہوں گے۔

خوراک کے کنٹرول پر بطور ایک ملک گیر پالیسی کے عمل کیا جائے گا اگرچہ مختلف ریاستوں میں نظم و نسق کی تفاصیل میں اختلاف کی گنجائش ہوگی۔ پھر بھی ملکی پالیسی کا مقصد یہ ہوگا کہ فالتو اناج والی ہر ایک ریاست سے مشترکہ ذخیرے کے لئے اتنا زیادہ سے زیادہ اناج فراہم کیا جائے جتنا وہ دینے کے قابل ہو اور ہر ایک قلت اناج والی ریاست میں اناج کی فراہمی اور تقسیم کا کام اس طور پر منظم کیا جائے جس سے وہ مرکزی ذخیرے سے کم سے کم ضروری مقدار اناج طلب کرے۔ اناج کی فراہمی اور فروخت کے نرخوں کا تعین کرنے اور ریاستوں کی کنٹرول پالیسی کو مضبوط کرنے کی ذمہ داری مرکز کے ہاتھ میں ہونی لازم ہے۔ کنٹرول کے نظام کو برقرار رکھنے کے لئے اعلیٰ نظم و نسق کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اس لئے موجودہ نظام کو لازماً بہتر بنانا ہوگا۔

خوراکی عادات میں تبدیلی

سب سے آخر میں دنیا میں چاول کی قلت اور اس کے بہت زیادہ بڑھے ہوئے نرخوں کے پیش نظر جو اس کی غیر ملکوں سے درآمد کے لئے ادا کرنے پڑتے ہیں۔ لوگوں کی خوراکی عادات تبدیل کرنا انتہا درجہ مناسب ہے ملک میں چاول کی پیداوار کی کمی اس کی کل ضروریات کے دو یا تین فی صدی حصے سے زیادہ نہیں ہے۔ اس لئے لوگوں کی عام خوراک میں ایک معتدل حد تک تبدیل کر کے چاول کی بجائے گندم یا دیگر ضمنی خوراک استعمال کر کے اس کمی کو پورا کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہونا چاہئے۔ (مسلسل)

محمد منشاءالرحمٰن خاں منشا

شرح واردات

سوزِ غم موجبِ حیات بھی ہے
ایک شے، زہر بھی نبات بھی ہے

آگہی میں بھلا یہ بات کہاں
عشق پختہ بھی، باثبات بھی ہے

دل جو سمٹے تو خون کا قطرہ
اور پھیلے تو کائنات بھی ہے

آپ کا ہر ستم بجا، لیکن
کوئی شے حسنِ التفات بھی ہے

چہرہ روشن ہوا تو کیا حاصل
دل ہو روشن تو کوئی بات بھی ہے

زندگی اک بلا سہی لیکن
اس بلا سے کہیں نجات بھی ہے

گل و بلبل کی داستاں ہی نہیں
شاعری شرحِ واردات بھی ہے

ابر احسنی گنوری

غزل

دل اپنی دھن میں ناداں اور ناداں ہوتا جاتا ہے
محبت کرتا جاتا ہے پشیماں ہوتا جاتا ہے

گلابی ابر اشکِ چشمِ گریاں ہوتا جاتا ہے
جگر کا زخم آنکھوں سے نمایاں ہوتا جاتا ہے

ہر اک داغِ جگر دامن بداماں ہوتا جاتا ہے
محبت بھی اندھیروں میں چراغاں ہوتا جاتا ہے

شکستوں پہ شکستیں ہوتی جاتی ہیں سفینے کو
مگر پھر بھی گریباں گیرِ طوفاں ہوتا جاتا ہے

گھٹاتے رہتے ہیں انفاس پیہم زحمتِ ہستی
کہ دردِ زندگی خود اپنا درماں ہوتا جاتا ہے

احاطہ کر رہی ہیں میرا دیواریں بگولوں کی
جنوں میں غیب سے تعمیرِ زنداں ہوتا جاتا ہے

جسے تم نوکِ مژگاں پر تڑپتا چھوڑ آئے تھے
وہ قطرہ اب ترقی کر کے طوفاں ہوتا جاتا ہے

نظر نیچی کئے وہ سوچتا تھا جورِ تازہ کی
میں یہ سمجھا جفاؤں پر پشیماں ہوتا جاتا ہے

یہ احساسِ اسیری آ کے کس منزل میں لے آیا
کہ اپنا گھر بھی مجھ کو اب تو زنداں ہوتا جاتا ہے

فیض الرحمن اعظمی

اُردو ادب میں جدید تریں رُجحانات اور اُن کا تجزیہ

قوموں کی زندگی جس طرح انقلابات سے دوچار ہوتی رہتی ہے اسی طرح ادب کی تاریخ میں بھی نئے نئے انقلاب آتے رہتے ہیں۔ نئے موڑ اور نئے رجحانات آتے رہتے ہیں جو قومی اور سماجی زندگی کی عکاسی ہی نہیں کرتے بلکہ انھیں ایک نیا شعور عطا کرتے ہیں۔ بڑے ادب کی یہی سب سے بڑی پہچان ہے کہ وہ سماجی ذمہ داریوں سے بیک وقت عہدہ برا بھی ہو سکے اور ایک نئے مسلک کا متلاشی بھی ہو۔ یہاں ادب میں حقیقت نگاری کا درجہ بالکل متعین ہو جاتا ہے۔ میکانکی حقیقت نگاری ہی کو جو لوگ سب کچھ سمجھتے ہیں وہ غلط راستے پر پڑ جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ادب میں زندگی کی جو ترجمانی ہوتی ہے وہ براہ راست نہیں بالواسطہ ہوتی ہے۔ زندگی میں اتنے پیچ و خم اتنے متضاد راستے ایک دوسرے کو قطع کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہ ان کی صحیح طور پر حقیقت نگاری اس وقت تک کی ہی نہیں جا سکتی ہے۔ جب تک ادیب سماجی علوم اور شعور کا صحیح ادراک نہ رکھتا ہو۔ اور جب ادیب سماجی علوم اور شعور سے اچھی طرح واقف ہوگا۔ جب اسے زندگی کی نامیہ اور جدلیاتی قوتوں کا احساس ہوگا۔ اسی وقت وہ ایسا ادب پیش کر سکے گا جو ہمارے خفتہ خوابیدہ جذبات عمل کو اُبھار سکے اور جو حقیقت نگاری کے پردے میں صحیح تنقیدی شعور سے لیس ہو کر ایک بہتر زندگی کے لئے جد و جہد کر سکے۔ اسی لئے ادب زندگی کا محض عکس ہی نہیں ہے اس کا معمار بھی ہے اور اس کا رہبر بھی۔ وہ انسانوں کی ذہنی بلوغت اور بیداری میں حصہ لیتا ہے اور ایک نئے آدرش تک پہنچنے کا عزم اور حوصلہ بخشتا ہے۔ یہاں میں ایک چیز اور واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جب ہم ادب اور زندگی کے باہمی ربط کو دیکھتے ہیں تو ہم زندگی سے کیا مراد لیتے ہیں۔ ظاہر ہے طبقہ واری سماج میں زندگی الگ الگ خانوں میں بٹی ہوئی ہے اور ادیب کسی نہ کسی طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن بڑا ادیب وہی ہوتا ہے جو داخلی انفرادی اور مائل بہ زوال طبقے کی زندگی کے عوض خارجی، اجتماعی اور اس زندگی کو اپنے فن کی اساس ٹھہرائے جو مستقبل کی عنان اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ زندگی کو محض طبقہ واری اصولوں پر نہیں پرکھا جا سکتا۔ ایک بڑا فن کار ایک خاص طبقے سے تعلق رکھتے ہوئے بھی اپنے فن کا دائرہ زندگی کی پوری وسعت، اُس کی ساری تقسیموں اور طبقوں پر محیط کرتا ہے اور اس کا اپنا نقطۂ نظر طبقاتی ہونے کے عوض آفاقی اور عوامی ہوتا ہے۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ زندگی کی کشمکش سے ادیب خود الگ تھلگ رہ سکتا ہے یا اپنی تخلیقات کو رکھ سکتا ہے۔

یہاں بعض حضرات یہ کہیں گے کہ طبقہ واری نظام میں چونکہ ادیب ایک خاص نظام حیات کی شعوری یا غیر شعوری طور پر عکاسی کرتا ہے اس لئے وہ خواہ عوامی اور آفاقی ادب تخلیق کرنے کی کتنی ہی کوشش کرے وہ اپنے خاص طبقے سے آگے نہیں دیکھ سکتا۔ اس گروہ کے لوگ دُنیا کے تمام بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کو اسی نظریے پر جانچتے ہیں۔ لیکن جب وہ عظیم فن کار اس نظریے کی حدود کو توڑتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ وہ عظیم اس لئے ہیں کہ انھوں نے دوسروں کے مقابلے میں اپنے طبقے کی زیادہ سے زیادہ خارجی اور ذہنی عکاسی کی۔ ایسے لوگوں کا کہنا ہے کہ جب دُنیا میں بالکل ایک نیا غیر طبقاتی نظام قائم ہو جائے اس وقت طبقہ واری نظام کے ان تمام بڑے فن کاروں کی عظمت محض تاریخی دستاویز بن کر رہ جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہُوا کہ شیکسپیئر، ٹالسٹائی، پشکن، بالزک اور دوسرے بہت سے عظیم فن کاروں کی عظمت محض طبقہ واری نظام تک محدود ہے اور اس کے علاوہ ان کی کوئی عظمت نہیں ہے۔ لیکن ادب کو جانچنے کا یہ بالکل غلط مارکسی نقطۂ نظر ہے۔ ادب کے بارے میں انگلز، مارکس اور لینن نے جہاں کہیں بھی لکھا ہے اس کی جمالیاتی خوبی اور ایک "ماورائے عصر" عنصر کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ قدیم یونان کے اساطیری ادب کے بارے میں مارکس لکھتا ہے کہ

"یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ یونان کے فنون اور ادب اور اس کے ادوار مخصوص قسم کی سماجی ترقی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ہاں یہ سمجھنے میں یقیناً دقّت ہوتی ہے کہ وہ آج بھی کیوں جمالیاتی حظ کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ اور بعض معنوں میں ایک ایسا معیار قائم کئے ہوئے ہیں جس کو حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔" ادب کا یہی وہ حسن ہے

جسے مارکس "ابدی حسن" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ لینن نے بھی ان ہر دو گروہوں کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے اور عملی تنقید کے ذریعے سے ہماری رہنمائی بھی کی ہے جو بہت بھونڈے اور میکانکی طور پر سماجی ارتقاء کے قوانین کا اطلاق ادب پر کرتے ہیں۔ سماجی ترقی کا تعلق ترقی کی مختلف سمتوں سے ہے۔ سماجی شعور ایک خلّاقانہ قوّت ہے لیکن اگر اس کی بنیادیں مستحکم نہیں ہیں تو وہ ہمیں غلط معاشی راستے پر بھی ڈال سکتا ہے۔ پھر یہ کہ علم و ادب کا رشتہ معاشی بنیادوں کے ساتھ طبقاتی نظام میں اتنا براہ راست نہیں رہا ہے جتنا کہ قبائلی نظام میں تھا۔ اس لئے ہمیں فکری تحریکوں کو جانچتے وقت خاص طور سے ان کے تسلسل، منطق اور قانون کا بھی پتہ چلانا چاہیئے۔ فکری تحریکیں ادب پر بڑے گہرے اثرات چھوڑتی ہیں اور ادب کی تعریف لینن نے نہ صرف اس طرح کی ہے کہ ادب خارجی حقیقت کا آئینہ ہے بلکہ اس طرح بھی کہ ادب ادراکِ حقیقت میں مدد کرتا ہے۔ انھیں معنوں میں ادب پورے سماج کی زندگی کی تاریخ ہے اور حقیقت میں پرانے اور نئے کی جنگ۔ اور ادیب انھیں معنوں میں عظیم ہے کہ اس نے اس پرانے اور نئے کی جنگ میں کس کا ساتھ دیا ہے۔ عظیم فن کار کسی نہ کسی معنی میں نئے کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن جس حد تک نئے خیالات کی متضاد اور گنجلک تصویر عوام کے ذہن میں جھلکتی ہے وہ بھی متضاد اور گنجلک خیالات سے اسی حد تک متاثر ہوتا رہتا ہے لیکن بنیادی طور پر وہ نئے ہی کے ساتھ رہتا ہے۔ اس لئے کہ عظیم ادب میں انقلابی خیالات کی بہت کم براہ راست طور پر ترجمانی کی گئی ہے اور انھیں معنوں میں شیکسپیر، ٹالسٹائی، گوئٹے، پشکن اور بالزک وغیرہ عظیم ہیں۔ میں نے یہ اتنی لمبی تمہید محض اس لئے لکھی ہے کہ ادب کے بارے میں میرے خیالات ظاہر ہو جائیں۔ میں میکانکی اور غلط مارکسی طور پر ادب کو جانچنے کے سخت خلاف ہوں اس لئے کہ اُس صورت میں ہمارے پاس ماضی کے ادب عالیہ کا کچھ حصّہ بھی محفوظ نہ رہ سکے گا۔

اُردو ادب میں جدید ترین رجحانات سے میری مراد اُن رجحانات سے ہے جو ادھر آزادی کے بعد ظاہر ہوئے ہیں یا ہو رہے ہیں اور جو ترقی پسند تحریک ہی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ لیکن یہ رجحانات جن کی عکاسی ہمارے ادب میں گزشتہ پندرہ برس سے کی جا رہی ہے، اس کے ردِ عمل کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک نے لوگوں کی آنکھیں کھول دی تھیں اور سماجی شعور نے ایک بالکل نئے انداز سے کروٹ لی تھی۔ ہر طرف ادب میں سماجی شعور ہی کا ذکر تھا۔ ہر شاعر اور ادیب اس ترازو پر تولا جانے لگا تھا کہ اس کے یہاں کس حد تک سماجی کشمکش ملتی ہے۔ شعور کی اس پیدائش میں ہمارے ادیبوں اور نقّادوں نے جہاں بڑے تاریخی رول انجام دئے ہیں وہاں غلط اور میکانکی طور پر ادب کو پیش کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ تنقید میں تو خیر بہت کچھ اس ٹھہراؤ، ضبط اور توازن کا پتہ بھی چلتا ہے جو فن کے بے لاگ تجزیے کے لئے بہت ضروری ہے لیکن شاعری اور افسانے کی دُنیا میں جس نئے شعور اور نئے عزم اور ولولے سے شاعر اور افسانہ نگار میدان میں آئے ہیں اور جس طرح انھوں نے سماجی اور طبقاتی زندگی اور کشمکش کی عکاسی کی ہے وہاں غلط جذبے کی رَو میں بہہ کر ادب کو خطابت اور صحافت کے قریب لاکر کھڑا کر دیا جب میں صحافت کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو میری مراد اس سے ہرگز یہ نہیں ہوتی کہ میں ترقی پسند شاعری یا ادب کا مُنکر ہوں۔ لیکن میں ترقی پسندی کو اس معنی میں ہرگز استعمال نہیں کرنا چاہتا ہوں جن معنوں میں ہمارے بہت سے ترقی پسند شاعر اور ادیب آج بھی استعمال کر رہے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کی بنیاد تاریخ اور وقت کی ضرورت تھی۔ اس نے سب سے بڑا کام یہ انجام دیا ہے کہ انفرادیت پسند اور داخلیت کی خول میں سمٹے رہنے والے ادیبوں اور شاعروں کو چونکا دیا اور انھیں اپنی ذات کے بلند حصاروں سے نکال کر اس طرف لے آئے جہاں زندگی اور مسرّت کے حصول کے لئے جد و جہد کی جا رہی ہے۔ اب سماج کو نئے نئے زاویوں سے دیکھا جانے لگا اور ہر بُرائی کا ذمہ دار غلط معاشی نظام اور دولت کی غیر مساوی تقسیم کو ٹھہرایا گیا۔ اور ادب ملک اور قومیت کی حدود سے آگے جاکر بین الاقوامی مسائل کو اپنے دامن میں جگہ دینے لگا۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن ادب میں بیماریوں کا ایک ایسا گروہ بھی آگیا جو ادب کے جمالیاتی کیف اور ابدی حسن سے قطعاً منحرف ہو گیا۔ یہی نہیں اس گروہ نے ماضی کے ادبِ عالیہ کی نفی بھی کی اور پرانے شاعروں اور ادیبوں کو بورژوا اور رجعت پسند کہہ کر اپنی ترقی پسندی کی داد لی جانے لگی۔ شاعری میں مزدوروں اور سرمایہ داروں کا اس طرح ذکر ہونے لگا جس طرح غزل کی شاعری میں گل و بُلبل اور شمع و پروانے کا ہوتا ہے۔ اور اس طرح یہاں بھی بہت سے ٹھیٹ قسم کے ترقی پسند شاعر اس ذہنی روایت کے طلسم سے نہیں نکل سکے جس کو انھوں نے اپنے خیال میں بالکل توڑ دیا تھا۔ گل و بلبل کی شاعری میں تو خیر صدیوں کا ایک ضبط اور جمالیاتی احساس بھی ہے اور بہت کچھ انسانی قدریں بھی اُبھر آتی ہیں جیسے یہ اشعار ہیں۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

میرؔ

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے — دل ہے گویا چراغ مفلس کا (میر)

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ — کتنے آنسو پلک تک آئے تھے (")

نہ ہر کہ چہرہ بر افروخت دلبری داند — نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند (حافظ)

اسی نے خاک کیا تھا اسی نے پاک کیا — خوشا نصیب جو پالے پڑے محبت کے

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا (غالب)

لیکن ان کے یہاں وہ شئے بھی نایاب ہوگئی۔ غرض بہت سے ترقی پسند شاعر مزدور اور سرمایہ دار کے ذکر سے زبان کا چٹخارہ لینے لگے اور ایک نئی روایت کے پرستار بن گئے۔ اس کے علاوہ بعض شاعروں اور ادیبوں نے نفسیاتی اور جنسی مطالعوں اور تجزیوں سے ادب کے دامن کو بھرنے کی کوشش کی۔ بعضوں نے آزاد نظم لکھنے کو نثر لکھنے کے مترادف سمجھ لیا۔ اس وقت کی شاعری میں باوجود ایک بالکل نئے سماجی شعور اور عسرت اور دکھ سے بھرپور ہو کر بھی وہ ادبی حسن، وقار اور فنی گہرائی نہیں ابھرتی جو فن کو عظمت کا درجہ بخشتی ہے۔ اسی وجہ سے آج اردو شاعری کے بہت سے سُرخ ستارے ماند پڑ گئے ہیں یا پڑتے جا رہے ہیں۔

زندگی کے مسائل اتنے پیچیدہ ہیں کہ انھیں سمجھنے کے لئے بڑی محنت اور استقلال کی ضرورت پڑتی ہے۔ زندگی کی بہت ساری قوتیں جو ایک دوسرے میں گڈمڈ ہیں اُن کے عمل اور ردِ عمل کو سمجھنا پڑتا ہے۔ لیکن ترقی پسند تحریک سے جذباتی وابستگی نے بہت سے شاعروں اور ادیبوں کے یہاں انقلاب کا اتنا غلط تصور پیدا کیا کہ انقلاب کے صحیح تصورات اُبھارنے سے زیادہ انھوں نے روایتی شاعری کے محبوب کی شکل اُبھاری۔ محبت کا بالکل غلط نظریہ پیش کیا جانے لگا۔ اور سچی عشقیہ شاعری کو رجعت پسندی کے مترادف سمجھا گیا۔ ظاہر ہے محض جذبہ ہی سماجی زندگی کی عکاسی کے لئے کافی نہیں ہوتا ہے بلکہ مطالعے اور تجربے کی بھی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ اور جب مطالعے اور تجربے کے بغیر محض جذبے کے بل بوتے پر ادب پیدا کیا جانے لگے اس وقت فن میں گہرائی اور انفرادیت کہاں سے نمایاں ہوگی۔ اسی وجہ سے آج کے بہت سے انقلابی شاعروں کے یہاں اپنا خاص کوئی انفرادی رنگ نہیں ہے۔ لب و لہجہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ عوامی ادب کا وہ شور اُٹھا کہ اس طوفان میں اسلاف کے جاندار کارنامے بھی بہہ گئے۔ اُن کی صحت مند شاعری کو بھی رجعت پسند اور اُن کے ڈکشن کو بورژوا کہا گیا۔ عوامی ادب کے بارے میں ہمارے یہاں بہت غلط فہمیاں ملتی ہیں۔ ایک بڑا طبقہ تو اس خیال کا حامی تھا کہ چونکہ ہم ادب اور شاعری محض عوام کے لئے کر رہے ہیں اس لئے ہمارا ادب ایسا ہونا چاہیئے۔ کہ اسے ہر کس و ناکس سمجھ سکے۔ دوسرے معنی میں یہ کہ ادب کو عوام کی سطح تک لانا پڑے گا۔ اسی وقت ہم صحیح معنوں میں عوامی اور ترقی پسند ادب پیش کر سکیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے لوگ محض نعرے بازی ہی کو ادب سمجھتے ہیں۔ ایسے Vulgar Sociologists کا لینن نے بہت مذاق اُڑایا ہے۔ جو اتنا نہیں جانتے کہ علمی اور عام بول چال کی زبان میں بڑا فرق ہوتا ہے اور عظیم ادب علمی زبان میں تخلیق کیا جاتا ہے۔ اور علمی اور عام بولی کی خلیج کو اس وقت تک نہیں پاٹا جا سکتا ہے جب تک عوام تعلیم یافتہ نہ ہوں۔ لیکن جب تک عوام تعلیم یافتہ نہیں ہو جاتے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم فلسفہ و سائنس اور دوسرے سماجی علوم کے متعلق کچھ نہ لکھیں۔ اور جب ہم ان موضوعات پر لکھیں گے۔ تو ہمیں ایسی اصطلاحات بھی لانی پڑیں گی جو عام فہم نہیں ہو سکتیں۔ غرض اسی قسم کی اور بہت سی خامیاں تھیں جو ترقی پسندی اپنی جلو میں لائی تھی۔ آپ یہ نہ سمجھئے کہ میں ترقی پسندی کے خلاف ہوں یا مجھے زندگی کی جدلیاتی اور نامیہ قوت کا احساس نہیں —— مجھے اس کا اچھی طرح احساس ہے کہ ترقی پسند تحریک نے ہمارے ادب میں نئی راہیں روشن کی ہیں اور نئی نظر عطا کی ہے —— اس لئے کہ اس کی بنیاد بہت صالح عناصر پر رکھی گئی ہے۔ لیکن اس سے غلط جذباتی وابستگی اور ہمارے ادیبوں کی سستی قسم کی شہرت کی خواہش نے اس کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ان خامیوں اور کوتاہیوں کا تجزیہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن میرے خیال میں ہماری خامیوں کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے اور یہی ہماری سب سے بڑی کمزوری رہی ہے کہ ہم نے پورے طور پر عوام سے اپنا رشتہ نہیں جوڑا اس لئے ایسے ادب کی تخلیق نہ کر سکے جس میں عوام کی زندگی کی جھلک فنی خوبیوں اور ادبی وقار کے ساتھ نمایاں ہو۔ ان خامیوں کے ردِ عمل کے طور پر آج اردو ادب میں بالکل نئے رُجحانات نظر آ رہے ہیں۔ جن کی آواز بظاہر اتنی اُونچی نہیں ہے لیکن جو مستقبل کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ اب تک ادیبوں اور شاعروں کی سہل نگاری کی وجہ سے کوئی ایسا تعمیری اور ٹھوس کام نہیں ہو سکا جسے عظیم کہا جا سکتا ہے۔ اس سہل نگاری کی وجہ سے اب تک منشی پریم چند کے بعد اردو میں کوئی اچھا ناول نہیں تخلیق کیا جا سکا۔ شاعری میں بھی بہت کم ایسی نظمیں لکھی گئی ہیں جو ٹھوس کہی جا سکتی ہیں اور جن میں زندگی کے مختلف مسائل اُٹھائے گئے ہوں۔ تنقید میں بھی ٹھوس کام کم ہوئے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے مضامین زیادہ لکھے گئے ہیں۔ لیکن اب ہر صنف میں ایک بدلا ہوا رُجحان نظر آنے لگا ہے۔ ایسے شاعروں نے محض جذبے کے بل بوتے پر شاعری کی تھی وہ یا تو بالکل خاموش ہو گئے ہیں یا انھیں

خیالات کو بار بار نظم کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے Readymade قسم کی چیزوں میں بلندی کہاں سے پیدا ہو سکے گی۔ لیکن جن شاعروں نے تجربے اور مطالعے سے اپنے ذہنی اُفق کو وسیع کر لیا ہے۔ اُن کی شاعری میں عظمت اور بلندی آرہی ہے۔ شاعری میں سب سے زیادہ نمایاں رجحان یہ ہے کہ لوگ پھر غزل کی طرف مائل نظر آرہے ہیں۔ اور ایسے شاعروں نے بھی جو غزل کہنا گناہ سمجھتے تھے غزلیں کہنی شروع کر دی ہیں۔ غزل کا معاملہ بڑا نزاعی ہے لیکن ایک چیز سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر غزل کو ایک صنف وحشی کیوں قرار دیا جائے جب کہ اس نے ہمارے جذبات اور خیالات کی تربیت اور تہذیب میں بڑا حصّہ لیا ہے۔ غزل میں ہر قسم کے خیالات کی ترجمانی کے امکانات ہوتے ہیں۔ اور اس کی سب سے بڑی مثال فراق کی شاعری ہے جس میں کلاسیکی انداز اور ادبی وقار ہوتے ہوئے بھی جدید ترین خیالات کا اظہار ملتا ہے۔ پھر اس کے علاوہ یہ ضروری نہیں ہے کہ غزل کو ختم کر کے ہی آزاد شاعری کو پھلنے پھولنے کا موقع مل سکتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ایسی غزلیں جن میں موجودہ دَور کی ذہنی اور مادّی اُلجھنیں اور سماجی کشمکش کا اظہار نہ ہو۔ آج کے لئے بالکل بے کار ہیں۔ اس لئے کہ ہمارے پاس غزلوں کا اتنا کافی سرمایہ ہے کہ ہم قدیم رنگ کی غزلوں کو قبول نہیں کر سکتے۔ بہرکیف غزل کو مٹانے کی جو کوشش کی جارہی تھی۔ اس کے ردِّ عمل کے طور پر آج غالب شعری رجحان غزل گوئی کی طرف پھر مراجعت ہے۔ دوسرے یہ کہ اب شاعری میں گہرائی اور ضبط کا بھی پتہ چلنے لگا ہے۔ جذبے سے زیادہ فکر کی آمیزش ہے۔ اسی نئے رجحان کے تحت اب طویل نظمیں زیادہ لکھی جارہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ طویل نظمیں لکھنے میں جس توازن ہم آہنگی اور سماجی شعور کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ بڑے ضبط اور ٹھہراؤ کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ شاعری میں یہ نیا رجحان بہت قابل قدر ہے۔ اس کے بغیر فن میں عظمت مشکل سے پیدا ہوتی ہے اور پھر طویل نظموں میں زندگی کے زیادہ سے زیادہ اہم مسائل اُٹھائے جا سکتے ہیں۔ نظم آزاد میں بھی ہئیت اور مواد کو زیادہ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور ایسی تکنیک کا تجربہ کیا جارہا ہے جو سماجی شعور کو فنی خوبیوں کے ساتھ ہم آہنگ کر سکے اور ذہن کے اندر جستہ تصوّرات کو زیادہ کامیابی کے ساتھ اُبھار سکے۔ جعفری کی "ایشیا جاگ اُٹھا" کے بعض ٹکڑے اس کے اچھّے نمونے ہیں۔

دوسرا رجحان جو نظر آرہا ہے وہ یہ ہے کہ اب افسانے اتنی شد و مد سے نہیں لکھے جارہے ہیں جتنا کہ ادھر دس بارہ سال کے اندر لکھے گئے ہیں یوں تو افسانہ نگاروں نے زندگی کے ہر مسئلے پر قلم اُٹھایا ہے لیکن اب ان کے یہاں وہ خلوص اور جذبہ کار فرما نہیں نظر آتا۔ "انگارے" کی اشاعت کے بعد سے ۱۹۴۲ء تک اُردو افسانوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ اسی زمانے میں اردو ادب میں بہترین افسانوں کی تخلیق ہوئی ہے۔ کرشن چندر کے بہترین افسانے اسی زمانے کے ہیں۔ اسی زمانے میں راجندر سنگھ بیدی، عصمت، احمد عباس، حیات اللہ انصاری، سعادت حسن منٹو اور اپیندر ناتھ اشک وغیرہ نے اپنے بہترین افسانے لکھے۔ لیکن اس کے بعد افسانے نعرہ بازی اور سُرخ پھول کی طرف زیادہ آتے گئے اور بہت کچھ صحافت اور خطابت سے قریب جا پڑے۔ اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ ان بڑے افسانہ نگاروں کا فن پختگی، تعمیری قصد اور خلوص کے باوجود زوال کی طرف مائل ہے اور اب ان کی تخلیقات میں نہ اتنا تنوع ہوتا ہے اور زندگی کی اتنی سچّی عکّاسی، یہاں تک کہ فن کے نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تو آج کے افسانوں میں وہ بلندی اور فنی محاسن نہیں نظر آتے جو ہمیں کرشن چندر کے "موچی" "زندگی کے موڑ پر" "بالکونی" وغیرہ۔ راجندر سنگھ کے "گرہن" "زین العابدین" منٹو کے "ہتک"۔ حیات اللہ انصاری کے "آخری کوشش" احمد علی کے "ہماری گلی"۔ "میرا کمرہ" اور عصمت کے "دوزخی" اور "بیشہ" وغیرہ افسانوں میں ملتی ہے۔ اسی لئے آج افسانوں میں جمہوری میلان ہوتے ہوئے بھی وہ رجحان نہیں نظر آرہا ہے جسے تعمیری اور تخلیقی اشاروں سے تعبیر کیا جا سکے لیکن افسانوں سے زوال کے ساتھ ایک نیا رجحان ناول نگاری کی طرف بڑھتا ہُوا نظر آرہا ہے۔ یہ رجحان بڑا مبارک ہے۔ اس لئے کہ ہمارے یہاں اس صنف کی طرف کسی نے دھیان ہی نہیں دیا اور جو دو ایک ناول لکھے بھی جا سکے۔ ان میں موجودہ دَور کی تمام پیچیدگیاں اور سماجی کشمکش کا کہیں پتا نہیں چلتا۔ ناول نگاری کے لئے زندگی کے بہت بھرپور مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جب تک ناول نگار کی گرفت زندگی پر بہت سخت نہ ہو۔ اس کا مطالعہ اور مشاہدہ بہت زیادہ وسیع نہ ہو اور اسے فن کا اچھی طرح علم نہ ہو اچھا ناول نہیں تخلیق کیا جا سکتا۔ اب تک ہمارے یہاں ناول کی طرف سے جو بے توجہی برتی گئی ہے وہ بھی موجودہ ذہن کی سہل نگاری کی وجہ سے ہے۔ ظاہر ہے اچھے افسانے لکھنے اور اچھے ناول لکھنے میں بہت فرق ہے۔ ناول میں سماج کی بھرپور زندگی اُبھرتی ہے۔ بہرکیف یہ نیا رجحان بڑا مبارک ہے اور اسی سلسلے میں دُنیا کے بہترین ناولوں کے ترجمے بھی شائع ہو رہے ہیں۔ لیکن ایک چیز کھٹکتی ہے۔ وہ یہ کہ کیا یہ تھکے تھکے ذہنوں والے افسانہ نگار کوئی اچھا اور معیاری ناول تخلیق کر سکیں گے افسانوں میں آج جو مائل بہ زوال رجحان نظر آرہا ہے اس کو دیکھ کر اُس کی طرف سے مایوسی نظر آتی ہے۔

تنقید میں بھی ایک نیا رجحان نظر آرہا ہے جو ادھر چار پانچ سال کے اندر بڑھا ہے اور وہ رجحان یہ ہے کہ اب ادب کو میکانکی اور غلط مارکسی طور پر جانچنے اور پرکھنے کی کوشش نہیں کی جارہی ہے۔ اُردو کے تقریباً تمام بڑے نقادوں نے ماضی کو اُس کے صحیح خدوخال میں دیکھنے کی کوشش کی ہے اور میر، غالب اور اقبال کی صحت مند روایات کو آگے بڑھایا ہے۔ ماضی کی حسین روایات کو حقارت سے دیکھنے کا جذبہ اصل میں تاریخ کو مٹانے کا جذبہ ہے۔ وہ تمام ادیب اور شعراء جو اپنے فن میں وہ گہرائی اور ضبط اور حسن نہیں پیدا کرسکے ہیں جو مطالعے، تجربے اور بڑی ریاض اور محنت کے بعد پیدا ہوتی ہے وہ ماضی کی حسین اور جاندار روایات سے انکار کرتے ہیں۔ تاکہ ابدی حسن کا واہمہ ہی ختم ہو جائے۔ لیکن آج کا غالب رجحان ماضی سے انکار نہیں اس کا احترام کرتا ہے۔ اس کے صحت مند اجزاء کو آگے بڑھاتا ہے ظاہر ہے انسانی زندگی ماضی، حال اور مستقبل میں اپنا دامن پھیلائے ہوئے ہے۔ اس لئے ماضی سے انحراف کرکے نہ تو حال کی تہذیب میں کوئی حصہ لیا جا سکتا ہے اور مستقبل کی طرف کوئی تعمیری اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ ماضی سے انکار کرنا سب سے بڑی رجعت پسندی ہے۔ اسی لئے آج کے تقریباً سب بڑے نقاد روایات کے انقلابی مفہوم کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں اور ماضی سے رشتہ نہیں توڑتے۔ یہ بہت صحت مند رجحان ہے۔ اس سے تنقید بہت کچھ تخلیقی ہوتی جارہی ہے۔ اور اس میں بہت زیادہ ٹھہراؤ اور توازن کا پتہ چلنے لگا ہے۔ ایسے نقاد دو ہیں جنہوں نے تاریخی تسلسل سے انکار نہیں کیا ہے اور ماضی کو اس کے صحیح خدوخال میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجنوں، احتشام حسین، آل احمد سرور، ڈاکٹر عبدالعلیم، فیض سجاد ظہیر، عزیز احمد اور ممتاز حسین وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی نگارشات اس لحاظ سے بڑی قابل قدر ہیں کہ ادب اور زندگی کے اس انتشاری دور میں اور اس افراتفری میں انھوں نے فکر و نظر میں توازن قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

مختصر یہ کہ یہ جدید ترین رجحانات جو آج اُردو ادب میں آگے بڑھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں بہت صحت مند ہیں۔ یہ بہت کچھ غلط ترقی پسندی کے ردّ عمل کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ ادبی فن کو معاشیات کے اصولوں پر میکانکی طور پر منطبق کرنے والے اب بھی موجود ہیں۔ اب بھی بہت سے سرپھرے ایسے ہیں جو ماضی سے رشتہ توڑ لینا چاہتے ہیں۔ جن کے نزدیک صحت مند عشقیہ شاعری کرنا رجعت پسندی ہے اور جن کے یہاں نہ تو ضبط اور گہرائی کا پتہ چلتا ہے اور نہ اپنے مقصد سے خلوص کا یہ طبقہ ادبی حسن اور فن کو بالکل غیر مارکسی سمجھتا ہے۔ محض خیالات کو نظم کر دینا ہی شاعری نہیں ہے۔ شعر ایک تخلیقی پیکر ہے جو صورت اور معنی کے جدلیاتی طریق کار سے ابھرتا ہے۔ عوامی ادب پیدا کرنے کا مطلب چیخنے اور چلّانے کا نہیں ہے۔ تپنے اور تپانے کا ہے۔ اور عوامی ادب کا مطلب کبھی بھی یہ نہیں ہوتا کہ ادیب عوام کی سطح تک اُتر آئیں بلکہ یہ کہ عوام کی زندگی کے حیات پرور اور صحت مند اجزاء منتخب کر کے انھیں ادب اور شاعری میں زندگی کی رُوح پھونکنی چاہیئے۔ ادیب کو عوام کی زندگی سے سبق سیکھنا پڑتا ہے اور جب یہ کام زندگی کے کسی انقلابی موڑ پر انجام دینا ہے تو اُسے ماضی کی روایات کو بھی جگانا پڑتا ہے۔ وہ ماضی سے نغمے، نام، ملبوس سب قرض لیتا ہے تاکہ وہ نئی حقیقت کو عوام کے محبوب لباس میں پیش کر سکے۔ ہمارے آج کے انقلابی ادیب اور شاعر جس حد تک اس سے دور ہوتے جائیں گے۔ عوام سے دور ہوتے جائیں گے۔

جاپانی طریقے پر چاول کی کاشت

- بھارت سرکار کی وزارت خوراک اور زراعت نے ریاستی حکومتوں سے کہا ہے وہ جاپانی طریقے پر چاول کی کاشت کے لئے نمائشی قطعات زمین تیار کرنے میں "کوراپٹنڈل" کے نمائندوں کی مدد کریں اور نمائشی مرکزوں میں چن کر اچھے اچھے کاشتکار بھیجیں۔ ان کاشتکاروں کا انتخاب ریاستوں کے محکمہ جات زراعت کریں گے اور وہ اپنے اپنے ضلعوں میں کاشت چاول کی مہم کے تحت کام کریں گے۔

- جاپانی طریقہ پر چاول کی کاشت کا فلم جو مرکزی وزیر زراعت ممبران پارلیمنٹ اور مرکزی حکومت کے زراعت سے متعلقہ حکام کو دکھلایا گیا ہے۔ چاول کی کاشت کو فروغ دینے کی مہم کے سلسلے میں بہت کثرت سے دکھایا جائے گا۔ یہ فلم گاندھی سمارک ندھی کی ملکیت ہے۔

انوار انصاری

ہندوستان میں شیشے کی صنعت

زمانہ آئے دن ترقی کی ارتقائی منزلیں طے کر رہا ہے۔ ہر فن اور ہر شعبہ میں تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب شیشے کی کوئی وقعت نہ تھی مگر سائنس کی ترقی نے اس صنعت کو بھی عروج پر پہنچا دیا۔ پہلے اس کی حیثیت گھریلو صنعت جیسی تھی۔ چھوٹے پیمانے پر اس کے کارخانے فیروز آباد بلگام، مدراس، اور انبالہ میں تھے۔ ان کارخانوں میں ٹوٹے ہوئے شیشوں کو فراہم کیا جاتا اور اسے پگھلا کر چوڑیاں تیار کی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ ان کارخانوں میں معمولی شیشے کے گلاس، بوتل، شیشیاں وغیرہ تیار کی جاتی تھیں۔ مغل شہنشاہوں کی ہمت افزائی حکومت کا تعاون، کچے اشیا کی فراوانی، مشاق اور تجربہ کار کاریگروں کی زیادتی کے باعث شیشے کی صنعت روز افزوں ترقی کرنے لگی اور اس کی بھی ایک اہمیت ہوگئی۔ موجودہ دور میں بہت سی صنعتیں مثلاً کیمیکل فارمیسی، بلڈنگ انڈسٹری، الیکٹرک سٹی وغیرہ اس صنعت پر منحصر ہیں۔

شیشے کی صنعت زمانہ حال کی پیداوار نہیں۔ بلکہ یہ ایک قدیم صنعت ہے۔ سولھویں صدی میں ہندوستان کے مشہور شہروں میں شیشے کے کارخانے موجود تھے۔ کچے اشیا کی خرابی اور سائنس کے اصولوں کے مطابق چیزوں کو نہ طیار کرنے کی وجہ سے اچھی چیزیں خراب تیار ہوتی تھیں۔ شیشے کی باقاعدہ صنعت ۱۸۹۲ء میں شروع ہوئی۔ سب سے پہلے شیشے کے پانچ کارخانے کھولے گئے مگر سب ناکامیاب ہوگئے۔ ناتجربہ کاری، اچھا انتظام، کارخانوں کا موزوں انتخاب، اچھے اور تجربہ کار مزدوروں کی کمی، مالی حالت کی دشواری ان تمام وجہوں سے ان کارخانوں کو ناکامیابی کا منہ دیکھنا پڑا۔

۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم نے شیشے کی صنعت میں نئی جان ڈالی جنگ کی وجہ سے کارخانوں میں کافی اضافہ ہوگیا۔ کارخانے ۳ سے ۲۰ تک پہنچ گئے شیشے کے کارخانے بوتل، بیکر، بلب، کاربائز، لالٹین کے شیشے، پیالے، نل، رکابیاں وغیرہ بنانے لگے۔ شیشے کے کچھ کارخانوں میں میڈیکل کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے پیداوار کا الگ شعبہ کھولا گیا۔ شروع شروع اس صنعت میں مجموعی طور سے ۱۵ لاکھ روپیہ صرف کیا گیا تھا۔ ۱۹۱۶ء اور ۱۹۳۲ء کے درمیان شیشے کی درآمد پر ٹیکس دوگنا ہوگیا۔ اور اس طرح شیشے کی صنعت کو آگے بڑھانے میں بہت سہولت ملی۔ ٹیرف بورڈ کے مطابق ۱۹۴۰-۴۱ء میں ۵۲ کارخانے موجود تھے اور ان میں ۲ کروڑ سے زائد کا سرمایہ لگا ہوا تھا اور تقریباً ۵۰ ہزار مزدور اس صنعت میں منہمک تھے۔ اب شیشے کی صنعت ملک کی ۵۰ فیصدی ضرورتوں کو پورا کر رہی ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے وقت مختلف قسم کے سائنسی اصول کے مطابق باقاعدہ منظم کارخانے کھولے گئے۔ غیر ممالک سے نئے قسم کی مشینیں منگائی گئیں اور ہنر مشاق اور تجربہ کار ورکر بھی بلائے گئے۔ نئے کارخانے اس وقت بنارس فیروز آباد، غازی آباد اور شکوہ آباد میں موجود ہیں۔

شیشے کی صنعت میں چوڑیوں کا اہم شعبہ ہے اور ۸۰ فی صدی چوڑیاں اسی شیشے کی صنعت کے ماتحت تیار کی جاتی ہیں۔ فیروز آباد چوڑیوں کا خاص مرکز ہے۔ جاپان اور چیکوسلوکیا کی درآمد کم ہو جانے کی وجہ سے فیروز آباد کی چوڑیوں کی مانگ سارے ہندوستان میں کافی ہوگئی ہے۔ شیشے کی نلکیاں جگ، پلیٹ وغیرہ کی طرف اب کافی دھیان دیا جانے لگا ہے تاکہ ملک کی ضرورت کی مانگ پوری کی جاسکے۔ اس کی خاطر ڈیرہ دون میں ایک کارخانہ بڑے پیمانے پر کھولا گیا ہے۔ شیشے کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا اندازہ صرف درآمد سے لگایا جا سکتا ہے۔

سال				روپے
۱۹۳۳-۳۴	..	..	..	۴۵،۹۸۲
۱۹۳۶-۳۷	..	..	..	۴۹،۲۱۶
۱۹۳۷-۳۸	..	..	..	۱۲۹،۵۹۰

سال	روپے
۱۹۳۸-۳۹	۲۲۰،۱۱۵
۱۹۳۹-۴۰	۴۹۱،۱۶۹
۱۹۴۰-۴۱	۷۷۵،۵۸۳

اس صنعت کو کچھ حد تک مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اوّل پاور کی بہت کمی ہے جس کی وجہ سے پیداوار میں کافی اضافہ نہیں ہو پاتا ہے۔

دوئم۔ نئی نئی مشینوں کی بھی بہت کمی ہے۔ سوئم نئی نئی قسم کے پاؤڈر اور مالوں کی کمی کی وجہ سے رنگین اور خوبصورت شیشے کی چیزیں طیّار نہیں کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ مشتاق کاریگروں کی کمی بھی مشکلات میں اضافہ کر رہی ہے پاور کی کمی کو تو بہت حد تک سستی بجلی ہو جانے کی وجہ سے دُور کیا جا سکتا ہے۔ اچھی کاریگروں اور ٹیکنیکل کام سیکھنے والوں کے لئے بنارس ہندو یونیورسٹی میں ۱۹۳۷ء ہی سے ایک الگ شعبہ قائم کر دیا گیا ہے۔ یہاں طلباء کو مختلف قسم کے ذریعے سے کام سکھلایا جاتا ہے۔ اور انھیں اس صنعت کے لئے ماہر بنایا جاتا ہے۔ اس صنعت میں روپے کی ابھی کمی ہے۔ اس صنعت کے مختلف سیکشن اور اُن کے پروڈکشن اور ٹارجٹ کا خاکہ درج ذیل ہے۔

سیکشن	پروڈکشن (موجودہ حالت)	ٹارجٹ
۱- چوڑیاں	۱۸۰ ہزار ٹن	۱۸۰۰ ٹن
۲- موتی	۱۲۰ ہزار ٹن	۴۲۰۰ ٹن
۳- بوتل اور فائل	۱۰۰ اور ۱۰ ہزار ٹن	۱۰۰،۰۰۰ ٹن
۴- لالٹین کے شیشے	۱۵،۰۰۰ ہزار ٹن	۱۵۰،۰۰۰ ٹن
۵- گلاس شیٹ	۴۳ مربع ٹکڑے	۴۴ مربع ٹکڑے
۶- سائنٹفک گلاس	صفر	۲۰ لاکھ

اُردو کے ایک محسن کا انتقال

تاس ایجنسی کی ایک مختصر خبر سے کہ اکاڈمیشین الیگزانڈر پیٹرووچ برانیکاف کا ایک طویل بیماری کے بعد انتقال ہو گیا۔ ماہرین مشرقی السنہ اور خصوصاً اُردو زبان کے ہمدردوں کو سخت صدمہ ہوا۔ موصوف کو ہندوستان کی دیسی زبانوں اور خصوصاً اُردو زبان سے خاص دلچسپی تھی جس کے لئے انھوں نے ہندوستان کا سفر بھی کیا تھا اور یہاں کے اُردو اداروں سے خط و کتابت کرتے رہتے تھے۔ کچھ دنوں سے وہ ایک رُوسی اُردو لغت مدون کرنے میں مشغول تھے۔

علاوہ رُوسی اُردو لغت کے جس کا کام وہ کئی سال سے کر رہے تھے اور اُس کی چند جلدیں با قساط شائع کر چکے تھے اکاڈمیشین برانیکاف کی بعض دیگر تصنیفات بھی اُن کی یادگار ہیں اور خاص کر ہندوستانی زبان کے مسئلے پر محققانہ اور غیر جنبہ دارانہ روشنی ڈالنے والی ہیں۔ "رنگین ہندی کے مسائل" پر اُن کی کتاب بڑی عالمانہ ہے اور "اُردو لٹریچر پر ایک مختصر مقالہ" اُن کی وسعت نظر اور وسعت معلومات کا مظہر ہے۔ اس کے علاوہ "جدید ہندوستانی لٹریچر کی تاریخ پر ایک مختصر مقالہ" "روسی لٹریچر پر ہندوستانیوں کے خیالات" "گورکی اور ہندوستانی لٹریچر" اور "پشکن پر ہندوستانی ادبی نقادوں کے خیالات" اُن کی چند یادگار تصنیفات ہیں جو اُن کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی اور السنہ مشرقی کے محققین کے لئے مشعلِ راہ کا کام دیں گی۔ موصوف کی کل تصنیفات کی تعداد سو سے اُوپر ہے۔ جو زیادہ تر السنہ مشرقیہ کے مسائل پر مشتمل ہیں۔

(رحم علی الہاشمی)

سنگیت ناٹک اکاڈیمی

بھارت کے وزیرِ تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد نے سنگیت ناٹک اکاڈیمی کی افتتاحی تقریب کے موقعے پر استقبالیہ ایڈریس پیش کرتے ہوئے کہا کہ سنگیت، ڈراما اور ناچ کے فنون بھارت کا قیمتی ورثہ ہیں۔ نہ صرف اپنے ملک بلکہ بنی نوعِ انسان کے تہذیبی ورثے میں اضافہ کرنے کے لئے ان فنون کی قدر کرنا اور انہیں فروغ دینا ہمارا فرض ہے۔ یہ اکاڈیمی اس سلسلے میں بھارت کی روایات کو زندہ رکھنے کی کوشش کرے گی۔ وزیرِ تعلیم نے مزید کہا کہ گزشتہ ۱۵۰ سال کی مدت میں حکومت نے فنونِ لطیفہ کی ترقی کی طرف مناسب توجہ نہیں دی۔ لیکن حصولِ آزادی کے بعد یہ مسئلہ خاص اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ چنانچہ اگست ۱۹۴۹ء میں فن کی ترقی سے متعلقہ مسائل پر غور کرنے کے لئے کلکتے میں ایک کانفرنس منعقد کی گئی بعد ازاں مارچ ۱۹۵۱ء میں نئی دہلی میں کئی کانفرنسیں ہوئیں ان کانفرنسوں میں مقرر کردہ کمیٹیوں نے ادب اور فنونِ لطیفہ کی ترقی کے لئے تین مختلف ادارے قائم کرنے کی سفارشات کیں۔ انہی سفارشات کی بنا پر ان میں سے پہلے ادارہ سنگیت ناٹک اکاڈیمی کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔

بھارت میں رقص، ڈراما اور موسیقی کی ترقی کے سلسلے میں تحقیقی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لئے ایک لائبریری اور میوزیم کا قیام علاقائی زبانوں کی بنیاد پر نئے تھیٹروں کو جاری کرنے کی حوصلہ افزائی، تھیٹر سے متعلقہ نئے تربیتی اداروں کا قیام، فن سے متعلقہ کتابوں کی اشاعت، ملک کے مختلف حصوں میں لوگ گیتوں و لوک ناچ کو از سرِ نو زندہ کرنا، رقص، موسیقی اور ڈراما کی ترقی کے لئے کل بھارت تقاریب کا اہتمام و علاقائی تقاریب کی حوصلہ افزائی اور قابل فنکاروں کو انعامات دینا اس اکاڈیمی کے اہم فرائض میں شامل ہے۔

اکاڈیمی کے اخراجات کا زیادہ بوجھ مرکزی حکومت برداشت کرے گی تاہم ریاستی سرکاروں اور فنون سے متعلقہ اہم جماعتوں کے نمائندے بھی اس کے ممبروں میں شامل ہوں گے۔ ضرورت کے مطابق اکاڈیمی کے نظم و نسق کے قواعد میں ترمیم کی جا سکتی ہے۔ محدود تعداد میں اکاڈیمی کے فیلوز کا انتخاب بھی عمل میں لایا جائے گا۔

مختلف تہذیبوں کو جذب کر لینا بھارتی تہذیب کا خاصہ رہا ہے۔ بھارتی سنگیت ملک کے مشترکہ تمدن کی سب سے زیادہ موزوں مثال پیش کرتا ہے۔ سنگیت کی ترقی کے لئے بھارت میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مشترکہ کوششیں کی ہیں ان کی مثال شاید ہی کہیں اور ملتی ہو۔ مسلمانوں نے نہ صرف بھارتی سنگیت کی خوبیوں کو جلد ہی سمجھ لیا بلکہ انہوں نے اسے اور بھی مالا مال کیا۔ اس کے بعد بھارت میں سنگیت نے بھارتی اور ایرانی روایات کی بنا پر الگ الگ ترقی نہیں کی بلکہ ان کے امتزاج نے ایک ایسی مشترکہ موسیقی کو جنم دیا جو ان دونوں سے زیادہ امیر اور شاندار ہے۔ امیر خسرو نے بھارتی اور ایرانی سُروں کو ملا کر فن موسیقی کی قابل قدر خدمت انجام دی۔ جہاں تک ڈرامے کا تعلق ہے کالیداس کا مقابلہ یونان کے بڑے سے بڑے ڈرامہ نویس سے کیا جا سکتا ہے۔ بھارت میں فنِ رقص کا دائرہ قدیم زمانے میں مندروں میں ترقی یافتہ ناچ کی مختلف اقسام سے لے کر لوک ناچ تک وسیع ہے۔ دنیا کے بہت کم حصوں میں ناچ کی اتنی قسمیں موجود ہوں گی۔

آخر میں وزیرِ تعلیم نے کہا کہ بھارت کی ان روایات کا تسلسل اور ان کا نفوذ آج تک قائم ہیں اور فن کی ترقی سے متعلقہ جو ادارے قائم کئے جا رہے ہیں وہ ان بھارتی روایات کو زندہ رکھنے کی کوشش کریں گے۔

آہ - گوپالاسوامی آئینگر

"میں نے آج صبح گہرے غم سے مسٹر آئینگر کی وفات کی خبر سنی۔ مسٹر آئینگر گذشتہ چھ برس سے میرے ایک ایسے عزیز اور قابل قدر رفیق کار تھے جن کی پختگیٔ عقل نے ہر مشکل کے وقت ہماری امداد کی۔ آپ کی موت قوم، اُن کے رفیقوں اور بالخصوص میری ذات کے لئے ایک صدمۂ عظیم ہے۔"

یہ تھے وہ الفاظ جو پردھان منتری شری جواہر لال نہرو نے بھارت کے ڈیفنس منسٹر شری گوپالاسوامی آئینگر کی موت پر کہے۔ اس قابل سیاست دان، آزمودہ کار ایڈمنسٹریٹر اور مردِ معقول کی موت سے ہندوستان کی سیاست اور انتظامی مشینری میں ایک ایسا خلا پیدا ہوا ہے جو شاید آسانی سے پُر نہ ہو سکے۔

گوپالاسوامی آئینگر ۱۰ فروری کو مدراس کے جنرل ہسپتال میں اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ ۳۱ مارچ ۱۸۲۲ء کو پیدا ہوئے۔ مدراس میں ایک قابلِ فخر تعلیمی کیریر کے بعد آپ نے اپنی زندگی کا آغاز پچیاپا کالج مدراس میں اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پر کیا۔ ۱۹۰۵ء میں آپ مدراس سول سروس میں داخل ہوئے۔ چودہ سال تک ڈپٹی کلکٹری کی۔ ۱۹۲۰ء میں آپ کو کلکٹر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مقرر کیا گیا۔ چند برس تک آپ پنچایتوں کے رجسٹرار جنرل اور لوکل بورڈوں کے انسپکٹر رہے۔ بعد میں حکومت کے سکریٹری رہے اور پھر ۱۹۰۵ء میں بورڈ آف ریونیو کے ممبر مقرر ہوئے۔

اس وقت تک آپ کی اہمیت اپنے صوبے تک ہی محدود تھی لیکن یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ ایک صوبائی ایڈمنسٹریٹر ہونے کے باوجود آپ بڑے بڑے آئی سی ایس افسروں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ حکومت ہند نے دوبارہ آپ کی اس قابلیت کا عملی اعتراف کیا اور ایک ایسے وقت میں آپ کو کشمیر کا وزیر اعظم مقرر کیا جب کہ یہ وزارتِ عظمےٰ محض کانٹوں کا ایک تاج تھی۔ کشمیر اس وقت ایک کڑے دور میں سے گزر رہا تھا اور شری گوپالاسوامی آئینگر نے وہاں کی انتظامی مشینری کو چلانے میں اپنی قابلیت کے ایسے جوہر دکھائے کہ تاریخ ہند میں اپنے لئے ایک مستقل مقام پیدا کر لیا۔

کرپس مشن کی آمد پر آپ نے مشن کے سامنے ریاستوں کی خود مختاری کی شدومد سے مخالفت کی اور انڈین یونین کی وحدت کے نقطۂ نگاہ کی حمایت کر کے اُن تنگ نظر سیاست دانوں کی آنکھیں کھولنے کی کامیاب کوشش کی جو ہندوستان کو کئی خود مختار حصّوں میں بانٹ دینا چاہتے تھے۔

۱۹۴۳ء میں آپ نے کشمیر کو الوداع کہی اور زیادہ وسیع میدان میں کام شروع کر دیا۔ کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی اور عارضی پارلیمنٹ کا قیام عمل میں آیا تو آپ نے اپنے مشوروں سے ان دونوں کو مستفید کیا۔ بھارت کے آئین کی تکمیل بڑی حد تک آپ کے کمالات اور قابلیت کی مرہونِ منّت ہے۔

بھارت کے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو نے شروع ہی سے اس جوہرِ قابل کو پہچان لیا تھا اور یہ محسوس کر لیا تھا کہ اس جینیس کا صحیح مقام بھارت کی کیبنٹ میں ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے آپ نے انھیں وزیر بغیر محکمہ مقرر کر کے ہند و پاکستان کے اہم معاملات اُن کے سپرد کر دئے۔ بعد میں آپ ٹرانسپورٹ کے وزیر مقرر ہوئے۔ ریلوں کے نظام میں آج جو بہتر صورت نظر آرہی ہے، یہ آپ ہی کی انتظامی قابلیت کا نتیجہ ہے۔ سردار پٹیل کی وفات کے بعد آپ کو ریاستی امور کے محکمے کا وزیر مقرر کیا گیا یہاں بھی آپ کے کارنامے چاند تاروں کی طرح چمک رہے ہیں۔

نئی کیبنٹ میں آپ کو ڈیفنس کا محکمہ پیش کیا گیا۔ آپ نے خرابیٔ صحت کے باوجود اس ذمہ داری کو سنبھالنے میں کوئی تامل نہ کیا اور آخری دم تک اپنا فرض ادا کرتے رہے۔

آپ نے ۱۹۴۸ء میں یو، این سیکورٹی کونسل کے سامنے اور اگست ۱۹۵۲ء میں جنیوا میں کشمیر کے مسئلے پر ہندوستان کا نقطۂ نظر پیش کر کے سارے ملک سے خراجِ تحسین وصول کیا۔ اہلِ کشمیر نے آپ کی ان خدمات کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ چنانچہ آپ کی موت پر کشمیر کے وزیر اعظم شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کا بیان گہرے رنج و درد و غم کا مظہر ہے۔ گزشتہ جنوری میں جب آپ مدراس میں بیمار تھے تو اہلِ کشمیر کا سلام، شیخ محمد عبداللہ نے ذاتی طور پر انھیں پہنچایا تھا۔

آپ کی موت کا صدمہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں محسوس کیا گیا۔ راشٹرپتی بھون اور حکومت کے دفتروں پر قومی جھنڈے سرنگوں کر دئے گئے۔ بھارت کے پریذیڈنٹ، پردھان منتری اور دوسرے عالمگیر شہرت رکھنے والے رہنماؤں، تینوں کمانڈر انچیفوں اور مرکزی اور صوبائی وزیروں نے نہایت موزوں الفاظ میں آپ کی ذات کو خراجِ تحسین ادا کیا۔
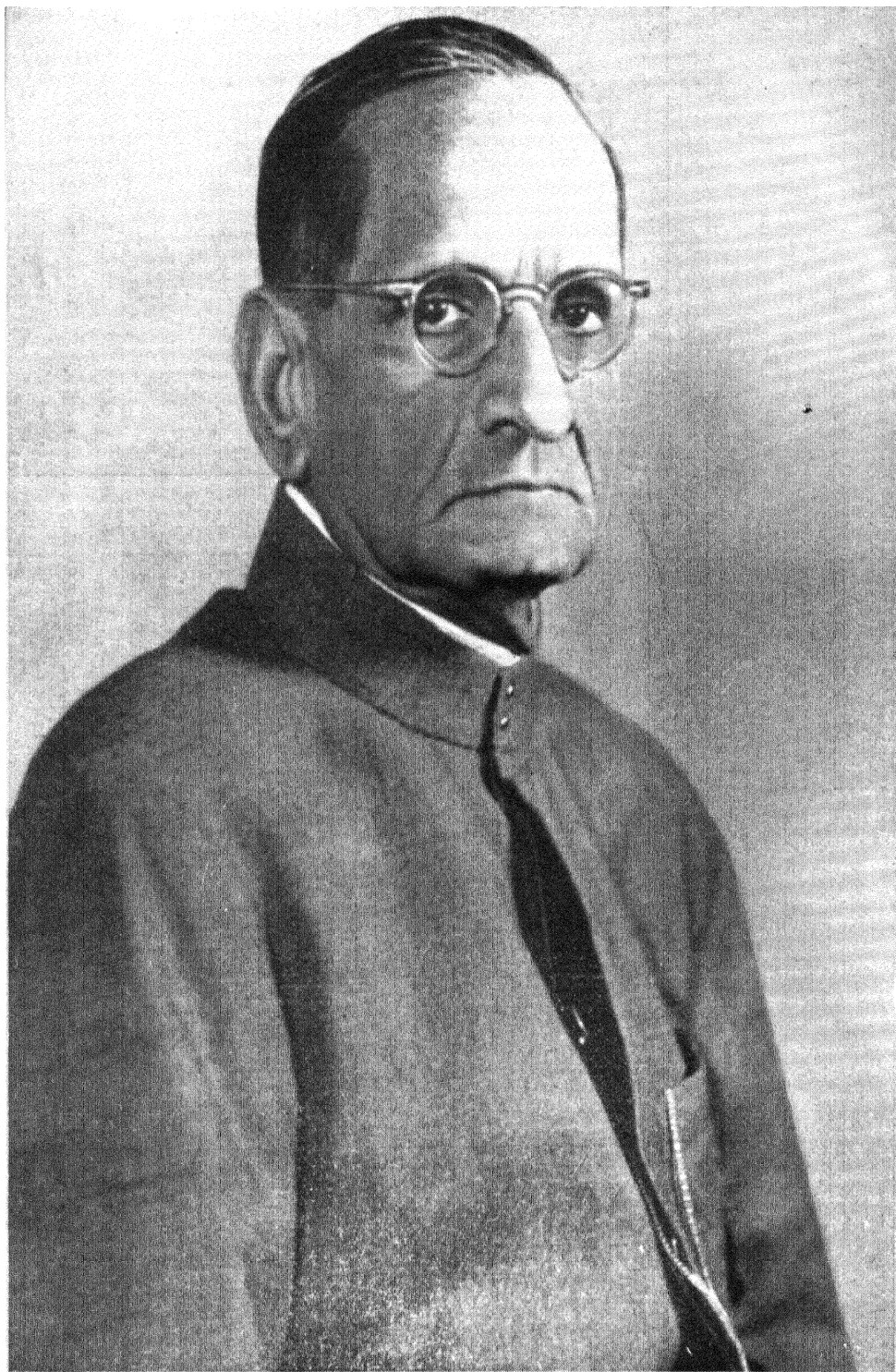
شري اين گوپالاسوامي آئينگر

از شمار دو چشم يک تن کم
وز حساب خرد هزاران بيش

بھارتی لوک ناچ

لوک ناچ ہماری، تہذیب، کا ایک لازوال جزو ہے۔ ان تصویروں میں اس تہذیب کی چند جھلکیاں ملاحظہ کیجئیے۔

بہار کے لوک ناچ کا ایک پہلو

ہماچل پردیش کی نوتکیاں
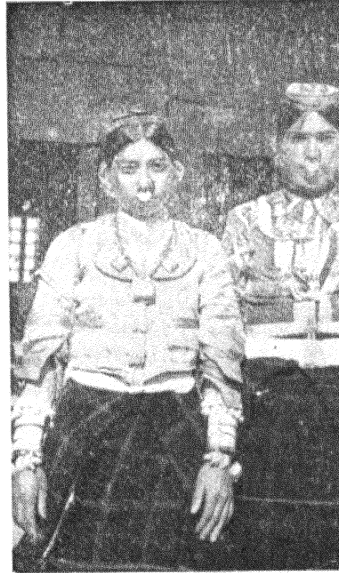
حیدرآباد کے سدیا لوک ناچ کا ایک جنگی رخ - یہ رقاص افریقہ کے حبشیوں کی اولاد ہیں جو کئی سو سال پہلے نظام کے باڈی گارڈ کے طور پر ریاست میں آباد ہوئے۔

مدھیہ پردیش کے بچے دربار ناچ میں

آسامی بچے رادھا کرشنا ناچ میں

أڑیسہ کا ایک لوک ناچ - ڈھول بجانے والوں کے سر کا سینگ نما لباس خاص طور پر قابل دید ہے

حیدرآباد کا ایک سدیا مغنی جس کے ساز کی لے پر رقاص اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں

پنجاب کے بھنگڑا ناچ کا ایک جنگی رخ

ایرانی صحافتی وفد بھارت میں

گذشتہ دنوں ایران سے ایک صحافتی ڈیلیگیشن بھارت میں آیا جس نے بھارت کے مختلف شہروں کا دورہ کیا اور پھر اراکین وفد نے اپنے تاثرات کا اظہار مختلف تقریروں میں کیا۔ ان تقریروں کے اقتباسات اسی شمارے میں ملاحظہ کیجیئے۔ اس تصویر میں جو اراکین وفد کے ہوائی اڈے پر اُترنے کے موقعے پر لی گئی درمیان میں ڈاکٹر متین دفتری کھڑے ہیں ان کے بائیں طرف جناب ہمایوں کبیر اور دائیں طرف ہزایکسیلینسی جناب اے. اے یکتا سفیر ایران اور مسٹر ایس. ایم طبا طبائی کلچرل کونسلر کھڑے ہیں۔
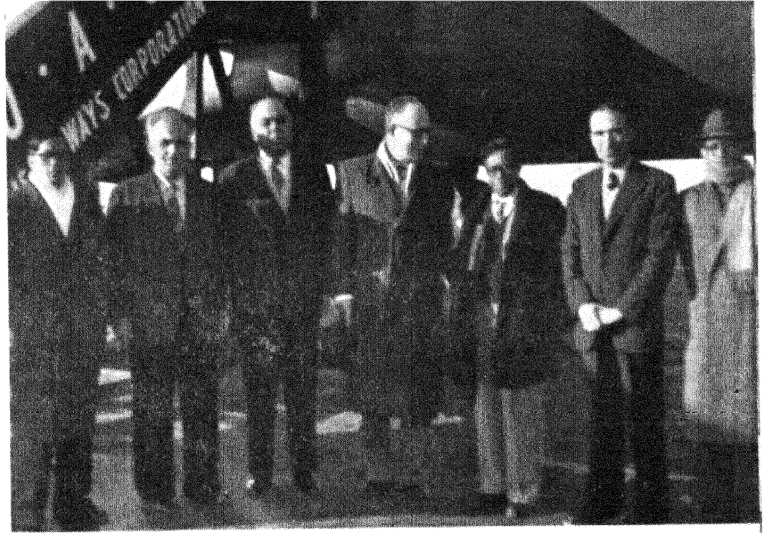
اراکین وفد کی تشریف آوری کے موقعے پر دہلی میں لالہ سوہن لال کے دولت کدے پر ایک محفل شعر و سخن منعقد ہوئی جس میں شعرا کے علاوہ اکابرین شہر بھی شریک ہوئے۔ اس تصویر میں منظور لکھنوی اپنا کلام پڑھ رہے ہیں۔

اسی بزم سخن کا ایک اور رخ

بھارت اور ایران

ایرانی صحافیوں کے ایک وفد نے حال ہی میں بھارت کا دورہ کیا ہے اس وفد کے ممبروں نے کچھ پیغامات آل انڈیا ریڈیو سے نشر کئے تھے ان پیغامات کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے

مسٹر ونیش نوبخت مدیر سیاست ما

غیر ممالک کا دورہ کرنے والے صحافیوں کو آزاد سفیروں کی حیثیت حاصل ہوتی ہے جو ایک قوم کی طرف سے دوسری قوم تک پیغام خیر سگالی پہنچاتے ہیں۔ صحافیوں کے لئے کسی قوم کی بین الاقوامی پالیسی پر بحث کرنا ہی کافی نہیں بلکہ ان کے لئے اس قوم کی روایات و رسوم کا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہے۔ صرف اسی طریقے سے وہ دوسری قوموں کے باب میں صحیح رائے قائم کر سکتے ہیں۔

بھارت اور ایران کے درمیان قدیم تاریخی تعلقات ہیں۔ ہر ایرانی اپنے بھارتی بھائیوں سے مصافحہ کا خواہاں ہے۔ حصولِ آزادی کے بعد مختصر مدت میں بھارت کے باشندوں نے جو ترقی کی ہے اس پر انھیں مبارک باد پیش کرتا ہے۔ بھارت میں خوشحالی کا دور دورہ ہے اور لوگ مل کر چین اور مسرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس ترقی کا راز حکومت و عوام کی محنت میں مضمر ہے بھارت کے مختلف فرقوں کے لوگ بھائیوں کی طرح مل کر ملک کی ترقی کے لئے مصروف عمل ہیں۔ بھارتی آئین میں مذہب کو سیاسیات سے بالکل الگ رکھا گیا ہے۔

شری جواہر لال نہرو نے ہمارے ساتھ بات چیت کے دوران میں اپنی تصنیف "ڈسکوری آف انڈیا" کے ایک باب کا حوالہ دیا جس میں بھارت اور ایران کے قدیمی تعلقات کا ذکر کیا گیا ہے۔ بھارت کے وزیر تعلیم مولانا ابو الکلام آزاد سے بھی اس موضوع پر تبادلہ خیالات ہوا۔ اپنے پیغام کے آخر میں انھوں نے کہا کہ میں اپنے دورے کی میٹھی یاد ایران کے باشندوں کو بطور تحفہ پیش کروں گا۔ اس طرح بھارت کے لئے ایرانیوں کے خلوص میں اور بھی اضافہ ہوگا۔ دنیا کی موجودہ منتشر صورت حالات میں ایشیا کی ان اقوام کا اتحاد لازمی ہے۔ ہر ایرانی کا نعرہ بھارت زندہ باد' اور ہر بھارتی کا نعرہ ایران زندہ باد ہے۔

مسٹر امیدی نوری ایڈیٹر اخبار 'داد'

جب ایک نو آمد ایرانی ہندوستانیوں سے بات چیت میں فارسی کے الفاظ' بھارت کے شہروں کے سائن بورڈ اور اپنی تہذیب اور زبان کو اس ملک کی تہذیب اور زبان کو مخلوط دیکھتا ہے تو مسرور ہو کر یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ وہ اپنے ہی کسی دوسرے ملک میں موجود ہے۔ ایرانی نسل ہندوستانیوں کو بمبئی اور حیدر آباد میں معاشی اور سماجی اداروں میں ممتاز عہدوں پر دیکھ کر دہلی اور حیدر آباد میں فارسی ادبیات کے مباحث سن کر اور یہاں کے باشندوں کی ایرانی تہذیب سے موانست پر نظر ڈالنے سے وہ بھارت کو ایک ایرانی گھر سے بہت زیادہ مشابہ خیال کرے گا۔ بھارت میں اجنتا اور ایلورا کے غاروں کے تاریخی آثار دہلی میں لال قلعہ اور مسجد کو آثار قدیمہ سے مقابلہ کرنے پر یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ماضی میں ایرانی اور بھارتی تہذیب بہت گھلی ملی تھی۔ یہیں سے اس امر کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ ابتدا میں تہذیب و تمدن نے انہیں دو ملکوں میں نشو و نما پائی پھر مغربی دنیا میں پہنچ کر پھلے پھولے۔

موصوف نے اپنے پیغام میں کہا کہ بھارت کی جمہوریہ کو جنم لئے چند ہی برس گزرے ہیں مگر یہاں کی حکومت عوام کا معیار زندگی بلند کرنے' زرعی اصلاحات اور سائنسی ترقیوں کے کاموں میں مصروف رہی ہے جس کا ثبوت بھاکڑا ننگل کے پشتوں' بمبئی میں مرض سرطان کے ادارے اور دہلی کی نیشنل فزیکل لیبارٹری سے ملتا ہے۔ بھارت کے پردھان منتری ایک صلح الخیال شخص ہیں جو اپنے ملک کی سرگرمیوں کو حقیقت پسندانہ زاویۂ نظر سے دیکھتے

ہیں۔ پردھان منتری سے چین۔ پان اسلام ازم۔ دفاع مشرق وسطی وغیرہ مسائل پر تبادلۂ خیالات سے ظاہر ہوا کہ وہ ہر حالت میں سچائی پر قائم رہیں گے۔ وہ اس جد و جہد میں مصروف ہیں کہ سچائی کی بدولت ان کا ملک بھی محفوظ رہے اور دنیا کا امن بھی بحال رہے۔ مسٹر نوری نے اس توقع کا اظہار کیا کہ ایشیائی رہنما پنڈت نہرو کے نقش قدم پر چل کر ایشیائی اقوام سے افلاس کو دور کریں گے اور ایشیا کی کھوئی ہوئی شان و شوکت کو دوبارہ قائم کریں گے۔

آخر میں موصوف نے کہا کہ بھارت کے عوام کی دنیا کے امن کو برقرار رکھنے کی کوشش قابل تعریف ہے اور توقع ہے کہ بھارت اور ایران کے باہمی تعلقات پہلے سے زیادہ مضبوط ہو جائیں گے اور یہ دونوں ملک ترقی کے راستے پر گامزن رہیں گے۔

مسٹر جلالی نینی مدیر روزنامہ باختر امروز ہمارے وفد کے ممبر بھارت کے جس حصے میں بھی گئے ہیں لوگوں نے ان کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ بھارت اور ایران کے تاریخی و تہذیبی تعلقات ہزاروں سال پرانے ہیں اور ان کی جڑیں بہت گہری ہیں بھارت میں ہر جگہ ان تعلقات کا اثر نمایاں ہے۔ حصول آزادی کے بعد بھارت میں جو سماجی اصلاحات کی گئی ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ بھارتی عوام نے استعماریت سے نجات حاصل کرنے کے بعد زندگی کے نئے دور میں کامیابی سے قدم رکھا ہے۔ آج بھارت کے تمام باشندوں کو عدل و انصاف اور زندگی کے تحفظ کی موجودگی کا احساس ہے اور وہ سماجی ترقی کے لئے مصروف عمل ہیں۔

بھارتی آئین کی بنیاد جمہوری اصول پر رکھی گئی ہے اور ہر شخص کو بلا لحاظ مذہب و ملت مساوی حقوق حاصل ہیں۔ بھارت کے لوگ مہاتما گاندھی کو راشٹریہ پتا اور شری جواہر لال نہرو کو ان کا وفادار پیرو تسلیم کرتے ہیں۔ شری نہرو کو بھارتی عوام کا اتنا ہی احترام و اعتماد حاصل ہے جتنا کہ ڈاکٹر مصدق کو ایرانی عوام کا۔ بھارت کے لوگوں کو ایران کی تحریک آزادی سے گہری دلچسپی ہے اور وہ اس امر پر خوش ہیں کہ ایرانی قوم ڈاکٹر مصدق کے زیر قیادت تیل کی صنعت کو قومیانے میں کامیاب ہوئی ہے۔ بھارت میں ڈاکٹر مصدق کو وسط مشرق کے ممالک کی تحریک آزادی کا رہنما تسلیم کیا جاتا ہے۔

اپنے پیغام کے آخر میں انھوں نے کہا کہ بھارت کے دورے میں ہمیں اس امر کا احساس نہیں ہوا کہ ہم کسی غیر ممالک میں قیام پذیر ہیں۔ بھارت کے لوگوں نے ہمارے لئے جس خلوص و محبت کا اظہار کیا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ بھارت کے راشٹرپتی، پردھان منتری اور بھارتی کابینہ کے دوسرے وزرا سے ملاقات کے دوران میں ہمیں یہ احساس ہوا ہے کہ وہ دونوں قوموں کے درمیان دوستی کے خواہاں ہیں۔ خدا بھارت اور ایران دونوں کو کامیابی نصیب کرے۔

مسٹر عبدالرحمن فرامرزی ایڈیٹر کیہان آل انڈیا ریڈیو نے ایرانی وفد کے ممبروں سے اس ملک کے باب میں اپنے احساسات اور تاثرات بیان کرنے کے لئے کہا ہے۔ بھارت ایک وسیع ملک ہے۔ اس کے متعلق جو کچھ دیکھا اور سمجھا ہے اسے بیان کرنے کے لئے بھی اس ملک کی وسعت کے مطابق وقت درکار ہوگا اس لئے میں مختصراً یہ کہوں گا کہ بھارت صرف ایک ملک ہی نہیں بلکہ ایک دنیا ہے اس لئے بھارت کے ایک شہنشاہ کو شاہ جہان کہا جاتا تھا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ شاہ جہان کیوں کہے جاتے ہیں۔ تو انھوں نے بھی یہی جواب دیا تھا کہ یہ ملک ایک جہان سے کم نہیں ہے۔

اس ملک یا اس دنیا میں قدرتی خوبصورتی، قدرتی ذرائع اور قلبی آزادی وغیرہ دنیا کی سبھی لاثانی چیزیں موجود ہیں۔ بھارت کو وہ تمام چیزیں حاصل ہیں جو اس ملک کو ہر طرح سے خود کفیل بنا سکتی ہیں اور اب اس ملک کے رہنما اس مقصد کے حصول کے لئے کوشش کر رہے ہیں حسن قدرت کے لحاظ سے یہ ملک اس قدر مالا مال ہے کہ میں اس کا بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ میرے ملک کے لوگ اس باب میں پہلے ہی بہت کچھ جانتے ہیں۔ جس قسم کی قدرتی آزادی اس ملک میں حاصل ہے اس کی مثال دنیا میں کہیں بھی نہیں مل سکتی یہاں ہر فرد و بشر اپنی مرضی کے مطابق کسی بھی مذہب کا پیرو ہو سکتا ہے کوئی بھی لباس پہن سکتا ہے اور جس طرح چاہے بود و باش اختیار کر سکتا ہے یہاں کے لوگوں کے کسی مجمع میں جانے پر انسان مختلف لباس پہننے والے اور مختلف مذہبوں کے پیرووں کو یکجا دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ کہ کوئی بھی کسی دوسرے کے مذہب یا لباس یا رہنے سہنے کے ڈھنگ پر معترض نہیں ہوتا۔

اگرچہ بھارت میں قدرتی حالات بہت موافق ہیں پھر بھی لوگوں کی اپنی مساعی بھی بہت حد تک مددگار ثابت ہوئی ہیں۔ بھارت کے جو چند ایک شہر ہم نے دیکھے وہ کسی بھی یوروپی شہر سے کم نہیں ہیں۔ اس ملک میں برطانیہ جیسی جمہوریت رائج ہے۔

محمد مصلح الدین احمد

آئزن ہوور

دُنیا آج اس منزل پر پہنچ چکی ہے جہاں ایک ملک میں واقع ہونے والی تبدیلیاں دوسرے ملک پر اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ یہ تبدیلی معاشی ہو یا سیاسی دوسری اقوام متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ موجودہ بین الاقوامی سیاسیات میں امریکہ کا جو مقام ہے اس کے پیشِ نظر امریکہ میں واقع ہونے والی ہر تبدیلی بین الاقوامی صورت حال پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ علاوہ اس کے مشرق وسطیٰ کی دھماکو صورت حال اور ملایا و ہندچینی کا غیر یقینی مستقبل، کوریا کی جنگ کی طوالت اور کلیدی مقامات کی دفاع کے مسائل ایسی نازک منزل پر تھے کہ امریکی انتخابات کے نتائج سے اُن کا براہِ راست اور گہرا تعلق تھا۔ مسلسل بیس سال تک امریکہ عمومی جماعت کی زیر اقتدار رہا۔ اب جمہوری جماعت کی کامیابی کے امکانات نے اُن تمام اہم مسائل کے تعلق سے بنیادی تبدیلیوں کے شبہات پیدا کر دئے۔ کوریا، ایران، مصر، ملایا و ہندچینی، جاپان اور جرمنی کی نئی صورت حال میں ریپبلکن پارٹی کے برسرِ اقتدار آنے سے کافی تبدیلی کی توقعات تھیں کیونکہ ٹرومن ایڈمنسٹریشن کے برخاست ہوتے ہی ٹرومن پالیسی بھی ختم ہو جائے گی۔ اسی سبب حالیہ صدارتی انتخابات بین الاقوامی اہمیت کے حامل تھے۔ دلچسپی اس لئے بھی زیادہ تھی کہ دونوں امیدوار امریکی آسمانِ سیاست پر نووارد کی حیثیت رکھتے تھے۔ ریپبلکن پارٹی نے ۱۱ر جولائی کو اپنے قومی اجتماع (نیشنل کنونیشن) منعقدہ شکاگو میں پہلے بیلیٹ پر جنرل آئزن ہوور کو سناتی رابرٹ ٹافٹ کے مقابلے میں اپنا امیدوارِ صدارت نامزد کیا۔ کنونیشن میں (۱۲۰۶) مندوبین شریک تھے جن میں سے (۸۴۵) نے مسٹر آئزن ہوور کو، (۲۸۰) نے سناتی رابرٹ اے ٹافٹ کو، (۷۷) نے گورنر ارل وارن کو اور صرف (۴) نے جنرل میکارتھر کو ووٹ دئے۔ عمومی جماعت نے پہلے مسٹر ٹرومن کو اور پھر مسٹر ایویرل ہیریمن کو اپنا امیدوار نامزد کرنا چاہا۔ لیکن گورنر اڈلائی اسٹیونسن بالآخر عمومی نامزدہ اُمیدوارِ صدارت بنے۔ ۴ر نومبر ۱۹۵۲ء بروز سہ شنبہ امریکہ کے طول و عرض میں ڈیموکریٹک اور ریپبلکن جماعتوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے انتخابات شروع ہو چکے۔ مبصرین ابھی تک یہ فیصلہ نہ کر سکے تھے کہ دونوں میں سے کس کو جیت ہو گی۔ لیکن اچانک ۵ر نومبر کو ۱۲ بجکر آٹھ منٹ پر مسٹر اسٹیونسن نے مسٹر آئزن ہوور کے نام اپنے شخصی پیامِ مبارکباد میں اپنی شکست کا اعتراف یوں کیا۔ "عوام نے اپنا انتخاب کر لیا ہے میں انھیں مبارکباد دیتا ہوں۔ انھوں نے اپنا فیصلہ دے دیا ہے اور میں اُسے قبول کرتا ہوں"۔ (۶۱،۶۲۱،۵۲۹) امریکیوں میں سے (۳۳،۹۳۸،۲۸۵) نے ایک جنرل کو سیاست داں پر ترجیح دی جبکہ (۲۷،۳۱۲،۲۱۷) آراء گورنر اسٹیونسن کو مل سکیں۔ عوامی آراء کی اتنی بڑی اکثریت اس سے قبل صرف مسٹر روزویلٹ نے ۱۹۳۲ء میں حاصل کی تھی۔ (۶۶۲۶۰۶۸) کی اکثریت رکھنے والے اس عظیم جنرل کو ۱۵ر دسمبر کو امریکہ کے انتخابی کالج نے امریکہ کا (۳۴) واں صدر منتخب کیا۔ امریکی تاریخ میں آپ گیارھویں جنرل ہیں جن کے ہاتھوں قومی اقتدار کی باگ ڈور آئی۔ ۲۰ر جنوری ۱۹۵۳ء کو آپ کا بہ حیثیت صدر افتتاح کیا گیا۔ اس جلوس میں دس میل لمبا جلوس نکالا گیا اور اس کی روداد ۷۵ ملین لوگوں تک ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے ذریعے سے پہنچائی گئی۔ صدرِ جمہوریہ مسٹر آئزن ہوور نے (۲۵۰۰) الفاظ پر مشتمل خطبۂ صدارت پڑھا اور اس طرح بیس سالہ عمومی راج کا خاتمہ ہوا اور جمہوری اقتدار کا آغاز۔

بچپن اور تعلیمی زندگی

دنیا کے متمول ترین ملک کا مقتدرِ اعلیٰ فرد جو بیک وقت امریکی عوام کا خادم و قائد، دستورِ امریکہ کا محافظ اور امریکی افواج کا کمانڈر انچیف ہو گا اور جو اہم ترین مسائل پر بغیر سنات کے مشورے کے اپنا فیصلہ کر سکے گا۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۸۹۰ء میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کی سب سے بڑی ریاست ٹیکساس کے مقام "ڈنیشن" میں سوئٹزرلینڈ سے آئے ہوئے جرمن بنا ہگزبین گھرانے میں پیدا ہوا۔ آپ کے اجداد ۱۷۳۲ء میں امریکہ آئے تھے۔ آپ کے والد مذہب پرست، امن دوست کسان اور برف ساز تھے۔ آپ کم سنی ہی میں ۱۸۹۲ء میں مع خاندان کنساس ریاست میں بمقام "ابی لین" قیام پذیر ہو گئے اور یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۰۸ء میں بعمر اٹھارہ سال آپ ابی لین ہائی اسکول سے گریجوایٹ ہوئے۔ یہاں آپ تاریخ و ریاضی میں امتیاز حاصل کر چکے تھے۔ آپ اس زمانے میں عملی امتحانات

سے دوچار رہتے۔ محنت و مزدوری کر کے اپنے بڑے بھائی کے کالج کی ضروریات پوری کیا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ وہ اپنی کوئی قطعی راہ منتخب نہ کر سکے تھے۔

فوجی زندگی کا آغاز

اسی کشمکش والی زندگی میں مسٹر ڈوائٹ ڈیوڈ آئزن ہوور کے اچانک فیصلے نے ایک نئی موڑ پیدا کر دی۔ اسی خاندان کے ایک فرد نے جو جنگ کو روحانی جرم سمجھتا چلا آیا تھا ۱۹۱۱ء میں ایک فوجی افسر بن کر میدانِ جنگ میں زندگی گزارنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ اسی سال جبکہ آپ کی عمر (۲۱) سال تھی آپ نے امریکی بحریہ میں شرکت کرنی چاہی لیکن عمر ہونے کے باعث رد کر دیئے گئے۔ تاہم ملٹری اکیڈیمی بمقام ویسٹ پائنٹ نیو یارک میں شریک ہو گئے۔ ۱۹۱۵ء تک جب آپ یہاں سے گریجویٹ بن کر نکلے۔ آپ کا اکیڈیمی ریکارڈ بتاتا ہے کہ آپ ہمیشہ اپنی جماعت کے پہلے تین بہترین طلباء میں سے رہے۔ اس کے بعد ہی آپ کا فوری اور پہلا تقرر اسی سال ماہ ستمبر میں سیکنڈ لفٹننٹ کے عہدے پر ۱۹ ویں پیادہ امریکی فوج فورٹ سام ہوسٹین ٹیکساس میں ہوا۔ یہاں آپ کی ملاقات (۱۹) سالہ حسینہ میمی جنیوا ڈوڈ سے ہوئی۔ روایت مشہور ہے کہ اس ملاقات کے بعد آپ نے پندرہ مرتبہ اسی روز اس لڑکی کو فون کیا۔ بہرحال یکم جولائی ۱۹۱۶ء کو ۲۶ سالہ آئزن ہوور کی ڈینور (کولوریڈو) کی (۱۹) سالہ لڑکی میمی سے شادی ہو گئی۔ دو بیٹے ہوئے جن میں سے ایک تیسرے سال میں چل بسا۔ دوسرا لڑکا جان آئزن ہوور اس وقت ۳۰ سالہ ہے اور امریکی فوج میں میجر ہے اس کا ایک بچہ ڈیوڈ دوم ہے جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۸ء کو پیدا ہوا تھا۔ جان آئزن ہوور کو جولائی ۱۹۵۲ء میں کوریا بھیج دیا گیا۔ مختصر یہ کہ جس دن آپ کی رفیقۂ حیات نے آپ کے گھر میں قدم رکھا آپ کو سیکنڈ لفٹننٹ سے فرسٹ لفٹننٹ کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ جنگِ عظیم کے دوران میں آپ نے جس غیر معمولی پھرتی، جوانمردی اور نظم و ضبط کا مظاہرہ کیا اُس کے اعتراف میں آپ کو کئی تمغے ملے۔ اس وقت آپ (۲۸) ویں سال میں تھے اور ٹینک کے مشہور ماہر تھے لیکن فضائیہ کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ۱۹۳۵ء تک آپ پناما اور براعظمی ریاستوں کی دفاع کے منصوبے بناتے رہے۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۹ء تک آپ جنرل میکارتھر کے تحت فلپائن میں امریکی مشن کے رُکن کی حیثیت سے فلپائنی فضائیہ کی تنظیم جدید کی۔ آپ نمبر (۴۷) سال ہوائی پائلٹ بنے تھے۔ ہوائی جنگ میں آپ کی دلچسپی اور مہارت بہت زیادہ ہے۔ اسی طرح فرانس میں یادگارِ جنگ کمیٹی کے رُکن کی حیثیت سے مصروف کار رہے۔ جب جاپان نے ۱۹۴۱ء میں پرل ہاربر پر حملہ کر دیا تو آپ ہوائیہ میں تھے۔ آپ کو فوراً واشنگٹن طلب کیا گیا اور وار پلان ڈویژن کا سارا کام آپ کے سر ڈال دیا گیا۔ یہ ڈویژن اعصابی مرکز تھا جو تمام جنگی پیش قدمیوں پر کنٹرول رکھتا تھا۔ اس وقت آپ میجر جنرل تھے۔ ۱۹۴۳ء میں آپ کو پورا جنرل بنا دیا گیا۔ ۱۹۴۴ء میں آپ نے امریکی فوج کا اعلیٰ ترین عہدہ جنرل آف دی آرمی حاصل کر لیا۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۴ء تک آپ سسلی، اطالیہ اور نارمنڈی کی فتح کے منصوبے بناتے اور اُن کو رُوبہ عمل لاتے رہے۔ اس مشن کی تکمیل کے بعد آپ نے زندگی کے سب سے اہم کارنامے کو سرانجام دینے کا بیڑہ اُٹھایا۔ وہ تھا نازی جرمنی کی تسخیر کے لئے شمال مغرب سے حملہ یورپ میں اتحادیوں کی فتح کا سہرا جنرل آئزن ہوور کے سر آتا ہے جن کی جنگی صلاحیتوں نے (۱۴) اقوام کو مساویانہ طور پر ساتھ دے کر آگے قدم اُٹھایا اور جرمنی کو شکست دی عظیم اتحادی افواج آئزن ہوور کی بیباک قیادت میں رود بارِ انگلستان پار کر رہی تھیں یہ حملہ جس کا نقشہ جنرل آئزن ہوور نے بنایا اور خود ہی روبہ عمل لایا۔ چار ہزار بحری جہازوں، تین ہزار چار سو ہوائی جہازوں اور تیس لاکھ کی وسیع فوج کے ساتھ کیا گیا۔ ۷ رمئی ۱۹۴۵ء کو نازی جرمنی کو شکست ہوئی اور آپ کا مشن پورا ہوا۔

۷ رجون کو آپ نے ان فرائض سے سبکدوشی حاصل کر لی۔ نومبر ۱۹۴۵ء میں صدر ٹرومن نے انہیں آرمی چیف آف اسٹاف مقرر کیا۔ نہ صرف یہ کہ آپ نے پوری فرض شناسی کے ساتھ امریکی مفادات کی حفاظت کی بلکہ فوجی طعام خانوں میں غذا کی مقدار اور جنس دونوں کا اچھا ہو جانا آپ ہی کے دور کی یادگار ہے ۱۹۴۸ء تک آپ اس عہدے پر خوش و خرم رہے۔ اس دوران میں امریکی عوام کے محبوب "آئکی" (امریکی عوام کا دیا ہوا نام جو انہیں بہت پسند ہے) کو برطانیہ، روس، اطالیہ، فرانس، پولینڈ، چیکوسلواکیہ، مصر، نیدرلینڈز، لکسمبرگ، ڈنمارک، بلجیم، ناروے، حبشہ، ٹیونس اور مراکش نے اُن کی عظیم خدمات کے صلے میں تمغے اور اعلیٰ اعزازات سے سرفراز کیا جبکہ بلفاسٹ، آکسفورڈ، ایڈنبرا، کیمبرج اور کولمبیا کی جامعات نے آپ کو اعزازی ڈگریاں عطا کیں۔ Crusade In Europe کا مصنف نہ صرف ایک زبردست اہلِ قلم ہی ہے بلکہ ایک بہترین عوامی مقرر بھی جو مسلسل مطالعے کا عادی اور غضب کے حافظے کا مالک ہے۔ ماہی گیری اور مصوری آپ کے دل پسند مشغلے ہیں جن کے لئے آپ میں اُنس و دلچسپی تو ہے لیکن وقت نہیں۔ پندرہ کروڑ ستر لاکھ امریکیوں کا صدر کسی زمانے میں بھٹیوں میں آگ دیا کرتا تھا اور اپنے سات بھائیوں اور بہنوں میں سب سے زیادہ مشقت کا عادی۔ آپ اپنے والد کی تیسری اولاد تھے۔ آئزن ہوور نے دورانِ جنگ میں نہ صرف ایک کمانڈر کا رول انجام دیا بلکہ ایک منتظم کا بھی جو نظم و ضبط کے معاملے میں سخت ترین، اصول کی راہ میں اٹل اور فیصلے کا پابند تھا۔ آپ نے اپنی سیاسی دانائی، ایڈمنسٹریشن چلانے کی صلاحیتوں اور قیادت کی اہلیتوں کا بڑا

اچھا مشورہ کا مظاہرہ کیا۔ آپ کے رفقاءِ کار آپ کو "امن کا جرنیل" "غیر فوجی جرنیل" اور "سیاسی جرنیل" کے ناموں سے یاد کرتے تھے۔ علاوہ ازیں آپ انتہائی موقع شناس اور مدبر بھی واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے بعضوں نے آپ کو Strategist اور Diplomat کا نام بھی دیا۔ ۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۹ء آپ نے امریکہ کے چیف آف دی اسٹاف کے قائم مقام صدر کی حیثیت سے امریکی مسلح افواج کی تنظیم جدید کی۔

صدرِ جامعۂ کولمبیا

امریکہ کے ایک مشہور ترین تعلیمی ادارے نے اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک فوجی جنرل کو اپنا صدر بنانا پسند کیا۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں آرمی چیف آف دی اسٹاف کے عہدے سے استعفیٰ دے کر جامعۂ کولمبیا کا (۲۳) واں صدر بننا منظور کر لیا۔ جس طرح ملک کی دفاع آئزن ہوور کا مطمع نظر رہی۔ اسی طرح وہ تعلیمی اقدار کی اہمیت کو بھی برقرار رکھتے ہیں۔ امریکہ کی اس عظیم الشان جامعہ کی روایات میں جنرل آئزن ہوور نے چند ایک کا اضافہ کیا۔ مسٹر آئزن ہوور نے طلباء جامع میں فوجی تعلیم و تربیت عام کرنے آزادی و جمہوریت کی قیمت کو سمجھانے اور امن کے لئے کوشش کرنے والے محاذ کو جنم دینے کے لئے مختلف انجمنیں قائم کیں جن کے ذریعے سے بین الاقوامی تعاون کو بڑھانے کی کوشش کی گئی۔ اسپورٹس اور گیم کے بڑے سرپرست رہے کیونکہ خود بھی زمانۂ طالب علمی میں اتھلیٹک اسوسی ایشن کے آرگنائزر رہ چکے ہیں۔ بیس بال اور فٹ بال آپ کے پسندیدہ کھیل ہیں جس کا پہلا ثبوت آپ کا ٹوٹا ہوا ٹخنہ ہے جو گھوڑ سواری کے زمانے میں دوبارہ متاثر ہوا۔ بحیثیت صدر کولمبیا یونیورسٹی آپ نے اکتوبر ۱۹۴۹ء میں پنڈت نہرو کو اعزازی ڈگری دی۔ اسی زمانے میں آپ نے ایک انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جو جنگ و امن کی اسٹڈی کے لئے وقف تھا تاکہ جنگ کا اس کے تمام پہلوؤں میں بحیثیت ایک "المناک سماجی سانحہ" کے مطالعہ کیا جائے اور بالخصوص انسان کی روحانی، ذہنی اور مادی ترقی پر اس کے تباہ کن اثرات کی بغور جانچ کی جائے۔ علاوہ اس کے آپ کے دورِ صدارت میں ایک اور نئی چیز "غذائی کلب" کا قیام تھا جس کو انسان کے گذر اوقات اور کھانے پینے سے متعلقہ تمام مسائل سے نپٹنا پڑتا تھا۔ اس میں تغذیہ، غذائی کیمیا، تجاسئے زمین، زراعتی ٹیکنیک اور سمندر سے نئی غذاؤں کا حصول وغیرہ تمام اس کلب کے متعلقہ مسائل تھے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ مقتدر اقوام کے درمیان حقیقی تعاونِ عمل ہی عالمی نظم و ضبط برقرار رکھ سکتا ہے۔ یہی بات آپ طلباء میں بھی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ آپ نے ایک دفعہ کہا تھا "میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ہر بچہ جو اس دنیا میں نمودار ہوا اس کے مالکوں سے اس طرح بنایا ہوا ہے کہ اپنے ماحولیاتی کیفیات کا مقابلہ کر سکے۔ ہر نسل اور ہر قوم ہر دوسرے سے بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ کوئی بھی اس قدر خود مکتفی تو نہیں کہ بغیر دوسروں کی مدد یا تعاون کے اپنی منزل پا سکے اور کوئی اس قدر پیش پیش نہیں کہ وہ اتنی معقولیت حاصل کر چکی ہے کہ معقول ترین کو بھی روشنی دکھا سکے۔" آپ نے انسانوں کے درمیان انصاف کی بقاء اور ضرورت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا "انسانوں کے ساتھ انصاف صرف انسانی تشنگی کے عالمی اور منصفانہ طور پر سیراب ہونے کے بعد ہی ممکن ہے۔ یہ انسانی تشنگی تین طرح کی ہے کیونکہ آدمی بیک وقت ایک جسمانی مخلوق ہے جس کو کپڑے، غذا اور سہارے کی ضرورت ہے۔ ایک سوچنے والی ذات ہے جو ہمیشہ سوال کیا کرتی ہے ان سوالوں کا جواب دیا جانا یا جواب پانے کا موقع دیا جانا ضروری ہے اور ایک روحانی وجود ہے جس میں توقعات و خواہشات کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے جس کو دنیا کی ساری نعمتوں سے تشفی نہیں مل سکتی۔" اس طرح آپ ۱۹۵۰ء تک ایک اعلیٰ ترین امریکی تعلیمی ادارے کے سرپرست رہے اور ملک کی ریڑھ کی ہڈی کی ہمہ جہت اصلاح میں مصروف رہے حتیٰ کہ دوبارہ آپ کو ملٹری یونیفارم میں آنا پڑا۔

سپہ سالارِ اعلیٰ برائے اتحادی افواجِ یورپ

دورانِ جنگِ عالمگیر میں آپ نے یورپ کا قریبی مطالعہ کیا تھا اور وہاں کی صورت حال پر حاوی ہو چکے تھے۔ اس لحاظ سے امریکی وزیر دفاع مسٹر جارج سی مارشل نے آپ کو روس کے بڑھتے ہوئے اثرات کی مدافعت کا ایک جامع فوجی پلان بنانے کی دعوت دی اور اطلاع دی کہ اس کو وہی (آئزن ہوور) رُوبہ عمل لائیں گے۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۵۰ء میں مسٹر آئزن ہوور تنظیم میثاق شمالی اوقیانوس N.A.T.O. کی چودہ اقوام کی مشترکہ دفاع کے سلسلے میں بحیثیت اتحادی سپہ سالار اعلیٰ دوبارہ یورپ تشریف لائے۔ اس وقت یورپ کی دفاعی طاقت کسی بھی شورش کی تاب نہ لا سکتی تھی۔ لیکن آپ نے اپنی قیادت میں ان چودہ اقوام کی فوجی طاقت میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور نتیجۃً آج یورپ اتنا طاقت ور ہے کہ شاید ہی کبھی تھا۔ یورپی مورچے کو مضبوط کرنے میں جہاں آپ نے اپنی جنگی اور نظم و نسق کی صلاحیتیں کام میں لائیں وہاں سیاسی دانائی کا بھی بہترین مظاہرہ کیا۔ آپ نے مسمار شدہ قلعے کی نہ صرف مرمت ہی کی بلکہ تقریباً نئی بنیادوں پر کھڑا کیا۔ آپ کا خیال ہے کہ "ہمیں طاقتور ہونا چاہیئے اور ساتھ ہی با حلم بھی۔ آپ کے نزدیک حب الوطنی مراد ہے مسلح افواج اور طیار شہریوں سے اخلاقی جرأت و طاقت مراد ہے۔ کھیت اور کارخانے کی پیداوار کے زیادہ سے زیادہ اضافے سے اور حریت سے محبت مراد ہے۔ اُن تمام ذرائع کی

حفاظت جس سے آزادی ممکن ہے، کیونکہ آخر کار ایک سپاہی کا لشکرہ آہنی زنجیر نہیں جتنا کہ ایک قیدی کی زنجیریں۔" آپ کی ان عظیم خدمات کے اعتراف میں حکومتِ فرانس نے ۲۳۔اپریل ۱۹۵۲ء کو آپ کو اپنے ہاں کا سب سے بڑا فوجی اعزاز Mediulla Militair اس امریکی جرنیل کو دیا جو فرانسیسی تاریخ میں اس اعزاز کا پہلا غیر ملکی ہے۔

امریکہ میں صدارتی انتخاب قریب آرہے تھے اور دونوں جماعتوں کی نظریں آپ پر لگی ہوئی تھیں لیکن آپ اس مشن کو ادھورا چھوڑنا نہ چاہتے تھے۔ لیکن جب عوامی تقاضوں نے آپ کو مجبور کیا کہ ری پبلکن ٹکٹ پر انتخابِ صدارت لڑنا منظور کریں تو آپ نے یہ کہتے ہوئے کہ "فرض نے للکارا ہے" مئی ۱۹۵۲ء کو اس عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ مسٹر ہیری ایس ٹرومن نے کو دیا میں آٹھویں امریکی فوج کے سپہ سالار جنرل میتھو بی رجوے کو آپ کا جانشین مقرر کیا۔ یکم جون کو آپ نے آرمی جنرل کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور ۳ جون کو ۴۲ سالہ فوجی زندگی کو خیرباد کہا۔ آپ نے بحیثیت سابق آرمی جنرل اپنے وظیفۂ حسنِ خدمت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

صدارتِ امریکہ

جنرل آئزن ہوور نے دورانِ جنگ میں باضابطہ اعلان کیا تھا کہ وہ کسی عوامی عہدے کے لئے انتخاب نہیں لڑیں گے کیونکہ آپ سیاسیات میں اُلجھنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن حالات کی رو نے جنرل کو مخالف چلنے پر مجبور کیا۔ آپ نے ایک دفعہ بانگِ دہل اعلان کیا تھا کہ "میں عمومیت پسند (ڈیموکریٹ) ہوں اور ہمیشہ رہوں گا"۔ لیکن تاریخ نے دیکھا کہ بیس سال بعد آپ ہی پہلے ری پبلکن صدر رہے۔

جب آپ کے اُمیدوارِ صدارت ہونے کی خبریں گرم تھیں تو آپ نے ارادہ کیا تھا کہ اگر دونوں جماعتیں متفقہ طور پر آپ کو نامزد کریں تو آپ اس خدمت کے لئے تیار ہیں۔ لیکن جمہوری جماعت نے آپ کو اپنی طرف کھینچ لینے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اور جب اس کا علم عمومی جماعت (ڈیموکریٹک پارٹی) کو ہوا تو مسٹر ٹرومن نے دوسری بار صدارت کے لئے انتخاب لڑنے کا خیال دل سے نکال دیا کیونکہ ۱۹۵۱ء میں جنرل کو امریکہ کا محبوب ترین فرد قرار دیا گیا تھا۔ مسٹر ٹرومن کو اُن کی جماعت نے دوبارہ کھڑا ہونے کا مشورہ دیا۔ لیکن انھوں نے اس کو رد کر دیا اور اپنی طرف سے مسٹر ایورل ہیریمن جو اُن کے مددگار خصوصی تھے کا نام تجویز کیا۔ لیکن مسٹر ہیریمن بعد میں دستبردار ہو گئے۔ مسٹر آئزن ہوور کے ری پبلکن ٹکٹ پر کھڑے ہونے کی اطلاع سے عمومی صفوں میں ایسی کھلبلی مچ گئی کہ ہر کوئی اُن کے مقابلے کو آنے سے ہچکچانے لگا۔ تاہم جولائی کنونشن منعقدہ شکاگو میں مسٹر اسٹیونسن کیفاور اور گورنر اڈلائی اسٹیونسن میں رسہ کشی ہوئی اور الی نوائے کے گورنر نے بازی جیت لی۔ اور اس طرح عمومی جماعت کی طرف سے مسٹر اسٹیونسن کو اُمیدوارِ صدارت نامزد کیا گیا۔ ادھر مسٹر آئزن ہوور اور مسٹر رابرٹ اے ٹافٹ کے درمیان ابتدائی انتخابات کی ریس ہو رہی تھی۔ ابتدائی انتخابات میں مسٹر آئزن ہوور نے مسٹر ٹافٹ کو بُری طرح ہرا دیا اور بالکل یہی حال مسٹر ٹافٹ کا ہم رجولائی کو شکاگو میں شروع کئے ہوئے ری پبلکن نیشنل کنونشن میں ہوا جس کی تفصیل تمہید میں آچکی ہے اور اس طرح ری پبلکن پارٹی کی طرف سے آئزن ہوور میدانِ انتخابات میں ڈیموکریٹک اُمیدوار مسٹر اسٹیونسن کے خلاف اُترے۔ قومی اجتماع کا برخاست ہونا تھا کہ امریکہ کے طول و عرض میں نیویارک سے لے کر سان فرانسسکو تک انتخابی مہم کی ہلچل تھی۔ مسٹر ٹرومن اور مسٹر اسٹیونسن ایک طرف سے اور مسٹر آئزن ہوور اور مسٹر نکسن دوسری طرف سے امریکی عوام کی رائے کو متاثر کرنے والی تقاریر کر رہے تھے۔ اور سارے ملک کے دورے کر رہے تھے۔ تاکہ ہر ریاست میں شخصی پروپیگنڈا کیا جا سکے۔ آپ نے اپنی آئندہ پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے "نکتہ چار پروگرام اور ادارۂ اقوامِ متحدہ کی پوری پوری تائید کے جاری رکھنے کا وعدہ کیا۔ آپ نے کہا کہ یورپ کو یا تو متحد ہونا ہے یا اپنی موت آپ مرنا ہے اور یہ کہ یورپ کا بوجھ امریکہ اکیلا نہیں اُٹھا سکتا۔ اس لئے یورپ میں مسلح بری افواج خود یورپی اقوام ہی فراہم کریں تاکہ براعظم کی دفاع ہو سکے۔ بھاری محاصل کے آپ نہ صرف مخالف ہیں بلکہ اس کو استحصال کی ایک شکل قرار دیتے ہیں۔ شہری حقوق کے تیقن دئے جانے کے بارے میں آپ کا خیال ہے کہ ابتدائی ذمہ داری تو ریاستی حکومتوں پر آتی ہے۔ تعلیمات کے لئے وفاقی امداد کے آپ مخالف ہیں۔ انھوں نے اعلان کیا کہ اس چیز کو ریاستی اساس پر آگے بڑھانا چاہئیے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ قومی زرعی حکمت عملی، قومی غذا پیدا کرنے کے سبب چند خطرات کو قبول کرنے پر مجبور ہوگی۔ آپ طبابت کے اشتراکی طرز کی تنظیم کے خلاف ہیں اور صحت عامہ کے ایک معقول اور جامع پروگرام کے خیال کی پوری تائید میں ہیں۔ آپ نے "انسان کی لافانی افضلیت کو جو کہ ابدی اخلاق اور فطری قوانین کے تابع ہے" کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا کہ "ہمارا یہ عقیدہ ہمارا اپنا ہی نہیں بلکہ اس دنیا کے تمام آزاد انسانوں کا مستحکم خیال ہے اور یہ مشترک رشتہ برما کے چاول کے کھیتوں کے مسکین انسانوں کو آئیوا (امریکہ) کے گیہوں کے کاشتکاروں سے اور اٹلی کے چرواہوں کو کوہِ اینڈیز کی چڑھائی سر کرنے والوں سے باندھتا ہے۔" اس لئے آپ اقوامِ متحدہ اور اُس کے کام کے بارے میں رجائیت پسند ہیں۔ آپ کا کہنا ہے کہ "اقوامِ متحدہ کی ترقی کتنی ہی متزلزل کیوں نہ ہو اور اس کے اجلاسوں میں ایک طبقہ کے لوگ اپنے حق تنسیخ اور طعنوں سے مخل ہونے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کریں ؟

ایک زندہ اور عملی وجود حقیقی ہے۔ ایک ٹھوس شہادت ہے بڑھتے ہوئے حوصلوں اور مقاصد کی اور ایک پیش لفظ ہے اُن خوشگوار ایّام کا جو مستقبل میں چھپے ہیں" آپ نے خوداعتمادی کا اظہار بھی ان الفاظ میں کر دیا کہ "ہم خطرے کے مقابلے میں قدم دھر چکے ہیں۔ خوف و ہراس سے نہیں بلکہ عزم و اعتماد اور استقامت سے۔" اپنی مہم کی تقاریر میں سب سے زیادہ اہمیت آپ نے کوریا کے مسئلے پر دی اور واقعہ ہے کہ عوام عمومی راج سے جمہوری راج کو اس لئے بدلنا چاہتے تھے کہ پہلے تو بیس سالہ عمومی اقتدار سے وہ مطمئن نہ تھے اور دوسرے یہ کہ کوریا میں عمومی جماعت کی پالیسی عوام کی خواہش نہ تھی۔ آپ نے وعدہ کیا کہ وہ سب سے پہلے مسئلہ کوریا کو جلد از جلد حل کریں گے۔ ۲۰ اکتوبر کو آپ نے اعلان کیا کہ "اگر کوریا میں جنگ ہوئی تو ایشیائی اقوام کو لڑنے دیا جائے۔" فارموسا سے امریکی بیڑے کی دستبرداری دراصل اسی پالیسی کا ایک ثبوت ہے۔ آپ نے انتخابات میں سب سے اہم نشریہ اعلان یہ کیا کہ "اگر میں صدر منتخب ہو جاؤں تو سب سے پہلے کوریا کا دَورہ کروں گا اور جنگ کوریا کو جلد سے جلد روکنے کی کوشش کروں گا۔" آپ نے یہ بات محض انتخابی مہم کو مؤثر بنانے کے لئے نہیں کہی بلکہ ۲ دسمبر کو آپ واقعی دورۂ کوریا کو بحیثیت صدر منتخب جنگی طیارے میں گئے۔ اگرچہ کہ صدر ٹرومن نے اپنی مسٹر آئزن ہوور سے ۱۸ نومبر کو اپنی (۶۵) منٹ کی طویل گفت و شنید کے بعد اپنا ذاتی طیارہ "انڈیپنڈنس" پیش کیا۔ لیکن مسٹر آئزن ہوور اپنے بیٹے جان آئزن ہوور کے جہاز میں ۷ دسمبر تک کوریا کا دَورہ کرتے رہے۔ آپ کی معیت میں آپ کی حفاظت کے لئے (۱۳) سو جنگی جہاز تھے۔ غرض انتخابات میں آپ نے ہزاروں میل کا سفر کر کے (۳۲) کروڑ الفاظ بول کر اور سب سے زیادہ نشری تقاریر کر کے انتخابی مہم کا نیا ریکارڈ قائم کر دیا اور اتنا اثر و رسوخ بڑھا لیا کہ خود ٹیکساس کے ڈیموکریٹک گورنر نے آپ کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ مسٹر ٹرومن اور گورنر اسٹیونسن دونوں مل کر ہاتھ پیر مار رہے تھے اور مسٹر آئزن ہوور اپنے ذاتی جوہروں سے فائدہ اُٹھا رہے تھے۔ اس لئے مساوی مقابلہ متوقع تھا۔ کیونکہ ملک پر عمومی جماعت کا اثر زیادہ تھا اور جمہوری جماعت کا کم۔ لیکن مسٹر آئزن ہوور شخصی طور پر مقبول ترین فرد تھے۔ اس طرح

اُن کے وجود نے امریکی تاریخ کو پلٹا دیا اور ۱۹۳۲ء کو مسٹر ہربرٹ ہوور کے علیحدہ ہونے کے بعد سے جو عمومی صدر حکومت شروع ہوا تھا وہ آپ کی آمد پر ختم ہو گیا۔ اس مہم پر جو تیرھویں ری پبلکن صدر نے لڑی، پندرہ کروڑ ڈالر صرف ہوئے جبکہ پہلے ری پبلکن صدر لنکن کو صرف (۲۵) ڈالر انتخابی مہم لڑنے کے لئے ملے تھے جس میں سے اُس نے صرف ۲½ ڈالر خرچ کئے اور بقیہ ۲۲½ ڈالر سرکاری خزانے کو واپس کر دئے۔ ۵ نومبر کو مسٹر آئزن ہوور نے اپنے حریف کو (۸۶۰۶۲۲۶۶) کی مہیب اکثریت سے شکست دی اور انتخابی کالج میں جو امریکی کانگریس کے ارکان پر مشتمل ہوتا ہے اور جس میں ایوان نمائندگان اور سنات دونوں کے ارکان شامل ہیں، (۲۲۴) جمہوری ارکان آئے جبکہ عمومی نشستیں (۸۹) تھیں۔ اس طرح ۱۵ دسمبر کو عوامی انتخاب کی انتخابی کالج نے بھی تصدیق کر دی اور صدر منتخب کو جانے والے صدر نے تشکیل کابینہ کی دعوت دی۔ ۱۸ نومبر کو دونوں نے (۶۵) منٹ تک طویل گفت و شنید کی اور نظم و نسق و خارجی حکمتِ عملی کے تمام پہلو زیر بحث آئے۔ ۲۰ جنوری سال حال کو آپ نے مسٹر ٹرومن سے اُن کے عہدے کا چارج لے لیا اور پندرہ کروڑ ستر لاکھ افراد کے سامنے دستور کی برقراری، حفاظت اور مدافعت کا حلف لیا۔

مختلف دارالحکومتوں اور بالخصوص لندن، پیرس اور کراچی میں آپ کی عہدۂ صدارت پر آمد کا شاندار خیر مقدم کیا گیا۔ یہودیوں نے اس سلسلے پر غم و غصّہ کا اظہار کیا جبکہ پیکنگ ریڈیو نے ۱۰ نومبر ۱۹۵۲ء کو اعلان کیا۔ "مسٹر آئزن ہوور کے آنے سے امریکی حکمران طبقے کی موجودہ جارحانہ پالیسی میں کوئی تبدیلی نہ ہو گی۔"

بہرحال اب آپ کو پیچیدہ ترین مسائل سے نپٹنا ہے، ایران و مصر کے تنازعات اب تک غیر حل شدہ ہیں۔ جنگ کوریا ابھی تک جاری ہے اور ملایا و ہند چینی میں صورت حال روز بروز بگڑتی جا رہی ہے تو ایسے عالم میں یہ مستقبل ہی یہ بتا سکے گا کہ میدانِ جنگ کا یہ شہسوار کس حد تک میدانِ سیاست کا مرد بن سکتا ہے" ——!

بسمل صحرائی

دو غزلیں

تیرا دامن مہک گیا ہوتا — غنچہ غنچہ چٹک گیا ہوتا

زندگی کے شکستہ ساغر میں — کوئی شعلہ بھڑک گیا ہوتا

تم نے دیکھا تھا مست آنکھوں سے — گر زمانہ بھٹک گیا ہوتا؟

مرے ساقی بھری بہاروں میں — کوئی ساغر چھلک گیا ہوتا

کوئی آنسو تو میری آنکھوں سے — ترے دامن تلک گیا ہوتا

میری پلکوں سے ٹوٹ کر بسمل
کوئی تارا چمک گیا ہوتا

زندگی جل رہی ہے آنکھوں میں — آگ سی ڈھل رہی ہے آنکھوں میں

جس کو کہتے ہیں عشق کا آغاز — بات وہ چل رہی ہے آنکھوں میں

ایک اُمید تیرے آنے کی — کتنی بے کل رہی ہے آنکھوں میں

حادثہ ہے کہ تم نہیں آئے — یوں تو ہلچل رہی ہے آنکھوں میں

زندگی کتنی تلخ تھی بسمل
وہ بھی اک پل رہی ہے آنکھوں میں

نشتر سندیلوی

گلشن و نشیمن

اب ہے گلشن نہ اپنا نشیمن — وہ چلی برق پھیلا کے دامن

ذرّہ ذرّہ چمن کا ہے دشمن — اب قفس بن گیا ہے نشیمن

کوئی ملجا نہ ہے کوئی مامن — اپنا گلشن نہ اپنا نشیمن

کوک کوئل کی تھی کوئی بجلی — لگ اُٹھی آگ جلنے لگا بن

آس ہے کامیابی کی ضامن — ایک تنکا! بنائے نشیمن

لاکھ بیم حوادث ہو لیکن — پھر نشیمن ہے اپنا نشیمن

کام وہ جس میں دل کا زیاں ہے — دوست دُنیا کا ہوں اپنا دشمن

اس کا دامن ہے پھولوں سے خالی — جو بچاتا ہے کانٹوں سے دامن

زندگی نام ہے زندگی کا — زندگی، زندگی کا ہے مدفن

اب ملے بھی تو کس کام کے پھول — ہو چکا نذر کانٹوں کے دامن

یوں اُمنڈتے ہیں آنکھوں میں آنسو — جیسے نشتر! برستا ہے ساون

سجاد حیدر

فلک شگاف چیخ سے خان بہادر کی آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے گھبرا کر تکیے کے نیچے سے ٹارچ نکالی اور کمرے کا جائزہ لینے کے بعد گھڑی دیکھی دو بجے تھے، خاصی رات باقی تھی۔ انہوں نے دوبارہ تکیے پر سر رکھا ہی تھا کہ پھر وہی چیخ کانوں میں گونج گئی۔ وہ ہڑبڑا کر پلنگ پر اُٹھ بیٹھے۔ پانچ ماہ کے طویل دورے سے وہ شام ہی کو پلٹے تھے، انہوں نے محسوس کیا کہ گھر میں عجیب قسم کی پُراسرار خاموشی اور اُداسی طاری ہے لیکن غور کرنے کی فرصت نہ تھی۔ تھکے ہارے کھانا کھا کر پلنگ پر دراز ہو گئے، وہ سوچتے رہے ان کا قدیم ملازم شبو جو تقریباً تیس سال سے کبھی کانسٹبل، کبھی چپراسی، کبھی ڈرائیور اور کبھی سائیس کے فرائض انجام دیتا رہا تھا اور جو روزانہ خان بہادر کو ناشتہ کرانا، کھانا کھلانا، کپڑوں پر استری کرتا اور بلا ناغہ جوتوں پر پالش کرتا تعجب ہے کہ وہ بھی گم سُم تھا۔ ان کی بیگم، لڑکی لڑکے یہاں تک کہ نئے ملازم بھی اُداسی کو چھپانے کی کوشش کے باوجود کامیاب نہیں ہو رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب کے سب کسی نامعلوم حادثے کے منتظر ہیں اور خان بہادر سے سب کچھ چھپایا جا رہا ہے، وہ کسی سے کچھ دریافت کرنے کے قطعی عادی نہیں تھے، ان کا خیال تھا گھر میں جو بات ان کو بتائی جانا ضروری ہوتی ہے ضرور بتائی جاتی ہے۔ انہوں نے سوچا کہ اُن کو اس بات کا احساس اس وقت کیوں ہوا، ان کی بیگم جوان ہی کے کمرے میں سویا کرتی تھیں۔ آج لڑکیوں کے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کیونکہ اکثر جب ان کی آپس میں جھڑپ (جھڑپ تو دونوں طرف کی لڑائی کو کہتے ہیں، مگر یہاں فریقِ اوّل فریقِ ثانی کو کچھ بولنے ہی نہ دیتے تھے) ہو جاتی یا بچوں میں سے کسی کی طبیعت خراب ہوتی تو ایسا ہوتا۔ جھڑپ تو ہوئی نہیں، اس لئے کہ میں مُدت سے باہر دورے پر تھا اور آنے کے بعد تمام بچے بندگی کے لئے آئے، اس کے معنی ہیں کہ کوئی علیل بھی نہیں، ہاں نکہت ذرا پیلی پیلی سی ہے، آتے ہی پلنگ پر سمٹ کر بیٹھ گئی۔ میری نگاہ اُٹھتے ہی تسلیم کر کے بھاگ گئی، حشمت بھی تو شرمانے لگی تھی اس طرح جوان ہو کر..... پھر..... ان کے دماغ نے سوال کھڑا کر دیا، ابھی ان کے دماغ نے "پھر" کا کوئی جواب نہیں سوچا تھا کہ نہایت احتیاط کے ساتھ اُن کا دروازہ کھولا گیا، تقریباً سہمے ہوئے لہجے میں انہوں نے دریافت کیا کون؟

"میں ہوں" ان کی بیگم نے برجستہ سہم کر جواب دیا۔ ارے تم کیا جاگ گئے طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ طبیعت کو میری کیا ہوا، یہ ابھی کون چیخ رہا تھا، خواہ مخواہ آنکھ کھل گئی تم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ایک بار جاگ کر میں مشکل سے سو سکتا ہوں" خان بہادر نے پلنگ پر ڈر سے سکڑے ہوئے پیر پھیلاتے ہوئے کہا "میں سمجھا گھر میں کوئی چور گھس آیا ہے" یہ سنتے ہی بیگم صاحبہ کا دل دھڑکا، چور تو واقعی ان کے گھر میں گھس چکا تھا، اور لوٹ لٹا کر چلتا بھی بنا تھا، مگر اب وہ کہتیں کیسے" تم تو سدا کے وہمی ہو۔ بیگم نے کہا اب آرام سے سو، نکہت کی طبیعت ذرا یونہی سی ہے، اللہ رکھے، اب جوان ہے، دُکھ سُکھ تو کاندھا جوڑ کر چلتے ہیں، ذرا اس کے پیٹ میں درد ہے، ابھی ذرا سینک کروں گی تو دل ٹھہر جائے گا" خان بہادر نے تکیے پر سر رکھتے ہوئے ایک ہاہُو والی طویل جماہی لی" گرمی کے دن ہیں، کھانے پینے میں کمی رکھو ورنہ آئے دن ڈاکٹر کی فیس اور دواؤں کا بل مجھ سے ادا نہیں ہوگا، اور نہ میں رات رات بھر جاگ سکتا ہوں۔ وہ اپنے اصلی رنگ میں آ گئے اُن کی بیگم اور گھر کے تمام آدمی ان سے بہت خائف رہتے تھے، لیکن اس وقت نہ جانے کیسے ان میں اتنی جسارت آگئی۔ اور وہ اپنے کان پوری سیاہ سلیپروں کو زور زور سے ٹر ٹر کرتی ہوئی مڑ گئیں، دروازے کو زور سے بند کرنے سے پہلے قریب قریب چیخ کر بولیں" کہتے لگا لو کمبختاں کو ترسا ہوں اور سوتے نہیں چور دن کے ڈر سے الزام بچوں پر میں تو اسپتال لے جاؤں گی اپنی بچی کو" اور آخری جملہ انہوں نے سرگوشی کے انداز میں کہا "جہنم میں چلی جاؤ اپنے بچوں سمیت مُردار" یہ ان کا مخصوص لفظ تھا جو وہ غصے میں اپنی چہیتی بیوی کو بالکل عامیانہ انداز میں

سناتے - اب دروازہ بند ہو چکا تھا خان بہادر نے کروٹ بدلی اور تھوڑی دیر میں اُن کے خراٹے کمرے میں گونجنے لگے -

اُن کی بیگم کمرے سے نکل کر سیدھی لڑکی کے کمرے میں پہنچیں، نکہت بستر پر پڑی ابھی تک منہ میں کپڑا ٹھونسے اہنکار رہی تھی، اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد تڑپنے لگتی، نکہت سے چھوٹی بہن اور بھائی شام ہی سے دوسرے کمرے میں منتقل کر دئے گئے تھے، نکہت سے بڑی بہن جو مبلغ چار بچوّں کی ماں بن چکی تھی اس کو تسلی دے رہی تھی "ابھی بس ابھی میں تم کو اپنے گھر لئے چلتی ہوں، تم بالکل فکر نہ کرو، سب کام ٹھیک ہو جائے گا" - لیکن یہ درد تسلیوں سے دور ہونے والا درد نہیں تھا، نکہت منہ میں کپڑا ٹھونسے برابر اہنکارے جا رہی تھی، اور ماں کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ زور سے چیخی "امی مجھے زہر دے دو، کنویں میں دھکیل دو، مگر مجھے اس تکلیف اور ذلت سے بچا لو - میری امّی میں مری جا رہی ہوں، خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو، مجھے بچاؤ مجھے بچاؤ میری امی" آپا خدا کے لئے تم ہی میرے گلے پر چھری پھیر دو، میں زندہ رہنا نہیں چاہتی" آہ میں ابا میاں کو کیا منہ دکھاؤں گی، وہ مجھ کو مار ڈالیں گے، ہلال کر دیں گے مجھے" اور نکہت پر غشی سی طاری ہو گئی، یا درد میں کمی واقع ہو گئی بہر حال وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئی بیگم بہت دیر سے انتظامات میں چپکے چپکے مصروف تھیں، اور نکہت کی خاموشی کو غنیمت سمجھتے ہوئے انہوں نے شبو اور نکہت کی کھلائی رحمت بوا کو بلا کر آہستہ سے کان میں کچھ کہا، اے ہے ہے بیو ہاں بی بی اور کیا، کیا بٹیا کی جان لینا ہے، اے ہے اب دیر کرنا خطرے سے خالی نہیں، چلئے لے چلیں، رحمت بوا نے ڈنکے پر چوٹ ماری حسب عادت مگر مخالف نہیں -

نکہت اپنی بڑی بہن حشمت کے مکان کے ایک کمرے میں پُر سکون لیٹی ہے قریب کے پلنگ پر حشمت ایک نوزائیدہ بچے کو شیشی سے دودھ پلانے کی کوشش کر رہی ہے - بچہ بُرے منہ بنا بنا کر ابکائیاں لے رہا ہے "اے میں نے کہا نکہت اس ننھی سی جان نے تیرا کیا بگاڑا ہے، بھلا اس کی کیا خطا ہے آج چوتھا دن ہے اور تم نے اپنے دودھ کا ایک قطرہ بھی نہیں دیا، قصور اس ننھی سی جان کا نہیں اُس حرامی کے پلے کا ہے جو تمہارے پیٹ میں رکھوا کر لاپتہ ہو گیا" حشمت نے ہزارویں مرتبہ ایک ہی مفہوم کا جملہ مختلف پیرائے میں دہرایا - لیکن نکہت کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا، ٹس سے مس نہ ہوتی، جیسے وہ بچہ جن کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گونگی بہری ہو گئی ہے - اس کا جی چاہا یا نہیں چاہا لیکن اس نے ایک نظر بھی بچے کو دیکھنے کی خواہش ظاہر نہیں کی - جب بھی اس کی بڑی بہن نے بچہ اس کے سامنے لانے کی کوشش کی، نکہت نے آنکھیں بند کر لیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی -

بیگم دوسرے ہی دن اپنے گھر واپس چلی گئیں - نہ جانے اُنہوں نے نکہت کی غیر حاضری کی کیا کیا تاویلیں پیش کی ہوں گی لیکن شبو کی زبانی اتنا معلوم ہو چکا تھا کہ خان بہادر کے تیور بُرے نہیں -

سُنا ہے اکثر محبّت سے نفرت اور نفرت سے محبت کے سوتے پھوٹتے ہیں، نکہت تو پھر ماں تھی مدّت تک وہ اپنے لختِ جگر سے دُور رہی، اس سے نفرت کرتی رہی، اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا لیکن ایک رات جب گھر کے تمام افراد گہری نیند سو رہے تھے، وہ بچّے کے رونے کی آواز سے بیدار ہو گئی، اس نے کئی بار آپا آپا پکارا اور چاہا کہ پھر آنکھیں بند کر کے سو رہے مگر بچے کے رونے کی آواز سے اس کا دماغ پھٹنے لگا، اس نے دوبارہ حشمت کو کئی آوازیں دیں، مگر آج شاید وہ کسی وجہ سے اپنے شوہر کے کمرے میں سو رہی تھی، جب کوئی جواب نہیں ملا تو نکہت نے اٹھ کر روشنی کر دی، اس نے دیکھا حشمت کا پلنگ خالی پڑا ہے، اور بچّہ تنہا پڑا رو رہا ہے - سولہ دن بعد آج پہلی نظر اس نے اپنے بچّے پر ڈالی - اور غیر ارادی طور پر قریب قریب اچھل کر وہ بچے کے پلنگ پر جا پہنچی - پاس ہی تولیا میں لپٹی ہوئی دودھ کی گرم شیشی رکھی تھی - اس نے ایک مشتاق ماں کی طرح بچّے کو پلنگ سے اٹھا کر اپنی گود میں لٹا لیا اور دودھ کی شیشی اس کے منہ میں لگا دی، بچّہ خاموش ہو گیا مگر اس کی پیاری پیاری آنکھوں میں آنسوؤں کے ننھّے ننھّے قطرے چھلکنے کے قریب تھے، نکہت نے دوپٹے سے اس کے آنسو خشک کئے اور شیشی سمیت اسے اپنے سینے سے لگا یا اور بے تحاشا اس کی پیشانی پر پیار کرنے لگی بچّہ دودھ پی کر بالکل خاموش تھا اور اب اس کے آنسو بھی خشک ہو چکے تھے مگر اب نکہت کی آنکھیں اُبلی پڑ رہی تھیں - وہ خوب رونا چاہتی تھی، جی بھر کے اتنا کہ سولہ دن کے رُکے ہوئے آنسو ایک ساتھ بہہ جائیں، وہ چاہتی تھی کہ اس کے دل پر نو ماہ اور سولہ دن سے جو گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں وہ برس کر کھل جائیں وہ سوچنے لگی، اس نے اس ننھے سے بچے کو کیوں سزا دی، اس کا حق کیوں چھینا، اس کی صورت اتنے دن کیوں نہیں دیکھی، وہ سوچتی رہی - سوچے چلی گئی

حتیٰ کہ بچہ گہری نیند سو گیا' نکہت کے پیر سُن ہو چکے تھے اور چیونٹیاں سی رینگنے لگی تھیں مگر پھر بھی وہ سوچتی رہی' اب بچہ نیند میں مسکرا رہا تھا' اچانک نکہت کو ایسا لگا کہ احسان اپنے مکان کے دریچے میں کھڑا مسکرا رہا ہے اور وہ اپنی کھڑکی میں کھڑی اس کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ بچہ مسکرا کر گہری نیند کے آغوش پہنچ چکا تھا' نکہت نے محسوس کیا کہ وہ اپنے لختِ جگر کو نہیں بلکہ احسان کو اپنی گود میں لئے بیٹھی ہے۔ اس احساس کے ساتھ اس نے جھٹ سے بچے کو اس کے پلنگ پر لٹا دیا اور اپنے دانت پیسنے لگی' کمینہ' سؤر' ذلیل کتا! اس کے دانت بُری طرح دکھنے لگے' زبان اینٹھنے لگی' مٹھیاں سختی کے ساتھ بند ہو گئیں اور تھوڑی دیر کے بعد نڈھال ہو کر وہ پلنگ پر دراز ہو گئی' مگر سو نہیں سکی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے گزشتہ واقعات رقص کرنے لگے' اور عجیب عجیب مُنہ بنا کر اس کو چڑھانے لگے۔

اس نے پہلی بار احسان کو اپنے مکان کے موڑ پر اسکول کی بس سے اتر کر گھر کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا' عجیب ڈھیٹ آدمی ہے یہ مجھے گھورے کیوں جا رہا ہے' اس نے دل میں سوچا' شکل صورت تو خاصی ہے مگر اعمال اور وہ زیرِ لب مسکرا دی لیکن کب جب وہ گھر میں داخل ہو چکی تھی' اب یہ معمول بن گیا' جب وہ بس سے اترتی تو ایک اجنبی پہچانی مسکراہٹ اس کا استقبال کرتی مہینے گزرتے گئے' مگر نکہت ایک بار بھی اس کی مسکراہٹ کا جواب نہیں دے سکی' اس مدت میں نکہت کو مختلف ذرائع سے معلوم ہو چکا تھا کہ اس کا نام احسان ہے' گنڈا ہے' اسی طرح لڑکیوں کو گھورا کرتا ہے' موقع ملنے پر دست درازی بھی کر بیٹھتا ہے۔ اب وہ اس سے بالکل نافر ہو گئی۔ اس واقعہ کے سننے سے پہلے اس کے دل میں ذرا سی گنجائش پیدا ہو چلی تھی اور ممکن تھا کہ وہ کسی دن جواباً مسکرا بھی دیتی' مگر اب وہ نفرت کے ساتھ اس سے ڈرنے بھی لگی تھی۔

اس نے والدین سے اس کا ذکر نہیں کیا' اسے ڈر تھا کہ کہیں حشمت کی طرح اس کی تعلیم بھی خطرہ میں نہ پڑ جائے' اسے یہ بھی ڈر تھا کہ خان بہادر کہیں اسی کو مجرم نہ سمجھیں' اور وہ اس حماقت کی پاداش میں گھر میں کچے آموں کی طرح پال ڈال دی جائے' وہ اپنے ابا میاں کی ڈکٹیٹر شپ اور گھر کے ماحول سے بہت نالاں تھی' اسے یقین تھا کہ ڈکٹیٹر شپ میں ذرا سی غلطی کی اکثر بہت بڑی سزا دی جاتی ہے۔

دن گزرتے گئے اور ایک دن اس نے دیکھا کہ احسان سامنے والے مکان کے دریچے میں کھڑا مسکرا رہا ہے' اس کا دل دھک سے ہو گیا' نکہت کا کمرہ بالائی منزل پر تھا اور وہاں سے احسان کا دریچہ بالکل سامنے تھا۔ اس نے اپنی کھڑکی کا پٹ بند کر لیا' شام کو چھت پر ٹہلنا بھی چھوڑ دیا۔ آتے جاتے ہوئے اس نے اوپر نگاہ اٹھانے کی قسم کھالی' کچھ دن بعد اس کو محسوس ہونے لگا کہ احسان نہیں بلکہ وہ خود مجرم ہے' اس نے کئی بار ارادہ کیا کہ گھر میں اس کا ذکر کر دے مگر ہمت نے ساتھ نہیں دیا۔ اور وہ غیر شعوری طور پر خود کو مجرم سمجھنے لگی' یہ کیا ہے؟ اس کی سمجھ میں نہیں آتا' وہ کیوں بدمعاش احسان کا ذکر نہیں کر دیتی' ساتھ ہی اسے یقین تھا کہ اس کے دل میں احسان کے لئے ذرہ برابر گنجائش نہیں نہ اسے احسان کے التفات کی پرواہ تھی اور نہ بے رُخی کا گلہ۔

اب احسان کی طرف سے پتھروں میں لپٹے خطوط نازل ہونے لگے' یہ ایک نئی الجھن اور مصیبت تھی اس کا بس چلتا تو وہ وہی پتھر احسان کے مُنہ پر دے مارتی' مگر نہ جانے کیوں جب وہ پتھر میں لپٹا ہوا خط پھینکتا تو نکہت کے تمام جسم کے رونگٹے جھن سے بج اٹھتے' اس کو ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے کسی نے بڑھ کر اس کے جسم کو چھو لیا ہے۔ وہ پسینہ میں تر ہو جاتی اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اب وہ کیا کرے' پتھر اکثر اس وقت پھینکے جاتے جب وہ اوپر آ رہی ہوتی یا نیچے جا رہی ہوتی' اس کے پیر لڑکھڑا جاتے وہ قصداً پتھر سے کترا کر جو اس اندازہ سے پھینکا جاتا کہ اس کے پیر کے پاس گرے نکل جاتی۔ مگر یہ کچھ بہت آسان بات نہیں تھی' بس اس کی جان ہی تو نکل جاتی' زینے سے اترتے ہوئے اس کی پنڈلیاں لرزی جاتیں اور اترنا دوبھر ہو جاتا' تھوڑی دیر بعد جب وہ اوپر چڑھتی اور دوبارہ پتھر کے پاس سے گزرتی تو پتھر کو ٹھوکر سے زینے کے نیچے پڑے ہوئے کوڑ کباڑ میں پہنچا دیتی۔ اس ڈر سے کہ کہیں کسی کی نظر نہ پڑ جائے۔ یہ سلسلہ بھی مدت تک جاری رہا' بلکہ آخری وقت تک جاری رہا' حتیٰ کہ وہ برباد کر دی گئی' لوٹ لی گئی۔ اس کی مسکراہٹوں کو اس کے ہونٹوں سے چھین کر پاتال کی گہرائیوں میں دفن کر دیا گیا۔

نکہت ایک بار چونکی' پلنگ پر سویا ہوا بچہ نیند میں ڈر کر چونک پڑا نکہت نے اس کے سینے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ بچے کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا' دھک دھک دھک دھک .... دھک .... دھک۔ بلکہ رو رہا تھا لیکن احسان کو جو ذرا رحم آیا ہو' وحشی' درندہ' کمینہ' سؤر اور اس نے بچے کے سینے پر سے ہاتھ ہٹا لیا' اس بدمعاش احسان کا ہی تو

دل دھڑک رہا ہے اس کے سینے میں، اس بار بچہ پھر اس کی شکست پر مسکرا رہا تھا
وہ جھنجلا کر پلنگ پر لیٹ گئی اور منہ پر چادر تان لی۔ وہی بھیانک منظر، وہی
مکالمے اس کی فکر کی آنکھوں کو پھوڑنے لگے، اس کے کان بج اٹھے، لیکن جیسے اسے
گزشتہ دنوں نے جکڑ لیا ہے، اس کا دم رکنے لگا، نجات کی کوئی سبیل نہیں سوجھی
اور اس نے آغوشِ فکر میں سب کو ایک دم سمیٹ لیا، کسی کو نوچا کسی کو کاٹا
کسی کو کوسا، مگر پیار کسی کو نہیں کیا، غنودگی کی حالت میں اس نے محسوس کیا
کہ کوئی چیز دھم سے اس کے کوٹھے پر گری ہے، آنکھ کھولنے کے بعد ابھی وہ
دھماکے کے بارے میں کسی نتیجہ پر نہیں پہنچی تھی کہ کوئی آکر اس کے دروازے
میں کھڑا ہو گیا، احسان کو اس نے کبھی نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا، پھر بھی پہچان
گئی کہ یہ سایہ احسان کے علاوہ کسی دوسرے کا نہیں ہو سکتا اور قبل اس کے
کہ وہ پلنگ پر سنبھل کر بیٹھے، یا کسی کو آواز دے، آنے والے نے دھیرے سے
"شوش" کہہ کر اس کو بولنے یا چیخنے سے خبردار کر دیا۔ "چیخنے کی کوشش نہ
کرنا نکہت، وہ اپنے نام پر چونکی، ورنہ خان بہادر صاحب کی ناک کٹ جائے گی
میں چور نہیں، احسان ہوں، مگر تم کیا جانو احسان کیا بلا ہے، مگر آج میں تمہاری
بے مہری اور سنگ دلی کا فیصلہ کرنے آیا ہوں تم مجھے رات بھر بے چین کر کے
خود چین سے نہیں سو سکو گی، گھبراؤ نہیں میں تم کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا، مجھے
معلوم ہے کہ تم ایک بزدل لڑکی ہو، اور اپنی مرضی سے محبت بھی نہیں کر سکتیں
مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم مجھ کو بدمعاش سمجھتی ہو، کیونکہ تمہارے اسکول کے
بیشتر آدمی مجھ کو جانتے ہیں، اور لڑکیاں میرے سائے سے گھبراتی ہیں، اور یہ
بھی کہ تم نے میرا ایک خط بھی نہیں پڑھا، میرا خیال ہے کہ اب تک میں نے ایک
بات بھی غلط نہیں کہی، کیوں یہی بات ہے؟

ابھی تک نکہت بہت سراسیمہ تھی، مگر اس طویل گفتگو سے اس کو اتنا
اندازہ ہو گیا کہ وہ خطرے میں تو ضرور ہے مگر اتنے خطرے میں نہیں جتنا وہ سمجھ
رہی تھی، پنڈلیوں سے رانوں تک دوڑنے والی تھرتھراہٹ آہستہ آہستہ کم
ہونے لگی اب وہ سنبھل کر پلنگ پر بیٹھ گئی، اور اپنی قوتِ گفتار کو مجتمع کرنے
لگی، اس کا حلق خشک ہو چکا تھا اور کوشش کرنے پر بھی وہ کوئی جواب نہیں
دے سکی۔ اب احسان دروازے کی چوکھٹ چھوڑ کر اس کے بستر کے پاس پائنتی
پر بیٹھ چکا تھا، اور بدستور آہستہ آہستہ کچھ کہے جا رہا تھا، نکہت کے کان
بجنے لگے، اعضاء پھر تھرتھرانے لگے۔ اور اس کو اس وقت ہوش آیا جب
احسان اس کے ہاتھ کو پکڑ کر جھنجھوڑ رہا تھا، بولو میری بات کا جواب دو، کیا تم
بہری ہو؟ کیا تمہارے سینے میں دل نہیں اور اگر ہے تو کیا اس میں جذبات نام کو
نہیں میں لاکھ بدمعاش سہی، مگر اس دنیا کے بہت سے نیک معاش لوگوں سے
بہتر ہوں، کئی سردوں، خان بہادروں، رائے صاحبوں سے بلند ہوں، میں نے اب
تک تم سے کوئی چھچھوری بات نہیں کی۔ میں نے اب تک تم کو کبھی سرِ راہ نہیں
چھیڑا، میں نے تم پر کبھی آوازہ نہیں کسا، حالانکہ میں تم سے زبردستی سب کچھ
منوا سکتا تھا"۔ وہ بولتا رہا۔

نکہت نے سوچا کہ ابھی اس نے میرے جسم کو ہاتھ نہ لگانے کے وعدے
کے فوراً بعد ہی مجھ کو چھوا ہے، اس کے ہاتھ کو جھنجوڑا ہے، اس کے قول و فعل کا کیا
اعتبار، ممکن ہے اب وہ اسے اپنے سینے سے لگا لے اسے پیار کر لے، اس کا سب
کچھ چھین لے۔ ایسا آدمی سب کچھ کر سکتا ہے کیا بعید، اور وہ ایک اول اور
آخر کوشش کے طور پر صرف اتنا کہہ سکی "تم چلے جاؤ احسان تمہاری بڑی مہربانی
ہوگی" اس نرم اور شائستہ جملے میں بہ باطن نرمی اور شائستگی نام کو نہ تھی، بلکہ
ایک خوف تھا جو جنگل میں بھیڑیے کو دیکھ کر آدمی کے دل پر مسلط ہو جاتا ہے
وہ ڈر رہی تھی، اسے ڈر تھا کہ کہیں بھیڑیا اس کے سخت سلوک سے بپھر نہ جائے
وہ اسے پھسلا کر اس سے دور بھاگنا چاہتی تھی، احسان ایک دم چونک پڑا "تم
مجھ کو اپنے سینے سے لگانے کے بجائے اپنے گھر سے نکالنا چاہتی ہو، تم زخم پر مرہم
کی جگہ نمک چھڑکنا چاہتی ہو، تم سوچتی ہوگی کہ میں رونے سے کمزور بچے کی طرح
اپنی چیز چھنوا کر بسورتا رہوں گا اور قطعی جد و جہد نہیں کروں گا۔ تو یہ
تمہاری بھول ہے، میں نے آج تک اپنی کسی تمنا کو سینے میں دفن نہیں کیا
میں نے اپنے دل کے سب ارمان نکالے ہیں، میں احمقوں کی طرح خود کو تمناؤں
کی قبر بنانا نہیں چاہتا میں نے ہمیشہ چیز چھینی ہے مانگی نہیں، میں مانگنا
ذلت سمجھتا ہوں اور چھیننا فخر، اگر تم نے اپنی محبت خوشی سے نہیں دی
تو میں اسے زبردستی حاصل کرنے کی کوشش کروں گا" وہ دل کو لرزا دینے
والے عزم کے ساتھ بولتا رہا۔

پیر تلے دبی ہوئی چیونٹی کی طرح نکہت بھڑک اٹھی، اسے حالات کے
اس قدر جلد جلد تبدیل ہونے کی امید نہیں تھی، ایک بار وہ پلنگ سے جست
لگا کر زمین پر تن کر کھڑی ہو گئی، اور اپنی پوری قوت سے چیخی "نکل جاؤ بدمعاش
تم مجھ کو تنہا سمجھ کر ڈرانا چاہتے ہو تم چاہتے ہو کہ ایک تنہا لڑکی پر رعب جما کر

اس کی زندگی برباد کر دو، اور برباد کر کے چلتے بنو۔ میں اتنی آسانی کے ساتھ خود کو حوالے کرنے سے رہی، میں تمہارا منہ نوچ لوں گی، تمہارے دیدے نکال لوں گی، شرم کرو احسان، تم اپنی بہادری کا مظاہرہ کہاں کر رہے ہو، ایک تنہا اور کمزور لڑکی کے سامنے، کیا تمہارے لئے اپنے تمام جوہر دکھانے کا یہی زرّیں موقع ہے، کسی تنہا لڑکی کی خواب گاہ میں اس طرح آنا، کیا تمہارا یہ فعل کسی نوعیت سے مستحسن ہے شاید تم سوچتے ہو گے کہ میں تم کو بہادر ہیرو سمجھ کر تم سے محبّت کرنے لگوں گی، نکل جاؤ ورنہ میں شور مچا کر گھر کے تمام آدمیوں کو جگا دوں گی، اور تمہاری بہادری خاک میں مل جائے گی، نکل جاؤ" اس بار وہ خاصی کھل کر چیخی۔ "شوش" اب احسان نے خالص دھمکانے کے انداز میں "شوش کیا" اور نکہت کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر اس کو زبردستی پلنگ بٹھا دیا" میں بدمعاش ہوں نکہت! اور تم خان بہادر کی لڑکی، تم اگر تمام محلّے کو بھی جمع کر لو گی تو میرے چہرے سے میری ناک ایک انچ بھی نہیں سرکے گی، اور تمہارے گھر کے کسی آدمی کے چہرے پر ناک نہیں ہو گی، تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ایک بدمعاش آدمی کی ناک یا تو سرے سے ہوتی ہی نہیں اور اگر ہوتی ہے تو یقیناً فولادی، برعکس بڑے آدمیوں کی ناک بڑی ہونے کے ساتھ موم کی ہوتی ہے۔ جو ذرا سی تپش سے پگھل جاتی ہے، تم مجھ کو میرے طرزِ عمل پر شرمندہ بھی نہیں کر سکو گی، کیونکہ میں تو بدمعاش ہوں، نہ صرف دنیا کی بلکہ تمہاری نظر میں بھی، مجھے یہ غلط فہمی بھی نہیں کہ میں بہادر ہوں۔ لیکن خان بہادروں سے ضرور زیادہ بہادر ہوں، میں مانتا ہوں کہ یہ نازیبا حرکت ہے میں تمہاری اجازت کے بغیر تمہارے گھر میں گھس آیا اور تمہاری خوشی کے بغیر اس وقت تم سے گفتگو کر رہا ہوں، یہ سب ٹھیک ہے، مگر کیا تم نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ اگر میں اس طرح تمہارے گھر میں گھس نہ آتا تو تم لوگ مجھ کو اپنے دروازے پر بھی نہ پھٹکنے دیتے۔ مجھ کو اپنے نوکروں سے دھکّے دلوا کر نکلوا دیتے اور میں اپنے دل کی تمام حسرتوں کو اپنے دل میں دبائے مر جاتا۔ اور تم لوگوں کو خبر بھی نہ ہوتی ایک آدمی جو بدمعاش کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، اور جو یقیناً بالکل ویسا ہی دل رکھتا ہے جیسا وہ لوگ جو بدمعاش کے لقب سے نہیں پکارے جاتے۔ اس کی سچّی محبّت کی تم کو خبر بھی نہ ہوتی، اس کی قربانی پر کوئی شاعر مرثیہ نہ لکھتا اس کی موت کا چرچا کسی اخبار میں نہ ہوتا، بُرے آدمیوں کی موت پر لوگ اِنّا لِلّٰہ کی بجائے خس کم جہاں پاک کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ دنیا میرے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کرے گی، کیوں نہ

میں دنیا کے مُنہ پر تھوک دوں، قبل اس کے کہ وہ مجھے دھتکارے میں خود اُسے دھکّے دے کر آگے بڑھ جاؤں، ہم لوگ بدمعاش نہیں، بدمعاش بنائے گئے ہیں ہم لوگوں کو فاقوں سے مار کر بیڑیاں پہنائی گئی ہیں، ہم لوگوں کو بیمار اور محتاج بنا کر ہمارے سامنے سکے نچائے گئے ہیں، اور ان سکوں کی تال پر برسوں ہماری مائیں بہنیں بہویں، بیٹیاں نچائی گئی ہیں، ان کو ریشمی کپڑے عطا کر کے ننگا کیا گیا ہے کیا یہ غلط ہے نکہت، اگر نہیں تو کیوں نہ میں ان سب کا بدلا چکا دُوں، تم ڈر رہی ہو، تمہارا دل دہل رہا ہے، تمہارا سارا جسم کانپ رہا ہے، بالکل اس غریب لڑکی کی طرح جس کو کسی نواب کے رنگیلے لڑکے نے موقع سے پکڑ لیا ہے جو اس کی طرف بڑھ رہا ہے، اس کی گھبراہٹ پر قہقہہ مار رہا ہے اور اس کے جسم کے وہ پوشیدہ مقام عریاں کرنے کی کوشش کر رہا ہے جس کو دیکھنے اب تک وہ خود شرماتی ہے۔ ڈرو نہیں، میں بدمعاش ہوں شریف بدمعاش نہیں، اکثر بدمعاش نیک معاش لوگوں سے زیادہ نیک ہوتے ہیں، اور سچّی محبت کرتے ہیں۔ بدمعاش اپنے قول و فعل کے سچّے اور اپنی بات کے دھنی ہوتے ہیں۔ خان بہادر صاحب نے کتنے ہی ایسے وعدے کئے ہوں گے جو آج تک وفا نہیں ہوئے ہوں گے، کتنے ہی جھوٹ بولے ہوں گے، کتنے ہی لوگوں کو دھوکہ دیا ہو گا، میرا مطلب خاص طور پر خان بہادر صاحب یعنی تمہارے والد سے نہیں، میں نے ایک عام بات کہی ہے، ایسے لوگوں کے لئے جو بڑے بڑے ناموں سے پکارے جاتے ہیں، جو بڑی بڑی کرسیوں پر جلوہ افروز ہیں، اور پستیوں کی طرف نگاہ نہیں جھکا سکتے، ہاں ٹھیک ہے تم کو میرا ایسا جاہل اُجڈ ہیرو نہیں جیت سکتا، کم از کم قانون کی رو سے۔ کیوں کہ میں تعلیم یافتہ نہیں، میرے پاس اتنا سرمایہ نہیں کہ بڑی سی شاندار کوٹھی تعمیر کرا سکوں، ایک عمدہ سی چمکتی ہوئی نئی موٹر رکھ سکوں، اس لئے کہ ہم غریبوں کے آباؤ اجداد تم امیروں کی کوٹھیاں تعمیر کرتے رہے ہیں، تم لوگوں کی سواری کے لئے موٹروں کے چندے جمع کرتے رہے ہیں کیوں کہ تم مائی باپ بنے رہے، دنیا نے غریب کے وجود کو، غریب کی شخصیت کو کبھی تسلیم نہیں کیا، لیکن بعض سر پھرے چاہے چند ہی دنوں کے لئے اپنی شخصیت، اپنے وجود کو اپنی ذاتی قوت سے منوا لیتے ہیں، میں اس وقت اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ تم مجھ کو ذلیل سمجھتی ہو، اور کبھی مجھ سے محبت نہیں کر سکتیں، لیکن میں جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں اپنے دل کو ارمانوں کا مقبرہ نہیں بننے دوں گا تمہاری اس بربریت اور تذلیل آمیز سلوک نے میرے صبر کے دامن کو تار تار کر دیا ہے، اب میں صرف ایک غنڈا ہوں تمہارا پرستار نہیں ہوں، بدمعاش

ہوں، لٹیرا ہوں، جس کا کام لوٹنا ہے، برباد کرنا ہے، کیوں کہ بدنام بد سے بدتر ہوتا ہے میں بدنام ہوں اور یقیناً بد سے بدتر ہوں، تم میری محبّت اور شرافت پر بھروسہ نہیں کر سکتیں، میں نے تم سے محبّت کی تھی اس لیے نہیں کہ تم کسی اور کے حوالے کر دی جاؤ اور میں اپنی حسرتوں کو سینے سے لگائے تمہاری برات کو دور بیٹھا دیکھتا رہوں ہمارے آبا و اجداد نے صدیوں ایسے صدمے اٹھائے ہیں، ان کی کمریں کمان کی طرح جھک گئی ہیں، لیکن میں نے اپنی کمر پر کوئی جوا نہیں رکھا، میں نے کسی قوّت کے آگے سر نہیں جھکایا، میں نے اپنے سوائے کسی کے وجود کسی کی شخصیت کو تسلیم نہیں کیا ۔ کسی قوّت کو خاطر میں نہیں لایا، تمہارے سوائے اور اب تم ہی میری محبت سے بغاوت کر رہی ہو، میں یہ برداشت نہیں کر سکتا، میں تم کو اپنے سینے سے لگاؤں گا، تمہارے یاقوتی ہونٹ چوسوں گا ۔ قبل اس کے کہ کوئی ان پر اپنی ظاہری بڑائی سے قابض ہو جائے ۔ میرے دل میں ایک ایسی آگ بھڑک رہی ہے جس کو تم اور صرف تم ہی بجھا سکتی ہو، اس اثنا میں نکہت بری طرح لرزتی رہی، احسان کے بھاری اور مضبوط ہاتھ اب تک اس کے کاندھوں پر تھے، اور ان کی گرمی چھن چھن کر اس کے تمام بدن میں دوڑنے لگی، رات تاریک اور پر ہول تھی، یا یہ خود اس کے دل کا عکس تھا، جھینگر زینے کے نیچے پڑے ہوئے کوڑ کباڑ میں دبکے چرچرا چرا رٹر کر رہے تھے، جیسے احسان کے اکھٹّا تین درجن خط زور زور سے پڑھ کر سنا رہے ہیں ۔ نکہت پسینے میں شرابور ہو چکی تھی، اور اس کے کان احسان کی گفتگو نہ سُن کر جھینگروں کی آواز پر لگے ہوئے تھے "پیاری نکہت" اس نے صاف سُنا ۔ "یہ میرا پہلا خط ہے، میں تم سے محبّت کرتا ہوں، لیکن تم مجھ کو کبھی بھولے سے بھی ایک نظر دیکھنا گوارا نہیں کرتیں وغیرہ، جھینگر اب دوسرا خط پڑھ رہے تھے، اب تیسرا، اب چوتھا اور یہ سلسلہ جاری رہا نہ جانے کب تک، پھر ایک دم سے تمام خط فلم کی طرح پردۂ دل پر منعکس ہونے لگے، اس نے محسوس کیا کہ وہ جیسے ان خطوط کو پڑھ چکی ہے، انہیں پہچانتی ہے، اُن کا مفہوم سمجھتی ہے ۔

اب احسان نے اس کو بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اٹھا لیا اور اپنے سینے سے لگا کر پیار کرنے لگا، نہ جانے اُس نے تھپڑ کیوں نہیں مارا، اس کا مُنہ کیوں نہیں نوچا، اس کا سر دیوار سے کیوں نہیں ٹکرا دیا، چیخی کیوں نہیں جیسے اس پر کسی نے سحر کر دیا ہے، جادو کر دیا ہے اور وہ جم کر رہ گئی ہے ۔

"احسان میری طبیعت گھبراتی ہے" یہ وہ جملہ تھا جو احسان کی طویل گفتگو سے بچاؤ اور اپنے ماحول سے فرار کی طرف اشارہ زن تھا جیسے نکہت کو نہ اس سے کچھ کہنا تھا اور نہ بعد کو، اور وہ پلنگ پر لٹا دی گئی ۔ زندگی میں پہلی بار نکہت کا دل اس بُری طرح دھڑکا، جیسے ابھی کچھ دیر پہلے اس کے بچے کا دل خواب میں ڈر جانے سے دھڑکا تھا ۔

نکہت کا بچّہ زور سے چیخا، اور نکہت کو اس وقت ہوش آیا، صبح کے پانچ بج چکے تھے، اُف میں تمام رات نہیں سوئی ۔

حسبِ معمول شبو صبح ہی صبح خیریت دریافت کرنے آیا اور اپنے ساتھ یہ خبر بھی لایا کہ خان بہادر کو تمام قصّے کا علم ہو چکا ہے، لیکن وسیلۂ علم پر روشنی نہیں ڈال سکا، بہرحال دونوں بہنوں کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے، ان کے لئے اتنا سننا ہی کافی تھا، نکہت جو تمام رات جاگتی اور سوچتی رہی تھی، اس خبر سے بالکل نڈھال ہو گئی، اس کو اس کا خواب و خیال اور گمان بھی نہیں تھا کہ اگر خان بہادر کو علم ہو گیا تو کیا ہوگا ۔ وہ تو بس یہ جانتی تھی کہ لوگوں کی نظر میں ان کی بڑی بہن حشمت کے ایک عدد بچّے کا اضافہ ہو جائے گا ۔ چنانچہ چھ سات روز ہوئے حشمت کے ایک عدد بچّے کا اضافہ ہو گیا، ان کے محلّے میں بہت کم لوگ رہتے تھے لیکن تاڑنے والا تو ایک بھی بہت ہوتا ہے، حشمت ناکردہ گناہ کی سزا کے طور پر کئی دن پلنگ پر چت پڑی رہی، لوگ باگ محلّے سے آئے اور چلے گئے، بوڑھی دائی آتی رہی، مالش ہوتی رہی، پٹیاں بندھتی رہیں، بڑی بی کو دل میں اونٹ تو سوجھتا نہ تھا حشمت اور نکہت کا کیا خاک فرق کر سکتیں مگر تھیں زمانہ دیکھے تجربہ کار "بیٹی پیٹ تو تمہارا پلوٹھی کا نہیں، مگر لگتا ایسا ہی ہے، خدا جوانی بنائے رکھے گود بھر کر جنوائی ہوں گی ہاں ۔

نکہت کا گھر میں قدم رکھنا تھا کہ قیامت مچ گئی، آسمان پھٹ پڑا، زمین ہلنے لگی، خان بہادر پر کئی دن سے عزّت کے دورے پڑ رہے تھے، یہ کم بخت ایسا موذی مرض ہے کہ اسپیشلسٹ تو دور کی بات ہے اس کا کوئی معمولی ڈاکٹر بھی نہیں ملتا، پھر یہ مرض ہے بھی بڑا چور قسم کا، احسان اور اس مرض میں بس اتنا فرق ہے کہ چور تو دونوں ہیں، مگر ایک کی آمد کا علم کسی نہ کسی طرح ہو جاتا ہے، مگر دوسرے کا اس وقت ہوتا ہے جب وہ پوری طرح مریض پر غلبہ پا لیتا ہے، بدقسمت ہندوستان میں جیسے کئی اور امراض لاعلاج ہیں، اس کا علاج

بھی ابھی گرفت میں نہیں آیا۔ بہرکیف خان بہادر کی حالت خطرے سے خالی نہیں تھی اور یہ سنتے ہی کہ نکہت آئی ہے، ان کی بری حالت ہو گئی۔ ناک سرخ ہو گئی کنپٹیوں کی رگیں پھول گئیں، منہ سے پھچکر نکلنے لگا اور بات کرتے ہوئے منہ سے جھاگ تک اڑنے لگا، بے چارے کے پیروں کی تو بری حالت تھی، سارے کمرے کو سیکڑوں بار روندا، ہاتھ ہوا میں کبھی گولے بنا کر چھوڑتے، کبھی جیسے پتنگ کو ڈھیل دے رہے ہیں، کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے پتنگ کا لٹکتا ہوا پیٹا تیزی کے ساتھ کاٹ رہے ہیں اور کبھی جیسے کٹی ہوئی پتنگ کی ڈور کھینچ رہے، اس خوف سے کہ کہیں لونڈے اُن کی ڈور نہ ہتھیا لیں، آخری کیفیت خود کو بار بار دہرا رہی تھی، وہ بار بار ڈور کھینچ کر ہتھیلیاں ملنے لگتے۔ ایک بار وہ زور سے گرجے، جیسے گلی کے لونڈوں سے کہہ رہے ہیں۔ ڈور کو ہاتھ نہ لگانا ورنہ سر توڑ دوں گا میری پتنگ پہلے ہی ہتھے پر سے کٹی ہے، مانجھے کا تو نام و نشان بھی باقی نہیں رہا آخری فقرے پر ان کی آنکھیں نم ہو جائیں۔ لیکن لونڈوں کی دست درازیوں کو بند نہ ہوتے دیکھ کر ایک بار وہ پھر غضب ناک ہو جاتے، ایک بار جیسے دم توڑتے ہوئے مریض نے سنبھالا لیا۔ ”نکہت کو بلاؤ“ خان بہادر کی آواز گھر کے تمام آدمیوں کے کانوں سے سیدھی دلوں میں اتر گئی۔ شبو کے ہاتھ سے چینی کی چار پانچ پلیٹیں شن شنا کر زمین پر کھل گئیں۔ بے چارے نے نکہت کو گود دوں پال کر بڑا کیا تھا، بیگم صاحبہ گو روزانہ نماز کی پابند نہیں تھیں مگر ادھر کئی ہفتوں سے بالالہی کے سوائے انہیں کوئی دوسرا کام ہی نہیں سوجھتا تھا اور اس وقت نماز ختم کر کے کوئی دعا پڑھ رہی تھیں کہ خان بہادر کے کمرے سے تھڑپ تھڑپ سوں سوں کی آواز آئی، اور بیگم صاحبہ نے تشکرانے کا ہاتھ اپنے کانپوری سیاہ سلیپروں پر بیٹھ کر پھیرا نہ جانے وہ نماز کی چوکی سے اپنی سیاہ کانپوری سلیپروں پر کب اور کیسے آگئیں۔ بہرحال اب وہ خان بہادر کے کمرے کے اندر سونگھ رہی تھی اگر دروازے کی طرف خان بہادر کی پشت نہ ہوتی تو وہ سب سے پہلے اپنی بیگم کی ناک کا جائزہ لینے پر مجبور ہوتے۔ خان بہادر گرج رہے تھے اور نکہت بھیگی بلی کی طرح ایک طرف کونے میں کھڑی اپنے گال سہلا رہی تھی۔

کمبخت اسی دن کو پیدا ہوئی تھی، سارے خاندان کی ناک کاٹ کر ہتھیلیوں پر رکھ دی، اس ساٹھ برس کی عمر میں یہ لکھا تھا کہ اب میں اپنی برائیوں سے منہ چھپاتا پھروں، اپنے ہم جنسوں سے کترا دوں، تو نے میرے سفید بالوں میں کالک لگا دی، میری تمام زندگی کی کمائی ہوئی عزت خاک میں ملا دی مجھے منہ دکھانے کے قابل نہ رکھا۔ نکہت میرے گھر میں تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں“۔ ”ابا میاں“، نکہت نے کچھ کہنا چاہا۔ ”خاموش مجھے ابا میاں کہتے تم کو شرم نہیں آئی، تم مر نہیں گئیں، تم مجھے اب کس منہ سے ابا میاں پکارتی ہو، تم نے اسی وقت زہر کیوں نہیں کھا لیا، جب تم نے سیاہ کاری کی طرف قدم اٹھایا تھا، تم کو اسی وقت موت کیوں نہیں آگئی۔ جب تم کو کسی غیر مرد نے ہاتھ لگایا۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ تمہارے آنسو بہانے سے میں تم کو سینہ سے لگا لوں گا، شفقت سے تمہارے آنسو پوچھوں گا، میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گا، نکل جاؤ ورنہ میں تمہارا خون کر دوں گا، اور ناحق میرے ہاتھ تمہارے گندے خون سے رنگے جائیں گے۔ آج سے تم میری اولاد اور میں تمہارا باپ نہیں، تم کو اس کا بھی خیال نہیں رہا کہ میں نے کتنی مشکل سے اتنی عزت حاصل کی تھی، کل تک میرا شمار شہر کے معززین میں ہوتا تھا اور آج جب لوگوں کو معلوم ہو گا کہ خان بہادر کی کنواری لڑکی نے بچہ جنا ہے تو کیا میں منہ دکھانے کے قابل رہوں گا، اگر تم کو اپنی اور اپنے بچے کی جان عزیز ہے تو اسی وقت میرا گھر چھوڑ دو، چلی جاؤ جہاں تمہارے سینگ سمائیں۔

”بہت بہتر تو آپ میری ایک بات بھی نہیں سنیں گے“ نکہت میں جیسے کسی نے نئی روح پھونک دی۔ اس نے گال سہلانا چھوڑ دیا حالانکہ اب بھی اس میں جھنجھناہٹ ہو رہی تھی۔

”بالکل نہیں، بالکل نہیں، میں ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتا، میں نہیں چاہتا کہ عذرِ گناہ سن کر میں اپنی عزت کا اور مذاق اڑواؤں۔ میں نے اپنی عزت کو اپنی اولاد سے زیادہ شفقت سے پالا ہے، میں اپنی اولاد کا گلا گھونٹ سکتا ہوں مگر اپنی عزت کو خاک میں ملتے نہیں دیکھ سکتا“۔ خان بہادر کا لاوا پھٹ پڑا تھا، ابھی وہ کچھ اور اگلتے کہ نکہت بجلی کی تیزی کے ساتھ ان کے کمرے سے نکل گئی، آتے ہوئے اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے مگر جاتے ہوئے نام کو لغزش نہ تھی۔

خان بہادر کے کمرے میں اب بالکل سناٹا تھا، لیکن جیسے کوئی سرگوشی کے انداز میں بڑبڑا رہا تھا نہ جانے کون۔ میں نے بہت دکھ جھیلے ہیں، مدتوں ایک وقت کھایا ہے، برسوں مانگے تانگے کپڑے پہنتا رہا ہوں، باپ نے گھر سے نکال دیا تھا مگر میں نے ہمت نہیں ہاری، اور آج میں خان بہادر بنا بیٹھا ہوں، اُف یورپ کی وہ سرد

رات جب میری ہوسٹ نے کرایہ ادا نہ ہونے کی وجہ سے مجھے گھر سے نکال دیا تھا کیا میں ان تکلیفوں کو بھول سکتا ہوں؟ کیا میں ان تمام کاوشوں تکلیفوں سے حاصل کی ہوئی عزّت اور نام کو اتنی آسانی سے خاک میں ملا دوں گا - میں نے پورے تیس برس اپنی آنکھیں پھوڑی ہیں، میں تیس برس تک روزانہ کئی کئی میل پیدل اور بسوں پر سفر کر کے دفتر پہنچتا رہا ہوں بڑے افسروں کی خوشامدیں کی ہیں، ڈالیاں نذر کی ہیں - دعوتیں کھلائی ہیں، اپنے دوستوں اور عزیزوں سے طوطا چشمی کی ہے انہیں قصداً بھول بھول گیا ہوں، اس لیے کہ بڑے افسر میرے ملمع کو نہ تاڑ جائیں اور یہ اولاد .... اولاد تو مجھے خاک میں ملا دے گی -

نکہت خاں بہادر کے کمرے سے نکل کر سیدھی اپنے کمرے میں گئی، اس کے چہرے سے یاس کے عوض ایک عزم ٹپک رہا تھا، اس نے ایک نظر کمرے کا جائزہ لیا اور ایک چھوٹے سے اٹیچی میں تلے اوپر اپنی ضروری چیزیں بھرنا شروع کر دیں - اس کام سے فراغت پا کر پلنگ پر دراز ہو گئی، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، روتی رہی، دھوپ ڈھل چکی تھی مگر جلا دینے کے آثار اب بھی باقی تھے - نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی، جب وہ بیدار ہوئی تو سائے ڈھل چکے تھے اور تاریکی نے اپنی زلفیں کھول دی تھیں، اچانک اس کی نظر دریچے پر پڑ گئی، مگر وہ تو مدّت سے خالی تھا اور ٹکرا کر واپس آ گئی، اب وہ کھلی چھت پر ٹہل رہی تھی، خالی خالی جیسے اس کی زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں، یا جیسے اس کی زندگی میں کچھ نہیں، یک بارگی وہ زینے کے پاس جا کر ٹھہر گئی اور بیٹھ کر کوڑ کباڑ کو کریدنے لگی - پھٹے گیند، دبی مڑی ٹین کی سیٹیاں، سلیٹ کے ٹوٹے ٹکڑے، جوتوں کے نکلے ہوئے دل، چھوٹی سی ناکارہ جھاڑو، صرف تین دانت والا کالا کنگھا اور تین درجن خط، جس میں سے اب صرف چند باقی بچے تھے - وہ اپنے کمرے میں چلی آئی، اور بتّی روشن کر کے پڑھنے لگی، پیاری نکہت، یہ میرا پہلا خط ہے، میں تم سے محبّت کرتا ہوں لیکن تم مجھ کو کبھی بھولے سے بھی ایک نظر دیکھنا گوارا نہیں کرتیں، بیچ کے دس خط دیمک یا کوئی اور کیڑے کھا گئے تھے، ایک اور خط میں لکھا تھا، پیاری نکہت، تم کو ذرا رحم نہیں آتا کہ میں تمام تمام رات دریچے میں کھڑا تمہارا انتظار کیا کرتا ہوں اور تم میٹھی نیند سویا کرتی ہو، میں اتنا برا تو نہیں کہ مجھے اتنی سزا دی جائے - پھر ایک اور خط جس کا اوپر کا حصّہ غائب تھا لکھا تھا، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تم سے ملوں گا، اور تم کو اپنی محبّت کا یقین دلاؤں گا، اگر تم نے پھر بھی میرے جذبات کی پروا نہیں کی تو .... تم کو یہ بھی جان لینا چاہئے کہ ناکام آدمی بہت خطرناک ہو جاتا ہے، زیادہ تو اپنے لیے لیکن اکثر اپنے محبوب کے لئے بھی، یہ دھمکی نہیں، حقیقت ہے، میں تم کو اپنے دل کی ملکہ بنا کر رکھوں گا، تمام زندگی تمہارے پیر دھو کر پیوں گا، تم ہی میری زندگی بدل سکتی ہو، تم ہی میرے نقائص دُور کر سکتی ہو، میرے دل میں ایک آگ روشن ہے بھڑک رہی ہے، جسے تم اور صرف تم بجھا سکتی ہو، کہیں یہ نہ ہو کہ میرے دل کی آگ تم کو جلا دے، تم کو بھسم کر ڈالے، اس تصوّر سے میرا دل ڈرتا ہے اس خیال سے میرے رونگٹے جھنجھنا جاتے ہیں، میں تم سے جلد ملوں گا، کہاں اور کیسے ؟ بتانا مشکل ہے، لیکن میری پہلی ملاقات فیصلہ کن ہو گی، برباد ہو جاؤں گا یا برباد کر ڈالوں گا، نفرت سے نہیں، دونوں حالتوں میں میری محبّت ہی کارفرما ہو گی، بہرحال میں تم سے جلد ملوں گا مجھے شبہ ہے کہ تم میرے خط بھی نہیں پڑھتی ہو، اس لئے کہ میرا ایک خط مدّت سے ایک ہی جگہ ایک ہی انداز میں پڑا ہوا ہے جس کو کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا لیکن مجھے یقین ہے کہ کسی نہ کسی دن تم ضرور میرے خط پڑھو گی میری محبّت پر ایمان لاؤ گی اس وقت تم کو میری کمی محسوس ہو گی، اس وقت تم کو افسوس ہو گا اور تم مجھے تلاش کرو گی - مجھے یقین ہے کہ میری سچّی محبت ایک نہ ایک دن تم کو میرے پاس کھینچ لائے گی -

" چار دن بعد میں یہ مکان خالی کر دوں گا، کیوں کہ اس کے کرایہ دار واپس آ رہے ہیں، میں اپنے پرانے مکان میں جو ۷ ابیٹن روڈ پر ہے واپس جا رہا ہوں، افسوس کہ اب تم کو ایک نظر دیکھنا بھی دشوار ہو گا، اس یقین کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ کسی نہ دن تم کو میری محبّت کا یقین آئے گا اور تم ضرور مجھ کو تلاش کرو گی " -

نکہت کی سانس پھول رہی تھی، اس کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ عجیب عجیب غریب زاویے بنا رہا تھا لیکن بار بار ہونٹوں پر پسینے کے قطرے چمکنے لگتے کبھی ہونٹ لٹک جاتے، اور ان میں خفیف سا ارتعاش محسوس کبھی وہ انگلیوں کو مروڑ مروڑ کر چٹخانے لگتی، ایک بار دل میں اس نے کچھ دہرایا، اس کے دماغ اور دل کے درمیان ایک جنگ جاری تھی، اس کے کانوں میں مختلف مکالمات گونجے، اس کا دل مختلف تالوں میں دھڑکا، کبھی رُک رُک کر کبھی تیز تیز، اس کے دماغ میں خیالات کی دوڑ اس کے بس سے باہر ہو گئی، لیکن وہ کوئی آخری فیصلہ نہ کر سکی، اب شام سہاگن بن چکی تھی اور اس کی پیشانی پر تاروں کی افشاں دمکنے لگی تھی، آسمان کے رُخ پر تارے بڑھنے

گئے اور نکہت کے چہرے پر اسی رفتار سے پسینے کے قطرے چھلک چھلک کر فنا ہوتے رہے۔ وہ کھڑی ہو گئی اور صحن میں کھلنے والی کھڑکی سے نیچے دیکھنے لگی بیگم صاحبہ نماز ختم کر کے پھر نہ جانے کیا دعا مانگ رہی تھیں۔ نکہت کے لبوں پر زہر میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ آئی، بے چاری کو کیا معلوم کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا اور یہ سوچ کر وہ رو پڑی، ممتا کی ماری خان بہادر کے حکم کے بغیر اپنی اولاد کو بھی سینہ سے نہیں لگا سکتی، ان کے آنسو بھی نہیں پونچھ سکتی، اس نے آہستہ سے کھڑکی بند کر دی اور اٹیچی اٹھا کر زینے سے دھیرے دھیرے اُترنے لگی، اتنی آہستہ کہ سیڑھی پر بیٹھی ہوئی بلی کو اس کی آمد کی خبر نہ ہوئی اور وہ کسی کو اتنا قریب دیکھ کر ڈر گئی اور اچھل کر سیدھی صحن میں پانی سے بھری ہوئی بالٹی میں غوطہ کھا گئی، ایک لمحے کے لئے سکوت ٹوٹا اور پھر وہی سناٹا، اس وقت نکہت زینے کی دیوار سے چمٹ گئی، اس کے آنسو بہے چلے جا رہے تھے، لیکن چند منٹ بعد وہ تازہ دم تھی، اب وہ تاریک کونوں میں چھپتی چھپاتی باہر نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سٹر سٹر کی آواز سُن کر وہ دبک گئی، بیگم صاحبہ اوپر اس کے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھیں، اور موقع کو غنیمت جان کر وہ باہر نکل گئی، گھر کے کسی فرد کو خبر بھی نہیں ہو سکی، لیکن جیسے ہی اس نے سڑک پر پہلا قدم رکھا کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "کہاں چلیں"؟ اس کے ہاتھ سے اٹیچی چھوٹ کر زمین پر آ رہا، یہ حشمت تھی جس کی گود میں نکہت کا بچہ میٹھی نیند سو رہا تھا، نکہت میں بولنے کی طاقت نہ تھی پھر بھی بمشکل اس نے اتنا کہا، ابا میاں کو عزّت پیاری ہے اولاد نہیں"۔ "پگلی" حشمت نے اپنی گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے کہا، اور بچّہ نکہت کی گود میں تھما کر سیدھی بیگم صاحبہ کے پاس دوڑی، اپنے خیال میں اس نے نکہت کو گرفتار کر لیا تھا۔ اور جب سہمی ہوئی بیگم صاحبہ اور حشمت ڈیوڑھی میں پہنچیں تو نکہت کا کہیں پتہ نہ تھا،

چند منٹ بعد شبّو دوڑتا ہوا آیا وہ بازار برف لینے گیا تھا، اس نے بتایا کہ چھوٹی بی بی کو اس نے ابھی بیٹن روڈ پر، انمبر کے مکان میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔

ذکر و فکر

غزل ——— نشتر خیر آبادی

نغماتِ محبت' دل کے شکستہ ساز پہ گانے آیا ہوں
یعنی کہ میں تجھ کو تیرا ہی افسانہ سنانے آیا ہوں

ناقوس حرم میں' مندر میں تکبیر سنانے آیا ہوں
بتخانے کو کعبہ' کعبے کو بتخانہ بنانے آیا ہوں

او طور پہ اِترانے والے عاشق ہوں مجھے موسیٰ نہ سمجھ
آ سامنے' تیرے جلووں سے' میں آنکھ ملانے آیا ہوں

محرابِ عبادت میں زاہد جن کو بحفاظت رکھتا ہے
سجدوں کی وہ دولت' میں تیرے قدموں پہ لٹانے آیا ہوں

کچھ کھوٹ اگر مجھ میں نشتر ہے ابھی تو یہاں چھٹ جائیگی
ایمان کو اس میخانے کی بھٹی پہ تپانے آیا ہوں

مشیت کا تبسم ——— محشر مرزاپوری

زندگی میری مشیت کا تبسم تو نہیں — سوزِ غم سازِ محبت کا ترنم تو نہیں
آرزوؤں کی یہ دنیائے حسین و رنگیں — خواب ہی خواب تو ہم ہی توہم تو نہیں
مجھ کو اتنا تو بتا دے نہ پتہ دے اپنا — جستجو میں تری خود میں ہی کہیں گم تو نہیں
یہ بتا دے نگہہ مست کا صدقہ ساقی — کیف مستی مرا پابندِ مے و خم تو نہیں
اے تمناؤں کے خالق خلشِ غم کے خدا — عشق ہی حسن کا معصوم تبسم تو نہیں

کیوں ہے محشر کا یہ اندازِ تغزل دلکش
آپ کا کشتۂ اعجازِ تکلم تو نہیں

غزل ——— جوہر صدیقی

نہ رہا سکوتِ سحر کبھی نہ فغانِ نیم شبی رہی
مگر اب بھی بزمِ حیات میں اسی کیف غم کی کمی رہی

یہ جمال و شوق کی داستاں اسی کشمکش میں پڑی رہی
انہیں عذر کم نگہی رہا مجھے فکر پردہ دری رہی

جو اٹھی بھی چشم مغاں تو یوں کہ بلاکشانِ ازل کو بھی
نہ تو تابِ دست کشی رہی نہ مجالِ بادہ کشی رہی

کوئی اب نگاہ اٹھائے کیا کوئی اب جمال دکھائے کیا
نہ مذاقِ جلوہ گری رہا نہ متاعِ دل شکنی رہی

مرا شکریہ کہ مرے فیض سے ترا آستانہ سنور گیا
یہ غرور کیا کہ مری جبیں ترے آستاں پہ جھکی رہی

ہے یہ جوہر آج گلوں کو غم کہ بہ زیرِ دامن باغباں
کوئی آگ تھی جو لگی رہی کوئی شمع تھی کہ جلی رہی

غزل ——— دیپک فیروزپوری

زمانے بھر میں رسوائی کا ساماں ہوتا جاتا ہے
ترا غم میرے چہرے سے نمایاں ہوتا جاتا ہے

یہ کیسا انقلابِ بزمِ دوراں ہوتا جاتا ہے
جدھر دیکھو ادھر مرنے کا ساماں ہوتا جاتا ہے

بہارِ ناز کی رنگینیاں کم ہوتی جاتی ہیں
تغیر آشنا حسنِ گلستاں ہوتا جاتا ہے

سکوں کے جس قدر ساماں مہیا ہوتے جاتے ہیں
مزاجِ دہر اتنا ہی پریشاں ہوتا جاتا ہے

جلاتا جا رہا ہوں لاکھ دیپک آرزوؤں کے
مگر کمبخت دل ظلمت بداماں ہوتا جاتا ہے

فکر و عمل ——— محمد عبدالحفیظ

سوئے ہوئے انساں کو جگا سکتے ہو — بام و درِ رفعت کو سجا سکتے ہو
اے اہلِ جنوں ہوش میں آجاؤ اگر — بگڑی کو زمانے کی بنا سکتے ہو

ہر خواب کی تعبیر بدل سکتی ہے — ہر آہ کی تاثیر بدل سکتی ہے
کیوں بیٹھا ہے اٹھ نام خدا کا لے کر — تدبیر سے تقدیر بدل سکتی ہے

دشوار منازل سے گزرنا ہوگا — خوں سینکڑوں ارمانوں کا کرنا ہوگا
ہے راہِ محبت کی یہ شرطِ اوّل — جینے کی طلب ہوگی تو مرنا ہوگا

بدلے ہوئے حالات نے بدلا تو سماج — لیکن ابھی ملتا نہیں دنیا کا مزاج
اس دورِ ترقی کی ہے معراج نئی — انسان کا انسان ہی دشمن ہے آج

کلکتے کی قومی لائبریری

پچھلے دنوں کلکتے میں قومی لائبریری کی گولڈن جوبلی منائی گئی ہے۔ یہ بھارت کی سب سے بڑی لائبریری ہے اور اس میں ساڑھے سات لاکھ سے زیادہ کتابیں اور دستاویزات موجود ہیں۔ بھارت کے وزیر تعلیم مولانا ابو الکلام آزاد بھی گولڈن جوبلی کی تقریب میں شامل ہوئے۔ اس لائبریری کی بنیاد ایک سو سال پیشتر رکھی گئی تھی۔ پچھلے ۵۰ سال سے یہ ایک سرکاری ادارے کی صورت میں کام کر رہی ہے۔

۳۱ اگست ۱۸۳۵ء کو کلکتے کے ٹاؤن ہال میں کچھ سرکردہ اصحاب نے کلکتہ پبلک لائبریری قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۸ مارچ ۱۸۳۶ء کو یہ لائبریری ۳۱۲ اسپلینڈے روڈ پر ڈاکٹر گرانٹ کے مکان میں کھولی گئی اور اس زمانے کے مشہور بنگالی ناول نویس پیارے چند مترا کو اس کا پہلا لائبریرین مقرر کیا گیا۔ تھوڑی مدت کے بعد یہ لائبریری مٹکاف ہال میں تبدیل کر دی گئی۔ گذشتہ صدی کے آخری دور میں یہ محسوس کیا گیا کہ محض نجی کوششوں سے اس لائبریری کو خوش اسلوبی سے چلانا مشکل ہے۔ چنانچہ لارڈ کرزن کے زمانے میں اسے قومی ادارے کی شکل دی گئی۔ اور ۳۰ جنوری ۱۹۰۳ء کو اس کا نام تبدیل کر کے امپیریل لائبریری رکھ دیا گیا۔ نئی لائبریری کے قواعد میں کچھ تبدیلیاں کی گئیں اور مسٹر میکفارلین نامی ایک انگریز کو اس کا پہلا لائبریرین مقرر کیا گیا۔ وائسرائے نے لائبریری کے منتظمین کو ملک بھر میں شائع شدہ تمام سرکاری کتابیں حاصل کرنے کا اختیار دے دیا۔ چنانچہ اس لائبریری میں اس وقت بھارت کی تاریخ میں انگریزوں کے زمانے کے بارے میں مستند کتابیں کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں یہ لائبریری اسپلینڈے ایسٹ کی ایک عمارت میں تبدیل کر دی گئی۔ یہ جگہ مقابلتاً زیادہ وسیع اور پرسکون تھی۔ لیکن دوسری عالمگیر جنگ کے دوران میں اس لائبریری کو پھر اسپلینڈے کی پرانی عمارت میں تبدیل کرنا پڑا۔

اس ادارے کی تاریخ کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ اس کا نام امپیریل لائبریری کے عوض قومی لائبریری رکھا گیا ہے۔

قومی لائبریری کے ریڈنگ روم سارا سال صبح سات بجے سے لے کر رات کے دس بجے تک کھلے رہتے ہیں۔ ریسرچ اسکالروں کے مطالعے کے لئے علیحدہ جگہ کا انتظام کیا گیا ہے۔ شہر کے مرکزی حصے کے باشندوں کی سہولت کے پیش نظر اسپلینڈے کی پرانی عمارت میں بھی ریڈنگ روم بند نہیں کیا گیا۔ لائبریری کی نئی عمارت تک پہنچنے کے لئے ریاستی سرکار نے بسوں کی آمد و رفت کے خاص انتظامات کر دئے ہیں۔ بجٹ میں اس لائبریری کے لئے مخصوص شدہ رقوم میں بتدریج اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۵۱-۵۲ء میں حکومت نے اس سلسلے میں ۲۷۸۱۱۰ روپے صرف کئے جبکہ ۱۹۴۵-۴۶ء میں صرف شدہ رقم صرف ایک لاکھ ۳۸ ہزار روپے تھی۔ مختلف ریاستوں سے بھارتی زبانوں میں شائع شدہ کتابیں حاصل کرنے کے لئے خاص گرانٹ دی گئی ہے۔ حکومت لائبریری کے منتظموں کو اس امر کا اختیار دینے پر غور کر رہی ہے کہ وہ ملک میں شائع شدہ ہر کتاب کی نقل حاصل کر سکیں۔ مزید تربیت یافتہ عملے کا تقرر عمل میں لایا گیا ہے تاکہ یہ لائبریری بہتر طریقے سے لوگوں کی خدمت انجام دے سکے۔ لائبریری کی عمارت میں ہی جلد سازی کے ایک علیحدہ سیکشن کے قیام کا سوال بھی زیر غور ہے۔

تحفے کی صورت میں موصول شدہ کتابوں سے بھی لائبریری میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ مرحوم سر آستوش مکرجی کے وارثوں نے لائبریری کے لئے اسی ہزار کتابوں کا گرانقدر تحفہ پیش کیا۔ اس طرح بہرام پور کے مرحوم ڈاکٹر رماداس سین کی جمع شدہ بنگالی اور سنسکرت کی ۵۰۰۳ کتابیں لائبریری میں بطور تحفہ پیش کی گئیں۔ حیدرآباد میں ریذیڈنسی لائبریری نے ۴ ہزار کتابیں بطور تحفہ پیش کیں۔ حصول آزادی کے بعد ۵ سال کی مدت میں قومی لائبریری میں کتابوں کی تعداد میں ڈیڑھ لاکھ کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ ۵۰ سال پیشتر جب کلکتہ پبلک لائبریری کو سرکاری ادارے کی شکل دی گئی تو اس میں صرف ایک لاکھ کتابیں موجود تھیں۔ اس وقت لائبریری میں تقریباً دو ہزار دستاویزات موجود ہیں۔ لوگوں کے مطالعے کے لئے تقریباً ۵ سو اخبارات اور میگزین لائبریری میں موجود رہتے ہیں۔ مرکزی اور ریاستی سرکاروں کے زیر اہتمام شائع شدہ کتابوں کے علاوہ اتحادی سبھا کے تعلیمی، سماجی و تہذیبی ادارہ (یونیسکو) کی طرف سے شائع شدہ کتابیں بھی لائبریری میں موجود ہیں۔ پرامن و پرکشش ماحول میں اس گراں قدر علمی ذخیرے سے ہر سال تقریباً ۴۷ ہزار اشخاص مستفید ہوتے ہیں اور یہ امر قومی لائبریری سے وابستہ توقعات کے پورا ہونے کا واضح ثبوت ہے۔

قدیم تاریخی دستاویزات کا تحفّظ

بھارت میں تاریخی دستاویزات کے تحفّظ سے متعلقہ شعبے کی رفتارِ ترقی کا جائزہ لینے کے لئے ۱۰ فروری کو بھوپال میں انڈین ہسٹاریکل ریکارڈ کمیشن کا انتیسواں اجلاس منعقد ہُوا۔ فرسودہ تاریخی دستاویزات کی مرمّت و تجدید کے اہم ترین فرائض میں شامل ہے۔ ہر ماہ متعدد فرسودہ قدیمی دستاویزات حاصل کی جاتی ہیں۔ ان میں سے کئی دستاویزات کھجور کے پتوں پر تحریر شدہ ہوتی ہیں اور بعض نہایت ہی گھٹیا قسم کے کاغذ پر۔ انھیں پھر سے قابلِ استعمال بنانے کے طریق کار میں اس امر کا پورا پورا خیال رکھا جاتا ہے کہ ان کی تحریر کا کوئی حرف مٹنے نہ پائے۔

ان دستاویزات کو سب سے پہلے ہوا کی تیز دھار سے گرد اور دوسری سطحی گندگی سے پاک کیا جاتا ہے۔ بعدازاں ایک اور کمرے میں ایتھیلین آکسائڈ اور کاربن ڈائی آکسائڈ کی مرکب گیس سے ان پر جمع شدہ جراثیم ہلاک کئے جاتے ہیں۔ اس طرح ان دستاویزات کو کسی قسم کے کیڑے سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں رہتا۔ پانی کے اجزا کی کمی کی وجہ سے جو کاغذات کرکرے ہو گئے ہوتے ہیں اُن میں ٹھنڈی بھاپ کے ذریعے سے رطوبت پیدا کی جاتی ہے۔ یہ عمل ہوا بستہ کمروں میں کیا جاتا ہے۔ جن دستاویزات کی حالت ناقابلِ استعمال حد تک خستہ ہو اُن کی نئی نقول تیار کی جاتی ہیں۔ اس کا عمل یہ ہے کہ کسی دستاویز کے جس حصّے کی نقل مقصود ہوتی ہے اسے سیلولوز ایسیٹیٹ کی پلیٹوں کے درمیان رکھ کر ان پر آبی سکنجے کے ذریعے سے دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ اس طرح سے متعلقہ دستاویز ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتی ہے۔

مختلف اقسام کے کاغذ کی مضبوطی کے تجربے کرنے کے لئے تاریخی دستاویزات کے تحفّظ سے متعلقہ شعبے کے زیرِ اہتمام ایک لیبارٹری قائم کی گئی ہے۔ اس لیبارٹری میں بھی پرانی دستاویزات کے سلسلے میں کیمیائی تجربے بھی کئے جاتے ہیں۔ کھجور کے پتوں پر تحریر شدہ دستاویزات کی مرمّت و تحفّظ کے سلسلے میں تحقیقی کام ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

زیرِ نظر سال کے دوران میں مختلف ذرائع سے بھارت سے متعلقہ قدیمی دستاویزات کی مائیکروفلم کے ذریعے سے اُتاری ہوئی نقول حاصل کی گئی ہیں۔ ہیگ سے ڈیڑھ لاکھ صفحات پر مشتمل دستاویزات حاصل کی گئیں۔ جو ۱۶۷۴ سے ۱۶۹۴ تک ولندیزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرگرمیوں سے متعلق ہیں۔ مانچسٹر کی جان رائلینڈز لائبریری سے ۳۲ ہزار صفحات پر مشتمل دستاویزات کی نقول حاصل کی گئی ہیں۔ ان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کنٹرول بورڈ کے پہلے صدر ہنری ڈنڈس کے خطوط بھی شامل ہیں۔ ویلز کی نیشنل لائبریری سے تین ہزار صفحات کی دستاویزات حاصل کی گئی ہیں، جن میں بھی ان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندے سر جان میلکم اور سر ولیم جونز کے خطوط شامل ہیں۔
اسی طرح پیرس سے فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی اور ڈوپلے کی خط و کتابت، محاصرۂ مدراس اور فرانسیسی کمپنی کی تجارت کے بارے میں تاریخی دستاویزات کی نقول حاصل کی گئی ہیں۔

گذشتہ کچھ مدّت سے شعبۂ تحفّظ دستاویزات ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کی خط و کتابت کی اشاعت میں مصروف ہے۔ یہ خط و کتابت ۱۷۴۸ء سے ۱۸۰۰ء تک کے زمانے سے متعلق ہے اور ۲۱ جلدوں میں شائع کی جائے گی۔ ہر جلد کے چھ سو صفحات ہوں گے۔ ان میں بہت سی جلدیں ۱۹۵۳ء کے اختتام سے بیشتر مکمل ہو جائیں گی۔ اس خط و کتابت کو بڑی تاریخی اہمیت حاصل ہے اور یہ اس زمانے کی سیاسی، معاشی، سماجی اور مذہبی زندگی پر روشنی ڈالتی ہے۔ تحقیقی کام میں مصروف طلباء کو تمام قدیمی دستاویزات کا مطالعہ کرنے کی سہولتیں حاصل ہیں۔ طلبا اور ادارے قیمت کے ادا کرنے پر ان دستاویزات کی فوٹوگرافی کے ذریعے سے اُتاری ہوئی نقول بھی حاصل کر سکتے ہیں۔
مذکورہ شعبہ کے زیرِ اہتمام قدیم دستاویزات کے تحفّظ سے متعلقہ تربیت کے ایک سالہ نصاب کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ اس نصاب کا آغاز یکم جولائی سے ہوتا ہے اور اس کی تربیت حاصل کرنے کے لئے گریجوئیٹ ہونا لازمی ہے۔ بھارت سرکار نے نصاب کے آغاز سے ایک ماہ بعد امتحان میں اوّل و دوئم رہنے والے طلباء کے لئے سوا سو روپیہ ماہانہ کے دو وظیفے منظور کئے ہیں۔ علاوہ ازیں مرکز اور ریاستوں کے مختلف وزارتوں کے منتخب کردہ ان اشخاص کے لئے تین ماہ کی تربیت کے ایک علیحدہ نصاب کا انتظام کیا گیا ہے جو پہلے ہی قدیمی دستاویزات کے تحفّظ سے متعلقہ کام میں مصروف ہیں۔

ع۔م

نئی کتابیں اور رسالے

نشاطِ غم مصنفہ بسمل سعیدی۔ ناشر منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز ۱۰ دریا گنج دہلی۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ، کتابت، طباعت عمدہ۔ جلد و جلد پوش گوارا۔ قیمت چار روپے۔

بسمل سعیدی صاحب کا کلام اکثر 'آج کل' میں شائع ہوتا رہا ہے۔ 'نشاطِ غم' آپ ہی کے کلام کا مجموعہ ہے جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ کتاب کے نام سے ظاہر ہے کہ بسمل صاحب غم پالنے والے انسانوں میں سے ہوں گے۔ فانی زندگی کے قنوطی پہلو کو اپنی غزلوں کا موضوع بنا کر ایک لذت محسوس کرتے ہوں گے بسمل غم کی نشاط آفرینی کے قائل ہیں۔ ان کی غزلوں میں آپ کو زیادہ تر ایسی باتیں ملیں گی جو ایک آہیں بھرنے اور تڑپنے والے عاشق کا طرۂ امتیاز ہوتی ہیں۔ آپ کے یہاں تغزل کی بہت اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ شعر کے لئے نئے نئے گوشے آپ تلاش کرتے ہیں۔ چنانچہ سارے مجموعے میں سپاٹ شعر بہت کم ملیں گے۔ کوئی نہ کوئی نکتہ ہر شعر میں موجود ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں۔

اُن کے فریبِ لطف کے دن بھی گزر گئے اب مطمئن ہیں اپنے غمِ معتبر سے ہم

بسمل صاحب کی غم سے لذت اندوزی "نشاطِ غم" کی تخلیق کا باعث ہوتی ہے۔ دیکھئے حوادث انھیں "غمِ غم کی تخلیق پر کب مجبور کریں۔ غمِ معتبر سے وہ لاکھ مطمئن نظر آئیں لیکن قرائن اور واقعات کچھ اور کہہ رہے ہیں۔ نشاطِ غم اچھے اشعار کا ایک حسین گلدستہ ہے۔ انتخاب کی ضرورت ہی نہیں۔ اس پر بھی چند اچھے اشعار ملاحظہ فرمائیے

جان اُس بے تعلقی پر بھی بر بنائے تعلقات گئی

دو دن میں ہو گیا ہے یہ عالم کہ جس طرح تیرے ہی اختیار میں ہوں عمر بھر سے ہم

جگر مرادآبادی نے 'گوشِ مشتاق' کے طفیل وہ نغمہ بھی سُن دیا جو ساز سے ابھی باہر نہیں نکلا ؎

جگر گوشِ مشتاق کی کیا بات ہے اللہ اللہ

سن رہا ہوں میں وہ نغمہ جو ابھی ساز میں ہے

بسمل صاحب 'مطربِ خوش نوا کی نگاہ' کے اثر سے یہی فیض پا رہے ہیں۔

یہ نگاہِ مطربِ خوش نوا کا اثر ہے بسملِ بے نوا

کہ میں سن رہا ہوں وہ نغمے بھی جو ابھی ہیں پردۂ ساز میں

بسمل صاحب کا شعر جگر کے شعر تک تو نہیں پہنچ سکا لیکن اس میں ایک محاکاتی بلکہ واقعاتی کیفیت اور "کرتے کی بدیا" کی ایک تجرباتی تصویر موجود ہے۔ کیا کیا کیفیات بسمل صاحب پر گزرتی ہیں ذرا ملاحظہ فرمائیے

جب وہ ہوتے ہیں تو ہر شے جیسے ہو جاتی ہے گم

وہ نہیں ہوتے تو ہر شے میں انھیں پاتا ہوں میں

وہ کیوں ہونے لگے لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے

کہ جیسے وہ بھی شامل ہیں مرے حالِ پریشاں میں

مری نظر کو نہ تھی تاب اُن کے جلووں کی

اب اُن کے جلووں کو میری نظر کی تاب نہیں

جب محبت اور وفا کی اتنی ارزانی نہ تھی ان دنوں میں تو یہ دُنیا اس قدر فانی نہ تھی

اللہ رے حسنِ یار یہ تیری سیاستیں اُس سے وہی ادا ہے جسے جو پسند ہے

میں یاد دلاتا ہوں اگر بھول گئے ہو اک رنج مرے دل سے بھلایا تھا تمھیں نے

اب تک تو خیر آئے اور آکر چلے گئے اب اُن کے تعلقات بڑھا کر چلے گئے

اُن کا شباب دیکھ کے ہوتا ہے یہ خیال دُنیا میں اب شباب کسی پر نہ آئے گا

"نشاطِ غم" کی غزلوں کا حصّہ ہی دراصل بسمل صاحب کی شاعری کا صحیح نمونہ ہے۔ غزلوں کے بعد نظمیں، رباعیات اور قطعات بھی ہیں۔ ان میں ایک مشاق شاعر کی پُرکاری تو نظر آئے گی لیکن وہ 'غم مزاجی' جو اُن کی غزلوں کی جان ہے کم ملے گی۔ بسمل صاحب نے ایک ہی کیفیت کو نہ جانے کتنی بار کہا ہے مگر تکرار کا شائبہ تک نہیں نظر آتا خود ان کے قول کے مطابق

ہر بار نئے شوق سے ہے عرضِ تمنّا

سو بار بھی ہم کہہ کے مکرّر نہیں کہتے

بسمل صاحب" اصل شہود و شاہد و مشہود" یا "ہم کوزہ و ہم کوزہ گر و ہم گلِ کوزہ" کی بھول بھلیاں میں نہیں پڑتے۔ ان کے مجاز پر تصوف کا اطلاق کرنا خود ان سے بے انصافی کرنا ہے۔ جب تک اُردو شاعری اور غزل کی محبوب صنف باقی ہے ان کا کلام بھی باقی رہے گا۔

بہار کے نوچراغ

مرتب سید محمد حسنین۔ بھونز پوکھر پٹنہ ۴
ضخامت ۱۷۶ صفحات، تقطیع ۲۰ × ۳۰/۱۶۔

کتابت و طباعت اوسط۔ قیمت عہ۱۲/۔

بہار کے سات افسانہ نگاروں کے خاکے اور ان کے نمائندہ افسانوں کا یہ مجموعہ صوبۂ بہار کے ذہین ادیبوں کی ایک اچھی تصویر ہے۔ پیش لفظ میں رشید احمد صدیقی نے حسنین صاحب کی خاکہ نگاری کو ان الفاظ میں سراہا ہے:۔

"تعارف کا انداز دوستانہ اور بے تکلفانہ ہے۔ ایسی بے تکلفی جو تکلف سے خالی نہیں۔ . . . . حسنین صاحب کے یہ ادبی خاکے بڑے دلچسپ ہیں۔ جزئیات پر ان کی نظر خوب پڑتی ہے اور کل کی تعمیر میں ان سے کام بھی لیتے ہیں۔ تحریر شاعرانہ بھی ہے اور شاطرانہ بھی . . . . . ."

'گذارش' میں حسنین صاحب کی شاعرانہ اور شاطرانہ تحریر دیکھئے

"جنک پور کی کمان الفت، بودھ گیا کا شجر الوہیت، نالندہ کا دار العلوم، پاٹلی پتر کا ایوان چوب، شاہ مخدوم کی سجدہ گاہ . . . . صنادید لنڈن کے شوقِ مذاق کو غیرت نہ دلا سکے۔ ایک پھٹنفر دو کاج۔ دہلی کا سستا کبابی جامع مسجد کی سیڑھیوں پہ محض کباب بنا کر حیاتِ جاوید پالے اور اُجڑی نگری کے یہ جسدِ فانی نمائش گھر کی مومیائی بھی نہ بن پائیں"

چنانچہ حسنین صاحب نے اسی تاثر کے تحت بہار کے قلم کاروں کو دنیائے ادب کے سامنے پیش کیا ہے۔

خاکوں میں مبالغے کے الزام سے بچنے کے لئے خود ان کی تخلیقات بھی پیش کی ہیں۔ افسانوں اور افسانہ نگاروں کے خاکوں کا یہ مجموعہ ایک اچھی ادبی اُپج ہے محمد مسلم، مانیہوری، محسن، اختر، سہیل، شکیلہ اختر، ج م اسلم ہمارے جانے پہچانے ادیب ہیں حسنین صاحب انھیں ہم سے اور قریب لے آئے ہیں۔

نگینے

دیوانِ غزلیات ابر احسنی گنوری۔ ناشر مکتبۂ احسن رام پور
ضخامت ۲۰۸ صفحات، تقطیع ۲۰ × ۳۰/۱۶، کتابت، طباعت اوسط

قیمت تین روپے، کتاب مجلد ہے۔

ابر صاحب جناب احسن مارہروی کے نامور اور عقیدت مند شاگردوں میں ہیں۔ اب تو آپ بجائے خود اُستاد ہیں ابر صاحب جتنے اچھے اور مخلص انسان ہیں اتنے ہی اچھے شاعر بھی ہیں۔ لطفِ زبان، لطفِ بیان آپ کے کلام کے جوہر ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو

آج تک تو کوئی افسانۂ دل سن نہ سکا
آپ کو اس پہ ہے اصرار تو کہتا ہوں میں

اک دن تو آکے سامنے جلوے بکھیر دو
میں یاد کیا کروں گا ملی تھی نظر مجھے

کسی کا شعر کتنا اچھا ہے

کچھ اس ادا سے یار نے پوچھا مرا مزاج
کہنا پڑا کہ شکر ہے پروردگار کا

یہی مضمون ابر صاحب کے یہاں دیکھئے

آکے بالیں پہ مرا ظالم نے یوں پوچھا مزاج
خاطراً کہنا پڑا مجھ کو کہ ہاں آرام ہے

سارا شعر ایک لفظ "یوں" سے پیدا ہوا۔ محاکات کا یہ عالم کہیں کہ ملے گا۔

کیا چارہ گر میں سچ مچ دیوانہ ہو گیا ہوں
یا دل لگی سے دُنیا دیوانہ کہہ رہی ہے

دھجیاں دے کے نکلے ہیں نمائش کے لئے
پست کس درجہ مذاقِ اہلِ زنداں ہو گیا

شکوہ سنجانِ ستم سے ابر کوئی پوچھ لے
کیا کرو گے پھر اگر قاتل پشیماں ہو گیا

۱۹۵۱ء کے بہترین افسانے

مرتب گوپال متل۔ ناشر نیشنل اکاڈمی
۵۵۲ ہ ڈپٹی گنج صدر بازار دہلی۔

قیمت دو روپے چار آنے۔

راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، منٹو، ہنس راج رہبر، کرشن چندر، سدرشن، اشک، عزیز احمد، اے حمید، مرزا ادیب، یہ سب نام اس کی ضمانت ہیں کہ انتخاب نمائندہ حیثیت رکھتا ہے اس پر بھی گوپال متل نے عجز کا رسمی اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"انتخاب کے لئے اسلوب اور موضوع کے اعتبار سے لاکھ اصول مقرر کیجئے لیکن ذاتی پسند اور ناپسند کا سوال پھر باقی رہتا ہے اور یہیں آکر انتخاب کرنے والے کے دل کا معاملہ کھلتا ہے۔ شعروں کے انتخاب نے غالب کو رسوا کیا تھا ڈر ہے افسانوں کا انتخاب کہیں مجھے رسوا نہ کرے۔" ہم انھیں یقین دلاتے ہیں کہ کم سے کم یہ انتخاب ان کی رسوائی کا باعث نہیں ہو سکتا۔

کتاب حسین و جمیل چھپی ہے اور مجلد ہے۔ ضخامت ۱۶۸ صفحات، تقطیع ۲۰ × ۳۰/۱۶

آیاتِ شفا

مجموعۂ کلام جناب شفا گوالیاری۔ مصنف سے بیرونِ بدھوارہ بھوپال کے پتے پر یہ کتاب مل سکتی ہے۔ قیمت ۱۲ار۔

۶۴ صفحوں کا یہ مجموعہ شفا صاحب کی ۵۲ غزلوں پر مشتمل ہے۔ شفا صاحب حضرت سیماب مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ سیماب صاحب نے اپنے ہونہار اور قابل شاگرد کے باب میں لکھا ہے ؎

قوتِ ذہن و نظر در نسخۂ افکارِ او مرہمِ قلب و جگر اندر بیاضاتِ شفا

شفا صاحب خوش فکر شاعر ہیں۔ نظم و غزل، قطعات، نثر وغیرہ سب خوب لکھتے ہیں۔ اساتذۂ فن وحشت، صفی، محوی، نیاز، جوش ملسیانی نے آپ کے کلام کی داد دی ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیے۔

دلِ آزردۂ بربادیٔ رفتہ دھڑک اٹھا کوئی جگنو بھی جب میں نے قریبِ آشیاں دیکھا
شفا اب خود ہی کو رہنما اپنا بنائیں گے بہت بھٹکے ابھی تک ہم اسیرِ کارواں ہوکر

کیجیئے اور التفات ابھی غم نہیں شاملِ حیات ابھی

کیوں کر نہ خون روئے بہار اس کے حال پر جو آشیاں میں رہ کے بھی بے آشیاں رہے

نئی صبح

ضیا فتح آبادی صاحب کے کلام کا یہ مجموعہ ۷۰ صفحوں پر مشتمل ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔ مصنف سے براہ راست ریزرو بنک آف انڈیا مدراس کے پتے سے مل سکتی ہے۔

ضیا فتح آبادی ایک پڑھے لکھے نوجوان ہیں۔ حضرت سیماب مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ آپ کا کلام اردو کے رسائل و جرائد میں ایک مدت سے شائع ہو رہا ہے۔ اس سے قبل کلام کے ایک دو مجموعے بھی آب و تاب سے شائع ہو چکے ہیں۔ رسمی شاعری کے آپ اسیر نہیں طبیعت میں جدت اور اُپج ہے۔ دو رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

پھیلا کے ترے حضور باہیں یارب لیتا ہے مقدر کی پناہیں یارب
انسان ابھی تک ہے جہالت کا شکار دے اس کو بصیرت کی نگاہیں یارب

محرومِ سرورِ جام ہونا تھا تجھے اک ہستیٔ ناتمام ہونا تھا تجھے
فطرت بھی ستم ظریف ہے اے زاہد حوروں کا مگر غلام ہونا تھا تجھے

اس مجموعے میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ خوش گوئی کے اچھے نمونے ضیا کے کلام میں ملتے ہیں۔ ع اللہ کرے حسنِ سخن اور زیادہ

ہندستان اور پاکستان میں زبان کا مسئلہ

مصنف شکیل الرحمن ناشر مکتبۂ ترقی ادب گدڑی پٹنہ سیٹی۔ قیمت ۴ر ضخامت ۱۶ صفحے۔

امر کہانی

مصنف جناب بیتاب بریلوی، یہ منظوم رامائن ۲۵ صفحات پر مشتمل ایک مسدس ہے۔ حضرت بیتاب بڑے سلجھے ہوئے ادیب اور شاعر ہیں۔ ان کی یہ تصنیف اہلِ سخن سے داد لیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ "سیتا جی کی کھوج" کے عنوان سے دو بند ملاحظہ فرمائیے۔

گن گن کے تیری راہ میں تارے بچھاؤں گا نقشِ قدم پہ عرش کے تارے جھکاؤں گا
انگلی پہ شش جہات کو اُلٹا نچاؤں گا پھر اشتیاق دید کا سکہ بٹھاؤں گا

کہہ دے تو ہی پکار کے سیتا کدھر گئی
مانندِ جوئے آب چڑھی یا اُتر گئی

آنکھیں ہیں فرشِ راہ خمِ انتظار میں بجلی تڑپ رہی ہے کفِ لالہ زار میں
آئینۂ جمال ہے پنہاں غبار میں جی چاہتا ہے آگ لگا دوں بہار میں

سائے کی جستجو میں بھٹکا جا رہا ہوں
چٹکی میں آفتاب لیے آ رہا ہوں

قیمت فی جلد ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ۔ آکاشش بانی آفس۔ بہاری پور۔ بریلی

اصطلاحاتِ معاشیات

مصنف پروفیسر دلشاد کلانچوی۔ ناشر دانشکدہ بہاول پور۔ قیمت سوا روپیہ۔

یہ کتاب ایک ایسی لغت ہے جس میں معاشیات کی مروجہ اصطلاحات کی سادہ مختصر اور مکمل تعریفوں اور واضح اور غیر مبہم الفاظ میں ان کے باہمی فرق و امتیاز کو بیان کیا گیا ہے۔ کتابت و طباعت نہایت عمدہ ہے۔ ضخامت ۱۱۸ صفحات۔ تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ جلد اور جلد پوش عمدہ۔

رسالے

نگار۔ داغ نمبر

نگار لکھنؤ ہندوستان کے ادبی رسالوں میں ایک نہایت ممتاز رسالہ ہے اور ۳۲ سال سے اردو ادب کی خدمت کر رہا ہے۔ اگر کہا جائے کہ اپنی قسم کا واحد ادبی رسالہ ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کے سالنامے تو ایک خاص شہرت رکھتے ہیں۔ چنانچہ مومن، ریاض، حسرت پر اس کے خاص نمبروں نے ادبی دنیا میں ایک ممتاز جگہ حاصل کی تھی۔ داغ نمبر اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ داغ کی زندگی اور شاعری سے متعلق بڑے دل چسپ مضمون اس میں شائع ہوئے ہیں۔ آغاز میں مدیرِ رسالہ

جناب نیاز فتحپوری کا عالمانہ مضمون داغ کے فن پر ہے۔ اس کے بعد فائق رام پوری، ڈاکٹر اعجاز حسین، پروفیسر وقار عظیم کے مضامین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ قیمت دو روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ منیجر رسالہ نگار لکھنؤ

تہذیب یہ رسالہ عبدالقیوم انصاری صاحب اور سہیل عظیم آبادی کی ادارت میں پٹنے سے جاری ہوا۔ قیمت سالانہ چھ روپے مکتبۂ تہذیب پٹنہ کے پتے سے مل سکتا ہے۔ اتنا اچھا اور سلجھا ہوا رسالہ بہار کی سرزمین سے اس سے قبل نہیں نکلا ہوگا۔ سیاسیات حاضرہ پر دلچسپ نوٹ، ادب، معاشیات اور ثقافت پر بصیرت افروز مضامین اس رسالے کی افادیت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ اس دَور میں ایسے اچھے رسالے کا اجراء قیوم انصاری صاحب ایسے آزمودہ سیاست داں اور سہیل ایسے آزمودہ فن کار کے زیر ادارت، واقعی ایک فال ہے۔ امید ہے "تہذیب" ترقی کی منزلیں جلد طے کرے گا۔

خیال مکتبۂ خیال۔ ۲۸ نسبت روڈ لاہور سے یہ رسالہ انتظار حسین اور یوسف امین کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ چندہ سالانہ پاکستانی آٹھ روپے، بھارت گیارہ روپے۔ نئے اور پُرانے دونوں خیال کی دُنیا میں نظر آئیں گے۔ تنقید کا لہجہ کہیں کہیں قدرے درشت اور غیر مبہم سا نظر آتا ہے۔ لیکن خلوص اور دیانت کا رنگ اتنا گہرا ہے کہ معمولی داغ یا دھبے نظر نہیں آتے۔ کتابت و طباعت بہت اچھی ہے۔ سرورق بڑا حسین و جمیل ہے، فن کار بڑے جاندار اور پُر مغز ہیں۔ زیرِ نظر شمارے میں جعفر طاہر، قیوم نظر، شاد عارفی، ممتاز شیریں، احمد ندیم قاسمی، شوکت تھانوی اور خود مدیر رسالہ انتظار حسین کے نگارشات شامل ہیں۔ اس رسالے کی اُٹھان بہت اچھی ہے۔ خدا نظرِ بد سے بچائے۔

ادبِ لطیف سال نامہ ۱۹۵۳ء ۲۷۸ صفحات پر مشتمل یہ سال نامہ ادبِ لطیف کی قابلِ قدر ادبی روایات پر ایک اور مہر ثبت کرتا ہے۔ میرزا ادیب خود ایک سلجھے ہوئے ادیب ہیں۔ ادارتی صلاحیتیں بھی ان میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ شعراء میں جوش، فیض، علی اختر، آل احمد سرور، مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر سلامت اللہ، افسانہ نگاروں میں احمد ندیم قاسمی اور بیسیوں ادیب اور شاعر اس محفل میں موجود ہیں۔ قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ اُردو لاہور، پاکستان۔

خاور۔ ڈھاکے سے ڈاکٹر عندلیب شادانی کی ادارت میں اُردو کا یہ ماہ نامہ سال بھر سے شائع ہو رہا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے اچھا لکھنے والوں کا اشتراک اس رسالے کو حاصل ہے۔ اس کی وجہ خود ڈاکٹر شادانی کی خوش ذوقی اور متانت پسندی ہے۔ اس رسالے میں زندہ رہنے کی صلاحیتیں ہی نہیں بلکہ اُمید ہے کہ یہ تاریخی نام "خاور افروز جلوۂ خاور" کو ہر نوع حق بجانب ثابت کرے گا۔ سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان میں سات روپے آٹھ آنے ملنے کا پتہ:۔ خاور کواپریٹو سوسائٹی لمیٹڈ ۱۳۱۔ نیل کھیت روڈ رمنا۔ ڈھاکا۔

اطّلاعات یو۔ پی گورنمنٹ کے ماہ نامۂ اطّلاعات کا جمہوری نمبر اپنی روایتی خوبیوں کا حامل ہے۔ ہندوستان، جمہوریت، پنج سالہ پلان وغیرہ پر اچھے اچھے مضامین اور نظمیں اس کی زینت ہیں۔ قیمت ۸ر ملنے کا پتہ نظامت اطّلاعات یو۔ پی

گورنمنٹ حمیدیہ کالج میگزین۔ اُردو سیکشن مدیر ڈاکٹر گیان چند غافل۔

چالیس صفحوں پر مشتمل اُردو کا حصّہ حمیدیہ کالج میں اُردو کی مقبولیت کا ثبوت ہے۔ طلباء اور طالبات کے مضامین ان کی استعداد کے لحاظ سے معیاری ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ اُردو میں طلباء کی دلچسپی اسی طریق سے جاری رہے گی۔ شروع میں صفیہ اختر کے انتقالِ پُر ملال پر ادارے کا نہایت ہی دردناک اور رقت انگیز نوٹ ہے۔ مرحومہ اسی کالج میں شعبۂ اُردو کی صدر تھیں۔ اس کے بعد بزمِ ادب حمیدیہ کالج کے نام قاضی عبدالغفار، رشید احمد صدّیقی اور ڈاکٹر اعجاز حسین کے پیغامات درج ہیں۔ پروفیسر ست پرکاش سنگر کا افسانہ "افریقہ کا آدمی" نہایت پُر لطف افسانہ ہے۔ عورت اور آزادی، اختر شیرانی، میرے خواب وغیرہ اچھے مضامین ہیں۔

فوجی اخبار ری پبلک ڈے نمبر {قیمت ۱۲ر} ۲۶ جنوری ۱۹۵۳ء کو ہندوستان بھر میں یومِ جمہوریت منایا گیا۔ اسی تقریب پر فوجی اخبار نے یہ خاص نمبر شائع کیا ہے۔ یہ ہفتہ وار اخبار فوجیوں کے لئے بالخصوص اور عوام کے لئے بالعموم بہت اچھی معلومات بہم پہنچاتا ہے۔ یہ خاص نمبر ۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ تقریب قریب ہر صفحہ تصاویر سے مزیّن ہے۔ مضامین بہت سلجھے ہوئے اور عام فہم ہی نہیں بلکہ عوام کو سچے شہری بننے کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ بھارتی سینا، بے گھر لوگوں کی آبادکاری، ہندی کے سبق، روزمرہ کے ناگہانی حادثے، فوجی میلے، نظم اور کتنے ہی موضوعات پر بڑے دلچسپ مضمون اس نمبر میں ملیں گے۔ ملنے کا پتہ:۔ ایڈیٹر فوجی اخبار اولڈ سیکرٹریٹ دہلی۔

رفتارِ زمانہ

مختلف مسائل پر شری نہرو کے ارشادات

بھارت پارلیمنٹ میں راشٹرپتی کے شکریے کی قرارداد پر بحث کا جواب دیتے ہوئے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو نے کہا کہ اس وقت دنیا میں نفرت کے جذبات ابھر رہے ہیں، اور کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ کسی وقت بھی حالات کیا رُخ اختیار کریں۔ اس سلسلے میں ہماری پالیسی یہ ہے کہ کسی قسم کی گروہ بندی میں حصہ نہ لیتے ہوئے قیامِ امن کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھیں گے۔ جنگ کو ختم کرنے کے لئے ہی ہم نے کوریا ریزولیوشن پیش کیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم اس کوشش میں ناکام رہے لیکن مجھے اس بات کی تسلی ہے کہ ہم نے اپنے فرض کو غیر جانبدار رہ کر پوری طرح نبھایا۔ ایک اور بات جس کا بھارت سے گہرا تعلق ہے وہ ہے ایشیا میں بیداری کی لہر کا پیدا ہونا۔ نسلی امتیاز اور غیر ملکی طاقتوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے ایک ایک ایشیائی بے قرار ہے ہم اس باب میں صاف طور پر اس رائے کا اظہار کر دینا چاہتے ہیں کہ بھارت کسی قسم کے نسلی امتیاز کو برداشت نہیں کر سکتا۔ افریقہ میں ایشیائی لوگوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جا رہا ہے وہ حد درجہ شرمناک ہے اور ہم اس کو ختم کرنے کے لئے پوری جد و جہد کریں گے۔ بھارت کی اقتصادی حالت کا ذکر کرتے ہوئے شری نہرو نے کہا ہے کہ چاہے رفتار دھیمی ہے لیکن ملک کے کسانوں کی مالی حالت میں بتدریج ترقی ہو رہی ہے۔ چین کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ بھارت اور چین میں بڑا فرق یہ ہے کہ بھارت ایک جمہوری ملک ہے اس لئے اگر بھارت میں ترقی کی رفتار کچھ دھیمی ہے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن جہاں تک ملک کے تعمیری کاموں کا تعلق ہے بھارت چین سے بہت آگے ہے۔ پردھان منتری نے اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا کہ عوام میں کافی بیداری آجانے کے باعث زیادہ کام کرنے کی سپرٹ پیدا ہو رہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہی سپرٹ پانچ سالہ پلان کو کامیاب کرائے گی۔ شری نہرو نے ملک کی صنعتی ترقی پر زور دیا لیکن انہوں نے کہا کہ جب تک ہم زرعی طور پر ترقی نہیں کریں گے صنعتی ترقی کی بنیاد کمزور سی رہے گی۔ ہمارے لئے یہ نہایت بُری بات ہے کہ ہم اپنی خوراک کے لئے غیر ملکوں کے محتاج ہوں۔ اس لئے ہمیں اپنے آپ کو خوراک کے مسئلے میں خود کفیل بنانا ہی ہوگا اور یہ تبھی ہو سکتا ہے جب ہم زراعت کے سوال کو دیگر مسائل پر ہر حالت میں ترجیح دیں۔ آخر میں شری نہرو نے فرقہ پرستی کو ملک کی بہتری اور ترقی کے لئے مہلک قرار دیا اور اس کے ساتھ ہی ذات پات، صوبہ پرستی اور علاقائی تعصب کی بھی مذمت کی۔

نیپال میں جنرل انتخابات

نیپال کے مہاراجہ تربھون نے اعلان کیا ہے کہ ملک کے نظم و نسق کو چلانے کے لئے بہت جلد ایک مشاورتی کونسل قائم کی جائے گی۔ اس کونسل میں ہر خیال اور علاقے کے طبقوں کو نمائندگی دی جائے گی۔ اس کے بعد بہت جلد نیپال میں عام انتخابات کا اعلان کر دیا جائے گا۔

بھارت کا ریلوے بجٹ

بھارت پارلیمنٹ میں سال ۱۹۵۳-۵۴ء کا ریلوے بجٹ پیش کر دیا گیا ہے جس کے مطابق سالِ رواں میں محکمہ ریلوے کو نو کروڑ روپے کے منافع کا اندازہ ہے۔ پچھلے سال مسافر گاڑیوں کی آمدنی میں دس کروڑ روپے کی کمی واقع ہوئی۔ ریلوے منسٹر شری لال بہادر شاستری نے بتایا کہ اس کمی کی وجہ ملک میں کسی قسم کی اقتصادی بدحالی نہیں ہے بلکہ کرنسی کے پھیلاؤ کا کم ہونا ہے۔ شری شاستری نے یہ بھی اعلان کیا کہ عنقریب ریلوں میں فرسٹ کلاس کو اڑا دیا جائے گا۔

افریقہ میں نسلی امتیاز کے خلاف ایجی ٹیشن

جنوبی افریقہ میں ملان گورنمنٹ کے نسلی امتیاز کے قوانین کے خلاف ایجی ٹیشن دن بدن زور پکڑ رہی ہے۔ اس میں کافی بارسوخ اور بڑے لوگ حصہ لے رہے ہیں۔ جوہنس برگ کے بشپ نے بھی اپنے ایک بیان میں نابرابری کے ان قوانین کی زوردار الفاظ میں مذمت کی ہے۔ اس کے علاوہ کیپ ٹاؤن

ڈربن اور دوسرے بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں اشخاص زبردست مظاہرے کر رہے ہیں -

شری گوپالا سوامی آئینگر کی وفات

بھارت کے ڈیفنس منسٹر شری گوپالا سوامی آئینگر کی غمناک وفات پر ملک کے طُول عرض میں گہرے رنج کا اظہار کیا گیا - پارلیمنٹ میں مرحوم کو اُن کی بے لوث خدمات کے لئے خراجِ تحسین ادا کیا گیا - شری نہرو نے کہا کہ ہر شلے پر اُن کی رائے ایک خاص وزن رکھتی تھی اور میرے تو وہ دائیں ہاتھ تھے - مرحوم کے اعزاز میں پارلیمنٹ کا اجلاس ملتوی کر دیا گیا اور بھارت سرکار کے تمام دفاتر میں ایک دن کی چھٹی کر دی گئی -

بھارت میں گندم کی ارزانی کی توقع

بھارت پارلیمنٹ میں وزیر خزانہ شری دیش مکھ نے ایوان کو بتایا کہ چونکہ جہازوں کی بار برداری کے اخراجات میں کافی کمی ہوگئی ہے اس لئے کچھ دنوں بعد بھارت میں درآمد شدہ گندم سستے داموں فروخت ہوگی - یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گورنمنٹ نرخوں کو جلد ہی ارزاں کر دے - وزیر خزانہ نے اس امر پر کوئی روشنی نہ ڈالی کہ کمی کتنی ہوگی بہرحال اس امر میں کوئی شک نہیں کہ بہت جلد نئے نرخ مقرر کئے جائیں گے -

مسئلۂ کشمیر پر بھارت پاکستان کانفرنس

جنیوا میں کشمیر کے سوال پر بھارت اور پاکستانی نمائندوں کے درمیان کانفرنس باقاعدہ طور پر ختم ہوگئی ہے ایک سرکاری اعلان میں بتایا گیا ہے کہ ہر دو ممالک کے نمائندے ان تجاویز کو اپنی حکومتوں کے سامنے رکھیں گے اور مسٹر گراہم اپنی رپورٹ حفاظتی کونسل کو پیش کریں گے - اس سلسلے میں یہ معلوم ہوا ہے کہ استصواب رائے کے ایام میں ریاست جموں و کشمیر میں ہر دو ممالک کی فوجوں کی تعداد تعین کرنے کے بارے میں کوئی خاطر خواہ فیصلہ نہیں ہو سکا -

نیتاجی سبھاش چندر بوس کی یادگار

بھارت پارلیمنٹ میں ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی کی اس تجویز کا پُرجوش خیر مقدم کیا گیا کہ جزائر انڈیمان اور نکوبار کا نام نیتاجی سبھاش چندر بوس کے نام پر رکھا جائے - ڈاکٹر مکرجی نے کہا کہ نیتاجی سب سے پہلے اس جگہ پر آزادی کا جھنڈا لہرایا تھا اس لئے ان جزائر کا نام بھی سبھاش دویپ ہی ہونا چاہئے

وزیر داخلہ ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو نے اس تجویز پر حکومت کی طرف سے غور کرنے کا وعدہ کیا -

بھارت میں خوراک کی تسلی بخش حالت

بھارت سرکار کے وزیر خوراک شری رفیع احمد قدوائی نے پارلیمنٹ میں بتایا کہ ملک میں خوراک کی حالت تسلی بخش ہے - آپ نے کہا مرکزی گورنمنٹ کے پاس جنوری ۱۹۵۳ء کے آخر تک ساڑھے اٹھارہ لاکھ ٹن اناج جمع تھا جب کہ ۱۹۵۱ء کے اسی مہینے میں اناج کی مقدار سولہ لاکھ ٹن تھی - اس کے علاوہ ملک میں فصل کی حالت بھی عام طور پر اچھی ہے - نائب وزیر خوراک شری ایم وی کرشن جھا نے یہ بھی بتایا کہ سارے دیش میں چاول کی قیمتیں کھلے بازار میں گرتی جا رہی ہیں -

بھارت اور پاکستان میں اچھے تعلقات کی ضرورت

پاکستان کی عوامی لیگ کے لیڈر اور متحدہ بنگال کے لیڈر مسٹر حسین شہید سہروردی نے کراچی کی ایک پریس کانفرنس میں اس رائے کا اظہار کیا کہ پاکستان کا فائدہ اس بات میں ہے کہ وہ بھارت کے ساتھ اچھے تعلقات بنائے رکھے - اگر حکومت پاکستان اپنے عوام کو خواہ مخواہ بھارت کے خلاف نہ بھڑکائے تو یہ دونوں ممالک کی بہتری کے لئے ایک نہایت اچھا قدم ہوگا - حکومت پاکستان کے موجودہ لیڈر ہندوستان کے خلاف نفرت کا جذبہ پھیلا کر اپنے اپنے ملک کے عوام کی توجہ نہایت ضروری مسائل سے ہٹانا چاہتے ہیں -

چین میں جنگ کے لئے حفاظتی تدابیر

"نیوٹائمز آف برما" کے ایک خاص نامہ نگار کی اطلاع کے مطابق کمیونسٹ چین کے حکام نے برما کی سرحد کے ساتھ پندرہ میل کے اندر رہنے والے یُنان صوبے کے تمام لوگوں کو وہاں سے ہٹا لیا ہے - اس کارروائی کی وجہ یہ ہے کہ برما میں قوم چین کی افواج یُنان جانے والی برما روڈ پر جمع ہو رہی ہیں - مبصروں کی رائے میں اس کارروائی سے قوم پرست چینی افواج کے حملوں سے بآسانی حفاظت ہو سکے گی -

مصر میں نئے آئین کی تشکیل

مصر میں نئے آئین بنانے کے لئے پچاس اشخاص کی ایک کمیٹی نے کام شروع کر دیا ہے - واضح رہے کہ جنرل نجیب نے برسر اقتدار آتے ہی پرانے آئین کو رد کر دیا تھا - نیا آئین مکمل طور پر جمہوری ہوگا اور ساری طاقت عوام کے ہاتھوں میں سونپ دی جائے گی - نئے آئین کے طیار ہونے تک ۱۳ فوجیوں اور ۵ شہریوں پر مشتمل ایک وزارت حکومت کے کام کو چلائے گی -

بھارت کو ٹرکی کے اخبارات کا خراجِ تحسین

ٹرکی کے اخبارات نے بھارتی جمہوریہ کی تیسری سالگرہ پر بھارت کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

استنبول کا روزنامہ 'وطن' رقمطراز ہے کہ ایشیا کے لئے موجودہ تاریکی کے دور میں بھارت ایک شعاعِ امید ہے۔ ایشیا میں بھارت ہی واحد ملک ہے جہاں سیاسی، سماجی، معاشی اور صنعتی ترقی کی اسکیموں کو تیز رفتاری سے عملی جامہ پہنانے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی گئی ہے۔ شری جواہر لال نہرو دنیا میں ایک ایسے نظام کے سب سے بڑے حامی ہیں جو دوسروں کے لئے مثال قائم کر سکے۔ مختلف مذاہب کے متعلق بھارت سرکار کی پالیسی رواداری پر مبنی ہے۔ یہ امر قابلِ افسوس ہے کہ شری جواہر لال نہرو کی مصالحانہ کوششوں کے باوجود بھارت اور پاکستان کے تعلقات ابھی تک خوشگوار نہیں ہوئے۔

'ٹرکش ہیرلڈ' نے ایک اداریہ میں لکھا ہے بھارت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جمہوریت میں ایشیا پچھمی ممالک سے پیچھے نہیں۔ مستقبل میں یقینی طور پر بھارت کا شمار دنیا کے سب سے بڑے جمہوری ممالک میں ہوگا

استنبول سے شائع ہونے والے ایک اور روزانہ اخبار 'آکن' نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ بھارت دنیا کی سب سے زیادہ قابلِ تعظیم قوموں کی صف میں کھڑا ہو گیا ہے اور اب اس کا شمار دنیا کے بڑے ملکوں میں ہوتا ہے۔

'ملیت' نے بھارت سرکار کی مذہبی رواداری کی پالیسی کی خاص طور پر تعریف کی ہے۔ مختلف مذاہب کی موجودگی کے باوجود سیکولر نظریہ کی کامیابی مہاتما گاندھی کی تعلیم کی مرہونِ منت ہے

'انقرہ' کے اخبار 'ظفر' نے بھارت کی آزادانہ خارجہ پالیسی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بھارت سرکار نے اپنے آپ کو پچھمی اور کمیونسٹ ملکوں کی گروہ بندی سے بالکل آزاد رکھا ہے۔ اتحادی سبھا کے گزشتہ اجلاس میں بھارت نے مسئلہ کوریا پر نیا ریزولیوشن پیش کر کے اپنی آزادانہ پوزیشن کا واضح ثبوت پیش کیا ہے۔

'علوس' نے دوسری عالمگیر جنگ کے بعد بھارت کی آزادی کو دنیا کا سب سے اہم واقعہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ بین الاقوامی معاملات میں بھارت اہم پارٹ ادا کر رہا ہے۔ جمہوری نظام بھارت کے لئے کوئی نئی چیز نہیں بلکہ یہ بھارت کی گزشتہ روایات و فلسفۂ زندگی کے عین مطابق ہے۔ آخر میں اخبار مذکور نے بھارت کی ترقی کے پانچ سالہ پلان پر اظہارِ پسندیدگی کیا ہے اور نہرو سرکار کی مذہبی رواداری کی پالیسی کی تعریف کی ہے۔

امام محمد الخلیقی کا پیغام

کاظمین (عراق) کے مشہور شیعہ بزرگ امام محمد الخلیقی نے بھارتی سفیر شری خوب چند کی وساطت سے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو کو خیرسگالی کا ایک پیغام دیتے ہوئے کہا ہے۔ یومِ جمہوریہ کی تقریب پر آپ اور بھارت کے عوام کے لئے دعائے خیر و برکت اور آپ کی مسرت، ترقی اور خوشحالی کے متمنی ہیں اور اس امر کے خواہش مند ہیں کہ ہر ہندوستانی بغیر امتیازِ مذہب و ملت حقیقی بھائی چارہ کے جذبہ کے تحت زندگی بسر کر سکے۔

ہمیں توقع ہے کہ بھارت اقوامِ عالم خصوصاً ایشیائی اقوام کے لئے ایک عمدہ مثال ثابت ہوگا۔ ہم ان کے تحفظ، الفت اور آسودہ حالی کے لئے دست بدعا ہیں۔

مسٹر بیون کی طرف سے بھارتی خارجی پالیسی کی تعریف

برطانیہ کی مزدور پارٹی کے لیڈر مسٹر بیون نے نئی دہلی میں بھارت کی پارلیمنٹ کے ممبران کے سامنے اپنے خیال پیش کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ اور روس کے دو طاقت ور گروپوں کی پوزیشن کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے امن کے قیام کے لئے یہ نہایت ضروری امر ہے کہ ایک تیسرے گروپ کی بنیاد رکھی جائے۔ یہ تیسرا گروپ مندرجہ بالا دونوں گروپوں میں توازن قائم رکھنے کے اہم کام کو انجام دے۔ امن کے لئے بھارت کی جد و جہد کا ذکر کرتے ہوئے مزدور لیڈر نے کہا کہ بھارت جمہوریت کے ذریعے ایک نئے سماج کی تعمیر میں کوشاں ہے۔ ۳۶ کروڑ انسانوں کا اس کام میں تعاون حاصل کرنا بھارت کی حکومت کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ آپ نے خارجی معاملات میں بھارت کی پالیسی کو سراہا۔

تپ دق کے خلاف مہم

بھارت کی وزارتِ صحت نے تپ دق کے خلاف اپنی مہم تیز کر دی ہے وزیرِ صحت راجکماری امرت کور نے اپنی ایک براڈکاسٹ تقریر میں ملک سے اپیل کی کہ وہ بی سی جی کے انجکشن لگوا کر اس موذی مرض کی روک تھام میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں کیوں کہ یہی ایک مؤثر اور سستا طریقۂ علاج ہے۔

Regd. No. E P - 689

صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم

ایک تھا لڑکا ٹوٹ بٹوٹ

ایک تھا لڑکا ٹوٹ بٹوٹ باپ تھا اس کا میر سلوٹ
پیتا تھا وہ سوڈا واٹر کھاتا تھا بادام اخروٹ
ایک تھا لڑکا ٹوٹ بٹوٹ

گھُمن لٹّو نام تھا اُس کا گھومتے رہنا کام تھا اُس کا
صبح کو ہوتا کلکتے میں شام کو ہوتا چڑیا کوٹ
ایک تھا لڑکا ٹوٹ بٹوٹ

آنکھیں اُس کی موٹی موٹی ٹانگیں اُس کی چھوٹی چھوٹی
نیچے پہنے صرف لنگوٹی اُوپر پہنے اوور کوٹ
ایک تھا لڑکا ٹوٹ بٹوٹ

ہر ایک اس کی چیز اُدھوری کبھی نہ کرتا بات وہ پوری
ہنڈیا کو کہتا تھا ہنڈی لوٹے کو کہتا تھا لوٹ
ایک تھا لڑکا ٹوٹ بٹوٹ

امّی بولی بیٹا آؤ شہر سے جا کر لڈّو لاؤ
سُنتے ہی وہ لے کر نکلا جیب میں ایک روپے کا نوٹ
ایک تھا لڑکا ٹوٹ بٹوٹ

اتنا اُس کا جی للچایا رستے ہی میں کھانا آیا
کھاتے کھاتے آئی ہچکی دانت میں اس کے لگ گئی چوٹ
ایک تھا لڑکا ٹوٹ بٹوٹ

بھائی اُسے اُٹھانے آیا ابّا گلے لگانے آیا
امّی اُس کی روتی آئی ہائے میرا ٹوٹ بٹوٹ

ہائے میرا ٹوٹ بٹوٹ

(شاباش)

رضوان رضوی

چوری

اس ناٹک میں کام کرنے والے:-

حامد ——— بارہ برس کا لڑکا

مُنّی ——— حامد کی چھوٹی بہن

اور اِن کے علاوہ حامد کی امّی اور ابا جان

پہلا منظر

مقام ——— حامد کا کمرہ

وقت ——— تین بجے دن

[جب پردہ اُٹھتا ہے تو ایک چھوٹا سا کمرہ نظر آتا ہے اور اُس کمرے میں حامد اور مُنّی اپنے اپنے اسکول کی کتاب پڑھ رہے ہیں۔]

حامد۔ (مُنّی سے) دیکھو تو ابّا جان گئے باہر

مُنّی۔ کِس لئے؟

حامد۔ اری پگلی تو جا کر دیکھ بھی تو

مُنّی۔ (تعجب سے) خیریت تو ہے بھیّا؟

حامد۔ بالکل، خدا کا فضل ہے، تو جا کر دیکھ تو

مُنّی۔ نہیں بھیّا آپ مجھے بتا دیجئے، کس لئے؟

حامد۔ اری پگلی سن! آج ابا جان بہت اچھی اچھی چیزیں لائے ہیں۔

مُنّی۔ (جلدی سے) وہ کون سی اچھی اچھی چیزیں؟

حامد۔ آج ابّا جان کے ایک دوست آنے والے ہیں۔

مُنّی۔ ہاں، تو مطلب؟

حامد۔ مطلب یہ کہ آج صبح ہی سے ابا جان نے طرح طرح کی مٹھائیاں لے رکھی ہیں۔

مُنّی۔ سچ سچ؟

حامد۔ سچ نہیں تو کیا میں تم سے جھوٹ کہہ رہا ہوں۔

مُنّی۔ (چٹخارا مارتے ہوئے) تب تو آج ہم لوگوں کی خوب چلے بنے گی؟

حامد۔ اس میں بھی کوئی شک ہے۔

مُنّی۔ تب کوئی صورت نکالو نا بھیّا۔

حامد۔ صورت تو میں نکال چکا ہوں۔ صرف تم ابّا جان کو دیکھ کر آؤ۔

مُنّی۔ اچھا میں ابھی آئی۔

(اور وہ دوڑ کر دیکھنے چلی جاتی ہے اور پھر تھوڑی دیر میں دیکھ کر آجاتی ہے)

حامد۔ کہو ابّا جان گئے باہر؟

مُنّی۔ ابا جان تو باہر چلے گئے ہیں لیکن امّی جان جو موجود ہیں۔

حامد۔ بڑے کمرے میں ہیں امّی؟

مُنّی۔ ہاں ہاں بڑے کمرے میں چارپائی پر لیٹی ہوئی ہیں۔

حامد۔ تب تو بہت مشکل ہے۔

مُنّی۔ کس کمرے میں مٹھائی ہے؟

حامد۔ جس کمرے میں امّی جان لیٹی ہوئی ہیں۔ اُسی کے بغل والے کمرے میں۔

مُنّی۔ تب ہم لوگوں کی کیسے چلے گی بھیّا؟

حامد۔ (گال پر ہاتھ رکھ کر) یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں مُنّی۔

مُنّی۔ (منہ بنا کر) چوری بھی بہت سخت کام ہے بھیا۔

حامد۔ ہاں مُنّی، بہت سخت کام ہے اور خاص کر آج کی چوری۔

مُنّی۔ (بات کاٹتے ہوئے) میرے مُنہ میں تو پانی آرہا ہے بھیّا!

حامد۔ پانی روکے رہی کی تو ترکیب سوچ رہا ہوں مُنّی۔

مُنّی۔ (تھوکتے ہوئے) تو ذرا جلدی بتائیے نا۔ میرا منہ تو پانی سے بھرا جا رہا ہے

حامد۔ (خوش ہوکر) بس صورت نکل آئی مُنّی۔

مُنّی۔ (جلدی سے) وہ کون سی صورت؟

حامد۔ وہ صورت یہ ہے کہ ہم دونوں امّی کے پاس چل کر بیٹھیں۔

مُنّی۔ اس کے بعد پھر کیا کریں؟

حامد۔ اس کے بعد اُن سے خوب میٹھی میٹھی باتیں کریں۔

مُنّی۔ تو پھر میرے مُنہ کا پانی کیسے بند ہوگا؟

حامد۔ بند ہو جائے گا تو چل بھی تو۔

مُنّی۔ اچھا تو چلو۔

(اور پھر وہ دونوں امّی جان کے کمرے میں پہنچ جاتے ہیں اور اُن کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ جاتے ہیں)

امّی (حامد سے) کیا ہے رے حامد

حامد۔ کچھ نہیں امّی

امّی۔ تم دونوں کیا کر رہے تھے؟

حامد۔ ہم دونوں پڑھ رہے تھے امّی

امّی۔ (حامد سے) تیرا امتحان کب ہے

حامد۔ بس پندرہ روز رہ گئے ہیں امتحان کو

امّی۔ (مُنّی سے) اور تیرا رے مُنّی۔

مُنّی۔ میرے امتحان کو بارہ روز باقی ہیں۔

امّی۔ خوب جی لگا کر پڑھو تم دونوں۔

حامد۔ ہاں امّی خوب ہی تو پڑھتے ہیں ہم دونوں۔

امّی۔ اور سنو!

مُنّی۔ کیا امّی

امّی۔ (مُنّی سے) اگر تو پاس ہو جائے تو تجھے سونے کا جگنو انعام دوں گی۔

حامد۔ (جلدی سے) اور مجھ کو۔

امّی۔ اور اگر تو امتحان پاس کر جائے گا تو تجھے ایک گھڑی انعام دوں گی۔

حامد۔ اچھا امّی۔ میں ضرور پاس کروں گا۔

امّی۔ ہاں میرے لال کوشش کرو۔

مُنّی۔ میں تو خوب محنت کر رہی ہوں امّی

امّی۔ ہاں بیٹی خوب جی لگا کر پڑھو۔ محنت کا پھل ضرور ملے گا۔

حامد۔ اچھا امّی۔ اب ہم دونوں ذرا باہر جلیں کھیلنے کے لئے۔

امّی۔ جاؤ۔ جاؤ میرے لال۔ اب ذرا میں سوتی ہوں۔

حامد۔ تو کیا آپ کو نیند آرہی ہے۔

امّی۔ ہاں۔ مجھے نیند آرہی ہے اور میں ذرا آرام کرنا چاہتی ہوں۔

حامد۔ اچھا آپ آرام کریں (مُنّی سے) ہم دونوں باہر چلیں۔

(اور پھر وہ دونوں وہاں سے اپنے کمرے میں آجاتے ہیں)

مُنّی۔ اب کیا کرنا چاہیئے بھیّا؟

حامد۔ اب کرنا یہ چاہیئے کہ ہم دونوں مٹھائی والے کمرے میں جلیں اور الماری میں بیٹھ کر مٹھائی کھائیں۔

مُنّی۔ تو کیا الماری میں سما سکیں گے ہم دونوں؟

حامد۔ اری پگلی۔ بڑی الماری میں مٹھائی ہے نا۔

مُنّی۔ اچھا تب تو مزے سے ہم دونوں اُس میں سما جائیں گے۔

حامد۔ لیکن دیکھو شور و غل نہ کرنا ورنہ سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔

مُنّی (خوشی سے تالیاں بجاتے ہوئے) بس تو چلئے نا بھیّا۔

حامد۔ اری پگلی، تو تو ابھی سے ہی شور کرنے لگی۔

منّی ۔ اچھا بھیّا اب شور نہیں کروں گی ۔

حامد ۔ تو چل جلدی کر ۔

(اور پھر وہ دونوں آہستہ آہستہ مٹھائی والے کمرے میں گھس جاتے ہیں ۔
اور الماری کھول کر اطمینان سے اس کے اندر بیٹھ جاتے ہیں ۔ اور
مٹھائی کھانے لگتے ہیں)

(کسی چیز کے گرنے کی آواز) ٹن ۔ ڈھن

امّی ۔ (اٹھ کر بیٹھتے ہوئے) کون ہے ؟

چھن چھن ۔ جھناک ۔

امّی ۔ (کمرے کی طرف آتے ہوئے)
کون ہے اس کے اندر ؟

ڈھا ۔ ڈھن

امّی (ارے باپ رے باپ)
کوئی گھسا ہے اس میں ۔

(حامد کے ابّا آجاتے ہیں اور
پکارتے ہیں)

ابّا ۔ اے حامد کی امّی

امّی ۔ کیا ہے جی ۔

ابّا ۔ وہ لوگ تو آنے ہی والے ہیں

امّی ۔ وہ تو آئیں گے جب آئیں گے ۔ ذرا اس کمرے میں جاکر تو دیکھئے ۔

ابّا ۔ کیا ہے اس کمرے میں ؟

امّی ۔ مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے ۔ ڈبے وغیرہ گرنے کی آواز آرہی ہیں ۔

ابّا ۔ چوہے ہوں گے اور کیا ؟

امّی ۔ نہیں جی ، کوئی چور معلوم پڑتا ہے ۔ کیونکہ جب میں اس کمرے میں داخل
ہوئی تو کسی کے سانس لینے کی آواز آرہی تھی ۔

ابّا ۔ سانس لینے کی آواز آرہی تھی ؟

امّی ۔ ہاں ہاں سانس لینے کی آواز آرہی تھی ۔

ابّا ۔ اچھا تو چلو آؤ میرے ساتھ ۔

(اور پھر وہ دونوں ایک لاٹھی لے کر مٹھائی والے کمرے میں پہنچتے ہیں)
کونے میں دیکھئے ۔

ابّا ۔ (لاٹھی ٹیکتے ہوئے) کون ہے بے جلدی بول ۔

امّی ۔ میرا خیال ہے کہ الماری کھول کر دیکھا جائے ۔

ابّا ۔ (الماری کھول کر) اوہو ۔ بہت بڑے بڑے چوہے ہیں ۔

امّی ۔ ارے ، تم لوگوں نے تو کہا تھا کہ باہر کھیلنے کو جا رہے ہیں ۔

حامد ۔ (ہاتھ جوڑ کر) نہیں امّی جان
بھوک لگی تھی ۔

امّی ۔ تو کھانا کھالیتا

ابّا ۔ اچھا ، نیچے اُترو ۔

حامد (نیچے اُتر کر کان پکڑ کر
اُٹھتے بیٹھتے ہوئے) ایک دو تین

ابّا ۔ میں تمہیں اُٹھنے بیٹھنے
کو تھوڑے ہی کہہ رہا ہوں ۔

منّی ۔ اب ہم لوگ کبھی ایسا کام
نہیں کریں گے ابّا ۔

ابّا ۔ اچھا جاؤ ۔ معاف کیا ۔ اب آئندہ سے ایسی حرکت کبھی نہ
کرنا ۔ ورنہ کان پکڑ کر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

حامد ۔ اب کبھی ایسا کام نہیں کریں گے ابّا جان ۔

ابّا ۔ جاؤ چپ چاپ پڑھو جاکر ۔ امتحان نزدیک ہے

(اور وہ دونوں سر نیچا کئے چپکے سے چلے جاتے ہیں)

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

محمد یسین

قدرتی چشمے

تم نے لوگوں کو رسی اور ڈول کی مدد سے کنوئیں سے پانی بھرتے ہوئے ضرور دیکھا ہوگا۔ آئیے ہم تمہیں ایسے کنوئیں اور چشمے بتائیں جن سے پانی خود بخود نکلتا ہے اور انسان کو پانی نکالنے کی زحمت نہیں اُٹھانی پڑتی۔ ان کا حال سُن کر تمہیں ضرور حیرت ہوگی۔

زمین پر بارش کا پانی کچھ تو نزدیک کے نالوں، تالابوں یا دریاؤں میں بہہ جاتا ہے اور کچھ پانی زمین کے اندر ہی جذب ہو جاتا ہے۔ اس جذب شدہ پانی کو خصوصیت سے زمین کا پانی کہتے ہیں۔ یہ بات یہاں قابل ذکر ہے کہ سب چٹانیں (جغرافیائی اصطلاح میں ہر قسم کی مٹی کو چٹان ہی کہتے ہیں) اپنے اندر پانی جذب کر لینے کی طاقت نہیں رکھتی ہیں۔ پانی صرف وہی چٹانیں جذب کر سکتی ہیں۔ جو مسام دار ہیں۔ بے مسام چٹانیں اپنے اندر پانی نہیں جذب کر سکیتں۔ سطحِ زمین جہاں مسام دار چٹانوں سے بنی ہوئی ہے۔ وہاں پانی خوب جذب ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مسام دار چٹان کے نیچے بے مسام چٹان واقع ہوتی ہے جو پانی کو جذب ہونے سے روک دیتی ہے۔ اس وجہ سے سارا پانی بے مسام چٹان پر جمع ہوتا رہتا ہے۔ چٹانوں کے متفقہ دباؤ سے یہ پانی کسی دراڑ سے باہر نکلنے لگتا ہے۔ اس طرح چشموں کا وجود ہوتا ہے۔ چشمے کو "سوتا" بھی کہتے ہیں۔ چشمے یا سوتے دو صورتوں سے بنتے ہیں۔ یہ بات مندرجہ ذیل مثال سے بخوبی واضح ہو جائے گی۔

(۱) بارش کا جو پانی مسام دار چٹان ب پر گرتا ہے۔ وہ جذب ہوتے ہوتے بے مسام چٹان ج تک پہونچ کر رُک جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ مقام س تک پہونچ جاتا ہے جہاں چشمہ پھوٹ پڑتا ہے۔ لیکن ایسے چشمے کا پانی اُچھل کر باہر نہیں نکلتا بلکہ دھیرے دھیرے بہتا رہتا ہے۔

(۲) بارش کا جو پانی مسام دار چٹان د پر گرتا ہے۔ رفتہ رفتہ بے مسام چٹان ہی پر پہونچ کر رُک جاتا ہے۔ مقام س پر دراڑ ہونے کی وجہ سے یہ پانی باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے باہر نکلنے کی کوشش کو مسام دار اور بے مسام چٹانیں اپنے متفقہ دباؤ سے اور بھی کامیاب بنا دیتی ہیں۔ تب یہ پانی تیزی سے سوراخ کے باہر نکلنے لگتا ہے۔ اس قسم کے چشموں کا وجود تب ہی ممکن ہے جبکہ مقام د مقام س سے زیادہ اونچا ہو۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ہماری زمین پہلے آگ کا ایک گولہ تھی جو رفتہ رفتہ ٹھنڈی ہوتی گئی۔ اب بھی زمین کے اندر کافی مقدار میں آتشی مادّہ موجود ہے۔ زمین کے اندر کا پانی جب آتشی مادّے سے ملتا ہے تو گرم پانی بن جاتا ہے۔ یہ اس قدر گرم ہو جاتا ہے کہ اس کا درجۂ حرارت ۲۱۲ درجہ ف سے بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ اس کھولتے ہوئے پانی سے جو بھاپ بنتی ہے وہ اتنی طاقت ور ہوتی ہے۔ کہ زمین کو توڑ کر باہر نکل آتی ہے اس طرح زمین میں ایک سوراخ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی سوراخ سے کھولتا ہوا گرم پانی تیزی سے باہر نکلتا ہے۔ اس قسم کے گرم پانی کے چشموں کو انگریزی میں گیسر کہتے ہیں۔ گیسر عام طور سے کوہ آتش فشانی خطوں میں پائے جاتے ہیں۔ ییلو سٹون پارک میں جو امریکہ میں واقع ہے بہت سے گیسر پائے جاتے ہیں ایک گیسر جس کا نام قدیم وفادار ہے ہر گھنٹے اُچھلتا ہے۔ دوسرا منٹ مین ہے جو ہر منٹ پر اُچھلتا ہے۔

چاہ آرطیسن۔ فرانس میں ایک صوبہ آرطیس ہے۔ جہاں بہت سے اس قسم کے کنوئیں ہیں۔ چاہ آرطیسن مخصوص قسم کے چشمے ہیں۔ چشمے اور چاہ آرطیسن میں صرف اتنا فرق ہے کہ چشمے قدرتی سوراخ سے اُبلتے ہیں اور چاہ آرطیسن میں یہ سوراخ انسان کو بنانے پڑتے ہیں۔ چاہ آرطیسن کے وجود کے لئے مندرجہ ذیل شرائط ہیں۔

(۱) چٹانیں کاسہ نما ہوں (شکل نمبر ۲ ا) یا چٹانوں کی تہیں نیچے کی طرف ڈھالو ہوں (شکل نمبر ۲ ب)

(۲) دو بے مسام چٹانوں کے درمیان ایک مسام دار چٹان ہونی چاہیئے۔

(۳) مسام دار چٹان کی تہیں باہر نکلی ہوئی ہوں۔

(۴) بارش کا پانی کافی مقدار میں ہمیشہ جمع ہوتا رہے۔

چاہ آرطیسن کا وجود مندرجہ ذیل اشکال سے بخوبی واضح ہو جائے گا۔

شکل نمبر ۲ ا

ب

بارش کا جو پانی مسام دار چٹان ج میں جذب ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ بے مسام چٹان ی تک پہونچ کر رُک جاتا ہے۔ بیرونی بے مسام چٹان اس پانی کو باہر نکلنے سے روک دیتی ہے جب بے مسام چٹان د پر بمقام چ ایک کنواں کھود دیا جاتا ہے تو چٹانوں کے متفقہ دباؤ سے پانی تیزی سے باہر نکلنے لگتا ہے۔ بشرطیکہ مسام دار چٹان کی سطح کنوئیں کی سطح سے اونچی ہو۔ مقام ج مقام چ سے جتنا ہی زیادہ بلند ہوگا پانی کا اخراج کنوئیں سے اتنا ہی تیز ہوگا۔ آرطیسن کنوئیں ۳۰۰-۴۰ فٹ سے لے کر ہزاروں فٹ تک گہرے ہوتے ہیں۔ اس قسم کے کنوئیں آسٹریلیا میں بہت پائے جاتے ہیں۔ پانی کم ہوتے ہوتے جب زمین کے پانی کی سطح کنوئیں کی سطح کے برابر ہو جاتی ہے تو پانی کا اُچھل کر نکلنا بند ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں پانی پمپوں کے ذریعے سے نکالتے ہیں۔

★ ★ ★

اسرائیل کیفی

طلسمی ڈنڈا

بہت دن پہلے کی بات ہے۔ شاہ آباد ضلع کے ایک گاؤں میں ایک وکیل صاحب رہتے تھے۔ وہ بڑے رحم دل اور نیک مزاج تھے۔ مگر اُن کی بیوی بڑی ہی بدمزاج اور ضدّی تھی۔ وہ جس کام کو ٹھان لیتی۔ بُرا بھلا کچھ نہ سوچتی کر گزرتی۔ اور اسی لئے دونوں میں ہمیشہ ناچاقی رہتی تھی۔ بات بات پر وکیل صاحب سے جھگڑ پڑتی تھی۔ رحم دل اور سیدھے سادے ہونے کی وجہ سے وہ ہمیشہ خاموش رہ جاتے تھے۔

اتنا کچھ ہوتے ہوئے بھی وکیل صاحب بیوی کو بہت چاہتے تھے اور اس کی وجہ صرف انور تھا۔ جو اُن کا اکلوتا اور لاڈلا سپوت تھا۔ انور کو وہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اس کی ساری مانگیں مُنہ سے نکلتے ہی پُوری کر دی جاتی تھیں۔ اور خدا کا دیا اُن کے پاس سب کچھ موجود تھا۔

سب کچھ ہوتے ہوئے بھی انور کی ایک عادت بُری ہو گئی تھی اور وہ اُس کا عادی ہو گیا تھا۔ کبھی اسکول میں کسی کا قلم غائب کر دینا کسی کی کتاب اُڑا لینا اور کبھی پنسل اور کاپیاں ہی غائب کر لیتا اور گھر میں وکیل صاحب کی جیب سے پیسے چُرا تا۔

محلے پڑوس کے تمام لوگ اُس کی اِس گندی عادت سے تنگ آ گئے تھے اور اس سے نفرت کرنے لگے تھے۔ اکثر لوگ وکیل صاحب سے اس کی نمک مرچ لگا کر شکایت بھی کرتے لیکن وہ کوئی دھیان نہ دیتے۔ اس کان سُنتے اور اس کان اُڑا دیتے۔ لیکن ماں اکثر اُسے کچھ نہ کچھ سزا دے ہی دیتی۔ پھر بھی اس کی عادت نہ چھوٹتی تھی۔

ایک روز جب کہ انور بے خبر سو رہا تھا یکایک آدھی رات گئے اس کی آنکھ کھلی تو وہ اپنے کمرے میں ایک عجیب و غریب قسم کے انسان کو دیکھ کر ڈر گیا۔ اور حیرت سے اس کی آنکھ پھٹی کی پھٹی رہ گئی کمرے کا دروازہ بند تھا ساری کھڑکیاں بند تھیں پھر یہ یہاں کیسے گھس آیا۔

بڑی بڑی سُرخ آنکھیں موٹا تازہ جسم سر پہ پگڑی بڑی بڑی کالی مونچھیں اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا خوبصورت ڈنڈا تھا۔ اور وہ کھڑا مسکرا رہا تھا۔

انور کو سہما ہوا دیکھ کر وہ بولا ــــ "ڈرو نہیں بھئی! میں کوئی پاپی نہیں ہوں میں ایک مشہور جادوگر ہوں کل تو تم نے میرے جادو کا کمال دیکھا تھا۔ میں تمہارے لئے یہ ڈنڈا لایا ہوں" ــــ اور اس نے ڈنڈے کو اس

کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا — "دیکھو یہ کتنا خوبصورت اور مضبوط ہے۔ جانتے ہو اس میں کون سی خوبی ہے؟ اگر تمہارا کوئی دشمن تمہیں راستے میں یا اور کہیں روک کر مار پیٹ کرے تو ڈنڈا تمہاری فوراً مدد کرے گا اور فوراً ہی تمہارے دشمن پر برسنے لگے گا۔ لیکن اگر تم نے بھی کوئی بُرا کام کیا تو وہ تمہیں بھی بغیر سزا دیئے نہ رہے گا۔ کہو کیا ارادہ ہے؟ منظور ہے؟ —"

انور اٹھ کر بیٹھ رہا اور سوچنے لگا۔ آج جمیل سے تکرار بھی ہوگئی ہے اور چوری کا پتہ بھی چل گیا ہے۔ کل وہ اسکول سے واپس آتے وقت راستے میں روک کر ضرور گڑبڑ کرے گا۔ اس نے اس کے ہاتھ سے ڈنڈا لے لیا اور فوراً ہی جادوگر غائب ہوگیا۔

دوسرے دن جب انور چار بجے اسکول سے واپس لوٹ رہا تھا تو اسے جمیل اور کئی لڑکوں نے گھیر لیا اور جوں ہی اُن لوگوں نے اُسے پیٹنا چاہا۔ ڈنڈا اس کی جیب سے اچھل کر باہر نکلا اور جمیل اور اس کے ساتھیوں پر بے تحاشا پڑنے لگا۔ بے چاروں کی بُری حالت ہوگئی وہ سب سر پر پَیر رکھ کر جان لے کر بھاگے۔ اور انور خوشی سے ناچتا رہا۔

اُن سبھوں کے بھاگ جانے کے بعد انور خوشی خوشی گھر آیا۔ اور آتے ہی میدان صاف دیکھ کر کمرے میں گھس گیا چونکہ گھر میں نہ تو وکیل صاحب ہی تھے اور نہ انور کی ماں ہی۔ دونوں پڑوس کے کسی دوست کے گھر چلے گئے تھے۔

وکیل صاحب کا کوٹ لٹکا ہوا تھا۔ انور نے کمرے میں گھستے ہی کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا اور پیسے ٹٹولنے لگا۔ اور ٹھیک اُسی وقت ڈنڈا اس کی جیب سے کود کر باہر آیا اور انور کے سر پر زور زور سے برسنے لگا۔ وہ درد سے چیخنے چلّانے اور ناچنے لگا۔ اتنے میں کسی کے زور سے ہنسنے کی آواز اس کے کان میں آئی۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا تو اُس کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ وہی جادوگر جس نے اُسے جادو کا ڈنڈا دیا تھا دیوار سے لگا کھڑا ہنس رہا تھا۔

انور نے روتے ہوئے کہا — "مجھے بچاؤ، مجھے جلد بچاؤ! درد سے میرا سر پھٹا جا رہا ہے! —" میں نے تو تمہیں پہلے ہی سب کچھ بتا دیا تھا — وہ ہنسی روک کر بولا — "اگر تم یہ بُرا کام نہ کرتے تو یہ سزا تمہیں کیوں ملتی؟ —"

مجھے اب بچاؤ، اب کبھی بُرا کام نہیں کروں گا چوری نہیں کروں گا وہ روتے ہوئے بولا۔ "جلدی سے ڈنڈے کو روکو ورنہ میں مر جاؤں گا۔"

"اچھا تو پھر دس بار کان پکڑ کر اُٹھو اور بیٹھو — وہ مسکراتے ہوئے بولا ڈنڈا خود ہی تم سے الگ ہو جائے گا —"

انور نے جیسے ہی کان دونوں ہاتھوں سے پکڑے ڈنڈا اس کی جیب میں چلا گیا، اور جادوگر بھی نظروں سے غائب ہوگیا —"

رات بھر وہ درد سے کراہتا رہا۔ اسے بالکل نیند نہ آسکی۔ چونکہ اُس کے جوڑ جوڑ میں درد تھا۔ صبح جب اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو ڈنڈے کو بھی غائب پایا۔ اُسے اپنے کیے پر بڑا ہی غصّہ آیا اور اُس دن سے اس نے توبہ کر لی اور پھر نہ کوئی بُرا کام ہی کیا اور نہ چوری ہی کی، اور اپنی اچھی اور نیک عادتوں کی بدولت جلد ہی سب کی آنکھوں کا نُور بن گیا —

لطیفے

کتب فروش - تم کیسی کتاب چاہتے ہو؟

طالب علم - جس میں اُستاد سے بہانہ کرنے کے گُر درج ہوں -

مجسٹریٹ - تم اپنی صفائی کے سلسلے میں کیا کہنا چاہتے ہو؟

ملزم - حضور میں ابھی ابھی نہا کر آیا ہوں -

مریض - میرے پیٹ میں کچھ گڑبڑ ہے -

ڈاکٹر - ذرا ٹھہرو میں ابھی پولیس کو بُلاتا ہوں -

آج کل

٨

مئی ۱۹۵۳ء

A GROUP OF
MEDIA WITH ALL INDIA CIRCULATION

Available everywhere or direct from:

THE PUBLICATIONS DIVISION,
Old Secretariat, DELHI.

ڈالڈا وناسپتی کیونکر
آپ کی قیمت خرید کا بہترین معاوضہ ہے؟

دن بہ دن زیادہ ملایم
وزیادہ دِلکش جِلد
رکسونا کا کیٹڈل آپ کیلئے
بھی یہ کمال کرے گا
اپنی جِلد پر رکسونا کا کیٹڈل آمیز جھاگ نرمی سے
ملئے، پھر دھو ڈالئے، آپ خود ہی محسوس
کریں گی کہ آپکی جِلد دن بہ دن زیادہ ملایم
اور صاف ہوتی جارہی ہے۔
رکسونا
کیٹِڈل* آمیز واحد صابن
جِلد کو ملایم کرنے اور مقوی جلد تیلوں
کے ایک خاص مرکب کا ملکیتی نام
Rexona
R.P. 107-50 UD
رکسونا پروپرائٹری لمیٹیڈ کیلئے ہندوستان میں بنایا گیا

اردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- بال مکند عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد

جلد ۱۱ ———— نمبر ۱

سالانہ چندہ	——	ہندوستان میں۔ چھ روپے پاکستان میں۔ چھ روپے
غیر ممالک سے	——	نو شلنگ یا ایک ڈالر
فی پرچہ	——	ہندوستان میں۔ آٹھ آنے پاکستان میں۔ آٹھ آنے

مئی ۱۹۵۳ء

ترتیب

بچوں کا آج کل

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱۔ دہلی

مانی جائسی

نقوشِ مانی

ذرّے افسانے سُناتے ہیں، کہیں تُم تو نہیں
جانِ عالم، یہ تمھارا ہی تکلّم تو نہیں

حدِّ امکانِ تماشا پہ نظر گُم تو نہیں
صنعِ قدرت یہی مہر و مہ و انجم تو نہیں

خاک اِس شبہے میں چھانی ہے بیابانوں کی
میری منزل انہی ذرّوں میں کہیں گم تو نہیں

ظاہراً سوئی ہے تقدیر تو دل جاگا ہے
واقعاً باعثِ بیداری دل تم تو نہیں

موت اِک مژدۂ جاں بخش بنی جاتی ہے
کون دامن کی ہوا دینے لگا، تم تو نہیں

اپنی ہستی کو جو موہوم سمجھتا ہوں میں
یہ یقیں ہے تری ہستی کا، توہم تو نہیں

دِل کو تسکین سی کچھ گریۂ پیہم سے ہوئی
میرا احساسِ گنہ تیرا ترحّم تو نہیں

جلوہ گر بھی وُہ اگر ہوں تو کہاں تابِ نظر
طالبِ دید ترے ہوش کہیں گُم تو نہیں

نغمۂ ناز برسنے لگا اُن آنکھوں سے
یہ مرے سازِ تمنّا کا ترنّم تو نہیں

مُسکراتا ہوں مصیبت میں کوئی کیا سمجھے
یہ بھی اک شکل ہے ماتم کی تبسّم تو نہیں

ظرفِ مانی میں ہے وسعت بہ عطائے ازلی
یہ نہ چھلکے گا، صُراحی تو نہیں خُم تو نہیں

طاہر دانیال

ابوالکلام اور بذلہ سنجی

اُردو کے مشہور ادیبوں کے خطوط میں تصوّراتِ ذہنی کی صورت گری، خیال آفرینی سے حقیقت رسی پیدا کر دینا، ماحول کے جبر سے آزاد رہ کر کسی اور دُنیا کی باتیں چھیڑ دینا، زندگی کے مسائل کی گتھیاں کھولتے جانا، فلسفہ اور سائنس کے نکات باتوں باتوں میں کہہ دینا، علم اور ادب کا گہرا امتزاج، بذلہ سنجی و لطافتِ طبعی کا متنوع اندازِ نگارش، یہ تمام باتیں ابوالکلام آزاد کو چھوڑ کر کسی کے یہاں نہ مل سکیں گی۔

اُردو کا کوئی ایسا ادیب اور شاعر نہیں جس نے مولانا کی نثر کی داد نہ دی ہو۔ حسرت موہانی کا شعر سب سے بڑی سند قرار دی جا سکتی ہے

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر   نظمِ حسرت میں بھی مزا نہ رہا

اس وقت مولانا کی نثر یا اُن کے خطوط پر کوئی ہمہ گیر تبصرہ مقصود نہیں بلکہ مولانا کے خطوط میں جو طنز اور مزاح کی چاشنی، بذلہ گوئی اور ظرافت سنجی کی نمک گیری پائی جاتی ہے، اس پر لکھنے کی ایک کوشش ہے۔

آج تک مولانا پر تنقید اور تبصرے کے لحاظ سے بہت کم لکھا گیا ہے۔ اُردو کے کسی صاحب طرز اور منفرد رنگ ادیب یا شاعر کے ساتھ اتنی بے اعتنائی نہیں برتی گئی جس قدر کہ ابوالکلام کے ساتھ، ایسا کیوں ہوتا رہا؟ یہ ایک طویل داستان ہے، تاہم مولانا پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں مولانا کے طنز و مزاح اور ان کی بذلہ سنجی پر تقریباً لکھا ہی نہیں گیا۔

بذلہ سنجی اور مزاح نگاری میں غالب اور ابوالکلام میں اشتراک اور مماثلت پائی جاتی ہے لیکن غالب کے پاس علم و کمال نبوغ و فضل کا وہ متاعِ گراں نہیں جو ابوالکلام کے حافظے کے کسی ایک گوشے میں پڑا ہوا ہے اس سے غالب کی بذلہ گوئی صرف بذلہ گوئی ہو کر رہ جاتی ہے اور ابوالکلام کے مزاح میں گہرے طنز کی خلش محسوس ہونے لگتی ہے ان کی بذلہ سنجی سے ایسی باتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو بہار دماغی اور شگفتہ روئی پیدا کرنے کے علاوہ طراوتِ دلی بھی اور درسِ نگاہی بھی لئے ہوئے ہوتی ہیں۔

کشمیر کی سیر و سیاحت کا ذکر کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"افسوس ہے لوگوں کو پھل کھانے کا شوق ہوا۔ عالمِ بہار کی جنّت نگاہیوں کا شوق نہ ہوا۔ کشمیر جائیں گے بھی تو بہار کے موسم میں نہیں بارش کے بعد پھلوں کے موسم میں۔ معلوم نہیں دُنیا اپنی ہر بات میں اتنی شکم پرست کیوں ہو گئی ہے؟ حالانکہ انسان کو معدہ کے ساتھ دل و دماغ بھی دیا گیا تھا۔" صفحہ ۲۵۱

قلعہ احمد نگر کے اپنے ہمراہی زندانیوں کی بے ذوقی کا ماتم کرتے ہوئے بے ذوقی بایں معنی کہ مولانا کا ذوقِ چائے نوشی ان کے دودھ دہی کے شوق کو گوارا نہیں کرتا، ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"دودھ اور دہی کی دُنیا چائے کی دُنیا سے کتنی دُور واقع ہوئی ہے عمریں گذر جائیں پھر بھی یہ مسافت طے نہیں ہو سکتی۔ کہاں چینی کے ذوقِ لطیف کا شہرستانِ کیف و سرور اور کہاں دودھ اور دہی کی شکم پُری کی نگری؟

اِک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں" صفحہ ۲۳۳

چین کی وہ بہترین چائے جو "وہائٹ جیسمین" کہلاتی ہے مولانا اس کو گوری چنبیلی کا نام دیتے ہیں۔ رنگ کو اس قدر ہلکا بتاتے ہیں کہ "واہمہ پر اس کی ہستی مشتبہ ہو جائے" اور کیف کو اس قدر تند و تیز کہ "اس کا ہر فنجان قاآنی کے رطلِ گراں کی یاد تازہ کر دے۔ اپنے ایک خط میں فنجان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"آپ کو معلوم ہے کہ میں چائے کے لئے روسی فنجان کام میں لاتا ہوں۔ یہ چائے کی معمولی پیالیوں سے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اگر بے ذوقی کے ساتھ پیجیئے تو دو گھونٹ میں ختم ہو جائیں مگر خدا نخواستہ میں ایسی بے ذوقی کا مرتکب کیوں ہونے لگا۔" صفحہ ۱۰۲

چین کی بہترین چائے کا ذخیرہ ختم ہو گیا ہے۔ مولانا اس کی نایابی اور لوگوں

کی بے ذوقی نیز عام استعمال ہونے والی چائے پر طنز کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں

"وہ چینی چائے جس کا عادی تھا کئی دن ہوئے ختم ہوگئی اور احمد نگر
اور پونا کے بازاروں میں کوئی اس جنسِ گرانمایہ سے آشنا نہیں

یک نالۂ مستانہ ز جائے نشنیدیم
ویراں شود آں شہر کہ میخانہ ندارد

مجبوراً ہندوستان کی اس سیاہ پتی کا جوشاندہ پی رہا ہوں جسے تعبیر و تسمیہ
کے اس قاعدہ کے بموجب کہ

برعکس نہند نامِ زنگی کافور

لوگ چائے کے نام سے پکارتے ہیں اور دودھ ڈال کر اس کا گرم شربت
بنایا کرتے ہیں

درماندۂ صلاح و فسادیم الحذر
زیں رسم ہا کہ مردمِ عاقل نہادہ اند" صفحہ ۱۸۹

سیاہ پتی کے جوشاندے اور دودھ ڈال کر گرم شربت بنا لینے پر جو مزاحاً طنز کئے گئے ہیں کوئی ادب شناس ہی اس کی داد دے سکتا ہے۔ اس گرم شربت کو کہیں وہ سیال حلوا بتلاتے ہیں کہیں کثافت آلودہ جوہر لطیف، حقیقت یہ کہ مولانا کی انفرادیت مذہب ادب اور فنونِ لطیفہ میں ہی نہیں بلکہ چائے نوشی کے باب میں بھی پائی جاتی ہے۔ وہ خود ایک خط میں لکھتے ہیں

"واقعہ یہ ہے کہ وقت کے بہت سے مسائل کی طرح اس مسئلہ (چائے نوشی)
میں بھی طبیعت کبھی سوادِ اعظم کے مسلک سے متفق نہ ہو سکی ——
چائے کے باب میں ابنائے زمانہ سے میرا اختلاف صرف شاخوں اور پتوں
کے معاملہ میں ہی نہیں کہ مفاہمت کی صورت نکل سکتی بلکہ سرے سے
جڑ میں ہوا۔" صفحہ ۱۹۰

اسی خط میں دوسری جگہ سیاہ پتی پر مولانا کے طنز کی ناوک افگنی دیکھئے
"کوئی ان زیاں کاروں سے پوچھے کہ اگر چائے نوشی سے مقصود انہی
پتیوں کو گرم پانی میں ڈال کر پی لینا ہے تو اس کے لئے ماہرینِ فن کی
دقیقہ سنجیوں کی کیا ضرورت ہے؟ جو پتی بھی پانی کو سیاہی مائل کر دے
اور ایک تیز بو پیدا ہو جائے چائے ہے اور اس میں ٹھنڈے دودھ
کا ایک چمچہ ڈال کر کافی مقدار میں گندگی پیدا کر دی جا سکتی ہے۔ چائے
کا ایک ماہرِ فن بھی اس سے زیادہ کیا خاک بتلائے گا؟

ہیں یہی کہنے کو وہ بھی اور کیا کہنے کو ہیں" صفحہ ۱۹۹

ہندوستان کی اس سیاہ پتی کے بارے میں جب وہ لوگوں کو رد و قدح کرتے دیکھتے ہیں کہ کوئی سیلون کی چائے کو بہترین قرار دے رہا ہے اور کوئی دارجلنگ کی چائے کو تو ان کو فریب خوردگانِ رنگ و بو کہتے ہوئے

چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

پڑھ بیٹھتے ہیں۔ مولانا اس باہمی رد و کد اور غلط فہمی کا سبب اپنے ایک خط میں نہایت بذلہ سنجی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

"دراصل یہ عالمگیر غلط فہمی اس طرح پیدا ہوئی کہ انیسویں صدی کے
اوائل میں جب چائے کی مانگ ہر طرف بڑھ رہی تھی ہندوستان کے
بعض انگریز کاشتکاروں کو خیال ہوا کہ سیلون اور ہندوستان کے
بلند اور مرطوب مقامات میں چائے کی کاشت کا تجربہ کریں۔ انہوں نے
چین سے چائے کے پودے منگوائے اور یہاں کاشت شروع کی۔
یہاں کی مٹی نے چائے پیدا کرنے سے تو انکار کر دیا مگر تقریباً اسی
شکل و صورت کی ایک دوسری چیز پیدا کر دی۔ ان زیاں کاروں نے اسی کا
نام چائے رکھ دیا اور اس غرض سے کہ اصلی چائے سے ممتاز رہے اسے
کالی چائے کے نام سے پکارنے لگے۔

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

دنیا جو اس جستجو میں تھی کہ کسی نہ کسی طرح یہ جنس کامیاب ارزاں ہو،
بے سمجھے بوجھے اس پر ٹوٹ پڑی اور پھر تو گویا پوری نوعِ انسانی نے
اس فریب خوردگی پر اجتماع کر لیا۔ اب آپ سر پیٹئے، سنتا کون ہے؟

اسی کی سی کہنے لگے اہلِ حشر
کہیں پرسشِ داد خواہاں نہیں" صفحہ ۱۹۳

چائے میں دودھ ملانے کی ابتدا بھی انگریزوں سے ہوئی اس لئے مولانا چائے کے معاملے میں سب سے زیادہ خیرہ مذاق انگریزوں کو ہی قرار دیتے ہیں اور ان کے اس فعل کو بدعتِ سیئہ۔ انگریزوں کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"یہ نزدیکانِ بے بصر حقیقتِ حال سے اتنی دور جا پڑے کہ چائے
کی حقیقی لطافت و کیفیت کا ذوق انہیں چھو بھی نہیں گیا۔

آشنا را حال ایں ست وائے بر بیگانہ" صفحہ ۱۹۵

زندانیوں کے قافلے میں صرف ایک ساتھی ہے جو مولانا کے نزدیک چائے نوشی

کا قدرے ذوق رکھتا ہے۔ کسی موقع پر مولانا نے ان کو چائے پر مدعو کر لیا تھا۔ اس کا ذکر مولانا کی ہی زبان سے سُنا جائے۔

"ان حضرات میں صرف ایک صاحب ایسے نکلے جنہوں نے ایک مرتبہ میرے
ساتھ سفر کرتے ہوئے یہ چائے پی تھی اور محسوس کیا تھا کہ اگرچہ بغیر
دودھ کی ہے مگر اچھی ہے یعنی بہت چیز تو وہی دودھ والا گرم شربت
ہوا جو وہ روز پیا کرتے ہیں مگر یہ بھی چنداں بُری نہیں۔
ان کے لئے یہ صرف اچھی ہوئی۔ یہاں چائے کا سارا معاملہ ہی ختم ہو جائے
اگر یہ "اچھی" ہے ختم ہو جائے۔ غالب کیا خوب کہہ گیا ہے۔
زاہد از ما خوشۂ تاکے بہ چشم کم مبیں
ہیں! نہ می دانی کہ یک پیمانہ نقصاں کردہ ایم" صفحہ ۲۰۴

مولانا جلد سو جانے اور سویرے بیدار ہو جانے کو اپنے مرحوم والد کے الفاظ میں زندگی کی سعادت کی پہلی علامت بتلاتے ہیں وہ عہدِ طفلی سے ہی سحر خیزی کے معاملے میں چاق و چوبند واقع ہوئے ہیں۔ بھولا بھائی ڈیسائی آنجہانی کی کوٹھی سے وہ ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو گرفتار کیئے جاتے ہیں۔ نصف شب گذر چکی تو مولانا بسترِ خواب پر دراز ہوئے اور چار بج کر دس منٹ پر اُن کو بیدار کرا دیا گیا کہ آپ کی گرفتاری کے لئے دو فوجی افسر اور ڈپٹی کمشنر پولیس آئے ہوئے ہیں۔ مولانا کو تیاری کرنے میں ڈیڑھ گھنٹے کا وقفہ کرنا پڑا ۵ بجکر ۵۴ منٹ پر وہ ڈپٹی کمشنر پولیس کے ہمراہ روانہ ہو گئے۔ جس وقت وہ احمد نگر لے جانے والی ٹرین میں پہنچکر اپنے ساتھیوں کی حالت دیکھتے ہیں تو ایک خط میں اس کا ذکر مزاح اور طنز کے ساتھ کرتے ہیں

"بعض احباب جو مجھ سے پہلے پہنچائے جا چکے تھے ان کے چہرے
پر بے خوابی اور ناوقت کی بیداری بول رہی تھی۔ کوئی کہتا تھا رات ۱ بجے
سویا اور چار بجے اٹھا دیا گیا۔ کوئی کہتا تھا۔ بہ مشکل ایک گھنٹہ نیند کا
ملا ہوگا۔ میں نے کہا معلوم نہیں سوئی ہوئی قسمت کا کیا حال ہے؟ اُسے
بھی کوئی جگانے کے لئے پہنچا یا نہیں
درازیٔ شب و بیداریٔ من ایں ہمہ نیست
ز بختِ من خبر آرید تا کجا خفت است" صفحہ ۴

قلعہ احمد نگر جہاں کہ مولانا اور اُن کے ساتھی نظر بند کئے گئے تھے ملک احمد نظام الملک نے پہلے اس کو تعمیر کیا تھا مگر اس کا حصار مٹی کا تھا پھر اس کے لڑکے برہان نظام شاہ اوّل نے اسے منہدم کرا کے از سرِ نو پتھر کا حصار تعمیر کرایا تھا جس پر سے صدیوں کا کارواں گزر چکا اور اُسے روند چکا ہے۔ پونا سے آگے کے لئے جب ٹرین روانہ ہو گئی تو مولانا کا خیال قلعہ احمد نگر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ وہ اس انتخاب کی موزونیت کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں

"ہم خراباتیوں کے لئے کوئی ایسا ہی خرابہ ہونا چاہیئے تھا
یا یک جہاں کدورت، یا زایں خرابہ جائے است"

اندر کا مستطیل احاطہ غالباً دو سو فٹ لمبا اور ڈیڑھ سو فٹ چوڑا ہوگا۔ اس کے متعلق لکھتے ہیں

"کم از کم اتنی جگہ ضرور ہے کہ جی بھر کے خاک اڑائی جا سکتی ہے
سر پہ ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیئے
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے
سبحان اللہ اس روزگارِ خراب کی ویرانیاں بھی اپنی آبادیوں کے کرشمے
رکھتی ہیں اس پُرانی قبر گاہ جو کہ قلعہ میں واقع ہے) ویران بھی ہونا تھا
تو اس لئے کہ کبھی ہم زندانیانِ خراباتی کے شور و ہنگامے سے
آباد ہو" صفحہ ۵۶

احمد نگر کے زندانیوں کے معاملے میں گورنمنٹ آف انڈیا نہایت رازداری سے کام لے رہی تھی۔ ہر کس و ناکس تو کجا، جیلر تک کو تلاشی دینی پڑتی تھی۔ قلعہ فوجی افسروں کی نگرانی میں تھا۔ باورچی کی دقت پیش آئی۔ قیدیوں میں کوئی باورچی نکل نہ سکا۔ چیتہ خاں (سپرنٹنڈنٹ جیل، یہ نام مولانا کا رکھا ہوا ہے) اس سلسلے میں کافی سرگرمی دکھلاتا ہے لیکن کوئی کام نہ بن سکا۔ بالآخر ایک روز وہ یہ خوشخبری سُناتا ہے کہ شہر میں سے کلکٹر نے ایک اچھے باورچی کا انتظام کر دیا ہے۔ چنانچہ دوسرے دن اس کو قلعہ میں لایا گیا۔ اس کی تصویر اور حلیہ مولانا کے الفاظ کے آئینہ میں دیکھئے۔

"دوسرے دن کیا دیکھتا ہوں کہ واقعی ایک جیتا جاگتا آدمی اندر
لایا گیا ہے۔ معلوم ہوا طباخ (یا باورچی) موعود یہی ہے
آخر آمد زپسِ پردۂ تقدیر پدید
مگر نہیں معلوم اس غریب پر کیا بیتی تھی کہ آنے کو تو آ گیا تھا لیکن کچھ
ایسا کھویا ہوا اور سراسیمہ حال تھا۔ جیسے مصیبتوں کا پہاڑ سر پر ٹوٹ
پڑا ہو۔ وہ کھانا کیا پکاتا اپنے ہوش و حواس کا مسالہ کوٹنے لگا۔" صفحہ ۹۰

قلعے کا کمانڈنگ آفیسر باہر کے آدمی کو باورچی بنا کر رکھنے کے لئے پونا کے صدر دفتر کی ہدایت کا منتظر تھا۔ اس باورچی کا قلعہ سے باہر جانا مناسب نہ سمجھا گیا

اب یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ اس کو رکھا کہاں جائے۔ بذلہ سنجی اور طنز نگاری کا بہترین نمونہ مولانا کے خط کے اس پیراگراف میں دیکھئے۔

"اسے کلکٹر کے یارانِ طریقت کی عقلمندی سمجھئے یا بے وقوفی کہ اُسے بہلا پھسلا کر یہاں کے مقامی قید خانے میں بھیج دیا کیونکہ اُن کے خیال میں قلعہ کے علاوہ اگر کوئی اور محفوظ جگہ یہاں ہو سکتی تھی تو وہ قید خانے کی کوٹھڑی ہی تھی۔ قید خانے میں جوں ہی رات دن قید و بند کے توسے پر سینکا گیا تو بھوسنے تلنے کی ساری ترکیبیں بھول گیا۔ اس احمق کو کیا معلوم تھا کہ ساٹھ روپے کے عشق میں یہ پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ اس ابتدائے عشق ہی نے کچومر نکال دیا تھا۔ تلو تک پہنچتے پہنچتے قلیہ بھی طیار ہو گیا۔

کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا" صفحہ ۹۱

مولانا کی شوخ مزاجی کبھی کبھی عجیب بہار دکھلا جاتی ہے۔ ایک روز صبح ساڑھے تین بجے وہ اپنے مخاطب اور مکتوب الیہ مولانا حبیب الرحمن شروانی کو خط لکھنے کے لئے قلم اٹھا کر چاہتے ہیں کہ درازنفسی ذوقِ مخاطبت اور نصف ملاقات کی خواہش پوری کی جائے۔ اس کا حال انہی کی زبان سے سُنا جائے

"اس وقت لکھنے کے لئے قلم اُٹھایا تو معلوم ہوا کہ سیاہی ختم ہو رہی ہے۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ سیاہی کی شیشی خالی ہو چکی تھی۔ نئی شیشی منگوانی تھی مگر منگوانا بھول گیا۔ میں نے سوچا۔ تھوڑا سا پانی کیوں نہ ڈال دوں؟ یکایک چائے دانی پر نظر پڑی۔ میں نے تھوڑی سی چائے فنجان میں انڈیلی اور قلم کا منہ اس میں ڈبو کر پچکاری چلا دی۔ پھر اُسے اچھی طرح ہلا دیا کہ روشنائی کی دھندلی پوری طرح نکھر آئے اور اب دیکھئے روشنائی کی جگہ چائے کے تند و گرم عرق سے اپنے نفسہائے سرد صفحۂ قرطاس پر نقش کر رہا ہوں۔" صفحہ ۱

یہ جو بذلہ سنجی اور مزاح نگاری کی بہترین مثالیں ہمیں مولانا کے یہاں ملتی ہیں اُن کے اندر سے مولانا کی علمیت اور فضیلت کی سرسراہٹ صاف سنائی دیتی ہے۔ وہ اپنے لطائف میں بھی کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور پیدا کر دیتے ہیں جو نکتہ اور علم کی موشگافی ہوتی ہے۔

مولانا کی قیام گاہ کے صحن میں چڑیوں نے گھونسلے بنائے تھے۔ چھت سے تنکوں گھاس کے ریشوں کی بارش ہونے لگی۔ پانی کا جگ وہ بھر دا کے رکھتے ہی پاتے ہیں کہ تنکوں کی بارش ہونے لگتی ہے۔ بالآخر ایک روز تنگ آ کر مولانا نے کمرِ ہمت باندھ لی کہ آج ان کا دفعیہ کر دیا جائے۔

"غبارِ خاطر" کے انتیس مکاتیب جو مولانا نے مولانا حبیب الرحمن شیروانی کے نام لکھے ہیں ان میں طنز، مزاح نگاری، بذلہ سنجی، ظرافت کی بہترین مثالیں، ۱۷ اور ۱۸ مارچ ۱۹۴۳ء کے دو خطوں میں بہتات اور کثرت سے ملتی ہیں۔ دونوں خط معیاری مزاح نگاری کی تصویر ہیں۔ چنانچہ ان خانہ برانداز چڑیوں کے تدارک کی داستان مولانا کے ۱۷ مارچ کے خط میں دیکھئے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"چند دنوں تک تو میں نے صبر کیا لیکن پھر برداشت نے صاف جواب دے دیا اور فیصلہ کرنا پڑا کہ اب لڑائی کے بغیر چارہ نہیں

من و گرز و میدان و افراسیاب

یہاں میرے سامان میں ایک چھتری بھی آ گئی ہے۔ میں نے اٹھائی اور اعلانِ جنگ کر دیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد معلوم ہو گیا کہ اس کوتاہ دستی کے ساتھ ان حریفانِ سقف و محراب کا مقابلہ ممکن نہیں۔ حیران ہو کر کبھی چھتری کی نارسائی دیکھتا کبھی حریفوں کی بلند آشیانی۔ بے اختیار حافظ کا شعر یاد آ گیا۔

خیالِ قد بلندِ تو می کند دلِ من
تو دستِ کوتہِ من بیں و آستینِ دراز

اب کسی دوسرے ہتھیار کی تلاش ہوئی۔ برآمدہ میں جالا صاف کرنے کا بانس پڑا تھا دوڑتا ہوا گیا اور اُسے اٹھا لیا۔ اب کچھ نہ پوچھئے کہ میدانِ کارزار میں کس روز کا رن پڑا۔ کمرہ میں چاروں طرف حریف طواف کر رہا تھا اور میں بانس اٹھائے دیوانہ وار اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا فردوسی اور نظامی کے رجز بے اختیار زبان سے نکل رہے تھے

بہ خنجر زمیں را میستاں کنم
بہ نیزہ ہوا را نیستاں کنم

آخر میدان اپنے ہی ہاتھ رہا اور تھوڑی دیر کے بعد کمرہ ان حریفانِ سقف و محراب سے بالکل صاف تھا۔

بہ یک تاختن تا کجا تاختم
چہ گردن کشاں را سر انداختم" صفحہ ۲۵۶

مولانا اس تعاقبِ پیہم کے باوجود بھی کامیاب نہ ہو سکے تو مجبور ہو کر ان

حریفانِ سقف و محراب سے دوستی کی راہ رسم پیدا کرنے لگتے ہیں۔ دری کو خوب صاف رکھتے ہیں تاکہ چاول کے دانے جو اُن سے دوستی کی راہ بڑھانے کے لئے بطورِ تواضع ڈالے گئے ہیں صاف نظر آئیں۔ لیکن اُن کی طبیعت کی جھجک بار بار مانع ہوتی ہے۔ چڑیاں آتی ہیں اور چاول کے دانوں کے پاس سے گزر جاتی ہیں۔ ایک چڑا جس کا نام مولانا نے موتی رکھ چھوڑا ہے اس کے عشوہ و تغافل کی داستان بڑے مزے سے کر بیان کرتے ہیں۔ اس ناز و انداز کی جلوہ فروشی کے عین عالم میں ایک چڑا آدھمکتا ہے۔ اسی خط میں مولانا لکھتے ہیں

"التفات و تغافل کی ان عشوہ گریوں کی ابھی جلوہ فروشی ہو ہی رہی تھی کہ ناگہاں ایک تنومند چڑے نے جو اپنی قلندرانہ بے دماغی اور رندانہ جسارتوں کے لحاظ سے پورے حلقہ میں ممتاز تھا سلسلۂ کار کی درازی سے اُکتا کر بے باکانہ قدم اُٹھا دیا اور زبانِ حال سے نعرۂ مستانہ لگاتا ہوا یک بیک دفعہ دانوں پر ٹوٹ پڑا

نہ دیدیم بر صفِ رنداں و ہرچہ بادا باد"

مولانا یہ لطیفہ لکھنے کے بعد اس سے ایک نکتہ پیدا کر دیتے ہیں اس سے آگے لکھتے ہیں۔

"غور کیجئے تو اس کارگاہِ عمل کے ہر گوشہ کی قدم رانیاں ہمیشہ اسی ایک قدم کے انتظار میں رہا کرتی ہیں۔ یہ اُٹھا اور گویا ساری دُنیا اچانک اُٹھ گئی

نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد" صفحہ ۲۶۳

یہ چڑا جو بے دماغی اور وارفتگی کی سرگرانیوں کے ساتھ ایک خاص طرح کے بانکپن سے اپنی وضعِ قلندرانہ چمکائے ہوئے تھا مولانا نے اس کا نام قلندر تجویز کر دیا۔

رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ ان چڑیاؤں کی جھجک بھی اس قلندر کی قلندرانہ جسارتوں کے سبب سے جاتی رہی اور وہ مولانا کے بغل میں حلقہ بنا کر بے تکلف چہچہانے کودنے لگیں اب ان وحشیانِ فضائی کے لئے مولانا خطرناک نہ رہے۔ وہ لکھتے ہیں

"بہرحال رفتہ رفتہ ان ہوائی ہوائی کو یقین ہو گیا کہ یہ صورت جو ہمیشہ صوفے پر دکھائی دیتی ہے آدمی ہونے پر بھی آدمیوں کی طرح خطرناک نہیں ہے۔"

مولانا اپنی اس بذلہ سنجی سے حقیقت رسی و نکتہ گیری پیدا کر دیتے ہیں وہ لکھتے ہیں

"دیکھئے محبت کا افسوں جو انسانوں کو رام نہیں کرتا وحشی پرندوں کو رام کر لیتا ہے

درسِ ادیب اگر بود زمزمۂ محبتے
جمعہ بہ مکتب آورد طفلِ گریز پائے را" صفحہ ۲۶۶

بلکہ نوبت بایں جا رسید

"بارہا ایسا ہوا کہ میں اپنے خیالات میں محو لکھنے میں مشغول ہوں اتنے میں کوئی دلنشین بات نوکِ قلم پر آ گئی یا عبارت کی مناسبت نے اچانک کوئی پُرکیف شعر یاد دلا دیا اور بے اختیار اُس کی کیفیت کی خود رفتگی میں میرا سر و شانہ ہلنے لگا۔ یا منہ سے "ہا" نکل گیا اور یکایک زور سے پروں کے اُڑنے کی ایک پھرسی آواز سنائی دی۔ اب جو دیکھتا ہوں تو معلوم ہوا کہ یارانِ بے تکلف کا ایک طائفہ میری بغل میں بیٹھا بے تامل اپنی اُچھل کود میں مشغول تھا۔ اچانک انہوں نے دیکھا کہ یہ پتھر اب ہلنے لگا ہے، تو گھبرا کر اُڑ گئے۔ عجب نہیں، اپنے جی میں کہتے ہوں یہاں صوفے پر ایک پتھر پڑا رہتا ہے، لیکن کبھی کبھی آدمی بن جاتا ہے۔" صفحہ ۲۶۷

مولانا کی شوخ طبعی اور ظرافت مزاجی کا نمونہ جو ہمیں ان کے الفاظ کی نقاشی گری کی صورت میں ملتا ہے اس کی نظیر اُردو ادب کی تمام مزاح نگاری میں نہیں مل سکتی۔ پطرس، رشید احمد صدیقی، چغتائی، رموزی نے مزاح نگاری میں جو اپنا مقام پیدا کیا ہے وہ ہزار لازوال سہی مگر ابو الکلام کی اس بذلہ سنجی اور مزاح نگاری کے سامنے ماند نظر آنے لگتا ہے۔

ابھی اس "منطق الطیر" میں کچھ اور بھی شناسائیاں باقی ہیں۔ دو چڑوں کا حال مولانا دوسرے خط میں لکھتے ہیں۔

"ایک چڑا بڑا تنومند اور جھگڑالو ہے۔ جب دیکھو زبان فرفر چل رہی ہے اور سر اٹھا ہوا اور سینہ تنا ہوا رہتا ہے۔ جو بھی سامنے آ جائے دو دو ہاتھ کئے بغیر نہیں رہے گا۔ کیا مجال کہ ہمسایہ کا کوئی چڑا اس محلے کے اندر قدم رکھ سکے۔ کئی منہ زوروں نے ہمت دکھائی لیکن پہلے ہی مقابلہ میں چت ہو گئے۔ جب کبھی فرش پر یارانِ شہر کی مجلس آراستہ ہوتی ہے تو یہ سر و سینہ کو جنبش دیتا ہوا اور داہنے بائیں نظر ڈالتا ہوا فوراً آ موجود ہوتا ہے اور آتے ہی اُچک کر کسی بلند جگہ پہ پہنچ جاتا ہے۔ پھر اپنے شیوۂ خاص میں اس تسلسل کے ساتھ

چوں اچاں، چوں اچاں شروع کر دیتا ہے۔ کہ ٹھیک ٹھیک فاآنی کے

واعظک جامع کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔"

اس کا نام مولانا نے مُلا تجویز کر ڈالا اس کے بالکل برعکس دُوسرا چڑا

"جب دیکھئے اپنی حالت میں گم اور خاموش ہے

کاں راکہ خبر شد خبرش باز نیامد

بہت کیا تو کبھی کبھار ایک ہلکی سی نا تمام چوں کی آواز نکال دی۔ دو تیتر

چڑے اس کا پیچھا کرتے ہیں گویا اس کی کم سخنی سے عاجز آ گئے ہیں

پھر بھی اُس کی زبان کھلتی نہیں، البتہ نگاہوں پر کان لگائیے تو آن کی

صدائے جوش سُنی جا سکتی ہے

تو نظر باز نۂ ورنہ تغافل نگہ است

تو زباں فہم نۂ ورنہ خموشی سخن است

میں نے یہ حال دیکھا تو اس کا نام صوفی رکھ دیا اور واقعہ یہ ہے کہ یہ لقب

جامۂ بود کہ بر قامتِ او دوختہ بُود!" صفحہ ۲۷۵

مولانا کی نیرنگی، بذلہ سنجی اور بوقلموں مزاح نگاری اس قدر ہے کہ صرف

ایک مکتوب شوخ رنگ پر کافی لکھا جا سکتا ہے مگر بخوف طوالت اختصار سے کام لینا

پڑ رہا ہے۔

ڈاکٹر سید محمود کو نہ جانے بیٹھے بٹھائے کیا سوجھتی ہے کہ وہ دانہ طشتری میں لئے

ہوئے چیسڑیاؤں کو، "آ آ" کرتے ہوئے بلانے کی ناکام کوشش کرنے لگتے ہیں مگر وہ

آہوانِ ہوائی کب دانوں پر نگاہِ غلط انداز ڈالتے ہیں۔ سید محمود کو اپنی ناکامی پر تاسف

ہے۔ مولانا اُن سے کچھ دریافت کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں

"سید محمود کہنے لگے عجب معاملہ ہے دانہ دکھا دکھا کر جتنا پاس جاتا ہوں

اتنی ہی تیزی سے بھاگنے لگتی ہیں گویا دانہ کی پیش کش بھی ایک

جرم ہوا

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے

کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

میں نے کہا طلب و نیاز کی راہ میں قدم اُٹھایا ہے تو عشوہ و ناز کی

تغافل کیشیوں کے لئے صبر و شکیب پیدا کیجئے۔ نیاز عشق کے

دعوؤں کے ساتھ نازِ حسن کی گلہ مندیاں زیب نہیں دیتیں" صفحہ ۲۳۲

سید محمود کی صلائے عام اور آوازۂ بخشش جنگلی مینائوں کو ملتفت نہ کر سکا۔ البتہ

مولانا کی زبان میں

"شہرستانِ ہوا کے دریوزہ گرانِ ہرجائی یعنی کوؤں نے ہر طرف سے

ہجوم شروع کر دیا میں نے کوؤں کو دریوزہ گرانِ ہرجائی اس لئے

کہا کہ کبھی انہیں مہمانوں کی طرح کہیں جاتے دیکھا نہیں۔ ہر دروازے

پر پہنچے، صدائیں لگائیں اور چل دئے

فقیرانہ آئے صدا کر چلے" صفحہ ۲۳۳

سید محمود کی بخشش عام رائگاں نہ جا سکی۔ بھکاریوں اور سائلوں کی یورش ہونے لگی۔

مولانا لکھتے ہیں

"صحن کے شمالی کنارے میں نیم کا تناور درخت ہے اس پر گلہریوں کے

جھنڈ کودتے ہیں۔ انہوں نے جو دیکھا کہ

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

تو فوراً لبیک اور مرحمت عالی زیادہ کہتے ہوئے اس دسترخوانِ کرم

پر ٹوٹ پڑیں

یاراں صلائے عام است گرمی کنید کارے

پھر فوراً گردن اُٹھا لیتیں، ٹکڑا چباتی جاتیں اور سر ہلا ہلا کر کچھ اشارے

بھی کرتی جاتیں۔ گویا محمود صاحب کو دادِ ضیافت دیتے ہوئے

بطریقِ حسن طلب یہ بھی کہتی جاتی ہیں کہ

گرچہ خوب است و لیکن قدرے بہتر ازیں" صفحہ ۲۳۴

بلکہ معاملے نے یہاں تک طول پکڑ لیا کہ سید محمود کے ساتھیوں کو اندیشہ محسوس

ہونے لگا کہ ابھی تو احمد نگر کی کوؤں کی یورش ہوئی ہے کہیں آگے چل کر تمام دکن کے

کوے قلعہ احمد نگر پر دھاوا نہ بول دیں۔ چنانچہ ان سے درخواست کی گئی کہ فیض عام کا

یہ لنگر خانہ کچھ دنوں کے لئے ہی ملتوی کر دیا جائے۔

مولانا لکھتے ہیں

"ابھی سید محمود صاحب اس درخواست پر غور کر ہی رہے تھے کہ

ایک دُوسرا واقعہ ظہور میں آ گیا۔ ایک دن صبح کیا دیکھتے ہیں کہ چھت

کی منڈیر پر دو مُعمر مشیبن [?] گدھ بھی تشریف لے آئے ہیں

پیری سے کمر میں اک ذرا خم توقیر کی صورتِ مجسم

اور گردن اُٹھائے صلائے سفرہ کے منتظر ہیں

اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی صفحہ ۲۳۶

سید محمود صاحب نے یہ کہتے ہوئے کہ بزرگوں سے سنا ہے کہ گدہوں کا آنا نحوست لاتا ہے اپنا اصطبل خانہ بند کر ڈالا ۔ مولانا اس کا ذکر کرتے ہیں

"اُن کی تشریف آوری ہمارے لئے تو بڑی ہی بابرکت ثابت ہوئی کیونکہ اِدھر تو اُن کا مبارک قدم آیا اُدھر محمود صاحب نے ہمیشہ کے لئے اپنا سفرۂ کرم لپیٹنا شروع کر دیا۔ ایک لحاظ سے معاملہ پر یوں بھی نظر ڈالی جا سکتی ہے کہ اُن کی آمد کی آبادی میں اس ہنگامۂ ضیافت کی ویرانی پوشیدہ تھی۔ دیکھئے کیا موقع سے مومن خاں کا قصیدہ یاد آ گیا

شیخ جی آپ کے آتے ہی ہوا دیر خراب
قصدِ کعبہ کا نہ کیجے گا بہ ایں یمنِ قدوم" ص ۲۳۶

صبح کے وقت صحن میں بلبل کی آواز مولانا کو سنائی دیتی ہے۔ اس کی شیریں نوائی کی طرف ایک صاحب کو (جو کہ صحن میں اس وقت ٹہل رہے تھے) توجہ دلاتے ہیں۔ وہ صاحب بلبل کی صدائے سامعہ نواز کو چھکڑے کے پہیوں کی آواز بتانے لگتے ہیں۔ اس بے ذوقی سماعت پر مولانا کے طنز کی آبداری دیکھنے کے لائق ہے۔

"سبحان اللہ ذوقِ سماع کی دقتِ امتیاز تو دیکھئے بلبل کی نواؤں اور چھکڑے کے پہیوں کی ریں ریں میں یہاں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔

ہمائے گو مفگن سایۂ شرف ہرگز
دراں دیار کہ طوطی کم از زغن باشد۔" ص ۲۴۷

مولانا موسم سرما کی دلچسپیوں کا ذکر بڑے مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں ہندوستان کے موسم سرما کو اس درجہ تنک مایہ قرار دیتے ہیں کہ ابھی آیا بھی نہیں کہ جانا شروع کر دیتا ہے۔

وہ مزاح کے ساتھ جنت کے موسم پر خدشہ کا اظہار کرتے ہیں

"معلوم نہیں بہشت کے موسم کا کیا حال ہوگا؟ وہاں نہروں کا ذکر بہت سننے میں آیا ہے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں گرمی کا موسم نہ رہتا ہو!

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف، سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو" ص ۲۱۲

مولانا نے جہاں کہیں بھی ظرافت طبعی سے کام لیا ہے ابتذال اور رکاکت کا شائبہ تک پیدا نہیں ہونے دیا۔ مولانا کی مزاح نگاری اور لطیفہ گوئی لطیف حسیات کو چھو کر دل و دماغ میں پھریری پیدا کر دیتی ہے۔ مولانا قہقہوں کے بجائے ہلکے پھلکے تبسموں اور نازک مسکراہٹوں سے دلوں کو طراوت اور تازگی بخشتے ہیں اور زندگی کو زعفران زار بنا دینے والے لطائف سے کام لیتے ہیں ان کی طبع خلوت پسند خاموش مسکراہٹوں کو ہی گوارا کر سکتی ہے تو طرازیوں کے قہقہے کب ان کی مجلس میں گذر سکتے ہیں۔

سیمنٹ کی صنعت

پانچ سالہ پلان کے تحت سیمنٹ کی صنعت کی ترقی کا جو پروگرام مرتب کیا گیا ہے اُس کے مطابق ۵۶-۱۹۵۵ء میں بھارت میں ۴۸ لاکھ ٹن سیمنٹ تیار ہوگا۔ اس طرح پلان کے آخری سال کے دوران بھارت اپنی ضروریات کے علاوہ تین لاکھ ٹن فالتو سیمنٹ دوسرے ملکوں کو برآمد کر سکے گا۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ۵۱-۱۹۵۰ء میں بھارت میں سیمنٹ کی پیداوار صرف ۲۶ لاکھ ۹۲ ہزار ٹن تھی۔

سیمنٹ تیار کرنے کی صنعت کا شمار ہمارے ملک کی مضبوط صنعتوں میں ہوتا ہے۔ ۱۹۵۲ء میں بھارت میں سیمنٹ کے کارخانوں کی تعداد ۲۳ تھی ۵۲-۱۹۵۱ء میں کل ۳۳ لاکھ ۹۰ ہزار ٹن سیمنٹ تیار کیا گیا۔ ۵۱-۱۹۵۰ء تک اس صنعت پر کل ۲۵ کروڑ روپے کا سرمایہ لگایا گیا اور اسی سال سیمنٹ کے مختلف کارخانوں میں کام کرنے والے اشخاص کی تعداد ۳۳ ہزار تھی۔ ۵۱-۱۹۵۰ء کے بعد غیر ممالک سے سیمنٹ کی درآمد میں بڑی کمی واقع ہوئی ہے۔ ۵۲-۱۹۵۱ء میں بہت کم مقدار میں سیمنٹ درآمد کیا گیا جبکہ ۵۱-۱۹۵۰ء میں ۷ ہزار ٹن سیمنٹ غیر ملکوں سے منگوایا گیا تھا۔ گذشتہ جنگ کے دوران بھارت سے سیمنٹ کی برآمد شروع کی گئی تھی لیکن اختتام جنگ کے بعد ملکی ضروریات میں اضافے کے باعث زیادہ مقدار میں سیمنٹ برآمد نہیں کیا جا سکا۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۴ء تک بھارت میں سیمنٹ کی کھپت اوسطاً چھ سات لاکھ ٹن سالانہ رہی ہے۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۵ء تک سیمنٹ کی اوسط کھپت ۲۰ لاکھ ٹن سالانہ رہی اور ۵۶-۱۹۵۵ء تک سیمنٹ کی کھپت ۴۵ لاکھ ٹن تک پہنچ جانے کا امکان ہے۔ اسی دوران پیداوار ۴۸ لاکھ ٹن تک پہنچ جائے گی جو ملکی ضروریات سے تقریباً تین لاکھ ٹن فالتو ہوگی۔

محمد حمید الدین محمود

مارشل اسٹالن — اس صدی کی شخصیت

۶ مارچ کو سرکاری اعلانیہ کے بموجب ۹ بج کر پچاس منٹ پر ۵ مارچ کی رات کو روس کا ۷۳ سالہ ڈکٹیٹر اور اشتراکیت کا سب سے بڑا محرم اور عالم اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ بلا مبالغہ وہ اپنے زمانے کی ایک اہم شخصیت تھا جس کے ایک جملے پر مہینوں تبصرے مباحثے اور قیاس آرائیاں کی جاتیں۔ اتنی ہی خاموش اور پر اسرار اس کی شخصیت تھی۔ اس کے چہرے پر چھایا ہوا سکون اس کو بحر الکاہل سے بھی زیادہ ساکن اور گہرا بناتا تھا۔ اور جس طرح اس عظیم سمندر کے سینے میں کتنے ہی طوفان مچلتے ہیں اور کتنی ہی گہرائیاں انگڑائی لیتی ہیں۔ اسی طرح اس عظیم انسان کی آہنی شخصیت نے اپنے اندر کتنے کارنامے اور عزائم چھپا رکھے تھے اور کتنی ہی بلندیاں اور وادیاں اس میں پنہاں تھیں۔ اس کے پائپ سے نکلنے والا دھواں اس کے چہرے کے مقابل آکر حلقے بنانے لگتا تو اس کی گہری آنکھیں کچھ کچھ دکھائی دیتیں اور دنیا ان میں آنے والے طوفانوں کی جھلکیاں ڈھونڈھنے لگتی۔ اس نے جس قوت کے ساتھ بانی انقلاب روس لینن کے دست راست ٹراٹسکی سے ٹکر لے کر اسے شکست دی اسی اولوالعزمی سے اس نے اپنی آمریت کی بنیادوں کو فولادی بنایا اور اس طرح روس کے ہاتھوں میں وہ قوت آئی جو اس کی پچھلی تاریخ میں کہیں بھی موجود نہیں ملتی۔ اسٹالن نے جس اقتدار اور عظمت کو حاصل کیا وہ زار کے بھی بس کی بات نہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک کامریڈ تھا۔ دنیا کے کروڑوں مزدوروں اور کسانوں کا ناخدا ہونے کے باوجود وہ ایک عام مزدور ہی سمجھا جائے گا۔ ۱۹۰۱ء میں دنیا کے نقشے پر کوئی سرخ دھبہ تک نہ تھا لیکن آج اس گلوب کا ⅓ حصہ بہ اعتبار رقبہ اشتراکی بن چکا ہے اور اس کو اشتراکی بنانا دراصل اس شخص کی زندگی کا مشن تھا جو بچپن میں شریر اور آوارہ بچوں کی ٹولیاں جمع کر کے اپنی زیر قیادت شہر کی دکانیں لوٹا کرتا۔ یہی اسٹالن جس کو چرچ کے ارباب ایک عظیم پادری دیکھنا چاہتے تھے "مذہب انسانیت کے لئے افیون ہے" کے مکتب خیال کا مالک بنا۔ تاریخ اس اسٹالن کی عظمت اور قوت ارادی کا اعتراف کئے بنا نہیں رہ سکتی جس کا بچپن اس کے والدین کو ہمیشہ شکی بنا دیتا کہ ان کا لڑکا زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے گا آج عظیم تر روس کا معمار بنا جس نے اپنی خاموش کارکردگی اور بلندیٔ عزم سے اپنے زمانے کے عظیم ترین عملی انسان ہٹلر کو نیچا دکھایا۔ جب اسٹالن نے لینن کے ہاتھوں اقتدار کی باگ ڈور سنبھالی تھی تو روس کی سیاسی معاشی سماجی حالت اس درجہ گر چکی تھی کہ وہ دنیا کا سب سے کمزور ملک تھا۔ لیکن جب اس نے کریملن کی دیواروں کو خدا حافظ کہا تو اس کا ذرہ ذرہ گواہی دے رہا تھا کہ اس نے اس کی بنیادوں میں اپنا خون بہا کر اسے اتنی طاقت دی ہے کہ زمانے کا بڑے سے بڑا طوفان بھی اس کو ہلا نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ لینن کی وفات کے بعد اقتدار کے لئے جیسی کشمکش چلی اور جس کی تلخی نے روسی سیاسیات میں تھلکہ مچا دیا ویسی ہی کشمکش کے امکانات اسٹالن کی موت سے بھی وابستہ تھے لیکن امر واقعہ نہ بن سکے۔ یہ اسٹالن کی مخصوص قیادت کا نتیجہ ہے۔ جس کے باعث اسٹالن کے گزرنے کا بین الاقوامی سیاسیات اور ملکی سیاسیات پر ویسا اثر نہ پڑ سکا جس کی توقع کی جا رہی تھی۔ اگرچہ کہ اس سانحۂ عظیم کے ساتھ روس کی تاریخ کے ایک باب کا خاتمہ ہوتا ہے۔ سر ظفر اللہ خاں نے تعزیتی پیام میں بڑی خوب صورتی سے بیسویں صدی پر اس آہنی انسان کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا کہ مارشل اسٹالن کی عظیم شخصیت نے بنی نوع انسان کے ایک بڑے حصے کی زندگی اور غور و فکر پر وسیع تر اثرات مرتب کئے۔ اور وقت ہی اس اثر کی گہرائی اور نوعیت کا فیصلہ کر سکے گا۔ اور جو بات مسلمہ ہے وہ یہ کہ آپ ان نامور ہستیوں میں ہمیشہ شمار کئے جائیں گے جن کا تذکرہ کرنے اور جن کے کاموں پر بحث کرنے کے لئے تاریخ اپنے آپ کو مجبور پاتی ہے۔ ایسی عظیم ہستی کی رحلت ایک ایسا مہیب بھونچال ہے جس کے فوری نتائج ممکن ہے کہ نمایاں نہ ہوں لیکن ان کے عواقب بے شمار ہوں گے جب کہ ان کو گزرے ہوئے ایک طویل عرصہ ہوا ہوگا"۔ میں نے بھی جب کبھی یہ سوچا کہ اس

صدی کی سب سے اہم شخصیت کون ہے؟ تو ہمیشہ میں نے اسٹالن کو
اپنی طرز کا اہم ترین آدمی پایا جس کے ایک ایک نقطہ کی یہ دعوت تھی کہ ہمیشہ
اس پر تبصرے ہوتے ۔ انسانی ذہنیتوں پر اتنا بڑا اثر کسی اور نے نہیں ڈالا ۔
تاریخ انسانی انہیں نئے روس کا معمار' دوسری جنگ کے فاتح' اقوام متحدہ
کے بانی اور بیسویں صدی کی تاریخ کے نئے دور کے علمبردار کی حیثیت سے یاد
رکھے گی ۔ اسٹالن کی زندگی اس نئے دور کی مکمل تاریخ ہے جس میں مہیب جنگوں
کے ساتھ ساتھ امن کی مخلص کوششوں کے بھی شواہد ملتے ہیں ۔

بچپن اور انقلابی زندگی

ریاست جارجیا کے مقام طفلس کے ایک قصبے گوری میں ایک کفش دوز کے
گھرانے میں ۲۱ دسمبر ۱۸۷۹ء میں جوزف دسار نوچ جوگاشوی کا جنم ہوا۔ بچپن
میں شرارت اور آوارگی کے مظاہرے والدین کو اس لڑکے کے مستقبل سے مایوس
کر دیا جو اپنے حواریوں کی ٹولیاں بنا کر دکانیں لوٹتا ۔ اور جس کو بعد میں دنیا
نے ایک قوم کا معمار اور محافظ جانا ۔ اسٹالن یہ نام انہوں نے ۱۹۱۲ء میں
اپنایا ۔ ابھی ساتویں سال ہی میں تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا ۔ اور بیوہ ماں
نے بچے کو مقامی چرچ میں شریک کروا دیا ۔ تعجب کا مقام ہے کہ چرچ کی فضا میں
اس شریر اور آوارہ لڑکے کو نظم و ضبط اور آداب کا نہ بھلائے جانے والا سبق
اس طرح پڑھایا گیا کہ چرچ کے ارباب اور اس کی ماں کے خوابوں میں کتنی ہی امیدیں
مسکرائیں اور اسٹالن پر اس تیسرے سبق کا اثر یہ تھا کہ مارکسی خیالات کا حامل
گروہ جو وہاں موجود تھا' اسٹالن سے گھبراتا تھا ۔ لیکن اس خلش کے باوجود
کشش تھی جس نے نوجوان جوزف کو جو ابھی اپنے پندرھویں سال میں تھا
انقلابی جماعت سے گٹھ جوڑ کرنے پر مجبور کر دیا ۔ ۱۸۹۸ء میں سوشل ڈیمو
کریٹک پارٹی کے مقامی گروپ نے اسٹالن کو رکن بنا لیا ۔ جس کے نتیجے کے طور پر
مئی ۱۸۹۹ء میں اسٹالن کو چرچ سے نکال برخاست کیا گیا ۔ اب اسٹالن نے
اپنی انقلابی جدوجہد کے جاری رکھنے میں کسی بھی بندھن کو اپنے اطراف لگا ہوا
نہ پایا ۔ کھلی انقلابی جدوجہد کے آغاز کے ساتھ ہی ۔ ۱۹۰۲ء میں بمقام باٹم
مارشل اسٹالن کو پہلی مرتبہ گرفتار ہونا پڑا ۔ اور اٹھارہ ماہ کے لئے سائبیریا
کو جلا وطن ہونا پڑا ۔ اسٹالن کی ایک دلچسپ خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے
کبھی بھی سزا کی میعاد پوری نہیں کی بلکہ ہمیشہ سے درمیان ہی میں راہ فرار
اختیار کی ۔ ۱۹۰۵ء بمقام ٹامرفور ایک جماعتی کانفرنس میں پہلی مرتبہ لینن سے
ملاقات کی ۔ آئیوونووچ کے فرضی نام سے ۱۹۰۶ء میں اسٹاکہوم کانگرس اور ۱۹۰۷ء
میں لندن کانگرس میں جس میں پہلی مرتبہ انہوں نے ٹراٹسکی کو دیکھا شرکت کی ۔
۱۹۰۸-۱۹۱۰ء میں وہ دوبار گرفتار ہوئے اور پھر جیل سے بھاگ نکلے ۔ اس کے بعد
انہوں نے اپنی انقلابی کارروائیوں کا مرکز باکو سے سینٹ پیٹرز برگ میں منتقل
کر دیا ۔ جہاں انہیں ایک اور مرتبہ گرفتار ہونا پڑا لیکن جلد ہی وہ بھاگ نکلے ۔
جنوری ۱۹۱۲ء میں انہیں کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی مجلس عاملہ کا رکن بنا دیا گیا ۔
آپ نے جماعت کے نئے ترجمان "پراودا" کے اجراء کے لئے نمایاں کوششیں کیں اور
اس کے اداریے اور مقالے لکھے ۔ ۱۹۱۲-۱۳ء میں بیرون ممالک کی سیر کی ۔ یہ زمانہ ان
کی انقلابی سرگرمیوں کے معراج کا تھا جبکہ آپ چھ مختلف ناموں سے انقلاب کو جنم
دینے والی کوششوں میں مصروف تھے ۔ انہیں ناموں میں سے ایک "اسٹالن" (فولادی
انسان) بھی تھا ۔ فروری ۱۹۱۳ء میں وہ چھٹی اور آخری مرتبہ گرفتار کر لئے گئے
اور چھ سال کی قید سخت گزارنے کے لئے شمالی سائبیریا کو جلا وطن کر دئے گئے
جہاں سے کوئی بھی قیدی واپس نہ آ سکا ۔ اور مارشل اسٹالن بھی شاید چھ سال
سے پہلے واپس نہ آ سکتے اگر ۱۹۱۷ء کا فروری انقلاب جنم نہ لیتا جس کے
نتیجے کے طور پر تمام انقلابی قیدی رہا کر دئے گئے ۔ ان چار سالوں میں مارشل
اسٹالن عملی کام تو کر نہ سکتے تھے انہوں نے سوچنا شروع کیا کہ مستقبل ہی پر وہ کیسے
انقلاب کو کیسے کامیاب بنایا جا سکتا ہے ۔ ۱۹۱۷ء میں جب انقلابی کارکنوں کی
رہائی کا اعلان ہوا تو آپ مرکزی مجلس عاملہ کے پہلے رکن تھے جنہوں نے سینٹ پیٹرز برگ
میں قدم رکھا ۔ عجلت اور تنگی وقت کے باعث "پراودا" کی ادارت بھی انہی کے تفویض
کر دی گئی ۔ انہوں نے صوبائی حکومتوں سے تعاون کرنا چاہا لیکن چونکہ لینن کا منشا
ہرگز یہ نہ تھا کہ روس کسی جنگ میں دھکیل دیا جائے اس لئے مارشل اسٹالن کو
روکنے کے لئے لینن سوئٹزرلینڈ سے بند گاڑی میں ماسکو پہنچے ۔

انقلاب ۱۹۱۷ء کے بعد

۱۱ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو روس کے انقلاب عظیم نے جنم لیا ۔ اور مزدوروں اور کسانوں کی نمائندہ
حکومت نے اقتدار کی باگ ڈور سنبھالی اور نئے روس کی نئی زندگی کا آغاز ہوا تب
اسٹالن اپنی جماعت کے صف اول کے اراکین میں تھا ۔ لینن نے اسٹالن کو وزیر
برائے نیشنلٹیز بنایا ۔ ۱۹۱۸ء میں آپ نے روسی سوویٹ جمہوریہ کے مسودۂ
دستور کی طیاری میں حصہ لیا ۔ ۱۹۲۳ء میں یونین آف سوویٹ سوشلسٹ ریپبلکس
کے وفاقی دستور کی طیاری میں مدد کی ۔

۱۹۲۲ء میں روسی سیاسیات میں موڑ پیدا ہونے لگا۔ اس زمانے میں ٹراٹسکی اور اسٹالن لینن کے دونوں بازو اور ایک دوسرے کے مولیف مقابل سمجھے جاتے تھے۔ ٹراٹسکی لینن نے پنج سالہ منصوبے کو روبہ عمل لانے میں منہمک تھا اور شخصی اقتدار کے حصول کی اسے چنداں ہوس نہ تھی۔ لیکن اسٹالن نے دور اندیشی سے کام لے کر جماعت کی معتمدی جو اس کی نظر میں "اقتدار اعلیٰ تک پہنچنے کا زینہ تھی" پر قبضہ کرلیا۔ یہ مارچ ۱۹۲۲ء کا مہینہ تھا جبکہ ٹراٹسکی بحیثیت وزیر جنگ عظیم سرخ روسی فوج کی تنظیم اور روسی دفاع کی تعمیر میں مصروف تھا۔ اس لئے جماعت پر اپنا قبضہ جمائے رکھنے کا خیال اس کے دماغ میں جگہ نہ پا سکا۔ اگرچہ باہمی اختلافات ٹراٹسکی اور اسٹالن میں اس وقت نمایاں تھے اور لینن بھی ان سے لاعلم نہ تھا۔ لیکن ان کو ختم کرنے اور روس کو آنے والی خانہ جنگی سے بچانے کے لئے وہ کچھ نہ کرسکا۔ یہ اختلافات لینن ہی کے دائرہ علم میں نہ رہ سکے بلکہ اس سے بہت پہلے ۱۹۱۳ء کی بارھویں کانگرس ہی میں نمایاں ہو چکے تھے۔ لینن اسٹالن و ٹراٹسکی میں مصالحت کروا نہیں اس لئے ناکام رہا کہ اسٹالن ایک سخت گیر جوشیلا خود شناس کھرا قسم کا انقلابی تھا جبکہ لینن کی نظر میں ٹراٹسکی ایک بہترین مدبر مثالی انقلابی کمیونسٹ اور دوربین اور شائستہ سیاستدان تھا۔ جس میں اسٹالن کا سا کھرا پن اور سخت گیری نہیں تھی۔ علاوہ اس کے اسٹالن "ایک ملک میں سوشلزم" کے نظریے کا حامل تھا جبکہ ٹراٹسکی "مستقل عالمی انقلاب" اور سوویٹ دستور کے حدود میں جمہوریت کے بتدریج قیام کا حامی تھا۔ اسٹالن روس کے زراعتی نظام کو اولیت دینے پر مائل تھا جبکہ ٹراٹسکی کا مطمع نظر روسی صنعتی نظام کی تعمیر تھا۔ لینن کی زندگی تک اقتدار کے لئے کشمکش کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوسکتا تھا لیکن جب جنوری ۱۹۲۴ء میں لینن نے سفر آخرت اختیار کیا تو تاریخ انقلاب میں سب سے کڑی رسہ کشی دیکھنے میں آئی۔ لینن کو بڑا افسوس یہ تھا کہ جماعت کا معتمد بن کر اسٹالن نے اقتدار کی کنجی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور ٹراٹسکی کی راہ میں پہاڑ بن کر حائل ہو گیا۔ لینن نے ایک خط میں اس ضمن میں لکھا کہ "اسٹالن بہت ہی کھردرا اور بے مروت قسم کا انسان ہے جس کو جلد از جلد کسی شائستہ تر آدمی سے بدل دینا چاہئے" نہ صرف یہ بلکہ اس نے اپنی آخری وصیت میں بھی اسٹالن کو ہٹا کر ٹراٹسکی کو اس کی جگہ لانے کا اشارہ کیا۔

اسٹالن ٹراٹسکی کشمکش

۱۹۲۵ء میں لینن کی جدائی کے بعد ٹراٹسکی کو مسلح اور گہری سازش کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنے نظریاتی اختلافات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسٹالن نے اپنا ہم خیال گروپ وسیع کرنا شروع کر دیا۔ کامینوف اور زائنوویف بھی ٹراٹسکی کے ساتھ بدنصیبی کے اس اقلیتی لیکن عقل مند گروہ میں شامل ہو گئے۔ ٹراٹسکی جو لینن کا دست راست اور دوسرا مقبول ترین قائد انقلاب تھا ۱۹۲۶ء میں پارٹی کانگرس اور کومن ٹرن دونوں کے اجلاسوں میں بری طرح ذلیل اور رسوا کیا گیا۔ مخالف نعرے اور تضحیک وغیرہ سے ٹراٹسکی کو مجبور کیا کہ وہ اپنے عہدے سے دستبرداری اور پارٹی سے علیحدگی میں اپنی فلاح محسوس کرے۔ ٹراٹسکی کو اعتبار نہ آتا تھا کہ یہ دنیا دم کے دم میں یوں بدل سکتی ہے۔ ٹراٹسکی' کامینوف اور زائنوویف کا اتحاد بعد از وقت تھا۔ اسی سال نومبر میں ٹراٹسکی اور اس کے دونوں ہم خیال ساتھیوں کو جماعت سے نکال دیا گیا اور جلا وطن کیا گیا۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب عظیم کا ہیرو وسط ایشیا میں پناہ کی تلاش میں سرگرداں پھر رہا تھا اور دسمبر ۱۹۲۹ء میں کریملن کے عظیم الشان محل میں اسٹالن کی پچاسویں سالگرہ جو اس کے برسر اقتدار آنے کے بعد کی پہلی تھی دھوم دھام سے منائی جا رہی تھی۔ تاریخ روس میں ایک نئے باب کے اضافے اور ایک نئے انسان کے ظہور کے ساتھ ساتھ انقلاب کی عظمت پیچھے ٹراٹسکی کے قدموں کے نشانات دھندلے ہو رہے تھے۔ کریملن کی اونچی اونچی دیواروں نے جارحانہ سخت گیر جوشیلے کمیونسٹ کو اپنے درمیان گھیر لیا جبکہ ٹراٹسکی کو اس کے پھوٹے نصیب نے یوروپی صدمہ مقاموں کی خاک چھاننے اور وہاں سے میکسیکو کی ہوا کھانے کے لئے کریملن سے دور اٹھا کر پھینک دیا تھا۔ نہ صرف ٹراٹسکی بلکہ اس کے تمام حمایتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں اسٹالن کے حکم سے چلائے ہوئے مقدموں کے ذریعے اور ۱۹۳۷ء میں بغیر کسی مقدمے کے ٹراٹسکی کے تمام ہم خیالوں کو جن میں ماہرین نظم و نسق اور نامور جرنیل بھی شامل تھے قتل کر دئے گئے۔

کریملن میں

جب اسٹالن نے اقتدار حاصل کرلیا تو اپنے نظریات پر وہ برقرار نہ رہ سکا کیوں کہ اسے ان کے صحیح نہ ہونے کا اب علم ہوا۔ زراعتی بہبود اور ترقی کو ملک کی صنعتی تعمیر پر اولیت دینے اور ایک ملک میں اشتراکیت کا نعرہ لگانے والے اسٹالن نے ٹراٹسکی کے نظریوں کو یعنی ملک کے صنعتی نظام کی تعمیر اور بین الاقوامی دائمی انقلاب کو اپنانے کی کوشش کی۔ اس لئے اپنے پنج سالہ منصوبۂ ترقی میں ملکی صنعتی نظام کی تعمیر کو سب سے اہم عنصر قرار دیا۔ ۱۹۲۸ء میں پہلا اور ۱۹۳۲ء میں دوسرا پنج سالہ منصوبۂ ترقی روبہ عمل لایا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں اسٹالن کا بنایا ہوا دستور نافذ ہوا۔

مئی ۱۹۴۱ء میں اسٹالن نے صدر مجلس وزراء کا موقف اختیار کر لیا۔ ۲۲۔ جون ۱۹۴۱ء کو جرمنی نے روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ان ہنگامی حالات کے تقاضوں کے تحت اسٹالن کو مارچ ۱۹۴۳ء میں مارشل اور اس کے بعد ہی جنرل اسموبن جانا پڑا۔ فوجی پیش قدمیوں اور سیاسی سرگرمیوں کے قریبی مطالعے اور مغرب کے رویہ کو سمجھنے کے لئے اپنے مشاہیر مغرب سے ملاقاتیں کرنا، عشائیے دینا اور اہم اجتماعات میں شریک ہونا شروع کیا۔ مسٹر چرچل دو مرتبہ ماسکو آئے۔ پہلی مرتبہ اگست ۱۹۴۲ء میں اور دوسری مرتبہ مسٹر ایڈن کے ساتھ ۱۹۴۴ء میں۔ دسمبر ۱۹۴۳ء میں بمقام طہران چرچل، روزویلٹ و اسٹالن ملاقات (اکابر ثلاثہ کانفرنس) ہوئی۔ اور دوبارہ فروری ۱۹۴۵ء میں بمقام یالٹا یہ تینوں اکابر دوبارہ ملے ۱۹۴۵ء کے ماہ جولائی میں پوٹسڈم کے مقام پر مسٹر چرچل کے بجائے مسٹر اٹیلی اور صدر روزویلٹ کے عوض صدر ٹرومین نے مارشل کے ساتھ اکابر ثلاثہ کی اس کانفرنس میں شرکت کی جو یورپی جنگ کے اختتام پر منعقد ہوئی تھی۔ اس جنگ میں سب سے زیادہ قربانیاں روسیوں نے دیں۔ ۲۰ ملین روسی ہلاک ہوئے اور ملک روس نازی بربریت کا شکار ہوا لیکن اس کے باوجود روسیوں کے عزم و استقلال میں لرزہ نہ پیدا ہو سکا بلکہ حق کی فتح میں اُن کے ایقان کو استحکام حاصل ہوا۔ اسی لئے آج روسی امن کی اہمیت اور جنگ کی لعنت کو بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔

دوسری جنگ میں ہٹلر کے خلاف اسٹالن کی کامیابی نے عالمی تاریخ میں اُن کے مقام کو محفوظ و متعین کر دیا۔ اُن کی خاموش کارگزاری نے اُنہیں ایک انوکھی شخصیت کی حیثیت میں پیش کیا۔ اور اُن کی اہمیت کو بہت ہی بڑھا دیا۔ مارشل اسٹالن نے اپنی آنکھوں سے ایک قوم کو کروٹ بدلتے دیکھا تھا۔ اب انھوں نے ایک نئے عالم کو جنم لیتے دیکھا، اور مصمم عزم کیا کہ نومولود کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رہیں گے۔ چنانچہ جنگ کے بعد ہی اسٹالن کی پالیسی کے نتیجے کے طور پر ایک ایسی صورت حال پیدا ہوئی جس سے روس نے سب سے زیادہ فائدہ اُٹھایا۔

مابعد جنگ دوران جنگ کی افواج میں آپ نے کوئی تخفیف نہ کی بلکہ ان کی تنظیم جدید اور تسلیح جدید کی (یہ صاف بتاتا ہے کہ اسٹالن کو اپنے ذاتی نظریہ "ایک ملک میں اشتراکیت" سے کتنا عملی اختلاف ہو چکا تھا۔ اور وہ کس حد تک ٹراٹسکی کے نظریہ "بین الاقوامی دائمی انقلاب" کی صداقت کو محسوس کر کے اس کو قبول کر چکے تھے) مشرقی یورپ کی تمام حکومتوں کو کریملین کے سائے میں گم کر دیا۔ یونان و جرمنی میں تعطل پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ایران کی شمالی سرحدوں پر اپنی فوجیں جمع کیں۔ اقوام متحدہ کی سخت مخالفت پر اُنھیں واپس ہٹا لینا پڑا۔ یونان میں ٹرومن نے ذاتی دلچسپی سے روسی عمل دخل کو بالکل ہی روک دیا۔ جرمنی میں صورت اتنی خطرناک ہو گئی کہ ۱۹۴۸ء و ۱۹۴۹ء میں برلن کسی وقت بھی تیسری جنگ کا نقطۂ آغاز بن سکتا تھا۔ برلن کی ناکہ بندی امریکی ہوائیہ کی سرگرمی کے سبب کامیاب نہ ہو سکی۔ لیکن اکتوبر ۱۹۴۹ء میں دنیا کی سب سے بڑی اشتراکی حکومت (بہ اعتبار آبادی) جمہوریہ چین وجود میں آ گئی۔ اس سے ایشیا میں روس کا مقام مضبوط تر ہو گیا۔ اور اس کا مورچہ ناقابل شکست بن گیا۔ لیکن اسٹالن کی سیاسی دانائی اور حکمت عملی کی سب سے بڑی ناکامی جنگ کوریا کا آغاز تھی۔ کوریا میں روسی وقار اور حکمت عملی کو سب سے بڑی ٹھیس پہنچی، اور اقوام متحدہ سے روس کا مقاطعہ جس نے روسی مخالفت کو کافی وزن دیا تھا غیر مشروط طور پر ختم کر دینا پڑا۔ اور اپنی شرائط کو منوائے بغیر روس نے ۱۹۵۰ء میں صیانتی مجلس کی صدارت کی۔ لیکن اس زمانے میں بھی روس کی حکمت عملی مغربی دنیا کے لئے ایک بڑی آزمائش رہی۔ کیونکہ روس نے تیسری جنگ کو یقینی بنانے والی ہر تجویز سے احتراز کیا۔ روس میں ایٹم بم کے دھماکے ہو رہے تھے لیکن مارشل اسٹالن کی خاموشی کا یہ عالم تھا کہ سال میں دو یا تین دفعہ سے زیادہ نہ بولتے تھے۔ کسی سفیر کی اسٹالن تک رسائی ایک کارنامے سے کم نہ تھی۔ صرف ڈاکٹر رادھا کرشنن اور مسٹر ایورل ہیریمن اسٹالن سے قریب ہو سکے تھے۔ روس کی پیچیدہ خارجی پالیسی دراصل اس خاموش انسان کی ایک حرکت تھی۔ اسٹالن نے اسی مخصوص پالیسی سے اقوام متحدہ میں اتنا کچھ حاصل کر لیا کہ روس کی وقعت اقوام متحدہ میں محفوظ رہ سکتی ہے۔ نئی جمہوریتوں کو تشکیل دینے سے مارشل کا مقصد یہ تھا کہ اقوام متحدہ میں زیادہ سے زیادہ نشستیں حاصل کی جائیں اور کمیونسٹ

بلاک کو مضبوط تر کیا جا سکے۔ اگرچہ جان توڑ کوششوں کے باوجود سرخ چین کو اقوامِ متحدہ میں ملانے میں روس ناکام رہا۔ جنگ ختم ہو چکنے کے بعد ڈھائی ماہ تک اسٹالن نے اپنی سرکاری مصروفیات کو خیرباد کہہ کر آرام کیا۔ اور اسی سال ماہ دسمبر میں اپنے فرائض پر رجوع ہوئے۔ جیمس بائرنس اور مسٹر ارنسٹ بیون (امریکی و برطانی وزرائے خارجہ) نے ان سے انہی ایام میں ملاقات کی۔ فروری ۱۹۴۶ء میں مارشل نے سپریم سوویٹ کے انتخابات لڑے۔ یہ وہی سال ہے جب کہ کمیونزم پر آپ کی تصنیفات کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔

اب وہ خاموش اور پُراسرار انسان بنتے جا رہے تھے۔ عوام میں آنا، معمولی کانفرنسوں میں شرکت کرنا، بیانات دینا اور سفراء سے ملاقات کرنا سب کچھ ختم کر دیا اور دُنیا پر قبضہ جمانے کی فکر میں رہے جو ممکن نہ ہو سکا۔ آپ کی اہمیت روز بروز بڑھتی جاتی اور آپ کے بیانات کا انتظار رہتا تھا۔ آپ کبھی کبھی پارٹی کانگریس میں شریک ہوتے تاکہ دنیا نے آپ کی زندگی سے متعلق جو شبہات لگائے ہوں اُن کو مٹا دیا جائے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن کو آپ نے دو دفعہ روس میں اُن کی آمد اور روس سے ان کی واپسی پر ملاقات کا موقع دیا اور اُن کو اچنبھے میں ڈال دیا جب کہ ہندوستانی سماج اور تمدّن کے پہلوؤں کو آپ واضح کرنے لگے۔ آپ نے ڈاکٹر سر رادھا کرشنن کے سامنے اپنی دو خواہشیں ظاہر کیں ایک یہ کہ اُن کا جانشین کوئی نوجوان صاحبِ عزم ہو اور دوسری یہ کہ جب وہ روسیوں کو خدا حافظ کہیں تو روس میں اتحاد امن اور مضبوطی ہو انتشار نہیں۔ آپ کی یہ دونوں خواہشیں ۶ مارچ سنہ ۱۹۵۳ء کو آپ کی موت کے بعد پوری ہوئیں۔ نہ اقتدار کے لئے کوئی کشمکش ہوئی نہ انتشار کے کچھ آثار نظر آئے۔ بلکہ روس نے ایک منظم و متحد قوم کی طرح اپنے باپ اور معمار کو اُس کی آخری آرام گاہ میں پہنچا دیا۔ انھیں دل کی وہ بیماری تھی جس نے لینن کو موت کا شکار بنا دیا۔ دو دن سے زیادہ آپ پر سکرات کا عالم طاری رہا اور اس عظیم انسان کے آخری الفاظ کسی دوسرے کے کان تک نہ پہنچ سکے۔ دنیا کے کونے کونے سے تعزیتی پیامات آئے۔ اور اُن کے عظیم کارنامے کو سراہا گیا۔ اور تاریخ میں اُن کے عظیم جداگانہ مقام کو تسلیم کیا گیا۔ کسی نے آپ کو اس زمانے کی سب سے عظیم شخصیت قرار دیا اور کسی نے آپ کو ایک عظیم ترین معمار و نجات دہندہ کا نام دیا۔ اشوک مہتا نے نہایت ہی سلجھے ہوئے انداز میں فرمایا وہ بیک وقت ایک اُبھارنے والی قوت اور ایک خوفناک مجبر تھے۔ "تاریخ انھیں ایک ایسی شخصیت جو اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کے ساتھ انسانوں کو ایک مہیب راستے پر لے جا سکتی ہے کی حیثیت سے یاد رکھے گی۔ اس عظیم شخصیت کو پنڈت نہرو نے جو خراجِ عقیدت پیش کیا وہ اسٹالن کی شخصیت کا بہترین اعتراف ہے۔ انھوں نے فرمایا "ایک رفیع الشان شخصیت کا مالک انسان جس نے اپنے زمانے میں وقت کے دھارے کو موڑا اور جو امن اور جنگ دونوں میں یکساں طور پر عظیم تھا۔ ان تمام سالوں میں کسی اور شخصیت نے مارشل اسٹالن سے زیادہ گہرے اثرات تاریخ کے صفحات پر نہیں چھوڑے اور ان سے زیادہ دیرپا اثر انسانی ذہنوں پر نہ ڈالا۔"

میر کی سُریلی آواز اسٹالن کی عظمت کا راز یوں کھولتی ہے ؎

مت سہج ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

غزل

داغ وہ تو نے دیا ہے کہ چھپا بھی نہ سکوں
گر ہو منظور دکھانا تو دکھا بھی نہ سکوں

کیا غضب ہے کہ تجھے پاس بُلا بھی نہ سکوں
اور تو مجھ کو پکارے تو میں آ بھی نہ سکوں

ہائے وہ غم جسے الفاظ میں لا بھی نہ سکوں
اور چاہوں تو اسے دل میں چھپا بھی نہ سکوں

خود گرائے ہیں جو انوار پہ میں نے پردے
وائے تقدیر کہ اب اُن کو اُٹھا بھی نہ سکوں

مجھ سے بے چارگیٔ عالمِ فریاد نہ پوچھ
لب پہ لانے کو ہوں مجبور تو لا بھی نہ سکوں

داغ ہے دل کا کسی روز چمک اُٹھے گا
یہ کوئی درد نہیں ہے کہ دکھا بھی نہ سکوں

وہ تصوّر نے بچھائی ہے نگاہوں میں بساط
کہ سجا بھی نہ سکوں اور اُٹھا بھی نہ سکوں

صدمۂ ہجر ترا ایک قیامت ہے مگر
نہیں احسان کسی کا کہ اُٹھا بھی نہ سکوں

رُوح کے ساز پہ آزاد وہ رقصاں ہے غزل
کہ سُنانے پہ ہوں مائل تو سُنا بھی نہ سکوں

شری رام سرنا

کویت میں

آج بھی ایسے آدمیوں کی تعداد بہت ہی تھوڑی ہوگی جو دنیا کے نقشے پر کویت کا صحیح صحیح پتہ بتا سکیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ بین الاقوامی سیاست کو ہنگاموں سے فرصت ہی کہاں تھی کہ وہ اس ملک کی خبر لیتی، اور سیاسی جغرافیہ تو لے دے کر بڑے ملکوں کے سیاسی اقتدار کے حلقے مقرر کرنے میں ہی مصروف رہا۔ وسط مشرق کی یہ چھوٹی سی ریاست اس تاریک زمرے میں شامل تھی جسے عالم گیر اقتصادی مصلحتوں نے پس ماندہ قرار دے رکھا تھا یا یوں کہئے کہ پس ماندہ بنا رکھا تھا۔ کویت کے پاس ریگستان عرب کی ریت تو تھی لیکن اس خطۂ زمین کی اہمیت ریت کے باعث نہیں بلکہ اس ریت کے نیچے بہنے والے تیل کے ذخیروں کے باعث ہے۔ اور معدنیات کے مغربی ماہرین کا قیاس تھا کہ کویت میں اور جا ہے جو کچھ بھی ہو تیل دستیاب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مغربی سیاست دانوں اور اُن کے پیچھے چلنے والے جغرافیہ دانوں اور سائنس دانوں نے ایران اور عراق کی طرف ساری توجہ مرکوز کر دی، اور کویت ترقی یافتہ دنیا سے بچھڑ گیا۔

لیکن قسمت کی دیوی تو ہرجائی ہے۔ وہ نہ تو بین الاقوامی سیاست کی رہین منت ہے اور نہ عالم گیر اقتصادی مصلحتوں کی محتاج۔ اس کی چال انوکھی ہے اور اس کے رنگ نرالے۔ اس لئے صدیوں کے بعد اچانک قسمت نے پلٹا کھایا، اور کویت میں دولت کے انبار لگا دئے۔ آج مغربی سیاستداں اور سائنس داں کویت کے ارد گرد چکر کاٹ رہے ہیں۔ دنیا کے سیاسی اور اقتصادی جغرافیہ میں کویت کی اہمیت اُجاگر ہوتی جا رہی ہے اور کویت ترقی یافتہ دنیا کے عین اندرونی گھیروں میں جا پہنچا ہے۔ خیال ہے کہ کویت کا حکمراں شیخ عبد اللہ السلیم الصباح آج دنیا کا سب سے بڑا امیر آدمی ہے۔ ۱۹۵۲ء میں اس کی کل آمدنی ۵ کروڑ پونڈ یعنی ۷۵ کروڑ روپیہ تھی۔ دولت کی اس فراوانی کے مقابلے میں نظام حیدرآباد کے گنجینے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں ـــــ امریکہ کے کروڑپتی راک فیلر کی آمدنی بھی ہیچ ہو جاتی ہے۔ آخر یہ ہوا کیسے؟ بتایا جاتا ہے کہ کویت کے ریگستان کے نیچے دنیا بھر میں تیل کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔ کویت سے جو ریاست کویت کا دارالخلافہ ہے، صرف ۲۵ میل دور برگان میں تیل کے ۱۵ ارب بیرل (ایک بیرل ۴۲ گیلن کا ہوتا ہے) کی موجودگی کا اندازہ لگایا جا چکا ہے۔ یہ علاقہ صرف آٹھ یا دس میل کے گھیرے میں ہے۔ لیکن دنیا بھر میں اس وقت زمین کے نیچے جتنے بھی تیل کے ذخائر معلوم کئے جا چکے ہیں اُن کا ½ حصہ صرف اسی جگہ مدفون ہے اور تیل کی موجودہ قیمتوں کے حساب سے کویت کے اس ذخیرہ کی مالیت قریباً ۸ ارب پونڈ یا ۱۲۰ ارب روپیہ ہوگی۔ مزید برآں کویت کے جنوب میں سعودی عرب اور کویت کی سرحد پر ایک غیر جانبدار خطہ ہے جو سعودی عرب کے بادشاہ عبد العزیز السعود اور کویت کے حکمراں شیخ عبد اللہ السلیم کی مشترکہ ملکیت ہے۔ اس علاقہ میں کئی امریکن کمپنیوں نے تیل کی جستجو میں تجربے کئے ہیں۔ ابھی تک ان تجربوں کے نتائج کا اعلان نہیں کیا گیا۔ اگر یہ نتائج کامیابی کے حامل ہوں تو کویت کے لئے مزید اور گراں قدر آمدنی کا راستہ کھل جائے گا۔

کویت کے تیل کا ڈراما ۱۹۳۲ء میں شروع ہوا۔ جب کہ تیل کے اس بے بہا ذخیرے کا سراغ ملا تھا۔ اس تیل کو نکالنے کے لئے کویت آئل کمپنی عالم وجود میں آئی۔ یہ کمپنی نصف نصف کی شراکت پر ایران کی اینگلو ایرانین آئیل کمپنی اور پیٹس برگ (امریکہ) کی گلف آئل کارپوریشن کی مشترکہ ملکیت کے زیر تحت جاری کی گئی تھی۔ شروع میں تلاش کا رُخ شمال کی طرف تھا۔ ۱۹۳۶ء میں البحارہ میں ایک کنواں کھودا گیا لیکن یہ تجربہ ناکام رہا۔ پھر بھی تلاش جاری رہی۔ بعد میں تلاش کا رُخ جنوب

کی طرف موڑ دیا گیا۔ آخر ۱۹۳۸ء میں برگان کے علاقے میں تیل مل گیا لیکن دوسری جنگ عظیم چھڑ جانے پر کام التوا میں پڑ گیا۔ جنگ کے خاتمے پر ۱۹۴۴ء میں پھر کام شروع کیا گیا اور ۱۹۴۶ء میں تیل کی عالمگیر تاریخ میں ایک انقلاب خیز باب جلوہ گر ہوا۔

کویت میں تیل کی پیداوار کا اندازہ لگانے کے لئے یہ موازنہ کافی ہوگا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں تیل کے ایک عام کنویں سے اوسطاً ۱۲ بیرل روزانہ نکل سکتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں وسط مشرق میں تیل کے ایک عام کنویں سے اوسطاً چار ہزار بیرل روزانہ نکل سکتے ہیں۔ کسی کسی جگہ تو یہ مقدار ۱۶ ہزار تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ لیکن تیل کی اوسط پیداوار کے تمام شمارے کویت میں ہزیمت خوردہ ہو جاتے ہیں۔ خیال رہے کہ ۱۹۴۹ء میں برگان میں تیل کے دو لاکھ چالیس ہزار بیرل روزانہ نکلتے رہے تھے اور ۱۹۵۱ء میں یہ تعداد بڑھتے بڑھتے چھ لاکھ پچاس ہزار بیرل تک جا پہنچی تھی۔ روزانہ پیداوار کی رفتار ابھی ترقی پذیر ہے۔

ماہرین کا اندازہ ہے کہ تیل کا ایک کنواں کھودنے اور تیل نکالنے پر تقریباً ۸۰ ہزار پونڈ کا خرچ اٹھتا ہے۔ یہ خرچ تقریباً ایک ہفتے کے بعد بیباق ہو جاتا ہے۔ اور پھر اس کنویں سے ہر سال ۳۵ لاکھ پونڈ کا منافع ہوتا رہتا ہے۔

کویت کے تیل کی بین الاقوامی مارکیٹ میں اہمیت بھی قابل غور ہے۔ تیل کی سب سے زیادہ پیداوار براعظم امریکہ میں ہوتی ہے لیکن ریاستہائے متحدہ امریکہ میں تیل کی ضروریات اتنی وسعت پذیر ہو چکی ہیں کہ یہ تیل اندرونی کھپت کے لئے ہی بمشکل کافی ہوتا ہے۔ اس لئے تیل کی عالمگیر مانگ کو جنوبی ایشیا اور مشرق وسطیٰ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جنوبی ایشیا میں حالات زیادہ امید افزا نہیں۔ برما میں خانہ جنگی ہونے کے باعث تیل کی پیداوار رکی ہوئی ہے۔ انڈونیشیا میں تیل کی پیداوار دوران جنگ کے بھاری نقصانات کے باعث ابھی ابتدائی مراحل طے کر رہی ہے۔ مشرق وسطیٰ میں بھی تغیر و تبدل درپیش ہیں۔ ایران میں تیل کی برٹش کمپنی کو حکومت ایران نے قومی ملکیت بنانے کا فیصلہ کر دیا ہے۔ لیکن کئی دشواریوں کے باعث آبادان میں تیل نکالنے کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا ہے۔ اس لئے تیل کی عالمگیر مارکیٹ میں ایک خلا پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ اس خلا کو پورا کرنے کے لئے ہر طرف تلاش کی جا رہی تھی۔ اس مرحلہ پر کویت کا ذخیرہ ایک غیبی امداد ثابت ہوا۔ ایرانی حلقوں میں تو یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انگریز بہت مدت سے ایران کے چشموں کو نظر انداز کر کے کسی اور نعم البدل کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

وسط مشرق میں تیل کی پیداوار

ہزار ٹن میں

ملک	۱۹۳۸ء	۱۹۴۸ء	۱۹۴۹ء	۱۹۵۰ء	۱۹۵۱ء
ایران	۱۰۳۵۶	۲۵۲۷۲	۲۷۳۴۰	۳۲۲۵۶	۱۳۸۴۸
سعودی عرب	۷۲	۱۹۲۶۰	۲۳۴۶۰	۲۶۹۰۴	۳۷۴۷۶
کویت	۰	۶۳۹۶	۱۲۳۸۴	۱۷۲۹۳	۲۸۳۳۲
عراق	۴۵۹۶	۳۴۳۲	۴۰۶۲	۶۴۸۰	۸۳۵۲
مصر	۲۲۸	۱۸۸۴	۲۲۸۰	۲۳۴۰	۲۳۲۸
بحرین	۱۱۴۰	۱۵۰۰	۱۵۱۳	۱۵۱۲	۱۵۱۲
قطار	۰	۰	۹۷	۱۶۳۲	۲۳۶۴
ترکی	۰	۲	۱۴	۱۷	۱۹

اب کچھ کویت کی تاریخ کے متعلق بھی۔ عرب روایت کے مطابق بدو قبیلہ بنی خالد نے کویت کی بنیاد رکھی تھی۔ غالباً برق بن عزیر جو بنی خالد کا سردار تھا اور حصا کا حکمران تھا کویت کا بانی تھا۔ برق کو آج سے تین سو سال پہلے اپنی قلمرو کے شمالی حصے میں ایک بندرگاہ کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ اس طرح کویت کی بندرگاہ معرضِ وجود میں آئی۔ کویت کے حکمرانوں کے موجودہ خاندان کا سب سے پہلا شیخ صباح ابوعبداللہ تھا۔ صباح نے ۱۷۵۶ء میں کویت کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ اس فتحیابی سے کچھ ہی پہلے جنوبی نجد میں افلاج سے بدو قبیلوں کا ایک گروہ کویت میں پناہ گزین ہوا تھا۔ اس گروہ کی سرداری صباح، خلیفہ اور جلاحیمہ کے تین گھرانوں کے ہاتھ میں تھی۔ بعد میں خاندان خلیفہ قطار چلا گیا۔ خاندان جلاحیمہ بھی علیحدہ ہو گیا۔ اس طرح کویت میں صرف خاندان صباح رہ گیا۔ جب ۱۹۴۹ء میں کویت کے تیل کی حیرت ناک پیداوار نے دنیا کو اچنبھے میں ڈال رکھا تھا

تو اچانک کویت کا حکمران شیخ احمد بطا بر فوت ہوگیا۔ احمد کی جگہ اس کا چچا زاد بھائی شیخ عبداللہ السلیم جانشین ہوا۔

شیخ عبداللہ عالی دماغ حکمراں ہے اور زبردست قوت ارادی کا مالک ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ جب اُسے تخت پر بیٹھنے کی دعوت دی گئی تو اُس نے یہ شرط عاید کی تھی کہ وہ شاہانہ وقار سے نہیں بلکہ سادگی سے رہے گا۔ اُس کی بلند حوصلگی کا ثبوت اس وقت ملا تھا جب پچھلے سال تیل سے ایک کروڑ پونڈ (۱۵ کروڑ روپیہ) کی آمدنی ہوئی تھی تو شیخ عبداللہ نے اعلان کیا کہ یہ آمدنی حکمراں کی ذاتی آمدنی نہیں بلکہ کویت کی قومی آمدنی تصور کی جائے گی اور اُسے کویت کی قومی اور مجلسی بہبود کی اسکیموں پر خرچ کیا جائے گا۔ بالخصوص یہ زاویۂ نگاہ اس کی روشن ضمیری کا اظہار کرتا ہے کہ "تیل تو ایک دن ختم ہو جائے گا لیکن تیل سے حاصل ہونے والا یہ سرمایہ اگر عوام پر خرچ کیا جائے گا — اگر عوام کی دماغی اور جسمانی بہتری پر خرچ کیا جائے گا۔ تو لابدی فائدہ ہوگا"۔

یہاں یہ بتانا بھی موجب دلچسپی ہوگا کہ جب کویت میں تیل کے چشموں نے دنیا کو اچنبھے میں ڈال رکھا تھا اور دولت کے بند دروازے کھلتے جا رہے تھے تو کویت کی حالت کیا تھی۔ پانچ سال پہلے تک کویت دنیا سے الگ تھلگ اور ایک پس ماندہ خطۂ زمین تھا۔ حالات اُسی معمول سے چل رہے تھے جو خلافت کے زمانے میں تھے۔ کویت میں روزگار بہت محدود ہے۔ خلیج فارس سے موتی نکالنے کا کام کچھ غوطہ خوروں اور کچھ تاجروں کے لئے ذریعۂ روزگار ہے۔ روزگار کی دوسری سبیل ہے کشتیوں کی تعمیر۔ کویت میں بنائی ہوئی کشتیاں عرب ممالک میں سب سے زیادہ پائیدار اور اچھی ہوتی ہیں۔ اور تیسری سبیل یہ ہے کہ جب عراق میں کھجوروں کی فصل اُترتی ہے تو کویت کے لوگ عراق جا کر کھجوریں خرید لیتے ہیں اور کشتیوں میں بھر کر دوسرے ملکوں میں بیچنے کے لئے لے جاتے ہیں اور لوٹتی دفعہ اپنی ضروریات خرید کر لے آتے ہیں۔ اس طرح کویت کی ڈیڑھ لاکھ آبادی کسی نہ کسی طرح اپنے دن کاٹ لیتی ہے کچھ تجارت پیشہ لوگ خوش حال ہیں۔ اور باقی لوگ غریبی سے ہمکنار۔ لہٰذا بیماری اور لاعلمی کے سائے ہر طرف پھیلے ہوئے ملیں گے۔

لیکن جب تیل کا جوار بھاٹا آیا تو ملک کی مجلسی اور اقتصادی زندگی نے بھی کروٹ بدلی۔ پہلی بات تو یہ ہوئی کہ جہاں جہاں تیل نکالنے کا کام شروع کیا جاتا تھا وہاں ایک چھوٹی سی صنعتی بستی آباد ہو جاتی تھی اور ایسی کئی بستیاں یکے بعد دیگرے وجود میں آرہی تھیں۔ یہ شہر مغربی ڈھنگ سے تعمیر کئے جا رہے تھے اور یہ سلسلۂ تعمیرات کویت کی مزدور آبادی کے لئے منبعِ روزگار بنتا جا رہا تھا۔ اس ریل پیل میں روزگار کے ایک نہیں ہزاروں سلسلے نکلتے آرہے تھے۔ کویت کے لوگ تیل نکالنے کے کام میں صرف غیر تربیت یافتہ مزدوری کے لائق ہی تھے اور تیل کی کمپنیوں نے انھیں آغاز میں ایسے ہی کاموں پر مامور کیا تھا لیکن یہاں بھی ایک بات قابلِ غور تھی۔ کویت میں عام طور پر ایک مزدور کی اوسطاً روزانہ آمدنی ۸ پنس ہوتی ہے لیکن تیل کی کمپنیاں ایک غیر تربیت یافتہ مزدور کو روزانہ ۱۵ شلنگ (۱۰ روپے) دیتی ہیں۔ یہ رقم مشرق کے کئی ممالک میں غیر معمولی نعمت سمجھی جاتی ہے۔

تیل کی کمپنیوں نے آگے چل کر ایک اور غیر معمولی قدم یہ اُٹھایا کہ کویت کے لوگوں کو کئی پیشوں کی تربیت دینے کا بھی بندوبست کیا۔——

اس طرح تربیت حاصل کرنے کے بعد کویتی لوگ میکنک۔ ویلڈر۔ بڑھئی۔ ڈرائیور۔ تیل کی نالیاں جوڑنے والے اور تیل کا کنواں کھودنے والے بن گئے۔ ان ملازمتوں میں تنخواہیں نسبتاً زیادہ تھیں۔ اس طرح کویتی لوگوں کو اچانک گراں قدر ذاتی آمدنی کمانے کا وسیع میدان مل گیا۔

دریں اثنا کویت کا حکمراں کویت کی مجلسی زندگی کو سدھارنے کی بھی کافی کوشش کر رہا ہے۔ عوام کی تکالیف میں سب سے پہلے پانی کا مسئلہ تھا۔ کویت میں جغرافیائی وجوہ کے باعث چھ ماہ تک بارش ہوتی ہی نہیں۔ کنویں بہت قلیل تعداد میں ہیں۔ اس لئے تازہ پانی سو میل کے فاصلے سے جہازوں کے ذریعے لایا جاتا ہے تیل کی کمپنی نے اپنے عملے کی ضرورت کے لئے ایک پلانٹ تعمیر کیا تھا جس میں روزانہ چھ لاکھ گیلن سمندری پانی کشید کیا جاتا تھا۔ شیخ عبداللہ نے شہر کے لئے ایک اور پلانٹ تعمیر کرنے کا حکم صادر کیا۔ اس پلانٹ میں بارہ لاکھ گیلن سمندری پانی روزانہ کشید کیا جائے گا۔

کویت کے مجلسی مسائل میں تعلیم کا مسئلہ بھی غور طلب تھا۔ ابتدا میں کویت میں صرف چار پرائمری سکول تھے۔ جہاں کل چھ سو متعلم پڑھتے تھے۔ شیخ عبداللہ نے ۲۰ نئے پرائمری اسکولوں کی تعمیر شروع کی جہاں آٹھ ہزار

متعلم پڑھ سکیں گے ۔ اس کے علاوہ ایک سیکنڈری ہسکول (دسویں جماعت تک) اور ایک کالج بھی جاری کئے جا رہے ہیں ۔

استادوں کی تربیت کے لئے ایک ٹریننگ کالج بھی کھولا جا رہا ہے ۔ اس وقت کویت کے ۲۸ لڑکے سمندر پار کے ملکوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے سرکاری وظیفے پر بھیجے گئے ہیں ۔ ان میں سے مصر میں ۹۰ بیروت میں ۴ اور انگلینڈ میں ۳۰ لڑکے تعلیم پا رہے ہیں تعلیمی پروگرام میں یہ بات قابلِ ستائش ہے کہ عورتوں کی تعلیم کا بھی معقول بندوبست کیا گیا ہے ۔ تاکہ عورتیں پردے سے باہر آنے کے قابل ہو سکیں اس وقت قریباً اڑھائی ہزار لڑکیاں ہسکولوں میں تعلیم پا رہی ہیں ۔

صحتِ عامّہ ۔ حکومت کی طرف سے ایک سرکاری ہسپتال کھولا گیا ہے جس میں ۲۰ بستروں کا انتظام ہے ۔ ایک اور ہسپتال جس میں ۱۶۰ بستروں کا انتظام ہے مختلف بیماروں کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے ۔ دو دواخانوں میں روزانہ ایک سو مریضوں کا علاج کیا جاتا ہے ۔ مضافات کی ضرورت کے لئے ایک چلتی پھرتی ڈسپنسری بھی جاری کی گئی ہے ۔ آنکھوں کا ایک ہسپتال قریباً مکمل ہو چکا ہے ۔ اس میں ۲۵۰ بستروں کا بندوبست ہوگا ۔ تپ دق کے علاج کے لئے بھی ایک بڑا ہسپتال کھولا جا رہا ہے ۔ مویشیوں کی بیماریوں کا علاج کرنے کے لئے بھی ایک ویٹرنری ہسپتال ہے ۔ مزید برآں صحتِ عامہ کی نگہداشت کے لئے محکمۂ صحت کی طرف سے گھروں ۔ گوداموں ۔ اصطبلوں اور دیگر مقاموں پر ڈی ڈی ۔ ٹی چھڑکنے کا بندوبست بھی کیا گیا ہے ۔

حالات اگر اسی رفتار سے چلتے رہے تو عین اغلب ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد وسطِ مشرق میں ترقی اور بہبود کی تحریک میں کویت سب سے آگے نکل جائے ۔ حالات سازگار رہیں کیونکہ ۷۵ کروڑ روپیہ کی سالانہ آمدنی صرف ڈیڑھ لاکھ نفوس کی بہبودی پر خرچ کرنے کے لئے کافی سے بھی زیادہ ہے ۔ حکمراں روشن ضمیر ہے اور عوام محنت کش ۔ اس لئے دیکھنا چاہیئے کہ مشرق اور مغرب کا یہ گٹھ جوڑ جو اقتصادی مورچے پر پنپ رہا ہے ، کیا نتائج پیدا کرتا ہے ۔

محمد حمید راسد

کتب خانۂ اسکندریہ

علمی مرکز کی حیثیت سے اسکندریہ کا عروج بطلیموسی فرمانرواؤں کے عہد کا ایک امٹ کارنامہ ہے۔ سکندر اعظم کی موت کے بعد یونانی شاہنشاہیت کی سالمیت کمزور ہونا شروع ہو چکی تھی اور اس سامراج کا ایک با اثر نمائندہ بطلیموس سوتر اپنے سیاسی مرکز سے کٹ کر مصر کی سرزمین پر ایک ایسے درخشاں عہد کا خواب دیکھ رہا تھا جو نہ صرف سیاسی حیثیت سے بلکہ علمی مرتبہ میں بھی یونان کا ہم پلّہ بن جائے۔ اس تجربے کے لئے اس کی نظر انتخاب اسکندریہ پر پڑی جو دارالخلافہ ہونے کے علاوہ یونانی اور مصری تہذیبوں کی جائے اتصال ہونے کی وجہ سے بہت بڑی تہذیبی اہمیت کا مالک بن چکا تھا۔ فاتح قوم اپنے ساتھ اپنا مذہب اپنی قومی اور نسلی خصوصیات اپنی زبان و ادب اور اپنا مخصوص تہذیبی مزاج لائی تھی، اور ان امتیازات کو بزور قوّت و حکومت باقی بھی رکھنا چاہتی تھی۔ تاریخ کی عام روایات کو جھٹلا دینے کا تجربہ یہاں بھی غلط ثابت ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ اسکندریہ کی علمی اور تہذیبی زندگی یونانی زبان بولتی تھی۔ اس کی خارجی ہیئت بڑی حد تک یونانی اثرات قبول کر چکی تھی۔ اسکندریہ کی بیشتر آبادی نے جو زیادہ تر یہودیوں پر مشتمل تھی ان نئے آقاؤں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا، کیونکہ بطلیموسی شاہنشاہوں نے شروع ہی سے قوم یہود کے ساتھ غیر معمولی مراعات کر کے انھیں جیسے اپنا بندۂ بے دام بنا لیا تھا لیکن عام مصریوں نے فاتح قوم کے تہذیبی سرمایہ کو بالکل اسی صورت میں اپنانے سے انکار کر دیا۔ اس لئے بطلیموسی فرمانرواؤں کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنی سرگرمیوں کو صرف اسکندریہ کی چہار دیواری تک محدود کر دیں۔ مصر کی ثقافتی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ اسکندریہ کے باہر ان فرمانرواؤں کی علمی سرگرمیوں سے آزاد مصر کے کلچر کا فطری بہاؤ جاری رہا، قوّت اور حکومت کے جبروت کے باوجود یونانی سامراج مصر کی قومی تہذیب کا گلا نہ گھونٹ سکا۔

گو ان سرگرمیوں کا آغاز بطلیموسی خاندان کے سب سے پہلے شہنشاہ سوتر کے عہد میں ہو چکا تھا لیکن بطلیموس فلیڈلفس کے غیر معمولی علمی شغف نے اسکندریہ کو بہت جلد اس قابل بنا دیا کہ ایتھنس کی علمی مرکزیت اسکندریہ میں منتقل ہونا شروع ہو گئی اور پھر صرف ایتھنس ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں اس کی علم نوازی کے چرچے ہونے لگے۔ قریب و بعید کے ممالک سے اہل ہنر اس علمی مرکز کی طرف کھنچنے لگے۔ ظاہر ہے کہ اتنے اعلیٰ پیمانے پر اہتمام ترقیِ علم و ہنر کے لئے ایک اعلیٰ پائے کا کتب خانہ ناگزیر تھا۔ ساتھ ہی شاہی امداد کے بغیر علماء و فضلاء کی اتنی بڑی تعداد کا اسکندریہ میں مستقل قیام ایک ناممکن بات تھی۔ فلیڈلفس نے جس دریا دلی سے اس بار کو سنبھالا اس کا سب سے بڑا ثبوت کتب خانۂ اسکندریہ کا قیام تھا۔ اس کتب خانہ کے قیام کے وقت تاریخ کتب خانہ مشرق میں ایک ہزار سال پرانی ہو چکی تھی۔ خود یونان میں ایک سو سال قبل کتب خانے کا وجود ثابت ہے۔ یہ کتب خانہ حکومت یونان نے ہراکلی کے مقام پر قائم کیا تھا۔

اسکندریہ میں علم و ادب کے عروج کی تاریخ ایتھنس اور روم سے بہت کچھ مختلف ہے۔ ان دونوں مرکزوں پر ترقی کی رفتار دھیمی ہی سوتر کے بعد فلیڈلفس نے اسکندریہ کی علمی مرکزیت کو آگے بڑھانے میں نہایت حوصلہ مندی کا ثبوت دیا، اور اس کی غیر معمولی سرگرمی کے سبب سے کافی تعداد میں مشاہیر علماء اور فضلائے روزگار اسکندریہ آ گئے۔ ان اہلِ قلم اور نقل نویسوں (Copyists) نے علمی کتابوں کے ایسے معیاری ایڈیشن تیار کئے کہ دوسرے علمی مرکز

حوالے کے لئے ان نسخوں سے رجوع کرتے۔ یہاں تک کہ خود یونان کے کتب خانوں میں اسکندریہ کے نسخے سب سے زیادہ مستند سمجھے جاتے۔

اسکندریہ کا میوزیم جسے بطلیموس سوتر نے قائم کیا تھا علوم و فنون کا نہایت وسیع اور معیاری ادارہ تھا، ایچ۔ جی۔ ویلس نے اس علمی ادارے کو دنیا کی سب سے پہلی یونیورسٹی کا درجہ دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ادارے کی ہمہ گیری حیرت خیز تھی۔ اسی میوزیم کے تحت وہ قابلِ رشک خزانہ تھا جسے کتب خانہ اسکندریہ کہتے ہیں۔ اسی میوزیم کا ایک حصہ شعبۂ نشر و اشاعت بھی تھا جو اپنی نوعیت اور وسعت کے لحاظ سے قاموسی Encyclopaedic ادارہ تھا۔ اس شعبہ کے ذریعے کتابوں کو بیرونِ مصر اور مقامی بازاروں میں فروخت کرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔

اس کی ظاہری حیثیت گو ایک مذہبی وقف کی تھی۔ کیونکہ اس زمانے میں حکومت کے قائم کردہ اداروں کا وجود مذہبی چھاپ کے بغیر ممکن نہ تھا لیکن علمی حیثیت سے اس کا میدان بڑی حد تک ان اثرات سے آزاد رہا جو کچھ بھی علمی کام اس کے تحت ہوا وہ اتنا عظیم ہے کہ بعض مورخین کا خیال ہے کہ اس کی نظیر یونان کا سب سے بڑا مرکز ایتھنس بھی پیش کرنے سے قاصر رہا۔ اسکندریہ کی علمی اور فنی روایات جن کی جڑیں یونان میں تھیں ایک صدی سے کچھ زائد عرصہ سے زیادہ اپنا معیار قائم نہ رکھ سکیں۔ کیونکہ ان کے سارے اہتمام و تنظیم کا بار شاہی خزانے پر تھا اور فرمانرواؤں کی توجہ کے بغیر اسکندریہ کا یہ علمی مرکز اپنا معیار قائم نہ رکھ سکتا تھا جب تک سوتر اور فلیڈلفس ایسے علم دوست فرمانروا زندہ رہے۔ یہ ادارہ شاہی سرپرستی میں بہت پھولا پھلا لیکن ان کے بعد اسکندریہ کی علمی محفل صاحبانِ تقدس کی ریشہ دوانیوں کے کارن درہم برہم ہونا شروع ہوگئی بطلیموسی خاندان کے کمزور فرمانروا تنگ نظر مذہبی پیشواؤں کی علم دشمنی کی تاب نہ لاسکے۔ اور وہ سرگرمی جو کبھی اس محفلِ علم و فن کا امتیاز تھی فریبِ تقدس کا شکار ہوگئی۔

اس علمی ادارہ کی خدمات علمی و تحقیقی رہیں اور کسی حد تک درسی بھی۔ مورخین کی تحقیق کی بنا پر پتہ چلتا ہے کہ کم از کم شروع میں یہاں درس و تدریس کا کوئی انتظام نہ تھا بطلیموسی فرماں روا نسلاً یونانی تھے اور ان کے ذہن یونانی روایات سے زیادہ مانوس تھے۔ اس لئے انہوں نے ایتھنس کے علمی مرکز کے نہج پر اس میوزیم کو تعمیر کیا تھا۔ ایتھنس کے Temple of Muses کے نمونے پر یہاں بھی فلسفہ کی تعلیم کے لئے مدرسے قائم تھے۔

اس مرکز کے قائم ہوتے ہی اسکندریہ میں یونانی کتب فروشی کے بازار پر تو جیسے بہار آگئی۔ یونان کے طالبانِ علم جوق در جوق اسکندریہ کی طرف آنے لگے۔ سرکاری ہمت افزائی، سامانِ تحریر کا بآسانی مہیا ہو جانا اور علمی کام کرنے والوں کی اتنی بڑی تعداد کا اسکندریہ میں موجود ہونا یہ سب ایسے اسباب تھے جنھوں نے اسکندریہ کو ایک عظیم مرکز بنانے کے علاوہ کتب فروشی کا ایک بہت بڑا بازار بھی بنا دیا۔ پیپرس Pyparus جسے مصری کاغذ کے طور پر استعمال کرتے تھے دوسرے ملکوں کو یہیں سے بھیجی جاتی تھی۔ مصریوں نے اسے سامانِ تحریر کی حیثیت سے کب و دفت رواج دیا یہ بتانا مشکل ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ مصری شروع ہی سے پیپرس پر اپنی ساری ذہنی کاوش منتقل کرتے رہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قرن ہائے قدیم کا اکثر ادبِ عالیہ پیپرس ہی پر تحریر ہے۔

سامانِ تحریر کی حیثیت سے پیپرس کی دریافت تاریخِ قدیم کا ایک عہد آفریں کارنامہ ہے اگر قدیم انسانوں کی علمی مساعی کو ہم تک پہنچانے کے لئے یہ چیز ذریعہ نہ بنتی تو خدا جانے ہمارے اس علمی ورثہ کا کیا حشر ہوتا اور پھر جو کچھ بھی بچا کھچا سرمایہ ہمارے ہاتھ اس کی داستان بھی بڑی دردناک ہے۔ گو پہلے بھی صدہا بار پیپرس کے گراں بہا خزانے زمین کا سینہ چیر کر نکالے گئے لیکن پچھلے پچاس سال میں جو عظیم ذخیرہ ملا ہے اس میں بطلیموسیوں کے عہد کے بعض بڑے نادر نسخے پائے گئے ہیں ان نسخوں کی تصنیف کا زمانہ تین سو سال قبل مسیح تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ خزانہ جس کا بڑا حصہ آج برٹش میوزیم کی زینت ہے ہزارہا سال سے ریگِ صحرا کے نیچے دبا ہوا تھا ان میں سے بعض خس و خاشاک سمجھ کر پھینک دئے گئے تھے اور نہ جانے کتنے عرصے سے شہروں سے باہر ملبہ کا حصہ بنے ہوئے تھے بعض نسخوں کو مردہ جسموں کو لپیٹنے کے کام میں لایا گیا اور ان میں سے چند قبروں میں اپنے مالکوں کے ساتھ ہزاروں سال سے دفن تھے۔

مصر میں سامانِ تحریر کے اتنی آسانی سے مہیا ہو جانے کی وجہ سے اسکندریہ میں لکھنے پڑھنے کا رواج بڑی حد تک عام ہو چکا تھا اور اس

عام علمی دلچسپی کے سبب سے کتب خانوں کا وجود میں آنا فطری بات تھی بطلیموسی عہد میں شاہی سرپرستی کی وجہ سے کتب خانہ اسکندریہ ایسی بڑی لائبریری کا قیام بھی ممکن ہوگیا ۔

اس کتب خانے کے لئے کتابوں کی فراہمی میں انہماک کی بہتیری مثالیں اب بھی مخطوطات تاریخ میں محفوظ ہیں. فلیڈلفس کے عہد میں دور دور سے کتب بفروش اچھی سی اچھی قیمتوں کے لالچ میں اسکندریہ کا رُخ کررہے تھے علمی خزانہ میں اضافے کے لئے کبھی کبھی نامناسب ذرائع کا استعمال بھی جائز رکھا جاتا. میورو اس بارے میں لکھتا ہے "کتب کی فراہمی میں بطلیموسی فرمانرواؤں کی گرم جوشی حیرت خیز تھی. جوں ہی ساحل پر کوئی جہاز آتا فوراً تحقیقات شروع ہو جاتی کہ آیا اس پر کتابوں کا کوئی ذخیرہ موجود ہے. اگر کتابیں موجود ہوتیں تو انہیں فوراً بحق سرکار ضبط کرکے کتب خانے میں پہونچا دیا جاتا، اور اصل نسخوں کی نقلیں مالکانِ کتب کو واپس کردی جاتیں مہتممین کی سہولت کے لئے ایسی کتابوں کو "جہازوں پر سے لائی ہوئی کتابوں" کے زمرے میں رکھا جاتا ۔

اسی طرح کتابوں کی فراہمی کی ایک عجیب و غریب مثال اور ملتی ہے. ایک بار ایتھنز میں زبردست قحط پڑا فلیڈلفس نے غلّہ کی امداد اس شرط پر دینا منظور کی کہ ایتھنس سے اسکیلوس، سوفوکلس اور یوریپڈیس کی تصانیف اسکندریہ منتقل کردی جائیں، جب شرط پوری کردی گئی تو قحط زدہ ایتھنس کو غلّہ بھیجا گیا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بجائے اصل نسخوں کے ان کی نقلیں ایتھنس واپس کی گئیں. آخر ضرور ہوا کہ پنتالیس ہزار روپے غلّہ کی امداد کے علاوہ ادا کئے گئے. بعض مورخین کا خیال ہے یہ واقعہ اورگیٹس کے زمانے کا ہے. بطلیموسی فرماں روا ایک کمزور اور نااہل ہونے کے باوجود کتب خانے میں ایک بڑے علمی ذخیرے کے اضافے کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے ۔

کتب کی فراہمی کے سلسلے میں جوزیفس نے ایک واقعہ لکھا ہے. بعض مورخین نے اس کی صحت پر شک کیا ہے لیکن اس بیان کا نقل کردینا فائدے سے خالی نہ ہوگا" دمی تریس جو شاہی کتب خانے کا مہتمم تھا اس کوشش میں تھا کہ ساری دنیا کے علمی خزانے اسکندریہ کے کتب خانے کے لئے مہیا کرلئے جائیں کہیں سے بھی کوئی علمی ذخیرہ مہیا ہوتا فوراً خرید لیا جاتا. ایک بار بادشاہ نے اس سے دریافت کیا کہ کتب خانے میں کتنی تعداد میں کتابیں مہیا کی جاچکی ہیں ؟ ــــ تو اُس نے جواب دیا کہ سردست دولاکھ نسخے جمع کئے جاچکے ہیں لیکن بہت جلد یہ تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ جائے گی. اُس نے بادشاہ کو یہ بھی بتایا کہ اس کی اطلاع کے مطابق یہودیوں کے قبضے میں قانونی کتابوں کی ایک بہت بڑی تعداد موجود ہے جو کتب خانے میں رکھنے کے قابل ہے. لیکن چونکہ یہ کتابیں خود انھیں کی زبان میں لکھی ہوئی ہیں اس لئے اُن کو یونانی زبان میں ترجمہ کرنے میں غیر معمولی محنت درکار ہوگی، ان کتابوں کا رسم الخط سامی رسم الخط سے مشابہ ہے اور تلفظ بھی انھیں کا سا ہے، یہ سن کر بادشاہ نے کہا کہ ان کتابوں کے حصول میں اور ترجمہ کرانے میں کوئی چیز حارج نہیں. کیونکہ اُن کو مہیا کرنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے ان کی ہمارے پاس کمی نہیں، اس لئے ہم ان کتابوں کو ضرور کتب خانے کے لئے حاصل کریں گے. بادشاہ کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ دمی تریس کتابوں کی فراہمی میں کتنی زیادہ دلچسپی لے رہا ہے. اس لئے اس نے یہودیوں کے بڑے مذہبی پیشوا کو کتابیں مہیا کرنے کے لئے ہدایات بھیجدیں"

جوزیفس نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کتابوں کے تراجم مکمل ہونے کے بعد دمی تریس نے ان سب کو خود پڑھا اور اُن کی صحت پر صاد کیا. پھر وہ ترجمے بادشاہ کے پاس بھیج دیئے گئے. اس نے حکم دیا کہ ان نسخوں کی پوری حفاظت کی جائے تاکہ ان میں کسی قسم کی تصحیف و تحریف نہ ہونے پائے.

آج کتب خانۂ اسکندریہ کی تاریخ دو ہزار سال سے زیادہ پرانی ہوچکی ہے لیکن جو بھی تھوڑا بہت تاریخی مواد اس کے بارے میں ملتا ہے اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ علم کتب خانہ اس زمانے کے حالات کے لحاظ سے ایک ترقی یافتہ علم کی صورت اختیار کرچکا تھا. طباعت کی عدم موجودگی اور اشاعت کے محدود ذرائع کے پیش نظر جو محنت اور دولت کتابوں کی تصنیف تالیف ترجمہ اور نقل کرنے میں صرف ہوتی ہوگی اس کا اندازہ لگانا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے. کمیابی اور گراں قیمتی کے باوجود اسکندریہ کے کتب خانے میں جو علمی ذخیرہ جمع کیا گیا تھا اس سے بطلیموسی فرماں رواؤں کی غیر معمولی علم دوستی کا پتہ چلتا ہے گو کتب خانے کے نسخوں کی صحیح تعداد کے بارے میں بے حد اختلاف ہے لیکن اس بات پر اکثر مورخین کا اتفاق ہے کہ اس زمانے میں اس سے بڑا علمی ذخیرہ دنیا کے کسی حصہ میں ایک مقام پر موجود نہ تھا ۔

جارجیس نے کتب خانے کی کتابوں کی تعداد ایک لاکھ بتائی ہے سینیکا چار لاکھ بتاتا ہے۔ جوزیفس کا خیال ہے کہ یہ تعداد دو لاکھ تھی جو پانچ لاکھ تک بڑھائی جانے والی تھی، ولس گلیس نے یہ تعداد سات لاکھ معین کی ہے۔ امیس نے اس کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔ یوزیبس کا خیال ہے کہ فلیڈلفس کے انتقال کے وقت کتب خانہ اسکندریہ میں صرف ایک لاکھ کتابوں کا ذخیرہ تھا اور سیس جولیس سیزر کے حملے کے وقت جلائی ہوئی کتابوں کی تعداد چار لاکھ بتاتا ہے لیکن لشنل کی تحقیق کے مطابق اکثر مورخین کا اتفاق پانچ لاکھ پر ہے۔

بارھویں صدی میں بازنطینی عالم زٹنرس کیلی ماکس کو سند ٹھہراتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس کتب خانے کے دو حصے تھے۔ بیرونی حصے میں بیالیس ہزار کتابیں تھیں اور اندرونی حصے میں چار لاکھ نوّے ہزار کا ذخیرہ تھا۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ فہرست کے مطابق نوّے ہزار نسخے ایسے تھے جن کی ایک سے زائد نقلیں موجود نہ تھیں اور چار لاکھ کتابیں ایسی تھیں جن کے دو سے زائد نسخے تھے اور بعض نوعیتوں سے وہ ایک دوسرے سے مختلف اور ممتاز تھے۔

اسکندریہ لائبریری میں کتابوں کی جو تعداد بتائی جاتی ہے غالباً اس میں مبالغے سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ کیونکہ یونانی ادب مکمل طور پر اس کتب خانے میں موجود تھا جس کا بہت بڑا حصہ ہم تک نہ پہنچ سکا۔ کتاب جو ایک لپٹی ہوئی شکل میں ہوتی تھی کوئی بہت لمبی چوڑی چیز نہ تھی۔ ہومر کی ایلیاڈ اور اوڈیسی تقریباً چوبیس کتابوں پر مشتمل تھیں، اور اس کے علاوہ کتب خانہ اسکندریہ میں مختلف کتابوں کے کئی کئی نسخے موجود تھے جیسا کہ بڑے کتب خانوں کا دستور ہے۔

مہتمین کتب خانہ کے بارے میں یہ بات قابلِ وثوق سمجھی گئی ہے کہ زینو ڈوٹس کتب خانہ اسکندریہ کا سب سے پہلا مہتمم تھا۔ دمی ٹریس کے بارے میں یقین کے ساتھ کہنا مشکل ہے کہ وہ کسی وقت بھی اس عہدہ پر فائز تھا لیکن لشنل اس کو دوسرا مہتمم گردانتا ہے۔ کالی ماکس، یراٹوس تھینس، اپولونیس، ارسطوفینیس، لائیکوفرون۔ اسکندراٹیوس اور اسٹارکس بہ ترتیب اس کتب خانے کے مہتمین شمار کئے جاتے ہیں بعض علمار کو اس ترتیب سے اختلاف ہے۔ لیکن اس میں غالباً غلط فہمی یوں ہوئی کہ ان میں کئی ایک بیک وقت شرکار کی حیثیت سے اہتمام کتب خانہ پر متعین تھے۔

زینو ڈوٹس غنائی شاعری اور رزمیہ کے نسخوں کے مقابلے کا کام کرتا تھا یسکندراٹوس اور لائیکوفرون ڈراموں کی تصحیح کے ذمہ دار تھے۔ زینو ڈوٹس چونکہ اپنے دور میں ہومر کی تصنیفات کا سب سے بڑا ماہر تھا۔ اس لئے مختلف نسخوں کی تصحیح کرتے وقت وہ باریک سے باریک نقص کو درست کرتا اس کے متعلق مشہور ہے کہ صحت کا اُسے یہاں تک خیال تھا کہ بطلیموس سوتر کے زمانے کے سارے نسخوں کو اس نے خود بڑی جاں فشانی سے پڑھا اور ناقص نسخوں کی یا تو قابلِ اطمینان تصحیح کرائی یا اُسے معیاری ذخیرہ سے خارج کرکے دوم درجے کے ذخیروں میں شامل کر دیا کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی قابلِ فروخت ذخیرے کی زینو ڈوٹس کو خبر ہوتی اور معیاری نسخوں کے بجائے ناقص نسخے مجبوراً کتب خانے میں رکھنے پڑتے لیکن اس کمی کے باوجود وہ کبھی ہمت نہ ہارتا اور اسی کوشش میں لگا رہتا کہ کتب خانے کے لئے معیاری نسخے فراہم ہو جائیں۔ جب تک یہ ممکن نہ ہوتا انھیں ناقص نسخوں سے کام چلایا جاتا یمختلف نسخوں کو سامنے رکھ کر مقابلہ کیا جاتا اور اُن سے حتی الامکان معیاری نسخے تیار کئے جاتے۔ انیسویں صدی کے نصف میں پیپرس کا جو ذخیرہ مصر میں کھود کر نکالا گیا اُس سے اسکندریہ کے اہلِ علم کی انتہائی محنت اور دیانت کا پتہ چلتا ہے جو انھوں نے قدیم یونانی ادب عالیہ کو مدوّن کرنے میں صرف کی۔

کتب خانے میں اس کے رفقا میں فلسفی تیمن نے ہومر کے نسخوں کے بارے میں ایک بار یہ رائے ظاہر کی تھی کہ "ہومر کا سب سے صحیح نسخہ وہ ہے جس میں سب سے کم تبدیلی کی گئی ہے۔ اس بات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ زینو ڈوٹس کی قیادت اور نگرانی میں تصحیح کا کام کتنی احتیاط سے کیا جاتا تھا اور تمام شرکار کو اس بات کا بھی خیال تھا کہ کتب خانے میں سب سے زیادہ صحیح نسخے رہیں۔

اکثر مورخین کیلی ماکس کو زینو ڈوٹس کے شرکار میں شمار کرتے ہیں۔ کتابوں کی مضمون وار تقسیم اور فہرست سازی کا کام اس کے سپرد تھا۔ بعض ماہرین کتب خانہ کالیماکس کو اصطفاف کتب کا باوا آدم خیال کرتے ہیں۔ گو حقیقت صرف اتنی ہے کہ ارسطو اس علم کا موجد تھا۔ جسے کسی حد تک عملی صورت میں پیش کرنے کا سہرا کیلی ماکس کے سر ہے۔ کئی ماخذوں سے کیلی ماکس کی تقسیم علوم کا بھی پتہ لگتا ہے۔ گو اس بارے میں

زیادہ کہنا مشکل ہے۔ لیکن ہم تک جس صورت میں وہ تقسیم پہونچی ہے وہ حسب ذیل ہے۔
(۱) فلسفہ (۲) اقلیدس (۳) طب (۴) مقننین (۵) تہوار (۶) مؤرخین (۷) مقررین (۸) شعراء (۹) مختلف قسم کے اہل قلم (۱۰) طیور (۱۱) مچھلیاں (۱۲) پنیر کی ٹکیاں۔

کیلی ماکس نے فہرست کو کم از کم نصف درجن خانوں میں تقسیم کیا تھا۔ ان خانوں میں تصنیف، صاحب تصنیف کے منصب علمی، اس کی تعلیم اور اس کے بارے میں تھوڑی سی معلومات درج کی جاتیں۔ کتب خانے کی یہ عظیم فہرست جسے کالی ماکس نے بے حد محنت سے تیار کیا تھا ایک سو بیس جلدوں پر مشتمل تھی۔

یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ اس زمانے میں کتاب اوراق کے مجموعے کے عوض ایک طویل پیپرس کی لپٹی ہوئی شکل کی ہوتی تھی اور حوالہ جات کے لئے اُسے بار بار کھولنا اور لپٹینا پڑتا تھا۔ اس مسلسل عمل سے کتاب کی حالت خراب اور عمر کم ہو جاتی ہوگی۔ اگر آج کا زمانہ ہوتا تو مشین کے ذریعے اسے احتیاط سے کھولنا اور لپٹینا آسان ہوتا۔ لیکن اُس دور میں ایسی کوئی چیز نہ ہونے کی وجہ سے طالب علموں کو کتنی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ کیلی ماکس کا یہ جملہ کہ ایک بڑی کتاب ایک بڑی مصیبت ہوتی ہے، اوپر کے بیان کی تصدیق کرتا ہے۔ اس لئے اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ان کتابوں کو حصوں میں تقسیم کرنے کی روایت جاری کی۔ الیڈ۔ اور اوڈیسی تاریخ ہیرودوٹس اور دوسرے مشہور مصنفوں کی کتابوں کو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔

علم و دانش کے عروج و زوال کی داستان تاریخ میں ہمیشہ ایک اہم اور دلچسپ باب کے اضافے کا موجب بنی ہے، اور اسکندریہ کی کہانی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اسکندریہ کے اہل علم کی مشکلات کا جائزہ لیتے ہوئے جس وقت ہم ان کا خود سے مقابلہ کرتے ہیں تو ہمارے سامنے ان دشواریوں کی تصویر آجاتی ہے۔ ہمیں تحصیل علم تصنیف و تالیف کے سلسلے میں جو سہولتیں مہیا ہیں وہ انھیں خواب میں بھی نظر نہ آتی ہوں گی۔ سالہا سال کی محنت شاقہ کے صلے میں ایک نقل شدہ کتاب کی محنت شاقہ کے صلے میں ایک نقل شدہ کتاب آج ہمیں کتنی عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس کی قدر کوئی اسکندریہ کے اس عالم کے دل سے پوچھے جو اُسے پاکر خود کو غالباً دنیا کا سب سے زیادہ خوش قسمت آدمی سمجھتا ہوگا۔ حوالہ جات کے لئے آج ہمارے پاس تقریباً ہر موضوع کی انسائیکلوپیڈیا، لغتیں، نقشے اور خاکے غرض ساری ضروری چیزیں موجود ہیں اور یہ ہمیں چند منٹوں میں جملہ مطلوبہ حوالے مہیا کر دیتی ہیں جو اسکندریہ کے عالم تین سو سال قبل مسیح مہینوں کی محنت کے بعد بھی حاصل کرنے پر قادر نہ تھے۔ کوئی تاریخ اس زمانے میں کسی زبان کی لغت کی موجودگی کا پتہ نہیں دیتی۔ محض حافظے کے بوتے پر اس قسم کے حوالوں کے مسئلہ کو حل کیا جاتا ہوگا۔ اسکندریہ کا مصنف آج کے مصنف سے کتنا مختلف تھا۔ وہ یا تو دوسروں کی مدد سے مسودہ تیار کراتا یا اسے خود لکھتا تھا اور اس طویل پیپرس کو لپیٹنے سے پہلے اُسے کتنی دیر تک صرف اس لئے ٹھہرنا پڑتا تھا کہ سیاہی خشک ہو جائے۔ خشک کرنے کے لئے لکھے ہوئے حصے کو پہروں دھوپ اور ہوا کے سامنے رکھا جاتا تھا یا پھر ریت کا استعمال کر کے مشکل آسان ہوتی تھی۔ کیونکہ اس غریب کے پاس بلاٹنگ پیپر قسم کی کوئی چیز نہ تھی۔ ہر تصنیف کی سیکڑوں نقلیں کی جاتیں تب کہیں جاکر اس کی وسیع اشاعت کے امکانات پیدا ہوتے۔ بار بار نقل کرنے کا نتیجہ ظاہر ہے نقل نویس ہر بار پرانی غلطیوں کو نہ صرف یہ کہ جوں کا توں باقی رکھتے بلکہ کچھ اور نئی غلطیوں کا اضافہ بھی کر دیتے۔ ہر نئی کتاب کی کم از کم سو نقلیں ہو جانے کے بعد اس کی اشاعت کی جاتی جب کبھی نقشے یا خاکے کسی تصنیف کے لئے لازم ہوتے تو مزید دشواریاں سامنے آجاتیں۔ مثلاً علم الابدان کا اعضاء کی شکلوں کے بغیر سمجھنا بہت دشوار بات ہے۔ نقل نویس چونکہ ان شکلوں کو مصور کرنے کے فن سے ناواقف تھے اس لئے اس قسم کی کتابوں کی افادیت بہت کم ہو جاتی تھی۔

ایک اور اہم بات جس کی طرف ہمارا ذہن قدرتی طور پر منتقل ہوتا ہے وہ اسکندریہ کی طباعت کی ایجاد کی طرف سے عدم توجہی ہے۔ اس دور میں ساری دنیا میں کتابوں کی مانگ بڑھی ہوئی تھی۔ صرف کتابیں ہی نہیں بلکہ انتظامی معاملات کے لئے حکومتوں کو اعلان ناموں اور دستاویزوں اور اسی قسم کی چیزوں کی ضرورت درپیش تھی۔ تاہم اسکندریہ میں طباعت کی ایجاد کے لئے کسی کوشش کا پتہ نہیں چلتا۔ گو چھپائی کی کئی غیر ترقی یافتہ شکلیں ہمیشہ موجود رہیں۔ مثلاً سکوں پر نقوش ڈھالنا بھی ایک قسم کی چھپائی ہے۔ پھر اگلے وقتوں میں ناخواندہ اپنے دستخطوں کے بجائے لکڑی یا لوہے کی مہریں استعمال کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ روشنائی اور پیپرس کو چھپائی

کے لئے ناقابل سمجھا گیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ غلام نقل نویسوں کے مالکوں نے اپنی تجارت کے لئے طباعت کو خطرہ محسوس کیا ہو اور اس لئے اس ایجاد کی مخالفت کی ہو۔ بہر حال اس عدم توجہی کی جو بھی وجہ رہی ہو یہ یقینی ہے کہ خاکوں اور نقشوں تک کے لئے چھپائی کی مدد نہیں لی گئی۔ ان محدود ذرائع کے پیش نظر ہم اس دور کے علمار کے غیر اہم کارناموں کو بھی آج کے بڑے سے بڑے کارناموں کے مقابلے میں رکھ سکتے ہیں اور ان پر بجا طور پر ناز بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن ہماری یہ سب سے بڑی بدقسمتی ہے کہ وہ خزانہ جو صدیوں کی محنت اور جانفشانی اور ایک بڑی دولت خرچ کر کے اکٹھا کیا گیا تھا ہم تک نہ پہونچ سکا۔ کم از کم دو بار کتب خانے کو برباد کرنے کا ذکر تاریخ میں موجود ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اب ہمارے لئے یہ محض قیاسات کی بات رہ گئی ہے کہ اس علمی ذخیرے میں کن علوم سے متعلق کتابیں موجود تھیں۔

اس مرکز کا سب سے عظیم کارنامہ قدیم بائیبل کا عبرانی زبان سے یونانی میں ترجمہ ہے۔ عبرانی کے کئی قدیم نسخوں کو سامنے رکھ کر ان کو یونانی میں منتقل کرنے کے لئے ستر اعلیٰ پائے کے یہودی علمار کو اس خدمت پر مامور کیا گیا تھا۔ تقریباً دو سو پچھتر سال قبل مسیح یہ پہلا یونانی ترجمہ مکمل ہوا۔ مترجمین کی تعداد کی مناسبت سے اس ترجمہ کا نام سپٹواجنٹ مشہور ہو گیا۔ محققین کا خیال ہے کہ بطلیموسی فرماں روا قدیم بائیبل کو ایک مذہبی صحیفہ سے زیادہ قوم یہود کی ایک بے مثل تاریخ تصور کرتے تھے اور یہودیوں کے ساتھ ان کی رواداری کے ثبوت میں وہ مدارس پیش کئے جا سکتے ہیں جو اسکندریہ میں ان کی مذہبی تعلیم کے لئے قائم کئے گئے تھے۔

ایتھی نیس کا کہنا ہے کہ کتب خانے کے ذخیرے میں ارسطو کی تصنیفات کے وہ نسخے بھی تھے جو نیلیس سے خریدے گئے تھے۔ سوفوکلس، یوریپڈیس اور اسکیولس کی تصانیف ایتھنس سے حاصل کی گئی تھیں جن کی صرف نقلیں واپس کی گئیں اور اصل نسخوں کو کتب خانہ میں رکھ لیا گیا۔

یوراسٹوتھینیس نے جو اسکندریہ کا باشندہ تھا زمین کا قطر ناپنے کی اتنی کامیاب کوشش کی کہ اس کی ناپ اور صحیح قطر میں صرف پچاس میل کا بُعد رہ گیا۔ اس کی تصنیف (Geographica) کے چند اجزار آج بھی محفوظ ہیں۔

اسی کتب خانہ اسکندریہ میں یونان کا مشہور ریاضی داں ارشمیدس نے بڑی تحقیق کے بعد ریاضی اور حرکیات کے تعلق پر کتابیں تصنیف کیں۔

ہیپارکس جس نے سیاروں کی فہرست اور نقشے تیار کرنے اور فلکیات کو زیادہ علمی انداز میں پیش کرنے کی سب سے پہلی کوشش کی اسی لائبریری سے استفادہ کرتا تھا۔

استرابو جو یونان کا ایک مشہور جغرافیہ داں تھا تھیوڈوسیس کے عہد (۳۸۹ء) میں اسی کتب خانے میں علمی کام پر مامور تھا۔

زینوڈوٹس کے بارے میں یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ وہ ہومر کی تصانیف پر ماہر کی حیثیت رکھتا تھا۔ ظاہر ہے اسکندریہ کے کتب خانے میں ہومر کی تصانیف کو مدون کرنے میں کتنی احتیاط سے کام لیا گیا ہوگا۔ ہومر کی نظموں کے وہ ایڈیشن جو آج سب سے زیادہ مستند سمجھے جاتے ہیں ان کی بنیاد کتب خانہ اسکندریہ کے نسخوں پر ہے۔ اس کے علاوہ غنائی شاعری اور ڈرامے پر جو کام اس علمی مرکز کی سرگرمی میں انجام پایا اس کے لئے آج بھی ساری علمی دنیا اسکندریہ کے علمار کی بیحد شکر گزار ہے۔

اب جہاں تک اس کتب خانے کا مسلمانوں کے ہاتھوں برباد ہونے کا سوال ہے اس پر مدت ہوئی ایک مفصل بحث ہو چکی ہے اور یہ بات بہ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ مسلمانوں کی فتح مصر کے وقت اس کتب خانے کا نام و نشان بھی باقی نہ تھا۔ مولانا شبلی نے اس سلسلے میں ایک بڑا پُر از معلومات مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "سب سے پہلے جس نے یورپ میں اس واقعے کو مشہور کیا وہ ابوالفرج ہے۔ ابوالفرج نے سریانی زبان میں ایک نہایت بسیط تاریخ لکھی جس کا ماخذ سریانی عربی فارسی اور یونانی کتابیں تھیں۔ اس بڑی کتاب کا اس نے عربی زبان میں ایک خلاصہ لکھا جس کا نام مختصر الدول ہے۔ اور جس کو ڈاکٹر پوکاک پروفیسر آکسفورڈ کالج نے ۱۶۶۲ء میں لیٹن ترجمہ کے ساتھ چھاپا۔ اس خلاصے کے مختلف نسخے ہیں اور سب نامکمل ہیں اور بعض واقعات اصل سریانی کتاب سے زائد ہیں۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ یہ زائد واقعات خود ابوالفرج نے بڑھائے یا کسی اور نے الحاق کئے"۔

بعض محققین جو اس واقعہ کو ثابت کرنا چاہتے ہیں سند میں عبداللطیف بغدادی مقریزی اور حاجی خلیفہ کے نام بھی پیش کرتے ہیں۔ مقریزی

کی شہادت کی صرف اس قدر حقیقت ہے کہ اس نے اپنی تاریخ میں عبداللطیف کی عبارت حرف بہ حرف نقل کردی ہے اور حاجی خلیفہ کی اس عبارت "یہاں تک بیان کیا جاتا ہے کہ ان لوگوں (اہلِ عرب) نے شہروں کے فتوحات میں جو کتابیں پائیں وہ جلا دیں" سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ یہ کتب خانہ اسکندریہ سے متعلق ہے صحیح نہیں ہے۔

عبداللطیف کی یہ روایت البتہ صاف اور صریح ہے لیکن بقول کریل "یہ بیان محض علی السبیل معلوم ہوتا ہے .... یہ کسی خاص اصل واقعہ کا یاد دلانا نہیں ہے بلکہ محض ایک مشہور بات کا اعادہ کر دینا ہے جس کو اس زمانے کے سیاحوں نے بار ہا کیا ہے اور یہ من قبیل اسی قسم کی غیر معتبر اور خلاف عقل بیانات کے ہے جو زمانۂ وسطیٰ کے سیاحوں میں بیت المقدس کے مقام کے بارے میں مشہور رہتے۔ ظاہر ہے کہ ہر مشہور بات صحیح نہیں ہوتی۔ اس لئے اگر اس مشہور بات کا عبداللطیف بغدادی نے صرف اعادہ کر دیا ہے تو اُس کو آنکھ بند کرکے مان لینا درست نہیں ہو سکتا۔"

ابوالفرج کے خلاصے کے بارے میں مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ اس کے مختلف نسخے ہیں اور سب نامکمل ہیں اور اصل سریانی کتاب سے زائد ہیں۔ انھوں نے یہ شبہ بھی ظاہر کیا ہے کہ ان زائد واقعات کے تصنیف کرنے والے ممکن ہے کوئی اور صاحب ہوں۔ مولانا موصوف نے ابوالفرج کے بیان پر بحث کرتے ہوئے تعجب ظاہر کیا ہے کہ سوائے ابوالفرج کے عرب کے تمام مورخین ایک ایسے اہم واقعہ کے متعلق خاموش ہیں بعض مورخین یہ قیاس بھی ظاہر کرتے ہیں کہ عرب کے مورخین نے اس واقعہ کو مسلمانوں کے دامن پر ایک بدنما داغ سمجھ کر نہ لکھا ہو لیکن اس قیاس میں بھی کوئی دم نہیں ہے۔

ان شہادتوں سے قطع نظر بعض قرائن اس واقعے کے ثبوت کے خلاف ملتے ہیں۔ مثلاً عمرو بن العاص نے حضرت عمر کو اسکندریہ کے بارے میں ایک مفصل یادداشت بھیجی تھی اور اس میں انھوں نے اسکندریہ کے بارے میں بے حد تفصیل سے واقعات درج کئے تھے لیکن اس یادداشت میں کتب خانہ اسکندریہ کا کہیں ذکر نہیں۔

"یوٹیکس جو دسویں صدی عیسوی میں اسکندریہ کا بطریق تھا اُس نے اسکندریہ کی فتح کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ اسی طرح المکین جو واقعہ مفروضہ کے تین سو برس بعد تھا۔ یعنی ابوالفرج سے دو سو برس پہلے اُس نے تاریخ مصر خود مصر میں رہ کر لکھی اور اسکندریہ کی فتح کے حالات نہایت تفصیل سے لکھے۔ لیکن ان دونوں کی کتابوں میں واقعۂ مفروضہ کے متعلق ایک حرف بھی نہیں" (شبلی)

اروسیس کا بیان ہے کہ "میں نے کتب خانے کو خود بنفس نفیس جا کر دیکھا۔ اس کی الماریاں اور خانے خالی تھے"

حقیقت یہ ہے کہ جولیس سیسر نے نصف سے زیادہ کتابیں جلا دی تھیں اور اسکندریہ کے بطریقوں نے نہ صرف تقریباً کل باقی کتابوں کے منتشر ہونے کی اجازت دی بلکہ اپنی نگرانی میں ان کو منتشر کرا دیا اس کے بعد انطونی نے قلوپطرہ کی مدد سے اسکندریہ کو ایک بار پھر ایک بہت بڑا علمی خزانہ مہیا کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی لیکن پانچویں صدی میں یہ علم و ادب کا ذخیرہ بھی عیسائیوں کے ہاتھوں ایسا برباد ہوا کہ پھر اس اُجڑے ہوئے چمن میں کبھی بہار نہ آئی۔

گو اس بحث پر خیال آرائی کی ہمیشہ گنجائش باقی ہے، لیکن جو قرائن اور شہادتیں اس کو رد کرتی ہیں اتنے مضبوط ہیں کہ اب اس مسئلہ پر سوائے جذباتی رد و قدح کے کسی علمی بحث کی گنجائش کے امکانات بہت کم ہیں۔

علی محمد لون

بچے

فیض کے اپنے بس کی بات ہوتی تو وہ تنگ پتھریلی پگڈنڈی پر یوں سنبھلنا سنبھالنا اور اپنے چھوٹے سے ریوڑ کو ہانکتا ہوا لے جانے کے بجائے پر لگا کر زینو کے پاس اُڑ جاتا۔ اور اس کی خیریت دریافت کرتا۔ دن بھر جنگل میں گھاس کاٹنے اور شام ہونے تک سمیع گوجر کے گھر تین گٹھے ڈال آنے کے دوران میں اسے بار بار زینو کا خیال آیا تھا۔ زینو جو آج سراپا درد بنی ہوئی تھی اس کی آنکھوں کے وہ خوف ناک سیاہ حلقے' پپڑیاں' جمے ہوئے ہونٹ' تمتمایا ہوا چہرہ' بھیگی آنکھیں فیض کو یاد آ کر ڈرا رہی تھیں۔ اور پھر آج صبح اس نے زینو کو کوٹھے کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگاتے اور پھر اپنے شانوں کو مسل کر کراہتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے اپنے ہونٹوں کو کاٹ کاٹ کر خون آلودہ کر دیا تھا۔ فیض کو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے زینو کے منہ سے چیخ نکلا چاہتی تھی۔ لیکن جیسے وہ بڑی مشکل سے روکے ہوئے تھی۔ شاید آج وہ گھڑی آ گئی تھی جس کا فیض اور زینو دونوں کو انتظار تھا۔ جس گھڑی کو نزدیک لانے کے لئے زینو نے پیر جی کی منت مانی تھی۔ اس کے مزار کے دئے روشن کئے تھے۔ اور جس گھڑی کا احساس فیض کے سینے کو اُبھار اور آنکھوں کو فخر بخش رہا تھا ہاں آج وہی گھڑی آ گئی تھی۔ لیکن فیض کی چھاتی سکڑ سی گئی تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں فخر اور خوشی کی جگہ پریشانی اور تردد نے لی تھی۔ اگر زینو کو اس کی غیر موجودگی میں کچھ ہو گیا تو کیا ہوگا؟ نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ کیونکہ زینو نے پیر جی کی منت مانی تھی۔ اس کے مزار کے دئے روشن کئے تھے۔ فیض کو پیر جی کی بڑائی پر پورا یقین تھا اُسی نے تو فیض کو زینو دی تھی۔ اگر زینو نے فیض کے گھر آنے کے لئے پیر جی کی منت نہ مانی ہوتی' تو شاید وہ آج دین محمد کی بیوی ہوتی دین محمد جس کے پاس مکئی کے بڑے بڑے کھیت تھے اور جو پیسے کے بل بوتے پر فیض اور زینو کی محبت پر چھاپا مارنے کی کوشش کر چکا تھا۔ مگر جانے کیوں پیر جی کے باوجود فیض آج حد سے زیادہ پریشان تھا۔ اور اس نے گھاس کاٹنے کے دوران میں کئی بار دل ہی دل میں زینو کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگی تھیں۔ لیکن جس طرح درانتی کی کاٹ سے گھاس کا گچھا پلک جھپکنے میں الگ ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح ایک نامعلوم ڈر اور وہم کی کاٹ نے اس کے دل سے اُمید کو کاٹ کے الگ پھینکا تھا۔ اور وہ ایک دم گھٹانے والی ہلچل کو اپنے سینے کے اندر دھڑکتا ہوا محسوس کر کے تڑپ رہا تھا۔

آج دن بھی ضرورت سے زیادہ لمبا ہو گیا تھا۔ اس لئے فیض نے کئی بار اپنی پیٹھ پر چمکتے ہوئے سورج کی اور نظریں اٹھا کر چاہا تھا۔ کہ وہ مغرب کے پہاڑوں کے اُدھر لڑھک جائے۔ کٹائی ختم ہو اور وہ فوراً کوٹھے پر آ جائے لیکن اس کے چاہنے کے باوجود سورج آج اطمینان کے ساتھ اس کی پیٹھ پر چمکتا رہا۔ جیسے اسے ڈوبنے کی کوئی جلدی نہ ہو۔ جیسے کسی کے خیال سے اس کا دل بھی ڈوبنے کا نام نہ لے رہا ہو فیض پہاڑ کا بیٹا تھا۔ کالے پتھروں کی کوکھ سے روٹی نکالنے والے باپ کا بیٹا۔ گرمی کے بڑے دن اور چمکتا ہوا سورج جن کے لئے رحمت کا باعث بن جاتا تھا۔ لیکن فیض آج رحمت اور زندگی کے اس سرچشمے کو بھی کوس رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر کئی بار ایک موٹی غلیظ گالی آ کر رُک گئی۔ وہ سورج کو کوس رہا تھا۔ لیکن دل ہی دل میں اس کی زبان بند تھی۔ کیونکہ وہ ڈرتا تھا۔ کہ اگر اس نے سورج کو زور سے گالی دی تو یہ کرنیں اس تک اس گالی کو پہنچا دیں گی۔ اور پھر وہ رُوٹھ کر اور بادلوں کی اوٹ میں چُھپ کر فیض کے کھیتوں پر اولوں کی بارش برسائے گا اور اس کے کھیت ویران ہو جائیں گے۔ بالکل نیچے وادی کے دھان کے کھیتوں کی طرح جن پر ابھی پرسوں ہی اولے گرے تھے۔ اور جن کی وجہ سے گاؤں والوں کے پُر امید چہروں پر مایوسی پھر گئی تھی۔ اور نہ خود اس کے اپنے گاؤں میں اس دن سارا کام کاج رُک گیا تھا۔ اور فیض کے نہ چاہنے کے باوجود وہ دن بھر کوٹھے میں رُکنے کے لئے مجبور رہا تھا۔ ہاں اسی دن فیض

نے زینو کو روٹیاں بناتے بناتے غور سے دیکھا۔ وہ کتنی بدل گئی تھی اس کی خوبصورت زینو! اُس کی بادامی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔ اس کے گال زرد ہو گئے تھے۔ ہاتھ پاؤں بھی پیلے پڑ گئے تھے۔ جیسے زینو برسوں کی بیمار ہو۔ یا کوئی روگ اسے اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ رہا ہو۔ توے پر روٹیوں کو الٹتے پلٹتے وقت زینو اپنی شلوار اور قمیض کی گرہوں کو ڈھیلا کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ وہ فیض کی نظروں سے جھینپ گئی تھی۔ اسے ایسے محسوس ہوا تھا۔ جیسے فیض کی نظریں اس کے بدن کو چیرتی ہوئی وہاں پہنچ جائیں گی۔ جہاں اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی چھپی ہوئی تھی۔ اس احساس نے زینو کے جسم میں کپکپی سی دوڑا دی تھی۔ اور اس کے پیٹ کے اندر کوئی چیز اچھلنے لگی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو زور سے تھام کر کراہنے لگی تھی۔ فیض نے گھبرا کر حقّے کی نے کو دانتوں سے علیحدہ کر کے پوچھا تھا۔

"کیا ہوا زینو"۔

"کچھ نہیں"

"درد ہو رہا ہے کیا"؟

"نہیں"

"پھر"؟

"تم اس طرح میری طرف نہ دیکھا کرو فیض"۔

"کیوں"

"میں کہتی ہوں مت دیکھا کرو میری طرف۔ میں مر جاؤں گی۔

یہ کہہ کر زینو دوسری طرف مُنہ پھیر کر رونے لگی۔ اور فیض کچھ نہ سمجھ کر حیران ہو گیا تھا۔ کیا ہو گیا تھا زینو کو؟ بات بات پر قہقہے لگانے والی شوخ اور چنچل زینو جس کی زندہ دلی کے چرچے سارے شال کھوڈ میں تھے۔ جو ہر مصیبت پر ہنس دیتی تھی۔ جو ہر غم کو ہنستے کھیلتے سہہ لیتی تھی جس نے آتے ہی فیض کے اُداس اور تاریک کوٹھے میں ہنسی اور روشنی بکھیر دی تھی۔ وہی زینو اب اتنی چڑچڑی ہو گئی تھی۔ وہ قہقہے وہ ہنسی وہ شوخی اور چنچلتا سب کیا ہوئی؟ فیض یہ سوچ کر کچھ اُداس ہو اٹھا۔ اور سامنے چولھے سے نکلنے والا سارا دُھواں اسے اپنے دل و دماغ پر چھاتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ اور سامنے کی ہر چیز تاریک ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ زینو بھی اور اس کے ساتھ منسوب کی ہوئی اُمید بھی کچھ کچھ دھندلانے لگی تھی۔ زینو کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطروں کو لرزتے دیکھ کر فیض کا دل ڈوب گیا تھا۔ اور وہ اپنے آپ ایک ایسے آدمی کی طرح محسوس کرنے لگا تھا۔ جیسے ساری دنیا مجرم کہتی ہو لیکن جس نے کوئی جرم نہ کیا ہو۔ ہاں زینو ہی تو اس کی دنیا تھی۔ اس کی زندگی کی اُمید۔ اُس کا سب کچھ۔ اور وہ اسی کی وجہ سے روئی تھی۔ اور فیض کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اپنے آپ کو کوسنے لگا تھا۔ اپنے آپ کو دل ہی دل میں گالیاں دی تھیں۔ شاید اس کی وجہ سے زینو سے اس کے قہقہے چھن گئے۔ اس کی شوخی چنچلتا اس سے رُوٹھ کر چلی گئی۔ ہاں وہی تو چاند پر گہن لگانے کا باعث بن گیا تھا۔ فیض کے دل میں یہ خیالات اُبھرے تھے۔ لیکن اس کی زبان بالکل گُنگ تھی۔ اور اس لئے وہ زینو کو یوں ہی چھوڑ کر کوٹھے سے باہر نکلا تھا۔ باہر زوروں کی بارش ہو رہی تھی۔ دُور پہاڑ کے اوپر بادل کڑک رہا تھا۔ اور فیض کو ایسا لگا تھا۔ جیسے اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا دھواں ساری فضا میں گھل گیا۔ اور ہر چیز اسی لئے تاریک ہو چکی ہے۔

اس وقت بھی چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ پہاڑ کی باہر نکلی ہوئی دو باہوں کے ساتھ چپٹے ہوئے ہموار چھتوں والے کوٹھے کُہر اور دُھند میں کھو گئے تھے۔ خوشبودار جھاڑیوں اور لمبی پہاڑی گھاس میں چھپے ہوئے لاکھوں بے نام کیڑوں نے اپنے نہ رُکنے والے نغمے سے ساری فضا میں ایک پُر اسرار گونج پیدا کی تھی۔ لیکن تاریکی میں کہیں کہیں کسی رکھوالے کی مشعل تھوڑی دیر کے لئے چمک کر پھر چھپ جاتی۔ جیسے وہ غول بیابانی ہوں۔ بادلوں کی چھاتی پر تھوڑی دیر تک چمکنے والی بجلی۔ سمیع گوجر کے گھر گھاس کا تیسرا گٹھا چھوڑنے کے بعد فیض اب لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے کوٹھے کی طرف آ رہا تھا۔ گو وہ تھک کر چُور ہو چکا تھا۔ لیکن پھر بھی نہایت تیزی کے ساتھ چل رہا تھا۔ اور اس کے آگے اس کی بکری رانی۔ بیل نیلا اور دو گائیں بھی تیزی کے ساتھ بھاگی جا رہی تھیں۔ کوٹھا نزدیک آ گیا تو چوپائے دوڑ کر گول پتھروں والی دیوار کو پھاند کر اندر صحن میں چلے گئے۔ لیکن فیض کے قدم اب کچھ دھیمے دھیمے پڑنے لگے۔ صحن کی دیوار تک آتے آتے وہ بالکل رُک گیا۔ کیونکہ اس کا دل اس کے سینے میں اس قدر تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگا تھا۔ جیسے ابھی اس کی پسلیوں کو توڑ کر باہر آ جائے گا اُس کی سانس

پھولنے لگی۔ ہونٹوں کے کنارے کانپنے لگے۔ اس نے اپنی لکڑی پر اپنے جسم کا سارا بوجھ ڈال دیا۔ اس نے ہمہ تن گوش ہو کر کسی آواز کو سننا چاہا۔ لیکن اسی وقت رانی ممیائی۔ اور نیلا اپنی لمبی آواز میں پکارا۔ جانوروں کی آواز سن کر بھی زینو کوٹھے سے باہر نہ آئی۔ فیض صحن میں داخل ہوا۔ تو اس نے سب سے پہلے دیوار کے ساتھ لگی ہوئی ناند میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ زینو نے بھوسہ طیار نہیں کیا تھا۔ تھان کا دروازہ بھی کھلا تھا۔ اور رانی کے دونوں بچے نہ جانے کہاں گئے تھے۔ رانی انہیں سامنے نہ دیکھ کر گھبرائی ہوئی تھان سے باہر نکلی۔ اور ایک بار پھر زور سے ممیائی۔ فیض کو محسوس ہوا جیسے وہ بھی رانی کی طرح اس وقت مضطرب اور گھبرایا ہوا ہے۔ فیض نے رانی پر سے نظریں اٹھا کر کوٹھے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ کھڑکی سے دھواں بھی نہیں نکل رہا تھا۔ اور زینو ابھی تک اندر ہی تھی۔ تو کیا وہ گھڑی سچ مچ آگئی تھی۔ فیض کا دل پھر زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کی سانس پھُول نے لگی۔ رانی دوڑ کر گول پتھروں کی دیوار پر اپنی اگلی ٹانگیں جما کر زور سے ممیائی۔ اس وقت فیض بھی دھڑکتے دل میں اٹھنے والے امید و بیم کے جذبات کے ساتھ زور سے چلایا

"زینو"

فیض کے جواب میں رانی ممیائی۔ فیض کا دل دھڑکا۔ کیڑوں کے پُر اسرار شور پر ایک ننھی سی کمزور آواز غلبہ پا کر فضا میں پھیل گئی۔ رانی کے بچے کوٹھے کے دروازے سے اچھلتے کودتے باہر نکل آئے اور دوڑتے ہوئے اپنی ماں کے لمبے لمبے تھنوں سے دودھ پینے لگے۔ رانی خوش ہو کر دُم ہلانے اور باری باری اپنے بچوں پر زبان پھیرنے لگی کوٹھے کے دروازے پر روشنی پھیل گئی۔ فیض سنبھلا۔ دین محمد کی ماں کوٹھے سے کھانستی ہوئی باہر نکلی۔ اس کے ایک ہاتھ میں دیا اور دوسرے میں مٹی کی ہانڈی تھی۔ فیض دوڑ کر اس کے پاس جا پہنچا۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت بھی اس کی زبان اسی طرح گنگ ہو گئی جیسے تین روز پہلے زینو کے رونے کے وقت ہوئی تھی۔ دیے کی روشنی میں اس نے دین محمد کی ماں کے چہرے کی جھریوں میں کوئی چیز ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ جھریوں میں ایک شرارت آمیز ہنسی چھپی ہوئی تھی۔ وہ جھینپ کر اور سر کو جھکا کر اپنے پیر کے انگوٹھے سے زمین کھودنے لگا۔ دین محمد کی ماں بولی۔

"فیض"

"ہاں چاچی"

"مبارک ہو! بچہ ہوا ہے"۔

"بچہ"؟

ہاں ہاں بچہ۔ پیر جی کی برکت سے زینو بھی بچ گئی۔ اور بچہ بھی۔

فیض کو ایسے لگا۔ جیسے کسی نے اس کے قدم زمین میں گاڑ دئے ہوں اور اس کے منہ پر تالا لگا یا ہو۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا۔ لیکن اس کی زبان اس کے منہ میں سوکھے چیتھڑے کی مانند ہو گئی۔ اس کا گلہ خشک ہو گیا۔ پیر جی کی برکت سے زینو بچ گئی۔ اور اس کے سر سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا۔ سمیع گوجر کے گھاس کے تینوں گٹھوں سے کہیں زیادہ بھاری بوجھ جو اس کے وجود کو کچلے جا رہا تھا۔ اس کی زندگی کو دبائے جا رہا تھا اور جس بوجھ کے تلے زینو کے قہقہے۔ اس کی شوخی اور ہنسی سسک رہی تھی فیض کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ اور وہ تھوک نگل کر بمشکل بول سکا۔

"میں اندر جاؤں چاچی"؟

بڑھیا فیض کی بے قراری کو دیکھ کر اپنے پوپلے منہ میں ہنسی اور ہانڈی کو نیچے رکھ کر اور اپنی میلی قمیص سے آنکھیں پونچھ کر بولی۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں"۔

بڑھیا نے دیے کی مدھم روشنی میں دیکھا۔ فیض کی آنکھوں میں شرم تھی۔ حیرانی تھی۔ خوشی تھی۔ وہ دوبارہ ہنسی۔ فیض جھینپ گیا۔ وہ کچھ عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ زینو اور اس کے درمیان چند قدم کا فاصلہ تھا۔ لیکن دین محمد کی ماں اس فاصلے کے بیچ پہاڑ کی طرح حائل ہو گئی تھی اور اب اپنے پوپلے منہ میں ہنسے جا رہی تھی جیسے سچ مچ کسی پہاڑ کی تاریک گپھا کا منہ کھل گیا ہو۔ فیض نے اپنے حواس کو اکٹھا کیا۔ سامنے پہاڑ نہ تھا اور نہ کوئی گپھا۔ یہ تو دین محمد کی ماں تھی۔ وہ ہمت کر کے پوچھنے لگا۔

"تو میں جاؤں اندر"؟

"نہیں! بڑھیا گرجی۔ فیض کا دل ڈوب گیا۔ یہ دین محمد کی ماں نہیں۔ سچ مچ ایک پہاڑ تھا۔ جو زینو اور اس کے آگے حائل تھا۔ اس کے پیچھے اور اس کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

رانی کے بچوں کو پہلے اس سے علیحدہ کر کے تھان میں بند کرو۔ وہ

دیکھو اُنھوں نے اس کے تھنوں کو خالی کر دیا"۔

فیض نے دیئے کی مدھم روشنی میں رانی اور اس کے بچوں کی طرف نظر دوڑائی - وہ آگے بڑھ کر انہیں رانی کے تھنوں سے الگ کرنے لگا - رانی پیار سے ممیانے لگی - فیض کے ہاتھ رک گئے اس نے جانے کیا سوچ کر انہیں پھر دودھ پینے کے لئے چھوڑ دیا - اور وہ اپنی چھوٹی چھوٹی دُموں کو ہلاتے ہوئے رانی کے تھنوں کے ساتھ لگ گئے رانی یکے بعد دیگرے ان پر اپنی زبان پھیرنے لگی - فیض کی آنکھوں میں پیار اُتر آیا وہ رانی اور اس کے بچوں کی طرف یوں ہی دیکھتا رہ گیا - بڑھیا فیض کو رکتے دیکھ کر چیخی!

"کیا دیکھ رہا ہے پھجے؟ بچوں کو تھان میں لے جاؤ"۔

"نہیں چاچی اس کی کوئی ضرورت نہیں"۔

"ہیں"

"ہاں چاچی پینے دے انہیں آج سارا دودھ! یہ دن روز روز تھوڑے ہی آئے گا"۔

فیض دین محمد کی ماں کو حیران چھوڑ کر لپک کر کوٹھے کے اندر چلا گیا اس کا دل ابھی تک اس کے کانوں میں بج رہا تھا - سامنے دیئے کی روشنی میں اُس نے دیکھا - زینو اس کے بچے کو دودھ پلا رہی تھی - اور پیار بھری نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھے جا رہی تھی - رانی اور اس کی آنکھوں میں کتنی مماثلت تھی! زینو کے چہرے پر اُمید کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں - اس کی خوشی لوٹ آئی تھی - زینو کی آنکھوں کے گرد ابھی تک سیاہ حلقے تھے - لیکن آنکھوں کی پتلیوں میں وہ اُداسی اور تفکر نہ تھا - اس کے گال ابھی تک زرد تھے - اس کے ہونٹ ابھی تک خشک تھے - لیکن ان پر ایک لافانی خوشی اور مسرت کی چھاپ تھی - فیض زینو کے چہرے کو جی بھر کر دیکھنے کے بعد آہستہ سے پکارا -

"زینو"

زینو کی آنکھیں ایک بار فیض کی طرف اُٹھ کر پھر بچے پر جھک گئیں فیض نے دیکھا - زینو کی آنکھوں میں خوشی اور پیار کے ساتھ وہ فخر اور غرور اتر آیا تھا - جو فیض کی آنکھوں میں تھا - اُسے زینو کا وجود قہقہے لگاتا ہوا محسوس ہوا - وہ خود کچھ حیران - کچھ خوش اور کچھ شرمسار سا دروازے کی چوکھٹ پر کھڑا اپنے بچے کو دیکھتا رہ گیا - قدرے توقف کے بعد زینو بولی -

"بالکل تمہاری شکل پر ہے"۔

"سچ"

"ہاں"

"دیکھوں تو"! یہ کہہ کر فیض زینو کے پاس آ کر بیٹھ گیا - اور بچے کو غور سے دیکھنے لگا - ڈرتے ڈرتے اُس نے اپنی اُنگلی سے اس کی ناک اور مُنہ کو چھیڑنا شروع کیا - بچے نے دودھ پینا چھوڑ دیا تو فیض نے اُسے دونوں ہاتھوں میں بڑی احتیاط کے ساتھ اُٹھا لیا - بچے کے ہونٹوں کے کنارے پھیل گئے - وہ رونے لگا - فیض کے ہونٹ بھی پھیل گئے اور تھوڑی دیر کے بعد کوٹھے کے دروازے سے فیض کے زوردار قہقہے باہر نکلنے لگے - زینو بھی فیض کی دیکھا دیکھی قہقہے لگانے لگی اور باہر دین محمد کی ماں رانی کے بچوں کو اس سے علیحدہ کرتے کرتے بڑبڑانے لگی -

"بچے ہیں ابھی"۔

مغیث الدین فریدی

تضمین

(برغزل حضرت غالب اکبرآبادی)

بیٹھا ہوں شمعِ غم کو فروزاں کئے ہوئے برسوں ہوئے ہیں کیف کا ساماں کئے ہوئے
عرصہ ہوا ہے ربطِ دل و جاں کئے ہوئے مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

ٹھکرا رہا ہوں آرزوئے تاج و تخت کو کچھ اور کر رہا ہوں بلند اوجِ بخت کو
طے کر رہا ہوں عشق کی ہر راہِ سخت کو کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

گزرے ہیں مجھ کو دورِ چمن سے کئی برس شوقِ بہارِ سیرِ گلستاں کی ہے ہوس
پھر گرمیِ نگاہ سے جلنے لگا قفس پھر گرمِ نالہ ہائے شرربار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کئے ہوئے

ہاتھوں میں خط کو لیتے ہی دل سے لگا لیا وارفتگی نے پڑھنے کی فرصت نہ دی ذرا
اب جا کے اضطراب کا وہ جوش کم ہوا پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کئے ہوئے

ہر لمحہ انتظار کا ہے مجھ کو اک برس سوزِ غمِ فراق سے ہے گرم ہر نفس
بس احترامِ آبروئے وضعِ عشق بس! مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے

ہنستی ہے ضعفِ زہد پہ پھر ہمتِ گناہ مسجد سے اٹھ کے لیتا ہوں پھر میکدے کی راہ
پھر ہے نظر میں ساقیِ نوخیز بے پناہ اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے ہے گلستاں کئے ہوئے

خوددار بن کے عشق میں کھائی ہیں ٹھوکریں اب چاہتے ہیں ترکِ غرور و وفا کریں
قدموں میں ان کے عمرِ محبت گزار دیں پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کئے ہوئے

تارے شبِ فراق میں لے چشمِ غم نہ گن یکسوئیِ خیال نہیں ہوتی یار بن
پھر شوق چاہتا ہے وہی دورِ مطمئن جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

اک عمر جس نے جھیلے ہوں صدمے فراق کے کیا طعنہ ہائے درد کی وہ تاب لا سکے
بس دور ہی سے حال فریدی کا دیکھ لے غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

ست پرکاش سنگر

مشترکہ گھوڑا

متفقہ طور پر یہ قرار پایا کہ اگلے دن چندن باڑی چلیں۔

"کل صبح ہی چار گھوڑوں کا انتظام کرنا پڑے گا۔ میں نے تجویز پیش کی"

"مجھے بھی گھوڑے پر بیٹھنا ہوگا؟" کرشن نے عینک کے شیشوں میں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ظاہر ہے"۔ مادھو نے جواب دیا۔ "اور گھوڑا آپ پر کیسے بیٹھے گا؟"

"میں اصولاً گھوڑے پر نہیں بیٹھتا"۔ اس نے کہا۔

"اصولاً گدھے پر بیٹھ لینا"۔ مادھو بولا

میں ان کے اصولوں سے واقف ہو چکا تھا۔ ان کا سب سے سنہری اصول یہ تھا کہ گانٹھ کو مضبوطی سے باندھ کر رکھیں۔ میں نے ایک تجویز پیش کی۔

"اگر ہم دونوں مل کر ایک گھوڑا لے لیں تو؟"

اُن کی باچھیں کھل گئیں۔ جس چہرے پر ابھی ایک منٹ پہلے ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، وہاں اب رونق ناچنے لگی۔ وہ فرطِ مسرت سے اُٹھے اور میری طرف لپکے میں نے سمجھا کہ سودا کا دورہ شروع ہو گیا ہے۔ میں پھرتی سے اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اور میز کے پار کھڑا ہو گیا۔ مدافعت کے طور پر میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر مرض زیادہ ستانے لگے گا۔ تو میز پر پڑی لیمن کی بوتل سے ان کا سواگت کر دوں گا۔

خبردار! اگر آگے قدم بڑھایا۔ میں نے کرشن کو للکارتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم نے بات ایسی کی ہے کہ تمہاری بلائیں لینے کو جی چاہتا ہے"۔ وہ بولے

"ارے چھوڑو بلائیں کیا لیں گے۔ یہ خوبانی لو"۔ مادھو نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ خوبانی کو دیکھ کر کرشن بلائیں کو بھول گیا اور ان کے ساتھ محو ہو گیا۔ کوئی سیر بھر کھانے کے بعد بولا۔

"تو یہ طے پایا کہ میں اور آپ ایک گھوڑا کریں ..."

"اور اسے نصف نصف بانٹ لیں"۔ میں نے جملہ پورا کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں کہ ہم دونوں کے لئے ایک گھوڑا کافی ہے اس سے ہم پہاڑ کی چڑھائی کا لطف بھی لے سکیں گے۔ اور گھوڑے کی سواری کا بھی"۔

".... رنگ بھی چوکھا آئے"۔ مادھو نے چٹکی لی۔

ہم میں سے اس سے پہلے کوئی چندن باڑی گیا نہیں تھا اور سب نے اس کے بارے میں مختلف باتیں سن رکھی تھیں۔ کوئی کہتا تھا کہ وہاں سردی ہوتی ہے۔ کوئی کہتا گرمی۔ مادھو کا خیال تھا کہ وہاں دن میں برف پگھلتی ہے۔ کرشن کہتا تھا کہ رات کو۔ ایک کہتا کہ علی الصبح چلنا چاہیئے' دوسرا کہتا کہ دھوپ تیز ہونے پر جانا مفید ہے۔ ایک کے خیال میں پیدل چلنے میں مزہ آتا ہے۔ دوسرے کے خیال میں گھوڑے کی سواری میں۔

"میں نہیں سمجھتا کہ لوگ اکیلے کیسے لطف اٹھا سکتے ہیں"؟ کرشن نے کہا۔

"صحبتِ بد سے اکیلے جانا بدرجہا بہتر ہے"۔ میں نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کرشن نے اشارہ اپنی طرف سمجھ کر ناراض ہونے کی کوشش کی۔ مادھو کو چند خوبانیوں سے جدا ہونا پڑا۔

اگلے دن صبح چھ بجے میری آنکھ کھلی' تو میں نے مادھو کو آواز دی۔ اس نے حسب معمول جواب دیا کہ میں جاگ رہا ہوں۔ میں نے کرشن کو آواز دی۔ اس نے کہا۔ "میں سو تو نہیں رہا۔ جاگ میں بھی رہا تھا۔ صرف کروٹ لے کر لیٹ گیا اس کے بعد سات بجے میری آنکھ کھلی۔ دونوں کو پھر آواز دی۔ اور انہوں نے بالکل وہی جواب دیا' جیسے رٹ رکھا تھا۔ آٹھ بجے میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چونکہ جاگ وہ بھی رہے تھے۔ وہ دونوں بھی اُٹھ بیٹھے۔ نو بجے تک ہاتھ مُنہ دھویا دس بجے تک ناشتہ ختم کیا' اور چل پڑے۔

جب ہم سڑک پر پہنچے تو ہمیں دیکھتے ہی گھوڑے والوں کا جم غفیر ہم پر
لپکا۔ کرشن نے سمجھا کہ شاید حملہ کرنے آ رہے ہیں اور واپس بھاگنے کو تھا لیکن
مدھو نے اسے دلاسا دیا۔ گھوڑے والوں نے ہر چیخ مچا دی۔ وہ شور کہ الامان
"صاحب میرے گھوڑے پر آئیے"۔ "صاحب! اس کا گھوڑا کسی کام کا نہیں
میری گھوڑی کبوتری کی طرح جاتی ہے"۔ "ارے صاحب! جب گھر سے اتنے
سو میل دور آئے ہو تو ٹٹو پر کیوں بیٹھتے ہو؟"

"کیا دام لوگے"؟ مدھو نے ایک سے پوچھا۔

"گھوڑے کے"؟ اس نے جواب میں پوچھا

"گھوڑے کے نہیں، سواری کے"۔

"ریٹ تو تین ہے۔ آپ سے پانچ ہی لے لیں گے۔ اس نے رعایت کا
اعلان کرتے ہوئے کہا۔

"مطلب"

"اب خدا نے آپ کو دو گھوڑوں کا جسم دیا ہے، اسے ایک گھوڑے کو
اٹھانا پڑے گا...."

بکو نہیں۔ مدھو نے اپنی چھڑی کو زور سے زمین پر مارتے ہوئے کہا

"مار ڈالا!" کرشن زور سے چلایا۔ چھڑی اس کے پاؤں سے جا ٹکرائی تھی۔

"اچھا آپ چار ہی دینا" گھوڑے والے نے کہا۔ اور ان دونوں صاحبوں کو
تین تین ہی دینے ہوں گے۔ اور آپ کی بچی کو دو"۔

لیکن ہم تو صرف ایک گھوڑا لیں گے۔ اور اس کے چار آنے کم دیں گے
کرشن نے کہا۔

"اس سے کیا ہوگا"؟ میں نے پوچھا۔

"چار مینار کے سگرٹ لیں گے"۔ وہ بولے

اوہ! میں نے خجالت کو چھپاتے ہوئے کہا۔

مدھو نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھوڑوں پر نظر دوڑائی
جیسے جیون ساتھی کا انتخاب مقصود ہو۔ اور ایک سفید پلی ہوئی گھوڑی پر
نظر ٹکا کر بولے۔ ہمیں تو یہ پسند ہے۔

اس بے چاری سے بھی تو پوچھ لو۔ کرشن نے دھیرے سے مشورہ دیا

تم خاموش رہو جی۔ مدھو نے ڈانٹ بتلائی

تو آپ کے لئے دوسری یہ گھوڑی موزوں رہے گی۔ ایک مرمٹنے نازے

کشمیری نے مدھو کو مخاطب کرکے کہا۔

میں دو کیا کروں گا؟

سرکار ایک گھوڑی تو دم توڑ دے گی۔

آپ خاموش رہئے۔ مدھو نے چشمے کو سنوارتے ہوئے کہا۔

"جی حضور"!

سب سے پہلے مدھو کو گھوڑی پر چڑھایا گیا۔ اس کی مدد کے لئے
دو ہم تھے، اور تین گھوڑے والے۔ سب سے پہلے جو انھوں نے چھلانگ لگائی
تو ایک کشمیری پر آ رہے۔ پلٹ کے آئے اور پھر چھلانگے تو دم کی طرف منہ کرکے
بیٹھ گئے لات کو گھماتے ہوئے سیدھے بیٹھنے کی کوشش کی۔ تو کیلوں والا بوٹ
دوسرے کشمیری کے جما دیا۔ جو اس نے اپنے کمبل پر دبوچا۔ طے یہ پایا کہ نیچے اتر
کر پھر چڑھیں۔ ساتھ والی دکان سے ایک میز مانگ کر لائی گئی۔ اور اس کی مدد
سے وہ گھوڑی پر چڑھنے میں کامیاب ہوئے۔

اس میز کو ساتھ ہی گھوڑی پر رکھ لو۔ کرشن نے مشورہ دیا۔

نہیں صاحب۔ بوجھ بڑھ جائے گا۔ گھوڑے والے نے پروٹسٹ
کیا۔ کرشن نے مدھو کے اس تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

گھوڑے کو بٹھلاؤ

بھئی گھوڑا ہے، اونٹ نہیں۔ میں نے کہا۔

اس میں کیا فرق ہے؟ وہ بولے۔

"جو آپ میں اور مدھو میں ہے"۔

مدھو، کرشن اور شمو گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ میں اور ایک سائیس
پیدل روانہ ہو گئے۔ چندن باڑی کی طرف۔

آدھ میل چلنے کے بعد مدھو نے پوچھا۔

کرشن! اٹیچی کیس لائے ہو؟

کرشن نے مجھ سے پوچھا۔ اور میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اب بھلا مجھ
سے کہا ہی کس نے تھا!

"لیکن اس میں تو شام کی چائے کے لئے سامان ہے!

سامان تو چندن باڑی مل جائے گا۔ میں نے کہا

اگر سامان کا مطلب برف ہے تو وہاں ضرور ملے گی۔

مدھو نے تمسخرانہ انداز سے کہا۔ لیکن کسی نے ان کی بات کی داد نہ

دی۔ کچھ دیر کے بعد وہ پھر بولے

"اٹیچی کیس لانا ہی ہوگا، اس میں چائے کا سامان ہے، اور خاص کر میں خالی چائے کبھی نہیں پیتا۔"

"صبر کا گھونٹ ہی پی لینا۔" کرشن نے بلا فیس مشورہ دیا۔

"Don't Be Vulgar" مدھو نے زور سے کہا۔ بہرحال تو حسب معمول غیر متاثر رہا۔ اس کا گھوڑا ہنہنا دیا۔ دوسرے دو گھوڑوں نے بھی اس کی نقل کی۔

ہم سب واپس لوٹے۔ میں ہوٹل میں گیا۔ لیکن چابی مدھو کے پاس ہونے کی وجہ سے پھر لوٹا۔ اور اٹیچی کیس لے کر واپس آیا۔

کارواں پھر روانہ ہوا۔ ایک میل جانے کے بعد مدھو نے کہا۔

کرشن! دیکھو کتنا خوبصورت نظارہ ہے۔ لاؤ کیمرہ اس کا فوٹو لیں۔

نظارے تو یہاں ایسے بیسیوں ہیں۔ میں نے کہا۔

بڑے بد ذوق ہو جی۔ مدھو بولا۔ کرشن! تم نکالو کیمرہ۔

میرے پاس کوئی الہ دین کا چراغ تو ہے نہیں، جس کی مدد سے کیمرہ نکال سکوں، کیونکہ وہ تو ہوٹل میں میرے بیگ میں پڑا ہے۔ اس نے جواب دیا۔

اُفوہ! مدھو نے چہرے پر غصہ لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ تم نے سب مزا ہی کرکرا کر دیا۔

تو آپ کا مزا محض کیمرے میں ہے! کرشن نے آگ پر تیل چھڑکتے ہوئے کہا۔

بکو مت! اور واپس جاکر کیمرہ لاؤ۔ مدھو چلّا کر بولا

سب میرے ساتھ چلیں تو جاؤں گا۔ کرشن نے تجویز پیش کی۔

پانچ روپے ملیں تو میں طیار ہوں۔ میں نے شرط تجویز کرتے ہوئے کہا۔

پانچ نہیں، پانچ سَو! کرشن نے غصے کے انداز سے کہا۔ اس نے گھوڑے کو واپس دوڑا، ایڑ لگائی اور غائب ہوگیا۔ اور جلد ہی کیمرا لے کر لوٹ آیا۔

لیکن یہ تو کوئی اور کیمرا ہے۔ میں نے کہا۔

ہوٹل کے کمرے کی چابیاں تو مدھو کے پاس ہیں۔ اس لئے میں دکان سے کرایہ پر لے آیا ہوں۔ اس نے جواب دیا۔

اور اپنا دماغ کرائے پر چڑھا آئے ہو۔ مدھو نے چٹکی لی۔

اگر تم مجھے ستاؤ گے تو میں شام کی چائے کے لوازم ختم کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔

ہم خاموش ہوگئے۔ اسی میں بہتری تھی۔

اتنے میں دس بج چکے تھے اور دھوپ تیز ہو رہی تھی۔ دو صاحبان جو پہلگام آکر ہمارے واقف اور کرشن کے دوست بنے تھے۔ فرمانے لگے۔ کہیں صبح آٹھ بجے چلے جانا چاہئے تھا۔ ان میں سے ایک صاحب بولے۔

"لیکن ہمیں یہ پہلے کسی نے نہیں بتایا۔"

اور ہمیں بھی پہلے کسی نے نہیں بتلایا۔ میں نے کہا۔ مدھو حسب دستور ہنسنے لگا۔ اس کی گھوڑی نے اس کی پیروی کی۔ سردار صاحب اسے یوں بے موقعہ ہنستے دیکھ اپنے ساتھی سے بولے "سودا کا مرض ہے۔ آؤ چلیں"۔

اور ہم بھی چلے۔ کرشن، مدھو اور شمو گھوڑوں پر، میں اور سائکس پیدل۔ طے یہ پایا کہ ہم باری باری گھوڑے کی سواری کریں گے۔ کشمیر آکر ہماری جو شامت آئی۔ ہم نے کرشن کو وزیر خزانہ بنا دیا۔ حکومت بُری شے ہے۔ اس کا سب سے پہلے اثر دماغ پر ہوتا ہے۔ اب کرشن تو ایک معمولی انسان ٹھہرا۔ اس کے دماغ میں یہ بات گھس گئی کہ منیجر کیا بنا نظام سقہ بن گیا۔ اور لگا چمڑے کی چلانے۔ جو بات اس کے مُنہ سے ایک بار نکل گئی، وہ پتھر کی لکیر۔ جو بات آپ نے کی، وہ ایک دم غلط۔ جب ہم سب کو گرمی لگتی، وہ سویٹر پہن لیتا۔ اور جب ہمیں سویٹر کی ضرورت محسوس ہوتی، وہ قمیص اتار دیتا۔ جب صبح کے وقت ہوٹل کی کھڑکی میں سے سامنے پہاڑ پر سورج کی سُرخ شعاعوں کو سفید برف سے ہم آغوش ہوتے دیکھ کر میں چلّا کر کہتا۔ دیکھو کتنا حسین نظارہ ہے! تو وہ عجیب ہنسی ہنس کر کہتا۔ مجھے تو اس میں کہیں حُسن نظر آ نہیں رہا۔ اور جب اس وقت پہلگام ہوٹل کا چالیس سالہ بیرا چائے لے کر آ کھڑا ہوتا اور مدھو کہتا "تمہاری نظر میں یہ حُسن ہے؟ تو وہ ناراضی سے مُنہ پھیر لیتا۔

ہمارے جھگڑے کے بے شمار موضوع تھے۔ مثلاً سیر ناشتے سے پہلے ہو یا ناشتہ سیر سے پہلے۔ گھی کھائیں یا مکھن۔ بس میں فرنٹ سیٹ پر وہ بیٹھیں یا میں۔ رات کو شیر کشمیر پارک میں جاکر ریڈیو پر فلمی ریکارڈ سنیں یا پنواڑی کی دکان پر۔ کھانا میوہ سنگھ کے ہوٹل میں کھائیں یا پکوڑی مل کے ڈھابے پر۔ مدھو حتی الوسع توازن قائم رکھنے کی کوشش کرتا۔ کرشن سے کہتا کہ میں غلطی پر تھا اور مجھ سے کہتا کہ کرشن بہت ضدی ہے۔

وزیر خزانہ ہونے کی حیثیت سے اور عمر میں ہم دونوں سے چھوٹا اور عقل میں کم ہونے کی وجہ سے، کرشن نے مشترکہ گھوڑے کو اپنی مرضی کے

مطابق استعمال کرنے کے جملہ حقوق ریزرو کر رکھے تھے ۔ کبھی تو وہ کہتا کہ ہم باری باری آدھ آدھ گھنٹے کے لئے گھوڑے کی سواری کریں گے ۔ اور کبھی کہتا کہ ہر کوئی ایک ایک میل تک سوار ہوگا ۔ اب وقت اور فاصلے کا تصفیہ کرنے کے جملہ حقوق بھی بحق ینیجر محفوظ تھے ۔ عموماً اترائی آنے پر وہ اتر جاتا اور مجھے بیٹھنے کی پیشکش کرتا اور چڑھائی آنے پر باگ کو پکڑ کر مجھے نیچے اترنے کا اشارہ کرتا اور ساتھ ہی میری طرف چھڑی کو بڑھاتا ۔ اس نے ایک دستور بنا لیا کہ پیدل چلنے والا چھڑی لے کر چلے گا ۔ گویا گھوڑے کی سواری کے مقابلے میں وہ چھڑی سے تسکین حاصل کرتا ۔ میں خاموشی سے گھوڑے سے اترتا اور چھڑی سنبھال کر پیدل چلنے لگتا ۔ جونہی میں اپنی تکلیف کے اس مصنف کو کوسنے کے منصوبے باندھتا ۔ قدرت میری توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی ۔

داہنی طرف دریا تیزی سے بھاگا جا رہا تھا ۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مسلسل نغمہ تھا اور نغمے میں ایک دائمی موسیقی تھی ۔ اپنے معمولی آغاز اور اپنی غیر معمولی تنہائی کی پروا نہ کرتے ہوئے کئی ارمانوں کو دل میں چھپائے اور کئی ولولوں کو سینے میں دبائے، وہ ایک لمبے اور نامعلوم سفر پر چل نکلا تھا ۔ راستے میں یہاں وہاں اور ہر کہاں اسے ہم سفر آملے تھے ۔ جو اپنی انفرادیت کو ایک دم مٹا کر اس کی ہستی میں جذب ہوگئے تھے ۔ ان کا مجموعی نغمہ، جو چوٹیوں سے پٹے ہوئے برف کے شانت ذخیروں سے چھیڑ خانی کرتا ۔ سورج کی گرم شعاعیں ان کے دل میں گداز پیدا کرتیں ۔ اور اس کی خاموش کرنیں ان کے کانوں میں زندگی کا راز پھونکتیں ۔ زندگی سے ہم کنار ہونے کی اٹوٹ خواہش ان میں طوفان بپا کر دیتی اور وہ اپنے خزانوں کو لٹانے اور اپنی بیش بہا پونجی کو بہانے کا تہیہ کر لیتے ۔ فلک بوس سفید چوٹیوں سے، پانی کی لاتعداد لکیریں ۔ پہاڑ کی بلند دیواروں کا سہارا لے کر بہنے لگتیں جیسے کئی حسینوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کے بے شمار سوتے بہہ رہے ہوں ۔ ندی سے ہم آغوش ہوتے ہی وہ اپنی خاموش تانوں کو اس کے بلند نغموں میں ملا دیتے اور ناچتے اور شور مچاتے منزل کی طرف گامزن ہو جاتے ۔

دس ہزار فٹ کی بلندی پر سورج کی کرنیں برف کو پگھلا رہی تھیں تاکہ انسانوں کے استعمال کے لئے پانی کا ذخیرہ ختم نہ ہو سکے ۔ ان کے کھیت سیراب ہو سکیں ۔ اور ان کی فصلیں اگ سکیں ۔ اور جب یہ ندیاں اور نالے اپنے محبوب سمندر میں جا ملتے تو یہی کرنیں ان کو بادل کی شکل میں بدل دیتیں ۔ اور یہی بادل برف بن کر پہاڑ پر جم جاتے، اور پھر یہی برف پگھل کر پانی میں تبدیل ہو جاتی ۔

یہ کرنوں کا کھیل، زندگی کا مسلسل کھیل ہے ۔ پاس سے گزرتے ہوئے ایک سادھو نے مجھے دھیرے سے کہا ۔ یہاں کچھ ضائع نہیں ہوتا ۔ صرف مادہ روپ بدلتا ہے برف سے پانی، پانی سے برف، جیسے زندگی سے موت، موت سے زندگی ۔

"آپ کے خیال میں زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں، باوا جی؟" میں نے حیران ہو کر ان سے پوچھا ۔

"بالکل نہیں ۔ انہوں نے فوراً جواب دیا ۔ دونوں ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں، ایک ہی سکے کے دو پہلو ۔

اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا امرناتھ کی طرف چلا گیا . . . .

مجھے کرشن مہاراج کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اور یہ صاحب بہادر بغل میں کیمرہ اور گلے میں سویٹر لٹکائے، آنکھوں میں چشمہ اور سر پر ہیٹ لگائے، اس طرح شان سے بیٹھے ہوئے سواری کا مزہ لے رہے تھے، جیسے باوا کا گھوڑا ہو ۔ وہ اس بات کو ایک دم نظر انداز کئے بیٹھے تھے کہ کرائے کا گھوڑا ہے اور وہ بھی مشترکہ ۔ انہیں اس طرح اکڑ کر بیٹھے دیکھ کر میری چھاتی پر سانپ لوٹنے لگا، اور لوٹتا بھی کیوں نہ ۔ پیسے آدھے میں بھروں اور ٹانگیں پوری تڑواؤں ۔ مدھو چپکے سے سگریٹ میں دیا سلائی دکھا دیتا ۔ مجھ سے بولا

"کیا تم نہیں بیٹھو گے" ؟

"کہاں چٹان پر" ؟ میں نے جل کر پوچھا

"نہیں، گھوڑے پر" ۔

"اس پر تو کرشن بیٹھا ہے" ۔

"اوہ"! وہ بولا ۔ جیسے اسے وہ نظر ہی نہیں آرہا تھا ۔

کرشن نے جان بوجھ کر اشارے کو سمجھنے سے انکار کر دیا اور ایک فلمی دھن گانے لگا ۔

اب بھلا میری چھاتی پر سانپ کیوں نہ لوٹتا ۔ جلن کو شانت کرنے کے لئے میں نے اوک سے دریا کا برفانی پانی پیا ۔ اچانک مجھے ایک ترکیب سوجھی ۔ یہاں بیٹھ کر قدرے سستانا چاہیئے ۔ میں نے ہوا میں تجویز چھوڑی ۔ مدھو نے حسب معمول اس تجویز کو قبول فرمایا اور کرشن نے حسب عادت اسے ٹھکرایا ۔

"میاں کون سی جگہ سستانے کے لئے ہے" ؟ وہ بولا

"کون سی جگہ نہیں ہے" ؟ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا ۔

"ارے آ بھی اب" ۔ مدھو اسے ڈانٹ بتلا کر بولا ۔

تم اتر جاؤ۔ میں تو گھوڑے پر ہی سستاؤں گا۔ اس نے جواب دیا۔

گھوڑا بھی تو سستائے گا۔ مدھو نے اترتے ہوئے کہا۔

ہاں صاحب! چڑھائی میں تھک گیا ہے۔ ذرا آرام کرنا ہی چاہیئے۔ میرے اشارہ کرنے پر سائیس نے اپنی لمبی خاموشی کو زندگی میں پہلی بار توڑتے ہوئے کہا۔

اب کرشن کو مات کھانی پڑی اور وہ بادلِ ناخواستہ اُتر پڑا۔

میں موقعہ کی تاک میں تھا۔ جونہی وہ ادک سے ندی کا پانی پینے لگا میں لپک کر گھوڑے پر چڑھ بیٹھا۔ پانچ منٹ کی جدوجہد کے بعد اور کرشن، سائیس اور چند راہ گزروں کی مدد سے مدھو بھی گھوڑے کی پیٹھ پر جم گیا۔ اور کارواں رواں ہوا۔

برف کے پل تک سخت چڑھائی تھی اور کرشن کو وہاں پیدل چلنا پڑا۔

برف کا پل قدرت کا ایک بہترین شاہکار تھا اور قدرتی کاریگری کا ایک بے نظیر نمونہ۔ دو دیو ہیکل چٹانوں کے سہارے یہ قدرتی پل کھڑا تھا۔ نیچے سے تین دھاروں کی شکل میں بہتا ہوا ایک مسلسل شور مچاتا ہوا دریا بہہ رہا تھا۔ اور اوپر برف کا فرش تھا اور اس کے ساتھ برف کی بلند دیوار کھڑی تھی۔ دریا کی تندی بھیانک تھی اور تیزی خطرناک۔ مدھو کو گھوڑے سے اتار کر اس پل پر لائے تاکہ اُس کی تکان دور کی جائے۔ اس کی تکان نے اُس ہی کو نہیں ہم سب کو، اور کشمیر کی ساری وادی کو پریشان کر رکھا تھا۔ باتوں باتوں میں ہم برف کے پہاڑ پر چڑھ گئے۔ مدھو نے میرے کان میں پھونک ماری اور حکم کی تعمیل میں میرے ہاتھ کرشن کی ٹانگوں میں جا پڑے اور انہیں کھینچنے لگے جیسا کہ خیال تھا، ٹانگوں کے ساتھ اس کا جسم بھی پہاڑ سے لڑھکنے لگا اور کچھ دو چار منٹ برف کے فرش پر آ رہا۔ زندگی بے حد پھیکی ہونے کی وجہ سے کرشن سفر کو جاری رکھنے اور ندی کی روانی میں جا ملنے کے خیال سے کھیل ہی رہا تھا کہ ایک حسینہ کی بے ساختہ ہنسی نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ صرف اس لڑکی کی نظرِ عتاب کے لئے کرشن نے پہلگام میں کئی دن سعیٔ ناکام کی تھی۔ اور اب بلا کوشش نظرِ عتاب کی جگہ نظرِ عنایت میسر ہو گئی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ زندگی اتنی بے رنگ تو نہیں جتنی وہ سمجھے بیٹھا تھا اور حسینوں کی مسکراہٹ اس میں رنگ بھر سکتی ہے وہ نئے جوش کے ساتھ اُٹھا، پہاڑ پر چڑھا اور وہاں سے پھسل پڑا۔ اسے پھر انعام ملا۔ اُس نے چاہا کہ اس کھیل کو جاری رکھوں لیکن مدھو کے دل کی جلن نے اس کے منصوبے کو پورا نہ ہونے دیا۔

چندن باڑی میں ایک ہی ہوٹل تھا، اگر دو تین چولھوں کے اوپر ایک خستہ حال چھپر کو ہوٹل کہا جا سکتا ہے۔ ایک لکڑی کے شیڈ کے نیچے اٹھارھویں صدی کی بنی ہوئی میزوں اور کرسیوں پر دو للنائیں اور چار لالے مونگ کی دال اور کدو کی سبزی پر بوس رہے تھے۔ ایک لڑکا گھی ملے ہوئے دودھ کی مدد سے مٹن کی پلیٹ کھا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مدھو کے منہ میں پانی بھر آیا اور اس نے بھی پلیٹوں کا آرڈر دیا۔ تین طشتریاں صاف کرنے کے بعد ہوٹل والے سے بولا۔

ارے ہہنگا سنگھ! یہ تو کچا تھا۔

صاحب! آپ چولھے کے پاس آ بیٹھئے، ابھی پک جائے گا۔

بھوک تیز کرنے کے لئے مدھو گھاس پر لیٹ گیا، کرشن مٹر کے دانے نکالنے لگ گیا اور میں دوسرے برف کے پل کی طرف روانہ ہو گیا۔ سبزی کا انتظام کر دیا، کرشن بھی پل پر آ رہا۔ مدھو نے کچھ کروٹیں بدل ڈالیں۔ اور شمّو نے کھانا ختم کیا۔ خُدا خُدا کر کے سبزی تیار ہوئی۔ لگاتار گھوڑے پر بیٹھے رہنے کی وجہ سے مدھو کو بھوک بہت لگ رہی تھی۔ اس نے دو درجن چپاتی اور آدھی درجن طشتریاں صاف کیں اور پھر لیٹ گیا۔ اسے گھاس میں اس طرح لوٹ پوٹ ہوتے دیکھ کر کرشن غصے سے بولا۔

کیا تم سات سو میل کا فاصلہ محض اس لئے طے کر کے آئے ہو کہ گدھے کی طرح یہاں آ کر لیٹو۔ لیکن اس کے جواب میں مدھو نے صرف اتنا کہا۔

ارے بھائی ہہنگا سنگھ! میں صرف چار کپ چائے پیوں گا اور چار انڈوں کا آملیٹ لوں گا۔ اور ہماری طرف اشارہ کر کے بولے ان لوگوں سے پوچھ لو انہیں کیا چاہیئے۔

آپ کی شفقت اور ہہنگا سنگھ کی عنایت۔ میں نے آداب بجا لا کر کہا۔

چندن باڑی سے امرناتھ دو تہائی حصہ اور رہ جاتا ہے اور مدھو شاید آگے جانے کو اسی وجہ سے طیار نہیں ہوا کہ لوٹتے لوٹتے اس کا دو تہائی حصہ راستے ہی میں رہ جائے گا۔ اس کی وجہ سے ہمیں بھی واپس لوٹنا پڑا۔

مٹن کھلانے والا لڑکا مجھے مخاطب کر کے بولا۔

"بابو صاحب! کیا پیدل چلیں گے"؟

"ظاہر ہے ہوائی جہاز کا انتظام تو ہے نہیں"۔

"تو آؤ چلیں"۔

کرشن اس تجویز سے بہت خوش ہوا۔ ایک تو اسے گھوڑے کی سواری

مل گئی' دوسرے پل والی لڑکی کا ساتھ مل گیا اور تیسرے مجھ سے نجات ۔

سردار صاحب سے باتیں کرتے راستہ کٹ گیا ۔ انہوں نے مجھے بتلایا کہ وہ سرگودھا کے رہنے والے تھے' اور آج کل امرتسر میں بیوپار کرتے تھے ۔ ان کی بدقسمتی انہیں کشمیر کی سیر کو کھینچ لائی ۔ کشمیر کے ایک شہر میں وہ ایک ہوٹل میں ٹھہرے ۔ جہاں کسی نے ان کے ٹرنک سے بہت سی چیزیں اڑا کر اس کا بوجھ ہلکا کر دیا ۔ وہ اس بات پر افسوس کرنے لگے ۔ جب میں نے انہیں بتلایا کہ میرا بستر راستے میں کھو گیا ہے' ان کا سب غم جاتا رہا ۔

باتوں باتوں میں ہم آدھے سے زیادہ راستہ طے کر گئے اور ندی کے موڑ پر رک کر شہسواروں کا انتظار کرنے لگے ۔ ایک گھنٹہ بعد گھوڑے اپنے سواروں سمیت آ پہنچے ۔ کمال فراخ دلی سے کرشن بھگوان نے گھوڑے کی باگ کو میری طرف بڑھا دیا اور دس منٹ کے بعد مکمل سنجیدگی کے ساتھ چھڑی کو میری طرف بڑھایا ۔ میں نے چھڑی کا چارج سنبھالا ۔ اور گھوڑے کا چارج دیا ۔ تین میل تک حالات میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی ۔ چھڑی میرے ہاتھ میں رہی اور باگ رقیب کے ۔ ہاں برف زیادہ پگھلنے کی وجہ سے نالے چڑھ آئے تھے اور انہیں پار کرنے کے لئے مجھے پتلون کو اوپر چڑھانا اور جوتوں کو اتارنا پڑتا ۔ اس مصیبت اور تنہائی میں علم دین سائیس کا ساتھ ہی مجھے گوناگوں تسلی بخش رہا تھا ۔ کیوں کہ سردار صاحب بھی میرا ساتھ چھوڑ گئے تھے ۔ علم دین کشمیر اور کشمیریوں کے بارے میں میری معلومات میں اضافہ کرتا رہا ۔ راستے میں پڑنے گاؤں میں کشمیری بچے یا تو میری سنجیدہ شکل دیکھ کر ڈر سے بھاگ نکلتے' یا مجھے علم دین سے باتیں کرتے دیکھ کر پیسے مانگتے ۔ ان کے والدین اکڑ کر کھڑے رہتے' اور راہگیروں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے ۔ بچوں کو پیسے دینے کے میں اصولاً خلاف تھا کیوں کہ جیب سے جاماہے اور مشترکہ گھوڑے نے میرا پارہ چڑھا رکھا تھا ۔ ان بچوں کو نظرانداز کرتا ہوا میں چلتا گیا ۔ حسین قدرتی مناظر میرے لئے غیر دلکش بن گئے تھے ۔ ناتی کا نغمہ مجھے محظوظ کر رہا تھا' نہ دلکش سبزہ ۔ ٹانگوں میں درد تھا' جسم میں درد تھا' دل میں درد تھا ۔ زندگی میں ایک بار نہیں' دو بار' مشترکہ بیوپار میں دھوکا کھا بیٹھا تھا ۔ اب مشترکہ گھوڑے میں بھی مات کھائی ۔ پیسے برباد کئے گئے' گھوڑا رقیب کے قابو میں رہا ۔

پہلگام سے آدھ میل کی دوری پر گھوڑ سوار میرا انتظار کر رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے ۔ شاید اپنی جیت اور میری ہار کے ۔ مجھے سنجیدہ مزاج دیکھ کر کرشن نے گھوڑے کی باگ کو میری طرف بڑھاتے ہوئے مجھ سے چھڑی مانگنے کی کوشش کی ۔ میں نے اس کی اس حرکت کو ایک دم نظرانداز کر دیا ۔ ہمدردی کے جذبے سے متحرک ہو کر' یا مذاق کے جذبے سے' مدھو صاحب بولے ۔

" تھک گئے ہوں گے' گھوڑے پر بیٹھنے میں کیا حرج ہے" ؟

خاموش رہنے میں کیا حرج ہے ۔ میں نے سنجیدگی سے اسے مشورہ دیا ۔ ان کا مذاق روپوش ہو گیا اور سنجیدگی یخ ۔

مجھے اس حد تک سنجیدہ دیکھ کر وہ دونوں بھی گھوڑے پر سے اتر پڑے ۔ کرشن کو پیچھے دیکھ کر مدھو میرے کان میں بولا

" یہ شخص بڑا خود غرض ہے ۔ میں نے اسے بار بار کہا کہ تمہیں بیٹھ لینے دے لیکن بولا کہ تمہیں پیدل چلنے میں زیادہ مزہ آتا ہے" ۔

مدھو کا سانس جلدی پھول گیا اور وہ پیچھے رہ گیا ۔ تب کرشن نے آہستہ سے میرے کان میں کہا ۔

" یہ مدھو بھی کیسا عجیب شخص ہے ۔ اس نے مجھے گھوڑے پر سے اترنے ہی نہیں دیا ۔ اچھا کل گلیشیر پر چلیں گے" ۔

" ایک شرط پر" ۔ میں نے کہا

" کیا" ؟

" مشترکہ گھوڑا نہیں لیں گے" ۔ میں نے کہا

سر سے پاؤں تک کرشن کے جسم میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی ۔

ذکر و فکر

غزل —— یعقوب عثمانی

موجزن سینۂ صرصر میں ہیں ارماں کچھ اور
گھٹ چلا فاصلۂ ساحل طوفاں کچھ اور

ظلمتِ شب سے ہیں آثار نمایاں کچھ اور
ہو گیا زرد رخِ شمعِ شبستاں کچھ اور

کیسے کھولے ابھی انسانیت اپنا پرچم
آ تو لیں صف میں نظر بازوں کی انساں کچھ اور

ہاں لبِ زخم یہی وقت گل افشانی ہے
شورشیں لاتی ہیں تقریر کے عنواں کچھ اور

مسکراہٹ کے دبائے نہ دبی دل کی کسک
ہو گئی کوششِ اخفا سے نمایاں کچھ اور

پیش بھی کرنی ہے گلچیں تجھے تاریخِ بہار
غور سے دیکھ لے اوراقِ پریشاں کچھ اور

عیشِ منزل کے تصور سے بھی آگے ہیں قدم
آج ہے مشورۂ کاوشِ پنہاں کچھ اور

ذرّہ ذرّہ ہے تمناؤں کا مدفن یعقوب
رنگ لائے گی ابھی خاکِ گلستاں کچھ اور

غزل —— طرفہ قریشی

یہ ساغروں کی کھنک نہیں تھی یہ بادۂ انگبیں نہیں تھا
نہ تھا مری مے کشی سے پہلے ظہورِ مستی کہیں نہیں تھا

مرے تبسم مرے قدم نے جہاں کو رنگینیاں عطا کیں
نہیں تھا میں تو ریاضِ عالم کا کوئی گوشہ حسیں نہیں تھا

مری طلب نے اسے ابھارا مری نظر نے اُسے نکھارا
تمہارا جلوہ کہاں نہیں تھا؟ تمہارا جلوہ کہیں نہیں تھا

ہوئی تھی مضراب زن نہ جب تک مری نظر سازِ عاشقی پر
خودی بھی تھی ناشناسِ نغمہ جنوں بھی سوز آفریں نہیں تھا

کہیں تھا غیظ و غضب نمایاں کہیں تھے جنگ و جدال رقصاں
جلال کی صورتیں تھیں لاکھوں جمال کا رخ کہیں نہیں تھا

ملا اسی کو مقامِ رفعت تھی جس کی فکر و نظر میں وسعت
بنا دیے آفتاب گردوں جو ذرّہ ننگِ زمیں نہیں تھا

توجہ اور اس طرح توجہ، عنایت اُن کی نوازش اُن کی
ستم رہے گا مسلسل اُن کا ہمیں تو یہ بھی یقیں نہیں تھا

کسے خیالِ اصولِ سجدہ کہاں کا آئینِ جبہ سائی
پہنچ گئے ان کے در پہ جب ہم تو ہم کو ہوشِ جبیں نہیں تھا

زہے کمالِ سرورِ فطرت خوشا وفورِ غمِ محبت
جنابِ طرفہ کی آرزوؤں کا کوئی پہلو حسیں نہیں تھا

چاندنی رات —— ضیا فتح آبادی

میرے محبوب تجھے حُسن و جوانی کی قسم
میری پاکیزہ محبت کو نہ رسوا کرنا

پرورش پائی اندھیروں ہی میں ہم نے اب تک
چاندنی رات کی ہرگز نہ تمنا کرنا

ہم ابھی رسم و روایات کے پابند تو ہیں
ننگ و ناموس کی فکروں سے نہیں ہیں آزاد

غم و آلام کو سہنے کی ہمیں عادت ہے
لب پر آتی نہیں جور اور جفا کی فریاد

چاندنی رات سویرا نہیں گو رات ہی ہے
اپنے ماحول کو پہچان تو سکتے ہیں مگر

ذہن میں جاگتا ہے عالمِ نو کا احساس
چشمِ بینا کو نظر آتے ہیں عیب اور ہنر

میرے محبوب محبت کا تقاضا ہے یہی
دل کے جلتے ہوئے داغوں سے اُجالا کرنا

چاندنی رات میں ملنے کی تمنا ہے غلط
چاندنی رات کی ہرگز نہ تمنا کرنا

غزل —— اشرف قادری

میں اپنے اس وہمِ دل کے قرباں فغانِ دل بے اثر نہیں ہے
خیال رہتا ہے مجھ کو جس کا اسے مری کچھ خبر نہیں ہے

ہے دل میں ایک اضطرابِ پیہم مگر میری آنکھ تر نہیں ہے
مجھے محبت ہے ان سے لیکن کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

ملیں گے وہ بالیقین مجھ کو کہ خام عزمِ سفر نہیں ہے
میں ان منازل کا راہ رو ہوں جہاں کوئی راہبر نہیں ہے

بقیدِ حسنِ طلب جہاں میں تمہارے جلوؤں کی کیا کمی ہے
ہے خام میرا ہی ذوقِ جلوہ مجھی کو تابِ نظر نہیں ہے

قفس ہے اب زیست کا سہارا ہے جبر کی زندگی گوارا
خیالِ پرواز کیا کریں ہم کہ جسم پر کوئی پر نہیں ہے

ابھی زمانے میں اور اشرف چلیں گی کچھ منقلب ہوائیں
ابھی مسافر جہانِ نو کا مقامِ مقصود پر نہیں ہے

غزل —— نشتر خیر آبادی

فریاد نہیں شکوۂ ستم کرتے رہیں گے
ہم خود اُنہیں مجبورِ کرم کرتے رہیں گے

کعبے کو شکایت ہے تو ہو اپنے خدا سے
سجدے تو درِ یار پہ ہم کرتے رہیں گے

افسانہ محبت کا کبھی ختم نہ ہوگا
تجویز نئی سرخیٔ غم کرتے رہیں گے

کعبے میں تو تسکین کی صورت نہیں ملتی
بت خانے میں اب طوفِ صنم کرتے رہیں گے

مے خانہ سلامت رہے ہم دور سے نشتر
نظارگیٔ دیر و حرم کرتے رہیں گے

محمد شفیع الرحمٰن

ہندی زبان اور مسلمانوں کی شرکت

زبانوں کے لحاظ سے ہندوستان، دُنیا کے بڑے سے بڑے براعظم سے زیادہ وسیع ہے۔ اسی کو ہمیشہ ایک ملک سمجھتے چلے آئے۔ حالانکہ یہاں آٹھ سو ستر (۸۷۰) سے زیادہ بولیاں اور بھاشائیں بولی جاتی ہیں اور یہاں کی زبانوں کی تاریخ اس قدر قدیم ہے کہ بہت سی زبانیں معدوم ہو چکیں۔ اُن میں سے بعض کا پتہ صرف پُرانی تحریروں اور کتبوں سے ملتا ہے۔ اصل ہندُستانی زبانیں جن کا سنسکرت کے خاندان کی زبانوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ زیادہ تر جنوبی حصّہ ملک میں اب بھی رائج ہیں جن میں سے تامل تیلگو ملایالم، دراوڑی اور کناڑی وغیرہ خاص ہیں۔

سنسکرت، بہت قدیم، مخصوص علمی اور مذہبی زبان تھی۔ اس کے جاننے اور استعمال کرنے والے بھی بہت ہی مخصوص اور محدود لوگ تھے۔ یہ زبان بہت اعلیٰ اور خاص علوم کے لیئے تھی اور عوام کی دسترس سے باہر تھی۔ اس علمی اور انتہائی بلیغ زبان سے مشتق ہوکر عام بول چال کے واسطے پراکرت رائج ہوئیں۔ اُن میں سے ہی پالی بھی تھی۔ مہاتما بُدھ اور اُن کے متبعین نے بُدھ مذہب کی تبلیغ پالی زبان میں کی مہاراجہ اشوک کی زبان پالی تھی اُن کے نصب کئے ہوئے مینار اور کتبے پالی زبان میں ہیں۔ عبرانی زبان جس طرح یہودیوں کی مذہبی زبان ہے اسی طرح پالی بُدھ مذہب کی زبان ہوگئی۔ برما، مشرقی جزائر، لنکا، تبت چین جہاں جہاں بُدھ مذہب پہنچا یہ زبان بھی پہنچی۔

پراکرتوں سے مشتق ہوکر مختلف مقامی اپ بھرنش अपभ्रंश عوامی غیر نحوی بولیاں رائج ہوئیں۔ جیسے سورسینی، مگدھی، اونتی، مہاراشٹری گجراتی وارچاری وغیرہ۔ مدت کے استعمال سے ان کی صورت بدلتی رہی۔ اور ان سے مشتق ہو کر ہر علاقے کی مقامی بھاشا بیں مُرتّب ہوئیں۔ جنوبی حصہ ملک کے علاوہ، شمالی وسطی حصہ ملک میں جو زبانیں بولی جاتی ہیں۔ وہ باستثناء بعض کے، تقریباً سب سنسکرت کے خاندان کی زبانیں ہیں۔ جیسے کشمیری، لاہنڈی، پنجابی، سندھی، گُجراتی، مہاراشٹری، راجستھانی، برج بھاشا، بندیلی، قنوجی، بھاگیلی، چھتیس گڑھی، بھوج پوری، اسعد مگدھی، مَیتھلی، اوڑیا بنگالی، آسامی وغیرہ۔

لسانیات کے عالموں نے پنجابی، لاہنڈی اور سندھی زبانوں کے علاقوں کی حدوُد سے مشرق میں بنگالی اور اوڑیا زبان کی حدود تک اور شمال میں پہاڑی زبانوں کی مختلف بولیوں کی حدود سے جنوب اور جنوب مشرق اور جنوب مغرب میں، جنوبی ہندوستان کی قدیمی زبانوں اور بنگالی اور اوڑیا کے علاقوں اور مراہٹی زبان کی حدود تک کے وسطی حصہ ملک کی مختلف بولیوں اور بھاشاؤں کی شاعری اور تحریری زبان کو ہندی کا نام دیا ہے۔ اس میں سنسکرت خاندان کی بہت سی بولیاں، بھاشائیں، محاورے اور لہجے، لغات، تت سم، تدبھو اور دیساج شامل ہیں۔

بے شمار قدیم زمانے سے سنسکرت ہی علمی، مذہبی، ادبی اور تحریری زبان تھی۔

پڑھنے لکھنے کی ضرورتیں اور رواج کم تھا۔ اس قسم کے کام کرنے والے بہت ہی خاص اور مخصوص طبقہ کے لوگ ہوتے تھے۔ مذہبی رسوم اور مکان اور خاص موقعوں پر سنسکرت کے اشلوک مقدس کتابوں کے اقتباس پڑھے جاتے تھے اور ان کے پڑھنے والے مخصوص طبقے کے لوگ ہوتے تھے۔ عوام میں پڑھنے لکھنے کا رواج نہ تھا۔ یہ کام ان ہی مخصوص لوگوں کا تھا اور سنسکرت تو بالاتر زبان تھی۔ سنہ عیسوی سے کئی سو برس پہلے پالی کا رواج ہوا اور پڑھنے لکھنے والے اس کو استعمال کرنے لگے۔

عوامی ضرورتوں اور موقعوں کے لئے مختلف زمانوں میں مختلف مقامی پراکرتوں، اپ بھرنشوں اور بھاشاؤں کا استعمال ہوتا رہا۔ مختلف حصۂ ملک میں اور مختلف زمانوں میں بھاٹ پنچولی اور سیوگ وغیرہ نظمیں، گیتیں کہہ لیتے اور گاتے اور پڑھتے تھے۔ اُن میں کسی ممدوح کی مدح رزمیہ گیتیں، یا کسی کا عشقیہ قصّہ یا خاندانی حال یا نسب نامہ ہوتا تھا۔ یہ نظمیں بیشتر زبانی پڑھی یا گائی جاتی تھیں اور ایک سے دوسرا یاد کرتا رہتا تھا۔ اور یہ تصنیفات لوگوں کی زبان پر رہتی تھیں۔ لکھنے کا رواج نہ ہونے کی وجہ سے قلمبند نہ ہوتی تھیں سنسکرت
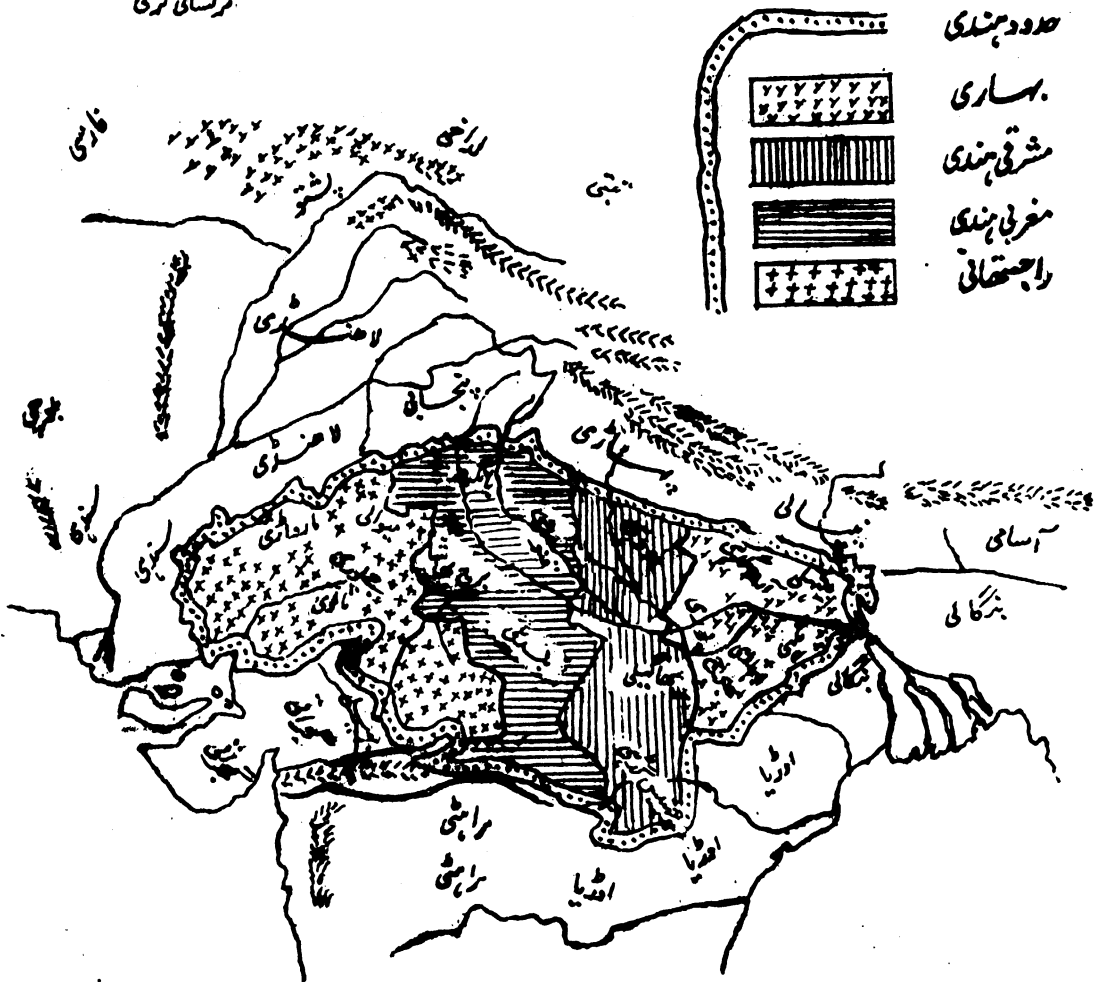
اور پالی کے علمی ذخیروں کے علاوہ سنسکرت خاندان کی زبانوں میں زیادہ قدیم تحریریں نایاب ہیں۔ ۸۰۰ء سے ۱۰۰۰ء تک کی کچھ مقامی نظموں کا پتہ ملتا ہے۔ اگرچہ یہ ہندی کی مسلمہ تاریخ سے پہلی ہیں لیکن ان کو ہندی شاعری کی ابتدا کہا جا سکتا ہے ان سب سے پُرانی ملنے والی نظموں کے مصنفوں میں بھی۔ اکرم، فیض، مسعود اور قطب علی کے نام بہت خاص مرتبے پہ موجود ہیں۔

سنسکرت خاندان کی متذکرہ بالا اور بعض غیر متذکرہ بولیوں اور بھاشاؤں کے مجموعہ اور سب کی مجموعی شاعری اور تحریری زبان کو ہندی کا نام دیا گیا۔ سنسکرت خاندان کی سورسینی اور مہاراشٹری زبانوں کے مجموعے کا نام ناگر تھا۔

नागरस्तु महाराष्ट्री - शौरसेन्योस्तु सकरात्

اس ناگر اور دوسری متذکرہ زبانوں سے مخلوط ہو کر ناگری زبان بنی۔ ہندی زبان کا رسم الخط ناگری اختیار کیا گیا اور اس سبب سے ہندی رسم الخط کو ناگری کہا گیا۔ یہ رسم الخط یا دنی تیز سنسکرت ہی کا رسم الخط ہے۔ ہندی زبان کے الفاظ علاوہ ان بھاشاؤں اور بولیوں کے سنسکرت سے مشتق ہوئے۔ کچھ الفاظ سنسکرت سے بجنسہٖ ہندی میں شامل ہوئے اُن کو تت سم کہتے ہیں اور کچھ الفاظ سنسکرت سے صورت بدل کر ہندی میں شامل ہوئے اُن کو تدبھو کہتے ہیں اور دوسری زبانوں فارسی ترکی عربی وغیرہ اخذ کئے ہوئے الفاظ کو دیساج کہتے ہیں۔

ہندی شاعری نے کچھ ترقی کی تو عروض کے قواعد بھی مرتّب کئے گئے اور وہ بھی سنسکرت ہی سے ماخوذ ہوئے۔ سنسکرت کی عروض اور صرف و نحو دُنیا کی زبانوں میں نہایت مکمّل اور مرتّب ہے۔ ہندی میں ایسی صرف و نحو کی ضرورت نہیں جیسی منضبط اور کس ویاکرن سنسکرت کی ہے۔ لیکن جس قدر بھی ویاکرن ہندی میں لی گئی وہ سنسکرت ہی سے ماخوذ ہے۔ اس لئے وُہ نہایت مکمل ہے۔ عروض کے قواعد بھی سنسکرت سے مستخرج ہوئے۔ لیکن زبان کے سہل اور سلیس ہونے کی وجہ سے اس کی پابندیوں میں بھی سہولت رہی۔ ہندی شاعری میں اچھراوٹی اور تتو بودھنی میں بہت آزادی ہے۔ بحور اور اوزان کے قواعد اور معیار البتہ سنسکرت کے تتبع میں پیچیدہ ہو گئے۔

کلام کی خوبی شاعر کی دست رس پر منحصر ہے لیکن زبان میں اس قدر سلاست شیرینی کی گنجائش اور ایسی سہاؤنا، دلفریبی اور دل کشی کے تاثرات کی وسعت ہے کہ دوسری زبانوں میں نہیں ملتی۔ ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ لطیف سے لطیف مضمون اور مؤثر سے مؤثر طرز ادا کے لئے سادہ سے سادہ اور عام فہم زبان سے کام لیا جا سکتا ہے۔ دوسری زبانوں سے ثقیل اور غیر متعارف الفاظ۔ غیر مانوس اور اجنبی ترکیبیں اور استعارے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تصنّع کا خواہ مخواہ ہی شوق ہو اور زبان کو ثقیل اور ناقابل فہم بنانا ہی حُسن سمجھا جائے تو مجبوری ہے ہندوستان کی لسانیات کے ماہر ڈاکٹر سر جارج گریرسن نے اس کے لئے ایک لطیف تمثیل لکھی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی زمانۂ حال کی نوخیز، نوجوان حسین لڑکی کو اُس کے موجودہ دستور کے موافق اچھے نفیس کپڑے اُتار کر اُس کی مری ہوئی، مرحوم، پردادی کے پُرانے بوسیدہ کپڑے پہنا دئے جائیں تو وہ کیسی معلوم ہوگی اور اُس کی کیا حیثیت اور وقعت ہوگی۔

ہندی زبان کے مؤرخ اس پر متفق ہیں کہ ۱۱۹۱ء میں راجہ پرتھی راج (۱۱۵۹-۱۱۹۲) کے دربار کے بھاٹ 'چاند بردائی' نے اپنے ممدوح کی سوانح اور اُس عہد کے حالات "پرتھی راج راسو" کے نام سے نظم کئے تھے۔ وہ نظم ہندی کی پہلی تصنیف ہے اور اُس وقت سے ہندی کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلی نظموں کا بھی پتہ ملتا ہے۔ ۱۰۰۰ء میں اجمیر کے راجہ 'بیل دیو' کی مدح میں "بیل دیو راسو" لکھی گئی لیکن وہ اپ بھرنش پراکرت میں تھی۔ ۱۱۶۰ء کی نظم "کھمان راسا" کے متعلق بھی یہ ہی فیصلہ ہے کہ وہ پراکرت میں تھی۔ انہل واڑہ، گجرات کے ہیم چندر کی نظم "کمار پال چرتر" بھی مقامی پراکرت میں تھی۔ "پرتھی راج راسو" بھی چاند بردائی نے ایسی زبان میں لکھی ہے کہ سر جارج گریرسن اور دوسرے محققین لسانیات ہند کی یہ رائے ہے کہ اُس کے الفاظ اپ بھرنش سورسینی سے بہت قریب ہیں۔ یہ نظم اُس وقت سے سترھویں صدی عیسوی تک ایک بھاٹ سے دوسرے کو منتقل ہوتی چلی آئی۔ سترھویں صدی میں میواڑ کے راجہ امر سنگھ جی نے اُس کو قلمبند کیا۔ بہرحال سب محققین اس پر متفق ہیں کہ یہ ہندی زبان کی پہلی تصنیف ہے۔ چاند برداری نے یہ نظم راجستھانی بولی میں جس کو ڈنگل بھی کہتے ہیں، لکھی۔

अपभ्रंश प्राकृत

अपभ्रंश शौरसेनी

ڈنگل اور پنگل کا فرق، جملہ معترضہ ہے اور مختصراً یہ ہے کہ راجستھان کے مصنف اپنی ملکی اور مقامی بھاشا کو ڈنگل کہتے ہیں اور دوسری بھاشاؤں اور دوسرے علاقوں کی زبانوں کو پنگل کہتے ہیں اور مؤخر الذکر میں برج بھاشا، اودھی، بالیسواڑی، بندیلی میتھلی وغیرہ سب شامل ہیں۔

ہندی زبان کی پہلی تصنیف، چاند بردائی کا شاہکار، 'پرتھی راج راسو' بہت مقبول نظم ہے اور اب تک بڑے شوق سے پڑھی اور ذوق سے سُنی جاتی ہے۔ زبان ابتدائی اور قدیم ہے زبان راجستھان کی ہے۔ یہ مسلّم طور پر ہندی کا پہلا

مصنف اور شاعر اپنی اوّل ترین ہندی تصنیف کی تمہید میں لکھتا ہے۔

बकिधर्मे विशालस्य राजनीति नवं रसं
बदूभाषा पुराणा च कुरानं कथितं मया

समय १ रूपक ३८ یعنی کلام بہت بڑا دھرم ہے اور راج نیتی پالیٹکس نو رسوں میں سے ایک رس ہے، میں نے چھو بھاشا، پُران کی زبان اور قرآن کی زبان میں سب کچھ کہہ دیا ہے۔

बदूभाषा اور **पुराणा** سے مراد سنسکرت اور پراکرت اور پُران کی زبان کے محاورے اور اشتقاقات ہیں اور **कुरान** سے مراد عربی کے الفاظ اور مضامین اور مسلمانوں کے لائے ہوئے خیالات ہیں۔ چاندبردائی لاہور کا رہنے والا تھا۔ وہاں مسلمانوں کی سلطنت تھی۔ اُن کی زبان، اُن کے خیالات اور مضامین کی ترویج شروع ہو چکی تھی۔ اس ہندی زبان کے آدم کی شہرہ آفاق پہلی ہندی تصنیف میں مسلمانوں کی لائی ہوئی عربی اور فارسی کے بہت الفاظ، ترکیبیں، مضمون اور خیالات موجود ہیں۔ اُن کی تفتیش، تشریح اور تنقیح تو بہت طویل مبحث ہے۔ اُس نظم کے ایک صفحے میں سے عربی، فارسی کے الفاظ مثال کے طور پر پیش ہیں۔ اسم، نشان، آماد، تیغ، نشانی، شرم، سلام، حرم، پاسبان، خود، نور، ترکش، امراء، رحمٰن، آب دین، نیزی، حکم، سلطان، غرور۔ ایک صفحے کا یہ انتخاب مشتے از خروارے کے پیمانے سے بہت کم ہے۔

امبیکا پرشاد ویج پائی، اپنی کتاب "ہندی پر فارسی کا اثر" میں لکھتے ہیں۔

"ہم چاند سے پہلے کسی شاعر سے واقف نہیں، جس کا کلام ہم تک پہنچا ہو۔ لیکن چاند کے بعد جو پہلا شاعر ہُوا وہ ہندو نہیں تھا بلکہ مسلمان تھا۔ اور اُس نے ڈنگل میں نہیں لکھا بلکہ پنگل میں لکھا۔"

اور دوسری جگہ ویج پائی جی لکھتے ہیں

یعنی پنگل کے پہلے شاعر امیر خسرو کے بعد جو ہندی شاعر ہوئے انھوں نے بہت آزادی سے فارسی، عربی اور ترکی الفاظ استعمال کئے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ الخ۔

ڈنگل **डिङ्गल** راجستھان کی زبان کا نام ہے۔ راجستھان کی زبانیں نسبتاً کرخت اور غیر مرصع، غیر مرتّب تھیں اور اب بھی ہیں۔ ڈنگل کے لغوی معنی، ایسے پتھروں کے مجموعہ کے ہیں جن کو سنگ تراش نے نہ کاٹا ہو یعنی گھڑے اور بنائے نہ گئے۔ اور بالمقابل پنگل سے مراد ہندوستان کی دوسری زبانیں ہیں۔ **पिङ्गल** کے لغوی معنی، شعر اور نظم کے اوزان اور بحروں کو جانچنے کے ہیں۔ گویا یہ زبان ہی شاعری کے لئے بنی ہے اور شاعرانہ ہے۔ یہ مجمل سا فرق ہے اور اصلیت وکیفیت اس فرق کی زبان جاننے والوں پر روشن اور واضح ہے۔ ہندی کی پہلی تصنیف اتفاقاً اور وقت کی ضرورت سے اور مؤرخ کے راجستھان سے متعلق ہونے کی وجہ سے راجستھانی زبان میں لکھی گئی۔ لیکن شاعرانہ زبان اور اصل ہندی پنگل سے ہی مُراد ہے۔ اور اس کے ثبوت میں ادب کے دلدادہ اور خود ادیب راجوں مہاراجوں کے پنگل میں کلام اور پنگل کی سرپرستی اور قدردانی کے واقعات تاریخ سے ملتے ہیں۔ راجستھان کے راجپوت راجہ خود بھی مصنف تھے اور پنگل کے مصنفوں سے کتابیں بھی لکھوائیں۔

بہاری لال ہندی کا مشہور شاعر مہاراجہ جے پور کے دربار کا شاعر تھا۔ جگد ونود کا مصنف کوی پدماکر مہاراجہ جگت سنگھ کے دربار کا شاعر تھا۔ جودھ پور کے مہاراجہ جسونت سنگھ خود عالم اور پنگل ہی کے شاعر تھے۔ بھاشا بھوشن اُن کی تصنیف ہے۔ کوی راج مراری دان نے مہاراجہ جسونت سنگھ کی فرمائش سے النکار کے فن پر جسونت بھوشن لکھی اور ایک لاکھ روپیہ انعام پایا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اصل ہندی زبان اور شاعرانہ زبان پنگل ہی تھی اور اُس کا پہلا شاعر، اور ڈنگل اور پنگل دونوں میں دُوسرا شاعر، حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کو قرار دیا گیا ہے۔ امیر خسرو کا علمی تبحر، روحانی کمال، فنون اور آلاتِ فنون کی ایجادات، راگ کے علم کی ترقی اور ابزادات اور اُس کے آلات کی ایجاد وغیرہ وغیرہ فضل وکمال زمانے میں مشہور ہیں۔ فارسی، عربی، ترکی اور سنسکرت کے علوم کے علاوہ فارسی اور ہندی ادب میں جو کچھ مرتبہ خسرو کا ہے اس کو سمجھنے اور پہچاننے کے لئے بھی علم کی ضرورت ہے۔ یہاں تذکرہ صرف ہندی کلام کا ہے۔ اُن کا کلام اس قدر دلآویز، دل کش اور مقبول عام ہے کہ اتنی مدت کے بعد بھی عورتوں اور بچّوں کی زبان پر جاری ہے۔ جب کوئی تیج تہوار، رُت، ریت رسم ہوتی ہے خسرو کا کلام ضرور گایا جاتا ہے۔ اس مقبولیت کی مثال ملنا دشوار ہے۔ شیرینی اثر، سلاست، معانی وغیرہ کے بیان کے لئے دفتر چاہیئے۔

اُن کی عجیب وغریب لغت کی کتاب "خالق باری" ہندی ہی میں ہے۔ ہندوستانیوں کے واسطے لکھی گئی۔ ہندی زبان میں اس قدر بولیاں اور بھاشائیں شامل ہیں۔ اصل ماخذ سنسکرت ہے۔ اس میں دوسری زبانوں سے الفاظ اخذ کرنے کی صلاحیت تمام زبانوں سے زیادہ اچھی تھی۔ مسلمان دوسرے ملکوں سے آئے اور اپنے ساتھ دینیں، علوم اور مضامین لائے۔ جن سے یہاں فائدہ اُٹھایا گیا۔ یہ سب چیزیں اور ان کے علاوہ اور اثرات یہاں جاری، طاری اور شاری ہو گئے۔ اس کے لئے باہر سے آنے والوں اور ملک کے رہنے والوں دونوں نے کوشش کی۔ یہ کتاب خالق باری اُس ہی کوشش کے سلسلے میں مفتی محققین

کا یہ خیال ہے کہ یہ کتاب بہت ضخیم تھی۔ دستبرد زمانہ کے بعد اتنی باقی رہ گئی جتنی اب موجود ہے۔ یہ ہندی لغت کی پہلی کتاب ہے۔ جو کچھ سلاست، لطافت اور طرز بیان کا حسن ہے وہ غیر مطالعہ سے ہی معلوم ہو سکتا ہے۔

امیر خسرو (۱۲۵۳ء - ۱۳۲۵ء) کا ہندی کلام یکجا موجود نہیں۔ تمام ہندی کے ملک میں اور اس سے باہر بھی زبان زد عوام ہے۔ جو کچھ قلمبند ہو گیا ہے اس میں عجیب عجیب صنعتیں، لطافتیں اور لطیف ترکیبیں ہیں۔ فارسی اور ہندی دونوں میں انھوں نے ایسے صنایع بدایع ایجاد کیے کہ نہ پہلے سے موجود تھے نہ بعد کو لکھنے والے ان کو اختیار کر سکے اور جو ہندی ادب کے ایسے جواہر پارے ہیں کہ دوسری جگہ مثال ملنی مشکل ہے امیر خسرو ترکستان کے ترک تھے۔ اس ملک کو وطن اختیار کر لیا تو یہاں کے علوم میں ید طولیٰ حاصل کیا۔ باہر سے آنے والوں کو یہاں کے علوم سکھائے اور یہاں کے باشندوں کو باہر سے آئے ہوئے علوم اور زبان سکھائی۔

ہندی زبان کے اور شاعروں کے تذکرے سے پہلے دو تذکرہ شاعروں سے بہت پہلے کے ایک شاعر کا تذکرہ کرنا ہے۔ تمام تذکرہ نویسوں نے ان کا ذکر قصداً یا سہواً نظر انداز کیا ہے اور ان کا کلام کسی جگہ نہیں ملتا۔ صرف ہندی کے بہت بڑے شاعر، گرو نانک نے اُن کے کلام کو محفوظ کر کے ہم تک پہنچایا۔ گرو نانک کا انتخاب کردہ حضرت خواجہ فریدالدین مسعود گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ کا کلام "گرنتھ صاحب" میں "اشلوک فریدجی" اور "شیخ فرید کی پاشیاں" کے نام سے موجود ہے۔ غالب گمان ہے کہ کلام اور بھی ہوگا۔ لیکن باقی نہیں رہا۔ گرو نانک نے اس کلام سے جو کچھ فیض اور حظ حاصل کیا وہ اُن کو ہی معلوم ہوگا۔ اُس کے سمجھنے اور کماحقہ فائدہ حاصل کرنے کے لئے گرو نانک جیسا عارف چاہیئے۔ گرو نانک کا یہ احسان ہندی زبان اور ہندوستان کے لوگوں پر ہے کہ انھوں نے اس کلام کو محفوظ کر دیا۔ ہندوستان کی لسانیات کے مؤرخوں اور تذکرہ نویسوں نے آپ کا تذکرہ نہیں کیا۔ آپ کے گرنتھ صاحب میں مندرجہ کلام میں پنجابی الفاظ اور لاہنڈی اور ملتانی محاورت زیادہ ہیں۔ ہندی کے مورخین اور لسانیات کے ماہرین نے ہندی کے شاعروں میں پنجاب کے شاعر گرو نانک کا بڑے خاص منزلہ پر ذکر کیا ہے۔ لیکن اُن ہی کے پسندیدہ شاعر اور معتقد الیہ شیخ فرید کا تذکرہ بالکل ترک کیا۔ اور سب ہی ترک کرتے چلے آئے۔ اگر ہندی کی جغرافیائی حدود کو اس فروگذاشت کا سبب سمجھا جائے تو گرو نانک کو بھی تو ان حدود کے باہر پنجاب سے ہے کہ ہندی شاعروں کے تذکرے اور ہندی ادب کو زینت دی۔

گرو ارجن سنگھ (۱۶۰۴ء) نے اس کے علاوہ ہندی ادب پر احسان کیا ہے کہ "آدی گرنتھ" میں ہندی شاعری کے ابتدائی نمونے جمع کر کے محفوظ کر دئے ورنہ یہ بھی مفقود ہو جاتے۔ اُن کے ذریعے سے جے دیو، سدنا، سین، نامی، نام دیو، دھنا جاٹ اور بھگت رائے داس کا کلام آدی گرنتھ میں ملتا ہے۔

آدی گرنتھ میں کبیر (۱۴۴۰ - ۱۵۱۵ء) کا بھی بہت کلام ہے۔ سکھ پیشواؤں کو شاعری اور ہندی شاعری سے خاص مذاق ہے۔ کبیر ہندی شاعری کے متقدمین میں بہت بڑا اُستاد مانا جاتا ہے۔ اُن کا کلام بہت ہے اور بہت کلام ایسا بھی ہے جو اُن سے منسوب ہے اور شاید اُن کا نہ ہو۔ کبیر کی شاعری کی زبان بشیتر اودھی ہے۔ اُس کے ساتھ دوسری زبانوں، عربی اور فارسی کے الفاظ اور ترکیبیں بھی استعمال کی ہیں۔

ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور، کبیر کے بڑے معتقد ہیں، انھوں نے لکھا ہے۔

"کبیر ۱۴۴۰ء میں مسلمان خاندان میں پیدا ہوئے۔ اپنی ابتدائی عمر میں رامانند کے چیلے ہو گئے۔ وہ ایسے زمانے میں تھے کہ جب بڑے ایرانی صوفیاء، عقلاء، سعدی، جلال الدین رومی اور حافظ کی جذباتی شاعری اور بلند فلسفے کا ہندوستان میں مذہب کے اوپر مؤثر اور گہرا اثر پڑ رہا تھا۔ اُس وقت اُن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اسلامی تصوف اور برہمنی مذہب کی روایتوں کو سمو کر ہم آہنگ اور مطابق کر دیں۔ کبیر میں لڑکپن ہی سے جبلی اور فطری مذہبی جذبہ موجود تھا۔"

کبیر کے رامانند کا چیلا ہونے کی روایت دوسرے مصنفوں نے بھی لکھی ہے اور ٹیگور نے بھی نقل کی ہے کہ کبیر رامانند کا چیلا ہونا چاہتے تھے۔ لیکن دشواری یہ تھی کہ ہندو گرو مسلمان چیلے کو کس طرح قبول کرے گا۔ کبیر نے اس دشواری کے لئے یہ تدبیر اختیار کی کہ رامانند جس گھاٹ پر نہانے کے واسطے جاتے تھے وہاں رات کو جا کر اُن کے راستے کی سیڑھیوں میں کبیر لیٹ گئے۔ صبح کو جب اندھیرے میں رامانند گھاٹ پر آئے تو اُن کا پیر کبیر کے اوپر پڑا۔ رامانند نے چونک کر کہا "رام رام"۔ کبیر نے رامانند سے کہا کہ میں داخل سلسلہ یا چیلا ہو گیا۔ اس طرح رامانند کو بھی تسلیم کرنا پڑا۔

کبیر کے کلام میں حقانیت، جذبہ صادق اور تصوف کی وجہ سے اثر اور جاذبیت ہے۔ وہ مذہبی ناروا تعصب کے خلاف تھے اور متعصبین کی مذمت برسر عام کرتے تھے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ اس ہی کا نتیجہ ہوا کہ اُن کی اس آزاد روش سے ہندو اور مسلمان دونوں ناراض ہوئے اور اُن کے خلاف بادشاہ تک شکایت پہنچائی۔ بادشاہ

نے ان کو بنارس سے شہر بدر کر دیا۔ آخر میں وہ گورکھپور کے علاقے میں، مگہر میں جا کر رہنے لگے۔

ٹیگور اور دُوسرے مصنفین نے ایک روایت یہ بھی لکھی ہے کہ کبیرؔ آخر عمر میں جھانسی میں پیر تقی کے مُرید ہو گئے۔ اُن کے انتقال اور دفن کا قصہ بہت مشہور ہے کہ جب انتقال ہو گیا تو مسلمانوں نے کہا کہ وہ مسلمان تھے۔ ہم جنازہ دفن کریں گے۔ ہندوؤں نے کہا کہ نہیں وہ ہندو تھے ہم جلائیں گے۔ اس تنازعہ کا فیصلہ خود کبیر کو کرنا پڑا۔ وہ دونوں فریقوں کو نظر آئے اور اُن سے کہا کہ جنازے پر سے چادر اُٹھا کر دیکھو۔ چادر اُٹھا کر دیکھا۔ مُردہ جسم کے عوض صرف پھول تھے۔ وہ پھول ہندو مسلمانوں نے تقسیم کر لیئے اور اپنی اپنی عقیدت کے اظہار میں ایک نے اپنے حصّے کے دفن کر دئے اور دُوسرے نے جلا دئے۔

کبیر کے لڑکے کا نام کمال تھا۔ ٹیگور نے لکھا ہے کہ کبیر کا نام اُن کے مسلمان ہونے کا یقینی ثبوت ہے۔ لڑکے کا نام بھی اس ہی قبیل سے ہے۔ کبیر نے اُن کا نام خود بھی اکثر جگہ لکھا ہے۔ جیسے

بوڈا بنس کبیر کا اپجو پوت کمال
ہر کا سمرن چھاڈ کے گھر لے آیا مال

دو تین اشلوک کبیر کے پیش ہیں۔

کبیر حج کعبے ہوئے ہوئے گیا کیتی بار کبیر
سائیں مجھ میں کیا خطا مکھوں نہ بولے پیر

تیرا صاحب ہے گھٹ ماہیں، باہر نینا کیوں کھولے
کہیں کبیر سنو بھائی سادھو، صاحب مل گئے تل اولے

کبیر حج کعبے ہو جائے تہا، آگے ملیا خدائے
سائیں مجھ سیوں لڑ پڑیا تجھے کن فرمائی گئے

کبیر کے ہم عصر، ہم مشرب، ہندی کے مایہ ناز شاعر گرو نانک (۱۴۶۹-۱۵۳۸ء) تھے۔ اُن کا کلام گرنتھ صاحب' اور' جاپ جی' میں محفوظ ہے۔ سکھ مذہب میں عظمت سے قطع نظر، کیسا عارفانہ، مؤثر اور دلپذیر کلام ہے۔ زبان کس قدر عام فہم اور سلیس ہے۔ عربی اور فارسی کے الفاظ اور ترکیبیں استعمال کرتے ہیں مسلمانوں سے تعلق اور ربط، ضبط، علماء، صوفیا اور درویشوں سے خصوصیت اور مراسم کی روایتیں موجود ہیں مسلمانوں کے خیالات، تہذیب، مذہب اور ادب کا اثر آپ کے کلام میں نمایاں ہے۔ آپ کے متعلق بھی یہ گفتگو ہے کہ ہندو تھے یا مسلمان۔ حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ سے خاص عقیدت تھی۔ اُن کا کلام گرنتھ صاحب' میں جمع کیا۔ یہ کلام اُن لوگوں کے پاس بھی موجود نہیں ہے جو نسل کا یا سلسلۂ طریقت کا براہ راست تعلق رکھتے ہیں۔

اُس ہی زمانہ کے ہندی کے باکمال شاعر، ملک محمدؐ جائسی (۱۵۴۰ء) درویش اور سنسکرت کے عالم تھے۔ پدماوتی اور اکھراوٹ، ہندی ادب میں بہت بڑے مرتبے کی تصنیفیں اُن کی یادگار ہیں۔ ہندی کا ہر منتہی طالب علم ان کو پڑھتا ہے۔ ہندی زبان کے سرمایہ میں ایک خاص رقم ہیں۔ ہندی زبان کے یورپین محققین نے ان کتابوں سے استفادہ کیا ہے اور اپنی زبانوں میں ترجمہ کیا ہے۔ پدماوتی، ہندی ادب میں ایک شاہکار ہے۔ زبان بہت ادق ہے۔ فارسی الفاظ اور ترکیبیں بھی استعمال کی ہیں۔ لیکن استعارے تلمیحات اور مناظر سب ہندوستانی ہیں۔ چتوڑ کی ۱۳۰۳ء کی لڑائی کا واقعہ تمثیلاً بیان کیا ہے اُس میں دوسرے قصّے اور افسانے بھی شامل کر دئے ہیں لیکن نظم کا مقصد موعظت ہے۔

سولھویں صدی میں کبیر، نانک اور ملک محمدؐ جائسی کے علاوہ نام دیو، میرا بائی اور ودیاپتی ہندی کے بڑے اور مشہور شاعر ہوئے۔ ہندی شاعری کا عروج اور کمال ترقی اس ہی صدی میں ہوا۔ یہ ہی زمانہ مغل سلطنت کے عروج کا تھا۔ اس ہی زمانہ میں ہندی شاعری نے ادبی صورت اختیار کی۔ اگرچہ مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی تھی۔ اُس زمانے کی درباری زبان فارسی تھی۔ لیکن مسلمان بادشاہوں، سرداروں اور عالموں نے ملک کی زبانوں کی طرف توجّہ کی۔ اُن کی سرپرستی، قدر افزائی کی۔ خود سیکھا جو کچھ علوم و فنون ان زبانوں میں تھے اُن کو اخذ کیا۔

اکبر (۱۵۵۶-۱۶۰۵ء) نے ملک کے فنون کی طرف زیادہ توجّہ کی۔ مختلف زبانوں اور علوم کا بہت بڑا کتب خانہ قائم کیا۔ سنسکرت سے کتابیں ترجمہ کرائیں اور ہندی کی خاص طور پر سرپرستی کی۔ دوسرے ملک سے آئے ہوئے شاہی خاندان کا فرد اور بادشاہ تھا۔ خاندانی اور شاہی زبان ترکی اور فارسی تھی۔ لیکن بذات خود اُس نے ہندی کی طرف توجہ کی بادشاہ کے اثر سے تمام دربار اور عمائدین نے توجّہ کی۔ ہندی کو چار چاند لگ گئے اور کچھ سے کچھ ہو گئی۔

ہندی کے مورخین اور یورپین مستشرقین اور مصنفین نے اس زمانے کی ہندی کی ترقی کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ امبیکا پرشاد واجپائی اپنی حال کی تصنیف میں لکھتے ہیں۔

" اور اُن (نانک) کے بعد ہندی کا تاریک زمانہ پانی پت کی دوسری لڑائی تک

رہتا ہے جبکہ ہندوستان کی سلطنت مغلوں کو مل گئی۔ اکبر عہد سلطنت، ہندی کی دوبارہ زندگی کا زمانہ کہا جانا چاہیئے۔ اس زمانے میں مختلف بھاشاؤں میں لکھنے والے بہت کثرت سے شاعر ملتے ہیں۔ اکبر کا عہد اعلیٰ مرتبہ کی تصنیفات کے لئے مشہور ہے ....الخ"

اکبر نے اپنے دربار میں ہندی شاعروں کو خاص منصب دیئے۔ کوی رائے، ہندی ملک الشعراء کا مستقل منصب مقرر کیا۔ شعراء کے مشاعرے اور مقابلے منعقد کرائے۔ امراء کو ہندی کی طرف ترغیب دلائی۔ خود مشاعروں میں شریک ہوا۔ خود بھی مختلف مواقع پر ہندی میں شعر کہا۔ ایک گیت میں کچھ بول اُن کے بتائے جاتے ہیں۔ بیربل کے انتقال کے صدمے میں اکبر نے کہا۔

सब कछु दीनन दीन, एक दुरायो दुसह दुख।
सोउ दै हमीहं प्रवीन, नहि राख्यौ कछु बीरबर ॥

بیان اور زبان کا لطف ترجمے میں نہیں آ سکتا۔ بیربل کی سخاوت بیان کی ہے کہ اُس نے عزیزوں کو جو کچھ پاس تھا۔ سب دے دیا۔ ایک ناقابل برداشت غم چھپا کر رکھ لیا تھا۔ ہوشیار بیربل نے وہ بھی اپنے پاس نہ رکھا اور وہ ہم کو دے دیا۔

بادشاہ، امراء عمایدین اور علماء کی سرپرستی، توجہ، دلچسپی اور وسعتِ نظر کا اثر یہ ہوا کہ ہندی کو ایسی ترقی ہوئی کہ نہ کبھی پہلے ہوئی تھی اور نہ بعد کو ہوئی۔ اتنی مدت کے مسلمانوں کے اتحاد، اختلاط، اُن کے لائے ہوئے علوم اور خیالات اور دوسرے علمی اثرات سے اُس زبان میں کہ جس میں صلاحیت اور گنجائش نادر تھی۔ فنی اور ادبی محاسن پیدا ہو گئے۔ وہ زبان جو مختلف بولیوں اور بھاشاؤں پر مشتمل تھی اور صرف بول چال کی زبان تھی۔ ان لوگوں کی کوشش، کاہش اور کاوش سے زبان اور مستقل ادبی زبان پیدا ہو گئی اور ایسی سنوری کہ شیرینی اور طرزِ ادا کے لئے دنیا کی زبانوں میں فائق ہو گئی۔

راجہ بیربل (۱۵۲۸-۱۵۸۳ء) قنوجی، دوبے برہمن، راجہ جے پور کے دربار کے ہندی شاعر تھے۔ اکبر کے دربار میں باریاب ہوئے۔ بادشاہ کی قدردانی اور فیض رسانی سے کوی رائے کا مرتبہ اور خطاب پایا۔ وزارت کے منصب پر سرفراز ہوئے۔ بڑے شاعر تھے لیکن کلام محفوظ نہیں رہا۔

راجہ ٹوڈرمل (۱۵۲۳-۱۵۸۹ء) فارسی کے مصنف اور شاعر، اکبر کے دربار کے ہندی کے شاعر اور وزیر تھے۔ فارسی میں بھگوت پران کا ترجمہ کیا۔ ہندوؤں کو فارسی پڑھنے کی طرف متوجہ اور آمادہ کیا۔ سلطنت کے وزیر مال تھے۔ اُن کے عہد تک مال اور زمینوں کے اندراجات اور حسابات ہندی میں تھے۔ انھوں نے فارسی میں تبدیل کر دیا۔

راجہ مان سنگھ (۱۵۳۵-۱۶۱۸ء) جے پور کے مہاراجہ۔ اکبر کے فوجی جنرل، خود ہندی کے اچھے شاعر، ادب کے ماہر، شاعری کے واقف اور قدرداں شاعروں کے سرپرست اور فیض رساں تھے۔ ایک شاعر کو ایک لاکھ روپیہ انعام دیا۔

اکبر کے عہد کے راگ کے جگت اُستاد اور ہندی کے شاعر راجہ تان سین (۱۵۵۰-۱۶۱۰ء) دوسرے درباروں میں رہنے کے بعد اکبر کے دربار میں باریاب ہوئے۔ اکبر نے قدردانی کی اور بہت اعزاز اور اختصاص بخشا۔ سانگیت سار اور راگ مالا، اُن کی نظمیں راگ میں ہیں۔ یہ ہندو مذہب تھے مسلمان ہو گئے اور حضرت غوث محمد گوالیاری کے مرید ہوئے۔

اکبری دربار کے دوسرے گوئے اور راگ اُستاد، بابا رام داس، ہندی کے مشہور شاعر تھے۔ راگ میں تان سین کے بعد ان ہی کا درجہ تھا۔ اکبری دربار کے پروردہ اُن ہی کے بیٹے سور داس تھے جو ہندی کے بڑے نامور شاعر ہوئے۔

کیشو داس مصرا (۱۵۵۵-۱۶۱۷ء) ہندی کے بڑے شاعر تھے۔ راجہ بیربل کے ذریعے سے اکبری دربار میں باریاب ہوئے۔ اپنے پہلے مخدوم اور ممدوح راجہ اندرجیت سنگھ کی دربار اکبری سے معافی کرائی۔ ہندی زبان میں اصناف اور محاسن کلام اور فن شاعری میں **कवी प्रया** کوی پریا ایسی کتاب لکھی کہ اُن کی اُستادی کی شہرت کا باعث ہوئی۔ رسک پریا اور رام النکرت منجری اُن کی عروض اور شاعری پر ایسی کتابیں ہیں کہ ہندی ادب میں نہیں لکھی گئیں **विज्ञान गीता** مذہبی تصنیف ہے۔

اسی عہد کے ایک مشہور شاعر، گنگ کوی (۱۵۳۸-۱۶۱۷ء) ہندی کے بہت بڑے شاعر تھے۔ ان کا کلام ضائع ہو گیا اور بہت تھوڑا باقی ہے۔ رزمیہ کلام کے اُستاد تھے۔ مزاحیہ بھی لکھتے تھے۔

ابوالفیض فیضی، عربی، فارسی، سنسکرت اور بہت علوم کے مشہور عالم، اکبر کے رفیق، جلیس اور دوست تھے۔ علاوہ دوسری زبانوں کے ہندی کے بھی شاعر تھے۔ عربی، فارسی کی تصانیف کے علاوہ سنسکرت کی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ بھگوت گیتا کا ترجمہ اور شرح فارسی میں ہے۔ ہندی کا کلام ان کا بھی مفقود ہے۔

ہندی کا باکمال اور مایہ ناز شاعر تلسی داس (۱۵۳۲-۱۶۲۴ء) بھی اسی عہد میں تھا۔ قنوجی برہمن تھے۔ راما نند کے سلسلہ کے گرو، نرہری داس کے چیلے تھے۔ اس

اسی سلسلہ کی خصوصیت سے رام چندرجی سے نہایت عقیدت تھی۔ اصلی نام 'رام بولا' تھا۔ درویشی اختیار کی تو تلسی داس نام رکھا۔ سادھوؤں میں تعلیم پائی۔ جب رام بھگتی اختیار کی تو بنارس میں قیام کیا۔ راجہ مان سنگھ اور عبدالرحیم خان خاناں سے ہم عصری، ہم مشربی اور دوستی تھی۔

ہندوستان کی مسلمہ مقدس اور بدیع النظیر مذہبی کتاب رامائن بہت ہی قدیم زمانے سے ملک کے بیشتر حصے میں مدار مذہب تھی۔ لیکن اس کے سنسکرت میں ہونے کی وجہ سے عوام کی دسترس سے باہر تھی۔ اور اس کا پڑھنا بھی خاص لوگوں کو جائز تھا۔ تلسی داس کو اس کتاب کے مضمون سے خاص تعلق اور عشق تھا۔ انھوں نے اپنی عقیدت اور جذبۂ شوق کی وجہ سے اور عوام تک اس مضمون کو عام فہم پیرایے میں پہنچانے کی ضرورت سے رام چندرجی کا قصہ لکھا۔ رام چرت مانس اس کا نام رکھا۔ اس کا ماخذ والمیکی (۵۰۰ قبل مسیح) کی رامائن ہی ہے۔ قصہ وہی ہے لیکن اس کا ترجمہ نہیں ہے تلسی داس نے اپنے طرزِ ادا اور اپنی زبان میں بیان کیا ہے۔ اپنے خیالات، اعتقادات اور عقیدت کا اظہار لطیف اور دل پذیر پیرایے میں کیا ہے۔ یہ نظم بیسواڑی یا اودھی بولی میں لکھی گئی ہے۔ لیکن تلسی داس دوسری بولیوں کے الفاظ اور با لخصوص برج بھاشا کے شبد بھی لکھتے ہیں۔ یہ کتاب ہندوستان بھر میں اس قدر مقبول ہوئی اور رام بھگتوں نے اس کی اس قدر عزت کی، یہ رامائن ہی کہلانے لگی۔

والمیکی کی سنسکرت کی رامائن سنسکرت کی سب سے بڑی اور مقدس کتاب تھی۔ اس کے پڑھنے اور سنانے والے خاص طبقے کے لوگ تھے۔ اُن کے علاوہ کسی کو پڑھنے کا حق نہ تھا اور جائز نہ تھا۔ تلسی داس کے رام چرت مانس ہندی زبان میں لکھنے پر اُن اجارہ داروں اور اُن کے معتقدین اور ہم خیال لوگوں نے بڑی سخت مخالفت کی اور تلسی داس کے اس فعل کو گناہ اور بے دینی بتایا۔ اور بہت تشہیر کی لیکن تلسی داس کی نظم کو مقبولیت اور شہرت حاصل ہونی تھی اور وہ اس کے لائق تھی۔ ہندی زبان میں رامائن کے مرتبے کی کتاب ہوگئی۔ ہندی پڑھ لینے والے کی پہنچ رام چندرجی کے سوانگ تک ہوگئی۔ پاٹھ کے لئے والمیکی کی رامائن اور اُس کے مخصوص اجارہ دار پڑھنے والوں کی ضرورت اور بندگی کی احتیاج نہ رہی۔

ہندوستان کا بڑا عالم فاضل، فارسی کا بے نظیر نغزگو شاعر، سنسکرت، عربی فارسی اور مختلف علوم اور نجوم کا ماہر، سخن فہم، شعراء کا قدرداں، فیض رساں اکبر کا وزیرِ اعظم، عبدالرحیم خان خاناں (۱۵۵۳ - ۱۶۲۷ء) ہندی شاعری میں اپنے طرز کا خاص اور عدیم المثال اُستاد تھا۔ اس کے ہندی کلام میں جو کچھ اثر، مضمون اور معانی میں دوسری جگہ ملنا دشوار ہیں۔ اس قدر مقبول اور دل آویز کلام ہے کہ ہر ہندی جاننے والے اور عوام کی زبان پر جاری ہے۔ جس قدر اُس کا فارسی کلام لطیف اور پُرمغز ہے۔ اُس سے زیادہ ہندی کا کلام شستہ اور بلیغ ہے۔ فارسی کلام سے قطعِ نظر، ہندی میں وہ لطیف پیرایے، نکات اور مضامین پیدا کئے ہیں۔ کہ دوسرے کو میسر ہونا دشوار ہے۔

ہر زبان کے شاعروں اور عالموں کا قدرداں اور سرپرست تھا۔ اپنے ہم عصر اکبر کے دربار کے شاعر، گنگا پرشاد، گنگ کوی کی سرپرستی کی اور گنگ کوی کو ایک ستر کا انعام چھتیس لاکھ روپیہ دیا۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا انعام ہے۔ کسی بادشاہ یا شہنشاہ نے کسی نظم یا تصنیف کا اتنا انعام نہیں دیا۔ **नीति** نیتی، موعظت کے خاص استاد تھے۔ ہر صنف کلام میں اور ہندی کی مختلف بولیوں میں لکھا ہے۔ سنسکرت، برج بھاشا، اودھی، راجستھانی وغیرہ میں کلام موجود ہے۔ ست سئی اور دوہے زیادہ مشہور ہیں۔

ہندی میں طرح طرح کے صنایع بدایع ایجاد کئے۔ سنسکرت اور ہندی کے ملمع میں اشلوک کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

[illegible]न्दिवसे अवसान समये,
मैं था गया बाग में ।
[illegible] कुरङ्ग[illegible]नयना,
गुल तोड़ती थी खड़ी ॥
[illegible] तां नवयौवनां शशिमुखीम्,
मैं मोह में जा पड़ा ।
[illegible] जीवामि तया [illegible] सखे ।
तो यार कैसे मिले ॥

عبدالرحیم خان خاناں کے فارسی یا ہندی شعر کا ترجمہ کرنا، شعر کو مسخ کرنا ہے طرزِ ادا اور لطافت بیان کی وضاحت دشوار ہے۔ دوسری بولی میں بیان کرنے میں بات بہت سادہ ہو جائے گی۔ زبان کی خوبی، بندش کی چستی، ملمع کی صنعت کی نزاکت کچھ باقی نہ رہے گی۔ اور یہ معنی ہوں گے کہ ایک دن شام کو میں باغ میں گیا۔ وہاں ایک آہو چشم پھول توڑ رہی تھی۔ اُس ماہ رُخ اور بدمست شباب کو دیکھ کر میں فریفتہ ہوگیا۔ اُس کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ اب اُس کے ملنے کی کیا تدبیر ہو۔

ہندی کے ان مایہ ناز اُستادوں کے علاوہ اکبری عہد کے ہندی شعراء کا تذکرہ بہت طویل ہے۔ کثرت سے شاعر ہوئے اور اُن میں سے بیشتر یادگار کے لائق ہیں۔ نرہری سہائے، کرن، بلبھدر، مصرا، رس خاں، بال کرشنا تریا ٹھی۔ کاشی ناتھ اور پیدیں بڑے شاعر تھے جن سے ہندی ادب کی زینت ہوئی۔

اکبر کے بعد، جہانگیر، شاہجہان، اورنگ زیب اور اُن کے خاندانی لوگوں اور آیندہ بادشاہوں نے ہندی کی سرپرستی کی۔ بادشاہوں اور شہزادوں کو بڑا خاص شوق ہندی سے رہا۔ جہانگیر (۱۶۰۵ - ۱۶۲۷ء) کے عہد میں اکبر کی جاری ہوئی ہندی کی سبھا قائم تھی۔ اُس زمانے کے شعراء اور اُستادوں کی سرپرستی جاری رہی۔

شاہجہان کے عہد (۱۶۲۷ - ۱۶۵۸ء) میں بادشاہ، شاہزادوں اور امراء کو ایسی ہی دلچسپی رہی۔ شاہجہان خود ہندی میں شعر کہتے تھے۔ کلام اُن کا باقی نہیں۔ جب اورنگ زیب نے شاہجہان کو قید کر دیا۔ تو اس وقت ایک نظم شاہجہان نے لکھی اُس کے اشعار یہ ہیں۔

जन्मत हो लख दान दियो अरु नाम धरयो नवरंग बिहारी।
बालहिसों प्रतिपाल कियो अरु देस मुलुक्क दियो बलभारी॥
सो सुत बैर बुझै मन में धरि हाथ दियो बंधसार में डारी।
शाहजहां बिनवै हरिसों बसि राजिवनैन रखाव बिहारी॥

شاہجہان کے عہد میں کوی رائے کا عہدہ سندر کے پاس رہا۔ انھوں نے ہندی عروض میں سندر سنگار لکھی اور سنگھاسن بتیسی کو برج بھاشا میں لکھا۔ شاہجہان کے زمانے میں رتنا کر تریاٹھی اور اُن کے چاروں لڑکے مشہور شاعر چینتامنی تریاٹھی साहित्य ساہتیا کے بہت بڑے اُستاد مانے جاتے ہیں۔ چھند بچار۔ کاویا دی دیک۔ کاویا پرکاس اور کوی کل کلپ ترو اُن کی اعلیٰ تصانیف ہیں۔ رامائن کو ہندی میں نظم کیا۔ بھوشن، نیل کنٹھ تریاٹھی، بھوشن تریاٹھی اور متی رام تریاٹھی مشہور شاعر تھے۔

ستارہ کے راجہ شمبھو ناتھ، سرسوتی، تلسی، ودیانگ رائے اور بہاری لال چوبے شاہجہان کے عہد کے بڑے شاعر اور ہندی کے مصنف تھے۔ ودیانگ رائے نے شاہجہان کے حکم سے پارسی پرکاس کتاب تقویم اور ہندوستانی شمسی اور قمری مہینوں اور ہجری سال کے مہینوں کی تفصیل اور مطابقت میں لکھوائی۔ بہاری لال چوبے بڑے مشہور شاعر تھے۔ شاہجہان کے لڑکوں کو بڑا شغف ہندی سے تھا۔ دارا شکوہ تو بڑے عالم اور عالموں کے قدردان تھے۔

اورنگ زیب (۱۶۵۸ - ۱۷۰۷ء) کے عہد میں بھی ہندی کی سرپرستی جاری رہی۔ کوی رائے کا منصب شاعروں کو ملتا رہا۔ کالیداس ترویدی اورنگ زیب کے دربار کا شاعر تھا۔ بہاری لال چوبے، کل پتی مصرا، رام جی، منڈن، نواج، عالم اس زمانے کے مشہور شاعر تھے۔ یاری صاحب دہلی کے ایک صوفی شاعر تھے اُن کے چیلے اور شاگرد، کیسو داس اور بُلّا صاحب شاعر ہوئے اور اُن سے ایک تصوّف کا سلسلہ جاری ہوا۔

اس ہی طرح ہر مغل بادشاہ کے عہد میں ہندی زبان پر توجہ رہی اور ترقی ہوتی رہی مسلمان شاعر اور مصنّف پیدا ہوتے رہے۔ ابتداً ہندی اور اُردو میں کوئی فرق نہ تھا جو زبان نئی مرتب ہوئی تھی اُس کو ہندی یا ہندوی ہی کہتے تھے۔ مسلمان مصنّف بھی یہ ہی لکھتے رہے۔ حضرت امیر خسرو کی تصنیف خالق باری ہندی زبان میں تھی لیکن فارسی رسم الخط میں لکھی گئی۔ چندر شیکھر دیج پائی کی تصنیف ہمیر ہٹھ فارسی رسم الخط میں تھی زبان ہندی میں تھی۔ اور بہت سی ہندی تصانیف فارسی رسم الخط میں لکھی گئیں ملک محمد جائسی کی تصنیف پدماوتی اور اکھراوٹ بہت اعلیٰ اور ٹھیٹ ہندی کی کتابیں ہیں لیکن پہلے فارسی رسم الخط میں لکھی گئیں۔ زبان ایک ہی تھی اور رسم الخط سنسکرت نما ناگری یا ہندی بھی رائج تھا اور اُس ہی زبان کو فارسی رسم الخط میں بھی لکھتے تھے۔ آخر زمانہ میں سید انشاء اللہ خاں، انشاء کی ہندی تصنیف، رانی کیتکی کی کہانی بڑی خوبصورت ہندی زبان میں ہے۔ لیکن فارسی رسم الخط میں لکھی گئی۔

مہاتما گاندھی کی کوشش اصلیت اور حقیقت پر مبنی تھی کہ زبان ایک ہے اور اُس کے رسم الخط دونوں طرح کے رہیں۔ اس ترکیب سے اُردو اور ہندی کا تفرقہ ختم ہو جاتا اور پچھلی تاریخ عود کر کے زبان کا ایک نیا دور شروع ہو جاتا۔

پنج سالہ پلان

(مسلسل)

زمینوں کے متعلق پالیسی

قومی ترقی کا سب سے بڑا بنیادی مسئلہ زمینوں کی ملکیت اور طریق کاشت کے مستقبل کا تعین کرنا ہے ملک کی اقتصادی اور مجلسی تنظیم کا ساںچہ اسی طریق پر بن جائے گا جس پر مسئلہ اراضی کو طے کیا جائے گا۔ جہاں پنج سالہ پلان کے مطابق زرعی پیداوار کو مقررہ حدود تک بڑھانا ضروری ہے وہاں یہ بھی لازم ہے کہ زمینوں کے متعلق پالیسی ایسی ہو جس سے دولت اور آمدنی میں تفاوت کم ہو جائے۔ لوٹ کھسوٹ کا خاتمہ ہو۔ کسان اور مزدور کو تحفظ حاصل ہو۔ اور دیہاتی آبادی کے مختلف طبقوں کو یکساں درجہ اور ایک سے مواقع میسر ہوں ان مقاصد کا حصول پنج سالہ پلان کا لازمی جزو ہے۔

پلان میں اصلاح اراضی کی تجاویز جاگیرداروں اور زمینداروں۔ بڑے مالکوں چھوٹے اور درمیانہ مالکوں اختیاری مزارعین بے زمین کسانوں وغیرہ کے مفاد کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ جاگیرداری اور زمینداری کا یا تو خاتمہ ہو چکا ہے یا جن ریاستوں میں وہ ابھی باقی ہیں۔ ان کا خاتمہ کرنے کا کام جاری ہے۔ زمینوں کی ملکیت اور طریق کاشت کے بارے میں اس وقت جو اطلاعات حاصل ہیں وہ چونکہ انتہا درجہ نامکمل اور غلط ہیں اس لئے ۱۹۵۳ء میں بھارت کی تمام ریاستوں میں ملکیت اور طریق کاشت کی اعداد شماری کی جائے گی۔ زمینوں کی ملکیت کے بارے میں کمیشن نے نہایت اہم سفارشات کی ہیں۔ جن کا مقصد یہ ہے کہ ملکیت زمین کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کرنا۔ خود کاشت کرنے والے بڑے مالکوں کو آسانیاں مہیا کرنا۔ کاشتکاری کو ایک خاص معیار پر برقرار رکھنے کے لئے قانون بنانا۔ اور چھوٹے اور درمیانہ مالکوں کو امداد باہمی کے طریقوں پر کھیتی باڑی کرنے کا حوصلہ دلانا۔ ان اقدام سے زمین کی ملکیت کے متعلق موجودہ تفریق کو مٹا دیا جائے گا۔ اور بہتر زرعی پیداوار کے لئے سازگار حالات لازماً پیدا کئے جائیں گے۔

بڑے اور چھوٹے مالکان

کمیشن کی رائے یہ ہے کہ زمینوں کی نجی ملکیت (ملک کی اقتصادیات کے دیگر شعبوں کی مانند) کی جو بھی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کی جائے وہ انفرادی حقوق اور جھگڑا کی بجائے مفاد عامہ کے نقطۂ نظر سے جائز اور منصفانہ ہو۔ اس حد کا فیصلہ ہر ایک ریاست اپنے مقامی حالات کے مطابق کرے گی۔ بڑے مالکوں کے پاس جو زمین اس حد سے زائد ہو۔ اور اس کی کاشت مزارعین کرتے ہوں۔ تو ان کے اس زمین کے مالک بننے کی حوصلہ افزائی کی جائے چھوٹے اور درمیانہ مالکان زمین کو امداد باہمی کے طریقوں پر منظم ہو کر اپنی پیداوار بڑھانے کی ترغیب دی جائے۔ چھوٹے کاشتکاروں کے لئے زمینوں کی ملکیت کی کم از کم حد بھی مقرر کی جائے۔ تاکہ اس سے کم زمینوں کی تقسیم ناممکن کر دی جائے۔ جو مالکان اپنی زمینوں کو خود کاشت کرنا چاہیں۔ ان کو ایک خاص مہلت دی جائے (مثال کے طور پر پانچ برس کی) اگر اس مدت میں وہ خود کاشت کرنے کے قابل نہ ہو سکیں تو مذکورہ بالا طریق پر مزارعین کو اس زمین کا مالک بنا دیا جائے۔

بے زمین مزدور اور بھومی دان تحریک

زمین کی تقسیم کی سکیموں کا اولین فائدہ ان بے زمین کسانوں کو پہنچتا ہے جو آج کل مزارعہ کے طور پر کاشتکاری کر رہے ہیں۔ اس لئے بھومی دان کی تحریک خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس سے بے زمین مزدور کو وہ مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ جو اسے کسی دیگر طریق سے نہیں مل سکتے ہیں۔ کسی ایسے نظام کو برقرار رکھنا مشکل ہو گا جس میں محض پیدائش یا حالات کے باعث بعض لوگوں کو کاشتکار اور مالک زمین بننے کا موقعہ ہی نصیب نہ ہو۔ یہ ضروری ہے کہ ایک ایسا امداد باہمی پر مبنی نظام طیار

کیا جائے جس کے ماتحت زمینوں اور دیہات کے دیگر ذرائع سے پیداوار کو بڑھانے اور بہتر بنانے کے ساتھ ہی ہر اس شخص کو روزگار مہیا کیا جا سکے جو کام کرنے کا خواہش مند ہو۔

کواپریٹو دیہاتی نظام

دیہات میں کواپریٹو کاشتکاری اور امداد باہمی کی دیگر سرگرمیوں کی توسیع سے گاؤں کی مجلسی اور اقتصادی زندگی کو بہت زیادہ فائدہ پہنچے گا۔ دیہاتی پنچائیتیں اس ضمن میں بہت مفید ثابت ہوں گی۔ تجویز یہ ہے کہ دیہات میں زمینوں کی اصلاح اور ان کے انتظام کے لئے دیہاتی پنچایت ہی عملی کام کا ذریعہ بن جائے زمینوں کو کاشت کے لئے ٹھیکے یا پٹے پر دینے کا کام جس کی از روئے قانون اجازت ہو صرف دیہاتی پنچایت ہی کرے۔ قانون انتظام اراضی دیہاتی لوگوں کو یہ اختیار سونپ دے کہ وہ اپنے گاؤں کی تمام زمین کا بندوبست اس طریق پر کریں جس طرح کہ ایک واحد کھیت کا کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ دیہاتی پنچائیتیں قومی منصوبہ بندی کے ڈھانچے میں ایک ایسا ترقی پذیر اور خود مختار گرہ بن جائیں جو جائداد۔ ذات پات یا درجے کی وجہ سے موجودہ مجلسی اور اقتصادی تفریق کو نیست و نابود کرنے کا باعث بنیں۔ کمیشن نے اصلاح اراضی کی ترقی اور مختلف ریاستوں کے پروگراموں کے مطالعہ۔ مختلف مسائل کی تحقیقات اور درست اعداد و شمار کی فراہمی کے لئے ایک مرکزی تنظیم قائم کرنے کی سفارش کی ہے۔

آبپاشی اور بجلی

آبپاشی اور بجلی طیار کرنے کے منصوبوں کے بارے میں کمیشن نے سفارش کی ہے کہ نہ صرف سطح زمین کے اوپر بلکہ سطح زمین کے نیچے کے پانی سے بھی فائدہ اٹھایا جائے۔ آبپاشی کے کثیر المقاصد منصوبے چھوٹے پیمانے پر آبپاشی کے انتظامات ٹیوب ویل لگانا اور پانی کے ذریعے بجلی طیار کرنا بھی پروگرام میں شامل کیا گیا ہے۔

ملک بھر میں آبپاشی اور بجلی کے نئے زیر تعمیر۔ زیر تحقیق یا زیر غور منصوبوں کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام منصوبوں کی تعمیر پر تقریباً ۲ ارب روپے خرچ ہوں گے۔ اس سے موجودہ زیر آبپاشی رقبے میں چار، ساڑھے چار کروڑ کا اضافہ ہوگا اور ستر لاکھ کلوواٹ بجلی مزید پیدا کی جا سکے گی۔ کمیشن کی یہ پختہ رائے ہے کہ اس وسیع پروگرام کو عملی جامہ پہنانے۔ کاشت کے طریقوں کا معیار بلند کرنے اور بڑی صنعتوں کے علاوہ چھوٹے پیمانے کی گھریلو صنعتوں کی ترقی سے ہی ملک میں معیار زندگی میں قابل قدر اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

اگرچہ زیادہ سے زیادہ ضروریات بالکل واضح ہونی چاہئیں تاہم معتبر ذرائع کے مطابق ہی کم از کم پروگرام تیار کرنا ضروری ہے۔ چونکہ پہلے ہی آبپاشی کی کئی اسکیموں پر عمل کیا جا چکا ہے۔ اس لئے پہلے پانچ سالہ پلان کا بڑا مقصد ان منصوبوں کو پایۂ تکمیل پہنچانا ہے جو ۱۹۵۱ء میں زیر تعمیر تھے۔ ۳۱ مارچ ۱۹۵۱ء کے اختتام تک ان منصوبوں پر ایک ارب ۵۳ کروڑ روپے صرف کئے جا چکے تھے۔

نئے منصوبے

کمیشن کی یہ رائے ہے کہ پلان کے پہلے تین سال میں کسی نئے منصوبے پر عمل شروع کرنا ممکن نہیں لیکن اس کے بعد کے عرصے میں کچھ نئے منصوبوں پر عمل کرنا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر پچھلے چند سال میں حاصل کردہ ٹیکنیکل اور دوسرے ذرائع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا ممکن نہیں ہوگا۔ اگرچہ پلان میں شامل کردہ نئے منصوبوں پر پلان کی میعاد کے دوران میں چالیس کروڑ روپے خرچ آئے گا لیکن ان کی شمولیت سے پہلے سے دوسرے پانچ سالہ پلان تک رفتار ترقی کا ایک سلسلہ بند ہو جائے گا۔

کوسی۔ کوئنا۔ کرشنا۔ چمبل اور ریہند نئے منصوبوں میں شامل ہیں۔ ان منصوبوں کی تکمیل کی مختلف منزلیں اور دوسری تفاصیل حسب ذیل ہیں:

نام منصوبہ	علاقہ جسے فائدہ پہنچیگا	تخمینہ لاگت	آخری فوائد آبپاشی	آخری فوائد بجلی
کوسی (پہلی منزل)	بہار اور نیپال	۴۴ کروڑ روپے	۲۶ لاکھ ۲۰ ہزار ایکڑ پر قابو پالیا جائے گا	۴۰ میلایو
کوئنا (پہلی منزل)	بمبئی	۳۴ کروڑ روپے	—	۲۴۰
کرشنا (ابھی رفتار ترقی کا فیصلہ نہیں کیا گیا)	مدراس اور حیدرآباد	ابھی تخمینہ نہیں لگایا گیا	—	فی الحال نامعلوم
چمبل (پہلی منزل)	مدھیہ بھارت اور راجستھان	۳۳ کروڑ ۷۵ لاکھ	ایک لاکھ ۲۰ ہزار ایکڑ	۸۰
ریہند	اترپردیش	۳۵ کروڑ روپے	—	۲۴۰

ان پروجیکٹوں کی مجموعی لاگت دو ارب روپے سے زیادہ ہوگی۔ پلان کی میعاد کے دوران میں اس میں چالیس کروڑ کے اخراجات ممکن ہیں۔

زیر عمل منصوبے پانچ سالہ پلان کے مسودے میں موجودہ منصوبوں پر چار ارب پچاس کروڑ روپے خرچ کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ رپورٹ میں درج ہے کہ کچھ پروجیکٹوں کی صورت میں تعمیر کے اخراجات میں اضافہ اور دوسری وجوہ کے پیش نظر پلان کی میعاد کے دوران میں پچاس کروڑ روپے کی زاید رقم صرف کرنا ضروری ہوگا۔

کثیر المقاصد منصوبے زیر تعمیر کثیر المقاصد پروجیکٹوں سے پلان کے آخری سال میں ۸۵ لاکھ ایکڑ رقبہ کی آبپاشی اور دس لاکھ اسی ہزار کلوواٹ بجلی کی مزید پیداوار کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ ان منصوبوں کی تکمیل اور مکمل ترقی کے بعد زیر آبپاشی رقبے میں کل ایک کروڑ ۹۶ لاکھ ایکڑ کا اور بجلی کی پیداوار میں کل چودہ لاکھ ساٹھ ہزار کلوواٹ کا اضافہ ہوگا۔

آبپاشی کی چھوٹی اسکیمیں کمیشن نے آبپاشی کی چھوٹی چھوٹی اسکیموں میں قابل قدر اضافے کی تجویز پیش کی ہے۔ پلان کے مسودے میں یہ تخمینہ لگایا گیا تھا کہ آبپاشی کی چھوٹی اسکیموں پر ۷۴ کروڑ روپے خرچ ہوں گے اور ۵۶-۱۹۵۵ء تک یہ ۹۷ لاکھ ایکڑ رقبے کو سیراب کریں گی۔ کمیشن نے اب یہ سفارش کی ہے کہ آبپاشی کی چھوٹی اور درمیانے درجے کی اسکیموں پر مزید تیس کروڑ روپے خرچ کئے جائیں۔

قومی پالیسی آبپاشی و بجلی سے متعلقہ امور کے بارے میں کمیشن نے سارے ملک کے لئے مشترکہ قومی پالیسی پر عمل کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

آبپاشی کے بارے میں کمیشن نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ جہاں ذرائع آبپاشی کی مانگ میں ہر سال رد و بدل ہوتا رہے اور جہاں میسر ذرائع کو ہمیشہ پوری طرح استعمال میں نہ لایا جاتا ہو وہاں آبپاشی پر ٹیکس لگانا جائز ہے۔ جہاں شرح آبپاشی کا فیصلہ کئی سال پیشتر کیا گیا تھا اور اس کے بعد وہاں کی فصلوں کی قیمت میں قابل قدر اضافہ ہو چکا ہو وہاں بھی آبپاشی کی شرح میں اضافہ کرنا جائز ہے۔ درحقیقت آبپاشی کی شرح کا وقتاً فوقتاً زیر آبپاشی رقبے کی فصلوں کی قیمت کے مطابق کرنا درست ہوگا۔

آبپاشی فنڈ کمیشن نے آبپاشی کی ترقی (طریقے اور ذرائع) کے لئے یہ تجویز بھی پیش کی ہے کہ ہر ریاستی حکومت ایک فنڈ قائم کرے جس میں ہر سال عام محاصل۔ قرضوں یا بچتوں کی رقوم کا کچھ حصہ شامل کیا جائے۔ مرکزی حکومت سے حاصل شدہ قرضے و امدادی رقوم (بشرطیکہ یہ امدادی رقوم اور قرضے حاصل ہوں) اور زمین کی بہتری پر ٹیکس و شرح آبپاشی میں اضافے سے ہونے والی آمدنی بھی مذکورہ فنڈ میں شامل کی جائے۔ یہ فنڈ مستقل ہونا چاہئے اور آبپاشی اور بجلی کے تمام منصوبوں کے اخراجات اس میں سے پورے کئے جائیں اس سے دوسرے منصوبوں کو پوری تحقیق کے بعد شروع کرنے اور انہیں طے شدہ پروگرام کے مطابق عمل میں لانے میں مدد ملے گی۔

آبپاشی و بجلی کے نئے منصوبوں کے لئے کمیشن نے ایک خاص طریقہ کار تجویز کیا ہے۔ جس کے تحت ایک خاص کمیٹی سارے ملک کے نقطہ نگاہ سے اس امر کا فیصلہ کرے گی کہ کس منصوبے کو زیادہ اہمیت دی جائے اور کسے کم۔

زمین کی بہتری کا ٹیکس کمیشن نے یہ سفارش کی ہے کہ زیر آبپاشی تمام زمین پر بہتری ٹیکس لگایا جائے۔ یہ ٹیکس آبپاشی کی سہولتوں سے زمین کی قیمت میں ہونے والے اضافے کا کچھ حصہ ہونا چاہئے۔ کمیشن کی رائے میں بغیر محنت کے حاصل کردہ اس آمدنی کا کچھ حصہ وصول کرنے میں حکومت حق بجانب ہوگی۔

صنعتوں کی توسیع اور متعلقہ پالیسی

کمیشن نے منصوبہ بندی کے اغراض و مقاصد اور ان کو عمل میں لانے سے متعلقہ طریق کار کی وضاحت کرتے ہوئے اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ ترقی کے پروگرام میں سرکاری اور نجی سرمایہ کا کیا کردار ہوگا۔ صنعتی ترقی کے متعلق حکومت کی پالیسی کے ضروری پہلو صنعتی پالیسی کے بارے میں اپریل ۱۹۴۸ء کے ریزولیوشن میں بیان کر دئے گئے ہیں۔

اس ریزولیوشن کے مطابق اسلحہ و بارود کی پیداوار۔ پرمانو شکتی کی پیداوار اور اس پر کنٹرول اور ریلوں کے ذریعے نقل و حمل اور ڈاک کے انتظامات مرکزی حکومت کے لئے مخصوص رکھے گئے ہیں۔ کوئلہ، لوہا، فولاد

ہوائی جہاز سازی۔ سمندری جہاز سازی۔ ٹیلیفون سازی معدنی تیل و تار اور وائرلیس کے سامان کی طیاری سے متعلقہ بعض صنعتوں کی ترقی کی ذمہ دار مرکزی۔ صوبائی سرکاریں ہوں گی۔ البتہ ان صنعتوں کی صورت میں نجی سرمائے کا تعاون بھی حاصل کیا جائے گا جن کے بارے میں حکومت ایسا کرنا ضروری تصور کرتی ہو۔ باقی کا سارا صنعتی میدان انفرادی یا کواپریٹو دونوں لحاظ سے نجی سرمایہ کے لئے کھلا پڑا ہے لیکن نجی سرمایہ سے چلنے والی کسی صنعت کی ترقی کی رفتار غیر تسلی بخش ہونے کی صورت میں حکومت مداخلت کر سکے گی۔ سرمایہ لگانے اور ٹیکنیکل مہارت کے نقطۂ نگاہ سے خاص اہمیت رکھنے والی خاص خاص اٹھارہ صنعتوں پر مرکزی کنٹرول اور ان کے لئے مرکزی قواعد کی ترتیب کو بھی ضروری قرار دیا گیا ہے۔ کمیشن کی رائے میں اس پالیسی کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے صنعتی ترقی کا ایسا پروگرام مرتب کیا جا سکتا ہے جو ملک کی موجودہ ضروریات پر پورا اتر سکے

ترتیب تقدیم

کمیشن نے تقدیم کے لحاظ سے صنعتوں کی مندرجہ ذیل ترتیب پیش کی ہے۔

(ا) آئندہ پیداوار میں کام آنے والی اشیاء کی صنعتوں (مثلاً جوٹ السپلائی وڈ) اور اشیاء صارفین کی صنعتوں (مثلاً کپڑا۔ کھانڈ۔ صابن دناسپتی۔ رنگ و روغن وغیرہ) کی موجودہ پیداواری صلاحیت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔

(ب) مشینیں اور آئندہ پیداوار کے لئے استعمال میں آنے والی اشیاء کی صنعتوں (لوہا۔ فولاد۔ ایلومینیم۔ سیمنٹ۔ کھاد، مشینی اوزار اور بھاری کیمیائی اشیاء وغیرہ) کی پیداواری صلاحیت میں توسیع کی جائے۔

(ج) ان صنعتی یونٹوں کی تکمیل کی جائے جن پر پہلے ہی کچھ سرمایہ صرف کیا جا چکا ہے۔

(د) نئے کارخانوں کا قیام جس سے حتی المقدور موجودہ خامیوں (کھریا مٹی سے گندھک کی طیاری وغیرہ) کو دور کر کے صنعتی ڈھانچے کو تقویت پہنچائی جا سکے گی۔

تقدیم کی مذکورہ ترتیب کے مطابق موجودہ حالات میں اشیاء صارفین کی پیداوار میں اضافہ موجودہ صنعتی صلاحیت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے سے ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پلان کی میعاد کے دوران میں ان صنعتوں کے لئے نئے کارخانوں کے قیام کو کم اہمیت دی جائے گی۔ کپڑا۔ کھانڈ۔ نمک۔ دیا سلائی اور صابن وغیرہ ضروری اشیا طیار کرنے کی صنعتوں میں موجودہ ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ لہذا جہاں تک ان صنعتوں کا تعلق ہے زیادہ زور موجودہ صنعتوں کی تجدید اور پیداوار کے درست توازن سے ان کی کارآمدگی میں اضافے پر دیا جانا چاہئے۔ کسی پسماندہ علاقے کی ترقی وغیرہ سے متعلقہ خاص حالتوں میں مذکورہ صنعتوں میں بھی نئے کارخانے قائم کئے جا سکتے ہیں۔

کمیشن نے صنعتی پروگرام کے مندرجہ ذیل مطمح مقرر کئے ہیں۔

	۱۹۵۰-۵۱ء کی پیداوار	۱۹۵۵-۵۶ء میں متوقع پیداوار
لوہا و فولاد		
لوہے کے ڈلے	۱۵ لاکھ ۷۰ ہزار ٹن	۱۹ لاکھ ۱۰ ہزار ٹن
طیار فولاد	۹ لاکھ ۸۰ ہزار ٹن	۱۲ لاکھ ۸۰ ہزار ٹن
سیمنٹ	۲۶ لاکھ نوے ہزار ٹن	۴۵ لاکھ ٹن
ایلومینیم	تین لاکھ ستر ہزار ٹن	بارہ لاکھ ٹن
کھاد		
ایمونیم سلفیٹ	۴۶ ہزار ۵ سو ٹن	۴ لاکھ ۵۰ ہزار ٹن
سوپر فاسفیٹ	۵۵ ہزار ایک سو ٹن	ایک لاکھ اسی ہزار ٹن
ریلوے انجن	..	ایک سو ستر
مشینی اوزار	گیارہ سو	چار ہزار چھ سو
پٹرول کی صفائی		
پٹرول (سیال کی صورت میں)	فی الحال اعداد و شمار دستیاب نہیں ہوئے	۴۰ کروڑ ۳۰ لاکھ گیلن
بٹومن (رال)	,,	۳۷ ہزار ۵ سو ٹن
کپاس سے تیار شدہ اشیا		
سوت	ایک ارب ۷ کروڑ ۹۰ لاکھ پونڈ	ایک ارب ۴۶ کروڑ پونڈ
مشینی کپڑا	تین ارب ۷۰ کروڑ ۸۰ لاکھ گز	چار ارب ۷۰ کروڑ گز
کھاڈی کا کپڑا	۸۱ کروڑ گز	ایک ارب ستر کروڑ گز
جوٹ سے تیار کردہ اشیا	۸ لاکھ ۹۲ ہزار ٹن	۱۲ لاکھ ٹن

زرعی مشینیں

د - بجلی سے چلنے والے پمپ	۳۴ ہزار تین سو	۸۵ ہزار
ب - ڈیزل انجن	۵ ہزار ۵ سو	۵۰ ہزار
بائیسکل		۵ لاکھ ۳۰ ہزار
پاور الکحل	۵۰ لاکھ گیلن	ایک کروڑ اسی لاکھ گیلن

سرکاری و نیم سرکاری سرمایہ کاری

سرکاری و نیم سرکاری سرمایہ کاری کے دائرے میں پانچ سال میں پلان کے ان منصوبوں پر ۹۴ کروڑ روپے خرچ ہوں گے جو مرکزی و ریاستی سرکاروں کے تحت آتے ہیں - پلان میں نیا بڑا صنعتی منصوبہ لوہے و فولاد سے تعلق رکھتا ہے - اس کے آغاز کی تاریخ سے چھ سال کے عرصے میں کل اسی کروڑ روپے کے اخراجات کا تخمینہ لگایا گیا ہے - ۱۹۵۵-۵۶ء تک تیس کروڑ کے اخراجات کا اندازہ ہے جس میں پندرہ کروڑ روپے حکومت مہیّا کرے گی اور باقی رقم ملکی و غیر ملکی سرمایے کی شمولیت کے ذریعے سے حاصل کی جائے گی -

نجی سرمایے کا دائرہ

اندازہ لگایا گیا ہے کہ نجی سرمایے کے دائرے میں آنے والی صنعتوں کی توسیع پر دو ارب ۳۳ کروڑ روپے کا سرمایہ صرف کرنے کی ضرورت ہے - اس میں سے اسی فیصدی سرمایہ مشینیں و آئندہ پیداوار کے کام میں آنے والی اشیاء طیار کرنے والی صنعتوں پر صرف ہوگا ان میں بڑی صنعتیں لوہا اور فولاد ہیں -

ان پر ۴۳ کروڑ روپے صرف کئے جانے کا اندازہ ہے - پٹرول صاف کرنے کے کارخانوں پر ۴۶ کروڑ روپے خرچ ہوں گے - سیمنٹ کی صنعت پر پندرہ کروڑ ۴۰ لاکھ ایلومینیم پر ۹ کروڑ اور کھاد اور بھاری کیمیائی اشیا اور پاور الکحل پر بارہ کروڑ روپے کے اخراجات کا تخمینہ لگایا گیا ہے - نجی سرمایے کے دائرے میں پانچ سال میں بجلی کی زائد طاقت پیدا کرنے پر سولہ کروڑ روپے خرچ ہوں گے -

مجموعی سرمایہ

سرکاری سرمایے کے دائروں میں توسیع کے پروگرام پر مجموعی طور پر تین ارب ستائیس کروڑ روپے کے اخراجات کا اندازہ ہے - اس میں ۹۴ کروڑ روپے سرکاری و نیم سرکاری سرمایے سے چلنے والی صنعتوں پر صرف کئے جائیں گے اور دو ارب ۳۳ کروڑ روپے نجی سرمایے سے چلنے والی صنعتوں پر صرف ہوں گے علاوہ ازیں مختلف صنعتوں میں مشینوں کی تجدید اور جدید طرز کی مشینیں نصب کرنے سے پانچ سال کی مدّت میں ایک ارب چالیس کروڑ روپے تک کی رقم خرچ ہو سکتی ہے - ان صنعتوں میں مشینوں کی ٹوٹ پھوٹ کے باعث بہت سے بقایا اخراجات جمع ہیں -

اس طرح سرمایہ قائم کی مجموعی ضروریات چار ارب ستر کروڑ روپے تک پہنچتے ہیں - پلان کے دوران میں صنعتوں کے لئے چالو سرمایے اور مشینوں کی ٹوٹ پھوٹ کے چالو اخراجات کی صورت میں بھی ایک بھاری رقم کی ضرورت ہوگی یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس رقم کو شامل کر کے کل اخراجات سات ارب سات کروڑ روپے کے لگ بھگ ہوں گے -

(مسلسل)

مضمون نگاروں سے

آج کل کے کرم فرماؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے - ہندوستان کے ہر گوشے سے مضامین اور نظمیں وصول ہوتی ہیں - ان سب کا شائع کرنا ادارے کے لئے قطعی ناممکن ہے -

اس وقت امانت میں جو مضامین اور نظمیں موجود ہیں وہ ایک مدّت کے لئے کافی ہیں - اس لئے بمجبوراً یہ عرض کیا جاتا ہے کہ غیر طلبیدہ مضامین اور نظموں پر کوئی غور نہیں کیا جائے گا -

خالص ادبی مضامین بتدریج کم کئے جائیں گے - ثقافتی اور علاقائی زبانوں سے متعلق مضامین ان کی جگہ لیں گے -

(ادارہ)

رفتارِ زمانہ

بھارتی فوجوں کو خراجِ تحسین

مختلف سیاسی مسائل پر بھارت پارلیمنٹ میں مختلف پارٹیوں میں کتنے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں، اپنی افواج کے بہادرانہ کارناموں اور اعلیٰ ڈسپلن پر سب کو فخر اور ناز ہے۔ چنانچہ پارلیمنٹ میں ڈیفینس کے اخراجات پر بحث کے دوران میں حکومت اور حزبِ مخالف نے بیک آواز نہ صرف اپنی فوجوں کی بہادری کی تعریف کی بلکہ ملک کے مختلف حصّوں پر سیلاب اور قحط کی جو تکلیفات نازل ہوئیں، اُن کو دُور کرنے کے لئے فوجیوں نے جو ریلیف کا کام کیا ہے اس کی بھی سراہنا کی گئی۔ اکثر مقررین نے اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ فوجی سامان طیار کرنے میں بھارت کو جلد از جلد خود کفیل ہو جانا چاہیئے تاکہ اس اہم ضرورت کے لئے ہم کسی غیر ملک کے محتاج نہ رہیں۔ اس کے علاوہ اکثر ممبروں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ بھارت کی ہوائی اور بحری فوج زیادہ مضبوط ہونی چاہیئے۔

صدرِ ریاست جمّوں و کشمیر کا بیان

کشمیر اور جموں آئین ساز اسمبلی کے سیشن کی رسمِ افتتاح ادا کرتے ہوئے صدرِ ریاست یوراج کرن سنگھ نے پرجا پریشد کی تحریک کی سخت الفاظ میں مذمّت کی۔ انھوں نے کہا کہ ویسے تو اس تحریک کے داعیان یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتے کہ وہ بھارت کے ساتھ ریاست جمّوں و کشمیر کے تعلقات مضبوط ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں، لیکن اُن کا عمل دیش کے لئے خطرے کا باعث بن رہا ہے۔ یُوراج نے عوام کو خبردار کیا کہ وہ گمراہ کن نعروں سے مرعوب نہ ہوں تاکہ ہمارے دشمن ہمارے خلاف باہر سے دباؤ ڈالنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ صدرِ ریاست نے اپیل کی کہ اس تحریک کو فی الفور ختم کر دیا جائے تاکہ ریاست کے مسائل کو صحیح طور پر حل کیا جائے اور ریاست کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی ذہنیت ختم ہو سکے۔ جمّوں کے لوگوں کی شکایات کو دُور کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کر دیا گیا ہے اور اُمید ہے کہ یہ کمیشن جمّوں کے لوگوں کی شکایات و تکلیفات کا ازالہ کرنے میں مدد و معاون ہوگا۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ حکومت اس کمیشن کی سفارشات پر پوری طرح غور و خوض کرے گی۔

چاول باہر سے نہیں منگوائے جائیں گے

بھارت کے وزیرِ خوراک شری رفیع احمد قدوائی نے بمبئی میں ایک انٹرویو کے دوران میں بتایا کہ اس سال چاول باہر سے نہیں منگوائے جائیں گے اور جہاں تک چاول کی پیداوار کا تعلق ہے۔ بھارت مکمل طور پر خود کفیل ہو چکا ہے۔ واضح رہے کہ اب تک بھارت ہر سال آٹھ لاکھ ٹن چاول سالانہ غیر ممالک سے منگواتا رہا ہے۔ لیکن امسال اپنے دیش ہی میں دس لاکھ ٹن چاول کی پیداوار ہوگی۔ قدوائی صاحب نے کہا کہ چاول کا مسئلہ وزارتِ خوراک کے لئے سب سے بڑا دردِ سر رہا ہے۔ یہ غیر ممالک سے کافی مقدار میں مہیا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور جو تھوڑا بہت ملتا تھا وہ بھی بہت زیادہ نرخوں پر۔ اس مسئلے کے حل ہو جانے سے ہم نے خوراک کے محاذِ جنگ پر مکمل طور پر فتح حاصل کر لی ہے۔ گندم ابھی کچھ سال تک باہر سے منگوائی جائے گی جو ہر جگہ سے مناسب نرخوں پر مل سکتی ہے۔

وزیرِ اعظم سوویٹ رُوس کی تقریر

مارشل اسٹالین کی وفات کے بعد روس کے نئے وزیرِ اعظم میلنکوف نے اپنی تقریر میں اعلان کیا ہے کہ روس امن کی پالیسی پر گامزن رہے گا۔ عوام امن کے خواہشمند ہیں اور جنگ سے نفرت کرتے ہیں۔ اس لئے ہماری خارجی پالیسی دنیا بھر کے عوام سے دوستانہ تعلقات بڑھانے اور امن کے قیام کی ہے۔ ہم جنگ بازوں کی مخالفت کرنا اپنا فرض سمجھیں گے۔

جنرل آئزن ہوور کا بیان

امریکہ کے پریزیڈنٹ آئزن ہوور نے ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ روس نے حال ہی میں امن کے سلسلے میں جو خیالات ظاہر کئے ہیں۔ اگر وہ اصلیت پر مبنی ہیں تو امریکہ اُن کو خوش آمدید کہے گا۔ آپ نے کہا کہ اگر روس امن کا خواہشمند ہے تو میری حکومت ہمیشہ اُس سے تعاون کرنے کو طیار رہے گی۔

بھارت کے لیڈروں کو خراجِ تحسین

بھارت میں امریکہ کے سفیر مسٹر چیسٹر باؤلز نے امریکہ واپس جاتے ہوئے ایک بیان میں، تھوڑی مدّت کے اندر ہی بھارت کی شاندار ترقی پر بھارت کے لیڈروں کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ آپ نے کہا کہ تین سال کی مدّت میں بھارت جتنی تیزی سے شاہراہِ ترقی پر آگے بڑھا ہے وہ روس اور چین سے کہیں زیادہ ہے روس کے پہلے پنج سالہ پلان پر دس سال بعد عمل ہو سکا تھا لیکن بھارت آغاز ہی سے اپنے پلان کو کامیاب بنانے میں تیزی سے قدم بڑھا رہا ہے۔ آپ نے مزید کہا کہ بھارت دُنیا بھر کو ایک بار اس حقیقت سے روشناس کرا دے گا کہ جمہوریت صرف شخصی آزادی کو قائم رکھنے کی طاقت ہی نہیں ہے بلکہ تیزی سے آگے بڑھنے کا ایک ذریعہ بھی ہے۔

پارلیمنٹ میں خارجہ پالیسی پر بحث

بھارت کے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو نے پارلیمنٹ میں خارجی پالیسی پر بحث کا جواب دیتے ہوئے فرانس اور پرتگال کو تنبیہ کی کہ وہ بھارت کی غیر ملکی بستیوں کو کسی حالت میں جنگی سرگرمیوں کا اڈہ نہ بنائیں۔ اگر انھوں نے کوئی ایسی حرکت کی تو اسے غیر دوستانہ اقدام سمجھا جائے گا۔ شری نہرو نے اپنی تقریر میں دنیا کو دو بلاکوں میں تقسیم کرنے کی مخالفت کی اور مغربی طاقتوں پر یہ الزام لگایا کہ وہ نسلی امتیاز کی پالیسی کو شہ دے رہے ہیں۔ چین کا ذکر کرتے ہوئے پردھان منتری نے کہا کہ شمال کے بڑے پڑوسی ملک چین کے ساتھ ملحق دو ہزار میل لمبی سرحد پر امن، دوستی اور تعاون کی پالیسی کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے اگر ہم بھی اُس کی طرح تنگ دلانہ نقطۂ نظر سے سوچیں گے تو ہمیں بھی اُن ہی حالات میں سے گزرنا پڑے گا جو آج کل وہاں رونما ہو رہے ہیں۔ پاکستان کی پالیسی کو ہمیں وہاں کے عوام سے وابستہ نہیں کرنا چاہیئے کچھ وجوہ سے آج ہم اُن سے الگ فرقہ ہیں لیکن ہم ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں اس لئے ہمیں غصّے یا جذبات کی رو میں بہہ کر ہمیں کوئی ایسا قدم نہیں اُٹھانا چاہیئے جس کا نتیجہ بعد میں بُرا برآمد ہو۔ کامن ویلتھ کے ساتھ بھارت کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے شری نہرو نے کہا کہ کامن ویلتھ کے ساتھ تعلق بنائے رکھنے سے ہمیں فائدے ہی حاصل ہوئے ہیں جب کہ نقصان کچھ بھی نہیں اُٹھانا پڑا۔ ہماری اپنی ایک آزاد پالیسی ہے اور اُس آزاد پالیسی کے راستے میں کوئی بھی رکاوٹ نہیں پڑ سکتی۔

ایران کے تیل کا مسئلہ

ایران کے وزیر اعظم ڈاکٹر مصدّق نے تمام بڑے افسروں اور مجلس کے ممبران کے روبرو یہ حلف اُٹھایا کہ وہ تب تک اپنے عہدے سے علیٰحدہ نہیں ہونگے جب تک کہ وہ قتل نہ کر دیئے جائیں۔ یا اُن کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ پاس نہ ہو جائے۔ اینگلو ایرانی تیل کمپنی کے معاوضے کے سلسلے میں برطانیہ نے جو تجاویز رکھی ہیں۔ آپ نے اُنھیں رد کر دیا ہے۔

بھارت اور پاکستان کے مابین تجارتی معاہدہ

بھارت اور پاکستان کے مابین ایک تجارتی معاہدہ طے پا گیا ہے جس کی رُو سے بھارت سے پاکستان جانے والے کوئلے اور پاکستان سے بھارت آنے والے پٹ سن پر کسی قسم کا زائد محصول سرچارج اور لائسنس فیس عائد نہیں کی جائے گی ہر دو ممالک کی تجارت میں یہ بڑی رکاوٹ دُور ہو جانے سے آئندہ کے لئے بڑے تجارتی سمجھوتوں کے لئے راستہ کھل گیا ہے اور دونوں ملکوں میں اس رکاوٹ کے ہٹ جانے کا بڑا خوشگوار ردِّ عمل ہُوا ہے۔

مسئلۂ سوڈان

سوڈان کے معاملات پر جنرل نجیب کے صلاح کار میجر صالح سلیم نے اعلان کیا ہے کہ مصر نے نہر سویز کے متعلق برطانیہ سے تب تک کسی قسم کی بات چیت نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے جب تک سوڈان کے سمجھوتے پر پوری طرح عمل درآمد نہیں ہو جاتا آپ نے کہا کہ سوڈان کے حالات تشویشناک ہیں۔ ہم محض کاغذی سمجھوتہ کرنے سے مطمئن نہیں ہو جائیں گے۔

ٹرکی میں بھونچال سے تباہ کاریاں

ٹرکی میں بھونچال آنے سے جان اور مال کا کافی سے زیادہ نقصان ہُوا ہے۔ تا حال پانچ سو اشخاص کے ہلاک ہونے اور لاکھوں کی جائداد کے نقصان کی اطلاع موصول ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں مزید نقصانات کی خبریں موصول ہو رہی ہیں۔

سردار پرتاپ سنگھ کیروں کی تقریر

پنجاب کے وزیر ترقیات سردار پرتاپ سنگھ کیروں نے جالندھر ریڈیو سٹیشن سے ایک تقریر نشر کرتے ہوئے کہا کہ اگر بھارت میں جاپانی طریقے سے چاول کی فصل بوئی جائے تو ملک میں چاول کی پیداوار دُگنی ہو سکتی ہے۔ تمام زمینداروں اور کاشتکاروں کو اس طریقے کو سمجھ کر اسے اپنانا چاہیئے۔ حکومت کی طرف سے عوام کو آگاہ کرنے کے لئے ایک مہم شروع کر دی گئی ہے۔

Regd. No. E P - 689

وید راہی

بہن بھائی

روبنش کی ساری قمیص لڑائی میں پھٹ چکی تھی - رہ رہ کر اُسے اپنے آپ پر غصّہ آ رہا تھا - میں نے لڑائی ہی کیوں کی - ماتا جی نے دیکھ لیا تو خوب مرمّت ہو گی - ابھی تو تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں یہ قمیص سی دی تھی - اور آج پھٹ بھی گئی - اب خوب تھپّڑ پڑیں گے -

انہی خیالوں میں کھویا وہ گھر چلا جا رہا تھا - گھر آیا تو آہستہ سے دروازہ کھولا - جھانک کر دیکھا اور ہولے ہولے قدم رکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا - اچانک ہی مُنی گڑیا کو ہاتھوں میں پکڑے سامنے آ نکلی - وہ ٹھٹک گیا - مُنی نے اُس کی طرف غور سے دیکھا اور روبنش کی پھٹی ہوئی قمیص کو دیکھ کر چلّانے ہی لگی تھی کہ روبنش نے مُنہ پر اُنگلی رکھ "چھی" کہہ کر اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا - بے چارے کی آنکھوں میں پانی بھی بھر آیا تھا - مگر مُنی کہاں ماننے والی تھی - اُسے ابھی کل والے تھپّڑ یاد تھے جو روبنش نے اُسے لگائے تھے - اور اس کی پیاری گڑیا کا سر بھی دھڑ سے جُدا کر دیا تھا - وہ بھلا اب کیوں خاموش رہتی -

یہ قمیص کیسے پھٹی - اب ہم ماتا جی سے کہیں گے - مُنی نے روبنش سے کہا -

روبنش نے ہولے سے جواب دیا - ہاں لڑائی میں پھٹ گئی مگر ماتا جی سے نہ کہنا

ہم تو کہیں گے کل تم نے میری گڑیا جو پھاڑ دی تھی - اور مجھے مارا بھی تھا -

مُنی کی بات سُن کر روبنش چپ ہو گیا - گھبراہٹ سے اس کا چہرہ لال ہو گیا تھا - پھٹی ہوئی قمیص کو ہاتھوں سے فضول ڈھکنے کی کوشش کر رہا تھا - کہ اتنے میں دونوں کی باتیں سُن کر ماتا جی بھی ادھر آ گئیں - کیا بات ہے ؟

مگر بات پوچھنے کی کیا ضرورت تھی - پھٹی ہوئی قمیص کو دیکھ کر انہوں نے زور سے ایک تھپّڑ بے چارے روبنش کے مُنہ پر لگا دیا - تیرا بیڑا پار ہو - روز روز کپڑوں کا ستیاناس کر ڈالتے ہو -

روبنش سسکیاں بھرنے لگا - اور ماتا جی نے ایک اور چپت جھاڑی اور مُنی کو یہ کہہ کر اپنے ساتھ لے گئیں کہ چل تجھے روٹی دوں - آج روبنش کی روٹی بھی بند ہے -

مُنی روبنش کی طرف دیکھتی ہوئی چل دی - اس نے اماں سے روٹی لی کہ صحن میں بیٹھ کر کھاؤں گی -

تھوڑی دیر کے بعد جب ماتا جی باہر آئیں تو انہوں نے دیکھا کہ مُنی اور روبنش دونوں ڈیوڑھی کی سیڑھیوں پر بیٹھے اکٹھے روٹی کھا رہے ہیں -

شفیع الدین نیّر

میلے کی دھوم

آج مچی ہے دُھوم[1]
جھُوم خوشی سے جھُوم

میلے کا بازار لگا ہے چیزوں کا انبار لگا ہے
آنے اور جانے والوں کا اوہو! کیسا تار لگا ہے

آج مچی ہے دُھوم
جھُوم خوشی سے جھُوم

جھُول رہے ہیں بچّے سارے پھُول ہوں جیسے پیارے پیارے
ایک ہنڈولے پر بیٹھا ہے ایک کھڑا ہنستا ہے کنارے

آج مچی ہے دُھوم
جھُوم خوشی سے جھُوم

اک بچّہ ہے چاٹ اُڑاتا ایک کھڑا رس گُلّا کھاتا
اک نے غبارہ اپنا پھُلایا ایک ہے باجا مُنھ سے بجاتا

---

[1] یہ شعر کسی اور شاعر کا ہے۔ اسی کو ٹیپ کا شعر بنا کر یہ نظم میں نے لکھی ہے۔ نیّر
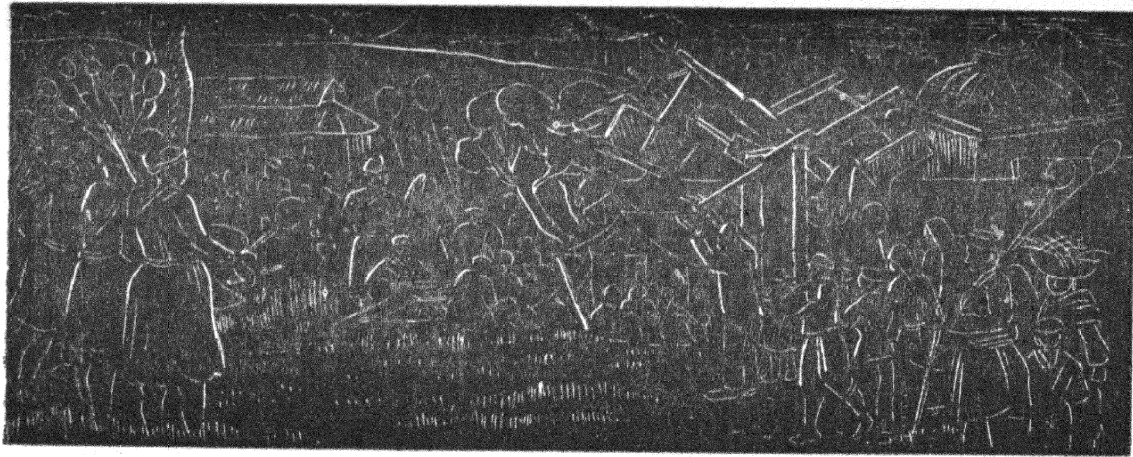
آج مچی ہے دُھوم
جھُوم خوشی سے جھُوم

اوہو دیکھو تو یہ کیا ہے شاعر بچّوں کا جلسا ہے
شعر کسی بچّے کا سُن کر سب کہتے ہیں "کیا کہنا ہے"

آج مچی ہے دُھوم
جھُوم خوشی سے جھُوم

کھیل کا ہے کیا خوب اکھاڑا اِس نے دبوچا اُس نے پچھاڑا
وُہ اُچھلا کوُدا، یہ دَوڑا یہ جو گرا تو اُس نے لتاڑا

آج مچی ہے دُھوم
جھُوم خوشی سے جھُوم

بچّوں کا آنا جانا ہے کچھ پینا ہے کچھ کھانا ہے
علم کا جھنڈا لہرانا ہے نیرّ کا میٹھا گانا ہے

آج مچی ہے دُھوم
جھُوم خوشی سے جھُوم

سراج انور

ادلے کا بدلہ

اگلے وقتوں کا ذکر ہے کہ ایک راجہ تھا۔ یہ راجہ بہت بے وقوف تھا۔ روزانہ نت نئے سوال اپنے وزیروں سے کیا کرتا۔ ایک دن بیٹھے بٹھائے اُسے خیال آیا کہ کیا وجہ ہے کہ اس کی ہتھیلی پر بال نہیں اُگتے۔ حالانکہ اور سب جگہ اُگتے ہیں۔ جب اِس خیال نے اسے بہت بے چین کیا تو اس نے دربار میں سب کے سامنے یہ سوال ظاہر کر دیا ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ جو شخص اس سوال کا صحیح جواب دے گا اُسے وزیر اعظم بنا دیا جائے گا ۔۔۔

دربار میں سبھی طرح کے لوگ تھے اچھے بھی بُرے بھی۔ ایک بُرے شخص نے کھڑے ہو کر کہا۔ مہاراج میرے خیال میں اس سوال کا جواب وزیر کاشی دے سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ سب سے زیادہ عقل مند ہیں "۔ اب سنو۔ وزیر کاشی کے سب درباری دشمن تھے۔ انہوں نے یہ ایک چال چلی تھی۔ تاکہ وزیر کاشی جواب نہ دے سکے اور راجہ کی نظروں سے گر جائے۔ راجہ نے خوش ہو کر کہا۔ ہاں کاشی جی۔ تمہیں ہی اس کا جواب دینا ہوگا' ورنہ ہم تم سے تمہاری تمام جاگیر چھین کر تمہیں شہر بدر کر دیں گے "۔

وزیر کاشی بہت گھبرایا اور دوسرے دن کی مہلت مانگ کر اپنے گھر چلا گیا۔ جب اس کے لڑکے نے اُسے پریشان دیکھا تو وجہ پوچھی اور کاشی کے وجہ بتا دینے پر لڑکے نے کاشی کے کان میں کچھ کہا۔ جسے سُن کر کاشی خوش ہو گیا۔

دوسرے دن راجہ نے وہ سوال دُہرایا تو وزیر نے جواب دیا "مہاراج آپ بہت دیالو ہیں۔ ہر روز دان پُن کرتے ہیں۔ آپ کی سخاوت ہر طرف مشہور ہے۔ کیا نہیں ہے "۔۔۔؟

" نہیں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہم واقعی بہت سخی ہیں "۔

بس تو مہاراج آپ اتنا روپیہ بانٹتے ہیں کہ روپیہ بانٹتے بانٹتے آپ کی ہتھیلی کے بال گھس گئے ہیں "۔

راجہ نے خوش ہو کر کہا۔ لیکن تمہاری ہتھیلی کے بال کس طرح گھسے ۔۔۔؟

کاشی نے کہا " مہاراج روپیہ لیتے لیتے میری ہتھیلی کے بال بھی گھس گئے ہیں "۔

راجہ نے پوچھا۔ اور ان درباریوں کی ہتھیلیوں کے بال "؟

کاشی نے جواب دیا۔ مہاراج آپ مجھے روپیہ دیتے ہیں اور یہ لوگ حسد کے مارے اپنے ہاتھ ملتے ہیں۔ اس لئے ان سب کی ہتھیلیوں

کے بال بھی گھس گئے ہیں ۔

راجہ بہت خوش ہوا اور کاشی کو اپنا وزیر اعظم بنا لیا۔ لیکن یہ بات دربار کے ایک نائی کو نہیں بھائی۔ وہ کاشی سے بدلا لینے کے متعلق سوچنے لگا۔ ایک دن اُس نے راجہ کی داڑھی بناتے ہوئے راجہ سے کہا کہ مہاراج آپ کے پتاجی کو جنّت میں گئے ہوئے چار سال ہو چکے ہیں مگر آپ نے یہ معلوم ہی نہیں کرایا کہ وہ جنّت میں کیسے ہیں ۔ کسی طرح سے اُن کی خیریت تو معلوم کرائیے ۔ راجہ نے کہا ۔ تم ٹھیک کہتے ہو ۔ مگر وہاں کسے بھیجیں" ؟

نائی نے جواب دیا ۔ کاشی جی کو بھیج دیجئے ۔ وہ بہت عقلمند ہیں

راجہ نے پوچھا مگر وہ جائیں گے کیسے ؟ اس پر نائی نے کہا کہ مہاراج میرے پاس ایک بُوٹی ہے ۔ اُن کے بدن پر وہ بُوٹی مل کر ہم اُن کو چِتا پر رکھ کر جلا دیں گے ۔ اس طرح وہ سیدھے جنّت پہنچ جائیں گے ۔ بُوٹی کے اثر سے پھر واپس آجائیں گے ۔ وہ مریں گے نہیں "۔

راجہ مان گیا اور کاشی کے بہتیرے چلّاتے اور شور مچانے کے باوجود اسے زندہ آگ میں جلا دیا گیا ۔ راجہ اب خوش تھا کہ کاشی آکر اُسے اس کے پتا کے بارے میں بتائے گا کہ جنّت میں وہ کیا کر رہے ہیں ؟

چھ مہینے کے بعد ایک دن راجہ اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ کھڑکی سے کود کر کوئی شخص اس کے پاس پہنچا ۔ اس کی داڑھی اور ناخن بہت بڑھے ہوئے تھے ۔ راجہ نے ڈر کر پوچھا ۔ تم کون ہو — ؟

آنے والے شخص نے کہا ۔ مہاراج ذرا آہستہ بولیئے ۔ میں کاشی ہوں سیدھا جنّت سے آ رہا ہوں ۔ میرا حلیہ دیکھ کر ڈریئے نہیں "۔

راجہ بہت خوش ہوا اور کاشی کو اپنے پاس بٹھا کر بولا ۔ کہو ہمارے پتا کیسے ہیں" ؟

کاشی نے کہا ۔ مہاراج جنّت کے میوے کھا کھا کر وہ بہت موٹے تازے ہو گئے ہیں ۔ مگر آپ سے ایک بات پر ناراض ہیں"

— کس بات پر ؟ راجہ نے تعجّب سے کہا ۔

آپ نے اُن کے پاس کوئی نائی نہیں بھیجا ۔ جیسا حُلیہ آپ میرا دیکھ رہے ہیں ۔ ویسا ہی اُن کا ہے ۔ نائی وہاں پہنچے تو ان کی داڑھی بنائے اور ناخن کترے ۔ راجہ نے کہا ۔ یہ کون سی بڑی بات ہے ۔ ہم اس کا ابھی انتظام کرتے ہیں ۔ اپنے خاص نائی کو ان کے پاس بھیج دیتے ہیں ۔ مگر وہ وہاں کس طرح جائے گا" ؟

جس طرح میں گیا تھا ۔ وہ بوٹی اُس کے بدن پر مل دیجئے گا اور اُسے چِتا پر رکھ کر جلا دیجئے گا ۔ راجہ نے خوش ہو کر کہا ۔ بالکل ٹھیک ہم ایسا ہی کریں گے ۔

تو بھئی — اس طرح نائی کو بھی جنّت میں پہنچا دیا گیا ۔ حالانکہ جلنے سے پہلے اس نے بہت شور مچایا تھا ۔ مگر سپاہیوں نے اسے زبردستی چِتا پر لٹا دیا تھا ۔

کچھ مہینوں کے بعد راجہ نے کاشی سے کہا ۔ ابھی تک ہمارا نائی نہیں آیا —" ؟

کاشی نے کہا ۔ مہاراج وہ کبھی نہیں آئے گا ۔ وہ مجھ سے جلتا تھا ۔ مجھے مارنے کے لئے اس نے ایک جال بُنا تھا جس میں وہ خود پھنس گیا ۔ بھلا سوچئے مہاراج کوئی مر کر بھی زندہ ہوا ہے" ؟

" مگر پھر تم کیسے زندہ ہو گئے "۔ راجہ نے حیرت سے کہا ۔

" مہاراج مجھے پہلے سے اس سازش کا پتہ چل گیا تھا ۔ میں نے چِتا کے نیچے راتوں رات ایک سرنگ بنوا دی تھی ۔ میں اس کے راستے اپنے گھر پہنچ گیا تھا اور چھ مہینے کے بعد آپ کے پاس اس حلیے میں آیا تھا ۔ اب نائی کو اپنے کیئے کی سزا مل گئی ۔

راجہ نے سُن کر کاشی کی عقل کی خُوب تعریف کی ۔ اور آئندہ وہ کاشی کے مشوروں پر چل کر ہی حکومت کے کام سرانجام دیتا رہا ۔

حامد اللہ افسر

ہمالیہ کی کہانی

چند روز پہلے کا ذکر ہے کہ میں ہمالیہ کے ایک حصّے پر مقیم تھا۔ ایک روز صبح کے وقت ٹہلتا ٹہلتا ایک ایسی پہاڑی پر پہنچ گیا جو بہت ہی پُر فضا تھی۔ میرے چاروں طرف بہت سی اونچی اونچی چوٹیاں تھیں، ایک عجیب کیفیت مجھ پر طاری ہو گئی۔ ہوا کے جھونکے سائیں سائیں کرتے گزر رہے تھے۔ پرندوں کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن اس کے باوجود ایک عجیب خاموشی طاری تھی۔ پاس ہی ایک چشمہ بہہ رہا تھا۔ میں اس چشمے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ خیالات کا ہجوم میرے دماغ کو گھیرے ہوئے تھا۔ پہاڑوں کا یہ سلسلہ کیسا عجیب ہے، کتنی دور تک پھیلا ہوا ہے۔ آباد بھی ہے، غیر آباد بھی ہے، اس کے کتنے حصّے ایسے ہیں جہاں تک انسان کی رسائی نہیں ہو سکی اور نہ شاید آئندہ ہو سکے گی۔

مَیں اسی قسم کے خیالات میں غرق تھا کہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ہمالیہ خود مجھ سے ہمکلام ہے اور ہلکی ہلکی ہوا کے جھونکوں کے ساتھ یہ آواز آ رہی ہے :-

سُن اے انسان! تو نے میرا نام ہمالیہ رکھا ہے، مجھے یہ نام پسند ہے۔ اس لئے کہ اس میں تھوڑی بہت سچائی ضرور ہے اور یہ نام مجھ پر صادق آجاتا ہے کچھ مُدت گزری کہ انسانوں کے ایک گروہ نے جو خود کو آریہ کہتا تھا اور جس کی زبان سنسکرت تھی میرا یہ نام رکھا تھا ـــــ اے انسان! تو شاید اس پر چونکا ہو کہ میں نے آریوں کے آنے اور میرا یہ نام رکھنے کو کچھ مُدت کی بات کہا ہے لیکن اس پر تعجب نہ کر۔ تیرے چند ہزار سال میرے چند لمحوں کے برابر بھی نہیں ہوتے ـــــ ہاں تو ان لوگوں کی زبان میں "ہم" برف کو کہتے تھے اور "لیا" سے یہ لوگ گھر مراد لیتے تھے۔ اس طرح ہمالیہ کے معنی "برف کا گھر" ہوئے۔ میرا یہ نام اس لئے تو صحیح ہے کہ میری بہت سی چوٹیاں بارہ مہینے برف سے ڈھکی رہتی ہیں لیکن میرے طویل سلسلے میں ایسے حصّے بھی ہیں جہاں سال کے کسی حصّے میں برف نہیں گرتی۔

اے انسان تجھے معلوم بھی ہے کہ دنیا میں کوئی پہاڑ ایسا اچھا پہاڑ نہیں ہے جیسا کہ تیرے ملک کی شمالی حد بن کر اس کی حفاظت کر رہا ہے۔ دریائے انڈس سے لے کر دریائے برہم پتر تک ایک لمبا

چوڑا سلسلہ چلا گیا ہے۔ اس سلسلے کی چوڑائی ہندوستان کے شمالی میدانوں سے لے کر تبت کی جنوبی حدوں تک ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ دنیا کے دور دراز حصّوں سے بڑے بڑے زمین داں اور کوہ نورد آتے ہیں اور میری آسمان سے باتیں کرنے والی چوٹیوں تک پہنچنے کی کوشش میں اپنی جانیں گنواتے ہیں۔ یہ لوگ ابھی تک میری چند چوٹیوں کا حال بھی معلوم نہیں کر سکے ہیں۔

انسان نے میری سب سے اونچی چوٹی کا نام ایورسٹ رکھا ہے جو نیپال میں ہے۔ اپنے حساب سے وہ اس چوٹی کی اونچائی ۲۹۰۰۲ فیٹ بتاتا ہے۔ میری ایک اور چوٹی کا نام اس نے کنچن جنگا رکھا ہے، یہ سکم میں ہے اور اس کی اونچائی ۲۸۱۵۶ فیٹ ہے۔ کمایوں میں میری ایک چوٹی نندا دیوی کہلاتی ہے۔ اس کی اونچائی ۲۵۷۰۰ فیٹ ہے اور بیس ہزار یا اس سے زیادہ اونچی چوٹیوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میری اونچی اونچی چوٹیوں تک انسان کی رسائی مشکل ہے اس لئے کہ وہ بارہوں مہینے برف سے ڈھکی رہتی ہیں اور ڈھلواں اور پھسلواں ہیں۔

ان دریاؤں کا شمار میں آنا مشکل ہے جو مجھ سے نکلتے اور میرے چشموں سے فیض پاتے ہیں۔ انڈس، گنگا، برہم پترا ان میں سے چند بڑے بڑے دریا ہیں۔ یہ دریا ہندوستان کے شمالی میدان کو سیراب کرتے ہیں۔ یہ بہت لمبا چوڑا میدان ہے اور اس کا رقبہ تقریباً ۵ لاکھ مربع میل ہے۔ یہ میدان ہندوستان کا سب سے زیادہ سرسبز و شاداب حصّہ ہے اور یہیں کی آبادی بھی سب سے زیادہ گھنی اور سب سے زیادہ مہذب ہے۔

میری اتنی بڑی لمبائی چوڑائی میں اور سمندر سے فاصلے کے اتنے اختلافات کی وجہ سے آب و ہوا قدرتی طور پر میرے مختلف حصّوں میں مختلف ہونی چاہیے۔ میری جن چوٹیوں پر ہمیشہ برف جمی رہتی ہے وہ تو خیر آبادی کا بار برداشت نہیں کر سکتیں لیکن گرمی کے موسم میں جب کہ میدانوں کے بعض حصّوں کا ٹمپریچر ۱۱۵ ڈگری (یا اس سے بھی زیادہ) تک پہنچ جاتا ہے۔ میں گرمی سے جھلس جانے والے انسانوں کو اپنے پہلو میں پناہ دیتا ہوں۔ میرے بعض ان حصوں کا ٹمپریچر جو چھ ہزار سے آٹھ ہزار فیٹ تک بلند ہیں موسم گرما میں ۶۰ ڈگری یا اس کے قریب رہتا ہے۔

میری ایک عجیب خصوصیت ہے جو شاید ہی دنیا کے کسی پہاڑ کو نصیب ہو۔ یہ خصوصیت بڑے بڑے 'تال ہیں' ان میں سے بعض تو کمایوں کے پہاڑی سلسلے میں ہیں اور بعض کشمیر کی وادی میں اتنی بلندی پر تال کے ہونے سے ایک عجیب کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس سے پہاڑوں کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے اور وہاں کی آب و ہوا پر نہایت خوشگوار اثر پڑتا ہے۔

برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کے علاوہ میرے قریب قریب تمام سلسلے جنگلوں سے ڈھکے ہوئے ہیں اور ان جنگلوں میں قسم قسم کے جانور نظر آتے ہیں۔ شیر ببر، چیتا، لومڑی قریب قریب میرے تمام جنگلوں میں پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح مختلف رنگ بہ رنگ کی خوبصورت اور خوش آواز چڑیاں میرے سلسلے کو زینت بخشتی ہیں طوطا، کوئل، فاختہ، مینا یہ سب چڑیاں اپنے نغموں سے میرے پہلوؤں کو زندگی سے لبریز کر دیتی ہیں۔

میری بلند چوٹیاں خدا سے قریب ہوں یا نہ ہوں لیکن اس میں کس کو شک ہو سکتا ہے کہ میری خاموش اور پرسکون آغوش میں بیٹھ کر انسان نے خدا کو تلاش کیا اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ پا لیا۔

ہندو مذہب مجھے بڑی عزت کی نظر سے دیکھتا ہے، ایک پُران میں ہے۔ "جیسے صبح کے وقت سورج شبنم کو غائب کر دیتا ہے اسی طرح ہمالیہ کا نظارہ گناہوں کو دور کر دیتا ہے"۔ ہندوؤں نے

مانسرود کے شمالی برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ کیلاش کو زمین کا وسط قرار دیا ہے ۔ مقدس گنگا سے کون واقف نہیں اور ہندو اس کو جس قدر عقیدت اور شردھا سے دیکھتے ہیں وہ کس سے پوشیدہ ہے ۔ گنگا بہت وقار اور شان کے ساتھ لہراتی اٹھلاتی ہردوار میں پہاڑ سے اترتی ہے' ہردوار سے چالیس میل اوپر الک نندا اور بھاگیرتی اس میں شامل ہو گئی ہیں ۔ بھاگیرتی کا مخرج سفید چٹانوں والے پربت کے اندر میں مندر کے اوپر واقع ہے ۔ اسی کا نام گنگوتری ہے ۔ ہزاروں جاتری اس کی زیارت کے لئے ہر سال جاتے ہیں ۔ اسی پربت کے دکھن میں کدار ناتھ اور پورب میں بدری ناتھ ہے ۔ گنگوتری اور بھاگیرتی کے پچھم میں ایک اور متبرک مقام جمنوتری ہے جو جمنا جی کا مخرج ہے ۔ وشنو گنگا پر بدری ناتھ کا مندر وشنو کا مندر ہے اور وشنو لوگوں کا تیرتھ ہے ۔

میرے مغربی سلسلے پر انڈس کے کنارے بودھ مت کے استوپے اور مندر بھی پائے جاتے ہیں' یہیں ایک پہاڑی کے پتھر پر اشوک کے مشہور احکام بھی کندہ ہیں ۔

صرف ہندو ہی نہیں بلکہ بہت سے خدا رسیدہ مسلمان بھی دنیا سے پیچھا چھڑا کر میری سکون ریز کھوہوں میں خدا سے لو لگائے اس فانی زندگی کے دن گزار رہے ہیں ۔

لیکن یہ نہ سمجھ لینا کہ میری انسانی آبادی صرف ان کوہ نوردوں اور حق کے تلاش کرنے والوں تک ہی محدود ہے ۔ میری اندرونی وادیوں اور میرے پہلوؤں میں بسنے والے ہزارہا انسان ہیں جو یہیں پیدا ہوئے اور یہیں پلے بڑھے' ان میں سے صدہا تو ایسے ہیں جنھوں نے کبھی کوئی غیر کوہی علاقہ نہیں دیکھا اور جن کے نزدیک ساری دنیا صرف میرے ہی پہلوؤں میں سمائی ہوئی ہے ۔ انہوں نے نہ کبھی ریل دیکھی ہے نہ موٹر کار' نہ سینما نے کبھی ان کی آنکھوں کو خیرہ کیا ہے اور نہ ریڈیو نے ان کے کانوں کو طرح طرح کی آوازوں سے بھرا ہے ۔ میری بلندیاں اور میری پستیاں' میرے چشمے اور میرے جنگل ہی ان کی دولت ہیں اور یہی ان کی تہذیب' مگر یہ میدانوں کے بڑے بڑے خوبصورت شہروں کے رہنے والوں کی طرح دبلے پتلے' کمزور' منحنی اور پست ہمت نہیں ہوتے' بلکہ یہ مضبوط چست اور گٹھے ہوئے بدن کے لوگ ہوتے ہیں ۔ گو یہ میلے کچیلے رہتے ہیں مگر ان کا رنگ گورا ہوتا ہے اور ان کی عورتیں تو ایسی خوبصورت ہوتی ہیں کہ ان کا جواب ہندوستان کے کسی خطے میں ملنا مشکل ہے ۔

سُن اے انسان! حیرت کے بھرے ہوئے جو سوالات تیرے دل میں اُٹھ رہے تھے ان کے جواب میں تیری تسلّی کے لئے میں نے اپنا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کر دیا ہے ورنہ میری آسمان بوس چوٹیوں کا جلال' میرے دلکش مناظر کا حُسن' میرا نہ ختم ہونے والا سلسلہ در سلسلہ پھیلاؤ' میری نامعلوم بلندیاں' میری انتھاہ گہرائیاں میری سرسبز و شاداب وادیاں سادہ اور ترقی کی رو سے محروم' میری ویرانیاں خاموش اور پُرسکون' میرے دریا' میرے چشمے' میرے آبشار' میری چٹانیں اور میرے گھنے اور ناقابل گزر جنگل' یہ سب ایسی چیزیں ہیں جن کا بیان لفظوں میں نہیں سما سکتا ۔

لطیفہ

اُستاد ۔ اگر تمہارے پاس چار گائیں ہوں ۔ اور ہر ایک گائے چار سیر دودھ دے ۔ تو بتاؤ تم کل کتنا دودھ فروخت کرو گے ؟

شاگرد ۔ چوبیس سیر ۔

اُستاد ۔ افسوس ہے کہ تم حساب سے ذرا بھی واقفیت نہیں رکھتے ۔

شاگرد ۔ اور جناب دودھ بیچنے کے طریقوں سے ناواقف ہیں ۔

آٹھ آنے

جون ۱۹۵۳ء

GOOD READING TODAY HISTORY TOMORROW

FACTS ABOUT INDIA

The country and its people, its constitution and political set-up ; industry and agriculture, transport and communications, scientific research etc. Art and architecture, the press, radio, educational and cultural institutions. Illustrated with photographs and charts, the handbook provides extensive factual information arranged conveniently for easy reference.

INDIA AND SOUTH EAST ASIA

A short account of our eastern neighbours, Burma, Malaya, Thailand, Indo-China and Indonesia, their history and relations with India, cultural and economic, past and present. Illustrated.

AC455.

From all leading booksellers or direct from

The PUBLICATIONS DIVISION

OLD SECRETARIAT, DELHI

روح افزا
آپ کا بہترین ساتھی
Rooh Afza
Rooh Afza
شربتوں میں روح افزا کا مقام بہت
بلند ہے۔ ایک دفعہ اس تسکین دہ
اور پُر لطف شربت کو استعمال کرنے
کے بعد آپ پھر کسی دوسرے شربت
کا نام بھی نہ لیں گے۔ آپ اسے
اپنا بہترین ساتھی پائیں گے۔
• خریدتے وقت روح افزا کی سیل دیکھ لیں ملتے جلتے ناموں سے دھوکا نہ کھائیں
ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی

"یہ سچ ہے...
لکس
ٹائلیٹ
صابن
سے آپ زیادہ
حسین بن سکتی ہیں"
— شیاما
شیاما کہتی ہیں "لکس ٹائلیٹ صابن
کے مقوی جلد اجزاء سے میری جلد
میں ایک نمایاں تبدیلی نظر آنے
لگی ہے۔ یہ سفید اور خالص صابن
ہر روز استعمال کرنے سے میری
جلد از حد ملایم بنی رہے گی"
LUX
TOILET SOAP
لکس ٹائلیٹ صابن
فلمی ستاروں کا حسن بخش صابن
کتنا سفید، کتنا خالص، کتنا خوشبودار

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- بال مکند عرش ملسیانی

جگن ناتھ آزاد

جلد ۱۱ —— نمبر ۱۱

سالانہ چندہ:-
ہندوستان میں —— چھ روپے
پاکستان میں —— چھ روپے

غیر ممالک سے —— نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ
ہندوستان میں —— آٹھ آنے
پاکستان میں —— آٹھ آنے

جون ۱۹۵۳ء

ترتیب

بچوں کا آج کل

سر ورق - بنگالی طالبات

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

ہارون خاں شروانی

حسرت موہانی کے سیاسی رجحانات

سنہ ۱۹۰۲ء کا ذکر ہے۔ میری عمر کوئی بارہ برس کی ہوگی۔ علی گڑھ کالج کے ملحقہ اسکول میں ساتویں درجے میں پڑھتا تھا۔ مدرسے سے آیا تو معلوم ہوا کہ ملاقات کے کمرے میں ایک صاحب بیٹھے والد مرحوم سے کچھ گفتگو کر رہے ہیں۔ اندر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ ملازم سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ سید فضل الحسن حسرت موہانی ہیں۔ وہ حاجی صاحب سے ملنے آئے ہیں۔ حسرت موہانی اس زمانے ہی میں علی گڑھ کے حلقوں میں مشہور ہو چکے تھے۔ گستاخی سہی، مگر دل نے نہیں مانا۔ ایک طرف کی چلمن کی تیلیوں میں سے دیکھا کہ حسرت صاحب معمولی وضع کی اچکن پہنے، سر پر ایک بالکل چپٹی قسم کی ترکی ٹوپی، بہی گھنی سیاہ ڈاڑھی رکھے والد صاحب کے پاس بیٹھے ہیں۔ علی گڑھ کی تاریخ میں اس زمانے کو بدرجہ اتم انگریزیت کا زمانہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ مذہبیت تو درکنار یہ خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ کالج کا کوئی ایسا گریجویٹ ہوگا جو روزمرہ اپنے چہرے پر اُسترا نہ پھیرتا ہو۔ مجھے یاد ہے کہ میں حسرت کو دیکھ کر کچھ مرعوب سا ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اس شخص میں کیا اوصاف ہوں گے کہ اس نے طالب علمی ہی کے زمانے میں اتنا نام پیدا کر لیا ہے۔ حسرت کی طبیعت میں بغاوت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اور اس کا شاخسانہ یہ نکلا کہ کالج کے پرنسپل مسٹر موریسن نے (جو بعد کو سر تھیوڈر موریسن اور وزیر ہند کی کونسل کے ممبر ہوئے) حسرت کو اقامت خانے سے نکال دیا۔ یہ بھی مشہور تھا کہ حسرت کی قابلیت کا سکہ کالج کے سکرٹری نواب محسن الملک مرحوم اور مقامی ٹرسٹیوں پر بیٹھا نہ ہوتا اور وہ طلباء میں اتنے مقبول اور ہر دل عزیز نہ ہوتے تو شاید انھیں اقامت خانے ہی سے نہیں بلکہ کالج سے بھی نکال دیا جاتا۔ مگر پرنسپل کی اتنی ہمت نہیں ہوئی اور انھیں صرف اقامت خانے ہی سے نکل جانے کے حکم پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔

حسرت نے ۱۹۰۳ء میں بی، اے کا امتحان پاس کیا۔ موجودہ صدی کی ابتدا سے پہلی سنساری جنگ تک علی گڑھ کالج کا گریجویٹ ہونا حکومتی خدمت کے لئے ایک طرح کا پاسپورٹ تھا، اور مشکل سے کوئی بی، اے ہوگا جسے نائب تحصیلداری اور تحصیلداری کیا اس زمانے کی معراج کمال یعنی ڈپٹی کلکٹری بھی نہ مل جاتی ہو۔ حسرت کی طالب علمی کا زمانہ تمامتر کامیاب رہا تھا، اور اگر وہ ذرا بھی اس کی خواہش کرتے تو انھیں سرکاری ملازمت ملنے میں کسی طرح کی دقت نہ ہوتی۔ مگر انھوں نے ایک طرف شعر و سخن اور دوسری جانب ملک کی خدمت کو اپنا مسلک قرار دیا، اور سرکاری ملازمت کے خیال تک کو ٹھکرا دیا۔ جب حسرت علی گڑھ میں طالب علم تھے تو انھوں نے اردو کی ایک انجمن اردوئے معلیٰ قائم کی جو الحمد للہ اب تک موجود ہے۔ اقامت خانے سے اخراج تک وہ برابر اس کے سکرٹری رہے۔ انھیں انجمن کا نام ایسا پسند تھا کہ آخر کار جب انھوں نے کالج کی تعلیم کو خیرباد کہا تو اسی نام کا ایک رسالہ نکالنا شروع کیا۔ اس رسالے کا ادبی معیار نہایت بلند تھا تو سیاسی اعتبار سے اس میں حسرت کی "گرم" یعنی انتہا پسند پالیسی کی جھلک نظر آتی تھی اور اس میں ان کے یا دوسرے اہل قلم کے جو مضامین چھپتے تھے وہ بھی ادبی اعتبار سے اونچے درجے کے اور سیاسی اعتبار سے بایاں پہلو لئے ہوتے تھے۔ سیاسی مضامین کی حد تک، اُردوئے معلیٰ کے ابتدائی دور میں مولوی برکت اللہ بھوپالی کے فارسی مضمون "ہندو مسلمان در ہندوستان"، ملا عبد القیوم حیدر آبادی کے سلسلے وار مضمون "ازالۃ الاوہام" اور والد ماجد حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب مرحوم کے مضامین نے کافی ممتاز جگہ

پائی تھی۔ حسرت کی معاشی حیثیت ہمیشہ نہایت پست ہونے اور اُن کے بار بار جیل میں جانے کی وجہ سے ایک تو یہ رسالہ اکثر بے ترتیب نکلتا اور دوسرے جیسا جیسا زمانہ گزرتا گیا ویسے اس کا کاغذ، کتابت، طباعت اچھی سے معمولی اور معمولی سے ادنیٰ درجے کی ہوتی گئی۔ مگر گدڑی کے لعل کی طرح اس کے مضامین، اس کی نظمیں، اس کے خیالات اور اس کے تذکروں کا معیار برابر اونچا رہا۔ اتنا اونچا کہ مشکل سے کسی ہم عصر ادبی یا سیاسی رسالے کا معیار ایسا ہوگا۔

حسرت علی گڈھ کی پیداوار تھے لیکن رائج الوقت علی گڈھی پالیسی کے سخت مخالف تھے اور علاوہ چند حریت پسندوں کے جن میں والد مرحوم کا نام شامل ہے اس زمانے کے علی گڈھ میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو برطانوی حکومت کے خلاف اپنی آواز بلند کرنے کی ہمت کرتے ہوں۔ حسرت ۱۹۰۳ء ہی سے انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاسوں میں شریک ہوتے تھے اور اس تنظیم کے بڑے دلدادہ تھے۔ چنانچہ وہ اپنے ایک مضمون میں کانگریس کی بابت لکھتے ہیں:-

"مسلمانانِ ہندوستان کا پولیٹیکل مستقبل اگرچہ بظاہر دیگر اقوام ہند کے مستقبل اور حال سے بالکل غیر مشابہ نظر آتا ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے اور ہمارے خیال میں بہت ممکن ہے کہ آج سے تیس سال کے بعد ملکی معاملات میں مسلمانوں کی وہی پالیسی ہو جائے جو اس وقت کانگریس کی ہے اور تیس چالیس سال کے بعد مسلمان بھی وہی روش اختیار کر لیں جو کانگریس کے گرم فریق نے اختیار کی ہے۔"

(اردوئے معلّٰی جون ۱۹۰۷ء)

علی گڈھ کی تحریک کے متعلق ان کی ایک مستقل رائے تھی۔ عام طور سے سید احمد خاں غفرلہٗ کو فرقہ پرست اور انگریزی حکومت کا مداح سمجھا جاتا تھا، اور ان کے پیرو انگریزوں کی مداحی اور اُن کی ثنا خوانی کو اپنی زندگی کا ایک بڑا مقصد بنائے ہوئے تھے۔ ایسی فضا میں سر سیّد کے انتقال کے صرف چھ برس بعد حسرت اپنے نئے رسالے میں یہ لکھنے کی ہمت کرتے ہیں۔

"ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ سر سیّد اپنے زمانے میں قوم کے مسلّم رہنما تھے اور اس وقت مسلمانوں کے حق میں جو کچھ انھوں نے کیا بہتر کیا۔ اگر انھوں نے مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ ہونے کی نصیحت اس بنا پر کی کہ غدر کے بعد سرکار انگلشیہ مسلمانوں سے بدگمان تھی اور ان کو بغاوت کا ملزم سمجھتی تھی تو بہت خوب کیا۔ اگر انھوں نے مسلمانوں کی توجہ کو تمام ملکی معاملات سے علیحدہ کر کے صرف اعلیٰ تعلیم کی طرف مائل کر دیا تو اور بھی خوب کیا۔۔۔۔۔

لیکن ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا زمانے کی اب بھی وہی حالت ہے جو سر سیّد کے وقت میں تھی؟ کیا سرکار انگریزی کو اب بھی کسی متنفس پر بغاوت کا شبہ ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر نا گوار کا

ل مولوی برکت اللہ بھوپالی مرحوم، انیسویں صدی کے اواخر کے مشہور انقلابی۔ ہندوستان کے سیاسی حالات سے متاثر ہو کر از خود ہندوستان سے جاپان چلے گئے اور وہیں بود و باش اختیار کر لی۔ متعدد کتابوں کے مصنّف تھے۔ غالباً جاپان ہی میں انتقال ہوا۔

جناب حاجی محمد موسیٰ خاں مرحوم، دتاولی ضلع علی گڈھ کے شروانی خاندان کے ایک ممتاز رکن اور راقم الحروف کے والد۔ صرف انیس برس کی عمر میں سر سید احمد خاں مرحوم نے انھیں علی گڈھ کالج کا ٹرسٹی مقرر کیا۔ مسلم لیگ کے قیام پر اس کے پہلے جائنٹ سکرٹری اور میجر حسن بلگرامی مرحوم کے قیام انگلستان میں مدّت تک اس کے قائم مقام سکرٹری رہے۔ مہاتما گاندھی کی تحریک کے بعد وہ بائیں بازو کی جماعت سے جا ملے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مؤسسوں میں سے ایک تھے۔ کل ہند۔ خلافت کمیٹی کی مجلسِ عاملہ کے رکن، علی گڈھ ڈسٹرکٹ ہوم رول لیگ کے صدر، اور سترھویں صوبہ واری پولیٹیکل کانفرنس منعقدہ علی گڈھ ۱۹۱۷ء کی سواگت سبھا کے صدر رہے۔ آخری زمانے میں بالکل گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ کئی کتابیں تصنیف کیں اور بیسیوں سیاسی اور مذہبی مضامین لکھے۔ ۱۹۴۲ء میں وفات پائی اور اپنے مولد و مسکن دتاولی میں سپرد خاک ہوئے۔

ملا عبد القیوم مرحوم حیدرآباد کے مشہور مُلّا خاندان کے ممتاز رکن اور کئی رسالوں کے مصنّف، اپنے زمانے کے بڑے قوم پرستوں میں شمار کئے جاتے تھے۔

موجب کون امر ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی فلاح و بہبود کے لئے خود کوشش نہ کریں بلکہ دوسروں کی عنایت پر بھروسہ رکھیں اور اپنے جائز حقوق کے طلب کرنے سے صرف ایک خیالی نفع کی امید کی وجہ سے باز رہیں۔"

(اردوئے معلےٰ ستمبر ۱۹۰۷ء)

یہی وہ قومی خودداری اور قومی خود اعتمادی کا جذبہ تھا جس نے حسرت سے جنگ بلقان ۱۹۱۲ء کے دوران میں ایک تھرا دینے والی نظم کہلوانے پر مجبور کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بے کس ترکوں پر بلقانی ریاستوں نے یلغار کر دی تھی اور مغربی دول نے اُف تک نہ کی تھی، اور جب ہندی مسلمان جگہ جگہ جلسے کر رہے تھے اور برطانیہ کے ساتھ وفاداری کے مسئلے میں ایک دوسرے سے مسابقت کر رہے تھے نظم ملاحظہ کیجئے

غضب ہے کہ پابندِ اغیار ہو کر — مسلمان رہ جائیں یوں خوار ہو کر
سمجھتے ہیں سب اہلِ مغرب کی چالیں — مگر پھر بھی بیٹھے ہیں بے کار ہو کر
اُٹھے ہیں جفا پیشگانِ مہذب — ہمارے مٹانے پہ تیار ہو کر
تقاضائے غیرت یہی ہے عزیزو — کہ ہم بھی رہیں ان سے بیزار ہو کر
ابھی تم کو سمجھے نہیں اہلِ مغرب — بتا دو انھیں گرم پیکار ہو کر
فریب و دغا کے مقابل میں تم بھی — نکل آؤ بے رحم و خونخوار ہو کر

وہ ہم کو سمجھتے ہیں احمق جو حسرت
وفا کے ہیں طالب دل آزار ہو کر

اسی طرح چند برس بعد پہلی سنساری جنگ کے دوران میں جب حسرت فیض آباد جیل میں بند ہیں تو خبر آتی ہے کہ ۱۱ مارچ ۱۹۱۷ء کو ہندوستانی فوج کی مدد سے انگریزوں نے بغداد پر قبضہ کر لیا حسرت سے نہیں رہا جاتا اور وہ فریاد کرتے ہیں۔

درسِ حق جاری ہے یاں بھی حسرتِ آزاد کا
قید خانہ مدرسہ گویا ہے فیض آباد کا
کامیابی پر غضب نازاں ہیں اربابِ ہوس
ہر طرف اک شور ہے برپا مبارکباد کا
یہ بھی کیا انصاف ہے اے دشمنِ اہلِ وفا
ہم رہیں ناکام یوں اور کام ہو حساد کا
ٹوٹ جائے کیوں نہ ہمت عاشقِ ناکام کی
جب نتیجہ کچھ نہ نکلے کوششِ برباد کا
شاہ جیلانی سے حسرت عرض ہے اسلام کی
یوں نہ ہونا چاہئے تھا فیصلہ بغداد کا

اردوئے معلےٰ کو جاری ہوئے چار ہی سال ہوئے تھے کہ حسرت اور اُن کے رسالے کو ایک مصیبت سے دوچار ہونا پڑا۔ ۱۹۰۸ء برطانوی ہند کی تاریخ کا نہایت اہم سال تصور کیا جاتا تھا۔ اس لئے کہ اسی سال ہندوستان کے پہلے انقلاب کی جسے غدر کا نام دیا جاتا ہے پچاسویں سال گرہ تھی۔ اور حکومت معمولی سے معمولی تحریک کو بھی مشتبہ نظروں سے دیکھتی تھی کہ کہیں دوسرا غدر برپا نہ ہو جائے — اردوئے معلےٰ میں ایک مضمون مصری وطن دوست مصطفیٰ پاشا کامل اور برطانیہ کی پالیسی پر نکلا۔ جو غالباً حسرت کے ایک دوست اور علی گڑھ کالج کے ایک طالب علم فضل امین کے قلم سے تھا۔ مضمون کا لہجہ کچھ ایسا سخت نہ تھا۔ لیکن صوبے کے لفٹنٹ گورنر سر جان ہیوئیٹ اس پر تلے بیٹھے تھے کہ برطانوی حکومت کے ذرا سے اختلاف کو بھی سختی کے ساتھ دبا دیں۔ الغرض حسرت موہانی پر تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۴ (الف) کے بموجب مقدمہ قائم ہوا۔ اس مقدمے میں حسرت نے اپنے اعلیٰ کردار کا ثبوت دیا اور اصل لکھنے والے کا نام بتانے سے انکار ہی نہیں کیا بلکہ مضمون کی پوری ذمہ داری خود اپنے سر لے لی۔ اس زمانے کے سیاسی جمود کا ایک ادنیٰ کرشمہ یہ تھا کہ حسرت کو اپنے بچاؤ کے لئے کوئی وکیل مل سکا نہ بیرسٹر۔ چنانچہ دو تین ہی پیشیوں کے بعد انھیں دو سال کی قید با مشقت اور پانچ سو روپے جرمانے کی سزا کا حکم سنا دیا گیا۔ اس پر طرہ یہ کہ چونکہ انھوں نے جرمانہ ادا کرنے سے انکار کر دیا اس لئے ان کا انمول کتب خانہ محض ساٹھ روپے میں نیلام کر دیا گیا اور یہ ساٹھ روپے اُن کے جرمانے میں جمع کر لئے گئے۔ حسرت اپنی پہلی قید فرنگ کے متعلق لکھتے ہیں:-

۲۳ جون ۱۹۰۸ء کو اردوئے معلیٰ پر مقدمہ سڈیشن قائم ہوا اور ۴ اگست ۱۹۰۸ء کو دو سال قید سخت اور پانچسو روپیہ جرمانے کا حکم سنا دیا گیا ...... ہمیں مجسٹریٹ علی گڈھ کے ان احکام کی شکایت اب ہے نہ کبھی ہوگی ...... جب تک ہندوستان میں مجسٹریٹ خود ایک شخص پر الزام لگائیں گے اور وارنٹ جاری

کریں گے۔ پھر خود ہی اس پر انصاف کرنے بیٹھیں گے اُس وقت تک فوجداری مقدمات میں عموماً اور پولیٹیکل مقدمات میں خصوصاً انصاف یا رہائی کی اُمید رکھنا اول درجے کی حماقت ہے۔ ۔ ۔ ۔ پولیٹیکل مقدمات میں یورپین مجسٹریٹ کے دل میں بغض و کدورت کا پیدا ہونا ایسا قدرتی امر ہے جس کی نسبت ہم اسے الزام نہیں دے سکتے۔ ایڈیٹر اردوئے معلّیٰ کو الہ آباد جیل میں معمولی سے زیادہ سختی برداشت کرنا پڑی اور تقریباً سال بھر تک ایک من آٹا پیسنے کی سخت مشقت سے سابقہ رہا جو عام طور پر دیگر صوبوں میں ایک ماہ سے زیادہ نہیں لی جاتی ۔ ۔ ۔ ۔ ہم پولیٹیکل قیدیوں کی خوش قسمتی دیکھیے کہ جیل کے اندر ایک اور جیل میں رہنا پڑتا ہے یعنی ایک خاص اڈہ یا بعض اوقات ایک خاص کوٹھری کے علاوہ جیل میں ہی نہ کسی دوسری جگہ جا سکتے ہیں نہ کسی سے بات کر سکتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
مزید نگرانی کے علاوہ بالکل برہنہ کرکے تلاشی لینے کا اندیشہ رہتا ہے۔ فقیر نے مصداق

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں
اس اک عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

ان تمام باتوں کو برداشت کیا اور بے تکلف برداشت کیا۔ ۔ فقیر کے دل پر بھی ان واقعات و حالات کا ذرّہ برابر بھی اثر نہ ہوا۔ تمام مذکورہ بالا موانعات کے باوجود غزلیں دن بھر چکّی پیسنے کے اثنا میں کہی جاتی تھیں، اور بوقت شام ایک قیدی دوست سے لکھوا دی جاتی تھیں۔ جو بحیثیت پرقندا زنسبتاً زیادہ آزاد تھے اور مخصوص طور پر نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے کاغذ پنسل اپنے پاس چھپا کر رکھ لیتے تھے۔

مائۂ عشرتِ بے حد ہے غمِ قید وفا میں شناسا بھی نہیں رنجِ گرفتاری کا
جو رہیم نہ کرے شانِ توجہ پیدا دیکھو بدنام نہ ہو نام ستمگاری کا
کٹ گیا قید میں ماہِ رمضاں بھی حسرتؔ گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا
(اردوئے معلّیٰ اکتوبر ۱۹۰۹ء)

.. حقیقت یہ ہے کہ کوئی دوسرا ہوتا، ایسا جس کے آزادی کے راسخ عقیدے میں ذرا سا بھی تزلزل ہوتا تو کسی حالت میں

اس صعوبت کے دوران میں وہ شعر و سخن سے آشنا نہ ہوتا۔ رومانی قسم کی نظمیں اور تغزل تو اطمینان قلبی کی باتیں ہیں، اور یہ اطمینان ایک ایک من اناج پیسنے والے کو کہاں میسّر ہوتا ہے۔ مگر حسرت تو ایک طرف فدائے آزادی اور دوسری جانب فدائے مذہب تھے۔ اور قربانی کا جذبہ اُن کے رگ و ریشہ میں بھرا ہوا تھا کسی کے کلام میں اس سے زیادہ حقیقت نہ ہوگی جتنی حسرت کے ان اشعار میں۔

ہے مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقت بھی اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی
جو چاہے سزا دے لو تم اور بھی کھل کھیلو پر ہم سے قسم لے لو کی ہو جو شکایت بھی
اے شوق کی بیباکی وہ یہ تری خواہش تھی جس پر اسے غصّہ ہے انکار بھی حیرت بھی
ہر چند ہے دل شیدا حریت کامل کا منظور دعا لیکن ہے قیدِ محبت بھی

اس چکّی کی مشقت کے دوران میں حسرت نے جو مضمون آفرینی کی ہے وہ وطن دوستی اور حسن و عشق دونوں سے مملو ہے اور انسان عش عش کرنے لگتا ہے کہ ایک من اناج پیسنے والے کے لئے یہ علو ہمتی، یہ علو دماغی اور یہ رنگینی طبیعت کیسے میسّر ہوتی ہوگی۔

اوپر بیان کیا گیا ہے کہ سنہ ۱۹۰۵ء اور سنہ ۱۹۰۸ء کا زمانہ ایک بحرانی زمانہ تھا جس میں ہندوستانیوں اور انگریزوں دونوں کو بار بار ایسے عہد کی یاد تازہ ہوتی تھی حب ملک انگریزوں کا جُوا اُتار پھینک دینا چاہتا تھا۔ اس احساس کا اثر ملک کی سیاست پر پڑنا لازمی تھا، اور بال گنگادھر تلک، بپن چندر پال اور اروبند گھوش کی قیادت میں ایک ایسی پارٹی بن گئی جو محض "دستوری جدّوجہد" کی بجائے "راست عمل" یعنی انقلاب ہی کو ملک کی آزادی کے حصول کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان میں سب سے پیش پیش تلک تھے جن کا مشہور قول "آزادی میرا پیدائشی حق ہے۔ اور میں اسے لے کر رہوں گا" ہر شخص کی زبان پر چڑھا ہوا تھا۔ تلک نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ "اگر ہمارے گھر میں چور گھس آئیں اور ہم انھیں پکڑ نہ سکیں تو ہمیں چاہیئے کہ انھیں بند کرکے آگ دے دیں تاکہ اس آگ میں وہ بھسم ہو جائیں"۔ اس کے برعکس کانگریس کے ایسے لیڈر جیسے فیروز شاہ مہتہ، دین شاہ واچا، سریندر ناتھ بنرجی، ان کا کہنا تھا کہ ہمیں آہستہ آہستہ چلنا چاہیئے اور آئین و قانون کو نہیں

توڑنا چاہیئے۔ ۱۹۰۶ء میں کانگریس کے آدرش پر تقریر کرتے ہوئے بنگال کے بڑے ایڈوکیٹ اور سیاسی لیڈر رراش بہاری گھوش نے کہا تھا کہ "جس مقصد کے حصول کے لئے ہم جد وجہد کر رہے ہیں وہ سلطنت برطانیہ کے اندر سوراج ہے، اور ہم کبھی اس ملک کی مکمل آزادی کا خیال بھی نہیں لا سکتے"۔ اسی طرح جب شاہ جارج نے ۱۹۱۱ء کے دہلی دربار میں پہلی تقسیم بنگالہ کی تنسیخ کا اعلان کیا تو کانگریس نے اپنا اظہار تشکر گزاری ان الفاظ میں کیا تھا۔

"یہ کانگریس اپنے گہرے تشکر و امتنان کا اظہار کرتی ہے کہ بادشاہ سلامت نے اپنی مہربانی اور عنایت سے بنگالے کی تقسیم کے اصول میں ترمیم فرمادی ہے"۔ نیز یہ تو ہر سال کا معمول تھا کہ کانگریس کا پہلا رزولیوشن "ہز مجسٹی شہنشاہِ ہند کی خدمت میں اپنی عمیق وفاداری اور خیر سگالی" کے اظہار پر مشتمل ہو۔ حسرت موہانی کو اس "نرم" قسم کی پالیسی پر مطلق اعتماد نہ تھا۔ بلکہ وہ تلک، پال اور گھوش ہی کو بے دھڑک اپنا رہنما تسلیم کرتے تھے۔ ۱۹۰۸ء میں جب تلک پر ایک مضمون کے سلسلے میں جو انھوں نے اپنے مرہٹی اخبار کیسری میں لکھا تھا سڈیشن کا مقدمہ قائم ہوا اور انھیں چھ سال قید با مشقت کی سزا سنائی گئی تو حسرت پر اس کا بڑا اثر پڑا اور تلک کی مدح میں دو مشہور نظمیں لکھیں۔

(۱) آزادیٔ ہند کی خواہش کو مقبول خواص و عوام کیا
دل اہلِ ستم کے بیٹھ گئے وہ بال تلک نے کام کیا
سب ہند کے گرم اخباروں میں مضمون لکھے کیسے کیسے
جس سے کہ فرنگی ڈرتے تھے اس کام کو سر انجام کیا
ہو جور و جفا یا ظلم و ستم ہٹنے کے نہیں پیچھے کو قدم
جس نے یہ کہا دب جائیں گے ہم واللہ خیالِ خام کیا
بلونت تلک اے فخرِ وطن، اے جرم اسیر دام محن
یاد آئی تری جس دم فوراً حسرت نے جھک کے سلام کیا
(ستمبر ۱۹۰۹ء)

(۲)

اے تلک اے افتخارِ جذبۂ حبِ وطن — حق شناس و حق پسند و حق یقین و حق سخن
تجھ سے قائم ہے بنا آزادیٔ بیباک کی — تجھ سے روشن اہلِ اخلاص و وفا کی انجمن
تجھ سے لوگوں نے لیا خود اعتمادی کا سبق — ہو گئے مستغنیِ اعدائے محبانِ وطن
سب سے پہلے تجھ سے کی برداشت اے فرزندِ ہند — خدمتِ ہندوستاں میں کلفتِ قید و محن
ذات تیری رہنمائے راہِ آزادی ہوئی — تھے گرفتارِ غلامی ورنہ یارانِ وطن
تو نے خودداری کا پھونکا اے تلک ایسا فسوں — یا قلم جس سے خوشامد کی مٹی رسمِ کہن
خیرِ آزادی سے واقف ہو گئے پیر و جواں — مٹ گئی لوگوں کے دل سے ہیبتِ دار و رسن
تا زیں تیری پیروی پر حسرتِ آزاد کو
اے تجھے قائم رکھے تا دیر ربِّ ذو المنن
(دسمبر ۱۹۱۰ء)

عقیدت کا یہ پہلا جذبہ تلک کی موت تک برابر جاری رہا اور جب ۱۹۲۰ء کی ابتدا میں اُن کا انتقال ہوا تو حسرت نے اُن کے سوگ میں ایک نوحہ کہا جس کے مطلع ہی سے اُن کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔

ماتم نہ ہو کیوں بھارت میں بپا، دنیا سے سدھارے آج تلک
بلونت تلک، مہاراج تلک، آزادوں کے سرتاج تلک

ممکن ہے کہ بعض پڑھنے والے اگلے دو اشعار پر ناک بھوں چڑھائیں مگر اُن سے اس زبردست تعلقِ خاطر کا اظہار ہوتا ہے جو حسرت کو آنجہانی کے خیالات سے تھا۔

جب تک وہ رہے دُنیا میں رہا ہم سب کے دلوں پر زور ان کا
اب رہ کے بہشت میں نزدِ خدا روحوں پہ کریں گے راج تلک
ہر ہندو کا مضبوط ہے جی، گیتا کی بات ہے دل پہ لکھی
آخر میں جو خود بھی کہا ہے یہی پھر آئیں گے مہاراج تلک

ظاہر ہے کہ حسرت کے دوست یہ پسند نہ کرتے تھے کہ مستقل طور پر جیل خانے میں اپنا گھر بنا لیں۔ حسرت جیل سے نکلے تو اُنھوں نے ان کو یہ صلاح دی کہ مناسب ہے کہ اردوئے معلّٰی کی پالیسی کو بدل دیا جائے اور اسے ایک خالص ادبی ماہنامہ بنا دیا جائے۔ لیکن اگر حسرت حکومت کی علانیہ مخالفت کو نہیں چھوڑ سکتے تو اُنھیں چاہیئے کہ "انتہا پسندوں" کی بجائے "اعتدالیوں" کے ساتھ ہو جائیں۔ اس پر حسرت نے اکتوبر ۱۹۰۹ء کے اُردوئے معلّٰی میں "اردوئے معلّٰی کی پالیسی" کے عنوان سے ایک اداریہ لکھا اور اُس میں اپنے خیالات کا ان الفاظ میں اظہار کیا۔

"اردوئے معلّٰی کی دوبارہ اشاعت پر چند احباب نے یہ صلاح

دی کہ ہمیں پالیٹکس سے بالکل دست کش ہو جانا چاہیئے۔ بعض کا مشورہ تھا کہ اگر سیاسی مضامین ہوں بھی تو مسلم لیگ کی پالیسی کے موافق ہوں۔ چند دوستوں نے جو نسبتاً زیادہ آزاد خیال ہیں یہاں تک اجازت دی کہ اگر جمہوری ہند کی ہم خیالی منظور ہو تو کانگریس کے نرم فریق کی روش اختیار کی جائے ۔۔۔ مشکل یہ ہے کہ ہمارے خیال میں عقیدہ، قطع نظر اس کے کہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی، ایسی چیز ہے جس کو محض خوف اور مصلحت کے خیال سے ترک یا تبدیل کر دینا اخلاقی گناہوں میں سے ایک بدترین گناہ ہے ۔۔۔۔ ہم پالیٹکس میں مسٹر تلک اور سرگروہ احرار بابو اروبندو گھوش کی پیروی اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں۔"

حسرت اسی سلسلے میں ہندوستان کی زبوں حالی کی بابت اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں اور اپنی انتہائی رجائیت اور بالغ نظری کا ثبوت دیتے ہیں۔

"دنیا کی رفتار اور اہلِ دنیا کے طبائع کا میلان صریحاً حریت کی جانب ہے۔ چنانچہ خوابیدہ برِّ اعظم ایشیا میں بھی ہندوستان کے سوا اور کوئی بڑا ملک اس وقت آزادی کی نعمت سے محروم نہیں ہے۔ پس عقلِ سلیم کسی طرح باور نہیں کر سکتی کہ تمام عالم میں صرف ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس کی قسمت میں محکومیِ دوامی کی ذلت لکھ دی گئی ہو ۔۔۔ غرض کہ اربابِ دانش و بینش کو یہ بات ماننی پڑے گی کہ فرنگی حکومت کا غیر طبعی نظام ہمیشہ کے لئے ہندوستان میں باقی نہیں رہ سکتا اور اپنی موجودہ صورت میں تو اس کا چند سال بھی قائم رکھنا دشوار نظر آتا ہے ۔۔۔ گرم فریق کے رہنما ۔۔۔ اپنی تمام پولیٹیکل کوششوں میں مذکورہ بالا اصول کو پیشِ نظر رکھتے ہیں اس لئے وہ ہمارے نزدیک حق پر ہیں۔ برخلاف اس کے رہنمایانِ فریقِ نرم، پیروانِ مسلم لیگ، اور بانیانِ ہندو کانفرنس اہلِ ہند اور دوامی محکومی کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ان حضرات کے نزدیک ہمارے انتہائی عروج کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ ہم غلام سے ترقی یافتہ غلام یا محکوم سے خوش حال محکوم ہو جائیں۔"

ان خیالات کو لے کر حسرت زیادہ دن تک جیل سے باہر نہیں رہ سکتے تھے۔ جیل میں اُن پر جو پابندیاں لگائی گئیں اُن کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ان کے والد نے اُن سے جیل میں ملنا چاہا تو اس کی انھیں اجازت نہیں ملی۔ جب وہ زیادہ علیل ہوئے اور گویا بسترِ مرگ پر دراز ہوئے تو حسرت کو ان کی علالت کی اطلاع نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ اُن کے انتقال کی بھی اُس وقت خبر ہوئی جب حسرت اپنی قید بھگت کر جیل سے باہر نکلے۔ اسی دوران میں

"الہ آباد کے جیل والوں نے میری عینک کو داخل دفتر کر کے بے دست و پائی کو ایک درجہ اور بڑھا دیا۔ ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر۔ جیلر صاحب کا ۔۔۔ ارشاد ہوا کہ اگر یہاں ٹھیک طور پر نہ رہو گے تو بیمار بنا کر اسپتال بھیج دئے جاؤ گے اور وہیں مار کر خاک کر دئے جاؤ گے۔" (اردوئے معلّٰی مارچ سنہ ۱۹۱۱ء)

اس انتہائی پریشانی کے عالم میں حسرت غزلوں پر غزلیں اور نظموں پر نظمیں کہتے ہیں۔ قید خانے میں کہی ہوئی دو نظموں کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

(۱) اچھا ہے اہلِ جور کئے جائیں سختیاں — پھیلے گی یونہی شورشِ حبِّ وطن تمام
سمجھے ہیں اہلِ شوق کو شایدِ فریبِ مرگ — مغرب کے یونہی جمع ہیں زاغ و زغن تمام

(۲) صبر مشکل ہے صبر ہے دشوار — دل وحشی ہے اور جنونِ بہار
دلِ عشاق میں اُمید کے جام — بادۂ اشتیاق کے سرشار
غیر ممکن ہے ہم سے طاعتِ غیر — اے جفاکار اے غریب آزار

روح آزاد ہے خیال آزاد
جسمِ حسرت کی قید ہے بے کار

(باقی)

جوشؔ ملسیانی

دو غزلیں

یاس میں لب پر اب فغاں بھی نہیں
آگ ایسی بجھی دھواں بھی نہیں

جس چمن میں تھا آشیاں اپنا
اب وہاں خاکِ آشیاں بھی نہیں

کیوں کیا دَیر سے حرم کا سفر
تو وہاں بھی نہ تھا یہاں بھی نہیں

عہد و پیماں کا اعتبار کسے
ہم سمجھتے ہیں ان کی ہاں بھی نہیں

حالِ رسوائیِ وفا کا نہ پوچھ
اب تو وہ قابلِ بیاں بھی نہیں

کیا کرے کوئی جستجو اس کی
جو عیاں بھی نہیں نہاں بھی نہیں

وقتِ آخر تو حالِ دل سن لو
ہم نہیں تو یہ داستاں بھی نہیں

تیرا دیدار گو نہیں ارزاں
جان و دل کے عوض گراں بھی نہیں

کیوں نہ دل مفت اُن کو دے ڈالوں
سود اگر کچھ نہیں زیاں بھی نہیں

حُسن نے سحر کر دیا کیسا
جَور پر جَور کا گماں بھی نہیں

شاعری جنسِ کس مپرس ہے جوشؔ
باوجود اس کے رائگاں بھی نہیں

وعدہ بھی دردِ دل کا سہارا نہ ہو سکا
بے چارگی کا ایک بھی چارا نہ ہو سکا

غم بھی ترا ہی غم ہے خوشی بھی تری خوشی
دونوں میں ایک بھی تو ہمارا نہ ہو سکا

مشقِ وفا سے بھی نہ ہوا فائدہ کوئی
ترکِ وفا بھی ہم کو گوارا نہ ہو سکا

صحرا سے اے جنوں مجھے انکار تو نہیں
لیکن اگر وہاں بھی گزارا نہ ہو سکا

یہ جانتے ہوئے بھی کہ بے سود ہے فغاں
خاموش تیرے درد کا مارا نہ ہو سکا

بے گانہ ہی رہا دلِ بے گانگی پسند
کم بخت ایک دن بھی ہمارا نہ ہو سکا

نکلا ہوں بوئے گل کی طرح چھوڑ کر چمن
پھولوں کی شوخیوں میں گزارا نہ ہو سکا

وہ قطرہ کیا صدف میں جو گوہر نہ بن سکا
وہ ذرّہ کیا جو آنکھ کا تارا نہ ہو سکا

صدمہ شکستِ عہد کا شاید نہیں بھی ہے
قول و قرار پھر جو دوبارا نہ ہو سکا

ہوتا نہ کیوں وقارِ محبت کنارہ کش
اہلِ ہوس میں رہ کے گزارا نہ ہو سکا

اے جوشؔ عرضِ حال پہ نادم ہوں اس قدر
کہنے کا حوصلہ بھی دوبارا نہ ہو سکا

اسرار احمد آزاد

کینیا کا مسئلہ

کینیا براعظم افریقہ کے مشرقی ساحل پر واقع ہے، اور اس تاریک براعظم کے دوسرے بہت سے علاقوں اور خطوں کی طرح ہمیں اس چھوٹے سے علاقے کے متعلق بھی کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں تھیں لیکن ۱۹۵۲ء کے آخری چند ماہ میں کینیا نے دنیا بھر کی توجہ کو اپنی جانب منعطف کر لیا۔ اور اُس وقت سے اِس وقت تک کچھ ایسے واقعات پیش آتے رہے ہیں جن کی بدولت کینیا کا مسئلہ روز بروز اہم اور پیچیدہ تر ہوتا جا رہا ہے، اور اپریل میں اس ملک کے رہنما جُومو کنیاٹا کو سات سال کی سزائے قید دئے جانے، نیز "کینیا افریکن یونین" کے جنرل سکریٹری مسٹر جوزف مورمبی کے ہندوستان آنے کے باعث نہ صرف کینیا کے مسئلے کی اہمیت میں اضافہ ہی ہوا ہے بلکہ کینیا سے متعلق پیش آنے والے واقعات اور خود کینیا میں رونما ہونے والے حالات، مشرق کے نو آزاد اور نیم محکوم ممالک کے باشندوں کے لئے دعوتِ غور و فکر کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد دنیا کی تمام محکوم اور نیم محکوم اقوام میں اپنی اقتصادی اور معاشی بدحالی کی بدولت قومی آزادی اور خودمختاری کا جو احساس پیدا ہوا ہے تاریک براعظم کے باشندوں کا ذہن بھی اس احساس سے خالی نہیں رہا اور آج اس براعظم کے ایک چھوٹے سے علاقے کینیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کینیا کے باشندے خواب سے بیدار ہو گئے ہیں لیکن حکمراں کی ساحری اور قوت و طاقت انھیں پھر سلا دینا چاہتی ہے۔ لیکن کینیا کے مسئلے کو سمجھانے یا سمجھنے کے لئے اسی قدر کہہ دینا کافی نہیں ہو سکتا بلکہ اس اجمال کی تفصیل بھی ضروری ہے۔

عام حالات

کینیا کا رقبہ دو لاکھ پچیس ہزار مربع میل ہے اور اس طرح یہ ملک فرانس سے بڑا واقع ہوا ہے۔ اس وقت ہمارے روبرو جو اعداد و شمار موجود ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۴۸ء کی مردم شماری کے مطابق کینیا کی مجموعی آبادی ۵۳۷۳۰۷۸ افراد پر مشتمل ہے جن میں ۵۲۱۸۳۳۲ حبشی ۹۰۵۲۸ ہندوستانی اور ۲۹۶۶۰ یوروپین شامل ہیں۔

کینیا کا تقریباً ۳/۵ حصہ نیم ریگستان واقع ہوا ہے اور چونکہ اس ملک کا جنوبی ساحلی علاقہ بہت زیادہ زرخیز ہے اس لئے ملک کے باشندوں کی تمام تر اقتصادی زندگی اسی حصے کے ساتھ وابستہ ہے۔ کینیا کا انتظامی مرکز شہر نیروبی ہے۔ اس شہر کی آبادی ۱۱۹۴۸۹ افراد پر مشتمل ہے۔ نیروبی کے علاوہ ممباسہ اور نکورو دو اور بڑے شہر ہیں۔ ممباسہ کی آبادی ۸۴۷۴۶ افراد پر مشتمل ہے۔ یہ شہر بندرگاہ اور صنعتی مرکز بھی ہے اور نکورو کو ان یورپی باشندوں کا مستقر سمجھا جاتا ہے جو کینیا میں زراعت اور باغبانی کرتے ہیں۔

نظم و نسق

انتظامی نقطۂ نظر سے کینیا دو حصوں یعنی علاقۂ زیر حمایت اور نوآبادی میں منقسم ہے۔ علاقۂ زیر حمایت مجمع الجزائر لامو نیز دس دس میل عریض قطعۂ ارض پر مشتمل ہے۔ جو ٹانگانیکا کی سرحد سے شروع ہو کر بحر ہند کے ساحل کے ساتھ کپنسی تک چلا گیا ہے اور باقی ماندہ ملک نوآبادی سمجھا جاتا ہے۔

انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں کینیا پر تسلط حاصل کرنے کے لئے جرمنی اور برطانیہ کے درمیان ایک خوں ریز تصادم رونما ہوا تھا۔ جس کے نتیجے میں ۱۸۹۰ء میں فریقین کے درمیان جو معاہدہ ہوا اُس کی رو سے برطانیہ نے بحر شمالی میں واقع اپنا مقبوضہ جزیرہ ہیلیگولینڈ جرمنی کے حوالے کر دینے کے علاوہ ٹانگانیکا پر جرمنی کے استحقاق کو بھی تسلیم کر لیا تھا اور جرمنی نے کینیا اور یوگنڈا کو برطانیہ کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ اس طرح

کینیا پر قابض ہو جانے کے بعد ۱۹۲۰ء میں برطانیہ نے کینیا کے اس علاقے کے علاوہ جیسے سلطان زنجبار کی مملکت میں شامل سمجھا جاتا تھا اور جو برطانیہ کا زیرِ حمایت علاقہ تھا ملک کے باقی ماندہ حصّے کو نوآبادی قرار دے دیا۔

بہر حال جہاں تک نظم و نسق کا تعلق ہے علاقہ زیرِ حمایت اور نوآبادی کے نظم و نسق میں کوئی فرق موجود نہیں۔ دونوں حصّے ایک گورنر کے ماتحت ہیں۔ جسے حکرانِ برطانیہ کی طرف سے مقرر کیا جاتا ہے۔ گورنر کی ایک مجلسِ عاملہ ہوتی ہے اور اس مجلس کے اراکین کو حکومت کے مختلف شعبوں کا ذمّہ دار سمجھا جاتا ہے۔ کینیا میں ایک مجلسِ قانون ساز بھی موجود ہے جس کے کچھ اراکین کو گورنر نامزد کرتا ہے اور باقی ماندہ کینیا میں آباد یورپی افراد کی رائے سے منتخب کئے جاتے ہیں۔ لیکن مجلس کے منظور کردہ تمام قوانین گورنر کی توثیق کے بعد ہی نافذ ہو سکتے ہیں۔

اقتصادی حالات

کینیا ایک زرعی ملک ہے۔ وہاں ایک خاص قسم کی گھاس پیدا ہوتی ہے جس سے مضبوط رسّے بٹے جاتے ہیں۔ گندم، کپاس، عاقر قرحا، مونگ پھلی اور نیشکر کی کاشت کی جاتی ہے اور چند ایسے کارخانے بھی قائم ہو چکے ہیں جن میں ملک کی زرعی پیداوار کو غیر ممالک میں بھیجنے کے قابل بنانے کے علاوہ جوتے اور اسی قسم کی چند اور اشیا بھی تیار کی جاتی ہیں۔ کینیا میں سونے تانبے نمک اور مینگانیز کے ذخائر بھی دریافت ہوئے ہیں۔ لیکن ابھی ان معدنی ذخائر کو برآمد کرنے کا کوئی معقول انتظام نہیں کیا گیا مختصر یہ کہ کینیا کے باشندوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے اور ان کی اسی اقتصادی اور معاشی بدحالی نے انھیں قومی آزادی کے حصول کی اس جدوجہد پر آمادہ کیا ہے جو روز بروز شدت اور وسعت اختیار کرتی جا رہی ہے۔

اراضی کی غیر منصفانہ تقسیم

جیسا کہ سطورِ بالا میں بتایا جا چکا ہے کینیا ایک زرعی ملک ہے اور اس اعتبار سے اس کے باشندوں کی اقتصادی اور معاشی زندگی کی بہتری یا ابتری کا تمامتر انحصار آراضی کی تقسیم ہی پر ہے۔ اور آج کینیا میں آراضی کی تقسیم ہی کے مسئلے نے موجودہ نازک ترین صورت اختیار کر رکھی ہے۔

کینیا میں اراضی کے سوال کی اہمیت کا اندازہ صرف اس بات سے بخوبی کر لیا جا سکتا ہے کہ اس وقت کینیا کے مقامی باشندوں کے قبضے میں دو کروڑ پچھتّر لاکھ ایکڑ زمین ہے اور صرف تیس ہزار برطانوی نوآبادکار ۱۸ لاکھ ایکڑ بہترین قابلِ کاشت آراضی پر قابض ہیں۔ پھر اسی قدر نہیں بلکہ بعض برطانوی زمیندار ایک ایک لاکھ سے لے کر ساڑھے تین تین لاکھ ایکڑ زمین کے مالک ہیں۔ اور مقامی باشندوں کی کاشت کو بعض ایسے مخصوص علاقوں میں محدود کر دیا گیا ہے جہاں بیشتر آراضی بنجر اور ناقابلِ کاشت ہے۔ "کراؤن لینڈ آرڈینینس" (اراضی سے متعلق ہنگامی شاہی حکم) کی رو سے مقامی لوگوں کو زرخیز علاقوں میں زمین حاصل کرنے کی اجازت نہیں اور ۱۹۲۰ء سے انھیں ان کی مقبوضہ زرخیز آراضی سے بے دخل کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ کینیا کے مشہور قبیلہ کیکو یو کو کم و بیش آٹھ سال قبل جو زمین دی گئی تھی وہ واپس لے لی گئی ہے۔ ایسی تمام آراضی برطانوی نوآبادکاروں کے حوالے کر دی جاتی ہے اور ان برطانوی نوآبادکاروں کی مالی امداد کے لئے ایک فنڈ بھی قائم ہے۔

آراضی سے محروم ہو جانے کے بعد مقامی باشندے غیر ملکی نوآبادکاروں کے یہاں مزدوری کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پھر اسی قدر نہیں بلکہ ان مقامی باشندوں پر گراں قدر محاصل بھی عاید کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ گذشتہ سال کینیا کے انگریزی اخبار "ایسٹ افریکن اسٹینڈرڈ" نے لکھا تھا کہ ——— ہمارا خیال ہے کہ مقامی باشندوں پر گراں قدر محاصل عاید کرنے کے بعد ہی انھیں (ذاتی کاشت) چھوڑنے اور مزدوری کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ مقامی باشندوں کی زندگی کے مصارف کو بڑھانے کا یہی ایک طریقہ ہے اور جیسا کہ اس سے پہلے بھی بتایا جا چکا ہے اسی ایک بات پر زیادہ سے زیادہ مزدور ملنے اور انھیں کم سے کم اجرت دیئے جانے کے مسئلے کا انحصار ہے ——— اور ان مزدوروں کو جو اجرت دی جاتی ہے وہ عموماً ۲ شلنگ سے ۱۰ شلنگ ماہوار تک ہوتی ہے۔ اور خاص حالات میں دو پاؤنڈ ماہوار سے زیادہ نہیں ہوتی۔

اقتصادی پراگندگی کے اثرات

غیر ملکی نوآبادکاروں کی اقتصادی حکمتِ عملی کی بدولت کینیا کے مقامی باشندے جس معاشی بدحالی میں مبتلا ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنی مخصوص بستیوں میں ہی رہنے پر مجبور ہیں۔ نرسلوں۔ پھونس اور مٹی سے بنے ہوئے ان کے جھونپڑے تاریک اور مرطوب ہوتے ہیں۔ ان کی بستیاں متعدی امراض کا گہوارہ بنی رہتی ہیں۔ تپِ دق کا مرض عام ہے ان بستیوں کی کم و بیش ۳۰ فی صد آبادی ملیریا میں مبتلا رہتی ہے؛ اور کم و بیش ۸۰ فی صد بچوں کے لئے ابتدائی تعلیم کا بھی کوئی انتظام نہیں اور

آج جب کہ آفتابِ علم کی روشنی دنیا کے ہر گوشے تک پہونچتی جا رہی ہے ، تاریک براعظم کا یہ گوشہ بدستور تاریک ہے ۔ لیکن انسان کے ذہن میں اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کے مسلط کردہ افلاس اور خود اپنی محکومیت اور بے چارگی کے احساس سے زندگی اور آزادی کا جو شعور بیدار ہوتا ہے علم اس شعور کو تیز تر تو بنا سکتا ہے لیکن اسے بیدار کرنے کے لئے علم درکار نہیں ہوتا ، اور آج کینیا کے باشندوں میں زندہ رہنے کے لئے جد وجہد کرنے کا جو احساس پیدا ہوا ہے وہ بھی بالادستوں کے غیر انسانی طرزِ عمل ہی کا مرہونِ منت ہے ۔

شہری اور سیاسی حقوق

کینیا کے مقامی باشندے ان تمام شہری اور سیاسی حقوق سے یکسر محروم ہیں جنھیں انسانیت کے بنیادی حقوق تصور کئے جاتے ہیں ، اور جو ادارہ اقوامِ متحدہ کے منشورِ حقوقِ انسانی میں تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں ۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کینیا میں مجلسِ قانون ساز موجود ہے جس میں مقامی باشندوں کے صرف چار نمائندے شامل ہوتے ہیں ۔ لیکن انھیں رائے عامہ سے منتخب نہیں کیا جاتا بلکہ گورنر نامزد کرتا ہے اور کینیا پر امتیازِ رنگ و نسل کی لعنت بھی مسلط ہے ۔

جہاں تک مقامی باشندوں کے شہری حقوق کا تعلق ہے اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ حکام ان سے ہر وقت بیگار لے سکتے ہیں اور انھیں اُن کی مرضی کے خلاف مزدوری کرنے کے لئے ملک سے باہر بھی بھیجا جا سکتا ہے ۔ مثلاً جنوری ۱۹۵۲ء میں جب مصری مزدوروں نے نہر سوئز کے علاقے میں برطانیہ کے لئے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا تو کینیا کے باشندوں کو اس علاقے میں کام کرنے کے لئے بھیج دیا گیا تھا ۔

قومی آزادی کی تحریک

کینیا میں وہاں کے حکمراں تفصیل بالجبر کی جس حکمتِ عملی پر کاربند رہے ہیں کینیا کے باشندوں نے کسی زمانے میں بھی اسے قابلِ برداشت تصور نہیں کیا ، اور اگرچہ یہاں اہلِ کینیا کی اس جد وجہد کو تفصیل کے ساتھ پیش کرنے کی گنجائش نہیں جو وہ اس صدی کے آغاز ہی سے مذکورہ بالا حکمتِ عملی کے خلاف کرتے رہے ہیں ۔ لیکن ۱۹۲۳ء سے ۱۹۴۴ء تک کینیا میں حکام کے طرزِ عمل کے خلاف احتجاج کے طور پر چار مرتبہ جو زبردست ہڑتالیں ہو چکی ہیں وہ اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ کینیا کے باشندے کسی زمانے میں بھی اس حکمتِ عملی سے مطمئن نہیں ہو سکے ۔

بہرحال دوسری عالمگیر جنگ کے بعد سے کینیا کے باشندوں کی قومی آزادی کی تحریک میں بھی شدت اور وسعت پیدا ہوتی جا رہی ہے اور اس تحریک کی قیادت کینیا کے باشندوں کی انجمن "کینیا افریقن یونین" کر رہی ہے ۔

"کینیا افریقن یونین" کی زمامِ قیادت اعتدال پسند رہنماؤں کے ہاتھوں میں ہے ، اور اس کے مطالبات کا خلاصہ یہ ہے کہ ———

انگریز نو آبادکاروں کی امداد کے لئے جو فنڈ قائم ہے اس میں سے افریقی کاشتکاروں کو بھی حصولِ اراضی کے لئے امداد دی جائے ۔ مزدوروں کو مناسب اجرتیں دی جائیں ۔ ٹریڈ یونینوں کی تنظیم کا حق تسلیم کیا جائے متشدّدانہ قوانین کو منسوخ کر دیا جائے ۔ مجلس قانون ساز میں اصل باشندوں کے نمائندوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے ۔ بچوں کی تعلیم کا معقول انتظام کیا جائے ، اور مقامی باشندوں کی صحت اور تندرستی کی طرف حکومت کا محکمہ صحت جس مجرمانہ غفلت کا ثبوت دے رہا ہے اُسے دور کیا جائے ، اور اس میں شک نہیں کہ مذکورہ بالا مطالبات میں "کینیا افریقن یونین" کو عوام کی کامل تائید اور حمایت حاصل ہے ۔ یہ انجمن ابتدا ہی سے قانون کی حدود میں رہ کر حصولِ مقاصد کی جد وجہد کرتی رہی ہے ۔ لیکن اس کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئی ہیں ۔

"ماؤ ماؤ"

کینیا کی قومی آزادی کی تحریک آج ایک ایسے دور سے گزر رہی ہے جس نے ایک طرف تو اُسے دنیا کے اہم اور پیچیدہ ترین مسائل میں سے ایک مسئلہ بنا دیا ہے اور دوسری طرف اس کے متعلق رائے عامہ میں کسی قدر اختلاف بھی پیدا کر دیا ہے ۔ مثلاً ہندوستان جہاں تک کینیا کے باشندوں کی قومی آزادی کے مطمح نظر سے متفق الرائے ہے وہاں تشدّد کی اس تحریک کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے جسے ماؤ ماؤ کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے ۔

اس وقت تک ہمیں "ماؤ ماؤ" کے متعلق جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ ——— ماؤ ماؤ کینیا کے دہشت انگیزوں کی ایک خفیہ جماعت ہے جس کا تشدد کے ذریعے سے کینیا میں مقیم تمام سفید فام باشندوں کو ملک سے نکال دینا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ کینیا کے باشندوں اور کینیا کے حکمرانوں کے مابین نئی کش مکش کا یہ سلسلہ گذشتہ سال کے اواخر میں شروع ہوا تھا اور اس سے قبل برطانوی اخبارات نے کینیا کے دہشت انگیزوں کی سرگرمیوں کے متعلق اطلاعات شائع کی تھیں۔ لیکن ان اطلاعات کی اشاعت کے بعد کینیا کے محکمۂ انصاف اور امن کے ذمہ دار رکن نے مجلس قانون ساز کے روبرو جو بیان دیا تھا اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ ——— گزشتہ پانچ سال کی مدّت میں کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا جسے جرائم کی فہرست میں اضافہ قرار دیا جا سکے۔

بہرحال اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ستمبر ۱۹۵۲ء میں کینیا کی مجلس قانون ساز نے جو ایسے قوانین مرتب اور منظور کئے تھے جس کا مقصد ملک کو دہشت انگیزوں کی سرگرمیوں سے محفوظ رکھنا تھا۔ ان قوانین کی رُو سے کینیا کی تمام سیاسی جماعتوں کو خلاف قانون قرار دیدیا گیا ہے حتیٰ کہ کینیا افریقن یونین کے تمام رہنما بھی مقید ہیں اور آج کینیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ عمل اور ردعمل کے قدرتی قانون پر مبنی ہے۔

کیکویو قبیلہ کا جرم

کینیا کی قومی آزادی کی تحریک اور جد و جہد میں سب سے زیادہ نقصان کیکویو قبیلہ کو برداشت کرنا پڑا ہے۔ یہ قبیلہ کم و بیش دس لاکھ افراد پر مشتمل تھا اور اراضی سے بے دخلی کے باعث چونکہ اسی قبیلے کو سب سے زیادہ نقصان بھی برداشت کرنا پڑا تھا۔ اس لئے آراضی کی صحیح تقسیم کے مطالبہ میں بھی اس قبیلے کے افراد پیش پیش رہے تھے۔ چنانچہ کینیا کی سیاسی جماعتوں کو منتشر کرنے کے بعد حکام نے تقریباً اس تمام قبیلے کو "ماؤ ماؤ" کے ساتھ وابستہ قرار دے دیا۔ اس کے ہزارہا افراد کو گرفتار کر لیا گیا اور جو لوگ خوف زدہ ہو کر جنگلوں میں روپوش ہو گئے اُن کی بستیوں کو تباہ کر دیا گیا اور جو چیز ہاتھ لگی اسے ضبط کر لیا گیا۔

یہ ہے کینیا کی قومی آزادی کی جد و جہد کی مختصر داستان۔ اس داستان کو بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس بات سے تو اختلاف کیا کیا جا سکتا ہے کہ کسی نہ کسی وجہ سے اس تحریک میں تشدد کا عنصر داخل ہو گیا ہے۔ لیکن اس بات سے انکار کی ذرا سی بھی گنجائش موجود نہیں کہ کینیا کے باشندوں کے تمام مطالبات حق پر مبنی ہیں اور انھیں صرف اس بنا پر محکوم نہیں رکھا جا سکتا کہ وہ تعلیم سے محروم یا سیاہ فام واقع ہوئے ہیں۔ اور آج کینیا کا مسئلہ ایک ایسا مسئلہ بن گیا ہے جسے بقائے امن عالم سے تعلق رکھنے والے جملہ مسائل میں داخل کیا جا سکتا ہے۔

مُلکی معلومات

بھارتی ریلوں کے محاصل مرکزی اور صوبائی سرکاروں کی مجموعی آمدنی کا ۳۴ فی صدی حصّہ ہیں۔

۱۹۵۱ء کے اختتام پر بھارت میں بیمہ زندگی کے کاروبار میں ۷ ارب ۹۲ کروڑ ۹۴ لاکھ روپیہ لگا ہوا تھا۔ پالیسیوں کی تعداد ۳۴ لاکھ ۱۴ ہزار تھی جن کے پریمیم سے ۳۹ کروڑ ۷۴ لاکھ روپیہ کی آمدنی تھی۔

۱۹۴۶-۴۷ء میں بھارت میں ۵۴ لاکھ ۲۰ ہزار ایکڑ زمین میں ترقی یافتہ اقسام کی روئی کاشت کی گئی جبکہ ۱۹۵۱-۵۲ء میں ۸۷ لاکھ ۷۰ ہزار ایکڑ رقبہ زمین میں مندرجہ بالا اقسام کی روئی کاشت کی گئی۔

۱۹۵۱ء میں بھارت میں ۸۵۹ ٹن سیسہ حاصل ہوتا تھا جو کہ ۱۹۵۲ء میں بڑھ کر ۱۱۳۲ ٹن ہو گیا۔

۱۹۵۱-۵۲ء میں مرکزی اکسائز ڈیوٹی سے ۸۴ کروڑ روپیہ وصول ہوا۔ اس کی وصولی پر ۲ کروڑ ۸۳ لاکھ ۵۴ ہزار روپیہ صرف ہوا۔

اظہر علی فاروقی

"کالی ماتا" کے چرنوں میں

بنگلا منسا منگل

ونگ پردیش (بنگال) نجانے کتنی مذہبی تحریکوں کا گہوارہ رہا ہے آریوں سے بہت پہلے بھی یہاں ریت رواج، سماج اور دھرم کی کوئی نہ کوئی صورت تھی۔ آریوں نے اس غیر آریائی تہذیب و تمدن کو توڑا پھوڑا اور اس کے سامنے سماج اور دھرم کی دوسری مورتیاں بٹھائیں۔ ویدوں کی رچنا کی۔ ہمیں اس سے سردست کوئی مطلب نہیں کہ ان غیر آریائی قوموں کی تہذیب آریائی تہذیب سے بلند تھی یا پست۔ اور نہ اس سے غرض ہے کہ پنڈت ہزاری پرشاد دویدی راہل سانکرتیاین اور ڈاکٹر رام بلاس شرما کا یہ خیال کہاں تک صحیح ہے کہ غیر آریائی تہذیب و تمدن اور دھرم آریائی تہذیب و تمدن سے زیادہ اجاگر تھا۔ بہرحال کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہاں دھرم تھا۔ ریت رواج تھے اور تہذیب و تمدن۔ دھان کے انہی لہلہاتے کھیتوں میں مہاتما گوتم بدھ کے وہ مدھر بول گونجے جن میں دھرم کرم دھرم کرو دھرم کی دو ند میاؤ کی سیکھ تھی۔ جن بولوں نے انسان کو نروان کی راہ دکھائی۔ سوامی مہاویر کے نرم و نازک گیت اور رسیلے راگ ونگ باسیوں کے لیے روحانی غذا بنے۔ سوامی شنکر اچاریہ، سوامی رامانج چیتنیہ دیو کے نصیحت آمیز بول ان کے روحانی مقولے۔ ونگ پردیش کے ناریلوں کی چھاؤں میں زگن اور کدم کے خوشنما پھولوں کی خوشبو میں۔ دھان کے سرسبز کھیتوں میں جوٹ اور پٹ سن کی رگند ھ میں نشو ونما پاتے رہے۔ سورج نکلتا رہا اور چاند ڈوبتا رہا۔ نجانے کتنے دھرم آئے اور گئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ونگ باسیوں کا جیون۔ مرن۔ بیاہ برات، ہاٹ پینٹھ میلے ٹھیلے، تیوہار، خوشی و غم حتیٰ کہ آپس کا میل جول، بات چیت، آنا جانا ربط ضبط، اختلاط و محبت سب پر دھرم نے اپنی گہری چھاپ لگا دی۔ دھرم نے ریت رواج دئے روایات ترکے میں چھوڑیں۔ راج نیتی بخشی غرضیکہ ونگ باسی سماج پر دھرم کا نہ صرف ہاتھ تھا بلکہ بے پناہ زبردست اور بہت اونچا۔

اونچائی کا تو یہ عالم تھا کہ ونگ باسی جتنا پھوس اور ناریل کے پتوں کے بنے ہوئے جھونپڑوں میں رہتی رہی مگر دھرم کے لئے اس نے سدا پکی اینٹوں کا گھر بنایا۔ مندر، دیو ستھان اور آشرم چونے کی سفیدی سے اجاگر ہی رہے خود ننگے بدن رہے لیکن بھگوان کی مورتی سونے چاندی سے لدی رہی۔ وہ خود بھوکے پیٹ رہ سکتے تھے مگر بھگوان کے بھوگ میں کمی نہیں کی۔ دھرم کے ٹھیکے داروں، پروہتوں، مہنتوں کے پیٹ بھرنے کی فکر۔ ان کے افکار زندگی میں پیش پیش رہی۔

جب سارے سماج کی یہ کیفیت ہو تو پھر بھلا آرٹ اور کلا مذہبی اثرات سے اپنا دامن کیوں کر بچا سکتا تھا۔ جوتشیوں کا وجود صرف اس لئے قابل قدر تھا کہ وہ یہ بتا سکیں کہ دیوی دیوتاؤں پر کب "بلی" چڑھائی جائے۔ جیومیٹری کی افادیت اس لیے اہمیت رکھتی تھی کہ اس کے ذریعے سے معلوم کیا جا سکتا تھا کہ "بلی بیدی" (قربان گاہ) کا سائز کیا ہو اور شاعر کی تخلیق صرف اس لئے ہوتی کہ وہ دیوی دیوتاؤں کی تعریف میں بھجن گڑھ سکے جسے مندروں میں گایا جا سکے۔ ایسے بھجن اور گیت اس خطے کی مقبول ترین پیداوار رہے ہیں اور آج ونگ پردیش کے غریب بھوکے کسانوں کے لئے یہ گیت روحانی غذا ہیں۔

ایسا کیوں ہے؟ صرف اس لئے کہ مذہب کے ٹھیکے داروں نے بھولے بھالے عوام اور سادہ لوح دہقانوں کو کچھ شخصیتیں ہی نہیں بخشیں، بلکہ ان کے ساتھ دیہاتیوں کی زندگیوں کی بیم و رجا وابستہ کر دی۔ آشا اور نراشا کے دور رہے ہے پر یہی شخصیتیں ان کا سہارا رہیں۔

ل ڈاکٹر دنیش چندر سین

دکھوں کے اندھکار میں یہی ان کے دیپک ہیں۔ منسا اگر انہیں سانپ بچھوؤں اور کچھاروں کے دوسرے حشرات الارض سے محفوظ رکھ سکتی تھیں۔ تو درگا اور لکشمی انہیں دھن دولت بخش سکتی تھیں اور ان پورنا پیٹ کی جوالا بجھانے کے لئے ان کالی کا غصہ اگر انہیں موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا تو چنڈی کی مہربانیاں ان کا دکھ درد دور کر سکتی تھیں۔ شنکر کا تانڈو ناچ اور خشمناکی، وشنو کی گمبھیرتا اور سنجیدگی، پاربتی کا چمتکار، سرسوتی کی کرامتیں یہ سب کچھ ان کے سامنے تھا۔

یہاں پر ہمیں ایک بات یاد رکھنا چاہیئے جس کا ذکر ہم نے پہلے اشارۃً کیا تھا کہ آریوں سے پہلے یہاں دھرم بھی تھا اور ریت رواج بھی تھے آریوں نے پہلے تو یہی کوشش کی ہوگی کہ ان کے ریت رواج ان کا دھرم غیر آریائی نظریات پر غالب آجائے۔ مگر ایسا نہیں ہو سکا اس لئے کہ ایشور کو ماں کا روپ دینے کا ذکر کہیں نہیں ہے۔ نہ ویدوں میں اور نہ شکتی پر ان سے پہلے کے پرانوں میں اور نہ ایشور کو کبھی نسائی تشکیل دی گئی۔[1] یہ نظریہ دراوڑی ہے۔ منگول، دراوڑ اور جین کی کچھ قومیں ایشور کو ماں کا روپ دے کر پوجا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ رگوید[2] میں اور دوسرے ہندو تنتروں میں بھی یہ بات صاف طور سے پائی جاتی ہے کہ شکتی (قدرت کاملہ) کی کچھ صورتیں چینی اور دراوڑی مذہبیات سے لی گئی ہیں۔ منسا[3] چنڈی اور کالی وغیرہ اسی نظریے کی تخلیق ہیں۔ جو عوام کی ذہنیتوں پر بری طرح چھا گئیں۔ اس حیثیت سے منسا منگل اور چنڈی کاویہ بنگلا شاعری کے وہ نمونے ہیں۔ جہاں عوام کی ذہنیتیں کارفرما ہیں اور جو عوامی جذبات کی آئینہ بردار ہیں۔ یہ کاویہ اور اس قسم کی شاعری عوامی عائلانہ زندگی کو روشنی میں لاتی ہے۔ ایسی شاعری تک بندی ہی کیوں نہ ہو۔ اس میں وہ کلاسیکی خصوصیات نہ پائے جاتے ہوں۔ جو الاول دولت قاضی اور بھرت چند کے ساتھ مخصوص ہیں۔ پھر بھی عائلانہ نقطۂ نظر سے ان کی وہی اہمیت ہے جو کلاسیکی نظریات سے ودیاپتی بھرت چند وغیرہ کی شاعری کی اور مذہبی نقطہ نظر سے ڈاکٹر نو اور ڈا کا رجن

---

[1] بھارتیندو ہریش چندر۔ دلیشنوتا اور بھارت ورش

[2] ڈاکٹر دنیش چندر سین۔ ونگ بھاشا و ساہتیہ کتھا

[3] کالی۔ چنڈی اور درگا تینوں کے امتیازی اوصاف ایک ہیں۔ صرف روپ الگ الگ کر دیئے گئے ہیں ورنہ تینوں ایک ہی ہیں۔

کی۔ کانو بھرٹ کی سہجیائی تحریک کی اور چنڈی کے رسیلے نغمات کی۔

منسا منگل اور چنڈی کاویہ کا مطالعہ کرنے سے پہلے قاری کو اس ماحول اور فضا سے واقفیت حاصل کرنا تو بہت ضروری ہے ہی، جہاں منسا کی پوجا اور بھگتی نے جنم لیا۔ ساتھ ہی ساتھ اسے بڑے صبر اور استقلال سے ان حکمت عملیوں اور پروپیگنڈوں پر بھی غور کرنا ہوگا جب منسا اور چنڈی شکتی تحریکات، شیوائی شکتی تحریک پر اپنا اثر کر رہی تھیں۔ کس طرح شیوجی کے پرستاروں پر منسا اور چنڈی کی قدرت کا سکہ بٹھایا جا رہا تھا مثلاً یہ کہ ان کے سینوں میں ماں کا دل ہے جو اپنے پرستاروں کی ماتا سے لبریز ہے۔ ان کے پرستاروں کے یہ بول کانوں سے ٹکراتے نہیں کہ ماں نے ماتا کے ہاتھ بڑھائے نہیں

اے ماں! کالی ماں! تمی امار ماں
ماں! اناتھ بالک ڈاکے شنے شنے نا؟ (کریم اللہ)

یہی وجہ ہے کہ منسا منگل ہوں یا چنڈی کاویہ ان کی ابتدا ہمیشہ سور اور چنڈی یا کالی کی جنگ سے ہوتی ہے شیوائی شکتی کے اسور کالی کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں۔ گویا باطل نے حق کے سامنے سر جھکا دیا۔ اور قاری کو ایک بار محسوس ہونے لگتا ہے کہ واقعی

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن — پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا

آگے چل کر وہ اپنے آپ کو ایک ایسی جگہ پاتا ہے جہاں سندربن کے دلدل ہیں اور کچھار، تیراکے جنگل ہیں۔ گوہاٹی اور چٹاگانگ کی سنگلاخ زمین ساون کی جھڑی لگی ہے اور بھادوں کی اندھیری راتیں، ندی ہیں اور نالے جھاڑیاں ہیں اور جھنکار، خودرو گھاس کے لمبے لمبے پودے، غریب کسان ہے اور اس کے ننگے پیر۔ سانپ منڈلا رہے ہیں، بچھو رینگ رہے ہیں۔ اژدہے اور اجگر منہ پھیلائے ہیں اور غریب کسان کے پاس کوئی ایسا آلہ بھی نہیں جن سے وہ انہیں یک دم صاف کر دے نہ اسے کوئی ایسا منتر یاد ہے جس سے وہ انہیں اپنے بس میں کر لے۔ موت کا خوف اور زندگی کی آس اس کے سامنے ہے اور اسی بیم و رجا کے دوراہے پر وہ اگر منسا دیوی کو پکارتا ہے تو کیا برا ہے، جبکہ منسا کی شکتی پر اس کا ایمان ہے وہ جانتا ہی نہیں بلکہ اسے پورا یقین ہے کہ منسا کا صرف نام لینا ان زہریلے ناگوں اور کالے کالے بچھوؤں کے دلوں میں جھرجھری پیدا کر سکتا ہے۔ وہ اس کی

ماں ہے اور اسے ان سے ضرور بچائے گی - اگر یہ ناگ نسل کے ایک بیٹے غریب
کسان کو ڈس سکتے ہیں تو منسا دیوی ان کو نیست و نابود کر سکتی ہے - ایسی حالت
میں اگر انہیں رات رات بھر جاگنا پڑے، اور منسا کے بھجن گانا پڑیں تو کوئی
حرج نہیں -

ساون کی جھڑی شروع نہیں ہوئی کہ بڑے بڑے بجرے سج گئے
اشوک کے پتوں اور کنیر اور رنگین کے پھولوں سے، ناریل اور کیلے کے پتوں
سے چھاجن ہوا - ایک دو نہیں پچاس پچاس اور سو سو مرد اور عورتوں کی
ٹولیاں مردنگ بجا بجا کر گا رہی ہیں -

ناگ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ، ہم تو منسا میا کے پجاری ہیں
بچھو اور اجگر کیا ہیں ، ہم تو منسا میا کے بھگت ہیں
کالے کالے بادل منڈلا رہے ہیں منسا میا کے سواگت میں

بجلی تڑپ تڑپ کر چیخ رہی ہے
شاید وہ بھی کسی پیڑ میں پھنسی ہے
اور پکار رہی ہے منسا میا کو
شاید اسے اجگر ڈس رہا ہے
منسا میا آؤ اور بچاؤ اسے
ناگ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ہم تو منسا میا کے پجاری ہیں
چاند، سوداگر اب ہمارا ساتھی ہے
گوا باڑی اس کا راج بھون ہے
وہ بھی اب بھگت ہے منسا میا کا

ایسے گیت ہری دت کی کتابی منسا منگل سے سینکڑوں برس پہلے
بنگال کے عوامی گیت بن چکے تھے جو سینہ بہ سینہ چلے آئے ہیں - یہ گیت
ادبی دنیا میں "بھاشن یاترا" کے نام سے موسوم ہیں - یہاں زبان کے چٹخارے
نہ ملیں - گرامر کی پابندیاں نہ ہوں مگر ان میں وہ مدھر مٹھاس ہے جو عوام کے
دلوں کی گہرائیوں میں پنہاں ہے جو ان کے کام و دہن کو شیریں بناتی ہے
اور روح میں ایک کیف پیدا کر دیتی ہے ان کی عاملانہ زندگی سے پردہ
ہٹاتی ہے اور اسے منظر عام پر لاتی ہے - یہاں وہ جذبات ہیں جو
صوفیانہ شاعری کے خیالات سے گزر کر آدم زاد کو ان بلندیوں پر پہنچاتی
ہیں جہاں فرد کا وجود ذات مطلق کی ہستی میں مدغم ہو جاتا ہے -

زمانے نے کروٹ لی - وقت نے پلٹا کھایا اور اب بنگلا زبان اپنے
پیروں پر کھڑی ہو گئی - راج درباروں میں اس کو جگہ ملی - پال سین راجاؤں
کے علاوہ گوڑ شاہی فرماں رواؤں نے اس پر ہاتھ رکھا - جہاں مہا بھارت
راماین اور بھاگوت گیتا نے بنگلا کا چولا دھارن کیا، وہاں منسا منگل بھی
بنگلا زبان میں ڈھلنے لگے - کم و بیش ۶۰ شاعروں نے ایسے گیت لکھے جو
بہت زیادہ ضخیم ہیں اور سبھی میں قریب قریب پندرہ سولہ ہزار اشعار
ہیں - ان شاعروں نے صدیوں کے سینوں میں بند جذبات منظر عام پر
پیش کئے انہیں لفظوں کی مٹھاس، ترکیبوں کی رنگینی اور بحروں کی مدھر
تانیں بخشیں -

کہنے کو تو ان گیتوں میں "چاند" سوداگر اور منسا دیوی کی ایک کشمکش
ہے مگر درحقیقت ان میں دیومالائی، مافوق فطری اور رومانی عناصر کا ایسا
امتزاج ہے جس میں عقیدت مندی ہے، حیرت اور استعجاب ہے، جاذبیت
ہے اور دلکشی - ایک کسک ہے جس میں مدھری مٹھاس ہے، ایک درد ہے
جس میں میٹھی میٹھی ٹیسیں ہیں - ان میں دو طاقتوں کا ٹکراؤ ہے اور فرقہ وارانہ
ذہنیتوں کی کشمکش - عام طور پر ان ضخیم کتابوں میں حسب ذیل کہانی ادنی تغیر
سے پائی جاتی ہے اور ہر شاعر اپنی ذہنیت کے مطابق ان بیانات میں دلکشی
اور دلفریبی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے -

چمپانگر کا ملک التجار "چاند" یا "چندر" شیو جی کا بھگت ہے
شیو جی نے اسے "مہا گیان" بردان میں بخشا جس کی بدولت وہ ہر بگڑا کام
بنا سکتا تھا - منسا دیوی یہ چاہتی تھی کہ چاند اس کا بھگت بن جائے
چاند اپنی استواری ایمان سے ایسا کرنے سے انکار کرتا ہے - منسا دیوی
انتقامی جذبات کے تحت اپنی حکمت عملیوں کا جال بچھا دیتی ہے - سب
سے پہلے وہ چاند کے راج محل "گوا باڑی"[1] کو ناگوں سے زہر آلود کرا دیتی
ہے اور اسے نیست و نابود کر دیتی ہے، مگر چاند اپنی مہا گیان شکتی کی بدولت
اسے دوبارہ نہ صرف جیسے کا تیسا بلکہ اس سے بہتر صورت کا بنا دیتا ہے
منسا حیران ہو جاتی ہے - اور ایک دوسرا حربہ اختیار کرتی ہے - وہ ایک

[1] گوا باڑی کو آپ عین بعین شداد کی بہشت سمجھئے - ایسے ہی بیانات
ڈبے گپت نے دئے ہیں -

خوبصورت نوجوان لڑکی کے روپ میں چاند کے سامنے آتی ہے ۔ چاند ایک ہی نظر میں اس کا شیدائی بن جاتا ہے ۔ لڑکی اس سے بردان مانگتی ہے اور چاند اسے "مہا گیان شکتی" بردان میں دے دیتا ہے ۔ اب لڑکی آکاش میں منسا بن کر منڈلاتی ہے اور چاند سے اپنا بھگت بننے کا اصرار کرتی ہے ۔ مگر چاند کی استواریٔ ایمان میں فرق نہیں وہ انکار کر دیتا ہے ۔

منسا یکے بعد دیگرے چاند کے چھ بیٹے سانپوں سے ڈسا لیتی ہے سارے گھر میں کہرام مچ جاتا ہے ۔ چاند سوداگر کی رانی سنکھا التجا کرتی ہے کہ انسان اور دیوی کی کشمکش ٹھیک نہیں اسے منسا دیوی کا بھگت بن جانا چاہیئے ۔ مگر چاند اپنے ارادے پر مستحکم ہے وہ نہیں مانتا اس کے ایمان میں تذبذب نہیں پیدا ہوتا ۔ آخر کار اس کی رانیاں اسے مجبور کرتی ہیں کہ وہ چمپانگر سے کہیں دور نکل چلے ۔ سات جہاز طیار کیئے جاتے ہیں اور چاند اپنی رانیوں اور بہو بہوؤں سمیت سراندیپ کے لیئے روانہ ہو جاتا ہے ۔ منسا ہنومان سے کمک چاہتی ہے اور ہنومان شکتی کی بدولت وہ ساتوں جہازوں کو ڈبا دیتی ہے ۔ چاند اپنے اہل و عیال سے الگ ہو کر ننگا بھوکا رہ جاتا ہے اور ایک جزیرے میں پہنچتا ہے اور وہاں اسے بھیک تک مانگنا پڑتی ہے ۔ مگر وہ منسا کی پوجا نہیں کرتا ۔ اپنے ایک دوست کی مہربانیوں سے وہ پھر سب کے ساتھ اپنے راج بھون گوا باڑی (چمپانگر) میں پہنچتا ہے ۔ اور ایک بار پھر اُسے منسا مہلت دے دیتی ہے اور وہ از سر نو زندگی کا آغاز کرتا ہے ۔

چاند کے دہاں چھوٹی رانی سے ایک بڑا خوبصورت بیٹا پیدا ہوتا ہے جس کا نام لکشمیندر رکھا جاتا ہے ۔ نجومی آتے ہیں وہ اس کی جنم پتری بناتے وقت بتاتے ہیں کہ عین شادی کی رات راجکمار لکشمیندر کی موت ہو گی ۔ ملک التجار چاند فوراً سمجھ جاتا ہے کہ سانپ ہی اس کی موت کا سبب ہو سکتے ہیں ۔ اس لئے وہ سنتھالی پربت پر ایک آہنی محل بنواتا ہے ۔ جب محل تیار ہو جاتا ہے اور منسا کو معلوم ہوتا ہے تو وہ معمار سردار کو ڈرا دھمکا کر ایک سوراخ چھوڑ دینے پر مجبور کرتی ہے اور وہ ایک سوراخ چھوڑ دیتا ہے ۔ جسے کوئی نہیں جانتا ۔ بیہولا راجکماری (بھلا یا راجکماری بپلا) سے راجکمار لکشمیندر کی

۱؎ ہری دت ۔ ۲؎ انوپ چند ۳؎ دجے گپت

شادی ہوتی ہے اور ان دونوں کو آہنی محل میں رکھا جاتا ہے ۔ راجکماری کو سرسراہٹ سی محسوس ہوتی ہے اور اس کے تعجب اور خوف کی حد نہیں رہتی جب وہ ایک ناگ دیکھتی ہے ۔ وہ ایک پیالے میں دودھ لے کر اس کے سامنے جاتی ہے اور جیسے ہی وہ دودھ پینا شروع کرتا ہے ۔ بیہولا راجکماری اسے ایک کٹیا سے پھانس لیتی ہے ۔ وہ دوسرا سانپ دیکھتی ہے ۔ اسے بھی پھانس لیتی ہے ۔ تیسرا ناگ آتا ہے ۔ راجکماری اسے بھی پھانس لیتی ہے ۔ آخر کار بیچاری تھک کر سو جاتی ہے اور وہ کالی ناگن آتی ہے جس نے گوا باڑی کو نیست و نابود کیا تھا اور لکشمیندر کو ڈس لیتی ہے ۔ سارے گھر میں کہرام مچ جاتا ہے اور جب اس کی لاش جلانے کی تیاری کی جاتی ہے تو راجکماری یاد دلاتی ہے کہ سانپ ڈسے لوگوں کی لاش جلائی نہیں جاتی اسے یونہی رکھ دو ۔ چنانچہ لاش "بھیلا" پر دریا کے کنارے رکھ دی جاتی ہے اور راجکماری مستحکم ارادہ کر لیتی ہے کہ وہ اپنی تپسیا اور بھگتی کی بدولت اسے دوبارہ زندگی بخشے گی ۔

دن گزرتے رہے اور راتیں آتی رہیں ۔ مگر لکشمیندر زندہ نہ ہوا ۔ دنیا اسے دیوانہ سمجھنے لگی ۔ اعزاء اور بھائی برادر اصرار کرنے لگے کہ وہ اپنی ہٹ سے باز آئے مگر بیہولا اپنے ارادے پر قائم رہی ۔ آخر کار وہ منسا دیوی کا نام جپنے لگی ۔ ہزاروں بار دن میں اور لاکھوں بار رات میں رفتہ رفتہ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ ایک غیر معمولی طاقت (مہا شکتی) کی مالک ہے ۔ وہ خبیث روحیں دیکھتی جو اسے ڈرائیں دھمکائیں مگر منسا دیوی کے نام جاپ کی بدولت کوئی اس کا بال بیکا نہ کر سکا ۔ لاش سڑنے لگی مگر اس کی آشا کو گھن نہ لگ سکے ۔ وہ اسی انتظار میں تھی کہ کسی نہ کسی دن لکشمیندر زندہ ہو جائے گا ۔

ایک دن اس کے تعجب کی حد نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ ایک دھوبن ندی کے کنارے کپڑے دھو رہی ہے اور اس کا چھوٹا بچہ اس کے کام میں خلل انداز ہو رہا ہے اس نے بچے کو مار کر ایک جھاڑی میں ڈال دیا اور جب شام ہوئی تو ندی سے پانی لے کر لاش پر چھینٹے دئیے بچہ زندہ ہو گیا اور وہ آسمان کی طرف اڑنے والی ہی تھی کہ بیہولا نے اس کے پیر پکڑ لیئے اور اپنی داستان غم رو رو کر سنانے لگی یہ دھوبن دیوتاؤں کے کپڑے دھونے آئی تھی اور اس کا نام نیتا[۴] تھا

۴؎ یہی نام بعد میں چل کر نتی بن گیا ۔ سب نام غیر آریائی ہیں ۔

اسے بیہولا کے حال پر رحم آیا اور وہ اسے اپنے ساتھ پرلوک لے گئی۔ دیوتاؤں نے بیہولا کو ناچنے کا حکم دیا۔ وہ ایسا خوبصورتی سے ناچی کہ سارے دیوتا ریجھ گئے اور اس سے خوش ہوئے۔ انہوں نے منسا دیوی سے سفارش کی وہ اس کے شوہر لکشمیندر کو دوبارہ زندہ کردیں۔ منسا دیوی نے اس شرط پر زندہ کرنے کا وعدہ کیا کہ وہ اپنے سسرا دیگ راج[1] چاند کو منسا کا بھگت بنا دے۔ بیہولا نے شرط منظور کرلی اور منسا نے نہ صرف لکشمیندر کو زندگی بخشی بلکہ اس کے چھ بھائیوں کو بھی زندہ کردیا وہ سات جہاز جو کالی ودھ میں غرق ہوگئے تھے انہیں بھی واپس دلا دیا گویا باڑی پھر سرسبز و شاداب ہوگیا۔

بیہولا چمپانگر آتی ہے۔ اس کی ساس اور جیٹھانیاں یہ دیکھ کر پھولے نہیں سماتیں کہ اس کے بیٹے اور ان کے شوہر پھر ایک بار زندہ ہیں۔ چاند کے لئے منسا کی یہ کرامات کم نہ تھی وہ اپنی ہٹ چھوڑ دیتا ہے اور منسا دیوی کا بھگت اور پرستار بن جاتا ہے ۔۔۔"

منسا منگلوں کا آپ مطالعہ کریں وہاں آپ کو وہ سب کچھ ملے گا جو میرامن کی باغ و بہار، سرور کی فسانۂ عجائب، مثنوی سحر البیان، مثنوی دیا شنکر نسیم، داستان امیر حمزہ وغیرہ میں ملتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں راجا ہیں اور پریاں، یہاں راجا ہیں اور دیوتا، وہاں پریاں مافوق فطری عناصر کی تخلیق کرتی ہیں اور یہاں وہ مذہبی عقیدت مندی ایسے عناصر پیدا کرتی ہے، جو صدیوں سے عوام کے دلوں کی گہرائیوں میں تہ نشین ہوچکے تھے۔ وہاں انسانوں اور پریوں کا ٹکراؤ ہے، یہاں دیوتاؤں اور دیوتاؤں کا، منتروں اور تنتروں کا، عقائد اور ارادتمندی کا تصادم، اگر وہاں گل بکاولی چھوانے سے اندھی آنکھوں میں روشنی آسکتی ہے تو یہاں تپسیا بل پر مردہ زندہ ہوسکتا ہے۔ آتم شکتی (روحانیت) اُجڑے مکان بسا سکتی ہے۔ اگر وہاں تیز آندھی کے جھونکے درویشوں کا چراغ نہیں بجھا سکتے تو یہاں بیہولا کے پکائے ہوئے چاول برسوں تر و تازہ رہ سکتے ہیں۔ وہاں دیو اور جن کام کرتے ہیں تو یہاں آننا ٹل اور اسُور ۔۔۔"

اسلوب اور بیانات کے لحاظ سے بھی منسا منگل ہمارے قدیم افسانوں سے بہت کچھ مماثلت رکھتے ہیں۔ آپ وجے گپت کے لکھے گدا باڑی کے بیانات پڑھئے۔ آپ کے سامنے وہی تصویریں چلنے لگیں، جو یہ اشعار پیش کرتے ہیں۔

دیا شہ نے ترتیب اک خانہ باغ ہوا رشک سے جس کے لالہ کو داغ

وہ مقیش کی ڈوریاں سربسر کہ مہ کا بندھے جس سے تارِ نظر

لکشمیندر کی ولادت اور حُسن و جمال کی وہی تصویریں ہیں جو شہزادہ تاج الملوک کی ولادت اور حسن و جمال پیش کرتا ہے وہ چاند سا مکھڑا رکھتا ہے۔ بدن کندن سا دمکتا ہے۔ دانت انار دانے ہیں اور ان کی چمک موتیوں جیسی۔ وہاں بارھویں سالگرہ بدشگونی کی آمد ہے اور یہاں عین شادی کے دن موت کا پیام۔ وہاں شہزادے کو تہ خانوں میں چھپا کر رکھا جاتا ہے اور یہاں آہنی محل تیار کیا جاتا ہے۔ شوہر کی موت پر بیہولا کی تفرع زاریاں اور بَین، بکاؤلی کی آہ زاریوں سے کسی طرح کم نہیں۔ سماجی زندگی۔ رسم رواج اور رُسوم کے نادر مُرقّعات گیتوں میں پائے جاتے ہیں۔

منسا منگل کا سب سے قدیم نسخہ ہری دت کی تصنیف ہے جو اوائل تیرھویں صدی عیسوی میں غالباً سلطان بلبن کے دوران حکومت میں تصنیف ہوا۔ زبان اور عروض کی کچھ خامیاں ضرور پائی جاتی ہیں ورنہ عوام میں بے حد مقبول ہے۔ ۱۴۸۴ء میں گوڑ شاہی فرماں روا سلطان حسین شاہ کے دوران حکومت میں منسا منگل کا دوسرا نسخہ منظرِ عام پر آیا جسے وجے گپت نے نظم کیا ہے۔ یہ بہت ضخیم کتاب ہے جس کے ۸۰ باب ہیں اور تقریباً ۱۶ ہزار اشعار کینیکا داس کے منسا منگل عوام میں بے حد مقبول ہوئے خصوصاً باقر گنج، میمن سنگھ، چنگاؤں فرید پور، گوہاٹی، سلہٹ وغیرہ اضلاع میں۔ اس میں تقریباً ۵ ہزار اشعار ہیں اور ۱۶۴۵ء میں نظم ہوئی۔

اس موضوع کی مقبولیت کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس پر ۶۰ شاعروں سے زیادہ شعراء نے طبع آزمائی کی۔ اس موضوع کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب وہ مذہبی عقیدت مندی اور روحانیت کی تشنگی ہے جو عوام کے دلوں میں صدیوں سے تہ نشین ہوچکی تھی اس پر دیومالائی ارادت مندی، مافوق فطری دلکشی، حیرت زا حادثات، اور رومانی مٹھاس نے گھُل مل کر اس میں کیف، سرور، دلفریبی اور کشش پیدا کردی ہے۔

---

[1] ملک التجار

رشید احمد صدیقی

علی گڑھ کے مخطوطات

مسلم یونیورسٹی کے کتب خانے میں مخطوطات کی تعداد کم و بیش چھ ہزار ہے جس میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اب تک بعض معذوریوں کے سبب سے اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ ہمارے کتب خانے میں کیا کیا نوادر اور بیش بہا قلمی نسخے ہیں۔ علمی تحقیقات کا کام کرنے والوں کو مخطوطات اور حوالے کی کتابوں کی دستیابی اور مطالعے میں بڑی دقت ہوتی تھی۔

اس دقت کی طرف سب سے پہلے ہمارے فاضل وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے توجہ فرمائی اور حسب منشاء موصوف اس کام کو اچھے پیمانے پر نفاست اور سلیقے سے شروع کیا گیا۔ مخطوطات اور دیگر علمی نوادر کا سیکشن علیحدہ کیا گیا۔ اس کے لئے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (سلطان جہاں منزل) کا وسیع اور خوبصورت ہال معہ گیلری کے حاصل کیا گیا۔ جس کی خوبصورتی اور افادیت میں فن تعمیرات کے مشہور جرمن ماہر مسٹر ہائنس نے ضروری ترمیم و اصلاح کر کے معتد بہ اضافہ کر دیا۔ مطالعہ کرنے والوں کی آسائش اور ہال کی زیبائش کے لئے ماہر موصوف نے نئے نئے انداز کے نہایت آرام دہ اور خوبصورت فرنیچر ڈیزائن کئے جو اب ہال کی زینت بنے ہوئے ہیں۔

اس سیکشن کا انتظام و انصرام مختار الدین آرزو صاحب ایم اے (علیگ) کے سپرد کیا گیا۔ جن کو تحقیقات علمیہ کے صلے میں اسی سال یونیورسٹی نے عربی میں ڈاکٹریٹ تفویض کی ہے۔ آرزو صاحب، یونیورسٹی کے بڑے ہونہار اور نہایت نیک نام طالب علم رہے ہیں اور اپنی مسلسل علمی و ادبی خدمات کے سبب سے علی گڑھ سے باہر بھی ارباب علم و ذوق سے روشناس ہو چکے ہیں۔ انھوں نے بڑی محنت اور سلیقے سے قدیم نادر مخطوطات، مصوّر و خوشخط نسخوں، مرصع اور منقش کتابوں، مشاہیر کے خطوط اور خطاطوں کی بے مثل وصلیوں کو چھ ہزار کتابوں کے انبار سے انتخاب کر کے انھیں موزوں مقامات پر نہایت سلیقے سے چُن دیا ہے۔

بجلی کی دودھیا روشنی میں ہال کی فضا، طلوع سحر اور شائقین علم کا انہماک مطالعہ، عبادت سحری کا سماں پیش کرتا معلوم ہوتا ہے! خیال ہے یہاں کی مسجد، اسٹریچی ہال، ایجی پارک، سائنس لیبوریٹریز، انجنیرنگ کالج، سوئمنگ باتھ، کرکٹ فیلڈ اور باغات کی طرح مخطوطات اور دیگر نوادر علمیہ کا یہ ذخیرہ بھی اب مرجع انام ہے!

ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ یونیورسٹی میں کچھ مہمان آئے ہوئے تھے جن میں خواتین بھی شامل تھیں۔ مجھے اس پر متعین کیا گیا کہ میں اُن کو ان نوادر کی سیر کرالاؤں۔ آرزو صاحب اس وقت موجود نہ تھے۔ یہ میرے لئے بڑی آزمائش کا موقع تھا۔ مجھے کیا معلوم کہ شیشے کی ان الماریوں میں آرزو صاحب نے کہاں پریوں کو اُتارا ہے اور کہاں جنات قید کر رکھے ہیں۔ کم لوگ جانتے ہوں گے بشرطیکہ میری طرح وہ بھی معلّم نہ ہوں کہ جو چیز معلوم نہ ہو، اُس پر گفتگو کرنا کتنا مشکل کام اور دلچسپ مشغلہ ہے۔

خیریت یہ ہوئی کہ مرد مہمان، قومی قسم کے لوگ تھے جنہوں نے لنچ، خوان یغما سمجھ کر خاصے خشوع و خضوع سے کھایا تھا اس لئے وہ تو ہال میں داخل ہوتے ہی آرام کرسیوں پر مراقبے میں چلے گئے۔ رہیں خواتین، انھوں نے گفتگو کا کچھ ایسا انداز رکھا گویا نوادر سے تعارف کرانے کا منصب اتنا میرا نہ تھا جتنا اُن نوادر سے خود اپنا تعارف کرانا خواتین کا فرض تھا۔ اُس وقت مجھے شیفتہ کا ایک شعر بے اختیار یاد آیا۔

تھوڑا سا میرے حال پہ فرما کے التفات

کرتے رہے وہ اپنی بڑائی تمام شب!!

اس آزمائش سے چھٹکارا پاتے ہی (اور اب آرزو صاحب بھی آچکے تھے) میں نے آرزو صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ تھوڑی سی تکلیف گوارہ فرما کر ان نوادر کی ایک طرح کی "خود وضاحتی" فہرست مرتب فرما دیں۔ اس سے نہ صرف اُن بزرگوں اور عزیزوں کو سہولت پہنچے گی جو یہاں آئیں گے، بلکہ وہ حضرات جو دُور دراز مقامات پر ہوں گے وہ بھی ان سے متعارف ہو جائیں گے اور فائدہ اُٹھائیں گے۔ میں نے تو یہاں تک کہا کہ اگر ان نوادر کا ایک نہایت خوبصورت مرصّع اور مصوّر کتابچہ شائع کر دیا جائے تو اس ذخیرے کی اشاعت بھی ہو گی۔ نیز معزز اور علم دوست مہمانوں کو بطور تحفہ پیش کیا جا سکے گا۔

مجھے بڑی خوشی ہے کہ آرزو صاحب نے بڑے شوق اور محنت سے اس ذخیرے کی فہرست مرتب کر دی جو اب ناظرین کرام کے سامنے ہے۔ آئیے جہاں تہاں سے ان کا تعارف میں آپ سے کرا دوں۔

اس میں سب سے پہلے بعض تاریخی کتابوں کا ذکر ہے، پھر دو ایسے نسخوں کا حال بتایا گیا ہے جو دنیا میں کہیں اور نہیں۔ نفائس، کاش کہ وہ خود ایڈٹ کر رہے ہیں اور اس طرح دسویں صدی ہجری کی ایک نایاب کتاب سے ارباب علم روشناس ہو سکیں گے۔

پھر فہرست میں ایسے نسخوں کا حال لکھا گیا ہے جو خود مصنفین کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں، ان میں صائب کا دیوان جو بخط صائب ہے دیکھنے کے لائق ہے۔

اب ایسے نسخوں کی باری آتی ہے جن پر مشاہیر کے دستخط یا تحریریں ہیں، یہاں جہانگیر کی تحریر ملے گی، جامی کی شان خط کا اندازہ ہوگا۔ فیضی کے دستخط اور مہر بھی دیکھنے کو ملے گی جو غالباً کہیں اور آپ نہ دیکھ سکیں گے۔

پھر عربی کتابیں، اس میں نہج البلاغت کا ایک قدیم نسخہ ملے گا، ایسا قدیم کہ اس سے قدیم تر نسخہ دنیا میں شاید اور کوئی نہ ہوگا اور لطف یہ کہ لکھا ہوا بھی شیر خدا کی روشنائی سے۔

نسخ قرآنی میں عبدالباقی حداد کا لکھا ہوا نسخہ بوسہ دینے اور آنکھوں سے لگانے کے قابل ہے۔ قرآن پاک کے وہ اوراق بھی زیارت کے قابل ہیں جو خط کوفی میں لکھے گئے ہیں۔ اور جن میں کاغذ کی جگہ ہرن کا چمڑا استعمال کیا گیا ہے۔

مطبوعات میں قانون ابن سینا کا وہ نسخہ ضرور دیکھنے کا ہے جو روم میں سولھویں صدی عیسوی میں چھاپا گیا تھا، سرسید کی سن ستاون سے پہلے کی چھپی ہوئی بعض نادر کتابیں بھی یہاں موجود ہیں۔

مکاتیب کا بھی یہاں بڑا اچھا ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے اور بعض تو بڑے اہم اور دلچسپ ہیں۔

وصلیاں آپ کو تقریباً ساری مشہور خطاطوں کی دیکھنے کو مل جائیں گی، یہاں ۲۴ وصلیاں نمائش کے لئے رکھی ہوئی ہیں۔ پھر بھی آرزو صاحب کو شکایت رہ گئی کہ جگہ کی قلت کی وجہ سے بہت سی وصلیوں کو وہ جگہ نہ دے سکے۔

تصویریں تھوڑی سی بہت ہیں لیکن ان میں ہر قسم اور قماش کے لوگ آپ کو دیکھنے کو مل جائیں گے، یہاں نادر شاہ سے لے کر تاناشاہ تک موجود ہیں، اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ محمد شاہ رنگیلے اور مولانا فخر الدین دہلوی کے پاس طوطی بیگم کی تصویر رکھی ہوئی ملے گی۔

اس کے علاوہ سمندر پار کی کتابوں کی اوٹوگراف، مائکروفلم، فرامین کے انبار کے ساتھ ساتھ آپ کو روپہلی اور سنہری سکّوں کی جھنکار بھی سنائی دے گی۔

آپ نے چاول یا چنے کی دال پر قل ہو اللہ اور پگڑی اور پیرہن پر قرآن پاک لکھے جانے کا ذکر اکثر سنا ہوگا۔ یہاں چاول، چنے کی دال، پیرہن، دستار سب کچھ موجود ہے۔

امید ہے میرے اس مختصر "پرچۂ ترکیب استعمال" سے "بہتوں کا بھلا ہوگا"!

رامادھن
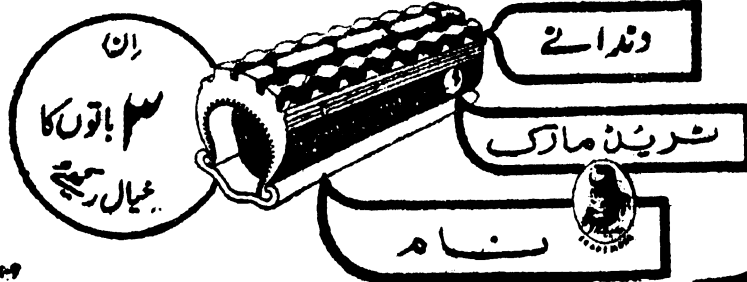
سُرینام

ساٹھ ہزار ہندوستانیوں کا گھر

ہندوستان یا انگلستان میں رہنے والے بہت کم ہندوستانی اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ جنوبی امریکہ کے شمالی ساحل پر سرینام یا ڈچ گی آنا نامی ایک ایسا ملک آباد ہے جس میں ساٹھ ہزار ہندوستانی (ہندوستانژاد) بستے اور کام کرتے ہیں اور جن کے دل میں ہر وقت "بھارت ماتا" کا خیال رہتا ہے۔

میں اپنے قیامِ انگلستان کے دوران میں وہاں پڑھنے والے یا کام کرنے والے ہندوستانیوں کے لئے قریب قریب ایک عجوبہ تھا۔ وہ اس بات کا خیال ہی نہیں کر سکتے تھے کہ ایک خالص ہندوستانی جنوبی امریکہ کے ایک گمنام ملک سرینام سے وارد ہو سکتا ہے۔ میرے لئے بھی یہ دریافت کوئی خوشگوار دریافت نہ تھی کہ مجھے ایک عجیب و غریب ہستی کی طرح دیکھا جا رہا ہے۔ لیکن آخر کار مجھے اس خیال اور اس قسم کے معاملات کے ساتھ ایک ذہنی سمجھوتہ کرنا پڑا۔

اس کے بعد میرے ہندوستان کے بحری سفر کے دوران میں پھر یہی بات رونما ہوئی۔ ہر طرف سے مجھ پر میرے وطن کے بارے میں سوالات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ سوالات کرنے والوں میں مسافر بھی تھے اور جہاز کا عملہ بھی اور میں اس شوق میں کہ "سرینام" کے متعلق ان کی واقفیت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کر سکوں، ان سوالات سے بالکل نہ گھبرایا، اور خندہ پیشانی سے ان کا جواب دیتا رہا۔ اس وقت سے لے کر اس وقت تک جب کہ میں ہندوستان میں مقیم ہوں سوالات اور جوابات کا یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت اور چند تاجروں کے علاوہ شاید ہی کوئی شخص ہندوستان میں ہو جو سرینام کے متعلق کچھ جانتا ہو، اب یہ احساس ایک بڑا عجیب و غریب احساس ہے کہ آپ ایک ایسے ملک کے باشندے ہیں جس کا علم اُس ملک کو بھی نہیں جو آپ کا اصلی وطن ہے۔

سرینام یا ڈچ گی آنا، گی آنا کا ایک حصہ ہے۔ گی آنا تین ملکوں پر مشتمل ہے۔ برٹش گی آنا (راجدھانی۔ جارج ٹاؤن) ڈچ گی آنا (راجدھانی: پاراماری بو) اور فرنچ گی آنا (راجدھانی: کینسی) یہ جنوبی امریکہ کے بالکل شمال میں واقع ہے اور اس کی شمالی سرحد بحرِ ظلمات ہے۔ جنوب میں اس کا پڑوسی برازیل ہے۔

گی آنا کے یہ تینوں ملک نوآبادیاں ہیں۔ لیکن حال ہی میں سرینام قریب قریب نیدرلینڈز کی ڈومینین کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ ہالینڈ کی طرف سے اب صرف ایک گورنر مقرر ہوتا ہے اور محض معاملات خارجہ ہالینڈ کے ہاتھ میں ہیں۔ باقی سارا انتظام خود سرینام کے پاس ہے جیسلیٹیو کونسل جسے سٹیٹس وان سرینام' (ایوانِ نمائندگان) کہتے ہیں، اکیس ممبروں پر مشتمل ہے جو خفیہ ووٹ کے آزادانہ انتخاب کے ذریعے سے چنے جاتے ہیں۔ تمام وزراء ملک ہی کے باشندے ہیں۔ ڈچ لوگ بے شک وہاں ہیں اور اُن کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ لیکن اب حکومت میں اُن کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔

سرینام کی خاص دلچسپ چیزوں میں سے ایک چیز اس کی کئی رنگ اور کئی نسلوں کی آبادی ہے۔ آپ کو وہاں ریڈ انڈین (اصل آبادی) بش نیگروز۔ انڈونیشیائی۔ ہندوستانی ہر قسم کے سرلولز (حبشی نژاد) چینی اور شامی، ڈچ، دوسرے یورپی اور کچھ امریکن ملیں گے۔ پاراماری بو کی مرکزی منڈی ان تمام نسلوں کے ملنے کی جگہ ہے۔

جب آپ ان سب کو مختلف رنگوں اور مختلف لباسوں میں اپنے کام کاج میں مشغول پاتے ہیں تو یہ ایک قابلِ دید منظر ہوتا ہے۔ یہاں آپ ایک ہندوستانی عورت کو سونے کی بالیاں اور چاندی کا ہار پہنے ہوئے بکے ہوئے ٹماٹر اور سبز گوبھی بیچتا ہوا دیکھیں گے۔ اس کے قریب ہی ایک انڈونیشیا کی عورت بیٹھی ہے جو صبر سے اپنی اشیا کے گاہکوں کے انتظار میں ہے۔ وہ دیکھئے اس کے قریب ہی چینی سوداگر اپنی چھوٹی سی دکان میں بیٹھا ہے۔ اُدھر ایک سیرول عورت اپنے سر پر نارنگیوں اور دوسرے پھلوں کا ٹوکرا اٹھائے جا رہی ہے۔

اگر اتفاق ہو جائے تو آپ کو ایک ہی قطار میں چلتے ہوئے کچھ مرد اور عورتیں نظر آئیں گی۔ یہ لوگ بش نیگروز ہیں۔ جو بازار میں لکڑی کے کنڈے بیچنے اور اپنی ضرورت کی اشیا خریدنے کے لئے آتے ہیں۔ یہ اپنی خرید و فروخت کے بعد اپنے دیہات میں جو جنگلوں میں واقع ہیں واپس چلے جاتے ہیں۔ کبھی کبھار آپ کو سرخ جسم والے لوگ بھی نظر آجاتے ہیں۔ یہ ریڈ انڈینز ہیں جو راج دھانی میں شاذ و نادر ہی آتے ہیں۔

مارکیٹ ایک ایسی جگہ ہے جہاں آپ کو مختلف طریقوں، لہجوں اور آوازوں میں تمام قسم کی زبانیں بھی سنائی دیں گی۔ سرینام کئی زبانوں کا دیش ہے۔ ریڈ انڈینز اور بش نیگروز کی زبانیں جنگلوں ہی میں محدود ہیں۔ مہذب علاقوں میں مارکیٹ کی زبان نیگر و انگلش ہے۔ جو کسی افریقن بول، انگریزی، ہسپانوی اور ڈچ کی ملی جلی صورت ہے۔ یہی دراصل سرینام کی لنگوا فرینکا ہے۔ کیونکہ تقریبًا ہر شخص اسے بول اور سمجھ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ہندی، اردو، چینی اور ہیبرو وغیرہ بھی ہیں۔ لیکن سرکاری زبان ڈچ ہے اور غالبًا اب ہمیشہ یہی رہے گی۔

تو گویا یہ ایک عجیب و غریب ملک ہے جس میں عظیم دریا اور جنگل ہیں اور عظیم آبادی ہے جو دنیا کے ہر حصّے سے یہاں آئی ہے۔ اس آبادی کا سارا تنوع سمجھنے کے لئے تاریخی پس منظر پر ایک نگاہ ڈالنا ضروری ہوگا۔

تاریخ

جب کولمبس نے ۱۴۹۲ء میں امریکہ کو دریافت کیا تو اُسے ایک نئی قسم کے لوگ نظر آئے۔ اُس نے اُنھیں انڈینز کہا۔ کیونکہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ وہ ہندوستان پہنچ چکا ہے۔ یہ غلط تو بعد میں منکشف ہوئی کہ کولمبس کا دریافت کیا ہوا ملک روئے زمین کا ایک بالکل ہی نیا حصّہ ہے۔ اس ملک کو بعد میں امریکہ کہا گیا اور یہاں کے اصل باشندوں کا نام ریڈ انڈینز پڑا لیکن انھیں امرانڈینز (امریکن انڈینز) کہنا زیادہ موزوں ہے کیونکہ اُن کے بعض قبیلوں کے لوگوں کا رنگ قطعًا سرخ نہیں ہے۔

امریکہ کی دریافت کے بعد سارے مغربی یورپ میں یہ افواہ پھیل گئی کہ امریکہ ایک بہت امیر ملک ہے۔ جہاں سونے اور چاندی کے انبار لگے ہیں۔ وہاں یہ مشہور ہو گیا کہ "ماربا جھیل" کے کنارے ریت کے نہیں بلکہ

خالص سونے کے ہیں۔ اب اس بات کا بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یورپین (خاص کر ہسپانوی اور پرتگالی) کتنی بھاری تعداد میں ان علاقوں کی طرف آئے ہوں گے۔ ان لوگوں کے پاس جو کچھ تھا انھوں نے بیچ ڈالا۔ تاکہ وہ بحرِ ظلمات کو عبور کر کے "ال ڈوریڈو" (سونے کی زمین) تک پہنچ سکیں۔ لیکن ان میں اکثر کی اُمیدیں خواب و خیال بن کر ختم ہو گئیں۔ اور وہ افسوسناک موت کا شکار ہوئے۔

"سونے کو تلاش کرنے والوں کا یہ ہجوم" اُن عظیم پرانی تہذیبوں کی بربادی اور خاتمے کا باعث بنا جو میکسیکو اور پیرو میں اُس وقت اپنا جلوہ دکھا رہی تھیں۔

آخر کار سنہ ۱۵ء میں ہسپانوی لوگ گی آنا میں آئے۔ جسے انھوں نے "غیر آباد ساحل" کا نام دیا۔ کیونکہ اسے انھوں نے آبادی کے قابل نہ پایا۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ کیونکہ انھیں پختہ یقین تھا کہ اس سرزمین میں سونا اور چاندی موجود ہے۔ اس لئے اپنی تاریخ کے ابتدائی ایام میں سرینام ایک ہسپانوی نوآبادی تھی۔ اس کے بعد یہ انگریزوں کی مملکت بنا اور سنہ ۱۶۶۷ء میں اسے ڈچ لوگوں نے فتح کر لیا۔

اب یورپین لوگوں کے لئے گرم علاقے میں زندگی بسر کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن چونکہ یہ لوگ واپس نہ جا سکتے تھے اس لئے انھوں نے گنے، تمباکو اور کپاس وغیرہ کی کاشت شروع کر دی۔ لیکن اس تپتے ہوئے علاقے میں اُن کے لئے کام کرنا بڑا مشکل تھا۔ چنانچہ انھوں نے امرانڈینز کو مجبور کیا کہ وہ ان کے لئے کام کریں۔ لیکن یہ لوگ چونکہ خانہ بدوش تھے اس لئے باقاعدگی سے کام کرنا ان کے بس میں نہ تھا۔ اس کے علاوہ وہ یورپین شراب اور بعض بیماریاں اپنے ہمراہ لائے تھے۔ جن کی وجہ سے ان میں وسیع پیمانے پر اموات واقع ہونا شروع ہو گئیں۔

ان کی حالتِ زار پر رحم کھا کر، ومن کیتھولک چرچ کے پادری لاس کاساس نے یورپین آبادی کو یہ مشورہ دیا کہ وہ امرانڈینز کے عوض افریقہ کے طاقتور حبشیوں سے کام لیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس سرزمین پر غلامی رائج کر دی جائے۔ لیکن ہوا ایسا ہی۔ افریقہ کے مغربی ساحل سے حبشی زبردستی پکڑ لئے جاتے تھے۔ انھیں جہازوں

میں بھر لیا جاتا تھا اور یہاں لا کر بازار میں فروختنی اشیا کی طرح فروخت کر دیا جاتا تھا۔ ان کی زندگی خاصی مشکل تھی۔ انھیں اکثر جسمانی سزا دی جاتی تھی اور کھانے کو بہت کم دیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں کو جب کبھی موقع ملتا یہ جنگلوں میں بھاگ جاتے تھے۔ ان کی اولاد ابھی تک جنگلوں میں زندگی بسر کر رہی ہے۔ انھیں "بش نیگروز" یا "جوئیکاز" کہا جاتا ہے اور اُن کی تعداد کوئی بائیس ہزار ہے۔

بش نیگروز اور امرانڈینز سرینام کی دو ابتدائی آبادیاں ہیں۔ امرانڈینز جن کی تعداد چار ہزار ہے زیادہ تر ملک کے جنوبی حصے کے گھنے جنگلوں میں رہتے ہیں۔ اُن کا گزارہ شکار اور ماہی گیری پر ہے۔ "جوئیکاز" قدرے شمال کی طرف رہتے ہیں۔ اور امرانڈینز اور ملک کے جنوب حصے کے درمیان ایک طرح کا رابطہ بنے ہوئے ہیں۔

انیسویں صدی میں غلامی کو ایک سماجی بُرائی قرار دے دیا گیا اور سنہ ۱۸۳۳ء میں انگلستان میں اپنی تمام نوآبادیوں میں جن میں برٹش گی آنا بھی شامل تھی غلامی کا قلع قمع کر دیا گیا۔ لیکن سرینام کو یہ روز سعید یکم جولائی سنہ ۱۸۶۳ء کو دیکھنا نصیب ہوا۔ جب کہ تقریباً تینتیس ہزار غلاموں کو آزادی کی نعمت عطا ہوئی۔ جو انسان کا پیدائشی حق ہے۔ چنانچہ سرینام میں سریولز کے لئے یکم جولائی کا دن ایک قومی دن کی حیثیت رکھتا ہے۔ (سرینام میں ان آزاد شدہ غلاموں کی اولاد خواہ وہ خالص نیگرو ہیں یا ملے جلے خون کے لوگ ہیں۔ سریولز کہلاتی ہے)

چونکہ یہ حقیقت آشکارا تھی کہ آزاد شدہ غلام کھیتوں میں کبھی کام نہیں کریں گے۔ ڈچ حکومت نے اُنھیں آزادی دینے سے پہلے اس کام کے لئے مزدوروں کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ مزدوری کے لئے منتقل ہونے والے پہلے لوگ حبشی تھے جو انڈونیشیا (جاوا) سے پانچ سالہ معاہدے کے تحت آئے۔ لیکن جب یہ مدت ختم ہو گئی تو وہ کھیتوں پر نہ رہے بلکہ دارالحکومت اور دوسری جگہوں پر آباد ہو گئے۔ اور انھوں نے تجارت کو اپنا پیشہ بنا لیا۔ آج یہ لوگ سرینام میں دولت مند تاجر ہیں۔ انکی تعداد کوئی چار ہزار کے قریب ہے۔

اس ناکامی کے بعد انھیں شرائط کے تحت لبنان سے لوگوں کو حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن ان لوگوں نے بھی معاہدے کی میعاد ختم ہونے

کے بعد کھیتوں میں کام کرنے سے انکار کر دیا۔ آج کل ان میں سے اکثر لوگ تجارت پیشہ ہیں ان کی تعداد بہت کم ہے (کوئی ایک ہزار) اور یہ "شامی" کہلاتے ہیں۔

۱۸۶۳ء میں جب غلاموں کو آزادی ملی تو اُس کا وہی نتیجہ ہوا جو نظر آرہا تھا آزاد شدہ غلاموں نے کھیتوں میں کام کرنا چھوڑ دیا، اور اُن میں زیادہ تر راجدھانی میں آباد ہو گئے۔ آج سریولز آبادی کا سب سے بڑا حصہ ہیں (کوئی اسی ہزار) یہ زیادہ تر تعلیم یافتہ طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں اور بہت اچھی پوزیشنوں پر ہیں۔

چونکہ سرینام ہمیشہ سے ایک زرعی ملک رہا ہے۔ اس لئے سریولز کے شہروں میں آباد ہو جانے سے ملک کی اقتصادیات کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ کھیتیاں ایک ایک کرکے تباہ ہوتی گئیں۔ لہٰذا حکومت نے انگلستان کے ساتھ اس مقصد کے پیش نظر ایک معاہدہ طے کیا کہ اسے ہندوستان سے کاشتکار مہیا کئے جائیں۔ چنانچہ جون ۱۸۷۳ء میں ہندوستانیوں کا پہلا جتھہ "لالہ رُخ" نامی بحری جہاز میں سوار ہو کر سرینام پہونچا۔

ان لوگوں کو پانچ برس تک کام کرنا تھا۔ اس کے بعد یہ اپنی مرضی سے واپس ہندوستان بھی جا سکتے تھے اور سرینام میں اقامت بھی اختیار کر سکتے تھے جہاں انھیں کھیتی کے لئے زمین کا ایک قطعہ بھی مل سکتا تھا۔ ان میں بعض لوگ تو ہندوستان واپس آگئے۔ لیکن ان کی بیشتر تعداد وہیں آباد ہو گئی اور چونکہ یہ لوگ محنتی تھے اس لئے کھیتوں کا کھویا ہوا جوبن پھر واپس آگیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بار بار ہندوستان سے کاشتکار بھرتی کئے جاتے رہے، اور ہندوستانیوں کی یہ آمد ۱۹۱۷ء تک جاری رہی۔ اس کے بعد یہ درآمد بند کر دی گئی۔ اس وقت تک کوئی چالیس ہزار ہندوستانی سرینام پہنچ کر اسے اپنا گھر بنا چکے تھے۔ آج اُن کی تعداد ساٹھ ہزار سے زیادہ ہے

اسی اثنا میں انڈونیشیوں کا داخلہ شروع ہوا تھا کیونکہ ہندوستانی کسی حد تک خطرناک سمجھے جانے لگے تھے۔ انھوں نے ایک پلانٹیشن منیجر کو ہلاک کر دیا تھا۔ یہ داخلہ بھی بہت کامیاب ثابت ہوا اور آج یہ انڈونیشی جن کی تعداد تقریباً چالیس ہزار ہے) ہندوستانیوں کے ساتھ ملک کی زراعت پیشہ آبادی کا ایک حصہ ہیں۔

ان کے علاوہ یہاں یورپین آباد ہیں جن میں زیادہ تر ڈچ ہیں۔ لیکن اُن کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ (تقریباً دو ہزار یا تین ہزار) اور یہ مختلف النوع آبادی دوستانہ اور برادرانہ طور پر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کر رہی ہے۔ اور زندگی بسر کر رہی ہے۔

اقتصادی پہلو

سرینام ایک بہت کم آباد ملک ہے۔ ۵۴۰۰۰ مربع میل زمین پر تقریباً ۲۱۵۰۰۰ نفوس آباد ہیں۔ بحر ظلمات کے ساتھ ساتھ ایک تنگ ساحلی علاقہ زیر کاشت ہے۔ باقی حصہ گھنے جنگلوں سے پُر ہے۔ جن میں دولت کے انبار لگے ہیں یہ ایسی دولت ہے جسے ابھی تک کسی نے ہاتھ نہیں لگایا۔

معاش کا سب سے زیادہ اہم ذریعہ زراعت ہے جو زیادہ تر ہندوستانیوں اور انڈونیشیوں کے ہاتھ میں ہے۔ کسی حد تک یورپینز (ہالینڈ نژاد) بھی یہ کام کرتے ہیں۔ چاول یہاں کی بڑی پیداوار ہے۔ اس سے صرف ملک کی ضروریات ہی پوری نہیں ہوتیں بلکہ اس کی برآمد بھی ہوتی ہے۔ بالخصوص ہالینڈ کو۔ ۱۹۴۹ء میں چاول کی کل برآمد ۲۱۰۹۲۲۳ گلڈر رہی۔ (ایک گلڈر = ۲ ۱/۲ روپیہ) اس کے بعد اہم پیداوار ہے پھل (نارنگیاں، انگور وغیرہ) ۱۹۴۹ء میں اس کی برآمد ۸۱۹۵۳۱۱ فلارین یا گلڈر رہی۔ کھانڈ اتنی مہیا ہوتی ہے کہ ملک کی ضروریات کو بآسانی پورا کر سکتی ہے۔ باقی پیداواریں ہیں ناریل۔ کافی اور کوکو وغیرہ۔

کان کنی کا کام بھی یہاں بہت اہم ہے۔ سب سے زیادہ مقدار میں برآمد کی جانے والی دھات کچا ایلومینیم ہے۔ ۱۹۴۹ء میں امریکہ میں اس کی برآمد ۲۵۷۷۲۰۵۱ فلارین کی تھی۔ دوسری جنگ عظیم میں امریکہ نے جو ہوائی جہاز استعمال کئے اُن میں ساٹھ فی صدی ایسے تھے جو سرینام سے حاصل شدہ کچے ایلومینیم سے بنائے گئے تھے۔

سونا یہاں بہت کم مقدار میں ملتا ہے اور بڑی مشکل سے دستیاب ہوتا ہے۔ ۱۹۴۹ء میں سونے کی برآمد ۲۹۵۵۹۶۴ فلارین تھی۔

جنگلوں سے بلاٹا بھی (ایک قسم کا ربڑ) حاصل ہوتا ہے جیسے سریولز

بڑی مشکلات سے جمع کرتے ہیں ۔ یہ امریکہ کو برآمد کیا جاتا ہے ۔ (۱۹۴۹ء میں ۵۰۹۸۱۱ فلارین کا بلاٹا امریکہ کو بھیجا گیا)

جنگلوں میں لکڑی بڑی بھاری تعداد میں دستیاب ہوتی ہے ۔ "جوتیکانز" درختوں کو کاٹتے ہیں اور لکڑی کے کُندوں کو دریاؤں کے ذریعے سے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے ہیں ۔ لکڑی کا بیشتر حصّہ ہالینڈ کو بھیجا جاتا ہے (وہاں ریلوے کے سلیپر اکثر سرینام سے جاتے ہیں) لیکن لکڑی کا استعمال سرینام میں بھی ہوتا ہے ۔ یہاں ایک پلائی وڈ فیکٹری ہے ۔ جہاں طیار کی ہوئی پلائی وڈ باہر کے ملکوں کو بھیجی جاتی ہے ۔ (۱۹۴۹ء میں ۱۵۳۵۲۱۲ فلارین کی پلائی وڈ باہر کے ملکوں کو بھیجی گئی) یہاں لکڑی مکانات کی تعمیر کے کام آتی ہے ۔ اکثر و بیشتر مکانات لکڑی کے بنے ہوئے ہیں ۔

لیکن اس کے باوجود سرینام کی درآمد برآمد سے زیادہ ہے ۔ ۱۹۴۹ء میں کل درآمد ۳۷۸۱۲۰۰۰۴ فلارین تھی جب کہ برآمد ۴۱۴۳۸۰۴۳۴ فلارین تھی ۔

سرمائے کی کمی سرینام کا ایک مشکل مسئلہ ہے ۔ یہاں ذرائع بہت ہیں لیکن اُنھیں استعمال کرنے کے لئے سرمائے کی کمی ہے ۔ غیر ملکوں کی طرف سے روپیہ لگانے کی بہت ضرورت ہے ۔ اور اس بات کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے ۔ حال ہی میں ہالینڈ نے چالیس ملین ڈچ گلڈر (پچاس ملین روپے) کا ایک "بہبود فنڈ" کام شروع کرنے کے لئے سرینام کر دیا ہے ۔

اقتصادی طور پر ہندوستانیوں کی حالت اچھی ہے لیکن دیہات میں اور راجدھانی میں بھی غریب لوگ موجود ہیں ۔ ہندوستانیوں کے پاس جب کچھ روپیہ جمع ہو جاتا ہے تو وہ زمین وغیرہ خریدنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ چنانچہ اب یہ کسی حد تک صاحبانِ جائداد بن چکے ہیں ۔ راجدھانی میں اُن کے پاس زمینوں کے ٹکڑے بھی ہیں ۔ اس کے خلاف سریولز زمینیں یا مکانات خریدنے کی طرف توجہ نہیں کرتے اور یہی وجہ ہے کہ اُن میں سے اکثر لوگوں کے پاس زمین وغیرہ نہیں ہے ۔

ہندوستانی

پہلی بات جو ہندوستان میں آ کر خاص طور پر میری توجہ کا باعث بنی یہ تھی کہ یہاں کے رہنے سہنے کے طور طریقے سرینام کے ہندوستانیوں کے رہنے سہنے کے طور طریقوں سے زیادہ مختلف نہیں ہیں ۔ وہاں ہندوستانیوں نے اپنی روایات اور تمدن کو برقرار رکھا ہے اور اُن کے رہنے سہنے کا طریقہ ہندوستان کے رہنے سہنے کے طریقے کی ایک نقل ہے ۔ لیکن تھوڑا سا فرق موجود ہے ۔

زیادہ تر ہندوستانی ہندو ہیں ۔ تقریباً بیس فی صدی مسلمان اور چار فی صدی عیسائی ہیں ۔ یہاں مذہب کی بنا پر کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا ۔ دیہات میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے پڑوس میں رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو بھائی بھائی سمجھتے ہیں ۔ جب کوئی تیوہار آتا ہے تو تمام ہندوستانی بلالحاظ مذہب و ملت اس میں شریک ہوتے ہیں ۔ ہولی کا تیوہار یہاں بہت مقبول ہے ۔ دیوالی پر چراغاں ہوتا ہے عید الفطر بھی منائی جاتی ہے ، اور محرم کی تقریبات بھی ۔ یہاں مندر بھی ہیں اور مسجدیں بھی ، جہاں اکثر بڑی بڑی تقریبات منائی جاتی ہیں ۔ ان تقریبات میں بڑی تعداد میں لوگ شامل ہوتے ہیں ۔ سرینام میں ست نارائن وارتا کتھا بہت مقبول ہے ۔ لیکن اکثر موقعوں پر ویدا اُپنشد ۔ گیتا اور بھاگوت بھی پڑھے جاتے ہیں ۔

ذات پات کی تمیز یہاں بالکل نہیں ہے ۔ ایک دوسرے کی ذاتوں میں شادیاں عام ہیں ۔ اکثر لوگوں کو خود یہ پتہ نہیں ہوتا کہ ان کی ذات کیا ہے ۔ ہندوستانیوں کی طرف سے ایک دوسرے کی نسل میں شادیوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی ۔ سرینام میں اُن کے اسّی برس کے قیام کے دوران میں سریولز کے ساتھ ان کی بہت کم شادیاں ہوئی ہیں ۔ سریولز کے ساتھ یہ بالکل دوستانہ طور پر رہتے ہیں ۔ لیکن ان کے رہنے سہنے کا طریقہ اُن سے خاصا مختلف ہے ۔ سریولز زیادہ تر مغربی طرز زندگی کے دلدادہ ہیں ۔ اور ہندوستانی اپنا ہندوستانی طرز زندگی پسند کرتے ہیں ۔

شادی کا طریقہ نہ تو وہ ہے جو اب سے کئی سال پہلے ہوا کرتا تھا ۔ یعنی یہ کہ ماں باپ ہی طے کر دیں اور نہ ہی محبّت کی شادی کا رواج پڑا ہے ۔ بلکہ ان دونوں کے درمیان کا ایک راستہ پیدا ہو چکا ہے ۔ ماں باپ طے بھی کرتے ہیں اور پھر لڑکے لڑکی کو ملنے جُلنے اور بات چیت کرنے کی آزادی

بھی ہوتی ہے۔ لڑکے لڑکیاں یہاں برسرِعام سڑکوں پر چلتے پھرتے کم دکھائی دیتے ہیں۔

بیوہ کی شادی پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ طلاق بھی حاصل کی جاسکتی ہے، لیکن خاصی دقت سے کیونکہ سرینام کا قانون اس معاملے میں ذرا سخت واقع ہوا ہے۔ پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں کی شادیاں حکومت کے رجسٹر میں درج نہیں ہوا کرتی تھیں، لیکن اب اُنھیں رجسٹر میں درج کرکے قانونی صورت دی جاتی ہے۔ حکومت کی طرف سے بعض پنڈتوں اور مولویوں کو رجسٹریشن آفیسر مقرر کیا جاتا ہے۔

لباس بالعموم مغربی وضع کا ہوتا ہے۔ دیہات میں عورتیں ابھی تک لہنگا اور چھبا پہنتی ہیں۔ لیکن شہروں میں فراک کا رواج عام ہے۔ ساڑی کو یہاں بہت پسند کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ بہت مہنگا لباس ہے، کیونکہ دوکانوں میں تو یہ فروخت نہیں ہوتیں۔ آرڈر دے کر منگوائی جاتی ہیں۔ خاص خاص مواقع پر مثلاً شادی بیاہ کے وقت متمول گھرانوں کی عورتیں ساڑی استعمال کرتی ہیں۔

خوراک بھی وہی ہے جو ہندوستانیوں کی ہے۔ دال۔ بھات (چاول) اور روٹی عام کھاتے ہیں۔ اصل خوراک چاول ہے۔ چٹنی، اچار اور مسالوں کا استعمال عام ہے۔ اکثر ہندوستانی مٹھائیاں بہت مقبول ہیں۔

ہندوستانیوں کے گھروں کی زبان ہندی سے ملتی جلتی ہے (کیونکہ اکثر ہندوستانی اُتر پردیش سے آئے تھے) لیکن وہ معیاری ہندی اور اُردو پڑھتے ہیں۔ ہندی اور اُردو پڑھانے کا انتظام پرائیویٹ اداروں میں ہے۔ سرکاری اسکولوں میں ہندی اور اردو کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں۔ کیونکہ سرکاری زبان ڈچ ہے۔ اور جب ایک بچہ چھ برس کی عمر میں اسکول میں داخل ہوتا ہے تو اس کی تعلیم ڈچ زبان میں شروع ہو جاتی ہے۔

ہندوستانیوں میں تقریباً ۸۰ یا ۹۰ فی صدی ڈچ زبان سے ناآشنا ہیں لیکن اب وہ اس زبان میں بڑی تیزی سے مہارت حاصل کر رہے ہیں۔ کیونکہ اس کی بدولت نوکریوں کے دروازے ان پر کھل سکتے ہیں۔ اگرچہ اکثر ہندوستانی زراعت پیشہ ہیں، لیکن ان میں بعض ڈاکٹر، وکیل، لیکچرار، ٹیچر اور افسر بھی ہیں۔ بعض تاجر بن گئے ہیں، اور اُن کا اچھا کاروبار چل رہا ہے۔ ایک ڈسٹرکٹ کمشنر بھی ہندوستانی ہے۔ اُن کا نام کولبیسر شکلا ہے۔ آپ ایم، اے ہیں اور سنسکرت کے بڑے عالم ہیں۔ صحت اور تعلیم کا وزیر بھی ہندوستانی ہی ہے۔ ان کا نام مسٹر ڈبلیو میگ لال ہے۔ لیجسلیٹو کونسل میں چھ ہندوستانی ممبر ہیں۔

وہاں کے ہندوستانی ابھی تک ہندوستان کو اپنی "بھارت ماتا" سمجھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اُن کے اصل دیش کے ساتھ جس کی اُن کے دل میں بڑی عزت ہے، اُن کے ثقافتی روابط پیدا ہوں لیکن سیاسی طور پر اُن کا ہندوستان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

چاول کا جاپانی طریقۂ کاشت

پوسا (نئی دہلی) میں بھارت میں زرعی تحقیق سے متعلقہ انسٹی ٹیوٹ میں پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے تقریباً ایک سو چالیس ممبروں کی موجودگی میں چاول کے جاپانی طریقۂ کاشت کی نمائش کی گئی۔ اُن کے سامنے جاپانی طریق کاشت کے اہم پہلوؤں کی وضاحت کی گئی۔ اس طریقہ کے مطابق بیج کو پہلے نمکین پانی میں بھگو دیا جاتا ہے۔ ہلکا اور گھٹیا قسم کا بیج اس پانی کی سطح پر تیرنے لگتا ہے۔ اس طرح گھٹیا بیج کو الگ کر دیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ممبروں کو بتایا گیا کہ کیاریاں کس طرح بنائی جاتی ہیں، اور پنیری کس طرح لگائی جاتی ہے۔

پارلیمنٹ کے ممبر، وزیر زراعت ڈاکٹر پنجاب راؤ دیش مکھ کی دعوت پر یہاں تشریف لائے۔ انھوں نے زرعی تحقیقی انسٹی ٹیوٹ کی مختلف لیباریٹریوں کا معائنہ کیا۔ انجینیئرنگ ڈویژن میں انھوں نے دیکھا کہ ماہرین کس طرح دیسی زرعی اوزاروں کو بہتر بنانے کے لئے مصروفِ عمل ہیں۔ فصلوں کی مختلف بیماریوں اور اُن پر قابو پانے کے طریقوں کے بارے میں بھی انھیں ضروری واقفیت بہم پہونچائی گئی۔ تمام ممبران انسٹی ٹیوٹ کی سرگرمیوں سے بڑے متاثر ہوئے۔

بھی ہوتی ہے۔ لڑکے لڑکیاں یہاں برسرِ عام سڑکوں پر چلتے پھرتے کم دکھائی دیتے ہیں۔

بیوہ کی شادی پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ طلاق بھی حاصل کی جا سکتی ہے، لیکن خاصی دقت سے کیونکہ سرینام کا قانون اس معاملے میں ذرا سخت واقع ہوا ہے۔ پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں کی شادیاں حکومت کے رجسٹر میں درج نہیں ہوا کرتی تھیں، لیکن اب انھیں رجسٹر میں درج کرکے قانونی صورت دی جاتی ہے۔ حکومت کی طرف سے بعض پنڈتوں اور مولویوں کو رجسٹریشن آفیسر مقرر کیا جاتا ہے۔

لباس بالعموم مغربی وضع کا ہوتا ہے۔ دیہات میں عورتیں ابھی تک لہنگا اور جھمپا پہنتی ہیں لیکن شہروں میں فراک کا رواج عام ہے۔ ساری کو یہاں بہت پسند کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ بہت مہنگا لباس ہے، کیونکہ دوکانوں میں تو یہ فروخت نہیں ہوتیں۔ آرڈر دے کر ملیّا رکر دی جاتی ہیں۔ خاص خاص مواقع پر مثلاً شادی بیاہ کے وقت متمول گھرانوں کی عورتیں ساری استعمال کرتی ہیں۔

خوراک بھی وہی ہے جو ہندوستانیوں کی ہے۔ دال۔ بھات (چاول) اور روٹی عام کھانے ہیں۔ اصل خوراک چاول ہے۔ چٹنی، اچار اور مسالوں کا استعمال عام ہے۔ اکثر ہندوستانی مٹھائیاں بہت مقبول ہیں۔

ہندوستانیوں کے گھروں کی زبان ہندی سے ملتی جلتی ہے (کیونکہ اکثر ہندوستانی اُتر پردیش سے آئے تھے) لیکن وہ معیاری ہندی اور اُردو پڑھتے ہیں۔ ہندی اور اُردو پڑھانے کا انتظام پرائیویٹ اداروں میں ہے۔ سرکاری اسکولوں میں ہندی اور اردو کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں۔ کیونکہ سرکاری زبان ڈچ ہے۔ اور جب ایک بچّہ چھ برس کی عمر میں اسکول میں داخل ہوتا ہے تو اس کی تعلیم ڈچ زبان میں شروع ہو جاتی ہے۔

ہندوستانیوں میں تقریباً ۸۰ یا ۹۰ فی صدی ڈچ زبان سے ناآشنا ہیں لیکن اب وہ اس زبان میں بڑی تیزی سے مہارت حاصل کر رہے ہیں۔ کیونکہ اس کی بدولت نوکریوں کے دروازے ان پر کھل سکتے ہیں۔ اگرچہ اکثر ہندوستانی زراعت پیشہ ہیں، لیکن ان میں بعض ڈاکٹر، وکیل، لیکچرار، ٹیچر اور افسر بھی ہیں۔ بعض تاجر بن گئے ہیں، اور اُن کا اچھا کاروبار چل رہا ہے۔ ایک ڈسٹرکٹ کمشنر بھی ہندوستانی ہے۔ اُن کا نام کولیسر شکلا ہے۔ آپ ایم، اے ہیں اور سنسکرت کے بڑے عالم ہیں۔ صحت اور تعلیم کا وزیر بھی ہندوستانی ہی ہے۔ ان کا نام مسٹر ڈبلیو میگ لال ہے۔ لیجسلیٹو کونسل میں چھ ہندوستانی ممبر ہیں۔

وہاں کے ہندوستانی ابھی تک ہندوستان کو اپنی "بھارت ماتا" سمجھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اُن کے اصل دیش کے ساتھ جس کی اُن کے دل میں بڑی عزّت ہے، اُن کے ثقافتی روابط پیدا ہوں لیکن سیاسی طور پر اُن کا ہندوستان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

چاول کا جاپانی طریقۂ کاشت

پوسا (نئی دہلی) میں بھارت میں زرعی تحقیق سے متعلقہ انسٹی ٹیوٹ میں پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے تقریباً ایک سو چالیس ممبروں کی موجودگی میں چاول کے جاپانی طریقۂ کاشت کی نمائش کی گئی۔ اُن کے سامنے جاپانی طریق کاشت کے اہم پہلوؤں کی وضاحت کی گئی۔ اس طریقہ کے مطابق بیج کو پہلے نمکین پانی میں بھگو دیا جاتا ہے۔ ہلکا اور گھٹیا قسم کا بیج اس پانی کی سطح پر تیرنے لگتا ہے۔ اس طرح گھٹیا بیج کو الگ کر دیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ممبروں کو بتایا گیا کہ کیاریاں کس طرح بنائی جاتی ہیں، اور پنیری کس طرح لگائی جاتی ہے۔

پارلیمنٹ کے ممبر۔ وزیر زراعت ڈاکٹر پنجاب راؤ دیش مکھ کی دعوت پر یہاں تشریف لائے۔ انھوں نے زرعی تحقیقی انسٹی ٹیوٹ کی مختلف لیبارٹریوں کا معائنہ کیا۔ انجینئرنگ ڈویژن میں انھوں نے دیکھا کہ ماہرین کس طرح دیسی زرعی اوزاروں کو بہتر بنانے کے لئے مصروفِ عمل ہیں۔ فصلوں کی مختلف بیماریوں اور اُن پر قابو پانے کے طریقوں کے بارے میں بھی انھیں ضروری واقفیت بہم پہونچائی گئی۔ تمام ممبران انسٹی ٹیوٹ کی سرگرمیوں سے بڑے متاثر ہوئے۔

دهلی کی دو هردلعزیز شخصیتیں

جن کا پچھلے دنوں انتقال هوگیا

مسٹر آصف علي جو سوئٹزر لینڈ
میں هندوستانی سفیر کے فرائض
انجام دیتے هوئے انتقال فرما گئے۔
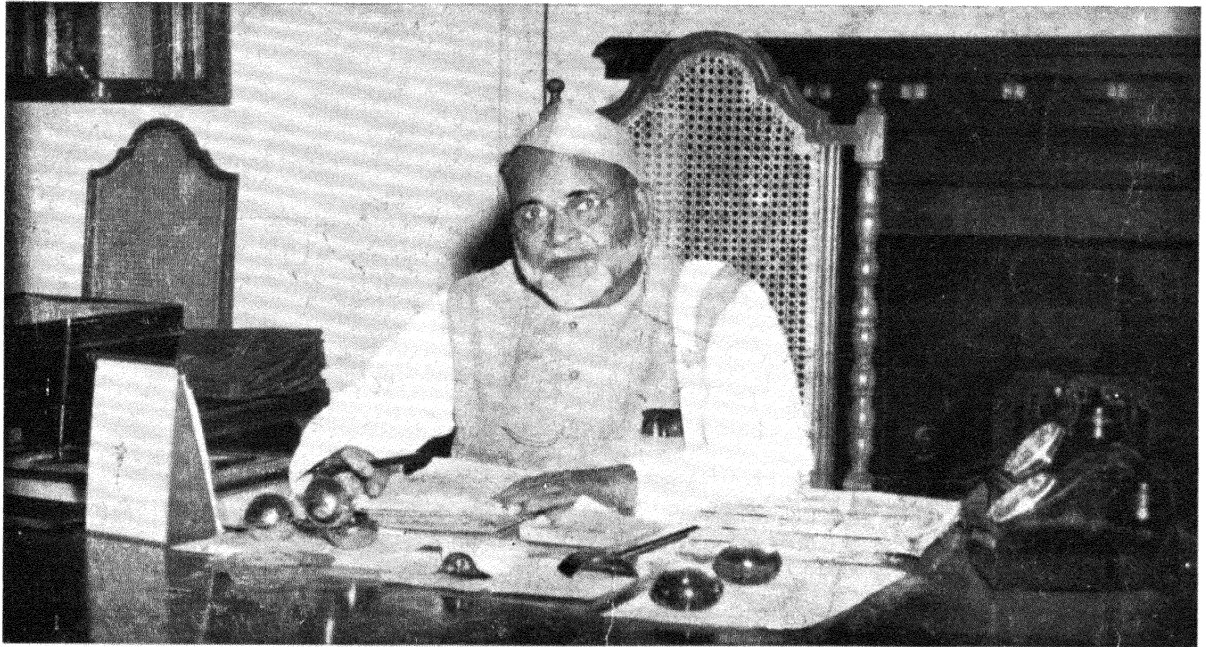
مولینا شفیق الرحمن قدوائي (وزیر تعلیم دهلي) جنهوں نے ایک مختصر علالت کے بعد
ولنگٹن هسپتال نئي دهلي میں داعي اجل کو لبیک کہا۔
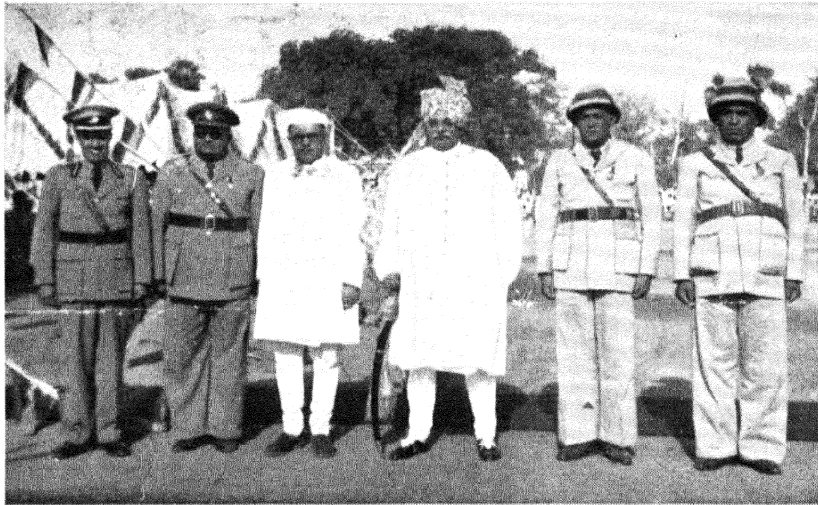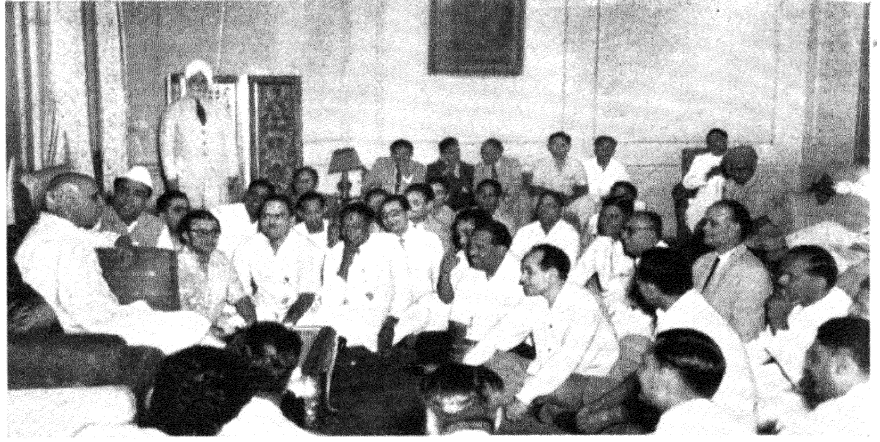
پردھان منتري شري جواھر لال نہرو اپني قیام گاہ پر "مختلف پردیشوں کے ڈیویلپمینٹ کمشنروں کو ھدایات دے رھے ھیں اور اُن پر پنج سالہ پلان کي اھمیت واضح کر رھے ھیں-

حال ھي میں سوراشٹر میں سوراشٹر ڈے منایا گیا اور تین پولیس افسروں شري میگھا ، شري دولت سنگھ جي اور شري دوست محمد کو ڈاکوؤں کي سرکوبي کرنے کے لئے مھاراجہ جام صاحب نواں نگر نے تمغے عطا کئے - بائیں سے دائیں- شري کینٹکر آئي. جي پولیس ، شري میگھا ، شري پاریکھر ھوم منسٹر ، ھز ھائي نیس راج پرمکھ ، شري دولت سنگھ جي اور شري دوست محمد

ریلوے اور ٹرانسپورٹ کے وزیر شري لال بہادر شاستري بلیا (ضلع ایٹہ) کے ایک پبلک جلسے میں تقریر کر رھے ھیں-

علاقہ چمبہ کا لوک ناچ

(سرجیت سنگھ)

عباس بیگ محشر

عشق پیچاں کا شرابی

ہوا میں جھولتی ہے بیل عشقِ پیچاں کی
ہیں پیچ ڈنا ب میں زلفیں نگارِ بستاں کی

یہ سُرخ سُرخ گلوں کی صُراحیوں کا نکھار
نشے سے کانپتے ہاتھوں کا جامِ آتش بار

شفق کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ستارے ہیں
فروغِ آتشِ سیّال کے شرارے ہیں

ہوا میں تیرتا ننھا سا ایک موسیقار
پھدک پھدک کے بجاتا ہوا فضا میں ستار

ہوا کے جھونکے سے اُترا چمن کے جھولوں میں
ٹھہر ٹھہر کے چہکتا ہے سرخ پھولوں میں

یہ اپنی رُوح کو کرتا ہے اور بھی سرشار
گلوں کے ساغرِ رنگیں میں ڈال کر منقار

سیاہ مست ہے پی کر شراب پھولوں کی
پھدک پھدک کے بڑھاتا ہے پینگ جھولوں کی

وفورِ نشہ میں کیسا خیالِ میخانہ
چھلک گئی وہ صراحی جھکا وہ پیمانہ

صبا جو تھپکیاں دے دے کے ہوش میں لائی
فضا کی سیر طبیعت کو جوش میں لائی

ٹھہر ٹھہر کے اُڑا اب حسین نظارہ ہے
فضائے چرخ میں ننھا سا ایک تارہ ہے

یحییٰ اعظمی

غزل

دمِ آخر یہ اشکوں کی روانی دیکھتے جاؤ
محبت میں مآلِ زندگانی دیکھتے جاؤ

مری آنکھوں کا جوشِ خونفشانی دیکھتے جاؤ
نگاہِ شوق کی رنگیں بیانی دیکھتے جاؤ

بہا جاتا ہے دل آنکھوں سے بہم اشکِ غم ہو کر
ہو لہو عشق میں ہوتا ہے پانی دیکھتے جاؤ

کوئی خاموش ہے اور آہ تم ہو وقف بیتابی
یہ تاثیرِ کمالِ بے زبانی دیکھتے جاؤ

تماشا دیدنی ہے رقصِ بسمل کا ٹھہر جاؤ
جمالِ نوبہارِ زندگانی دیکھتے جاؤ

غزل

کہاں ہے تاب اسے بھلا جمالِ بے حجاب کی
نگاہِ شوق کو ہیں بس تجلیاں نقاب کی

یہ گرمیِ جمال سے عرق ہے روئے یار پر
کہ گل کدہ میں ہو رہی بارشیں گلاب کی

کسی کی چشمِ مست کی نواز شوں کے دم سے ہے
یہ سرخوشی شراب کی یہ بیخودی شباب کی

وہ کیفِ ربطِ اللہ اللہ ابتدائے شوق کا
نگاہیں احتیاط کی ادائیں اجتناب کی

وہ روئے دل فروز ہے کہ اک کلی کھلی ہوئی
وہ لعلِ جاں نواز ہے کہ پنکھڑی گلاب کی

غضب کی ہیں جنجل نوازروئے گل پہ صبحدم
تموّج آفرینیاں شعاعِ آفتاب کی

دل و جگر میں آج ہے اک آگ سی لگی ہوئی
تڑپ تھی موجِ برق کی نوا نہ تھی رباب کی

صدیقہ بیگم

فسادی کی موت

یہ ہوگی کوئی پانچ سال پہلے کی بات، جب یہ دیس آزاد ہو چکا تھا۔
یہ اُسی سال کی کہانی ہے جب ہمیشہ کی طرح بسنت کی رُت آئی۔ ہر چیز بسنتی
رنگ میں ڈوب گئی۔ کیا کنواری کیا بیاہی، ہر ایک نے بسنتی دوپٹہ اوڑھ
لیا۔ لیکن اس بار تو اس رنگ میں سیاہی جھلکنے لگی۔ بسنتی رنگ ہی جیسے
کہیں اُڑ گیا ہو۔ پریاں چُرا کر لے گئیں۔ یہ رنگ خوبصورت ہوتا ہے نا۔
اسی لئے تو ہر اوڑھنی جیسے خون میں رنگی ہو، سیاہ دھبّے جیسے دلہن
کی مانگ سے سیندور کہیں غائب ہو گیا، جیسے اس کے ماتھے کی بندی
کسی نے نوچ لی۔ اس کا سہاگ کسی نے لُوٹ لیا ہو۔ اس کا کنوارپن
کسی نے چھین لیا ہو، اور یہ سرسوں کے پیلے پیلے پھولوں پر کسی نے
خون چھڑک دیا۔ ہاں یہ انھیں دنوں کی کہانی ہے۔ گزری ہوئی بات
کہانی ہی تو بن جاتی ہے۔ میں ٹرین میں سفر کر رہی تھی۔ ریل کے ڈبّے
کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ مجھے انٹر کلاس کے زنانے ڈبّے میں جگہ مل گئی
گاڑی پوری رفتار کے ساتھ آہنی پٹریوں پر دوڑ رہی تھی۔ میں شام کے کھلائے
ہی اونگھنے لگی۔ لیکن میرے کانوں میں گاڑی کی کھٹ کھٹ سنائی دے
رہی تھی، جیسے اختلاجی مریض کے دل کی دھڑکن۔ میں نے ذرا سی دیر
میں آنکھ کھول کر دیکھا لیکن باہر اندھیرا گھُپ تھا۔ ڈبّے میں ہلکی ہلکی روشنی
تھی اور یکبارگی یہ روشنی تیز سی ہوتی ہوئی معلوم ہوئی، اور میں نے
ڈبّے میں بیٹھی ہوئی عورتوں کا جائزہ لیا۔ تقریباً سبھی عورتوں کی
گود میں ننھے مُنّے بچّے تھے۔ ایک مدراسن جو میرے قریب بیٹھی ہوئی
تھی وہ بار بار اپنے بچّے کو پیار کر رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ کھڑکی سے باہر
چاند کی طرف دیکھ لیتی، اور پھر اپنے بچّے کے گھنگھریالے بالوں سے کھیلنے
لگتی اور پھر دوسرے لمحے اپنے دونوں ہونٹ اُس کے گالوں میں پیوست
کر دیتی جیسے اُس کے سیاہ گالوں میں شہد ہی تو گھُلا ہوا ہے۔

سامنے والی برتھ پر ایک پنجابن بیٹھی ہوئی اپنے خوبصورت سے
بچّے کو دودھ پلا رہی تھی۔ بچّہ دودھ پیتا جاتا تھا اور کبھی کبھی لاپروائی سے
منہ پھیر کر ہنسنے لگتا اور غوں غاں کرنے لگتا۔ اور پھر ذرا سی دیر کے بعد
اُسی طرح دودھ پینے میں مشغول ہو جاتا، گویا زندگی سے زندگی لے رہا تھا۔
بچّوں کے چہرے پر مسرّتیں کھیل رہی تھیں شرارتیں اُن کی آنکھوں میں
مچل رہی تھیں لیکن ان سب کی ماؤں کے چہرے اُداس تھے۔ سب کی
مسکراہٹوں کو جیسے کسی نے سر بازار نیلام کر دیا تھا، اور ٹھہر ٹھہر کر یہ عورتیں
فساد اور کشت و خون کے قصّے سنانے لگتیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس
وقت یہ مختصر سا ڈبّہ بہت سارے تجربوں کا مسکن بنا ہوا تھا، اور پنجابن
کے قریب ایک اور عورت بیٹھی تھی۔ گھونگھٹ کاڑھے ہوئے اُس کا بچّہ
بھی اُس کی آغوش میں تھا، وہ دودھ مانگ رہا تھا۔ عورت نے شرماتے
ہوئے اُس کو اپنی گود میں ٹھونس کر دودھ پلانا شروع کر دیا، اور پھر
سر جھکا کر اُسی طرح بیٹھ گئی۔ گھونگھٹ میں سے اُس کا سُرخ و سفید رنگ
جھلک رہا تھا اور وہ قطعی جذبات سے عاری معلوم ہوتی تھی لیکن پنجابن
کے چہرے پر خوف و ہراس کی بے شمار لکیریں تھیں اور جیسے جیسے یہ لکیریں
گہری ہوتی جاتیں وہ اپنے بچّے کو اور تیزی سے اپنی چھاتی میں چھپا لیتی۔
پنجابن نے شاید وقت گزارنے کے لئے ہی بات چیت شروع کر دی۔
"سنا ہے کہ کل اسی گاڑی میں کئی آدمی مارے گئے۔ دیکھو جو آج
خیریت سے چلی جائے۔"
سب عورتیں ہمہ تن گوش ہو گئیں۔ مگر کسی کی زبان سے ایک حرف
نہ نکلا۔ سب کی آنکھوں کے سامنے دنگا کرنے والے کیا مرد، کیا عورتیں،
کیا بچّے، جس کو جی چاہا آنکھ بند کر کے پھینک رہے تھے۔ سب کے چہروں
پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

گاڑی ایک اسٹیشن پر جا کر رُکی اور ذرا سی دیر میں چل پڑی۔ لوہے کی پٹریوں پر آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی کہ اچانک ایک آدمی ہمارے ڈبے میں گھس آیا۔ ایک ساتھ سب کی نگاہیں اس پر پڑیں۔ اس کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک خوفناک چمک سی تھی، وہ چمک جو جرم کرنے سے پہلے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ وہ ہم میں سے ہر ایک کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا اور جس کی طرف جا کر اُس کی نگاہ ایک لمحے کے لئے بھی رُک جاتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ نگاہ اُس کی سانس کے ساتھ اُس کے جسم میں داخل ہو گئی ہے اور اُس کا سانس اس ایک لمحے میں منجمد سا ہو جاتا۔ ہر چند وہ نگاہ پھر ہٹ کر دوسری طرف پہنچ جاتی مگر وہ نگاہ جو ایک بار سانس کے ساتھ اُتر گئی ہو وہ ایک ایسا زہر دم چھوڑ جاتی جو دل کی دھڑکن کا ہم نوا ہو جاتا۔

اور اس وقت مجھے گھڑی کی کھٹ کھٹ کی طرح سبھوں کی دل کی دھڑکن کی صدا سنائی دے رہی تھی، اور وہ فسادی جیسے ان دھڑکنوں کو اکٹھا کر رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی تھی اور گاڑی تیزی کے ساتھ بھاگ بھاگ کرتی چلی جا رہی تھی لیکن ہمارا دل تو دھک دھک کر رہا تھا۔ ہم سب کے دماغ مفلوج ہو گئے تھے جیسے اچانک کوئی بجلی گری ہو۔ جس نے ہماری تمام قوتوں کو سلب کر لیا ہو۔ سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ہر چیز ٹھہری ہوئی ہے منجمد ہے۔ زندگی میں کہیں بھی حرکت کے آثار نہیں ہیں۔ یہ جمود کچھ اضطراری سا تھا۔ کیونکہ فوراً ہی دوسرے لمحے عورتوں نے اپنے بچوں کو اپنی گود میں اور زیادہ اچھی طرح چھپا لیا، جیسے اُن کی گود امن و امان کا گہوارا ہو، اور بچے بھی گویا یہ سب کچھ سمجھ گئے تھے۔ وہ اپنے ننھے مُنے ہاتھوں سے اپنی ماؤں کی گود میں چمٹ گئے۔ اب انھیں کوئی نہیں چھین سکتا۔ اب انھیں کوئی نہیں مار سکتا۔ ماں کی ممتا دہکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کر سکتی ہے۔ جنگ کی بھٹی پر پانی چھڑک سکتی ہے۔

اور پھر وہ فسادی اس عورت کی طرف جھپٹا جو دیر سے سر جھکائے گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی تھی۔ میں نے فسادی کے آنے سے پہلے اُس کے چہرے کو دیکھا بھی نہ تھا۔ اُس کا بچہ دیر سے دودھ پی رہا تھا اور صرف فسادی کو دیکھ کر ہی اُس نے دودھ چھوڑا تھا۔ فسادی کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر اُس کے منہ سے جیسے چیخ ہی تو نکل گئی۔ مگر اس کی آواز کوئی بھی نہ سن سکا۔ اُس نے اپنا گھونگھٹ تو پہلے ہی اُلٹ دیا تھا۔ اس کے سر سے آنچل ڈھلک گیا۔ اس کی چھاتی کھلی کی کھلی رہ گئی۔ وہ دوپٹہ بھی نہ سرکا سکی۔ اس نے فوراً اپنے بچے کو اور تیزی سے اپنی گود میں چھپانے کی کوشش کی۔

لیکن اجنبی نے اُس کی گود سے بچے کو چھین لیا۔ ماں تلملا اُٹھی۔ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اُس کی ممتا بھرے دل پر کسی نے پتھر گرا دیا ہو۔ اجنبی نے اس کو گالیاں دیں۔

"سُور کی بچی! اس کو مجھ سے چھپا رہی ہے۔ ذرا سی دیر میں اس کا سر پٹری پر دکھائی دے گا۔ اور دو ٹکڑے ہو جائے گا"

اور میری آنکھوں کے سامنے سر کے دو ٹکڑے دکھائی دینے لگے جس کا بھیجا باہر نکلا ہوا تھا اور وہ آنکھیں جو چند لمحہ پہلے چمک رہی تھیں بے نور ہو گئیں۔ میں نے اس تصور کے خیال ہی سے اپنی آنکھوں کو بھینچ لیا، اور آنکھوں کا بند کرنا تھا کہ وہ اجنبی کی شکل اور ہیبت ناک روپ میں میرے سامنے آ گئی۔ جیسے وہ ہر ماں کی گود سے اُس کا بچہ چھین رہا ہے۔ اور اس کے ہات دیکھتے ہی دیکھتے نکیلے پنجوں میں تبدیل ہو گئے۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے میری آنکھیں بند کرنا بیکار تھا۔ اس لئے کہ اس درندے کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جو ملک الموت کی طرح اس ریل کے ڈبے کے دروازے کے پاس کھڑا تھا اور جس نے اپنے ہاتھوں میں بچے کو جکڑ رکھا تھا۔

اور وہ عورت جو عورت ہونے کے ساتھ ساتھ ماں بھی تھی جس کا دل ہر لمحہ ڈوبتا جا رہا تھا، وہ کانپ رہی تھی اور اس کی آنکھیں جیسے ان میں بصارت ختم ہو چکی تھی وہ پوری طاقت سے اپنی آنکھیں پھاڑ رہی تھی، جیسے کوئی اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرے اور وہاں ہر سمت اندھیرا تھا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے، وہ کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر آواز نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا، اور یہ حال اس کا ہی نہیں کم و بیش سب کی یہی کیفیت تھی۔ اجنبی کے ہاتھ میں جیسے ہر ایک عورت کا بچہ تھا۔

اب عورتوں نے اپنے بچوں کو اور زیادہ مضبوطی سے اپنی گود میں

ٹھونس لیا تھا۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح اپنے بچوں کو اس درندے کی نظروں سے چھپا دیں۔ کاش اس اجنبی کی آنکھیں پٹ ہو جائیں اور وہ کسی بچے کو نہ دیکھ سکے۔ وہ بندروں کی طرح اپنے بچوں کو اپنے سینوں سے چمٹائے ہوئے تھیں۔ اور وہ بچہ جو اجنبی کے پنجوں میں تھا اس کی عمر لگ بھگ دو سال کی تھی۔ فسادی نے بچے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر ایک بار غور سے دیکھا۔ بچے کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی، گویا وہ کھیل کھیل میں اوپر اٹھا لیا گیا ہے۔ جیسے اجنبی اُسے اُچھال کر پھر ہاتھوں میں لے لے گا، اور اس کے رخسار پر ایک ہلکا سا پیار کرے گا۔

وہ اس ماحول سے کس قدر بے خبر تھا اس کو یہ بھی نہ معلوم تھا کہ اب اس کا سر ریل کی بے حس سیاہ پٹری پر دکھائی دے گا، اور دو ٹکڑے ہو جائے گا۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی، جن کو یہ بھی احساس نہ تھا کہ اب وہ بے نور و بے بصر ہو جائیں گی۔ بچہ اپنے ننھے منے ہات اجنبی کے ہاتھوں پر پھیر رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا — اور یہ سب کچھ اس ایک لمحہ میں ہو گیا جس کے فوراً بعد ہی بچے کی زبان سے ایک آواز نکلی ——— "ابا" ——— "ابا"

اور پھر یہ آواز اس بھیانک خاموشی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے خوب زور زور سے گونجی — اور اس آواز کے ساتھ ریل کی گھڑگھڑاہٹ سنائی دینے لگی جس سے فضا کا بھیانک سناٹا درہم برہم ہو گیا، جیسے وہ جمود یکبارگی پگھل گیا۔

اور ہم سب نے دیکھا کہ اس وقت فسادی کے چہرے کی رنگت تبدیل ہو گئی، اس کی آنکھوں کی وہ چمک غائب ہو گئی۔ اس کے چہرے کی وہ درندگی اسی لمحہ اس کے چہرے میں غائب ہو گئی۔ بچہ اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ڈبہ میں گر گیا اور زور سے چیخا — جیسے وہ اس سناٹے کے خلاف احتجاج کر رہا ہو اور اس بچے کی چیخ کے ساتھ اجنبی کی بھی چیخ نکل گئی۔ اور وہ کھڑکی کے باہر کود گیا۔

ایسا معلوم ہوا کہ فضا میں کوئی دھماکا ہوا — میں نے اُٹھ کر زنجیر کھینچی اور بات کی بات میں گاڑی رُک گئی — اور ذرا سی دیر میں ہم نے دیکھا کہ اس کی لاش تڑپ رہی تھی، اُس کا سر چکنا چور ہو گیا تھا۔ اُس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں جیسے وہ کوئی داستان کہہ رہی ہوں۔ اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے دم توڑ دیا۔ لیکن وہ آنکھیں بدستور کھلی ہوئی تھیں۔

میرے پاس وہ عورت اپنا بچہ لئے کھڑی تھی۔ میں نے غور سے بچے کی طرف دیکھا، بچہ زندہ تھا مگر وہ فسادی مر گیا تھا، اور فسادی تو اس سانحے سے پہلے ہی مر گیا تھا جبکہ بچہ اُس کے ہاتھ سے چھوٹا تھا۔

"آج کل" کا سالنامہ

۱۹۵۳ء

اگست ۱۹۵۳ء کا شمارہ سالنامہ ہوگا۔ جو شعر و شاعری کے لئے وقف کیا جائے گا۔ اس میں اردو اور ہندوستان کی مختلف زبانوں کی شاعری سے متعلق مضامین اور شاعری کے نمونے درج ہوں گے۔ حسب سابق یہ سالنامہ رنگین اور دوسری تصاویر سے مزین ہوگا۔ امید ہے کہ اپنی افادیت کی بنا پر یہ ملک میں بہت مقبولیت حاصل کرے گا۔ قیمت وہی آٹھ آنے فی پرچہ ہوگی۔ ایجنٹ حضرات اپنی زائد ضروریات سے ابھی مطلع کر دیں۔ مشتہرین اس موقع سے فائدہ اُٹھائیں۔

ڈسٹری بیوشن آفیسر پبلی کیشنز ڈویژن اولڈ سکریٹریٹ دہلی

گجندر سنگھ

بڑے آدمی

آج ایک بڑا آدمی سیر و سیاحت کے لئے شہر سے باہر جا رہا ہے۔ اس کے اعزاز میں اس کی فلک بوس کوٹھی کے مناروں کے نیچے ایک بڑی دعوت ہے۔ شاید اس دعوت کے طفیل وہ اپنے دوستوں سے ملنا چاہتا ہے۔ اُن کے نزدیک بیٹھ کر شاید اُس کے گالوں کی زرد زرد رنگت میں تھوڑی دیر کے لئے گلاب کی لالی آجائے یا وہ ان سب کو ایک مرتبہ پھر اپنی امارت اور وقار کے بوجھ تلے مسل دینا چاہتا ہے۔ بہر طور اُس کی کوٹھی میں آج بڑی رونق ہے۔ لوگ جوق در جوق چلے آتے ہیں۔ اُس کے نہایت عزیز دوست کوٹھی میں اس طرح گھوم پھر رہے ہیں گویا اس بات کا فخر ہی ان کے رتبے کو بڑھا دے گا۔

آج بڑے آدمی نے ایک خوبصورت اچکن اور چوڑی دار پائجامہ پہنا ہے۔ وہ ہمیشہ یہی لباس پہنتا ہے۔ گو اس کے لڑکے مغربی لباس کے بغیر اپنے کو برہنہ محسوس کرتے ہیں اور اُس کی بیٹیاں اور بہوئیں اپنے نیم عریاں لباس کو اور بھی کم کرنے کی فکر میں مبتلا رہتی ہیں۔ انھوں نے روز روز کی لعنت کو دور کرنے کے لئے اپنے لمبے بال محض کاکل آرائی میں تبدیل کر لئے ہیں۔ لیکن وہ خود اور اُس کی امیر اور بھاری بھرکم بیوی سادہ لباس ہی میں رہتے ہیں۔ کیونکہ وہ کتنا ہی چاہیں ان کے پرانے خیالات اور احساسات بدل نہیں سکتے۔ گو انھوں نے بہترین لباس پہن لئے ہیں اور عالیشان سوٹ اور فلک بوس کوٹھی کا پس منظر اُن سے مرعوب ہونے کے لئے انسان کو مجبور کر دیتا ہے۔ اور وہ جھک کر آداب کہہ دیتا ہے۔ لیکن اتنے قیمتی اور خوشگوار ماحول میں مجھے بڑے آدمی کے جلد کی سیاہی اور اُس کی آنکھوں کی بیزاری یا ماتھے کی شکنیں نظر آنے لگتی ہیں۔ ناک کے دونوں طرف گالوں کے گڑھے جو اب بھر چکے ہیں، پھر سے تازہ ہونے لگتے ہیں اور میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اس ماحول سے مجھے دور لے جانا چاہتا ہے۔ اتنے شور و غل میں میں اس کے ساتھ دور جانا نہیں چاہتا میں بھی اتنے پسندیدہ نظارے کو اچھی طرح ذہن میں بسا لینے کے لئے اسے دیکھتے رہنا چاہتا ہوں لیکن وہ میرے ہاتھ پکڑ لیتا ہے اور مجھے دور کھینچتا ہے۔ جانے میری طاقت اب بڑھاپے کی وجہ سے ختم ہو رہی ہے یا اُس کے ہاتھوں میں مجھ سے واقعی زیادہ طاقت ہے۔ وہ مجھے اس پیپل کے درخت کے نیچے سے دور دھکیلنا چاہتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ میں اس پُر رونق ماحول کو دیکھتا رہوں اور پیپل کے تنے سے پیٹھ لگائے سب کو ہنستے کھیلتے محسوس کر سکوں۔ اس کی اچکن اور چوڑی دار پائجامے کی نفاست اور عمدگی میں مجھے شک نہیں لیکن اُس کے خد و خال وہی ہیں —— میں اسے اچھی طرح دیکھ کر میں دل میں دُہرا لینا چاہتا ہوں —— مجھے یقین ہے۔ مجھے کوئی دیکھ رہا ہے نہیں رہا اور کوئی ہنسے گا بھی نہیں —— وہ میرا دوست ہے —— میرا دوست!

اُس نے دوستوں کو مدعو کیا ہے اور تقریباً سبھی اپنے اہم ترین کاموں کو چھوڑ کر یہاں پہنچ رہے ہیں۔ کیونکہ بعد میں اگر وہ یہ کہہ دیں گے کہ وہ اس کے یہاں مدعو تھے تو لوگ اُس کی تائید کے لئے انھیں مسکرا کر دیکھیں گے —— میں یہاں بھی آ کھڑا ہوا ہوں۔ وہ میرے پاس سے کتنی بار گزر چکا ہے، اس نے ترچھی نظروں سے مجھے ایک دو بار دیکھا بھی ہے۔ بار بار اسے یاد آ جاتا ہے کہ سیٹھ دھنّا مل بھی مدعو ہے اور میں اس کے ساتھ آیا ہوں کیونکہ اُس کے چہرے کے بل یکدم دور ہو جاتے ہیں۔ وہ ضرور لمبا سانس لے کر سوچتا ہوگا کہ میرے آنے سے کوئی خلل واقع نہیں ہوا وہ میرا دوست ہے لیکن اُس نے مجھے مدعو نہیں کیا۔ اُس نے سیٹھ دھنّا مل کو مدعو کیا ہے اور میں سیٹھ دھنّا مل کا منشی ہوں۔ وہ آقا اور خادم کو ایک میز پہ نہیں بٹھا سکتا۔ مجھے بیٹھنے کی ضرورت بھی —— شاید نہیں۔

یہاں پہنچ کر مجھے اپنے میلے پائجامے اور گندے کوٹ کا خیال آ گیا ہے۔ جبھی تو اُس نے مجھے مدعو نہیں کیا۔ وہ مہمانوں کا استقبال کرتے کرتے کسی بات پہ بے طرح ہنس دیتا ہے۔ مجھے اُس کے ہنستے ہوئے چہرے کی سب شکنیں یاد آ جاتی ہیں۔ وہ مجھے ایک بار پھر بُری طرح پکڑ کر آگے دھکیل دیتا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ میں مدعو نہ سہی، اس پیپل کے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر اس کے مہمانوں کو اچھی طرح دیکھ لوں۔ وہ مجھے اشارے سے بُلاتا ہے اور میں بے بس ہو کر اس کے ساتھ چل پڑتا ہوں۔ وہ مجھے ان گلیوں کوچوں میں سے گذارتا ہوا آگے لئے جاتا ہے۔ ان گلیوں

کو میں ہر روز پار کرتا ہوں - کیونکہ میرا گھر اسی طرف ہے - وہ مجھے میرے گھر کے سامنے لاکر اِدھر اُدھر بے چینی سے دیکھتا ہے - اسے کیا چاہیئے؟ اُس کی بے چین روح اور اُس کا ذہن بُری طرح مضطرب ہیں - اتنے بڑے آدمی کو میں اپنے گھر میں نہیں لے جا سکتا - میرے پاس ایک بھی خوبصورت کرسی نہیں - ایک بھی سجا ہوا کمرہ نہیں - اس گندی گلی میں ہمیشہ بدبو رہتی ہے - اس کا یہاں ٹھہرا رہنا بھی مجھے گوارا نہیں - میں اسے واپس لے جانا چاہتا ہوں لیکن وہ یہاں سے نہیں جانا چاہتا - وہ یہیں کھڑے رہنا پسند کرتا ہے - بے حس آنکھوں سے وہ ہر طرف دیکھ رہا ہے - آسمان پر اڑتے بادلوں اور اس گندے محلے کے ایک ایک مکان پر اُس کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں - یہاں تک آتے آتے قدرتی طور پر اُس کے پائجامے پر خاک اٹک گئی ہے، اس کی اچکن پر سلوٹیں پڑ گئی ہیں - اور اُس کے بکھرے ہوئے بالوں میں بھی مٹی اُڑ کر جم چکی ہے - وہ اسی کرب اور بے چینی سے اس ماحول کو دیکھ رہا ہے - بار بار وہ اس [illegible] اندر جھانکتا ہے - جس کی تاریکی میں سے میرے گھر اور ساتھ والے مکان کو راستہ [illegible] ہے - میں شرمندہ ہوں بے حد شرمندہ - پیدل آنے سے وہ تھک بھی گیا ہے - یکدم [illegible] آنکھیں مجھ پر گاڑ دیتا ہے - اُس کی آنکھوں میں بھی کرب ہے - بے حد حیران ہو کر جب اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھتا ہوں - میں سب کچھ بھول جاتا ہوں - اپنی حیثیت یا اُس کے معیار کو بھول کر میں اُسے چھاتی سے لگا لیتا ہوں - وہ بچوں کی طرح مجھ سے لپٹ جاتا ہے - اُس کی سسکیاں مجھے رُلا دیں گی - اس لئے میں اُسے خاموش کرانے کی تدبیریں کرتا ہوں - میں متعجب بھی ہوں کہ وہ اس حالت میں یک بیک ہی کیوں آ گیا ___ وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ جاتا ہے - میرے گھر کے صحن میں بیٹھ کر وہ دوسری طرف دیکھتا ہے - پارٹی میں اتنی خونخوار آنکھوں سے مجھے دیکھنے کے بعد اُس پُر خلوص سلوک کو میں سمجھ نہیں سکا - اسے یہ مکان بہت پسند ہے جو میرے گھر کے ساتھ ہے - وہ اچکن اُتار کر میری چارپائی پر آرام سے بیٹھ گیا - میں نہیں جانتا کہ اتنے بڑے آدمی کو میرے لئے کھانے کی دعوت دینا ضروری ہے یا نہیں ___

اسے شاید یاد آ گیا کہ وہ اسی مکان میں رہا کرتا تھا - اسے شاید وہ دن بھی یاد آ رہا ہے جب وہ رات کے آٹھ بجے بدحواسی کے عالم میں میرے پاس آیا تھا - میں سیٹھ جی کے دفتر سے تھکا ماندہ آیا تھا - میری بیوی نے چارپائی پر کھانے کی تھالی رکھ دی تھی اور میں بیٹھ کر ابھی کھانے ہی لگا تھا کہ وہ جلدی سے آ کر میرے ساتھ لپٹ گیا - اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے - اس کے گرد آلود کپڑوں میں تعفن تھا اس کے کالے اور سفید کھچڑی بالوں میں خاک جم گئی تھی - وہ میری طرح ایک منشی تھا اور اُس کی بیوی میری بیوی کی طرح اُس کے لئے چارپائی پر کھانے کی تھالی شام کے پانچ یا چھ بجے رکھ دیتی تھی - کیونکہ وہ بھی اسی وقت آیا کرتا تھا - گھر میں وہ ٹھہرتا نہیں کہ میرے ساتھ چھت پر ٹہلنے لگتا - ہم دونوں دن بھر کے قصے یا سیاست کی بحث چھیڑ دیتے - رات کے آٹھ بجے تک ہم سپنوں کی دنیا میں کھو جاتے - صبح کھانا کھا کر ہم دونوں اکٹھا ہی اپنے اپنے کام پر روانہ ہو جاتے تھے -

اس رات وہ میرے ساتھ لپٹ گیا تھا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے - اُس نے کراہتے ہوئے مجھ سے کہا - "سیٹھ جی کا انتقال ہو گیا ہے" اُس کی آواز بھرائی ہوئی تھی - پھر اُس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "کیا میں سب سے زیادہ اس حادثے کی لپیٹ میں نہیں آ گیا؟ میری روزی کی اب کوئی سبیل نہیں رہی -" پھر وہ پھوٹ پڑا - روتے روتے اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں - جانے وہ کتنی دیر سے رو رہا تھا -

میں نے بھی اس رات کھانا نہیں کھایا - میں اس کی طرح پریشان رہا - محض اس کے لئے مجھے بھی چین نہیں تھا - میں رات بھر سوچتا رہا، قدرت آدمی کو اتنا پریشان کیوں کر دیتی ہے - آخر کس لئے ___ میں نے رات بھر سوچ بچار کے بعد فیصلہ کر لیا کہ میں اپنے آقا سے اس کی سفارش کروں گا، میں اس کے لئے کوئی نہ کوئی کام ضرور ڈھونڈ دوں گا -

ساری رات میں اپنے صحن میں ٹہلتا رہا، مجھے نیند ہی نہیں آئی -

صبح وہ پھر میرے پاس آیا - اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے - اُس کے بکھرے ہوئے بالوں میں ایک چمک تھی - اُس کے چہرے کی جھریوں میں نیا گوشت اُبھر رہا تھا - وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گیا - میں نہا کر آیا تھا - میں نے اس سے بات کرنا چاہی لیکن وہ اپنے آپ میں نہیں تھا - میں نے رسماً پوچھا "تم کوٹھی سے آ رہے ہو؟"

" ہاں - اُس کی آواز بھی پُرسکون تھی بلکہ اس میں ایک شوخی بھی تھی - میں نے اسے غور سے دیکھا -

تھوڑی دیر بعد بڑی مشکل سے اُس نے کہا "سیٹھ جی کی وصیت دیکھ کر آ رہا ہوں" -

" اُن کے بھتیجے کیا تمہیں رکھنا پسند کریں گے - میں نے نرمی سے اُس کے جمود کو توڑنا چاہا

جذبات کے جوش سے وہ اُٹھ کھڑا ہوا "سیٹھ جی اپنی جائیداد میرے نام لکھ گئے ہیں" وہ کھڑکی میں سے باہر جھانکنے لگا - میں کچھ نہیں سمجھ سکا یا یہ بات مجھے حیران کن لگی میں ایسی خبر کے لئے تیار نہ تھا - ایک بار میں نے اُسے سر سے پاؤں تک اچھی طرح دیکھا - ایک ساٹھ روپے کا ملازم جس کے پاس دو یا تین پوشاکیں تھیں اور جس کے کپڑے گندے رہتے تھے، جس کے بال ہمیشہ بکھرے رہتے تھے ___ وہ ایک منشی

تھا، محض ایک کارندہ — میں نے اُسے پھر ایک بار دیکھا۔ اُس نے کہا تھا وہ اس ساری جائیداد، دولت اور ساز و سامان کا مالک ہے۔ میں اسے نہیں مان سکتا تھا میری نظر میں شروع سے وہ ایک منشی تھا، ساٹھ روپے کا منشی! — میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اُس نے میری طرف پُرجوش نظروں سے دیکھا! اُس کی آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں "سیٹھ جی نے لکھا ہے کہ میں نے اُن کی بے حد خدمت کی ہے۔ وہ مجھے بیٹا سمجھتے ہیں" — بیٹا — وہ پھر کھڑکی میں سے باہر جھانکنے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس کی ملازمت نہ بھی رہی تو وہ بھوکا نہیں رہے گا۔ اُس کا جوان بیٹا دفتر میں کلرک تھا۔ کھانے کے لئے اُس کے پاس یہ ذریعہ تھا۔ میری نظر میں گویا اُس کی پنشن ہو گئی تھی — اس کا بیٹا اسے کھانا دینے کے قابل تھا۔ میں نے اپنی سفارش والی تجویز کو خود ہی رد کر دیا۔ اتنی دیر میں وہ کمرے میں سے جا چکا تھا۔

تھوڑے دنوں میں ہی یہ خبر عوام کے لئے پرانی ہو چکی تھی۔ میں نے کبھی کسی سے اس بارے میں ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ یہی خبر مجھے شرمندہ کر دیتی، اس لئے کہ مجھ میں اور اس میں ایک خلا پیدا ہو چکا تھا جس کا مجھے علم تھا۔ لیکن اس کا برتاؤ میرے ساتھ ویسا ہی تھا۔ ایک بار اُس نے کہا تھا۔ "مجھے تمہاری باتوں پر افسوس ہوتا ہے، ہم دوست ہیں اور دولت ہمیں دور نہیں کر سکتی۔" لیکن خود میں نے اُس کے یہاں جانے سے گریز کرنا چاہا۔ وہ میرا پڑوس چھوڑ گیا تھا۔ اسے سیٹھ کی کوٹھی کے علاوہ سب کچھ مل گیا تھا کیونکہ وہ کوٹھی سیٹھ نے ایک اسکول کے نام لکھ دی تھی۔

اسے ایک نیا مکان چاہیئے تھا۔ اس نے موجودہ مکانوں میں سے کسی کو بھی پسند نہ کیا۔ وہ ساری عمر امیروں کے ہمرکاب رہا تھا۔ سارے کاروبار اس نے بڑی مستعدی سے سنبھال لئے تھے کیونکہ سیٹھ کا سارا کام وہ خود ہی کیا کرتا تھا۔ وہ ہر چیز سے واقف تھا۔ اور اب ایک دم اُسے اپنی حالت کو بدلنا تھا۔ گھنٹوں وہ مجھ سے اس بارے میں بحث کیا کرتا۔ اسے اپنے رہنے کے لئے ایک مکان بنوانا تھا۔ لیکن بنگلہ کس طرح کا ہو، وہ اس بارے میں خود فیصلہ نہ کر سکا۔

آخر اُس کے بنگلے کی خوبصورت عمارت طیار ہو گئی۔ وہ اسے خود اپنے خیالات کے مطابق سجا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں اتنے خوشنما اور وسیع پلان موجود تھے۔ اس کا مجھے کبھی احساس نہ ہوا تھا۔ لیکن پلان خود بخود بن جاتے ہیں۔ جب اُن کے لئے دماغ کو سوچنا پڑتا ہے۔ یہ چیزیں اُس کے ذہن میں اچھی طرح موجود تھیں کیونکہ اُس نے ہمیشہ اپنے آقا کے لئے سب کام کئے تھے اور وہ بڑے شوق سے اب اپنے لئے یہ سب کچھ کر رہا تھا۔ اُس نے کتنی بار مجھ سے اس بات پر اصرار کیا کہ میں اپنی ملازمت چھوڑ دوں۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس کے ساتھ مل کر کام کروں۔ لیکن مجھے یہ منظور نہ تھا۔ جانے کب اُس کا مزاج بگڑ جائے اور میں بالکل محتاج ہو جاؤں۔ کبھی کبھی میں سوچتا شاید میرا مالک میرے نام سب کچھ وقف کر دے۔ مگر اس کے کتنے ہی بیٹے تھے اور میں محض اُن کا ایک ادنےٰ خادم تھا۔ لیکن میں نے اس کی بات نہیں مانی۔ میں اپنے حقیر کام میں خوش تھا مجھے اپنی حیثیت معلوم تھی اور اب وہ ایک امیر آدمی تھا۔

بنگلے کی عمارت بن کر طیار ہو گئی۔ اس نے قیمتی چیزوں سے اسے سجایا اپنے ہاتھوں سے اس نے ایک ایک چیز کو قرینے سے سنوارا۔ وہ مجھے ہر وقت اپنے ساتھ لئے پھرتا۔ اُس کی گفتگو بے حد شیریں ہو گئی تھی۔ میری اور اُس کی دوستی روز بروز بڑھ رہی تھی۔ وہ ایک مخلص دوست اور آقا تھا۔ میرے مشورے اسے بڑے عزیز تھے اور وہ بنگلے میں داخل ہونے کے لئے ایک خاص رسم کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اُس کی پرانی حیثیت اُسے شرمندہ کیا کرتی۔ وہ ان امیروں کے ساتھ کس طرح ہمسری کر سکتا تھا جن کے سامنے وہ محض ایک منشی تھا۔ اپنے بیکار وقت میں میں اُس کے یہاں پہنچ جاتا۔ وہ اور میں بڑے سکون کے ساتھ باتیں کرتے۔ پہلے کی طرح ہنستے اور بے تکلف ہو جاتے۔ لیکن وہ ان امیروں سے ملنا جلنا چاہتا تھا جو اُس کے مالک کے دوست تھے۔ اب اس کی اقتصادی حالت ان میں کتنوں سے بہتر تھی۔ لیکن اُس کا ماضی ایک خوفناک بھوت کی طرح اُس کے سامنے منڈلانے لگتا اور ہر بار وہ گھبرا جاتا۔

میں نے اُسے مشورہ دیا۔ اس نے میرے کہنے پر شہر کے امیر لوگوں کو دعوت دی۔ وہ نئے گھر میں داخل ہونے کی رسم کو ایک یادگار بنانا چاہتا تھا۔ اس طرح اس کا خیال تھا کہ وہ ان لوگوں سے بے تکلف ہو سکے گا۔ سارا دن طیاریوں میں مصروف رہنے کے بعد شام کو وہ ان سب کے استقبال کے لئے انتظار کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ لوگ اکٹھا ہونے لگے۔ لیکن اس کی نظریں بھاٹک پر امیروں کی گاڑیوں کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اس روز مشکل سے چار پانچ آدمی ایسے آئے جو بلند سوسائٹی میں مقبول تھے۔ ورنہ اس کے سارے مہمان اُس کے غریب رشتہ دار یا اُس کے پہلے دوست تھے جو اب بھی غریب تھے۔ وہ چار پانچ امیر بھی چند لمحے بیٹھ کر پارٹی میں شامل ہوئے بغیر واپس چلے گئے۔ مودب خادم، غریب اور بے سلیقہ مہمانوں کی خاطریں کرتے رہے جنہیں ایسا موقعہ پہلی بار نصیب ہوا تھا۔

اس رات وہ بے حد پریشان رہا۔ اس کے دماغ نے اس بے عزتی
کو برداشت کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن وہ سوچنا چاہتا تھا کہ اس بلند ترین
معیار میں اپنی جگہ کس طرح قائم کرے۔ اس کا بڑا بیٹا کلرکی چھوڑ کر باپ کے
ساتھ کاروبار میں شریک ہو گیا تھا۔ وہ اسے غیر ممالک میں بھیجنا چاہتا
تھا۔ اس کے دوسرے بچے شہر کے بہترین اسکولوں میں داخل ہو گئے
تھے۔ کیونکہ اب وہ ان کم درجہ مکتبوں میں جانے کے اہل نہ تھے۔ ان کی
جگہ زندگی کی بہترین آسائشوں میں تھی۔ ان کی عادتیں اور خصلتیں
پہلے سے بہتر ہو گئی تھیں۔ ان کے جسم اب بہترین کپڑوں میں ملبوس ہوتے۔
کتنے نوکر ان کی خاطر موجود رہتے۔ یہ سب ایک عجیب بات تھی۔ وہ لوگ
اب تک اپنی اس تبدیلی پر حیران تھے۔ اتنی بلند و بالا عمارتیں ان کی
آنکھوں کو چندھیانے پر مجبور کر دیتیں۔ نفیس لوازم سے بھرے کمرے انھیں واقعی
پریوں کے محل نظر آتے۔ لیکن اُن کے دلوں میں اطمینان تھا۔ وہ سب کچھ
انھیں کا تھا۔

اُس نے ایک بار پھر خود کو بہترین سوسائٹی میں داخل کرنے کی
کوشش کی۔ اُس نے اپنے بیٹے کو غیر ممالک میں بھیجنے کے موقع پر ایک
عظیم دعوت دی۔ کتنے دنوں تک وہ پلان بناتا رہا۔ مسکرا کر وہ کہتا،
"میں اپنے غریب ساتھیوں کو نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے ہمیشہ یاد رہتا ہے
کہ میں اُن کا رشتہ دار ہوں۔ میں ایک انسان ہوں اور اپنی انسانیت
کو نہیں چھوڑ سکتا۔"

کتنے لوگ اس کے برآمدے میں اس سے ملنے کے لئے بیٹھے رہتے۔
اب وہ ایک مشہور آدمی تھا جس کا سارا وقت اپنے لئے روپیہ کمانے
میں صرف ہوتا۔ وہ ان کی ہر بات کو برداشت کرنے کی کوشش کرتا تھا۔
ایک بڑا آدمی ہوتے ہوئے جو تبدیلیاں اُس کے ذہن اور اس کی روایات
میں آ چکی تھیں وہ ان کے خلاف کوئی بات پسند نہیں کرتا تھا۔ لیکن
وہ اسی وقت یہ بھی جانتا تھا کہ اُس کے رشتہ دار اور دوست غریب
ہیں۔ وہ ان کی ناجائز حرکات کو بھی معاف کر دینا چاہتا۔ لیکن وہ
لوگ اب بھی اس کی عزت نہیں کرتے تھے۔ وہ اسے اب بھی اسی طرح مخاطب
کرتے۔ وہ بھول جاتے کہ بڑے لوگ کسی نہ کسی وجہ سے ملنے کے لئے منتظر
رہتے ہیں، اور وہ اُن کے سامنے بھی اسے بے عزتی یا بے ادبی سے
پیش آتے۔ اور وہ بہت بُرا مانتا۔ وہ کہتا "بے چارے بیوقوف ہیں"۔ لیکن
اس کا دل سب باتیں سمجھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان لوگوں کے ساتھ
محبت بڑھانے میں اُس نے کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کی ہے۔ کیونکہ وہ الٹے
رعب جماتے، اپنا حق جتاتے اور پھر ناراض ہو جاتے۔

اس نے مجھ سے اس دعوت کے لئے بہت مشورے لئے اور واقعی
انتظام بہت خوبصورت تھا۔ اس کا بیٹا تھوڑی سی مدت میں کلرک سے
ایک امیر نوجوان میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کے جسم پر بیش قیمت ملبوسات
اچھے بھی لگتے تھے۔ اس کا رویّہ بدل چکا تھا۔ اب وہ ایک با حیثیت اور
پُرغرور نوجوان تھا جو نئی دولت کے سہارے غیر ممالک میں تعلیم پانے
جا رہا تھا۔ وہ مجھے بُری طرح گھورتا۔ میں اُسے بچہ سمجھ کر معاف کر دیتا
تھا۔ لیکن اس کا باپ ابھی تک اپنے قدیم رویّے سے ہٹا نہیں تھا۔ یہ
اُس کے چلن کی پختگی تھی۔

دعوت پر اُس نے اپنے سب رشتہ داروں، دوستوں اور شہر کے
بلند معیار طبقوں کو مدعو کیا۔ اس بار اس کی دعوت پر کئی با مرتبہ لوگ
بھی آئے۔ گو ان کے پاس وقت اب بھی کم تھا۔ اُس کے غریب ساتھیوں
کو دیکھ کر وہ ناک بھوں چڑھاتے اور اس کی حقیقت کا احساس کر کے
خاموش واپس لوٹ جاتے۔ اپنے دل کو بہلانے کی خاطر اس نے مان لیا
کہ دعوت بہت کامیاب ہوئی تھی۔ اپنے بدتمیز اور بے سلیقہ ساتھیوں پر
اُس نے نگاہ کی۔ امداد اور حق شناسی کے باوجود وہ اس کی پروا یا
اس کی حیثیت کا خیال نہ کرتے۔ وہ اس کی باتیں سنتے سنتے کسی امیر
مہمان کے آتے ہی بکھر جاتے، وہ اُس امیر سے اس طرح باتیں کرتے
جیسے وہی اُن کا میزبان ہو۔ یہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔

وہ چڑ گیا۔ اُس کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے لوگ اس تک
آسانی سے باریابی نہیں پا سکتے تھے۔ ایک روز میں صبح اُس کے یہاں
گیا۔ باہر ہجوم تھا۔ لوگ اس سے ملنے کے لئے منتظر تھے۔ اتنے میں وہ
اپنی کار میں جا بیٹھا۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ اُس وقت میں
کار کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اُس نے مجھے اچھی طرح دیکھا، اُس نے کار روکنے
کے لئے نہیں کہا۔ وہ چلا گیا۔ لوگوں کو نوکروں نے کہہ سن کر باہر نکال
دیا ــــ بے عزتی محسوس کر کے میں بڑی مدت اُس کے پاس نہیں گیا۔ اُس نے
بھی زیادہ میل جول کی کوشش نہیں کی۔ لوگوں کی بھیڑ اب اُس کے بنگلے
میں اتنی نہیں رہتی تھی۔ سخت ضرورت پر کوئی اس سے ملنے چلا جاتا ــــ

ہر کسی سے ملنے کی اُس نے اجازت بند کر دی تھی۔ لوگ اُس سے ملنے کے لئے ترستے تھے، اور وہ بیحد سخت مزاج ہو گیا تھا۔ اُس کی بات چیت، اس کے جذبات بالکل بدل چکے تھے۔ وہ بے درد اور ظالم ہو گیا تھا اور لوگ اُس کے پاس جاتے ڈرنے لگے تھے۔ اس کے سامنے وہ لوگ اب بے سلیقگی سے پیش نہیں آتے تھے۔ کیونکہ اب اس کے چہرے پر رعب تھا، خاموشی تھی اور شکنیں تھیں اور اس کا برتاؤ بیحد بدتمیزی کا تھا۔ وہ ان رشتہ داروں یا دوستوں سے سیر ہو چکا تھا وہ اُن سے نفرت کرنے لگا تھا جو سب غریب تھے اور ان کے لباس یا حرکات یا خیالات نہایت پست اور شرمندہ کن تھے۔ وہ ان غریبوں سے ہنسنے کھیلنے میں شرم محسوس کرنے لگا تھا جو اس کے وقار اور معیار کو گرا دیتے تھے۔

اُسے عزّت چاہیئے تھی، وقار چاہیئے تھا اور وہ مکّھیوں کی طرح چپکے ہوئے انسان ایک عظیم رکاوٹ تھے۔ اس روز جب میں اس کے یہاں ملنے کے لئے کافی دنوں کے بعد گیا تو اس کی چیختی ہوئی آواز نے مجھے بدحواس کر دیا۔ ایک بوڑھا غریب آدمی آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر سے اُترتا ہوا میرے نزدیک آیا۔ اُس کی آنکھیں نیچے سڑک پر تھیں، اور وہ ابھی تک خوف سے کانپ رہا تھا۔ اس کا زرد چہرہ گھبرایا ہوا تھا۔ میں نے اُسے روک لیا۔

"کیا ہے؟" میں نے اس سے پیار سے پوچھا۔ میں خود بدحواس تھا۔

" وہ میری طرف غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اس کی آواز بھرّا گئی سسکیاں بھرتے ہوئے اُس نے کہا: "مجھے اس طرح اُنھوں نے کہا ہے — جاؤ نکل جاؤ"۔

"کیوں"— میں نے خود سے سوال کیا۔ میں نے کبھی اُسے اتنے غصّے میں نہیں سنا تھا اور نہ ہی خود دیکھا تھا۔

"ہم غریب لوگ ہیں نا، ہمیں کھانے کے لئے چاہیئے۔ رہنے کے لئے چاہیئے۔ ہماری زندگی روپے سے قائم رہ سکتی ہے۔ ہمیں مانگنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ لیکن وہ امیر لوگ ہیں، ہماری کون مدد کرے، وہ امیر لوگ ہیں!"

بوڑھا طیش میں آ کر بولتا گیا۔ اس کے آنسو، اس کی جذباتی سُرخ آنکھوں آنکھوں میں سُوکھ رہے تھے۔ ایک دو بوندیں آنکھوں ہی میں جذب ہونا چاہتی تھیں اُس کی بھرّائی ہوئی آواز پھر صاف ہونے لگی تھی۔

میں نے آہستہ سے کہا: "ہاں بھائی، وہ لوگ امیر ہیں"۔ میں پھر کبھی اس سے نہیں ملا۔

اور کچھ دنوں میں اس کا رعب اور اُس کا وقار چھا گیا تھا اور لوگ مان گئے تھے کہ وہ امیر ہے۔ کیونکہ اب وہ آرام سے اس کے کمروں میں ہجوم نہیں کر سکتے تھے، اور اُن کے پاؤں اس بنگلے میں جاتے اب خوف محسوس کرتے تھے۔ کیونکہ وہ اب ایک انسان سے بعید ہو چکا تھا۔ کیونکہ اب اس کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئی تھیں اور اس کی آواز میں ہمدردی اور درد نہیں رہا تھا۔ وہ اس کا ذکر کرتے تو اُن کے دلوں میں خوف اُٹھنے لگتا اور سب مان جاتے کہ وہ واقعی امیر ہے، بہت بڑا امیر۔

لیکن ایک مدّت گزر گئی ہے۔ اب وہ مجھے اور میں اُسے نہیں پہچانتے۔ کیونکہ پاس سے گزر جانے پر ہم ایک دوسرے کو نہیں بُلاتے۔ آج اتنی مدّت کے بعد وہ میرے صحن میں بیٹھا اس دوسرے مکان میں جھانکنے لگا ہے۔ اس مکان میں ایک اور کلرک رہتا ہے، جس کی ترقی کی اب کوئی اُمید نہیں رہ گئی۔ اور وہ میری طرح جوتے گھسنے کے سوا اور کوئی فائدہ اس زندگی میں نہیں پا سکتا۔ کیونکہ وہ ایک غریب کلرک ہے، اور میں ایک غریب منشی ہوں، اور اتنا امیر آدمی میرے صحن میں بیٹھا ہے جس کی خاطر یا خدمت میں نہیں کر سکتا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں جن کا سبب میں نہیں جانتا۔ وہ ایک بار میرے گلے لگ کر سسکیاں بھرنا چاہتا ہے، لیکن میری حیثیت مجھے اس سے دور رکھ رہی ہے۔ میں اس کے سامنے بیٹھنے سے بھی ہچکچا رہا ہوں۔ یونہیں مجھ میں اتنی جرأت نہیں۔ بعید کو سمجھ کر بھی میں تدبیر نہیں کر سکتا۔ میں کھڑا رہوں گا جب تک وہ میرے سامنے میری چارپائی پر بے چین بیٹھا روتا رہے گا۔ . . . .

لیکن اس کے گھر میں ایک ٹی پارٹی ہے کیونکہ وہ سیاحت کے لئے دُور دُور تک گھومے گا، اور میں اس کے بنگلے میں ایک پیپل کے درخت کے نیچے کھڑا رہنا چاہتا ہوں میں اسے واپس یہیں لے آنا چاہتا ہوں کیونکہ اس بنگلے کے سامنے میرا گھر بہت حقیر ہے، میری پیٹھ پیپل کے تنے کے ساتھ لگی ہوئی تھک گئی ہے سیٹھ دھنا مل مجھے آواز دیتا ہے: "منشی جی، تم واپس جاؤ میں انھیں سٹیشن تک پہنچا کر لوٹ آؤں گا۔ دوستی کا تقاضا ہے!"

تاروں کی چھاؤں میں گھر پیدل لوٹ جاؤں گا، سیٹھ دھنا مل اور کتنے ہی امیر لوگ اسے اسٹیشن تک چھوڑنے کے لئے اپنی کاروں میں بیٹھ کر چلے جائیں گے کاروں میں سے اُترتے اور چڑھتے ان کی سانسیں پھول جائیں گی لیکن میرے پاؤں میلوں چلتے درد محسوس نہیں کریں گے۔

میں واپس ان بدبودار گندی گلیوں میں واقع اپنے گھر جا رہا ہوں، وہ اور سیٹھ دھنا مل بنگلے میں قہقہے لگا رہے ہیں۔ لیکن وہ کون تھا جو میرے گھر کے صحن میں بیٹھا تھا؟ میں بڑبڑاتا ہوں۔ یکایک چلتے چلتے میرے قدم رُک جاتے ہیں۔ میں ڈر جاتا ہوں۔

"وہ کون تھا —— ؟

میرے پاؤں پھر چل پڑتے ہیں۔ میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔

امین کامل

کشمیری زبان میں شادی بیاہ کے گیت

کشمیر میں شادی بیاہ کے موقعوں پر جو گیت گائے جاتے ہیں وہ کشمیری میں "وَنہ وُن" کہلاتے ہیں۔ ملک کی زبان میں انہیں بادھاوا اور سہاگ گھوڑیاں نام دیا جاتا ہے۔ اس قسم کے گیت ہر ملک اور قوم کی زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہر قوم کے اپنے اپنے سماجی ڈھانچوں کی ان پر چھاپ ہوا کرتی ہے لیکن مرکزی خیال کے اعتبار سے ان کی نوعیت ایک ہی ہوتی ہے۔ تہذیب و تمدن کی ترقّی کے ساتھ ساتھ ان گیتوں کی شکل اور موضوع دونوں میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ ان کی فطری سادگی اتاثر موسیقی اور رس میں سنجیدگی، تصنع اور غیر جذباتی لہجہ راہ پانے لگتا ہے یہاں تک کہ ایک مخصوص مقام تک پہنچنے کے بعد یہ ایک لطیف موسیقی کے سُروں میں تبدیل ہو کر منتہی ہو جاتے ہیں۔

کشمیری زبان بولنے والے مختلف علاقوں میں شادی بیاہ کے سلسلے میں جو رسوم ادا کی جاتی ہیں وہ ہر علاقے میں فروعات میں مختلف ہونے کے باوجود اصولی طور پر درج ذیل رسوم میں ایک دوسرے سے بہت ہی قرابت رکھتی ہیں۔

یَڑہ ھل۔ لفظی معنی مہمان نوازی ہیں۔ کشمیر میں عام طور پر "درمیان دار" کی معرفت شادیاں انجام پاتی ہیں۔ جب یہ شخص کسی گھر میں کسی لڑکے کی بات طے کر لیتا ہے تو لڑکی والے یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ گھر ان کے معیار پر کس حد تک پورا اترتا ہے چند آدمیوں کو اُن کی طرزِ معاشرت، رہن سہن اور دوسری متعلقہ باتوں کا سرسری طور پر جائزہ لینے کی غرض سے بھیج دیتے ہیں۔ اگر لڑکے والے اپنے سے پست معیار کے گھرانے میں اپنے لڑکے کی شادی رچائیں تو وہ رشتے برادری کے یہ طعنے کیسے برداشت کر سکیں گے کہ "کنگالوں کے یہاں سے لڑکی اٹھا کر لائے ہیں"۔ ظاہر ہے کہ یہ جاگیردارانہ سماج کے اُس ابتدائی زمانے کی چھاپ ہے جب عورت پر مرد کی فوقیت کا خیال انسانی ذہن میں ابھر گیا تھا۔ ورنہ یہ رسم دوسرے طور سے ہوتی۔

نشانٔ یعنی منگنی۔ اس روز لڑکے والے کچھ تحفے تحائف لے کر لڑکی والوں کے ہاں جاتے اور مذہبی رسوم کے مطابق شادی پکّی کر کے بارات کے آنے کا دن مقرر کر لیتے ہیں۔ ان تحائف کو کشمیری زبان میں "میوہ مُجمہ" یعنی پھلوں بھرا تھال کہا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں جب عوام کا معیارِ زندگی بہت ہی پست تھا اور کشمیر میں پھلوں کی پیداوار تجارت کے لئے نہیں بلکہ ذاتی ضرورت کے لئے ہوتی تھی کیونکہ یہ خوراک کے طور پر استعمال کئے جاتے تھے اس قسم کے تحائف لئے جاتے تھے۔ آج کل نبات، بادام، سوکھی کھجوریں اور ناریل ایسی نوع کی چیزوں کے ساتھ چاندی کا ایک آدھ زیور بھی لیا جاتا ہے۔ اس روز لڑکی بیاہی جاتی ہے، نئے سلے ہوئے کپڑے پہنائے جاتے ہیں کیونکہ مذہبی اعتبار سے شادی کی اصل اور اہم رسم یہی ہے۔

لَمانٔ وَر یعنی بیاہ۔ لڑکی والوں کے ہاں بارات آتی ہے اور رات کو وہاں ٹھہرنے کے بعد دوسرے دن پو پھٹتے ہی دُلہن کو لے کر چلی جاتی ہے۔ اس طرح بیاہ کی منزل تک مہماں نوازی اور منگنی کے دو اہم مرحلے ہوتے ہیں۔ دوسری رسوم یہ ہیں۔

لَگتَن بِہُن یعنی مائیوں بٹھانا۔ شادی سے عموماً دس پندرہ دن پہلے تک لڑکی مائیوں بیٹھا کرتی ہے۔ اس کو پھٹے پرانے کپڑے پہنائے جاتے اور بال پریشان کر کے رکھے جاتے ہیں۔ اس سے لڑکی میں بہت سی رعنائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

مانِزہ راتھ یعنی مہندی رات۔ اس رات لڑکی کے ہاتھ پیروں پر مہندی رچائی جاتی ہے اور لڑکے والوں کے یہاں دولہا کے۔ گاؤں یا محلّے کی عورتیں جو اس موقعہ پر گیت گانے کے لئے آئی ہوئی ہوتی ہیں خوشی کے اظہار کے طور پر اپنے ہاتھوں پر بھی مہندی رچاتی ہیں۔ یہ رسم بیاہ کے دن سے پہلے کی رات میں ادا کی جاتی ہے۔

وَمھُل یعنی دعوتِ ولیمہ۔ جب دولہا، دُلہن کو اپنے گھر لے آتا ہے تو اس خوشی کی تقریب پر اڑوس پڑوس اور رشتے برادری کے لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے۔

پھِرَہ سالہ یعنی دعوتِ بازگشت۔ سسرال میں دُلہن کے سات دن قیام کرنے کے بعد اُس کے میکے والوں کی طرف سے دونوں میاں بیوی کو اپنے گھر لا کر دو چار دن تک مہمان نوازی کی جاتی ہے۔ اس رسم کا مقصد دولہا کو اپنی ساس، سالیوں اور دوسرے قریبی رشتے کے لوگوں سے متعارف کرانا ہوتا ہے جن سے وہ یا تو اس سے پہلے آشنا

نہیں ہوتا یا پھر اس نئے رشتے کی حیثیت سے اُن سے مُلاقی نہیں ہُوا ہوتا ہے۔

گیت گانے کے طریقے ۔ شادی بیاہ کی ان تمام رسوم میں سے پہلی دو آخری رسم کے بغیر دُوسرے تمام مواقع پر "وَنہ وُن" گائے جاتے ہیں جن کا مقصد خوشی کا اظہار کرنا یا لڑکی کا دل بہلانا ہوتا ہے۔ یہ گیت دو طریقوں سے گائے جاتے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ گانے والیاں دو ٹولیوں میں بٹ جاتی ہیں۔ ایک ٹولی گیت کا ایک شعر گاتی ہے اور دوسری ٹولی دوسرا شعر۔ یہ گانے گھر کی چاردیواری ہی تک محدود نہیں رہتے بلکہ بارات کے آنے یا لڑکی کے رخصتانے کے وقت گھر سے باہر دو تین فرلانگ کے فاصلے تک عورتیں ایک دوسری کے کندھوں پر ہاتھ دھرے اور صف باندھے کھڑے گیت گاتی رہتی ہیں۔ یہ طریقہ شہروں اور دیہات میں ایک ہی طرح رائج ہے کشمیر پر اسلامی تسلط (سنہ۱۳۲۰ء) کے بعد سے چونکہ عورتوں کا ساز و دف پر گانا معیوب سمجھا جانے لگا۔ اس لئے اس ڈھنگ سے گائے جانے والے گیتوں کے ساتھ کسی ساز کا استعمال نہیں ہوتا۔ یہ بات ذہن میں رکھنا لازمی ہے کہ قوافی کی ترتیب کے لحاظ سے یہ گیت عموماً مسلسل ہونے کے بجائے منتشر اشعار کی صورت میں ہُوا کرتے ہیں لیکن بحر کے ہر حالت میں ایک ہی رہنے سے اور موضوع کی وحدت کے باعث ان میں ایک لطیف جذباتی اور تاثراتی تسلسل برقرار رہتا ہے۔

دُوسرا طریقہ یہ ہے کہ عورتیں باضابطہ ساز و دف پر رُومانوی گیت یا غزلیں گاتی ہیں جن کا شادی بیاہ کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ طریقہ حال کی پیداوار ہے اور ابھی شہروں ہی تک محدود ہے۔ دیہات میں اس ڈھنگ سے مرد گایا کرتے ہیں۔ دراصل جن گیتوں کو "وَنہ وُن" کہا جاتا ہے وہ اوّل الذکر ہیں۔

"وَنہ وُن" کی ایک مخصوص بحر ہوتی ہے جس کے ہر دو مصرعوں کی تقطیع فارسی علم عروض میں "فعلُن فعلُن فعلُن فعلُن ـــــ فعلُن فعلُن فعلُن فع" کے مطابق ٹھیک طور سے ہوتی ہے۔ ان گیتوں کے الفاظ بہت ہی رس بھرے، سادہ اور رواں ہوتے ہیں۔ جذبات و تاثرات کی لطافت کے علاوہ تشبیہات و استعارات کی موزونیت اور تخیل کی نزاکت و سادگی کے لحاظ سے یہ گیت فنِ شاعری کے بہترین نمونے ہوتے ہیں

یہ گیت عام طور پر عورتیں خود ہی تخلیق کرتی ہیں۔ مردوں میں سے اگر کسی شاعر نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے وہ ان کے مقابلے میں کامیاب نہیں رہا ہے۔ اُس کے شعروں میں شادی بیاہ کے لوازم کا نہ وہ رنگ آیا ہے اور نہ ہی وہ تاثر پیدا ہوسکا ہے جو ان گیتوں کا خاصہ ہے۔ البتہ افضل کے یہاں ہمیں کچھ کامیاب نمونے ملتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد جس کا ذکر ناگزیر تھا میں ان رسوم کے قدرے تفصیلی پس منظر میں اصل گیتوں کی طرف راجع ہوتا ہوں۔

منگنی کا دن ہے۔ لڑکی کو نئے سلے ہوئے کپڑے پہنائے جا رہے ہیں۔ کپڑوں کے رنگ بہت ہی شوخ ہیں اور ہونے بھی چاہئیں۔ سکھیاں، سہیلیاں اور رشتے برادری کی عورتیں گا رہی ہیں۔

تو اِن لال لال کپڑوں میں کتنی بھلی لگتی ہے
جیسے تو بسنت کا ایک کھلا ہُوا گلاب ہے
تیرے مکھڑے اور کپڑوں کی چمک دمک کو دیکھ کر
پیلے چاند کے دل میں انگارے سلگ رہے ہیں
لاڈلی کے کپڑے کتنے باریک سلے ہوئے ہیں
اے درزی تیرے ہاتھ درد تو نہیں کر رہے ہیں

یہ تو گھر کے اندر کی بات تھی۔ باہر سڑک پر "پھولوں بھرا تھال" لے کر آنے والے مہمانوں کے انتظار میں عورتیں صف باندھے کھڑی تھیں کہ انھیں کچھ فاصلے سے آتے دیکھ کر دولہن کو مخاطب کرکے گانے لگیں۔

پھولوں بھرے تھالوں پر مینا کاری کئے ہوئے
اے لاڈلی تیرے سسرال والے آگئے ہیں
آکاش کے جھلملاتے تاروں کو سمیٹ کر
تھالوں میں سجائے کس شان سے آگئے ہیں
عرب کی کھجوریں اور بنگال کا نبات
تجھے تیرے پیا کا پیام لے کر آیا ہے

مہمان ضیافت کھا چکے اور اب مذہبی رسوم کے مطابق شادی کی بات پکی (نکاح خوانی) ہونے لگی۔ اس موقعے پر مذہبی نوعیت کے ہی گیت موزوں ہوسکتے ہیں۔

ہم پر خدائے پاک نے کتنی مہربانیاں کیں
نکاح خوانی کے لئے خود سرکارِ مدینہ آئے ہیں
حضرت کے ساتھ چار یار ایسے ہی بھلے لگتے ہیں
جیسے چاند کے اردگرد ستارے زیب دیتے ہیں
ہم پر اندھیارے میں روشنی کی کرنیں پھوٹیں
نکاح خوانی کے لئے سرکارِ مدینہ آئے ہیں

لڑکی کے مائیوں بیٹھنے کا پہلا دن ہے۔ اس کے بال کھولے جا رہے ہیں۔ عمر کی چھوٹی ہے۔ نہ بھی ہو پھر بھی نفسیاتی طور پہ ماں باپ کو چھوٹی ہی دکھائی دیتی ہے۔ اس کا دل بہلانے کے لئے سہیلیاں گا رہی ہیں۔

تیری زلفوں کا ایک ایک بال کھولا جا رہا ہے
تو ابھی کمسن ہے، ہم تجھے گودی میں جھلائیں
تیرے ریشم ایسے نرم بالوں کو کھولنے کے لئے
پریوں کے نازک ہاتھ ہی زیب دیتے ہیں
تیری ماں نے تیرے بالوں کی پہلی لٹ خود کھولی
نظر بد سینے والوں کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا

مائیوں بیٹھنے کی رسم تو صرف لڑکی میں رعنائیاں پیدا کرنے کے لئے تھی۔ اصل رسم تو مہندی رات ہے جب لڑکی کے ہاتھ پیروں پر مہندی رچائی جاتی ہے۔ یہ مہندی شہر سے لائی گئی ہے۔

شہر سے بھوج کے پتوں میں مہندی لائی گئی
آج اے لاڈلی تیری مہندی رات ہے

ایک بڑی ہانڈی میں مہندی تیار ہے۔ اس میں سے پیالیوں میں تھوڑی تھوڑی گانے والی عورتوں میں بانٹ دی جاتی ہے۔ دلہن کو اس کی خالہ اماں کے بغیر اور کون مہندی رچانے کے لئے موزوں ہو سکتی ہے۔

مہندی بھری ہانڈی کے ارد گرد پیالیاں ہیں
اے دلہن کی خالہ آ اور لاڈلی کو مہندی رچا
اور دلہن کو مہندی رچائی جانے لگی۔
اے خدا — تو ان ہاتھوں میں مرادیں بھر لا
شہزادی کے ہاتھوں پر مہندی رچائی جاتی ہے
اے خدا — تو ان پاؤں کو استقامت بخش
شہزادی کے پاؤں پر مہندی رچائی جاتی ہے

بیاہ کا دن ہے لڑکی نہائی دھوئی جا رہی ہے۔ پانی ڈالنے کی نزاکت ملاحظہ ہو۔

ہلکی ہلکی دھاروں سے تجھے پانی ڈالا جا رہا ہے
کوہساروں کی پریاں تجھے "مبارکباد" گا رہی ہیں
کٹوروں سے تجھے ڈھیر ڈھیر پانی ڈالا جا رہا ہے
جنگلوں کی مینائیں تجھے "مبارکباد" گا رہی ہیں

نہا دھو کر بال سنوارے جا رہے ہیں۔

صندل کی کنگھی سے تیرے بال سنوارے جا رہے ہیں
تیرے بالوں میں ہم پھول (زنالی وانکہ) کاڑھیں گی
تیری مانگ پہاڑیوں سے بہتی ہوئی دودھ کی ندیا ہے
یا — آکاش پر کہکشاں چمک رہی ہے

یہ تو دن کی بات تھی۔ شام کے وقت دلہن سجی سجائی اور بناؤ سنگار کئے ہوئے ہے ہر طرف چہل پہل اور گہما گہمی ہے۔ برات کا انتظار چھوٹے بڑے سبھی کر رہے ہیں۔ ہر کوئی دولہا کو دیکھنے کا تمنائی ہے۔ عورتیں صف باندھے سڑک پر کھڑی ہیں۔ اتنے میں دور سے مشعلوں کی روشنی نمودار ہوتی ہے۔ یہ باراتیوں کے سوا اور کون ہو سکتے ہیں۔

پہاڑ کے اس پار مشعلوں کی روشنی جھلملا اٹھی
آج یہاں سے "لالہ زار" گذرنے والا ہے
اتنے میں شہنائی کی آواز بھی کانوں میں پڑنے لگتی ہے
شہنائی کی آواز کتنی اونچی اور سریلی ہے
آکاش کے ستاروں کے دل دھڑک اٹھے ہیں

بارات سامنے آموجود ہوئی۔ بچوں نے "دولہا آیا، برات آئی" کا شور مچانا شروع کیا۔ آگے آگے شہنائی والے، ان کے پیچھے سجے سجائے گھوڑے پر دولہا میاں شاہانہ وقار و تمکنت سے سوار ہے اور پھر باراتیوں کا جھرمٹ ہے۔ اس جلوس کے دونوں جانب مشعلچی مشعلیں ہاتھ میں لئے سارے ماحول کو جگمگا رہے ہیں۔ بارات کا رنگ ڈھنگ ملاحظہ ہو۔

دھوبی کے دھلے ہوئے کپڑے پہنی پہن کر
باراتی کس شان سے چلے آ رہے ہیں
باراتیوں کے جھرمٹ میں دولہا میاں ہے
یا — ستاروں کے جھرمٹ میں چاند ہے
پیچھے باراتی اور آگے شہنائی والے ہیں
ہمارا دولہا مجسم کا بڑا راجہ ایسا ہے

اس تمام بارات میں سب سے نمایاں شخصیت دولہا کی ہے جس کی طرف ہر گوشے سے سینکڑوں آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔ اس کا خیر مقدم کرنا پہلا فرض ہے

تجھے اس دروازے تک کس نے راہ بتائی
بے شک — تیری لیلیٰ کا میکہ یہی ہے

تیرے دل کی آواز تیری لیلیٰ کے کانوں تک پہونچی

اے بنڑے تو کیا ہی سجا ہُوا آیا ہے!

اے راجاؤں ایسے ٹھاٹھ والے بنڑے!

ہم قدرہی سے تیرے حُسن سے چندھیا گئیں

تیری رانی سنگار کئے تیری راہ دیکھ رہی ہے

اے بنڑے تُو کیا ہی سجا ہُوا آیا ہے!

دلھن کے بناؤ سنگار کی بھی گیتوں میں تعریف کی جاتی ہے تاکہ دولہا کے دل میں اُس کے لئے ایک تڑپ اور لگن پیدا کی جائے۔ زیوروں کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

تیرا ماتھا چاندکی طرح جگمگا رہا ہے

تیرا جھومر اور ٹیکہ کیا ہی دمک رہا ہے

تیرے کانوں کی بالیاں اور جھمکے کتنے بھلے لگتے ہیں

تیرا بنڑا تجھے لینے آیا ہے!

انگوٹھیوں بھرے تیرے ہاتھ برف سے بھی چٹے ہیں

مہندی کی لالی سے ان کی رنگت نکھر آئی ہے

ناخنہ اور تیل ملنے سے ان میں کتنی چمک آگئی ہے

تیرا بنڑا تجھے لینے آیا ہے!

چاندی کی تیلیں اور سونے کے پازیب کتنے سُندر ہیں

سر پہ پاپچے کی چُنری کیا ہی زیب دیتی ہے

گلے میں ہنگنی کی چوڑی اور ہاتھوں میں ڈونگے کتنے عمدہ ہیں

تیرا بنڑا تجھے لینے آیا ہے!

بارات کمرے میں یا شامیانے کے نیچے جیسا کہ موسم اجازت دے بیٹھ جاتی ہے۔ دولہا اپنی مخصوص اور نمایاں جگہ پر بیٹھ جاتا ہے۔ سکھی سہیلیاں چوری چھپے کواڑوں یا شامیانے کی درازوں میں سے جھانکتی ہوئی دولہا اور باراتیوں کو نہ معلوم کن کن زاویوں سے جائزہ لینے لگتی ہیں۔ اتنے میں ساری محفل میں دستر خوان بچھائے جاتے ہیں۔ تھالوں میں چاول حاضر ہوتے ہیں۔ ایرانی طرز پر پکی ہوئی گوشت کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ مُغلوں کی یہ یادگار ہندبھر میں صرف کشمیریوں ہی نے قائم رکھی ہے۔ جبھی تو یہاں کا "وازہ بھتہ" ہندوستان چھوڑ یورپ تک شہرت رکھتا ہے۔

اِدھر پَو پھٹنے لگی، اُدھر دُلہن کو رُخصت کرنے کی وہ گھڑی آئی جو اِس ڈرامے کا پہلا اور آخری المیہ ہوتا ہے۔ صحن میں کہار ڈولی کَس رہے ہیں کہ پہلی بار گیت کے درد بھرے بول بلند ہوتے ہیں۔

آنگن میں کہار ڈولی کیا کس رہے ہیں

بنّو کی ماں کا کلیجہ شکنجے میں اینٹھ رہا ہے

ہر چہرہ اُترا اُترا سا اور ہر آنکھ ڈوبی ڈوبی سی نظر آتی ہے۔ ایک طرف ماں باپ اپنے لختِ جگر سے جُدا ہو رہے ہیں اور دوسری جانب لڑکی اپنے ماں باپ، بھائی بہنوں اور سکھی سہیلیوں سے بچھڑ رہی ہے۔ اپنی جانی پہچانی لوگوں اور ماحول سے ایک اجنبی اور انجانی دُنیا میں قدم رکھتی ہے۔ ایک نامعلوم زندگی اور مستقبل کا تصوّر دُلہن اور اُس کے ماں باپ کے دل و دماغ میں زبردست اُمید و بیم کے جذبات کی کشمکش پیدا کرتا ہے۔ ہمارے سماج کے غیر یقینی اور ناہموار بھیانک ڈھانچے سے خوشگوار مستقبل کا خواب کس کو نظر آسکتا ہے۔ ماں بیٹی ایک دوسرے کو گلے لگائے آنسو بہا رہی ہیں۔ باراتی صحن میں انتظار کر رہے ہیں۔ گیت جاری ہے۔

آنگن میں سے ڈولی اُٹھنے میں نہیں آتی

لاڈلی کو رُخصت کرنے کو جی نہیں چاہتا ہے

بالآخر لڑکی کو الوداع کہہ کر ڈولی میں بٹھایا جاتا ہے کہار ڈولی کو اُٹھاتے ہیں۔ ماں کے درد بھرے دل کی ترجمانی گیت میں ہوتی ہے

آج تک تُو میرے گھر کی دیکھ بھال کرتی رہی

اے لاڈلی کیا اب تُو مجھے چھوڑ کر اپنے گھر جا رہی ہے

بارہ سال تک میں نے تجھے کھلونوں کا زیب دے کر اپنائے رکھا

آخرکار — تو مہمان اور پرائی ہی نکلی

اے لاڈلی — اپنی ماں کو بھُلا نہ دینا

اپنے دل کے گوشے میں اُسے تھوڑی سی جگہ دے ہی دینا

بارات دُلہن کو لے کر چل پڑتی ہے۔ دولہا کو خطاب کیا جاتا ہے۔

ہماری طرف سے خدا درمیان ہے

ذات کے نیک ہو تو اس کی خبرگیری کرنا

اپنی جیب اس سے نہ چھپانا، اپنا دل اس پر ظاہر کرنا

قسم ہے تجھے جو اسے میکے کی یاد کبھی آئے

معصوم لڑکی کی خطاؤں پر نہ جانا — کبھی

اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آنے پائیں!

بارات چل پڑی۔ اب لڑکے والوں کے وہاں "وَٹھل" کا نظارہ کیجئے۔ دُلہن کے آنے

کا انتظار ہو رہا ہے۔ ساس، نندیں سبھی انتہائی خوشی اور شوق سے بھری ہوئی ہیں۔ ہر طرف دھوم دھام اور چہل پہل ہے۔ گانے والیاں سڑک پر ہیں کہ ڈولی نظر آتی ہے۔

دُور سے ڈولی آتی نظر آ رہی ہے
ہماری بھی پھلواڑی میں گلاب کا پھول کھِل اُٹھا ہے

دولہا کو سب سے پہلے مبارک باد کرنا لازمی امر ہے۔

اے دولہا میاں تجھے مبارک ہو، تیرے چہرے پر کتنی خوشی ہے
تیری ماں تجھے گلے لگائے، تُو نے اُس کی بہت لاج رکھی

گرمی کا موسم اور دُور سے آئی ہوئی، چاہے حقیقی طور پر یا نفسیاتی رنگ میں، دُلہن سے ساس کو جو محبّت ہے اُس کی ترجمانی لطیف پیرائے میں کی جاتی ہے۔

اے دُور سے آئی ہوئی دُلہن! تجھے گرمی تو نہیں لگی؟
میں جنگل کے پھولوں کی ڈالی سے تجھے پنکھا کروں گی

گیت جاری ہے

تُو میری پھلواڑی کی پھولوں بھری ڈالی ہے!
اے پری رُو دُلہن میں تجھے اپنے دل میں جگہ دوں گی
کتنے ہی گاؤں چھان کر میں نے تجھ ایسی دُلہن لائی

میں نے کسی کے لئے اُنگلی اُٹھانے کا موقعہ نہیں دیا ہے۔

یہ شادی بیاہ کے اُن گیتوں کی ایک جھلک ہے جن میں شعریت، فنکاری، تخیل کی رفعت و نزاکت اور آمد کی فراوانی ہے۔ جن کے تخلیق کا سہرا اُن مقدس اور اَن پڑھ عورتوں کے سر ہے جنہیں صدیوں سے مکر و فریب کی دیویاں، عشوہ سازانہ اور مکر و جنس کے ناموں سے پکارا گیا، جو کشمیر پر سامراجی شہ پر پاکستان کی جانب سے حملہ ہوتے وقت اپنے نازک کندھوں پر بندوق اُٹھائے کشمیر کے ایک بڑے قومی شاعر مرزا عارف کا یہ ترانہ گاتی ہوئی دشمن کو مار بھگانے کے لئے نکل پڑیں۔

میرے قدم اس لئے تیز تیز نہ اُٹھے — میں ہمیشہ حرم سراؤں کی زینت سمجھی گئی
مجھے اس کشمیر کی وادی کی قسم ہے — میں ستاروں پر اپنی کمند لگاؤں گی

انقلاب زندہ باد، انقلاب، انقلاب!

کشمیر پہ میرا لہو بہاری جائے — میں اس کی محبت میں دیوانی ہو گئی ہوں
میں ستاروں کے اندر چاند ایسی ہوں — آج میرے دل کے ارماں جاگ اُٹھے

انقلاب زندہ باد، انقلاب، انقلاب!

میں نے اس لئے بندوق کندھے پر اُٹھائی — میں اپنے چمن پر دوسروں کو چھانے نہ دوں گی
میں اُن کا خون اپنے ہاتھوں کی مہندی بناؤں گی — جو میری عصمت سے کھیلنے کا خواب دیکھ رہے ہیں

انقلاب زندہ باد، انقلاب، انقلاب!

مُلکی معلومات

(۱) بھارت میں براہ راست ٹیکس کا ۷۰ فیصدی حصّہ آمدنی کے بالائی درجوں سے متعلق ہے۔ یہ تناسب دُنیا کے اکثر ممالک سے زیادہ ہے۔ ان میں امریکہ اور برطانیہ شامل نہیں ہیں۔ جہاں براہ راست ٹیکس کا بالترتیب ۹۱ اور ۹۷ اعشاریہ ۵ فیصد حصّہ آمدنی کے بالائی درجوں پر ہے۔

(۲) ۱۹۵۲ء میں بھارت کی ۵۴۰۰ مشینیں طیّار کی گئیں۔ اس کے مقابلے میں گذشتہ سال ۴۴۰۶ مشینیں طیّار کی گئی تھیں۔

(۳) مہنگائی الاؤنس کمیٹی کی سفارشات کی تعمیل سے ۱۵ لاکھ ۲۵ ہزار اشخاص کو فائدہ پہنچے گا اور اس پر سرکار کو ہر سال مزید ۵ کروڑ روپیہ صرف کرنا پڑے گا

(۴) ۵۲-۱۹۵۱ء میں انڈین یونین میں ۲۳ کروڑ ۵۴ لاکھ ۸۵ ہزار ایکڑ رقبہ زمین میں دالوں اور اناج کی کاشت کی گئی۔ جس میں سے ۴ کروڑ ۴۱ لاکھ ۴۶ ہزار ایکڑ رقبہ اُتر پردیش میں تھا اور اس سے دوسرے درجے پر ۲ کروڑ ۷۰ لاکھ ۸۰ ہزار ایکڑ کا رقبہ بمبئی میں تھا۔

(۵) گذشتہ سال کے آخر میں آل انڈیا ریڈیو سے ہر روز خبروں کے ۷۳ بلیٹن نشر کئے جاتے تھے۔ جن میں سے ۴۴ بھارت میں سننے والوں کے لئے اور ۲۹ دوسرے ملکوں میں

ذکر و فکر

غزل — محشر مرزاپوری

اے ہمنوا قفس کو جو گھر کہہ دیا گیا
ماحول کے یہ زیرِ اثر کہہ دیا گیا

منزل سے ماجرائے سفر کہہ دیا گیا
کہنا نہ چاہیے تھا مگر کہہ دیا گیا

مجبوریوں کی منزلِ حدِ کمال کو
کچھ اختیار دے کے بشر کہہ دیا گیا

جن سے شرابِ حسن کے جلوے چھلک پڑے
ان ساغروں کو شمس و قمر کہہ دیا گیا

جو ڈھونڈھتا تھا خاک میں منزل عروج کی
اس جذبۂ نیاز کو سر کہہ دیا گیا

جب کھل سکے نہ لب کبھی دل کے دباؤ سے
آنکھوں سے حالِ دردِ جگر کہہ دیا گیا

جس میں تلاشِ جلوۂ جاناں کی ہے تڑپ
اس ذوقِ مضطرب کو نظر کہہ دیا گیا

افسانۂ شکستِ دلِ صبر آزما
مجبوریوں کے پیشِ نظر کہہ دیا گیا

اتنا نکھر گیا ہے شعورِ مذاقِ وقت
ہر عیب کو ہمارے ہنر کہہ دیا گیا

جو بجھتے بجھتے دے گیا سورج کو روشنی
محشر اسے چراغِ سحر کہہ دیا گیا

غزل — کوثر جائسی

انہی سے دورِ غمِ عاشقی کی بات گئی
ہمارے اشکوں سے سیراب ہو کے رات گئی

دیارِ عشق کی تقدیر سنگِ در میں تھا
لہو میں ڈوب کے اس راہ سے حیات گئی

ترے جمال کو ملتی گئی فضائے ظہور
جہاں جہاں مری سیلِ تخیلات گئی

وہ عرضِ غم پہ مری ان کا اہتمامِ سکوت
تمام شورشِ تفصیلِ واقعات گئی

زمانہ رازِ بہار و خزاں سمجھ نہ سکا
مری نگہ تھی کہ تا قلبِ کائنات گئی

چھلک اٹھا جو کبھی خونِ آرزو میرا
ذرہ ذرہ تری رعنائیوں کی بات گئی

وہ دور تھے تو محبت کو وہم تھے کیا کیا
قریب آتے ہی وہ طرزِ التفات گئی

وہ نقشِ پا تو سرِ راہ تھا مگر کوثر
جبینِ شوق بپاسِ تکلفات گئی

غزل — جلیل عرشی

یہیں ختم تم نہ سمجھو غمِ عشق کا فسانہ
ابھی اور رو دے گا کچھ مرے حال پر زمانہ

مرے دل کی داستاں ہے جو ہے زیرِ بحث عنواں
جو زبانِ خلق پر ہے وہ ہے آپ کا فسانہ

یہ نگارِ غنچہ و گل یہ بہارِ حسن ساماں
تری اک نگاہ تک ہیں سرِ شاخ آشیانہ

جو محبت وفا کی وہ امید سے نوازیں
ابھی زندگی کا اپنی کوئی ڈھونڈ لوں بہانہ

ہے شباب پر محبت یہی وقت ہے مغنی
کوئی دلگداز نغمہ، کوئی جانفزا ترانہ

کوئی مائلِ کرم تھا مجھے خواب سا گماں ہے
یہ غلط اگر ہے عرشی تو وہ کیا ہوا زمانہ

حسن — مسلم الحریری

ظلمتکدۂ دہر کی زینت ہے حسن
افسانۂ عالم کی حقیقت ہے حسن
فردوس کی بے خزاں بہاروں کی قسم
آدم کی سرشتِ غم کی جنت ہے حسن

اک سلسلۂ نغمۂ بے ساز ہے حسن
اک سوز میں ڈوبی ہوا آواز ہے حسن
سب کچھ ہے بہارِ باغِ ہستی لیکن
کونین کا سررشتۂ آغاز ہے حسن

کافر کو جمالِ رخِ اصنام ہے حسن
مومن کے لئے جلوۂ اسلام ہے حسن
کہنے کو تو ہیں لاکھوں ہی اسمائے صفات
پر اصل میں اک جلوۂ بے نام ہے حسن

دنیا ہے اسیر اور آزاد ہے حسن
نخچیرِ جہاں ہے اور صیاد ہے حسن
اس عالمِ ہستی کی نمائش کی قسم
تعمیر ہے عشق اور بنیاد ہے حسن

امید کا جلوہ کہ شبِ یاس ہے حسن
خود روح ہے یا گرمیٔ انفاس ہے حسن
یا حسن کے ماسوا یہاں کچھ بھی نہیں
یا صرف مرے عشق کا احساس ہے حسن

غزل — حسن نجمی

جو سرزد ان سے نادانی نہ ہوتی
تو دنیا مجھ سے بیگانی نہ ہوتی

اگر بندش نہ ہوتی فصلِ گل پر
تو میرے گھر میں ویرانی نہ ہوتی

تصنع سے اگر تم دور رہتے
تو آئینے کو حیرانی نہ ہوتی

تبسم پر اگر ڈاکے نہ پڑتے
مری آنکھوں میں طغیانی نہ ہوتی

جو ہوتا عام نظارا تمہارا
جہاں میں کفر سامانی نہ ہوتی

جو اپناتے جنوں کو اہلِ حکمت
یہ رسمِ چاک دامانی نہ ہوتی

اگر ہوتا خلوصِ کار نجمی
سخن کی اتنی ارزانی نہ ہوتی

اندازِ سخن — مضطر کاکوروی

تقاضائے گل و سرو و سمن کچھ اور ہے ساقی
مگر منظورِ اربابِ چمن کچھ اور ہے ساقی

ہوا ہے اب سے پہلے بھی تغیر بارہا لیکن
یہ رنگِ انقلاباتِ چمن کچھ اور ہے ساقی

کہاں وہ نشہ وہ کیف و اثر اس بادۂ نو میں
ترے شیشے کی صہبائے کہن کچھ اور ہے ساقی

ہزاروں شنگ خوبانِ جہاں ہم نے دیکھے ہیں
ترے ناز و ادا کا بانکپن کچھ اور ہے ساقی

جمالِ شاہدِ ایماں فسوں ساماں سہی لیکن
ترا یہ غمزۂ تقویٰ شکن کچھ اور ہے ساقی

ستم کا کیا گلہ، طرزِ تغافل کی شکایت کیا
کہ اب تیری روش تیرا چلن کچھ اور ہے ساقی

شاہ مقبول احمد

بہاری ماحول اور اردو ادب

یوں تو اردو ایک ہندوستان گیر زبان ہے مگر اپنے عام رواج اور چلن کے اعتبار سے اس نے ہندوستان کے بعض علاقوں میں ایک مقامی اور صوبائی حیثیت بھی اختیار کرلی ہے۔ اتر پردیش تو اس کا مولد ہی ہے بقیہ بہار، پنجاب اور دکن اس کے مخصوص اور قدیم مسکن ہیں۔ گو تقسیم ملک کے بعد موجودہ مشرقی پنجاب ایک جداگانہ لسانی منظر پیش کرتا ہے اور ہندی اور پنجابی (گورمکھی رسم خط میں) کی آویزش نے وہاں کی فضا کو اس درجہ مکدر کر دیا ہے کہ اس کے متعلق ہر فیصلہ ابھی قبل از وقت معلوم ہوتا ہے۔ تاہم یہ بات قطعی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ یو۔ پی، بہار اور دکن آج بھی بدستور سابق اردو ہی کی حدود اختیار میں ہیں۔ مذکورہ علاقوں کی ایک کثیر آبادی اسی زبان میں اپنے سارے کام انجام دیتی ہے خط وکتابت اور روزمرہ کے معمولی حساب وکتاب سے لے کر تعلیم و تعلم، شعر و ادب، تصنیف و تالیف، تحریر و تقریر، اخبار و رسائل، دین و مذہب غرض زندگی کا کوئی شعبہ نہیں جس کی ترجمانی کے لئے اس کا یہی تنہا وسیلہ نہ ہو۔

آپ ایسا نہ سمجھیں کہ جو سطور تمہیداً احاطۂ تحریر میں آگئی ہیں ان کی وجہ سے میں اپنے عنوان کے پیش نظر کسی بے انصافی یا دور از کار بحث کا مرتکب ہو رہا ہوں۔ دراصل مجھے یہ امر ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ زبان اردو یو۔ پی، بہار اور دکن کے اطراف و جوانب میں کسی قدر وسیع اثرات کے ساتھ جاری و ساری ہے اور کس درجہ وہاں کی زندگی کے ہر جز و کل پر کلی طور سے حاوی ہے۔ اسی وجہ سے ہم اپنی اس آرزو میں بالکل حق بجانب ہیں کہ ان علاقوں کی زندگی اور عام ماحول کا پورا پورا عکس اس کے ادب کے آئینے میں دیکھیں۔ اور ہمارا یہ مطالبہ کہ اس کے ہر حرف کے ایک ایک دائرے، شوشے، اور گوشے کو ان علاقوں کی تفسیر حیات ہونی چاہیئے کسی پست و فرومایہ قسم کی صوبائی ذہنیت کا غماز نہیں ہو سکتا۔ ملک کی دوسری رائج زبانیں مثلاً بنگالی، آسامی، اوڑیا، مراٹھی اور گجراتی وغیرہ مقامی طور پر اپنے اپنے مخصوص لسانی علاقوں میں محدود ہیں۔ ان زبانوں کا ذخیرۂ ادب صرف اپنے اپنے علاقے ہی کی زندگی کا آئینہ دار ہو سکتا ہے بنگالی میں گجرات کے کھیت کھلیان کی تلاش بے معنی ہے۔ مراٹھی میں آسام کے کوچہ و بازار کے مناظر اگر نہیں ہیں تو یہ بالکل فطری امر ہے۔ مگر اردو کی حیثیت بالکل جداگانہ ہے۔ دوسری رائج زبانوں کے مقابلہ میں منجملہ دیگر امتیاز خصوصی کے اس کا طرۂ افتخار یہ بھی ہے کہ یہ کئی متعدد متفرق علاقوں کی زبان ہے جو ایک ہی ملک کے ایسے ٹکڑے ہیں جن کی تاریخ و جغرافیہ الگ الگ ہیں اور اسی لئے لسانی وحدت کے باوجود زندگی کے یکساں خد و خال پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ پنجاب، یو۔ پی، بہار اور دکن کے عام ادبی پس منظر میں ایک قسم کا اشتراک ہی سہی مگر فطری ماحول اور گرد و پیش کے حالات نے ان علاقوں میں زندگی کے ایسے نقوش بنائے ہیں کہ ہر تصویر پکار کر کہتی ہے کہ اس کا آب و رنگ دوسری تصویر کے رنگ و روغن سے جدا ہے۔ اور یہ اختلاف درجے کا نہیں بلکہ نوعیت کا ہے۔ ایسی صورت میں زندگی کی عام اور مشترک قدروں سے قطع نظر جزیات و تفصیلات میں بیّن فرق ہونا عین مطابق فطرت ہے۔ اور ایک علاقے کی زندگی کی عکّاسی میں کسی دوسرے علاقے کی زندگی کے خد و خال دیکھنے کی تمنا کمال سادگی ہے۔ مثلاً جس حصہ ادب میں دلّی، لکھنؤ اور اس کے اطراف کی زندگی کی تصویریں پیش کی گئی ہوں اس میں اس معاشرے کی جھلک کہاں مل سکتی ہے جس کی شام و سحر پنجاب، بہار اور دکن کی سرزمین کی آغوش میں ہو۔

اردو کے اکثر و بیشتر ادبا و شعرا وطنی طور پر اطراف یو۔پی سے منسوب ہیں اس وجہ سے اس کے ادب میں یو۔پی کی زندگی کے تمام نہ سہی بعض پہلو ضرور نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ اگر یہ ادیب و شاعر دنیائے تخیل

مطالعۂ باطن اور لغات و محاورات اور دانست فن کے اظہار کے بجائے ارد گرد کے ماحول اور اس کے جائزے پر زیادہ زور دیتے تو اطراف یو۔پی کی زندگی اور اس کی پیچیدگیوں کے سمجھنے میں ان کا پیش کردہ فن اور زیادہ ہمارا ممد و معاون ہوتا۔ مگر پھر بھی ان کے قلم نے جو نقوش بھی بنائے ہیں ان سے وہاں کی زندگی کی کم از کم ایک دھندلی ہی سی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اور اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اردو ادب میں یو۔پی کی زندگی کا عکس کسی حد تک موجود ہے مگر دوسرے خطے جو گو لسانی اعتبار سے اردو ہی کے زیر نگیں ہیں پھر بھی اس کا ادب ان علاقوں کی زندگی کا عکاس نہیں۔

چونکہ موضوع بحث بہاری ماحول ہے اس لئے سر دست پنجاب اور دکن کو ہم نظر انداز کرتے ہیں۔ عام طور سے کہا جاتا ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ اس اصول کو اگر ہم اپنی بحث کی بنیاد تسلیم کر لیں اور پھر یہ غور کریں کہ اردو ادب بہاری ماحول اور اس کے متعلقات کا کہاں تک آئینہ دار ہے تو تجزیہ کی دو تین ہی کڑیوں میں یہ راز عیاں ہو جائے گا کہ یہ آئینہ ضرور ہے مگر اس میں عکس بہار کی زندگی کا نہیں۔ یعنی کسی صاحب تحقیق کے حق میں بہار کی زندگی اور اس کے نشیب و فراز کے سمجھنے کے لئے اردو ادب زیادہ کارآمد ہتھیار ثابت نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ اس کا دعوےٰ ہے کہ یہ اہل بہار کا بھی ادب ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اطراف یو۔پی کے ادبا و شعرا بہار کی زندگی سے دلچسپی نہیں رکھتے اور اس کے باعث وہ مورد الزام سمجھے جائیں۔ انہوں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولی ہیں اور جس قسم کے گرد و پیش میں اُن کی صبح و شام ہو رہی ہے اس کی عکاسی کے سوا اُن سے اس سے زیادہ کے طالب ہم کیونکر ہو سکتے ہیں۔ اس کے لئے ہم کو بہار کے شعرا و ادبا کی قوت مشاہدہ کا جائزہ لینا ہوگا دراصل اس موقع پر ہم اس سے بھی زیادہ اہم سوال کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ تقریباً تمام دنیائے اردو تخلیق کے بجائے تقلید کا شکار ہے۔ شمالی ہندوستان کے اہم ادبی مرکز دلّی اور لکھنؤ نے شیراز اور اصفہان کی ناکام نقالی میں اپنا وقت عزیز ضائع کیا اور دلی اور لکھنؤ کی ایک قسم کی مرکزیت کی تشکیل کے بعد ملک کے دوسرے اہم ادبی مراکز نے اپنی تمام سعی اور کاوش دلّی اور لکھنؤ کی تقلید میں صرف کی۔ اور نقل مطابق اصل کے کج روی نے حقیقی منزل سے اس درجہ دور کر دیا کہ مقامی زندگی کی عکاسی کا تو ذکر ہی کیا زبان تک میں مقامی اثرات کے اظہار کو ہنر کے بجائے اپنے فن کا عیب تصور کیا گیا۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ جوشش عظیم آبادی اور راسخ عظیم آبادی وغیرہ کے کلام کا مطالعہ کر کے آپ کبھی متیقن نہیں ہو سکتے کہ اگر یہ شعرا کبھی بہار نہ بھی آتے تو ان کی زبان یا ان کے کلام کا رنگ اس کے سوا کچھ اور ہوتا۔ ہم ان کو بہاری ادیب اور شاعر کیوں تسلیم کرتے ہیں فقط اس لئے کہ یہ یہاں پیدا ہوئے، رہے بسے اور آج تک یہیں آسودۂ خاک ہیں۔ ورنہ بہاری زندگی کی تصویر کشی کا جہاں تک تعلق ہے اس کے متعلق مرتب کلام جوشش کا یہ قول کافی ہے کہ "جوشش[1] کی زبان وہی ہے جو ان کے دہلوی معاصروں کی ہے۔ بہاری اثر دو ایک جگہ نظر آتا ہے ماگن بہ کسر گ اور لفظ خوردک بہ ایک باجے کا نام ہے جو بہار میں اب تک سنا جاتا ہے"۔ اس کے علاوہ ایک نظم ٹکاری[2] کی ہجو کے سلسلے میں ہے۔ ازیں قبیل تمام دواوین و کلام کا یہی حال ہے۔ اس نظر سے اردو ادب کا مطالعہ کیجئے تو صرف دو جذبے برسر کار اور غالب نظر آتے ہیں۔ ایک طرف ایران کے نازہ دار و شعرا کے ستائے ہوئے دہلوی شعرا انتقاماً یہ نعرہ بلند کئے ہوئے ہیں ؂

نسیم دہلوی ہم موجد باب فصاحت ہیں
کوئی اردو کو کیا سمجھے گا جیسا ہم سمجھتے ہیں (نسیم دہلوی)

اور اسی کے بالمقابل دوسری جانب غیر دہلوی و غیر لکھنوی شعرا کے دوسرے گروہ نے اس میں اپنے لئے راہ نجات نکالی ہے ؂

سن لیا تم نے آج اخگر کو
لکھنؤ کی زبان ہے کہ نہیں (اخگر بہاری)

یہی وجہ ہے کہ اردو یو۔پی کے علاوہ جن دوسرے علاقوں کی زبان بنی ان کی زندگی اور ماحول کی تصویر کشی سے قاصر رہی۔ مقامی شعرا و ادبا صحت و صفائی، محاورہ، روزمرہ، سلاست و فصاحت کے پیچ و خم میں ایسے الجھے کہ اپنے ارد گرد کو بھول گئے۔ کلام کا بیشتر حصہ محض تخیلی اور مصنوعی ہو کر رہ گیا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ جو چیزیں محض تخیلی فضا میں جنم لیتی ہیں وہ بھی خلا کی پیداوار نہیں ہو سکتیں بلکہ خارجی اثرات کی وہ ایک حد تک داخلی کیفیت ہوتی ہیں اور اسی وجہ سے اگر ان کے تمام پیش کردہ تصورات کا تجزیہ کیا جائے

---

[1] صفحہ ۴۶ کلام جوشش مرتبہ قاضی عبدالودود۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند دہلی

[2] ضلع گیا کا ایک مشہور قصبہ ہے۔

تو کچھ ایسے تمدنی اقدار، تہذیبی اجزا اور سماجی شعور کی تشکیل عمل میں آجاتی
ہے جس سے ہم ان شعراء و ادبا کے قریبی ماحول کا پورا پتہ تو نہیں مٹا مٹا سا
سراغ لگا لیتے ہیں۔ مگر یہ تمام منزل کوہ کندن و کاہ برآوردن کے بمصداق
طے ہوتی ہے۔ آئینہ اور عکس میں جو رشتہ براہِ راست ہوتا ہے۔ ویسا تعلق
ہمارے ادب اور علاقائی ماحول میں نہیں۔ یہاں سارا ماحول لکھنئی اور غیر علاقائی
ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر رئیسانہ ٹھاٹھ دکھائے جاتے ہیں تو لکھنوی ساز و سامان
سے آرائش حاصل کی جاتی ہے۔ ایک رئیس کو مقامی رنگ کے بجائے لکھنوی
اوصاف سے متّصف کرکے پیش کیا جاتا ہے۔ اس کی مثالیں بہار کے بعض
مشہور ناول پیش کرتے ہیں۔ مثلاً سید افضل الدین کا ناول "فسانۂ خورشیدی"
یا سید علی سجاد عظیم آبادی کا ناول "نئی نویلی" موخر الذکر ناول میں ماحول مقامی نہ
سہی کم از کم زبان میں کہیں کہیں مقامی اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ گو کتاب کے
سرورق ہی پہ یہ جملے لکھے ہوتے ملتے ہیں۔ ایک پھوہڑ بیگم کا قصہ جو نہایت ظرافت
اور نصیحت آگیں پیرایہ میں لکھنؤ کی محلات کی زبان میں لکھا گیا ہے۔ امراؤ
رؤسا ہی نہیں بلکہ ان کے ملازمین بھی ہیں تو وہی لکھنوی خصوصیات کے خدام
ادب۔ حالانکہ بقائی، رمضانی، انگھڑ، گھسیٹو، دوساہی، جولائی، طوفانی اور
فولادی جیسے ناموں والے شائستہ یا نیم شائستہ ملازمین و خدمتگار بہار کی
زندگی میں دخیل ہیں جو غلط اردو بھی بولتے ہیں مگر اپنی جگہ بڑے فصیح اور دلچسپ
ہیں۔ چونکہ اردو ادب میں سارا کھیل زبان، الفاظ اور اسلوب کا ہے اس لئے
باستثنائے چند کثیر التعداد شعراء و ادباء غیر لکھنوی و غیر دہلوی ہونے کے
باوجود زبان اور بیان کے اعتبار سے غیر فطری طور پر لکھنوی یا دہلوی بنے ہوئے
ہیں۔ اور ان کے فن کے جانچنے کا معیار بھی یہی ہے کہ وہ کہاں تک اپنے علاقوں
سے دور اور دہلی و لکھنؤ سے قریب ہیں۔ اگر اس خود فریبی نے ہمارے ادبا
کی تمام قوتوں کو شل نہ کر دیا ہوتا تو آج اردو ادب میں کم از کم یو۔ پی، بہار،
پنجاب اور دکن کی زندگی کی لہریں ہر جگہ دکھائی دیتیں۔

اس نظر سے بہار کے اکثر مصنفین کا جائزہ لینے کے بعد یہ نظر آتا ہے کہ
ایک شاد عظیم آبادی ہی کی ہستی ہے جو عجیب و غریب خصوصیات اور کمالات کی
حامل ہے۔ زباندانی کے باب میں ان کا ریاض ساٹھ برس کا تھا اور زبان لکھنؤ
کے متعلق اُن کو دل سے اقرار بھی تھا کہ ؎

زبانِ حضرتِ مونس کا شاد کیا کہنا

لیکن اس کے باوصف وہ بہار کے لغات و محاورات و ضرب الامثال
اور قواعد کی بعض مقامی ترمیمات کی سند کے لئے بہار میں ان کے عام رواج کو
کافی سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان کا قابل قدر ناول "صورت الخیال" اس حیثیت سے
ایک بہترین تصنیف ہے۔ اردو ادب کے تموّل میں اس کتاب نے وہ اضافہ
کیا ہے جس کے باعث ادب اردو کسی حد تک بہاری ماحول کی عکاسی کا
دعوےٰ دار ہو سکتا ہے۔ اس کتاب کے اوراق درحقیقت بہار کی زندگی کے
ابواب ہیں۔ اس آئینہ میں ہم بہار کی زندگی دیکھتے ہیں اور دوسرے اطراف
کے باشندے اس کے ذریعے یہاں کے ماحول کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ
ہے کہ "ناول کی تاریخ و تنقید" کے مصنف علی عبّاس حسینی کے ہم بھی ہم نوا ہیں
کہ یہ ناول اس قابل ہے کہ اسے پھر دوبارہ آب و تاب کے ساتھ شائع کیا
جائے۔ "صورت الخیال" کے ابتدائی صفحات میں مصنف بغیر کسی ایچ پیچ
کے صاف لکھتے ہیں۔ "بڑی بات تو یہ ہے کہ علاوہ عظیم آباد کے شریف اور قدیم
خاندان کی عورتوں کے (جن کے خاص محاورے میں کتاب لکھی گئی ہے) اور شہروں
کی عورتیں بھی اس کی بول چال پسند کرتی ہیں"۔ دوسری جگہ مقامی زبان کے باب
میں ان کا خیال اور زیادہ واضح ہو گیا ہے "جہاں تک ہو سکا اہل پیشہ اور
عام لوگ صوبہ بہار کے جس طرح کی بول چال رکھتے ہیں جیسے میاں گھسیٹو وغیرہ
وغیرہ ان کی زبان میں اصلاح نہیں دی گئی ہاں خاص عظیم آباد کے شریف خاندانوں
کی عورتیں جیسی بات چیت کرتی ہیں ولایتی (ایک کردار) کی زبان سے ویسے ہی
محاورے نکلے ہیں غالباً ہمارے تمام صوبہ بہار کی عورتوں کی شائستگی زبان کا
ولایتی اور دولھن بیگم اور علیمن اور رقیہ سبق دیں گی"۔

بہرحال اس اقتباس کا مدعا یہ تھا کہ اپنے تبصرے کے بجائے خود مصنف
کا نقطۂ نظر ان کے الفاظ میں پیش ہو جائے۔ چونکہ مصنف کے نزدیک مقامی
زندگی اور اثرات غیر اہم نہ تھے اس لئے تقلید کی تاریکیوں میں تخلیق کی شعاعیں
اُفقِ ادب پر کھیلتی ہوئی نظر آئیں اور مایوس دلوں کو شاد کام کر گئیں۔

شاد عظیم آبادی کی ایک نظم "پٹنے کے اگلے شرفا" کے یہ اشعار ہیں۔

بھرا ہوا تھا شریفوں سے شہر یوں سارا — کہ جیسے قطرۂ باراں سے ابر دریا بار
وہ صورتیں متبرک وہ ان کی شان و شکوہ — جہاں بانہ وہ باتیں وہ جانفزا گفتار
وہ ان کی وضع متیں اور لباس نورانی — وہ اُن کے عزم درست اور نچی تلی رفتار
وہ کان دار کلاہ آستیں قبا کی فراخ — وہ اُن کے گھٹنے جوتے وہ پائنچے ہموار

ہر اک کو وضع کا پاس اپنے دوستوں کا لحاظ   نبوں پہ خلق کی باتیں دلوں میں صبر و قرار

کسی کو نثر کا ذوق اور کسی کو نظم کا شوق   فقیہہ و صاحب تقوا و کاسب و ابرار

وہ دوستوں سے عزیزوں کی طرح مل جانا   بُرائیوں سے کنارہ شکائتوں سے عار

سنو غریبوں کی حالت امیر تو ہیں امیر   مجال کیا جو کریں اپنے حال کا اظہار

نہ نکلیں گھر سے جو نکلیں تو شان سے نکلیں   کہ اپنے ہاتھ سے جانے نہ پائے اپنا وقار

بشاشتیں وہی منہ پر ہزار ہو تکلیف   طلب کا نام نہ لائیں زبان پر زنہار

لئے دئے ہوئے اور آبرو بنائے ہوئے   کہ تا نہ سمجھے کوئی ان کو مفلس و نادار

مہذب ایسے تھے جاہل بھی اس زمانے کے   کہ اہل علم میں کر لے زمانہ ان کو شمار

محاوروں میں وہ شیرینیاں کہ صلِّ علیٰ   وہ جب کریں تو بہ آہستگی کریں گفتار

نہ بات بات پہ قسمیں نہ قہقہے بے وجہ   نہ وہ کلام کہ سُن کر عقیل ہوں بیزار

متین وہ لب و لہجہ وہ مختصر باتیں   فضول گو نہ تعلّق سے اپنی کچھ سروکار

جھکائے سر کو شرافت سے راستہ چلنا   ادب سے ہاتھ اٹھانا سلام کو ہر بار

کریں غریب کا بھی تا بہ فرش استقبال   بہت لحاظ کہ آئے نہ اُن کے دل پہ غبار

نشست ان کی دو زانو کنارہ تکیوں سے   معاشرت سے عیاں انضباط و صبر و قرار

لحاظ بھائیوں تک میں بھی باپ بیٹوں کا   یہ کیا مجال کہ مرکز سے بڑھ کے ہو گفتار

ہر اک کو حفظِ مراتب میں تکملہ حاصل   ہر اک سے جھک کے تعارف صفا رہوئی کیا

بہادرانہ اُمنگیں سپاہیانہ شوق   جریب دست مبارک میں اور کمر میں کٹار

کوئی جگہ کوئی صحبت نہیں کہ ہوں نہ وہاں   مورخ و شعرا و ادیب و نثر نگار

متبرک صورتیں، مہذبانہ باتیں، جانفزا گفتار، وضع متین، لباس نورانی، عزم درست، چھچی تلی رفتار، کان دار کلاہ، قبا کی آستین فراخ۔ گھیتلے جوتے، پائینچے بردار، پاس وضع، دوستوں کا لحاظ۔ لبوں پر خلق کی باتیں، دلوں میں صبر و قرار، دوستوں سے عزیزوں کی طرح ملنا، برائیوں سے کنارہ اور شکایتوں سے عار، غربت میں اپنا وقار قائم رکھنا اور اظہار حال سے پرہیز، تکلیف میں بھی منہ پر بشاشتیں اور طلب سے احتراز، ان پڑھ اشخاص کا بھی مہذبانہ انداز کلام، آہستگی سے باتیں کرنا بات بات پر قسمیں نہ کھانا، بے وجہ قہقہے نہ لگانا، ایسی باتیں نہ کرنا جن سے عقیل کو ناگواری ہو، لب و لہجہ میں متانت اور فضول کلام سے اجتناب، راستہ سر جھکائے ہوئے چلنا، ہر جگہ ادب و تمیز سے سلام کو ہاتھ اُٹھانا، اگر غریب بھی آجائے تو تا فرش اس کا استقبال کرنا اور اس کی دلداری و دلجوئی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرنا، دو زانو ہو کر ادب سے بیٹھنا، اور نظم و ضبط کی ایک خاص فضا پیدا کرنا خورد و بزرگ کا اپنی اپنی حدود میں رہ کر ایک دوسرے کا پاس و لحاظ کرنا، حفظ و مراتب میں ایسا حصول کمال کہ ہر ایک سے جھک کر تعارف کرنا اسی کے ساتھ بہادری و شجاعت جیسے فضائلِ اخلاق سے متصف ہونا۔ یہی وہ تہذیبی و تمدنی اجزا تھے جنہوں نے ایک خاص ترتیب و ترکیب کے بعد ایک زندہ جیتے جاگتے معاشرہ کی شکل اختیار کی جس کو شاد کی چشم بینا نے اپنے گرد و پیش سرگرم عمل دیکھا اور اس کو ایک بے کیف روداد کی طرح نہیں بلکہ ماہرانہ حسن کاری کے ساتھ کمال دیانت فن کو ملحوظ خاطر رکھ کر پیش کیا ہے اس میں شک نہیں کہ اس تہذیب کے جو عناصرِ ترکیبی ہیں وہ اس درجہ متعین ممیّز اور مخصوص بھی نہیں ہیں جن پر عمومیت کا حکم مطلقاً نہ لگایا جا سکے۔ اس مرقعۂ تہذیب کا اطلاق بادنیٰ تغیر دلی و لکھنؤ کے تمدنی ماحول پر بھی کسی قدر ہو سکتا ہے۔ مگر اس مناسبت اور مشابہت سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ شاد کا تخیّل تخلیق کی شاہراہ سے الگ ہو کر تقلید کی وادی میں بھٹک رہا ہے، اور ماحول کی عکّاسی کے بجائے تخیل کے پر پرواز سے کام لے رہا ہے۔ اصل میں اس کی ایک تاریخی توجیہہ بھی قابل لحاظ ہے۔ مسلم عہد حکومت میں تمام سیاسی مرکزوں اور شہروں میں ایک طرح کی یکسانیت سی ہو گئی تھی۔ اس وقت دلّی ہی کے چراغ سے ہر محفل روشن تھی۔ عمائدین دہلی ہی نے ان مختلف شہروں میں بود و باش اختیار کی تھی جن کی آل و اولاد نے الگ الگ مقامی ماحول کے باوجود یکساں قسم کی تمدنی و معاشرتی اقدار بطور ورثہ کے پائی تھیں۔ اسی لئے اس امر کو تسلیم کر لینے کے باوجود یہ کہنا حقیقت سے دور نہیں ہے کہ مندرجہ بالا نظم کے آئینہ میں عظیم آباد اور اس کے اطراف و مضافات کے معاشرے کی ایک محدود انداز میں مکمل تصویر دکھائی دیتی ہے۔

اس طرح ماحول اور زبان کے اعتبار سے "اصلاح النسا" (رشیدۃ النساء ۱۸۸۱ء) ایک قابل قدر ناول ہے۔ اس میں بھی مقامی ماحول رسم و رواج کی عکّاسی ملتی ہے۔ قصہ لکھتے وقت مصنفہ کے پیش نظر اپنے ہی گرد و نواح کے حالات تھے۔ اصلاح غرض تھی مگر غیر ارادی طور پر مصنفہ کی گردش قلم سے ایسے نقوش اُبھرے ہیں جن میں اس خطۂ ملک کے معاشرے کے آب و رنگ دکھائی دیتے ہیں جہاں اس کے ہوش و تمیز کی آنکھیں کھلیں۔

جدید ادب کے معماروں کا قول ہے کہ وہ ابھی عبوری دور سے گزر رہے ہیں اس لئے اردو ادب کی روائتی تقلید اور ادب نو کی حیات بخش تخلیق میں سخت

آویزش ہے۔ اسی لئے جہاں تخریب کے مناظر سے دل دہلتے ہیں وہاں ہم تعمیر کی بشارت کا سہارا بھی پاتے ہیں۔ جدید ادب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ادیبوں کو اردو کے مخصوص معنوں میں "اہل زبان" یا "زبان دان" کہلانے کی مریضانہ حرص سے آزاد کیا ہے اور مقامی اثرات و قریبی ماحول کے مشاہدے کے لئے اس نے ان کو چشم وا عطا کی ہے۔ چنانچہ اسی کا اثر ہے کہ دیگر علاقوں کی طرح بہار کے بعض ادیب بھی تقلید کی گرفت سے نکل کر تخلیق کی پناہ میں آگئے ہیں ان کے پیش کردہ ادب میں گردوپیش کی زندگی کی خوبو ہے۔ ان کے شہر تقلیدی طور پر لکھنؤ، دلی اور آگرہ نہیں بلکہ یہیں کے چھوٹے بڑے شہر ہیں۔ اور ان کے افسانے یہیں کے اچھے بُرے باشندوں کے حالات و کوائف ہیں ان کے گاؤں وہی ہیں جن میں اس حصۂ ملک کے لاکھوں انسان لطف و مسرت، رنج و کلفت، دولت و ثروت، افلاس اور غریبی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اختر اورینوی کے بہت سے افسانے، کردار اور ان کا ذہنی پس منظر، اور مقامی ماحول اس نوع کی چیزیں ہیں جن میں یہیں کی خوبو اور تاثیر ہے۔ مصنف مذکور کی "ماما دہیا" بہار کی مخصوص ماما ہے جن کا نام اور کردار ٹھیٹھ بہاری ہے۔

زمینداری و کاشتکاری کے طریقۂ معاش نے بہار کے معاشرے میں بعض عجیب باتیں پیدا کی ہیں۔ جس کی ایک مثال دیہات و قصبات میں زمیندار قسم کے شرفار کی ایک اچھی خاصی تعداد کا وجود ہے۔ اس گروہ نے دیہات میں ایک مخصوص قسم کے نیم شہری و نیم قصباتی تمدن کی بنیاد ڈالی تھی۔ اختر اورینوی نے اس ماحول کی مختلف تصویروں میں اس انداز سے رنگ بھرا ہے کہ یہ ماحول اپنی تمام و کمال جزیات و تفصیلات کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتا ہے اسی نظام معاش نے کثیر التعداد افراد کو عدالت اور کچہری کے دروازے تک پہنچایا اور اس ضرورت سے اس مخصوص آبادی نے ڈاکٹروں اور انجینئروں سے زیادہ وکلا پیدا کئے۔ پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ وکیل موضوع بحث نہ بنتے چنانچہ اسی نسبت سے اختر اورینوی کا "جونیر وکیل" آج بہار کے صدہا وکیلوں کی سوانح حیات ہے۔ ان کے ناول "کارواں" کے ابواب اس امر کی ضمانت لئے ہوئے ہیں کہ اگر اسی دیانتِ فن کے ساتھ اس کے اوراق تمام ہوئے تو یہ "صدرت الخیال" کے بعد صفحات ادب میں نقشِ ثانی کے رتبے کو پہنچے گا اور یہ کتاب اس حصۂ ملک کی ایک قابل قدر اور نمایندہ تصنیف ہوگی۔ اس باب میں اور بھی دو ایک ادیب اختر اورینوی کے رفیق راہ ہیں شکیلہ اختر مانپوری اور سہیل عظیم آبادی کے قلم کی گردش نے جن نقوش کو وجود بخشا ہے وہ بھی خیالی اور تصوراتی نہیں بلکہ وہاں بھی ہمارا ہی ذکر و افکار ہے۔ ان کے پیش کردہ ادب کا اول و آخر اور ہماری داستان کا طول اور عرض دونوں ایک دوسرے میں سمائے ہوئے ہیں۔ شکیلہ اختر نے اپنی زندگی کے ابتدائی حالات میں لکھا ہے "ایک قصبے کا مکتب جس کے بچھے ہوئے ٹاٹ پر لڑکیاں بیٹھ جاتیں ان کا بستہ سامنے ہوتا کوئی کتاب کھلی ہوتی اور لڑکیاں اپنے اپنے بستے کے اندر سے مزے مزے کی چیزیں نکال نکال کر مسلسل کھاتی رہتیں۔ کسی کے بستے میں چوڑے اور گڑ رہتے کوئی بونٹ اور مکئی کا بھونا لاتا۔ اور کوئی چاول کی روٹی۔ تو اسی طرح دوسروں کے چوڑے اور گڑ کھا کھا کر میں پرچے پڑھنے لگی"۔ ان سطروں کے ماحول سے جو گہرا تعلق ہے وہ کسی توضیح کا محتاج نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان چند غیر مبہم، واضح اور بے باک جملوں سے سمت متعین ہوجاتی ہے اور ان کی منزل کی طرف سے یک گونہ اطمینان ہوجاتا ہے۔ بہار کے قصبات کا عالم ہو یا عامی یونی ورسٹی کا تعلیم یافتہ ہو یا مدرسہ کا فارغ التحصیل کون ہے جس کی تعلیم کے ابتدائی ماحول کے نقوش ان میں نہیں۔

مانپوری نے بہار میں جو مقبولیت حاصل کی تھی اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ مزاح و طنز تمام تر معیاری یا تشفی بخش تھا۔ ان کے مقبول عام ہونے کا خاص سبب یہ تھا کہ ان کا فن ایک ایسا نخل تھا جس نے مقامی ماحول سے نشو و نما حاصل کی تھی۔ ان کے کسان، زمیندار، وکیل مختار، مؤکل، گواہ، دوست احباب، آقا ملازم، ماما بیگم، داروغہ، ڈپٹی، سیر و سفر، کوچہ و بازار جانی پہچانی ہوئی فضا پیش کرتے ہیں۔ بہار کی زندگی کے صدہا رُخ ہیں جن سے انھوں نے خام مواد کا کام لیا ہے اور ان کے مضامین کے مجموعے بہار کی زندگی کی رنگا رنگ تصویریں ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ زندگی پیش کرنے کے معنے یہ نہیں ہیں کہ شہروں کے بجائے دیہات کو موضوع بحث بنالیں اور امرا و رؤسا اور متوسط طبقے کے افراد اور اشخاص کو نظر انداز کرکے محض کسانوں اور مزدوروں کی زندگی کے مرقعے پیش کئے جائیں۔ پورے نظام اور پورے معاشرے کے تمام جلوے ادیب کی نگاہ میں ہونے چاہئیں۔ کیونکہ زندگی کا ہر گوشہ اس کی تنقید کا محتاج ہے۔ تمام راہوں کی پیچیدگیوں اور دشواریوں سے آگاہی کے بغیر

وہ ایک نئی راہ کی طرف رہنمائی نہیں کر سکتا۔ سہیل عظیم آبادی کے گاؤں اور ان کے باشندوں کی جھلک کا جائزہ لینے اور ان کے فن کی قیمت مقرر کرنے سے پہلے یہ تمام خیالات میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔

گزشتہ فسادات کے دھبّے اس حصۂ ملک کے دامن پر امٹ ہیں۔ اس واقعے نے صدیوں کی ہمسائیگی کے تصوّر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ہم وطنی کے قدیم رشتوں ناتوں کی بنیادوں کو جڑ سے ہلا دیا۔ دل محسوس کرتا تھا مگر ساکت اور بے حس تھا، دماغ سوچتا تھا مگر سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اس قلب ماہیت کو دیکھ کر ہر متنفس اپنی جگہ حیرت و استعجاب کی ایک تصویر تھا ایسے حالات میں ادیب کے احساسات کا کیا پوچھنا۔ چنانچہ سہیل عظیم آبادی نے بعض افسانے مخصوص طور پر اس خاص موضوع پر لکھے ہیں۔ ان میں مظلوموں کی فریاد و بکا اور دکھیوں کی بنیائیں ہیں ... دردناک آوازیں ہمارے ایوان ادب میں مدتوں گونجیں گی۔ اس سلسلے میں انھوں نے گاؤں اور ان کے باشندوں اور کھیت کھلیان کی جو تصویر پیش کی ہیں وہ مقامی رنگ سے رنگین ہیں۔ اور جن کو ان دیہاتوں سے واسطہ ہے وہ ان کوچوں کے ہر ذرّہ سے خود کو آگاہ پاتا ہے۔ مخدوم کی ذی شرف سرزمین پہلے کیا تھی اس کی بابت وہ لکھتے ہیں۔ ”(دل کا بوجھ“ کا ایک کردار) اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس طرح لوگ کیسے بدل گئے۔ اُسے یاد تھا جب کھیتوں سے غلہ کھلیان میں آتا تھا تو غلے سے بہت سی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں نکالی جاتی تھیں۔ مخدوم صاحب کی فاتحہ کی، سائیں کی، برہمن کی، یہ سب ڈھیریاں سب کے غلے سے نکالی جاتی تھیں خواہ ہندو کا ہو یا مسلمان کا۔ اور پھر یہ کہ ہر کام میں ایک دوسرے کے مددگار ہوتے تھے۔

دوسری جگہ ”اندھیارے میں ایک کرن“ میں لکھتے ہیں۔ ”بوڑھی بقاتن بکری کو پانکڑ کا پتہ اور گائے کو گھاس دینے کے بعد چرخہ لے کر سائبان میں بیٹھ گئی بوڑھا طوفانی کپڑا بننے کیلئے کرگھہ پر بیٹھ گیا تھا۔ گھر کے اندر دو طرح کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ ایک تو کرگھہ کی کھٹ کھٹ اور دوسرے چرخے کی چرخ چوں ——“

بظاہر یہ دو تین سطریں ہیں مگر بہار کی دیہات اور اس کے متعلقات کے حق میں مفصل و مشرح بیان ہیں جس کی معصوم اور دلربایانہ فضا بہار کے لاکھوں دیہاتوں اور دیہاتیوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ مقامی ماحول کی ایسی بے داغ عکاسی کے لئے ہم مصنف کو مستحق داد و تحسین سمجھتے ہیں۔ پہاڑوں کے دامن میں، ندیوں کے کنارے، جنگلوں اور جھاڑیوں کی آغوش میں ایسے صدہا گاؤں ہیں جن کو سہیل عظیم آبادی نے زندگی بخشی ہے اور سب کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ جن کو دیکھتے ہی ہم پہچان لیتے ہیں اور جو ہم کو پہچاننے میں دوسروں کی مدد کرتے ہیں۔

یہ امر موجب حیرت ہے کہ بہار کے صدہا ادبا و شعرا کے باوجود ان ہی دو چار ادیبوں کے کارناموں پر یہ اہم داستان کمال تشنگی کے ساتھ تمام ہوتی ہے۔ حالانکہ ایک حصۂ ملک کی پوری زندگی کے تمام حقائق کے پیش نظر یہ صورت حال کس قدر غیر تسلی بخش ہے محتاج بیان نہیں میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان معدودے چند ادباء و شعراء کے کارنامے اردو کے ذخیرے سے الگ کر لئے جائیں تو بہار کی زندگی اور اس کے نشیب و فراز اور متعلقات سے اس کا ادب تہی داماں ہوگا۔ اور پھر اس حصۂ ملک کی زندگی کے سمجھنے کے لئے اس کو (اردو کو) ایک ذریعے کے طور پر کسی کے سامنے پیش کرنے کی ہم جرأت نہیں کر سکتے۔

اصل میں ساری دقّت اس وجہ سے ہے کہ اب تک اردو کو برتنے میں ہمہ دم یہ خیال پیش نظر رہا ہے کہ یہ دلّی کی امانت ہے حالانکہ اس تو ہم کو اپنے مخصوص حالات کے لحاظ سے اپنے طور پر بالکل اسی طرح استعمال کرنا ہے جس طرح بنگلہ کو بنگالی یا آسامی کو اہل آسام استعمال کرتے ہیں۔ یہ بات مقامی ادباء و شعرا کو سمجھ لینا چاہئے کہ پنجاب، بہار اور دکن کی زندگی اور ماحول کے خد و خال جب تک اردو کے صفحاتِ ادب پر طور سے طور پر اُجاگر نہیں ہوں گے اس وقت تک اس کا ادب یو۔پی بھی نہیں محض دلّی و لکھنؤ کی داستانِ مسلسل کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔

پنج سالہ پلان

(مسلسل)

غیر ملکی سرمایہ

غیر ملکی سرمایہ کے متعلق حکومت کی پالیسی آج بھی یہ ہے کہ کسی طرح کا امتیاز نہیں کیا جاتا۔ منافع اور سرمایہ کی واپسی کے لئے سکۂ تبادلہ کی مناسب آسانیاں دی جاتی ہیں اور یہ وعدہ کیا جاتا ہے کہ اگر کسی صنعت کو قومی بنا لیا جائے گا تو اسی صورت میں جائز اور منصفانہ معاوضہ دیا جائے گا۔ مناسب یہ ہے کہ غیر ملکی سرمایہ صرف ان کاموں پر لگنے کی اجازت دی جائے جو پیداوار کے نئے ڈھنگ سے متعلق ہوں۔ یا جن کے لئے خاص قسم کا تجربہ یا ہنر مندی درکار ہو یا جن صنعتوں کی ملکی پیداوار مانگ کے مقابلے میں بہت کم ہو، اور اس کے مطلوبہ درجے تک بڑھنے کی توقع نہ ہو۔ مشترکہ غیر ملکی اور بھارتی کاروباری قوموں کے معاہدے حکومت کی منظوری کے تحت ہو سکیں گے۔

دیہاتی صنعتیں

دیہاتی صنعتوں کی ترقی کے پروگرام میں اس امر کو مدِ نظر رکھا گیا ہے کہ وہ زیادہ تر مقامی تحریک اور تعاون سے ترقی کریں۔ ان کے لئے ایسا اقتصادی ماحول پیدا کیا جائے جس سے اُن کی کامیابی کی جائز توقع ہو سکے جن وجوہ کے باعث ماضی میں ان صنعتوں کو زوال پہنچا اُن کی جانچ پڑتال کر کے اُن کو حتی الامکان دُور کرنے کا انتظام کیا جائے۔ دیہاتی صنعتیں اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی ہیں جب تک وہ دیہاتی سماج کا ایک متحدہ اور منظوم کاروبار نہ بن جائیں۔ اس مقصد کے لئے دیہاتی تنظیم کو ایسے طریقے پر تبدیل کرنا ہوگا جو موجودہ حالات میں دیہات کے مزدور کو روزگار مہیا کرنے کے قابل ہو سکے۔ اس کے علاوہ صنعتی کواپریٹو انجمنیں قائم کرنے اور ایسے اداروں کو جو دیہاتی صنعتوں کے میدان میں کافی تجربہ رکھتے ہوں۔ امداد بہم پہنچانے سے اس مقصد کو تقویت حاصل ہوگی۔ دیہاتی صنعتوں کی ترقی کے لئے ایک مرکزی ادارہ ہونا چاہیئے جو سرکاری محکموں کے نظم و نسق سے بالکل الگ ہو۔ اس میں کھادی اور دیگر دیہاتی صنعتوں کے تجربہ کار کارکنوں کے علاوہ مرکزی حکومت کے چند ایک نمایندے بھی شامل ہوں۔ مرکزی حکومت بہت جلد کھادی اور دیہاتی صنعتوں کے لئے ایک بورڈ قائم کر رہی ہے۔ ریاستوں میں بھی اس قسم کے ادارے بنائے جائیں گے جو مرکزی ادارے کے ساتھ مل کر کام کریں گے۔

ریاستوں کی پالیسی

اس بارے میں ریاستوں کی پالیسی کا بنیادی مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ہر ایک گھریلو دستکاری کے لئے ایسا میدان مہیا کیا جائے جس میں وہ اپنی تنظیم خود ہی کر سکے۔ گھریلو دستکاریوں کو بڑی صنعتوں کے مقابلے کی زد سے بچانے کے لئے ایک مشترکہ پیداواری پروگرام وضع کیا جائے گا۔ جس کے تحت ہر ایک کا پیداواری دائرہ مقرر کر دیا جائے گا۔ بڑی صنعتوں کی توسیع کو روک دیا جائے گا۔ اور ان پہ محصول عائد کر دے گا۔ خام مال کی سپلائی کا انتظام کیا جائے گا۔ نیز کھوج اور تربیت کے کام کو مربوط کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ دستی کھڈی کے مخصوص دائرے کو توسیع دینے۔ غذائی روغنیات کی پیداوار دیہاتی صنعتوں کے لئے اور غیر غذائی تیلوں کی پیداوار تیل نکالنے والے کارخانوں کے لئے مخصوص کر دینے۔ نیز کھاد، دستی کھڈیوں اور دیہاتی کولھوں کی ترقی کے لئے ملوں کے بنے ہوئے کپڑے اور تیل پر محصول عائد کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔ کھوج کے کام کے لئے ایک مرکزی انسٹی ٹیوٹ قائم کی جائے گی جو دیہاتی صنعتوں کے مسائل کے بارے میں تحقیقات کرے گی۔ گھریلو دستکاریوں اور دیگر چھوٹی صنعتوں کی ترقی کے لئے پندرہ کروڑ روپے کی رقم مہیا کی گئی ہے جس سے مندرجہ ذیل دس دیہاتی صنعتوں کی ترقی کے پروگرام کو امداد بہم پہنچائی جائے گی۔

(۱) تیل نکالنے کی دیہاتی صنعت (۲) نیم کے تیل سے صابن بنانے (۳) دھان کوٹ کر چاول نکالنا (۴) کھجور سے گڑ بنانا (۵) گڑ اور کھنڈسری (۶) چمڑا (۷) اونی کمبل

(۸) اعلیٰ درجے کا دستی تیار کیا ہوا کاغذ (۹) شہد کی مکھیاں پالنا (۱۰) دیا سلائی بنانا۔

تجارتی پالیسی

تجارتی پالیسی میں ایسے طریقے سے ردّ و بدل کرنا ضروری ہے کہ اس سے پلان کے مقاصد کی تکمیل میں مدد مل سکے۔ کمیٹی کی رائے میں یہ پالیسی مندرجہ ذیل مقاصد پر مبنی ہونی چاہیئے۔

ا۔ اس سے پلان کے مطلوبہ پیداواری کیفیت کی تکمیل میں مدد ملے۔

ب۔ تجارت برآمد میں اضافے پر زور۔

ج۔ ادائیگی کے توازن کا خسارہ غیر ملکی مبادلہ کے ذرائع کے اندر اندر رہنا چاہیئے۔

د۔ جہاں تک ممکن ہو تجارت درآمد برآمد مالی و قیمتوں کی اس پالیسی کے مطابق ہونی چاہیئے۔ جس پر پلان کی تکمیل کے لئے عمل کرنا ضروری ہو۔

ہ۔ جہاں تک ممکن ہو پالیسی میں تسلسل قائم رہنا چاہیئے تاکہ درآمد و برآمد کے سلسلے میں دوسرے ملکوں کے ساتھ تجارتی تعلقات اور ملکی صنعت و تجارت کی تجاویز میں بار بار ردّ و بدل کی ضرورت پیش نہ آئے۔

تجارت پر اثر

جہاں تک غیر ملکی تجارت کا تعلق ہے تقسیم اور زمانہ بعد از جنگ کے حالات نے پہلے ہی برآمد میں کمی، درآمد اناج و خام مال پر زیادہ انحصار، مشینری کی تجدید میں سست رفتاری اور ڈالر دیشوں کے ساتھ غیر متوازن تجارت کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ پلان میں کسی حد تک ان مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جوٹ اور کپاس وغیرہ کی پیداوار میں اضافے سے درآمد پر انحصار کم ہو جائے گا اور جوٹ سے تیار کردہ اشیاء اور سوتی کپڑے کی برآمد میں اضافہ ہوگا۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۵۶-۱۹۵۵ء تک ۴۹-۱۹۴۸ء کے مقابلے میں بھارت کی تجارت برآمد میں تقریباً تیس فیصدی اور درآمد میں تیس فیصدی کا اضافہ ہوگا۔ درآمد میں مقابلۃً کم اضافے کی وجہ اشیاء تعیش کی درآمد پر سخت کنٹرول ہے۔ سوتی کپڑے، جوٹ سے تیار کردہ اشیاء، تیلوں، کوئلہ، کالی مرچ، تمباکو اور اونی کپڑے وغیرہ کی برآمد میں زیادہ تر اضافہ ہونے کی امید ہے۔ نہ صرف ڈالر دیشوں کو ہی بلکہ ان ملکوں کو بھی زیادہ اشیاء برآمد کرنے کی ضرورت ہے جو بھارت کو پلان کی تکمیل کے سلسلے میں ضروری سامان مہیا کر سکتے ہیں۔ کپڑا بیننے کی مشینوں، بجلی کے پنکھوں، بائیسکلوں، صابن، سیمنٹ اور چھوٹے مشینی اوزاروں کی تجارت برآمد میں ترقی کے امکانات بھی موجود ہیں۔

اس مقصد کے لئے کسی ملک کے ساتھ باہمی یا مختلف ملکوں کے ساتھ علاقائی معاہدوں کے علاوہ تجارت درآمد و برآمد پر ایسے طریقے سے کنٹرول رکھنا ضروری ہوگا کہ اس سے ملکی صنعتوں یا مستقبل میں تجارت برآمد کو نقصان پہنچنے کا احتمال نہ ہو۔

مزدوروں کے متعلق مسائل

مزدوروں کے مسائل کے دو پہلو ہیں پہلا یہ کہ محنت کشوں کی بہبود کے لئے خوراک، کپڑے، علاج معالجہ، سماجی تحفظ اور تعلیم و تفریح کی آسانیاں فراہم کی جائیں اور دوسرے یہ کہ ملک کی معاشیات کی ترقی اور اس کے استحکام کو بھی مدِ نظر رکھا جائے۔ اس کے علاوہ مزدور کو اپنے حقوق کی حفاظت اور مفاد کو ترقی دینے کی بھی آزادی حاصل ہو۔ چنانچہ اس سلسلے میں آئین کے اندر بھی قوانین وضع کر دئے گئے ہیں۔ اگرچہ مزدوروں کے مفاد کے اکثر قوانین بہت دیرینہ نہیں لیکن ان سے متعلق قوانین وضع کرنے میں تیز رفتاری آزادی کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں کول مائینز پراویڈنٹ فنڈ بونس اسکیم ایکٹ مینیمم ویجز ایکٹ ایمپلائز اسٹیٹ انشورنس ایکٹ مجریہ ۱۹۴۸ء وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

مزدوروں کے متعلق سفارشات حسبِ ذیل امور پر مبنی ہیں۔

صنعتی تعلقات

نجی شعبہ صنعتی شعبے کے لئے پلان کے مطمحات کا انحصار اور سرمایہ کے درمیان رفاقت پر ہے۔ تعلقات کو اس قدر بڑھایا جائے کہ مزدور کو کام سے دلچسپی پیدا ہو جائے۔ مزدور کے حقوق کو تسلیم کیا جائے اور جب کوئی قضیہ پیدا ہو جائے تو اسے مصالحت کے ذریعے سے طے کیا جائے۔ قضیوں سے بچنے کے لئے آجرین اور مزدوروں کے درمیان شرائط طے پانی چاہئیں اور ضابطہ مرتب ہونا چاہیئے۔ اتفاقاً کا موقع پر ہی تصفیہ کرنے کے لئے کمیٹیاں بھی قائم کی جائیں اور جب کسی قضیہ کا فیصلہ نہ ہو سکے تو حکومت کو فیصلے کے لئے قدم اٹھانا چاہیئے۔ بڑے بڑے قضیوں میں سمجھوتے کے عارضی بورڈ قائم کرنا بھی لازمی امر ہے۔

ٹریڈ یونینوں اور آجرین کے اداروں کے فرائض

پلان کی کامیابی کے لئے ٹریڈ یونینوں اور آجرین کا تعاون اشد ضروری ہے۔ اس سلسلے میں پلان کے لئے آجرین اور یونینوں میں پلان کے لئے جوش اور ولولہ پیدا کیا جائے۔ صنعتی امن قائم رکھنے کے لئے یونینیں بہت کچھ مدد دے

سکتی ہیں۔

افراطِ زر کی روک تھام کے لئے منافع اور اُجرت پر قدرے کنٹرول کی ضرورت ہوگی۔ تاہم اُجرت کی پالیسی کے لئے یہ امر لازمی ہے کہ قومی آمدنی میں مزدور کا بھی مناسب حصہ رہے اور اُجرت کے معیاروں کو بڑھایا اور عمدہ بنایا جائے متعدد کاموں کی اُجرت میں جو فرق پایا جاتا ہو اُسے حتی الامکان دُور کیا جائے بلکہ مختلف دستکاریوں اور پیشوں کی اُجرتیں سائنسی اصولوں پر متعین کی جائیں۔ بونس اور منافع میں شرکت کے مسئلے کی غیر ملکی ماہرین کی مدد سے چھان بین کی جائے۔ بہرکیف مرکز اور ریاستوں میں اُجرت کے مستقل بورڈ قائم کرنے کی تجویز زیرِ غور ہے۔

اکثر ریاستی حکومتوں نے ورک مینز کمپنسیشن ایکٹ اور اس قسم کے جو دوسرے قوانین بنائے ہیں اس سے مزدوروں کے نقصان کی بہت کچھ تلافی ہو جاتی ہے۔ ان قوانین کے علاوہ ۱۹۵۲ء کا پراویڈنٹ فنڈ ایکٹ مزدور کے مستقبل کے لئے بہت مفید ہے۔

فیکٹریوں میں کام کرنے کی شرائط میں ابھی بہت سی اصلاح اور سدھار کی ضرورت ہے تاہم فیکٹری ایکٹ ۱۹۴۸ء اور پلانٹیشن لیبر ایکٹ سے بھی مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

ملازمت اور تربیت

جن شکتی کا مناسب طریقے سے استعمال قومی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ پیداوار کے لئے ہنر مند مزدوروں کا کافی مقدار میں ملنا ضروری ہے۔ اگرچہ روزگار فراہم کرنے اور تربیت کے ادارے قائم ہو چکے ہیں مگر ابھی بہت کرنا باقی ہے۔ چنانچہ بھرتی کے انتظامات میں اصلاح روزگار کی تبادلہ گاہوں کے متعلق تحقیق اور جن شکتی کا جائزہ لینے کے کام کا آغاز وغیرہ کرنا چاہیئے۔

پیداوار کی لاگت میں تخفیف کے لئے ضروری ہے کہ جن صنعتوں میں مزدوروں کی تعداد فالتو ہے اسے معقول حد تک کم کیا جائے بلکہ مزدوروں کے احتیاج اور کام کی مقدار کے لئے سائنسی طریقہ معیار مقرر کئے جائیں۔ فالتو مزدوروں کے لئے دوسرے شعبوں میں کام مہیا کیا جائے۔ الغرض مذکورہ اقدامات سے مزدور اور آجر دونوں فائدہ اُٹھا سکیں گے۔

نقل و حمل اور مواصلات

ریلیں

نقل و حمل اور مواصلات کے پروگرام میں کل مصارف کے چار بٹا پانچ حصے سے قدرے زیادہ رقم ریلوں کے لئے ہے۔

بھارت کی ریلوں کے لئے سب سے زیادہ مشکل مسئلہ بحالیات کا کام اور مناسب ساز و سامان کی بہم رسانی ہے۔ ۱۹۳۰ء کے بعد جو اقتصادی بحران رونما ہوا اُس کے اثرات سے ۱۹۳۷ء میں ہندوستانی ریلیں بچ کر نکلنے پائی تھیں اور وہ ابھی اپنے ضروری اخراجات اور ترقی کی باقیات بھی پوری نہ کرنے پائی تھیں کہ دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوئی جس کی وجہ سے اس کام میں رکاوٹ پڑ گئی۔ جنگ کے دوران میں جدید اور پُرانے ساز و سامان کو تبدیل کرنے کے اخراجات کی باقیات غیر معمولی طور پر بڑھ گئیں۔ اور بحالیات کے کام کے لئے اندرونی سہولتیں بہت بڑی حد تک گھٹا دی گئیں۔ جنگ کے بعد ملک کے بٹوارے کے ساتھ ہی بہت سے نئے مسائل پیدا ہو گئے۔ کمیشن کا اندازہ ہے کہ وہ تمام اسٹاک جو ۳۱ مارچ ۱۹۵۶ء تک از سرِ نو تبدیل کئے جانے کی عام حد تک پہنچ جائے گا اس میں ۲۰۹۲ انجن ۵۸۳۲۶ ڈبے اور ۴۷۵۳۲ ٹینکڑے ہوں گے۔ اس کے علاوہ ریلوے لائنوں کی حالت بھی پچھلے برسوں میں کافی خراب ہو چکی ہے اور اس کو بھی بحال کرنے کی ضرورت ہے۔

بھارت میں انجن سازی

ضروری اشیاء کے لئے غیر ممالک کا مرہونِ منت ہونے کی صورتِ حال کو ختم کر دینے کی غرض سے مرکزی حکومت نے چترنجن میں انجن سازی کا ایک کارخانہ کھولا ہے جس پر پندرہ کروڑ روپے خرچ ہو جانے کا اندازہ لگایا گیا ہے اگرچہ اس ورکشاپ کے پُورے طور پر چالو ہو جانے پر اس میں ایک سو بیس انجن اور پچاس فالتو بائیلر سالانہ طیار کرنے کا تہیہ کیا گیا ہے۔ پھر بھی کمیشن یہ توقع رکھتا ہے کہ منصوبے کی مدت کے دوران میں اس کارخانے سے صرف تین سو انجن طیار ہوں گے۔ حکومت نے ٹاٹا لوکوموٹو کمپنی کے سرمایہ میں دو کروڑ روپے کا حصہ شامل کر کے اس کو مالی امداد دی ہے۔ توقع ہے کہ منصوبے کی مدت کے دوران یہ کمپنی دو سو انجن حکومت کو مہیا کرے گی۔

اسی کروڑ روپے سالانہ خرچ

روزمرہ ضرورتوں اور بحالیات کے اخراجات کی بڑھتی ہوئی باقیات کو پورا کرنے اور ریلوں میں ایک مفید عام بہتری کے طور پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ان میں سے کم از کم کو پورا کرنے کے لئے جو ترقی کا نوسی پروگرام ہونا چاہیئے اس کے لئے روپیہ بہم پہنچانے کی غرض سے کمیشن یہ ضروری خیال کرتا ہے کہ پانچ برس کی مدت کے لئے ریلوے منصوبے میں تیس کروڑ روپے سالانہ یا کل چار سو کروڑ روپے کے اخراجات کے

لئے روپیہ بہم پہنچایا جائے۔ اس رقم سے ریلیں موجودہ معیار کے لگ بھگ مسافروں اور مال کی آمد و رفت کے کام کو احسن طور پر سرانجام دینے کے لئے قابل ہو سکیں گی۔ اس کے ساتھ ہی کمیشن نے مزید پچاس کروڑ روپے کی رقم بنیادی اہمیت رکھنے والی صنعتوں اور نقل و حمل کے لئے مخصوص کی ہے۔ اس سے ریلوں کی ترقی کے پروگرام کو بہت مدد ملے گی۔ کیونکہ اس رقم کا بہت بڑا حصّہ ریلوں پر خرچ ہوگا۔ چار سو کروڑ روپے کے کل مصارف کے لئے مرکزی مالیات میں سے اسی کروڑ روپے دئے جائیں گے۔ باقی تین سو بیس کروڑ روپے ریلیں خود اپنے ذرائع سے حاصل کریں گی۔

جہازرانی

جہازرانی کی ترقی کے پروگرام سے ۵۶-۱۹۵۵ء تک ساحلی اور سمندر پار ملکوں سے تجارت میں کل درج شدہ وزن میں تقریباً چھ لاکھ ٹن کا اضافہ ہوگا۔ کمیشن نے سفارش کی ہے کہ جہازراں کمپنیوں کو جہازوں کی خرید کے لئے مرکز کی طرف سے پندرہ کروڑ روپے کی رقم بطور قرضہ دیا جائے۔ کمیشن کو اُمید ہے کہ مزید جہاز حاصل کرنے کے لئے خاص کر خوراک کی باربرداری کی اہمیت کے پیشِ نظر بین الاقوامی بنک برائے تعمیر نو و ترقی بھی کچھ امداد مہیا کرے گا۔

بندرگاہوں کی ترقی

اس وقت ملک کی پانچ بڑی بندرگاہیں یعنی کلکتہ، بمبئی، مدراس، کوچین اور وساکھاپٹنم، مٹی کے تیل، دیسی مصنوعات اور کوئلے کے علاوہ کل تقریباً دو کروڑ ٹن سامان سالانہ سنبھالنے کی اہلیت رکھتی ہیں۔ یہ اہلیت ہر ایک قسم کے سامان کی آمد و رفت کے لئے کافی نہیں ہے۔ مزید براں مندرجہ ذیل وجوہ کے لئے بندرگاہوں کی ترقی ضروری ہے۔

(۱) ملک کے بٹوارے کے اثرات کو زائل کرنے اور مال و اسباب کی جو آمد و رفت بیشتر ازیں کراچی کی بندرگاہ سے ہوتی تھی، اس کے عوض ایک قدرتی ذریعہ مہیا کرنے کی ضرورت

(۲) بندرگاہوں کے ساز و سامان کا بیشتر حصّہ اب پُرانا اور فرسودہ ہو چکا ہے

(۳) مرکزی حکومت نے پیٹرولیم صاف کرنے والے ان کارخانوں کو جو بمبئی میں قائم کئے جائیں گے بندرگاہ کی آسانیاں مہیا کرنے کا ذمّہ لیا ہے۔

منصوبہ بندی کمیشن نے اپنی سفارشات مرتّب کرنے میں مذکورہ بالا ضروریات کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ جو کاروبار پہلے کراچی کی بندرگاہ سنبھالتی تھی۔ اس کو سنبھالنے کے لئے کاندلہ کی بندرگاہ طیّار ہوگی۔ جس پر منصوبے کی مدّت کے دوران میں بارہ کروڑ پانچ لاکھ روپیہ خرچ کرنے کا اندازہ ہے۔ پیٹرولیم صاف کرنے کے کارخانوں کو بندرگاہ کی آسانیاں مہیا کرنے اور جزیرہ بوچر پر واقع موجودہ کارخانوں کو متبادل آسانیاں بہم پہنچانے کی غرض سے آٹھ کروڑ روپے صرف کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔ بمبئی، کلکتہ، مدراس وساکھاپٹنم اور کوچین کی موجودہ بڑی بندرگاہوں کو ترقی دینے اور ان کو جدید معیار پر لانے کے لئے کمیشن نے سفارش کی ہے کہ حکومت منصوبے کی مدّت کے دوران بارہ کروڑ روپے تک کی رقم قرضہ دے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس مدّت کے دوران بندرگاہوں کے حکام مزید ساڑھے پندرہ کروڑ روپے کی رقم اپنے ذرائع سے فراہم کریں گے۔

سڑکیں

قومی شاہراہوں کی ترقی کے لئے پنج سالہ پلان میں موجودہ زیرِ تعمیر کام کی تکمیل کے علاوہ ساڑھے چار سو میل لمبی نئی سڑکیں اور بہت بڑی تعداد میں چھوٹے پُلوں کے علاوہ ۳۱ بہت ہی بڑے پُل تعمیر کرنے کے لئے روپیہ مہیا کیا گیا ہے۔ علاوہ بریں دو ہزار دو سو میل لمبی سڑکوں کو بہتر بنایا جائے گا۔ توقع کی جاتی ہے کہ اس سارے کام میں دو تہائی کام ۵۶-۱۹۵۵ء تک مکمل ہو جائے گا اور باقی زیرِ تعمیر ہوگا۔

مرکزی حکومت کے قومی شاہراہوں کی ترقّی کے پروگرام میں پانچ برسوں میں ستائیس کروڑ روپے کی رقم صرف کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ مرکزی حلقے میں (قومی شاہراہوں کے علاوہ) دیگر خاص سڑکوں کی ترقی کے لئے چار کروڑ روپے کی ایک اور رقم رکھی گئی ہے۔ ان سڑکوں کے سلسلے میں مرکزی حکومت پہلے ہی لاگت برداشت کرنا منظور کر چکی ہے۔ علاوہ ازیں اکیس لاکھ پندرہ ہزار روپے کی رقم سنٹرل روڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پر صرف کی جائے گی

ریاستوں کے منصوبے میں سڑکوں کی ترقی کے لئے کل ۳۷ کروڑ ۵۴ لاکھ روپے کی رقم رکھی گئی ہے جس میں سے درجہ الف کی ریاستوں کے حصے میں ساٹھ کروڑ ۵۹ لاکھ روپیہ، درجہ ب کی ریاستوں کے حصّے میں ۱۶ کروڑ ۸۶ لاکھ روپیہ اور باقی درجہ ج کی ریاستوں کے حصّے میں آئے گا۔

شہری ہوابازی

شہری ہوابازی ترقی کا ایک اور نیا شعبہ ہے۔ یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ آمد و رفت کی بھیڑ بھاڑ اور طریق عمل کی موجودہ حالت میں موجودہ فضائی ٹرانسپورٹ کمپنیاں خوش اسلوبی سے کام نہیں کر سکتی ہیں۔ لہٰذا ان کمپنیوں کو لازمی طور پر مدغم ہو کر ایک ہو جانا چاہیئے۔ منصوبے میں موجودہ فضائی کمپنیوں کو معاوضہ ادا کرنے اور نئے ہوائی جہاز خریدنے کے لئے ساڑھے نو کروڑ روپے کی رقم مہیا کی گئی ہے۔

ڈاک تار اور ٹیلیفون

کمیشن نے ڈاک تار اور ٹیلیفون کی ترقی کے لئے پچاس کروڑ روپے کے پروگرام کی

سفارش کی ہے۔ اس پروگرام میں زیادہ زور اس پر دیا گیا ہے کہ دو ہزار یا اُس سے زائد آبادی والے ہر گاؤں میں ڈاک خانہ ہو، اور بڑے شہروں میں ٹیلیفون کی سہولتوں کو توسیع دی جائے۔

مجلسی بہبود

پلان میں سماج کے اہم مجلسی مسائل کے بارے میں پروگرام بنایا گیا ہے جس میں عورتوں، بچوں اور جوانوں کے علاوہ جسمانی، ذہنی اور مجلسی طور پر پس ماندہ لوگوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

عصمت فروشی کا انسداد

عورتوں اور بچوں کی خرید و فروخت اور عصمت فروشی کے انسداد کے لئے کمیشن نے منصوبہ بندی میں یہ سفارش کی ہے کہ مرکزی حکومت جامع قانون بنائے نیز اُس کے نفاذ کے لئے ایسا موثر نظم و نسق قائم کرے جو بہبود عامہ کے رضا کارانہ اداروں کے ساتھ مل کر اس کام کو سرانجام دینے کے قابل ہو۔ بچوں کی ہر پہلو سے ترقی کی اہمیت واضح کرتے ہوئے کمیشن نے متعدد سفارشیں کی ہیں۔

نوجوانوں کی بہبود

کمیشن نے تجویز کیا ہے کہ نوجوانوں کی ملحقہ انجمنوں کی ایک قومی کونسل کے ذریعے سے ملک بھر میں طاقت ور اور منضبط تحریک چلائی جائے۔ سکاؤٹ تحریک کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ نوجوانوں کی ہمہ گیر ترقی اور اُن کی خدمات کو قومی تعمیر کی سرگرمیوں کے لئے منظم بند کرنے کے کام کو بڑھاوا دیا جائے۔ ماہرین کی ایک کمیٹی بنائی جائے گی جو مختلف عمر کے گروہوں اور مختلف آب و ہوا والے علاقوں کے لئے جسمانی تندرستی کا ایک قومی معیار قائم کریگی۔

جرائم کی روک تھام اور مجرموں کو سزا دینے کے لئے موجودہ طریق عمل میں جدید سائنسی اور اصلاحی طریقوں کے مطابق تبدیلی کی جائے گی۔ موجودہ تعزیرات میں ضروری رد و بدل کیا جائے گا کمیشن یہ مناسب خیال کرتا ہے کہ مجرموں کیلئے آزمائش اور سزا بھگتنے کے بعد اُن کی دیکھ بھال کرنے کا ایک قومی ادارہ قائم کیا جائے۔ کیونکہ اس پر خرچ بھی کم ہوگا اور اس سے مجرموں کو پھر سے امن پسند زندگی بسر کرنے کے قابل بنایا جا سکے گا۔

مجلسی بہبود کی رضا کارانہ انجمنیں

اگرچہ یہ توقع کی گئی ہے کہ حکومت اپنے محدود ذرائع کے دائرے میں مجلسی بہبود کے کاموں میں اپنی سے زیادہ براہ راست حصہ لیگی۔ لیکن رضا کارانہ انجمنوں کو اس بارے میں زیادہ بوجھ برداشت کرنا ہوگا۔ اس لئے ان اداروں کو تقویت دینے، بہتر بنانے اور توسیع دینے کے لئے چار کروڑ روپے کی رقم پلان میں مہیا کی گئی ہے۔ اس رقم کے خرچ اور استعمال کیلئے مجلسی بہبود کا ایک بورڈ قائم کرنے کی تجویز کی گئی ہے۔ موجودہ قوانین کا مطالعہ کر کے مجلسی بہبود کیلئے ضروری مجلسی قوانین وضع کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا ہے۔

پس ماندہ جماعتیں

بھارت کے آئین کی منشا اور غرض کے عین مطابق پسماندہ قبائل، ذات جاتیوں اور دیگر پسماندہ جماعتوں کی بہبود و ترقی کے لئے ایک جامع پروگرام تجویز کیا گیا ہے۔ کمیشن نے آئین کی دفعہ ۲۷۵ کے ماتحت مخصوص علاقوں اور مخصوص قبائل کی ترقی کے لئے ایک خاص رقم کا عطیہ دینا تجویز کیا ہے اس غرض کے لئے ریاستوں اور مرکز کے کل اخراجات کو ملا کر پس ماندہ لوگوں کی ہمہ گیر ترقی کے لئے ۳۷ کروڑ روپیہ خرچ ہوگا۔ پس ماندہ جماعتوں کے لئے ایک کمیشن مقرر کرنے کی سفارش کی گئی ہے جو تمام پس ماندہ جماعتوں (خواہ شامل فہرست ہیں یا نہیں) کے بارے میں خاص سفارشات کریگا۔ اس کمیشن کی تحقیقات کے نتائج سے پسماندہ جماعتوں کی بہبود کے موجودہ منصوبے کو مزید ترقی حاصل ہوگی۔

راجستھان کی تاریخی دستاویزیں

بھارت سرکار نے حکومت راجستھان کے مشورے سے ایک کمیٹی قائم کی ہے جو راجستھان کی اکثر ریاستوں کے پُرانے کاغذات اور تاریخی دستاویزوں کے متعلق تحقیقات کا کام سرانجام دے گی۔ ان پُرانے کاغذات میں کثیر تعداد ایسی تاریخی اہمیت رکھنے والی قلمی دستاویزوں کی بھی ہے جن کا تعلق خاندان مغلیہ کے دورِ حکومت سے ہے۔ کمیٹی کے چیئرمین راجستھان کے چیف منسٹر شری جے نرائن ویاس ہوں گے۔ ارکان میں راجستھان کے وزیر تعلیم شری ناتھو رام مِردھا، دہلی کے پروفیسر ستیا رام کوہلی۔ گورنمنٹ آف انڈیا کے ڈائرکٹر آف آرکائیوز اور سنٹرل ایشین اینڈ انٹیکوٹیز میوزیم (گورنمنٹ آف انڈیا) کے سپرنٹنڈنٹ شامل ہیں۔ راجستھان کے ڈائرکٹر آف آرکائیوز ممبر، سیکرٹری اور کنوینر کی حیثیت سے کام کریں گے۔

رفتارِ زمانہ

پنج سالہ پلان کی کامیابی

پنج سالہ پلان کو کامیابی سے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ملک کے طول و عرض میں نہایت جانفشانی سے کام شروع ہو گیا ہے۔ بڑے بڑے لیڈروں سے لے کر ہر امیر و غریب وطن عزیز کی خوشحالی کے لئے اپنے تمام وسائل کو کام میں لا کر میدانِ عمل میں اتر آیا ہے۔ اس سلسلے میں پردھان منتری شری جواہر لال نہرو نے بھارت پارلیمنٹ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ دیش میں نوے فیصدی اجتماعی ترقی کے مراکز نہایت شاندار اور تسلی بخش طریقے سے اپنے کام کو انجام دے رہے ہیں اور اس کام میں مزید تیزی لانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔

بھارت اور برما میں معاہدہ

بھارت اور برما میں چاولوں کی بھارت میں برآمد کے متعلق ایک سمجھوتہ طے پا گیا ہے جس کے مطابق بوقتِ ضرورت برما بھارت کو پانچ لاکھ ٹن چاول مہیا کرے گا اور اس کے بدلے میں بھارت سے فولاد، سوتی کپڑا اور چمڑے کا سامان حاصل کرے گا۔ واضح رہے کہ اس سلسلے میں بھارت کے وزیر خوراک شری رفیع احمد قدوائی خاص طور پر اس مقصد کے لئے رنگون گئے تھے اور انہوں نے حکومت برما کے نمائندوں کے ساتھ اس سلسلے میں بات چیت کی تھی۔

جموں و کشمیر

جموں میں ایک ٹیوب ویل کا افتتاح کرتے ہوئے ریاست کے وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ نے کہا کہ جموں اور کشمیر مخالف سمتوں میں جا کر کامیاب نہیں ہو سکتے۔ شیخ صاحب نے کہا میں اس موقعے پر جموں کے عوام کو آگاہ کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم اس وقت نہایت نازک دور سے گزر رہے ہیں اور ابھی بیشتر خطرات ہمارے سامنے ہیں۔ ہم ان خطرات کا کامیاب مقابلہ اسی صورت میں کر سکتے ہیں جب ہم میں باہمی اتحاد اور رواداری کا جذبہ ہو۔" آخر میں شیخ صاحب نے جموں کے لوگوں کو خبردار کیا کہ وہ غلط پراپیگنڈے کا شکار نہ ہوں۔ حکومت سچے دل سے اہالیانِ جموں کی ترقی اور خوشحالی کی خواہاں ہے اور وہ اس کے لئے ہر ممکن کوشش کرے گی۔

کوریا کی جنگ اور بھارت

کوریا کی جنگ کو ختم کرنے کے سلسلے میں بھارت سرکار کی کوششیں چاہے بادی النظر میں کامیاب نہ ہوئی ہوں لیکن اُس کے نتائج نہایت دور رس ثابت ہوئے اور بالآخر کوریا میں بیمار اور زخمی قیدیوں کے تبادلے کے باب میں امریکہ اور روس میں سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ یہ سمجھوتہ ایک طرح سے کوریا کی جنگ ختم ہونے کا پیش خیمہ ہے اور سیاسی حلقوں میں یہ یقین کیا جاتا ہے کہ تھوڑی مدت میں ہی کوریا کی جنگ اختتام پذیر ہو جائے گی اور قیام امن کی ان کوششوں کا بڑا کریڈٹ بھارت کو ہی ملے گا۔

بھارت اور پاکستان

پاکستان کی سیاست میں ایک انقلاب انگیز تبدیلی رونما ہوئی جبکہ گورنر جنرل مسٹر غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کو پاکستان کی وزارتِ عظمیٰ سے سبکدوش کر دیا۔ پاکستان کے اس سیاسی اتار چڑھاؤ کے نتائج چاہے پاکستان کے لئے کچھ بھی ہوں اس کا ایک خوشگوار پہلو یہ ہے کہ بھارت اور پاکستان کے تعلقات میں بہتر صورت پیدا ہونے کے امکان کم نہیں ہوئے۔ وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ سنبھالنے کے بعد پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر محمد علی نے بھارت کے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو کو مندرجہ ذیل پیغام بھیجا ہے۔ "وزیر اعظم پاکستان کا عہدہ سنبھالنے کے موقعے پر میں آپ کو اس بات کا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میری حکومت کی یہ پرخلوص کوشش ہوگی کہ دونوں ملکوں کے درمیان دوستانہ تعلقات میں اضافہ ہو۔" شری جواہر لال نے اس پیغام کے جواب میں ذیل کا تار دیا ہے۔ "میں آپ کے پیغام کا شکر گزار ہوں میری حکومت اور میں اس امر میں یقین رکھتے ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم ہو کر باہمی اشتراک ہونا چاہیے اور اس جذبے کے ماتحت اپنے مسائل کو حل کرنا چاہیے۔ ہم اس اصول پہ عمل پیرا رہیں گے۔ وزیر اعظم پاکستان نے شری جواہر لال نہرو سے جلد از جلد ملنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے

ہوائی فوج کا دن

بھارت کی ہوائی فوج کے کمانڈر انچیف مارشل جی ای گبس نے یومِ ہوائی فوج کے سلسلے میں ایک نشری تقریر کرتے ہوئے بھارت کی ہوائی فوج کی تنظیم و ترقی پر فخر کا اظہار کیا۔ انھوں نے بتایا کہ جدید قسم کے ہوائی جہازوں کی تعداد میں گذشتہ برسوں سے کافی اضافہ ہوا ہے اور افسروں اور ہوابازوں کے تجربے اور تعداد میں بھی نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ مارشل گبس نے مزید کہا کہ اگرچہ ہوائی فوج کا مقصد جنگ میں دیش کی حفاظت کرنا ہے۔ لیکن ہمارے ہوائی بیڑے کی زمانۂ امن کی خدمات بھی کم قابلِ تعریف نہیں۔ قحط اور سیلاب سے پیدا شدہ ہنگامی صورتِ حال میں ہمارے ہوائی جاں بازوں نے دُور دراز مقامات کو رسد اور طبّی امداد پہنچانے کے سلسلے میں جو خدمات انجام دی ہیں اُن کے لئے وہ سارے ملک سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ آخر میں کمانڈر انچیف نے ہوائی جہازوں کی صنعت کی ترقی کے لئے ٹیکنیکل تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا۔

بھارت اور کشمیر

آسٹریلیا کے ایک سرکردہ اخبار نویس مسٹر ڈگلس وکی نے کشمیر اور بھارت کا دَورہ کرنے کے بعد اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ ریاست جموں اور کشمیر میں استصواب رائے کا نتیجہ یقیناً بھارت کے حق میں ہوگا۔ کیونکہ کشمیر کے باشندے اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ بھارتی لوگوں نے کس جرأت اور دلیری کے ساتھ ہر مصیبت میں کشمیر کی مدد کی ہے۔ ریاست کشمیر کی آبادی کا نوّے فیصدی مسلمان ہونے کے باوجود اس امر سے بخوبی آگاہ ہے کہ ریاست کے لوگوں کو ایک خالص مذہبی پالیسی پر کاربند رہنے اور پاکستان کی جاگیردارانہ پالیسی کی نسبت مذہبی رواداری پر عمل پیرا بھارت سرکار کے تعاون اور امداد سے زیادہ فائدہ پہنچ رہا ہے۔

مرکزی بلڈنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

رُڑکی میں سنٹرل بلڈنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح کرتے ہوئے بھارت کے وزیرِ تعلیم مولانا آزاد نے کہا کہ جب تک ملک کے عوام کا معیارِ زندگی بلند نہیں ہوتا اُس وقت تک اُن کی صحت کے لئے کوئی معقول انتظام ہونا مشکل ہے موجودہ وقت میں سب سے اہم اور ضروری کام رہنے والے مکانات کی حالت کو درست کرنا ہے۔ اس لئے بلڈنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو یہ اہم کام اپنے ہاتھ میں لے کر کوشش کرنی چاہیئے کہ دیہات میں رہنے والے کسانوں اور کارخانوں کے مزدوروں کے لئے آرام دہ اور صحت مند مکانات کا معقول انتظام کیا جا سکے۔

نہر سویز اور برطانوی افواج

جنرل نجیب نے قاہرہ میں ایک انٹرویو کے دوران میں اس امر کو ایک بار پھر واضح کیا کہ جب تک کل برطانوی افواج نہر سویز کے رقبے سے نہیں نکال لی جاتیں تب تک مصر کسی مشرق وسطیٰ کی حفاظت کے عہد نامے پر دستخط کرنے کی بات چیت شروع کرنے کو طیار نہیں۔ مصر کے وزیر اعظم نے کہا کہ ہم یہ کام پورے طور پر مکمل ہو جانے کے بعد برابری کے اصول پر مشرق وسطیٰ کے سلسلے میں کسی بھی مسئلے پر گفتگو کرنے کے لئے طیار ہیں۔

کوریا کی جنگ

متحدہ اقوام کی اسمبلی کے سابق سیکرٹری جنرل مسٹر ٹرگوی لی نے نیویارک میں اپنے الوداعی پیغام میں کہا کہ کوریا کی جنگ کا مسئلہ اُس وقت تک حل نہیں ہو سکتا جب تک کہ حکومت چین کو اس سمجھوتے میں شامل نہیں کیا جاتا۔ آپ نے اس امر پر اظہارِ اطمینان کیا کہ سمجھوتے کے لئے بات چیت جاری ہو چکی ہے اور ہمیں امید کرنی چاہیئے کہ اس بار یہ بات چیت ضرور کامیاب رہے گی۔ لیکن میری رائے میں حکومت چین کے نمائندوں کو اس گفتگو میں شامل کئے بغیر سمجھوتے کا امکان زیادہ روشن دکھائی نہیں دیتا۔

برما میں کے، ایم، ٹی کی فوجیں

متحدہ اقوام کی سیاسی کمیٹی نے چینی قوم پرست افواج کے برما میں داخلے کو روکنے کے لئے ایک قرارداد منظور کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ برما میں بیرونی فوجوں کو اپنے ہتھیار ڈال دینا چاہیئے اور برمی علاقے سے فوراً ہی چلے جانا چاہیئے۔ قرارداد کی ایک دوسری دفعہ میں تمام ملکوں سے کہا گیا ہے کہ وہ برما کی سیاسی آزادی اور علاقائی سالمیت کا احترام کریں۔

مومن کانفرنس

اُتر پردیش کے پردھان منتری پنڈت گووند بلبھ پنت نے علی گڑھ میں مومن کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے بھارت کے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ فرقہ پرستی کی راہ پر نہ جائیں اور مہاتما گاندھی کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر میل جول سے زندگی بسر کریں۔ آپ نے پاکستان کی مثال دیتے ہوئے بتایا کہ وہاں جو واقعات پچھلے دنوں رونما ہوئے وہ فرقہ پرستی کی نفرت انگیز پالیسی ہی کا نتیجہ ہیں۔ بھارت نے ہر پہلو سے جو حیرت انگیز اور شاندار ترقی کی ہے وہ اُس کی جمہوریت پسندی اور سیکولرزم کے اصول کی کامیابی کی دلیل ہے۔

Regd. No: E P - 689

پریم کے چشمے

فیض لودھیانوی

ایک بنو اے سُندر بچّو — بے ہُودہ جھگڑوں سے بھاگو
بھائی بھائی بن کر بیٹھو — جو لڑتے ہیں اُن سے کہہ دو
کرشن محمد عیسےٰ نانک
چاروں خاص بزرگ ہیں بے شک

چاروں نے پھیلائی وحدت — چاروں میں تھی غیبی طاقت
چاروں نے کی خلق کی خدمت — چاروں کی واجب ہے عزّت
تم تو ان کا نام ادب سے
دل میں عقیدت رکھو سب سے

اپنے اپنے دھرم کو مانو — ہردم اچھے کام کی ٹھانو
ان کو سچّے رہبر جانو — ان سب کی عظمت پہچانو
سب نے بگڑی قوم سنواری
سب نے ڈوبی ناؤ اُبھاری

چاروں ہیں بھگوان کے پیارے — چاروں ہیں نورانی تارے
چاروں ہیں سرتاج تمہارے — چاروں ہیں محبوب دُلارے
جگ ہے اِن کا چاہنے والا
ان چاروں کا بول ہے بالا

ہندو مسلم سکھ عیسائی — کیوں کرتے ہیں روز لڑائی
آپس میں لڑنا ہے بُرائی — مذہب کا مقصد ہے بھلائی
ان کا حکم جو مانیں سارے
پھر ہو جائیں وارے نیارے

یہ آئے نیکی پھیلانے — دھرتی سے ہر پاپ مٹانے
گیان بھرا پیغام سُنانے — پاپی من کی جوت جگانے
ان کے دم سے ظلمت بھاگی
گمراہوں کی قسمت جاگی

جھوٹ کا بھانڈا پھوڑ گئے سب — ظلم کے بندھن توڑ گئے سب
ٹوٹے رشتے جوڑ گئے سب — پریم کے چشمے چھوڑ گئے سب
آج بھی ان کا فیض ہے جاری
لابھ اُٹھاتے ہیں نر ناری

حامد اللہ افسر

مکانوں کی کہانی

اب سے بہت پہلے انسان مکان بنانا نہیں جانتا تھا اور مرد اور عورتیں اور بچے اس طرح نہیں رہتے تھے جیسے آج کل ہم اور تم رہتے ہیں وہ زمین میں غار کھود لیتے تھے یا چٹانوں کی کھوہوں میں رہتے تھے - جب زور کا جاڑا پڑتا تھا یا جب تیز گرمی پڑتی تھی تو وہ غار میں چلے جاتے تھے یا کھوہوں میں گھس جاتے تھے اور جنگلی جانوروں سے بچنے کے لیئے ایک بڑا سا پتھر ڈھکا کر کھوہ کے منہ پر رکھ دیتے تھے - کھوہ کے اندر وہ آگ جلا لیتے تھے اسی سے روشنی بھی رہتی تھی اور گرمی بھی - ان کھوہوں میں سوراخ بنا لیتے تھے تاکہ دھواں سوراخوں سے باہر نکل جائے اور دم نہ گھٹے -

خوراک کا حال یہ تھا کہ مچھلیاں پکڑ لاتے تھے یا جنگلی پھل اور ترکاریاں توڑ لاتے تھے یا جنگلی جانوروں کا شکار کر کے ان کا گوشت کھاتے تھے -

یہ لوگ پتھر یا لکڑی سے جانوروں کا شکار کرتے تھے - بچوں کو کھوہ میں چھوڑ دیتے تھے اور ماں اور باپ دونوں پیٹ پالنے کا سامان ڈھونڈنے نکل جاتے تھے - کسی کسی دیس میں اب بھی کوئی پرانی کھوہ مل جاتی ہے - اس کے اندر سے ہڈیاں نکلیں، نوکدار پتھر کے ٹکڑے نکلے، لکڑیاں نکلیں - ان سب چیزوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کیا کھاتے تھے اور کس طرح کھانے کی چیزیں اکٹھی کرتے تھے -

کھوہ میں رہتے رہتے جو دقتیں پڑیں اُن کو دور کرنے کے لیئے اس نے تدبیریں سوچیں - اس کا خیال گھنے درختوں کی طرف گیا اور اس نے جھونپڑی بنائی اس میں کھوہ اور غار سے زیادہ آرام ملا -

جھونپڑیاں پہلے پہل ندیوں اور نالوں کے کنارے بنائی گئیں انسان سالہا سال جھونپڑیوں میں رہتا رہا - ایک چھپر سا ادھر کھڑا کر لیا ایک اُدھر، ایک سامنے اور ایک پیچھے چھت کے لیئے درختوں کے پتّوں کے جھاڑ جھنکار اکھٹا کر لیا - چلو گھر بن گیا - کہیں کہیں ایسی جھونپڑیاں آج تک بنائی جاتی ہیں -

ہوتے ہوتے اس جھونپڑی میں انسان اپنے آرام کے لیئے ایجادیں کرنے لگا - چھت کے لیئے چھپر بننے لگے موٹے اور گھنے، مٹی کی دیواریں کھڑی کی گئیں - شروع شروع میں بھونڈی اور بھدّی، پھر صاف ستھری اور سبھی درختوں سے لکڑیاں کاٹ کاٹ کر ان جھونپڑیوں میں لگائی

شروع کیں، جھونپڑی کے الگ الگ حصے بنائے گئے، یہ گویا کمرے تھے ۔

اب ہوتے ہوتے اس نے گھرداری کی دوسری چیزیں بھی بنانا شروع کیں ۔ درختوں کی ٹہنیوں سے ٹوکریاں بنائیں، چٹائیاں بنائیں، مٹی سے اوندھے سیدھے برتن بنائے ۔

ایسے جانوروں کو جو آسانی کے ساتھ پل جاتے ہیں انسان نے اسی زمانے سے پالنا شروع کر دیا تھا جب وہ گھر بنانا بھی نہ جانتا تھا انسان ان کی دیکھ بھال اور ان کا بچاؤ کرتا تھا اور وہ انسان کی دیکھ بھال اور اس کا بچاؤ کرتے تھے ۔ اور جب انسان نے اپنے رہنے کا ٹھکانا بنایا تو ان جانوروں کے رہنے کی بھی فکر کی اور اسی جھونپڑی کا ایک حصّہ ان کے لئے الگ کر دیا ۔

لیکن جنگلی جانور اس زمانے میں انسان کو بہت پریشان کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ جہاں جنگلی جانور زیادہ ہوتے تھے وہاں درختوں کے اوپر مکان بنائے جاتے تھے ۔ وہ مکان کیا تھے اُلٹی سیدھی چھپّر کی جھونپڑیاں تھیں اس سے یہ فائدہ ضرور ہوتا تھا کہ جنگلی جانور حملہ نہ کر سکتے تھے ۔ کہیں کہیں اب بھی درختوں پر جھونپڑیاں بنائی جاتی ہیں ۔

ان جھونپڑیوں تک پہنچنے کے لئے لکڑی کی سیڑھی بنا لیتے تھے ۔ اسی کے ذریعے سے چڑھتے اترتے تھے ۔ بچّوں کا تو اچھا خاصا کھیل تھا کھیلنے کو جی چاہا زمین پر اتر آئے کھیل کود کر پھر سیڑھی پر چڑھے اور اپنے گھر میں پہنچ گئے ۔

لیکن اس زمانے میں بھی سب جگہ ایک ہی ڈھنگ کے مکان نہیں بنائے جاتے تھے ۔ اب بھی یہی ہوتا ہے ۔

اس زمانے میں پہاڑوں پر بسنے والے چٹانوں پر مکان بناتے تھے، کبھی کبھی تو چٹانوں میں غار سا کھود لیتے تھے اور اسی کے اندر رہتے سہتے تھے ۔ ایک رسّی ٹانگ لیتے تھے اور اسی کو پکڑ کر چڑھتے اُترتے تھے، پھر چٹانوں کے اوپر مکان بنانے لگے ۔ شروع شروع میں یہ مکان بڑے بے ڈھنگے اور بدصورت ہوتے تھے ۔ بس پتھروں کا ایک ڈھیر سمجھو ۔ پھر کچھ ڈھنگ پیدا ہو چلا ۔ اب تک بھی بہت سے پہاڑی علاقوں میں اس قسم کے مکان پائے جاتے ہیں، دنیا میں اب بھی بہت سی جگہیں ایسی ہیں جہاں انسان اسی طرح رہتا سہتا ہے جس طرح اب سے ہزاروں سال پہلے رہتا سہتا تھا ۔ اس نے کوئی ترقی نہیں کی ہے اور نہ دوسرے انسانوں کی ترقّی سے کوئی فائدہ اٹھایا ہے یہ دنیا کے ان حصّوں کا ذکر ہے جہاں ترقّی کر جانے والے انسان پہنچ نہیں سکے اور جو لوگ وہاں رہتے ہیں وہ اپنی جگہ سے کہیں باہر نہیں گئے ۔

قطب شمالی کے پاس کچھ انسان رہتے ہیں جو اسکیمو کہلاتے ہیں ان کا ملک بہت سرد ہے اور وہاں سارے سال برف جما رہتا ہے ۔ یہ لوگ مکان عجیب طرح بناتے ہیں ۔ برف کی سِلوں کو اوپر تلے کھڑا کر لیتے ہیں بس اسے برف کی کھوہ سمجھو یہ لوگ اپنے مکان کو "اگلو" کہتے ہیں ۔ وہ اس کے اندر رینگ کر جاتے ہیں ۔ جاڑوں میں تو اگلو خاصا مضبوط اور پکّا رہتا ہے لیکن گرمی کے موسم میں گھل گھل کر بہ جاتا ہے ۔ جب پھر جاڑا آتا ہے تو اسکیمو کو نیا گھر بنانا پڑتا ہے ۔

وہ لوگ اس گھر میں رہنے کے عادی ہوتے ہیں ان کا سارا ملک ہی برف کا ملک ہے ۔ اسی میں پلتے بڑھتے ہیں ۔ ہم تم ایسے گھر میں رہیں تو مر جائیں لیکن ان کو اپنے برف کے گھر ہی میں آرام ملتا ہے ۔

اس گھر کو گرم رکھنے کے لیے اور اس کو روشن رکھنے کے لئے اسکیمو مچھلی کے تیل کا چراغ جلاتے ہیں یہ تیل بہت گاڑھا ہوتا ہے اور اس میں سے دھواں بہت نکلتا ہے ۔ برف کی اس کھوہ میں وہ ایک سوراخ کھول لیتے ہیں اس پر یا تو کوئی ہلکا سا برف کا ٹکڑا ڈھک دیتے ہیں یا سیل مچھلی کی کھال کا ٹکڑا اس میں ٹھونس دیتے ہیں ۔ اسی سوراخ میں سے دھوُاں نکلتا رہتا ہے ۔ مگر پھر بھی ساری کھوہ میں دھواں گھٹا رہتا ہے ۔ سیل مچھلی یا قطبی ریچھ کی کھال نیچے بچھا لیتے ہیں ۔ یہ لوگ کپڑے بھی

انہیں دونوں جانوروں کی کھال کے پہنتے ہیں۔

افریقہ کے بعض حصّوں میں بہت سخت گرمی پڑتی ہے اور دھوپ بہت ہی تیز ہوتی ہے اس لئے مکان ایسے بنائے جاتے ہیں جن میں دھوپ نہ جا سکے۔

دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کسی ایک جگہ جم کر نہیں رہتے آج یہاں ہیں تو کل وہاں۔ یہ لوگ "خانہ بدوش" کہلاتے ہیں، جانوروں کے گلّے ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ جب ایک جگہ کی گھاس جانور چر لیتے ہیں تو یہ گھاس کی تلاش میں کسی دوسری جگہ پہنچتے ہیں۔ عرب کے "بدو" خانہ بدوش ہیں یہ کہیں مکان نہیں بناتے اور خیموں میں رہتے ہیں یہ لوگ خیموں کو اپنے ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ جہاں جا کر ٹھہرتے ہیں خیمے گاڑ لیتے ہیں یہی ان کے گھر ہیں، عربوں کے خیمے اونٹ کے بالوں کے بنائے جاتے ہیں، اس کے دو حصّے ہوتے ہیں ایک حصّہ عورتوں کے لئے اور دوسرا مردوں کے لئے۔

ایک اور عجیب گھر کا حال سنو۔ یہ چینیوں کا "ناؤ گھر" ہے، چین میں بہت سے لوگ کشتیوں میں رہتے ہیں، وہی ان کا گھر ہوتا ہے۔ یہ ناؤ گھر دریا میں پھرتا رہتا ہے، ایک جگہ سے دوسری جگہ مچھلیاں پہنچاتا ہے اس میں رہنے والے بعض ایسے بچے بھی تمہیں ملیں گے جنھوں نے ابھی تک زمین پر قدم نہیں رکھا ہے، ماں باپ کو ناؤ گھر میں رہنے والے بچّوں کی دیکھ بھال کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے، ڈر یہ ہوتا ہے کہ کہیں وہ پانی میں نہ گر پڑیں۔ بہت چھوٹے بچے تو ماں کی کمر سے بندھے رہتے ہیں جو بچّے پاؤں پاؤں چل سکتے ہیں ان کی کمر میں ایک رسّی باندھ دی جاتی ہے، ناؤ گھر کشمیر میں بھی ہوتے ہیں۔ گرمی کا موسم بعض لوگ ناؤ گھر میں گزارتے ہیں۔

آج کل دنیا کے سارے ملکوں میں بڑے اچھے اچھے مکان بننے لگے ہیں انسان نے جس قدر ترقی کی ہے، اس کا اثر مکانوں کے بنانے میں بہت زیادہ نظر آتا ہے۔ اب مکان بہت زیادہ آرام پہنچانے والے اور بہت زیادہ خوبصورت بننے لگے ہیں، جس ملک میں مکان بنائے جاتے ہیں اس ملک کے ہر موسم کا خیال رکھا جاتا ہے تاکہ کسی موسم میں تکلیف نہ ہو، جاپان میں زلزلے بہت آتے ہیں اس لئے وہاں لکڑی اور کاغذ کے مکان بنائے جاتے ہیں یہ مکان زلزلے میں گرتے نہیں۔ لیکن ان میں آگ بہت جلد لگ جاتی ہے۔

انگلستان اور یورپ کے بعض اور ملکوں میں سردی رہتی ہے، صحن کی ضرورت نہیں ہوتی اس لئے وہاں اس قسم کے مکان زیادہ بناتے ہیں جن میں صحن نہیں ہوتا۔ ان کو وہ لوگ "فلیٹ" کہتے ہیں، بجلی کی مدد سے آج کل مکانوں میں روشنی اور ہوا کا انتظام اچھا ہو گیا ہے۔ اکثر مکانوں میں بجلی کے زینے لگے ہوتے ہیں، یہ آن کی آن میں اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر پہنچا دیتے ہیں امریکہ میں تو بغیر ان کے کام ہی نہیں چل سکتا۔ وہاں پچاس پچاس منزل کے مکان بنائے جاتے ہیں اور ان منزلوں پر بجلی کے زینوں کے ذریعے سے چڑھتے اترتے ہیں۔ اصل میں وہاں جگہ کم اور آبادی زیادہ ہے اونچے اونچے مکانوں میں محلّے کا محلّہ آباد ہوتا ہے۔

نیویارک میں ایک مکان ہے جس کا نام وول ورتھ بلڈنگ ہے۔ یہ عمارت ۷۹۲ فٹ اونچی ہے، اس کو ایک چھوٹا سا شہر سمجھو، مین ہاٹین کی چٹان پر ۱۱۰ فٹ کی گہری نیو کھود کر یہ عمارت بنائی گئی ہے، اس میں بہت سی کمپنیوں کے دفتر ہیں ان کمپنیوں میں بارہ ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ آدمیوں کی اس فوج کو اپنے دفتروں تک لانے اور لے جانے کے لئے ۲۹ تیز رفتار بجلی کے زینے کام کرتے رہتے ہیں اور آدھے آدھے منٹ کے وقفے کے بعد ہر منزل پر آ موجود ہوتے ہیں، دو بڑے بجلی کے زینے سیدھے سب سے اوپر والی منزل تک آتے جاتے ہیں ان دونوں زینوں کی رفتار سات سو میل فی گھنٹہ ہے، اس عمارت میں ایک ہزار آٹھ سو ٹیلیفون ہیں۔ امریکہ والوں نے اس قسم کے مکان بنانے میں کمال حاصل کر لیا ہے۔ اب تو وہاں ایک اور عجیب قسم کا مکان بنایا گیا ہے یہ لوہے کا فریم ہوتا ہے، پیچ کھول کر سارا مکان ایک صندوق میں بند کیا جا سکتا ہے جب چاہے اور جہاں چاہے صندوق سے نکالا اور مکان بنا لیا۔

نعیم کوثر

نئے سال کی دعوت

کشمیر کی حسین وادی میں ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر ہے جس کا نام لیہہ ہے یہاں سردی بہت پڑتی ہے اور پہاڑوں کی چوٹیاں برف سے ڈھکی رہتی ہیں کئی برس گزرے یہاں ایک غریب آدمی نیلو نامی رہتا تھا۔ یہ بہت غریب تھا اور ساتھ ہی بیمار بھی رہتا تھا۔ اس کی بیوی کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی جس کی وجہ سے بھی وہ کوئی کام نہیں کر سکتی تھی۔ نیلو کی ایک چھوٹی سی حسین اور معصوم لڑکی تھی جس کا نام چاندنی تھا۔ چاندنی اور اُس کی ماں دن بھر دیا سلائیاں بناتے تھے اور چاندنی دیا سلائیوں کو بازار میں بیچنے لے جاتی تھی۔ اس طرح وہ روز کا خرچ چلاتے تھے۔

ایک دن بہت برف پڑ رہی تھی۔ گھر سے نکلنا دشوار تھا اور سردی کے مارے خون جما جا رہا تھا۔ چاندنی کے پاس کوئی گرم کپڑا نہ تھا جس کو پہن کر وہ دیا سلائیاں بیچنے بازار جاتی۔ اُس کے ماں باپ آج بہت پریشان تھے کہ اگر دیا سلائیاں نہ بکیں تو آج بھوکے مر جائیں گے۔ لیکن چاندنی نے سردی کی کوئی پروا نہ کی اور دیا سلائیوں کا بنڈل لے کر سخت سردی میں بازار کو چل دی۔ سردی کے مارے اُس کے دانت بجنے لگے اور وہ ڈرنے لگی لیکن اپنے ماں باپ کی پریشانی کا خیال آتے ہی وہ تیزی سے بازار کو روانہ ہو گئی۔ بازار میں پہنچتے پہنچتے وہ تھک گئی ..... "بابو، دیا سلائی، سستی دیا سلائی، ایک پیسے کی چار دیا سلائیاں ــــ" مگر کسی نے اُس کی آواز نہ سُنی اور اُس کی ایک دیا سلائی بھی نہ بکی۔ اُس سے اب سردی برداشت نہ ہو سکی۔ اُس کے ہاتھ اکڑ سے گئے اور وہ بے جان سی ہو کر ایک بڑے مکان کی دیوار سے ٹِک کر بیٹھ گئی۔ چاندنی نے سوچا۔ اب کس مُنہ سے گھر جاؤں گی۔ ایک بھی دیا سلائی نہ بک سکی۔ ماں باپ کیا کہیں گے۔ اُن کا کیا حال ہو گا۔ بھوک سے چاندنی کا بُرا حال ہو رہا تھا اور اُس کے ہاتھ اکڑتے ہوئے محسوس ہوئے۔

اُس نے ایک دیا سلائی کھولی اور پوری جلا ڈالی۔ اب اُس کے ہاتھ کچھ گرم سے ہونے لگے۔ اُس نے دیا سلائی کی روشنی میں دیکھا کہ ایک میز پر طرح طرح کے کھانے چُنے ہوئے ہیں۔ اُن کی خوشبو چاندنی کے دماغ پر بُری طرح چھانے لگی اور اُس کا ہاتھ تیزی سے میز کی طرف کھانے کی پلیٹ پر بڑھا۔ لیکن ایک دم دیا سلائی بجھ گئی اور کھانا وغیرہ غائب ہو گیا۔ چاندنی نے سوچا۔ اُف غریب کے سپنے بھی پُورے نہیں ہوتے۔ اُس نے جلدی سے دوسری دیا سلائی جلائی اور ہاتھ پھیلا کر تاپنے لگی۔ روشنی میں اُس نے دیکھا کہ اُس گھر میں

میز پر طرح طرح کے تحفے رکھے ہیں۔ ایک چاندی کی گڑیا بھی رکھی ہے۔ اُس نے خوش ہو کر گڑیا اُٹھانی چاہی لیکن ہوا کا تیز جھونکا آیا اور دیا سلائی بجھ گئی چاندی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ سامنے کی عمارت سے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اور چمچوں اور پلیٹوں کی جھنکار صاف سنائی دے رہی تھی۔ آج سال کی آخری رات تھی۔ اس لئے اس سال کو الوداع کہنے کے لئے سیٹھ جی کے یہاں شاندار دعوت ہو رہی تھی۔ چاندی نے کھانے کی خوشبو سونگھی اور سوچا کل نیا سال ہے۔ اب کیا ہوگا۔ اُس کو پھر سردی محسوس ہوئی۔ اُس نے تیسری دیا سلائی جلائی۔ ایک تیز روشنی ہوئی اور اُس نے دیکھا کہ اُس کی دادی جو تین سال ہوئے مر گئی تھیں، سامنے کھڑی ہیں۔
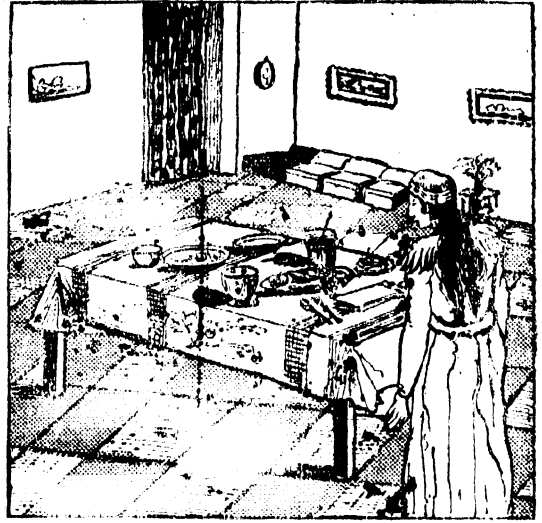
چاند چلا اُٹھی، "دادی اماں۔ تم کتنی خوش ہو۔"

چاندی کی دادی بولیں "بٹیا چاند پریشان کیوں ہے۔ آ میرے پاس آ۔ میں تجھے عمدہ عمدہ کھانے کھلاؤں گی۔ گرم کپڑے پہناؤں گی۔ پھر تجھے کبھی سردی نہ لگے گی۔ آ میری بچی ـــ" اور جیسے ہی چاندی ہاتھ بڑھا کر دادی کی طرف بڑھی۔ ہوا کے زور سے دیا سلائی بجھ گئی اور اُس کے سامنے وہی اندھیرا اور بڑی عمارت تھی

چاندی نے جلدی سے ایک اور دیا سلائی جلائی۔ اور اب پھر اُس کو روشنی میں دادی نظر آئیں۔ وہ چلائی۔ "دادی! مجھے چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھیں۔ مجھے لے چلو دادی ـــ" اور دادی نے چاندی کو گود میں لے لیا۔ اور دیا سلائی بجھ گئی ـــ اندھیرا چھا گیا ـــ صبح لوگوں نے دیکھا کہ سیٹھ جی کے مکان کے سامنے ایک لڑکی کی لاش پڑی ہے اور اردگرد کئی جلی ہوئی دیا سلائیاں پڑی ہیں۔ جن سے اُس نے اپنے جسم کو شاید گرمی پہنچائی ہوگی۔

نئے سال کا سورج تیزی سے آسمان پر چمک رہا تھا۔ صبح ہوئے بہت دیر ہو گئی تھی۔ اور سیٹھ جی کی بلڈنگ میں نئے سال کی خوشی میں ایک بہت بڑی پارٹی ہو رہی تھی۔ نہ معلوم چاندی کو ان کھانوں کی خوشبو پہنچ بھی رہی ہوگی کہ نہیں۔ مگر وہ تو دُنیا کے ان جھگڑوں سے دور، بہت دور نئے سال کے سورج سے بھی اوپر چلی گئی تھی۔ گرم کپڑے پہننے اور کھانا کھانے۔

جادو کا کھیل

آپ اپنے دوست سے کہئے کہ وہ کچھ رقم سوچ لے اور اتنی ہی رقم اپنے دوست کی بھی شامل کر لے۔ اس کے بعد آپ اپنی جانب سے بھی کچھ رقم جمع کرنے کے لئے کہہ دیجئے۔ اب اپنے دوست سے کہئے کہ جملہ رقم میں سے آدھی خیرات کر دے اور اپنے دوست کی رقم دوست کو واپس کر دے۔ اب کہئے کہ اُس کے پاس جو باقی بچا ہے وہ آپ بتلا سکتے ہیں۔ اور جتنی رقم آپ نے اپنی جانب سے جمع کروائی ہے اُس کا آدھا بتلا دیجئے۔ مثلاً آپ نے "۲" جمع کرنے کے لئے کہا ہے تو ایک بچے گا اگر "۴" کہا ہے تو "۲" بچے گا۔

محمد عبید اللہ شریف

دیوکی نندن ناصح

چائے کی کہانی

دسمبر کی ایک رات تھی اور بڑے غضب کی سردی۔ سب بچے لحاف میں دبکے رمیش بھائی سے کہانی کی فرمائش کر رہے تھے اور رمیش بھائی ہر روز کی طرح ٹالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب ننھی رادھا نے منہ پھلا کر کہا۔

"کرسمس کی چھٹیوں کے بعد تو آپ اپنے کالج لوٹ جائیں گے اور پھر ہمیں کہانیاں کون سنائے گا۔" تو رمیش بھائی کا چہرہ اداس ہو گیا اور بولے "نہیں نہیں ہم اپنی گڑیا کو کہانی ضرور سنائیں گے اور پھر جب ہولی کی چھٹیوں میں آئیں گے تو لکھنؤ کے گول باغ سے بہت ہی کہانیاں توڑ لائیں گے۔"

یہ بات سن کر سب بچے ہنسنے لگے رمیش بھائی نے گلے میں مفلر لپیٹتے ہوئے اپنی کہانی شروع کی۔

"کئی ہزار سال ہوئے، کہ چین کا ایک بادشاہ آگ کے پاس بیٹھا نہانے کے لئے پانی گرم کر رہا تھا کہ کچھ پتیاں اڑتی ہوئی پانی کے برتن میں آ گریں۔" "بھیا! کیا بادشاہ کے گھر میں پانی گرم کرنے کے لئے کوئی نوکر نہیں تھا۔" نٹ کھٹ ونود جھٹ سے بول اٹھا۔

"اگر تم بیچ میں بولو گے تو کہانی ختم۔" بھیا نے دھمکی دی اور سب بچے چپ چاپ لحاف میں اور بھی سکڑ گئے۔

ہاں تو چین کے بادشاہ کو ان پتیوں کی خوشبو بہت پسند آئی اور جب اس نے وہ گرم پانی چکھا تو اس کا ذائقہ نہایت مزیدار لگا۔ بس تو اس طرح چائے پینے کی عادت چین سے شروع ہوئی۔ مدتوں بعد کچھ سیاحوں کے ساتھ چائے یورپ میں پہنچی اور بہت جلد لوگوں میں مقبول ہو گئی۔ شروع شروع میں چائے کے دام بہت زیادہ تھے اور اس لئے صرف امیر لوگ ہی اسے پی سکتے تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ قیمتیں کم ہوتی گئیں اور آج تو دنیا بھر میں کیا غریب اور کیا امیر سبھی چائے کو بڑے شوق سے پیتے ہیں۔

"بھیا ہمارے ملک میں چائے کیسے آئی۔" بھولی رادھا نے رکتے رکتے پوچھ ہی لیا۔

"کوئی سو برس پہلے کچھ انگریزوں نے آسام کی پہاڑیوں میں چائے کی کاشت شروع کی اور آہستہ آہستہ چائے کی کاشت ملک کے دوسرے حصوں میں پھیل گئی۔"

"بھیا پچھلے سال جب اندرا کے ڈیڈی دارجلنگ گئے تھے تو وہاں سے بہت سی چائے لائے تھے۔" سریندر نے پہلی بار زبان کھولی۔

"ہاں ہمارے ملک میں بہترین چائے دارجلنگ کے علاقے میں ہی

ہوتی ہے۔ ویسے بنگال اور آسام کے علاوہ نیل گری، دیرہ دون اور کانگڑہ کی پہاڑیوں میں بھی چائے کی کاشت ہوتی ہے۔ اچھا تو ذرا بتاؤ۔ چائے کی سبز پتیاں کالی کیسے ہو جاتی ہیں؟" سب بچے دماغ لڑانے لگے۔

"دھوپ میں سوکھ سوکھ کر کالی ہو جاتی ہیں۔" ونود سب سے پہلے بولا۔

"ان کو آگ میں رکھ کر بھونتے ہوں گے" سریندر نے اپنی رائے دی۔

"بالکل غلط"۔ بھیا نے کہا۔ "دراصل بات یہ ہے کہ چائے کی سبز پتیوں کو کھیتوں سے لاکر پہلے کچھ وقت ہوا میں رکھا جاتا ہے۔ اس سے پتیاں کمھلا جاتی ہیں۔ ان پتیوں کو ایک ایسی مشین میں ڈال دیا جاتا ہے جو ان کو دوائی کی طرح باریک باریک ٹکڑوں میں کاٹ دیتی ہے پتیوں کا بہت سارا رس بھی نکل کر مشین کے نیچے ایک گڑھے میں جمع ہو جاتا ہے۔ ان کٹی ہوئی پتیوں کو صاف فرش پر کچھ گھنٹوں کے لئے بکھیر دیا جاتا ہے۔ اس طرح پڑے رہنے سے ان کی رنگت قدرے بھوری ہو جاتی ہے۔ اب انہیں ایک ایسی مشین کے اندر سے گزارا جاتا ہے۔ جس میں بھاپ کی مدد سے بہت گرمی پیدا کی جاتی ہے۔ اس تیز گرمی کی وجہ سے چائے کا رنگ سیاہ ہو جاتا ہے"

"بس اسی چائے کو ڈبوں میں بند کر لیتے ہوں گے۔" رادھا نے اپنی عقل لڑائی۔

بھیا نے پیار سے تھپکی دیتے ہوئے کہا "ڈبوں میں بھرنے سے پہلے چائے کو الگ الگ حصوں میں بانٹا جاتا ہے۔ ایک مشین چائے کو چھانٹ کر کئی درجوں میں بانٹ دیتی ہے۔ نرم پتیوں اور کونپلوں سے بنی چائے نہایت عمدہ اور خوشبودار ہوتی ہے۔ اسی طرح پہاڑوں میں کاشت ہونے والی چائے ذائقے اور خوشبو کے لحاظ سے میدانوں کی چائے سے اچھی ہوتی ہے۔ کھیتوں سے یہ چائے کارخانوں میں اور کارخانے سے شہروں میں پہنچتی ہے۔ ہمارے ملک کے علاوہ چین، سیلون اور انڈونیشیا کی چائے بھی بہت مشہور ہے۔"

"چائے پینے سے فائدہ کیا ہوتا ہے بھیا؟" سریندر نے چائے پیتے ہوئے کہا

"بہت چستی آتی ہے۔" بھیا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "غضب کی سردی میں چائے ایک نعمت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرد ملکوں کے لوگ اسے زیادہ پیتے ہیں۔ ہمارے ملک سے کروڑوں پونڈ چائے دوسرے دیسوں کو بھیجی جاتی ہے۔ اور چائے کے کھیتوں میں لاکھوں آدمیوں کو روزگار ملتا ہے۔"

"بھیا کیا سب ملکوں کے لوگ ایک جیسی ہی چائے پیتے ہیں؟" ونود نے اونگھتے ہوئے سریندر کو چٹکی لیتے ہوئے کہا۔

فرق بس اتنا ہے کہ کئی ملکوں کے لوگ چائے میں دودھ بالکل نہیں ڈالتے۔ کچھ لوگ تو کھانڈ بھی نہیں ڈالتے۔

"بنا کھانڈ کے چائے کیسے پی لیتے ہیں؟" مٹھائیوں کی رسیا رادھا نے حیرت کا اظہار کیا۔

"بھیا نے اپنے بستر کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "یہ تو اپنے شوق کی بات ہے۔"

اور سب بچے اپنے اپنے بستروں میں جا دبکے۔

آج کل

جولائی سنہ ۱۹۵۳ء

آٹھ آنے

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- بال مکند عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد

جلد ۱۱ —————— نمبر ۱۲

سالانہ چندہ:—— ہندوستان میں:- چھ روپے
پاکستان میں:- چھ روپے

غیر ممالک سے:—— نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:—— ہندوستان میں:- آٹھ آنے
پاکستان میں:- آٹھ آنے

جولائی سنہ ۱۹۵۳ء

ترتیب

بچّوں کا آج کل

سرورق:- حیدرآباد کی ایک بنجارن

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱- دہلی

"آزما کر دیکھئے...
...آپ بھی لکس ٹائلیٹ صابن سے
زیادہ حسین بن سکیں گی"
- دیوجانی
دیوجانی کہتی ہیں، "ذیل کا طریقہ حسن افزا ہے: لکس ٹائلیٹ
صابن کا بالائی دار جھاگ اچھی طرح سے جلد پر ملئے اور پھر
دھو ڈالئے۔ لکس ٹائلیٹ صابن کا باقاعدہ استعمال کرتے
رہنے سے آپ کی جلد بھی زیادہ ملایم اور نکھری رہیگی۔"
لکس
ٹائلیٹ صابن
فلمی ستاروں کا
حسن بخش صابن
LUX
TOILET SOAP
کتنا سفید، کتنا خالص، کتنا خوشبودار
LTS. 374-X30 UD
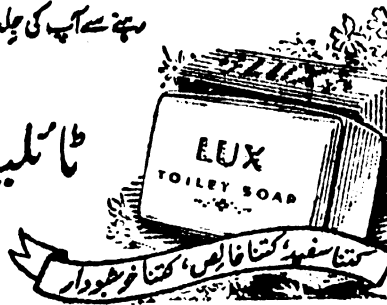
اِس روز روز کی گندگی
کے جراثیم سے اپنی صحت کی حفاظت کیجئے
LIFEBUOY
لائف بوائے کے
محافظ جھاگ
سے
چاہے آپ کتنی ہی احتیاط کیوں نہ برتیں اس روز روز کی گندگی
کے جراثیم سے آپکو بیماری لگنے کا خطرہ رہتا ہی ہے۔ اپنی صحت کی
حفاظت کرنے کیلئے لائف بوائے سے نہانے کی عادت ڈالیئے۔
اسکے مصفی جھاگ سے گندگی کے جراثیم سے جسم
صاف رہتا ہے اور دن بھر تر و تازہ بھی رہتا ہے
لائف بوائے صابن
روز روز کی گندگی کے جراثیم سے ہر روز آپکی حفاظت کرتا ہے
L. 229-50 UD
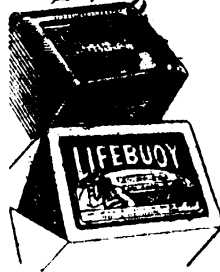
بسمل سعیدی

غزل

شبِ تاریک میں پیدا سحر کرنا بھی آتا ہے
ہمیں داغِ جگر کو جلوہ گر کرنا بھی آتا ہے

بدل جاتی ہیں جب ہم سے نگاہیں شادمانی کی
ہمیں ناشادمانی میں بسر کرنا بھی آتا ہے

زمانہ چھین لیتا ہے جب ایوانِ طرب ہم سے
ہمیں غمخانوں میں رہ کر گزر کرنا بھی آتا ہے

طرب کی شاہراہیں بند ہو جاتی ہیں جب ہم پر
سرِ راہِ الم چل کر سفر کرنا بھی آتا ہے

غبارِ کارواں بر سر ہیں راہوں میں مگر ہم کو
غبارِ رہرواں کو پئے سپر کرنا بھی آتا ہے

ہمارا مقصدِ ہستی کوئی رہینِ وسائل ہے
ہمیں اپنا سفر بے بال و پر کرنا بھی آتا ہے

بچاتے ہیں نگاہیں خاک کے ذرّوں سے بھی لیکن
ہمیں افلاک پر نقد و نظر کرنا بھی آتا ہے

ہم اِک عمرِ خضر ہر آن ضائع کر چکے لیکن
ہمیں ہر آن کو عمرِ خضر کرنا بھی آتا ہے

ہمارا ہر ہُنر اِک عیب ہو کر رہ گیا لیکن
ہمیں ہر عیب کو اپنے ہُنر کرنا بھی آتا ہے

جو دِن کٹتے نہیں تقدیر کے زیرِ اثر ہم سے
اُنھیں تدبیر کے زیرِ اثر کرنا بھی آتا ہے

سجودِ بندگی کی ناپذیرائی کی غیرت سے
جبینِ شوق کو بیزارِ در کرنا بھی آتا ہے

غُرورِ چارہ گر جب درد کی حد سے گُزر جائے
ہمیں اطلاقِ درماں درد پر کرنا بھی آتا ہے

ابھی جنسِ ہُنر ہے مُنفعل جنسِ نقدِ دولت سے
اُسے شرمندۂ جنسِ ہُنر کرنا بھی آتا ہے

زمانے کے بلند و پست کے نرغے میں ہیں لیکن
زمانے کو ہمیں زیر و زبر کرنا بھی آتا ہے

نظر کو ٹھوکروں میں رکھنے والو! جلوہ گاہوں میں
ہمیں جلوؤں کو پامالِ نظر کرنا بھی آتا ہے

مِلا کر اپنی قسمت کے ستارے خاک میں بسمل
ہمیں ذرّوں کو خورشید و قمر کرنا بھی آتا ہے

ہارون خاں شروانی

حسرت موہانی کے سیاسی رُجحانات

(۲)

حسرت شاید پہلے مسلمان تھے جنھوں نے پہلی تقسیم بنگالہ کے بعد ہی نہایت سختی کے ساتھ سودیشی تحریک کو اپنا لیا اور باہر کی چیزوں کے مقاطعے کی ایسی ٹھانی کہ مرتے دم تک بدیشی چیزوں، خصوصاً ولایتی کپڑے کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں کہ ایک روز کڑاکے کے جاڑے میں وہ ان کی قیام گاہ پر آئے اُن کے پاس لحاف توشک کافی نہیں تھی۔ مولانا نے اپنا گرم کمبل پیش کیا۔ حسرت کو معلوم ہوا کہ کمبل ولائتی ہے تو انھوں نے اُسے اوڑھنے سے انکار کر دیا، اور رات بھر ٹھٹھرنے کو ترجیح دی۔ جب ۱۹۱۲ء میں مسلم لیگ نے ہندوستان کے لئے حکومت خود اختیاری کا ریزولیوشن پاس کیا ہے تو حسرت پھُولے نہیں سماتے تھے اور بڑے خوش تھے کہ اب مسلم لیگ کانگریس کے اتنی قریب آگئی ہے کہ دونوں کے مابین ہمیشہ کے لئے سمجھوتہ ممکن ہو جائے گا۔

"الحمد للہ کہ مسلم لیگ کی کونسل نے دسمبر ۱۹۱۲ء کے اجلاس میں خرابیِ بسیار کے بعد آخر کار سلیف گورنمنٹ کو اپنا آخری مقصد تسلیم کر کے ہمارے اس قیاس کو ہمارے تخمینی وقت سے بہت قبل بالکل صحیح ثابت کر دیا جس کا اظہار ہم نے شروع ۱۹۰۷ء میں کیا تھا"

وہ اس کیفیت کو بالکل ایک فطری ارتقا سمجھتے ہیں اس لئے کہ:

"حریت ایک ایسی خواہش ہے جس کی ابتدا ضرور ہوتی ہے۔ لیکن انتہا نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک بار دل میں پیدا ہو کر برابر بڑھتی رہتی ہے، گھٹنے کا نام نہیں لیتی"

(اردوئے معلےٰ جنوری ۱۹۱۳ء)

لیکن بہت جلد حسرت، لیگ کے ممبروں سے نالاں ہو گئے اس لئے کہ اُن کے نزدیک ان میں خدمت کا جذبہ مفقود ہو چلا تھا۔ وہ اس صورت حال سے بہت پریشان اور برافروختہ ہیں اور کہتے ہیں۔

ہے کسے خدمتِ اسلام کی حرص لوگ رکھتے ہیں فقط نام کی حرص
دین کا غم ہو تو کیا چیز ہے غم حرصِ دنیا ہو تو کس کام کی حرص
طلبِ جاہ کہاں تک حسرت
چھوڑ اس آرزوئے خام کی حرص
(۱۹۱۷ء)

ڈاکٹر انصاری نے دسمبر ۱۹۱۸ء کے مسلم لیگ کے اجلاس میں (جو کانگریس کے ساتھ دہلی میں ہو رہا تھا) اپنا بصیرت افروز خطبہ پڑھا جو بالآخر یو۔ پی کی حکومت نے ضبط کر لیا۔ اس خطبے میں ایک طرف تو ہندوؤں مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا اور دوسری جانب انگریزوں اور ان کے حلیفوں سے صاف کہدیا گیا تھا کہ وہ جزیرۃ العرب کا تخلیہ کر دیں۔ حسرت اس خطبے سے متاثر ہوئے اور مارچ ۱۹۱۹ء میں کہا۔

خطبۂ لیگ ہے کفارہ گنہگاری کا اب ہمیں شکوہ نہیں ڈاکٹر انصاری کا
کاش سمجھیں اسے اربابِ حکومت کہ نہیں دخل اس پیرویِ صدق میں غداری کا
خود ہی انصاف سے کہئے کہ اٹھا رکھا ہے آپ نے کوئی دقیقہ بھی دل آزاری کا
ان کی مجبوریِ مظلوم سے ڈریئے کہ جنہیں ادّعا آج بھی باقی ہے وفاداری کا
حسرت اس خطبے سے نالاں ہوں نہ کیوں اہلِ فریب
راز مخفی نہ رہا اُن کی ریاکاری کا

ایفص خیالات کو سے کر حسرت نے ۱۹۲۱ء کے اجلاس مسلم لیگ کی صدارت قبول کی۔ یہ اجلاس اس اعتبار سے معرکۃ الآرا تھا کہ یہ کانگریس خلافت کانفرنس اور جمعیت العلماء کے اجلاسوں کے ساتھ ساتھ احمدآباد میں منعقد ہو رہا تھا۔ اور ترقی پسند جماعتوں کے نمائندے خواہ ہندو ہوں یا

یا مسلمان اس وقت احمد آباد آئے ہوئے تھے۔ کانگریس کے صدر حکیم اجمل خاں چنے گئے تھے۔ مگر ان کے قیدِ فرنگ میں ہونے کی وجہ سے صدارت حکیم اجمل خاں کو تفویض ہوئی تھی۔ خلافت کانفرنس کی صدارت کے فرائض بھی حکیم اجمل خاں ہی انجام دے رہے تھے، اور مولانا آزاد جمعیتہ العلما کے صدر تھے۔ حسرت کا جو رویّہ کانگریس میں ہوا اس کا ذکر تو آگے کیا جائے گا، مسلم لیگ کے صدارتی خطبے میں انھوں نے انگریزوں کو صاف صاف الفاظ میں دھمکی دی کہ اگر انھوں نے مسلمانانِ عالم کے ساتھ عموماً اور ہندوستان کے ساتھ خصوصاً اپنی روش میں تبدیلی نہ کی تو کم سے کم مسلمانوں کو قرآن مجید کا حکم فَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ کی تعمیل کرنی پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز انگریزوں کے لئے ناقابلِ برداشت تھی، اُن کا خطبہ ضبط ہو گیا۔ ان پر مقدمہ قائم ہوا، اور انھیں عدالت نے بیس سال قید بامشقت کی سزا سنائی۔ مگر اپیل میں یہ صرف دو سال کی قید رہ گئی اور حسرت اس مدت کے لئے یروداجیل میں بند کر دئے گئے۔ یہ قید ایک اعتبار سے اس لئے ممتاز ہے کہ اس مرتبہ اُن کا اور مہاتما گاندھی کا جیل میں ساتھ ہوا۔

کہتے ہیں کہ مرد عورت کا رشتہ آسمان پر جڑتا ہے۔ حسرت کو اللہ تعالیٰ نے بی بی بھی ایسی ہی دی تھیں جنھیں حق کی خاطر اذیت میں لطف آتا تھا۔ اور جو بڑے بڑے تاریخی سورماؤں اور ویش بھگتوں کی طرح ہمیشہ اپنے شوہر کا دل بڑھایا کرتی تھیں۔ حسرت کو ۱۹۱۶ء میں نام نہاد قواعد تحفظ ہند کے تحت نظر بند کیا گیا تو اُنھوں نے اس حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں ان قواعد ہی کو سرے سے ظالمانہ سمجھتا ہوں۔ ان پر مقدمہ قائم ہوا اور ایک ہی پیشی پر انھیں دو سال کی قید کا حکم سنا کر فیض آباد جیل میں بند کر دیا گیا۔ فیض آباد کی آب و ہوا اور اس پر سخت مشقت کی وجہ سے ان کی تندرستی خراب ہو گئی اور حکومت کو اُنھیں وہاں سے منتقل کرنا پڑا۔ بیگم حسرت نے ہزار کوشش کی کہ ان کے شوہر کو علی گڈھ جیل میں رکھا جائے تاکہ وہ اُن کی تھوڑی بہت خدمت کر سکیں لیکن حکومت نے اس درخواست کو رد کر دیا اور حسرت کو پابجولاں الہ آباد جیل بھیج دیا۔ رہائی کے بعد علی گڈھ کے محلہ رسل گنج میں ایک چھوٹی سی دوکان میں حسرت نے ایک سودیشی اسٹور کھول لیا تھا جس میں اپنی بساط کے اعتبار سے موٹا کپڑا وسوتی وغیرہ رکھ لیا تھا اور اسی پر میاں بیوی کی قوت بسری ہوتی تھی۔ یہاں کام نہ چلا تو کانپور جا کر وہاں بڑے اور وہیں دوکان کھول لی۔ جب ۱۹۱۶ء میں حسرت کو جیل ہوئی اور انھیں دور افتادہ للت پور بھیجا گیا تو بیگم حسرت کی زندگی بڑی عسرت اور تنگی سے بسر ہونے لگی لیکن اس ایماندار خاتون نے اُف تک نہیں کی، اور حسرت کے بعض محبّوں نے اُنھیں مالی امداد دینی چاہی تو اس خوددار بی بی نے اسے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ حسرت اپنے سلسلہ وار مضمون "مشاہدات زندان" میں بیگم حسرت کا ذکر کرتے ہیں کہ جب ۱۹۰۸ء میں یعنی شادی سے صرف پانچ برس بعد اُنھیں قید ہوئی تو بیگم صاحبہ نے اُنھیں لکھا کہ "تم پر جو اُفتاد پڑی ہے اُسے مردانہ وار برداشت کرو۔ میرا یا گھر کا خیال نہ کرنا۔ خبردار تم سے کسی طرح کی کمزوری کا اظہار نہ ہو۔"

(اردوئے معلّٰی۔ نومبر ۱۹۱۰ء)

حسرت سے کمزوری کا اظہار ہو ہی کیسے سکتا تھا، وہ تو تنہائی میں یہ گنگناتے ہیں۔

اے گریۂ محرومی تو جانِ محبّت ہے	تو جانِ محبّت ہے ایمانِ محبّت ہے
ہر چپ کہ بے باکی ہے لازمۂ محنت	ہم چپ ہیں کہ ایسا ہی فرمانِ محبّت ہے
ہوں دولت و حشمت پر ارباب ہوس نازاں	یاں بے سروسامانی پایانِ محبّت ہے

بیگانۂ آسائش مستغنیِ آسائش
اے بے خبری حسرت حیرانِ محبّت ہے

۱۹۱۵ء میں پہلی مرتبہ کانگریس اور لیگ کے اجلاس ایک ہی مقام پر یعنی بمبئی میں ہوئے اور دونوں میں سمجھوتہ ہونے کی سبیل نکل آئی تو حسرت بھی لیگ کے ممبر ہو گئے۔ مگر وہ زیادہ دن تک آزاد نہیں رہ سکتے تھے۔ اُنھیں نظر بندی کا حکم ملا جس کی اُنھوں نے تعمیل نہیں کی۔ ان پر عدم تعمیل کا مقدمہ دائر ہوا اور دو برس کے لئے پھر جیل جانا پڑا۔ چھوٹے تو تھوڑے دن آرام لے کر سیدھے ۱۹۱۹ء والی امرتسر کانگریس میں شریک ہوئے۔ جیسا ہر تاریخ بین کو معلوم ہو گا کانگریس کی تاریخ میں اس اجلاس کی بڑی اہمیت ہے۔ پنڈال اسی جلیانوالے باغ میں بنایا گیا تھا جس میں چند مہینے پہلے ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں کا قتل عام ہوا تھا۔ اسی اجلاس میں انگریزی حکومت سے

ترکِ موالات اور عدم تعاون کی ابتدا ہوئی اور وہ بھی وہ کشش تھا جس میں پہلی مرتبہ مہاتما گاندھی کی جے" اور "ہندو مسلمان کی جے" کے نعروں سے پنڈال گونج اُٹھا تھا۔ آہستہ آہستہ مہاتما گاندھی پورے ہندوستان کی سیاسیات پر حاوی ہوتے جا رہے تھے۔ اور محمد علی اور شوکت علی نے اور ان کے ساتھ تمام ترقی پسند مسلمانوں نے اپنے آپ کو کانگریس کی تحریک سے وابستہ کر لیا تھا۔ یہاں ایک واقعہ بیان کرنا ہے جس سے حسرت موہانی کے کردار کی مثال ملتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ جس بات کو وہ حق سمجھتے تھے اس کے افشا میں کبھی پس و پیش نہ کرتے تھے۔ تحریکِ خلافت کے باضابطہ آغاز کرنے سے پہلے اکابرِ اہلِ اسلام کا ایک وفد وائسرائے سے ملنے دہلی گیا۔ اس وفد میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا سلیمان ندوی، حسرت موہانی اور بعض دوسرے رہنما شریک تھے۔ جب ایڈریس پیش ہو چکا اور وائسرائے اس کا جواب دے چکے تو وہ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ وفد کے ممبروں سے ہاتھ ملانے لگے۔ لیکن حسرت کی باری آئی تو اُنھوں نے مصافحہ نہیں کیا اور ویسے ہی کمرے سے باہر نکل آئے۔

حسرت کو روزمرّہ کی سیاست کاری سے زیادہ دلچسپی نہیں۔ مگر کبھی کبھی وہ اس میں بھی ایک طرح کی شعریت پیدا کر دیتے ہیں۔ گویہاں ان کا رنگ طنز آمیز ہو جاتا ہے۔ ۱۹۱۹ء میں مونٹیگیو چیمسفورڈ اصلاحات کا بڑا زور شور تھا۔ ان اصلاحات کی بابت لکھتے ہیں۔

کس درجہ فریب سے ہے مملو | تجویز رفارمِ مانٹیگو
مشہور زمانہ میں مسلّم | دستور کے حسبِ ذیل پہلو
قانون پہ اختیارِ کامل | عمّال پہ زور، زر پہ قابو
ان میں سے نہ ہو جب ایک سی بھی | گلہائے رفارم میں کہیں بو
کاغذ کے سمجھئے پھول ان کو | جن میں نہیں نام کو بھی خوشبو
مدراس کے ڈاکٹر کا یہ قول | کس درجہ ہے دل پذیر و نیکو
مقصود ہے صرف یہ کہ تا جنگ | ہم سب رہیں مُرفِ این تگا پو
اے ہندیِ سادہ دل، خبردار | ہرگز نہ چلے یہ تجھ پہ جادو
کیا پائے گا خاک پھر جب ان سے | اس وقت بھی کچھ نہ لے سکا تو

حسرت کا ہمیشہ یہ وطیرہ رہا کہ جس بزم میں، جس قومی مجلس میں شریک ہوتے اس کا کوئی بھی رنگ ہوتا وہ اپنی سی بکتے تھے، خواہ کوئی دوسرا ان کی تائید کرے یا نہ کرے۔ کانپور کے محلّہ مچھلی بازار میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ ۱۹۲۵ء کا واقعہ ہے کہ حکومت نے شہر کی آرائش کے سلسلے میں اس کے صحن کا ایک حصّہ شہید کر دیا۔ اس بظاہر غیر اہم واقعہ سے اس زمانے کے ہندی مسلمانوں میں جو ہیجان برپا ہوا اُس سے اُس زمانے کے جذبات کا اندازہ ہوتا ہے اُس سے برطانوی ہند کی گویا بنیادیں ہل گئیں، اور جب مسلمانوں نے ایک وفد جس کے ممبر مولانا محمد علی اور سیّد وزیر حسن تھے انگلستان بھیجا تو گو اس کی رسائی انگلستان کے وزیروں تک نہ ہو سکی لیکن وہاں کی پبلک نے اس کا کھلے دل سے سواگت کیا۔ وائسرائے ہند لارڈ ہارڈنگ اس بات کو بھانپ گئے کہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگی ہے اور انھیں چھیڑنا خطرے سے خالی نہیں۔ چنانچہ انھوں نے کمال دور اندیشی سے مسجد کے منہدم شدہ حصّہ کو ازسرِ نو تعمیر کرنے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔ اس پر مسلم لیگ میں وائسرائے کے شکریہ کا رزولیوشن پیش ہوا اور اس کی تائید پرانے خیال کے لیگیوں اور احراریوں دونوں نے کی لیکن حسرت جنھیں قوم نے رئیس الاحرار کا خطاب دیا تھا، لیگ کے ان گنے چُنے ممبروں میں سے تھے جنھوں نے اس رزولیوشن کے خلاف رائے دی۔

۱۹۲۱ء میں احمد آباد میں کانگریس اور خلافت کانفرنس کا اجلاس ہو رہا ہے اور حسرت دونوں کے رکنِ رکین ہیں۔ اس سے پہلے کراچی کی مشہور خلافت کانفرنس میں ترکِ موالات کے فتوے اور کانگرس کے اس کے مماثل اعلان کی وجہ سے وہ بھی دوسرے مسلم اور غیر مسلم قائدوں کی طرح سزایاب ہو چکے ہیں۔ احمد آباد کانگریس کی سبجکٹ کمیٹی میں حسرت ہندوستان کے لئے مکمل آزادی کا رزولیوشن پیش کرتے ہیں۔ اتفاقاً مہاتما گاندھی اُس وقت مسلمانوں کے کیمپ میں کچھ مشورے کے لئے آئے ہوتے ہیں۔ پنڈال کی طرف سے دو رضا کار دوڑے ہوئے آتے ہیں اور گاندھی جی سے کہتے ہیں کہ مہاتما جی غضب ہو گیا۔ مولانا حسرت موہانی اپنی ضد پر اڑے ہیں اور مکمل آزادی کی تحریک پیش کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ مہاتما جی الٹے پاؤں کانگریس پنڈال واپس ہوتے ہیں۔ رائے لی جاتی ہے تو حسرت کی رائے ایک طرف اور باقی سب کی رائے دوسری طرف جاتی ہے۔ اب حسرت نوٹس دیتے ہیں کہ کانگریس کے کھلے اجلاس میں وہ اس رزولیوشن کو پیش کریں گے۔ وہاں بھی اس کی تائید کرنے والا کوئی نہیں ملتا۔ اس لئے کہ انتہائیوں میں سے انتہائی بھی اس کے لئے طیار نہیں کہ انگریز بوریا بدھنا باندھ کر ہندوستان سے نکل جائیں۔

اب خلافت کانفرنس کا رُخ کیجیے۔ آج کل بہت سوں کا خیال ہے کہ مسلمان بحیثیت قوم ہمیشہ انگریزوں کے ہم نوا رہے ہیں لیکن احمد آباد کی فضا ہمیں بالکل دوسرا سبق سکھاتی ہے۔ کانگریس میں تو مکمل آزادی کے رزولیوشن کو ایک مؤید بھی نہیں ملتا۔ خلافت کانفرنس کی سبجکٹ کمیٹی کی اکثریت حسرت کے موافق ہو جاتی ہے اور یہ رزولیوشن اس کمیٹی میں منظور ہو جاتا ہے۔ خلافت کانفرنس کے صدر حکیم اجمل خاں کو خیال ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس رزولیوشن کی وجہ سے کانگریس اور خلافت کانفرنس میں بگاڑ ہو جائے اور اس بگاڑ کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کسی طرح کا افتراق پیدا ہو جائے۔ چنانچہ وہ اپنے صدارتی اختیارات کو کام میں لا کر رزولیوشن کو خلافت کانفرنس کے کھلے اجلاس میں پیش کرنے کی ممانعت کر دیتے ہیں۔ لیکن بقولِ حسرت، حُبِّ وطن کی آگ جب لگا دی جاتی ہے تو اُسے کوئی بجھا نہیں سکتا، اور حسرت کے جس رزولیوشن کو ۱۹۲۱ء میں کانگریس نے نامنظور اور خلافت کانفرنس میں ممنوع قرار دیا گیا تھا اُسی کو اِدھر اُدھر سے کاٹ چھانٹ کر آٹھ برس بعد اسی کانگریس نے دریائے راوی کے کنارے ۲۶ جنوری ۱۹۲۹ء کو پنڈت جواہر لال نہرو کی قیادت میں بڑے جوش و خروش سے پاس کیا، اور اب یہ تاریخ ہندوستان کے عہدِ حاضر کی اہم ترین تاریخوں میں شمار کی جاتی ہے۔

حسرت اپنی دُھن کے پکے تھے اور جہاں کہیں وہ جاتے، جہاں کہیں بیٹھتے، اُن کے سامنے ایک ہی مطمحِ نظر ہوتا وہ یہ کہ ضمیر کی جو بھی آواز ہو اس کے مطابق اپنے خیال کا اظہار کریں۔ اُن کا مسلک اُن کا اپنا ہوتا تھا۔ ان کا ضمیر ساتھ نہ دیتا تو کسی کے اتباع کو، یہاں تک کہ عوام کے اتباع کو بھی، اپنے اصول کے خلاف سمجھتے تھے۔ ستمبر ۱۹۱۷ء میں فیض آباد جیل سے لکھتے ہیں۔

ہر چند کہ میں خلافِ جمہور نہیں تقلیدِ عوام دل کو منظور نہیں

وہ کانگریس کی اعتدالی پالیسی سے تنگ آتے ہیں تو اس کا ساتھ چھوڑ کر انتہا پسندوں سے جا ملتے ہیں۔ مسلم لیگ حکومت خود اختیاری کا رزولیوشن پاس کرتی ہے تو اس میں بڑے شوق سے شریک ہو جاتے ہیں۔ مگر بہت جلد اسے بھی بیکار سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ خلافت کانفرنس ان کا ساتھ نہیں دیتی تو اسے بھی خیرباد کہتے ہیں۔ پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں جو آل پارٹیز کانفرنس ہوتی ہے اور جو دستور اس میں تجویز ہوتا ہے اس کی اس بنا پر مخالفت کرتے ہیں کہ اس میں ہندوستان کی مکمل آزادی کا کہیں ذکر نہیں اور رائے لی جاتی ہے تو ان کی تنہا رائے کانفرنس کے مجوّزہ دستور کے خلاف ہوتی ہے۔ آخر وہ پہلے سوشلسٹ اور پھر کمیونسٹ اور سوویٹ طرزِ حکومت کے مؤید بن جاتے ہیں، اور ۱۹۲۵ء میں پہلی کمیونسٹ کانفرنس کے صدر استقبالیہ کی حیثیت سے فرماتے ہیں۔

"کمیونزم کی تحریک کاشتکاروں اور مزدوروں کی تحریک ہے بعض یہ سمجھتے ہیں کہ کمیونزم اور خوں ریزی اور فساد لازم و ملزوم ہیں۔ حالانکہ اس کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہم لوگ عدم تشدّد کو صرف ضرورت اور مصلحت کی بنا پر جائز سمجھتے ہیں اور مہاتما گاندھی کی طرح اُس کو ہر حالت میں بطور اصول لازمی قرار نہیں دیتے۔"

پھر فرماتے ہیں۔

ہدایت کا زمانہ تشنہ تھا، اہلِ سوویت نے دکھائی سب کو راہِ حرّیت بے خوف و بیباک ہو کر

اور پھر۔

لازم ہو کہ ہو ہند میں آئینِ سوویت دو چار برس میں ہو کہ دس پانچ برس میں

ان کے خیال میں سوویٹ نظام اسلام کے عین مطابق تھا اور اس میں مطلق کوئی مضائقہ نہ تھا کہ انسان کمیونسٹ ہو اور ساتھ ہی دل سے اور عمل سے اسلام کا پیرو بھی۔

تکمیلِ علاجِ دنیوی کو حسرت ہے خواہشِ حُسنِ عاقبت بھی لازم
درویشی و انقلاب مسلک میرا صوفی مومن ہوں اشتراکی مُسلم
تا اں رو کہ بہ ہنج بیت اسلام فی الجملہ ہے آئینِ سوویت قائم

ان کے نزدیک تو اس نظام سے سادہ مشکل ہی سے کوئی دوسری تنظیم ہو گی۔ اس لئے کہ اس میں ذاتی چیزوں میں گھڑی، چھتری، لوٹا، مکان، کپڑے آتے ہیں شخصی میں زمین، کارخانے وغیرہ، اور کمیونسٹ اصول کا عمل ذاتی جائداد پر نہیں ہوتا، صرف شخصی چیزوں پر ہوتا ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ جب ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء کو دو برس کی چھان بین کے بعد ہندوستان کی دستور ساز جمعیت میں نئے دستور پر رائے شماری ہوئی تو ممبروں میں صرف سید فضل الحسن حسرت موہانی ہی تھے جو ہندوستان میں سوویٹ راج چاہتے تھے، اور انہی کی اکیلی آواز تھی جو نئے دستور کے خلاف اُٹھی۔ یہ روش ان کے عمر بھر کے وطیرے کے عین مطابق تھی۔ اس لئے کہ ان کا اصول یہ رہا تھا کہ۔

لگا دو آگ عذرِ مصلحت کو کہ ہے بیزار اس شے سے میرا دل
غلط ہے قولِ عقلِ مصلحت کوش نہ اس جانب کرے گا اعتنا دل

توانائے صداقت ہے تو ہرگز   نہ ہوگا پیرو باطل مرا دل

ایسے شخص کو جس نے اپنی عمر قید کی مشقت یا گھر کی بے دامی و بے درمی میں گزاری ہو اس کا کیا خیال ہو سکتا تھا کہ کوئی اس کا مؤید ہوگا یا نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ابتدا ہی سے حسرت پر دو جذبے غالب تھے۔ ایک تو خدا کا خوف اور دوسرے آزادی سے عشق۔ انھیں جذبۂ آزادی کی وجہ سے ابتدا ہی سے طرح طرح کی جسمانی کلفتوں سے دوچار ہونا پڑا تھا، اس لئے وہ گویا اس کی نذر ہوگئے اور یہ جذبہ اُن کے دمِ واپسیں تک کارفرما رہا۔ انتہا پسند ہوں یا مسلم لیگی، خلافتی ہوں یا سوشلسٹ کمیونسٹ ہوں یا کوئی دوسرا گروہ، اگر یہ پارٹی یا یہ گروہ حسرت کے ساتھ چلنے کے لئے تیار رہتا تو حسرت بھی اس میں مضائقہ نہ سمجھتے تھے کہ انھیں اس پارٹی یا اس گروہ کے ساتھ وابستہ سمجھا جائے۔ لیکن اگر وہ پارٹی یا وہ گروہ مکمل آزادی کے آدرش سے ذرا بھی ڈگمگاتا تو پھر گویا یہ کہہ کر کہ

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی   کیں رہ کہ تو میروی بترکستان است

حسرت اس سے ہٹ جاتے اور اپنی پرانی ریت پر چلنے لگتے۔ ان سے زیادہ کون اپنی مدد آپ کرنے کے اصول کا پکا تھا، ان کا کہنا تو یہ تھا کہ

حق سے بعذرِ مصلحت وقت یہ جو کرے گریز
اس کو نہ پیشوا سمجھ اس پہ نہ اعتماد کر

یہ حسرت کے راسخ عقیدے کا ایک عجیب مظاہرہ تھا کہ ایک طرف تو دنیا کی کوئی مشکل کوئی تکلیف ایسی نہ تھی جو ان پر نہ پڑی ہو تو دوسری طرف اُن کی رجائیت کا یہ عالم تھا کہ بقول شخصے کال کوٹھری میں بھی وہ باغوں اور نہروں کے خواب دیکھتے تھے، ایک طرف تو،

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں
اس اک عشق میں ہیں نے کیا کیا نہ دیکھا

زنجیر سے بیزار ہیں شمشیر کے مشتاق   سب تیرے گرفتار ہیں تعزیر کے مشتاق

اور دوسری طرف

روح آزاد ہے خیال آزاد   جسم حسرت کی قید ہے بیکار

میں غلبۂ اعدا سے ڈرا ہوں نہ ڈروں گا
یہ حوصلہ بخشا ہے مجھے شیر خدا نے

حسرت کا سب سے بڑا سیاسی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے نام نہاد غدر ۱۸۵۷ء کے بعد پہلی مرتبہ ملک کے سامنے مکمل آزادی کے آدرش کی شمع ہندو مسلمان اور تمام طبقوں کے لئے روشن کر دی۔ وہ آزادی کے جذبے کو اپنی جان اور اپنے آرام سے کہیں زیادہ عزیز رکھتے تھے اور اس کے لئے کسی قسم کی قربانی سے کبھی گریز نہ کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی پرورش اس تخیل کی مخالفانہ بلکہ معاندانہ فضا میں پائی تھی۔ مگر وہ اپنے راستے پر برابر قائم رہے۔ اور اس کے لئے انھوں نے جیسی جیسی تکلیفیں اٹھائیں وہ تقریباً لاثانی ہیں مسلم لیگی ان کے خلاف ہو گئے۔ کانگریسی ان کے خلاف ہو گئے۔ خلافتی اُن سے کنی کاٹنے لگے۔ مگر وہ مردِ میدان آخر دم تک اپنی جگہ سے نہیں ہٹا۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۲۱ء کی یو۔ پی پولیٹیکل کانفرنس میں جو سیتاپور میں منعقد ہوئی تھی، اس پر کافی مباحثہ رہا تھا کہ اُن کی قید پر کوئی رزولیشن پاس کیا جائے یا نہیں۔ اس لئے کہ مشکل سے کوئی اس پر آمادہ تھا کہ کھلے اجلاس میں اس کی تحریک کرے۔ لیکن حسرت کسی طرح کے ہمدردانہ رزولیشنوں سے بالکل مستغنی تھے۔ وہ آج ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کا کردار، ان کی ہمت، ان کا استقلال یہ ایسی صفات ہیں کہ اُن سے آج بھی ہم سبق لے سکتے ہیں۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

ضمیمہ

آج کل کے زمانے میں ایک خیال عام ہے کہ اگر کوئی شخص سیاسیات میں انتہا پسند بن جائے تو وہ مادیت میں اتنا دب جاتا ہے کہ خدا پرستی اور مذہب سے اُسے کوئی سروکار نہیں رہتا۔ لیکن حسرت کو جتنا سیاسیات میں غلو تھا اتنا ہی بلکہ اس سے ایک قدم زیادہ وہ راسخ العقیدہ باعمل مسلمان تھے۔ نماز کے پابند اور رمضان کے روزہ دار ہونے کے علاوہ اپنی زندگی کے آخری چند سالوں میں تو وہ تقریباً ہر سال حج کرتے تھے۔ یہاں ان کی وہ نظمیں نقل کرنے کا موقعہ نہیں جو مذہبی جذبات سے بھری ہوئی ہیں۔ لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند ایسے اشعار یہاں نقل کر دئے جائیں جن سے ان کی خدا پرستی کا تھوڑا بہت اندازہ ہوتا ہو۔

(۱) کچھ بھی حاصل نہ ہوا زہد سے نخوت کے سوا
شغل بے کار ہیں سب ان کی محبت کے سوا

دے سکا کوئی نہ دہری کے وسواس کا جواب
تیری وارفتہ و دیوانہ طبیعت کے سوا

حشر میں تابِ جہنم سے مفر اور کہاں
اہلِ عصیاں کو ترے سایۂ رحمت کے سوا

سب سے منہ موڑ کے راضی ہیں تری یاد سے ہم
اس میں اک شانِ فراغت بھی ہے رحمت کے سوا

عقل حیران ہے اے جانِ جہاں راز ترا
کون سمجھے دلِ دیوانۂ حسرت کے سوا

۱۹۱۷ء

---

(۲) تیرا کرم جو رہنما میرے لئے ہے
یہ درد کہ ہے جانِ دوا میرے لئے ہے

پرسش جو ہوئی روزِ ازل قسمتِ غم کی!
بے ساختہ دل بول اٹھا میرے لئے ہے

میں اپنی مصیبت پہ ہوں نازاں کہ وہ خوش ہیں
مجھ سے کہ یہ پابندِ بلا میرے لئے ہے

ایسا تو نہ ہوگا کہ نہ پہنچوں ترے در پر
جب تیری کشش راہ نما میرے لئے ہے

ہر حال میں خوش ہوں کہ ہر اک بات میں لازم
پابندیٔ تسلیم و رضا میرے لئے ہے

دیکھا تو کہا مجھ کو غمِ یار نے حسرت
یہ سوختۂ بے سود یا میرے لئے ہے

۱۹۱۷ء

(۳) نظارۂ پیہم کا صلا میرے لئے ہے
ہر سمت وہ رخ جلوہ نما میرے لئے ہے

زنہار اگر اہلِ ہوس مجھ پہ فدا ہوں
یہ مرتبۂ صدق و صفا میرے لئے ہے

خوشنودیٔ فجار کے پیرو ہیں یزیدی
تقلیبِ رشہ کرب و بلا میرے لئے ہے

محروم ہوں مجبور ہوں، بے تاب و تواں ہوں
مخصوص ترے غم کا مزا میرے لئے ہے

سرمایۂ راحت ہے فنا کی مجھے تلخی
اس زہر میں سامانِ بقا میرے لئے ہے

مر جاؤں گا بتخانے سے نکلا تو کبھی میں
نظارہ ہے روح فزا میرے لئے ہے

تشخیصِ طبیباں پہ ہنسی آتی ہے حسرت
یہ دردِ جگر ہے کہ دوا میرے لئے ہے

ترا اور سرسوں کی فصل کا اندازہ

وزارتِ خوراک و زراعت کے تحت شعبۂ معاشیات اور اعداد و شمار نے بتایا ہے کہ ۵۳-۱۹۵۲ء کے دوران کل بھارت میں ترا اور سرسوں کی فصل کے لئے دوسرا اندازہ ۲۳۷۵۰۰۰ ایکڑ رقبہ زیر کاشت لگایا گیا ہے۔ جب کہ گذشتہ سال ترمیم شدہ اندازہ ۱۹۸۸۰۰۰ ایکڑ تھا۔ ان اعداد سے رقبہ کاشت ۳۸۷۰۰۰ ایکڑ یا ۱۹ء۲ فیصدی کا اضافہ ظاہر ہوتا ہے۔

اس سال کی فصل میں زیادہ اضافہ کی اطلاعات پنجاب اتر پردیش، پیپسو اور راجستھان سے موصول ہوئی ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بوائی کے وقت آخر اگست اور وسط نومبر ۱۹۵۲ء میں کافی بارشیں ہوئی ہیں۔ تاہم آسام اور بنگال میں بوائی کے وقت موسم کی حالت خراب ہونے کی وجہ سے جو کمی واقع ہوئی اس کے ناموافق اثرات کو رقبہ کے اضافہ نے بے اثر بنا دیا ہے۔

یہ اندازہ زیادہ تر آخر فروری ۱۹۵۳ء کی مدت سے متعلق ہے۔ اس وقت تک فصل کی حالت عام طور پر تسلی بخش تھی۔ مگر آسام کے بعض حصوں میں کیڑوں کی وبا کے باعث فصل کی حالت خراب رہی۔

مرگِ بے ماتم

اپنی نوجوانی کے آغاز میں حضرتِ بزم اکبرآبادی کو میں نے رام پور میں دیکھا تھا، جب کہ وہ مرحوم نوّاب صاحب رام پور کے درباری شاعر تھے۔

بزم صاحب کی ذات بہت سے نادر خصوصیات کا قابلِ قدر مجموعہ تھی ـــــ وہ اگر ایک طرف ہماری قدیم شاعری کے رکنِ ممتاز تھے، تو دوسری طرف وہ ہماری قدیم وضع داری، اور ہماری قدیم تہذیب کا بھی ایک اعلیٰ مرقّع تھے۔ اُن کی ذات میں شعر و سخن اور انجمن آرائی کا وہ سلیقہ تھا کہ وہ جہاں بیٹھ جاتے، وہیں طرحِ بزم ڈال دیتے تھے۔ اُن کے مزاج میں علم و انکسار اور ادبیت و ظرافت کا ایسا اچھا امتزاج تھا کہ اُن کی شخصیت میں ایک بہت بڑی دل کشی و محبوبیت پیدا ہوگئی تھی۔

افسوس کہ موت نے گزشتہ ماہ انھیں ہماری محفل سے اُٹھا لیا۔ صرف انھیں کو نہیں اُٹھایا، ہماری ماضی کی صحبتوں، ہمارے بزرگوں کی وضع قطع اور ہماری ماضی کی بہت سی داستانوں کو، اس پردے میں، ہم سے چھین لیا

موت کے وقت حضرتِ بزم کی عمر کچھ اوپر سو برس تھی۔ وہ ایک صدی کا نچوڑ تھے۔ کسے معلوم کہ اُن کے ساتھ ہماری ایک پوری صدی کا معاشری و ادبی ریکارڈ بھی دفن ہوگیا ہے۔

ایک مدّت سے وہ حیدرآباد میں، اپنے قابلِ ناز فرزند نجم آفندی کے ساتھ جنھیں زمانے کی قدردانی نے قبل از وقت گوشہ نشین بنا دیا ہے، زندگی کے آخری ایّام گزار رہے تھے۔

جہاں تک شمالی ہندوستان کے اربابِ کمال کا تعلق ہے، حیدرآباد کمال کا ایک بہت بڑا مقبرہ ہے۔ جو صاحبِ کمال وہاں جاتا ہے، وہ پورے ہندوستان کی نظروں سے اوجھل ہوجاتا ہے اور گم نامی کی زندگی بسر کر کے ایک دن وہیں خاک کے سپرد ہوجاتا ہے ـــــ یہ اور بات ہے کہ صاحبانِ کمال میں جو قسمت کے دھنی ہوتے ہیں، وہ منتوبِ روزگار ہو کر وہاں سے نکل جاتے ہیں، اور جیتے جی مرنے سے محفوظ ہوجاتے ہیں

چناں چہ دیگر اربابِ کمال کی طرح یہی حشر بزم صاحب کا بھی ہُوا۔ وہ جس آسمان کے ستارے تھے، حیدرآباد کی ہوا، زمانے کے امتداد اور زمین کی گردش نے اُس آسمان ہی کو ہماری نظروں سے اوجھل کر دیا تھا، اس لئے جدید نسل کو اس کا پتہ ہی نہیں تھا کہ ع "یادِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی" ایک شمع دکن کے ایک دور دراز گوشے میں ٹمٹما رہی ہے۔

لیکن جو لوگ اُس شمع کی تابندگی سے واقف تھے، اُن کے دل سے پوچھیے کہ "سو وہ بھی خموش ہے" کا زخم کس قدر گہرا ہوتا ہے۔

کسے معلوم کہ بزم صاحب کے ساتھ کیا کچھ زمین کے اندر پوشیدہ ہوگیا ہے۔

یہ ایک فرد کی نہیں، ایک ایسے پورے دور کی موت ہے، جو اب کبھی واپس نہیں آئے گا، اور تھوڑے ہی دن کے بعد جس کے یاد کرنے والے بھی باقی نہیں رہیں گے۔

یہ موت ایک ایسا زلزلہ تھی، جس کے جھٹکے کو عوام نے نہیں، خواص نے محسوس اور بُری طرح محسوس کیا ہے۔

کس قدر عبرت ناک ہوتی ہیں وہ موتیں، جو اہمیت کے باوجود، امتداد و انقلابِ زمانہ کے ہاتھوں، اپنی اہمیت کھو دیتی، اور ایک معمولی واردات کی طرح خلیے میں ٹپکے ہوئے صرف دو چار آنسوؤں کے دُھندلکے میں گم ہو کر رہ جاتی ہیں۔

(جوش)

سروش عسکری طباطبائی

بیقراری کے مزے

یاد ہیں اب تک وُہ عہدِ بیقراری کے مزے
دو دلوں میں ایک ہی سے زخمِ کاری کے مزے

عشق کی دُشواریاں، تدبیر کی ناچاریاں
چارہ جوئی کے مزے، سینہ فگاری کے مزے

شرم پہلے، پھر تکلّف، پھر توجّہ، پھر تپاک
رفتہ رفتہ دلدہی و پاسداری کے مزے

اتفاقاتِ حسیں کی سلسلہ جنبانیاں
ارتباطِ دمبدم کی اُستواری کے مزے

بیٹھ کر پہلو میں وہ کشتی چلانا ساتھ ساتھ
اور کنارِ آبجُو وُہ شہسواری کے مزے

دستِ رنگیں اور وُہ موجِ رواں سے چھیڑ چھاڑ
زُلف اور وہ شوخیِ بادِ بہاری کے مزے

ہائے رفتارِ زمانہ کی تلوّن کاریاں
سازگاری کے مزے، ناسازگاری کے مزے

گاہ لطفِ زندگی، گہ تلخیِ کام و دہن
خوشگواری کے مزے، ناخوشگواری کے مزے

ہجر اور وہ ہجر کی لائی ہوئی بیتابیاں
اشکباری کے مزے، اختر شماری کے مزے

نامۂ و پیغام سے پھر دل کے ٹکڑے جوڑنا
گلفشانی کے مزے، مضموں نگاری کے مزے

طبعِ نکتہ گیر کی گوہر طرازی کے ہنر
چشمِ رنگیں ماجرا کی لالہ کاری کے مزے

اُف وُہ اک پیغامبر کے رحم پر وہ دو نفوس
ہائے رُسوائی کے دھڑکے، رازداری کے مزے

وُہ خلوص و شرم میں ڈوبے ہوئے مکتوبِ شوق
نکتہ سنجی کے مزے، جادُو نگاری کے مزے

حسرت و یاس و تمنّا، انتظار و آرزو
نااُمیدی کے مزے، اُمیدواری کے مزے

رات کی تنہائیوں میں، آہ گُل کر کے چراغ
منہ چھپا کر، چپکے چپکے، اشکباری کے مزے

پھر وہ ذہنی کشمکش کا بڑھ کے بن جانا مرض
وُہ عیادت کے مزے، تیمارداری کے مزے

وہ حیات و موت کے مابین لرزاں زندگی — پائداری کے مزے ، ناپائداری کے مزے
وہ مرض کی لَو سے شمعِ زندگی پگھلی ہوئی — سینہ کاوی کے قرینے، جاں سپاری کے مزے
ہائے وہ دستِ حنائی، اُف وہ نازک اُنگلیاں — قلب کی، گہ نبض کی، حرکت شماری کے مزے
اُف وہ لمسِ حُسن سے تارِ رگِ جاں مُرتعش — اللہ اللہ سازِ دل کی نغمہ باری کے مزے
وہ مرض کے ساتھ آب و رنگِ رُخ کا مدّ و جزر — گہ مسرّت کے مزے ، گہ سوگواری کے مزے
بال وہ بکھرے ہُوئے ، وہ نرگسی آنکھوں میں اشک — وہ تلاطم ، وہ حسیں ماتم گساری کے مزے
قید و بندِ مذہب و ملّت سے بے پروائیاں — ہاں وہ ناموسِ وفا کی پاسداری کے مزے
سرکو شانے سے لگا کر اور پلا کر خود دوا — آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ منّت گذاری کے مزے
غسلِ صحّت کے لئے وہ اشکِ شکر آمیزِ حُسن — کِشتِ خشکِ زندگی کی آبیاری کے مزے
وہ تپش دل کی ، کہ ہر تارِ نفس اُلجھا ہُوا — وہ ادب ، وہ شوق کی بے اختیاری کے مزے
اُف سُرور و کیف میں بھی لذّتِ سوز و گداز — ہائے دلجمعی میں بھی وہ دلفگاری کے مزے
عشق کی آنکھوں میں آنسو ، حُسن کے رُخ پہ عرق — اُف وہ رنگیں التجا ، وہ شرمساری کے مزے
وہ لبِ پیماں شکن کے وعدہ ہائے نَو بہ نَو — بدگمانی کے مزے ، خوش اعتباری کے مزے
خلوتوں میں عاجزی سے ، تھام کر دامانِ ناز — آہ و شیون کے مزے ، فریاد و زاری کے مزے
پھر تو چھپ چھپ کر گلے ملنے کی گھاتیں دمبدم — چاک ہائے زندگی کی بخیہ کاری کے مزے
غمزۂ و صلح و ستیز و عاجزی ، لاف و گزاف — گاہ نخوت کے مزے ، گہ خاکساری کے مزے
وعدۂ و پیمانِ اُلفت ، عہد و میثاقِ وفا — نظم و آئینِ جہاں کی پاسداری کے مزے
ہائے روزِ ابر میں وہ خلوتِ طرفِ چمن — اُف شبِ مہتاب میں وہ میگساری کے مزے
چاکدامانی میں پیدا پاکدامانی کی شان — اللہ اللہ بیخودی میں ہوشیاری کے مزے

اے سروشِ مست چھیڑی تونے کب کی داستاں
بھول کر بے دید کی غفلت شعاری کے مزے

حامد اللہ افسر

میر کی ظرافت

لطف مجھ میں بھی ہیں ہزاروں میر
دیدنی ہوں جو سوچ کر دیکھو

ظرافت کی کوئی منطقی تعریف ممکن نہیں، اس لئے کہ یہ ایک ذوقی چیز ہے اور ذوقی چیزوں کا ادراک اور احساس ہو سکتا ہے منطقی تعریف نہیں ہو سکتی۔

ظرافت کو اصل میں مہمل، بے سروپا، لغو اور خلافِ عقل باتوں کا ہلکا، سبک اور غیر سنجیدہ انداز نہ سمجھو۔ یہ مضحکہ خیز، تفنن آمیز، غیر متناسب اور بے میل چیزوں کا ادراک اور احساس ہے، ظرافت میں کامل ترین شاعرانہ تخلیقی قوتوں کی ضرورت ہے، ظرافت میں رحم اور ترس کے جذبات خوش طبعی کے لباس میں جلوہ افروز نظر آتے ہیں۔

ہمارے روزمرّہ میں لفظ "مذاق" ظرافت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، مذاق اصل میں ذوق کا اسم ظرف ہے، ذوق کے لغوی معنی چکھنے کے ہیں۔ اس طرح مذاق کے معنی ہوئے محلِ قوتِ ذائقہ یعنی کام و زبان۔

اُردو میں یہ لفظ عام طور پر ہنسی، دل لگی اور ظرافت کے معنی میں بولا جاتا ہے بلکہ اس کے مُشتقات بھی انھیں معنی میں مستعمل ہیں مثلاً مذاقاً، مذاقیہ

تجھ سے ہنستے ہیں کبھی کرتے ہیں گلچیں سے مذاق
اِن گلوں کے ہیں کچھ انداز نرالے بلبل

ظرافت فارسی میں دانائی اور خوش طبعی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اُردو میں بھی اس کا یہی مفہوم ہے۔ انہیں معنوں میں مزاح مستعمل ہے۔

ادبیات سے ظرافت کا بہت گہرا تعلق ہے۔ ظریفانہ ادب کی تخلیق کو نقّادوں نے بڑی اہمیت دی ہے، یہ ادبیات کی لطیف ترین اور مشکل ترین صنف ہے۔

ظرافت یکسر وہبی ہے، کسب و کوشش سے اس کا حاصل کرنا ممکن نہیں۔ یہی سبب ہے کہ کہیں صدیوں میں ایک آدھ ظریف پیدا ہوتا ہے۔

لیکن خالص ظریفانہ ادب کی تخلیق کے علاوہ بھی اگر کوئی ادیب یا شاعر ذوقِ ظرافت سے محروم ہے تو ایک نقّاد کو اس کے ادیب یا شاعر تسلیم کرنے میں تامل نہ ہوگا۔ سنجیدہ سے سنجیدہ ادب میں ظرافت کا حسن جلوہ افگن ہے۔

ظرافت بے انتہا لطیف و نازک چیز ہے اور اکثر لوگوں کو اس کی کریہہ المنظر بہن یاوہ گوئی پر اس کا دھوکا ہو جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک طرف تہذیب و شائستگی کی انتہائی بلندیاں بھی ظرافت کی رفعت تک پہنچنے سے محروم رہتی ہیں۔ دوسری طرف بیہودہ گوئی انسانی فطرت کی ذلیل ترین پستیوں کو بڑے فخر کے ساتھ اپنے سر پہ اُٹھائے پھرتی ہے۔ غرض "روسیہ گی پیشہ کن" سے ظرافت کو کوئی تعلق نہیں۔

ظرافت کا معیار دَور بہ دَور بدلتا رہتا ہے۔ ایک دَور میں جو چیز ظرافت سے تعبیر کی جاتی ہے اور دلوں کو کیفیت سے لبریز کر دیتی ہے دوسرے دَور میں وہی چیز بالکل معمولی سمجھی جاتی ہے اور کوئی کیفیت پیدا نہیں کر سکتی۔ گویا ظرافت ادب کی ہر صنف کی طرح ہر زمانے کے تہذیب و تمدّن اور طرزِ معاشرت سے متاثر ہوتی ہے، اعلیٰ اور عام تعلیم سے بھی ظرافت کی نوعیت بدل جاتی ہے لوگ زیادہ شائستہ ہو جاتے ہیں اور ان کا ذوق پاکیزہ ہو جاتا ہے اس لئے ان کی تفریح اور تفنن کے لئے زیادہ لطیف اور زیادہ نازک ظرافت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ سوسائٹی کے اعلیٰ اور ادنیٰ طبقوں میں ظرافت کا معیار مختلف ہے۔

ظرافت جب اپنی انتہائی بلندیوں پہ ہوتی ہے تو وہ بھی زندگی کی توضیح و تشریح کا ایک جزو ہے۔

بہ ظاہر آثارِ ظرافت کا شعر و شاعری سے بہت کم تعلق رہا ہے۔ ظرافت کے جتنے شاہکار ہیں وہ سب نثر میں ہیں۔

عام طور پر شاعری میں ظرافت، ایہام، تجنیس، مراعات النظیر یا ضلع جگت تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے اور ایہام، تجنیس اور مراعات النظیر اور ضلع جگت لفظوں کے کھیل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے جو زیادہ سے زیادہ بچوں یا غیر تربیت یافتہ افراد کی دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔

اصل ظرافت تخیلی اور تخلیقی ظرافت ہے اور جب ظرافت ہجو اور طنز کے پردے میں جلوہ نما ہوتی ہے تو وہ اکثر نازک ترین شاعرانہ تخیل کے دوش بدوش نظر آتی ہے۔

پُرخلوص اور بے ریا ظرافت "ظریف" اور "مذاق شناس" دونوں کو مسرور کر دیتی ہے اور دونوں کے لئے کیف و سرور اور برکت و سعادت کا باعث ہوتی ہے۔

ظرافت کو گفتگو کا نمک سمجھو خوراک نہیں۔

میر تقی میر کی شاعری سوز و گداز اور درد و اثر کے لئے مشہور ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں:

ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان ہوا

وہ جذبات حزنیہ اور واردات قلبیہ کے مالک ہیں۔ ممکن ہے اس کا سبب ان کے تلخ تجربات اور نامرادانہ زندگی ہو، لیکن اسی کے ساتھ ہی میر صاحب کے کلام میں نہایت لطیف ظرافت بھی موجود ہے۔ ان کے چھ دیوان ہیں اور کوئی دیوان ظرافت سے خالی نہیں ہے۔ ہجویات کے علاوہ ان کا متین و سنجیدہ کلام بھی خوش مذاقی اور ظرافت کی چاشنی سے لبریز نظر آتا ہے۔ خود فرماتے ہیں:

لطف مجھ میں بھی ہیں ہزاروں میر دیدنی ہوں جو سوچ کر دیکھو

ہاں ایک بات ضرور ہے۔ میر صاحب کی ظرافت سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہمیں اب سے سوا سو ڈیڑھ سو برس پہلے کی معاشرت کو نظر میں رکھنا پڑے گا۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس وقت کی تہذیب ہمارے زمانے کی تہذیب سے بہت مختلف تھی۔ جو باتیں اس زمانے میں دلچسپ اور لطیف سمجھی جاتی تھیں اب ان میں ہم لطافت نہیں پاتے۔ اس زمانے کی ظرافت میں زاہد ریاکار اور شیخ زمانہ ساز کو تختۂ مشق بنایا جاتا تھا۔ اصل میں شیخ اور زاہد کے پردے میں سوسائٹی کے افراد کا خاکہ اڑایا جاتا تھا۔ تصنع، بناوٹ، ظاہرداری، تکبر، بے حیائی، عیاری، حیلہ سازی، بہانے بازی، سوسائٹی کے یہ اوصاف تھے۔ شیخ و زاہد کو جن کا ٹھیکہ دار سمجھ لیا جاتا تھا اور تعزیری تنقید کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس کی مدد سے ان پر حملہ نہ کیا جاتا ہو۔

میر صاحب نے بھی اپنے ظریفانہ خیالات کے لئے انھیں کو منتخب کیا ہے۔ اب ہماری شاعری سے ان دونوں بزرگوں کو کوئی خاص واسطہ نہیں رہا۔ زندگی کے نظریئے بالکل بدل گئے۔ ہمارے ماحول نے ہمارے ذوق کو کچھ کا کچھ بنا دیا۔ لیکن اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ظرافت خواہ وہ کسی زمانے کی ظرافت کیوں نہ ہو اگر اس زمانے کو نظر میں رکھ کر دیکھی جائے تو کیف و سرور سے خالی نہ ہوگی۔

آیئے اب میر صاحب کی ظرافت کی بہار دیکھیے

کھلا نشے میں جو پگڑی کا پیچ اس کی میر سمند ناز پہ اک اور تازیانہ ہوا

یہاں پگڑی کے شملہ کو سمند ناز کے لئے تازیانہ بنایا ہے لیکن یہ نہ بھول جایئے گا کہ یہ تازیانہ نشے میں کھلنے سے ہوا ہے۔

ایک غزل کے دو قطعہ بند شعروں میں شیخ و برہمن دونوں سے گھبرا کر بھاگنا چاہتے ہیں

شرکت شیخ و برہمن سے میر کعبہ و دیر سے بھی جائیے گا
اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد کسی ویرانے میں بنائیے گا

شیخ کے آدمی سے گدھا بن جانے کی ترکیب ملاحظہ فرمایئے

کچھ کم نہیں ہیں شعبدہ بازوں سے مے گسار دارو پلا کے شیخ کو آدم سے خر کیا

سوفٹ Swift کی طرح میر صاحب بھی اپنے زمانے کے عمال حکومت سے نالاں ہیں

کہاں سے تہ کریں پیدا یہ ناقابل عمال کہ یوں ہی بانی ہی ہے کہ ہم ان حسب ال ہوں کا

زاہد علامہ کی آبرو کس طرح گئی اس کا حال بھی سن لیجئے

مفت آبروئے زاہد علامہ لے گیا اک مغبچہ اتار کے عمامہ لے گیا

ایک اچھی خاصی سنجیدہ غزل ہے۔ حباب سا، گلاب سا زمین ہے۔ اس میں جلاب کا قافیہ ملاحظہ ہو

بتنگ جو ہم مستی آ گئے سو بار مسجد سے اٹھا
واعظ کو مارے خوف کے کل لگ گیا جلاب سا

داڑھی مونڈنے یا منڈوانے کا رواج میر صاحب کے زمانے میں اتنا نہیں تھا جتنا آجکل ہے۔ لیکن زاہد کی داڑھی آج بھی اسی احترام کے ساتھ دیکھی جاتی ہے جیسی میر صاحب کے زمانے میں دیکھی جاتی تھی۔ مگر میر صاحب واعظ کی مسجد کے پاس سے گزرے تو حیرت ہوئی کہ حجام ساتھ نہیں تھا۔

میں داڑھی تری واعظ مسجد ہی میں منڈواتا
یہ کیا کروں ساتھ اپنے حجام نہیں رکھتا

واعظ کی داڑھی تو خیر بچ گئی لیکن قاضی کی داڑھی پر جو آفت آئی اس کا حال بھی سن لیجئے

شور قلقل کی ہوتی تھی مانع — ریش قاضی پہ رات میں تھوکا

شیخ کا عصا دیکھ کر میر صاحب کو خیال آیا کہ گدھے کو ہنکانے کے لئے لکڑی کی ضرورت ہوتی ہے۔

بن عصا شیخ یک قدم نہ رکھے — راہ چلتا نہیں یہ خر بے چوب

لگے ہاتھوں محفل سماع میں رقص شیخ کا نظارہ بھی کر لیجئے۔

کل رقص شیخ مطلق دل کو لگا نہ میرے
آیا وہ غیر شرعی کتنا مٹک مٹک کر

رشوت لینے کو شاید میر صاحب کے زمانے میں بھی ہوشیاری سے تعبیر کیا جاتا تھا

ہائے مستوں نے ہوشیاری کی — دے کے کچھ محتسب کا منہ چھیلا

شیخ صاحب کی ساری کرامات جبہ و دستار ہی تو ہے۔ فرماتے ہیں

خرقہ مندیل و ردا مست لئے جاتے ہیں — شیخ کی ساری کرامات چلی جاتی ہے

شیخ صاحب اپنے محبوب کے لبوں کا بوسہ لینے کے لئے جھکے تو میر صاحب کو ڈر تھا کہ اب داڑھی کی خیر نہیں

شیخ ان لبوں کے بوسے کو اس ریش سے نہ جھک
رکھتا ہے کون آتش سوزندہ گھاس پاس

نزع کے عالم میں محبوب کے آجانے سے زندگی دوبارہ حاصل ہو گئی۔ اس خیال کو کس قدر لطیف پیرایے میں بیان کیا ہے

ہمیں تو نزع میں شرمندہ آکے اُن نے کیا
رہا ہے ایک رمق جی، سو کیا نثار کریں

اسی قسم کے سیکڑوں شعر میر صاحب کے دواوین میں ملتے ہیں شیخ اور زاہد کی تضحیک سے میر صاحب کا مقصد ایسے ریاکاروں کو بے نقاب کرنا ہے جن کا ظاہر و باطن ایک نہیں ہے اور جو ہیں فاسق و فاجر۔ لیکن خلق خدا کو فریب دینے کے لئے زہد و اتقا کا بہروپ بھرے پھرتے ہیں، ایسے لوگ ہر دور میں ہوتے ہیں اور آج بھی کوئی ملک ایسے لوگوں سے خالی نہیں ہے۔

میر صاحب نے بھی سودا کی طرح اپنے زمانے کے لوگوں کی ہجویں کہی ہیں لیکن ان میں ذاتیات کا جزو غالب نہیں ہے، ان کی ہجویات بھی زیادہ تر اصلاحی پہلو لئے ہوئے ہیں۔ کسی مخصوص شخص کی ہجو وہ صرف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ کم مایہ اور کم پایہ ہونے کی وجہ سے اس درجے کا اہل نہیں ہے جس پر وہ متمکن ہے ملا اس رائے کی ہجو سنیئے

دیکھو منہ تو خدا ہی خیر کرے — پاک ہو شہر جو کہیں یہ مرے
کب تک ایسے نجس سے کوئی بھرے — کہنی تکیہ پہ اس کو دیکھے دھرے
جن نے دیکھے نہ ہو دیں خرس جوال

ایک صف خالی دھول اڑاتی ہے — سنگ وحشت ایک صف چلاتی ہے
لوہے پتھر کی اس کی چھاتی ہے — اک قیامت جلو میں آتی ہے
نکلے ہے گھر سے جبکہ یہ دجال

اس مخمس میں میر صاحب کی تمام ہجویات سے زیادہ ذاتی پہلو نمایاں ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے خود اس امر کو محسوس کیا ہے اور یہ ہجو لکھ کر وہ کچھ پچھتائے ہیں۔ مخمس کے آخری بند میں فرماتے ہیں

بد زبانی نہیں ہے اتنی خوب — بات اچھی نہیں ہے بے اسلوب
گفتگو اس طرح کی ہے معیوب — مل رہے گا جو کچھ کہ ہے مطلوب
بس قلم اب زبان اپنی سنبھال

ایک اور مخمس میں اس زمانے کے لشکر کی ہجو ہے۔ اس میں سلطنت مغلیہ کے آخری دور کی ابتری کا نقشہ کھینچا ہے۔

جس کسو کو خدا کرے گمراہ — آوے لشکر میں رکھ امید رفاہ
یاں کوئی نے وزیر ہے نے شاہ — جس کو دیکھو سو ہے بحال تباہ
طرفہ مردم ہوئے اکٹھے آہ

خاک اڑتی ہے صبح سے تا شام — شام سے صبح تک ہے فکر طعام
رحم کی جا ہے حال تنگ انام — ایک دو ہوں تو لوں کسو کا نام
سیکڑوں کے نہیں جگہ میں آہ

"ہجو مرغ بازاں" میں لکھنؤ کی سوسائٹی کی خرابیاں بیان کی ہیں، فرماتے ہیں

دِتی سے ہم جو لکھنؤ آئے — گرم پرخاش مرغ یاں پائے
جمعہ منگل کو پالی کی ہے دھوم — گلیوں میں روز حشر کا ہے ہجوم
مرغ بازوں کو ہے قیامت جوش — جس کو دیکھو تو مرغ در آغوش
مرغ لڑتے ہیں ایک دو لاتیں — سیکڑوں ان سفیہوں کی باتیں

اُن نے پر جھاڑے یہ ترمینے لگے
ان نے کی نوک یہ کرٹ کنے لگے

وہ جو سیدھا ہوا تو یہ ہیں کج
ساتھ اس کے بدلتے ہیں سج دھج

مرغ کو ایک پر فشانی ہے
ان کی صد رنگ بد زبانی ہے

ایک بولے کہ کاری آئی چوٹ
ایک کہتا ہے بس گیا اب لوٹ

جھکتے ہیں آپ کو تڑاتے ہیں
لاتیں گویا کہ یہ ہی کھاتے ہیں

ایک کے منہ میں مرغ کی منقار
ایک کے لب پہ ناسزا گفتار

منہ پہ آیا جو کچھ وہ بکنے لگے
تیکھی آنکھوں سے سب کو تکنے لگے

طرفہ ہنگامہ طرفہ صحبت ہے
بعد نصف النہار رخصت ہے

کھا پچے سر پہ بغل میں مارے مرغ
لے گئے جیتے ہارے سارے مرغ

مثنوی "در ہجو خانۂ خود" کے چند شعر سنیئے۔ یہ مثنوی بارش کی کثرت کے وقت نظم کی گئی تھی

اب جو آیا ہے موسم برسات
دن کو ہے اپنے ہاں اندھیری رات

مینھ میں گھر کے پانچ چھ چھپّر
ہم غریبوں کے ہوتے ہیں سر پر

پر تلک تنکے تھے کچھ ایک نئے
سو وہ چڑیوں کے گھونسلوں کو گئے

دل ہے کچھ مکڑیوں کا احسان مند
کہ جنھوں نے کئے ہیں چھانکے بند

پھوس کچھ ہے کہیں سو آتا ہے
بانس کو جھینگر دل نے چاٹا ہے

کیا کہوں آہ گھر ہے کہنے کو
باندھتا ہوں مچان رہنے کو

ٹٹیاں تھیں جو آگے چھپر کے
بہتی پھرتی ہیں صحن میں گھر کے

تا گلے سب کھڑے ہیں پانی میں
خاک ہے ایسی زندگانی میں

"تنبیہہ الجہال" میں شاعروں پر طنز کیا ہے

گر چیارا اس کارخانہ میں نہ ہو
لوٹے جوتے کو کہاں لے کر پھرو

چار و ناچار اس کنے جانا پڑے
کوڑیاں دے جوتی گٹھوانا پڑے

حاجت اس فرقے سے یاں مطلق نہیں
جو نہ ہو شاعر تو کچھ نقصان نہیں

یہ تو دنیا میں ہے اس فن کا کمال
دین کا اس فرقے کے پوچھو نہ حال

کذب ہو جس جائے رونق بخش سمع
واں کی دین داری کھوا ور دل کو جمع

جھوٹ آوے اس قدر جب درمیاں
کہ یقین ایمان کیسا دیں کہاں

ہجو اکول میں فرماتے ہیں

اک ہے پُر خور آشنا بے پیر
سینہ سوراخ جس سے ہے کف گیر

صد منی دیگ ہے شکم اس کا
نفسِ اژدہا ہے دم اس کا

آنت شیطان کی ہے اس کی آنت
دانت اس کا ہے ہاتھی کا سا دانت

تو ندکالی جو کھول جلئے لپیٹ
آہنیں ہے تنور اس کا پیٹ

راہ مطبخ میں پاوے ہے جو کبھی
چاٹ جاتا ہے دیگچوں تک بھی

اس کے آنے کی سن کے بازاری
کرتے ہیں سودوں کی خریداری

کوئی تختہ کرے ہے دوکاں کو
کوئی لاوے بلا گزرباں کو

کنجڑے ڈھانکے ہیں ساگ پات اپنا
تکتے ہیں بنیے داؤ گھات اپنا

کہ مبادا ادھر کو آجاوے
سودے بکسو، ہمیں نہ کھاجاوے

جب مرے گا وہ بھوک کا روگی
روح توشے کی روٹی میں ہوگی

کھانے کی بو جو ناک میں پیٹھے
مر گیا ہووے تو بھی اُٹھ بیٹھے

عقل باور اگرچہ کرتی نہیں
وہ مرے، بھوک اس کی مرتی نہیں

بھوکے اس کا جو جی نکل جاوے
گور میں بھی کفن نگل جاوے

ان اقتباسات سے آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ میر صاحب کی ہجویات تمام تر اصلاحی پہلو لیے ہوئے ہیں۔ انھوں نے ذاتی مخاصمت کی بنا پر کبھی کسی کی ہجو نہیں کی اور نہ تمسخر اور تضحیک کی نیت سے کسی کے خلاف قلم اُٹھایا بلکہ اُن کی ہر ہجو اس امر کی آئینہ دار ہے کہ وہ نہایت خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ اس دور کی سوسائٹی کی خرابیاں بیان کرتے ہیں اور دل سے یہ آرزو رکھتے ہیں کہ وہ خرابیاں دور ہو جائیں۔ سودا کی طرح تلخ گوئی اور فحاشی ان کے یہاں نام کو نہیں ہے۔

وفا راشدی

اُردو زبان اور بنگال کے ہندو ادیب

"تاریخ شاہد ہے کہ ہند میں بسنے والی قوموں کے میل جول سے اردو زبان کی بنیاد پڑی اور ہندو مسلم اتحاد کی گود میں پروان چڑھی۔"

ماہنامہ "ادبی دنیا" لاہور کے ایک شمارے میں ڈاکٹر تارا چند اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں۔

"انیسویں صدی کے آخر تک بہت ہندو اردو کو خالص اپنی زبان مانتے تھے۔ ہندو شعراء اور نثر لکھنے والے اردو کو اظہار خیال کا ذریعہ بناتے تھے۔"

یہ مسلم حقیقت ہے کہ اردو زبان نہ صرف مسلمانوں کی ملکیت ہے اور نہ صرف ہندوؤں کی بلکہ اس کی ترقی و فروغ، توسیع و اشاعت میں ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کا برابر حصہ رہا ہے۔ انہوں نے ہندو مسلم اتحاد ان کے رسم و رواج اور مذاہب کے موضوعات کو مرکز فکر قرار دے کر جس خلوص اور احترام و محبت کے ساتھ خامہ فرسائی کی ہے وہ قابلِ رشک اور ایک دوسرے کے دیرینہ تعلقات کا آئینہ دار ہے۔

ایک طرف ماضی ص کے فن کاروں میں راجہ رام نرائن موزوں، پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی، مہاراجہ سرکرشن پرشاد، کبیر داس، چندر بھان، لالہ دلی رام کوثری، پنڈت جواہر پرشاد برق، بابو شیام سندر لال، منشی دیبی پرشاد بشاش اجمیری، منشی مہاراج بہادر، منشی رام سہائے تسلیم، پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی، جگن ناتھ خوشتر، سردار مہن سنگھ دیوانہ، خوب چند ذکاء، پنڈت رتن ناتھ سرشار، منشی طوطا رام شایاں، منشی مول چند، رام پرشاد عاقل، منشی ہری پرشاد عطا عظیم آبادی، بابو جگن ناتھ پرشاد فیض، منشی لال چند فلک، لالہ سری رام دہلوی، منشی پریم چند، سدرشن، رام بابو سکسینہ وغیرہ نے اپنے جواہر پاروں اور افکار عالیہ سے اردو زبان میں جو گرانقدر اضافہ کیا ہے وہ رہتی دنیا تک فراموش نہیں کیا جا سکتا تو دوسری طرف حال کے فن کاروں میں کرشن چندر، پنڈت دیا نرائن نگم، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی، دیویندر ناتھ اشک، عرش ملسیانی، فراق گورکھپوری، خوشتر گرامی

ص۔ ان ناموں میں حال کے بہت سے نام بھی ہیں۔ (ادارہ)

لوگ چند محروم کی بے پناہ خدمات کے احسانات سے اردو زبان کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

اردو زبان میں ہندوؤں کی خدمات کی داستانیں متعدد عنوانات سے رسائل و جرائد و اخبارات کی زینت بنتی رہی ہیں۔ ہندو اہل قلم کے تذکرے بھی مختلف کتابوں کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ مقام افسوس ہے کہ سرزمین بنگال میں ہندوؤں نے اردو ادب کی جو قابل قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ ادب اردو میں ان کا تذکرہ خال خال ہے۔ اسی خیال کے تحت بنگال کے چند ایسے ہندو ادیبوں کو دنیائے ادب سے روشناس کرانا چاہتا ہوں جن کا اردو کی ترقی و فروغ میں بہت بڑا حصہ رہا ہے۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر میں جب عہدِ مغلیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ گل ہو گیا اور انگریزوں کا آفتابِ حکومت طلوع ہوا تو اس وقت تک زبان فارسی تھی۔ ہندوستان کے حالات کو "الف" تہذیب و تمدن، ثقافت و معاشرت سے بہرہ ور ہونے اور وہاں کے تعلیم یافتہ طبقے سے ربط و ارتباط پیدا کرنے کے لئے انگریزوں کے نزدیک اردو سے بہتر کوئی اور زبان اس کام کی صلاحیت نہ رکھتی تھی چنانچہ انہوں نے اردو کو رواج دینے کا فیصلہ کیا۔ ۱۸۳۷ء میں فارسی کے عوض اردو کو دفتری زبان قرار دیا گیا۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی بنیاد ڈالی گئی۔ ہندوستان کے طول و عرض سے بڑے بڑے علماء و فضلاء اور شعراء و ادباء کا عمدہ "تصنیف" تالیف و ترجمہ پر تقرر ہوا۔ انہوں نے وہ بلند پایہ و عدیم المثال کتابیں لکھیں جو آج اردو ادب کا گراں قدر سرمایہ تسلیم کی جاتی ہیں۔ ان مصنفوں میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل تھے۔

میر شیر علی افسوس، میر حسین تحسین، میر امن دہلوی، محمد حیدر بخش حیدری، میر بہادر علی حسینی، کاظم علی جوان دہلوی وغیرہ کے دوش بدوش بعض قابل قدر ہندو ادیبوں کے نام بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔

نہال چند لاہوری نے ۱۸۰۴ء میں "تاج الملوک اور گل بکاولی کی داستانِ عشق کو سب سے پہلے نثر میں موسوم بہ مذہب عشق پیش کیا۔ یہ کہانی اس قدر

مقبول ہوئی کہ کئی بار ڈراموں کی شکل میں اسٹیج اور اسکرین کے ذریعے سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے ۔ نہال چند کی نثر کا نمونہ ملاحظہ ہو

"اشرف البلاد کلکتہ میں آب و خورش کھینچ کر لائی اور بہ خاکسار کپتان وارث صاحب بہادر کی خدمت میں سابق سے بندگی رکھتا تھا ان کی دستگیری سے صاحب گلکرسٹ بہادر مدظلہ کے دامنِ دولت تک دسترس پایا ۔"

مری لال گجراتی نے پرانی بھاشا کو اردو کے نئے روپ میں پیش کیا ۔ بے شمار کتابیں اردو میں لکھیں ۔ ان میں پریم ساگر، راج نیتی، لطائف ہندی اور کشن جی وغیرہ مشہور ہیں ۔

لالہ سدا سکھ لال کی ایک تالیف "مجموعۂ قوانین" ۱۸۲۷ء میں اور ایک کتاب "گنگا کی لہر" ۱۸۵۴ء میں چھپی ۔ آخر الذکر کتاب در اصل انگریزی زبان سے ترجمہ تھی جو علم زراعت کے متعلق ایک انگریز نے لکھی تھی ۔

ہیمنت چندر نے ۱۸۳۷ء میں گل صنوبر کو اردو لباس سے آراستہ کیا ۔

مہاراجہ نبو کرشنا دیب (بہادر) ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹوں میں تھے ۔ لارڈ کلایو کے زمانے کے بہت مشہور ادیب اور پرگو شاعر تھے ۔ وارن ہیسٹنگز کے میر منشی بھی رہے ۔ آخری عمر میں شاہی دربار سے وابستہ ہو گئے تھے ان کی اولاد میں کئی نامی گرامی شاعر گزرے ہیں ۔

راجہ راج کرشنا دیب (بہادر) تخلص راجہ ۔ مہاراجہ نبو کرشنا دیب کے خلف اکبر ۔ باپ کی طرح وہ بھی شاہی دربار سے منسلک رہے ۔ فارسی اور اردو میں اچھی استعداد تھی ۔ شعر و شاعری کا ستھرا مذاق رکھتے تھے ۔ تپش کے شاگرد تھے ۔ معظم شاہ کی توصیف میں ایک نظم لکھی تھی جو اتنی مقبول ہوئی کہ دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں مثلاً رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ، برمن کے سرکاری کتب خانہ اور برلن یونیورسٹی لائبریری کی زینت بنی ۔ نظموں کے علاوہ غزلوں کا سرمایہ بھی اچھا خاصہ ہے ۔ ان کی کلیات پانچ جلدوں میں چھپی ان کا یہ شعر زبان زد عام ہے ۔ ؎

گر شب کو نہ تم پاس مرے آؤ گے صاحب
تو مجھ کو سحر تک نہ یہاں پاؤ گے صاحب

راجہ اپورب کالی کرشنا دیب ۔ سنِ پیدائش ۱۸۰۷ء ۔ تخلص کنور راجہ کرشنا دیب کے بیٹے تھے ۔ اس خاندان کے سب سے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے انگریزی نظم کا سب سے پہلا ترجمہ "احسن المواعظ" کے عنوان سے کیا ۔ مسلمان بادشاہانِ ہند کا شاہنامہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے ۔ متعدد تالیفات و تصنیفات ان کی یادگار ہیں ۔ ایک دیوان اور ایک تالیف "مجموعۂ لطائف اردو" بہت مشہور ہیں ۔ اردو کی اشاعت کی غرض سے کلکتے سے رسالہ "نظام شمسی" ۱۸۳۰ء میں جاری کیا تھا ۔

راجہ جادب کرشنا دیب متخلص بہ شفق ۔ راج خاندان کے مشہور شاعر عبد الغفور نسّاخ کے ہمعصر اور محزوں کے شاگرد تھے ۔ شفق کے دو شعر ہیں ؎

خفتگانِ خاک میں قربان اس رفتار پر
ہے قیامت کا گماں سب کو ترے دلدار پر
نیند تو آتی نہیں جو خواب میں دیکھوں اسے
حیف آتا ہے مجھے اس دیدۂ بیدار پر

بابو کرشنا چندر گھوش کشن ۔ مہاراجہ نبو کرشنا دیب کے ناتیوں میں اچھے شاعر تھے ۔

راجہ جنہوی مترا رماں چو رنگان کے راجہ نبھی کے چشم و چراغ تھے ۔ شرف تلمذ ضیغم سے تھا ۔ یہ سب سے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے 'گرے' کی نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا ۔ صاحبِ دیوان تھے ۔ ارماں کا ایک شعر ہے ؎

کام اپنا نہ کبھی تجھ سے مری جاں نکلا
تن سے جاں نکلی مگر دل سے نہ ارماں نکلا

شعرائے اردو کا ایک تذکرہ "نسخۂ دلکشا" کے نام سے تصنیف کیا یہ کتاب نہ صرف بنگال بلکہ ہندوستان کے کئی کتب خانوں میں ہے ۔

جب نسخۂ[1] دلکشا کی پہلی جلد ۱۸۷۰ء میں چھپوا کر شائع کی گئی گارساں دی تاسی کی مشہور کتاب "تاریخ ادبیاتِ ہندو ہندوستانی کی دو جلدیں اس سے قبل شائع ہو چکی تھیں اور آخری جلد بھی مکمل ہو کر مطبع کو بھیج دی گئی تھی اگر نسخۂ دلکشا پہلے شائع ہوتا تو دتاسی اس سے استفادہ کر کے اپنی آخری جلد میں کچھ اضافہ یا ترمیم کر سکتا تھا لیکن اس نے اتنا ضرور کیا کہ ان تمام شعرا کی فہرست جن کا حال اسی تذکرے میں ہے داخلِ کتاب کر دی چنانچہ یہ فہرست صفحہ ۳۵۵ سے ۳۷۶ تک پھیلی ہوئی ہے ۔ تاریخ ادبیات کی آخری جلد شائع ہونے نہ پائی تھی کہ ارماں کا انتقال ہو گیا بابو راجندر لال متر

---

[1] جدید اردو کلکتہ سالنامہ ۱۹۴۱ء

عالمانہ مذاق رکھتے تھے۔ انہوں نے دوسری جلد کا غیر مطبوعہ نسخہ ڈتاسی کے پاس بھیج دیا جس کا تعارف ڈتاسی نے اپنی کتاب کی جلد ثالث کے دیباچے میں کر دیا ہے۔

کلکتے کے دوسرے کئی خاندانوں میں بھی ہندو شاعروں نے جنم لیا ان میں ملک خاندان ساکن جوڑا سانکھو کے جگنا تھ پرشاد ملک نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی ملک باسط علی محوی کے تلمیذِ رشید تھے۔

راجہ رام موہن رائے۔ فرقہ برہمو سماج کے بانی۔ اٹھارھویں صدی کے مجددین میں سے تھے۔ ان کی بہت سی اردو تصانیف ہیں۔ بنگلہ اور انگریزی کی کئی کتابیں لکھیں۔ پیرس میں موسیو گارساں دی تاسی سے بھی ان کی ملاقات اور راہ و رسم اتنی بڑھی کہ ۱۸۵۳ء میں کلکتہ واپس آ کر اردو میں خط و کتابت کرتے رہے۔ ایک اردو اور ایک انگریزی اخبار کے بیک وقت ایڈیٹر رہے۔

مرزا جھنو لال طرب۔ اچھے مرثیہ گو شاعر تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے دل سے متمنی اور خواہش مند تھے۔ چنانچہ دونوں قوموں کے رسم و رواج، تہذیب و تمدن اور برگزیدہ ہستیوں سے متعلق بے شمار مرثیے کہے۔ حضرت کبریٰ و حضرت قاسمؑ کے حال پر یوں آنسو بہاتے رہے۔ کتنا پرسوز منظر ہے ؂

آخر لعینوں نے جوانی ماٹی میں ملائی اس کی
کاٹی پہونچوں سے ہے ہر ایک کلائی اس کی
گھوڑے سے گرا اور گھر میں آواز جو آئی اس کی
یوں روتا لاش پر اس کی فرزند پیمبر آیا
قاسم دلہن کو تیرے ڈھونڈھوں نہ پاؤں
ماٹی میں یوں مل گیو بیر حسن کے ناؤں
گھوڑے پر لاشہ رکھ کر اس زخمی تیغ اپنا لٹکا
خیمے کی جانب اور وہ شبیر نے گھوڑا ہانکا
سوہے جوڑے سے اس دم بنڑی نے منہ اپنا ڈھانکا
دلہا کا لاشہ جس دم خیمے کے اندر آیا
ہاتھ کی چوڑی پھوڑ کے نوچے بیٹھے کیس
منہ کو پیٹ کے کیا فقیری بھیس

آج سے آٹھ دس ماہ قبل کلکتے کے ایک بڑے علمی ادارہ "مسلم انسٹی ٹیوٹ" کے زیر اہتمام ایک نہایت معیاری انگریزی جریدہ "مسلم ریویو" کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ ہر قسم کے معیاری مضامین کے علاوہ ہند، ایران اور عرب کے قدیم و جدید شعراء و ادباء کے تذکرے بھی اکثر شائع ہوا کرتے تھے اس کے نمبروں کے دیکھنے سے کئی ہندو شعراء کا بھی پتہ چلتا ہے ایسے شاعروں میں متھرا داس کا نام سرِ فہرست نظر آتا ہے۔ متھرا داس شاہجہاں کے عہد کا بہت بڑا فارسی گو شاعر تھا۔ نثر و نظم کا مجموعہ "متھرالامرا" اس کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ جب گورنر بنگال خاں زماں نے اسے قید کر دیا تو اس نے فارسی میں ایک نظم کہی یہ اتنی پسند کی گئی کہ انہیں فوراً رہا کر دیا گیا اس نظم میں (Imperial City) کا پیغام تھا جو حکیم رکنا کاشی کی معرفت بھیجا گیا تھا۔

جسونت سنگھ پروانہ۔ نواب شجاع الدولہ (بنگال) کے دربار سے منسلک تھے ؂

تڑپتے جو دیکھیں ہیں لاشیں تو دل اب
ترے کوچے کو کربلا جانتا ہے

دیبی پرشاد دلؔ مرشد آباد کے رہنے والے تھے اور شاہ عالم کے عہد میں دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی ؂

امیدِ وصل اس سے عبث تو رکھے ہے دل
جس سے کہ رسمِ نامہ و پیغام بھی نہ ہو

بینی بہادر راجہ بھی بنگال کے رہنے والے تھے۔ تاریخ وفات ۱۷۶۰ء یہ بھی شاہ عالم کے زمانے میں دہلی آ گئے تھے ان کی بھی دربارِ شاہی میں بڑی قدر دانی تھی۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؂

سیاہی ہو کی گئی دل کی آرزو نہ گئی
ہمارے جامۂ کہنہ سے مے کی بو نہ گئی

مہاراجہ[1] رام نرائن مرشد آباد کے باشندے تھے۔ موزوں تخلص کرتے اور شیخ علی حزیں کے زمرۂ تلامذہ میں شامل تھے۔ نواب سراج الدولہ کے دامنِ دولت سے بھی وابستہ رہے۔ ۱۱۷۷ھ میں انتقال کیا۔ دو شعر ملاحظہ ہوں ؂

ابر ہوگا تو خجالت سے نہ پانی پانی
مت مقابل ہو مرے دیدۂ خونبار کے ساتھ

---

[1] "اردو زبان اور ہندو" مصنفہ ناظم سیوہاروی

غزل لالا تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانا مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری[1]

عصر حاضر کے ہندو شعرا میں منی لال جوان، شیدا تلمیذ حضرت جرم محمد آبادی، لچھمی نرائن سوتج آصفی، مدن لال آباد، بابا لعل دردہ آصفی، دھنپتی مظہری شاگرد خورشید حسین آج بھی اپنے اپنے طور پر بنگال میں اردو کی خدمت میں مصروف و کوشاں ہیں۔ گو سب کا وطن بنگال نہیں لیکن مدت سے سکونت پذیر ہیں اور سرزمین بنگال میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزار رہے ہیں۔

منی لال جوان سندیلوی کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ عمر تقریباً ۵۵ - ۶۰ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ کلکتہ میں کوئی پچیس تیس سال سے مقیم ہیں۔ آرزو لکھنوی مرحوم جیسے یکتائے روزگار استاد سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ خود بھی صاحب تلامذہ ہیں۔ کلکتہ کی دنیائے شاعری میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کلام ہفتہ وار نظام کلکتہ (حال لاہور) جذبہ اردو کلکتہ وغیرہ اور دیگر اخبارات و رسائل میں برابر شائع ہوتا رہا ہے۔ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کے باوجود وہ شہرت نہ حاصل کرسکے جس کے وہ مستحق ہیں۔ اس کی وجہ کچھ ان کی بے نیازی اور کچھ زمانے کی بے قدری ہی ہو سکتی ہے۔ نمونۂ کلام[2] ملاحظہ ہو۔

یہ خون دل منتقل ہوا ہے پسینے سے تر جبیں نہیں ہے / بدل کے کروٹ بہا ہے دریا کہیں ہے پانی کہیں نہیں ہے
سرفروشانِ محبت باز آ سکتے نہیں / روکنا ہوگا انہیں کو ہاتھ قتل عام سے
پامالِ غم ازل سے دل ناصبور ہے / اک آئینہ ہے پاس مگر چور چور ہے
آب رکھتا ہے تو کیا جب کام آ سکتا نہیں / تشنہ لب کی پیاس آئینہ بجھا سکتا نہیں
کس طرح کشتی امید و بیم کی حد سے بڑھے / جتنی دھارے کی کشش ہے اتنی ہی ساحل میں ہے
جائیے جائیے لے جائیے دیدار کا جام / پینے والا نہ رہا جب تو دوا کیا ہوگی

ہندوستان کے ساتھ ساتھ بنگال کا بٹوارہ ہو گیا مگر اردو زبان کا اس سکیم سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ بقول رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو "اردو ہندو مسلمانوں کو اپنے آبا و اجداد سے ایک مشترکہ و مقدس ترکے کی حیثیت سے ملی ہے جو قطعاً ناقابل تقسیم ہے"[3]۔ اور یہ ایک ایسی مسلم حقیقت ہے کہ سینکڑوں مخالفتوں کے باوجود نہ صرف بنگال بلکہ سارے ہندوستان میں اردو زبان زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔

---

[1] یہ شعر تو یقین کا ہے (ادارہ)
[2] نمونۂ کلام کے لئے محترمی حضرت جرم محمد آبادی کا ممنون ہوں۔ وفا
[3] "ہماری زبان" دہلی یکم مئی ۱۹۴۵ء

معلومات اور اعداد

۱۔ اگرچہ ہندوستان میں فالتو غلہ کی کل مقدار دس لاکھ ۵۹ ہزار ٹن بتائی گئی تھی تاہم ۵۲-۱۹۵۰ء کے تین سال میں فالتو غلہ والی ریاستوں نے قلت والے علاقوں کو مجموعی طور پر ۱۴ لاکھ چار ہزار ٹن غلہ فراہم کیا ہے۔

۲۔ نئی دہلی سے ایک دن رات کے ہر دو منٹ میں ٹیلیفون کی سات ٹرنک کال بک کی جاتی ہیں۔

۳۔ ۵۳-۱۹۵۲ء میں حکومت نے دہلی اور نئی دہلی میں پارکوں کے رکھ رکھاؤ پر چھ لاکھ ۹ ہزار روپیہ صرف کیا ہے۔

۴۔ بھارت کے سکہ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ خالص نکل کا سکہ بھارتی ٹکسال علی پور میں ڈھالا جا رہا ہے۔ یہ ٹکسال گزشتہ سال جاری کی گئی تھی۔

۵۔ بھارتی ریلوں کے تقریباً ۱۸ ہزار انجن روزانہ ڈھائی لاکھ ٹن سے زیادہ مال و اسباب ڈھوتے ہیں۔

۶۔ مارچ ۱۹۵۳ء میں قانون خوراک کی خلاف ورزی کے سلسلے میں ۱۹۱۵ سزادہی کے واقعات عمل میں آئے جن کے تحت ساڑھے چالیس ہزار روپیہ کا ۲ ہزار آٹھ سو ۳۷ من غلہ ضبط کیا گیا۔

۷۔ بھارت نے ٹیکنیکل امداد کی متعدد اسکیموں کے تحت آخر ۵۳-۱۹۵۲ء تک غیر ملکوں کو ۵ ماہرین بھیجے اور غیر ملکوں کے ستر طلباء کو تربیت کی آسانیاں فراہم کیں۔ اسی مدت میں بھارت کو ۱۵۰ ماہرین فراہم کئے گئے اور ۳۵۰ ہندوستانی ٹیکنیشنوں کو غیر ملکوں میں تربیت کی آسانیاں مہیا کی گئیں۔

۸۔ بھارت میں مصنوعی ریشم کے دھاگے کی پیداوار ۱۹۵۱ء میں ۵۴ لاکھ ۱۰ ہزار پونڈ رہی جو ۱۹۵۲ء میں ۸۷ لاکھ ۴۰ ہزار پونڈ ہوگئی۔

۹۔ بھارت کے ڈاک اور تار کے محکمے نے گزشتہ دو برس میں خصوصی اجرائی کے ۷ کروڑ ۲۰ لاکھ ٹکٹ چھاپے جن کی مقررہ قیمت تقریباً ۳ ۹ لاکھ روپیہ ہوتی ہے۔ ان ٹکٹوں کی ایک کثیر تعداد فروخت ہو چکی ہے۔

فیروز رام پوری

محمد فیروز شاہ خاں صاحب فیروز تخلص کے والد محمد اکبر شاہ خاں صاحب متنا تھے۔ رام پور کے محلہ گھیر سنگی میں رہتے تھے۔ فنِ شعر میں نواب مرزا خاں داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ خوشنویسی کا فن مولوی الٰہی بخش صاحب غریب سے حاصل کیا۔ فنِ تاریخگوئی میں قابلِ رشک کامیابی حاصل کی۔ ان کی تاریخوں کی یادگاریں رام پور کے اکثر مکانات، مساجد، اور مزارات وغیرہ پر کندہ ہیں۔ جو انھیں ہمیشہ یاد دلاتی رہیں گی۔ یہ دیکھ کر انتہائی افسوس ہوا کہ مرزا داغ کے تقریباً ۲۵ خط حیدرآباد سے فیروز کے نام آئے جن کے لفافے تو داغ کے قلم کے لکھے ہوئے دیکھے گئے لیکن کسی ستم ظریف نے سب خط اُڑا لئے۔ کاش وہ خط بھی مل جاتے تو فنِ انشا و تاریخ میں قابلِ قدر اضافہ ہوجاتا اور اصلاحِ شعر پر بھی روشنی پڑجاتی۔ داغ کا آخری خط ۱۲ رجون ۱۸۹۹ء کا ہے۔

فیروز سرکاری ملازمت میں ۱۰ رجون ۱۸۹۱ء کو داخل ہوئے۔ میر اخبار کے عہدے پر بحکم نواب سید حامد علی خاں بہادر والئی رام پور رشک تخلص، تقرر ہوا۔ ۱۷ رمئی ۱۸۹۶ء کو درباری ہوئے۔ اُن کا ذاتی پریس اور اخبار بھی تھا۔ کچھ مدت میر منشی کی خدمات بھی انجام دیں۔ افسوس کہ اُن کا انتقال ۴۸ برس کی عمر میں بمرضِ ہیضہ ۲۹ ربیع الثانی ۱۳۱۸ھ مطابق ۲۶ اگست ۱۹۰۰ء کو بروز دوشنبہ ہوا۔ اُن کے ایک مخلص شاگرد منشی فیروز شاہ خاں صاحب تحصیلدار افروز تخلص عرف چھن خاں صاحب نے اپنے محلہ گھیر قلندر خاں کے خاندانی مقبرے کے قریب دفن کیا۔

فیروز کے شاگردوں کی تعداد بہت کافی تھی۔ وہ شاعر ہونے کے علاوہ ایک اچھے ادیب بھی تھے۔ چند ماہ کی مسلسل کوشش سے اُن کے کلام کا کچھ حصہ اور مختصر حالات دستیاب ہوئے جو پیش کئے جا رہے ہیں۔ افسوس کہ اُن کا دیوان بعد وفات، اُن کے والد نے ایک شاعر رئیس کے ہاتھ پانچسو روپے میں فروخت کر دیا۔ "تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو"

حالات اور کلام کی دریافت میں ایک یہ دشواری بھی پیش آئی کہ امیر مینائی نے انتخاب یادگار میں اُن کا ذکر نہیں کیا۔ نہ کسی اور تذکرے نے، اور یہ ممکن بھی نہ تھا، کیونکہ ۱۸۷۳ء میں جب کہ تذکرہ مذکور شائع ہوا ہے فیروز کی عمر ۲۱ سال کی تھی، اور وہ اس وقت بحیثیت شاعر مشہور نہ تھے۔

اُن کی ایک قلمی کتاب موسوم بہ "گلزارِ خیالِ فرخ خاں" نہایت خوشخطی سے اُن کے قلم کی لکھی ہوئی سرکاری کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس میں ۹۶ سطریں ہیں۔ ہر سطر کے عدد "۱۸۹۰" ہیں، کتاب کے نام کے بھی عدد یہی ہیں۔

اب میں اُن کی تاریخ گوئی کے کمال کے چند نمونے پیش کرتا ہوں جن سے واقعاتِ عالم پر بھی روشنی پڑے گی اور تاریخی نقطۂ نظر سے بھی قابلِ قدر ہوں گے۔

پہلے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

تاریخ کی زمانے میں آئی ہے پھر بہار
۱۸۹۰
لالہ نے پھر کیا ہے گریباں کو تار تار
۱۸۹۰

تشنہ لبی سے آج طبیعت ہے بے قرار
۱۸۹۰
اپنے رفیقِ دل پہ نہیں مجھکو اختیار
۱۸۹۰

تاریخی واقعات سال ۱۸۹۰ء

کلکتہ میں تعلیم پولس کا اعلیٰ مدرسہ جاری ہوا
۱۸۹۰

امیر کابل نے سرحد پر متفرق فوج جمع کی
۱۸۹۰

مقام منگلور میں سخت ہولناک زلزلہ آیا
۱۸۹۰

نواح روم میں جاہل ارمنی رعایا کی شورش ہوئی
۱۸۹۰

سلطان روم نے بیس ہزار ہولناک فوج کریٹ کو روانہ کی
۱۸۹۰

شہر پیرس میں لا انتہا بلند عجیب مینار بنا - قرب امریکہ میں برقی قوت سے ریل چلائی گئی

۱۸۹۰ ۱۸۹۰

لندن میں بارہ ہزار اہلِ کمال مصوروں کی تعداد معلوم ہوئی

۱۸۹۰

جنرل امیر احمد نے لرزہ سے قضا کی

۱۸۹۰

اسّی ہزار لاجواب روسی جنگی فوج ترکی سرحد پر آئی

۱۸۹۰

گرامی عصر سر سالار جنگ دکن نے وفات پائی

۱۸۹۰

منبعِ جود شاہزادۂ وکٹر نے ہندوستان کی سیر کی

۱۸۹۰

مقام انگلستان میں معدنِ برکات مسجد بنائی گئی

۱۸۹۰

مقام جرمن میں بے دھوئیں کی باروت تفنگ ایجاد ہوئی

۱۸۹۰

مقام دہلی میں فخرِ آفاق مدرسۂ طبّیہ قائم ہوا

۱۸۹۰

لندن میں مشرقی زبانوں کا باشکوہ مدرسہ جاری ہوا

۱۸۹۰

ریاست کوچ بہار میں بارگاہِ عالم پناہ سے کالجِ نسواں قائم ہوا

۱۸۹۰

طالع مند شاہِ روس کے لئے خاص ریل بنائی گئی

۱۸۹۰

فرانس میں بُودھ مذہب کا ذرّیں مندر بنا

۱۸۹۰

امریکہ میں تیز نکلنے کی راحت آمیز کل جاری ہوئی

۱۸۹۰

مقام لاہور میں علم موسیقی کا تعلیم گر اسکول کھولا گیا

۱۸۹۰

علی گڑھ کالج میں محترز نا اتفاقی کی بنیاد قائم ہوئی

۱۸۹۰

عالی جناب مدار المہام بہادر کے حکم سے رام پور میں نمائش ہوئی

۱۸۹۰

جناب گردوں قباب عرش آشیاں[ل] کی وفات

۱۸۹۰

دولت مدار نوّاب حامد علی بہادر کا جلوس - تشنہ جگر فیروز شاہ فیروز

۱۸۹۰ ۱۸۹۰

فیروز کے یہ تاریخی کمالات ۶۵ سال کے بعد منظر عام پر آرہے ہیں۔ متفرق تاریخیں بے شمار ہیں۔ کلام سے دوسروں نے فائدہ اٹھایا۔ اس سے زیادہ شاعر کی کیا بدقسمتی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے کمالات کا اظہار بھی نہ کر سکے اور گردشِ زمانہ گوشۂ گمنامی میں ہمیشہ کے لئے دفن کردے۔

اب آپ فیروز کی شکوۂ روزگار کی نظم ملاحظہ فرمائیں جس کے چند شعر بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔ اس نظم میں فیروز نے نہ صرف آپ بیتی پر روشنی ڈالی ہے بلکہ ابنائے زمانہ کی صحیح نباضی کی ہے جو ہر دور میں موزوں ثابت ہوگی، اور جگ بیتی کہلائے گی۔

قطعہ

اے ساکنانِ عالمِ ایجاد ہوشیار — دنیا نہیں ہے مکر و دغا کا یہ جال ہے

دہرِ دو رنگ پر کبھی غرّہ نہ چاہیئے — دنیا ہے جس کا نام وہ خوابِ خیال ہے

دولت کدے میں نئے رنگ یہ دیکھے ہیں ہا — قبضے میں آج اس کے تو کل اس کا مال ہے

رہتی ہے چار دن سے سوا کب کسی کے پاس — سچ ہے عروسِ دہر عجب بدخصال ہے

بنتے بگڑتے رہتے ہیں دن رات سیکڑوں — گویا کہ دھوپ چھاؤں عروج و زوال ہے

یا طائروں کی زمزمہ سنجی کا شور تھا — یا دخزاں چلی کہ چمن پائمال ہے

آج اس کی بات تک بھی نہیں پوچھتا کوئی — کہتے تھے جس کو کل شہِ حسن و جمال ہے

ل مراد نوّاب سید مشتاق علی خاں بہادر والئی رام پور خلف نوّاب خلد آشیاں ہیں

لازم ہے دوستوں کو چلیں دیکھ بھال کر   ہر اک جگہ فریب کا پھندا ہے جال ہے
بغض و حسد کا نرخ تو ارزاں ہے آجکل   ہاں دوستی و لطف و مروت کا کال ہے
ممکن ہے اتفاق سے مل جائے سلطنت   لیکن شفیق دوست سے یہ محال ہے
غیروں کو یہ ہے فکر کہ ہم مال چھین لیں   دشمن ہیں جان کے یہ عزیز دل کا حال ہے
کہلا رہے ہیں قوم میں جو مقتدائے قوم   اُن کے یہ رنگ ڈھنگ ہیں یہ چال ڈھال ہے
ریشِ دراز، اس پہ عمامہ، عبا، قبا   کس شد و مد سے بحث حرام و حلال ہے
اعمال دیکھئے تو بس اللہ کی پناہ   لیکن زباں پہ دعویٔ فضل و کمال ہے
ہر ایک بات شیر و شکر کی طرح لذیذ   دل دیکھئے تو معدنِ بغض و ملال ہے
فیروز تنگ آکے تباہی سے دہر کی   اک شعر یہ زباں پہ مری حسب حال ہے
وہ ظلم دوستوں نے کئے ہیں کہ میرا حال   عبرت کے واقعات کی پوری مثال ہے
اُمید ہے خدا سے کہ بدلے یہ رنگ جلد   سنتے ہیں ہر کمال کو آخر زوال ہے

غزلیں

اب آپ فیروز کی چند غزلیں ملاحظہ فرمایئں جن میں مرزا داغ کی زبان، محاورہ بندی۔ ظرافت مضمون آفرینی اور جدت جا بجا نظر آئے گی، اور اس کے ساتھ ہی مضمون ثبوت سے مستحکم پایا جائے گا۔ وہ خود لکھتے ہیں۔

فیروز شاعری مری کیوں کر نہ ہو نئی   مضمون سوجھتا ہے ہمیشہ نیا مجھے

ستمبر ۱۸۹۸ء کی غزل

دل لوٹتا ہے پھول سے رخسار کے لئے   بلبل بنا ہے گلشنِ بے خار کے لئے
فتنے بنے، خرام کی زینت کے واسطے   زیور ہیں، شوخیاں تری گفتار کے لئے
شوخی نے تمکنت میں لگائے ہیں چار چاند   طرّہ بنی ہے حُسن کی دستار کے لئے
اس کے سوا بتوں سے غرض اور کچھ نہیں   حاضر ہیں ہم بھی گرمیٔ بازار کے لئے
آتا ہے جی میں وصفِ رُخِ یار ہی لکھوں   مضمون جب لکھوں کسی اخبار کے لئے
بازار میں پھر آئے ہیں فیروز لے کے دل   مژدہ ہو ہر حسین خریدار کے لئے

پھر چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں اک فتنہ گر سے ہم   کہتے ہیں دل کا حال پھر اک بے خبر سے ہم
اب کیا کہیں کہ آپ کی لاکھوں شکایتیں   سنتے ہیں رات دن لب زخم جگر سے ہم
موسیٰ کے ہوش گم ہیں وہ کیا ماجرا کہیں   پوچھیں گے حالِ وادیٔ ایمن شجر سے ہم
بازِ نگاہ تم کو اگر ناگوار ہے   دیکھا کریں گے آج سے دل کی نظر سے ہم

اچھا ملا ہے رہ زنِ مصیبت ہمیں شریک   ہنستے ہیں بات بات پہ زخم جگر سے ہم
دن رات لُٹتے رہتے ہیں اہلِ خلق کے جہاں   فیروز آرہے ہیں اسی رہگذر سے ہم

کسی کو کیا خبر کیا راز ہیں مقتول و قاتل میں   ذرا آنکھیں ملیں باہم کہ باتیں ہو گئیں دل میں
محبت میں بس اب فیروز کا اللہ مالک ہے   بچے گی جان مشکل سے پھنسی ہے جان مشکل میں

بے وجہ بات بات پہ رنج و ملال ہے   اچھی سمجھ ہے آپ کی اچھا خیال ہے
اب کیا جواب اس سخنِ لاجواب کے   کہتے ہیں بے سبب ہمیں تجھ سے ملال ہے
اقرار ظلم کا نہ کرے گو زبانِ یار   آنکھیں تو کہہ رہی ہیں ہمیں انفعال ہے

ہو کے مجبور ہم آنسو ہی بہا لیتے ہیں   اس طرح دل کی لگی آگ بجھا لیتے ہیں
جنسِ دل، میں سرِ بازار لئے پھرتا ہوں   کوئی کہتا ہی نہیں مجھ سے کہ آ لیتے ہیں

دل مجھ سے پوچھتا ہے کہ جاتے ہو تم کہاں   میں دل سے پوچھتا ہوں کدھر لے گیا مجھے
مدت سے جستجو ہے مجھے اپنے حال کی   اب تک نہیں ملا کہیں اپنا پتا مجھے
فیروز شاعری مری کیوں کر نہ ہو نئی   مضمون سوجھتا ہے ہمیشہ نیا مجھے

فروری ۱۸۹۹ء کا سرکاری طرحی مشاعرہ

پہلے اس مشاعرے کا ایک قطعہ ملاحظہ فرمایئے پھر غزل۔

گلستانِ فصاحت ہے کہ فیروز   کھلا پھولا سخن کا بوستان ہے
چہک کر بول اُٹھا طوطیٔ طبع   یہ گلزارِ صفاہن بے خزاں ہے

۱۸۹۹

غزل

یوں تو اس غزل کے ہر شعر میں زبان اور محاورہ بندی کے مظاہر ہیں۔ لیکن پانچواں شعر ندرت مضمون کی بہترین مثال ہے

صورت دکھا کے ہم کو بلا میں پھنسا گیا   ہم مر مٹے، خراب ہوئے، اس کا کیا گیا
پژمردہ میں اِدھر کہ جگر پر پڑا نہ تیر   افسردہ وہ اُدھر کہ نشانہ خطا گیا
اول تو میں نے عشق میں کھایا بہت سا غم   آخر ہوا یہ حال کہ غم مجھ کو کھا گیا
پیری میں پوچھئے نہ جوانی کے ولولے   وہ دن گئے وہ لطف گیا وہ مزا گیا
مشعل کا کام شب کو دیا دل کے داغ نے   میں اس کی روشنی میں ترے گھر تک آگیا
تھوڑی سی عمر میں وہ بلا کا ذہین ہے   جنبش لبوں کی دیکھ کے مطلب کو پا گیا

چنگاریاں سی دل میں چمکتی ہیں عشق کی
کیا جانئے وہ آتے ہی کیا گُل کھِلا گیا

اب اور کس کا کیجئے دنیا میں اعتبار
دل سا رفیق وقت پہ آنکھیں چُرا گیا

آنکھوں سے گر کے اشک سرِ خاک میں ملے
ملکِ عدم کو قافلے کا قافلہ گیا

فرہاد و قیس و امق و فیروز، عشق میں
ہر ایک چار روز کو ڈنکا بجا گیا

یہی حال اس غزل کا ہے جس میں ردیف کو بڑی خوبی سے استعمال کیا گیا ہے۔

مزہ جب وصل کا جب لذّتِ حُسنِ شباب اُٹھے
ترے رُخ سے نقاب اُٹھے، ترے دل سے حجاب اُٹھے

تماشا ہو اُدھر ہلچل پڑے عالم میں محشر کی
اِدھر سے یار بن ٹھن کر قیامت کا جواب اُٹھے

یہاں ہم خونِ دل پی کر گزاریں رات فرقت کی
وہاں جلسے میں شب کو سیکڑوں بوتل شراب اُٹھے

مجھے الزام دینے کو بڑے دعوے سے بیٹھے تھے
پتے کی جب سنیں باتیں تو ہو کر لاجواب اُٹھے

ہمارا مدعا یہ ہے نہ ٹھہرے وصل کی جب تک
نہ ہم اُٹھیں نہ تم اُٹھو، نہ اب جامِ شراب اُٹھے

بسائے خلد میں اللہ ان چل بسنے والوں کو
ہمارے یار بھی دنیا سے کیا کیا انتخاب اُٹھے

الٰہی آج ایسے وقت آ جائیں وہ دعا رے پر
اِدھر لو چاندنی چھٹکے اُدھر رخ سے نقاب اُٹھے

وہ صورت دیکھ کر فیروز کی پڑھتے ہیں یہ مصرع
خداوندا جہاں سے جلد یہ خانہ خراب اُٹھے

تیری آنکھوں میں اعجاز کا انداز نیا
مجھ کو جینے نہ دیا غیر کو مرنے نہ دیا

کر دیا دفن عزیزوں نے سرِ شام مجھے
رات کی رات مسافر کو ٹھہرنے نہ دیا

لوگ مرتے ہیں عبث اُس کے دُرِ دنداں پہ
پیاس میں کام کبھی آب گہر نے نہ دیا

آئینہ یار نے اُٹھوا دیا برہم ہو کر
سامنے مدِّ مقابل کو ٹھہرنے نہ دیا

انصاف کر کہ جب تری سیدھی نظر نہ ہو
کس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہمارا جگر نہ ہو

بن بن کے اُس کا دیکھنا وہ اپنے آپ کو
اور میرا بار بار یہ کہنا نظر نہ ہو

چولی مسکی ہوئی اور وصلِ عدو سے انکار
منھ ذرا اپنے گریبان میں ڈالا ہوتا

دلِ کج بخت نے بے فائدہ ڈالے الجھاؤ
اپنا مطلب کسی پہلو سے نکالا ہوتا

نوک کا نشترِ مژگاں کو اگر دعویٰ تھا
غم کی پھانسوں کو مرے دل سے نکالا ہوتا

زُلفیں ہٹ جاتیں جو رُخ سے تو کچھ اندھیر نہ تھا
چاند بدلی سے نکلتا تو اُجالا ہوتا

سیدھے فقروں میں چال، کیا کہنا
واہ رے با کمال، کیا کہنا

اپنے منھ سے نہ کیجئے تعریف
آپ ہیں بے مثال، کیا کہنا

بولے فیروز کی غزل سن کر
واہ ری بول چال، کیا کہنا

بھارت میں تعلیم

بھارت سرکار کی وزارتِ تعلیم نے ایک کتاب "۱۹۴۸-۴۹ء کے دوران بھارت میں تعلیم" حال ہی میں شائع کی ہے۔ اس کتاب میں ان سابقہ صوبوں اور سابقہ دیسی ریاستوں کی ۱۹۴۸-۴۹ء کے دوران تعلیمی ترقی پر تبصرہ پیش کیا گیا ہے جو اب صوبوں میں مدغم کر دی گئی ہیں یا مرکزی حکومت کے زیرِ انتظام آ گئی ہیں۔

۱۹۴۸-۴۹ء کا سال تعلیمی واقعات سے پُر ہے کیونکہ اس مدت میں تعلیم کے ایک جامع طریقۂ کار کے لئے مالی امداد کے ذرائع کی تحقیق سے متعلق کھیر کمیٹی اور ڈاکٹر رادھا کرشنن کی زیرِ صدارت یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن مقرر کیا گیا۔ اسی مدت میں مقرر شدہ کمیٹیوں میں سے سیکنڈری ایجوکیشن کمیٹی تعلیم بالغان (سماجی) کی کمیٹی صوتی اور نظری تعلیمی کمیٹی اور غیر ملکوں میں وظائف کے متعلق کمیٹی نے اپنی اپنی رپورٹیں پیش کی ہیں۔

مبارز الدین رفعت

بھارت اور انڈونیشیا

آپ کے آگے جب کبھی کسی ملک کا نام لیا جائے۔ جیسے روس، ہند، چین عرب یا عراق تو آپ کے ذہن میں ایک گتھی ہوئی ٹھوس سرزمین کی تصویر کھنچ جاتی ہے۔ لیکن انڈونیشیا کے ملک کی یہ حالت نہیں۔ ذرا ایشیا کے نقشے پر نظر ڈالئے۔ اور ملایا کے نیچے انڈونیشیا کو تلاش کیجئے آپ دیکھیں گے یہ ملک جزیروں کا ملک ہے، اور بڑے چھوٹے ہزاروں جزیرے مل کر بنا ہے ان جزیروں میں کچھ تو ایسے ہیں کہ نقشے میں سرے سے دکھائے ہی نہیں گئے ہیں، اور کچھ ایسے ہیں کہ دکھائے گئے ہیں تو سوئی کی نوک کے برابر۔ آپ مانیں نہ مانیں پر یہ سچ ہے کہ ان جزیروں کی گنتی تین ہزار سے بھی زیادہ ہے۔ ان جزیروں کے دو بڑے مجموعے ہیں۔ ایک مجموعے کا نام بڑے سندا جزیرے اور دوسرے کا چھوٹے سندا جزیرے ہے۔ پہلے مجموعے میں جاوا، سماٹرا، بورنیو، مدورا اور سیلیبیس کے جزیرے ہیں اور دوسرے میں بالی، لمباک، تیمور، مولوکس کے جزائر اور جزیرہ نیوگنی کا مغربی علاقہ ہے جسے انڈونیشیا کے لوگ "آریان" کہتے ہیں ان سب جزیروں کا مجموعی رقبہ کوئی سات لاکھ پینتیس ہزار مربع میل ہے اور شمال سے جنوب تک کوئی گیارہ سو میل اور مشرق سے مغرب میں کوئی تین ہزار میل کے اندر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان جزیروں میں جو لوگ بستے ہیں ان کی نسل پالونیسی بتائی جاتی ہے۔ جو زبان یہاں سب سے زیادہ بولی جاتی ہے وہ ملائی ہے۔ اس زبان میں ڈچ، جاوی اور سنسکرت زبانوں کے بہت سے لفظ مل گئے ہیں۔ سنسکرت زبان کے الفاظ اس زبان میں (۲۵) فی صد کے قریب ہیں۔

جتنے لوگ اس ملک میں بستے ہیں انکی تعداد سات کروڑ سے زیادہ ہے کسی زمانے میں یہاں ہندو دھرم کے ماننے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی لیکن اب جو مذہب یہاں سب سے زیادہ مانا جاتا ہے وہ اسلام ہے اور پوری آبادی کا نوے فی صد حصہ مسلمان ہے۔ باقی دس فی صد میں ہندو، بدھ متی اور عیسائی ہیں۔ بدھ مت کو ماننے والے اور عیسائی زیادہ تر چینی ہیں۔ اور ہندو زیادہ تر بالی اور اس کے آس پاس کے جزیروں میں بستے ہیں۔

اب ہمیں یہ ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں کہ بھارت اور انڈونیشیا کے آپسی تعلقات کس زمانے سے شروع ہوئے۔ رامائن میں "جاوا دیوپا" کی سات ریاستوں کا ذکر ملتا ہے۔ سگریو نے سیتا جی کو ڈھونڈنے کے لئے جہاں جہاں بانروں کو بھیجا تھا ان میں سے ایک جگہ "جاوا دیوپا" بھی تھی۔ انڈونیشیا کی تاریخ کے بارے میں سب سے قدیم منتشر معلومات چینی سنسکرت اور پالی کتابوں میں ملتی ہیں۔ مشہور جغرافیہ نویس اسکندریہ کا یونانی، ٹالمی نامی لکھتا ہے کہ پہلی صدی عیسوی سے چھٹی صدی عیسوی تک بہت بڑی تعداد میں بھارتی انڈونیشیا گئے ہیں۔ ان کی وجہ سے وہاں پہلے شیومت اور اس کے بعد بدھ مت پھیلا تھا۔ سب سے پہلے یہاں گناورمن نامی بدھ مت کے ایک پیرو نے بدھ مت پھیلایا اور اس نے یہاں کے بہت چھوٹے بڑے راجاؤں کو اس مت میں ملا لیا تھا ان بھارتیوں کی وجہ سے انڈونیشیا کی تہذیب پر بھارت کی تہذیب کا ان مٹ اثر پڑا ہے۔ اس کے ثبوتوں میں ایک پکا ثبوت یہ ہے کہ جاوا کے علاقے میں بہت سے کتبے ملے ہیں۔ جس رسم خط میں یہ کتبے لکھے گئے ہیں وہ پانچویں صدی عیسوی کے لگ بھگ جنوبی بھارت میں رائج تھا۔ ان کتبوں کی زبان سنسکرت ہے۔ بورنیو میں بھی ایسے ہی ریکارڈ ملے ہیں۔ جو اور بھی ایک سو سال پہلے کے ہیں۔ یہ سب ریکارڈ برہمن مت کے ہیں۔ آٹھویں صدی عیسوی تک سنسکرت ہی ان کتبوں کی زبان رہی۔ اس کے بعد پرانی جاوی زبان نے اس کی جگہ لے لی۔ پرانی جاوی زبان سنسکرت اور پالینیسی زبانوں کی کھچڑی ہے چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں وسطی جاوا میں کلنگا نام کے ایک حکمران خاندان کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ تاریخ کے بعض مبصروں کا خیال ہے کہ یہ خاندان بھارت کے مشرقی علاقے کلنگا سے آیا تھا۔ اس کے بعد ہی ایک

اور حکمران خاندان نے اس خاندان کی جگہ لے لی - اور یہ خاندان شیومت کا ماننے والا تھا -

آٹھویں صدی عیسوی کے لگ بھگ وسطی جاوا کی سیاست میں زبردست انقلاب آیا اور یہ علاقہ سلندرا راجاؤں کے ہاتھوں میں آ گیا - اس خاندان کے راجہ مہایانہ بدھ مت کے ماننے والے تھے - ان کی راجدھانی سری وجایا (سماترا میں تھی - اب یہی مقام پے لم بنگ کہلاتا ہے - بوروبدور کا مشہور باتھی مندر اور کئی اور مندر اسی گھرانے کے راجاؤں کے دور حکومت میں وسطی جاوا سے ملتے ہیں - اسی گھرانے کے ایک راجہ کے کہنے پر بھارت کی مشہور نلندا یونیورسٹی میں ایک مہا وہار بنایا گیا تھا اور دیوا پالا راجہ نے اس کے لئے کئی گاؤں بخشے تھے دسویں صدی میں اسی گھرانے کے ایک راجہ نے مدراس کے قریب ناگاپٹم میں ایک مندر بنوایا تھا - اس کے بعد شیومت کے ماننے والے راجاؤں کو پھر عروج حاصل ہوا - اور انہوں نے وسطی جاوا میں ہندو ریاست قائم کر لی جو متارام ریاست کہلائی - اس طرح دسویں صدی عیسوی سے لے کر سولہویں صدی تک چھوٹے بڑے کئی ہندو خاندان انڈونیشیا کے علاقوں پر حکومت کرتے رہے - اس کے بعد پورے ملک میں اسلام پھیل گیا اور یہ ریاستیں ختم ہو گئیں اکیلا ایک بالی کا جزیرہ اس سے بچ گیا اور آج تک بھی اس ٹاپو میں ہندو ہی بستے ہیں -

انڈونیشیا میں اسلام پہلی صدی ہجری میں پھیلنا شروع ہوا کیونکہ عرب دوسری صدی قبل مسیح سے بھی پہلے سے لنکا سے بیوپار کیا کرتے تھے ساتویں صدی عیسوی میں انہوں نے چین سے بھی ایسا ہی ناتا جوڑ لیا لیکن ۱۱۱۱ء کے بعد سے انڈونیشیا میں اسلام بڑی تیزی کے ساتھ پھیلنے لگا - سب سے پہلے عبداللہ عارف نامی ایک بزرگ کی کوششوں سے شمالی جاوا کے لوگوں نے اسلام قبول کیا - اس کے بعد عبداللہ عارف کے مریدوں نے یہ کوشش جاری رکھی - پندرھویں صدی میں متانگ کباد کی پوری ریاست مسلمان ہو گئی - تاریخ کے بعض ماہروں کا خیال ہے کہ انڈونیشیا میں اسلام بھی بھارت ہی سے گیا ہے اور بھارتی مسلمانوں نے ہی انڈونیشیا میں اسلام پھیلایا ہے - ابن بطوطہ کے سفرنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ سماترا کے مسلمان سلطان اور دہلی کے سلطان کے آپسی تعلقات بہت اچھے تھے لیکن اس سے بھی پہلے جنوبی ہند کے بہت سے تاجر انڈونیشیا پہنچ چکے تھے جنوبی ہند کے ساحلوں پر شافعی مسلمان بہت ہیں اس کے علاوہ انڈونیشیا کے مسلمان بہت سی ایسی ریتوں اور رسموں کو مانتے ہیں جو عرب یا ایران یا کہیں اور نہیں ہوتیں اکیلے بھارتی مسلمانوں ہی میں ملتی ہیں -

انڈونیشیا میں قدیم زمانے کے آثار خاص طور پر وسطی جاوا اور شمالی جاوا میں ملتے ہیں - وسطی جاوا میں جو عمارتیں ملتی ہیں وہ شیومت اور بدھ مت سے تعلق رکھتی ہیں - یوں تو یہ عمارتیں اپنی طرز تعمیر اور اپنی اٹھان کے لحاظ سے بالکل بھارتی ہیں - لیکن ان پر اس ملک کی تعمیر کاری کا بھی اثر پایا جاتا ہے یہ عمارتیں "چنڈی" کہلاتی ہیں - اس لفظ کا ٹھیک ٹھیک ترجمہ تو معلوم نہیں لیکن ہند کی دیوی چنڈی سے اس کا کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے - بھارت میں ہم مندروں سے جو کام لیتے ہیں یہاں کے بہت سے مندروں سے ٹھیک ٹھیک یہی کام نہیں لیا جاتا کیونکہ ان میں سے اکثر مندر پچھلے راجاؤں کی سمادھیوں پر بنائے گئے ہیں - سلندرا خاندان کے راجہ مہایانا بدھ مت کے ماننے والے تھے اور وسطی جاوا میں جتنی عمارتیں ملی ہیں وہ سب کی سب ان ہی کے زمانے میں بنی ہیں - ان میں سب سے مشہور بوروبدور کا بودھی استوپا ہے جو جوگجکارتا سے کوئی ۲۲ میل دور ہے - اب یہ پتہ نہیں کہ یہ مندر کس نے بنایا تھا پر اتنا یقینی ہے کہ یہ مندر کوئی نویں صدی عیسوی میں بنا ہے - یہ مندر بہت بڑے نقشے پر بنایا گیا ہے اور تقریباً تین میل لمبا چوڑا ہے - اس مندر کے اندر مہاتما گوتم بدھ کے پچھلے جنموں اور آنے والے جنم کی کہانیاں کھدی ہوئی مورتیوں میں دکھائی گئی ہیں - یہ سب کہانیاں جاتکا مالا سے لی گئی ہیں - اس مندر میں انسان کی غم و آلام سے جنگ اور آخر میں اس پر فتح پاکر نروان بڑے پیارے ڈھنگ سے دکھایا گیا ہے - اس مندر کے سوا اس کے پڑوس میں دو اور مندر ہیں جو اسی زمانے میں بنے ہیں - ایک مندر کا نام چنڈی منڈٹ اور دوسرے کا چنڈی پاون ہے - چنڈی منڈٹ کے بیچ میں مہاتما گوتم بدھ کی ایک بڑی سندر مورتی بنی ہوئی ہے - اس مندر میں بھی کھدی ہوئی مورتیوں سے جاتکاؤں کی کہانیاں اور پنچ تنتر کے قصے دکھائے گئے ہیں - ہندو مندروں میں سب سے بڑا مندر "چنڈی اور اجونگا رانگ" یا سندر دیوی کا مندر ہے - یہ مندر سلندرا راجاؤں کے بعد کے شیومت کے ماننے والے راجاؤں نے بوروبدور کے مندر کے جواب میں بنایا ہے - یہ مندر دسویں صدی عیسوی کے پہلے برسوں میں بنا ہے - بیچ میں ایک بہت بڑا مندر

ہے جو شیو جی کا ہے ۔ اس کے چاروں طرف ۲۲۴ چھوٹے چھوٹے مندر تھے لیکن ان میں سے اکثر ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں ۔ شیو کا مندر بیچ میں ہے اور برہما اور وشنو کے مندر اس کے سیدھے بائیں بنائے گئے ہیں ۔ شیو جی کے مندر میں شیو کی مورتیوں کے علاوہ گنیش، اگاستیا اور مہیشاسورا مردنی کی مورتیاں بھی ہیں ۔ مہیشاسورا مردنی کی آٹھ ہاتھوں والی مورتی بہت سندر ہے ۔ اور اسی مورتی سے اس مندر کا نام سندر دیوی کا مندر پڑ گیا ہے ۔ ان مندروں کے اندر مورتیوں کے ذریعے رام چندر جی اور شری کرشن جی کی جیون کتھا دکھائی گئی ہے ۔

اب تک جتنے مندر انڈونیشیا میں بنے تھے ان پر جنوبی ہند کی طرز تعمیر کا بڑا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے ۔ لیکن اس کے بعد جو مندر بنے ہیں ان پر آہستہ آہستہ جاوی طرز تعمیر کا اثر بڑھتا گیا ۔ اس زمانے سے لے کر انڈونیشیا میں پوری طرح اسلام پھیلنے تک دس بارہ چنڈیاں ملتی ہیں ۔ ان میں بھی رامائن اور مہابھارت کی کہانیاں مورتیوں کے ذریعے سے دکھائی گئی ہیں ۔ لیکن ان کی طرز پچھلے مندروں کی طرز سے اتنی الگ ہے کہ جاوی اثر کی صاف صاف غمازی ہوتی ہے ۔ تیرھویں صدی عیسوی میں بدھ مت اور شیو مت کو ملا کر جاوا میں ایک نیا مت بنایا گیا ۔ چنڈی جاگو کے مندر اسی مت کے ہیں ۔ اور ان میں گوتم بدھ اور شیو جی کو جاوی طرز میں ساتھ ساتھ دکھایا گیا ہے ۔

ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ جہاں اب انڈونیشیا کے سب ہی جزیروں میں زیادہ تر مسلمان ہی بستے ہیں وہاں یہ بھی بتایا ہے کہ اب بھی بالی اور آس پاس کے جزیروں میں زیادہ تر ہندو ہی بستے ہیں ۔ اس جزیرے کی پچھلی تاریخ ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں ۔ لیکن اتنا کہا جا سکتا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں بھارتی یہاں آ کر بس گئے تھے ۔ نویں صدی عیسوی سے ان جزیروں کی ٹھیک ٹھیک تاریخ معلوم ہوتی ہے ۔ بالی پہلے جاوا کی حکومت میں رہا ۔ پھر ماجاپہٹ راجاؤں نے اسے اپنایا اور جب سولھویں صدی عیسوی میں ان کی ریاست ختم ہو گئی اور جاوا میں اسلام پھیل گیا تو یہ جزیرہ پھر جاوا سے الگ ہو گیا ۔ اور یہاں کے لوگ ہندو ہی رہے ۔ اب بالی ملی جلی بھارتی جاوی تہذیب کا بڑا دلکش نمونہ پیش کرتا ہے اور اسلام پھیلنے سے پہلے اس ملک کی تہذیب کی بڑی اچھی تصویر ہے ۔ جیسے قدیم ہند میں سماج کی نیو ذات پات پر رکھی گئی تھی ۔ ویسے ہی بالی کے لوگوں میں براہمن، کھتری، ویش اور شودر چار ذاتیں مانی جاتی ہیں ۔ بالی کے ہندو چاروں ویدوں کو مانتے ہیں ۔ ان کے بڑے بڑے دیوتا برہما، وشنو اور شیو ہیں ۔ لیکن ان کے ساتھ اور بہت سے چھوٹے دیوتا اور دیویاں بھی مانی جاتی ہیں جیسے سوریہ، یم، اندر، گنیش، درگا، سرسوتی وغیرہ ۔ جیسے بھارت میں روزمرہ کی باتوں میں سمرتیاں مانی جاتی ہیں ویسے ہی بالی کے لوگ اٹھارہ "ساسناؤں" کو مانتے ہیں ۔ اپنشد بھی لوگ جانتے ہیں پر ہر کوئی نہیں ۔ کرم اور آواگون ان کا دھرم ہے ۔ رامائن اور مہابھارت بالی کا بچہ بچہ جانتا ہے اور بالی کے ناٹک اور بالی کی مصوری ان ہی عظیم الشان کتابوں کے گرد گھومتی ہے ۔ بھارت کی طرح بالی کے دیہات میں لوگ جھونپڑیوں میں رہتے ہیں اور اس کے چاروں طرف مٹی یا اینٹ کی دیوار اٹھا دی جاتی ہے ۔ لیکن یہاں ایک اور نئی بات دکھائی دیتی ہے ۔ ہر گھرانے میں باہر کی دیوار کے پاس چھوٹے چھوٹے مندر ہوتے ہیں ۔ یہ مندر اس گھرانے کے پچھلے بڑے لوگوں کے نام پر بنائے جاتے ہیں ۔ اور ان میں ہر وقت ان کی آتماؤں کے لئے چڑھاوے رکھے ہوتے ہیں ۔ گاؤں کا سب سے بڑا مرکز مندر ہوتا ہے اس میں تین بڑے بڑے ہال ہوتے ہیں ۔ یہاں پوجا پاٹ ہی نہیں ہوتی بلکہ یہ گاؤں کا پنچایت گھر بھی ہوتا ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں کھیل تماشے بھی کئے جاتے ہیں ۔ گاؤں کے متعلق تمام سیاسی اور سماجی باتوں پر یہیں بیٹھ کر سوچ بچار کیا جاتا ہے ۔

ان سب باتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بھارت کی زبان، بھارت کے ادب، بھارت کی تعمیر کاری، بھارت کے دھرموں اور سماجی باتوں نے ان دور دیشوں پر کیسا گہرا اثر ڈالا ہے ۔ یہ اثر اتنا گہرا ہے کہ اتنا زمانہ گزرنے پر بھی صاف دکھائی دیتا ہے ۔ ایک وہ بھی وقت تھا کہ بھارت کے شمال جنوب اور مشرق و مغرب سے بھارتی ان دیشوں میں جاتے اور اپنی تہذیب سے وہاں کے تہذیبی چراغ جلاتے تھے اور اکثر تو انہیں کے ہو رہتے اور لوٹ کر نہ آتے ۔ اسی لئے تو بھارت میں کبھی یہ کہاوت مشہور تھی کہ جو کوئی "سورنا دیپ" جاتا ہے وہ لوٹ کر نہیں آتا اور لوٹ کر آ بھی جاتا ہے تو اتنا سونا چاندی ساتھ لے کر آتا ہے کہ اس پر اس کی پیڑھیوں کی پیڑھیاں پل جاتی ہیں ۔

مصوری کی بین الاقوامی نمائش

بائیں طرف – اوپر :- ایک لیڈی - سیرز مونٹی (اٹلی) آئل
وسط :- سارہ ایلیٹ - پروڈنس ہیورڈ (کینیڈا) آئل
نیچے :- ماں اور لڑکی - یاسوکنی یوشی (یو. ایس. اے) آئل

آخری شمع - ونیسیلیو گارسن (فلپائن) آئل
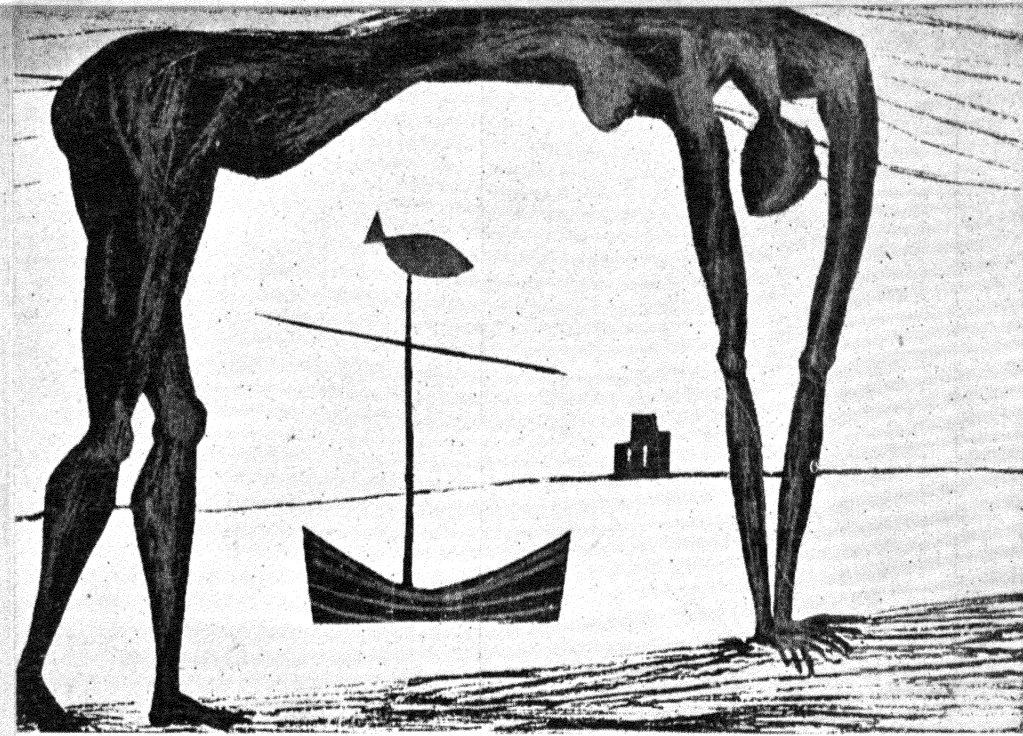
پار اُترنے کا گھاٹ - ڈبلیو ایلنپیس روڑدم (نیدرلینڈ) رنگین لتھو گرافی
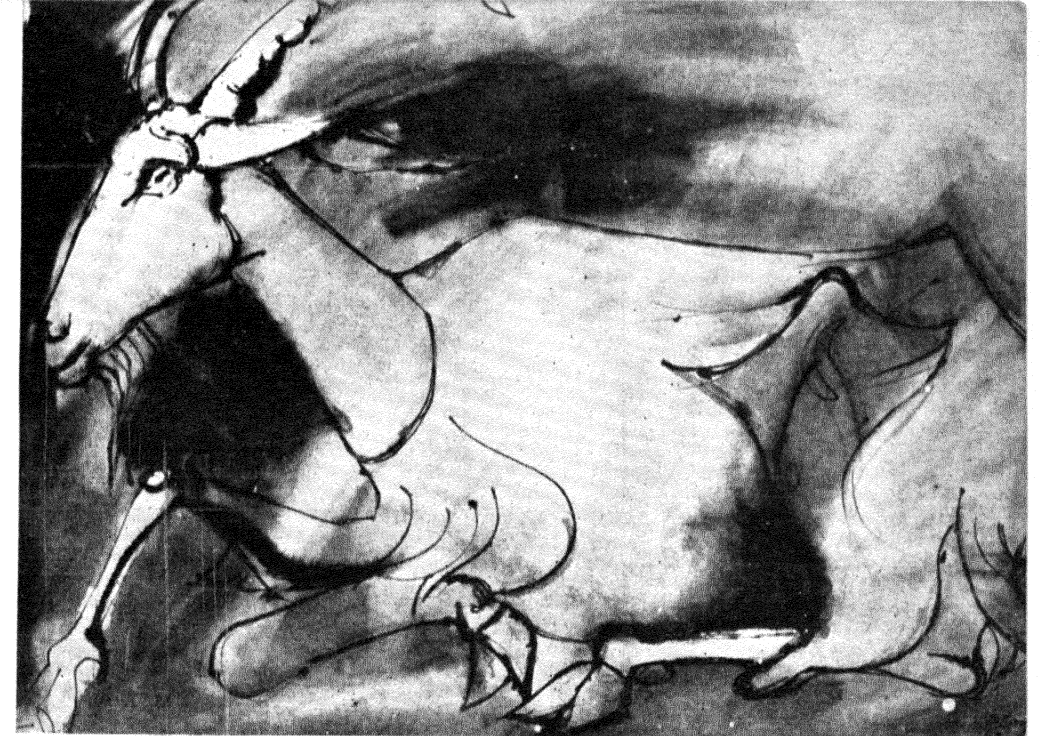
بکری - ایڈونرڈ پگنن (فرانس) انڈین انک

وسط میں ء اوپر :- میرا آرٹ ٹیچر -
ہزمیجسٹی شاہ
عراق - آئل
نیچے :- جنگلی دیوتا -
پابلو پکاسو (فرانس)

مون سون - مانگ کھن (برما) واٹر کلر

مچھلیاں - ہنس رابرٹ پپل (آسٹریا) پیسٹل
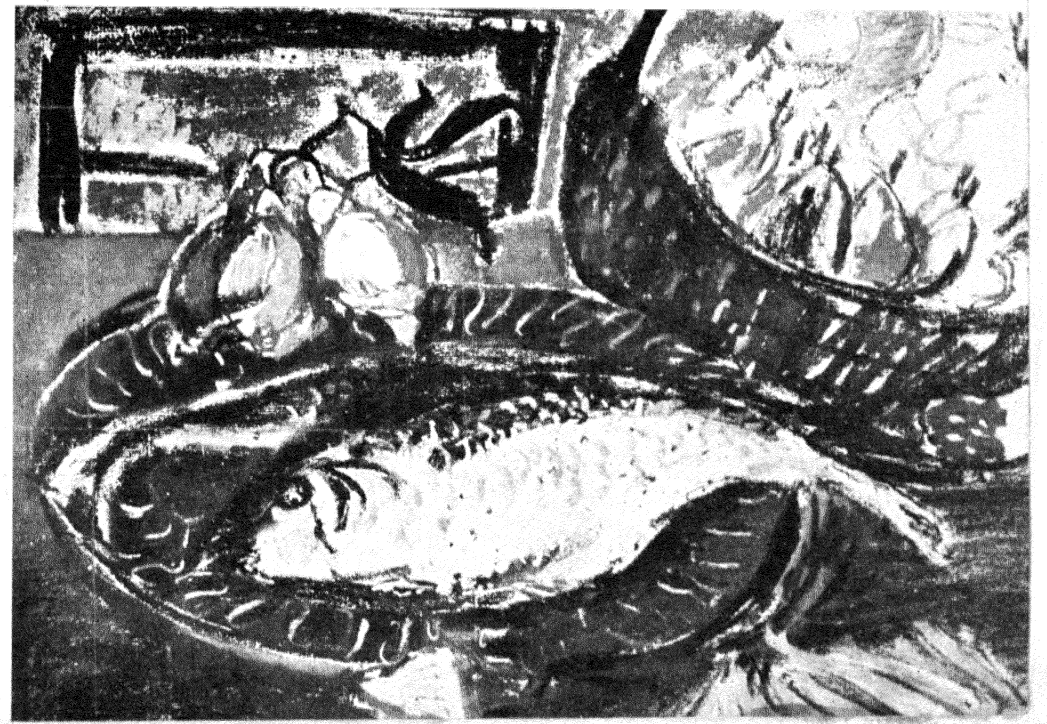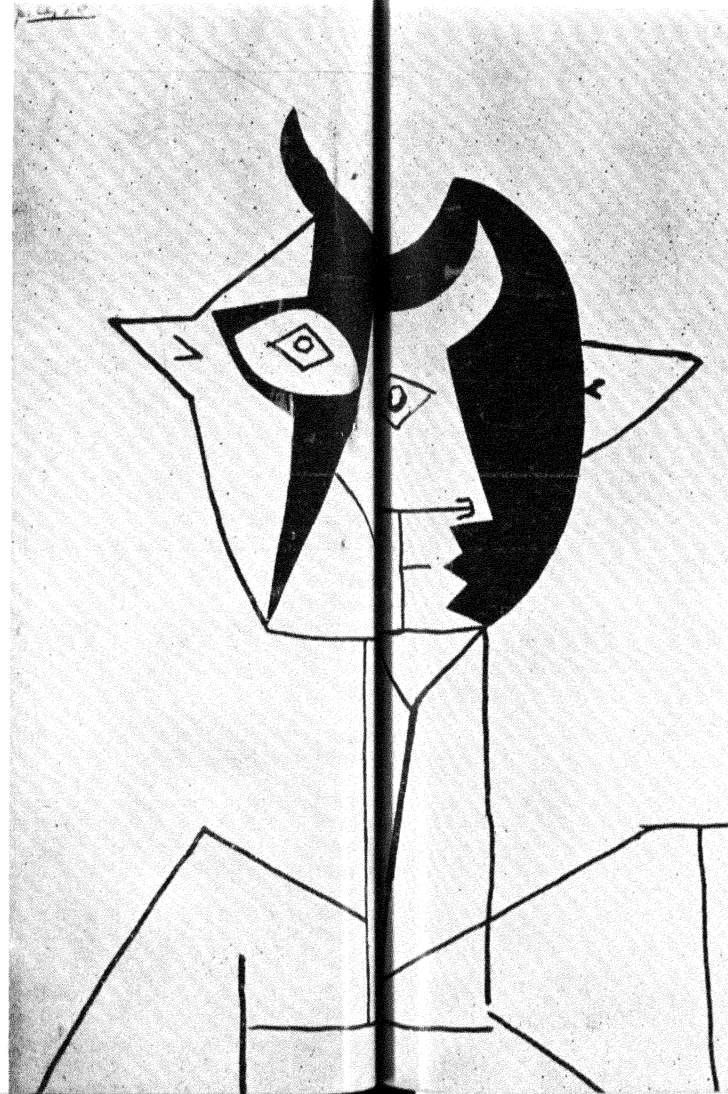
۳

۲

۱

۱. مقدونیہ کی کسان عورت — میہا میلز (یوگوسلاویہ) تانبے میں کھدائی کا کام
۲. کنواری — کانسٹینس اسٹوکس (آسٹریلیا) آئل
۳. مجلس طرب — زاویہ (ایران) واٹر کلر
۴. استراحت — انا کولیزو (فن لینڈ) لکڑی میں کھدائی کا کام
۵. بلیوں کی لڑائی — سبنیلوواھرن (سویڈن) سلک کے کپڑے پر نقاشی

ذکی انور

نیسگڑی

سوما منڈا نے پانچویں بار تیر کے پھل کو انگیٹھی سے نکال کر زہر کے برتن میں ڈال دیا۔ چھپاک کی آواز آئی اور نارنجی رنگ کا دھواں فضا میں پھیل گیا۔ اس طرح اُسے دو بار مزید تیر کے پھل کو زہر میں بجھانا تھا۔ پھر جب تیر کا وہ پھل محض ایک آدھ اِنچ بھی کسی آدمی یا جانور کے بدن میں گھپ جائے گا تو آناً فاناً اُس آدمی یا جانور کے بدن میں زہر پھیل جائے گا۔

سوما منڈا نے یوں مُنہ بنایا جیسے اُس کے بدن میں زہر پھیل رہا ہو — بہرحال کسی کی جان لینا بہت بُرا کام ہے۔ اُس نے سوچا اور انگیٹھی کے پاس سے اُٹھ گیا۔ پاس ہی کونے میں ایک مٹّی کے برتن میں گھر کی بنی ہوئی چاول کی شراب "ہنڈیا" چھن چھنا رہی تھی۔ ہنڈیا کے برتن کے پاس ہی مٹّی کا ایک کلہڑ دھرا تھا۔ اُس نے برتن سے ایک کلہڑ ہنڈیا ڈھالی اور غٹاغٹ پی گیا۔ اُس کے سارے بدن میں جیسے آگ کی بجی ہوئی گرم گرم چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ اُسے ایسا لگا جیسے سچ مچ اُس کے بدن میں زہر ہی پھیل رہا ہو۔ اور اُس وقت اُس نے اور بھی شدّت سے سوچا کہ کسی کی جان لینا اچھّا کام نہیں۔ ایک لمحے کے لئے اُس کے دل میں یہ بات آئی کہ وہ تیر کے پھل کو گھر سے باہر جا کر تالاب میں پھینک دے اور آئندہ کسی کی بھی جان نہ لینے کی قسم کھالے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ تقریباً غیر ارادی طور پر وہاں سے اُٹھا اور انگیٹھی کے پاس آکر بیٹھ گیا

ابھی تیر کے پھل کو کافی دیر تک زہر کے برتن میں رہنا تھا۔

سوما منڈا نے سوچا، وہ بزدل ہو گیا ہے۔ اُس کا تعلق جنگلی قوم سے ہے اور جنگل میں رہنے بسنے والی قوم کا کوئی فرد کسی کی جان نہ لینے کی قسم کھالے تو اُس کا مطلب یہ تھا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں اپنا گلا دبا لے گا۔ اُسے یا تو بھوکوں مرجانا پڑے گا یا پھر آسام چلا جانا پڑے گا اور چائے کے باغ میں کام کرتے کرتے ملیریا کا شکار ہو کر مرجانا پڑے گا۔ اُن کے زندہ رہنے کی اور کیا صورت ہو سکتی تھی؟ وہ جنگلی جانوروں کا شکار کر کے ہی تو زندہ رہ سکتے تھے۔ شہر میں کوئی کام نہیں ملتا تھا۔ کام تھا تو بس آسام کے چائے کے باغوں میں۔ مگر وہاں کام کے ساتھ ساتھ ملیریا کے مچھر بھی تھے اور ملیریا کے مچھّروں کے ساتھ ساتھ موت بھی تھی۔ پھر بھی چھوٹا ناگپور کے جنگلوں کے کتنے ہی جنگلی وہاں ہر سال مرنے چلے جاتے تھے۔

آسام کے چائے کے باغ کی یاد آتے ہی سوما منڈا کا جوان اور صحت مند چہرہ یک لخت مُرجھا گیا۔ اُس نے سر جھکا لیا۔

آنگن میں اُس کی نئی نویلی دُلھن نیسگڑی چولھے کے پاس بیٹھی کچھ پکا رہی تھی۔

سوما منڈا نے سر اُٹھایا اور نیسگڑی کی طرف اک نظر دیکھا اور پھر اُس نے گردن جھکا لی۔ وہ نیسگڑی کے بارے میں سوچنے لگا۔

نیسگڑی اُس وقت کم سے کم جنگلی جیسی نہیں نظر آرہی تھی۔ نہ تو اُس کے بالوں میں کوڑیاں پروئی ہوئی تھیں۔ نہ اُس کے ماتھے پر تاڑ کے پتّے کی خوب صورتی سے تراشا ہُوا اور سُرخ رنگا ہُوا لمبا چوڑا بھدّا سا ٹیکہ تھا۔ نہ اُس کے کانوں میں اُنگلی سے زیادہ موٹی لکڑی کی کیل گھسی ہوئی تھی! اور نہ ہی وہ کمر سے اُوپر ننگی تھی۔

پرسوں ہی نیسگڑی آسام سے واپس آئی تھی۔ وہ دو برس سے آسام میں تھی۔ اور اب اُس میں جنگلی قوم کی عورت ہونے کے نشانات موجود نہیں تھے۔ اُس کے بال سلیقے سے سنورے ہوئے تھے۔ اُس کے ماتھے پر سیلولائیڈ کا چھوٹا سا سیاہ ٹیکہ تھا۔ اُس کے کانوں میں ہلکے پھلکے خوب صورت آویزے لٹک رہے تھے اور اُس نے خوب صورت پھول دار کپڑے کا بلاؤز پہن رکھا تھا اُوپر سے اُس نے بنگالی وضع سے سفید ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔

بچپن سے نیسگڑی کے آسام کے لئے روانہ ہونے کے ایک منٹ پہلے تک سوما منڈا اُسے پیار کرتا رہا تھا۔ دونوں کے گھر آس پاس تھے۔ اُن دنوں

سوما منڈا کے ماں باپ زندہ تھے اور وُہ فیصلہ کر چکے تھے کہ اگر نیسگڑی کا باپ نیسگڑی کے عوض کچھ زیادہ غلّہ یا تیر نہیں مانگے گا تو وہ اُسے سوما منڈا کے لئے مانگ لیں گے۔ سوما منڈا اور نیسگڑی دونوں ہی اس بات سے بہت خوش ہوئے تھے۔ اور تب سے سوما منڈا نے کئی بار نیسگڑی کے گھر شکار کے جانور بھیجے تھے۔

پھر سوما منڈا کے ماں باپ جنگل سے اکھٹّا غائب ہو گئے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ انھیں آدم خور بگھا کھا گیا ہوگا یا ہنڈار جنگل سے اُٹھا لے گیا ہوگا۔ سوما منڈا کے ماں باپ جنگل سے غائب ہونے کے بعد نیسگڑی ہی گھڑی بھر کے لئے سوما منڈا کے گھر آ کر اُس کا کھانا پکا دیا کرتی۔ لیکن عموماً ایسا ہوتا کہ سوما منڈا اُسے چولھے کے پاس سے ہٹا کر تالاب کے کنارے لے جاتا اور دونوں وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہتے اور سوما منڈا بھوکا رہ جاتا۔

نیسگڑی کو یہ بات بہت بُری لگتی کہ محض اُسی کی وجہ سے سوما منڈا بھوکا رہ جاتا ہے۔ اگر وہ اُس کے ہاں کھانا پکانے کو آنا چھوڑ دے تو اچھا ہوگا اور تب سے وہ سوما منڈا کا کھانا بھی اپنے ہی گھر پکانے لگی۔ کبھی وہ کھانا لے کر آ جاتی اور اُسے کھلا کر برتن لے کر چلی جاتی اور کبھی اُسے اپنے ہی گھر بلا کر کھلا دیتی۔ اس کے عوض سوما منڈا صرف چاول اور دال نیسگڑی کے گھر بھجوا دیا کرتا۔

سوما منڈا کے ماں باپ کے غائب ہو جانے کے بعد نیسگڑی کے ماں باپ نے سوچا کہ نیسگڑی کا بیاہ سوما منڈا سے کر دیا جائے تو اچھا رہے گا۔ اس قدر گھاٹا تو ضرور ہوگا کہ نیسگڑی کے عوض انھیں چاول کا ایک دانہ یا ایک خرگوش تک کا شکار نہیں ملے گا۔ لیکن سوما منڈا بیر تھا۔ اُس نے نو شیر مار ڈالے تھے اور نو شیر مار ڈالنے والا آدمی "بیر" کہلاتا تھا۔

بیر سوما منڈا انھیں پسند تھا۔

ایک دن انھوں نے سوما منڈا کو بلا کر اس بارے میں پوچھا تو جواب میں بیر سوما منڈا نے کمر سے چھُری نکال کر جھٹک سے اپنی ذرا سی اُنگلی کاٹ ڈالی اور اپنا خون اُس نے نیسگڑی کے ماتھے پر مل دیا۔ یعنی وہ اس سے بہت محبّت کرتا تھا۔

اور ایک دن جب ابھی اُن کا بیاہ ہو بھی نہیں پایا تھا کہ آسام کے چائے کے باغ کا کوئی افسر جنگل کے بیچوں بیچ اُس بستی میں پہنچا جہاں سوما منڈا اور نیسگڑی رہتے تھے۔

....

اس سے آگے سوچتے ہُوئے سوما منڈا کو ایسا لگا جیسے اُس نے برتن کی ساری ہنڈیا اپنے حلق میں انڈیل لی ہو۔ اُس کا سارا بدن بڑے اذیت ناک انداز میں سن سنانے لگا اور جلد ہی اُس کے تحت الشعور میں نیسگڑی کے لئے بڑی شدید نفرت جاگ اُٹھی۔ جس کے لئے وہ ہرگز طیّار نہیں تھا۔ وہ تلملا سا گیا۔ اُس کی آنکھوں کے اندر ایسا لگنے لگا۔ جیسے کوئی گرم سی چیز رکھی ہو۔ اُس کا بدن بھی ذرا سا کانپ اُٹھا۔ اُس نے ایک نظر پھر نیسگڑی کی طرف دیکھا۔ اُس وقت نیسگڑی اُسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دونوں کی نظریں ٹکرا گئیں۔ اور اس ٹکر سے کم سے کم سوما منڈا کو ایسا ضرور جان پڑا کہ تمام آگ ہی آگ پھیل گئی ہو نیسگڑی مسکرا دی اور سوما منڈا نے جلدی سے جھپٹا تھام لیا۔ پھر اُس نے بجلی کی سی سُرعت سے چھپٹے سے تیر کا پھل پکڑ لیا اور اُسے دہکتی ہوئی آگ میں ڈال دیا۔ زہر کے کچھ قطرے آگ پر گرے اور چھنا کے سے آواز ہوئی اور نارنجی رنگ کا دُھواں فضا میں پھیل گیا۔ لیکن اب کے دُھواں کچھ زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرا۔ لیکن سوما منڈا کو ایسا لگ رہا تھا جیسے نارنجی رنگ کا نہیں بلکہ سیاہ گہرا دُھواں ساری فضا میں پھیلتا جا رہا تھا۔

سوما منڈا نہیں چاہتا تھا کہ چائے کے باغ کے افسر یا نیسگڑی کے بارے میں کچھ اور سوچے۔ لیکن باتیں تھیں کہ اُس کے دماغ میں گھُسی پڑتی تھیں۔ اُسے ایسا لگتا تھا جیسے اُس کا دماغ خراب ہو جائے گا۔

وہ ٹخنوں پر سر ٹیک کے بیٹھ گیا۔

نیسگڑی آہستہ سے چولھے کے پاس سے اُٹھی اور اُس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ پھر اُس نے ہولے سے پوچھا۔

"سوما! کیا تو مجھ سے ہمیشہ رُوٹھا ہی رہے گا؟"

"ہاں ــ" سوما منڈا نے قطعی غیر ارادی طور پر کہا۔ اور یہ کہہ چکنے کے بعد اُسے ایسا لگا جیسے زہر کا برتن اُٹھا کر اُس نے سارا حلق میں انڈیل

لیا ہو۔ اُسے اپنے حلق میں شدید تلخی کا احساس ہوا اور یہ تلخی اُس وقت اور بڑھ گئی جب نیسگڑی نے کہا۔

" پھر تو نے مجھ سے بیاہ کیوں کر لیا۔ برادری کے لوگ مجھے مار ڈالتے تو یہی ٹھیک تھا۔ وہ راکھ بھی گرا دیتے تو میں خود مر جاتی۔"

"نیسگڑی ——" سوما منڈا بڑے زور سے چیخا اور اُٹھ کھڑا ہوا وُہ پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر تک ٹہلتے ٹہلتے وہ ہنڈیا کے برتن کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر تک وہ ہنڈیا کے برتن کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے جُھک کر برتن اُٹھا لیا اور برتن ہی میں مُنہ لگا کر غٹا غٹ پینے لگا۔

ہنڈیا پینے کے بعد وہ اُسی جگہ بیٹھ گیا۔ پھر اُس نے سنجیدگی سے سوچا۔

سچ مچ اُس نے نیسگڑی سے بیاہ کیوں کیا؟ اُسی وقت نیسگڑی نے پھر پوچھا۔

" برادری والوں نے تو تجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ تو مجھ سے بیاہ کر لے۔ اور تو بچپن کا تو ہٹیلا تھا۔ پھر تو نے مجھے ساتھ نہ رکھنے کی قسم کیوں توڑ دی ——؟ مگر سوما!" اُس کا لہجہ بہت پیار بھرا ہو گیا —— "مگر سوما! اب گزری باتوں کو بھول جا۔ میں تجھ سے اب بھی ویسی ہی محبت کرتی ہوں، تو مجھ پر یقین کر سوما!"

لیکن سوما منڈا نے اُس کی پیار بھری بات نہیں سُنی۔ ہاں اُس کا یہ سوال اُس کے دماغ میں اب تک ہلچل مچا رہا تھا کہ اُس نے نیسگڑی سے بیاہ کیوں کیا، جب کہ اُس نے اُسے کبھی ساتھ نہ رکھنے کی قسم کھائی ہوئی تھی۔

سوما منڈا نے سوچا کہ وہ نیسگڑی سے صاف صاف کہہ دے کہ اُس نے محض اس لئے اُس سے بیاہ کیا کہ اُس کی جان بچ جائے۔

نیسگڑی کا ماں باپ کی مرضی کے بغیر اور سوما منڈا کی نارضامندی اور بہت زیادہ روکنے کے باوجود، چائے کے باغ کے افسر کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر آسام چلی گئی تھی۔ وہ افسر لوبڑھا تھا۔ اور یہ بات خود سوما منڈا بھی اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ افسر اُسے اس لئے نہیں بلا رہا تھا کہ وہ جوان اور حسین تھی۔ بلکہ محض اس لئے کہ وہ تندرست اور قوی تھی۔ اور اُس کے خون کے کیڑوں میں ملیریا کے کیڑوں کو مار ڈالنے کی طاقت تھی۔ پھر بھی سوما منڈا یہ ہرگز پسند نہیں کرتا تھا کہ وہ کہیں باہر چلی جائے۔ لیکن جب اُس نے ایک نہ مانی اور اچھی تنخواہ، عیش و آرام، اچھے اچھے کپڑے، شہر کی سیر اور خوش گوار زندگی کا جادو جب اُس کے سر چڑھ کر بولنے لگا تو اُس نے اپنے انگوٹھے میں کالک لگا کر چائے کے باغ کے افسر کے کاغذ پر نشان لگا دیا تھا۔

اور تب سوما منڈا نے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا "میں تجھے اب کبھی ساتھ نہیں رکھ سکتا۔"

سوما منڈا بچپن کا ہٹیلا اور ضدی تھا۔ وہ جس کام کو کرنے کا ارادہ کر لیتا تھا اُسے کر کے ہی چھوڑتا تھا۔ چاہے اُس کے لئے اُسے کیسے ہی خطرناک اور دشوار گزار حالات کا کیوں نہ سامنا کرنا پڑے۔ وہ ان حالات سے گزر چکا تھا۔ اس لئے وہ گھبراتا نہیں تھا اور ہمت نہیں ہارتا تھا۔

لیکن نیسگڑی جب آسام سے واپس آئی تو اُس نے اس سے بیاہ کر لیا۔

یقیناً اُس نے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ سوما منڈا سوچنے لگا۔ لیکن وہاں تو بات ہی کچھ اور تھی۔

نیسگڑی کے گھر والوں نے اُسے ساتھ رکھنے سے قطعی طور پر انکار کر دیا تھا۔ اُس کے ماں باپ ایک بیٹی کی محبت کی خاطر دیوتاؤں کو ناخوش نہیں کر سکتے تھے۔ دیوتاؤں کو ناخوش کرنے کا صاف مطلب یہی تھا کہ سارا علاقہ کسی بلا میں پھنس جاتا اور یہ بات ہرگز اچھی نہیں تھی۔

دیوتاؤں کا ناخوش ہونا بھی ایک یقینی امر تھا۔ دیوتا اپنے علاقے میں کسی ایسی چیز کو برداشت نہیں کر سکتے تھے جو ناپاک ہو۔ اور نیسگڑی کے بارے میں خود اُس کے ماں باپ کا یقین تھا کہ دو برس تک کسی شہر میں اکیلی رہنے والی لڑکی پاک نہیں رہ سکتی!

چنانچہ یہیں تک حد نہیں تھی کہ اس کے ماں باپ اسے اپنے گھر میں رکھنے پر رضامند نہیں تھے۔ بلکہ مقدس برگد کے سائے میں نیگڑی کو پرائشچیت کا ناچ ناچنا پڑا تھا۔ پرائشچیت کے ناچ کا یہ دستور تھا کہ تین گھنٹوں تک مسلسل ناچ سکنے والے کے گناہ کا پرائشچیت ہو سکتا تھا۔ جو بیچ میں تھک کر بیٹھ جائے۔ گویا دیوتاؤں نے اس کا گناہ معاف کر دینے سے انکار کر دیا! اور تب اس آدمی کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ دھرتی ماں کسی گناہ گار کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔

نیگڑی گناہ گار ثابت ہو چکی تھی۔ محض آدھے گھنٹے تک ناچنے کے بعد وہ تھک کر چور چور ہو گئی تھی اور گر گئی تھی۔ گناہ گار نیگڑی کا بوجھ برداشت کرنے کے لئے نہ تو دھرتی ماں طیار تھی، اور نہ نیگڑی کے ماں باپ، نہ محلہ نہ علاقہ۔

لیکن ایسی گناہ گار لڑکیوں کے لئے کچھ رعایت ان کے قانون میں ضرور تھی۔ جن کا بیاہ ابھی نہیں ہوا ہو۔ انہیں بارہ گھنٹوں تک قتل نہیں کیا جاتا تھا۔ اور ان بارہ گھنٹوں کے اندر اگر ان سے کوئی بیاہ کرے تو ان کے گناہوں کا پرائشچیت ہو جاتا تھا۔

کوئی وجہ نہیں تھی کہ نیگڑی کے ساتھ بھی یہی رعایت نہیں برتی جاتی۔ مگر اس سے بیاہ کرنے کے لئے طیار ہی کون ہو سکتا تھا؟ پھر بھی سردار نے پکار پکار کر اعلان کر دیا کہ گیرومنڈا کی بیٹی، نیگڑی کو دیوتاؤں نے معاف نہیں کیا۔ اب وہ بارہ گھنٹوں کے بعد اسی برگد کے نیچے قتل کر دی جائے گی۔ اگر کوئی جوان اس سے بیاہ کرنے کے لئے طیار ہو تو وہ آگے بڑھے۔ اس وقت نہیں تو بارہ گھنٹوں کے اندر کسی بھی وقت وہ آکر نیگڑی سے بیاہ کر سکتا تھا۔ اور اس مدت کے لئے نیگڑی سردار کے گھر رہے گی۔

مجمع ختم ہو گیا۔ اور سردار نیگڑی کو لے کر اپنے گھر چلا گیا۔

اس مجمع میں سوما منڈا بھی موجود تھا۔ گھر واپس آکر چپ چاپ ایک کھاٹ پر پڑ گیا۔ اس وقت اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ آج سے دو سال پہلے کی دنیا میں ہو۔ جب وہ نیگڑی سے بے پناہ محبت کر رہا تھا۔ لیکن پھر تو وہ نیگڑی سے نفرت کرنے لگا تھا اور آج؟ — آج کے بارے میں وہ کچھ بھی فیصلہ نہیں کر سکا۔ وہ نیگڑی سے محبت کرتا ہے یا نفرت، یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آسکی۔ لیکن نیگڑی کے لئے اس کے دل میں کسی قسم کا جذبہ تو ضرور تھا۔ محبت، نفرت یا کچھ اور۔

وہ بڑی شدت سے اس بات کو سوچ رہا تھا کہ بارہ گھنٹوں کے بعد نیگڑی قتل کر دی جائے گی۔ اس نے اپنے آپ کو تسلی بھی دی کہ آخر نیگڑی کے قتل ہونے میں اس کا کیا قصور تھا؟ پھر بھی اسے ایسا لگتا رہا جیسے وہ ہی اپنے ہاتھوں سے نیگڑی کو قتل کر رہا ہو۔ اس دن پہلی بار اس نے سوچا تھا کہ کسی کی جان لینا اچھی بات نہیں۔ بلکہ اس نے تو یہاں تک سوچ لیا تھا کہ وہ دیوتا جو کسی کی جان لے کر خوش ہو۔ وہ دیوتا نہیں شیطان ہے۔ مگر اس نے اس بات کو اپنے دل میں کچھ زیادہ دیر تک ٹھہرنے نہیں دیا تھا۔ دیوتاؤں کی شان میں ایسی بات سوچ کر وہ بہت ڈر گیا تھا۔

سوما منڈا نے دن کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا اور نیگڑی کے قتل ہونے کی گھڑی نزدیک آتی جا رہی تھی۔ سوما منڈا کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ مگر وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ دو سال پیشتر وہ عہد کر چکا تھا کہ اب وہ نیگڑی کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا! اور سوما منڈا کم سے کم اپنا عہد ہرگز نہیں توڑ سکتا تھا

اپنے عہد توڑنے کی بات سوچ کر دوسرے دن انگیٹھی کے پاس بیٹھا ہوا سوما ایک بار پھر مضطرب ہو اٹھا۔ اس نے ایک نظر پاس بیٹھی ہوئی نیگڑی کو دیکھا۔ مگر وہ اس کی آنکھوں میں لرزتے ہوئے آنسو کو دیکھے بغیر ہی چمٹا لے کر انگیٹھی سے تبر کا پھل نکالنے لگا جسے اب چھٹی بار زہر میں بجھانا تھا۔

تبر کا پھل آگ ہی کی طرح لال ہو رہا تھا۔ سوما منڈا کو اس وقت تبر کے پھل کا وہ رنگ بہت ہی بھلا معلوم ہوا۔ اس نے دو تین بار ادھر ادھر سے گھما کر اسے دیکھا اور پھر زہر کے برتن میں چھوڑ دیا۔

پھر چھناک کی آواز ہوئی اور نارنجی رنگ کا دھواں فضا میں پھیلنے لگا۔

اس وقت نیگڑی نے آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"جب تو نے اپنی قسم توڑ کر مجھ سے بیاہ کیا ہے تو . . . ."

"نہیں نہیں نہیں — سوما منڈا پاگل کی طرح بکنے لگا — میں اپنی

قسم نہیں توڑ سکتا - میرا عہد نہیں ٹوٹ سکتا میں تیرے ساتھ نہیں رہ سکتا نہیں رہ سکتا - میں بزدل نہیں جو اپنی قسم توڑ دوں - علاقے کی ساری جوان اور خوب صورت لڑکیاں بھی چاہیں کہ میں اپنے کسی عہد یا قسم کو اُن کی جوانی اور سندرتا کے قدموں پر قربان کر دوں، تو یہ نہیں ہو سکتا - سوما منڈا بیر ہے - بیر ہی کیوں اب میں مہابیر ہوں میں نے اب تک اٹھارہ شیر مار ڈالے ہیں ...،،

"مہابیر سوما منڈا! نیگرڈی بڑے پیار سے بولی - کیا تیرے دل میں اتنی نرمی نہیں کہ تو مجھے معاف کر دے،،؟

"تھی — سوما منڈا گرج کر بولا - بہت کافی نرمی - اور تیرے لئے بہت کافی ہمدردی تھی - وہ سب کچھ میں نے تیری جان بچانے میں صرف کر دی - اب میرے پاس کچھ بھی نہیں، میرے پاس اب کچھ بھی نہیں —،،

"سوما! نیگرڈی ہنسی - کیا تجھے علاقے کا یہ قانون بھی معلوم ہے کہ کوئی شخص اپنی بیاہتا کو چھوڑ نہیں سکتا ...،،

اور ایسا کرنے والے کو قتل کر دیا جاتا ہے - سوما اس کی بات پوری کر کے زور سے ہنسا - تو بڑی چالاک ہو کر آئی ہے ؟ تو مجھے قانون سے ڈرانا چاہتی ہے - نیگرڈی قانون سے کوئی بزدل ہی ڈر سکتا ہے - بہادر قانون کو اپنا بھگوان سمجھتے ہیں - اور بھگوان کی مرضی پر مر مٹنا فخر کی بات سمجھتے ہیں!

کیا تو یہ ذلت برداشت کرے گا ؟ نیگرڈی نے پوچھا - کہ تجھے، مہابیر سوما منڈا کو سارے لوگ حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھیں کہ اس نے اپنی بیاہتا کو چھوڑ دیا ہے - اور پھر قتل کرنے سے پہلے تک لوگ تیرے منہ پر تھوکیں،،؟

نیگرڈی — سوما منڈا اور بھی پریشان ہو اٹھا -

اسے حقارت کی نظروں کا احساس بس کل ہی ہوا تھا - کل سے پہلے سے کبھی کسی کی حقارت بھری نظروں سے واسطہ نہیں پڑا تھا - اُسے کوئی حقیر سمجھتا ہی نہیں تھا - مہابیر سوما منڈا کو علاقے کے سارے جوان اور بوڑھے عزت اور محبت کی نظروں سے دیکھتے تھے -

لیکن کل جب اس نے نیگرڈی کے قتل کے لئے مقررہ شدہ وقت سے تھوڑی دو تین منٹ پیشتر مجمع کو چیرتے پھاڑتے اندر جا کر سردار کے سامنے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ نیگرڈی سے بیاہ کرنے کے لئے تیار ہے - تو مجمع کے لوگ نہ صرف حیران رہ گئے تھے - بلکہ اُن میں سے بہتوں نے یہ کانا پھوسی شروع کر دی تھی - سوما منڈا اس چڑیل کی خاطر اپنی قسم اور اپنا عہد توڑ رہا ہے - جب وہ اس کی مرضی کے خلاف آسام جانے لگی تھی - تو اس نے قسم کھائی تھی کہ اب وہ نیگرڈی کو کبھی ساتھ نہیں رکھ سکتا -

سوما منڈا نے گھوم گھوم کر مجمع کے سارے لوگوں کو دیکھا تھا تو وہ کانپ کر رہ گیا تھا - جن نظروں میں اس کے لئے محبت، عزت اور عقیدت ہوا کرتی تھی ان ہی نظروں سے نفرت اور حقارت کے شعلے نکل رہے تھے -

سوما منڈا نے اپنی گردن جھکا لی تھی - اور پیچھے سے کسی نے اُس کے اور نیگرڈی کے بال ملا کر باندھ دئے — بیاہ ہو گیا - اور سوما منڈا اپنی نئی نویلی دلھن کو گھر لے کر آ رہا تھا تو اس کے قدم یوں اُٹھ رہے تھے جیسے اس نے کوئی بڑا بھاری پاپ کیا ہو - اُسے نہ تو گردن پھیر کر اپنے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی نیگرڈی کو دیکھنے کی ہمت ہوتی تھی - نہ ہی راستے میں اس نے اپنے کسی من چلے ساتھی کے کسی فقرے کا جواب دیا تھا -

نیگرڈی کو اپنے گھر لا کر سوما منڈا نے اسے دالان میں چھوڑ دیا تھا اور خود ایک کوٹھڑی میں گھس کر اس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا تھا - اور آج دوسرے دن وہ کوٹھڑی سے باہر نکلا تھا تو اُسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی تھی نیگرڈی نے اپنے ساتھ کئے ہوئے برتاؤ کا جیسے کچھ بھی برا نہیں مانا تھا - اُس کے چہرے پر اُداسی تو ضرور تھی، مگر اُس اُداسی میں کچھ بھی گھبراہٹ یا اکتاہٹ نہیں تھی - بلکہ وہ بڑے اطمینان سے ہانڈی دھو رہی تھی -

لیکن سوما منڈا کے دل میں نیگرڈی کے لئے آج بھی نفرت ہی تھی - وہ اُس سے کچھ بھی نہیں بولا - چپ چاپ انگیٹھی کے پاس جا بیٹھا تھا اور آگ سلگانے لگا تھا - پھر وہ دو گھنٹوں سے تیر کا پھل زہر میں بجھا رہا تھا -

اُس نے پھر چمٹے سے پکڑ کر تیر کے پھل کو زہر کے برتن سے نکالا اور انگیٹھی میں ڈال دیا - مگر اب کے جو نارنجی رنگ کا دھواں اُٹھا تو سوما منڈا کو ایسا بالکل نہیں لگا کہ ساری فضا میں گہرا اور سیاہ دھواں پھیل رہا ہو -

اُس نے نیگرڈی کی طرف دیکھا - وہ گم سم بیٹھی، لکڑی کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے سے زمین پر ٹیڑھے میڑھے نشان بنا رہی تھی -

"سوما — اُس نے بڑے پیار سے کہا: کیا تو ایسا نہیں سمجھتا کہ اس

پتنی کی زندگی موت سے زیادہ بُری ہے جیسے پتی کا پیار نہ مل سکے۔"

سومامنڈا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نیگڑی پھر کہنے لگی۔

"اگر تو مجھ سے اُس بات کا بدلہ لینا چاہتا ہے کہ میں تیری مرضی کے بغیر چائے باغ کے افسر کے ساتھ چلی گئی تھی تو خیر تجھے اختیار ہے۔ میں کچھ نہیں بولوں گی۔ تو مجھ سے اچھی طرح بدلہ لے لے۔ تاکہ تیرا کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے لیکن اگر ایسی بات نہیں تو تو نے مجھے موت کے پنجے سے نکال کر ایسی زندگی کے حوالے کیوں کر دیا۔ جو زندگی موت سے کہیں زیادہ۔۔۔۔۔"

"نیگڑی ــــ" سوما نے اُس کی طرف بڑی بے بسی سے دیکھا۔

"سوما ــــ" نیگڑی کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے نکل کر اُس کے گالوں پر لڑھکتے ہوئے زمین پر گرنے لگے۔

"نیگڑی ــــ" سومامنڈا یوں رُک رُک کر کہنے لگا جیسے کوئی چیز اُس کے حلق میں پھنس رہی تھی ــــ "نیگڑی اُس آدمی کی زندگی کتے کی موت سے بھی بدتر ہے۔ جو آدمی اپنا عہد نہ نبھا سکے تو نہیں جانتی۔ کل جس وقت مجمع کے لوگ میرے بارے میں یہ کانا پھوسی کر رہے تھے کہ میں نے اپنی قسم توڑ دی، تو میری کیا حالت ہو گئی تھی۔ حالانکہ ابھی میں نے اپنی قسم نہیں توڑی ہے۔ میں نے تیری جان بچانے کے لئے تجھ سے بیاہ کر لیا ہے اور بس ــــ میں تیرے ساتھ رہ نہیں سکتا۔۔۔۔"

"سوما ــــ" نیگڑی یوں چیخی جیسے وہ کراہ رہی ہو ــــ "پھر تو نے میری جان بچا کر بھی کون سا بڑا کام کر لیا؟"

"نیگڑی" سومامنڈا بڑی سنجیدگی سے کہنے لگا "میں یہ سوچتا ہوں کہ کسی کی جان لینا بہت بُری بات ہے"

نیگڑی کی آنکھوں میں اب تک آنسو ڈبڈبائے ہوئے تھے۔ مگر وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ پھر بولی۔

"کتنی عجیب بات ہے! تو سوچتا ہے کہ کسی کی جان لینا بہت بُری بات ہے، اور تو تیر کے پھل کو زہر میں بُجھاتا جا رہا ہے۔ کس لئے، کیا اس سے تو کسی مرتے ہوئے کو بچانے کی ترکیب سوچے گا؟"

سومامنڈا چپ ہو گیا۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ زہر میں بجھے ہوئے تیر کے پھل کو انگیٹھی سے نکال کر لے جائے اور تالاب میں پھینک دے۔ مگر وہ ایسا نہیں کر سکا۔ البتہ اُس نے چمٹا اُٹھایا اور ساتویں بار تیر کے پھل کو انگیٹھی سے نکال کر زہر کے برتن میں ڈال دیا۔ پھر اُس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"ہم جنگلی لوگ کسی کی جان نہ لینے کا عہد کر کے اپنی جان کچھ زیادہ دنوں تک نہیں بچا سکتے نیگڑی!"

"تو نے شہر کے لوگوں کو نہیں دیکھا" نیگڑی ہنس پڑی "شہر کے لوگ ہم سے زیادہ وحشی ہیں"

ایسا معلوم پڑا کہ نیگڑی شہر کے بارے میں کچھ بتانے کے لئے تیار ہو گئی تھی۔ مگر سومامنڈا وہاں سے اُٹھ گیا۔ اُس نے پھر ایک کُلہڑ ہنڈیا ڈھال کر پی اور پھر کھاٹ پر پڑ رہا۔ نیگڑی بھی وہاں سے اُٹھی اور اُسی کھاٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔

"تو کس جھمیلے میں پڑ گیا ہے سوما" اُس نے کہا "گئی گزری باتوں کو ختم کر دے اور مجھے معاف کر دے، تاکہ ہم دونوں ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگیں"

بظاہر سومامنڈا خاموش رہا۔ مگر اُس نے اپنے دل میں کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

سومامنڈا کو کافی دیر تک خاموش دیکھ کر نیگڑی نے پھر پوچھا۔

"کیا سوچ رہا ہے سوما! کیا تو بچپن اور جوانی کے وہ دن بھول گیا۔ جب ہم ایک دوسرے کو نہ دیکھ کر بے کل ہو جاتے تھے؟"

"سب کچھ یاد ہے" سوما مسکرایا "اور وہ کسک بھی میرے دل میں اب تک باقی ہے جو تیرے جانے کے بعد پیدا ہو گئی تھی"

نیگڑی چپ ہو گئی۔ جلد ہی اُس کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔

سوما اُٹھا اور اُس نے زہر کے برتن میں ڈلے ہوئے تیر کے پھل کو چمٹے سے نکال کر ادھر اُدھر سے گھما کر دیکھا اور ایک گندے پانی کے برتن میں ڈال دیا اور پھر کھاٹ پر آ کر پڑ رہا۔ نیگڑی اب سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

سوما کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور وہ یک لخت تلملا کر اُٹھ بیٹھا۔

"تو مجھے بزدل بنا دے گی ــــ" وہ چیخا "میری آنکھوں نے آج تک آنسو کا مزا نہیں چکھا تھا۔ رونا ایک بہادر کے لئے کتنی بُری بات ہے"

وہ پاؤں پٹک پٹک کر ٹہلنے لگا۔

"تو ٹھیک کہتا ہے سوما" نیگڑی سسکیاں لے لے کر بولی "پتھر پگھل نہیں سکتا۔۔۔۔"

"اور اگر وہ پگھل جائے تو وہ پتھر نہیں موم ہے" سوما منڈا نے اُس کی بات کاٹ کر کہا "اور ایک پتھر کے لئے یہ گندی گالی ہے کہ کوئی اُسے موم کہے۔"

سوما منڈا پاگل کی طرح ہنسنے لگا۔

نیگڑی اُٹھی اور بھاری بھاری قدم اُٹھاتے ہوئے چولھے کے پاس گئی اور جا کر بیٹھ گئی، اور سوما منڈا بدستور کھاٹ پر پڑا رہا۔

نیگڑی نے کھانا پکا لیا۔ مگر اُس رات نہ تو سوما منڈا نے کچھ بھی کھایا نہ نیگڑی نے۔ سوما منڈا کھاٹ پر پڑا رہا، اور نیگڑی دروازے پر بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔

شام کے وقت بہت سے جنگلی جوان سوما منڈا کے گھر میں گھس آئے اور اُن میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کہا۔

"سوما! ہم تجھ سے یہ کہنے آئے ہیں کہ ہم تجھے اب اپنا سردار ماننے کے لئے تیار نہیں۔ تو نے ایک ایسی ویسی لڑکی کے لئے اپنی قسم توڑ دی۔ اپنا عہد توڑ ڈالا۔ تجھ سے اچھی امید کیا کی جا سکتی ہے! تو دغاباز ہے۔"

"یہ سب کچھ الزام ہے" سوما منڈا شیر کی طرح گرجا "میں نے اپنی قسم نہیں توڑی ہے۔ میرا عہد نہیں ٹوٹا ہے۔ سوما منڈا بہادر ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایک بہادر کے لئے یہ سب کچھ کتنا بھاری پاپ ہے۔"

"تو ہمیں باتوں سے نہیں بہلا سکتا" کوئی جوان ہنستے ہوئے آگے بڑھا۔ "تو نے نیگڑی سے بیاہ کیا ہے اور کہتا ہے کہ یہ سب کچھ الزام ہے۔"

"ہاں ہاں میں نے اُس سے صرف بیاہ کیا ہے" سوما منڈا پہلے ہی کی طرح گرجا۔ "میں نے اُس کے ساتھ نہ رہنے کی قسم کھائی ہے، اور میں اُس کے ساتھ نہیں رہوں گا۔"

سارے جوان ہنس پڑے۔

"تو ہمیں اتنا بے وقوف سمجھتا ہے!" کسی اور نے آگے بڑھ کر کہا۔ "تو نے اُس سے بیاہ کر لیا ہے اور تو اُس کے ساتھ نہیں رہے گا۔ ہم جانتے ہیں کہ تو اُس سے بچپن سے پیار کرتا ہے۔ ہم تیرے پیار کو تباہ کرنا نہیں چاہتے ہم تو صرف یہ کہنے آئے ہیں کہ تجھ پر سے ہمارا بھروسہ ختم ہو چکا ہے — تو ہنسی خوشی اپنا پیار ...."

"موڑا —" سوما منڈا چیخا — "موڑا مجھ پر رحم کر موڑا!"

سوما منڈا نے بڑی بے بسی سے سارے جوانوں کو دیکھا۔ اُس وقت اُسے یہ بات پھر یاد آگئی تھی کہ وہ بچپن سے نیگڑی سے پیار کرتا آیا تھا۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا، اور اُس کا دماغ سن سنانے لگا تھا۔

"سوما —" اُسی جوان نے آگے بڑھ کر سوما منڈا کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا — "پندرہ برس کی محبت محض دو برس کی نفرت سے مر نہیں سکتی سوما۔ تجھے نیگڑی سے محبت تھی اور ہے۔ تو ہنسی خوشی زندگی گزار۔"

سوما منڈا خاموش ہو گیا۔ اُس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ وہ سوچنے لگا۔

کیا یہ درست ہے کہ پندرہ برس کی محبت دو برس کی نفرت سے مر نہیں سکتی؟ اور کیا یہ بھی سچ ہے کہ نیگڑی سے مجھے اب تک محبت ہے۔ اگر یہ سب کچھ درست ہے تو کیا میں نیگڑی کے ساتھ رہ کر یہ غم بھول جاؤں گا کہ میں ایک بزدل جوان ہوں، میں نے اپنی قسم کا پاس نہیں رکھا۔ میں نے اپنا عہد توڑ دیا۔

سوما منڈا کا سر چکرانے لگا۔

"اب ہم جاتے ہیں سوما —" موڑا نے کہا — "ہماری نیک دعائیں تیرے ساتھ ہیں۔ تو پھل پھول — وہ تو ہم محض اپنے دستور کے مطابق تجھے سرداری سے الگ کرنے آگئے تھے۔ ویسے تو ہمارا ساتھی ہے۔ ہمارا سردار نہیں تو کیا ہوا!"

"سردار نہیں تو کیا ہوا! —" یہ بات سوما منڈا کے دل میں تیر کی طرح گھپ گئی۔ اُسے ایسا لگا جیسے موڑا نے اُسے بڑی بُری گالی دے ڈالی ہو۔ اُس کا دل اور بھی تیزی سے دھڑکنے لگا، اور اُس کا سر اور بھی بُری طرح چکرانے لگا۔

"آج رات کو ہم نئے سردار کا چناؤ کریں گے" موڑا بولا۔ "تو ضرور آنا، سوما ہم نے تو تجھے جات سے الگ نہیں کیا ہے — نئے سردار کے چناؤ میں ضرور آنا۔"

سوما منڈا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھا رہا اور سارے جوان واپس جانے کو مڑنے ہی والے تھے کہ پیچھے سے نیگڑی نے پکارا۔

"ٹھیرو —"

وہ مجمع کے اندر آ گئی۔ اُس کی چھاتی میں تیر کا ایک پھل گھونپا ہوا تھا۔ اور چھاتی سے بُری طرح خون بہہ رہا تھا اور اُس کا چہرہ زردی مائل سبز ہو گیا تھا، اور اُس کے قدم بہت زیادہ لڑکھڑا رہے تھے۔

"نیگڑی —" سوما منڈا ایک لخت چلّاتے ہوئے اُٹھا اور دوڑ کر

اُس نے نیگڑی کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ پھر اُس نے جلدی سے تیر کا پھل نکال کر ایک طرف پھینک دیا۔ نیگڑی بُرے وقار کے ساتھ کہنے لگی۔

"تمھیں نیا سردار چُننے کی ضرورت نہیں۔ یہ میرے سوما کی توہین ہے۔ تمہارا سردار جہا بیر سوما منڈا ہے۔ جہا بیر سوما منڈا ہی تمہارا سردار ہے۔"

"نیگڑی ــــ" سوما منڈا پھر چلایا: "یہ تونے کیا کر ڈالا نیگڑی!"

مگر نیگڑی نے اُس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ البتہ وہ جوانوں کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

"تمھیں دوسرا سردار چُننے کی ضرورت نہیں۔ سوما نے اپنی قسم نہیں توڑی ہے۔ اُس کا عہد نہیں ٹوٹا ہے۔ اُس نے میری جان بچانے کے لئے مجھ سے شادی کی ہے بس ــــ اُس نے میرے ساتھ نہ رہنے کی قسم کھائی تھی اور وہ میرے ساتھ نہیں رہے گا۔"

نیگڑی کا سارا بدن برف کی طرح سرد ہوتا جا رہا تھا، اور اُس کے چہرے کا رنگ آناً فاناً تیز سبز ہوتا جا رہا تھا۔

"نیگڑی ــــ" سوما منڈا نے اُسے جھنجھوڑ ڈالا ــــ نیگڑی، نیگڑی!"

وہ اُس کے بازوؤں میں بالکل ڈھیلی پڑ گئی۔ اور اُس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

"نیگڑی!" سوما منڈا نے پھر پکارا۔

نیگڑی نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر جیسے بڑی مشکل سے اُس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اُس نے سوما منڈا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا، پھر وہ مسکرا دی اور تب اُس کی آنکھیں یوں بند ہو گئیں جیسے یکایک دیپ بجھ جائیں۔

سوما منڈا اُس کے چہرے پر اپنا چہرہ ملنے لگا۔ اُس کا چہرہ اور سارا بدن برف کی طرح سرد ہو گیا تھا، اور اُس کے چہرے کا رنگ سیاہی مائل سبز ہو چکا تھا۔ وہ اُس کے بازوؤں میں بالکل ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ سوما منڈا نے اُسے اُٹھا کر کھاٹ پر ڈال دیا۔ اُس وقت اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے ساری فضا میں نارنجی رنگ کا دھواں پھیلتا جا رہا ہو ــــ اور نیگڑی کہہ رہی ہو۔

"سوما! کیا تو مجھے معاف نہیں کر سکتا!"

نیگڑی بڑی بے بسی کا سا چہرہ لئے اُس کے ذہن میں کھڑی ہو گئی۔

اور سوما منڈا بے تاب سا ہو کر نیگڑی کی لاش سے لپٹ گیا۔

دینا ناتھ مست کشمیری

کیسر کی شہزادی

(کشمیر کے زعفران زاروں میں ایک چاندنی رات)

کیسر یا زعفران کشمیر کی ایک انمول پیداوار ہے۔ قدرت کے عام قانون کے خلاف زعفران زار پت جھڑ کے دنوں میں اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ کاتک کی صاف شفّاف چاندنی راتوں میں لوگ اِن زعفران زاروں کا لطف لینے جاتے ہیں۔ زعفران سرینگر سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر واقع ایک قصبے پاں پور کے ارگرد کے رقبے میں پیدا ہوتا ہے اور اس لحاظ سے اسے تاریخی اہمیت حاصل ہے۔

پت جھڑ کے سماں سے پھر — گلزار ہیں پژمردہ
ہنگامِ خزاں سے پھر — نظّارے ہیں افسردہ
سنسان ہیں مے خانے
اور چُور ہیں پیمانے

کشمیر کی وہ نزہت — ہے آج کہاں باقی
میخوار بھی ہیں رخصت — محفل نہ کہیں ساقی
گرمی نہ گُل و مُل کی
آواز نہ بُلبل کی

ہے باغ و گلستاں سے — پھولوں کی سواری گُم
اس روضۂ رضواں سے — ہے فصلِ بہاری گُم
ہر کشت و چمن ویراں
کہسار و دمن ویراں

گُم آب و ہوا سے ہے — تاثیرِ مسیحائی
معدوم فضا سے ہے — وہ خلد کی زیبائی
ہر موجِ صبا نشتر
بے کیف ہر اک منظر

۲- پاں پور کے میداں کی — ہے اور ہوا لیکن
اس طرفہ گلستاں کی — ہے اور فضا لیکن
اک عالمِ رنگ و بُو
چھایا ہے یہاں ہر سُو

ہر بستیِ میداں سے — کہسار کے دامن تک
اطرافِ گلستاں سے — دہقان کے مسکن تک
ہیں چاروں طرف روشن
کیسر کے بھرے گلشن

کیسر کی بھری کھیتی — امید ہے دہقاں کی
نیلم کی پری کھیتی — تصویر ہے ارماں کی
جو پھول ہے پیارا ہے
اور آنکھوں کا تارا ہے

کیسر کی بہار آئی — کیسر کے چمن پھولے
خوش رنگ فضا چھائی — خوشیوں کے پڑے جھولے
ہیں ناچتی گاتی اب
پال پور کی پریاں سب

۳- وہ چاند نکل آیا — وہ کوہ دمک اٹھے
تبدیل ہوئی کایا — وہ کھیت چمک اٹھے
ہر ذرۂ میدانی
اب ہو گیا نورانی

کچھ دور وتستا میں — اب چاند نہاتا ہے
پرنور وتستا میں — وہ ڈبکیاں کھاتا ہے
وہ موجوں میں ڈوبا وہ
وہ لہروں سے ابھرا وہ

لو رند بھی زاہد بھی — آ نکلے پئے عشرت
عشاق بھی عابد بھی — آ دھمکے پئے عشرت
کچھ ایسی بہار آئی
خود حسن ہے سودائی

منظر ہے عجب رنگیں — اڑتا ہے غمِ انساں
کچھ دل کو ملی تسکیں — کچھ طبع ہوئی شاداں
اے کاش دوامی ہو
یہ لطف مدامی ہو

۴- مہتاب درخشاں میں — اک پیکرِ رنگینی
کیسر کے گلستاں میں — ہے محو یہ گل چینی
پھولوں میں ہے کھوئی سی
پھولوں میں سموئی سی

یہ دخترِ دہقانی — یہ پیکرِ رعنائی
یہ صورتِ نورانی — یہ جلوۂ زیبائی
اک زیورِ فطرت ہے
اک حسن کی جنت ہے

سرتا بقدم خود یہ — کیسر کا گلستاں ہے
ہے باغِ ارم خود یہ — تصویرِ بہاراں ہے
یہ روپ بھرا جوبن
یہ حشر ادا جوبن

کھیتوں میں خراماں ہے — کیسر کی یہ شہزادی
صد حشر بداماں ہے — مستِ مے آزادی
کیا اٹھتی جوانی ہے
آپ اپنی دوانی ہے

اس چاند سے مکھڑے سے — کھیت اور بھی دمکے ہیں
اس نور کے ٹکڑے سے — پھول اور بھی چمکے ہیں
کندن ہے یہ سرتاپا
گہنوں کی ضرورت کیا

کیا جانے کسے گی یہ — آغوشِ محبت میں
جے مال ہے کیسر کی — کس مست کی قسمت میں
اِتراتی ہوئی چل دی
اِٹھلاتی ہوئی چل دی

سہ وتستا - دریائے جہلم - پال پور جہلم کے کنارے پر واقع ہے۔

محمد عقیل

ادب و ابلاغ

جب کبھی کسی مشاعرے، کسی علمی مجلس میں کوئی ایسی نظم، کوئی ایسا افسانہ پڑھ دیا جاتا ہے جس میں سماجی کشمکش، ملکی انتشار، سرمایہ داری کے استحصال اور عوام کی ناداری کا تذکرہ ہوا کرتا ہے تو ہر طرف سے پروپیگنڈہ، پروپیگنڈہ کا شور اٹھنے لگتا ہے۔ حیات انسانی کی مختلف ضرورتوں اور اس کے ارتقاء کی جد و جہد کی طرف توجہ مبذول کرانا ابھی تک بہت سے حلقوں میں پروپیگنڈہ، مقصدیت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اب سے کچھ سال پہلے تو یہ چیزیں ایسی تھیں جن کی طرف دھیان دینا، ہمارے بہت سے بزرگ محض لایعنی سمجھتے تھے اور ان باتوں کو مجذوب کی بڑ کہہ کر ٹال دیا کرتے تھے۔ مگر ان خیالات کی روز افزوں وسعت اور ترقی دیکھ کر کچھ لوگ اس طرف متوجہ ہونے لگے ہیں ان میں سے ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اس تحریک کو حقیقی معنوں میں سمجھنا چاہتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو کسی وجہ سے دانستہ یا نادانستہ طور پر اس سے یک لخت منہ پھیر لینا چاہتے ہیں۔ ادب کیا ہے؟ مقصدیت کیا ہے؟ پھر ادب کا مقصدیت سے کیا تعلق ہے؟ ادب میں مقصدیت ہونی یا نہ ہونی چاہیئے اور اگر ہو تو کس حد تک؟ مقصدیت کے ساتھ ادب زندہ رہ سکے گا یا نہیں؟ وغیرہ ایسے متعدد سوال آج کے ادبی حلقوں کو پریشان کر رہے ہیں اور ان پریشان حلقوں کو ایسا نظر آ رہا ہے جیسے ادب کا سارا حسن و جمال، سارا کیف اسی مقصدیت کے سیلاب میں بہا جا رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ ایسے موقعے پر ہم ان سوالوں کو لے کر آگے بڑھیں اور ان غلط فہمیوں کو دور کر کے اپنے خیالات کو واضح طور پر سامنے رکھیں، ان غلط ترجمانیوں کا ازالہ کریں جو لوگوں کے ذہن میں مقصدیت کا صحیح مفہوم اور اس کا ادب سے رشتہ، سمجھنے میں سدِ راہ ہوتی ہیں۔

پروپیگنڈے کا ایک عام مفہوم جو اکثر لوگوں کے ذہن میں ہے وہ یہ کہ ہر وہ بات جس کی بنیاد اصلیت پر نہ ہو، جو الزام محض ہو، پروپیگنڈہ ہے۔ بہت سے لوگ مبالغہ آرائی کو بھی پروپیگنڈہ سمجھتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے رومان کے معنی عشق و عاشقی عموماً سمجھا جاتا ہے۔ مگر ان دونوں خیالات میں سے ایک بھی پروپیگنڈے کی صحیح ترجمانی نہیں کرتا۔ پروپیگنڈہ اصل میں کسی خیال، اصول یا اعتقاد کی تبلیغ کو کہتے ہیں چاہے وہ سیاسی ہو یا اخلاقی، چاہے مذہبی ہو یا عشقیہ۔

امریکی نقاد جیمس فیرل[1] کے نزدیک پروپیگنڈے سے مراد کسی اصول اور کسی تحریک کے اغراض و مقاصد کی تدوین و تلقین ہے جو ہمیں کسی عمل کی طرف راغب کرے۔ پروپیگنڈے کی تلقین میں چند نعرے بھی ہوتے ہیں جو آلۂ کار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ یہ نعرے اس مدوّن پالیسی کا ایک حصہ ہوتے ہیں اور مارکسی نظریے کے مطابق یہ نعرے اس تحریک کے بڑھنے اور پھیلنے میں مدد دیتے ہیں۔ اگر صرف انفرادی طور پر کچھ باتیں کہہ دی جائیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ لوگوں کو پسند بھی آئیں مگر جب تک ان کے پھیلانے کی کوشش نہ کی جائے گی وہ پروپیگنڈے یا ابلاغ کے صحیح معیار پر نہ اتریں گی۔ اور وہی چیز بڑھنے اور پھیلنے میں صحیح کامیابی حاصل کرے گی جو عملی طریقے سے انسانوں کی زندگی میں بھی کامیاب ہو۔ اگر کوئی اصول ناقابل عمل ہے یا عمل میں مشکل سے آ سکتا ہے تو انسانی جماعت نہ تو اس سے استفادہ کر سکتی ہے اور نہ اس کی ترقی کے امکانات ہیں۔ وہ اصول صرف ایسے سنہری اصول ہوں گے جن کی تخلیق ہوا میں ہوئی ہے اور جو مادی دنیا میں یقیناً ناکامیاب ہوں گے۔ اس طرح باوجود اس کے کہ وہ شکلی اعتبار سے دل پسند ہیں مگر عملی اعتبار سے ترقی نہیں کر سکتے اور پروپیگنڈہ کا صحیح مفہوم بھی ادا نہ کر سکیں گے۔ مثال کے لئے ہم صوفیانہ عقائد کو لے لیتے ہیں۔ جب ان عقائد کی تدوین ہوئی ہوگی، کسے خیال ہوا ہوگا کہ چھ سو سال بعد ان کی اہمیت محض تاریخی رہ جائے گی۔ ایسا کیوں ہوا؟ اسباب بہت صاف ہیں۔ ان عقائد میں زندگی سے فرار اور بیزاری تھی۔ مادی زندگی عملی حیثیت سے دنیاوی

---

[1] فیرل مارکسی نظریۂ حیات کا قائل ہے

زندگی سے محبت کرتی ہے اور کرتی رہے گی۔ مادّی زندگی اس دنیاوی زندگی میں مدغم ہو کر سب مادّی لذّات حاصل کر لینا چاہتی ہے۔ ترکِ لذّات، فقر، قناعت وغیرہ مادّی زندگی کے لئے کارآمد ثابت نہ ہوئے۔ تخیُّلی اعتبار سے یہ چیزیں مزور بھلی معلوم ہوئیں مگر کیا اتنی کوششوں کے باوجود حیاتِ انسانی ترکِ لذّات میں کامیاب ہو گئی؟ کیا فقر، ترک اور قناعت پر قناعت کی گئی؟ شاید چند ہی نفر ان اصول پر کامیاب اُترے ہوں۔ انسان اجتماعی طور سے ہر دَور میں مادّی لذّات، حرص و ہوس کا شکار رہا ہے اور رہے گا۔ یہ اس کی سرشت میں داخل ہے۔ اس سے جماعتی طور پر وہ کسی حالت میں بھی گریز نہیں کر سکتا۔ دنیا کے بڑے بڑے اصول انھیں وجوہ کی بنا پر کامیابی حاصل نہ کر سکے کہ ان میں سرشتِ انسانی کی زبردست مخالفت کی گئی تھی۔ اگر انسانی مزاج کو مدِّ نظر رکھ کر ان کا ہیولیٰ طیّار کیا جاتا اور ان میں اتنی لچک بھی رکھی جاتی کہ بڑھتی اور پھیلتی ہوئی زندگی اپنی ضروریات کے مطابق انھیں موڑتی رہے تو وہ اصول انسانوں کے بہت دنوں تک کام آتے۔ اس طرح پروپیگنڈہ کیا ہے۔ اس کے مختلف نظریات، اس کی کامیابی اور ناکامیابی کی وجہیں بیان کی گئی ہیں۔ یہ بات بھی واضح طور سے ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ پروپیگنڈے میں حقیقت نگاری کو بھی اتنا ہی دخل ہے جتنا کہ زندگی کی مختلف قدروں کو زندگی میں دخل ہوا کرتا ہے۔

اِبلاغ کی توضیح کے بعد اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ادب سے اس کا کیا تعلّق ہے یا کیوں تعلّق ہو۔ اس کے جواب کے لئے ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ ادب کا صحیح مفہوم کیا ہے یا کیا ہونا چاہیئے۔ عام طور سے لوگ ابھی تک اس سے کیا مطلب سمجھتے رہے ہیں اور آج جو ایک عام رجعت پسندانہ خیال ادب کے متعلق قائم کر لیا گیا ہے وہ ہے کیا۔

عہدِ عتیق سے لے کر آج تک کے ادب پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہر دَور میں انسان اور اُس کی معاشرت ماحول کے لحاظ سے اس کے ادب میں مختلف کروٹیں لیتی رہی ہے۔ کوئی دَور ایسا نہیں گزرا جب انسانی تاریخ انسانی ادب پر اثر انداز نہ ہوئی ہو۔ کسی زمانے کا ادب بھی اس دَور کے انسانوں کی تحریکات، خیالات و نظریات کی عکّاسی سے خالی نہیں رہا۔ چنانچہ وہ پروپیگنڈہ یا مقصدیت جسے ہم آج بُری نظر سے دیکھتے ہیں۔ روزِ ازل ہی سے ادب کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے انسان نے جب بھی اپنے خیالات کو رواج دینا چاہا۔ اپنی اُلجھنوں کا، چاہے وہ روحانی ہوں یا مادّی، تذکرہ کیا تو وہ ادب میں شامل کر لیا گیا۔ وہ دَور جب انسان نے لکھنا پڑھنا سیکھا، یا پھر وہ تصویری زمانہ جب وہ اپنے جذبات و خیالات کی ترجمانی تصویریں بنا کر کیا کرتا تھا، اس وقت بھی ادب میں انسانی ضروریات، سماجی کشمکش اور اس کے جذبات ہی کا اظہار ہُوا کرتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ جب اُس کے خیالات میں ربط و تسلسل پیدا ہُوا تو اُس نے اپنے ارادے، اپنے نظریات کو ادب ہی کے ذریعے سے پھیلانا شروع کیا۔ آرٹ، مصوّری، ادب، اگر ہم بہ نظرِ غور مطالعہ کر سکیں تو ہر ایک کو پروپیگنڈہ سے معمور پائیں گے۔ ادب کی حرکت اور پیدائش ہی پروپیگنڈے کی ضرورت پر ہوتی ہے۔ اس سے کوئی بھی ہوش مند انسان انکار نہیں کر سکتا۔ پھر رفتہ رفتہ جب انسانیت، روحانیت کی لذّت سے شناسا ہوئی اور بڑے بڑے پیغمبر رونما آئے تو انھوں نے بھی اپنے خیالات کی ترویج و اشاعت میں ادب کا سہارا لیا۔ چنانچہ توریت، زبور، انجیل وید، اُپنشد، اوستا، قرآن، گیتا سبھوں نے ان کے خیالات کی توسیع میں بڑی مدد دی۔ کیسے اس بات سے انکار ہو سکتا ہے کہ ادب کے اس اتنے بڑے ذخیرے سے پروپیگنڈہ الگ ہے یا قرآن اور دوسری مذہبی کتابیں ادب کا بہترین نمونہ نہیں ہیں۔ یا ان کتابوں میں ابلاغ مدِّ نظر نہیں ہے یا یہ کہ یہ کتابیں حیاتِ انسانی کی ارتقائی تاریخیں نہیں ہیں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ادب اور پروپیگنڈے کا چولی دامن کا ساتھ ہے تو پھر ادب کو الگ دیکھنے کے کیا معنی ہوئے۔ جواب بہت آسان ہے اور آسانی سے سمجھا بھی جا سکتا ہے۔ وہ طبقہ جو کسی تخلیق و تخیُّل پر ابلاغ کا الزام لگاتا ہے۔ اس کے نزدیک ادب کا اطلاق صرف ایک محدود خیال، فکر و اندازِ نظر تک ہوتا ہے جسے یہ طبقہ پورا ادب سمجھتا ہے۔ ہر چند یہ جزو محض فروع کی حیثیت رکھتا ہے جو ہر ادب میں تو موجود ہوتا ہے مگر پورا ادب نہیں بن سکتا۔ اس جزو کے بغیر ادب میں کمی ضرور محسوس ہوگی مگر ادب اس جزو کے معدوم ہونے پر بھی ادب رہے گا۔ اس طبقے کے نزدیک ادب کی اہمیت اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے کہ کسی ادب پارے میں موضوع سے قطع نظر محض فن کو انتہائی حد تک مدِّ نظر رکھا گیا ہو۔ ظاہری بناؤ سنگار، نمائش میں کسی طرح کمی نہ آنے پائے چاہے رُوح بڈھی ہی کیوں نہ ہو چکی ہو۔ موضوع اس طبقے کے بہت محدود قسم کے ہیں۔ مثلاً قلبی واردات کا بیان، حسن و عشق کی حکایتیں، وصل و ہجر کے تذکرے، خلوت و جلوت کی معرکہ آرائیاں، انتظار، انتشار وغیرہ یا پھر عشقِ حقیقی، فقر، ترک، دنیا سے بے نیازی، معرفت وغیرہ کے تذکرے۔ اب اگر کوئی ادیب ان روایات سے آگے قدم بڑھاتا ہے تو اسے مہمل گو، اس کی تخلیق کو لایعنی، بکواس، مجذوب کی بڑ اور معلوم نہیں کیا کیا کہا جاتا ہے۔ ادب کا یہ محدود نظریہ جس کا تذکرہ اوپر کیا گیا، انحطاط پذیر اور زوال آمادہ نظام کی پیداوار ہے جو زندگی کی کشمکش اور انقلابات سے

آنکھیں پھیر کر اس محدود دُنیا میں کسی طرح اپنے کو خوش رکھنا چاہتا تھا۔ ورنہ ادب ہمیشہ انسان کی زندگی کے ساتھ قدم ملا کر چلتا رہا اور اسی طرح چلتا رہے گا۔ کچھ یہ بھی ہے کہ اس محدود نظریہ رکھنے والے طبقے کے سامنے ادب کی پوری اور صحیح شکل آئی بھی نہیں۔ انھوں نے ادب کی وسعت کو سمجھا ہی نہیں اور بہت سے تو ایسے ہیں جو آج بھی سمجھنے سے انکار کرتے ہیں۔

ادب کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم زندگی کو اپنا ہمراز و دمساز بنائیں۔ کوئی ادب زندگی سے الگ ہو کر ادب کہلانے کا مستحق نہیں ہوگا۔ اور جب ادب زندگی میں اتنی نزدیکی ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ادب کو مسائلِ حیات کے تذکروں سے بچا لیا جائے اور جب ادب میں مسائلِ حیات لائے جاتے ہیں تو ابلاغ اور پروپیگنڈے کا شور مچایا جاتا ہے۔ بظاہر مسئلہ بالکل صاف ہے۔ مگر اسی کے ساتھ کچھ پیچیدگی بھی پیدا کر دی گئی ہے۔ بہت سے لوگ مسائلِ حیات ہی میں اختلاف رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر مسائلِ حیات کچھ ہیں جن میں انسان اُلجھ سکتا ہے تو وہ یہ ہیں۔

ہم آنکھ کئے بند تصور میں پڑے ہوں
لیتے میں کوئی چھم سے جو آ جائے تو کیا ہو (ریاض خیرآبادی)

ہے سنا جب سے وہ ٹہلنے میں ہیں آئے ہوئے
کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے (جرأت)

کیا اضطرابِ شوق نے مجھ کو خجل کیا
وہ پوچھتے ہیں کہئے ارادے کہاں کے ہیں (داغ)

مت مل اہلِ دُول کے لونڈوں سے
میر جی اُن سے مل فقیر ہوئے (میر)

زمیں ہم کو نہایت شوق ہے۔۔۔۔ پرستی کا
جہاں جائیں وہاں دو ایک کو ہم تاک رکھتے ہیں (آبرو)

یا پھر

عمر برق و شرارہ ہے دُنیا • کتنی بے اعتبار ہے دُنیا
لگاؤ نہ اس دارِ فانی میں دل • عیاں اس کی ہیں سست پیمانیاں

لیکن ان باتوں کو مسائلِ حیات نہیں سمجھا جاتا۔

ابھی تو دیوار و در پہ سنّاٹا طاری ہے ہیں بیکاریوں کے سائے
ملوں کے اعصاب کا تشنج وہی رگوں کی شکستگی وہی ہے

بادباں کھل گئے جہازوں کے • بمبئی کے جہازیوں کو سلام
جو شہنشاہیت سے ٹکرائے • ایسے جانباز غازیوں کو سلام (سردار جعفری)

بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
کیا اُن کو خبر تھی سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اُٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اُٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں (جوش)

اور چونکہ ایسی باتوں کو مسائلِ حیات کے زمرے میں لانا مستحسن نہیں خیال کرتے۔ اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ اس اختلاف کو کیسے طے کیا جائے۔ اُوپر کی باتیں بھی مسائلِ حیات کے زمرے میں آتی ہیں اور بعد میں جن کا تذکرہ ہُوا وہ بھی زندگی کی کشمکشوں سے الگ نہیں ہیں۔ موجودہ نظریہ جو ادب کے متعلق ہے اور جس سے مارکسی اور غیر مارکسی کوئی بھی انکار نہ کر سکے گا۔ وہ دونوں کو مسائلِ حیات سمجھتا ہے۔ جنسی اُلجھنیں بھی انسانی زندگی کا ایک رُخ ہیں مگر انھیں انتہا پسندی کی حد تک نہیں لایا جا سکتا۔ بالکل یہی باتیں ہم ادب کے دُوسرے رُخ کے لئے بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایک مشہور مارکسی نقاد کارنیشیدوسکی کا کہنا ہے کہ ادب کا مخصوص کام یہ ہے کہ وہ ایسی چیزوں کو پیدا کرے جو انسان کی دلچسپیاں زندگی سے وابستہ کر دیں اور ظاہر ہے کہ متذکرۂ بالا مثالیں یقیناً ہم کو زندگی کے قریب بھی لاتی ہیں اور زندگی سے ہماری دلچسپیاں بھی بڑھاتی ہیں۔ مگر جب یہ چیزیں انتہا پسندی کی حد تک پہنچ جائیں گی تو زندگی سے نفرت اور فرار پیدا ہونے کے بھی امکانات ہیں چاہے وہ معاملات خارجی ہوں یا داخلی۔ جمیں فیراں نے یہ لکھ کر کہ ادب قاری کو زندگی کی کشمکشوں سے ہمکنار کر کے اسے زندگی کی اُلجھنوں کے سمجھنے میں اور حساس بنا دیتا ہے ایک بہت بڑی گتھی حل کر دی۔ صرف دلچسپی لینا ہی ہمارے زیادہ کام نہ آ سکتا اگر ہم ان کو صحیح طریقے پہ محسوس نہ کرتے ورنہ سمجھتے کہ واقعی یہ زندگی کی صحیح اور جائز ضرورتیں ہیں۔ ہمارے رجعت پسند طبقے نے یہی غلطی کی۔ اس نے زندگی کے ایک جزو سے انتہا پسندی کی حد تک دلچسپی لی مگر کبھی صحیح ادراک و احساس سے کام نہیں لیا۔ یہی وجہ ہے کہ سب کے احساسات میں یکسانی پیدا ہوگئی۔ جس میں تصنّع ہی تصنّع مجموعی حیثیت سے نظر آتا ہے۔ جہاں حقیقی جذبات کا کوسوں پتہ نہیں ہے۔ رفتہ رفتہ جب انھیں یکطرفہ جذبات نے رُخ بدلا تو

ہمارے فن کار کو زندگی سے بیزاری سی پیدا ہو گئی اور اس نے

کشمکشِ حیات کی منزلِ آخری فنا — زیست کا اعتبار کیا موت کا اعتبار کر
حبابِ لبِ جو ہیں اے باغباں ہم — چمن کو تسرے کوئی دم دیکھتے ہیں
یاس نے دو ہی تہیں حق تو یہ ہے دوا بھی — فانیؔ نا امید کو موت کا آسرا دیا

کے سے نغمے الاپنے لگا۔ زندگی اسے بار گراں نظر آنے لگی۔ اسے موت کا آسرا زندگی کے لئے ایک سہارا بن گیا۔ وہ موت میں نئی نویلی دلھن کی سی دلربائی پانے لگا۔ مگر یہ سب خیالات بڑھتی اور پھیلتی ہوئی زندگی کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔

دُنیا کا ہر عظیم فن کار اور عظیم ادب، موت سے زیادہ زندگی اور اُس کی قدروں کا طرفدار ہوا کرتا ہے۔ اور دراصل یہی انسان کی صحیح فطرت بھی ہے۔ عملی زندگی میں جتنی محبت ہمیں زندگی اور اُس کی صلاحیتوں سے ہوا کرتی ہے۔ اتنا مزہ ہمیں موت کی سرگوشیوں اور پُراسرار خاموشی میں نہیں آتا۔ "انسان فانی ہے" کہتے وقت ہم ایسا محسوس کرتے ہیں گویا یہ اصول ہمارے اُوپر منطبق نہیں ہوتا، جیسے کہنے والا ان بندھنوں سے آزاد ہے۔ اب اگر ہم حقیقت بیں نظروں سے دیکھیں تو یہ بات صاف واضح ہو جاتی ہے کہ زندگی کی گردش، اس کی تگ و دو اور حیات کے تذکروں سے وابستہ باتیں، ہمیں فطری طور پر اپنی طرف کھینچتی ہیں اور کھینچتی رہیں گی۔ ان سب کا اظہار ہم نے ہمیشہ پُر زور طریقے پر کیا ہے اور کرتے رہیں گے۔ چاہے ان باتوں کو ابلاغ کہا جائے یا پروپیگنڈا، خواہ ان باتوں کو ادب میں شامل کیا جائے یا نکال پھینکا جائے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ نظریات میں ہمیشہ فرق رہا ہے۔ بہت سے فن کار ایسے گزرے ہیں جو اس دُنیا کی زندگی پر دوسری دُنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے رہے ہیں۔ مادّی زندگی کو انھوں نے اس لئے پسند نہیں کیا کہ اس میں جلد مٹ جانے کے امکانات ہیں اور روحانی زندگی ان کے نزدیک ابدی زندگی ہوگی جہاں وہ ہمیشہ کے لئے زندگی کی مختلف لذّتوں سے ہمکنار رہیں گے۔ اس طرح وہ مادہ پرستوں کے خلاف روحانی زندگی کے زیادہ دلدادہ نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک روحانی زندگی بغیر کسی رکاوٹ کے تمام لطائف کا مزہ دے گی۔ 'نروان' 'موکش' اور 'نجات' اسی ابدی زندگی کی خواہش کے نتیجے ہیں۔ اور جب ان خیالات کی ترویج و اشاعت کی کوشش کی جاتی ہے تو وہیں سے اِبلاغ کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔

ان تمام بحثوں سے یہ نتیجہ نکلا کہ ادب کا اطلاق ہر اُس فن پارے پر ہوگا جس سے زندگی کی تشکیل موجود ہو، جس میں حیات کے بڑھنے اور پھیلنے کا راز مضمر ہو۔ جو ادب محض خلا میں قلا بازیاں لگانے اور تخیلات کی دنیا میں ہوائی قلعے بنانے کا اشتیاق ظاہر کرے۔ وہ انسانی زندگی کے لئے مفید نہیں ہوگا اور اس لئے ہمیں اُسے ایک اچھا اور صالح ادب ماننے میں تکلّف ہوگا اور درحقیقت ایسے ادب کی انسانی جماعت میں بہت دن تک زندگی ناممکن ہے۔ وہ ادب جو مسائلِ حیات سے متعلق ہوگا، جس میں زندگی کی قدروں اور اس کی گوناگوں صلاحیتوں کا تذکرہ ہوگا وہ یقیناً ابدی اور لازوال ہے۔ اسے ہر دور میں بڑھنے اور پھیلنے کے لئے موقع اور مواد ملتا رہے گا۔

سرشار، خوجی اور آزاد کا تذکرہ ایسے عبوری دور میں کرتے ہیں جب پُرانی دنیا مر رہی اور نئی دنیا اپنے تازہ ترین تجربوں کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ کسے خیال ہو سکتا تھا کہ زندگی کو اس نئی تجرباتی روشنی میں سمجھنے کے بعد پھر کبھی آزاد اور خوجی پیدا ہوں گے اور اسی وجہ سے ہم ان کا مذاق بھی اُڑاتے ہیں — مگر اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ آج بھی انسانی جماعت میں ایسے افراد موجود ہیں جن میں خوجی اور آزاد کی خاصیتیں پوری طور سے موجود ہیں۔ بظاہر فسانۂ آزاد اس دور میں محض ایک اِبلاغی چیز سمجھا جاتا ہوگا مگر حقیقت میں یہ ہر دور میں موجود تھے اور زماں و مکاں کی قید ان کا احاطہ نہ کر سکی۔ اور اگر نہ ہوتے یا نہ ہوں تو شاید ان تذکروں سے ہم اتنی دلچسپی بھی نہ لیتے رہتے۔ ہم اپنی زندگی کے اچھے اور بُرے دونوں پہلو ان میں پاتے ہیں۔ ایسے پہلو جنہیں زمانہ اپنی انتہائی کوشش کے باوجود کبھی بھی نہ مٹا سکے گا۔ الف لیلیٰ کی شہزادی روسی رستم ایلیا موروبٹز، داستان امیر حمزہ میں آسمان پری اور عفریت شاہ دیوان طلسم ہوش ربا کی تاریک شکل کش، ماہیان زمرد پوش، یاقوت سخندان، سرد انیرٹو کے ڈان کوئکزاٹ سے ہماری دلچسپی صرف اسی لئے ہے کہ ہم انسانیت کو ترقی دیکر ان قوتوں کا مالک بنانا چاہتے ہیں جس سے زندگی بہتر سے بہتر شکل میں نظر آئے اور جب ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ محض ہمارا فریب ہے تو ہماری توجہ ان کتابوں کی طرف نہیں رہتی۔ صرف وہی عنصر ہمیں اپنی طرف مائل کرتا ہے جسے انسانی زندگی اپنا سکتی ہے۔ لیونارڈو ڈاونچی کی مانولیزا اور عشائے آخر Last Supper میں دلکشی آج تک صرف اسی وجہ سے قائم ہے کہ ان میں انسانی زندگی کے نقوش ملتے ہیں۔ عشائے آخر کا پس منظر، ترتیب وغیرہ ضرور روائتی ہے مگر عمل، انسانی زندگی سے وابستہ ہے۔ غرض کہنے کی یہ ہے کہ انسانی زندگی سے متعلق جس دور میں بھی جو کچھ کہیں بھی کہا، لکھا یا پیش کیا گیا ہے وہ کبھی بھی کسی حالت میں فنا نہیں ہو سکتا اور ان متعلقات کی اشاعت ہمیشہ اِبلاغ کے حدود میں رہے گی۔ ایک ترقی پسند ادیب و ادب کا یہی ایمان ہے اور رہے گا۔

بات میں بات پیدا ہی ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کسی حالت میں بھی

اپنے خیالات کی تردید نہیں چاہتے۔ ان کے نزدیک جو کچھ انھوں نے اپنی جگہ سوچ رکھا ہے وہ اٹل ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ ابلاغی ادب اگر فنا نہ ہوا تو اس کی حیثیت محض تاریخی ہو کر رہ جائے گی۔ میں بڑے ادب سے عرض کروں گا کہ ایسا بھی ممکن ہے کہ اس کے کچھ حصے ضرور تاریخی حیثیت اختیار کریں۔ خارجی حیثیت سے بہت سی چیزیں تاریخی ہو جاتی ہیں اگر ان میں فن کی چاشنی نہ رکھی گئی ہو۔ مگر ان کی روح ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بہت سی بنیادی باتیں ہیں جو ترقی و تبدیلی کے باوجود ہمیشہ انسانی زندگی کے ساتھ کسی نہ کسی صورت میں لگی رہتی ہیں۔ زندگی میں ٹھہراؤ نہیں ہے مگر کسی نہ کسی حالت میں دہراؤ ضرور ہے۔ وہ زمانہ جب انسان غلام بنائے جاتے تھے، جب بازارِ عام میں بھیڑ بکریوں کی طرح اُن کا نیلام ہُوا کرتا تھا، موجودہ دَور سے صرف خارجی طور پر ہی بدلا ہُوا ہے ورنہ حقیقت میں آج بھی بہت سی قومیں گو جسمانی حیثیت سے آزاد ہیں مگر ان کے حرکات و سکنات، ان کی تحریر و تقریر پر ویسی ہی پابندیاں لگی ہوئی ہیں۔ اب جو باتیں غلامانہ نظام کی مخالفت میں اس وقت کہی گئی تھیں اُن کا اطلاق آج بھی اس غلامانہ ذہنیت پر تھوڑے سے تغیر و تبدل کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ یہی نہیں، زندگی میں مخالف اور موافق دونوں طرح کی قوتیں کام کرتی رہتی ہیں۔ خوش حالی کے ساتھ ہر دَور میں بدنصیبی اور زبوں حالی بھی لگی رہتی ہے۔ ظلم و استبداد بھی اسی طرح ہر دَور میں ہوتا آیا ہے۔ جمہوریت پسند طاقتوں کے ساتھ ہمیشہ غیر جمہوری طاقتیں بھی کام کرتی رہتی ہیں۔ اگر آپ اسے تسلیم کرتے ہیں۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ یہ تسلیم نہ کیا جائے۔ تو آپ اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ آج کا ادب آئندہ دَور کے ماحول پر ضرور اثر انداز ہوگا۔ —— جب بھی کوئی غیر جمہوری نظام کسی جمہوری خیال کی مخالفت کرے گا، جب بھی کوئی طبقاتی جنگ چھڑے گی، جب بھی کوئی استبدادی ہاتھ کسی مظلوم کی گردن دبانے کے لئے بلند ہوگا، اس وقت ہمارے ادب کی ایک ایک سطر بالکل اسی شان سے تلوار کی طرح بلند ہوگی جیسے آج بلند ہو رہی ہے کون کہہ سکتا ہے کہ سودا کا یہ شعر

اک لبِ ناں کے لئے حیران ہوتے شہر شہر — مثلِ ماہِ نو پڑے پھرتے ہیں عالی ہمتاں

یا مومن کا یہ شعر

کوئی اس دَور میں جئے کیونکر — ملک الموت ہے ہر ایک بشر
داد خواہوں کے شور سے دیکھو — چونک اُٹھتا ہے فتنۂ محشر

صرف اُنھیں کے دَور کی ترجمانی کر رہا ہے اور آج اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ گئی۔

کچھ لوگ ابلاغ کے تو کسی نہ کسی طرح قائل ہو جاتے ہیں مگر اُن کو دوسری چیزیں کھٹکتی ہیں مثلاً یہ کہ ایک خاص قسم کے ادب میں ہنگامیت ہے اور جب یہ خلفشار یہ ہنگامہ ختم ہو جائے گا تو یہ ادب بھی (جو ان کے نزدیک، ان کی اصطلاح میں پروپیگنڈہ ہے) ختم ہو جائے گا۔ بعض حلقے اس ادب کو محض وصل، ہجر، خلوت کے واقعات کی تمنا سے کر پڑھتے ہیں اور جب یہ چیزیں ان کے خاطر خواہ نہیں ملتیں یا اگر ملیں تو اُس شدت کے ساتھ نہیں بلکہ ایک اعتدال کے ساتھ بدلے ہوئے انداز میں، تو وہ جھنجھلا جاتے ہیں اور ادب پر واہیات، خرافات ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔ کچھ لوگ ادب میں موضوع سے قطع نظر محض فن کے جویا ہوتے ہیں۔ وہ فن کو زندگی سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک حسن نسوانی اس طرح پیش کیا جائے کہ عورت کے خدوخال مفقود ہو کر پری، حور یا اُن کے تخیل کی انتہائی اڑان سے نادیدہ کوئی ایسی شکل ڈھلے جسے مادی انسان آج تک نہ پا سکا ہے اور نہ پا سکے گا۔ آئیے ان اعتراضات پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

ہنگامیت کے جو معنی معترضین نے سمجھ رکھے ہیں اور جس کا اطلاق ان کے نزدیک پورے ادب پر ہوتا ہے، (درحقیقت ادب میں اس ہنگامیت کے کوئی معنی نہیں ہوتے) اور اگر ان معانی کو مدِ نظر رکھ کر کوئی ادیب کچھ لکھتا ہے تو وہ تخلیق یقیناً دفترِ بے معنی ہے ہنگامیت اگر انفرادی جھگڑے، فساد یا خانگی نزاع کے متعلق ہے تو وہ یقیناً فنا ہو جائے گی (اور دراصل رجعت پرست طبقہ اسی ہنگامیت کو طبقاتی جنگ و جماعتی کشمکش کا مترادف سمجھتا ہے جو کہ نہیں ہے)، مگر جب یہ ہنگامیت تمام انسانوں یا ایک بہت بڑی انسانی جماعت کی جد و جہد، ان کی کشمکش سے متعلق ہوگی تو اُسے زوال نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ وہ جذبہ عوام دوستی اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے پیدا ہُوا تھا جو ہر دَور میں پیدا ہوتا رہے گا۔ موجودہ ادب میں جو جد و جہد ہے جسے ہنگامیت کہہ کر اس پر تمسخر و استہزا کیا جاتا ہے وہ عوامی ادب ہے جو عوامی ضرورتوں اور وقتوں کو، جو ایک بہت بڑی انسانی جماعت کے متعلق ہیں، پیش کرتا ہے۔ کیا اس بات سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ آج انسانوں کی ایک بہت بڑی جماعت زبردست شکنجے میں جکڑی ہوئی ہے، کیا آدمی غلامی کی کمندوں سے بالکل آزاد ہو چکا ہے؟ کیا افلاس و قحط کا پوری طرح سے استیصال ہو چکا ہے؟ کیا سرمایہ دارانہ نظام نے مزدور پیشہ جماعت کا استحصال ختم کر دیا ہے؟ اگر نہیں تو اسے ہونا چاہیئے اور یہ انسانی جماعت کے ساتھ زبردست ہمدردی ہوگی۔ اب اگر ادب ان کے ختم کرنے، ان کو اکھاڑ پھینکنے کے مشورے دیتا اور طریقے بتاتا ہے تو اُس پر ہنگامیت، پروپیگنڈہ، خرافات، واہیات اور نہ معلوم کن کن چیزوں کا الزام لگا دیا جاتا ہے۔

بعض حلقوں کے لئے نئے ادب کی سب سے پریشان کن چیز، ادب میں نیا مواد،

نیا طرزِ بیان اور موجودہ اصطلاحات ہیں - جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے۔ یہ لوگ ادب میں وصل و ہجر کی لذت کے جویا ہوتے ہیں اور انھیں داستانوں کے رمز و کنایات اور مصطلحات سے انھیں واقفیت بھی ہوتی ہے اور وہ ادب جس میں ان کے نزدیک ان کا سمجھا ہوا پروپیگنڈہ ہُوا کرتا ہے، اس میں مسائلِ حیات، ملکی سیاسیات اور اُس کا اثر عوام پر، انسانی جماعت کی اُلجھنیں اور پھر ان واقعات میں زمان و مکان کا اثر، روزانہ ہونے والے ملکی واقعات سے طیّار شدہ نقشہ ہُوا کرتا ہے۔ اب یہ بات صاف ظاہر ہے کہ جب تک قاری کو ان واقعات، ان کے اثرات، ان کرداروں سے واقفیت نہ ہو جو ان واقعات و سیاسیات میں حصّہ لیتے رہتے ہیں تو اس کی سمجھ میں وہ باتیں کس طرح آئیں گی۔ پھر یہی نہیں روزانہ کی سیاست، تغیّر و تبدل سے بھی انھیں واقف ہونا پڑے گا۔ اگر وہ روزانہ کی سیاسی اور سماجی باتوں سے واقف نہیں ہیں تو ان بیانات کے سمجھنے میں انھیں دقّت ہوگی۔ بعینہٖ جیسے ہفتوں بعد اخبار دیکھا جائے تو واقعات مبہم ہو جاتے ہیں۔ ان کا سلسلہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اسی عدم واقفیت کا سبب ہے کہ یہ معترضین ان مسائل پر کچھ لکھنا بھی چاہیں تو نہیں لکھ سکتے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی ناواقف کے سامنے اقبال کے یہ اشعار پڑھے جائیں۔

ساحرِ الموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش   اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات

یا

کشتیٔ مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم   علمِ موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

ظاہر ہے کہ ان اشعار کو سمجھنے کے لئے 'ساحر الموط' 'الموط' - برگِ حشیش اور پھر ایک دوسرے کا تعلق۔ پھر حسن بن صباح اور اور اُس کی ارضی جنّت سے اچھی طرح واقف ہونا پڑے گا۔ تب شعر کا مطلب سمجھ میں آسکے گا۔ ورنہ جو ان تلمیحات سے واقف نہ ہوگا۔ اس کے لئے کشتیٔ مسکین، دیوارِ یتیم، محض مجذوب کی بڑ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔

بہت سے لوگ ادب میں صنّاعی اور چابکدستی کو ہر چیز پر اہمیت دیتے ہیں ان کے نزدیک آرٹ کو اتنا بلند ہونا چاہیئے کہ اُسے زندگی، خیالات، ماحول، سماج ہر چیز پر فوقیت حاصل ہو اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ آرٹ محض ہنگامیت و ابلاغ کا شکار ہو جاتا ہے جس میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ جاتی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ حقیقی طور پر ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ آرٹ و ادب میں زندگی کے تجربے ہوتے ہیں - وہ بھی کسی ایک ہی پہلو سے متعلق ہوں گے۔ پوری زندگی کا عکس اس میں نہیں آ سکتا اور اگرچہ کچھ جز و سمیٹ کر ایک ڈھانچہ طیّار بھی کیا گیا تو وہ زندگی سے کسی بھی حالت میں بڑھ نہیں سکتا۔ جو آرٹ یا ادب زندگی سے بلند ہونے کی کوشش کرے گا وہ آرٹ یا ادب زندگی کی ترجمانی کبھی نہیں کر سکتا۔ وہ ہمیشہ خیالی ہوگا۔ وہ ایسی تخلیق ہے جسے زندگی سے کوئی لگاؤ نہ ہوگا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آرٹ زندگی کی بلندیوں تک پہونچ ہی نہیں سکتا۔ آرٹ اور ادب کی کامیابی کا راز اسی میں مضمر ہے کہ وہ کہاں تک زندگی کے قریب پہونچ سکتا ہے۔ جو ادب جو آرٹ زندگی سے جس قدر زیادہ قریب ہوگا۔ وہ اُسی قدر زیادہ حقیقی ہے۔ ایک اچھّے آرٹ کی کوشش ہمیشہ زندگی کے قریب سے قریب تر پہنچنے کی ہوتی ہے۔ مگر وہ بالکل مکمل زندگی کبھی نہیں بن سکتا اور ایک اچھے ادیب کی یہی کوشش ہوتی ہے۔ کہ وہ جہاں تک ہو سکے آرٹ کو زندگی کے قریب سے قریب تر لائے۔ دُنیا کے ہر بڑے آرٹسٹ نے ہمیشہ اسی بات کی کوشش کی ہے چاہے وہ ہومر ہو یا دانتے سفاکلس ہو یا شیکسپیر فردوسی ہو یا کالی داس، ٹیگور ہو یا چیخوف، گورکی ہو یا ملا خان، ناظم حکمت ہو یا پریم چند، کرشن چندر ہو یا پال روبسن، پکاسو ہو یا جوش جس نے بھی زندگی کی کشمکش، مسائلِ حیات، اقتصادی اُلجھنیں پیش کرنے کی کوشش کی، وہ ادب کو پروپیگنڈے سے بچا سکا اور نہ بچا سکے گا۔

خوراک کے اعداد و شمار کا بلٹین

وزارتِ خوراک و خوراک کے تحت شعبۂ معاشیات و اعداد نے خوراک کے اعداد و شمار کے بلٹین کی تیسری اشاعت حال ہی میں شائع کی ہے اس بلٹین میں ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۲ء تک پیداوار، محصول، درآمد اور راشن بندی کے غلّہ کے اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس مدّت میں بھارت میں اجناس خوراک کی قیمتیں بھی درج کر دی گئی ہیں۔

حیدر حسین موسوی

عراق کے جواں سال بادشاہ کی تاجپوشی

عراق کے جواں سال شاہ فیصل دوم کی تاجپوشی کی رسم ۲ رمئی سن ۱۹۵۳ء کو بغداد میں ادا کی گئی۔ حسنِ اتفاق سے یہی شاہ موصوف کی سالگرہ کا بھی دن تھا۔ تاجپوشی کے موقع پر مختلف سلطنتوں کے نمایندے موجود تھے۔ اس تقریب میں شرکت کرنے کی غرض سے ایک وفد ڈاکٹر سید محمود کی قیادت میں ہندوستان سے بھی گیا تھا۔ اس وفد کا عراقی باشندوں نے بہت پُر تپاک خیر مقدم کیا۔

جس وقت شاہ فیصل کی سواری بازاروں سے گذرتی ہوئی پارلیمنٹ کی طرف جا رہی تھی آفتاب پوری آب و تاب سے شہر کے مختلف میناروں کو اپنی کرنوں سے منوّر کر رہا تھا اور ہزاروں آدمی شاہ کے دیدار کی غرض سے سڑکوں کے دو طرفہ کھڑے تھے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے مشترک اجلاس میں آئین سے وفاداری کا حلف لینے کے بعد شاہ بڑے تزک و احتشام سے محل کی طرف روانہ ہوئے۔

شاہ فیصل کا سن اس وقت ۱۸ سال ہے۔ آپ ۲ رمئی سن ۱۹۳۵ء کو پیدا ہوئے تھے۔ آپ کی تعلیم ہیرو Harrow میں ہوئی ہے۔ آپ نے انگریزی بچپن ہی سے اپنی اسکاچستانی دایہ مس بورلینڈ سے سیکھی اور موصوف اپنی مادری زبان کی طرح انگریزی بھی بڑی روانی سے بولتے ہیں۔ اپنے والد شاہ غازی الاول کے موٹر کے تصادم کے حادثے میں وفات پانے پر آپ ۴ راپریل سن ۱۹۳۹ء کو بادشاہ بنے تھے۔ لیکن اس پندرہ سال کے دوران میں ان کے چچا امیر عبدالالہ ان کے عوض ریجنٹ کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور اب ۱۸ سال کی عمر ہونے پر آپ کی تاجپوشی کی باقاعدہ طور پر رسم ادا کی گئی ہے۔

عراق جزیرہ نمائے عرب کے شمال مشرق میں تقریباً ایک لاکھ بیچیتر ہزار مربع میل وسیع عرب ریاست ہے جس کا تقریباً ایک لاکھ سولہ ہزار مربع میل رقبہ قابلِ سکونت ہے۔ اس کے شمال میں ترکی، مشرق میں ایران، مغرب میں شام، اردن اور سعودی عرب اور جنوب میں کویت اور خلیج فارس واقع ہے۔ نومبر سن ۱۹۴۷ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ۴۷۹۹۵۰۰ ہے۔ اس کا دارالحکومت بغداد ہے۔ خلیج فارس پر اس کی ایک بندرگاہ بھی ہے جو بصرہ کہلاتا ہے۔

یہ علاقہ پہلے 'میسو پوٹامیہ' کے نام سے مشہور اور سلطنت عثمانیہ میں شامل تھا لیکن جنگِ عظیم کے بعد اسے برطانیہ کا حکمبردار علاقہ قرار دے کر یہاں عرب ریاست قائم کر دی گئی تھی۔ سن ۱۹۲۱ء میں جب امیر فیصل شام کی ریاست سے محروم کر دئے گئے تو انھیں عراق کا بادشاہ بنا دیا گیا۔ حکمبرداری کی شرائط کے تحت یہاں ایک 'مجلس نمائندگان' مقرر کی گئی جس نے ۱۹۲۲ء میں نیا دستورِ حکومت نافذ کر کے 'ملوکیت' کو محدود کر دیا، ذمّہ دار حکومت قائم کی اور دو ایوانات پر مشتمل ایک پارلیمنٹ کا قیام عمل میں لائی۔

عراق کا ایوانِ زیریں ڈیڑھ سو (۱۵۰) منتخبہ نمایندوں اور ایوانِ اعلیٰ بیس (۲۰) نامزد اراکین پر مشتمل ہے۔ سن ۱۹۳۰ء میں امیر فیصل اوّل کے انتقال کے بعد اُن کے فرزند غازی الاوّل تخت نشین ہوئے۔ سن ۱۹۳۹ء میں موٹر کے تصادم کے حادثے سے آپ کا انتقال ہو گیا اور آپ کی جگہ آپ کے کمسن فرزند شاہ فیصل ثانی کو تخت نشین قرار دیا گیا۔

اقتصادی زندگی

عراق دراصل ایک زراعتی ملک ہے جس کی زراعت کا دار و مدار زیادہ تر وہاں کی آبپاشی کے وسیع نظام پر ہے۔ اس کا تقریباً ۳۵ ہزار مربع میل رقبہ قابلِ زراعت ہے۔ یہاں کی خاص پیداواریں جَو، کھجور، روئی، تمباکو اور پھل ہیں۔ محکمہ زراعت یہاں کھیتی باڑی کے جدید طریقے کامیابی سے رائج کر رہا ہے۔ اس ملک کی اقتصادیات میں مویشیوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کھجوروں کی تمام دنیا کی پیداوار میں عراق کا حصّہ ۴/۵ ہے۔

تیل

اگرچہ عراق کے باشندے سیکڑوں سال سے اپنے ملک کے تیل کو متعدد مقاصد کے لئے استعمال کرتے چلے آرہے ہیں لیکن اس کی صنعتی اہمیت کا احساس موجودہ صدی کے ابتدائی زمانے میں اس وقت پیدا ہوا جبکہ برطانی اور امریکی ماہرین کو اس سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اس کے بعد سے عراق

پٹرولیم کمپنی، موصل پٹرولیم کمپنی، بصرہ پٹرولیم کمپنی وغیرہ وغیرہ وجود میں آئیں۔

تعلیم

عراق کے موجودہ تعلیمی نظام کو حق بجانب طور پر قومی، جمہوری اور ترقی پذیر کہا جا سکتا ہے۔ یہ نظامِ تعلیم قومی اس لحاظ سے ہے کہ اس میں موجودہ نسلوں میں قومی احساس پیدا کرنے اور ان پر عربی تہذیب و تمدن میں عراقی روایات کی مرکزیت واضح کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے یہ نظام جمہوری اس لحاظ سے ہے کہ اس کا مقصد عراق کی آبادی کے ہر طبقے کے لئے تعلیم حاصل کرنے کے مساوی مواقع بہم پہنچانا ہے۔ چنانچہ اس نظام کے تحت بعض صورتوں میں ابتدائی اور ثانوی (مفت) تعلیم کا انتظام موجود ہے۔ یہ نظام نسل، قوم یا ذات پات کے امتیاز سے بالکل مبرا ہے اور یہ تعلیمی نظام ترقی پذیر اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ مغربی تعلیم کی تمام بہتریوں اور برتریوں کی قدر کرتا ہے اور مغربی نظامِ تعلیم سے وابستہ سماجی، صنعتی اور حفظانِ صحت کے مسائل سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔

تعلیم کا یہ نظام تین منزلوں پر مشتمل ہے۔ ابتدائی تعلیم کے چھ سال اور ثانوی تعلیم کے پانچ سال کے بعد اعلیٰ تعلیم کی منزل آتی ہے۔

عراق میں ابتدائی اور ثانوی مدرسوں کے علاوہ اعلیٰ تعلیم کے مدارس بھی موجود ہیں جن میں مختلف علوم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مثلاً ادب، قانون، انجینیری، طب، فوجی تعلیم وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ یہاں فنونِ لطیفہ کے ادارے، آثارِ قدیمہ کے محکمے، سائنسی انجمنیں، کتب خانے اور عجائب خانے بھی ہیں۔

صحافت

عراق میں کافی صحافتی سرگرمی پائی جاتی ہے۔ یہاں تقریباً ڈیڑھ درجن معیاری قسم کے "روزانہ اخبارات" شائع ہوتے ہیں اور غالباً اتنی ہی تعداد میں رسالے اور گزٹ وغیرہ نکلتے ہیں۔

آثارِ قدیمہ

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بیرونِ عراق دنیا میں عراق کے نام کے ساتھ ساتھ دو چیزیں وابستہ سمجھی جاتی ہیں۔ ایک تیل کے چشمے اور دوسرے آثارِ قدیمہ۔ مغرب کے عالموں اور تحقیق و تفتیش کے دلدادہ افراد نے سیکڑوں برس پہلے سے بابل اور نینوا کے چکر لگانا شروع کر دئے تھے۔

عراق میں مسلمانوں کی مشہور و معروف زیارت گاہوں، مدفنوں اور متبرک مقامات کے علاوہ دوسرے مذہب کے لوگوں کے مقبرے بھی محفوظ ہیں۔ مثلاً یہودی مذہب، کلدانی قوم اور شام کے کیتھولک مذہب والوں کے مقبرے۔

عراق اپنے محلِ وقوع کے اعتبار سے۔ نیز ان حالات کے پیشِ نظر جو مشرقِ وسطیٰ میں برابر رونما ہو رہے ہیں خاص اہمیت رکھتا ہے لیکن عراق میں دوسرے عرب ممالک سے زیادہ جمہوری رجحانات پائے جاتے ہیں۔ حال ہی میں وہاں کے عوام نے اپنے پارلیمانی نمائندوں کو براہِ راست منتخب کرنے کا حق حاصل کیا ہے۔ یہ ان کی جمہوریت پسندی کا نمایاں ثبوت ہے۔ خواتین بھی ووٹ دینے کا حق حاصل کرنے کی جد و جہد میں منہمک ہیں اور عوامی کابینہ عوام کی بھلائی کے لئے بہت کچھ کام انجام دے رہی ہے۔ اس وقت یہاں کے وزیرِ اعظم جنرل نورالدین محمود ہیں۔

شاہ فیصل ثانی اگرچہ جوان العمر ہیں لیکن عراقی عوام کو امید ہے کہ وہ اپنے ملک کو نازک صورتِ حال سے نکال لے جائیں گے کیونکہ انہیں ملک کی ہر جماعت کا تعاون حاصل ہے۔

اعلیٰ تعلیمی اداروں کی مکمل فہرست

مرکزی وزارت نے ۳۱ مارچ ۱۹۵۳ء تک کی بھارتی یونیورسٹیوں و اعلیٰ تعلیمی اداروں کی مکمل فہرست شائع کی ہے۔ اس فہرست میں مندرجہ ذیل یونیورسٹیوں کی ترتیب علیحدہ علیحدہ ہے ایسی یونیورسٹیاں جن میں طلباء کی رہائش کے انتظامات موجود ہیں۔ ایسی یونیورسٹیاں جن سے کچھ کالج ملحق ہیں اور ایسی یونیورسٹیاں جن سے دوسرے کالج ملحق نہیں اور جو اپنے طور پر طلباء کو تعلیم دینے کے انتظامات کرتی ہیں۔

علاوہ ازیں فہرست مذکورہ میں ہر یونیورسٹی سے ملحق کالجوں کے نام درج ہیں۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کس کالج میں کون کون سے مضامین کی پڑھائی کا انتظام ہے۔

سائنسی، تحقیقی اداروں و ادبی اداروں کے نام بھی اس فہرست میں درج ہیں۔ کانکنی سے متعلقہ قومی اسکول (انڈین سکول آف مائنز) اور بنگلور کے سائنسی ادارہ (انڈین انسٹیٹیوٹ آف سائنس بنگلور) کے نام بھی فہرست میں شائع کئے گئے ہیں۔ یہ دونوں ادارے کسی یونیورسٹی سے ملحق نہیں ہیں۔

ہماری ریلیں

فولادی گھوڑے سے موجودہ ریلوے انجن تک

بھارت میں ریلیں جاری ہونے سے پہلے سفر کرنا بڑا کٹھن اور پُرخطر تھا۔ مغلوں اور مرہٹوں کی بنائی ہوئی سڑکیں اور شاہراہیں زمانے کے انقلابات کے ساتھ ساتھ برباد ہوگئی تھیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اپنی ہی ترقی کے مسائل میں اُلجھی رہتی تھی۔ گاؤں کے لوگ ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ بلکہ اُن کے درمیان کوئی تجارتی یا کاروباری رشتہ بھی قائم نہ تھا۔

اس زمانے میں رسل و رسائل کا ذریعہ محض دریاؤں اور نہروں میں کشتی رانی تک محدود تھا اور وہ بھی کوئی اچھا نہ تھا۔ نقل وحمل کا ذریعہ بھینسیں، اونٹ اور بیل تھے اور اُن کے اخراجات ناقابلِ برداشت ہوتے تھے۔

یہ ایک مصدقہ امر ہے کہ ناگپور اور امراؤتی کی روئی مرزاپور لے جانے میں (جو پانسو میل کا فاصلہ ہے) دوسو روپیہ فی ٹن کا خرچہ برداشت کرنا پڑتا تھا۔ برسات کے موسم میں حالات اور بھی بگڑ جاتے تھے۔ باربردار جانور دلدل اور کیچڑ میں پھنس کر مر جاتے تھے۔ ناپ تول کے اوزان بھی ہر گاؤں کے جُدا جُدا ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ سکّہ بھی مختلف مقامات پر مختلف ہی ہوتا تھا۔

سیاسی صورتِ حال کے مستحکم ہونے کی بدولت رسل و رسائل کی حالت میں بھی ترقی ہوئی۔ چنانچہ ۱۷۸۵ء میں کلکتہ سے مرھانک گرانڈ ٹرنک روڈ کی تعمیر اور مرمت کا کام شروع کیا گیا۔ فوجی سڑکیں تعمیر کی گئیں۔ ۱۸۳۹ء اور ۱۸۴۹ء کی درمیانی مدت میں ساڑھے تین کروڑ روپے کی لاگت سے ۳۰ ہزار میل لمبی سڑکیں تعمیر کی گئیں۔

سب سے پہلے ۳۲-۱۹۳۱ء میں صوبہ مدراس میں ریل کی پٹڑیاں بچھانے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ دریائے کاویری کے کنارے ڈیڑھ سو میل لمبی لائن تعمیر کی گئی جس کی لاگت فی میل آٹھ ہزار روپے تھی۔ اس اسکیم کے تحت ریل کی پٹڑیاں اور سڑک ایک دوسرے کے متوازی بچھائی گئیں اور گاڑیاں جانوروں کے ذریعے کھینچی جاتی تھیں۔

ایشیا کی پہلی ریلوے ٹرین

ایشیا کی پہلی ریل گاڑی بھارت میں پوری ایک صدی پہلے سنیچر وار ۱۶۔ اپریل ۱۸۵۳ء کو بمبئی سے تھانہ تک چلائی گئی تھی۔ اس ریل گاڑی میں تین انجن اور چار پہیئے والے چھوٹے ڈبے لگے ہوئے تھے۔ اور اُن میں پانسو اشخاص نے سفر کیا تھا۔

اس تاریخی موقعے پر بمبئی میں لوگوں نے مسرّت اور جوش وخروش کا اظہار کیا۔ ہزارہا کی تعداد میں مرد، عورت اور بچّے ٹرمینس سے لے کر پٹڑی کے ساتھ ساتھ اکھٹے ہوکر بمبئی اور تھانے کے درمیان تقریبًا ۲۱ میل کے فاصلے پر چلنے والی پہلی ریل گاڑی کے اس نئے واقعے کو دیکھنے کے لئے تعجب بھری نگاہوں سے انتظار کر رہے تھے۔

بوری بندر پر مہمانوں کے استقبال کے لئے مغربی اور مشرقی طرز پر خوبصورتی سے سجائے ہوئے شامیانے لگائے گئے تھے۔ خواتین محوِ تبسّم اور مرد اپنے کارنامے سنانے میں محو تھے، اور گاڑی کے روانہ ہونے کا وقت نزدیک آ رہا تھا۔ شام کے ساڑھے تین بجے سینٹ جارج کے مقام پر شاہی سلامی دی گئی اور اس کے بعد گورنر کے بینڈ نے، جو کہ ایک ڈبے میں سوار تھا قومی گیت اور شریلے راگ سنائے گئے۔

لوگوں کے جوش کی کوئی انتہا نہ رہی جب تین انجن اس تاریخی سفر کے لئے تیار ہوکر لائن پر آ کھڑے ہوئے۔ چار بجنے میں پچیس منٹ پر آگے والے انجن نے رُک رُک کر ایک لمبی سیٹی دی اور بھاپ نکالتا ہوا ...

کی طرف اپنا سفر طے کرنے کے لئے روانہ ہوگیا۔

تماشائیوں میں تعجب اور پسندیدگی کی ایک لہر دوڑ گئی اور بعض لوگوں نے ہپ ہپ ہرّے کے نعرے لگائے اور تالیاں بجائیں۔ بہت سے لوگوں نے اپنی چھتریاں اور بعض نے اپنی ٹوپیاں اور پگڑیاں ہوا میں اُچھالیں۔

یہ واقعہ اُن مرد اور عورتوں کے لئے جنھوں نے پہلے ایسی چیز کبھی نہ دیکھی ہو اور نہ ہی یہ خیال کیا ہو کہ ایسا ممکن ہو سکتا ہے، ناقابلِ فراموش ہے۔ اُس دن بھارت میں پہلی ریلوے کا آغاز ہوا۔

گاڑی چلتی گئی اور بائیکلہ کے مکانوں سے گزر کر ماہیم اور سیون کے علاقے میں داخل ہوگئی۔ گاڑی سیون کے مقام پر جا کر رُکی، کیونکہ وہاں انجن کو پانی لینا تھا۔

بمبئی سے تھانہ پہنچنے میں گاڑی کو ۷۵ منٹ لگے۔ تھانہ پر لوگوں کے بہت بھاری ہجوم نے بڑے جوش و خروش سے گاڑی کو رُکتے ہوئے دیکھا اور بڑے زور سے تالیاں بجائیں۔

تھانے کے مقام پر اُس زمانے کے لحاظ سے اعلےٰ طریقے پر سجائے ہوئے خوبصورت شامیانوں میں چار سو آدمیوں کو ایک پُرتکلف دعوت دی گئی جس میں اُس موسم کی ہر مزیدار اور لذیذ چیز شامل کی گئی تھی۔

کمپنی کے سینئر ڈائرکٹر میجر سوانسن نے جو اس وقت بطور چیرمین کام کر رہے تھے، ہر میجسٹی ملکہ وکٹوریہ کی صحت کے لئے جام پیش کیا۔ دوسرا جام سر ولیم یارڈے نے پیش کیا، اور اس طرح وہ تاریخی دن ختم ہوگیا۔

ریلوں کے انجن

بھارتی ریلیں کل چونتیس ہزار میل طویل ہیں۔ اور یہ ریلیں ایک ارب مسافر اور دس کروڑ ٹن سالانہ مال و اسباب آٹھ ہزار تین سو انجنوں کے ذریعے ڈھوتی ہیں۔ انجن زیادہ تر اسٹیم سے چلنے والے اور مروّجہ طرز کے ہیں۔ اس تعداد میں بہتر بجلی سے چلنے والے انجن، سترہ ڈیزل اور بجلی کے یونٹ پانچ اسٹیم سے چلنے والے۔ ستائیس ڈیزل سے چلنے والے ریل گاڑیاں اور ایک سو بارہ الیکٹرک موٹر کوچیں بھی شامل ہیں۔

مستقبل میں بھی بھارتی ریلوں میں اسٹیم انجن ہی نقل و حرکت کا خاص ذریعہ رہے گا۔ کیونکہ اوّل تو بھارت میں اسٹیم کوک کے کثیر ذخیرے موجود ہیں۔ دوسرے ریلوں کو بجلی اور ڈیزل آئل سے چلانے میں لاگت بہت زیادہ آتی ہے۔ اس صورتِ حال کے تحت ریلوں کو اسٹیم انجن میں اصلاح و ترقی کے پیشِ نظر بیس سال تک تحقیقاتی کاموں کو جاری رکھنا پڑے گا۔

جدید معیار کے انجن بہت خوبیوں کے حامل ہیں۔ ان کی بدولت اسٹور اور تحفظی مسائل بہت سہل ہو جائیں گے، اور زیادہ انجن رکھنے کی ضرورت بھی نہ رہے گی اور یہ امور اقتصادی نقطۂ نظر سے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

بھارت کے ریلوے انجنوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ انجن کی طاقت اعلیٰ اور معقول بنائی جائے۔ پچھتّر برس گزرے بھارتی ریلوں میں معیاری طرز کے اسٹیم انجن کو رائج کیا گیا۔ مگر چند ریلوے کمپنیوں نے اُسے منظور نہ کیا بالآخر ۱۹۰۱ء میں برٹش انجنیرنگ اسٹینڈرڈز ایسوسی ایشن کے انجن رائج کئے گئے۔ جو آج چالیس برس سے زیرِ استعمال ہیں لیکن ان میں گھٹیا قسم کا کوئلہ استعمال ہوتا ہے۔ بھارتی ریلوں کے انجنوں کا معیار قائم کرنے کی غرض سے ۱۹۲۵ء سے پہلے لوکوموٹیو اسٹینڈرڈز کمیٹی قائم کی گئی۔ اس کمیٹی نے دیگر کمیٹیوں کے تعاون سے انجنوں کے اٹھارہ درجے مقرر کئے جن کو ۱۹۲۸ء اور ۱۹۳۰ء سے استعمال کیا گیا۔ بھارتی ریلوں میں انجنوں کی کارکردگی پر نظر ڈالنے سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ کم از کم چالیس درجوں (کلاسوں) کے انجن ضروریات کو پورا نہیں کرتے — ۱۹۳۵-۳۶ء میں ریلوے بورڈ نے محسوس کیا کہ مزید درجوں کے اضافے کی ضرورت ہے۔ انڈین ریلوے اسٹینڈرڈز کی فہرست میں خاص طرز کے انجن شامل کر دیئے گئے۔ اور انجن کے درجوں کی تعداد ۲۳ ہوگئی۔

جنگ کے فوراً بعد انجنوں کی صورتِ حال کا جائزہ لیا گیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ گزشتہ زمانے میں انجن برطانوی طرز کے مطابق طیار کئے جاتے تھے۔ لیکن اب بھارتی معیار کے انجنوں میں وہ خصوصی ڈیزائن بھی شامل کر دینے چاہئیں جو ۱۹۴۴-۴۶ء کی مدت میں موصول ہونے والے انجنوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ۱۹۳۷ء اور ۴۶ کے درمیان ریلوں کو پتھر کا کوئلہ استعمال کرنے کی دقت بھی پیش آئی۔

آخر کار طے پایا کہ ڈبلیو۔ یو۔ ڈبلیو ایم۔ اور ڈبلیو۔ ڈبلیو طرز کے انجنوں کو استعمال
کیلئے باقی رکھا جائے۔ اور دیگر کاموں کے لئے نئے طرز کے انجن طیار رکھے جائیں۔
دو فٹ اور ڈھائی فٹ چوڑی پٹریوں کے لئے ڈیزل انجن طیار کرنے کی اسکیم
مرتب کی گئی۔

انجن کے نئے نمونے میں ایندھن کی کھپت کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا ہے
کیونکہ ایندھن کی لاگت انجن کی طاقت کے تحفظ اور فراہمی کی لاگت کے
برابر پڑتی ہے۔ تاہم دس پندرہ سال کی مدت میں انجن کے عمدہ اور نئے
معیاروں کے لئے ایک اسکیم مرتب کرنی پڑے گی اور پانچ سالہ پلان
کی بدولت اچھے اور بڑے انجنوں کی مانگ بھی بڑھ جائے گی۔

سفر کو محفوظ بنانے کے اقدامات

آغاز میں ریلوے سفر کتنا خطرناک تھا اس امر کا اندازہ جان رسکن
کے ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے یکم مارچ ۱۸۸۳ء کو لنکا شائر
سے تحریر کئے۔ ریل گاڑیوں سے اظہار نفرت کرتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ
"ریلوے سفر قتل عام کو دعوت دینے کے مترادف ہے"۔ جان رسکن کے یہ
الفاظ حقیقت سے دور نہیں تھے۔ کیونکہ شروع شروع میں ریل گاڑیوں کی
آمد و رفت کو قابو میں رکھنے کے لئے سگنل دینے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔
بیان کیا جاتا ہے کہ دنیا میں پہلی بار انگلستان میں ہرٹل پول کے مقام پر
اسٹیشن ماسٹر کی میز پر ایک موم بتی گاڑ کر اس سے سگنل کا کام لیا گیا تھا۔

بھارت میں ریلوے سسٹم کے آغاز میں گھومنے والی روشن طشتریوں
کو سگنل کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ بعد ازاں ریلوں کی آمد و رفت کا
اشارہ کرنے والے سگنل لگائے گئے بھارت میں معیاری سگنلوں کا
استعمال ۱۸۹۲ء میں شروع ہوا۔ اس سلسلے میں ابتدائی تحقیق کا کام
مسٹر جی۔ ایچ لسٹ نے کیا۔ ۱۸۹۲ء میں مسٹر لسٹ نے مسٹر اے مورس
کے تعاون سے لاہور اور غازی آباد کے درمیان اکہری لائن کے
۲۸ ریلوے اسٹیشنوں پر سگنل کے بہتر سسٹم کا نفاذ کیا اور اس کا نام لسٹ
اینڈ مورس سسٹم رکھا گیا۔ بھارت کے بعض ریلوے اسٹیشنوں پر آج بھی یہ سسٹم
جاری ہے۔ جہاں تک مختلف سگنلوں کے اندرونی رابطے کو قائم رکھنے کا
تعلق ہے۔ ۱۹۰۵ء کے بعد نارتھ ویسٹرن ریلوے کے سگنل انجینئر لاس ہیٹر
چابیوں کی ترسیل کے لئے بجلی کا ٹرانسمٹر ایجاد کیا۔

گذشتہ تیس سال کے دوران میں ریلوے سفر کو زیادہ سے زیادہ محفوظ بنانے
کے لئے سگنلوں اور ان کے اندرونی رابطہ اور دور تک پیغام رسانی کے طریقوں
میں نمایاں بہتری ہوئی ہے۔ بھارتی ریلیں آٹومیٹک (خود بخود کام کرنے والے)
سگنل اور ریل گاڑیوں کی آمد و رفت پر آٹومیٹک کنٹرول وغیرہ کے جدید
طریقے اپنانے میں دوسرے ممالک سے پیچھے نہیں رہیں۔ ان اقدامات نے
ریلوے سفر کو بڑا محفوظ بنا دیا ہے۔ مثال کے طور پر بھارت کے بعض اہم ریلوے
اسٹیشنوں پر بجلی کے ذریعے یہ معلوم کرنے کے انتظامات کئے گئے ہیں کہ کس خاص
وقت پر ریلوے لائن کا کوئی خاص حصہ خالی ہے یا اس پر سے کوئی گاڑی گزر
رہی ہے۔ اس طرح سگنل پر کنٹرول قائم رکھنے میں مدد ملتی ہے۔ بجلی کے ذریعے
حرکت میں آنے والے سگنل کے نفاذ سے ریلوے سفر اور بھی زیادہ محفوظ ہو گیا
ہے۔ بمبئی۔ کلکتہ اور مدراس وغیرہ بڑے اسٹیشنوں پر یہ سسٹم جاری ہے۔
ریلوں کی آمد و رفت پر کنٹرول کے سلسلے میں پیغام رسانی کے جدید ذرائع
ٹیلیفون، ٹیلی پرنٹر اور وائرلیس وغیرہ سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ گاڑیوں
کی آمد و رفت کے بلاک سسٹم کے مطابق کوئی بھی ریل گاڑی اگلے ٹھہراؤ کے
اسٹیشن سے اجازت کی موصولی کے بغیر آگے حرکت نہیں کر سکتی۔ اس طرح
دو اسٹیشنوں کے درمیان ایک وقت میں ایک ہی گاڑی حرکت میں رہتی ہے۔
اور حادثہ پیش آنے کا خطرہ نہیں رہتا۔ ریل گاڑیوں کی رفتار میں اضافہ
سب سے زیادہ اسی سسٹم کا مرہون منت ہے۔

حال ہی میں ریلوے وزارت نے سگنل اور دور تک پیغام رسانی
کی شاخوں کو ایک دوسرے سے ملا دینے کا اہم قدم اٹھایا ہے۔ اس طرح
ریلوے سفر کو مزید محفوظ بنانے سے متعلق اہم امور کی طرف زیادہ توجہ دی
جا سکے گی۔

بجلی سے چلنے والی ریل گاڑیاں

ریلوں کے ذریعے نقل و حمل میں بھاپ سے چلنے والے انجنوں کے
کردار کو اگرچہ اب بھی نمایاں حیثیت حاصل ہے تاہم بجلی سے چلنے والے ریلوے
انجن آہستہ آہستہ ان کی جگہ لے رہے ہیں۔ مسافروں کے لئے بجلی کے انجنوں
کا استعمال تیز رفتاری کے علاوہ اس لحاظ سے بھی زیادہ مفید ہے کہ انھیں
سفر کے دوران میں کوئلے کے دھوئیں سے پریشان نہیں ہونا پڑتا۔ بجلی کے ذریعے
سے چلنے والے انجنوں کا خرچ مقابلتاً کم بیٹھتا ہے اور ان کے استعمال سے

کوئلے کی کھپت میں بھی کافی بچت کی جا سکتی ہے۔ بجلی کے انجن کا ایک اور
فائدہ یہ ہے کہ اس کو چلانے کے لئے مقابلتاً کم عملے کی ضرورت ہے۔

سب سے پہلے ۱۸۲۵ء میں انگلستان میں گلاسکو اور ایڈنبرگ کے ریلوے
اسٹیشنوں کے درمیان بجلی کے ذریعے ریلوے انجن چلانے کا تجربہ کیا گیا تھا۔
بھاپ سے چلنے والے ریلوے انجنوں کے انجنیروں میں اس واقعے سے بڑی
گھبراہٹ پیدا ہوئی لیکن یہ تجربہ ناکام رہا اور ۱۸۹۰ء تک اس سلسلے میں
کوئی قابل ذکر ترقی نہ ہوئی۔ آغاز میں ٹرام کاریں چلانے کے لئے بجلی کا
استعمال کیا گیا اور بھارت کے بڑے بڑے شہروں میں آج کل بھی ٹرام،
آمد و رفت کا سب سے سستا ذریعہ ہے۔ بھارت میں ۱۹۱۲ء میں بمبئی اور
مدراس کی نواحی ریلوں کو بجلی کے ذریعے چلانے پر غور کیا گیا تھا لیکن پہلی
عالم گیر جنگ چھڑ جانے سے یہ اسکیم سرے نہ چڑھ سکی۔ چنانچہ بھارت میں ریلوں
کو بجلی کے ذریعے چلانے کا آغاز ۱۹۲۵ء میں ہوا۔

بجلی کی ٹرینوں کے چلنے سے بمبئی کی نواحی بستیوں میں بڑی ترقی ہوئی ہے
اور ان کی آبادی میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۳۰ء کی ۵ لاکھ آبادی کے مقابلے
میں ۱۹۵۰-۵۱ء میں ان بستیوں کی مجموعی آبادی ۵۳ لاکھ تھی۔ بدقسمتی سے برقی
قوت کی کمی کے باعث بمبئی کی نواحی بستیوں میں ریل گاڑیوں کی آمد و رفت کے
سلسلے کو بہتر بنانے کے پروگرام میں رکاوٹ پیدا ہوئی ہے۔ البتہ کلیان
میں ریلوے پاور ہاؤس کے قیام سے صورت حال بہتر ہو گئی ہے اور بمبئی
کی نواحی بستیوں میں ریل گاڑیاں چلائی جا رہی ہیں۔ بمبئی سے اگات پور اور
پونہ تک بجلی کی ٹرینیں چلانے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس علاقے کی پہاڑی خاصیت
کے پیش نظر بھاپ سے چلنے والے انجنوں کے ذریعے مسافر و مال گاڑیوں
کی آمد و رفت مقابلتاً زیادہ دشوار ثابت ہو رہی تھی۔ اب دکن کوئن ریلوے
بمبئی اور پونہ کے درمیان ۱۱۲ میل کا سفر تین گھنٹے سے کم وقت میں طے
کرتی ہے۔

بجلی کے ذریعہ ریل گاڑیوں کی آمد و رفت کے پیش نظر ریلوے بورڈ
نے ۱۹۴۶ء میں مختلف ریلوں کے مختلف سیکشنوں پر بجلی کی ٹرینیں چلانے کے
امکانات پر غور کیا۔ ۷۰۰ میل طول کے مختلف سیکشنوں پر بجلی کی ٹرینیں چلانے
کے مصارف کا تخمینہ ۵۰ کروڑ روپے لگایا گیا لیکن اتنے بھاری اخراجات
وسیع پیمانہ پر اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں مانع ثابت ہوئے۔

پلان کے دوران میں اس اسکیم پر عمل شروع کرنے کے خیال سے تمام اسکیم
کا از سر نو جائزہ لینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ کوئلے وغیرہ کے استعمال میں بچت
کے ذرائع تلاش کرنے سے متعلقہ کمیٹی اور بھارت سرکار کی مقرر کردہ کچھ
دوسری کمیٹیوں نے دو ہزار میل طول کی ریلوے لائن پر بجلی کی ٹرینیں چلانے
کی سفارشات پیش کی ہیں۔

تیسرے درجے میں سفر

گزشتہ ۵ سال کے دوران میں بھارتی ریلوں پر نچلے درجے کے سفر کو
زیادہ آرام دہ بنانے کے لئے مزید سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔ ۱۹۵۲-۵۳ء
میں اس مقصد کے لئے ۳ کروڑ روپے صرف کرنے کی گنجائش رکھی گئی تھی،
اور ۱۹۵۳-۵۴ء میں بھی اتنی رقم خرچ کئے جانے کا امکان ہے۔ ریلوں
کی آمدنی کا بڑا حصہ تیسرے درجے کے مسافروں سے وصول ہوتا ہے۔
لہٰذا انھیں زیادہ سے زیادہ سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے طے شدہ پروگرام
کے مطابق عمل کیا جا رہا ہے۔ جنتا ایکسپرسوں کے چلنے سے تیسرے درجے
کے لمبے سفر میں انقلابی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ اس سے دوہرا فائدہ ہوا
ہے۔ اوّل یہ کہ دوسری ڈاک گاڑیوں و ایکسپریس گاڑیوں میں بھیڑ کم
ہو گئی ہے۔ اور دوئم یہ کہ جنتا ایکسپریسوں کی رفتار تیز ہونے کے باعث لمبا سفر
کم وقت میں اور آرام سے کٹ جاتا ہے۔

تیسرے درجے کے مسافروں کو لمبے سفر کے لئے نشستیں ریزرو کرانے
کی سہولت دی گئی ہے۔ بھیڑ کو کم کرنے کے لئے ریل گاڑیوں کی تعداد میں اضافہ
کیا گیا ہے۔ ۱۹۵۲ء میں ۲۴۱ نئی مسافر گاڑیاں چلائی گئیں۔ ۱۹۵۲-۵۳ء کے
پہلے چھ مہینوں میں تیسرے درجے کے ڈبوں میں بجلی کے مزید تین ہزار پنکھے
لگائے گئے۔ تیسرے درجے کے جدید ڈبوں کی ساخت میں سفر کو زیادہ
آرام دہ بنانے کے خیال کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ لمبے سفر میں سونے کے لئے
جگہ کا انتظام کیا گیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ان ڈبوں میں منہ ہاتھ دھونے کے لئے
نلکوں کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ مختلف ریلوے اسٹیشنوں پر تین سو نئے ویٹنگ
ہال و کمرے (انتظار کے کمرے) زیر تعمیر ہیں جو جلد ہی پایۂ تکمیل کو پہنچ جائیں گے۔
چھوٹے اسٹیشنوں پر مسافروں کو گاڑیوں کے انتظار کی مدت کے دوران میں
زیادہ سہولتیں مہیا کرنے کی طرف خاص توجہ دی جا رہی ہے۔ بعض چھوٹے ریلوے
اسٹیشنوں پر بجلی کی روشنی کے انتظامات بھی کئے گئے ہیں۔ بعض جنکشن اسٹیشنوں

پر جہاں آٹومیٹک (خود بخود چلنے والی) ٹکٹ مشینوں سے کام لیا جا رہا ہے۔ مسافروں کو ٹکٹ خریدنے کے لئے زیادہ دیر لمبی قطاروں میں کھڑا نہیں رہنا پڑتا۔ گرمیوں میں مسافروں کو ٹھنڈا پانی مہیا کرنے کے لئے پچاس سے زائد ریلوے اسٹیشنوں پر بجلی کے ذریعے پانی ٹھنڈا رکھنے کے انتظامات کئے گئے ہیں۔ اس طرح مسافروں کو نہ صرف ٹھنڈا بلکہ صحت کے نقطۂ نگاہ سے بالکل صاف پانی پینے کو مل سکتا ہے۔ جن اسٹیشنوں پر گھڑوں کے ذریعے پانی پلانے کا انتظام ہے وہاں گرمیوں میں پانی پلانے والوں کی تعداد میں کافی اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ لمبے سفر میں تیسرے درجے کے مسافروں کو غسل کی سہولتیں بھی مہیا کی گئی ہیں۔ ناخواندہ مسافروں کو گاڑیوں کے اوقات اور ٹکٹ خریدنے وغیرہ سے متعلقہ امور کے بارے میں ضروری واقفیت بہم پہونچانے کے لئے بڑے بڑے ریلوے اسٹیشنوں پر گائڈ متعین کئے گئے ہیں۔

ریلوے کی عمارتیں

بھارتی ریلیں ترقی کے میدان میں کسی پہلو سے بھی پیچھے نہیں رہیں ٹیکنیکل امور میں ترقی کے علاوہ ریلوے کی بڑی بڑی عمارتوں کی تعمیر کی طرف بھی توجہ دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں وکٹوریہ ٹرمنس (بمبئی) اور چرچ گیٹ بمبئی کے انتظامیہ دفاتر کی عمارتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ وکٹوریہ ٹرمنس بلڈنگ گوتھک طرز کے فن عمارت سازی کا بہترین نمونہ ہے۔ اسی طرح ہوڑہ۔ مدراس کان پور۔ لکھنؤ اور دوسرے مقامات پر وقتاً فوقتاً ریلوے کی شاندار عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں بمبئی کے مرکزی اسٹیشن کی عمارت تعمیر کی گئی۔ آسام اور بھارت کے باقی حصوں کے درمیان ریلوں کی آمد و رفت کے سلسلے کے پیش نظر سنہ ۱۹۵۰ء میں سلیگری کے مقام پر ایک نیا ریلوے اسٹیشن تعمیر کیا گیا جو جدید فن عمارت سازی پر پورا اترتا ہے۔ چونکہ یہ مقام ایک ایسے علاقے میں واقع ہے جہاں اکثر زلزلہ آنے کا خطرہ رہتا ہے۔ اس لئے عمارت کے نمونے کی تیاری میں اس امر کو پیش نظر رکھا گیا ہے کہ زلزلے سے اسے زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ رہے۔ چترنجن میں ریلوے انجن تیار کرنے کے کارخانہ کی عمارت کا ذکر کرنا بھی موزوں ہوگا۔ علاوہ ازیں متعدد انتظامیہ دفاتر ٹیکنیکل اور ہائی اسکولوں، ہسپتالوں اور کلبوں وغیرہ کی عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں۔ ریلوے کی نئی عمارتوں کے نمونے قدرتی طور پر جدید فن عمارت سازی سے ہی مطابقت رکھتے ہیں۔

شروع شروع میں یورپ میں ریلوے اسٹیشنوں کی عمارتیں گھروں کی مانند معلوم ہوتی تھیں لیکن آہستہ آہستہ ان کی بناوٹ میں تبدیلی واقع ہوتی رہی۔ جدید طرز کے ایک بڑے ریلوے اسٹیشن کی تعمیر کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے۔ کیونکہ آج کل مسافروں کے آرام کے لئے ہال کمرے ویٹنگ روم کھانا کھانے کے کمرے اور سامان کی دیکھ بھال کے لئے خاص کمرے تعمیر کرنا ضروری ہے۔ علاوہ ازیں عملے میں اضافے کی وجہ سے انتظامیہ دفاتر کے لئے زیادہ جگہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ پارسلوں۔ ریلوے ڈاک اور ریلوے پولیس وغیرہ کے لئے علیحدہ کمرے تعمیر کرنا اور اسٹیشن سے باہر موٹروں وغیرہ کے ٹھہرنے کے لئے خاص جگہ کا انتظام کرنا بھی لازمی ہے۔ ان تمام مشکلات کے باوجود بھارت کی ریلوے عمارتوں کا مقابلہ دنیا کے دوسرے ترقی یافتہ ممالک سے کیا جا سکتا ہے۔ اب ریلوے اسٹیشنوں کی تعمیر میں نچلے درجے کے مسافروں کی سہولتوں کا زیادہ خیال رکھنے پر زور دیا جا رہا ہے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ نئے ریلوے اسٹیشنوں پر نچلے درجے کے مسافروں کے لئے بھی آرام کرنے کے کمرے تعمیر کئے گئے ہیں۔ ان کمروں کا بہت تھوڑا کرایہ وصول کیا جائے گا نچلے درجے کے مسافروں کے ویٹنگ ہالوں میں بھی زیادہ سہولتیں بہم پہنچانے کی طرف توجہ دی جا رہی ہے۔ ان میں بیٹھنے اور سونے کے تسلی بخش انتظامات کئے جائیں گے۔ نئی عمارتوں کی تعمیر میں وہ سہولتیں مہیا کرنا آسان ہے لیکن اس نقطۂ نگاہ سے پرانے ریلوے اسٹیشنوں کی بناوٹ میں ردّ و بدل کرنے میں زیادہ مشکلات پیش آتی ہیں۔ اس مقصد کے لئے کوئی جامع اسکیم مرتب کرکے اُسے آہستہ آہستہ ہی عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔ اگرچہ بھارت ایک غریب ملک ہے۔ تاہم ہوائی اڈّوں پر ہوائی کمپنیوں کے دفاتر کی مانند ریلوے اسٹیشنوں کو بھی مسافروں کے آرام کے نقطۂ نگاہ سے جدید شکل دینا لازمی ہے۔

اسکولوں، اسٹیشنوں اور دوسرے انتظامیہ و تحقیقی اداروں کی عمارتوں کے علاوہ ریلوں کے عملے کے لئے رہائشی مکانات کی تعمیر کے مسئلے کو بھی خاص اہمیت دی جا رہی ہے۔

بھارتی ریلوں کی سو سالہ سالگرہ کے سلسلے میں دہلی میں وسیع پیمانے پر نمائش کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس کی تعمیر میں بھی فنی معیار کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ نمائش کا وہ حصّہ جس میں ریلوں کی ترقی کے مختلف مدارج پر روشنی ڈالی گئی تھی اور ایک سو فٹ اونچا مینار خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

پنچ سالہ پلان

(مسلسل)

تعلیم

تعلیم کی ترقی کے لئے منصوبے میں ایک ارب ۵۵ کروڑ ۶۶ لاکھ روپے مخصوص کئے گئے ہیں۔ مجلسی کاموں پر کل جتنی رقم خرچ کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے مذکورہ بالا رقم اس کا ۷ء۴ فی صدی اور منصوبے کے کل اخراجات کا سات فی صدی ہے۔

مذکورہ بالا رقم میں سے ۹۳ کروڑ ۲ لاکھ روپے مرکزی حکومت کے ان پروگراموں کے لئے ہیں جن پر ریاستوں کی حکومتوں کے تعاون سے عمل ہوگا۔ تجویز یہ ہے کہ یہ رقم اعلیٰ تعلیم خاصکر ٹیکنیکل تعلیم اور بنیادی اور مجلسی تعلیم کے ان ملک گیر پہلوؤں پر خرچ کی جائے گی جن کے لئے بہت زیادہ تجربات اور کھوج کی ضرورت ہے۔ ٹیکنیکل تعلیم کے زمرے میں زیادہ تر زور مندرجہ ذیل کاموں کی ترقی پر دیا جائے گا۔ گریجویٹ ہو جانے کے بعد مطالعہ اور گریجویٹ سے کم تعلیمی معیار پر کام کو مجتمع کرنا اور بعض خاص قسم کے مضامین کے مطالعے کے لئے آسانیاں پیدا کرنا، مثلاً چھاپنے کا ہنر، اون اور ریشم سے متعلقہ ہنرمندی وغیرہ۔ گریجویٹ سے کم تعلیمی معیار کے لئے فن تعمیر اور شہروں کی تعمیر کے لئے منصوبہ بندی وغیرہ کی سہولتیں مہیا کرنا، یونیورسٹیوں میں انسانیات سے متعلقہ امور کے مطالعہ کو تقویت دینے کے لئے بھی روپیہ مخصوص کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ نئی دہلی میں ایک مرکزی قومی لائبریری قائم کرنے پر بھی غور کیا جا رہا ہے۔ بنیادی تعلیم کے بارے میں یہ توقع کی جاتی ہے کہ ہر ایک ریاست میں بنیادی تعلیم کا کم از کم ایک مکمل مرکز قائم کیا جائے گا جس میں بنیادی تعلیم سے پہلی جماعتوں کے اسکول سے لے کر گریجویٹ بن جانے کے بعد تک کے بنیادی ٹریننگ کالج ہوں گے۔ مقصد یہ ہوگا کہ تعلیم کے مختلف طریقوں کی ریسرچ کا کام جاری رکھا جائے۔ اور لٹریچر تیار کیا جائے۔ مجلسی تعلیم کے زمرے میں خاص کام حسب ذیل ہوں گے۔ اجتماعی مرکزوں کے ساتھ شامل اسکولوں اور مجلسی تعلیم کے کارکنوں کی تربیت کے لئے کالجوں کی ترقی۔ لٹریچر تیار کرنا اور سماعی و بصری طریقوں سے تعلیم مہیا کرنا۔

ریاستوں کے پروگرام

ریاستوں کے پروگرام کل ایک ارب پندرہ کروڑ ۹۸ لاکھ روپیہ یا ۲۳ کروڑ ۲۰ لاکھ روپیہ سالانہ اخراجات کے حامل ہوں گے۔ یہ اخراجات ۱۹۵۰-۵۱ء کے لئے ترقی کے اخراجات کی اٹھارہ کروڑ ۳۱ لاکھ روپیہ کی رقم سے ۲۷ فی صدی زائد ہوں گے۔ چونکہ مرکزی حکومت کے لئے مخصوص کی ہوئی رقم بھی ریاستوں ہی پر صرف ہوگی۔ اس لئے ریاستوں کے اپنے ذرائع کو تقویت حاصل ہوگی۔

مصارف کی زیادہ تر رقم مختلف معیاروں پر توسیع کی اغراض کے لئے صرف ہوگی۔ مختلف شعبوں میں مندرجہ ذیل نتائج حاصل ہوں گے۔

۱۔ ابتدائی تعلیم

ابتدائی اسکولوں کی تعداد میں سترہ فی صدی اور ان کے طلبہ کی تعداد میں ۲۵ فی صدی اضافہ ہوگا۔ اسی طرح نچلے درجے کے بنیادی تعلیم کے سکولوں کی تعداد میں ۲۲ فی صدی اور ان کے طلبا کی تعداد میں اکیاسی فی صدی کا اضافہ ہوگا۔ ابتدائی اور نچلے درجے کے بنیادی تعلیم کے اسکولوں کے طلبا میں سے چھ سے گیارہ برس کی عمر کے طلبا کی اوسط ۱۹۵۰-۵۱ء کی ۴۴ر۵ فی صدی کے مقابلے میں سال ۱۹۵۵-۵۶ء میں ۵۵ر۷ فی صدی ہوگی۔

۲۔ سیکنڈری تعلیم

سیکنڈری اسکولوں کی تعداد میں ۱۸ فی صدی اور ان کے طلبا کی تعداد میں ۲۳ فی صدی کا اضافہ ہونے کا اندازہ کیا گیا ہے۔ ۱۹۵۰-۵۱ء میں گیارہ سے سترہ برس تک کی عمر کے طلبا کی اوسط ۱۰ر۸ فی صدی اور اس کے مقابلے میں ۱۹۵۵-۵۶ء میں یہ اوسط ۱۳ر۳ فی صدی ہو جائے گی۔

۳۔ ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ تعلیم

(ماسوائے دستکاری سکولوں کے) درسگاہوں کی تعداد میں ۷۵ فی صدی اور تربیت پانے والے کی سالانہ تعداد میں ۴۶ فی صدی کا اضافہ ہوگا۔

صحت عامہ

پنج سالہ پلان میں صحت عامہ کے لئے جو پروگرام مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل تقدیمات شامل ہیں۔

۱۔ پانی کی فراہمی اور حفظانِ صحت کے لئے اقدام

۲۔ ملیریا کا انسداد

۳۔ صحت کے یونٹوں اور سفری یونٹوں کے ذریعے دیہاتی آبادی کو بیماریوں سے بچانے کے لئے اقدامات۔

۴۔ ماؤں اور بچوں کے لئے طبی سہولتیں۔

۵۔ تعلیم و تربیت اور تعلیم صحت۔

۶۔ مفرد ادویہ اور سازو سامان کی خود کفالت

۷۔ فیملی پلاننگ اور ضبطِ تولید۔

مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی طبی اور صحت عامہ کی اسکیموں (کے اخراجات) کی رقم ننانوے کروڑ پچاس لاکھ روپیہ ہوتی ہے۔ اس میں سے ۱۷ کروڑ ۸۷ لاکھ روپیہ کے قریب رقم مرکزی حکومت برداشت کرے گی۔ علاوہ ازیں مرکز اعلیٰ تعلیم، تحقیقاتی کاموں اور دیگر خصوصی اسکیموں میں بھی ریاستوں کی مدد کرے گا۔

طبی پروگراموں کے لئے ۴ کروڑ ۳۸ لاکھ روپیہ کا مجموعی خرچہ منظور ہوا ہے۔ اس رقم کا پچاس فی صدی حصہ ہسپتالوں اور شفاخانوں اور تقریباً چالیس فی صدی حصہ تعلیم و تربیت پر خرچ کیا جائے گا — آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ قائم کرنے کے علاوہ طبی تعلیم و تربیت کی اسکیموں کے تحت آسام، بمبئی، مدراس، مدھیہ پردیش، مغربی بنگال اور ٹراونکور کوچین کے نئے طبی کالجوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے گا۔ اسی ضمن میں موجودہ طبی اسکولوں کا پایہ بلند کیا جائے گا۔ اور امدادی طبی عملے مثلاً نرسیں، دائیوں اور کمپاؤنڈروں کی تربیت کا انتظام بھی شامل ہیں۔

توقع ہے کہ اسکیموں کو بروئے کار لانے سے تربیت یافتہ عملے کی تعداد میں حسب ذیل اضافہ ہوگا۔

	تعداد	تربیت یافتہ	
	۱۹۵۰-۵۱ء کے دوران میں	۱۹۵۵-۵۶ء کے اختتام پر	فی صد اضافہ
ڈاکٹر	۲۵۰۴	۲۷۸۳	۱۱٫۱
کمپاؤنڈر	۸۹۴	۱۶۲۱	۸۱٫۳
نرسیں	۲۲۱۲	۳۰۰۰	۳۵٫۶
دائیاں	۱۴۰۷	۱۹۳۲	۳۷٫۳
وید اور حکیم	۹۱۴	۱۱۱۷	۲۲٫۲

توقع ہے کہ ہسپتالوں اور شفاخانوں اور ان میں بستروں کی تعداد میں حسب ذیل اضافہ ہو جائے گا۔

اوسط

	۱۹۵۰-۵۱ء کے دوران	۱۹۵۵-۵۶ء تک	فی صد اضافہ
ہسپتالوں کی تعداد	۲۰۱	۲۰۶۲	۲٫۴
شفاخانوں کی تعداد			
شہری	۱۳۵۸	۱۶۹۵	۲۴٫۸
دیہاتی	۵۲۲۵	۵۸۴۰	۱۱٫۶
ہسپتالوں میں بستروں کی تعداد	۱۰۶۴۷۸	۱۱۷۲۲۲	۱۰٫۱
شفاخانوں میں			
بستروں کی تعداد شہری	۲۰۱۳	۲۲۳۳	۱۱٫۴
دیہاتی	۵۰۶۶	۵۵۸۲	۱۰٫۲

صحت عامہ کے پروگراموں پر مرکزی اور ریاستی حکومتوں کا ۵ کروڑ اڑتالیس لاکھ روپیہ خرچ ہوگا۔ اس رقم کا زیادہ حصہ پانی کی بہم رسانی، گندے پانی کی نالیوں اور انسداد ملیریا کی اسکیموں پر صرف کیا جائے گا۔ پنج سالہ پلان کو بروئے کار لانے کے دوران میں ۱۹۵۰-۵۱ء میں ترقی کے اخراجات کو ہر سال چار گنا کر دیا جایا کرے گا۔

بھارت میں صحت عامہ کے مسائل میں سب سے اہم ملیریا ہے لہٰذا اس کی روک تھام کو سب سے اعلیٰ تقدیم دی جائے گی۔ چنانچہ

اس مقصد کے لئے پلان میں سترہ کروڑ چار لاکھ روپیہ کی رقم ریاستوں کے لئے اور دس کروڑ روپیہ مرکز کے لئے ہے۔ ملیریا اسکیم کے تحت دیہاتی علاقوں میں ۲۰ کروڑ اشخاص کی حفاظت کے پیش نظر کیڑے مار دواؤں کو چھڑکنے کی کاروائیاں اور انسداد ملیریا کی مقرر دواؤں کے ذریعے علاج معالجہ کیا جائے گا۔

اس اسکیم میں "ڈی۔ ڈی۔ ٹی" کے دو کارخانوں کی تعمیر بھی شامل ہے تاکہ یہ دوا کافی مقدار میں کم قیمت پر فراہم ہوسکے۔ اس پروجیکٹ کے لئے سرمایہ مرکزی اور ریاستی حکومتیں مشترکہ طور پر فراہم کریں گی۔

ملیریا کے بعد صحت عامہ کا سب سے اہم مسئلہ تپ دق ہے اس سلسلے کی اسکیموں میں عام طور پر صحت گاہیں ہسپتال۔ تجربہ گاہیں مہیا کرنے کے علاوہ بستروں اور "بی سی جی" کا ٹیکہ لگانے والے دستوں کی تعداد میں اضافہ شامل ہیں۔ چنانچہ اس اسکیم کی بدولت ۱۹۵۰-۵۱ء کے مقابلے میں ۱۹۵۵-۵۶ء تک حسب ذیل اضافہ کی توقع ہے۔

	۱۹۵۰-۵۱ء		۱۹۵۵-۵۶ء	
	اداروں کی تعداد	بستروں کی تعداد	اداروں کی تعداد	بستروں کی تعداد
سینیٹوریا (صحت گاہیں)	۳۷	۶۱	۴۶	۵۷۵۶
ہسپتال	۴۸	۳۰۷۷	۵۰	۴۸۱۴
تجزیہ گاہیں (طبی)	۱۲۷	۲۳۴۳	۱۸۰	۲۵۶۲

جنسی امراض۔ زچہ وبچہ کی بہبودی، طبی تعلیم اور تحقیقاتی کام کے لئے بھی خاص طور پر سفارشات پیش کی گئی ہیں۔

بھارت کی آبادی میں حالیہ اضافہ اور ملک کے محدود ذرائع و وسائل پر دباؤ کی وجہ سے ضبط تولید اور آبادی کی رفتار کو محدود رکھنے کے مسئلے کو اہم تر بنا دیا ہے۔ کنبوں کی (تعداد کی) حد بندی لازمی مستحسن امر ہے کیونکہ اس کی بدولت ماں اور بچے کی صحت بھی اچھی رہتی ہے۔ اور بچوں کی نگہداشت اور پرورش بھی بخوبی ہوجاتی ہے فیملی پلاننگ کے سلسلے میں اقدامات کرنے کی غرض سے پلان میں ۶۵ لاکھ روپیہ مخصوص کیا گیا ہے کمیشن نے تجویز کیا ہے کہ مستقبل میں پالیسی اور تحقیقاتی کام کی کمیٹیاں قائم کی جائیں اور اس کے بعد آبادی کے متعلق ایک کمیشن بھی قائم کیا جائے۔

بحالیات

آبادکاری کی موجودہ اسکیم پر ۸۵ کروڑ روپے کے اخراجات کا تخمینہ لگایا گیا ہے۔ پروگرام کی تفاصیل ذیل کے گوشوارہ میں درج ہیں۔

	۱۹۵۱-۵۲ء	۱۹۵۲-۵۳ء	۱۹۵۳-۵۴ء	میزان
دیہاتی آبادکاری	۳ کروڑ ۸۸ لاکھ روپے	۴ کروڑ ۱۱ لاکھ روپے	۷ کروڑ ۱۴ لاکھ روپے	۱۵ کروڑ چار لاکھ روپے
شہری مکانات	۱۷ کروڑ ۱۱ لاکھ روپے	۳۱ کروڑ ۶۲ لاکھ روپے		
شہری قرضے (بحالیات کی مالی ایڈمنسٹریشن کے علاوہ)۔	۲ کروڑ ۲۴ لاکھ روپے	۳ کروڑ ۶۳ لاکھ روپے -	[illegible] کروڑ ۹۰ لاکھ روپے	[illegible] کروڑ ۴۱ لاکھ روپے
بحالیات کی مالی ایڈمنسٹریشن کی طرف سے دیے ہوئے قرضے	ایک کروڑ ۲۵ لاکھ روپے -	۲ کروڑ ۵ لاکھ روپے	۲ کروڑ روپے	۵ کروڑ ۳۰ لاکھ روپے
ٹیکنیکل تربیت تعلیم اور دوسری اسکیمیں	۴ کروڑ ۸۸ لاکھ روپے	۳ کروڑ ۳۵ لاکھ روپے -	۳ کروڑ ۶۴ لاکھ روپے	۱۱ کروڑ ۸۷ لاکھ روپے
متفرق	.	.	۲ کروڑ ۳۸ لاکھ روپے	۲ کروڑ ۳۸ لاکھ روپے
	۲۸ کروڑ ۴۵ لاکھ	۲۶ کروڑ ۸۵ لاکھ	۲۹ کروڑ ۸۸ لاکھ	۸۵ کروڑ

بے گھر لوگوں کے پیشوں کے بارے میں صحیح معلومات کی عدم موجودگی کے باعث بحالیات کے پروگرام مرتب کرنے میں بڑی مشکلات پیش آئی ہیں۔ جہاں تک پوربی بنگال کے بے گھر لوگوں کا تعلق ہے دونوں طرف لگاتار آمد و رفت سے اس مسئلے کی پیچیدگیوں کا صحیح اندازہ لگانا اور بھی مشکل ہوجاتا ہے۔ اس لئے پچھمی اور پوربی پاکستان سے آمدہ بے گھر لوگوں کے بارے میں مختلف طریقہ کار کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ (مسلسل)

رفتارِ زمانہ

غلّے کی پیداوار کے شاندار نتائج

بھارت سرکار نے زرعی مقابلے کرانے اور زیادہ اناج پیدا کرنے والوں کو انعامات دینے کی جو پالیسی اختیار کی ہے اُس کے نتائج نہایت حوصلہ افزا برآمد ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک تازہ اطلاع مظہر ہے کہ مکتسر تحصیل کے فکمر سر گاؤں کے شری تہر سنگھ نامی ایک کسان نے ایک ایکڑ زمین میں اسّی من اکتیس سیر نو چھٹانک گندم پیدا کرکے ایک نیا ریکارڈ قائم کر دیا ہے فصل کٹنے کے وقت مقامی افسر موقعے پر موجود تھے۔ واضح رہے کہ پچھلے سال ضلع لدھیانہ کے شری گوبند سنگھ نے ۷۱ من ۲۳ سیر ۱ چھٹانک فی ایکڑ کا ریکارڈ قائم کیا تھا۔ اس کے لیے شری جواہر لال نہرو نے اُنھیں انعام بھی دیا تھا۔

شیخ محمد عبداللہ کی پبلک سے اپیل

ریڈیو کشمیر سے ایک تقریر نشر کرتے ہوئے ریاست جموں و کشمیر کے وزیرِ اعظم شیخ محمد عبداللہ نے جموں کے عوام سے نہایت مؤثر الفاظ میں اپیل کی کہ وہ اُن لوگوں کے بہکانے میں نہ آئیں جن کے اعمال سیاہ ہیں۔ انھوں نے کہا "اگر آپ نے اب بھی اپنے جذبات سے اُنھیں کھیلنے دیا تو اس کا نتیجہ نہایت بھیانک ہوگا۔ میں اور میری حکومت دیانتدارانہ اور تعمیری نکتہ چینی کے حق میں ہیں۔ ہم اپنے آپ کو غلطیوں سے مبرّا نہیں سمجھتے۔ لیکن نکتہ چینی ایسی ہونی چاہیے جس سے ملک کے اندر انتشار نہ پیدا ہو۔ بلکہ باہمی یگانگی کا جذبہ پیدا ہو۔ اگر ہماری ریاست کے لوگ آپس میں متحد ہوں تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتی۔" آخر میں شیخ صاحب نے اپیل کی کہ "آؤ ہم ایک دوسرے کی عزت کے پاسبان بنیں اور ایک دوسرے کے دوش بدوش ترقی کے میدان میں آگے بڑھتے چلے جائیں۔"

پنج سالہ پلان کے سلسلے میں حوصلہ افزا کارگزاری

بھارت کے وزیر منصوبہ بندی شری گلزاری لال نندہ نے پارلیمنٹ میں پنج سالہ پلان کی دو سالہ کارگزاری پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ اس مدت میں پلان پر مجموعی خرچ پانچ ارب پچاسی کروڑ آیا ہے جب کہ پوری مدت کے لئے خرچ کا اندازہ بیس ارب ۶۹ کروڑ لگایا گیا تھا۔ اس دوران میں جو کام ہوا ہے وہ اس قابل ہے کہ عوام اس پر فخر کر سکیں۔ چودہ لاکھ بیس ایکڑ مزید زمین قابلِ آب پاشی بنائی گئی ہے اور تین لاکھ پندرہ ہزار کلو واٹ بجلی کی نئی طاقت پیدا کی گئی ہے۔ ۱۹۵۱ء سے زرعی پیداوار میں جو اضافہ ہوا اُس میں پٹ سن ۱۸ لاکھ گانٹھیں۔ روئی تین لاکھ نوّے ہزار گانٹھیں۔ گنّا تین لاکھ ٹن اور اناج گیارہ لاکھ پچاس ہزار ٹن ہے زیرِ کاشت علاقے میں ساٹھ لاکھ ایکڑ کا اضافہ ہوا ہے صنعتی اشیاء میں سوتی کپڑے سیمنٹ۔ لوہا اور فولاد، کاغذ مصنوعی ریشم اور پٹ سن کے سامان کی پیداوار میں تسلّی بخش حد تک اضافہ ہوا ہے۔ ریلوے انجن، گاڑیوں کے ڈبے، سمندری جہاز بھی کافی تعداد میں بنائے گئے ہیں۔ اس کام میں ابھی مزید ترقی ہو رہی ہے اور اُمید کامل ہے کہ جنتا کے تعاون سے ہمارا پنج سالہ پلان کامیاب ہوگا۔

فرانس میں وزارتی اُلجھنیں

فرانس میں سیاسی حالات پیچیدہ صورت اختیار کر رہے ہیں۔ آئے دن وزارتیں بنتی اور ٹوٹتی ہیں۔ اس وقت وہاں کوئی وزارت نہیں ہے۔ اب پریذیڈنٹ ونسینٹ اوریول نے ملک کو اس مشکل سے نکالنے کے لئے سوشلسٹ پارٹی کے لیڈر موسیو مولیٹ کو دعوت دی ہے کہ وہ وزارت مرتب کرنے کی کوشش کریں۔ موسیو مولیٹ ابھی تک وزارت بنانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

بھارت اور پاکستان کے مابین خوشگوار حالات

ملک کی تقسیم کے بعد بھارت اور پاکستان کے باہمی تعلقات میں بے اعتمادی اور مخالفت کی جو گھٹائیں چھائی تھیں وہ اب چھٹنی شروع ہو گئی ہیں، اور پاکستان کے حکمران یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ نفرت اور باہمی کشمکش سے پاکستان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ پاکستان کے نئے وزیر اعظم مسٹر محمد علی نے اپنے عہدے کو سنبھالتے ہی یہ اعلان کیا کہ پاکستان بھارت کے ساتھ دوستی کا پورے طور پر خواہاں ہے۔ انھوں نے شری جواہر لال نہرو کو اپنا بڑا بھائی مانتے ہوئے اُن کے ساتھ ملاقات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس کے بعد پاکستان کے گورنر جنرل مسٹر غلام محمد نے ایبٹ آباد میں ایک تقریر کے دوران میں بھارت اور پاکستان دونوں سے اپیل کی کہ وہ آپس میں تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے سنجیدگی سے غور کریں۔ انھوں نے کہا کہ نفرت اور عدم رواداری کے جذبے کی وجہ سے بھارت اور پاکستان نے ڈیفنس پر کروروں روپیہ صرف کیا جو ملک کو خوش حال بنانے اور سڑکیں اور ہسپتال بنانے کے کام آ سکتا تھا۔

پاکستانی اکابر کے اس خوشگوار رویے سے بھارت کے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو کی تمنا بر آئی، اور پارلیمنٹ میں بھارت کی خارجہ پالیسی کے سلسلے میں بیان دیتے ہوئے انھوں نے سب سے بیشتر اس امر پر نہایت خوشی کا اظہار کیا کہ پچھلے چند ہفتوں میں بھارت اور پاکستان کے تعلقات میں نمایاں بہتری ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں مسٹر محمد علی وزیر اعظم پاکستان نے کراچی کی ایک پریس کانفرنس میں اس امر کا انکشاف کیا کہ ملکہ الزبتھ کی رسم تاجپوشی کے بعد باضابطہ طور پر شری جواہر لال نہرو اور اُن کے درمیان کراچی میں کانفرنس ہوگی۔ انھوں نے یہ بات زور دے کر کہی کہ بد امنی کا خطرہ دور کرنے کے لئے پاکستان، ہند اور پاکستان کے جھگڑوں کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ ان جھگڑوں سے جنگ، نفرت اور شکوک کے جراثیم پرورش پاتے ہیں۔

مصری عوام کا جذبہ

نہر سویز کے مسئلے پر مصر اور برطانیہ کے مابین کشیدگی بڑھتی جا رہی ہے، اور مصریوں میں برطانیہ کے لئے نفرت اور بد اعتمادی کے جذبات ابھر رہے ہیں۔ اگلے روز سویز کے برطانوی تیل کے کارخانوں سے تین ہزار مصری مزدور "ہم سویز کے علاقے کے مالک ہیں" کے نعرے لگاتے ہوئے کام چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ اس وقت ملک بھر میں دہشت پھیلی ہوئی ہے، اور انگریز کنبے خطرے کے پیش نظر قاہرہ اور اسکندریہ سے نکل رہے ہیں۔ امریکہ کوشش کر رہا ہے کہ سمجھوتے کی کوئی راہ نکل آئے۔ اسی سلسلے میں یہ بھی اطلاع ہے کہ جنرل نجیب بھارت کے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو سے ملاقات کر کے انھیں تمام صورت حالات سے آگاہ کر کے اُن سے مشورہ طلب کریں گے۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی کی منظور شدہ قراردادیں

آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اپنے دو روزہ اجلاس میں بہت سی اہم قراردادیں منظور کیں۔ ایک ریزولیوشن میں بیکاری دور کرنے کے لئے حکومت سے مؤثر قدم اٹھائے جانے کا مطالبہ کیا گیا۔ بھومی سُدھار اور صنعتی ترقی پر خاص توجہ مبذول کرنے کی سفارش کی گئی۔ ایک دوسرے پرستاؤ میں فرقہ پرست جماعتوں کی طرف سے جاری کی ہوئی جموں ایجی ٹیشن کی پُرزور الفاظ میں مذمت کی گئی، اور عوام کو آگاہ کیا گیا کہ وہ رجعت پسند اور فرقہ پرست جماعتوں کے غلط پراپیگنڈے کا شکار نہ بنیں اور کسی قسم کے دھوکے میں نہ آئیں۔ زبان کے بارے میں جو قرارداد منظور کی گئی اُس میں سفارش کی گئی کہ جہاں ہندی کو قومی زبان کے طور پر ہر ممکن ترقی دی جانی چاہیئے وہاں اس کے ساتھ علاقائی زبانوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیئے۔

اردو کے متعلق ورکنگ کمیٹی نے خاص طور پر یہ سفارش کی کہ اس کو اس کا جائز حق دیا جائے۔ کیونکہ یہ زبان ہندوستان میں ہی پیدا ہوئی اور یہیں پروان چڑھی اور ملک کے لوگوں کی کافی تعداد اس زبان کا استعمال کرتی ہے۔

جسمانی محنت کے لئے وزیر اعظم کی اپیل

بھارت سیوک سماج کی ایک کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے شری جواہر لال نہرو نے اس بات پر زور دیا کہ ایک خوش حال اور ترقی یافتہ بھارت کی تشکیل کے لئے یہ امر ضروری اور ناگزیر ہے کہ ہماری جنتا جسمانی محنت کے کام میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لے۔ آپ نے کہا کہ ہر وہ چھوٹے سے چھوٹا کام جو ہم جسمانی محنت کے ذریعے انجام دیتے ہیں ملکی ترقی اور خوش حالی کی راہ میں ایک طرح کا سنگ میل ثابت ہوتا ہے۔ آپ نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ اس ملک کے عوام جسمانی محنت کو شخصی وقار کے منافی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک غلط نظریہ ہے۔

Regd. No. E P - 683

مظہر امام

ہم ایک ہیں

ہم ایک ہیں ! ہم ایک ہیں !! — ہم ایک ہیں ! ہم ایک ہیں !!

رشکِ جناں، ہندوستاں — دو ہیں رگیں اور اک لہو

ہندو ہیں اس کے باغباں — دو پھول ہیں اور ایک بو

مسلم، بہارِ گلفشاں — پیمانے دو اور اک سبو

مہمل ہے فرقِ این و آں — ہم سے وطن کی آبرو

ہم ایک ہیں ! ہم ایک ہیں !! — ہم ایک ہیں ! ہم ایک ہیں !!

اک مرغ کے دو بال و پر — ہم ہیں غزالانِ وطن

نخلِ وطن کے دو ثمر — روحِ گلستانِ وطن

اک آسماں کے دو قمر — رقصِ بہارانِ وطن

اک راہ کے دو ہمسفر — شانِ وطن، جانِ وطن

ہم ایک ہیں ! ہم ایک ہیں !!

بی بی جان

مگرمچھ کی شادی

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ گیدڑوں میں خوب لڑائی ہوئی۔ ایک کمزور گیدڑ کو اُس کے ساتھیوں نے جھنجھوڑ کر پاس کے ایک دریا میں ڈھکیل دیا۔ یہ گیدڑ بہتا ہوا پانی کے دھارے پر جا رہا تھا کہ راہ میں ایک مگرمچھ نے اُس کو آدبوچا۔ گیدڑ نے اپنے چھڑانے کی بہت کوشش کی، مگر نہ چھوٹ سکا۔

گیدڑ نے کہا کہ مجھ کو میرے ساتھیوں نے اس خطا پر دریا میں ڈھکیل دیا تھا کہ میں اپنی شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اب تم اگر چاہو تو میں تمہاری شادی ابھی کرا دوں۔ مگرمچھ شادی کے پیغام سے بہت خوش ہوا، اور گیدڑ کو فوراً چھوڑ دیا۔ گیدڑ دریا پار کر کے ایک پاس کے کھیت پر پہونچا۔ وہاں بھینس کی ہڈیوں کی ایک مانجر پڑی ہوئی تھی۔ گیدڑ دوسرے کھیت پر گیا اور وہاں سے ایک لال اوڑھنی کسی عورت کی جو مینڈ پر رکھی ہوئی تھی اُٹھا لایا۔

اُس کپڑے کو مانجر پر اُڑھا دیا اور مانجر کو گھسیٹ کر ایک درخت کے سہارے کھڑا کر دیا۔ یہ انتظام کر کے پھر دریا پر گیا اور مگرمچھ کو آواز دی۔ مگرمچھ نکلا تو گیدڑ نے کہا لو وہ تمہاری عورت آگئی ہے۔ اب تم خود جا کر اُس کو لے آؤ۔ وہ سامنے کے درخت کے پاس کھڑی ہے، شرم کے مارے یہاں تک نہیں آئی۔ مگرمچھ نے غور کے ساتھ دیکھا اور مارے خوشی کے درخت کے پاس پہونچ کر اپنے پنجے مارے کہ اُس کو پکڑ لیا جائے۔ مگر وہاں عورت ہوتی تو ہاتھ آتی۔ ہڈیاں چُبھ گئیں، اور مانجر زمین پر آرہی۔ گیدڑ قہقہہ مار کر دُور بھاگ گیا۔ مگرمچھ زخمی ہو گیا اور مارے غصے کے پھر دریا کو واپس گیا۔ لیکن گیدڑ کو آگاہ کرتا گیا، کہ اب جب کبھی وہ مل جائے گا تو زندہ نہ چھوڑے گا۔

گیدڑ اب دوسرے گھاٹ پر پانی پینے جاتا تھا۔ مگرمچھ کو گیدڑ کی ہر وقت فکر رہتی تھی۔ ایک دن پتہ چلا کر مگرمچھ اُسی گھاٹ کے کنارے پانی میں چھپ کر بیٹھ رہا، جہاں گیدڑ پانی پینے آتا تھا۔ گھاٹ کے کنارے گولر کا ایک درخت تھا جس کی جڑیں پانی کی وجہ سے کھل گئی تھیں۔ گیدڑ جڑوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر پانی پی لیا کرتا تھا۔ جیسے ہی گیدڑ نے جڑ پر ہاتھ رکھے اور پانی پینے کو سر جھکایا، ویسے ہی مگرمچھ نے جو اُس کی تاک میں دیر سے پانی کی تہ میں چھپا ہوا تھا گیدڑ کے دونوں ہاتھ اپنے مضبوط پنجوں سے پکڑ لئے اور کہا اب بتاؤ۔ کہاں جاؤ گے؟ گیدڑ ہنسا اور کہنے لگا، واہ رے بے وقوف تجھ کو پکڑنا تھے میرے ہاتھ، مگر پکڑیں جڑیں۔ یہ سنتے ہی مگرمچھ نے ہاتھ تو

چھوڑ دیئے اور جھٹ سے درخت کی نکلی ہوئی جڑیں پکڑلیں۔ گیدڑ اپنی جان بچا کر ہنستا ہوا رفوچکر ہوا۔

اب گیدڑ نے دریا کا جانا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ وہ گاؤں کے تالابوں میں پانی پی لیا کرتا تھا اور رات کو گاؤں کے باہر ایک غار میں رہا کرتا تھا۔ مگر مگرمچھ کو ہر وقت اُس کی فکر رہتی تھی آخر اُس غار کا پتہ لگا ہی لیا۔ اور ایک دن لوٹتا پوٹتا اُس کے غار میں جا کر دن ہی سے چھپ کر بیٹھ رہا۔ شام کو جب

گیدڑ اپنے غار میں جانے کو آیا تو اُس نے مگرمچھ کی لوٹن زمین پر بنی ہوئی پائی۔ وہ سمجھ گیا کہ دشمن اُس کے غار میں چھپا ہوا ہے۔ اُس نے باہر ہی سے آواز دی کہ روز تو غار کے اندر سے آواز آتی تھی کہ "آجاؤ" آج آواز کیوں نہیں آئی۔ مگرمچھ نے یہ سُن کر آواز دی کہ "آجاؤ" گیدڑ خوب ہنسا اور بھاگ گیا۔ مگرمچھ کو پھر وہاں سے کھسیانا ہو کر مجبوراً دریا کو واپس آنا پڑا۔

گیدڑ نے غار کا رہنا چھوڑ دیا۔ اب وہ باہر کھلیان میں دھانوں کے پیال کے ایک ڈھیر میں چھپ چھپا کر رات بسر کر لیتا تھا۔ مگرمچھ کو اب بھی اس کی کھوج رہی اور وہ برابر پتہ چلاتا رہا۔ یہاں تک کہ اُس کو معلوم ہی ہو گیا کہ فلاں پیال کے ڈھیر میں گیدڑ رات کو آ کر رہتا ہے وہ پھر ایک بار چھپ کر دن ہی سے اُس ڈھیر میں بیٹھ رہا۔ مگر شام کو جب گیدڑ آیا تو مگرمچھ کی لوٹن اُس کو معلوم ہو گئی اور وہ سمجھ گیا کہ اب کی مرتبہ دشمن اِسی ڈھیر میں کہیں چھپا ہوا ہے، وہ گاؤں میں گیا اور ایک آدھا سلگتا ہوا کنڈا اپنے منہ میں دبا کر لے آیا۔ ہوا میں جب آگ نے تیزی پکڑی تو گیدڑ نے اُس کنڈے کو ڈھیر کے ہر کونے میں پہونچا کر چاروں طرف آگ لگادی۔ مگرمچھ کو ڈھیر کے اندر ابھی خبر بھی نہ ہوئی تھی کہ آگ کے بڑے بڑے شعلے ہر طرف سے نکلنے لگے۔ جب گرمی معلوم ہوئی تو مگرمچھ نے باہر آنا چاہا۔ مگر آگ کی لپٹ نے اُس کو نکلنے نہ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اُچھل اُچھل کر اُسی ڈھیر میں گر گیا، اور جل کر مر گیا۔ اِس طرح گیدڑ نے اپنے جانی دشمن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

اِس کہانی سے ہم کو دو سبق حاصل ہوتے ہیں۔ (۱) کسی کام کی ایک مرتبہ ناکامی پر ہمت نہ ہارنا چاہیئے اور مگرمچھ کی طرح برابر ناکامیوں پر بھی کوشش اور تلاش کو جاری رکھنا چاہیئے۔ (۲) انسان بھی اگر مُصیبت میں ہوش حواس قائم رکھے اور عقل سے کام لیتا رہے تو وہ گیدڑ کی طرح ہر مصیبت اور مشکل میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

لطیفہ

پہلا شخص۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ حیدرآباد سے بمبئی ۵۰۰ میل ہے۔

دوسرا۔ بے وقوف کیا کہا، ۵۰۰ میل بالکل غلط۔ میں نے کل ہی ناپا ہے بمشکل سے دو انچ ہے۔

امام منظر

ودیا ساگر

پیارے بچو! تم میں بہت سے ایسے ہوں گے جنہوں نے کبھی "ودیا ساگر" کا نام بھی نہ سنا ہوگا۔ آؤ آج ہم تمہیں ان کے متعلق کچھ بتائیں۔

آپ کا پورا نام ایشور چندر ہے اور "ودیا ساگر" خطاب ہے انہیں یہ خطاب کس طرح حاصل ہوا یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ ایشور چندر مدنا پور ضلع کے ایک گاؤں ورنگھا میں ۱۸۲۰ء میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام ٹھاکر داس بینرجی اور ماں کا نام بھگوتی دیوی تھا۔ آپ کے والد ایک غریب برہمن تھے۔ اور والدہ نہایت ہی لائق اور شریف عورت تھیں۔ غریبوں کی بہت ہمدرد۔ انہوں نے اپنے لڑکے پر بہت گہرا اثر ڈالا۔

ایشور چندر پانچ سال کی عمر میں گاؤں کے ایک اسکول میں داخل کر دیے گئے۔ وہ بچپن میں بہت شریر تھے۔ کوئی ایسی شرارت نہیں تھی جو انہوں نے نہیں کی ہو۔ لیکن ان سب کے باوجود وہ ایک ذہین طالب علم تھے۔ ان کی یادداشت اتنی اچھی تھی کہ جو کچھ وہ پڑھتے تھے۔ وہ انہیں یاد ہو جاتا تھا۔ نو سال تک گاؤں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کے والد انہیں کلکتہ لے گئے اور سنسکرت کالج میں داخل کر دیا۔ اس وقت وہ بہت چھوٹے تھے قد بھی اُن کا لانبا نہیں تھا۔ اور صحت بھی اچھی نہیں تھی۔ پروفیسر انہیں دیکھ کر ہچکچائے۔ لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری وہ کوشش کرتے رہے۔ کالج کے ساتھی ان کا مذاق اڑاتے۔ انہیں دیکھ کر ہنستے۔ مگر ان کو اس کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا۔ اُن کے نادان ساتھیوں کو اس وقت بہت تعجب ہوا جب یہ چھوٹا سا لڑکا امتحان میں اوّل آیا۔ اور اس نے وظیفہ بھی حاصل کیا۔

سنسکرت کا پورا ادب پاس کرنے کے بعد ایشور چندر نے درباری پنڈتوں کا امتحان پاس کر لیا جو کہ بہت ہی اعلیٰ امتحان تھا۔ یہ امتحان پاس کرنے پر انہیں سو روپے کا انعام ملا۔ لیکن تمام پنڈت اپنے اس قابل شاگرد کو کوئی خاص خطاب دینا چاہتے تھے۔ لہٰذا ان لوگوں نے انہیں "ودیا ساگر" (یعنی تعلیم کا سمندر) کا خطاب عطا کیا۔

ودیا ساگر نے زندگی میں بہت سی مصیبتیں اٹھائیں۔ تعلیم کے زمانے میں انہیں خود کھانا پکانا پڑتا۔ لیکن وہ ہمت ور اور قوی ارادے کے آدمی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ایک دن ودیا ساگر کا نام دنیا کے بڑے سے بڑے لوگوں میں لیا جانے لگا۔ اس زمانے کے تمام دولت مند اور بڑے بڑے لوگ ان سے ملنے کے خواہشمند رہتے تھے۔ بنگال کے گورنر انہیں مشورے کے لئے بلایا کرتے تھے۔ لیکن ان سب کے باوجود ان کا لباس بالکل سادہ تھا۔ یعنی دھوتی، پاجامہ اور معمولی سی چپل۔

اب آؤ! تمہیں ودیا ساگر کے چند کارنامے سنائیں۔

ودیا ساگر نے بنگال کے عوام کے درمیان تعلیم پھیلانے کی انتہائی کوشش کی۔ انہوں نے لڑکیوں کی تعلیم میں خاص حصہ لیا۔ گاؤں میں لڑکیوں کے کئی اسکول قائم کئے۔ کوئی سائل آپ کے پاس سے ناکام نہیں گیا۔ انہوں نے اپنے پھاٹک پر کبھی دربان نہیں رکھا۔ تاکہ کوئی غریب آدمی اگر ان سے ملنا چاہے تو نکال نہ دیا جائے۔

ایک دفعہ ودیا ساگر نے ایک بوڑھے آدمی کو گلی میں آتے دیکھا اس کے چہرے سے اداسی ٹپک رہی تھی۔ انہوں نے اس کی وجہ دریافت

کی ضعیف آدمی نے جواب دیا کہ اس نے چند ہزار روپے قرض لے رکھے ہیں - اگر اس نے روپے ادا نہیں کئے تو اسے جیل جانا پڑے گا۔ ودیا ساگر نے اس سے مقدمے کی تاریخ دریافت کی اور تاریخ کے دن حسب خواہ رقم بھیج کر اس کا قرض چکا دیا - بوڑھے آدمی کو یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ اس کا نجات دہندہ کون تھا -

اس طرح ایک اور مثال سُن لو -

بنگال کے عظیم شاعر مدھو سودن دت جب پیرس میں قیام پذیر تھے - تو وہ بھی قرض کے شکار ہو گئے - اور انہیں روپے کی سخت ضرورت تھی - اگر وہ روپیہ ادا نہ کرتے تو انہیں بھی جیل جانا پڑتا لیکن صرف ودیا ساگر کی وجہ سے وہ جیل جانے سے بچ گئے -

ودیا ساگر کے متعلق اس طرح کی کئی کہانیاں مشہور ہیں - جن سے ان کی شرافت، فیاضی اور سخاوت کا پتہ چلتا ہے -

ودیا ساگر ستر برس کی عمر میں چند مرتبہ بیمار پڑنے کے بعد انتقال کر گئے - اور اس طرح بنگال کی ایک عظیم ہستی کا خاتمہ ہو گیا لیکن انکی یاد اب بھی سب کے دل میں موجود ہے - ان کے نیک کارناموں سے ہم سب کو سبق حاصل کرنا چاہئے -

---

لطیفے

اُستاد - بتاؤ امجد والد کی جمع کیا ہے؟

امجد - جی جناب اولاد

ایک دفعہ ایک امیر کے گھر چور گھسا

امیر - ارے م م م منگو میری ب ب ب بندوق لا

منگو - ک ک ک کہاں ہے -

امیر - ج ج ج جانے دے بھاگ گیا -

وی - مدن موہن ریڈی

اپنے دیس میں

— سب سے اونچا پربت ماؤنٹ ایورسٹ (۲۹۰۰۲ فٹ اونچا ہے)

— سب سے گہری جھیل ڈلہ (کشمیر) ہے

— سب سے بڑا دریا انڈس (سندھ) ہے -

— سب سے اونچا آبشار جرسوپا (میسور) (۹۶۰ فٹ اونچا ہے)

— سب سے بڑا ڈیلٹا سندربن کا ڈیلٹا (۸۰۰۰ مربع میل) ہے

— سب سے لمبا پُل سون پل ۱۰۰۵۲ فٹ لمبا ہے -

— سب سے لمبی سڑک گرانڈ ٹرنک روڈ ۱۵۰۰ میل لمبی ہے -

— سب سے بڑی آبادی کا شہر کلکتہ ہے -

— سب سے زیادہ بارش کا علاقہ چراپونجی ہے -

— سب سے لمبا برآمدہ رامیشورم مندر کا برآمدہ ۴۰۰۰ فٹ لمبا ہے -

— سب سے اونچا دروازہ فتح پور سیکری ۱۷۶ فٹ اونچا ہے -

— سب سے بڑا گنبد گول گنبد (بیجاپور) ہے -

— سب سے بڑا غاری مندر ایلورہ (حیدرآباد دکن) ہے

— سب سے لمبی مورت گومٹ ناس وار (میسور) ۵۶ فٹ اونچی ہے

— سب سے لمبا پلیٹ فارم سون پور (بہار) کا ہے -

— سب سے خوبصورت وادی وادئ کشمیر ہے -

— سب سے زیادہ جنگلوں کا صوبہ آسام ہے

— سب سے خوبصورت عمارت تاج محل ہے -

— سب سے بڑی مسجد، جامع مسجد دہلی ہے -

محمد امین

سُورج اور اُس کا خاندان

آپ نے موٹر، ریل گاڑی یا ہوائی جہاز سے سفر ضرور کبھی کیا ہوگا۔ لیکن آپ نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ موٹر سڑک پر کتنی تیز چلتی ہے یا ریل گاڑی کی رفتار کیا ہے یا ہوائی جہاز اُڑ کر ایک گھنٹہ میں کتنے سو میل پہنچ جاتا ہے؟ اچھا یہ بتائیے کہ ایک منٹ میں کتنے سو میل سفر کر سکتے ہیں۔ کیا ایک منٹ میں ایک ہزار میل سے زیادہ سفر کرنے کا اتفاق ہوا ہے؟ آپ ہی کہیں گے کہ "نہیں" لیکن یہ آپ کا خیال ہے۔ آپ اس لمحہ تو نہایت تیزی سے سفر کر رہے ہیں۔ آیئے ہم آپ کو بتائیں۔ زمین سال میں سُورج کے ارد گرد ایک چکر لگاتی ہے۔ یہ سفر طے کرنے کے لئے ایک منٹ میں ۱۱۰۰ میل دوڑتی ہے اور آپ کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ آپ اتنی تیزی سے بھاگ رہے ہیں اس لئے کہ زمین کے اوپر کی ہوا اور دوسری تمام چیزیں آپ کے ساتھ ساتھ اتنی ہی تیزی سے گھوم رہی ہیں۔ اسی دوران میں جب آپ پڑھ رہے تھے آپ نے کم سے کم ۲۰۰ میل کا سفر طے کر لیا ہے۔

زمین سورج کے خاندان کا ایک سیارہ ہے اور ہر لمحہ اس کے ارد گرد چکر کاٹتی رہتی ہے لیکن صرف زمین ہی سورج کے چاروں طرف چکر نہیں کاٹتی۔ سورج کا اپنا ایک بہت بڑا خاندان ہے اور اس کے خاندان کا ہر ممبر نہایت تیزی سے ہر وقت سفر کرتا ہے۔

زمین کوئی ستارہ نہیں۔ یہ ایک سیارہ ہے۔ سورج کے خاندان میں آٹھ اور سیارے ہیں اور ان میں سے سبھی زمین سے کچھ نہ کچھ ملتے جلتے ہیں۔ ان سیاروں کے نام یہ ہیں۔ عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری، زحل، یورینس، نیپچون اور پلوٹو۔ غالباً آپ نے زہرہ، مریخ، مشتری اور زحل کو رات کے وقت آسمان پر جگ مگ جگ مگ کرتے ہوئے دیکھا ہوگا لیکن انہیں دیکھ کر آپ نے یہ سمجھا ہوگا کہ وہ بھی دُوسرے ستاروں کی طرح باقاعدہ ستارے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ستاروں کے بجائے وہ سیارے ہیں جن کے اندر خود اپنی روشنی نہیں ہوتی بلکہ سورج کی روشنی پڑنے سے وہ چمک جاتے ہیں۔ ان نو بڑے بڑے سیاروں کے علاوہ سورج کے خاندان میں ایک ہزار سے زیادہ اور بھی بہت چھوٹے چھوٹے سیارے شامل ہیں وہ اس قدر چھوٹے ہیں کہ بغیر دوربین کی مدد کے دکھائی نہیں دے

سکتے - بڑے سیاروں کی طرح یہ سب کے سب چھوٹے بہن بھائی سورج
کے اردگرد تیزی سے سفر کرتے ہیں -

زمین کے ساتھ اس کا ایک لڑکا بھی ہے جسے چاند کہتے ہیں - یہ
چاند زمین کے چاروں طرف چکر کاٹتا ہے - پانچ دوسرے سیارے اور
بھی ہیں جن کے اپنے اپنے چاند ہیں - ان میں سے بعضوں کے پاس تو
کئی کئی چاند ہیں - یہ سب چاند بھی سورج ہی کے خاندان سے
تعلق رکھتے ہیں -

سورج کے خاندان کے سب سے عجیب وغریب چاند وہ ہیں
جن کو آپ دُم دار ستارے کہتے ہیں - آپ میں سے تو بہتوں نے
دُم دار ستارہ کبھی نہ دیکھا ہوگا حالانکہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں دُم دار
ستارے سورج کے چاروں طرف اپنے اپنے راستوں پر اپنی منزلیں
طے کرنے میں دن رات لگے رہتے ہیں - یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے
پرانے زمانے میں ایسے ہی ستاروں کو بالوں والا یا بال دار ستارہ کہتے تھے

سورج کے خاندان میں لاکھوں اور کروڑوں شہاب بھی ہیں -
آپ نے کوئی شہاب ثاقب دیکھا ہے یا نہیں ؟ بہرحال رات کے وقت
آپ نے آسمان پر ٹوٹتے ہوئے تاروں کو تو ضرور دیکھا ہوگا اور اگر
نہ دیکھا ہو تو کبھی جب اندھیری رات ہو اور آسمان پر خوب تارے
چھٹکے ہوں تو ذرا غور سے دیکھیے - آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک تارہ
ٹوٹ کر تیزی سے نیچے گرتا ہے - ٹوٹتے وقت لمبی سی روشنی ہوتی ہے
پھر وہ ستارہ ایک دم سے غائب ہو جاتا ہے یا اس کی روشنی گُل
ہو جاتی ہے - انہیں شہاب کو جو آسمان پر ٹوٹتے تاروں کی شکل میں
دکھائی دیتے ہیں ٹوٹتے ہوئے تارے بھی کہتے ہیں -

سائنس دان سورج اور سیارے، چاند، دُم دار ستارے
ٹوٹنے والے تارے اور ننھے مُنے سیارے جو سورج کے اردگرد تیزی
سے گھومتے ہیں ان سب کو ملا کر سورج اور اس کا خاندان کہتے ہیں -

دوسرے تمام ستارے جنہیں رات کے وقت آپ دیکھتے ہیں، وہ
سب کے سب ایک دوسرے سے دُور دُور ہیں - ان کے متعلق جتنا بھی
ہم جانتے ہیں اس کی بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے بعض ممکن ہے
ایسے ہوں کہ خود ان کا اپنا الگ ایک خاندان ہو اور وہ بہت سے
سیاروں کے کرتا دھرتا ہوں - ہم سے یا ہماری زمین سے وہ اتنے زیادہ
دور ہیں کہ ان کے متعلق ٹھیک سے کوئی شخص نہیں بتا سکتا -

جب سورج کا اپنا ایک خاندان ہے اور وہ بھی بہت بڑا
خاندان ہے تو ممکن ہے آپ یہ سمجھیں کہ سورج کے اردگرد جتنی بھی جگہ
ہے اس میں بہت بھیڑ ہے یعنی اس میں جگہ جگہ اتنے چھوٹے بڑے
سیارے، دم دار ستارے، ٹوٹنے والے ستارے ہیں ان کا اچھا خاصا
جمگھٹ ہے لیکن آپ کا یہ خیال ٹھیک نہیں ہے - سورج کا خاندان
ایک بہت وسیع خلا کے اندر پھیلا ہوا ہے - باوجود اس کے کہ سورج کا
خاندان بہت بڑا ہے پھر بھی اس میں بیشتر جگہ خالی ہے اور ایک
سیارے کا دوسرے سیارے کے ساتھ ٹکرانے یا لڑ جانے کا کوئی
ڈر نہیں ہے -

یہ تو ایک حقیقت ہے کہ زمین ایک منٹ میں ۱۱۰۰ میل کی رفتار
سے سفر کر رہی ہے - زمین بجائے اس کے کہ اپنے مقررہ راستے پر سورج
کے اردگرد چکر کاٹے اگر کہیں یک بیک سیدھے اپنے راستے پر دور
وسیع خلا میں یہ آگے بڑھ جائے تو سال کے آخر میں سورج سے یہ
سیکڑوں لاکھوں میل دور نکل جائے گی - اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زمین
پر سورج کی روشنی اور گرمی کم ہو جائے گی اور سردی بڑھ جائے گی
ساری جاندار چیزیں فوراً ختم ہو جائیں گی - انسان بھی اس سردی کو
برداشت نہ کر سکے گا اور دیکھتے دیکھتے منٹوں میں دنیا کی کل آبادی
جم کر رہ جائے گی -

ساری جاندار چیزیں بہت خوش قسمت ہیں کہ زمین اپنے چکر

میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا کرتی اور نہایت باقاعدگی سے مسلسل سورج
کے اردگرد اپنے راستے پر دوڑتی رہتی ہے۔ لیکن آپ پوچھیں گے
کہ بھلا یہ زمین کو کیا اللہ میاں نے سورج کے ساتھ رسّے سے باندھ
دیا ہے کہ وہ کبھی اپنے راستے سے الگ ہٹتی نہیں۔ آخر یہ کیا بات
ہے کہ زمین ایک لا تمناہی راستے پر ہر لمحہ اتنی تیزی سے بھاگنے
میں مشغول ہے۔

سائنس کا چھوٹا موٹا اصول آپ جانتے ہوں گے۔ وہی جسے
قوت کشش کہتے ہیں یعنی ہر چیز ایک دوسری چیز کو اپنی طرف کھینچنے
کی طاقت رکھتی ہے تو اب فوراً یہ خیال آئے گا کہ سورج کی کشش
زمین کو شاید اپنے راستے پر گھومنے کے لئے ایک چکر میں ڈالے ہوئے
ہے۔ لیکن صرف سورج کی کشش ہی کافی نہیں کوئی اور چیز بھی ہے
اس حقیقت کو بھی آپ جانتے ہوں گے کہ زمین سورج سے ۹ کروڑ
میل سے بھی زیادہ دور ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ سورج اس قدر
بھاری ہے کہ وہ زمین کو اپنی طرف بہت ہی بڑی طاقت سے کھینچتا ہے
سائنس دان اس کشش کو قوت کشش کہتے ہیں۔ مختصراً اس کو صرف کشش کہتے ہیں۔

سورج کی کشش کو سمجھنے اور جاننے کے باوجود یہ بات اب بھی صاف
نہیں ہوتی کہ آخر زمین کیسے ایک مقررہ راستے پر گھومتی ہے بلکہ اب تو
ایک خطرہ بھی پیدا ہو گیا۔ کہ جب سورج اتنی طاقت سے زمین کو اپنی طرف
کھینچتا ہے تو کہیں زمین سورج ہی کی طرف کھنچ کر نہ چلی جائے یا اس سے
جا کر لڑ نہ جائے۔ لیکن زمین بھی تو طاقتور ہے۔ وہ بھی سورج کو اپنی
طرف کھینچتی ہے البتہ اس کی گردش اتنی تیز ہے کہ سورج کی کشش زمین
کے کسی ایک نقطہ پر پوری طرح اپنا زور ہی نہیں لگا سکتی۔ زمین اتنی
جلدی جلدی آگے بھاگ رہی ہے کہ سورج کی کشش زمین کو اپنے
اردگرد صرف گھما پاتی ہے۔

سورج زمین کو اتنی طاقت سے اپنی طرف کھینچ رہا ہے کہ زمین
سورج کو چھوڑ کر کہیں بھاگ ہی نہیں سکتی اور زمین اتنی تیزی سے گردش
کرتی ہے کہ وہ ہر وقت سورج سے ایک ہی فاصلے پر رہتی ہے۔ وہ ایک
راستے پر چلتی رہتی ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور نہ ہونے کا خطرہ ہے۔

زمین کے دوسرے بھائی بہن بھی اپنے راستے پر گھومنے میں دن رات
لگے رہتے ہیں۔ وہ ستارے جو سورج کے قریب ہیں ان کو سورج زیادہ طاقت
کے ساتھ اور وہ جو دور ہیں ان کو نسبتاً کم قوت سے اپنی طرف کھینچتا
ہے اس لئے وہ ستارے جو ہم سے قریب ہیں وہ دور کے سیاروں کے
مقابلے میں کہیں زیادہ تیزی سے چکر کاٹتے ہیں۔ پلوٹو جو کہ سورج سے سب سے
زیادہ دور ہے وہ زمین کے مقابلے میں بہت ہی آہستہ آہستہ گھومتا ہے۔
عطارد جو کہ سورج سے سب سے قریب ہے وہ زمین کی نسبت کہیں زیادہ
تیز گردش کرتا ہے۔

جس طرح سیارے سورج کے چاروں طرف گھومتے ہیں اسی طرح ستاروں
کے چاند یا بیٹے ان سیاروں کے اردگرد دن رات چکر کاٹنے میں منہمک ہیں
چاند بھی سیاروں کی قوت کشش کی وجہ سے دور نہیں ہٹ پاتے۔ سورج بھی
ان چاندوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور اگر سیارے ان کو اپنی طرف کھینچنا
بند کر دیں تو بھی سورج کے خاندان سے وہ علیحدہ نہیں ہو سکتے اور نہ بچ
کر کہیں بھاگ سکتے ہیں۔ قوت کشش کی وجہ سے ننھے ننھے ستارے
دُم دار ستارے، شہاب ٹوٹ کر گرنے والے ستارے سورج کے
خاندان سے نکل کر بھاگ نہیں پاتے اور قدرت کے بنائے ہوئے
ایک قانون کے تحت سب جکڑے ہوئے ہیں۔ قوت کشش
کے بغیر سورج اور اس کا خاندان کبھی قائم رہ ہی نہیں سکتا۔ اس
طرح سورج محض ایک معمولی ستارہ بن جائے گا اور بہت سے
ستاروں کی طرح وہ بھی آسمان پر چمکے گا اور ہم میں سے کوئی بھی اس کی
اہمیت سے واقف نہ ہو گا اور اس طرح اس کا خاندان بھی
نہیں چل سکتا۔